سائنس
انجمن ترقی اردو
کا
ماہوار رسالہ

سائنس

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ماہوار رسالہ

منظورہ سررشتہ تعلیمات حیدرآباد، صوبہ پنجاب، صوبہ بہار، صوبہ مدراس، میسور، صوبہ متوسط (سی۔ پی)، صوبہ سرحد، صوبہ سندھ، صوبہ دھلی، قیمت سالانہ محصول ڈاك وغیرہ ملا کر صرف پانچ روپے سکہ انگریزی (پانچ روپے ۱۴ آنے سکہ عثمانیہ)۔ نمونے کی قیمت آٹھہ آنے سکہ انگریزی (دس آنے سکہ عثمانیہ)

قواعد

(۱) اشاعت کی غرض سے جملہ مضامین بنام مدیر اعلی رسالہ سائنس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن روانہ کئے جائیں۔

(۲) مضمون کے ساتھہ صاحب مضمون کا پورا نام مع ڈگری عہدہ وغیرہ درج ہونا چاهئے

(۳) مضمون صرف ایك طرف اور صاف لکھے جائیں۔

(۴) شکلیں سیاہ روشنائی سے علحدہ کاغذ پر صاف کھینچ کر روانہ کی جائیں۔ تصاویر صاف ہونی چاهیئیں۔ ہر شکل اور تصویر کے نیچے اس کا نمبر، نام اور مضمون پر اس کے مقام کا حوالہ درج کیا جائے۔

(۵) مسودات کی حتی الامکان حفاظت کی جائیگی لیکن ان کے اتفاقیہ تلف ہوجانے کی صورت میں کوئی ذمہ داری نہیں لی جاسکتی۔

(۶) جو مضامین سائنس میں اشاعت کی غرض سے موصول ہوں، مدیر اعلی کی اجازت کے بغیر دوسری جگہ شائع نہیں کئے جاسکتے۔

(۷) کسی مضمون کو ارسال فرمانے سے پیشتر مناسب ہوگا کہ صاحبان مضمون مدیر اعلی کو اپنے مضمون کے عنوان، تعداد صفحات، تعداد اشکال و تصویر وغیرہ سے مطلع کردیں تاکہ معلوم ہوسکے کہ اسکے لئے پرچے میں جگہ نکل سکے گی یا نہیں۔ عام طور پر مضمون دس صفحہ (فلسکیپ) سے زیادہ نہ ہونا چاهئے۔

(۸) تنقید اور تبصرہ کے لئے کتابیں اور رسالے مدیر اعلی کے نام روانہ کئے جائیں قیمت کا اندراج ضروری ہے۔

(۹) انتظامی امور اور رسالے کی خریداری واشتہارات وغیرہ کے متعلق جملہ مراسلت معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس حیدرآباد دکن سے ہونی چاهئے۔

سائنس

مئی ۱۹۴۳ء

جلد ۱۶ — نمبر ۵

فہرست مضامین

مجلس ادارت رسالہ سائنس

"بم"

(سید محمد حسنی صاحب)

یہ جنگ گذشتہ جنگ عظیم سے بھی بہت
زاید خطرناک ہے ۔ انسان کا دماغ نئے نئے
آلات ایجاد کرنے میں لگا ہوا ہے تاکہ انسانوں
کو باآسانی موت کے گھاٹ اتارا جاسکے اور ان کی
عمر بھر کی کمائی اور املاک کو منٹوں میں ملیا
میٹ کر دیا جائے ۔ جنگ کے زمانہ میں ایسی
تباہی اور بربادی پھیلائی جائے کہ سطح زمین
پر انسان کی زندگی مشکل اور دوبھر ہوجائے ۔
یوں تو تباہی کے لئے بہت سے آلات ایجاد
ہوچکے ہیں اور رات دن ہورہے ہیں لیکن
ان تباہ کن چیزوں میں جو مرتبہ بموں کو حاصل
ہے وہ شاید کسی دوسری چیز کو نصیب نہیں ۔
یہ وہ خوفناک حربہ ہے جس سے شہر، صنعتی
مقامات، ریلیں، پل، جنگی جہاز منٹوں میں
تباہ و برباد کردئے جاتے ہیں ہزاروں انسانوں
کو سیکنڈوں میں موت کے آغوش میں ہمیشہ
کو سلادیا جاتا ہے ۔

گذشتہ جنگ عظیم میں جرمن کے زپلن
جہاز لندن پر آآکر گولے برساتے تھے لیکن
نہ تو وہ گولے اس قدر زبردست تھے اور نہ
ان جہازوں کی رفتار ہی زیادہ تیز تھی ۔ اس کا نتیجہ
یہ تھا کہ اکثر جہاز توپوں سے مار کر گرائے
جایا کرتے تھے ۔ لیکن آج کل کے بمبار جہاز
اتنے زبردست ہیں کہ وہ ٹنوں وزن کے بم بہ آسانی
ایک جگہ سے دوسری جگہ پھیک کر آسکتے
ہیں ۔ اس کے علاوہ ان کی رفتار، قوت اور
بڑے فاصلے طے کرنے کی صلاحیت اس قدر
بڑھ گئی ہے کہ وہ پندرہ سو میل کے فاصلے پر
بم پھیک کر چند گھنٹوں میں اپنے اڈے پر
واپس آسکتے ہیں ۔ امریکہ کے جدید ترین
جہاز جنگی رفتار ۳۰۰ سے زیادہ میل فی گھنٹہ
بتائی جاتی ہے ۲ ٹن وزن کے بم بہ آسانی پھیک
کر اپنے اڈوں پر ۱۵۰۰ میل کے فاصلہ پر باآسانی
آسکتے ہیں ۔ اس کے علاوہ موجودہ بم پہلے کے
مقابلہ میں زاید طاقتور، بڑے اور وزنی ہیں
چنانچہ جرمنی کا سب سے بڑا بم ''شیطان'' ۲ ٹن
وزن کا ہے اور یہ اتنا طاقتور ہے کہ بڑے سے
بڑے جنگی جہاز کو نشانہ مار کو غرق کرسکتا
ہے ۔ شاید اس سے زاید وزنی بم اس لڑائی
میں اور کوئی استعمال نہیں ہوا ۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے گذشتہ جنگ
عظیم میں شہروں پر بم پھیکے گئے تھے اور

اس کو سب سے اول اہل جرمنی نے استعمال کیا تھا لیکن ہوائی جہازوں کے ذریعہ اس طرح بم پھینکنے کی ابتدا جس طرح کہ آج کل پھینکے جاتے ہیں ۔ اہل اسپین کا کارنامہ ہے ۔ وہیں کے ایک جنرل نے اول اول بموں کو مراکش کے نہتے مسلمانوں پر استعمال کیا تھا ۔ لیکن شاید اس کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ ایجاد خود موجدین کے لئے عذاب ہو جائیگی ۔ چنانچہ جس بے دردی سے اہل اطالیہ اور اہل جرمن نے بموں کو میڈرڈ اور بارسیلونا کی تباہی کیلئے استعمال کیا ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے ۔ جرمن اور اہل اطالیہ ، ہسپانیہ کی خانہ جنگی میں اندرونی طور پر شریک تھے اور انہوں نے یہ بھی فیصلہ کرلیا تھا کہ ان کو ایک اور جنگ عظیم لڑنی ہے اس لئے نئے آلات کا امتحان کرنا ہے اس کا تجربہ ہسپانیہ میں کیوں نہ کرلیا جائے چنانچہ وہاں ان لوگوں کو ایک وسیع میدان اپنے تجربوں کے لئے ہاتھ آگیا اور ان کو وہ تمام باتیں بخوبی معلوم ہوگئیں جو مزید تحقیق کی محتاج تھیں ۔ ان خوفناک تجربوں نے شروع شروع میں جرمن اور جاپان کو متحدین کے مقابلے میں بعض کامیابیوں میں بڑی مدد دی ۔

بم حقیقت میں ایک فولادی خول ہے جس میں دھماکہ سے پھٹنے والے کیمیاوی مرکبات بھرے ہوتے ہیں ۔ جب ان مرکبات کو صدمہ یا حرارت پہونچائی جاتی ہے تو وہ گیسوں میں تبدیل ہوجاتے ہیں ۔ یہ گیسیں اس قدر مقدار میں پیدا ہوتی ہیں کہ خول کے ٹکڑے ہوجاتے ہیں اور یہ ٹکڑے فضا میں اڑنے لگتے ہیں ۔ اس تبدیلی کے وقت تین باتیں مشاہدہ میں آتی ہیں ۔

(۱) حرارت کی پیدایش ۔
(۲) کیمیاوی مرکبات کی گیسوں میں تبدیلی ۔
(۳) اور ان پیدا شدہ گیسوں کا ایک دم غیر معمولی پھیلاؤ ۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسے مرکبات ہیں جو یہ خوفناک اثرات پیدا کرسکتے ہیں ۔ ابھی تک یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کون کون دھماکو ہیں جو بموں میں استعمال ہو رہے ہیں ۔ لیکن جہاں تک عام معلومات کا تعلق ہے یہ قرین قیاس ہے کہ حسب ذیل استعمال ہو رہے ہونگے نئے ایجاد شدہ دھماکو کا پوری پوری طرح علم جنگ ختم ہونے سے قبل تقریباً ناممکن ہے ۔

(۱) نائٹروگلسرین
(۲) نائٹرو سیلو اوز
(۳) نائٹرو گن پاؤڈر
(۴) نائٹرو ہائیڈرزین
(۵) نائٹرو والمیونٹینیگ مرکری
(۶) نائٹرو ازائڈ
(۷) ٹرائی نائٹرو ٹو اوئین
(۸) ڈائنامائیٹ
(۹) گلگنائٹ
(۱۰) امٹول اور سلور (پھڑک پارہ
(۱۱) اموئل اور چاندی)

دھماکو عموماً چار قسموں میں تقسیم کئے جاتے ہیں اور مختلف موقعوں پر مختلف دھماکو اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے استعمال ہوتے ہیں ۔

۱۔ محرک (Propellant) یہ دھما کو زاید تر کم رفتار کے دھما کے پیدا کرتے ھیں اس قسم کے خاص خاص دھما کو (۱) گن کاٹن Gun Cotton (۲) بالسٹا ئیٹ Ballistite (۳) کارڈ ائٹ Cardite ھیں۔

۲۔ متبدی (Initiators) یہ دھما کو بہت جلد آگ پکڑ لیتے ھیں اور فوراً جل اٹھتے ھیں اس قسم کے خاص دھماکو (۱) مرکری فلمنیٹ (Mercury fulminate) اور سیسے کا ازائڈ (Lead Azides) ھے۔

۳۔ آتش بازی کی طرح چھوٹنے والے اور آگ لگانے والے یہ زاید تر (۱) دھویں کی چادر (۲) رنگین روشنی کے بان اور آگ لگانے والے بموں میں استعمال ھوتے ھیں۔

۴۔ توڑنے والے۔ یہ زاید تر چٹانوں، محفوظ مقامات اڑانے میں مستعمل ھوتے ھیں اور دھماکے سے اطراف کی چیزوں کے ٹکڑے اڑا دیتے ھیں۔ اس ضمن کے خاص دھماکو (۱) مائع اکسیجن، گلگنائٹ اور ڈائنامائٹ ھے۔

عام طور پر کسی مخصوص دھماکہ کو پسند کر لیا جاتا ھے اور اسکو بھر کر بم کے ذریعہ پھینکا جاتا ھے۔ لیکن بعض اوقات مختلف ضروریات کا خیال رکھتے ھوئے مختلف دھماکوں کا آمیزہ استعمال کیا جاتا ھے تاکہ مطلوبہ اثر پیدا کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ مختلف ملکوں کے بم ایک دوسرے سے بالکل مختلف ھوتے ھیں اور ان میں مختلف کیمیائی مرکبات استعمال ھوتے ھیں۔ ان کی بیرونی ساخت بھی مختلف ھوتی ھے لیکن ایک اصول کے طور پر فوری جلنے والے بموں میں وہ کیل جو ٹکر کھانے سے بھڑکنے والے مسالے پر لگی ھے، ان کے آگے لگی ھوتی ھے تاکہ ٹکراتے ھی بم فوراً پھٹ جائے۔ لیکن وہ بم جن میں دیر میں پھٹنے والا فلیتہ لگا ھوتا ھے ان میں کیلہ زیادہ تر نیچے ھوتا ھے تاکہ بم عمارت میں پوری طرح داخل ھونے کے بعد پھٹے اور تعمیر کو پوری طرح منہدم کر دے۔

اگر بموں کے خوفناک اثرات کو دیکھتے ھوئے ان کی تقسیم کی جائے تو یہ چار قسموں میں تقسیم کئے جا سکتے ھیں۔

(۱) عمارتوں کو توڑنے والے بم
(۲) ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والے بم
(۳) اسلحہ توڑ بم
(۴) آگ لگانے والے بم

ان بموں کو مختلف موقعوں پر مختلف ضروریات کے لئے استعمال کیا جا سکتا ھے عمارتوں کی تباھی کے لئے پہلی قسم کے بم استعمال ھوتے ھیں۔ یہ بم بہت زور سے پھٹتے ھیں اور ان سے سخت دھماکہ پیدا ھوتا ھے۔ یہ دھماکہ عمارتوں کو ھلا کر منٹوں میں تباہ و برباد کر دیتا ھے اور عزاروں انسانوں کو ھلاک کر ڈالتا ھے اور جو مال و متاع بچ جاتا ھے اس کو آگ لگانے والے بم جلا کر خاک و سیاہ کر دیتے ھیں دوسری قسم کے بم زاید تر انسانوں کی

ہلاکت کے لئے مستعمل ہوتے ہیں خاصکر کے فوج کے دستوں پر بکثرت پھیکے جاتے ہیں تاکہ بڑی سے بڑی تعداد کو بہ آسانی ہلاک کیا جاسکے۔ تیسری قسم کے بم عام طور پر بہت مضبوط اور مستحکم مقامات، جنگی جہاز اور قلعوں پر پھیکے جاتے ہیں جہاں معمولی اور کمزور بم کام نہیں دے سکتے ہیں یہ بم فولادی چادروں کو توڑ ڈالتے ہیں۔ اور استحکامات کو منہدم کر ڈالتے ہیں۔ اس قسم کے بم بہت بڑے ہوتے ہیں اور اس لئے سوائے مخصوص موقعوں کے کم استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن بعض ماہرین فن اس قسم کی تقسیم سے مطمین نہیں وہ اس کی تقسیم بم کے خول کے لحاظ سے کرتے ہیں ان کی تقسیم یہ ہے۔

(۱) بھاری خول والے
(۲) اوسط خول والے عام کام کے
(۳) ھلکے خول والے ابدوز توڑ
(۴) آدم کش

(۱) بھاری خول والے بم زاید تر ۲۰۰ پونڈ سے لیکر ۲۰۰۰ پونڈ تک وزن ہوتے ہیں اور مضبوط مقامات کی تباھی کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں ان کو حقیقت میں اسلحہ توڑ بموں کا قائم مقام سمجھنا چاھئے۔ ان میں اکثر میں دیر میں چھوٹنے والا خلیہ لگا ہوتا ہے۔

(۲) اوسط خول والے یہ بم بہت سے کاموں کے لئے بکثرت استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ شہروں پر پھینکے جاتے ہیں تاکہ جانوں اور عمارتوں کو زاید سے زاید نقصان پہونچائیں ان کا وزن عموماً ۵۰ پونڈ سے لیکر ۱۰۰۰ پونڈ تک ہوتا ہے۔ ان کے پھٹنے سے ھزاروں فولادی ٹکڑے بکھر جاتے ہیں اور ھوا کا زبردست جھٹکا پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ ھی ان کی کامیابی اور کثرت استعمال کا راز ہے۔ ان میں ابر میں چھوٹنے والا خلیہ لگا ہوتا ہے۔

(۳) آبدو توڑ بم سے بہت زبردست موج پیدا ہوتی ہے یہ اکثر بندرگاھوں وغیرہ تباھی کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں یہ مختلف وزن کے ہوتے ہیں اور ان میں اکثر دیر میں چھوٹنے والا خلیہ لگا ہوتا ہے۔

(۴) آدم کش بم عام طور پر زاید وزنی نہیں ہوتے عموماً ان کا وزن ۲۰ پونڈ ہوتا ہے یہ بڑی تعداد میں ٹکڑے بکھر دیتے ہیں جو کہ فضا میں اڑ کر انسانوں کو ھلاک یا زخمی کردیتے ہیں۔ کوشش یہ کی جارھی ہے کہ اس بم کے ٹکڑے زمین کے بالکل متوازی اڑیں تاکہ کھڑے ہوے انسانوں کو گھائل کیا جاسکے۔ اس معاملے میں سب سے زاید کامیابی اھل جاپان کو نصیب ہوئی ہے۔ ماھرین کا خیال ہے کہ ان کے آدم کش بموں کے ٹکڑے تقریباً ۲ فٹ سے لیکر ۶ فٹ کی بلندی تک زمین کے متوازی اڑتے ہیں۔ جب تک کہ کسی خندق یا نالی میں پناہ نہ لی جائے ان سے چھٹکارا مشکل ہے۔ ان بموں میں اکثر فوری جلنے والا خلیہ لگا ہوتا ہے۔

یہ بم مختلف وزن اور جسامت کے ہوتے ہیں۔ ذیل کی جدول سے ان کی چند طبعی خصوصیات کا بخوبی علم ہوسکیگا۔

نمبر شمار	قسم بم	لمبائی فٹوں میں	قطر انچوں میں
۱	ھلکے خول والے ۲۰۰۰ پونڈ	۱۳۰۹	۲۳۰۹
۲	بھاری خول والے ۱۱۰۰ پونڈ	۵۰۹	۱۲۰۰
۳	اوسط خول والے ۵۰۰ پونڈ	۴۰۹	۱۴۰۹
۴	اوسط خول والے ۲۲۰ پونڈ	۴۰۵	۹۰۹
۵	اوسط خول والے ۱۰۰ پونڈ	۳۰۹	۸۰۹
۶	ادم کش ۲۰ پونڈ	۱۰۹	۴۰۹

بموں کی ساخت میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ھے کہ ان کے وزن اور ان کے بارود کے وزن میں ایک خاص تعلق قیام رھے تاکہ دھماکو زائد خرچ نہ ھوں اور فائدہ پورا حاصل ھو۔ بم ھر ملک کے اس قدر مختلف ھیں کہ ان کے متعلق صحیح اعداد و شمار ملنا مشکل ھیں ذیل میں جرمن بموں کے متعلق اعداد و شمار پیش کئے جاتے ھیں ان کی مدد سے ایک عام اندازہ ھوسکے گا۔

قسم بم	فیصدی (بارود کا وزن / بم کا وزن)	کل وزن
آدم کش	۱۶ سے لیکر ۲۱ تک	۲۰ پونڈ
ھلکے خول والے	۵۱ سے لیکر ۶۱ تک	۵۰ پونڈ سے لیکر ۴۰۰۰ پونڈ تک
اوسط خول والے	بہت معمولی	
بھاری خول والے	۲۶ سے لیکر ۴۱ تک	

ان اعداد و شمار کو دیکھنے کے بعد انسان خوفناک بموں کا اندازہ لگا سکتا ھے اندازہ لگایا گیا ھے کہ اگر ۲۰۰۰۰ فٹ کی بلندی سے ایک ۱۰۰ پونڈ کا بم کسی عمارت پر پھینکا جائے تو یہ بم تقریباً ۶۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آکر عمارت سے ٹکرائیگا اور عمارت کو ۶۷۵ فٹ ٹن حرکی توانائی کا صدمہ پہونچے گا۔ ظاھر کہ معمولی عمارتیں یہ صدمہ برداشت نہیں کرسکتیں اس لئے جبتک کہ ان کو خاص طور پر مستحکم نہ بنایا جائے وہ بم کے لگتے ھی مسمار ھوجائینگی۔ حساب لگایا گیا ھے کہ اگر ۵۰۰ پونڈ کا بم جسکی تراشی کثافت (Sectional Density) پانچ پونڈ فی مربع انچ ھو تو وہ تقریباً ۸۲۵ پونڈ فی سکنڈ کی رفتار سے آکر زمین پر ٹکرائے گا اور ۸ فٹوں زمین میں دھس جائیگا۔ ذیل میں ایک نقشہ دیا جاتا ھے جس سے قیاس ھوسکیگا کہ یہ بم مختلف چیزوں میں کہاں تک ٹکراکر پیوست ھوجائیگا۔

ابھی تک ھم نے صرف یہ بیان کیا ھے کہ بم کس قوت سے آکر ٹکراتا ھے۔ اب ھم دوسری بات کی طرف متوجہ ھوتے ھیں یعنی بم کے ٹکرانے کے بعد کیا اثرات ھوتے ھیں۔ یہ ظاھر کہ جب بم کسی عمارت سے ٹکرائےگا تو اس میں جو دھما کو مرکبات بھرے ھوتے ھیں وہ فوراً آگ پکڑ لیںگے اور وھاں کیمیائی تبدیلیاں واقع ھونگی۔ یعنی دھما کو فوراً گیسوں میں تبدیل ھوجائیںگے اور یہ گیسیں بم کے بند خول میں پھیلنا چاھیں گی حقیقت میں گیسوں کا یہ پھیلاو اس قدر زبردست ھوتا ھے کہ بم کا فولادی خول اپنے حجم سے تقریباً $1\frac{1}{2}$ گنا پھیل جاتا ھے اس کے بعد دباو کی زیادتی کی وجہ سے پھٹ جاتا ھے اس وقت ان گیسوں کا دباو ۶۵۰ ٹن فی مربع انچ سے لیکر ۱۰۰ ٹن فی مربع انچ تک ھوتا ھے لیکن جیسے جیسے یہ گیسیں پھیلتی جاتی ھیں ان کا دباو تیزی کے ساتھ کم ھوجاتا ھے۔ چنانچہ ۵۰۰ پونڈ کے بم کا دباؤ ۵۰ فٹ کے فاصلہ

نام	گہرائی فٹوں میں	نام	گہرائی فٹوں میں
چونے کا پتھر	۳۰۱	ریتیلی مٹی	۲۰۰۱
لوھا ملا ھوا کنکریٹ	۲۰۲	اوسط مضبوطی کی زمین	۱۷۰۰
معمولی کنکریٹ	۳۰۳	نرم زمین	۳۴۰۰
پتھر کی جڑائی	۵۰۰	ھلکی زمین	۲۶۰۴
اینٹ کی جڑائی	۱۰۵۰	کاشت دار زمین	۲۳۰۰

پر صرف ٦ پونڈ فی مربع انچ رہ جاتا ہے۔ اس پھیلاو کے لئے $\frac{1}{10000}$ سکنڈ درکار ہوتے ہیں اور اس وقت گیس ایک دم ۲۰ سے لیکر ۲۵ فٹ کے نصف قطر کے کرہ میں پھیل جاتی ہے اور ان سے مثبت اور منفی لہریں پیدا ہوتی ہیں جنکی لمبائی ابتدا میں تقریباً ۳۰ فٹ ہوتی ہے اور ان کے درمیان ایک سکنڈ کے پانچ ہزاروین حصے سے لیکر ۲۰ ہزاروین حصے تک کا وقفہ لگتا ہے۔ اور بم کے ۲۰۰۰ سے لیکر ۶۰۰۰ تک ٹکڑے ہوجانے ہیں جن کا وزن تقریباً ایک اونس کے قریب قریب ہوتا ہے۔ یہ ٹکڑے نہایت تیزی سے فضا میں اڑتے ہیں۔ چنانچہ جس جگہ بم پھٹتا ہے وہاں سے تقریباً ۱۰ فٹ کے فاصلہ پر ان کی رفتار ۴۰۰۰ سے لیکر ۷۰۰۰ فٹ فی سکنڈ تک ہوتی ہے۔ لیکن یہ رفتار تیزی سے کم ہوتی چلی جاتی ہے چنانچہ ۵۰ فٹ کے فاصلہ پر صرف ۲۰۰۰ فٹ سے لیکر ۴۰۰۰ فٹ تک رہ جاتی ہے۔ یہ ٹکڑے بندمقامات پر ۵۰۰ فٹ تک بخوبی انسانوں کو ہلاک کرسکتے ہیں اور کھلی ہوئی جگہ پر ۳۰۰ سے لیکر ۱۲۰۰ گز تک تباہی پھیلا سکتے ہیں۔ یہ ٹکڑے اتنی زور سے آکر لگتے ہیں کہ فولاد وغیرہ میں پیوست ہوجاتے ہیں ذیل کے نقشہ سے یہ بخوبی معلوم ہوسکیگا کہ یہ ٹکڑے مختلف چیزوں میں کہاں تک داخل ہوسکتے ہیں ۔

نام	گہرائی انچوں میں
نرم فولاد	$1\frac{1}{2}$
اینٹ کی ٹھوس جڑائی	$13\frac{1}{2}$
معمولی کنکریٹ	۱٦
مٹی اور بالو	۳۱
ٹوٹے ہوئے پتھر	۲۵

چنانچہ وہ مقررہ وقت پر پھٹنے والا بم جو سینٹ پال پر پھینکا گیا تھا اتنا زبردست تھا کہ جس وقت کہ وہ پھوڑا گیا ہے تو اس نے ۱۰۰ فٹ چوڑا غار بنادیا تھا۔ عام اندازہ یہ ہے کہ ۳۰۰ سے لیکر ۲۲۰۰ پونڈ تک کا بم ۹۰ ٹن سے لیکر ۱۰۰۰ ٹن تک مٹی کھود کر غار کے کناروں پر جمع کردیتا ہے یا فضا میں منتشر کردیتا ہے اس کے علاوہ زمیں میں ایک زبردست زلزلہ پیدا کردیتا ہے کہ مستحکم سے مستحکم عمارت کی بنا ہل جاتی ہے اور اگر وہ خاص طور پر مضبوط نہ بنائی گئی ہو تو فوراً عمارت منہدم ہوجاتی ہے۔

لیکن یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بم کے اثرات کا تعلق اسکے وزن کے علاوہ دیگر چیزوں سے بھی ہے۔ کامیاب نشانہ اندازی اور زاید تباہی کیلیے یہ ضروری ہے کہ بم زمین پر عمودی اکر گرے وہاں وہ جتنا عمود سے ہٹتا جائیگا، اس کی رفتار کم ہوتی جائیگی اور اس میں اس بات کا احتمال بڑھتا چلا جائیگا کہ بم زمیں پر لگ کر اچٹ جائے اور پوری پوری تباہی نہ پھیلا سکے۔ عام طور پر بم اسطرح پھینکے جاتے ہیں کہ وہ عمود سے کم سے کم زاویہ بنائیں اکثر بم ۱۵ سے لیکر ۳۰ تک زاویہ بناتے ہوئے زمیں سے ٹکراتے ہیں۔ ذیل کا دیا ہوا نقشہ اس کو بخوبی واضح کرتا ہے۔ یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ جہاز تقریباً ۲۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑرہا ہے۔

بم پھینکتے وقت بلندی فٹوں میں	زمین سے ٹکرانے کا زاویہ	ٹکرانے کی فٹ فی رفتار سیکنڈ تقریباً
۱۰۰۰	۴۵	۴۰۰
۳۰۰۰	۳۵	۵۵۰
۵۰۰۰	۲۵	۶۲۵
۷۵۰۰	۲۰	۷۵۰
۱۰۰۰۰	۱۹	۸۰۰
۱۲۵۰۰	۱۷	۸۵۰
۱۵۰۰۰	۱۶	۹۵۱

ان باتوں کے علاوہ جو اوپر بیان کی گئی هیں ، تین باتیں بم کے پھٹتے وقت اور دیکھنے میں آتی هیں ۔ بم کے پھٹتے وقت آگے آگے فولادی ٹکڑوں کی ایك قوس هوتی هے اس کے پیچھے دھما کے سے پیدا شدہ گیسوں کا کرہ هوتا هے جو موجیں مارتاهوا تیزی کے ساتھه آگے بڑھتا هے اس کو هم جھونکے کی موجیں یا جھٹکے کی موجیں کہه سکتے هیں یه لهریں اسقدر قوت کی حامل هوتی هیں که بہت کم وقفے میں بڑی بڑی عمارتوں کو گرادیتی هیں اور جانداروں کو بری طرح زخمی کرتی هیں ان کے بعد کھینچنے والی موجیں هوتی هیں جو که جھونکے والی موجوں کا لازمی نتجه هیں ۔ اکثر دیکھتے هیں ایا هے که بم سے شکسته عمارتیں اگر لوهے اور کنکریٹ کی بنی هوی هوں تو وہ بم کے مرکز کی طرف جھکی هوئی پائی جاتی هیں ۔ اس کی وجه یه هے که اول تو جھونکے والی موجوں کی وجه سے فولادی شہتیر بم کے مرکز سے پڑے جھك جاتے هیں لیکن اس کے بعد هی جو کھینچنے یاجذب کرنے والی موجیں آتی هیں وہ ان شہتیروں کو بم کےمرکز کی طرف کھینچ لےجاتی هیں ۔ اور اکثر شکسته شدہ عمارتوں کو بالکل ڈھیر کر دیتی هیں ۔

ابھی تك هم نے بموں کا عام حال بیان کیا هے اور ان کی هلاکت خیزی کا مختصر ذکر کیا هے لیکن دشمن تباهی کے علاوہ شهر میں دهشت اور پریشانی بھی پھیلا نا چاهتا هے چنانچه جرمن کے بموں میں اس قسم کی سیٹیاں لگائی گئیں هیں جن سےبہت زائد شور پیدا هوتا هے اور باشندے خیال کرتے هیں که هزاروں بم بیك وقت گررهے هیں ۔ یه بم اگر چه نقصان تو صرف محدود رقبه کو پهونچاسکتے هیں لیکن شهر کے امن و امان میں بہت بڑا خلل پیدا کرسکتے هیں اس کے علاوہ بعض اوقات دوسری ترکیبیں بھی

مستعمل ہوتی ہیں تاکہ بموں کو زائد سے زائد موثر بنایا جاسکے۔ مثلاً بموں میں زبردست دھواں کوؤں کے ساتھ ساتھ زہریلی گیس بھری جاسکتی ہے۔ یا ان میں آگ لگانے والے مسالے رکھے جاسکتے ہیں تاکہ جو املاک تباہ ہو وہ فوراً جلا بھی دی جائے۔ چنانچہ وہ بم جو جاپان نے رنگوں میں استعمال کئے تھے ان کا وزن تقریباً ۱ ½ ٹن کا تھا ان میں زبردست دھوا کوؤں کے ساتھ ساتھ آگ لگانے والی گولیاں بھی تھیں جنھوں نے ان بموں کو اور زیادہ خوفناک اور تباہ کن بنادیا تھا۔ مزید بر اں یہ بات تجربوں سے ثابت ہو چکی ہے کہ ایک ۲۰۰۰ پونڈ کے بم سے اتنی تباہی نہیں پھیلائی جاسکتی جتنی کہ چار ۵۰۰ پونڈ کے بموں سے پھیلائی جاسکتی ہے۔ یا جتنی کہ ۱۰۰ پونڈ کے ۵ بموں سے پھیلائی جاسکتی ہے اتنی ۵۰۰ پونڈ کے ایک بم سے نہیں پھیلائی جاسکتی۔ اس کے علاوہ ہوائی جہاز پر سے بم پھینک کر صحیح نشانہ لگانا جبکہ جہاز ۲۰۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ۳۰۰ میل کی رفتار سے اڑ رہا ہو تقریباً ناممکن ہے اسلئے اگر بڑا بم اپنے نشانہ پر نہ لگے تو بجائے فائدہ کے الٹا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین کا خیال ہے کہ جبتک کہ کوئی خاص مستحکم مقام کی تباہی منظور نہ ہو شہروں پر ۵۰۰ پونڈ سے زائد کے بم کبھی استعمال کئے جائنگے بلکہ چھوٹے چھوٹے بم بڑی تعداد میں مستعمل ہونگے۔

اس ہی نظریہ کو پیش نظر رکھکر "مالوٹوو کا ٹوکرا" ایجاد کیا گیا ہے۔ یہ روسیوں کی ایجاد ہے۔ اس کو حقیقت میں بہت بڑا بم سمجھنا چاہئے جس کا طول تقریباً ۸ فٹ اور قطر تقریباً ۳ فٹ ہوتا ہے۔ یہ بم دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں۔ جس وقت یہ بم پھینکا جاتا ہے اس کے دونوں حصے فضا میں علحدہ علحدہ ہو جاتے ہیں اور ان میں سے بہت سے چھوٹے چھوٹے بم نکل کر منتشر ہو جاتے ہیں اور زمین کے ایک وسیع رقبہ پر گر کر تباہی اور بربادی پھیلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ آگ لگانے والے بم بھی ہوتے ہیں جو بہت زیادہ نقصان کے باعث ہوتے ہیں۔ ان کے لئے ایک علحدہ مضمون کی ضرورت ہے فی الحال طوالت کے خیال سے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

ضمنی پیداوار

(محمد حمیس صاحب)

سائنس کی بڑھی ترقی کے ساتھہ جب بڑے بڑے کارخانے قائم ہونے لگے تو سائنسدانون کو ایک نئی دقت نے پریشان کرنا شروع کیا۔ وہ دقت ضمنی پیداوار کے استعمال کی تھی۔ اب لگے ہاتھون دار ضمنی پیداوار کا مطلب بھی سمجھہ لیجئیے۔ عام طور پر اس دنیا میں دیکھا گیا ہے کہ جب ہم کوئی چیز بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس سلسلے میں اصلی چیز کے ساتھہ ساتھہ خواہ مخواہ کی ہیں دو تین چیزیں اور بھی حاصل ہوجاتی ہیں، جو بظاہر بالکل بے کار معلوم ہوتی ہیں۔ ان ہی بظاہر بیکار چیزون کو ہم ضمنی پیداوار کہتے ہیں۔ اب آپ کہینگے کے جب دنیا کا ہمیشہ ہی سے دستور رہا ہے کہ ہر کام میں فاضل اشیا حاصل ہون، تو پھر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے ؟ جو حشر ہمیشہ سے فضل اشیاء کا ہوتا چلا آرہا ہے وہی اب بھی ہونا چاہئیے۔ تو اس کے جواب میں آپ کو میرا پہلا جملہ یاد کرنا چاہئیے۔ میں نے لکھا ہے کہ یہ دقت بڑے بڑے کارخانون کے قائم ہونے پر پیدا ہوئی۔ ائیے اب یہ دیکھنے کی کوشش کرین کہ آخر ان بڑے بڑے کارخانون کے قائم ہونے سے کیا خاص بات پیدا ہو گئی۔

اگر آپ نے آم کے آم اور گٹھلیون کے دام والی مثل سنی ہے تو اس کو آسانی سے سمجھہ جائینگے۔ ظاہر ہے کہ اون کے سلسلے میں گٹھلی خواہ مخواہ کو ہاتھہ لگتی ہے۔ اگر کسی طور پر گٹھلیاں کار آمد ثابت ہون اور ان کے دام کھڑے ہو سکیں تو انسان کو کیا کچھہ خوشی نہ ہوگی۔ گٹھلیون کا کار آمد ثابت ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ لیکن فرض کیجئیے کہ ایسا ہو بھی گیا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون شریف آدمی گھر گھر پھر کر دو دو چار چار گٹھلیاں جمع کرتا پھرے گا۔

بڑے بڑے کارخانون میں یہ بات ہوتی ہے کہ ضمنی چیزین بیک وقت کافی بڑی مقدار میں حاصل ہوتی ہیں، اتنی کہ ان بلاون سے چھٹکارا پانے میں بھی ایک دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن چونکہ بڑے بڑے کارخانے والون کے پاس روپیہ کافی ہوتا ہے اس لئیے وہ کچھہ سائنسدانون کو اس بات کی تحقیق کرنے کے لئیے بٹھادیتے ہیں کہ ان فاضل اشیا سے کیا کیا کار آمد چیزین بن سکتی ہیں۔ جب اس کا پتہ لگ

جاتا ہے تو اصلی کارخانون کے ساتھہ ہی ان چیزون کے چھوٹے چھوٹے کارخانے قائم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اجکل کارخانون میں مشکل ہی سے کوئی چیز بیکار جانے دی جاتی ہے۔ سائنسدانون کا محض یہی کام نہیں ہوتا کہ وہ دیکھیں کہ ضمنی چیز کسی مصرف میں لائی جاسکتی ہے یا نہیں بلکہ انکو یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ ضمنی چیز سب سے بہتر کس مصرف میں لائی جاسکتی ہے۔

کہاں تو وہ دن تھے کہ لوگ ضمنی چیزون سے پناہ مانگتے تھے اور ان کو اپنے کارخانے کی بدبختی شمار کرتے تھے اور اب یہ دن آگیا ہے کہ بعض کارخانے اپنے ضمنی پیداوار ہی کے بل پر چلتے ہیں۔ کارخانہ قائم کرتے ہیں ایک چیز کے لئے، لیکن صحیح نفع اٹھاتے ہیں ان چیزون سے جو کارخانے میں ضمنی طور پر حاصل ہوتی ہیں۔ اس کی سب سے بہتر مثال لبلانک کا طریقہ ہے۔ سوڈیم کاربونیٹ بنانے کے دو طریقے ہیں ایک لبلانک کا طریقہ اور دوسرا سولوے امونیا کا طریقہ کہلاتا ہے۔ سولوے کا طریقہ لبلانک کے طریقے سے بہت آسان اور سستا ہے لیکن لبلانک کے طریقے میں ضمنی طور پر رنگ کٹ سفوف اور کاوریٹ وغیرہ حاصل ہوجاتے ہیں۔

سوڈا یعنی سوڈیم کاربونیٹ بہت اہم چیز ہے۔ ایک بار فرانسیسی اکیڈمی نے یہ اعلان کیا کہ جو شخص نمک سے سوڈے کی تیاری کا کامیاب طریقہ دریافت کرے گا اس کو سو با وند انعام دیا جائیگا۔ لبلانک (۱۷۵۲ - ۱۸۰٦) میدان میں ایا اور یہ انعام جیت لے گیا۔ اس کے طریقے میں نمک پر سلیفورک ترشے کا عمل کیا جاتا ہے جس سے سوڈیم سلفیٹ اور ہائڈروکلورک ترشہ کی گیس حاصل ہوتی ہے۔ سوڈیم سلفیٹ کو لکڑی کے کوئلے اور کھریا کے ساتھہ گرم کیا جاتا ہے تو سوڈیم کاربونیٹ حاصل ہوتا ہے اور ایک بھاری میلے رنگ کی کیچڑ جیسی چیز بچ جاتی ہے۔

اب اس طریقے میں سوڈے کے ساتھہ دو ضمنی چیزیں یعنی ہائیڈروکلورک ترشہ اور کیچڑ جو حاصل ہوئیں وہ ابتدا میں سخت تکلیف وہ ثابت ہوئیں۔ ہائیڈروکلورک ترشہ کی گیس فضا میں پھیل جاتی تھی اور عوام کے صحت کے لحاظ سے سخت نقصان دہ تصور کی جاتی تھی۔ اگر کہیں سولوے کا طریقہ پہلے دریافت ہو چکا ہوتا تو پھر لبلانک کا طریقہ کبھی آگے بڑھ نہیں سکتا تھا۔ لیکن غنیمت ہوا کہ میدان ابتدا میں اس کے ہاتھہ تھا۔ جب ان ضمنی بلاون سے جان چھڑانی مشکل ہوگئی تو پھر اس کو کام میں لانے کی فکر لوگون کو ہوئی۔ اس کو پھر اس طرح کام میں لایا گیا کہ اس سے جو چیزین بنیں وہ سوڈے سے بھی زیادہ قیمتی ثابت ہوئیں۔ ہائڈروکلورک ترشے سے رنگ کٹ سفوف وغیرہ حاصل کیا گیا اور کیچڑ بھی بہت بیش قیمت ثابت ہوی اس کی بدبو گندھک کے سبب تھی ایک طریقہ ایسا دریافت کیا گیا جس سے پوری کی پوری گندھک اس سے نکال لی گئی۔

۱۸۷۲ تک سوڈا بنانے کا اور کوئی طریقہ معلوم نہ تھا اس لئے لبلانک کا طریقہ ہی ہر جگہ

استعمال ہوتا رہا لیکن اس سال بلجیم کے مشہور کیمیا دان ارنسٹ سولوے نے ایک دوسرا طریقہ ایجاد کیا جو آج تک اسی کے نام سے مشہور ہے۔ غالباً سوڈا بنانے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔ اس میں لبلانک کے طریقے سے ادھا ایندھن استعمال ہوتا ہے اور کوئی کیچڑ یا رسوب باقی نہیں بچتا۔ اس نئے طریقے کے ایجاد ہوتے ہی لبلانک کے طریقے کو طبعی موت مر جانا چاہئیے تھی لیکن وہ زندہ رہا اور اب بھی زندہ ہے۔ اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے بہت سے کارخانے والے سوڈا بنانے کے لئیے لبلانک کے طریقے کو خاص کر اسی لئیے استعمال کرتے ہیں کہ سوڈے کے ساتھ ساتھ اس میں رنگ کٹ سفوف اور گندگ وغیرہ بھی گویا مفت ہی دستیاب ہو جاتا ہے۔

یہاں تک تو سوڈے کے متعلق ہوا اب کوئلے کو لیجئیے کوئلے کو آج کل سیاہ سونا کہا جاتا ہے۔ اور صحیح معنی میں یہ اس قدر بیش قیمت چیز ہے کہ سونا اس کے پاسنگ نہیں آسکتا۔ ایک زمانے میں کوئلے سے گیس نکالی جاتی تھی جس کو جلانے کے کام میں لایا جاتا تھا۔ اس کے بڑے بڑے کارخانے تھے۔ کوئلے کو بند بھٹیوں میں گرم کیا جاتا تھا اور اس سے جو گیس نکلتی تھی اس کو نلوں کے ذریعے مختلف جگہوں میں پہونچایا جاتا تھا اور پھر اس کو روشنی یا حرارت حاصل کرنے کے لئیے استعمال کیا جاتا تھا۔ گیس نکل جانے کے بعد جو کوئلہ بچ جاتا تھا وہ ہلکا کوئلہ ہوتا تھا۔ جلانے کے لئیے بہتر ہوتا تھا کیونکہ اس میں دھواں نہ ہوتا تھا۔

ان کارخانوں میں کوئلے سے جب گیس نکالی جاتی تھی تو ضمنی طور پر ایک نہایت بدبودار، سیاہ، چکنی چیز نکلتی تھی جو تارکول کہلاتی تھی یہ بدبخت چیز اس قدر تکلیف دہ تھی کہ کارخانے والے اس سے پریشان رہتے تھے اس کو رکھنا اور پھینکنا دونوں مشکل تھا۔ رکھی جائے تو بے کار چیز جگہ گھیرے ہوئے رہتی تھی پھینکی جائے جو جس جگہ ڈالی جائے اس کو بدبو سے خراب کر دے جس دریا یا تالاب میں گرائی جائے اس کے پانی کو نا قابل استعمال بنادے۔ اس لئیے مجبوراً کارخانے والے اس کو آبادی سے بہت دور پھینکواتے تھے اور اس سلسلے میں کافی نقصان اٹھاتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور پانی جیسی چیز نکلتی تھی جس کو امونیاوی مائع کہا جاتا تھا کیونکہ اس کے اندر سے امونیا جیسی بو نکلی رہتی تھی۔ یہ چیز بھی ایک آفت تھی۔ اس کو بھی پھینکوایا جاتا تھا یا جو مانگتا تھا اس کو یونہی دے دیا جاتا تھا۔

غرض یہ کہ کوئلے سے جب گیس نکالی ہوتی تھی تو دو ضمنی چیزیں حاصل ہوتی تھیں۔ تارکول اور امونیاوی پانی۔ ان کو کارخانے والے ایک خواہ مخواہ کی پریشانی تصور کرتے تھے۔ لیکن بے چارے کارخانے والوں کو معلوم نہ تھا کہ جس چیز کو وہ آفت سمجھ رہے تھے وہ ان کے لئیے سب سے بڑی راحت کا سامان پیدا کرنے والی تھی۔ ان دونوں ضمنی چیزوں پر کیمیا دانوں نے تجربے شروع کئیے اور دنیا کو بتا دیا کہ جو چیزیں بے کار سمجھی جاتی

تھیں وہ نہ صرف یہ کہ بیکار تھیں بلکہ اس قدر بیش قیمت تھیں کہ ان کے مقابلے میں کوئلے کی گیس کوئی حقیقت نہیں تھی۔

تارکول سے اس وقت تقریباً دو ہزار رنگ نکالے جاتے ہیں۔ اور ان کی خوبصورتی ایسی ہے کہ قوس قزح کے رنگ ان کے سامنے ماند پڑجاتے ہیں۔ دلچسپی کی خاطر آپ کو اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ ایک ٹن کوئلے سے اتنا رنگ نکل سکتا ہے کہ اس سے اگر ایک بون گز چوڑے فلالین کے تھان کو رنگا جائے تو زرد رنگ سے دو میل، سرخ رنگ سے ڈیڑھ میل، بنفشئی سے پون میل، شوخ قرمزی سے چودہ سو فیٹ، ٹرکی رڈ سے سات سو فیٹ، اور نارنجی سے تین سو ستر فیٹ لانبے تھان رنگے جاسکتے ہیں۔

اور ایک رنگ ہی پر کیا موقوف ہے تار کول کی جدید زمانے میں اتنی اہمیت ہے کہ ہماری روزانہ زندگی میں کام آنے والی شاید ہی کوئی چیز ہو جس میں تارکول سے نکلی ہوئی اشیا کسی نہ کسی طرح کام نہ آتی ہوں۔ رنگوں کے علاوہ تارکول کی کشید سے بنزول حاصل ہوتا ہے جسے موٹروں میں پٹرول کی جگہ جلایا جاسکتا ہے، پچ حاصل ہوتا ہے جسے سڑکوں پر بچھایا جاتا ہے۔ کریوسوٹ آئیل حاصل ہوتا ہے جس سے نفتھلین اور کاربولک ترشہ تیار ہوتا ہے۔

کاربولک ترشہ سے جراثیم کشی کے علاوہ پکرک ایسڈ تیار کیا جاتا ہے جس سے زبردست دھماکو مسالے تیار ہوتے ہیں۔ امونیاوی پانی سے امونیا نکال لی جاتی ہے اور اس سے امونیم سلفیٹ تیار کی جاتی ہے جو کاشتکاری میں کھاد کی حیثیت سے کثرت کے ساتھ استعمال ہوتی ہے۔

ایک بڑے لوہے کے کارخانے پر نگاہ ڈالئے تو اس میں ضمنی پیداوار کا تماشہ نہایت خوبصورتی سے نظر آتا ہے۔ لوہے کی پگھلاتوں کو کوئلے کے ساتھ جلایا جاتا ہے۔ لیکن کوئلے کو اس میں استعمال کرنے سے پہلے ہلکا کرلیا جاتا ہے۔ یعنی اس کی ساری صعود پذیر اشیا کو نکال لیا جاتا ہے۔ اس کام کے لئے کوئلے کی بڑی بڑی بند بھٹیاں ہوتی ہیں۔ پہلے بھٹیاں کھلی رہتی تھیں اور کوئلے کا دھواں اڑجایا کرتا تھا لیکن جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ اس دھوین میں سیکڑوں بیش قیمت چیزیں پوشیدہ ہیں تو اس کو جمع کرنے کا انتظام کیا گیا۔ اور اب بھٹیوں کے اوپر بڑے بڑے نل لگے ہوتے ہیں جن کے ذریعے دھواں اور گیس کو محفوظ کرلیا جاتا ہے۔ گیس جو اس طرح حاصل ہوتی ہے اس کو پھر ان ہی بھٹیوں کو جلانے اور گرم رکھنے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ لیکن جلانے سے قبل گیس اور دھوین میں جو کول تار، امونیا اور بنزول وغیرہ ہوتا ہے اس کو الگ کرلیا جاتا ہے۔ اور پھر ان سے، ساتھ کے کارخانوں میں، طرح طرح کی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔

کوئلے سے جو کچھ نکلنا تھا جب نکل چکتا ہے تو یہ مسام دار اور ہلکا ہوجاتا اور پھول جاتا ہے۔ اس کو اصطلاح میں کوک کہتے ہیں۔

اس کوک کو لوھے کی کھدھات میں ملایا جاتا ھے اور اس کے ساتھ چونے کا پتھر بھی ھوتا ھے۔ جب اس امیزہ کو بھٹیوں میں ڈال کر جلایا جاتا ھے تو یہ سارا مادہ پگھل جاتا ھے۔ لوھا گل کر الگ ھوجاتا ھے اور لوھے کی کھدھات میں جو کچھ لوث تھا وہ چونے سے مل کر ایک رقیق مادے کی حیثیت سے باھر نکل کر جم جاتا ھے۔ اسے کارخانے والے سلیگ کہتے ھیں۔ یہ بھی ایک ضمنی چیز ھے۔ جس کو ابتدا میں بہت دور لے جا کر پھیکا جاتا تھا۔ اور اب بھی بعض کارخانوں میں ایسا ھی کیا جاتا ھے اور ان کے اطراف سلیگ کے بڑے بڑے پہاڑ کھڑے نظر آتے ھیں۔ لیکن اب اس چیز کو بھی ایک خاصی اھمیت ھوگئی ھے۔ جرمنی اور امریکہ میں اس سے نہایت اعلی درجے کی سمنٹ بنائی جاتی ھے۔ بسیمیر کے طریقے پر لوھا بنانے میں جو سلیگ نکلتا ھے اس کو پیس کر کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ھے۔ کیونکہ اس میں فاسفورس ھوتا ھے۔ فاسفورس لوھے کو خراب کرتا ھے لیکن سلیگ کو کھاد کی حیثیت سے مفید بناتا ھے۔ اس لئے لوھے کی جتنی صفائی کی جائے گی، اس سے جس قدر فاسفورس نکال کر باھر کر لیا جائیگا، اتنا ھی سلیگ بھی کھاد کے لحاظ سے اچھا ھوگا۔ سلیگ میں جتنی مقدار فاسفورس کی ھوتی ھے اسی لحاظ سے اس کی قیمت اٹھتی ھے۔

سلیگ کا کام یہیں پر ختم نہیں ھوجاتا ھے۔ اس سے نہایت اعلی درجے کے حرارت کے غیر موصل غلاف بنائے جاتے ھیں جن کو اسٹیم پائپوں پر چڑھادیا جاتا ھے جس کے سبب ان کی گرمی باھر جانے نہیں پاتی۔ بعض طریقوں کو کام میں لا کر اس کو روئی کی طرح دھن دیا جاتا ھے اور پھر اس سے جو غیر موصل چیزیں بنائی جاتی ھیں وہ اسبسطوس کی چیزوں سے بھی بہتر ھوتی ھیں۔

آپ نے دیکھ لیا کہ ایک لوھے کے کارخانے میں، جس کا صحیح مقصد صرف لوھا تیار کرنا ھونا چاھئے تھا، خواہ مخواہ کی متعدد ضمنی چیزیں تیار ھوجاتی ھیں، جو اپنی اھمیت کے سبب سے کارخانے والوں کو بہت فائدہ پہونچا دیتی ھیں۔ اسی طرح کسی کارخانے پر نظر ڈالئے تو اس کے ساتھ ساتھ متعدد کارخانے ایسے نظر آئینگے جو ضمنی پیداوار کی خواطر قائم ھوگئے ھیں۔ ابھی حال حال کی بات ھے کہ ھندوستان میں شکر کی صنعت کو بہت ترقی ھوگئی ھے۔ شکر کی صفائی کے دوران میں ٹنوں شیرہ (Mollasces) ضمنی پیداوار کے طور پر حاصل ھوتا ھے۔ لیکن اس سے کوئی خاص کام نہیں لیا جاتا اس کو سستے داموں بیچ دیا جاتا ھے۔ اور زیادہ سے زیادہ اس کا استعمال یہ ھوتا ھے کہ تمباکو بنانے والے اس کو تمباکو میں مٹھاس پیدا کرنے کے لئے ڈالتے ھیں۔ لیکن ضرورت ایجاد کی ماں ھے۔ ھندوستان میں پٹرول نہیں ھے جو آتا ھے باھر سے آتا ھے۔ اب سوائے اس کے چارہ نہیں کہ مصنوعی طور پر پٹرول یا تو کوئلے سے بنایا جائے یا پھر شکر یا اس کے شیرے سے الکوھل بنایا جائے جس سے گاڑیاں چل سکیں۔ شکر کا مصرف، ظاھر ھے کہ موٹر

میں ڈالنے سے بہتر، لوگوں کو معلوم ہے۔ اس لئے اب رہ گیا شیرہ جو اب تک ایک غیر اہم ضمنی حاصل تھا۔ اب اس کو کام میں لایا جانے لگا ہے۔ حیدرآباد میں بودھن شکر فیکٹری کے ساتھ اب ایک پاور الکوھل کا کارخانہ قائم کیا گیا ہے جس میں اسی شیرے سے لاکھوں گیلن پاور الکوھل تیار کیا جاچکا ہے اور برابر تیار ہورہا ہے اس طرح جو چیز تقریباً بے کار جاتی تھی اب بہت کام کی ہوگئی ہے۔ گنے سے رس نکال لینے کے بعد صرف کھوئیا (کھوجڑ) بچ جاتا ہے۔ اس کو ھندوستان میں تو عام طور پر جلا ڈالتے ہیں لیکن مغربی ممالک میں اس ضمنی چیز سے بھی پورا فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور اس سے موٹا کاغذ اور دفتی وغیرہ بنائی جاتی ہے۔

آپ نے ضمنی پیداوار کے متعلق بہت کچھ سن لیا لیکن اس سلسلے کی سب سے دلچسپ مثال غالباً شکاگو کی گوشت بھیجنے والی کمپنیاں ہیں۔ کیونکہ وھاں کی حالت یہ ہے کہ وھاں جو جانور گوشت کے لئے ذبح کئے جاتے ہیں ان کا ایک بال بھی ضائع نہیں ہونے دیا جاتا۔ اب سنئے کہ کیسے۔

ہم آپ تو ایک جانور کی زیادہ سے زیادہ یہی قدر کرسکتے ہیں کہ گوشت کھا جائیں کھال بیچدیں اور ھڈیاں اور دیگر لوازمات کتوں کو ڈال دین چلئے فرصت ہوگئی۔ لیکن شکاگو کی گوشت بھیجنے والی کمپنیوں کے لوگ اس کے قائل نہیں وہ تو جانور کے ایک ایک جزو کو استعمال کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ھڈیوں، کھالوں اور انتوں سے جن کو ہم اور آپ بےکار سمجھتے ہیں وہ سریش اور جلیٹن جیسی کارآمد چیزیں تیار کرتے ہیں۔ دراصل جن بافتوں (Tissues) سے سریش اور جیلیٹن بنتے ہیں وہ جانوروں کی ھڈیوں، آنتوں اور کھالوں ھی میں پائے جاتے ہیں۔ گرم پانی میں ان کو ابالنے سے سریش بنانے والی چیزیں گھل کر الگ ہوجاتی ہیں۔ اور پھر جب اس محلول کو تبخیر کرتے ہیں تو جیلی قسم کی ایک چیز حاصل ہوتی ہے جس کو سریش یا جیلیٹن کہتے ہیں۔ سریش دراصل جیلیٹن کی غیر خالص شکل کو کہتے ہیں۔ جو کہ لکڑی کاغذ اور چمڑا وغیرہ چپکانے کے کام آتا ہے۔

جیلیٹن ایک قسم کا پروٹین ہوتا ہے جس کے بذات خود بے شمار فوائد ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بحیثیت پروٹین ہونے کے غذا کے کام میں آتا ہے۔ بچوں کو جو گائے کا دودھ پلاتے ہیں اس میں ملادینے سے معدے میں ایک قسم کی دھی کے بڑے بڑے ٹکڑے نہیں بنتے جو کہ ویسے دودھ اور معدے کے اندر کے ترشوں کے ملنے سے بن جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بیماری میں بچھڑوں کی ھڈیوں سے نکلا ہوا جیلیٹن آپ خود بھی نوش فرماسکتے ہیں۔ آئسکریم کے کارخانوں میں بھی اس کی بے حد ضرورت پڑتی ہے۔ یہ برف کے بڑی بڑی قلمیں بننے سے روکتا ہے۔ دودھ کے شیرے (Emulsion) کو قائم رکھتا ہے اور آئسکریم کو جسمیت بخشتا ہے۔ اس کے علاوہ دوا کی

گولیوں پر چڑھانے اور گولیاں رکھنے کی جھلی ڈبیاں (Capsules) بنانے میں بھی کام آتا ہے۔

جیلیٹن کے پوٹسیم ڈائکرومیٹ کے ساتھ روشنی میں ملنے سے ایک قسم کی جیلی بنتی ہے جو سوکھنے کے بعد کسی چیز میں نہیں گھلتی۔ اس خاصیت کو فوٹوگرافی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فوٹوگرافی کے لئے پلیٹ، فلم، اور کاغذ سب اسی اصول پر بنائے جاتے ہیں۔

یہ تو سریش اور جیلیٹن کا تذکرہ ہوا جو کھالوں، ہڈیوں اور آنتوں کو ابالنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد سینگ، کھر اور ہڈیوں کا نمبر آتا ہے۔ جن سے بٹن، پائپ، بالوں میں لگانے کا پن اور شکاری چاقوں کے ہینڈل وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بندوق بھی ہڈیوں کے کوئلہ ہی سے سخت کی جاتی ہے۔

خون میں البومن ہوتا ہے۔ اس سے کسی چیز میں تحلیل نہ ہونے والی ایک قسم کی چھاپنے کی روشنائی بنتی ہے۔ اس کے علاوہ چمڑے کی چمک اور شکر کی دل آویز سفیدی بھی اسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

خشک خون، ھڈیاں، زمین پر گری پڑی بےکار چربی، کھر اور سینگ بڑے پر از نائٹروجن کھاد کا کام دیتے ہیں۔ اور اسی کھاد کو جب ہم ترشئی فاسفیٹ کے ساتھ ملاتے ہیں تو بس یوں سمجھئے کہ ناکارہ زمین بھی سونا اگلنے لگتی ہے۔

اون سے کپڑے کل وغیرہ بنتے ہیں لیکن قبل اس کے کہ اون کپڑے کے کارخانے والوں کے حوالہ کیا جائے اس سے روغن نچوڑ لیتے ہیں۔ اس روغن سے صابون اور حسن و جمال کی آرائش کے لئے نوع نوع کے تیل اور عطریات اور دوسرے سامان بنتے ہیں۔

قابل حل گائے کا گوشت لرزہ میں طاقت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہ پہلے ہی سے ھضم شدہ اور گوشت کی ایک مرتکز شکل ہوتی ہے۔

آنتوں سے ساوسج کے، جو کہ ایسے گوشت سے بنائے جاتے ہیں جس کے ویسے بکنے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی، خول بنائے جاتے ہیں۔

الغرض اس کے علاوہ گلیسرین، منہ دھونے کا پوڈر، سینڈ پیپر، برش وغیرہ سب ھی چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ایک لاکھ بھیڑوں کے غدود جمع کرکے آدھ سیر سپرارینیلن (Suprarenelin) تیار کی جاتی ہے جو کہ نازک آپریشنوں کے لئے ایک بہت ھی کارآمد دوا ثابت ہوئی ہے۔ کوکین کے ساتھ اس کا انجکشن دینے سے آنکھ، ناک، اور دوسرے نازک اعضا کا بلا خون نکالے ہوئے آپریشن ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جراحی کے صدمے کے سبب یا کلوروفارم کی وجہ سے حس مریض کے خون کا دباؤ کم ہونے لگتا ہے تو اس کا انجکشن اس دباؤ کو بڑھا کر جان بچا لیتا ہے۔

اس مثل سے اب آپ اچھی طرح اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ضمنی پیداوار کا استعمال کس حد تک ترقی کرچکا ہے۔

اور یہ کچھ کارخانوں پر ہی موقوف نہیں ہے خود آپ کا گھر، آپ کا شہر اس کے بازار اس کی سڑکیں اور گلیاں اسی جگہیں ہیں جہاں ہر وقت ضمنی پیداوار ہوتی رہتی ہے۔ کوڑا کرکٹ آپ نے ادھر آدھر پھینکا ہوا اور مختلف جگہوں میں جمع کیا ہوا دیکھا ہوگا۔ اور اسے محکمہ صفائی والوں کو گاڑیوں میں لاد لاد کر لے جاتے ہوئے اور شہر سے دور میدانوں میں ڈالتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ یہ چیزیں آپ کی روزانہ زندگی کے کارخانے کی ضمنی پیداوار ہیں جب تک آپ ہیں کوڑا کرکٹ بھی رہے گا اور روزانہ پیدا ہوتا رہے گا۔ اب یا تو آپ روپے خرچ کیجئے گاڑیوں میں لادیے اور اسے شہر سے باہر پھینک دیجئے اور اس کے پہاڑ کے پہاڑ کھڑے کر دیجئے اور اچھی خاصی زمیں کے ایک بڑے رقبے کو برباد کر دیجئے یا پھر عقل سے کام لیجئے اور اس بے کار چیز کو باکار بنائے۔

آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ کوڑے کرکٹ کو جلانے سے اتنی قوت حاصل کی جاسکتی ہے کہ اس سے شہر میں روشنی کی جائے اور گاڑیاں چلائی جائیں۔ بہت سے جدید شہروں میں کوڑے کرکٹ کو اہم ضمنی پیداوار سمجھا جاتا ہے۔ اور حالانکہ ایندھن کے نقطہ نگاہ سے کوڑے کرکٹ اور کوئلے میں کوئی مناسبت نہیں، ایک من کوئلہ جلانے سے جو بات حاصل ہوتی ہے اسی کے لئے پانچ سے پندرہ من کوڑا جلانا پڑتا ہے اور پھر یہ کہ یہ آسانی سے جل بھی نہیں سکتا، اس کے لئے خاص قسم کے چولھے بنائے جاتے ہیں، لیکن ان ساری دقتوں کے باوجود کوڑے کو جلایا جاتا ہے اور اسی گندی، بد بو دار، جراثیم سے بھری ہوئی ناپاک چیز سے اتنی بجلی پیدا کی جاتی ہے کہ اس سے پورا شہر روشن کیا جاتا ہے اور جو بجلی بچ رہتی ہے اس سے گاڑیاں چلائی جاتی ہیں۔

دوست ۔ (حیوانیات کے طالبعلم سے) بتاؤ کونسی مچھلی کی آنکھیں قریب قریب ہوتی ہیں۔
طالبعلم ۔ مجھے تو کوئی ایسی خاص مچھلی نہیں معلوم۔
دوست ۔ چھوٹی مچھلی کی۔

جسمانی اعمال پر کیمیائی تصرف

(ترجمہ از ۔ محمد زکریا صاحب مائل)

مادۂ حیات یا نخزمایہ کو کسی نادر یا انوکھے کیمیاوی عنصر پر مشتمل نہیں ہوتا تاہم وہ اساسی طور پر غیر ذی حیات مادے سے مختلف ہوتا ھے۔ یہ مادہ ھمیشہ مرتب و منظم ہوتا ھے۔ زندہ مادے کی وحدت سالمہ نہیں بلکہ عضویہ ھے۔ مزیدبراں عضوے ھمیشہ پہلے سے موجود رھنے والے عضویوں سے وجود میں آتے ھیں۔ اسی وجہ سے نخزمائے کی مرئی ساخت کا مطالعہ تاریخی مطالعے کی حیثیت رکھتا ھے۔ اس صورت میں حیاتیات کا علم جو زندہ مادوں یا جسموں کے علم کا دوسرا نام ھے دوگونہ فرائض رکھتا ھے۔ (۱) نخزمائے کے وظائف و فعلیات کا بیان کرنا اور (۲) عضوے کی مختلف ساختوں کا انکی تاریخ یا ارتقا کی روشنی میں مطالعہ کرنا۔

اس مفہوم کو ایک تشبیہ سے زیادہ واضح کیا جاسکتا ھے۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص اپنے آپ کو لندن میں پاتا ھے۔ اگر وہ ناتجربہ کار اور ناواقف قسم کا عالی شخص ھے تو وھاں کی چھوٹی اور پیچ در پیچ سڑکوں میں بری طرح کھو جائے گا۔ لیکن اگر اسے اپنے گرد و پیش کی زندگی سے پہلے سے دلچسپی ھے تو وہ سڑکوں کے طرز اور نمونے نظر انداز کر کے ان میں بے مقصد طور پر ادھر ادھر پھرنے پر قانع رھے گا۔ دوسری طرف، اگر شہر کی تاریخ اسے موھنے اور لبھانے میں کامیاب ھوئی تو وہ بہت جلد لنڈن کے خاکے کا ایک ایسا صحیح اور صاف نقش قائم کرلے گا جسے ایک عالی و معمولی سیاح ھرگز پسند نہ کرے گا۔ فعلیات کا ماھر نقشہ کش یا جلد اثر قبول کرنے والے سیاح سے مشابہہ ھے۔ وہ عضویہ کی پیچیدہ فعلیتوں سے دلچسپی رکھتا ھے اور اسکے باوجود اسکی قابل مشاہدہ ساخت سے کوئی بڑا گہرا یا قریبی تعلق نہیں رکھتا۔ ماھر شکلیات (Morphologist) یا ھر تشریح کی مثال اس سیاح کی سی ھے جو (Baedeker) ھاتھ میں لئے ھوئے لگاتار اس تلاش میں رھتا ھو کہ اصولی طور پر اپنے آس پاس کی مشغول زندگی سے محفوظ تاریخی دلچسپی کے مناظر ڈھونڈ نکالے۔

نخزمائے کے مخصوص اعمال یا اسکی قومی و اھم صفات بھی ایسی ھی ھیں خواہ عضویہ کیسا ھی پیچیدہ یا سادہ ھو۔ سادہ ترین فرو محض خلیہ یعنی نخزمائے کا ایک دقیق جو ایک تو وہ چھوٹے سے

کردی جسم یا نواہ پر مشتمل ہے۔ ماہر کے لئیے سب سے زیادہ دلچسپ چیز عضوے ہین خواہ ہمارے اجسام کی طرح کتنے ہی پیچیدہ کیون نہ ہون کیونکہ ان اجسام کے اندر محنت و مشقت یا انکے متعلقہ کام منقسم ہیں اور خلیون کے گروہ خاص خاص اور اہم فرائض ادا کرنے مین خصوصی مہارت رکھتے ہین مثلاً خراش پذیری ایصالیت، حرکت یا تولید۔ خلیون کے اسی قسم کے خصوصی مہارت یافتہ گروہ سے اعضاء عضلات، دماغ اور پھیپھڑے وغیر وجود مین آتے ہین۔

اب یہ معلوم ہونا چاہئیے کہ عضویہ کی جسامت یا پیچیدہ گی خواہ کتنی اور کیسی ہی کیون نہ ہو وہ دو کام ضرور کرتا ہے جنہین شکل نمبر (۱) مین ظاہر کیا گیا ہے۔

شکل نمبر (۱)

ایک تو وہ اپنے ماحول کے ساتھہ اپنا توازن برقرار رکھتا ہے جیسا کہ تیر کے نشانات سے عیاں ہے جن کے سرے دائرہ کی بیرونی سمت میں ایک دوسرے کی طرف نمایان ہیں۔ اس کے مثالیں کھانے اور پانی کی تلاش، مفرط حرارت یا برودت کے ضرر سے بچنے کی کوشش وغیرہ۔

افعال ہیں۔ دوسرا کام یہ ہے کہ توازن عضوئے کے اندر اس غرض سے قائم رہے کہ وہ ماحول پر ایک اکائی کے طور پر اثر انداز ہوگا۔ اسی چیز کو دائرہ کے اندر کے متخالف تیرون سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اعضا کو اپنے فرائض موزون ومتوافق طور پر انجام دینا چاہئیں ان کے ایسا کرنے کا۔ مفہوم یہ ہوگا کہ ایک کی فعلیت دوسرے کی فعلیت پر اثر ڈالنے کے قابل ہے۔

شکل نمبر (۲)

یہ کام دو صورتون سے انجام پاتا ہے جو شکل نمبر (۲) مین ظاہر کی گئی ہین۔ (الف) کی فعلیت اعصابی نظام کی وساطت سے (ب) کو متاثر کرتی ہے جو خراش پذیری اور ایصالیت مین خصوصی مہارت رکھتا ہے۔ (الف) ایک عصبی حرکت (ایک کیمیاوی تغیر) ترتیب دیتا ہے جو دماغ یاحرام مغزین جہان ایک دوسرا عصبی خیلہ واقع ہے عصبی رشیے پر عصبی مرکز تک فی سکنڈ سوفٹ کی رفتار سے جاری رہتی ہے۔ اس خلیے مین ایک دوسری عصبی حرکت شروع ہوجاتی ہے جو خلیے سے متعلق عصبی رشے پر روان دوان

رهکر (ب) کے اندر ایسی کیمیاوی تبدیلیان پیدا کرنے لگتی ہے جو اسکی فعلیت کو گھٹاتی یا بڑھاتی رہتی ہیں۔ اس نوع کی مطابقتیں جو اعصاب اور مراکز اعصاب پر مشتمل ہیں انعکاسی اعمال کہلاتی ہیں اور سرعت اور نہایت مختصر دوران ان کی نمایان خصوصیت ہے۔

اس موقع پر ہمیں (الف) کی (ب) پر مطابقت کے زیادہ سست اور زیادہ ابتدائی طرز پر غور کرنا ہے جو دوران خون میں واقع ہوتی ہے (الف) کی فعلیت کے نتیجے کے طور پر کچھ مادہ اس قسم کا پیدا ہوتا ہے جو خون میں داخل ہوتا ہے اور دوران خون کے ذریعہ سے (ب) تك پہنچتا ہے۔ یہان (ب) اسے جذب کرتی ہے اور نتیجتہ (ب) کی فعلیت میں کمی یا بیشی رونما ہوتی ہے مثال کے طور پر یون سمجھیے کہ جب ورزش کی جاتی ہے تو عضله میں ایك ترشه پیدا ہوتا ہے جسے لبنی ترشه یا لیکٹك ایسڈ کہتے ہین اور خون کے دوران میں شامل ہو جاتا ہے۔ یه ترشه جو تعب و تکان کا موجب ہے دوسرے عضلات میں پہنچتا ہے جو اسے جذب کرتے ہین اور ان سے عمل کئے بغیر خستگی اور تھکن کی علامات ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ پھر یہی ترشه خون سے حصه دماغ تك جاتا ہے جو تنفس میں باقاعدگی پیدا کرتا ہے۔ یہان مرکز تنفس کے خلیے اسے جذب کرتے ہیں اور تنفس کی سرعت اور گہرائی میں اضافه ہوجاتا ہے تاکه خون کو آکسیجن زیادہ مہیا ہوسکے اور آکسیجن کی ضرورت مادہ تکان یعنی لیکٹك ایسڈ کو تباہ کرنے کے لئے پیش آتی ہے۔ اس طرح تکان کا سبب بننے والے مادے کی ساخت عضو نے میں تبدیلیان رونما کرتی ہے جو اس مادے کی تباہی کا وسیلا بنتی ہیں۔

زندہ خلیون کے خصوصی گروہون کے درمیان بعض گروہ ایسے بھی ہیں جو "افرازات" نامی مادون کو اتمام تك پہنچاتے ہیں۔ ان خلیون کا ایك گروہ ایك غدہ ہے۔ اس غدے میں قنات یا نلکی موجود ہوتی ہے جس میں سے یه افرازات گزر کر جسم کی سطح تك پہنچتے ہیں جیسا پسینے کی صورت میں واقع ہوتا ہے جو جلد کو نم کرتا ہے یا لعاب یا تھوك پیدا کرتا ہے جس سے منہه تر رہتا ہے۔ علم افعال اعضا یا فعلیات میں جو ترقیان ہوئی ہیں ان میں نہایت دلچسپ چیز غدے کی ایك خاص شکل کی شناخت ہے جس مین کوئی قنات نہیں اور اس کے باوجود وہ اپنے افرازات کا ترشح براہ راست خون پر کرتا رہتا ہے۔ یه غدہ اندرونی افراز کا یا درون افرازی عضو ہے۔ یه خون کے اندر ایك ایسا مادہ پہنچاتا ہے جو غذا کی طرح توانائی کا منبع تو نہیں ہوتا مگر دوران خون میں داخل ہونے کا مخصوص فرض ادا کرتا ہے اور دوسرے اعضا تك پہنچ کر ان کی فعلیت کو درست و باقاعدہ بناتا ہے۔

غیر قناتی غدود کی رطوبت

درون افرازی عضو سے جو رطوبت پیدا ہوتی ہے وہ ہارمون (اکسانے والا گماشته) کہلاتی ہے۔ ہارمون دوسری عضوی پیداوارون کے مقابلے میں کم سالماتی وزن

والے سادہ کیمیائی مرکبات ھیں ۔ اسی وجہ سے وہ خون کی رگوں (عروق دمویہ) کی دیواروں میں آسانی سے نفوذ کرسکتے ھیں اور زندہ خلیوں میں پہنچکر ان کی فعلیت کو متاثر کردیتے ھیں ۔ اس سے بھی زیادہ خاص بات یہ ھے کہ جو ھارمون ایک حیوان کے درون افرازی کے عضو سے تیار ھوتا ھے اگر اسے دوسری جنس کے حیوان کے بدن میں پچکاری سے داخل کیا جائے تو اس پر بھی وھی عمل کرتا ھے جو پہلے حیوان پر کرتا تھا ۔ انسولین جو لبلبے کے اندرونی خلیوں کے چند گروھوں سے بنی ھے اس لئے درکار ھوتی ھے کہ جسم کے بافتوں کو شکر سے کام لینے کے قابل بنادے ۔ یہی وہ خوراک ھے جو عضلاتی حرکت یا سمٹاؤ کے لئے توانائی کا سر چشمہ ھے ۔ اگر ھارمونی انسولین مفقود ھے تو اس کے نتیجے میں مرض ذیابیطس اٹھہ کھڑا ھوتا ھے ۔ اس مرض میں بافتے شکر کی تکسید (آکسیجن ملانا) نہیں کرسکتے اور دوسرے غذائی مادے، چربی، اور پروٹین (لحمیہ) اس کے نتیجے میں نا مکمل طور پر استعمال میں آتے ھیں کیونکہ وہ شکر کی بہ نسبت کم سہولت سے جلتے ھیں ۔ شکر جسے جسم جلانے سے قاصر رھتا ھے خون میں بافراط ظاھر ھوتی ھے اور اسے گردے نکال پھینکتے ھیں جب شکر کے ذخائر جگر اور عضلات میں ختم ھوجاتے ھیں تو بافتے خود ٹوٹ پھوٹ کر شکر بنانے لگتے ھیں جو پیشاب میں بھی نمودار ھونے لگتی ھے اور بالآخر مریض ضائع ھوجاتا ھے ۔ لیکن یہ بیماری لا علاج نہیں ھے ۔ اگر مریض کو انسولین کے انجکشن بار بار دئے جائیں تو قابو میں آسکتی ھے ۔ جیسے ھی انسولین صناعی طور سے جسم میں پہنچتی ھے، بافتے ایک بار پھر شکر کو منبع توانائی ھونے کی حیثیت سے استعمال کرنے کے قابل ھوجاتے ھیں اور پہلے کی طرح اس غذا کی کثیر مقدار مہیا کرسکتے ھیں ۔ مریض کا وزن بڑھنے لگتا ھے اور جب تک یہ علاج جاری رھتا ھے اس میں طاقت پیدا ھوتی رھتی ھے ۔ اگر انسولین کا انجکشن ترک کردیا جائے تو مرض پھر عود کر آتا ھے ۔

یہاں یہ معلوم کرنا دلچسپی کا باعث ھوگا کہ مچھلی یا گائے کے لبلبے سے تیار کی ھوئی انسولین انسانی ذیابیطس پر بھی قابو پاسکتی ھے ۔ انسولین خواہ کسی ماخذ سے بنی ھو ایک ھی ھے ۔ مچھلی کے خون میں جو انسولین ھے وہ بھی ایسا ھی کیمیائی مرکب ھے جیسا انسانی خون کی انسولین میں ھوتا ھے ۔

ھارمونوں کی ایک اور خصوصیت یہ ھے کہ وہ جسم کے اندر تیزی سے تباہ ھوجاتے ھیں ۔ جیسے ھی وہ خون کے اندر پیدا ھوکر مختلف اعضا کی فعلیت میں تغیر و تبدل پیدا کرچکتے ھیں ویسے ھی ان کی ضرورت ختم ھوجاتی ھے اور تباھی کا پیام آ پہنچتا ھے ۔ یہی سبب ھے کہ اگر ھارمون منہہ کے ذریعے جسم میں پہنچائے جائیں تو ایک استثنائی صورت کے سوا ان کا کوئی اثر نہیں ھوتا کیونکہ ھضم کرنے والے رس انہیں تیزی سے ضائع کردیتے ھیں ۔

نشو و نما پر غدود درقیہ کا اثر

جو چیز صحیح طور سے انسانی ساخت کو متعین کرتی ہے اس کا صحیح علم ہمیشہ سے حیرت و استعجاب کا موضوع رہا ہے ۔ لوگ جس طرح ایک لمبے تڑنگے دیو پیکر شخص کو تعجب سے دیکھتے ہیں اسی طرح پستہ قد اور بونے آدمی پر بھی ان کی نگاہیں بے اختیار اٹھ جاتی ہیں ۔ گذشتہ چند برسوں کے اندر اس مسئلے سے متعلق صحیح معلومات فراہم ہوئی ہیں جن میں ہنوز اضافہ جاری ہے ۔ در اصل اب درون افرازی ریزش کے دو عضووں یعنی غدۂ درقیہ و غدۂ نخامیہ کے ہارمونوں کی تعدیل و ترتیب کی بدولت انسان تجربی طور پر بونے یا طویل القامت ہوسکتے ہیں ۔ غدہ درقیہ دو لختوں پر مشتمل ہے جو ہوا کی نالی کے دونوں سروں پر واقع ہیں ۔ غدوی بافتوں کے یہ تودے جب بڑے ہوجاتے ہیں تو گردن کے پھول جانے کا باعث بنتے ہیں اور اس حالت کو گھیگھا کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ بعض علاقوں میں سے ایک امریکہ میں گریٹ لیکس (Great Lakes) کے کنارے واقع ہے یہ بیماری بہت عام ہے ۔ باور کیا جاتا ہے کہ یہ کیفیت پانی میں آیوڈین کی کمی سے پیدا ہوجاتی ہے ۔ غدۂ درقیہ کی اندرونی رطوبت یعنی تھائیراکسین (Thyroxin) کا تجزیہ حال ہی میں صحیح طور سے کیا جا چکا ہے اور اب وہ تالیفی طور سے بھی تیار کی جا سکتی ہے ۔ دریافت ہوا ہے کہ اس کی ترکیب میں آیوڈین ایک اساسی عنصر ہے ۔ اسی لئے اگر کافی آیوڈین بہم نہ پہنچے تو درقی غدے آیوڈین کی نامناسب سربراہی سے تھائراکسین کی مقررہ مقدار حاصل کرنے کی سعی میں پھیل جاتے ہیں ۔ انہی درباقتوں کی بنا پر جہاں کہیں گھیگھے کی بیماری پھیلی ہو وہاں کے طلباء مدارس کو آیوڈین استعمال کرایا جاتا ہے ۔

دنیا کے ان حصوں میں جو گھیگھے کے لئے مشہور ہیں خصوصیت سے ان بونوں کا نفرت انگیز نمونہ اکثر دیکھا جاتا ہے جو قمی (شاہ دولھا کے چوہے) کہلاتے ہیں ۔ یہ قمی (Cretin) احمق ہوتے ہیں اور دماغ کی طرح ان کے اجسام بھی غیر مکمل و غیر مرتب ہوتے ہیں ۔ ان کے قد و خال بھدے اور گھناونے ہوتے ہیں ۔ پیٹ باہر کو نکلے ہوئے اور حرکات کمزور اور بے مصرف و ناموزوں ہوتی ہیں ۔ اس قسم کے افراد تیس سے اوپر شاذ و نادر ہی عمر پاتے ہیں ۔ ان کی موت کے وقت معائنہ سے معلوم ہوا کہ غدۂ درقیہ سرے سے غائب ہے ۔ یہ غدہ یا تو ان میں مکمل ہونے نہیں پایا یا انحطاط پذیر ہوگیا ۔ اگر درقی غدے کی کمی کی تشخیص بچپن ہی میں ہوجائے تو بچے کو خشک غدے کی کچھ مقدار باقاعدگی سے استعمال کرا کے درقی ہارمون پیدا کئے جاسکتے ہیں اور غدۂ درقیہ اس عمل سے اپنی مقررہ نشو و نما کو پہنچ سکتا ہے ۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے درقی ہارمون ہی ابتک ایسا ہارمون علم میں آیا ہے جو ہضم کرنے والے رسوں کے عمل سے ضائع نہیں ہوتا ۔ تھائراکسین کی

جو مقدار مقررہ نشو و نما و قیام کے لئے ضروری ہے اتنی کم ہوتی ہے کہ کسی وقت بھی تلاش کی جائے جسم بھر میں صرف چند ملگرام (ایک گرام کا ہزاروان حصہ) مل سکتی ہے۔

فعلیات دان اپنے تجربات پورے کرنے کے لئے بیماری کے انتظار میں بیٹھنے کا عادی نہیں ہوتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ درقی ہارمون کے افعال کی نسبت ہمارا علم جانوروں پر تجربات کی بدولت ترقی کر گیا ہے۔ مثال کے لئے نمو اور بالیدگی پر تھائراکسین کے اثر سے متعلق ہماری نہایت صحیح معلومات جو ان جانوروں کے درقی غدے دور کرنے اور اسی عمر کے معمولی جانوروں سے ان کی نشو و نما کا مقابلہ و موازنہ کرنے حاصل ہوئی ہیں۔ مثال کے لئے تین بکروں کا ذکر مناسب ہے جن پر تجربات کئے جا چکے ہیں ان میں سے ایک معمولی قد کا تھا۔ اور باقی دونوں اسرنڈہ (باڑہ مارے ہوئے) مجربی قمی (شاہ دولہا کے چوہے)(Cretin) تھے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ جانور نو عمر تھے اسوقت ایک مقامی مخدر دوا استعمال کر کے ایک غیر تکلیف دہ عملیے سے ان کا غدۂ درقیہ نکال دیا گیا تھا۔ اس مثال سے واضح ہے کہ پست قد بکرے کو درقی رطوبت سے محروم کر کے بونا بنا دیا گیا اس عمل سے بونے بکروں کا خلیہ بھی نہایت مکروہ اور بھدا ہو گیا۔ ان بکروں کی نہ صرف ترقی ہی رک گئی بلکہ تکمیل بھی۔ یہ اپنی ناقص جسامت کے علاوہ ہر اعتبار سے بچے نظر آنے لگے۔ اس نوع کی بھیڑوں یا بکریوں کی مدت حیات معمولاً صرف دو سال ہوتی ہے۔

بالیدگی پر غدۂ درقیہ کی اس مصرط تاثیر کا سبب نہایت سادہ اور غیر مبہم ہے۔ یہ غدہ زندہ جسم میں کیمیاوی تغیرات کو ترقی دیتا ہے۔ جب درقی غدہ دوران خون میں تھائراکسین داخل نہیں کرتا تو بافتوں کے اندر کیمیاوی تغیرات کی شرح کم ہوجاتی ہے اور جوان جانور میں بالیدگی اور نمو دونوں رک جاتی ہیں۔ ناقص درقی رطوبت کی خاص علامت دیکھنا ہو تو ادنے ایچ مائے (Metabo-lism) کی شکل میں دیکھی جاسکتی ہے۔

غدہ نخامیہ اور اس کے ہارمون

اندرونی رطوبت کا ایک اور غدود جو نشو و نما پر اثر انداز ہوتا ہے غدۂ نخامیہ ہے۔ یہ غدہ اس بافتے کا ایک چھوٹا تودہ ہے (انسان میں ہیزل نٹ (Hazelnut) کے برابر پایا جاتا ہے) جو دماغ کی اندرونی جانب ایک چھوٹی ڈنٹھل جیسی ساخت سے لٹکا ہوتا ہے۔ بصری اعصاب کے دماغ میں داخل ہوتے وقت جو چلیپا بنتا ہے ٹھیک اس کے نیچے اس کا محل وقوع ہے۔ در اصل یہ ایک میں دو غدے ہیں۔ اس جگہ ایک آگے کو نکلا ہوا لختہ ہے جو بالیدگی پر اثر کرنے والی رطوبت خارج کرتا ہے اور ایک پیچھے کی طرف ابھرا ہوا لختہ ہے جس کی اندرونی رطوبت متعدد اثرات پیدا کرتی ہے۔ مثلاً پیشاب کی ساخت میں تحریک، دودھ میں روانی اور رحم کا انقباض یا تنگی۔ آخرالذکر تاثیر

کی وجہ سے لختۂ موخر کا ھارمون، یعنی نخامی مادہ (پچوترین (Pituitrin) بچے کی پیدائش میں سہولت پیدا کرنے کے لئے جسم میں پچکاری سے داخل کیا جاتا ھے۔

نخامی عضو کے لختۂ موخر کا دور کر دینا مہلک نہیں ہوتا لیکن اگر غدے کا لختۂ مقدم (آگے کو نکلا ہوا گوشہ) اکھاڑ پھینکا جائے تو نتیجہ ھمیشہ موت ہوتا ھے۔ اب یہ دریافت ہوچکا ھے کہ اگر جوان حیوان سے اس لختے کا بیشتر حصہ علحدہ کرلیا جائے تو بالیدگی رک جاتی ھے اور جانور بونا بن کر رہ جاتا ھے۔ دوسری طرف اگر نخامی عضو کے لختۂ مقدم کے باقتے کا خلاصہ با قاعدہ وقفوں سے معمولی نشو و نما والے جانور میں انجکشن سے داخل کیا جائے تو وہ قد و قامت میں بڑھتے بڑھتے دیو بن جائے گا۔ اس کے تجربے کے لئے ایک ھی جھول کے دو چوھے چار سو دن کی عمر کے لئے گئے۔ ان میں سے ایک کو اصلی حالت پر رکھا دوسرے چوھے کو نخامی عضو کے لختۂ مقدم کا خلاصہ پچکاری سے دیا گیا۔ نتیجتہ اس کا قد غیر معمولی طور پر بڑھ گیا جس کا باعث چربی کا اجتماع نہیں بلکہ ڈھانچے یا قالب کے غیر معمولی بڑھاؤ کا ثمرہ تھا۔

اب یہ معلوم ہوچکا ھے کہ بہت سے انسانی دیو بڑھا ہوا نخامی عضو رکھتے ھیں اور اسی لئے اس عضو کے لختۂ مقدم کے نمو افزا ھارمونوں کی غیر معمولی مقدار ان کے قد و قامت کو بڑھا دیتی ھے۔ لختۂ مقدم کی اندرونی رطوبت جس کیمیاوی ترکیب سے بنی ھے اس کا حال بجز اس کے کچھ نہ معلوم ہوسکا کہ اس رطوبت کو تھائراکسین سے بالکل مختلف ہونا چاھئے۔

یہ معلوم کرنا موجب دلچسپی ہوگا کہ درون افزائی ریزش کے یہ دو عضو جو نمو پر متصرف ھیں باھم متعلق معلوم ہوتے ھیں۔ اگر غدۂ درقیہ علحدہ کر دیا جائے تو نخامی غدہ بڑھ جاتا ھے۔ انسانیات کے عالموں نے مختلف انسانی اقوام کی جسمانی خصوصیات مثلاً ساخت، خد و خال کی وضع و شکل، سر وغیرہ کا تعلق ان اندرونی رطوبت کے غدوں کی فعلیت سے بیان کرنے کی کوشش کی ھے جو ایسے حیرتناک طریقے سے نمو اور بالیدگی پر اثر انداز ھیں۔

اب تک اس سلسلے میں جو کچھ کہا جا چکا ھے اس سے ظاھر ھے کہ نخزماے کی فعلیتوں سے متعلق کسی قسم کی تحقیقات میں مجموعی حیثیت سے عضوے کو ھرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ھم کسی خاص عضو کو اپنا کام انجام دیتے ہوے دیکھنے کی کوشش کریں تو بات یہیں تک ختم نہیں ہوتی بلکہ خود بخود بڑھ جاتی ھے اور ھم مجموعی طور پر عضوے کے اندر عضو کے باھمی تعلقات کا مطالعہ کر کے اس کا اختتام کرتے ھیں۔ ھر خاص تحقیقات عضوے کے اندر توازن کی ماھیت اور عضوے اور اس کے ماحول کے درمیان ھماری بصیرت کو عمیق و وسیع بنادیتی ھے۔

دیاسلائی کی صنعت

(غلام جیلانی صاحب)

اس جنگ کے سبب جہاں اور بہت سی آفتیں ہندوستان پر آئی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے۔ کہ ہم بہت سی ضروری اشیا سے محروم ہو گئے ہیں۔ اور جیسے جیسے وقت گذرتا ہے ہمیں یہ چیز نہایت وضاعت کے ساتھ معلوم ہوتی جاتی ہے کس طرح معمولی سے معمولی چیزوں کے لئے بھی غیروں کے محتاج ہین۔

دیاسلائی ایک معمولی سی چیز ہے جس کی ضرورت ہر شہر، ہر گاؤں اور ہر گھر میں دن رات پڑتی ہے۔ لیکن یہ ضروری چیز بھی دن بدن کم ہوتی جارہی ہے اور جو ملتی ہے وہ زیادہ قیمت پر۔ دیاسلائی تو ہندوستان میں بنتی ہی ہے لیکن وہ اجزا یعنی پوٹاسیم کلوریٹ اور سرخ فاسفورس وغیرہ جن پر دیاسلائی کی تیاری کا دار مدار ہے باہر سے آیا کرتے تھے۔ ان کا آنا آجکل بند ہو گیا ہے اور یہی سبب دیاسلائی کی گرانی اور کمیابی کا ہے۔ ابھی تک ہندوستان میں ان کی تیاری کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ اگر ہو گیا ہوتا تو پھر ہر دقت پیش نہ آتی۔

دیاسلائی کی ایجاد سے پہلے لوگ آگ نکالنے میں کافی محنت سے کام لیتے تھے۔ پتھر کو پتھر پر مار کر لوہے کو پتھر پر مار کر، لکڑی کو لکڑی سے رگڑ کر آگ نکالا کرتے تھے۔ یہ آگ کافی محنت اور دقت سے نکلتی تھی اور جب ایک دفعہ آگ نکل جاتی اور کوئی چیز سلگ جاتی تو پھر اس کو ہمیشہ روشن رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ آج بھی دیہات میں یہ نظارہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک جگہ آگ سلگتی رہتی ہے اور جس کسی کو آگ جلانے کی ضرورت ہوتی ہے اسی آگ سے جلتی ہوئی لکڑی یا کوئلہ لے جا کر کام چلاتا ہے۔

سب سے پہلے جو دیاسلائیاں بنائی گیں وہ اس طرح کہ سلائیوں کو گرم موم میں ڈبا کر ان کے سرے پر پوٹاسیم کلوریٹ اور شکر کا امیزہ لگا دیا جاتا تھا اور خشک ہونے پر ان پر گندھک کا تیزاب ٹپکایا جاتا تھا جس کے سبب سلائی فوراً مشتعل ہوجاتی تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ طریقہ اطمینان بخش نہیں تھا۔ اور نہ اس میں سہولت تھی کیونکہ ہر شخص ان دیاسلائیوں کو اپنے ساتھ رکھ نہیں سکتا تھا۔ جو لوگ رکھتے تھے ان کو سلائیوں کے ساتھ ساتھ گندھک کے تیزاب کی شیشی بھی ساتھ رکھنی پڑتی تھی۔

چنانچہ سائنس دانوں نے دیاسلائی کو آسان بنانے کی کوشش جاری رکھی۔ اور یہ کوشش دراصل فاسفورس کے دریافت کے بعد ہی کامیاب ہو سکی۔

فاسفورس جیسا کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں دو قسم کا ہوتا ہے ایک سرخ ایک زرد۔ زرد کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ فوراً آگ پکڑ لیتا ہے۔ چنانچہ اس خصوصیت کو کام میں لا کر پہلے پہل دیاسلائی بنائی گئی۔

یوں تو ایک قسم کی دیاسلائی ایسی بنائی جاچکی تھی جو ایک حد تک کامیاب تھی لیکن اس کو جلانے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ اس کو رگڑ کی دیاسلائی یا موسی فر کہا جاتا تھا۔ اس دیاسلائی کے سرے پر، شکر، پوٹاشیم کلوریٹ اور ببول کے گوند کا آمیزہ لگا دیا جاتا تھا۔ اس کو جلانے کا طریقہ یہ تھا کہ ان سلائیوں کو سینڈ پیپر کے درمیان دبا کر زور سے کھینچتے تھے۔ جن سے ان کو آگ لگ جاتی تھی۔ لیکن یہ طریقہ تکلیف دہ تھا اور ان میں مشکل سے آگ لگتی تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان سلائیوں میں ایسا مسالہ لگایا جائے جو فوراً آگ پکڑ لے۔ اس کمی کو زرد فاسفورس نے پورا کیا۔ زرد فاسفورس سے جو دیاسلائی بنائی گئی اس کو غیر محفوظ دیاسلائی کہتے ہیں۔

غیر محفوظ دیاسلائی گندک کی دیا سلائی

غیر محفوظ دیاسلائی کو کارخانوں کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے۔ اس کی تیاری کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے سلائیوں کے ۱/۴ حصہ کو پگھلی ہوئی گندک میں ڈبا کر۔ ان کے سروں پر سریش، پٹاشیم کلوریٹ زرد فاسفورس، پٹاشیم بائیکرومیٹ، سفوف کانچ اور زنگ آکسائیڈ کا مرکب لگا کر خشک کرلیا جاتا ہے اور ڈبیہ کی سطح پر سریش لگا کر اسپر ریت چپکادی جاتی ہے تاکہ اسپر سلائیوں کو رگڑ کر جلایا جاسکے۔

ان سلائیوں کو ڈبیہ کی سطح کے علاوہ اگر کسی پتھر یا چوبی تختے یا کارڈبورڈ پر سختی سے رگڑا جائے تو جل جاتی ہیں ان کے غیر محفوظ کہلانیکا سبب یہ ہے کہ زرد فاسفورس کا دھواں انسانی صحت کیلئے بے حد مضر ہوتا ہے۔ جس زمانہ میں غیر محفوظ دیاسلائی عام طور پر کارخانوں میں بکثرت تیار کیجاتی تھی اسوقت کے اعداد وشمار سے پتہ چلایا ہے کہ سیکڑوں مزدور جو دیاسلائی سازی کے کارخانوں میں کام کرتے تھے زرد فاسفورس کے دھوئیں سے امراض میں مبتلا ہو کر فوت ہوگئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ برن میں ۱۹۰۶ء میں ایک بین القوامی کانفرنس میں یہ طے کیا گیا کہ زرد فاسفورس کو دیاسلائیوں میں بالکل استعمال نہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ ماہرین دیاسلائی سے اس عظیم نقص کو دور کرنے کے لئے اور بھی تحقیقات کی اور آخر کار ایسی دیاسلائی بنانے میں کامیابی حاصل کرلی جسمیں مندرجہ بالا نقص بالکل موجود نہیں ہے۔ کسی کھردوری سطح پر رگڑنے سے جل اٹھنے والی دیاسلائیاں اب بھی بنتی ہیں لیکن ان میں زرد فاسفورس کی بجائے فاسفورس کا سسکوئی سلفائیڈ استعمال کیا جاتا ہے۔ جس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ایک اور دیاسلائی ایجاد کی جو زمانہ موجودہ میں تقریباً ہر جگہ زیر استعمال ہے اور اس کو محفوظ دیاسلائی کہتے ہیں۔

محفوظ دیا سلائی

محفوظ دیاسلائی کے اجزائے ترکیبی میں پٹاشیم کلوریٹ، پٹاسیم بائیکرومیٹ، زنک آکسائیڈ سفوف کانچ، گندک، منیگنیز ڈائی اکسائیڈ، اور آئرن آکسائیڈ شامل ہیں ان اجزاء کو پگھلے ہوئے سریش میں حل کرلیا جاتا ہے اور سلائیون کو پہلے موم میں ڈباکر یہ مرکب ان کے سرون پر لگادیا جاتا ہے اور ڈبیہ کی سطح پر سرخ فاسفورس، انٹی مونی سلفائیڈ پگھلے ہوئے سریش میں ملاکر لگا دیا جاتا ہے سرخ فاسفورس میں مضر صحت اثرات بالکل نہیں ہیں۔ ان دیاسلائیون کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ جب تک ان کو سرخ فاسفورس سے تیار کی ہوئی محفوظ سطح پر رگڑا نہ جائے یہ جل نہیں سکتیں اس کے علاوہ ایسا انتظام بھی کر لیا جاتا ہے۔ کہ جلی ہوئی سلائیون کے گرنے کا خطرہ کم سے کم ہوجائے کہ اس کام کے لئے تراشیدہ سلائیون کو پہلے ایک حوض میں ڈبایا جاتا ہے جسکے پانی میں امونیا پاوڈر اور فاسفورس اینڈ حل کیا ہوا ہوتا ہے چند منٹ کے بعد حوض میں سے نکالکر سلائیون کو دھوپ یا ہوا میں خشک کرلیا جاتا ہے یہ عمل کرنے کے بعد اگر سلائیاں جلائی جائیں تو راکھ نہیں بنتی بلکہ کوئلے کی شکل اختیار کرلیتی ہیں سلائیون کے راکھ بننے میں نقص یہ ہے کہ جلتے وقت ہاتھ سے ٹوٹ کر لباس یا فرش پر گرجاتی ہے جس سے جلجانے کا خطرہ ہے اتنا جاننے لینے کے بعد اب مناسب ہوگا کہ ہندوستان میں دیاسلائی کی صنعت کے متعلق کچھ بیان کیا جائے۔

ہندوستان میں دیاسلائی سازی کی ابتدا

انیسوین صدی کے اوائل میں ہندوستان میں اس صنعت کی ابتدا ہوئی ابتدا میں دیاسلائی کیلئے لکڑی جاپان یا سویڈن وغیرہ سے منگائی جاتی تھی لیکن بعد میں تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں اس لکڑی کی کمی نہیں ہے بلکہ کثیر مقدار میں موجود ہے۔ علاقہ جنوبی ملبار میں ملبار آسپان (درخت) کثیر مقدار میں ہیں اسکی لکڑی دیا سلائی سازی کیلئے بہترین ثابت ہوئی ہے اس لکڑی کا رنگ سفید ہوتا ہے اور یہ ہلکی اور مضبوط ہوتی ہے دیاسلائی کیلئے لکڑی میں یہی صفات ہونا ضروری ہیں۔

ملبار آسپان کے علاوہ دوسرے درجہ پر سیمل درخت کی لکڑی بھی دیاسلائی کیلئے کارآمد ثابت ہوئی ہے نیم کے درخت سے بھی سلائیان بن سکتی ہیں لیکن یہ سلائیان زیادہ مضبوط نہیں ہونگی۔ درخت چیڑ (دودھیا) کی لکڑی بھی دیاسلائی کے لئے کارآمد ہوتی ہے یہ لکڑی ریاست میسور اور نینی تال کے جنگلون میں کثرت سے موجود ہے سخت کارڈبورڈ کی بھی سلائیان بنائی جاتی ہیں ان سلائیو کا رواج انگلستان میں زیادہ ہے۔

کارخانوں میں دیاسلائی بنانے کا طریقہ

درختون کے ایسے تنے جو بالکل سیدھے اور ہموار ہون اور انکی گولائی کم ازکم دوفٹ ہو جنگلون سے فراہم کرلئے جاتے ہیں ان تنون

کو ایک ایک فٹ کے ٹکڑوں میں منتقل کر لیا جاتا ہے انکا پوست علیحدہ کر کے مشین پر فٹ کر دیا جاتا ہے ۔ مشین کی حرکت سے یہ ٹکڑا تیزی سے گھومنے لگتا ہے ۔ اس کے قریب لوہے کی تیز چھریاں لگی ہوتی ہیں ۔ مشین چلنے پر چھریاں لکڑی سے قریب ہوتی جاتی ہیں ۔ جب لکڑی سے ملجاتی ہیں ۔ تو باریک باریک پٹیاں سائز کے مطابق لکڑی سے اترنا شروع ہو جاتی ہیں ۔ ان پٹیوں پر ساتھہ ہی ساتھہ لائن پڑتی جاتی ہے تاکہ جب انکو موڑا جائے تو ٹوٹ نہ جائیں ان تمام پٹیوں کو تہ بہ تہ جما کر دوسری مشین پر رکھکر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنائے جاتے ہیں ان ٹکڑوں کو موڑ کر ڈبیاں بنائی جاتی ہیں ۔ ڈبیاں مشین پر بنتی ہیں اور دستی طریقہ پر بھی بنائی جاتی ہیں ۔ تراشیدہ پٹیوں پر صرف کاغذ چپکانا ہوتا ہے اگر مشین پر بنائی جائیں تو ایک دن میں ایک مشین سے تقریباً بیس ہزار ڈبیاں تیار ہوسکتی ہیں ۔ اور دستی طریقہ پر ایک شخص جس کو اچھی مشق ہو یومیہ ۳ ہزار بنا سکتا ہے ۔ سلائیاں بنانے کیلئے دبیز پٹیاں اتاری جاتی ہیں اوران پٹیوں کو تہ بہ تہ مشین میں رکھکر سلائیاں تراشی جاتی ہیں ۔ فی منٹ دس پونڈ سلائیاں ایک مشین تراش سکتی ہے تراشیدہ سلائیوں کو اس حوض میں ڈبایا جاتا ہے جس کے پانی میں فاسفورس ایسڈ اور امونیا پوڈر حل کیا ہوا ہوتا ہے تاکہ جلتے وقت سلائیاں راکھہ نہ بن سکیں بلکہ کوئلہ بن جائیں ۔ اس عمل کے بعد سلائیوں کو ہوا یا دھوپ میں خشک کر کے مشینوں کے ذریعہ یکجا کر لیا جاتا ہے یعنی فریموں میں اس طور پر جمع لیا جاتا ہے کہ سلائیاں بالکل ہموار طور پر کھڑی حالت میں جم جائیں اور ایک دوسرے سے فاصلہ پر رہیں تاکہ ان پر کیمیاوی عمل کرنے میں دقت پیش نہ آئے ۔ جن فریموں میں سلائیاں بھری ہوئی ہیں ان کو لوہے کی پلیٹ پر یکے بعد دیگرے رکھکر پریس کیا جاتا ہے تاکہ اونچی نیچی نہ رہیں اور پلیٹ آگ کے ذریعہ گرم ہوتی ہے تاکہ اگر سلائیاں پورے طور پر خشک نہ ہوئی ہو تو خشک ہوجائیں ۔

اس کے بعد پگھلے ہوئے گرم موم کی سطح پر رکھکر سلائیوں کا کچھہ حصہ موم میں ڈبا دیا جاتا ہے ۔ اگر یہ عمل نہ کیا جائے تو سلائیاں جلانے میں بڑی مشکل ہوگی کیوں کہ سلائیوں کو ڈبیہ کی سطح پر رگڑنے سے جو شعلہ برآمد ہوتا ہے اس میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ فوراً سلائی کو مشتعل کر دے اور وہ شعلہ دیر پا بھی نہیں ہوتا فوراً بجھہ جاتا ہے ۔ لیکن موم فوراً اس شعلہ کو اپنی جانب منتقل کرلیتا ہے اور اس طرح سلائی گرم ہوکر جلنے لگتی ہے ۔ سلائیوں پر موم کا عمل کرنے کے بعد مرکب میں جو پہلے سے تیار شدہ ڈپنگ پلیٹ (مرکب لگانے کی میز) میں جو موجود ہوتا ہے ڈبا کر خشک کرلیا جاتا ہے ۔ سلائیوں کا مرکب خشک ہونے کے لئے اگر موسم گرم ہو تو نصف گھنٹہ کافی ہوتا ہے لیکن موسم باراں یا سردی میں زیادہ عرصہ لگتا ہے ۔ ایسی صورت میں خاص طور پر گرم کمرے بنائے جاتے ہیں جہاں آگ یا برقی طاقت سے حرارت پہنچائی جاتی ہے ان کمروں میں سلائیاں بہت جلد خشک ہوجاتی ہیں ۔ خشک ہوجانے پر سلائیوں کو فریم سے

علحدہ کر کے خانہ دار کشتی میں منتقل کر دیا جاتا ہے یہ کام بھی مشین کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اب ان سلائیوں کو تیار شدہ ڈبیوں میں ہاتھ یا مشین کے ذریعے بھر دیا جاتا ہے اور ڈبیوں کی سطح پر برش کے ذریعہ مرکب لگا کر خشک کر دیا جاتا ہے۔ ان تمام کاموں کو انجام دینے کے لئے ایک معمولی کارخانے میں چار سو آدمی ہوتے ہیں ان سب کا رہنما یا نگرانکار صرف ایک آدمی ہوتا ہے جسکو کیمسٹ (دوا ساز) کہا جاتا ہے یہ آدمی اکثر جاپانی یا جرمن ہوتا ہے۔ اسکا خاص کمرہ (کیمیکل روم) علحدہ ہوتا ہے اجزائے ترکیبی کا وزن کرتے وقت دوسرا کوئی شخص کمرے میں نہیں جا سکتا کیونکہ کیمسٹ اجزاء کا صحیح تناسب پوشیدہ رکھتا ہے اسی لئے اس کو اپنی خدمات کا معقول معاوضہ ملتا ہے اگر اس کام کو دوسرے بھی سیکھ جائیں تو کیمسٹ کی اہمیت باقی نہیں رہسکتی۔ فی زمانہ بعض کارخانوں میں ہندوستانی کیمسٹ بھی دیکھے جاتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح اس کام میں مہارت حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن غیر ملکی ماہرین کے مقابلہ میں بہت کم معاوضہ اپنی خدمات کا پاتے ہیں۔

بعض اجزاء ہندوستان میں تیار نہیں ہوتے

دیا سلائی سازی میں دو چیزیں بہت اہم ہیں پوٹاشیم کلورایٹ اور سرخ فاسفورس اگر یہ چیزیں موجود نہ ہو تو دیاسلائی تیار کرنا ناممکن ہے۔ یہ دو چیزیں ابھی تک ہندوستان میں تیار نہیں ہوئیں۔ جاپان۔ سویڈن جرمنی امریکہ وغیرہ سے منگائی جاتی ہیں۔ موجودہ جنگ کے سبب ان کی درآمد تقریباً دو سال سے بند ہے پہلے کا ذخیرہ جو کچھ موجود ہے اسی پر کام چل رہا ہے اگر یہ ذخیرہ ختم ہوجائے تو ہندوستان میں دیاسلائی کے تمام کارخانے بند ہو جائینگے۔ جن اجزاء سے پوٹاشیم کلوریٹ اور فاسفورس بنائی جاتی ہیں وہ ہندوستان میں کافی مقدار میں مہیا ہوسکتے ہیں اگر حکومت ہند ان ضروری اجزاء کی تیاری کا انتظام ہندوستان میں کرتی تو فی زمانہ اس مفید صنعت کے ختم ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا۔

اب سے دس سال پیشتر دیاسلائی سازی کا ایک معمولی کارخانہ جاری کرنے کے لئے تقریباً دو لاکھ کے سرمایہ کی ضرورت ہوتی تھی گویا کم سرمایہ دار اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے لیکن موجودہ زمانہ مین دستی طریقہ پر بھی اس کام سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے کیوں کہ تراشیدہ سلائیاں اور ڈبیاں دوسرے کارخانوں مثلاً ساوتھ ملبار سے مہیا ہوسکتی ہیں صرف ان پر کیمیاوی عمل کرنا پڑتا ہے۔ دستی کارخانے مین مختصر مشینری کی مدد سے تقریباً ایک سو گرز یومیہ دیا سلائی تیار ہوجاتی ہے۔ ایسے کارخانے کے لئے پندرہ ہزار کا سرمایہ کافی ہوسکتا ہے۔

دیاسلائی پر گورنمنٹ کی نگرانی

سنہ ۱۹۳۴ع میں دیاسلائی کے کارخانوں پر گورنمنٹ کی نگرانی قائم ہوئی اور دیاسلائی کیلئے ایک قانون مرتب کیا گیا۔ اس قانون کی رو سے بغیر حصول لائسنس کوئی شخص دیاسلائی تیار نہیں

کر سکتا کیونکہ دیا سلائی انڈیا اکسائز ڈیوٹی قائم کی گئی ہے ہر دیا سلائی کی ڈبیا پر انڈیا اکسائز کی علامت کے لئے ایک کاغذی رول جس پر سلائیوں کی تعداد اور ٹکس کی شرح درج ہوتی ہے چسپان کیا جاتا ہے جس ڈبیہ پر چسپاں نہ ہو وہ قابل گرفت ہے ۔

اس ٹکس کی ادائیگی کا طریقہ یہ ہے کہ سرکاری خزانوں میں مطبوعہ بنیڈ رولس جمع ہوتا ہے کارخانے والے حسب ضروری نقد قیمت ادا کر کے اسکو خرید لیتے ہیں اور ڈبیوں پر چسپاں کر دیتے ہیں ۔ اس قانون کی باقاعدہ تعمیل کی نگرانی کیلئے ہر کارخانے پر گورنمنٹ کے نمائندے مقرر ہیں جو اسکے حساب و کتاب کی نگرانی کرتے ہیں ہندوستانی ریاستوں کیلئے اس قانون میں ایک رعایت رکھی گئی تھی مثلاً ایسے کارخانے جو کسی ریاست کی حدود میں جاری ہیں ان پر انڈیا اکسائز ڈیوٹی (ٹکس) عائد کرنا یا نکرنا اس ریاست کی حکومت پر منحصر ہوگا اگر ٹکس عائد نا کیا جائے۔ تو شرط یہ تھی کہ وہاں کی تیار شدہ دیا سلائی علاقہ برٹش گورنمنٹ میں نہ بھیجی جاسکیگی اس رعایت کے مد نظر چند ریاستوں نے مثلاً جوناگڈھ اسٹیٹ (کاٹھیاواڑ) جام نگر اسٹیٹ، بھاؤ نگر اسٹیٹ وغیرہ نے برٹش گورنمنٹ سے معاہدہ کر لیا ہے کہ وہاں کی تیار شدہ دیا سلائی انگریزی علاقہ میں نہیں بھیجی جائیگی اسلئے وہاں کی دیا سلائی پر یہ ٹکس یا پابندی نہیں ہے ان ریاستوں میں دیا سلائی ارزان فروخت ہوتی ہے کیونکہ کارخانوں کو کوئی ٹکس ادا کرنا نہیں پڑتا ۔

ہندوستان میں دیا سلائی کا سب سے بڑا کارخانہ

ہندوستان میں سب سے بڑا اور مکمل کارخانہ دیاسلائی کا (ومکو) یعنی ویسٹرن انڈیا میاچ کمپنی ہے یہ کارخانہ بمبئی سے تقریباً پچاس میل کے فاصلہ پر عنبرناتھ میں ہے اس کارخانہ میں تقریباً چالیس لاکھ سرمایہ لگا ہوا ہے یہ کارخانہ سویڈن کے کارخانوں کی ایک شاخ ہے ہندوستان کے مختلف حصوں میں اسکی شاخیں موجود ہیں اور ہر بڑے شہر میں اسکی ایجنسیاں قائم ہے اس کارخانے میں ہر ایک کام مشین کے ذریعہ کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ بمقابلہ دیگر کارخانون کے اس کارخانے کی تیار شدہ دیا سلائی اچھی ہوتی ہے تقریباً دس ہزار گرز یومیہ دیا سلائی تیار ہوتی ہے ۔ یعنی تقریباً بیس ہزار روپیہ یومیہ انڈیا اکسائز ڈیوٹی کی شکل میں اس کارخانے سے ادا کیاجاتا ہے ۔

موجودہ زمانہ میں دیاسلائی کی صنعت تجارتی نقطہ نظر سے کافی منفعت بخش ہے اگر اسکے وہ اجزاء جو دوسرے ممالک سے تیار حالت میں منگائے جاتے ہیں ہندوستان میں ہی تیار ہونے لگیں تو یہ صنعت خالص ہندوستانی صنعت کہلانے کی مستحق ہو سکیگی ۔

ہماری غذا

(ریاض الحسن قریشی صاحب)

قوموں کی زندگی میں سب سے بڑا مسئلہ زندگی کا ہے۔ ہاپکنس کا قول ہے کہ غذا کی ضرورت اس کی مقدار اور نوعیت نے قوموں کی قسمتوں کے فیصلے میں بڑا حصہ لیا ہے تغذیہ کے علم نے گزشتہ چند سال میں بڑی سرعت سے ترقی کی ہے اور جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان کی بدولت صحت عامہ کی پالسی نئی کروٹ بدل رہی ہے۔ آج کل غذا کے مسئلہ پر حکومتیں زیادہ توجہ کر رہی ہیں۔

بین الاقوامی انجمن مزدوران جس کا مقصد قیام ہی یہ ہے کہ مزدوروں اور کاریگروں کو مشکلات اور فاقہ کشی سے بچائے اور انہیں کافی مزدوری دلا کر زندہ رہنے کے قابل بنائے۔ پورے طور پر اس امر کی کوشاں ہے کہ تمام دنیا میں غذا کا معیار علمی اور فنی اصولوں کی بنا پر رائج کرا دے۔ آج کل عام لوگوں کو تغذیہ کے علمی اور فنی اصولوں کی تعلیم دیجا رہی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ کثرت سے لوگ بری غذاوں کے استعمال سے روز مرہ مختلف بیماریوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ عام طور پر لوگوں کی جسمانی صحت خراب ہونے کی وجہ سے ان میں بیماریوں کے مقابلے کی قوت باقی نہیں رہتی جس کی ذمہ داری ایک بڑی حد تک نقص تغذیہ پر مبنی ہے۔ اگر غذا اچھی اور مختلف قسم کی ہو تو علاوہ اس کے اس سے لوگوں کی صحت میں ترقی ہوگی اور ان کی بیماریوں سے بچنے کی قوت بڑھ جائے گی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلے گا کہ ملک کی پیداوار اور صرف دولت میں بہتر تناسب قائم ہوجائے گا۔

غذا کا مزیدار ہونا ضروری ہے۔ انسان کے خیال کا ہاضمہ کے فعل پر بہت اثر پڑتا ہے۔ اور یہ عام تجربہ ہے کہ بد مزہ کھانا جس سے طبیعت اکتا جائے دیر میں ہضم ہوتا ہے۔ بہ خلاف اس کے خوشگوار اور مزیدار کھانا جو خوبصورت برتنوں میں عمدہ طریقہ سے سجا کر سامنے رکھا گیا ہو آسانی سے ہضم ہوجاتا ہے۔ اور جز و بدن ہوکر فائدہ بخشتا ہے طبیعت کا غم و غصہ یا فکر افکار سے خالی ہونا بھی غذا کو جلد ہضم کرنے اور جز و بدن بنانے میں بڑی مدد دیتا ہے۔

ہماری غذا کے حسب ذیل اجزا ہیں ۔
(۱) پروٹین (۲) کاربوھائیڈریٹس (۳) چربیاں
(۴) نمک (۵) پانی (٦) آکسیجن (۷) حیاتین

جسم کے بافتوں کے نمو کے لئے پروٹین کی سخت ضرورت ہے کیونکہ اس کے ذریعہ جسم کو نائٹروجن اور گندک مہیا ہوتی ہے ۔ نائٹروجن یوریا اور دوسرے مرکبات کی شکل میں روزانہ خارج ہوتی رہتی ہے ۔ اور اس خارج شدہ نائٹروجن کی تلافی کے لئے پروٹین کا استعمال ضروری ہے ۔ پروٹین کی زیادہ مقدار گوشت، دودہ اور انڈے میں ہوتی ہے اس کے علاوہ بعض نباتی اشیا مثلاً مٹر اور پھلیوں میں بھی اس کی کافی مقدار موجود رہتی ہے ۔ آلو اور آٹے میں بھی اس کی کچھہ مقدار موجود ہوتی ہے ۔

جب تک جسم میں کاربوھائیڈریٹس کا مکمل احتراق نہ ہو اس وقت تک چربیوں کا احتراق مکمل نہیں ہوتا ۔ کاربو ھائیڈ ریٹس جسم میں تحلیل ہوکر کاربن ڈائی اکسائیڈ اور پانی میں تبدیل ہوجاتے ہیں اگر جسم میں کاربوھائیڈریٹس کا احتراق کم ہو تو چربیوں کی تکسید مکمل نہیں ہوتی ۔ کاربوھائیڈ ریٹس چاول اور ٹماٹوں میں زیادہ مقدار میں ہوتے ہیں ۔

چربیاں آنتوں میں تقریباً مکمل طور پر جذب ہوجاتی ہیں چربیوں کا انجذاب، غذا استعمال کرنے کے پانچ یا چھہ گھنٹوں کے بعد عمل میں آتا ہے ۔ اگر غذا میں چربی نہ ہو تو وہ بہت جلد جذب ہوجاتی ہے اور کھانے کے کچھہ دیر بعد ہی بھوک محسوس ہونے لگتی ہے ۔ چربی سے حرارت خارج ہوتی ہے ۔ یہ جسم میں بطور ذخیرہ جمع رہتی ہے ۔

معمولی غذا میں مختلف قسم کے نمک ہیں ۔ اگر ان نمکوں کی مقدار کم ہو تو صحت میں خرابی پیدا ہوتی ہے ۔ کیلسیم کے باعث ھڈیوں میں سختی قائم رہتی ہے ۔ غذا میں معمولی نمک (سوڈیم کلورائیڈ) کی سب سے زیادہ مقدار ہونی ہے جس سے نہ صرف ذائقہ بہتر ہوجاتا ہے بلکہ جسم کی ضرورت بھی پوری ہوجاتی ہے ۔ اس کے علاوہ فاسفورس، لوھا گندک ہر ایک اپنا اپنا فعل انجام دیتا ہے ۔ ان کو ہم اکثر ترکاریوں سے حاصل کرتے ہیں ۔

جو پانی جسم سے پسینہ وغیرہ کے ذریعہ خارج ہوتا ہے اس کی تلافی ضروری ہے ۔ جسم کا بیشتر حصہ پانی سے بنا ہوا ہے ۔ پانی غذائی نالی میں غذائی اشیا کو حل بھی کرتا ہے اور جب تک غذائی اشیا محلول کی شکل میں نہ ہوں آنتوں میں جذب نہیں ہوتیں ۔ جسم کو کاربوھائیڈریٹس اور چربیوں کی تکسید سے بھی پانی حاصل ہوتا ہے ۔

آکسیجن زندگی کے لئے ضروری ہے ۔ ہوا، سانس لینے سے پھیپھڑوں کے ذریعہ جسم میں داخل ہوتی ہے ۔ اس میں صرف آکسیجن ہی ایسی گیس ہے جو کیمیائی ترکیب میں حصہ لیتی ہے ۔ خون آکسیجن کو جذب کرتا ہے ۔ جس سے ھیموگلوبن، آکسی ھیموگلوبن میں تبدیل ہوجاتا ہے ۔ آکسیجن غذا کے ساتھہ مل کر اس کو آکسائیڈس میں تبدیل کردیتی ہے ۔ غذا چونکہ زیادہ تر کاربن پر مشتمل ہوتی ہے

اس لئیے کاربن ڈائی آکسائیڈ پیدا ہوتی ہے۔ سانس جو باہر چھوڑی جاتی ہے اسی میں کاربن ڈائی آکسائیڈ اور آبی بخارات ہوتے ہیں۔ آبی بخارات کسی ایک صاف شیشے کی سطح پر سانس چھوڑنے سے نمایاں ہوسکتے ہیں۔ چونے کے پانی میں کچھ دیر تک پھونکنے سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہے۔

ان مرکبات کے علاوہ غذا میں دوسری نہایت اہم چیزیں بھی موجود ہیں جو صحت کے برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہیں۔ سنه ۱۹۰۶ع سے سنه ۱۹۱۲ع تک کیمبرج میں یف۔ جی ہاپکنس نے مختلف تجربے کئے اور معلوم کیا کہ جن چوہوں کو ایسی مصنوعی غذا پر جن میں جملہ پروٹینی اجزا چربی، کاربو ہائیڈریٹ، نمک وغیرہ تھے پالنے کی کوشش کی گئی ان کا وزن کم ہوگیا اور وہ بالآخر مرگئے۔ برخلاف اس کے وہ چوہے جن کی غذا میں تازہ دودھ کے چند قطرے شامل کردئے جاتے تھے تندرست رہے۔ ہاپکنس نے اس امر پر غور کرنا شروع کیا کہ تازہ دودھ میں ضرور کوئی ایسی شے موجود ہے جو اس فرق کا باعث ہے۔ قدیم زمانے میں جب سفر مہینوں تک جاری رہتا تھا مسافروں میں بعض امراض پھوٹ پڑتے تھے۔ ان میں اسکر بوط اور بیری بیری بہت مشہور امراض ہیں۔ تازہ میوہ استعمال کرنے سے یہ امراض نہیں پھیلتے تھے۔ اس سلسلہ میں تجربے کرنے پر عجیب و غریب چیزوں کا پتہ چلا جو خاص خاص اغذیہ میں رہتی ہیں اور جو زندگی قائم رکھنے کے لئیے ضروری ہیں۔

ان کو حیاتین (وٹامنس) کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ویٹا، زندگی کو کہتے ہیں۔

ابتداء جب حیاتین کے متعلق تحقیق جاری تھی تو علم کی کمی کی وجہہ سے ان کو نام دینا مشکل تھا۔ مختلف حیاتیں کو ان کے مختلف افعال کی بنا پر مختلف نام دئے جاتے تھے۔ لیکن بعد کو ان کے نام بطریق ابجد الف، ب، ج، د اور ہ وغیرہ رکھے گئے۔

حیاتین الف کا ماخذ پودے ہیں اور کلوروفل ان کا افراز کرتا ہے۔ جب جانور ان پودوں کو کھاتے ہیں تو یہ چربی میں حل ہو کر جگر میں جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ حیاتین دودھ، مکھن، مچھلی کا تیل، انڈے کی زردی اور دوسری نباتی غذاؤں میں پائی جاتی ہے۔ گرم کرنے سے حیاتین الف کی تکسیہ ہوتی ہے۔ دودھ کو ابال دینے سے یہ ضائع ہو جاتی ہیں۔ حیاتین الف جانوروں کی بالیدگی قائم رکھتی ہے۔ اس کی کمی سے جانور ٹھٹھر جاتا ہے۔ اور وزن گھٹنے لگتا ہے۔ جسم میں اس کے مفقود ہونے سے جانور جراثیم کا با آسانی شکار ہو جاتا ہے۔ آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں اور جلنے لگتی ہیں۔ بالآخر بصارت جاتی رہتی ہے۔ اور جانور کی تولید میں بھی فرق رونما ہوتا ہے۔

حیاتین الف کثیر مقدار میں مچھلی کے تیل اور بکرے کی کلیجی میں موجود ہوتا ہے۔ متوسط مقدار میں مکھن، بالائی چربی، مکئی گیہوں، مٹر، گاجر، پالک، موز، انناس، بیر، ٹماٹو دودھ اور انڈے کی زردی میں موجود ہے۔ لیکن مسور، اخروٹ، پھول گوبی، آلو کھجور،

انجیر ، لیموں پیاز ، مولی میں کم مقدار میں موجود ہے ۔

حیاتیں ب ، ایک پیچیدہ شے ہے جو دو اجزا پر مشتمل ہے ۔ حیاتین ب۱ بیج کے بیرونی پرت میں ہوتی ہے ۔ چاول کا بھوسہ نکالنے سے اس کے ساتھ حیاتین ب بھی نکل جاتی ہے اور بعد میں کچھ بچا ہوا حصہ بھی پانی میں حل ہو جاتا ہے یہ ہضم کرنے کی قوت کو بڑھاتی ہے اور ہضمی نظام کے افعال کو بحال رکھنے میں مدد دیتی ہے ۔ حیاتین ب کی غیر موجودگی سے بیری بیری و غیرہ کے امراض پیدا ہوتے ہیں ۔ حیاتین ب ۱ اور ب ۲ دونوں کا اثر بالیدگی پر ہوتا ہے ۔ حیاتین ب ۱ کثیر مقدار میں جوار مکئی میں موجود ہوتی ہے ۔ سیم ، مسور ، مٹر اور گوشت میں متوسط مقدار لیکن کم مقدار میں بادام پالک ، شلجم ، سیب ، آم ، موز ، ٹماٹو اور انڈے میں میں پائی جاتی ہے ۔

حیاتیں ب ۲ ان ہی اشیا میں پائی جاتی ہے جن میں ب۱ ہوتی ہے ۔ لیکن یہ ب۱ سے علحدہ ہے کیونکہ ب ۲ الکوہل میں حل نہیں ہوتی لیکن ب۱ بہ آسانی حل ہوجاتی ہے ۔ انڈے کی سفیدی اور خمیر میں ب۲ کی زیادہ مقدار ہوتی ہے اس کی کمی سے آنکھوں میں جلن محسوس ہوتی ہے ۔ ہاضمہ خراب ہوجاتا ہے ۔ اور انسان نحیف و لاغر ہوجاتا ہے ۔ ان کے علاوہ دماغ کمزور ہوکر نسیان یعنے بھول اور دوسری اعصابی کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں ۔ اس کی متوسط مقدار گیہوں ، مٹر ، پالک ، گوشت اور انڈے میں ہوتی ہے لیکن کم مقدار مکئی ، جوار ، پیاز ، آلو ، سیب ، آم ، موز اور ٹماٹوں میں موجود ہے ۔

حیاتین ج پانی میں حل پذیر ہے ۔ سبز ترکاریوں اور تازہ میووں میں پائی جاتی ہے ۔ اس کی کمی سے اسکر بوط اور بیری بیری کے امراض پھیلتے ہیں ۔ گزشتہ جنگ میں انگریزی فوج عراق میں چند ماہ تک ٹھہری رہی ۔ اس عرصہ میں سپاہی اسکربوط کے مرض میں مبتلا ہوے اور اس کے ساتھ بیری بیری کا مرض بھی پھیل گیا ۔ بیری بیری کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ ہندوستانی فوج چاول کی پیچ استعمال کرتی تھی اور گوروں کو مصفا چاول دئے جاتے تھے ۔ جن میں حیاتین ج موجود نہیں ہوتی تھی ۔ یہ حیاتین ہڈیوں اور دانتوں کے نشوونما میں بھی نمایاں حصہ لیتی ہے ۔ اور دانتوں کو جلد ضائع ہونے سے روکتی ہے اس کی کمی سے جوڑوں کا درد ہوتا ہے ۔ حیاتین ج خشک میوے میں نہیں پائی جاتی اور گرم کرنے اور خشک کرنے سے بہت جلد تباہ ہوجاتی ہے ۔ متوسط مقدار میں ، پیاز ، آلو ، مولی ، شلجم ، سیب ، موز ، انناس میں موجود ہے لیکن کم مقدار میں بالائی ، مسور ، ناشپاتی ، شہد اور دودھ میں موجود ہے ۔

حیاتیں د نہایت اہم حیاتین ہے ۔ اس حیاتین کی کمی سے ہڈیاں ٹیڑھی ہوجاتی ہیں اس کے علاوہ قوت ہاضمہ میں بھی فرق آجاتا ہے ۔ حیاتیں د مچھلی کے تیل ، انڈے کی زردی ، مکھن اور دودھ میں ہوتی ہے ۔ اس کی کمی سے دانت بہت جلد خراب ہوجاتے ہیں ۔ جسم پر بالائی بنفشئی شعاعیں ڈالنے سے حیاتین د پیدا ہوتی ہے ۔

چربی، زیتون کے تیل، پالک میں کم مقدار میں ہوتی ہے۔

حیاتین ھ چربیوں میں حل پذیر ہے۔ اس کا ماخذ نباتات ہے ڈاکٹر ھربوٹ اور ایم ربودانس نے یہ ثابت کردیا ہے کہ اگر چوھوں کو یہ حیاتین میسر نہ آئے تو ان میں بانجپن پیدا ھوجاتا ہے۔ یہ حیاتین، متوسط مقدار میں مکھن، خوبانی، گائے گوشت کلیجی اور انڈے کی زردی میں پائی جاتی ہے۔ زیتون کے تیل، چاول اور دودہ میں کم مقدار میں موجود ہے۔

غذا کے مختلف حصوں سے ظاھر ہے کہ ھر ایک جز کس قدر اھمیت رکھتی ہے۔ ھماری غذا میں ھر ایک کی موجودگی ضروری ہے۔ ایسی ھی غذا صحت کو برقرار رکھتی اور کارکردگی میں نمایاں حصہ لیتی ہے۔ صحت کو برقرار رکھنے کے لئے اگر ایک طرف مناسب لباس اور مکان کی ضرورت ہے تو دوسری طرف غذا کا مسئلہ نہایت اھمیت رکھتا ہے۔

صحت اور قوت کارکردگی کو بڑھانے یا برقرار رکھنے کے لئے متوازن قسم کی غذا کا استعمال ضروری ہے۔ "متوازن غذا" سے روزمرہ کی وہ مستعملہ غذا مراد ہے جس میں صحت اور قوت کارکردگی کو بڑھانے یا برقرار رکھنے والے جملہ اجزا ایک موزوں تناسب میں پائے جائیں۔

سوال و جواب

سوال - "آله نور پیما" کی نسبت میرے سوال کا جواب رساله سائنس کے مارچ سنه ۴۳ع نمبر میں طبع هوا هے، بهت بهت شکریه - جواب غیر تشفی بخش هے - مهربانی فرما کر اس کی پوری ساخت سے آگاه فرمائیں تا که آله مذکور بنایا جا سکے - یا اس کی نسبت کسی کتاب کا حواله دیں جس سے مقصد حاصل هو سکے -

محمد سعید مسلم صاحب - کلکته

جواب - افسوس هے که جواب سے آپ کی تشفی نه هو سکی - آپ نے یه دریافت فرمایا تها که نور پیما کس اصول پر کام کرتا هے - جواب میں بتایا گیا تها که اس اصول کو نور برقی اصول کہتے هیں - بعض دهاتوں میں یه خصوصیت هوتی هے که جب ان پر نور کی شعاعیں پڑتی هیں تو ان سے برقیے نکلنا شروع هوتے هیں - روشنی جس قدر تیز هوتی هے اس لحاظ سے برقیوں کی تعداد بهی زیاده هوتی هے - اسی اصول کو کام میں لا کر نور سی کا آله بنایا جاتا هے - اس میں ایک سوئی لگی هوتی هے جو برقی رو سے متاثر هوتی هے جب رو زیاده قوت کی هوتی هے تو سوئی زیاده حرکت کرتی هے، کم قوت کی هوتی هے تو کم - اس آلے کے متعلق کچهه تفصیلات بهی دی گئی تهیں - خیال تها که آپ اتنا هی جاننا چاهتے هیں لیکن اب معلوم هوتا هے که آپ کو نور برق خانون پر ایک مستقل مضمون کی ضرورت هے - ظاهر هے که سوال و جواب کے باب میں مستقل مضامین کی گنجائش نهیں هے -

نور برقی خانون کے متعلق اگر آپ مزید معلومات حاصل کرنا چاهتے هیں تو پهر طبیعیات کی بڑی اور مستند کتاب میں نور برقی اثر (Photo electric effect) کا باب ملاحظه فرمائیے - اس کے علاوه انسائکلوپیڈیا بریٹانیکا میں بهی یه عنوان آپ کی معلومات میں کافی اضافه کرے گا - دی بک آف پاپولر سائنس (The Book of Populer Science) (ایڈیر ڈی ایس کیمبال - ناشر گرولیر سوسائٹی نیو یارک) کی چوتهی جلد میں نور برقی خانون پر ایک مضمون

ہے اسے ملاحظہ فرمائیے۔ ہمیں امید ہے کہ ان مضامین سے آپ کی معلومات میں کافی اضافہ ہوگا۔

جہاں تک بنانے کا تعلق ہے ہمارا خیال ہے کہ اس کو تیار کرنا مشکل ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ گو ان کا اصول زیادہ مشکل نہیں ہوتا لیکن ان کا بنانا بغیر موزون کارخانے کے مشکل ہوتا ہے۔ پھر بھی ہم آپ کی ہمت شکنی کرنا نہیں چاہتے۔ آپ پہلے ان مضامین کو ملاحظہ فرمالیجئے پھر بھی کوئی چیز رہ جائے تو ہمیں مطلع فرمائیے۔ ہم خدمت کے لئے حاضر ہیں۔

سوال - ماہ فروری کے رسالے کے صفحہ ۱۰۰ پر آپ نے سیارون کے متعلق لکھا ہے کہ ”آفتاب کے ڈوبنے کے بعد مشرق کی طرف نظر ڈالئے تو مشتری چمکتا نظر آئیگا .... سر کے اوپر آسمان پر نظر ڈالئے تو زحل دکھائی دیگا ...... زہرہ اور مریخ آج کل صبح کو نظر آتے ہیں“ ۔ پھر آسمان کی سیر کے تحت لکھا گیا ہے ”عطارد اور مریخ صبح کے ستارے ہیں ، زہرہ شام کا ستارہ ہے .... مشتری ۷ بجے شام کو نصف النہار پر ہوگا .... زحل اور یورینس برج ثور میں ہونگے“ براہ کرام اس اختلاف سے بیانی کی تصحیح فرمائیے۔

احمد انور کمال صاحب - وقار آباد دکن

جواب - آپ نے بڑا کرم فرمایا کہ ہمیں اس غلطی سے آگاہ کردیا۔ فروری کے رسالے میں جو غلطی ہے وہ یہ ہے کہ عطارد کی جگہ زہرہ چھپ گیا ہے اور زہرہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی غلطی نہیں ہے۔ لیکن اس غلطی کی اصلاح بھی کردی جائے تو بظاہر مضمون میں اختلاف باقی رہ جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ سوال و جواب کے باب میں مشتری کے متعلق لکھا گیا ہے کہ شام کو مشرق کی طرف دیکھنے سے نظر آتا ہے اور زحل کو سر کے اوپر یعنی نصف النہار پر بتایا گیا ہے۔ اس کے برخلاف آسمان کی سیر میں مشتری کو نصف النہار پر اور زحل کو مغرب کی طرف مائل بتایا گیا ہے۔

بات یہ ہے کہ سوال جواب رسالہ شائع ہونے سے بہت پہلے لکھا جاتا ہے۔ اور آسمان کی سیر کا مضمون رسالہ چھپنے کے ایک مہینے بعد کا ہوتا ہے مثلاً فروری کے مضمون میں جو آسمان کی سیر ہے وہ مارچ کے لئے ہے۔ اس طرح سوال و جواب کے مضمون اور آسمان کی سیر کے مضمون میں دو تین مہینے کا فرق ہوگیا۔ اس عرصے میں سیارون کی جگہ بدل گئی اور یہی سبب اختلاف بیان کا ہوا۔ امید ہے کہ اس کو آپ سمجھ گئے ہونگے۔

سوال - سنا ہے کہ پائین سرخ (Infra Red) شعاعون کے ذریعے رات کو اندھیرے میں تصویر لی جاسکتی ہے۔ یہ بیان کہاں تک صحیح ہے۔ جب روشنی نہیں تو تصویر کس طرح آسکتی ہے۔

احمد بیگ صاحب - حیدرآباد دکن

جواب - ہاں آپ کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ روشنی نہیں تو تصویر بھی نہیں لی جاسکتی - لیکن پائین سرخ شعاع خود روشنی کی شعاع ہے کو ہماری آنکھیں اس کو دیکھہ نہیں سکتیں لیکن کیمرے کے آنکھہ ہم سے زیادہ تیز اور اس کی فلم یا پلیٹ ہماری آنکھوں کے پردے سے زیادہ حساس ہوتی ہے - یہی سبب ہے جو شعاع ہماری آنکھوں پر اثر نہیں کرتی وہ کیمرے پر اثر کر جاتی ہے اور اس سے تصویریں لی جاسکتی ہیں -

لیکن اس بیان کو آگے بڑھانے سے پہلے مناسب ہوگا کہ آپ پہلے یہ سمجھہ لیں کہ پائین سرخ شعاع کیا چیز ہے اور اس کو پائین سرخ کیوں کہا جاتا ہے - یہ تو آپ جانتے ہونگے کہ سورج کی روشنی جو بظاہر سفید معلوم ہوتی ہے دراصل سات رنگوں کا مجموعہ ہے - اگر سورج کی روشنی کو کسی منشور (Prism) سے گزارا جائے تو سامنے دیوار یا پردے پر سات رنگوں کی ایک پٹی نظر آئے گی - جس کو سائنس کی زبان میں طیف کہتے ہیں - طیف میں ایک طرف سرخ اس کے بعد نارنجی ، پھر پیلا ، پھر سبز آسمانی ، پھر بنفشئی ہوتا ہے -

پہلے لوگ سمجھا کرتے تھے کہ سورج کی روشنی میں بس اتنے ہی رنگ ہیں - لیکن ایک روز اتفاقاً سر ولیم ہرشل نے سرخ رنگ کے بازو میں جہاں پر کوئی روشنی پڑ نہیں رہی تھی ایک تپش پیما رکھا - تعجب انگیز بات یہ واقع ہوئی که تپش پیما کی حرارت بڑھنے لگی - جس سے ثابت ہوا کہ کو سرخ کے بعد روشنی کی کوئی شعاع نظر نہیں آتی ہے - لیکن شعاع موجود ضرور ہے کیونکہ اس کے اثر سے پارہ اوپر چڑھ رہا ہے یعنی یہ بات معلوم ہوئی کہ اس شعاع میں خصوصیت کے ساتھہ حرارتی اثرات زیادہ ہیں - اس شعاع کا نام پائین سرخ شعاع رکھا گیا - اس طرح بنفشئی رنگ کے بازو میں فوٹوگرافی کا ایک کاغذ رکھا گیا تو وہ سیاہ پڑگیا - جس سے معلوم ہوا کہ یہاں پر بھی کوئی شعاع پڑ رہی ہے - جو آنکھہ سے نظر نہیں آتی لیکن فوٹوگرافی کے کاغذ پر اسی طرح اثر کرتی ہے جس طرح معمولی روشنی کی شعاع اس شعاع کا نام بالائے بنفشئی (Ultra Violet) شعاع رکھا گیا -

ان تجربوں سے معلوم ہوا کہ سورج کے طیف میں دراصل بہت سی شعاعیں مگر انسانی آنکھہ کی صلاحیت بہت محدود ہے وہ سرخ سے لانبی طول موج کی یا بنفشئی سے چھوٹی طول موج کی شعاع کو نہیں دیکھہ سکتی - یہ شعاعیں آنکھوں پر پڑتی ضرور ہیں لیکن ان کا اثر کچھہ نہیں ہوتا آنکھہ کے لئے ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے -

انسانی آنکھہ ان کے لئے بیکار ضرورت ہے لیکن کیمرے کی آنکھہ انسانی آنکھہ سے زیادہ تیز ہوتی ہے اور فوٹو کی پلیٹس یا فلم ان دونوں شعاعوں کے اثر کو قبول کرسکتی ہیں - اور ان کے ذریعہ تصویریں لی جاسکتی ہیں -

اگر ہماری آنکھوں میں ایسی قوت آجائے کہ ہم پائیں سرخ شعاعوں کو دیکھ سکیں تو پھر عجیب و غریب تماشہ نظر آئے۔ اندھیری رات میں گرم پانی کا ایک لوٹا ہمارے لئے وہ کام دے جو روشنی کا ایک لیمپ دے سکتا ھے وجہ اس کی یہ ھے کہ جو چیز گرم ہوتی ھے اس سے کثرت کے ساتھ پائین سرخ شعاعیں نکلتی رھتی ہیں۔ اگر آپ کسی چیز کو گرم کرنا شروع کریں تو پہلے اس سے حرارتی شعاعیں مثلاً پائیں سرخ شعاعیں نکلنا شروع ہونگی آپ اس کی حرارت کو محسوس کر سکینگے لیکن وہ شعاعیں نظر نہ آئینگی۔ اور زیادہ گرم کیجئے۔ تو وہ چیز سرخ ہوجائیگی۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اب اس میں پائیں سرخ کے ساتھ ساتھ سرخ شعاع بھی نکلنا شروع ہوئی۔ سرخ شعاع آنکھ کو نظر آتی ھے اس لئے ہمیں وہ چیز سرخ دکھائی دیگی۔ جیسے جیسے آپ اس چیز کو گرم کرتے جائینگے ویسے ویسے دوسری شعاعوں کا اضافہ ہوتا جائیگا۔ سرخ کے ساتھ نیلی پھر آسمانی پھر سبز پھر پیلی وغیرہ ملینگی۔ یہاں تک کہ ساتوں شعاعیں نکلنے لگینگی اور وہ چیز سفید ہو کر چمکنے لگے گی۔

کسی چیز کو سفید رنگ سے دھکانے کے لئے تو کافی حرارت کی ضرورت ہوتی ھے لیکن معمولی پائیں سرخ شعاع کے لئے تھوڑی حرارت بھی کافی ھے۔ کسی چیز کا گرم محسوس ہونا ھی اس بات کی علامت ھے کہ اس سے پائیں سرخ شعاعیں نکل رھی ہیں۔

اندھیرے کمرے میں کوئی گرم چیز آپ کے سامنے رکھ دی جائے اور کیمرے میں ایک پائیں سرخ سے متاثر ہونے والی پلیٹ ڈال کر آئینے کے سامنے رکھ دیا جائے تو آپ کی تصویر آجائیگی۔ تصویر میں وہ گرم چیز ایسی نظر آئیگی جیسی کہ کوئی روشن چیز ہوتی ھے۔

اس کام کے لئے خاص قسم کی پلیٹیں بنائی جاتی ہیں۔ ان پر پائیں سرخ شعاعوں کا خاص اثر ہوتا ھے۔ دن کے وقت ان پلیٹوں سے جب تصویر لی جاتی ھے تو ایک حیرت انگیز نقشہ دیکھنے والوں کے سامنے آتا ھے۔ تصویر میں بارہ پندرہ میل کے مناظر ایسے نظر آتے ہیں جیسے کہ سامنے موجود ہیں اور گرد و غبار اور بادل یا کہر وغیرہ کا نام تصویر میں نہیں رھتا۔ گو تصویر لیتے وقت فضا میں کتنا ھی گرد وغبار کیوں نہ ہو۔

پائیں سرخ میں سب سے بڑا کمال یہی ھے کہ اس پر بادل یا کہر یا گرد وغبار کا اثر نہیں ہوتا۔ آپ کے سامنے کہرے سے کہرا کہر کیوں نہ ہو اگر آپ اسی شعاع سے تصویر لینگے تو کہر کے اس پار کی چیز صاف تصویر میں آجائیگی۔ آجکل اس کا سب سے بڑا کام یہی ھے کہ دور دور کی چیزوں کی تصویر اس سے لی جاتی ھے۔ جو چیزیں معمولی آنکھ نہیں دیکھ سکتیں یہ دکھائی دیتی ھے۔

سوال۔ میرے ایک عزیز دوست بد قسمتی سے کوتاہ قامت اور بد شکل واقع ہوئے ہیں۔ ان کا بیان ھے کہ انہوں نے اپنے قد کو بڑھانے کی کوشش کی اور دو انچ کے اضافے تک میں کامیاب

ھوئے۔ لیکن افسوس ھے کہ چہرے کی بد صورتی میں کمی نہ ھوسکی ۔ کیا آپ مجھے براہ کرم بالتفصیل بتا سکتے ھین کہ عصر جدید کی سائنس میں ایسی ایجادات ھوتی ھیں جن سے بد ھیئتی اور کوتاہ قامتی کو بدلا سکے۔
میں نے اکثر اخبارون مین پڑھا ھے کہ یورپ میں بیوٹی ٹریٹمنٹ کا علاج ھوتا ھے۔ مہربانی فرماکر ان دواخانون کے پتے اور مصارف سے مطلع فرمائیے تاکہ میں اپنے دوست کے لئے کچھ سبیل کرنے کی کوشش کرون۔

محمد عبدالقوی صاحب

محمد پور ۔ ضلع نظام آباد دکن

جواب۔ کوتاہ قامتی کا تو پتہ چل گیا لیکن کاش کہ آپ اپنے دوست کی تصویر بھی بھیج دیتے تاکہ ھمین ان کی بد صورتی کا صحیح اندازہ ھوسکتا۔ ویسے بغیر دیکھے ھوئے کچھ کہنا بہت مشکل ھے۔ آخر آپ کے دوست میں کیا عیب ھے ۔ کیا ناک چپٹی ھے ؟ کیا کان بڑے ھین ؟ کیا ھونٹ موٹے اور آگے کو نکلے ھوئے ھین ؟ کیا رنگ خراب ھے۔ بات کیا ھے۔ جو آپ لوگون کو اور خود ان کو اس قدر پریشانی ھے۔

بد صورت ھونا کچھ جرم نہیں ھے۔ اور مرد کے لئے خاص طور پر یہ ایسی چیز نہیں ھے کہ اسکے غم میں نڈھال رھا جائے۔ یا پھر شہر شہر اور دوکان دوکان افزائش حسن کی تلاش کی جائے اور قد کو بڑھانے کی سوترکیبین ڈھونڈھی جائیں۔ اگر ھم آپ کے دوست کی جگہ ھوتے تو نہایت اطمینان کے ساتھ اسی چہرے کو لئے ھوئے بازارون اور سڑکون پر گھومتے اور ذرہ برابر غم نہ کھاتے۔

آپ کہہ سکتے ھین کہ آپ کا رسالہ سائنس کا ھے بجائے اخلاقیات پر لکچر دینے کے مناسب یہ ھوگا کہ سوال کا جواب دیجئے۔ اگر آپ ایسا کہیں گے تو ھمین رنج ھوگا۔ ھم یہ ماننے کو تیار نہیں ھین کہ سائنس والون کو دل نہیں ھوتا۔ اور انہین اس کا حق نہین پہونچتا کہ دو جملے نصیحت کے ادھر ادھر بول سکین۔

بہر حال جواب دینا چونکہ ضروری ھے اس لئے عرض ھے کہ جدید زمانے میں جراحی نے اس قدر ترقی کی ھے کہ چہرہ بدلا جاسکتا ھے۔ چپٹی ناک کی جگہ لانبی اور خوبصورت ناک لگائی جاسکتی ھے۔ بڑے کان چھوٹے کئے جاسکتے ھیں۔ ھونٹون کو پتلا اور دھانے کو کم کیا جاسکتا ھے جراحی کے اس کمال کے لئے بھی جنگ کو دعا دینی چاھئے۔ جنگ کے سبب ھزارون لاکھون انسانون کے اعضا بری طرح زخمی اور مجروح ھوجاتے ھیں۔ چہرہ اس بری طرح کٹتا ھے اور ٹکڑے ٹکڑے ھوجاتا ھے کہ اگر زخمی اچھا بھی ھوجائے تو وہ عوام کے سامنے جانے کے لائق نہ رھے۔ جدید جراحی ان کے لئے رحمت کا پیام لیکر آئی ھے۔ ھوشیار سرجن متعدد نشتر دے کر اور پیوندکاری کر کے چہرے میں ایسی تبدیلی کر دیتا ھے کہ۔ زخم بھر جاتے ھیں۔ گوشت مل

جاتا ہے ۔ اور بعض صورتوں میں عمل جراحی کا نشان تک نہیں رہتا ۔ مریض جب اسپتال سے باہر نکلتا ہے تو خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ آج سے وہ بیس سال پہلے زخمی نہ ہوا کیونکہ اس زمانے میں اس کے زخموں کا علاج ہو سکتا تھا ۔ لیکن گوشت کی کمی کو پورا کرنا ، زخموں کے داغ دھبوں کو دور کرنا اور غائب شدہ اعضا کو از سر نو لگانا ڈاکٹروں کے بس کی بات نہ تھی ۔ یہ کام آج کل کا ہی ڈاکٹر کر سکتا ہے ۔

اس گفتگو سے آپ کو اندازہ ہوا ہوگا اس قسم کی جراحی در اصل جنگ کے زخمیوں پر زیادہ کامیابی کے ساتھ کی گئی ۔ اس کے بعد یہ چیز آہستہ آہستہ ہر جگہ پھیل گئی ہے ۔ زخمی جنگ کے سبب ہو یا کسی دوسرے حادثے کے سبب سب کا علاج ہوتا ہے ۔

ظاہر ہے کہ یہ علاج مجبوری کا علاج ہے حادثے کے بعد اس قسم کا علاج ضروری ہو جاتا ہے ۔ لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو پولیس اور قانون کے ڈر سے اپنا چہرہ بدلوا لیتے ہیں ۔ امریکہ کے بدمعاشوں کا قصہ پڑھئے تو اس قسم کے واقعات اکثر ملینگے ۔

ایک بات یہاں پر اور بتادینی ضروری ہے کہ اس تبدیلی سے چہرہ تو یقیناً بدل جاتا ہے لیکن اس میں قدرتی خوبصورتی بھی آجاتی ہے یا نہیں یہ بالکل مریض کے پہلے چہرے اور ڈاکٹر کی ہوشیاری پر منحصر ہے ۔ اور سچ پوچھئے تو اس زحمت میں وہی لوگ پڑتے ہیں جن کو اس کے بغیر چارہ نہیں ہے ۔

یہ علاج زیادہ تر کامیابی کے ساتھ یورپ اور امریکہ میں ہوتا ہے ۔ بد قسمتی سے ہمارے پاس اس وقت اس قسم کے افزائش حسن کے اداروں کا پتہ نہیں ہے کیونکہ آپ کا اس قسم کا پہلا سوال ہے ۔ ہمیں اب تک صحیح طور پر اس کا اندازہ ہی نہیں ملا کہ کن سوالات کا جواب دینا ہے ورنہ اس کا سامان پہلے سے کر رکھتے ۔ اخراجات کا معمول تخمینہ پر سمجھئے کہ یورپ یا امریکہ آنے کا خرچ اور پھر آپریشن کے لئے کم از کم پچاس ساٹھ ہزار روپیے کوئی ایک لاکھ کے اندر علاج ہو جائے گا ۔

کیا آپ اپنے دوست کے لئے اتنا خرچ برداشت کر سکینگے؟ یا اگر آپ نے برداشت بھی کر لیا تو اس کا حاصل کیا ہوگا ۔ مان لیجئے کہ چہرہ درست بھی ہوگیا تو صرف یہی ہوگا انہیں تھوڑی سی تسکین حاصل ہوجائے گی ۔ اندر سبھا کی پریاں تو ان کے سامنے سجدہ کرنے سے رہیں ۔ کیونکہ بہت ہوا تو چہرہ پہلے سے کچھ ٹھیک ہوجائیگا ۔ حسن یوسف اس میں آنے سے رہا ۔ ہماری رائے اگر آپ مانیں تو بجائے علاج کرانے کے ان کو روپیے ہی دے ڈالئے تاکہ آرام و چین کی زندگی گزاریں ۔ مگر آپ کے دوست کو چاہئے کہ اپنے چہرے کا خیال چھوڑ دیں ۔ آئینہ دیکھنا ترک کر دیں ۔ نہ دیکھینگے

نه خیال آئیگا۔ اور اگر کبھی غلطی سے خیال بھی اجائے تو یا قسمت کبھه یا نصیب کر خاموش بیٹھه جائین۔

یہان تک تو چہرے کے متعلق ہوا اب رہا قد کا سوال آپ نے یہ نہین لکھا که آپ کے دوست کا قد کتنا ہے۔ دو انچ تو وہ بڑھ ہی چکے اب آگے کہان تک پہونچنے کا ارادہ ہے۔ کچھه معلوم ہو تو اسی حساب سے جواب دیا جائے۔ بہتر ہوگا که اس کے متعلق وہ ویلکم روس بی ایم / ہائیٹ لندن ڈبلیو سی کو لکھین امید ہے که تین چار انچون کا اضافه ہو جائیگا۔

(ل ۔ ح)

ہوائی جہازوں کی صنعت میں تازہ ترین اصلاحیں

مستند اطلاعیں مظہر ہیں کہ روسیوں اور برطانویوں دونوں نے پلائی وڈ (امریکن تختہ یا ایک قسم کی پرت دار لکڑی) کے ڈھانچے کے لڑاکو ہوائی جہاز بنائے اور استعمال کئے ہیں ایک مدت سے اطالوی بھی میڈیٹرینین میں استعمال کرنے کے لئے دو موٹر اور تین موٹر والے پلائی وڈ کے ڈھانچے کے بمبار ہوائی جہاز کام میں لا رہے ہیں۔

ممالک متحدہ (امریکہ) میں فوجی حکام اعلیٰ نے تربیتی اغراض کے لئے لکڑی کے ہوائی جہازوں سے کام لیا ہے۔ حال ہی میں کرٹس رائٹ نے فوجوں کے لئے ۵ ٹن کے باربردار ہوائی جہاز بھی پہلی پہل پلائی وڈ سے تیار کرنا شروع کئے ہیں۔

"چند منافع"

فوج اور سامان لے جانے والے جہازوں کی تمام قسموں میں لکڑی اچھا کام دے سکتی ہے ایسے جہازوں کو تمام دھات سے بنے ہوئے جہازوں پر چند وجوہ ترجیح حاصل ہیں۔

ہوائی جہازوں میں جو دھات مستعمل ہے لکڑی اس کے مقابلہ میں دیر سے اور زیادہ آہستگی کے ساتھ جلتی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سے حالات میں آگ کے خطرہ سے زیادہ محفوظ رہتی ہے۔

لکڑی بم کے ٹکڑوں اور گولیوں کو بھی بہتر طور سے جذب کرسکتی ہے۔ اسی لئے بنظر احتیاط تمام دھات سے بنے ہوئے لڑاکو اور بمباروں پر بھی لکڑی کی چادر چڑھا دی جاتی ہے تاکہ گولیوں سے جو سوراخ ہوجاتے ہیں لکڑی چرکر ان کے درمیان آجائے۔

جس وقت ہوائی جہاز دھماکے سے زمین پر گرتا ہے تو اگر اس کا چوکھٹا یا ڈھانچہ پلائی وڈ کا ہو تو صرف اس کے بیرونی حصہ کو نقصان پہنچتا ہے اور کچھ ٹوٹ پھوٹ کی شکایت پیدا ہوجاتی ہے لیکن اگر دھات کا ہو تو وہی فریم آرگن باجے کی طرح تہ ہوجاتا ہے اور ہوائی جہاز نشین سخت خطرہ میں

پڑ جاتے ھیں ۔ ایسی مثالیں بہت ملتی ھیں جن میں لکڑی کے ڈھانچے کی وجہ سے ایسے تصادم کے وقت بیٹھنے والے بغیر کسی ضرر کے جانبر ھو گئے ۔

جب کبھی ھوائی جہاز بہت زیادہ پھوار اور ترشح کی زد میں آجاتے ھیں اس وقت بھی لکڑی دھات سے کہیں زیادہ مستحکم ثابت ھوتی ھے ۔

لچکدار اور گھڑی ھوئی پلائی وڈ ھوائی جہاز کے بازو اور چوکٹھے کی چادر کیلئے بہت کارآمد اور مضبوط ثابت ھوتی ھے ۔ پلائی وڈ کے بجائے مہاگنی، پاپلار (درخت حور) اور دوسری قسم کی لکڑی بھی استعمال ھوسکتی ھے ۔ پہلے گھڑائی یا ڈھلائی سرد دباو (Cold pressure) اور جبنین (کیسٹین) کے سریشن یا گوند سے کی جاتی تھی اب میڈیسون، ممالک متحدہ کے جنگلاتی معملوں میں جن نئے طریقوں کو رواج دیا گیا ھے ان میں گرم داب اور رال کے گوند سے کام لیا جارھا ھے ۔

رال لکڑی کو اتنا بوجھل کر دیتی ھے کہ اس سے بنا ھوا ڈھانچہ قوت اور پائداری میں پوری طرح ایلومینیم کا مقابلہ کرتا ھے ۔ اس طرز کے بنے ھوئے جہاز ممالک متحدہ میں حمل و نقل کا کام کافی عمدگی سے انجام دے چکے ھیں جن کی بدولت توقع ھے کہ فوجی ھوائی پروگرام میں اس قسم کے باربردار ھوائی جہازوں کو وسیع تر مقام حاصل ھو جائیگا ۔

نیا دستی ریڈیو سٹ

جنگ کی بدولت ایک نیا تعجب خیز ریڈیو سٹ ایجاد ھوا ھے ۔ یہ اتنا چھوٹا ھے کہ سپاھی کی پیٹھ پر بآسانی باندھا جاسکتا ھے اور اسے ھاتھ سے لانے لیجانے میں کوئی دشواری نہیں ھوتی اس سے پیغام بھیجنے اور وصول کرنے کے دونوں کام لئے جاسکتے ھیں ۔

اس خاص سٹ کی نمایاں خصوصیت یہ ھے کہ پیام بھیجنے والے کے پیام اس کی بدولت ھیڈکوارٹرس کو گلے کی حرکات سے واپس ارسال کئے جاتے ھیں ۔

جب اس پر کام کرنے والا فوجی جاسوسی پر مستعد رھکر کوئی اھم بات دیکھتا یا سنتا ھے تو وہ کچھ بولکر خبر رسانی نہیں کرتا بلکہ صرف سرگوشی سی کرتا ھے ۔ باقی کام یہ سٹ انجام دیتا ھے جو اس کے گلے میں بندھا ھوتا ھے ۔ اس کی کھسر پھسر سے جو حرکات واقع ھوتی ھیں انہیں آلہ جذب کرکے ھیڈکوارٹرس کو منتقل کردیتا ھے ۔ آج کل یہ دستی وائرلیس سٹ مشرق وسطی میں استعمال ھورھا ھے ۔

جنگ میں حصّہ لینےوالی شہد کی مکھیاں

ممالک متحدہ (امریکہ) میں شہد کی مکھیاں ضروریات جنگ کے سلسلے میں اھم کام انجام دے رھی ھیں ۔ لیکن یہ کام ان کے شہد سے نہیں بلکہ موم سے نکل رھا ھے جو چارسو سے زیادہ صنعتی اشیاء میں کارآمد ھیں ۔ ان چیزوں میں دوائیں، اسلحہ، گولی بارود اور جنگی

طیار ے سب شامل ہیں ۔ شہد کی مکھیاں پالنے والون نے سنہ ۱۹۴۲ع میں (۳۳۸۰۰۰۰) پونڈ موم جمع کیا ۔ ممالک متحدہ کی تاریخ میں ایک سال میں موم کے اتنے ذخیرے کی یہ بہترین مثال ھے ۔

بچھیوں کے لئے پر اسرار خوراک

آج کل جوان بچھیوں کو ایک پراسرار طریقے سے تیار کی ھوئی خوراک استعمال کرائی جارھی ھے جس کا ادنی کرشمہ یہ ھے کہ اس طرح کھلائے ھوئے ھر بچھڑے کی بدولت چالیس گیلن دودہ انسانی صرف کے لئے بچ رھتا ھے ۔

یہ خوراک ایک مخفی نسخے سے بنائی جاتی ھے اس لئے اسکے اجزا تو نہیں بنائے جاسکتے مگر اتنا ضرور کہا جاسکتا ھے کہ عنقریب رسد مین کفایت پیدا کرنے کے لئے بہت سے غذائی مرکز اسے تیار کرینگے ۔ یہ مرکب خوراک بچھیوں کو انکی پیدائش کے تیسرے ھفتے سے دلیے یالپسی کے طور پر بڑی مقدار میں شروع کرادی جاتی ھے اور جس مقدار میں انہین فطری خوراک کے طور پر دودھ ملتا تھا اس میں اسی مناسب سے کمی کردی جاتی ھے ۔

اس مرکب خوراک کی تیاری وزارت اغذیہ و وزارت زراعت کے قریبی تعاون کا نتیجہ ھے اسٹافورڈ شائر فارم انسٹی ٹیوٹ کی بچھیوں کو اس پر پرورش کیا گیا تو ان سے دس پونڈ فی ھفتہ زیادہ دودہ حاصل ھوا ۔

آنکھ سے گرد نکالنے کے لئے زبان کا استعمال

بریٹینی کے دور دراز گاؤوں میں آنکھ سے گرد صاف کرنے کا ایک عجیب طریقہ رائج ھے ۔ جب ایسی تکلیف دہ صورت پیش آتی ھے تو کسی دوست یا شنا سے کہا جاتا ھے کہ وہ اپنی زبان سے اسے نکال دے ۔

یہ عمل قواعد حفظ صحت کے لحاظ سے شائد چنداں اصولی نہیں مگر مجرب و کارگر ضرور معلوم ھوتا ھے زبان کا نرمی سے مس کرنا دیدے کو کوئی تکلیف نہیں دیتا اور گرد کے جو ذرے آنکھ میں گھس جاتے ھں زبان کے تر ھونے کی وجہ سے ان میں لیس پیدا ھوجاتی ھے ۔ وھاں زبان کا سرا آنکھ کے اندر دوا یا مرھم لگانے کے لئے بھی کام میں لایا جاتا ھے ۔

غیر مہلک بندوقیں

سب بندوقیں ھلاک کرنے ھی کے لئے نہیں بنتی ھیں ان کی بعض قسمین صنعتی کاموں میں بھی کارآمد ھیں ۔

بے شبہ دھما کو مادہ سپا ھی کی رائفل میں توانائی کا مجتمعہ سر چشمہ ھے لیکن اسے اور طریقوں سے بھی کام میں لایا جاسکتا ھے ۔ مثلاً آپ کو ایک آدھ انچ دبیز فولادی چادر میں انچ بھر گول سوراخ کرنے کی ضرورت پیش آسکتی ھے ۔ ممکن ھے آپ یہ کام برمے سے لینا چاھیں ۔ لیکن اس میں دیر لگے گی ۔ پینچ کا بھی خیال آسکتا ھے جس سے ۔ ٹرام اور بس وغیرہ کے

کنڈکٹر اپنے ٹکٹوں میں سوراخ کیا کرتے ہیں مگر اس کے لئیے تاروں اور نلکیوں کی ضرورت ہوگی جو اسے صحیح طریقے سے توانائی کے ایک بڑے سرچشمے سے وابستہ رکھیں۔

''فولاد میں سوراخ کاٹنا''

ان صورتوں کے علاوہ ایک شکل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ آپ فولادی چادر کو بندوق کا نشانہ بنا کر مطلوبہ سوراخ بنا لیں۔ شائد آپ کے خیال میں اس قسم کی بندوق آسانی سے نہ آئیگی۔ یہ بندوق بھی فولاد ہی سے بنتی ہے مگر اس کی وضع عام بندوقوں سے مختلف ہوتی ہے۔ شکل میں جلی خط میں لکھے ہوے حرف (C) سے مشابہ ہوتی ہے۔ اس میں جو کارتوس رکھا جاتا ہے وہ ایک معمولی قسم کے سادہ کارتوس سے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ یہ جس وقت سر ہوتا ہے تو اس سے ایک لاکھ پونڈ کا دباؤ ڈالنے والی گیسیں خارج ہوتی ہیں اور فولادی چادر میں سوراخ ہوجاتا ہے جو نہایت مکمل گول اور چکنا ہوتا ہے اور اسکے دونوں طرف کگر نام کو نہیں ہوتی۔

اس بندوق کا وزن (۴۷) پونڈ ہوتا ہے۔ جو بندوقیں اس سے چھوٹی ہوتی ہیں ان میں (۲۷) پونڈ وزن کی بندوق (۷۰۰۰۰) پونڈ کا دباو ڈالتی ہے۔ اس قسم کی کسی بندوق سے کام لیا جاے تو لوھے کی میالوں (گرڈرس) میں فی گھنٹہ تیس چالیس میال کے حساب سے سوراخ کئیے جاسکتے ہیں۔

یہی قاعدہ اوزاروں میں بھری تار کاٹنے کے لئیے مستعمل ہے۔ دونوک والی کیلیں ایسے اوزاروں کی مدد سے گزاری جاسکتی ہیں جو آلہ ان کیلوں کو ہٹاتا ہے وہ ہاتھہ کی گرفت میں رھتا ہے اور کیلوں کے سرے پر سے ایک ملحقہ پنیچ کو دبا کر اس شئے سے علحدہ کرلیا جاتا ہے جس میں سوراخ کرنا مطلوب ہے۔

ان اوزاروں میں سے بعض ایسے ہیں جن کو غوطہ خور اشخاص پانی کے اندر استعمال کرتے ہیں۔ ان کی وضع قطع معمولی بندوقوں سے ممتاز ہوتی ہے۔ ان کا فشارہ یا پھیلتی ہوئی۔ کھل مندن (Piston) جو گویا اسکی گولی ہے ان بندوقوں سے کبھی جدا نہیں ہوتی۔ اسکا یہ مطلب ہے کہ دھماکے سے جو گیسیں پھیلتی ہیں وہ نالی میں رک جاتی ہیں۔ اس سے اتنا زیادہ شور نکلتا ہے جتنا گولی کے رائفل سے نکل چکنے کے بعد ہوتا ہے اور فرار گیسیں پیچھے کی طرف دھکا دیتی ہیں۔

مشین سے تیل کے کنوئیں کھودنا

غالباً صنعتی بندوقیں مشین سے تیل کے کنوئیں کھودنے میں سب سے زیادہ مستعمل ہیں۔ بہت سے لوگ تیل کے کنوئیں کو بھی زمین کا معمولی سوراخ یا بل تصور کرتے ہیں۔ یہ کنوئیں اگرچہ کئی کئی میل تک اندر چلے جاتے ہیں مگر عموماً ان کی دیواروں پر سیمنٹ لگی رھتی ہے اور سیمنٹ کے اندر فولادی غلاف ہوتا ہے۔ بسا اوقات ان میں کئی مختلف طبقے ہوتے ہیں جن سے تیل حاصل کیا جاسکتا ہے

اور کنواں کھودتے وقت یہ تیل بہت زیادہ گہرائی میں چلا جاتا ہے۔ یہ عمل اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس میں کفایت زیادہ متصور ہے۔ جب برمانے یا کھودنے کے لئے سب انتظام ہوچکتا ہے تو ایک آدمی سیدھا گہرائی میں جا کر ایک طبقے میں سوراخ کر دیتا ہے، اس کے تھوڑی دیر بعد دوسرے طبقے میں اس سے زیادہ گہرا سوراخ کرتا ہے اور سارا کام آسانی سے انجام پا جاتا ہے۔

جب کنواں اچھی طرح تیار ہو جاتا ہے اور تمام راستے میں غلاف بچھ جاتا ہے اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے اندر شگاف یا سوراخ بنائے جائیں جن سے تیل بہہ کر آسکے۔ سنہ ۱۹۰۳ع میں ایک میکانیکی برمے یا سوراخ کرنے والے آلے سے اس قسم کے دہانے بنانے کی ایک تدبیر پیٹنٹ کرائی گئی تھی۔ اس آلے میں مسطح یا افقی نوکدار پن لگے ہوتے تھے جو غلاف کے درمیان سے باہر کی طرف اس طرح پھینکی جاتی تھی جس طرح چھرا اوزار ڈھکیلی جاتی ہے۔ سنہ ۱۹۲۶ع میں یہی کام ایک بندوق سے لینے کی تدبیر پیٹنٹ کی گئی جو دراصل کسی نہ کسی صورت میں سنہ ۱۹۰۳ع ہی سے زیر کار تھی۔

بظاہر برمانے والی بندوق اور سپاہی کی رائفل میں کوئی تعلق نظر نہ آئے گا۔ یہ بندوق بمقابلہ کسی اور ہتیار کے ایک نہایت پتلے تارپیڈو سے زیادہ مشابہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کا قطر تین انچ سے پانچ انچ تک ہوتا ہے اور یہ کنوئیں کے سوراخ پر نصب ہوتی ہے جس میں اس سے کام لینا مقصود ہوتا ہے۔ اس تارپیڈو کے اطراف بہت سے منھ ایسے بنے ہوتے ہیں جن میں بڑے جوز سے مشابہ چیزیں اسکرو سے کسی ہوتی ہیں۔

یہ "جوز نما" چیزیں فائر کرنے والی اکائیاں ہیں اور ایک بندوق میں (۴۴) تک استعمال ہوتی ہیں۔ ہر اکائی بارود، نالی اور نوکدار فولادی گولی پر مشتمل ہوتی ہے۔ جب بندوق مناسب گہرائی کی طرف جھکا دی جاتی ہے اس وقت یہ اکائیاں ایک وقت میں ایک کے حساب سے برقی قوت سے فائر کرتی ہیں۔

چونکہ اس بندوق کی نالی بہت چھوٹی ہوتی ہے اس لئے اس کی گولی میں ضروری دباؤ پیدا کرنا بھی خاصہ اہم مسئلہ تھا۔ رائفل کے اندر دھماکے سے جو گیسیں پھیلتی ہیں جب تک گولی بندوق کے اندر چلتی رہتی ہے اس پر برابر اپنا دباؤ ڈالتی رہتی ہیں۔ مگر برمانے والی بندوق کی چھوٹی نالی اس کے لئے کم وقت دیتی ہے۔ جلد سلگنے اٹھنے والی پستول کی بارود سے بھی گولی اتنی جلدی نکل جاتی ہے کہ اس میں ضروری توانائی پیدا ہونے کا بہت کم موقع رہتا ہے۔

اس مشکل پر قابو پانے کے لئے ایک کترا ہوا پتر (Shear dix) استعمال کیا جاتا ہے جو ایک دھات کا ہوتا ہے اور بندوق کی نالی اور بارود کے درمیان داخل کر دیا جاتا ہے۔ یہ پتر گیسوں کو اس وقت تک روکے رہتا ہے جب تک ان سے پورا دباؤ پیدا نہ ہوجائے۔ اب پتر ٹوٹتا ہے اور دھماکے کی قوت فوراً گولی پر پڑتی

ھے ، اسے باھر کی طرف نکال پھینکتی ھے اور اس عظیم الشان دباؤ پر قابو پالیتی ھے کنواں میل دو میل گہرا ھوکر پانی سے بھر جاتا ھے ۔ اس وقت گولی کنوئیں کے غلاف میں گھس جاتی ھے اور بعض اوقات لوھے اور سیمنٹ کی پرتوں کو بھی اپنے دائرہ اثر میں لے لیتی ھے ۔

جب کافی سوراخ کنوئیں کے خول میں بندوق سے بن چکتے ھیں تو بندوق اوپر کھینچ لی جاتی ھے اور تیل بہہ نکلتا ھے ۔ جب یہ پرتیں کام آچکتی ھیں تو ان کے اوپر کنوئیں میں ایک ڈاٹ لگادی جاتی ھے ۔ اگر ایسا نہ ھو تو اوپر کی پرت میں سوراخ کرنے کی صورت میں تیل بجائے اوپر چڑھنے کے نیچے بہنے لگے ۔ ڈاٹ لگاتے وقت بھی دھاکو اشیاء سے مدد لی جاتی ھے ۔

,, ہیلیم بردار بندوقیں ،،

بندوقوں سے جس طرح تیل نکالا جاتا ھے اسی طرح ھیلیم گیس بھی بندوقوں کی مدد سے فوجی و بحری چھوٹے ھوائی جہازوں میں بھری جاتی ھے ۔ اس کے علاوہ بندوقوں سے ادویہ اور صنعت کے سلسلے میں اور بہت سے کام لئے جاتے ھیں مثلاً بعض خاص بندوقیں ان خوفناک اور مہیب اعطاف (bends) کو روکتی ھیں جو پانی کے اندر کام کرنے والوں اور غوطہ زنوں کو متاثر کرتے ھیں ۔ ھیلیم کے بڑے عالمی سر چشمے ٹیکساس کے گیسوں کے کنوین ھیں ۔

صنعتی بندوق کا ایک اور نمونہ وہ ھے جسے دھاکو روشکن ، (Explosive circuit breaker) کہتے ھیں ۔ اس کی ساخت میں یہ خیال کارفرما ھے کہ اس میں ایک تار ایسا رکھا جائے جو بارود میں سے ھوکر گزرے اگر بار غیر معمولی ھو تو تار گرم ھوتا ھے ، بارود بھڑکتی ھے اور دھاکا برقی رو کو توڑ دیتا ھے ۔ اس ایجاد کی ایک شکل میں ایک سادہ کارتوس روابط کو جدا کردیتا ھے اور بیک وقت دباؤ تیل جیسے ایک حاجز سیال کو روابط کے درمیان سے علحدہ کرکے اثر انداز طریقے سے اس محراب کو قطع کردیتا ھے جو ان کے مابین بن سکتی ھے ۔ اس کی ھلکی، مرکب تدبیر سے نہایت وزنی کرنٹ حاصل کیا جاسکتا ھے جسکے لئے پہلے قدیم نمونے کے بڑے پٹاخوں (Breakers) کی ضرورت ھوا کرتی تھی ۔

جنگ اور سائنسی انکشافات

جنگ کی مقتضیات و ضروریات سے متاثر ھوکر سائنسدانوں نے عموماً کیمیادانوں نے خصوصاً نہایت انقلاب آفرین چیزیں مواد اور ساخت و حکمت وغیرہ کے لحاظ سے بنا ڈالی ھیں جن کی بدولت سنہ ۱۹۴۰ ع کا زمانہ عہد کہن معلوم ھوتا ھے ایسا معلوم ھوتا ھے جیسے مہینوں کی ایسی تکمیلی مدت میں سمٹ آئی جس کے بروے کار آنے کے لئے صدیاں درکار ھوتیں صرف دو برس پہلے جو چیزیں احاطہ خیال سے باھر تھیں وھی آج حقائق کی شکل میں جلوہ گر ھیں ۔

تالیفی ربر کی صنعت میں ترقی

دنیا بھر میں خام ربر کی پیداوار کو ترقی دینے میں تقریباً ایک صدی سے زیادہ مدت لگی

جب کہیں اس کی مقدار پیداوار سالانه دس لاکھ ٹن تك پہنچی ۔ اب ممالك متحده امریکه دو سال سے کم مدت میں اتنا ہی بڑا کارنامه پٹرولیم ، الکحل ، کوئلے اور چونے سنگریزوں سے کیمیائی ربر تیار کر کے انجام دے رہے ہیں ۔ اسی طرح ایلومنیم کی پیداوار کا حال ہے ۔ ممالك متحده میں جتنی مقدار میں ایلومنیم ۱۹۳۹ ع مین پچاس سال کی سخت تدریجی ترقی کے بعد پیدا ہوئی تھی ۱۹۴۳ ع کے آخر میں اس کی مقدار سات گنی زیاده ہوجائیگی ۔ اسکے ساتھ جب سائنسی طریقے اور تدبیریں سمندر کے نمکین پانی اور دوسرے وسائل و مآخذ کے متعلق عالم آشکار ہونگی تو میگنیشیم جتنی مقدار میں ۱۹۳۹ع میں بر آمد ہوئی تھی کم از کم اس سے سو گنی زیاده حاصل ہو سکے گی ۔ ۱۹۳۹ ع میں میگنیشیم کی صنعت (۲۴) سال کی عمر پا چکی تھی اور اب صرف (۴) سال کے اندر اسکی پیداوار میں اتنا عظیم الشان اور حیرت انگیز اضافه ہوگا ۔

اب کی دنیا جب اس جنگ کے بھنور سے نکلے گی تو اس کا دامن پلاسٹك (ملائم شکل پذیر ماده)، تالیفی سوت ، نائٹریٹس ، ھائڈروکاربن ، ھائی آکٹین گیسولین اور حقیقتاً بیسیوں دوسری کیمیاوی اشیاء اور خام مواد کی پیداوار سے مالا مال ہوگا اور یه سب چیزین اتنے وسیع اور بہتر پیمانے پر اسکے پاس موجود ہونگی کہ صرف دو سال قبل ان کا تصور کرنا دشوار تھا ۔

قدیم وسائل سے نئی دولت کا حصول

میگنیشیم وزن کے اعتبار سے ایلومینیم کے مقابلے میں تقریباً (٦٠) فیصدی ہے اور لوہے کے وزن کا تقریباً ⅕ وزن رکھتی ہے ۔ سنه ۱۹۱۵ع میں اس کی قیمت ۵ شلنگ فی پونڈ تھی اور چند سال قبل تك اسے ایك مصنوعی حیرت خیز چیز کی نظر سے دیکھا جاتا تھا ۔ آج کل یہی شئے مربع فٹ سے ناپ کر ساڑھے بائیس سنٹ (سنٹ $\frac{1}{100}$ ڈالر) فی پونڈ کے حساب سے فروخت ہوتی ہے اور ایلومینیم سے زیاده ارزاں ہے جو (۱۵) سینٹ فی پونڈ کے حساب سے بکتی ہے ۔ اوسطاً نصف ٹن میگنیشیم امریکه کے ہر لڑاکو ہوائی جہاز کی تیاری میں کام آنے کے لئے چلا جاتا ہے ۔ جنگ کے بعد صنعتی دھاتوں میں اس سب سے زیاده ہلکی دھات کی پیداوار و ساخت کی قابلیت قوم میں ایلومنیم کی مقدار پیداوار سنه ۱۹۳۹ع کی دوگنی سے زیاده ہوگی ۔

ہوائی جہاز کے علاوه میگنیشیم کی جو غالب مقدار صنعتی اغراض میں کارآمد ہے اس کا ماخذ بھی اتنا ہی اہم ہے ۔ تاریخ میں پہلی مرتبه ایك صنعتی دھات کیمیاوی ترکیبوں سے سمندر سے حاصل کی جارہی ہے ۔ بڑے بڑے زبردست پمپ پیچیده ساخت کے آلات سے روزانه (۳۰۰،۰۰۰،۰۰۰) تیس کرور گیلن پانی سمندر سے نکالنے میں مصروف ہیں ۔ سردست میگنیشیم اور برومائن ہی ایسے مادے ہیں جو شتابکاری سے سمندر سے نکالے جارہے ہیں ۔

لیکن ظن غالب اور پورے امکان کے ساتھہ کہا جاسکتا ہے کہ جتنے عناصر زمین پر پائے جاتے ہیں ان میں سے ہر ایک عنصر کے آثار سمندر میں موجود ہیں۔ کیا عنقریب افسانوں کے تخیلات سے زیادہ نرالا اور جدید کیمیا کا میدان تیار ہونے والا ہے؟ توقعات کچھہ ایسی ہی ہیں گو اب تک پورے یقین کے ساتھہ اس کا جواب نہیں دیا جاسکتا۔

ادھر فولاد بھی اپنی نوبت پر دعوت مقابلہ دے رہا ہے۔ ادنی قسم کی بھرت کا فولاد اور اعلی قسم کی بھرت کا فولاد حال ہی میں معمل سے تازہ دم نکلا ہے اور پرواز کے کاموں میں یا جہاں بھی ہلکا پن اور مضبوطی ناگزیر طور پر درکار ہو اس کا استعمال روز افزوں ہے۔ آج کل ماہر کاریگروں کی با وثوق رائے کے مطابق دیو پیکر ہوائی جہازوں کا ذکر بہت آتا ہے جن میں زیادہ تر فولاد ہی کا دخل ہے۔ یہ نئے بھرت وزن میں ایلومینیم سے تین گنے اور میگنیشیم سے تقریباً پانچ گنے ہیں لیکن ان کی کھینچنے والی قوت مربع انچ میں (۰۰۰ و ۱۹۰) پونڈ کے لگ بھگ ہے۔ یہ خوبی حجم کو گھٹا کر اور غیر ضروری سہارے دور کر کے وزن کے کم ہونے کا موقع بہم پہنچاتی ہے۔

فولاد کے کیمیا داں کہتے ہیں کہ جیسے جیسے آیندہ ہوائی جہاز تعداد میں بڑھینگے نئے فولادی مرکبات کے استعمال کا رجحان ترقی کرتا جائے گا۔ ان مرکبات میں معمولی لوہے سے کم زنگ لگتا ہے مگر گلنے کا مادہ ایلومینیم سے زیادہ ہے۔ کوشش جاری ہے کہ اس کے تحفظ کے متعلق کوئی مناسب حل دریافت ہوجائے۔

موٹر کے ایندھن کا ارتقا

پٹرولیم پر بھی ہر حیثیت سے نظر رکھئے اس کا ارتقا بھی کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا۔ چند سال پہلے لوگوں کو یقین تھا کہ موٹر کے ایندھن کی انتہائی حد طاقت میں گیسولین سے ملتی جلتی ایسی شئے کی ایجاد ہوگی جو اپنی شوربند (Antiknock) خصوصیت و قوت میں خالص آئسو آکٹین (Iso-octane) کی نظیر ہو۔ آئسو آکٹین ان اعتبارات میں اتنا بڑھا ہوا ہے کہ اس کے لئے ہنگامی طور پر آکٹین نمبر (۱۰۰) کا نشان مختص کردیا گیا جو گیسولین کے ارتقا کے لئے معیار قرار پایا۔

شاہی ہوائیہ نے (رائل ایر فورس) جو انگلستان کو بچانے کے لئے شدید حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے ماہ بماہ اپنی قوت میں اضافہ کیا وہ بھی در اصل بہتر ایندھن پیدا کرنے کے لئے کیمیا داں کی جدوجہد کا مظاہرہ ہے جس کی بدولت وہ ہوائی جہازوں کو زمانہ سابق کے مقابلے میں کم سے کم وقت میں تیز سے تیز رفتار سے طویل سے طویل مسافتیں حلقوں میں پرواز کے قابل بنادے گا۔ سچ پوچھئے تو برطانیہ کی جنگ اس لحاظ سے ایک آزمائشی معمل بن گئی ہے جس میں ایک قوم کی صلاحیتیں اور جانیں اپنا دم خم دکھارہی ہیں۔

اس برطانوی اور امریکی معمل میں جو کام ایک غیر معمولی تجربے کی حیثیت سے انجام

پا چکا ہے اس نے موٹر کے ایندھن کی صنعت میں ایسی سریع اور فوری تبدیلیاں پیدا کی ہیں جن کی صدا صلح ہوجانے کے بعد بھی ایک مدت تک فضا میں گونجتی رہے گی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ ایندھن اب آکٹینی معیار سے بھی آگے بڑھ سکتا ہے۔ ان کے تخمینہ کردہ آکٹینی نشانات (۱۱۰) یا (۱۱۵) بلکہ اس سے بھی متجاوز ہیں۔ آکٹین ایندھن نمبر ۱۰۰ سے جتنی طاقت حاصل ہوسکتی ہے اس سے ڈیوڑھی ان سے حاصل ہوا کریگی۔ جنگ کے بعد کے حالات کی جو علامات نمایاں ہیں ان پر نظر کرتے ہوئے پٹرولیم کا ماہر کیمیا آج کل کی موٹروں کو نکمی اور دقیانوسی خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک موٹر کے ایندھن میں جو گوناگون جدتیں اور اصلاحیں ہوں گی موجودہ موٹروں میں ان کی گنجائش نہ ہوگی۔

تیل کے پیپے کی کرامات

اب پٹرولیم کی کیمیا کے ایک اور پہلو پر نظر کیجئے۔ تیل کے پیپے میں یوں تو معمولی سے تیل کے سوا کچھہ نہیں لیکن غور کیجئے تو یہی پیپہ بلا مبالغہ ہزاروں کیمیاوی مرکبات کا خزانہ ہے۔ کیمیا داں مدت سے اس تیل کی ان صفات پر فریفتہ ہے اور اسے اس کا امکان نظر آتا ہے کہ سورج کے نیچے قریب قریب ہر چیز، ہائیڈروجن اور کاربن کے کیمیاوی سنگ تعمیر سے بنائی جاسکتی ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ مناسب ترکیب سے صرف آکسیجن اور دوسرے عناصر شامل کرکے تیل سے الکحل

اسٹر، (Esters = الکحل اور ترشے کے انجماد سے بنا ہوا مرکب) ترشے، محللات، خوشبویات، دوا سازی کے مواد اور ہر نمونے کے عضوی تالیفی مرکبات حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ وہ عمل انگیز (Catalytic) انشقاقی (Cracking) طریقہائے عمل جن کو حال حال میں عمل پذیری کے اعلے درجہ پر پہونچایا گیا ہے۔ آج کل اسی منزل کی رہنمائی کر رہی ہیں اور پٹرولیمی کیمیا کو اس احاطے میں لیجا رہی ہیں جو کبھی کولتاری کیمیا کے لئے مخصوص تھا۔

یہ تکمیلی مرحلہ جسے سنہ ۱۹۳۹ع میں طے کرنے کی سعی جاری تھی اور جس کی حدود میں جنگی ضرورتوں نے عظیم الشان وسعت پیدا کردی ہے موجودہ و مروجہ خیالات کی دسترس سے باہر ہے۔ تالیفی ربر جیسا کہ ہر کیمیا داں واقف ہے ایک سرے سے ربر ہے ہی نہیں بلکہ ایک وسیع تر اور زیادہ امید افزا کام آنے والا نیا کیمیاوی مرکب ہے جو بیوٹاڈین (Butadiene) اور اسٹیرین (Styrene) نامی مادوں سے حاصل کیا جارہا ہے اور خود یہ مادے وہ ہیں جنہوں نے پٹرولیم سے تالیف پائی ہے۔ ٹولوئین (Toluene ٹولو اور تارکول کا مرکب) جو نہایت اہم نئے اعلی دھماکو مادوں میں سے ایک کی اساس کی حیثیت سے بہت مشہور ہے اور ساتھہ ہی کیمیاء رنگ سازی اور بہت سی دوسری صنعتوں کا بھی نہایت ضروری جزو ہے آج کل پٹرولیم ہی کی پیداوار ہے۔

پٹرولیم کا ماہر کیمیا تقریباً مساوی سہولت کے ساتھ ایک طرف ہیں ایتھلین (Ethylene = الکحل کی ایک قسم) دے سکتا ہے ، دوسری طرف بنزین۔ ساتھ ہی انہیں ناپ تول سے روزانہ سیکڑوں ٹن کی مقدار میں فراہم کر سکتا ہے۔ اس کارنامے کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ہی پیپے یا خم سے شراب بھی نکالی جائے اور پانی بھی یا ایک ہی جانور سے گائے کا گوشت بھی برآمد کیا جائے اور سور کا بھی۔ بالکل یہی صورت ایتھیلین اور بنزین کی ہے جو بالکل کیمیاخانوادوں کے رکن ہیں باوجود اس کے یک پٹرولیم سے دونوں حاصل ہوتے ہیں۔ عملی حیثیت سے دیکھئے تو ان سے بالکل مختلف کام لئے جاتے ہیں جیسے اسٹیرین پلاسٹک کی ساخت یا تالیفی ربر کے دونوں نمونے جو بنا (Buna) اور تھکول (Thickol) کہلاتے ہیں ، دوائیں ، رنگ اور نیلون (Nylon) کی تیاری۔

اندھوں کے لئے وزن کرنے کا آلہ

حال ہی میں ایک نیا آلہ ایجاد ہوا ہے جسے پیمانۂ سماعت (Andio-scale) کہتے ہیں۔ یہ آلہ آواز کی مدد سے اندھوں کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ چھوٹی چیزیں بھی صحیح طریقے سے تول سکتے ہیں۔ اس کی نمائش چند روز قبل نابیناؤں کے امریکی وفاق میں کی گئی تھی۔

اس آلہ کا خیال امریکہ کی ایک نابینا عورت ایویلی واٹسن کو آیا تھا۔ اس کے اندر یہ خوبی رکھی گئی ہے کہ اس کو تولنے کی ہر مشین میں لگایا جاسکتا ہے اور یہ مختلف وزن پر ایک علحدہ آواز دیتا ہے۔ توقع ہے کہ اس آلے کی تکمیل کی بدولت جنگی صنعتوں کے بہت سے ابواب اندھوں کے لئے کھل جائنگے۔

نیوگنی میں پہاڑی بونوں کا انکشاف

نیو گنی کے علاقے میں پہاڑی بونوں کے ایک عجیب قبیلے کا پتہ لگا ہے۔ یہ لوگ پہاڑی باغوں کی رکھوالی سے گزر بسر کرتے ہیں اور درختوں کی چھال سے تن ڈھانکتے ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑے قد کا آدمی (۳۸) انچ سے کچھ اوپر ہے۔ زیادہ تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہے جن کے قد (۳٦) انچ یا اس سے بھی کم ہیں۔

ان علاقوں میں بونوں کے متعلق گزشتہ زبانوں میں بھی خبریں گشت کررہی ہیں مگر ان کے موجود ہونے کی یہ پہلی تصدیق ہے جو آسٹریلیا کے سپاہیوں کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔

(م۔ز۔م)

سائنس کی دنیا

ہندوستان میں جپسم کے ذخیرے

جپسم کیلسم کا آبیدہ سلفیٹ($Ca SO_4, 2H_2O$) ہے۔ یہ قدرت میں مختلف شکلوں میں پایا جاتا ہے مثلاً الباسٹر جپسم کے سفید باریک ذرات پر مشتمل ہوتا ہے سلی نائیٹ جپسم کی قلمی شکل ہے اور "ساٹن اسپار" ریشہ دار قسم ہے۔ جپسم میں سختی نہیں ہوتی۔ ناخن سے اس پر خراش پڑ جاتا ہے تاہم یہ بلغم سے زیادہ سخت ہے یہ پانی سے ۲½ گنا بھاری ہے۔ جپسم پیرس پلستر کی تیاری میں کام آتا ہے۔ جو نیم آبی کیلسیم سلفیٹ ($Ca SO_4, \frac{1}{2} H_2O$) ہے جپسم کو معتدل حرارت دے کر اس کا تین چوتھائی پانی خارج کرنے پر پلستر باقی رہتا ہے۔ اس میں پانی ملانے سے یہ آہستہ آہستہ سخت ہوجاتا ہے۔ بستگی کے دوران میں حجم میں بھی تھوڑا سا پھیلتا ہے۔ اسی خاصیت کی بنا پر پیرس پلستر کو سانچے بنانے میں اور تعمیرات میں دیوار کی استرکاری وغیرہ میں استعمال کرتے ہیں۔ پلستر کی تیاری کے علاوہ جپسم سمنٹ بنانے میں، ٹین پلیٹ پر پالش کرنے اور بعض وقت زراعت میں کھاد کے طور پر بھی کام آتا ہے۔ نیز کاغذ، پنسل، پینٹ اور ربڑ کی صنعتوں میں بھی اس سے کام لیا جاتا ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان میں جپسم کے ذخیرے وسیع طور طور پر پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے اہم حسب ذیل مقامات پر ملتے ہیں۔

(۱) بلوچستان
(۲) بھوٹان
(۳) بمبئی
(۴) وسط ہند
(۵) مدراس
(۶) صوبہ سرحد
(۷) پنجاب
(۸) راجپوتانہ
(۹) سندھ
(۱۰) صوبجات متحدہ

سنہ ۱۹۳۸ع میں ہندوستان میں مجموعی طور پر ۶۹۸۲۳ ٹن جپسم نکالا گیا اور مختلف اغراض کے لئے استعمال کیا گیا۔ دوران جنگ کے صحیح اعداد ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔

سنہ ۱۹۳۸ع کے اعداد سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کی مجموعی پیداوار کا ۹۸ ٪ حصہ حسب ذیل چار اہم مراکز سے حاصل ہوا۔ ضلع جہلم (پنجاب) ۴۰۰۰ ٪ ریاست بیکانیر (راجپوتانہ) ۲۸۰۶ ٪ ، ریاست جودھپور (راجپوتانہ) ۱۵۰۵ ٪ ، ضلع ترچناپلی (مدراس) ۴۳۰ ٪

ہندوستان میں جپسم کی پیداوار کو بآسانی بڑھایا جاسکتا ہے اور اس کی کھپت میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ کیونکہ آرٹ اسکولوں میں پیرسی پلستر کی طلب بڑھ گئی ہے نیز سمنٹ کی صنعت بھی توسیع پارہی ہے۔ زراعت کی ترقی کے ساتھ جپسم کا استعمال کھاد کے طور پر بڑھتا جائیگا علاوہ ازیں جپسم سے گندھک بھی تیار کی جاسکتی ہے۔

ہندوستان میں تیل کے بیجوں کی پیداوار اور ان سے استفادہ

ہندوستان کی زرعی دولت کا ایک بڑا حصہ تیل کے بیجوں پر مشتمل ہے۔ اندازہ ہے کہ ۳ ارب ایکڑ کے مجموعی زیرکاشت رقبہ میں سے ۲۵ فیصد زمین پر تیل کے بیجوں کی کاشت کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ۹۰ کروڑ ایکڑ کے جنگلات سے بھی بعض اہم تیلیا بیج حاصل ہوتے ہیں۔ ذیل میں بکثرت اگنے والے تیل کے بیجوں کا زیرکاشت رقبہ اور سالانہ پیداوار درج کی جاتی ہے۔

بیج کی قسم	زیر کاشت رقبہ	سالانہ پیداوار
۱۔ پنبہ	۲ کروڑ ۵۰ لاکھ ایکڑ	۲۰ لاکھ ٹن
۲۔ مونگ پھلی	۱ کروڑ ”	۳۳ ”
۳۔ رائی	۷۰ لاکھ ”	۱۰ ”
۴۔ السی	۵۰ لاکھ ”	۵ ”
۵۔ کنگیلی	۵۰ لاکھ ”	۶ ”
۶۔ ارنڈی	۲۰ لاکھ ”	۲ ”
۷۔ کھوپرا	۱۴ لاکھ ”	۱۴ ”
۸۔ خشخاش	۵ لاکھ ”	۲ ”

علاوہ ازیں عصفر، ککم، چل موگرا، نیم، ریٹھا، کاجو، کسم، حشیش وغیرہ بھی کم مقداروں میں پیدا ہوتے ہیں اور صنعی اہمیت رکھتے ہیں۔

ان تمام ذرائع سے مجموعی پیداوار ایک کروڑ ٹن قرار دی جاسکتی ہے جس کی قیمت تقریباً ایک ارب روپیہ ہوتی ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھہ کہنا پڑتا ہے کہ ان بیجوں سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جارہا ہے۔

تیل کے بیجوں سے خاطر خواہ استفادہ کے لئے اس کے تینوں حصوں کا استعمال ضروری ہے یعنی (۱) بیرونی خول اور بھوسہ۔ (۲) بیج سے حاصل ہونے والے تیل۔ (۳) کھلی۔ ان اجزا میں سے صرف تیلوں کے باقاعدہ استعمال اور فروخت کا انتظام ہے۔ دیگر اجزا سے استفادہ کی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی۔

اس ضمن میں یہ بتانا بےمحل نہ ہوگا کہ اب تک ہندوستان میں ایک ہزار قسم کے مختلف بیجوں کے پودوں کی جن کا تعلق ۱۲۵ گروہوں سے ہے باقاعدہ تشریح کی گئی اور ان کے اندر پائے جانے والے مرکبات کا امتحان اور ان سے نکلنے والے تیلوں کے خواص کا مطالعہ کیا گیا یہ دیکھا گیا کہ گروہ کے پودوں کے اندرونی مرکبات اور تیلوں میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ تیلوں کے نکالنے کے مختلف طریقوں اور مختلف صنعتوں میں استعمال کے لئے تیلوں پر جو عمل کرنے پڑتے ہیں ان کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ البتہ یہ بتایا جاسکتا ہے کہ ان کا صنعی استعمال حسب ذیل طریقوں پر ہوسکتا ہے۔ (۱) خوردنی تیل اور نباتی گھی۔ (۲) مختلف قسم کے صابن مع ٹرکی ریڈ آئیل (۳) جلانے کے تیل مع موم بتیاں۔ گلسرین اور دھماکو اشیاء۔ (۵) پینٹ، وارنش، اور پلاسٹکس اور ربڑ کے قائم مقام۔ (۶) جوتوں اور چمڑوں کے صاف کرنے اور پالش کرنے میں۔ (۷) سادہ اور مرکب چکنانے والے تیل۔ (۸) لن اولیم اور آب روک کپڑے، (۹) طبی تیل اور ادویاتی آمیزے۔ (۱۰) مختلف قسم کے ہلکے کیمیائی اشیاء مع تالیفی خوشبوئیات کے۔

تیلوں کے استعمال کے متعلق جو سائنسی معلومات ہیں اس کے مقابلہ میں کھلی کے متعلق نہایت سطحی معلومات ہیں۔ تیل کے مقابلہ میں اس کی کھلی صنعی اور سائنسی اہمیت میں کم نہیں ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں خوردنی اشیاء مویشیوں کے چارے اور کھاد کے طور پر ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ علاوہ ازیں کھلیوں سے دھنی اشیاء، گلوکوسائیڈز، الکلائیڈز، اور بیروزے جو دواؤں اور مصفی اشیاء کے طور پر کام آتے ہیں حاصل کئے جاسکتے ہیں اور لطف یہ کہ ان اشیاء کے نکالنے کے بعد کھلیوں میں پروٹنز، کاربوہائیڈریٹس اور معدنی اجزاء کی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس لئے کھلی پر باقاعدہ سائنسی تحقیقات ضروری ہیں۔

بیجوں کے خول اور بھوسہ کے متعلق علمی معلومات کا بالکل فقدان ہے۔ اور خیال ہے کہ ان سے فنولز، فرفرال ڈی ہائیڈ وغیرہ کی سی قیمتی اشیاء حاصل ہوسکتی ہیں جو تالیفی پلاسٹکس کی تیاری میں بےحد ضروری ہیں۔ علاوہ ازیں خول اور بھوسہ سے پوٹاش

اور فاسفیٹس بھی حاصل ہوسکتے ہیں جو قیمتی اشیاء ہیں۔ فی الحال بیجوں کے خول اور بھوسے کو جلانے میں یا کبھی کبھی مویشیوں کے چارے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے واضح ہے کہ ہندوستان میں تیل کے بیجوں سے جو اس وقت صرف ایک ارب روپیے کی لاگت رکھتے ہیں سائنسی تحقیقات اور صنعی استفادہ سے کم از کم پانچ ارب روپیہ بآسانی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

پروفیسر ایچ۔ بی۔ ڈنیکلف

یہ خبر افسوس سے سنی جائیگی کہ پروفیسر ڈنکلف سنٹرل ریونیوز کیکل لیبوریٹری کی چیف کیمسٹ کی خدمت سے بہت جلد سبکدوش ہوجائینگے۔ پروفیسر ہوریس ہبرٹ ڈنیکلف کو گذشتہ تیس سال سے ہندوستان کے کیمیا دانوں میں ایک ممتاز درجہ حاصل رہا۔ لندن اور کیمبرج میں ممتاز جامعی زندگی گزارنے کے بعد آپ سنہ ۱۹۰۸ع میں ہندوستان آگئے اور یم۔ اے او۔ کالج (علی گڑھ) میں پروفیسر سائنس بن گئے سنہ ۱۹۱۴ع میں انہیں انڈین ایجوکیشنل سرویس کا رکن بنایا گیا۔ اور خالصہ کالج (امرتسر) میں پروفیسر کیمیا مقرر کیا گیا۔ سنہ ۱۹۱۷ع میں ان کی خدمات گورنمنٹ کالج لاہور منتقل کردی گئیں جہاں یہ کچھ عرصہ تک پرنسپل بھی رہے۔ لاہور میں پروفیسر ڈنیکلف نے نہ صرف غیر نامیاتی اور تشریحی کیمیا میں تحقیقات کیں بلکہ ہندوستان کے لئے سنٹرل ریونیوز سرویس کے قیام میں حصہ لیا۔ اس سرویس کا قیام اور تنظیم غالباً پروفیسر ڈنیکلف کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

اپنی ملازمت کے ابتدائی زمانہ میں پروفیسر ڈنیکلف نے اس ضرورت کو شدت سے محسوس کرلیا کہ ہندوستان میں کیکل پروفیشن (کیمیائی پیشہ) کی تنظیم ہونی چاہئے اور اسے مستقل بنیادوں پر قائم ہونا چاہئے۔ سنہ ۱۹۱۸ع میں انہیں ہندوستانی اسلحہ کے بورڈ کے تحت کارڈائٹ فیکٹری (اروون کڈو) میں ورکس کیمسٹ مقرر کیا گیا جب یہاں سے وہ سنہ ۱۹۲۱ع میں سبکدوش ہوئے تو ان کو لیبوریٹری کے ناظم کی حیثیت حاصل تھی۔ اور انہوں نے اپنی مخصوص قابلیت سے کئی ایک کیمیائی تحقیقات انجام دیں جو اسلحہ کے نقطۂ نظر سے بڑی اہم تھیں۔ حکومت ہند کے ایماپر پروفیسر موصوف نے سنہ ۱۹۲۸ع میں ہندوستان اور برما کی بڑی بندرگاہوں پر آزمائشی تجربہ خانوں (ٹسٹنگ لیبوریٹریز) کی ایک وسیع اسکیم بنائی۔ لیکن سنہ ۱۹۲۹ع میں خود اپنی اصلی خدمت پر (گورنمنٹ کالج لاہور) واپس ہوگئے۔ یہاں حکومت پنجاب کی منظوری سے گورنمنٹ کالج لاہور میں سنٹرل بورڈ آف ریونیو کا کیمیائی تجربہ خانہ میں قایم کرلیا۔ اس تجربہ خانہ مالیاتی کیمیا (ریونیو کیمسٹری) کا پورا کام انجام پاتا رہا اور بہت جلد اس میں توسیع ضروری ہوگئی۔ جس کی وجہ سے اسے ایک علیحدہ ادارہ کی حیثیت دینا ضروری ہوگیا۔ پروفیسر ڈنیکلف کی تحریک پر سنہ ۱۹۳۷ع میں سنٹرل ریونیوز کیکل

سروس کا قیام عمل میں آیا اور کلکتہ ، بمبئی ، مدراس ، غازی پور ، سامبر ، اور دھلی میں تجربے خانے قائم کردیے گئے جن میں ۱۴ اعلی عہدہ دار اور کئی ایک ماتحتین کیمکل سرویس میں کام کرنے لگے۔ سنٹرل ریوینوز کیمکل لیبورٹری کا قیام سنہ ۱۹۳۹ع میں ہوا اور پروفیسر ڈنیکلف اس کے چیف کیمسٹ بن گئے۔ پروفیسر ڈنیکلف کا نام ھمیشہ سنٹرل ریوینوز سرویس اور لیبورٹری کے بانی اور تنظیم کنندہ کے طور ادب اور احترام سے یاد کیا جائے گا۔

پروفیسر ڈنیکلف نے غیر نامیاتی اور تشریحی کیمیا میں کئی ایک تحقیقی مقالے شائع کئے۔ انھوں نے حال میں کی نمک صنعت (سالٹ انڈسٹری) کے ضمنی حاصلون پر جو تحقیقات کیں اسے ساری دنیا میں پسند کیا گیا۔ سنہ ۱۹۳۹ع میں مرکزی حکومت اور پنجاب کے لئے ان کی خدمات کے صلہ میں سی۔ آئی۔ ای کا اعزاز عطا کیا گیا۔ بورڈ آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ میں یہ قدرتی طور پر پائے جانے والے نمکوں کی کمیٹی کے صدر ھیں اور حکومت ھند کے ادویہ کے مشاورتی بورڈ اور ادویہ کی رسد کی کمیٹی کے رکن ھیں۔ ھماری دعا ھے کہ پروفیسر موصوف خدمت سے علیحدگی کے بعد ایک طویل اور پر مسرت زندگی بسر کریں۔

ملیریا اور بی اویٹن

رسالہ سائنس (امریکا) کی حالیہ اشاعت میں اس امر کا انکشاف کیا گیا۔ کہ بی اویٹن (حیاتین الف) کی کمی سے ملیریا کے لئے حساسیت بڑہ جاتی ھے اور اس حیاتین کی مناسب مقدار ملیریا کے لئے مزاحمت بڑھا دیتی ھے۔ راک فیلر انسٹیوٹ کی طبی تحقیقات کے پرنسٹن اسٹیشن پر ڈاکٹر ولیم ٹریگر (W. Trager) نے مرغون اور بطون پر تجربے کر کے متذکرہ نتیجہ اخذ کیا۔

اس انکشاف سے اب یہ راز پہلی دفعہ کھل گیا کہ بعض اشخاص کیون ملیریا کے لئے زیادہ حساس ھوتے ھیں اور یہ بات بھی معلوم ھوگئی کہ ایک خاص حیاتیں ایک خاص مرض سے بہت اھم تعلق رکھتا ھے۔ اس امر کی اھمیت اس واقعہ کے مد نظر بہت بڑہ جاتی ھے کہ زیر بحث مرض دنیا کے لکھوکھا انسانون کی تکلیف اور موت کا باعث ھے۔ اس سے ملیریا کی روک تھام کے لئے ھمارے ھاتھ ایک نیا حربہ آجاتا ھے۔ کیونکہ بی اوئین انڈے کے چھلکون، جگر، دودھ وغیرہ میں پایا جاتا ھے جس سے ظاھر ھے کہ تغذیہ کی کمی اور متعدی بیماری کے لئے حساسیت میں خاص تعلق پایا جاتا ھے

کئی امراض کی دوا

آکسفورڈ کے پروفیسر اور مسز فلوری (Florey) نے رسالہ لانسٹ (Lancet) کی حالیہ اشاعت میں ایک نئی دوا پر وسیع تجربات کے نتائج بیان کئے ھین۔ یہ دوا ،،پنی سی لین،، (Penicillin) کہلاتی ھے اور توقع ھے کہ تاریخ طب میں یہ دور آفرین ثابت ھوگی۔ ،، پنی سی لین ،،

سلفان ایمائیڈ دواؤن اور سلفاتھا ئیو زول کے مقابلہ میں سیکڑوں گنا طاقت ور ہے اور یہ نخاعی بخار (مننجائی ٹس)، سمیت خون (سپٹی سیمیا) وغیرہ کا موثر علاج ہے حالانکہ سلفان ایمائیڈ دوائیں ان امراض میں بے کار ثابت ہوئیں۔

اس دوا کو کھاسکتے ہین اور جسم کے متضرر حصون پر لگا سکتے ہین - لیکن ابھی یہ دوا عو ام کے لئے قابل حصول نہیں۔ اس کی تھوڑی سی مقدار تیار کرنے طویل او رصبرآزما عملون کی ضرورت ہے۔ لیکن توقع ہے کہ تحقیقات سے اس دقت پر قابو پالیا جائے گا اور اس کی تالیف کے آسان طریقے ایجاد کئے جائین گے۔

(ش - م)

آسمان کی سیر

جون سنہ ۱۹۴۳ء

۲۲ - جون سنہ ۱۹۴۳ء کو سورج برج سرطان میں داخل ہوگا۔

عطارد صبح کا ستارہ ہے بتاریخ ۴ - جون ۴۳ء عطارد ساکن ہوگا اور اس کی اعظم تباین ۲۳۰° بجانب غرب بتاریخ ۱۸ جون واقع ہوگی - وہ ۳۰ - جون کو زحل کے ساتھ قریبی اقتران میں ہوگا۔

زہرہ شام کا ستارہ ہے - اور جون ۲۸ ۴۳ء کو اس کی اعظم تباین ۴۵° بجانب مشرق واقع ہوگی۔

مریخ صبح کا ستارہ ہے۔

مشتری شام کا ستارہ ہے۔

زحل ۷ جون کو سورج کے ساتھ اقتران میں ہوگا یہ مہینے کے آخری دنوں میں صبح کا ستارہ ہوجائیگا

(رصدگاہ نظامیہ)

اطلاع

جملہ خریدار صاحبان کو اطلاع دیجاتی ہے کہ براہ کرم بوقت خط و کتابت
نشان خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے

"ادارہ"

مضمون نگار صاحبان ! مضمون صاف اور خوش خط لکھیں

اُردو

انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

(جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے)

اس میں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے۔ تنقید اور محققانہ مضامین خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اردو میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر تبصرے اس رسالے کی ایک خصوصیت ہے۔ اس کا حجم ڈیڑھ سو صفحے یا اس سے زیادہ ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپیے سکہ انگریزی (آٹھ روپیے سکہ عثمانیہ)۔ نمونہ کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے (دو روپیے سکہ عثمانیہ)۔

نرخ نامہ اجرت اشتہارات "سائنس"

	۱ ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	۸ ماہ	۱۰ ماہ	۱۲ ماہ
پورا صفحہ	۷ روپے	۲۵	۳۵	۴۵	۵۵	۶۵
آدھا "	۸/۳	۱۳	۱۸	۲۳	۲۸	۳۳
چوتھائی "	۲	۷	۹	۱۲	۱۴	۱۶
سرورق کا فی کالم	۱۲	۳۰	۴۰	۵۵	۶۵	۷۵
چوتھا صفحہ نصف کالم	۶	۱۸	۲۳	۲۸	۳۳	۳۸

جو اشتہار چار بار سے کم چھپوائے جائیں کے ان کی اجرت کا ہر حال میں پیشگی وصول ہونا ضروری ہے۔ البتہ جو اشتہار چار یا چار سے زیادہ بار چھپوایا جائے گا اس کے لئے یہ رعایت ہوگی کہ مشتہر نصف اجرت پیشگی بھیج سکتا ہے اور نصف چاروں اشتہار چھپ جانے کے بعد۔ معتمد کو یہ حق حاصل ہوگا کہ سبب بتائے بغیر کسی اشتہار کو شریک اشاعت نہ کرے، یا اگر کوئی اشتہار چھپ رہا ہو تو اس کی اشاعت ملتوی یا بند کردے۔

Registered No. M. 4438

رجسٹرڈ نمبر ۱۸۰ آصفیه

VOL. 16

MAY 1943

NO. 5

SCIENCE

The Monthly Urdu Journal of

SCIENCE

Published By

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

DELHI

Printed at
The Intizami Press, Hyderabad-Deccan

سب سے خوش نصیب انسان وہ ہی جو نئے حقائق کا انکشاف کرتا ہی. اور دوسرے درجے پر وہ ہی جو پرانے تعصبات ترک کرتا ہے
سائنس
انجمن ترقی اردو کا
سہ ماہی رسالہ

اطلاع

(۱) اشاعت کی غرض سے جملہ مضامین اور تبصرے بنام ایڈیٹر سائنس ۹۱۷ ' کلب روڈ ' چادر گھاٹ حیدر آباد دکن روانہ کئے جانے چاہئیں —

(۲) مضمون کے ساتھہ صاحب مضمون کا پورا نام مع ڈگری و عہدہ وغیرہ درج ہونا چاہئے تاکہ ان کی اشاعت کی جاسکے ' بشرطیکہ اس کے خلاف کوئی ہدایت نہ کی جاے —

(۳) مضمون صاف لکھے جائیں تاکہ ان کے کمپوز کرنے میں دقت واقع نہ ہو - دیگر یہ کہ مضمون صفحے کے ایک ہی کالم میں لکھے جائیں اور دوسرا کالم خالی چھوڑ دیا جائے - ایسی صورت میں ورق کے دونوں صفحے استعمال ہوسکتے ہیں —

(۴) شکلوں اور تصویروں کے متعلق سہولت اس میں ہوگی کہ علحدہ کاغذ پر صاف اور واضع شکلیں وغیرہ کھینچ کر اس مقام پر چسپاں کردی جائیں - ایسی صورت سے بلاک سازی میں سہولت ہوتی ہے —

(۵) مسودات کی ہر ممکن طور سے حفاظت کی جاے گی - لیکن اُن کے اتفاقیہ تلف ہوجانے کی صورت میں کوئی ذمہ داری نہیں لی جاسکتی -

(۶) جو مضامین سائنس میں اشاعت کی غرض سے موصول ہوں اُمید ہے کہ ایڈیٹر کی اجازت کے بغیر دوسری جگہ شائع نہ کئے جائیں گے -

(۷) کسی مضمون کو ارسال فرمانے سے پیشتر مناسب ہوگا کہ صاحبان مضمون ایڈیٹر کو اپنے مضمون کے عنوان ' تعداد صفحات تعداد اشکال و تصاویر سے مطلع کردیں تاکہ معلوم ہوسکے کہ اس کے لئے پرچہ میں جگہ نکل سکے گی یا نہیں - کبھی ایسا بھی ہوتا ہےکہ ایک ہی مضمون پر دو اصحاب قلم اٹھاتے ہیں - اس لئےاس تواردسےبچنے کے لئے قبل از قبل اطلاع کردینا مناسب ہوگا -

(۸) بالعموم ۱۵ صفحے کا مضمون سائنس کی اغراض کے لئے کافی ہوگا -

(۹) مطبوعات براے نقد و تبصرے ایڈیٹر کے نام روانہ کی جانی چاہئیں - مطبوعات کی قیمت ضرور درج ہونی چاہئے —

(۱۰) انتظامی امور و اشتہارات و غیرہ کے متعلق جملہ مراسلت منیجر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے ہونی چاہئے —

———) ⁂ (———

جلد ۶ سائنس جولائی سنہ ۱۹۳۳

مرتبۂ

مولوی محمد نصیر احمد صاحب عثمانی ام - اے - ؛ بی - ایس - سی - ؛
(علیگ) معلم طبیعیات کلیہ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

تخلیق حیات و انسان

پر

ایک مکالمہ

(۸)

محبت؛ عداوت، اور خوف ہماری زندگی پر کیوں مسلط ہیں

نوٹ :- لاکھوں برس اُدھر زندہ جیلی کے ایک ننھے ننھے سے ذرے سے وہ عجیب و غریب مخلوق، جس کو " موجودہ انسان " کہتے ہیں، عالم وجود میں آئی، اور اپنی تمام محبتوں، عداوتوں اور خوفوں کے ساتھ آئی - ڈاکٹر ولیم کے گریگوری نے یہ سلسلۂ داستان اسی مقام سے شروع کیا تھا - اس کے بعد ڈاکٹر ہر برٹ روکس نے یہ بتلایا کہ انسان اپنی خصوصیات اپنی اولاد میں کیونکر منتقل کرتا ہے - پچھلے نمبر میں ڈاکٹر روکس نے اندرون افرازی غدود کا حال بیان کیا تھا - آج کی صحبت میں جامعہ کولمبیا کے شعبہ نفسیات کے صدر ڈاکٹر اے - ٹی - پفن برگر نے یہ بتلایا ہے کہ ہمارے اعمال و افعال پر ہمارے جذبات کہاں تک حاوی ہیں —

مسٹر ماک :- ڈاکٹر صاحب - میں آپ کی خدمت میں جذبات کی داستان سننے آیا تھا - براہ کرم ارشاد فرمائیے کہ لوگ ایک دوسرے

سے محبت اور نفرت کیوں کرتے ھیں اور خوف کیوں کھاتے ھیں ۔ اور خفا کیوں ھوجاتے ھیں۔ قصہ مختصر ' یہ فرمائیے کہ جذبہ (Emotion) کس کو کہتے ھیں ؟

ڈاکٹر پفن بر گر :- مجھے اس سوال کے جواب سے شروع کرنے دیجیے جس سے ھر کس و ناکس دلچسپی رکھتا ھے - لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے ھیں ۔ کیوں ؟ اس لیے کہ لاکھوں برس اُدھر بعض ننھی سی ابتدائی مخلوق ' اپنے ٹکڑے کرتے کرتے تھک گئی ' آپ جانیے کہ توالد کا اصلی طریقہ یہی تھا ' اور بالآخر تکثر کا صنفی طریقہ اختیار کر لیا گیا ۔ صنفوں کے درمیان کشش کی حیثیت سے محبت لاکھوں کروروں برس کے نشو و نما اور تغیر کی یادگار (Vestige) ھے —

مسٹر ماک :- میں تو سمجھا تھا کہ یادگار سے مطلب کسی انسان یا حیوان کا وہ حصہ یا وظیفہ ھے ' جو اب کار آمد نہیں رھا مثال کے طور پر زائدہ (Appendix) کو دیکھ لیجئے ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس عضو میں اور جذبۂ محبت میں کون سی قدر مشترک ھے —

ڈاکٹر پفن بر گر :- کوئی ضروری نہیں کہ کوئی عضو یا جذباتی جواب بالکل کار آمد نہ رھنے ھی پر یادگار کہلاے - وہ اس وقت یادگاری ھو جا تا ھے جب اس کی فائدہ مندی زائل ھونے لگتی ھے —

مسٹر ماک :- تو آپ کا مطلب یہ ھے کہ محبت کی فائدہ مندی کچھ زائل ھوگئی ھے ؟

ڈاکٹر پفن بر گر :- بہت کچھ - اس میں شک نہیں کہ صنفی جذبہ اس پر اسرار تغیر کے لیے بہت ضروری تھا، جس کو ہم ارتقا کہتے ہیں - ہر منفرد نوع کے تحفظ کے لیے بھی اس کی ضرورت تھی - انسان کی صورت میں تو آج یہ خیال قریب قریب یقین کے درجے کو پہنچا ہوا ہے کہ اب اس کی ضرورت بہت کم رہ گئی ہے - ابتدائی زمانے میں بہت سے لوگوں کو پیدا ہونے کی ضرورت تھی تا کہ نسبتاً ایک چھوٹی تعداد زندہ رہے - اب درازی عمر کے وہ وہ ذرائع استعمال کیے گئے ہیں کہ شرح اموات میں کمی واقع ہوگئی ہے اور اس لیے اب اتنے لوگوں کے دنیا میں آنے کی ضرورت باقی نہیں رہی —

مسٹر ماک :- بایں ہمہ یہ جذبات لطیف اب بھی ہم پر حکمراں ہیں —

ڈاکٹر پفن بر گر :- درست ہے - لیکن چونکہ اس جذبہ کی فائدہ مندی برابر گھٹ رہی ہے اس لیے ممکن ہے کہ اس جذبے سے متاثر ہونے کی قابلیت ہم میں کم ہوتی جاے - اس کی مثال ایسی ہے جیسی ان اعضاء کی جو اس وقت غائب ہوجاتے ہیں جبکہ ان کی ضرورت باقی نہیں رہتی - لیکن اس کے وقوع کا امکان ایک لاکھ برس سے ادھر تو ہے نہیں اس لیے آپ پریشان نہ ہوں —

مسٹر ماک :- پریشانی تو مجھ کو نہیں - لیکن میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا صرف محبت ہی وہ جذبہ ہے جو یادگاری ہے ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- نہیں - اس تعبیر پر تو ہمارے پاس کہنا چاہیے کہ ایسے جذباتی جوابوں (Emotional Responses) کا پورا ایک مجموعہ ہے جو اپنی فائدہ مندی بہت کچھ کھو چکے ہیں - ان میں سے بعض تو قطعی طور پر مضرت رساں ہیں - لیکن ہم اپنی داستان سے آگے نکل گئے - اس پر بحث میں آگے چل کر کروں گا - پہلے میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے اساسی یا ابتدائی جذبات کیا ہیں —

مسٹر ماک :- وہ کون کون سے ہیں ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر جان بی واٹسن جب جامعہ جانس ہاپکنس میں نفسیاتی تجربہ خانے کے ناظم تھے' تو انھوں نے چند گھنٹوں کے نوزائیدوں پر تجربے کیے تھے - ان کی آزمائشوں سے یہ پتہ چلا کہ طبعی حالات میں پیدائش کے فوراً بعد تمام بچے تین جذبوں سے متاثر ہوتے ہیں یعنی خوف ' غصہ اور محبت سے —

مسٹر ماک :- نوزائیدہ کو محبت کا تجربہ کیوں کر ہوتا ہے ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- صورت موجودہ میں محبت سے مراد جلد پر ہاتھ پھیرنے سے خوشگوار اثر کا محسوس ہونا ہے - بالفاظ دیگر بچہ اپنے وقت ولادت ہی سے چاہتا ہے کہ کوئی اس پر ہاتھ پھیرے اور پیار کرے - بقول ڈاکٹر واٹسن یہی اساس محبت ہے - ہر بالغ انسان کی جذباتی زندگی ان ہی تین اساسی ابتدائی جذبات پر مبنی ہے —

مسٹر ماک :- ڈاکٹر واٹسن کو یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ نوزائیدہ ان تین

جذبوں کو محسوس کرتے ھیں ؟

ڈاکٹر پفن بر گر :- انھوں نے بچوں کو خاص خاص طریقوں سے بر انگیختہ کیا ' اور پھر ان کے بشرے اور حرکات سکنات پر نظر رکھی ' انھوں نے اور اس کے جانشینوں نے ان کی متحرک تصاویر لیں - ان تجربوں سے یہ دلچسپ امر منکشف ہوا کہ بچوں میں دو طرح پر خوف کے جذبہ کو بر انگیختہ کیا جا سکتا ہے - اسی طرح دو طرح سے غصہ بھی دلایا جا سکتا ہے —

مسٹر ماک :- بچے کن دو چیزوں سے ڈرتے ھیں ؟

ڈاکٹر پفن بر گر :- وہ یک بارگی زور کی آواز سے بہت ڈرتے ھیں اور پھر سہارے کے ھٹ جانے سے بھی وہ بہت گھبراتے ھیں یعنی وہ گرنے سے ڈرتے ھیں —

مسٹر ماک :- اس میں تو کوئی عجیب بات نہیں معلوم ھوتی - ان چیزوں سے تو ھم سب ڈرتے ھیں —

ڈاکٹر پفن بر گر :- درست - لیکن عجب بات یہی ھے کہ بچے کسی اور چیز سے مطلقاً نہیں ڈرتے —

مسٹر ماک :- اچھا تو بچے کو غصہ میں لانے والی دو باتیں کون سی ھیں ؟

ڈاکٹر پفن بر گر :- اس کی حرکات کو روکنا ' مثلاً ھاتھوں کو پہلو سے باندھ دینا ' اور بھوک - اس کے علاوہ کوئی چیز بچے کو خفا نہیں کرتی - اثر محبت کو بر انگیختہ کرنے کے لیے واٹسن نے بھی معلوم کیا کہ آھستگی سے ھاتھ پھیرنے پر ' بالخصوص جسم کے حساس حصوں میں ' یہ کیفیت پیدا ھوسکتی ھے —

مسٹر ماک :- تجربوں میں یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ بچے ہاتھ پھیرنے کے لاڈ پیار کو پسند کرتے ہیں ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- انکی مسرت کے بے ساختہ اظہار سے - جس کو آپ تبسم سمجھ سکتے ہیں - بایںہمہ ان آزمائشوں میں وہ کامیابی نہیں ہوئی جو ان آزمائشوں میں ہوئی جن میں خوف اور غصہ کا اظہار ہوا ۔ "محبت" کے سلسلے میں بھی کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی ' کیوں کہ بچوں سے "کھیلنے" کے خلاف ایک طرح کا قدیم اور بجا طور پر شدید تعصب ہے —

مسٹر ماک :- آپ نے فرمایا کہ ہر بالغ کی جذباتی زندگی خوف ' غصہ اور محبت کے تین اساسی جذبات پر قائم ہے ۔ یہ کیوں کر ہوتا ہے ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- عمل تشریط [Conditioning process] سے —

مسٹر ماک :- اس سے آپ کا کیا مطلب ہے ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- یعنی عمل اختیار یا قدیم تجربوں کے ساتھ نئے تجربوں کا تطابق - اس کی بہترین توضیح ایک سادہ سی مثال سے ہوسکتی ہے جس کو ڈاکٹر واٹسن نے بیان کیا ہے - نفسیات کے قدیم علما ' بشمول مشہور و معروف ولیم جیمس کے ' یہ سمجھتے تھے کہ بچے متعدد قسم کے خوفوں کو ساتھ لیے پیدا ہوتے ہیں - مثلاً تاریکی کا خوف ' بالدار جانوروں کا خوف وغیرہ - واٹسن کا دعویٰ یہ تھا کہ اس قسم کے تمام خوف ابتدائی شیر خوارگی میں لاحق ہو جاتے

ہیں - اس کے ثبوت کے لیے اس نے چند مہینے کے ایک بچے کو لیا اور کھیلنے کے لیے اُسے ایک خرگوش دیا - بچہ بالکل اس سے نہ ڈرا - پھر موصوف نے عمداً بچے کو خرگوش سے ڈرنا سکھایا —

مسٹر ماک :- کیوں کر ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- ایک دن جب بچہ خرگوش سے کھیل رہا تھا تو واٹسن نے بچے کے کان کے پاس ایک دھاتی سلاخ بجائی - اس سے دفعتاً زور کی آواز پیدا ہوئی جس نے بچے میں ڈر پیدا کیا - اب کیا ہوا ؟ بچے کے دماغ میں آواز خرگوش کی موجودگی سے وابستہ تھی ؛ اس لیے اس کے بعد بچہ جانور سے ڈرنے لگا - اسی کو عکس تشریطی (Conditioned Reflex) کہتے ہیں - یعنی ایک عمل ہے جس سے کوئی جوابی عمل ایک نئے مہیج (Stimulus) کے ساتھ وابستہ ہوجاتا ہے ' جو ابتداءً اس مہیج کے ساتھ نمودار ہوا ' جس کی وجہ سے جوابی عمل وجود میں آیا - اس طرح اکثر لوگوں کے بچپنے میں خوفوں کا ایک " خوفناک مجموعہ " تیار ہوجاتا ہے —

مسٹر ماک :- کیا خوف تاریکی کا اکتساب کسی دفعتاً زور کی آواز کے ذریعہ ہوا ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- جی ہاں - چھوٹا بچہ رات کے وقت تاریکی سے اس وقت ڈر سکتا ہے جب کہ بادل کی گرج یا کھڑکیوں کی کھڑکھڑاہٹ وغیرہ سے اس کی آنکھ کھلے - بچہ کے لیے آواز کے ساتھ

جو کچھہ بھی ہوتا ہے، بصورت موجودہ آواز، وہی آواز کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سانپ، چوہے، مکڑی اور دیگر حشرات کا خوف بھی اسی طرح پیدا ہوجاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ بہت سے لوگ اس خوف کو دور نہیں کرسکتے —

مسٹر ماک — مگر سانپ، چوہے اور مکڑیوں سے تو یکبارگی کوئی زور کی آواز نہیں نکلتی ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- آواز تو کوئی نہیں نکلتی۔ لیکن بچے کی ماں ان کو دیکھہ کر چیخ اُٹھتی ہے۔ بچہ آواز سے ڈر جاتا ہے، سانپ، چوہے یا مکڑی کو دیکھتا ہے اور اُن کو آواز کے ساتھہ وابستہ کردیتا ہے۔ ڈاکٹر واٹسن کے انکشافات کی اہمیت اسی سبب سے ہے کہ اس کے مطالعہ کرنے سے پیشتر کوئی ان باتوں کو جانتا نہ تھا۔ جیمس اور اس کے متبعین نے یہ دعویٰ کیا کہ مثلاً پانچ یا سات برس کے بچے کی جذباتی زندگی فطری ہوتی ہے۔ یعنی اس عمر میں جن جذبات کا وہ اظہار کرتا ہے وہ پیدائش سے اس کے ساتھہ ہوتے ہیں —

مسٹر ماک :- جو چیز سب سے زیادہ مجھے تعجب میں ڈالتی ہے وہ یہ ہے کہ نوزائیدہ بچہ بھی ان گنتی کے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ میری ذہن میں تو یہ تھا کہ جذباتی حیثیت سے چند گھنٹوں کا بچہ بالکل معرا ہوتا ہے - اب مثلاً اس کا کہا سبب کہ ایسا بچہ بھی یکبارگی زور کی آواز سے

پریشان ہو جاتا ہے —

ڈاکٹر بفن برگر :- میرے نزدیک تو اس کا سبب یہ ہے کہ قبل ولادت کی حالت میں تہییج قوی کوئی ہوتا ہی نہیں۔ بالفاظ دیگر ولادت سے پیشتر کوئی بچہ بھی غالباً کبھی پریشان نہیں ہوتا، اور نہ کسی چیز سے خاص طور پر خوش ہوتا ہے۔ جہاں تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایسی جگہہ ہوتا ہے " کہ آنجا آزارے نباشد " —

مسٹر ماک :- کیا اکتسابی خوفوں کو بچہ سے دور کیا جاسکتا ہے ؟

ڈاکٹر بفن برگر :- جی ہاں۔ لیکن ذرا کارے دارد کا مضمون ہے۔ ان خوفوں کو جاگزیں کرنے کے لیے ایک ہی واقعہ کافی ہے، لیکن کسی ایک خوف کو دور کرنے کے لیے درجنوں آزمائشیں کرنی پڑتی ہیں۔ جب ایک مرتبہ وہ میکانیت سمجھہ میں آجائے، جس سے خوف کا اکتساب عمل میں آتا ہے تو پھر تقریباً اسی عمل سے اس کو دور بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس عمل کو ہم عمل باز تشریط یا ضد تشریط (Reconditioning or deconditioning) کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس بچے کو لیجئے جو بالوں والے خرگوش سے ڈرتا ہے۔ فرض کیجئے کہ اس بچے کو ناشتہ میں کوئی خاص غذا مثلاً دلیا پسند ہے۔ اب طریقہ یہ ہوگا کہ اس خوفناک شے کو بچے کے قرب میں لایا جائے جب کبھی وہ دلیا کھا رہا ہو۔ لیکن اس عمل کو بتدریج کرنا چاہیے۔ اگر بہت جلدی سے کام لیا جائے گا تو نتیجہ معکوس

ہوگا' یعنی ممکن ہے کہ بچہ دلیے ہی سے ڈرنے لگے۔
ایسی صورت میں یک نشد دو شد کا مضمون ہو جاے گا۔
پس پہلی مرتبہ خرگوش کو بچہ کی کرسی سے فاصلے
پر رکھنا ہوگا' اس کے بعد ہر مرتبہ اس کو نزدیک
تر کرتے رہنا چاہئے۔ رفتہ رفتہ بچہ دلیے کے خوشگوار
احساس کے ساتھہ خرگوش کو وابستہ سمجھنے لگتا ہے۔
اور اس طرح وہ خوف مغلوب ہوجاتا ہے —

مسٹر ماک :- کیا عمر والے لوگوں میں بھی غیر طبعی خوف اسی طرح پیدا ہوتے ہیں —

ڈاکٹر پغن برگر :- جی ہاں۔ عمر والوں میں بھی یہی میکانیت کام کرتی ہے' اور بہت سے عصبی خلل اسی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔
جنگ عظیم میں گولوں کے پھٹنے سے جو صدمات پہنچے
ان سے یہ امر بالکل واضح ہو گیا۔ ان آدمیوں کا علاج
یوں ہی کیا گیا کہ شفا خانوں میں اُن کو بالکل سکون
اور خاموشی میں رکھا گیا۔ اس کی ضرورت بڑی تھی'
کیونکہ کتاب کے گرنے سے بھی ان میں ہیجان پیدا
ہوجاتا تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ جو مریض بہت کچھہ
اچھا ہو گیا تھا وہ دفعتاً پھر مبتلا ہوگیا' اور وہی
ابتدائی علامات' پسینہ چھوٹنا' تشنج اور عارضی فالج
نمودار ہو گئیں۔ ابتداءً تو مرض کے عود کرنے کا سبب
ایک راز بنا رہا' بعد میں معلوم ہوا کہ بیمارستان
میں ایک شخص وردی پہنے آ گیا تھا۔ اس سپاہی کا

محض نظر آجانا ہی مرض کے عود کا سبب بن گیا،
کیونکہ مریض کا ابتدائی تجربہ وردی پوشوں ہی سے
وابستہ تھا۔ بالفاظ دیگر مریض کا ایک بے ضرر سپاہی
سے اس درجہ خوف زدہ ہونا عکس تشریطی تھا۔ اب
آپ سمجھے کہ مریض میں اس وردی پوش کا جو خوف
(جو ہرگز اس خوف کا سبب نہ تھا) پیدا ہوا تو اسی
میکانیت کی وجہ سے جس کی بدولت واٹسن کے تجربے
میں بچہ خرگوش سے ڈرا تھا، اگرچہ درحقیقت ایک
شور نے نہ کہ خرگوش نے یہ خوف پیدا کیا تھا؟

مسٹر ماک :- جی ہاں۔ میں سمجھا - آپ نے ابھی فرمایا کہ گولوں
کے اثر سے لوگوں میں تشنج اور عارضی فالج پیدا ہوگیا
لیکن یہ تو ایک غیر طبعی صورت تھی۔ کیا طبعی
جذبات بھی جسم پر اسی طرح عمل کرتے ہیں؟

ڈاکٹر پفن برگر :- مجھے خوشی ہے کہ آپ نے یہ سوال کیا۔ کیونکہ اس سے
مجھے خود جذبہ کی تشریح کا موقع مل گیا۔ جذبہ
درحقیقت نام ہے ایک ہیجان، تہیج، یا تموجی حرکت
کا۔ اس کو احساس [Feeling] کے ساتھ ملتبس نہ کیجئیے۔
جذبہ کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں ہیجان میں آنے کا
تجربہ ہوتا ہے۔ مشہور امریکی نفسیاتی ولیم جیمس
متوفی ۱۹۱۰ کا قول ہے کہ جذبہ جسم کے اندر تغیرات
کا شعوری تجربہ ہے۔ احساس میں یہ عکسیت (Reverberation)
نہیں ہوتی۔ احساس غالباً جذبہ کی ایک ہلکی شکل ہے۔

اسی عکسیت کا عدم یا وجود فرق پیدا کردیتا ہے —

مسٹر ماک :- میں نہیں سمجھا کہ آپ نے "عکسیت" سے کیا مطلب لیا - یہ فرمائیے کہ جذبہ کی صورت میں کون سے جسمانی تغیرات واقع ہوتے ہیں ؟

ڈاکٹر پفن بر گر :- کیا آپ کبھی شرمائے نہیں ؟ کیا محبوب کو دیکھکر آپ کے قلب کی حرکت کبھی تیز نہیں ہوئی ؟ کیا امتحان کے نتیجے کے انتظار میں آپ کا دل کبھی بیٹھا نہیں ؟ اس قسم کے مظاہر اس قدر عام ہیں کہ یہ سب باتیں اب روز مرہ میں داخل ہیں - بایںہمہ یہ سب نتیجے ہیں قلب کی حرکت یا تنفس کی شرح میں حقیقی تغیر کا ' خون کی تقسیم کا ' اور جسم کے مختلف حصوں میں عضلاتی تنشوں کا - بقول جیمس کے ان اور ان جیسے دیگر طبیعی تعاملات میں سے گزرنا ہی جذبہ ہے - بالفاظ دیگر جب آپ خوف زدہ ہوتے ہیں تو آپ کے دماغ میں کوئی غیر محسوس چیز نہیں ہوتی بلکہ آپ کے جسم ہی میں چند تغیرات ہونے لگتے ہیں جن کا آپ کو احساس ہوتا ہے —

مسٹرماک :- میں تو سمجھتا تھا کہ اس کے بالکل برعکس صحیح ہوگا یعنی طبیعی تعاملات جذبات ہی کا نتیجہ اور اثر ہوں گے - آپ کا کیا خیال ہے ؟

ڈاکٹر پفن بر گر :- ذاتی طور پر تو میرا یہ خیال ہے کہ جیمس کا قول درست ہے - لیکن اس سے کسی امر کا اثبات نہیں ہوتا -

سائنس دانوں کے نزدیک اس نظریہ کی صداقت ابھی
کماحقہ ثابت نہیں ہوئی - اس سلسلہ میں هاروارڈ کے
مدرسۂ طبی کے معلم فعلیات ڈاکٹر والٹر کینن نے
بہت کچھہ غور و فکر اور مطالعہ کیا ہے - انہوں نے
جذبات کے دوران میں طبیعی تغیرات کی پیمائش بہت
احتیاط کے ساتھہ کی ہے - ان کا بیان ہے کہ وہ مختلف
جذبات کے تحت طبیعی تعاملات میں کوئی فرق نہ پا سکے -
مثلاً انہوں نے غصہ کی حالت میں ایک شخص کی نبض ،
حرکت قلب ، اور تنفس کو دیکھا اور ساتھہ ہی فشار
خون (Blood Pressure) کی پیمائش کی اور دیگر وظائف
مثلاً معدے کے اندر هضمی حرکات کا مشاہدہ کیا - پھر اس
شخص کو خوف کی حالت میں دیکھا - تو هر دو صورتوں
میں قریب قریب ایک ہی قسم کے بر آمد ہوے —

مسٹر ماک :- کیا یہ ممکن نہیں کہ خوف اور غصہ کے طبعیی اثرات
ایک ہی ہوں —

ڈاکٹر پفن بر گر :- اگر جیمس کا نظریہ صحیح ہے تو ممکن نہیں - اگر جذبہ
جسمی تغیر کا شعوری وقوف ہے تو اس کے معنے یہ ہوے
کہ مختلف جذبات مختلف جسمی تغیرات کا وقوف ہوں -
میرے نزدیک دشواری یہ واقع ہوئی ہے کہ بعض طبیعی
تغیرات ، جن میں شاید بعض کیمیاوی بھی ہوں ، پیمائش
بلکہ شناخت سے بھی رہ گئے - بہر حال مثلاً غصہ کی
حالت میں طبعی تغیر بہ حیثیت مجموعی پورے جسم

کا تغیر یا رد عمل ھے - چنانچہ عضلات ' جلد ' خون ' اعصاب' غدود ' سب کے سب اس تغیر میں حصہ لیتے ھیں - ایسی پیچیدہ حالت میں بہت ممکن ھے کہ باوجود احتیاط کے کوئی جز پیمائش کرنے سے رہ جاے —

مسٹر ماک :- تو کیا جذبات اور جسمانی تغیرات کے درمیان اس علاقہ کی جانچ کا کوئی اور طریقہ نہیں ؟

ڈاکٹر پفن بر گر :- جی ھاں' ھیں - ان طبیعی تغیرات کی تازہ ترین کوشش نفسی برقی عکس یعنی جلد کی برقی مزاحمت کے ذریعہ ان کی پیمائش ھے - اس برقی مزاحمت کی نسبت معلوم ھوا ھے کہ وہ تقریباً ھر قسم کے جذبہ کے تحت بہت کچھہ کم ھوجاتی ھے - دو برتنوں میں نمک کا محلول ھوتا ھے - برتن برقی آلے سے ملے ھوتے ھیں - شخص زیر امتحان ایک ایک انگلی ھر برتن میں ڈالتا ھے - ایک برتن سے دوسرے برتن میں انگلیوں میں سے ھو کر ایک ھلکی برقی رو گذاری جاتی ھے - برقی آلے کے ذریعہ ان انگلیوں کی مزاحمت دریافت کی جاتی ھے - یہ آلہ اصلاً مشہور و معروف معیاری وھیٹسٹون کا پل ھوتا ھے - اگر معمول یعنی شخص زیر امتحان مشتعل ھو' یا خوف زدہ ھو ' یا کسی دوسرے کا اس کو وقوف ھو تو یہ جلدی مزاحمت بہت کچھہ کم ھوجاتی ھے - کبھی کبھی اس آزمائش کو " شناخت کذب '' کے لیے بھی استعمال کرتے ھیں لیکن اس غرض کے لیے یہ ترکیب کچھہ زیادہ کار گر نہیں

ثابت ہوئی —

مسٹر ماک :- جذبات اور درون افرازی غدود کے درمیان کیا علاقہ ہے ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- آپ کو یاد ہوگا کہ گزشتہ صحبت میں ڈاکٹر روکس نے فرمایا تھا کہ اس کے متعلق بہت کم معلومات ہیں ! اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ایسا علاقہ ہے ضرور - ڈاکٹر کینن نے اس علاقہ کو ایڈرینیلن [یعنی غدوہ فوق الکلیہ کا افراز] اور کتے بلیوں کے غصے کے لیے ثابت کر دکھایا ہے - دلچسپ تجربوں کے ایک سلسلے میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ غصہ کے دوران میں خون میں ایڈرینیلین کا حقیقی اضافہ ہوتا ہے- یہ تجربے بہت دقیق ہیں- اور حقیقت تک پہنچنا بہت مشکل ہے ' کیوں کہ بقول ڈاکٹر روکس کے درون افرازی غدود کیمیاوی حیثیت سے توازن کی حالت میں ہیں —

مسٹر ماک :. تو ڈاکٹر کینن نے کیا کیا ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- انھوں نے تجربہ خانے میں ایک بلی کو میز سے باندھ دیا - بلی نے اس سے پہلے کھانا کھایا تھا - اس کے معدے کی حرکات کی پیمائشیں بہت احتیاط سے کی گئیں اور لاشعاعی تصویریں بھی لی گئیں - اس کا فشار خون معلوم کیا گیا - اس کے قلب کی حرکت اور تنفس کی مدت دیکھی گئی وغیرہ وغیرہ - بلی بالکل طبعی حالات میں اور سنجیدہ رہی - اب اس کے بعد کتا لا یا گیا کتے نے دست و پا بستہ بلی پر بھونکنا شروع کیا اور دانت دکھانے لگا-

بلی کو بالکل فطری طور پر غصہ آ گیا۔ فوراً ہی نئی پیمائشیں کی گئیں۔ جن سے معلوم ہوا کہ معدے کے ہضمی انقباضات فوراً رک گئے۔ خون کے دوران اور فشار میں ایسی تبدیلیاں واقع ہوگئی تھیں جنھوں نے بلی کو حملہ کے لئے بالکل تیار کردیا۔ دوسرے دن تجربہ دہرایا گیا۔ بلی کو پھر کھانا کھلا کر میز سے باندھ دیا گیا۔ اور جملہ پیمائشیں کی گئیں۔ لیکن اس مرتبہ تجربہ خانے میں کوئی کتا نہ لایا گیا۔ اس کی بجائے بلی کے اندر ایڈرینیلین کی ایک مقدار بذریعہ پچکاری پہنچادی گئی تو نتیجہ بالکل وہی نکلا —

مسٹر ماک :— اس سے تو جیمس کے نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ بلی غصہ میں آ گئی یا کم از کم اس نے علامات غصہ کا اظہار اس وجہ سے کیا کہ اس کے خون میں ایڈرینیلین کا اضافہ ہو گیا —

ڈاکٹر پفن برگر :— بالکل درست۔ جذبات کے ان طبیعی جوابات کی ایک دلچسپ تعبیر یہ ہے کہ دوران ارتقاء ان کا بھی نشو و نما ہوتا رہا کیونکہ حفاظت کے لیے یہ مفید تھے۔ چنانچہ غصہ کی حالت میں طبیعی جوابات نے حیوان کو حملہ کے لیے موزوں کردیا اور خوف کے جوابات نے مدافعت کے لیے مستعد کردیا۔ انتہائی خوف کی حالت میں یہی جوابات شلل کی صورت اختیار کرلیتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال اوپوسم (Opossum) ہے جو ایک

چھوٹا سا نحیف‌الجثہ جانور ہے، جو خوف کی حالت میں بالکل شل ہوجاتا ہے۔ اور اس بے حرکتی کی وجہ سے نظر میں نہیں آتا۔ اور اگر نظر میں آ گیا تو اس کے دشمن اس کو مردہ سمجھکر چھوڑ دیتے ہیں۔ میں اس سے پیشتر بھی عرض کر چکا ہوں کہ ہم میں اب بھی متعدد جذباتی جوابات یادگاری صورت میں موجود ہیں۔ لیکن بجائے مفید ہونے کے وہ ہمارے لئے اب مضر ہیں۔ مثلاً کسی سڑک پر موٹر یا لاری کو اپنے اوپر آتا دیکھکر ہمارے اعضا عارضی طور پر شل ہوجاتے ہیں۔ تو ابتدائی زمانے میں یہ یقیناً مفید رہا ہو گا لیکن اب تو قطعی طور پر خطرناک ہے۔ اسی طرح غصہ کے جوابی تغیرات عہد غار باشی میں بہت کچھ مفید رہے ہوں گے لیکن اب تو ہماری راہ میں رکاوٹ ہی ہیں۔ متمدن معاشرہ (Society) میں عام طور پر غصہ کے اظہار کی بجائے اس کا اخفا بہتر سمجھا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک دن ایسا آئے کہ یہ جوابی عمل ہم میں نہ پیدا ہوں۔ لیکن اس قسم کے حشو و زوائد کا دور کرنا بغایت بطی‌العمل ہے۔ جیسا کہ میں نے محبت کے جوابی عمل کے سلسلہ میں کہا تھا، اس کا امکان دس لاکھ برس سے اِدھر تو نہیں ہے ـــ

مسٹر ماک :ـ یہ تو آپ نے ابتدائی جذبات خوف، غصہ اور محبت کی

داستان سنائی - اب فرمائیے کہ ہمارے دیگر احساسات کا کیا حال ہے ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- ان تین ابتدائی جذبات کو تو آپ بنیاد قرار دیجئے - ان پر حافظہ ' تخیل ' اور تلازمہ کی مدد سے ایک پیچیدہ عمارت تیار ہوتی ہے جس کو حسیت (Sentiment) کہتے ہیں - جذبات کے مقابلے میں اوسط متمدن آدمی کے وقوف و تجربہ کو یہ حسیات زیادہ ظاہر کرتی ہیں - مثال کے طور پر محبت کی حسیت کو لیجئے - وہ ابتدائی جذبہ سے بہت کچھ دور ہو گئی ہے —

مسٹر ماک :- میں ایک بات یہاں واضح کر لینا چاہتا ہوں - وہ یہ کہ محبت کا ابتدائی جذبہ کیا وہی ہے جس کو صنفی محرک (Sex Impulse) کہتے ہیں ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- نہیں - محبت کا ابتدائی جذبہ وہ ہے جس سے صنفی محرک اور حسیت محبت دونوں نے نشو و نما پائی ہے - وہ تو لذت کا ابتدائی وقوف ہے جس کو ڈاکٹر واٹسن نے نوزائیدہ بچوں میں معلوم کیا —

مسٹر ماک :- کیا نفرت ابتدائی جذبہ نہیں ہے ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- نہیں نفرت تو ایک حسیت ہے - وہ غصہ کے جذبہ ؛ مظالم کی یاد ' نا کردہ مظالم کے خیال ' اور آئندہ ہونے والے مظالم کی توقعات سے مرکب ہے —

مسٹر ماک :- تو پھر خوشی اور غم ' رونے اور ہنسنے کو کیا کہئے گا ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- اس گفتگو میں میں نے اِن ابتدائی جذبات کا نقشہ کھینچنے

کی کوشش کی ہے جو ہماری جذباتی زندگی کی بنیاد ہیں - لیکن ایک متمدن شخص ان جذبات کو جیسا چاہئے ظاہر نہیں کرسکتا - رسم و رواج' آداب معاشرہ' قانون اور تعلیم' سب کے سب اس میں مانع ہیں - یہ امور جذبات کو ایک خاص رخ پر ڈال دیتے ہیں - لیکن اس پر ہم پھر کبھی گفتگو کریں گے —

ایوو گیڈرو

از

(جناب رفعت حسین صاحب صدیقی - ایم - اس -
سی- ریسرچ انسٹیٹیوٹ طبیہ کالج دهلی)

" اشیا یا اجسام سے جواھر کی کمیت اضافی اور تناسب ترکیبی معلوم کرنے کا طریقہ " یہ اس مشہور و معروف مضمون کا عنوان ھے جو رسالہ طبیعیات سنہ ۱۹۱۱ ع (جلد ۷۳ صفحہ ۵۸ تا ۷۶) میں شایع ھوا اور اس میں ایووگیڈرو (Avogadro) کے کلیہ کی اشاعت ھوئی - یہ در اصل اس کُلیہ کی صد سالہ یادگار تھی اور ایک خوبصورت کتاب کی شکل میں منائی گئی تھی۔ اُسے ٹیورن (Turin) کی رائل اکاڈیمی آف سائنس نے شائع کیا تھا - مقدمہ کتاب پروفیسر اچی لیوگواریشی (Ichilio Guareschi) کا لکھا ھوا ھے جس میں مصنف کے حالات بھی درج ھیں- ذیل میں اسی مقدمہ سے اس کے مختصر سوانح حیات سپرد قلم کئے جاتے ھیں —

ایوو گیڈرو کا پورا نام لارینزو رومانو امیڈیو کارلو ایوو گیڈرودی کو ارینا ای دی کریٹو (Lorenzo Romano Amedeo Avogadro di Quaregna e di Cerreto) تھا- ۹ اگست سنہ ۱۷۷۶ع کو ٹیورن میں پیدا ھوا - خاندانی نام ایوو گیڈرو

غالباً ڈی ایڈوکیٹس (De Advocatis) کا بگڑا ہوا ہے جو زبان کی تبدیلی سے رفتہ رفتہ ایڈوکیرائی (Advocarii) ایوو کیرائی (Avocarii) اور بالآخر ایووگیڈری (Avogadri) ہو گیا - یہ نام غالباً قانونی فرائض کی بنا پر ہوگا جو زمانہ سابق میں اس خاندان کو امور مذہبی کے سلسلے میں انجام دینا پڑتے تھے- بعد میں یہی نام خاندانی ہوگیا - خاندان کی دوشاخیں تھیں، جن میں ایک کا سلسلہ ٹریویزے (Trevise) سے اور دوسرے کا ور چیلی (Vercelli) سے تھا —

ایوو گیڈرو کے باپ ' کیویلیرو فلیپو ایوو گیڈرو (Cavaliere Philippo Avogadro) کا سلسلۂ نسب ورچیلی سے ملتا ہے ' کیو یلیر و فلیپو سنہ۱۸۱۲ع میں فوت ہوا - ایوو گیڈرو کی ماں کا نام انا ور چیلونے (Anna Vercellone) تھا - یہ بیلا (Biella) کی رہنے والی تھی جو لمبارڈی (Lombardy) میں ایک چھوٹا سا مقام ہے اور خاندان ایوو گیڈری کی املاک جس جگہ تھی اس جگہ کے قریب ہے —

امیڈیو ایوو گیڈرو نے سنہ ۱۷۸۹ع میں فلسفہ کی ڈگری حاصل کی اور سنہ ۱۷۹۲ ع میں اصول قانون کی' اور آخر میں قانون مذہبی میں ڈاکٹری کی ڈگری سے سر فراز ہوا - کچھ مدت تک قانون پیشہ رہا مگر سنہ ۱۸۰۰ع میں نہایت سنجیدگی سے حساب و طبیعیات کو پڑھنا شروع کیا - سنہ ۱۸۰۹ع میں پروفیسر ورچیلی کے رائل کالج یا اکاڈیمی میں طبیعیات کا پروفیسر مقرر ہوا - اس کا پہلا کام جس میں اس کا بھائی فیلیچ (Felice) بھی شریک تھا ' برق کے متعلق تھا جو ٹیورن کی سائنس اکاڈیمی میں ۲۰ستمبرسنہ ۱۸۰۳ ع کو پیش ہوا —

سنہ۱۸۲۰ع میں وکٹر ایما نوئل اول (Victor Emanel I) نے جامعہ ٹیورن میں

ریاضیاتی طبیعیات کی جگہ قایم کی - اس جگہ پر ایوو گیڈرو سنہ ۱۸۲۱ ع کے اختتام تک مامور رہا۔ بعد ازاں سیاسی معاملات کی وجہ سے یہ عہدہ حذف کردیا گیا۔ اب ایوو گیڈرو کو امیریٹس (Emeritus) پروفیسر کا خطاب ملا اور چھہ سو لیرے سالانہ تنخواہ ملنے لگی —

اس دوران میں ایووگیڈ رو طبیعیات و کیمیا کے خاص سائنٹفک مضامین میں مشغول رہا جن سے اسے بہت دلچسپی تھی - اور اپنی سرگزشت توزک ایوو گیڈرو کے نام سے سنہ ۱۸۱۱-۲۱ ع کے درمیان شایع کی - اس کے بعد اس کی دوسری سر گزشت جو پہلی سے زیادہ دل چسپ تھی ۳۰ سال کی مدت میں شایع ہوئی —

سنہ ۱۸۳۲ ع میں ریاضیاتی طبیعیات کی پروفیسری کا عہدہ پھر قایم ہوا - لیکن اس مرتبہ اس جگہ فرانسیسی طبیعیات داں کوشی (Cauchy) کا انتخاب ہوا۔ دوسال بعد ایوو گیڈرو پھر اس عہدہ پر مقرر ہوا اور سنہ ۱۸۵۰ ع تک فائز رہا - بعد ازاں خود ہی سبکدوش ہوگیا اور اس کا شاگرد فلیچ چیو (Felice chio) اس کا جانشین ہوا —

ایوو گیڈرو کی شادی ڈونا فلیچیتا مازی (Donno Felicita Mazzi) سے ہوئی۔اسکے بطن سے چھہ لڑکے ہوے جن میں سے دو بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے ۔ کاؤنٹ لوئگی (Count Luigi) اطالوی فوج میں جنرل ہوا اور ایڈوکیٹ فلیچ (Felice) عدالت مرافعہ کا صدر بنایا گیا ۔

ایوو گیڈرو کی زندگی بڑے انہماک کی تھی - وہ بہت سے عہدوں پرجنکا تعلق قومی اعداد و شمار' جویات (Meteorology)' اوزان اور پیمانوں سے تھا مامور رہا - تعلیم عامہ کی مجلس اعلی کا ممبر ہوا - اس کی زباندانی کا یہ عالم تھا کہ وہ صرف اطالوی زبان ہی کا ماہر نہ تھا بلکہ یونانی و لاطینی میں ادب دسترس ہونے کے

علاوہ انگریزی اور جرمن زبانوں سے بھی واقف تھا - وہ محنت اور حیا میں ڈالٹن و شیل (Scheele) سے ملتا جلتا تھا - اعلی مراتب اور اعزازات کی مطلق پروا نہ کرتا تھا - اسی لئے سنہ ۱۸۳۰ ع میں ٹیورن میں جو سائنٹفک کانگرس منعقد ہوئی اس میں وہ صدر کا نائب بھی نہ ہوسکا - دراصل اس کی زندگی زمانہ سلف کے فلسفی کی طرح تھی - وہ ہمیشہ اپنے تعلیمی مشاغل میں محو رہتا تھا - لیکن اپنے فرائض جو شہری ہونے اور گھر کا مربی ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتے تھے انھیں کبھی فراموش نہ کرتا تھا - جس کلیہ کی بنا پر اس کا نام مشہور ہے نہ تو اس سے فوراً اس کی قدر دانی ہوئی نہ وہ مقبول ہوا - خیال کرنے کی بات ہے کہ سنہ ۱۸۱۱ ع میں اس نے یہ دعوی پیش کیا تھا - اس وقت تک کیمیا داں نظریہ جواہر سے بھی بخوبی واقف نہ ہوے تھے - بعد میں ڈالٹن اور اس کے معاونوں نے مشہور کیا - لفظ سالمہ اس وقت سائنٹفک ادب میں مفقود تھا - مگر ایوو گیڈ رو نے اپنے مضمون مطبوعہ رسالۂ طبیعیات جولائی ۱۸۱۱ ع میں کثرت سے اس کا استعمال کیا - اس مضمون سے قارئین کے دماغوں میں کچھ الجھن پیدا ہوگئی اور کہنے لگے کہ یہ ایک نیا الجھاوا ہے جو پہلے نہ تھا —

یہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے سنہ ۱۸۱۱ ع کے مضمون کو تمام و کمال دھرایا جاے جو انگریزی میں اول سے آخر تک المبک کلب ریپرنٹس (Alembic Club Reprints No. 4) میں شائع ہوچکا ہے اور جس کا لب لباب ہر ایک جدید کیمیاوی کتاب میں موجود ہے - لیکن پروفیسر واکر (Walker) کے مناسب نوٹ کا تذکرہ کرنا ضروری ہے جو بالکل صحیح ہے اور ذیل میں درج کیا جاتا ہے —

" ایوو گیڈرو پر یہ الزام لگایا گیا ھے کہ اس کے لفظ سالمہ (مالیکول) کے استعمال میں مطابقت نہیں ھے لیکن اس کے مضمون کے عمیق مطالعہ سے صاف ظاہر ھے کہ اس نے اس لفظ کو مختلف جگہوں پر مختلف صفتوں کے ساتھہ بیان کیا ھے - اس وجہ سے استعمال میں عدم مطابقت بالکل نہیں ھے - ذیل کی مثالوں سے یہ امر بالکل واضح ہوجاتا ھے —

" Mole'cule " جس کا انگریزی ترجمہ مالیکول ھے - جدید کیمیاوی اصطلاحات میں جہاں کہیں بغیر صفت کے استعمال کیا گیا ھے ' وہاں اس سے یا جوہر مراد ھے یا سالمہ —

" Molecule integrante "ترجمہ انٹیگرل مالیکول (Integral Molecule) اس سے عام مالیکول مراد ھے لیکن اس کو صرف مرکبات کے واسطے استعمال کیا ھے —

" Molecule constituante " ترجمہ کا نسٹی ٹیو نٹ مالیکول (Constituent molecule) عنصری شے کے سالمہ کے لئے استعمال کیا ھے —

" Molecule Elementaire " ترجمہ الیمنٹری مالیکول (Elementary Molecule) سے مراد عنصری شے کا جوہر ھے —

ناظرین کو معلوم ہونا چاھئے کہ ایوو گیڈرو ھی وہ شخص تھا جس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ بہت سے عناصر کے سالمات ایک سے زیادہ جوہر سے بنے ھیں - اس لئے بہت سے تعاملات کی ترکیبی کیفیت دکھائی جاسکتی ھے - جیسا کہ فی زماننا دہری تخریب یا تجزیہ (Double Decomposition) میں علامات کے ذریعہ سے ظاہر کیا جاتا ھے - اس وقت ہم صرف دو ترکیبی تعاملات کی طرف توجہ مبذول کرنا چاھتے ھیں - ایک میں ہائڈروجن کلورین کے ساتھہ ملی ھے اور دوسری میں آکسیجن سے متحد ھے - ان تعاملات کو حسب ذیل مساوات سے ظاہر کیا گیا ھے —

$$H\,H + Cl\,Cl = HCl + H\,Cl$$

$$H\,H + H\,H + OO = HOH + HOH$$
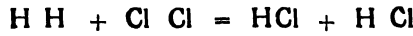
اس سے اور اسی قسم کی دوسری مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عنصر یا حاصل مرکب جب تک ایک ہی درجہ تپش اور دباو کے ایک ہی درجہ پر گیسی حالت میں رہتے ہیں ان کا حجم بھی ایک ہی ہوتا ہے —

یہ سوچ کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ ایووگیڈرو اور اس کے انکشافات کے ساتھہ ایک مدت تک کافی انصاف نہیں ہوا - سنہ ۱۸۱۴ ع میں فرانسیسی طبیعات داں امپیرے (Ampe're) نے برتھو لیت (Berthollet) کو ایک خط لکھا جس میں اس نے ایو وگیڈرو ہی کے الفاظ استعمال کیے - حالانکہ اس کے یہ خیالات و الفاظ تین سال قبل شائع ہو چکے تھے - نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی ایک عرصہ تک اس دعوی یا کلیہ کو امپیرے کے نام سے منسوب کرتے رہے - لیکن سنہ ۱۸۵۶ ع میں جب ایووگیڈرو وفات پا چکا تو کیمیائی دنیا' کنی زارو (Cannizzaro) کی تحریک پر اس کے ہم وطن کی نہ صرف خوبیاں اور اوصاف ماننے پر بلکہ اس کا کلیہ بااصول بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہوئی - ناظرین اگر ایوو گیڈرو کے ان مختصر حالات کی تفصیل چاہتے ہوں تو کنی‌زارو کے اس مضمون کا مطالعہ کریں جو اس نے اسی سلسلہ میں قلمبند کیا ہے اور اس پر کچھہ بحث بھی کی ہے —

برزیلیس کی وفات کے بعد سنہ ۱۸۴۸ ع میں علمی کیمیا بڑی کشمکش کی حالت میں تھی جس سے نکلنے میں اس کو بیس سال لگے - مرکب اصلیہ (Compound redical) کا نظریہ بنسن (Bunsen) کی کیکوڈائل (Cacodyle)

کی تحقیقات کی بنا پر اور لیبگ و ویلر (Wohler) کے بنزوائل (Benzoyle) اصابہ کی وجہ سے مقبول ہوچکا تھا لیکن ساخت یعنی سالمہ میں ترتیب جواہر کے خیالات بہت ہی پوچ و خام تھے - اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے تھا کیونکہ عناصر کے ترکیبی قاعدے یا گرفت عناصر کے وہ اصول جس کی بنا پر وہ ایک دوسرے سے متحد ہوتے ہیں بالکل معدوم تھے - جماعت بندی نظام نمونہ (Type system) کی بنا پر اپنے بچپن میں تھی - ولیمسن اور فرینکلینڈ کے کام کی اشاعت بغیر مزید ترقی کے نہیں ہوسکتی تھی - ایسے وقت میں اطالوی سائنس داں اسٹینسلاو کنی زارو (Stanislao Cannizzaro) نے ایووگیڈرو کے کلیہ کی تشریح کر کے بڑا کام کیا - اگرچہ یہ کام سائنٹفک دنیا کے سامنے سنہ ۱۸۵۸ ع میں شائع ہوا جب کہ اس کلیہ کے موجد ایو وگیڈرو کے مضمون کی اشاعت کو نصف صدی گذر چکی تھی —

دنیا میں بہت سے لوگ ایسے گذرے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں شہرت و عزت کی مطلق خواہش نہ کی - نام و نمود سے ہمیشہ اجتناب کیا اور قلیل عرصۂ حیات کو کسی نہ کسی بہتر کام میں صرف کرنے کی کوشش کی - یہی وجہ ہے کہ ان کا کام ان کی وفات کے بعد دنیا میں نمایاں ہوا - اپنی محنت کے اثمار سے وہ خود زندگی میں مستفید نہ ہوسکے - یہی حال ایو وگیڈرو کا تھا جو سنہ ۱۸۵۶ ع میں انتقال کر گیا اور دنیا میں ایسا کلیہ یا قانون چھوڑ گیا جس سے اس کا نام فانی اوراق تاریخ میں ہمیشہ جلی قلم سے درخشاں نظر آے گا —

پٹرولیم

اور اس سے حاصل شدہ اشیا

از

(محمد عبدالحی صاحب متعلم بی' ایس' سی' الہ آباد یونیورسٹی)

پٹرولیم بھی قدرت کی ان بے بہا نعمتوں میں سے ہے جن کی قدر انسان نے بہت دیر میں جانی - اور ابھی نہیں کہا جا سکتا آیا اب بھی وہ اس سے تمام امکانی فائدہ اٹھا سکا ہے یا نہیں - پٹرولیم کے وجود کے علم کا پتہ تو بہت پرانے زمانے میں لگتا ہے - بائبل میں بھی اس کا ذکر متعدد جگہ ہے اور دیگر پرانی تصنیفات میں بھی اس کا حوالہ اکثر ملتا ہے - ہیرو ڈوٹس یونانی (Herodotus) نے اس کا ذکر اکثر کیا ہے اور اس کو " بہت تیز بو دینے والا " لکھا ہے - اس نے بابل کے قریب تیل کے چشموں کا ذکر کیا ہے - ساتویں صدی میں جاپان میں اس کا نام " جلنے والا پانی " رہا ہے - سترھویں صدی کے آخر میں مار کو پولو نے باکو کے قریب تیل کے چشموں کا ذکر کیا ہے - تیل کے چشموں کے قریب کچھ گیسیں بھی نکلا کرتی ہیں جو جلنے والی ہوتی ہیں - باکو میں ان ہمیشہ جلنے والے چشموں کے گرد آتش پرستوں کے معبد رہے ہیں اور اس کو آسمانی نور جان کر مدتوں تک مسجود بتایا گیا ہے - موجودہ استعمال میں آنے سے پہلے تقریباً

ایک ہزار سال قبل سے باکو پارسی زائرین کا مرکز رہا ہے - برما کے دریاؤں میں اکثر پٹرولیم کا جزو ملا ہوا پایا جاتا ہے - اس دھنیت کو مدتوں تک وہاں کے باشندوں نے اس کو ان معتوبین کی چربی جانا ہے جو اپنے اعمال کی سزا میں دوزخ میں جلے اور جن کی جلی ہوئی ہڈیاں دریاؤں میں بہادی گئیں - ان تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے وجود کا علم بہت پرانا ہے مگر اس کو کام میں لانے اور اس سے ہزاروں ضروریات زندگی کو پورا کرنے کی نوبت ابھی حال میں آئی ہے - قبل اس کے کہ ہم یہ بتائیں کہ کن کن ممالک میں اور کس کس طرح اس کے استعمال اور صنعت کو ترقی ہوئی ایک بڑی دلچسپ بات بیان کرتے ہیں - جو سائنس دانوں کے لیے اب تک ایک زبردست مبحث رہی ہے - سوال یہ ہے کہ آخر پٹرولیم زمین کے اندر آیا کہاں سے ؟

سب سے پہلے مینڈلیف (Mendeleeff) نے اپنی رائے بیان کی - اس نے کہا کہ شاید پٹرولیم لوہے کے کاربائڈ (Iron carbide) سے بنا ہے - یہ تو معلوم ہی ہے کہ لوہا اور کاربن زمین کے اندر بکثرت موجود ہیں - ان کی ترکیب سے لوہے کا کاربائڈ بنا اور جب پرگرم بھاپ (Super - heated steam) نے اس کاربائڈ پر اثر کیا تو پٹرولیم بنا - مینڈلیف نے تجربہ خانے میں اس تجربہ سے ایک چیز بنائی جو پٹرولیم سے ملتی جلتی تھی ـــ

مگر اس رائے پر سائنس دانوں نے ایک اعتراض کیا کہ اگر پٹرولیم بطون ارض میں غیر نامیاتی (Inorganic) اشیا (کاربائڈ) سے بنا ہے تو اس کو مناظری طور پر عامل (Optically Active) نہ ہونا چاہیے مگر چوں کہ وہ مناظری عامل ہے لہذا یہ خیال صحیح نہیں ہے ـــ

اس کے بعد اینگلر (Engler) نے اپنی رائے ظاہر کی - اس نے بتایا

کہ یہ حیوانی مادہ کی کشید فارق (Destructive Distillation) سے بنا ہے جو زمین کے اندر بڑے دباؤ کے ماتحت عمل میں آئی ہے ۔ اس نے بھی اس عمل کو تجربہ خانے میں کیا اور ایک چیز حاصل کی جو مثل پٹرولیم کے تھی اور مناظری عامل بھی تھی ۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس قدر کثیر حیوانی مادہ ایک جگہ کیوں کر جمع ہوسکا ۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ممکن ہے کہ یہ جانور ہاتھی کی طرح بڑے ہوں اور ایک جگھہ مل کر رہتے ہوں یا کیڑوں کی طرح ایک جگھہ جمع ہوتے اور مرتے رہتے ہوں ۔ اس طرح ایک جگہ اس قدر حیوانی مادہ کا جمع ہونا کچھہ نا ممکن نہیں ۔ دوسرا اعتراض اس رائے پر یہ ہوا کہ ہر حیوانی مادے میں نائٹروجن جزو لازم ہے مگر پٹرولیم میں اس کا پتہ نہیں ۔ آخر یہ نائٹروجن کہاں گئی ؟ اس کا کوئی اطمینان بخش جواب نہ ملا اور اس طرح یہ رائے بھی مسترد کردی گئی —

اس کے بعد ہیفلر (Heffler) نے کہا کہ نباتاتی مادہ کی کشید فارق کا نتیجہ ہے مگر نباتاتی مادہ کی خشک کشید فارق میں کوئلہ لازمی طور پر پیدا ہوتا ہے لہذا پٹرولیم کے نزدیک کوئلہ پایا جانا چاہیے ۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ تقریباً تمام پٹرولیم کے کنوؤں سے کوئلہ بہت دور پایا جاتا ہے ۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ممکن ہے کہ پٹرولیم زمین کے اندر اندر دور تک نکل گیا ہو اور کوئلہ سے دور ہوگیا ہو ۔ مگر دوسرے اعتراض کا کوئی جواب نہ دیا جاسکا ۔ وہ اعتراض یہ تھا کہ بالعموم نباتاتی مادہ میں گندھک کا جزو نہیں پایا جاتا مگر تقریباً ہر قسم کے پٹرولیم میں کم از کم ۲ فی صدی گندھک کا جزو ہوتا ہے ۔ یہ کہاں سے آیا ؟ اس کا کوئی جواب نہ دیا جا سکا اور یہ رائے بھی شبہ میں پڑ گئی ۔ آج تک یہ مسئلہ سائنس دانوں کے درمیان زیر بحث ہے —

پٹرولیم زمین کے اندر مختلف گہرائیوں پر پایا جاتا ہے۔ بعض مقامات پر یہ زمین کے اندر ایک بڑے دباؤ کے ماتحت ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اس کو نکالنے کے لیے زمین میں سوراخ کیا جاتا ہے تو یہ بغیر پمپ کئے ہوئے خود بخود بڑے زور سے فوارہ کی شکل میں نکلنے لگتا ہے۔ بعض اوقات یہ بہت دور تک پھیل جاتا ہے۔ اس کے ساتھہ ساتھہ بہت سے ہائیڈرو کاربن (Hydro Carbon) گیس کی شکل میں نکلتے ہیں۔ زمین سے نکالنے کے لئے سخت چٹانوں میں سوراخ کرنا پڑتا ہے۔ اس سوراخ کا قطر ۴ فٹ سے لیکر ۱۲ فٹ تک ہوتا ہے اور چند فٹ سے لیکر ۶ ہزار فٹ تک گہرا ہوسکتا ہے۔ سوراخ کرنے کے لئے برمے کی قسم کا آلہ ہوتا ہے جو بھاپ کے انجن سے چلایا جاتا ہے۔ اس میں ایک تدبیر ایسی کی گئی ہے کہ اس کی دھار خود بخود تیز ہوتی رہے اور کام برابر جاری رہے۔ یہ ممکن ہے کہ دوران عمل اس آلہ کی نوک اس قدر گرم ہوجائے کہ پگھل جائے یا نرم ہوکر مڑجائے یا زمین سے نکلتی ہوئی پٹرولیم کی گیسوں کو جلادے۔ لہذا اس آلہ کو خول دار بنایا جاتا ہے اور ٹھنڈے پانی کی رو برابر اس کے اندر جاری رکھی جاتی ہے یا برف سے ٹھنڈا کیا ہوا گارا استعمال کیا جاتا ہے۔ سوراخ ہونے کے بعد یا تو پٹرولیم خود زمین کے اندر سے اُبلتا ہے یا مشینوں کے ذریعہ پمپ کرکے نکالا جاتا ہے —

نکالنے کے بعد سب سے پہلا عمل اس کے صاف کرنے کے متعلق یہ کیا جاتا ہے کہ اس کو کشید فارق کے ذریعہ مختلف ہائیڈرو کاربنوں میں علیحدہ کرلیا جاتا ہے۔ اس کی مفصل تشریح ابھی بیان کی جائےگی۔ صاف کرنے میں پانی کی کثرت سے ضرورت ہوتی ہے لہذا صاف کرنے

والی فکٹریاں دریاوں کے کناروں یا سمندر کے ساحلوں پر واقع ہوتی ہیں - جہاں اندرون ملک سے پٹرولیم پائپ لائن کے ذریعہ لایا جاتا ہے - پٹرولیم کو مخروطی شکل کے ظرف میں رکھا جاتا ہے اور ۲ فی صدی گندھک کا ترشہ ملا دیا جاتا ہے - بہت دباو والی ہوا کے ذریعہ متحرک کیا جاتا ہے - پھر پانی سے بار بار دھوکر ۴۰ فی صدی کاسٹک سوڈا (Sodium Hydroxide) ملا دیا جاتا ہے - اس طرح پٹرولیم پہلے قلوی اجزا اور پھر ترشئی اجزا سے پاک ہوجاتا ہے - اب پٹرولیم کا رنگ سیاہ سے ہلکا بھورا ہوجاتا ہے - پہلے اس کو سفید کرنے کے لئے اتھلے برتنوں میں بھر کر کانچ کی پتلی چادروں سے ڈھک دیا جاتا تھا اور دھوپ میں رکھا رہنے دیا جاتا تھا - مگر اب سفوف رنگ کٹ (Bleeching powder) استعمال کیا جاتا ہے - پٹرولیم صاف کرنے والی فیکٹریوں کے قریب رنگ کٹ سفوف کی بھی فکٹریاں قائم ہیں - صاف کرنے کے بعد پھر کشید فارق کا عمل ہوتا ہے اور اس طرح یہ عمل پورا ہو جاتا ہے - اس کشید فارق سے بہت سی مختلف‌الفوائد اشیا دستیاب ہوتی ہیں - قبل اس کے کہ ان اشیا کا مفصل حال بیان کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پٹرولیم کی کیمیائی ماہیت کے متعلق کچھہ بتا دیا جائے —
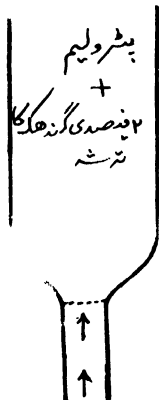
پٹرولیم میں خاص اجزا کاربن (C) اور ہائیڈروجن (H) ہیں - کچھہ تھوڑی گندھک او آکسیجن بھی پائی جاتی ہیں - خاص اجزا کے مرکبات کا اجمالی نام ہائیڈرو کاربن ہے اور دوسری چیزیں ملاوٹ

سمجھی جاتی ھیں - ھائیڈرو کار بن مندرجۂ ذیل تین اقسام کے پائے جاتے ھیں —

۱ - دھنیت والے (Aliphatic)

۲ - بو رکھنے والے (Aromatic)

۳ - بو رکھنے والے جن میں ھائیڈروجن کے جوھر کا تناسب زیادہ ھے -
Hydro-aromatic

۱ - دھنیت والے ھائیڈرو کاربن میں مندرجۂ ذیل اشیا شامل رھتی ھیں
(۱) پیرافن (Paraffine) جن کے سالمہ میں ھائیڈروجن کے جواھر کی تعداد زیادہ سے زیادہ ھوتی ھے - اور کسی مزید جوھر کی کوئی گنجائش نہیں ھوتی - ان کا عام ضابطہ (General Formula) ($C_n H_{2n+2}$) ھوتا ھے - ان میں مندرجہ ذیل اشیا شامل ھیں

میتھین	Methane
ایتھین	Ethane
پر و پین	Propane
وغیرہ	

(ب) اولی فین (Olefin) جن کے سالمہ میں ھائیڈروجن کے جواھر کی تعداد پیرافن کے مقابلہ میں کم ھوتی ھے اور جن کا عام ظابطہ ($C_n H_{2n}$) ھوتا ھے - ان میں مندرجۂ ذیل اشیا شامل ھیں —

ایتھیلین	Ethylene
پروپیلین	Propylene
بیوٹی لین	Butylene
وغیرہ	

(۲) بو رکھنے والے ہائیڈرو کاربن میں مندرجہ ذیل اشیا پائی جاتی ہیں

بنزین	Benzine
ٹولواین	Toluene
نیپتھلین	Naphthalene
اینتھراسین	Anthracene

۳ - بو رکھنے والے جن میں ہائیڈروجن کے جوہر کا تناسب زیادہ ہے۔ اس قسم میں مندرجہ ذیل نوعیت کے مرکبات پائے جاتے ہیں مثلاً ہائیڈروجن کے ۶ جواہر زیادہ والی بنزین۔ Hexyhydrobenzine

یہ تمام ہائیڈرو کاربن مختلف قسم کی اشیا کی شکل میں پٹرولیم سے علیحدہ کیے جاتے ہیں۔ ان کو جدا جدا کرنے کے لیے جیسا کہ اوپر بیان ہوا کشید فارق کا عمل کیا جاتا ہے۔ کشید فارق سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ اس صاف کیے ہوئے پٹرولیم کو پہلے دھیمی اور پھر رفتہ رفتہ تیز حرارت کے زیر اثر کشید کیا جاتا ہے۔ درجۂ حرارت کے اختلاف کے ساتھ ساتھ مختلف اشیا حاصل ہوتی ہیں جو مختلف کاموں میں لائی جاتی ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے :—

صفر درجہ مئی (سینٹی گریڈ) سے ۴۰ درجہ مئی تک :—

اس تپش پر صرف گیسیں حاصل ہوتی ہیں۔ ہندوستان اور برما میں چونکہ موسم گرم ہوتا ہے اس وجہ سے یہ پہلے ہی خارج ہو جاتی ہیں۔ یہ گیسیں برف سازی میں کام آتی ہیں —

۴۰ درجۂ مئی سے ۷۰ درجہ مئی تک :—

پٹرولیم ایتھر حاصل ہوتا ہے جو رال، موم، چربی، تیل وغیرہ کے حل کرنے میں کام آتا ہے اور سرد ممالک میں پٹرول کے ساتھ ملا دیا جاتا

ہے تاکہ وہ جلد آگ پکڑ سکے —

۷۰ درجہ مئی سے ۱۲۰ درجہ مئی تک :-

پٹرول کشید کیا جاتا ہے جو موٹروں اور ہوائی جہازوں کے انجنوں میں جلایا جاتا ہے —

۱۲۰ درجہ مئی سے ۱۶۰ درجہ مئی تک : —

ہلکا مٹی کا تیل حاصل ہوتا ہے جو اعلی قسم کا ہوتا ہے (مثلاً اشرفی یا ہاتھی مارکہ وغیرہ) یہ تیل لیمپوں اور بعض بڑے انجنوں میں جلانے کے کام آتا ہے —

۱۶۰ درجہ مئی سے ۱۸۰ درجہ مئی تک : —

اوسط درجہ کا مٹی کا تیل ملتا ہے جو کچھہ بھورے رنگ کا ہوتا ہے اور جلنے میں اتنا اچھا نہیں ہوتا جتنا کہ ہلکا تیل - یہ خاص قسم کے لیمپوں میں جلا یا جا سکتا ہے - بہت بڑے انجنوں میں بھی جلا یا جاتا ہے —

۱۸۰ درجہ مئی سے ۲۲۰ درجہ مئی تک :-

رنگین مٹی کا تیل ملتا ہے جو روشنی صاف نہیں دیتا ہے اور دقت سے جلتا ہے - ریلوے کے سگنلوں وغیرہ میں استعمال ہوتا ہے- سستا ہونے کے باعث اور لوگ بھی استعمال کرتے ہیں —

۲۲۰ درجہ مئی سے ۲۶۰ درجہ مئی تک :—

ہلکا تہ ہینی تیل (Lubricating oil) حاصل ہوتا ہے جو ہلکی مشینوں کے پرزوں کی تہ ہین میں کام آتا ہے - مثلاً چھوٹے انجن؛ بائسکل - سینے کی مشین وغیرہ —

۲۶۰ درجہ مئی سے ۳۰۰ درجہ مئی تک —

اوسط درجہ کا تہ ہینی تیل ملتا ہے جو سیاہ رنگ کا ہوتا ہے اور

بڑے انجنوں کے پرزوں میں لگانے کے کام آتا ہے —

۳۰۰ درجہ مئی سے ۴۵۰ درجہ مئی تک :—

" بھاری " تدھینی تیل ملتا ہے جو بہت بڑے بڑے انجنوں یا ریل گاڑی کے پہیوں کے دھروں کے چکنا کرنے میں کام آتا ہے - یہ بہت گاڑھا ہوتا ہے اور بھاری مشینوں میں کچھہ ٹھہر سکتا ہے جہاں ہلکا تیل کام نہیں دے سکتا —

۴۵۰ درجہ مئی سے ۶۰۰ درجہ مئی تک —

ویسلین (Vaselene) دستیاب ہوتی ہے جو صاف اور خوشبو دار بنا کر بازار میں فروخت ہوتی ہے - یہ مختلف قسم کے مرہموں میں کام آتی ہے - اور بہت سی ادویات میں بھی استعمال ہوتی ہے - بذات خود اچھا مسہل ہے - لوہے کو زنگ سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے —

۶۰۰ درجہ مئی سے زیادہ —

پیرفن ویکس (Paraffin wax) حاصل ہوتا ہے - یہ سفید موم کی قسم کی ایک شے ہے - جس میں ۳ سے لے کر ۱۵ فی صدی تک اسٹیرک ترشہ (Stearic Acid) ملاکر موم بتیاں بنائی جاتی ہیں - اگر ویکس کچھہ عرصہ تک ہلکے دباو کے تحت رکھا جائے تو اس کے سالمہ میں جواہر کی ترتیب میں فرق ہونے کی وجہ سے یہ شفاف ہو جاتا ہے - مگر ذراسی ٹھیس لگنے سے یہ ترتیب بگڑ جاتی ہے اور ویکس پھر اپنی اصلی صورت پر آ جاتا ہے —

اس کے بعد سیاہ کوئلہ یا Coke باقی رہ جاتا ہے —

گرفت پر برقی حیثیت سے نظر

از

(جناب سید عبدالحکیم صاحب ایم ایس سی ' ایل ٹی)

بڑے سے بڑے اجرام فلکی اپنی ساخت میں کچھہ وھی مشابہت رکھتے ھیں جو کائنات کے چھوٹے سے چھوٹے ذروں میں پائی جاتی ھے - ھماری سائنس آھستہ آھستہ آگے بڑھ رھی ھے - مگر اس بحر بے پایاں میں باوجود اتنی مسافت کے جب نظر اٹھتی ھے تو ساحل کی دوری کچھہ ویسی ھی نظر آتی ھے جیسی پہلے تھی - ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ ایک دوسرے میں عناصر کی تبدیلی کے خیال کو سائنس کی مستند ھستیوں نے ایک خیال موھوم سے زیادہ تصور نہ کیا تھا - مگر چند تابکار (Radio Active) عناصر (ریڈیم - ایکٹنیم - پولونیم - یورے نیم اور تھوریم) کے انکشاف نے ' جو نہایت سرعت سے ایک دوسرے میں تبدیل ھوجاتے ھیں ' اس بھولے ھوئے افسانے کو از سر نو تازہ کردیا - انسانی دماغ اب اس جستجو میں پڑ گیا کہ کیا یہ ممکن ھے کہ تانبے اور سیسے کے مثل کم قیمت دھاتیں سونے اور چاندی کی طرح قیمتی دھاتوں میں تبدیل ھوسکیں - دوسرے لفظوں میں کیا یہ ممکن ھے کہ عناصر کی قلب ماھیت ھوسکے - اپنے اس قیاس کو کامیاب بنانے کے واسطے

اُس نے یہ ضروری سمجھا کہ عناصر کے جزو لا یتجزا کی ماہیت کو کامل طور سے سمجھے۔ لیکن جوہر کی اصل حقیقت کا پتہ اسی وقت سمجھ میں آتا ہے جب گرفت (Valency) کے پیچیدہ مسئلے کو حل کیا جاسکے۔ 'گرفت' سے مراد مادے کی وہ صفت ہے جو مختلف اشیا کو آپس میں ترکیب دینے کا باعث بنتی ہے۔ گرفت کے تشریح طلب معنی کو چند عملی مثالوں سے سمجھا دینا نامناسب نہ ہوگا—

اگر نیلے تھوتھے ($CuSO_4$) کے محلول میں لوہے کا ایک ٹکڑا ڈال دیا جاتا ہے تو مندرجۂ ذیل تبدیلی واقع ہوتی ہے—

$$CuSO_4 + Fe = FeSO_4 + Cu$$

نیلہ تھوتھا لوھا کسیس تانبا
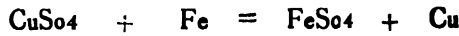
لوھا تانبے کی جگہہ پر آ جاتا ہے اور تانبا علحدہ ہوجاتا ہے۔ بجائے نیلے تھوتھے کے کسیس کا محلول بن جاتا ہے۔ اس صفت یا قوت کا نام جس نے لوہے کو اخذ کرکے تانبے کو آزاد کردیا 'گرفت' ہے۔ اسی طرح پر سلور نائٹریت ($AgNO_3$) کا محلول معمولی نمک کے محلول سے ترکیب پانے پر سلور کلورائڈ (AgCl) بناتا ہے—

$$AgNO_3 + NaCl = AgCl + NaNO_3$$
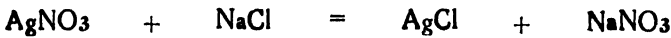
سلور نائٹریت نمک سلور کلورائڈ سوڈیم نائٹریت

یہاں پر اسی صفت کے تحت چاندی (Ag) اپنے قدیمی دوست (NO_3) کا ساتھہ چھوڑ کر کلورین (Cl) کا ساتھہ دیتی ہے۔ اور مجبوراً سوڈیم (Na) اپنے اولین دوست کو خدا حافظ کہکر (NO_3) کے ساتھہ رشتۂ اتحاد جوڑتا ہے۔ اس قوت کا نام جس نے سوڈیم کو کلورین سے اور چاندی کو (NO_3) سے جدا کردیا اور نئے رشتۂ اتحاد پیدا کردئے 'گرفت' ہے۔ ایک

اور مثال دی جاتی ہے —

$$2HI \underset{\rightarrow}{\overset{440^\circ}{\leftarrow}} H_2 + I_2$$

(۸۰ فیصدی) (۲۰ فی صدی)
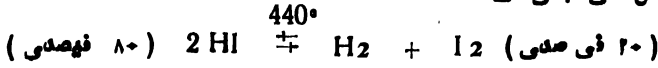
اس صورت میں جب ہائیڈروجن آئیڈائڈ (HI) (۴۴۰°) کی تپش پر ہائڈروجن اور آئیڈین میں منتشر ہوتی ہے تب یہ آخری دو عناصر پھر آپس میں مل جاتے ہیں اور ہائیڈروجن آئیڈ آئڈ بنادیتے ہیں۔ ایک طرف (۴۴۰°) کی تپش ان دونوں عناصر کو منتشر کرتی ہے اور دوسری طرف ایک چھپی ہوئی کشش جس کا نام گرفت ہے ان دونوں کو پھر ملا دیتی ہے۔ اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کبھی بیس فی صدی سے زیادہ ہائڈروجن اور آئیڈین منتشر نہیں ہوتیں۔ ایسی ہی بیشمار مثالوں پر نظر ڈالنے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سبب ہے کہ کوئی سی دو یا ان سے زیادہ چیزیں کبھی تو آپس میں مل کر ایک نئی صورت پیدا کر لیتی ہیں اور کبھی دوسرے عناصر کی موجودگی میں یہ منتشر ہو کر نئے مرکبات یا عناصر پیدا کردیتی ہیں۔ جستجو میں رہنے والے دماغ چین سے نہیں بیٹھتے۔ مختلف خیالات آتے ہیں۔ کبھی تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیمیاوی کشش جو مختلف چیزوں کے درمیان میں رشتۂ اتحاد پیدا کرتی ہے کہیں اُن جذبات سے تو مشابہ نہیں ہے جو دوست دوست میں یا دشمن دشمن میں پائے جاتے ہیں۔ وہ روح اور جسم کے پیچیدہ مسئلے پر غور کرتا ہے لیکن اس مشابہت سے بھی اُس کو تسلی نہیں ہوتی۔ وہ مقناطیسی کشش کے قوانین کی طرف غور کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ شمالی قطب اپنے مخالف قطب کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ لیکن کسی مقناطیس کے شمالی قطب سے کسی دوسرے مقناطیس کا شمالی قطب

دور ہٹ جاتا ہے - چونکہ یہ مقناطیسی کشش صرف فولاد کے مثل چند چیزوں کے واسطے مخصوص ہے اِس خصوصیت نے اُس کے خیالات کو بھی محدود کردیا اور وہ اب آگے بڑھتا ہے اور برق کی جانب متوجہ ہوتا ہے - مقناطیس کی طرح یہاں پر بھی اُس کو قوت برقی کی دو مخالف قسمیں ملتی ہیں لیکن اِن کا دائرۂ اثر مقناطیس کی طرح چند چیزوں پر محدود نہیں ہے- اب وہ اِس فکر میں پڑتا ہے کہ گرفت کے مسئلے میں قوت برقی کس طرح پر کام کرتی ہے - بیشمار عملی تجربات کے بعد یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں یہ دونوں متضاد برقی قوتیں مساوی طور پر موجود ہیں- اور ہر ایک کیمیائی تبدیلی دراصل اسی برقی قوت کے تحت میں کام کرتی ہے- برزیلیس (Berzilius) فراڈے (Fraday) اوردوسرے علمائے سائنس نے ایک سو برس قبل اس بات کو ثابت کردیا تھاکہ تمام مرکبات اپنے محلول میں دو روانوں (Ions) میں منتشر ہوجاتے ہیں اور ہردو رواں علحدہ علحدہ اِن ہی دو متضاد برقی قوتوں کے زیر اثر ہوتے ہیں- ایک روان پر مثبت برق کا بار ہوتا ہے اور دوسرے پر منفی برق کا اثر ہوتا ہے- مثلاً نمک کے محلول میں سوڈیم اور کلورین روانوں کی ایک آمیزش ہوگی ($NaCl = \overset{+}{Na} + \overset{-}{Cl}$) سوڈیم پر مثبت بار اور کلورین پر منفی بار ہوگا - یہ واضح رہے کہ سوڈیم اور اور کلورین کے جوہر برق کے زیر اثر معمولی سوڈیم اور کلورین کے جوہروں سے جو برق سے اثر پذیر نہیں رہتے اپنے اپنے خواص میں بالکل جدا ہوتے ہیں - برقایا ہوا سوڈیم ($\overset{+}{Na}$) معمولی سوڈیم سے بالکل مختلف ہے اور جب تک یہ برقی قوت سے وابستہ ہے یہ اپنے حسب معمول خواص کا اظہار نہیں کرسکتا - یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ اِن روانوں پر جو برقی بار موجود رہتے ہیں وہ مختلف عناصر میں مختلف تعداد میں معین رہتےہیں - اور جس اُستواری اور مضبوطی سے یہ بار عناصر کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں وہ بھی

ہر صورت میں علحدہ علحدہ ہے۔ پوٹاشیم ($\dot{K}$) سوڈیم ($\dot{Na}$) کلورین ($\bar{Cl}$) وغیرہ پر جو بار رہتے ہیں۔ وہ اِن عناصر سے نہایت مضبوطی کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں اور اس وجہ سے اِن روانوں کو قوی روان (Strong ions) کہتے ہیں۔ برخلاف اس کے چاندی $\dot{Ag}$, $\dot{OH}$, Cy اپنے باروں کو آسانی کے ساتھ علحدہ کر دیتے ہیں۔ ان کو کم زور روان (Weak ions) کہتے ہیں۔ جس قوت سے کسی عنصر کا کوئی روان ان برقی بار کو اپنے سے وابستہ رکھتا ہے وہ قوت برقی کشش یا برقی گرفت (Electrical affinity) کہلاتی ہے۔ روانوں پر برقی کشش زیادہ رہتی ہے اس لئے اُن کو خالص حالت میں تیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ علحدہ ہوتے ہی فورا دوسرے عناصر یا مرکبات سے مل جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے کم زور روان آسانی سے تیار ہو جاتے ہیں۔ جب کسی قوی رواں کا عنصر کسی کم زور رواں کے عنصر سے ملتا ہے تو آخر الذکر رواں کا برقی بار اول الذکر عنصر پر منتقل ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر جست پر برقی کشش زیادہ تیز ہوتی ہے بمقابلہ تانبے کے۔ ایسی صورت میں اگر تانبے کے کسی نمک کے محلول میں جست ڈال دیا جائے تو تانبا علحدہ ہوجائے گا اور تانبے کا برقی بار جست پر منتقل ہوجائے گا —

$$Zn + \ddot{Cu} = \ddot{Zn} + Cu$$

جستہ   تانبا (بار)   جستہ (بار)   تانبا
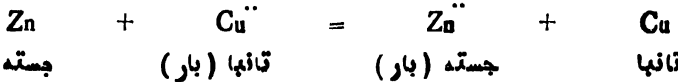
جست کی برقی کشش ہائڈروجن کی برقی کشش سے بہی زیادہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جست ہائیڈروجن کو ہلکے ترشے سے نکال دیتا ہے —

$$Zn + 2\dot{H} = \ddot{Zn} + H_2\uparrow$$

جست   ہائڈروجن (بار)   جست (بار)
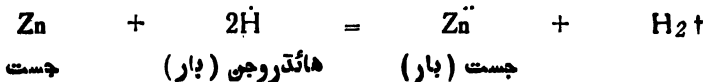
اسی طرح پر کلورین برومین کو اور برومین آیوڈین کو ان عناصر کے نمکوں کے محلولوں سے علحدہ کرے گا —

$$Cl_2 + \underline{2\dot{K} + 2\bar{Br}} = \underline{2\dot{K} + 2\bar{Cl}} + Br_2 \quad Br_2 + \underline{2\dot{K} + 2\bar{I}} = \underline{2\dot{K} + 2\bar{Br}} + I_2$$
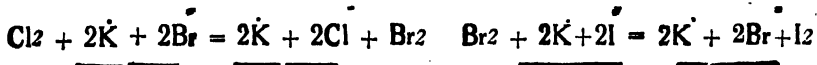
اس برقی کشش کے استحکام کے لحاظ سے عناصر کی ایک فہرست حاشیہ پر دیجاتی ہے ۔

ابھی تک کیتھوڈی (Cathode)، لینارڈی (Lenard) اور رنٹگنی (Rontgen) شعاعوں کا انکشاف نہیں ہوا تھا۔ ان شعاعوں کے انکشاف پر برقیے کا ظہور وجود میں آتا ہے۔ اولاً کیتھوڈی شعاعوں کی نسبت یہ خیال کیا گیا کہ وہ اس گیس کے چھوٹے چھوٹے ذرات پر مشتمل ہیں جو نلی میں خلا پیدا کرنے کے بعد تھوڑی سی باقی رہ جاتی ہے - اور ان ذرات پر منفی برق کا بار ہے ۔ لیکن یہہ خیال غلط ثابت ہو گیا کیونکہ ان برقیوں کا کوئی تعلق گیس کے ساتھ نہ تھا - جے ۔ جے تھامسن نے جلد صحیح رائے کا اظہار کردیا - ان کے خیال کے بموجب یہ برقیے جوہر کے منتشر ہونے پر پیدا ہوتے ہیں - ان پر منفی برق کا بار رہتا ہے اور اپنے وزن میں ہائڈروجن کے جوہر سے تین ہزار گنا چھوٹے ہوتے ہیں - مختلف گیس سے جو برقیے بنے اُن میں آپس میں کوئی فرق نہیں ہوتا - اس بناء پر یہ خیال کیا گیا کہ تمام گیسوں میں ایک ہی قسم کے برقیے مشترک ہیں ۔ مرطوب ہوامیں اِن برقیوں کی ایک باڑہ مارنے پر پانی کے چھوٹے چھوٹے ذرات ہر برقیے کے چاروں طرف چمٹ جاتے ہیں اور پانی کی بوندیں برس پڑتی ہیں ۔ امریکہ کے علماے سائنس نے اُڑتے بادلوں پر برقیوں کی باڑہ مار کر عملی طور سے پانی برسایا ہے ۔

عناصر	Elements
سیزیم	Caesium
ربی ڈیم	Rubidium
پوٹیشیم	Potassium
سوڈیم	Sodium
لیتھم	Lithium
بیریم	Barium
استرانشیم	Strantium
کیلشیم	Calcium
مگنشیم	Magnesium
المونیم	Aluminium
کرومیم	Chromium
میگنیز	Manganese
جست	Zinc
لوہا	Iron
کوبلٹ	Cobalt
نکل	Nickel
رانگ	Tin
سیسہ	Lead
ہائڈروجن	Hydrogen
انٹی منی	Antimony
بسمتھ	Bismuth
آرسینک	Arsenic
تانبا	Copper
پارہ	Murcury
چاندی	Silver
پلیڈیم	Palladium
پلیٹینم	Platinum
سونا	Gold
اریڈیم	Iridium
روڈیم	Rhodium
آسمیم	Osmium
سلیکن	Silican
کاربن	Carbon
بورن	Boron
نائٹروجن	Nitrogen
سلینم	Selenium
فاسفورس	Phosphorus
گندھک	Sulphur
آیوڈین	Iodine
برومین	Bromine
کلورین	Chlorine
آکسیجن	Oxygen
فلورین	Florine

منفی برقیوں کے ساتھ ساتھ دوسری شعاعوں میں مثبت برقیے بھی دریافت ہوئے ہیں - مثبت برقیوں کا وزن منفی برقیوں سے قریب قریب سترہ سو گنا ہوتا ہے - اگرچہ مثبت برقیوں کی نسبت ابھی تک بہت کم معلومات حاصل کی گئی ہیں —

اس نکتۂ نظر سے عنصر ایسے ذروں کا مجموعہ ہوا جن کو جوہر کہتے ہیں اور ہر جوہر دوحصوں میں منقسم ہوسکتا ہے - ایک تو مرکز پرقائم رہنے والا حصہ جس کو مرکزہ (Nucleus) کہتے ہیں- اور دوسرا حصہ ان برقیوں کا جو مرکزہ کے چاروں طرف گردش کرتے ہیں اور ان پر منفی بار ہوتا ہے - مختلف عناصر میں برقیوں کی تعداد اور گردش کے راستے مختلف ہوتے ہیں - ان برقیوں کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بڑی تیزی سے ایک گولے کے مرکز کے چاروں طرف ایک خاص ہم مرکز بیضوی راستوں پر گردش کرتے رہتے ہیں - چونکہ ان پر منفی بار رہتا ہے لہذا گردش کے دوران میں وہ ایک دوسرے کو ہٹاتے رہتے ہیں - اور چونکہ مرکزے پر مثبت بار رہتا ہے لہذا وہ اِن برقیوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے - مگر ان کی تیز رفتاری کی وجہ سے ان میں ایک قسم کی مرکز گریز قوت (Centrifugal Force)
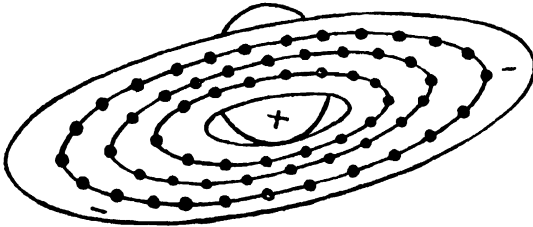
جے جے تھامسن کے خیال کے بموجب برقیے ایک گولے کے گرد جس پر مثبت بار ہے ہم مرکز بیضوی راستوں پر گردش کر رہے ہیں - اور یہ صورت مانند (زحل) سیارے کی ہے —

پیدا ہو جاتی ہے - جو ان کو مرکز سے ایک خاص فاصلے پر گردش میں رکھتی ہے۔ لوئی (Lewis) اور لانگ نیر (Longnuir) اس مسئلے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ برقیے متحرک نہیں ہیں بلکہ مرکزے کے اطراف مختلف ہم مرکز کھوکھلے مکعب کے گوشوں پر آویزاں رہتے ہیں - ان منفی بار دار برقیوں کی تعداد اتنی ہی ہوتی ہے جتنی مرکزے پر مثبت باردار آزاء

برقیے جن کو بدویہ (Proton) کہتے ہیں، ہوتے ہیں - دوسرے لفظوں میں یہ تعداد کسی عنصر کے جوہری عدد (Atomic Number) کے مساوی ہوتی ہے - مثال کے طور پر ہیلیم پر دو برقیے رہتے ہیں اور اس کے مرکزے پر اس طرح پر دو مثبت بار والے بدویے آزاد ہوجاتے ہیں - اور یہی ہیلیم (He) کا جوہری عدد ہے - ان برقیوں کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مرکزہ کی متضاد سمتوں میں آویزاں رہتے ہیں - جب بیرونی مکعب کے تمام گوشوں پر یہ برقیے آویزاں ہوجاتے ہیں اور کوئی گوشہ خالی نہیں رہتا تب اس کے اطراف دوسرے ہم مرکز مکعب کا وجود ہوتا ہے - اور اس نئے مکعب کے بڑی تمام گوشے بالترتیب ایک برقیے سے لے کر آٹھہ برقیوں میں پر ہوجاتے ہیں - جوں جوں یہ برقیے گوشوں پر لٹکتے جاتے ہیں اُسی طرح نئے عناصر وجود میں آتے جاتے ہیں - مثال کے طور پر ہیلیم (He) کے اوپر جو ہم مرکز مکعب کا خول چڑھتا ہے اور اس مکعب کے گوشوں پر ایک سے آٹھہ برقیے آویزاں ہوجاتے ہیں تب مندرجۂ ذیل عناصر وجود میں آ جاتے ہیں —
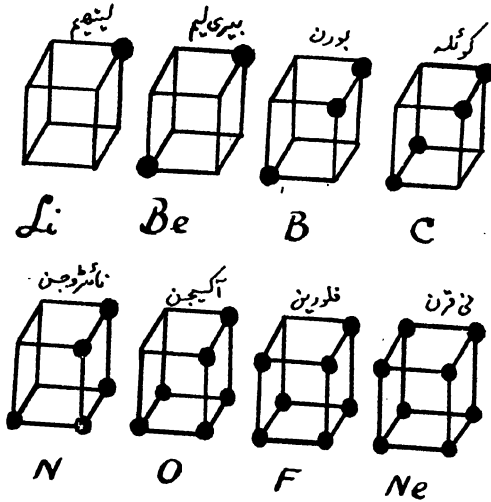
اُن عناصر کے جوہروں کا خاکہ جو ہیلیم پرمکعبی خول چڑھنے پر پیدا ہوتے ہیں اور ان کے گوشوں پر برقیے آویزاں ہونے پر دو مختلف عناصر میں تبدیل ہوجاتے ہیں —

اس طرح پر لیتھم سے ابتدا ہوتی ہے اور یہ سلسلہ نیان پر جاکر ختم ہو جا تا ہے- اب ان پر تیسرا ہم مرکز مکعبی خول چڑھتا ہے اور دوسرے عناصر وجود میں آتے ہیں - پس اگر ہم کسی طرح ان مکعبی خولوں کے چڑھانے اور ان کے گوشوں پر برقیے آویزاں کرنے پر قدرت حاصل کرلیں تو ہم عناصر کو بھی ایک دوسرے میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے - اور انسان نہایت آسانی سے تانبے یا سیسے کی مثل کم قیمت دھاتوں کو سونے یا چاندی کے مثل قیمتی دھاتوں میں تبدیل کر سکے گا - اور اپنے دیرینہ خیالات کو عملی جامہ دینے میں کامیاب ہو جائے گا - اس سمت میں سرتوڑ کوشش کی جا رہی ہے اور بہت کچھ کامیابی حا صل ہو چکی ہے - یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ان برقیوں میں کمی یا زیادتی صرف ان برقیوں پر ہو سکتی ہے جو سب سے اوپر کے مکعبی خول پر آویزاں ہوتے ہیں - اگر کسی خول پر ایک برقیے کی کمی ہو جا تی ہے تو اس کو برقی مثبت (Electro Positive) اور اگر زیادتی عمل میں آتی ہے تو برقی منفی (Electro Negative) کے نام سے موسوم کرتے ہیں - یہ مسئلہ مندرجۂ ذیل مثالوں سے صاف ہو جا تا ہے- جب لیتھیم اور فلورین عناصر کے درمیان ترکیب کیمیاوی وقوع میں آتی ہے تب لیتھیم فلورائڈ (Lif) کا مرکب اس طرح پر بنتا ہے کہ لیتھیم ایک برقیہ خارج کرتاہےاور فلورین اس کو حا صل کر تا ہے- اب چونکہ لیتھیم کے جوہر سے ایک برقیہ خارج ہوجاتا ہے لہذا اس میں ایک بدویہ کی زیادتی ہوجاتی ہے (اولاً برقیے اور بدویے مساوی تعداد میں موجود تھے) اور اب اس جوہر پر مثبت برق کا اثر ظاہر ہوجاتا ہے - اس کے بالکل خلاف فلورین پر اثر پڑتا ہے - یعنی وہ منفی برق کا اثر ظا ہر کرتا ہے - اور اسی وجہ سے برقی منفی کے نا م سے موسوم کیا جا تا ہے - کیمیاوی تحریر میں یہ تبدیلی اس طرح پر ظاہر کی گئی ہے —

اب ایک پر منفی بار ہے اور دوسرے پر مثبت بار اور دونوں متضاد برق کی کشش سے متحد ہوکر ایتھیم فلورائڈ (Li F) بناتے ہیں - اگرچہ بظاہر دونوں علحدہ علحدہ معلوم ہوتے ہیں —
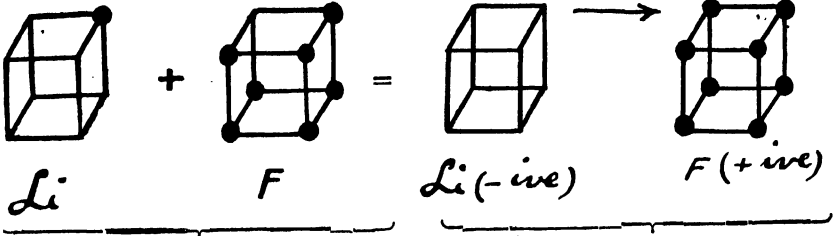
اس وقت دونوں عناصر بالکل تعدیلی (Neutral) ہیں یعنی ان پر منفی اور مثبت برق نے ایک دوسرے کے اثر کو بالکل زائل کردیا ہے۔ چونکہ ہر جوہر میں مثبت اور منفی برقیے مساوی تعداد میں ہوتے ہیں —

اور چونکہ ان دونوں عناصر میں صرف ایک برقیہ خارج کرنے یا حاصل کرنے کی صلاحیت ہے لہذا ان کو ایک گرفتہ عناصر کہتے ہیں۔ ایسی ہی دلیل کے تحت آکسیجن دو گرفتہ اور کاربن چہار گرفتہ عناصر قرار پائے ہیں - مثال کے طور پر کاربن اور آکسیجن کی کیمیاوی ترکیب دکھائی جاتی ہے —
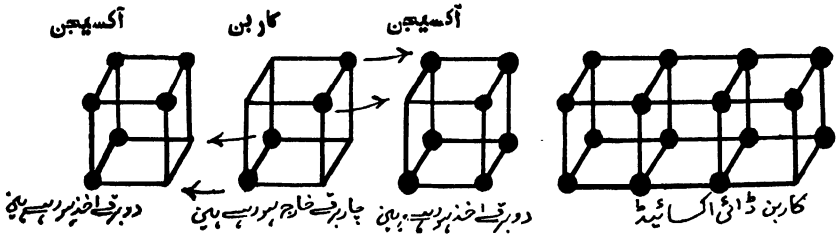
اوپر بیان کئے ہوئے دو عناصر میں کاربن اپنے سے چار برقیے خارج کرنے کی اور آکسیجن اپنے میں دو برقیوں کو اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے - لہذا کاربن بہ نسبت آکسیجن کے برقی منفی ہے۔ آکسیجن دو گرفتہ

اور کاربن چہار گرفتہ ہوا۔ ذیل میں اہلی گرفت کے لحاظ سے چند مشہور عناصر کی گرفت کی جدول دی جاتی ہے —

یک گرفتہ	دو گرفتہ	سہ گرفتہ	چہارگرفتہ	پنج گرفتہ	شش گرفتہ	ہفت گرفتہ
لیتھیم	آکسیجن	بورن	کاربن	نائیٹروجن	گندھک	کلورین
سوڈیم	میگنشیم	المنیم	ٹین	فاسفورس		برومین فلورین
پوٹیشیم	کیلشیم		سیسہ	اینٹی منی		
کلورین	جستہ					
فلورین	بیریم					
برومین	پارہ					
آئڈین	سونا					
چاندی						

یہ بھی ممکن ہے کہ کسی عنصر کے دو جوہر جن کے مکعبی خول کے گوشوں پر جگہ خالی ہے آپس میں متحد ہوجائیں اور اس طرح اُس عنصر کا مستحکم سالمہ بنا دیں —
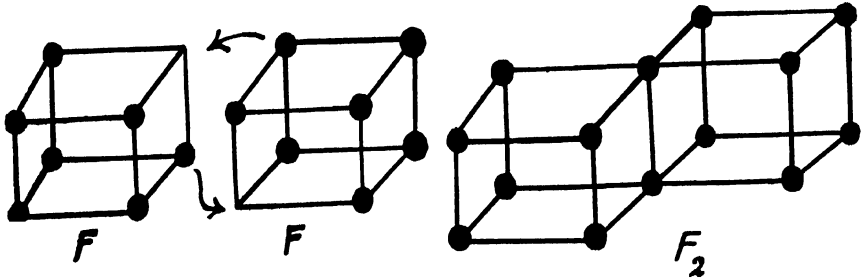
یہاں پر فلورین جوہر کے دونوں خالی گوشوں پر دو برقیے مشترکہ

طور پر آویزاں ہوکر فلورین کا مستحکم سالمہ بنا رہے ہیں —

لوئی اور لانگ نیر کے خیالات جے جے تھامسن سے بالکل جدا ہیں۔ جے جے تھامسن کا خیال ہے کہ برقیے بیضوی ہم مرکز راستوں پر بڑی رفتار سے گردش کر رہے ہیں۔ جے۔ جے تھامسن کے اصول کے تحت بہت سے دریافت شدہ مسائل مثلاً کیمیاوی ترکیب کیسے عمل میں آسکتی ہے، گرفت، تابکاری دھاتوں اور دھاتوں کی برقی گرفت کے لحاظ سے تقسیم وغیرہ نہایت خوبی سے واضح ہو جاتے ہیں لیکن مینڈلیف کے کلیہ ادوار (Periodic Law) کی وضاحت میں یہ اُصول کام نہیں دیتا۔ تھامسن اس امر کی بھی خاطرخواہ وضاحت نہ کر سکا کہ مثبت برق کا اجتماع کہاں پر ہوگا اور برقیوں کا راستہ ہمیشہ ہم مرکز بیضویوں میں کیوں ہوگا۔ برخلاف اس کے لانگ نیرلوئی کے اُصول کے تحت برقیے متحرک نہیں ہیں بلکہ ساکن ہیں۔ کلیہ ادوار کی وضاحت اس اصول کے تحت نہایت خوبی سے ہو جاتی ہے —

فن دباغت

(۳)

از

(حضرت دباغ سیلانوی)

کچا چمڑا اور اس کی حفاظت

ایک زمانہ تھا جب کسی ملک یا سلطنت کی مالی حالت کا اندازہ اس کی فوج کی تعداد اور سپہ سالار کی شجاعت اور بہادری سے کیا جاتا تھا - لیکن موجودہ زمانے والے کہتے ہیں کہ تجارت سلطنت کی پیشوا ہے - اس لئے کسی ملک یا سلطنت کی مالی حالت کا اندازہ کرنا ہو تو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ ملک کی خام پیداوار کیا ہے اور یہاں کے باشندے ان خام اشیا کو جو اُن کے روزانہ کے استعمال سے بچ رہتی ہیں غیر ملک کے لئے مفید بنا کر باہر بھیج سکتے ہیں یا نہیں - اگر یہ ملک کی قدرتی پیداوار کا بچا استعمال کرتے ہیں اور ان کی چیزیں بناکر غیر ملک سے تجارت کرتے ہیں تو ان کو قابل سمجھا جاتا ہے اور اگر صرف خام اشیا دیگر ممالک کو بھیجتے ہیں اور جب انہیں خام اشیا سے بنی ہوئی چیزیں ان ممالک کی قیمت سے دگنی ' چوگنی قیمت دے کر خریدتے ہیں تو ان کو کم قابل سمجھا جاتا ہے ـــ مثال کے طور پر روئی ' سن (Jute) گیہوں اور السی وغیرہ پر غور کیجئے کہ یہ کس قیمت

سے فروخت کی جاتی ہیں اور ان سے جو مختلف اشیا مثلاً کپڑے ' مصنوعی ریشم ' بسکٹ ' وارنش وغیرہ بن کر آتی ہیں ان کو کیا دام دے کر خریدتے ہیں تو اندازہ ہوگا کہ جیت میں کون رہا یا فائدے میں کون - اس لئے ہر ملک اور قوم کا فرض ہونا چاہئے کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا بجا استعمال کرے اور ملک قوم اور بادشاہ وقت کو اس طرح فائدہ پہنچائے —

قدرت کی دی ہوئی نعمتوں میں زمین کی پیداوار سونا ' چاندی ' لوہا ' کوئلہ ' درخت ' پھل ' پھول ' گائے ' بھینس ' بکری ' بھیڑ ' وغیرہ وغیرہ بے شمار نعمتیں ہیں اور یہاں صرف ایک چیز یعنی خام چرم کا ذکر کیا جاتا ہے جو ہندوستان میں کثرت سے ہوتی ہے —

ہندوستان کے زراعتی ملک ہونے کی وجہ سے اس کے بیشتر باشندے زراعت کا کام کرتے ہیں اور بیل ' بھینس ' وغیرہ سے کاشت کا کام لیتے ہیں - مرنا ' جینا ' سب جاندار چیزوں کے ساتھ لگا ہوا ہے اس لئے ہر شہر موضع اور ہر چھوٹی سے چھوٹی آبادی میں چمار کا آباد ہونا نہایت ضروری سمجھنا چاہئے - یہ غریب کاشتکاروں کی جوتیاں بناتا ہے - ان کی مرمت کرتا ہے اور ان کو آب پاشی کے لئے موٹھ ' چرس ' یا کوھر چمڑے کی بنا کر دیتا ہے جس سے کسان اپنی فصل کو پانی دے کر زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے - جب گائے ' بھینس بیمار ہوتی ہے تو یہ مویشیوں کے ڈاکٹر کا کام دیتا ہے اور جب ان میں سے کوئی مرجاتا ہے تو اس کو کسان کے مکان سے پیشتر اس سے کہ وہ بد بو دینے لگے لے جاتا ہے - اس کی کھال کھینچ کر کسانوں کی جوتی ' موٹھ وغیرہ بناتا ہے - اور ہڈی ' سینگ وغیرہ فروخت کر کے اپنی شکم پری کرتا ہے - یہ

اُس زمانہ کا ذکر ہے جب کسان صاحب اور ان کے ساھوکار زمین دار صاحب اور وکیل صاحب یا پٹواری صاحب سال میں صرف ایک جوتا استعمال کرتے تھے اور یہ سال بھر کے لئے ان کو بالکل کافی ہوتا تھا۔ مگر اب تو زمانہ بالکل بدل گیا ہے - وکیل صاحب اور پٹواری صاحب وغیرہ کو ایک نہیں بلکہ دو دو بوٹ ایک سیاہ ' ایک بادامی ' اسی قدر شوز ' سلیپر اور ھاٹ سلیپر اور چمڑے کے صندوق وغیرہ وغیرہ کے بغیر کام ھی نہیں چلتا ہے - مگر غریب چمار کے لئے یہ ایک بہت بڑا کام ھو گیا - اس لئے ساتوں قومیں اس کا ھاتھہ بٹانے لگی ھیں اور مسٹر این ایس - ٹی - چاری میسور کروم اور کلکتہ کروم ٹیننگ کے مشہور و معروف دباغ اور مسٹر پنڈت آف ایسٹرن انڈیا ٹینریز کمپنی بمبئی کے نامور دباغ جو برھمنوں میں چوٹی کے برھمن مانے جاتے ھیں - ایسی ھستیاں بھی ان کی امداد کرنے پر مجبور ھیں - نتیجہ یہ ھوا کہ غریب چمار کی چھوٹی سی تجارت ایک چھوٹے سے چھوٹے موضع سے چل کر بڑے بڑے شہروں میں آباد ھو گئی اور مقدس ھاتھوں میں پہنچ کر اس کو وہ فروغ ھوتا جاتا ہے کہ چمار چمار ھی رھا اور اب اس اکیلے کے کام کو ساتوں ذاتیں مل کر مشکل سے انجام دے رھی ھیں -

موضع سے قصبہ اور قصبے سے شہر اور شہر سے ملک در ملک چمڑے کی تجارت ھونے لگی تو خام اشیا (کھال) کی تلاش ' تحقیق اور حفاظت کے مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت لاحق ھوئی اور اس نتیجہ کو پہنچے کہ ھندوستان سے خام چرم بیرون ملک سب سے پہلے ڈینمارک کے لوگوں نے سنہ ۱۶۴۴ ع میں روانہ کیا (ملاحظہ ھو اکبر تا اورنگ زیب از مورلینڈ) اور یہ تجارت دن بدن ترقی کرتی گئی - چنانچہ سنہ ۱۸۲۹ اور ۱۸۳۰ ع میں قریباً ۹۴،۰۰ فرد قیمتی قریباً ایک لاکھہ چھپن ھزار روپیہ کی اور بکری
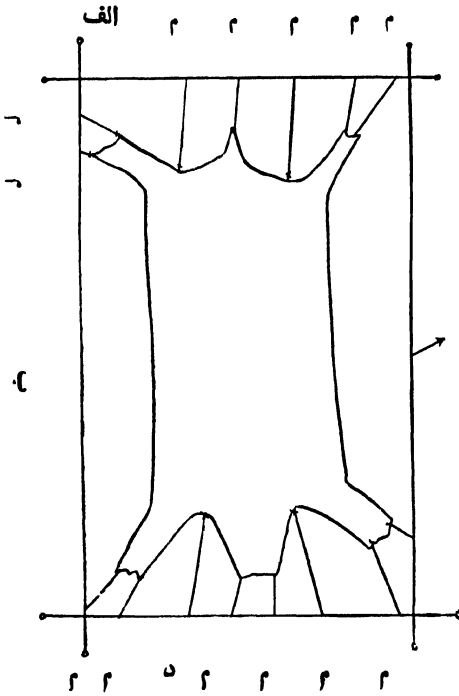
بانس کا چوکھٹا جس میں

کھال تان کر فرمہ بنایا جاتا ہے

(الف ۔ ب ۔ ج ۔ د)

م رسی جس سے کھال

فرمہ پر تانی جاتی ہے —
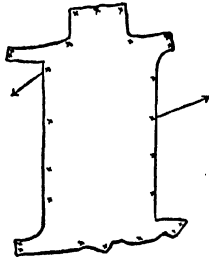
لکڑی کی کھونٹی یا لوہے

کی میخ سے کھال زمین

پر تانٹا

کی کھال قریباً ۲۷۰۰۰۰۰ فرد قیمتی قریباً (۹۴۰۰۰۰) روپیہ کی بیرون ملک روانہ کی گئی اور تقریباً سو برس پہلے ہندوستان کا کچا چمڑا دوسری ولایتوں کو بھی جاتا تھا۔ ذیل میں ایک نقشہ درج کیا جاتا ھے جس سے معلوم ہوگا کہ سنہ ۱۸۵۱ ع ۱۸۵۴ ع میں ہندوستان سے کن کن ولایتوں کو کتنی کتنی تعداد میں اور کن کن جانوروں کی کھالیں کلکتہ کی بندرگاہ سے روانہ کی گئیں (ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۱) —

نقشہ نمبر ۱ جس سے یہ معلوم ہوگا کہ ۱۸۵۱ - ۵۲ میں کس قدر کچا چمڑا دیگر ولایتوں کو ہندوستان سے بھیجا گیا —

نام ملک	گائے کا چمڑا		بھینس کا چمڑا		بکری کا چمڑا	
	تعداد فرد	قیمت	تعداد فرد	قیمت	تعداد فرد	قیمت
(۱) انگلستان	۱۸,۵۷,۶۸۱	۱۶,۲۹,۷۳۹	۲,۷۳۱	۲,۷۳۱	۹,۵۲۳	۱۸,۸۶۹
(۲) امریکہ	۱۵,۷۳,۸۰۳	۶,۸۶,۸۲۲	۲۸,۳۰۲	۲۸,۳۰۲	۳۹,۸۳۵	۹۹,۶۷۰
(۳) جنیوا	۱,۵۵,۵۶۳	۱,۳۷,۸۷۳	....	....	....	....
(۴) فرانس	۱,۱۶,۳۸۶	۹۱,۰۶۵	....	....	....	....
(۵) ہمبرگ	۲۱,۳۵۳	۲۰,۷۲۳	....	....	....	....
(۶) اینٹ ورپ	۱۱,۳۰۳	۱۱,۳۰۳	....	....	....	....
(۷) تریسٹ	....	....	۲۹,۶۸۲	۲۹,۷۶۲	....	....
میزان	۳۷,۳۷,۲۸۰	۲۵,۷۷,۵۲۷	۶۰,۷۱۵	۶۰,۷۹۵	۵۹,۳ ۹	۱,۱۸,۵۳۹

نقشه نمبر (۲) سنه ۷۷ - ۱۸۷۶ ع یعنی ۲۵ سال بعد کا نقشه

	تعداد فرد	قیمت لاکھوں میں	اوسط قیمت فی فرد	پائی	آنه	روپیه
گائے بھینس کا چمڑا	۵۱,۹۱,۷۶۲	۱,۳۵,۰۰۰۰۰		۰	۸	۲
بکری بھیڑی کا چمڑا	۲۳,۱۳,۲۹۸	۱۶,۰۰,۰۰۰	" "	۰	۱۲	۰

سنه ۷۳ - ۱۸۷۲ ع میں قحط ہونے کی وجه سے قریباً اٹھاسی لاکھه چمڑے اور اس کے بعد سنه ۱۹۰۰ ع کے قحط عظیم میں ایک کرور سے زیادہ چمڑے ہندوستان سے باہر ممالک کو روانه کئے گئے - اوسطاً ساٹھه لاکھه سے اسی لاکھه فرد تک ممالک غیر کو ہندوستان سے بھیجا جاتا تھا - خیال کیا جاتا ہے که اب بھی کم و بیش اسی تعداد میں چمڑا بیرونی ممالک کو جاتا ہے - ان اعداد میں بھیڑ ' بکری کی کھال شریک نہیں ہے جس کا کہیں اور ذکر کیا جاے گا —

سنه ۲۵ - ۱۹۲۴ ع میں گاے بھینس کا شمار کیا گیا تھا تو ہندوستان میں اُن کی تعداد کا تخمینه اُنیس کرور بتایا گیا تھا - پیداوار کے متعلق مبصرین کی راے میں آپس میں بہت اختلاف ہے - بعض کا کہنا ہے که کم از کم سالانه پیدائش تین کرور ہے - بعض کہتے ہیں که صرف دو کرور ہے لیکن ہر شخص اپنا اندازہ خود لگاتا ہے اس کے لیے نقشه ذیل میں درج کیا جاتا ہے - جس سے مویشی کی تعداد ان کی اوسط عمر سے پیدائش کا اندازہ ہر شخص کرسکتا ہے —

نام مویشی	تعداد	اوسط عمر	تخمینہ پیدائش
گائے بھینس	اُنیس کرور	۴ سے ۶ سال	تین سے چار کرور
بکری	پانچ کرور	۳½ سال	۱¼ سے ۱½ کرور تک
بھیڑ	۳½ کرور	تین سال	۱¼ کرور

قحط سالی جانوروں کی بیماری وغیرہ ایسے اسباب ہیں کہ بہتر سے بہتر تخمینہ بھی صحیح نہیں ہوسکتا لیکن اوپر جو کچھہ بیان کیا گیا ہے اس سے اندازہ کیا گیا تو ہندوستان میں دو کرور سے تین کرور تک کی سالانہ پیدائش مویشی ہماری ضروریات کے لیے بالکل کافی سمجھنا چاہئے۔

بکری، بھیڑ کے متعلق یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہندوستان میں تمام دنیا جہان سے بکری کی کھال زیادہ تعداد میں ہوتی ہے۔ میک واٹر صاحب اپنی کتاب "ہند کی تجارت پر تبصرہ" میں فرماتے ہیں کہ دنیا بھر کی بکریوں کی کھالوں کا ایک تہائی حصہ ہندوستان میں ہوتا ہے۔ ارنالڈ صاحب کا قول ہے کہ بکری کی کھال کی پیداوار ہندوستان میں سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ بکری کی کھالوں کی پیداوار ہندوستان میں تقریباً پونے تین کرور فرد اور بھیڑ کی قریباً ایک کرور کے سمجھی جاتی ہے —

اوپر جو کچھہ بیان کیا گیا ہے اس سے تمام ہندوستان میں ریاستوں کو مستثنیٰ کرکے گائے، بھینس۔ بکری اور بھیڑ کی کھال کی پیداوار تقریباً بیس کرور روپیہ سالانہ کی ہے اور اس سے اندازہ کیاجاسکتا ہے کہ ملک کی یہ کس قدر ضروری اور کیسی گراں قدر دولت ہے —

نقشہ نمبر (۳) کس قدر چمڑا کن ممالک کو جاتا ھے

گائے کا کچا چمڑا	سنہ ۲۷-۱۹۲۶ع ٹن	سنہ ۲۸-۱۹۲۷ع ٹن	سنہ ۲۹-۱۹۲۸ع ٹن
(۱) جرمنی — — —	۹۶۵۰	۱۶۳۴۳	۱۲۷۸۴
(۲) اٹلی — — ...	۵۲۲۳	۳۳۵۳	۳۷۹۶
(۳) اسپین — — —	۲۵۸۱	۱۵۴۸	۲۰۵۳
(۴) انگلستان — — —	۱۰۳۲	۲۸۴۵	۱۱۸۳
(۵) نیدر لینڈ س — —	۳۶۹	۵۵۵	۱۵۸۷
(۶) یونان — — —	۳۵۵	۲۷۹	۱۰۳۷
(۷) بلجیم — -- —	۱۲۴	۲۳۰	۱۰۱۴

بکری کا چمڑا	ٹن	ٹن	ٹن
(۱) امریکہ — — —	۱۵,۵۸۲	۱۵,۶۸۹	۱۸,۶۱۶
(۲) فرانس -- — -	۱,۵۰۷	۷۱۲	۸۸۰
(۳) انگلستان — — —	۱,۰۱۱	۸۹۶	۶۳۱
(۴) نیدر لینڈ --- --- —	۵۶۲	۶۵۷	۳۸۵
(۵) جرمنی — — -.-	۱۹۳	۳۹۸	۲۸۱

نقشه نمبر (۳) کس قدر چمڑا کن ممالک کو جاتا ہے

بھینس کا چمڑا	سنه ۲۷ - ۱۹۲۶	سنه ۲۸ - ۱۹۲۷	سنه ۲۹ - ۱۹۲۸
	ٹن	ٹن	ٹن
(۱) جرمنی — — —	۱,۵۵۱	۲,۵۲۸	۲,۲۷۱
(۲) بلگیریه — — —	۶۲۴	۶۴۹	۱,۰۳۶
(۳) امریکه — — —	۵۵۰	۱,۹۷۲	۹۸۰
(۴) ترکی — — —	۴۶۷	۵۳۵	۶۲۵
(۵) انگلستان — — —	۳۳۴	۸۷۹	۴۹۸

نقشه نمبر۳ سے ثابت ہوگا که کس تعداد میں ہندوستان سے سالانه کھالیں غیر ملکوں کو جاتی ہیں۔ اور باقی کے متعلق یه سمجھنا چاہئیے که یه ملک میں استعمال کے لیے یا مدراس اور بمبئی اور ان کے قرب و جوار کی ریاستوں میں مثلاً ریاست حیدر آباد، میسور، بنگلور وغیرہ میں جہاں آنول، تروورما یا آورم کے درخت کثرت سے ہوتے ہیں پخته کرکے انگلستان، امریکه اور جرمنی

وغیرہ ملکوں کو روانہ کی جاتی ہے - نقشہ نمبر ۴ سے ظاہر ہوگا کہ پکا کیا

نقشہ نمبر ۴

بچھیل (گائے بچھڑیکی کھال)	سنہ ۲۷-۱۹۲۶ع ٹن	سنہ ۲۸-۱۹۲۷ع ٹن	سنہ ۲۹-۱۹۲۸ع ٹن
(۱) جرمنی — — —	۱۱۱	۲۹۳	۳۲۶
(۲) اسپین — — —	۲۲۱	۲۳۳	۲۷۸
(۳) اٹلی — — —	۱۰۸	۲۱۱	۲۸۲
(۴) انگلستان — — —	۲۰	۴۲	۱۸

نقشہ نمبر ۵

(بھیڑی کا چمڑا)	ٹن	ٹن	ٹن
(۱) جرمنی — — —	۳۳	۱۲۳	۸۳۰
(۲) اٹلی — — —	۴۰	۱۱۱	۱۱۸
(۳) فرانس — — —	۷	۷۴	۱۶۸
(۴) امریکہ — — —	۲	۳۶	۱۱۱
(۵) انگلستان — — —	۶۶	۲۲	۵۲

نوٹ - ٹن - ایک ٹن ستائیس من کا ہوتا ہے - اور ایک من تراسی پونڈ کا ہوتا ہے - ایک ٹن ۲۲۴۰ پونڈ کا ہوتا ہے —

نقشہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کس ملک کو ہندوستان کا کونسا چمڑہ زیادہ تعداد میں جاتا ہے —

ہوا چمڑا کس قدر بیرونی ممالک کو بھیجا جاتا ہے۔ کانپور پنجاب اور دیگر اضلاع کا پکا یا ہوا چمڑا ہندوستان کی ضرورت پوری کرتا ہے اور ملک سے بہت کم باہر جاتا ہے —

بیس کرور روپیہ کے خام چمڑے کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ قریباً پچاس فی صدی اس میں کا مختلف ولایتوں کو کچا روانہ کیا جاتا ہے۔ اور باقی ماندہ ہندوستان میں پکا کرکے استعمال کیا جاتا ہے۔ جو نقشے جو درج کیے گئے ہیں اُن سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ کچا اور پکا چمڑا کس قدر ہندوستان سے باہر جاتا ہے۔ اگر اس کی قیمت کو کل بیس کرور روپیہ میں سے کم کردیا جائے تو ہندوستان کم و بیش دنیا کی ایک تہائی گائے اور بھینس کے چمڑے کی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور بکری بھیڑ اور خاص کر بکری کا چمڑا ایک تہائی سے بھی زیادہ دیگر ولایتوں کو بھیجتا ہے۔ ہندوستانی مال کچا یا پکا جیسا بھی اس وقت بھیجا جاتا ہے انگلستان جرمنی اور امریکہ میں اچھا سمجھا جاتا ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ پکا کیا ہوا چمڑا تقریباً کل صرف مدراس سے ولایت کو جاتا ہے اور بمبئی وغیرہ کا حصہ اس میں صرف ۱۰ یا ۱۲ فی صدی ہوتا ہے —

کچا چمڑا ہندوستان کی ضرورت سے بہت زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ پہلے بیان کیا گیا ہے اور اس کا مطلب یوں سمجھنا چاہئیے کہ ملک میں اس قدر چمڑا پکا کرنے کے کارخانہ نہیں ہیں جو سب کو پکا کرسکیں اس لیے باقی ماندہ چمڑے کو ہی ملک سے باہر روانہ کردیا جاتا ہے۔ چمڑا خاص موسم کا اچھا سمجھا جاتا ہے مثلاً بارش کے بعد ستمبر سے لے کر آخر مارچ تک جو چمڑا آتا ہے وہ اور موسموں سے بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس لیے ولایت سے خریداری انہیں دنوں میں ہوتی ہے اور اپریل سے لے کر اکتوبر تک خرید بالکل بند رہتی ہے۔ وجہ یہ

معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں جانور دبلے ہوتے ہیں اور سردی میں موٹے
تازے جس کا اثر کھال پر بھی ضرور پڑتا ہے - اس کے علاوہ نسل اور آب و ہوا
کا چمڑے پر بہت بڑا اثر ہوتا ہے - مدراس بمبئی وغیرہ (اس میں ریاست
میسور کی مشہور نسل اور گجراتی نسل کو شریک نہ سمجھنا چاہئیے)
کے جانور پنجاب اور یوپی کے مقابلے میں کچھہ بھی نہیں ہوتے اور یہی حال
آگرہ ' میرٹھہ' دہلی اور پشاور وغیرہ کی کھالوں کا ہے اور یہی وجہ ہے کہ
مدراس اور بمبئی وغیرہ میں بیشتر کچا چمڑا کانپور آگرہ ' میرٹھہ ' انبالہ ؛
لاہور کا خریدتے ہیں - کلکتہ میں جو خریداری ہوتی ہے ؛ اس کی خاص وجہ
یہ ہے کہ کچا چمڑا وہاں سے دیگر ممالک کو روانہ کیا جاتا ہے اس لئیے ہندوستان
کا کل چمڑا وہاں جمع ہوجاتا ہے —

اس قدر زیادہ تعداد میں چمڑہ فوری پختہ نہیں ہوسکتا اور نہ
اس کی معقول حفاظت کرنے سے پیشتر اس کو عرصہ تک کارخانہ میں
رکھا جاسکتا ہے اور نہ باہر بھیجا جا سکتا ہے - اس لئیے اس کو بگڑنے
سے بچانے کی کئی صورتیں ہیں جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں جس
کی مدد سے یہ کئی ماہ بلکہ ایک سال تک محفوظ رہ سکتا ہے - ورنہ
قانون فطرت کے مطابق ایک دو روز کے بعد خراب ہونا شروع ہوجاتا ہے-
اور ایسے خراب چمڑے سے جو چمڑا پکا کیا جائیے گا بے کار ہوگا - اس کی
حفاظت کے لئیے زیادہ تر نمک طعام ' کھاری نمک اور سنکھیا استعمال ہوتا ہے

ا — اقسام چرم میں سے گوکھہ (گائے)' بھینس ' بھیڑ ' بکری کے چمڑے
زیادہ تر ہندوستان میں استعمال ہوتے ہیں اور ولایت اور دیگر ممالک
کو جاتے ہیں —

ان کی تیاری کی مختلف صورتیں ہیں اور ویسے ہی ان کے نام

رائج هیں - چونکه هر شهر میں کمیله (یاکیل) خانه نهیں هوتا اس لئے ان کو محفوظ کر لینا کهتے هیں تاکه وه ایک جگهه سے دوسری جگهه جانے کے قابل هوجاوے - گوکهه یعنے گاے کا چمڑه ' اول حالت جو که کیل خانه میں جانور کو ذبح کرنے کے بعد هوتی هے اس کا نام گوکهه کمیله یا حلالی عام طور سے مشهور هے - دباغت والے اس چمڑے کو دباغت کے لئے بہت هی اچها سمجھتے هیں اور اس سے پخته چمڑه یعنے لیدر نهایت عمده تیار هوتا هے - اُردو میں کچا چمڑه (Hide) اور پکا چمڑه (Leather) بولا جاتا هے - اور سمت کے اعتبار سے اس کے دو نام رائج هیں - پورب اور پچهم - پورب کی طرف کا پورب اور پچهم کی طرف کا پچهم کهلاتا هے - کمیله سے نکلنے کے بعد اس کی تیاری کے کئی طریقه هیں - سب سے سهل طریقه یه هے که کمیله کے گوکهه کو گوشت صاف کرکے فرمه یعنے بانس کے چوکهٹے میں تان دیا اور تاننے کے بعد پانی سے دونوں رخ سے دهودیا اور دهوپ میں رکهه کر خشک کر لیا اب اس کا نام گوکهه فرمه (Frame) یا گوکهه مصالحه بولا جاوے گا —

اگر اس کو ولایت روانه کرنا هے تو اس کو حوضوں میں سنکهیا کے پانی میں ڈبو کر خشک کرلیتے هیں جس سے وه عرصه تک کیڑے وغیره سے محفوظ رهتا هے - سنکهیا کا پانی اس طرح بناتےهیں که سفید سنکهیا پندره سیر اور سوڈا ساڑهے سات سیر ڈال کر ایک بڑے کڑهاؤ میں آگ پر پکا لیتے هیں - سوڈا صرف سنکهیا کو گلادینے کے لئے شامل کیا جاتا هے - یه دو هزار فرد کے لئے کافی هے - پهر سنکهیا کے پانی کو حوض کے پانی میں ملا دیتے هیں که جس میں چمڑا ڈوب جاوے -

سنکهیا دیے هوے گوکهه مصالحه کو انگریزی میں (Arsenicated cow) کهتے هیں —

۲ - دوسری صورت ' کھیلہ سے لانے کے بعد گوشت صاف کر کے اور پانی سے دھوکر' اس کو ایسی میز پر' جس کے دونوں سرے ڈھالو اور بیچ میں اونچا ہو بچھاتے ہیں - پھر دو آدمی ایک اس طرف دوسرا دوسری طرف کھڑا ہو کر اس میں سانبھر نمک کم و بیش پانچ پونڈ جو چمڑے کے ناپ پر منحصر ہے' ڈال کر خوب رگڑتے ہیں - دوسرے روز پھر دو پونڈ اور نمک ڈال کر ملتے ہیں تیسرے دن صرف ایک پونڈ جہاں پر ضرورت ہو لگا کر ملتے ہیں - اب یہ چمڑا محفوظ ہو گیا - صرف دوسرے تیسرے روز ہاتھ لگا کر ذرا دیر مل دیتے ہیں - یہ صورت صرف دیگر ممالک کے جانے والے چمڑوں کے لئے ہے - اس کو سانبھر نمک کا گوکھہ یا گوکھہ سانبھر (Table Salted or Green Salted) کہتے ہیں - روانگی کے وقت اس میں نصف پونڈ کھاری نمک لگادیتے ہیں- اس کے لگادینے سے چمڑے میں ذرا سختی آ جاتی ہے- صرف سانبھر نمک کا گوکھا زائد عرصہ تک نہیں رہ سکتا گل جانے کا اندیشہ رہتا ہے - یہ گوکھا بوروں میں روانہ کیا جاتا ہے —

۳ - تیسری صورت ' جو چمڑا ہندوستان میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں جاتا ہے اس کو زمین میں بچھا کر سانبھر نمک دیتے ہیں اور ترکیب وہی ہے - صرف میز کے بجائے زمین میں نمک لگاتے ہیں اور یہ ایک کے اوپر ایک بچھاتے جاتے ہیں - نئے چمڑے اس کے اوپر بچھاتے جاتے ہیں اور جب روانہ کرنا چاہا گٹھی بنا کر روانہ کردیتے ہیں - ولایت والوں میں صفائی وغیرہ بہت زیادہ ہوتی ہے - اور ولایت کے جانے والے جو میز پر تیار کیے جاتے ہیں وہ کسی منڈی میں تیار کیے جاتے ہیں - ہر شہر میں نہیں بنتے —

زمین پر بچھا کر نمک لگانے کا طریقہ گاؤں تک میں' جہاں چمڑے کا کام

ہوتا ہے ' جاری ہے۔ اس کو گیلا سانبھر کا گوکھا (Wet Salted Sambhar) کہتے ہیں۔

۴ - چوتھی صورت وہ ہے جس میں کھاری نمک (جو مثل سجی کے ہوتا ہے - اور زیادہ تر عمدہ اور مشہور مظفرپور میں تیار کیا جاتا ہے) استعمال کیا جاتا ہے - یہ ہندوستان میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں جو چمڑے جاتے ہیں ان میں لگایا جاتا ہے اور ہندوستان سے باہر دیگر ممالک کو جو چمڑے جاتے ہیں ان میں بھی لگایا جاتا ہے - کھاری نمک کو لکڑی کے پیپوں میں یا لکڑی کی بڑی بالٹیوں میں جو اس کام کے لیے بنالی جاتی ہیں ' گھول کر موتی بنالیتے ہیں۔ چمڑے کو زمین پر پھیلا کر یہ موتی اس پر ڈال کر ہاتھوں سے مل کر ان میں جذب کرتے ہیں۔ یہ ہلکی دھوپ میں کرتے ہیں - صبح سے دس بجے تک - اسی طرح کئی روز تک یہ عمل جاری رکھتے ہیں - جب ان میں تعداد کے مطابق کافی رس جذب ہوجاتا ہے تو اس کو سیٹ کر خشک کر دیتے ہیں - اس آخر خشک کرنے کا نام سیٹ دینا یا سٹائی کرنا کہتے ہیں - یعنے ہاتھ گلہ (گلا گردن) یعنے سر کی طرف سے دم کی طرف لے جاتے ہیں کہ سطح بالکل چکنی ہوجاوے - اب یہ چمڑہ خشک ہوکر سفید زردی مائل ہوجاتا ہے - اسی صورت میں روئیں صاف کرکے یہ ولایت روانہ کیے جاتے ہیں - اس کو پتنہ گوکھا یا کھاری کا گوکھا (Dry Salted Khan) کہتے ہیں - اوپر جو قسمیں گوکھہ کی بیان کی گئی ہیں وہ صرف ان جانوروں کی کھالیں ہوتی ہیں جو ذبح کیے جاتے ہیں۔ سمت کے اعتبار سے پورب سے پچھم کا گوکھا اچھا ہوتا ہے اور زائد قیمت سے فروخت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مردار (یا سکتی) کھال ہوتی ہے یعنے ان جانوروں کی جو خود مرجاتے ہیں خواہ کسی وجہ سے مرے ہوں۔ جس طرح

ذبیحہ پورب کی اور پچھم کی کھال ہوتی ہے ' اسی طرح اس کے بر خلاف مردار میں اوتر اور دکھن مشہور ہے - اوتر کا گوکھا اندر سے تر ہوتا ہے یعنے اس کی رطوبت اس کو بالکل خشک نہیں ہونے دیتی یا یوں سمجھنا چاہئے کہ چربی زائد ہوتی ہے جس سے کہ ان کی قدرتی رطوبت (Gelatine) باقی رہتی ہے —

دکھن میں تری نہیں ہوتی اور وہ مثل لکڑی کے خشک ہوتی ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں اکثر ٹوٹ جاتی یا چٹخ جاتی ہیں - یہ ہندوستان میں ایک جگہ سے دوسری جگہ دھوپ سے خشک کی ہوئی ہی جاتی ہیں - اور ولایت بھی روانہ کی جاتی ہیں - جن کو مثل حلالی کے سنکھیا یعنے مصالحہ دے کر روانہ کرتے ہیں - ان میں سوائے سنکھیا دینے کے اور کوئی صورت تیاری کی نہیں ہے —

بھینس کی کھال بھی مثل گوکھہ کے تیار کی جاتی ہے - گوکھہ کی طرح مثل دوسری صورت کے یعنے میز پر بھینس کی کھال نہیں بنتی - اس لیے کہ بھینس کو اس‌قدر ملایم رکھنے کی ضرورت نہیں - کیوں کہ اس سے تلے اور مشین کے پٹے وغیرہ کا کام لیتے ہیں - گوکھہ چونکہ زیادہ تر ملائم کام میں استعمال کیا جاتا ہے اور تازہ کھیلہ نہ ملنے کے بعد گیلا سانبر لگا ہوا ملایم رہتا ہے اس لیے میز کا طریقہ رایج ہوا - باقی اور سب صورتیں تیاری کی اس میں مثل گوکھہ کے ہوتی ہیں - نمک کی تعداد بھینس میں کم و بیش دوگنی کے برابر استعمال کی جاتی ہے - اس میں بھی دوسہت مشہور ہیں وہ ہی پورب اور پچھم - ذبیحہ میں اور مردار (سکتی) میں اوتر اور دکھن اور مثل مردار گوکھہ کے اس کی بھی تیاری صرف سکھلا کر کی جاتی ہے - اور کوئی طریقہ نہیں ہے - اور یہ مردار (یا سکتی) بھینس (Buffalo Sukhtee) کہلاتی ہے —

بھیڑ ہندوستان میں بھی استعمال ہوتی ہے اور ولایت بھی جاتی ہے - مگر اس کی روانگی کی صورت بیرون ممالک کو مثل گوکھہ کے نہیں ہے —

یہ زیادہ تر پکی ہوئی یعنے لیدر کی صورت میں ولایت جاتی ہے - کیل خانہ میں ذبح ہونے کے بعد اس کا نام کیل بھیڑی ہوتا ہے یا تو اس کو اسی طرح خشک کر لیتے ہیں - اگر شہر کے شہر میں ٹینری یا دباغت والے خرید کرتے ہیں تو اُس سے بہت اچھا چمڑہ تیار ہوتا ہے - دیسی طور پر پکائی والے (دیسی سے مراد کھتیک وغیرہ جو لوگ ہندوستان میں عام طور پر نائد وغیرہ میں پکا کرلیتے ہیں) اس کی اُون رانپی سے اُکھاڑ لیتے ہیں اور ٹینری والے کیلی خریدنے کے بعد اس کو چونہ کے ساتھہ گوشت کی طرف سو ڈیم سلفائڈ (Sodium Sulphide) لگا کر رات بھر رکھہ دیتے ہیں اور صبح کو اُون بہت آسانی سے ہاتھہ سے بغیر نوچے ہوئے نکل آتی ہے - اُون الگ فروخت ہوجاتی ہے اور چمڑہ پکا کرلیتے ہیں - غرض کہ اُون دار اگر خرید کرتے ہیں تو اس کی اُون ضائع نہیں ہونے دیتے - اگر ایک شہر سے دوسرے شہر روانہ کرنا ہوا تو اس میں سانبر نمک ایک پونڈ سے ڈیڑہ پونڈ تک اوسی طریقے پر جو گوکھہ میں بیان کیا گیا ' لگاتے ہیں - اس کو ایک پر ایک بچھانے کے بجائے ایک ایک کی علحدہ علحدہ گڈی بنا بنا کر رکھتے ہیں اس لیے کہ اس کے روئیں میں نمک نہ لگے ورنہ اُون خراب ہوجائے گی - جیسا کہ اوپر بتایا ہے کہ زائد تر پکی کی ہوئی کھالیں ولایت جاتی ہیں - بھیڑ یا پڑا اس کو کہتے ہیں کہ اس کو بعد اُون نکالنے کے نمک لگا کر خشک کر دیتے ہیں اور اس کی گانٹھہ باندہ کر باہر ملکوں کو روانہ کرتے ہیں سوائے اس کے اور کوئی صورت نہیں ہے - اول صورت پکی ہوئی جانے کی دوسری صورت پاپڑا جانے کی ہے —

بکری - بکری زیادہ تر بلکہ ستر اسی فی صدی ولایت جاتی ہے جس میں قریب ساٹھہ فی صدی امریکہ جاتی ہے اور امریکہ میں دو مقام اس کے جانے کے لیے مشہور ہیں - نیو یارک (New York) اور فلےڈلفیا (Philadelphia) - ان میں اس کی ٹینریاں ہیں - اور دنیا میں بکری کی کھال امریکہ سے بہتر کہیں نہیں پکی کی جاتی - اس لیے زیادہ تر امریکہ جاتی ہے اور کم تر بوسٹن (Boston) یا دوسری جگہ جاتی ہے - ہندوستان میں بکری کی کھالیں بہت کم پکائی جاتی ہیں جس کی وجہ خاص کر یہ سمجھی گئی ہے بلکہ تجربہ بتلاتا یہ ہے کہ بکری کی کھال کو جیسا پکنا چاہیے ویسی تیار نہیں ہوتی آج تک اس میں کامیابی نہیں ہوئی —

بلکہ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ امریکہ کے دباغوں نے جو اس کو وہاں خصوصیت کے ساتھہ بنانے میں مشہور ہیں ' ہندوستان میں آکر پختہ کیا مگر وہ بات پیدا نہ ہوئی - کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ ہندوستان میں بکری سے گلیس کڈ (Glace Kid) نہ بن سکے - افسوس ہے کہ کلکتہ گلیس کڈ کمپنی (Calcutta Glace Kid Co. Ltd.) کا کارخانہ جو ہندوستان میں اپنی نظیر نہیں رکھتا ' مالی دشواریوں کی وجہ سے بند ہو گیا - ورنہ چاری صاحب جنھوں نے کروم کا چمڑا ہندوستان میں بنا کر شہرت حاصل کی تھی ضرور گلیس کڈ بھی تیار کرنے میں کامیاب ہوتے —

بکری کے تیار کرنے کی دو تین صورتیں ہیں - اول بکری کمھاہ سے لا کر اس کو صاف کر کے اس میں سانبر نمک لگاتے ہیں - ایک پونڈ سے تیرہ پونڈ تک ' پھر اس کو گڈی بنا کر رکھہ دیتے ہیں -

دوسرے صبح پھر قدرے نمک ڈال کر ہاتھ ملتے ہیں۔ تیسرے دن پھر قدرے نمک ڈال کر ملتے ہیں۔ اسی طرح پر دو پونڈ نمک یا کم و بیش جو کھال کی ناپ پر منحصر ہے، لگایا جاتا ہے۔ چوتھے دن ان کی گڈی تہ لگائی ہوئی، ریڑھ پر سے دوھرا کر کے تھاپ یا تھپکی لگا دیتے ہیں۔ ہندوستان میں ایک شہر سے دوسرے شہر بھیجنے کے لیے اس کو بوروں میں بھر کر روانہ کرتے ہیں —

اور دیگر ممالک امریکہ وغیرہ روانہ کرنے کے لیے ان کو لکڑی کے پیپوں میں بھر کر روانہ کرتے ہیں۔ یہ لکڑی کے پیپے دوسری ولایت سے شراب تیل وغیرہ کے آتے ہیں جو یہاں خالی ہوکر اس کام کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس میں بکری ایک ایک ۸ فرد کی گڈی بنا کر پیپے میں بھر دیتے ہیں۔ اس کو گیلی بکری (Wet Salted Goatskin) کہتے ہیں —

دوسری صورت دیہاتوں میں، جہاں بنانے کے طریقہ جاری نہیں ہیں یہ ہے کہ وہاں قدرے نمک یا کھاری نمک لگا کر یا ویسے ہی زمین پر کھونٹی لگا کر تان کر خشک کر دیتے ہیں اور بڑے شہروں میں فروخت کرنے کی غرض سے لے جاتے ہیں۔ اور بڑے شہر کے تیار کرنے والے اس کو گیلا کر کے بنا لیتے ہیں مگر خشک بناتے ہیں، تو اس کی اچھی نہیں بنتی۔ اور ولایت بھی سوکھی (Brined) بکری جاتی ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کھیاہ سے لا کر کھاری سے تیار کرتے ہیں۔ کھاری کی تعریف اوپر ہو چکی ہے۔ اس کا رس بنا ہوا بکری پر ڈالتے ہیں لیکن عمدہ بنانے والے اس کو تختوں پر کیل سے جڑتے ہیں اور پھر اس پر رس ڈالتے ہیں اور ہاتھ سے جذب کرتے ہیں۔ دو تین روز اسی طرح کر کے پھر اس کو مثل گوکھہ کے لپیٹ دیتے ہیں۔

اور بہت سے لوگ اس کو بجائے تختوں کے زمین پر کیلوں سے تان دیتے ہیں اور رس دے کر آخر میں سیت دیتے ہیں - اب اس کو پتلہ بکری (Dry Salted Goats) کہتے ہیں - اس کی بہترین تیاری کے لیے پورنیہ بنگال مشہور ہے - اس کے بعد مظفر پور مشہور ہے جہاں کھاری نمک پیدا ہوتا ہے - اس کی کانٹھہ باندھ کر بیرون ممالک کو روانہ کرتے ہیں —

علم کیمیا کا انقلابی دور اور آکسیجن کا انکشاف

از

(جناب آتما رام صاحب - ایم ایس سی- ایمپرس وکٹوریہ
ریڈر، شعبۂ کیمیا، جامعہ الہ آباد)

علم کیمیا کے پڑھنے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا بشر ہوگا جو اس عجیب علم کی تاریخ سے کچھ نہ کچھ واقفیت نہ رکھتا ہو۔ یہ بات قریب قریب سب ہی کو معلوم ہے کہ کیمیائی دور سے قبل سائنس دانوں کا خاص مقصد ادنیٰ دھاتوں سے بہترین دھاتوں کا تیار کرنا تھا اور اُن کی خاص تشویش پارس پتھر (Philosopher's Stone) کی تلاش میں تھی۔ پارس پتھر اُس زمانہ میں ایک ایسی عجیب شے خیال کی جاتی تھی کہ جس کے چھو جانے سے لوہا وغیرہ جیسی ادنیٰ دھاتیں سونے میں تبدیل ہو سکیں۔ اس زمانہ کو عام طور پر الکیمیائی دور (Alchimical period) کہتے ہیں۔ اِس دور کے بعد ایک دوسرا دور آیا جس کو طبی کیمیائی دور کہتے ہیں۔ اس وقت کے کیمیا دانوں کا خاص منشا یہ تھا کہ علم کیمیا کو طب کے طریقہ پر پڑھا جائے۔ اِس دور میں وان ہیلمنٹ (Van Helmont) اور بیسل ویلنٹین

(Basil Valentine) کے ایسے عالم پیدا ہوے - اِس کے بعد ایک عجیب دور آیا جو فلوجستی دور (Philogiston period) کے نام سے مشہور ہے - اِس وقت کے عالموں میں بیکر (Becker) اور اسٹال (Stahl) کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں- ان دونوں کا قول تھا کہ جب کوئی شے جلتی ہے تو اُس میں سے فلو جستن نکل جاتا ہے جس ہم آج کل آکسائڈ کے نام سے پکارتے ہیں - اِسی طور پر اور بہت سی چیزوں کے کیمیائی عمل سمجھاے گئے - اِس مضمون میں یہ بات دکھلانے کی کوشش کی جاے گی کہ فلوجستن کے نظریہ کو کس طرح غلط ثابت کیا گیا اور ساتھہ ہی ساتھہ اُس وقت کے خاص عالموں کا کچھہ حال بیان کیا جاے گا - اِس زمانہ میں ہی جدید کیمیا کی بنیاد ڈالی گئی اور اسی وجہ سے اِس کو کیمیا کا انقلابی دور کہتے ہیں —

اس وقت کی دنیاے کیمیا میں پانچ شخص سب میں پیش پیش رہے ہیں - بلیک ' کیونڈش ' پریسٹلے ' شیل ' اور لیواسے (Black, Cavendish, Priestley, Scheele, Lavoisier) - ان عالموں کے سوانح حیات اور تحقیقات صاف صاف بتلانے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا بیان الگ الگ کیا جاے —

جوزف بلیک (۱۷۲۸ - ۱۷۹۹)

بلیک کی پیدائش سنہ ۱۷۲۸ ع میں اسکاٹ لینڈ میں ہوئی- پہلے وہ معمولی طور پر عطاری کرتا تھا - بعد ازاں گلاسگو یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر کیا گیا - اُس کی خاص تحقیق میگنیشیم کاربونٹ (Magnesium carbonate) کی بابت ہے - پہلے وہ فلوجستی نظریہ کا پیرو تھا مگر لیواسیے کے نئے نظریہ کے بعد وہ لیواسیے کی پیروی کرنے لگا اور اُس کی کافی مدد کی - یہ بات عرصہ سے معلوم تھی کہ کیلشیم کاربونیٹ (Calcium Carbonate) کو

گرم کرنے سے کاوی قلی (Caustic alkali) بن جاتا ہے - پہلے عالموں کا یہ خیال تھا کہ جب کیلشیم کاربونیٹ کو گرم کرتے ہیں تو اُس میں آگ کے چھوٹے چھوٹے ریزے مل جاتے ہیں اور ان کے مل جانے سے اس میں تیزی پیدا ہوجاتی ہے - اِسی بنا پر اُس کو کاوی قلی کہنے لگے- لیکن سنہ ۱۷۵۵ع میں بلیک کے کارناموں سے لوگوں کو یہ معلوم ہوگیا کہ ہلکے (Mild) قلی کو گرم کرنے سے کاوی قلی کیوں کر بن جاتا ہے —

اس نے میگنیشم کاربونیٹ (میگنیشیا ایلبا) (Magnesia alba) کو خوب جوش دیکر میگنیشم آکسائڈ (میگنیشیا استا) (Magnesia Usta) تیار کیا - اُس زمانہ میں عام طور پر کاربونیٹوں کو ہلکا قلی کہتے تھے اور آکسائڈوں کے محلول کو کاوی قلی - اِس تجربہ سے بلیک نے یہ دکھلا دیا کہ کس طرح کاربونیٹوں سے آکسائڈ بنتے ہیں - اِس تجربہ سے مندرجۂ ذیل باتیں بھی ظہور میں آئیں :—

۱ - میگنیشم کاربونیٹ کا وزن گرم کرنے کے بعد نصف رہ جاتا ہے -

۲ - میگنیشیم ایلبا کو گندھک کے ترشہ (Acid) کے ساتھ گرم کرنے سے میگنیشیم سلفیٹ (Magnesium Sulphate) بنتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک گیس بھی خارج ہوتی ہے (آج کل اِس گیس کو کاربن ڈائی آکسائڈ کہتے ہیں) —

۳ - مگر مگنیشیم آکسائڈ کو گندھک کے ترشہ کے ساتھ گرم کرنے سے بغیر کسی گیس کے خارج ہوئے ہی میگنیشیم سلفیٹ بن جاتا ہے —

۴ - میگنیشیم سلفیٹ کے محلول میں جب پوٹاشیم کاربونیٹ (Patassium Carbonate) ڈالا جاتا ہے تو ایلبا یعنی میگنیشیم کاربونیٹ کا رسوب نیچے بیٹھ جاتا ہے -

ان تجربوں کے ملاحظہ سے یہ معلوم ہو جاے گا کہ بلیک نے کس طرح ان سب باتوں کو ایک نئے اور درست طریقہ پر سمجھایا - نمبر ۲ و ۳ کی مدد سے یہ بتلایا گیا کہ میگنیشیم ایلبا اور میگنیشیم استا میں صرف یہی فرق ہے کہ ایلبا اور ترشہ کو ساتھہ ساتھہ گرم کرنے سے ثابت ہوا (Fixed air) (یہ کاربن ڈائی اکسائڈ کا پرانا نام ہے) خارج ہوتی ہے - مگر میگنیشیا استا کو ترشہ کے ساتھہ گرم کرنے سے کوئی گیس خارج نہیں ہوتی اس لئے ایلبا میں ثابت ہوا ضرور شامل ہوگی جو ایلبا کو گرم کرنے سے خارج ہوتی ہے اور استا باقی رہ جاتا ہے - اگر غور سے دیکھا جاے تو ہمارے موجودہ خیالات اور بلیک کے قول میں کچھہ بھی فرق نہیں -

(بلیک) میگنیشیا استا + کاربن ڈائی اکسائڈ = میگنیشیا ایلبا

(موجودہ) میگنیشیم اکسائڈ + کاربن ڈائی اکسائڈ = میگنیشیم کاربونیٹ

بلیک نے ان سب تجربوں کو دھرایا اور انہیں تجربوں کو سنگ مر مر کے ساتھہ بھی کیا - وہ ہر حالت میں اسی نتیجہ پر پہنچا - یہیں سے فلوجسٹی نظریہ کے خلاف بنیاد پڑنی شروع ہو گئی - اس وجہ سے بہت سے اِسکاچ (Scotch) مصنف بلیک کو ہی موجودہ علم کیمیا کا بانی قرار دیتے ہیں - جب ایک مرتبہ لیواسیے نے فلوجسٹی نظریہ کو غلط ثابت کردیا تو بلیک نے فوراً ہی اس کو قبول کرلیا اور اس کی حتی‌الامکان مدد کی - اب میں ایک دوسرے عالم کا ذکر کروں گا جس کی تحقیقات سے فلوجسٹی نظریہ کو بہت صدمہ پہنچا —

جوزف پریسٹلے (۱۷۳۳-۱۸۰۴) پریسٹلے کی پیدائش ۱۳ مارچ سنہ ۱۷۳۳ ع کو یارکشایر کے قریب بمقام فیلڈھیڈ ہوئی - اس کی تندرستی عموماً خراب رہتی تھی اور اسی وجہ سے وہ کسی اِسکول میں تعلیم پانے سے

محروم رہا مگر اس کے سنجیدہ والد نے ایک قابل معلم کو گھر ہی پر تعلیم دینے کے لئے مقرر کر دیا تھا - اس کی تعلیم میں بہت دقتیں پیش آئیں - مگر پھر بھی اس کو کتب بینی کا بہت شوق تھا اور اس نے متعدد کتابیں ایسی پڑھیں جو فطرت اور اس کے رازوں پر کافی روشنی ڈالتی تھیں-

اس کو وعظ دینے کا بہت زیادہ شوق تھا اور اسی وجہ سے وہ سنہ ۱۷۵۵ ع میں نیدھیم کے گرجے کا پادری مقرر کیا گیا مگر وہ اپنی صحت کی وجہ سے مجبور رہتا تھا اور اسی وجہ سے وہ اس کام کو بخوبی انجام نہ دے سکا - اس دوران میں بھی پریسٹلے کیمیائی مضامین کا مطالعہ کرتا رہا کیونکہ اس کو کیمیائی باتوں سے سب سے زیادہ دلچسپی تھی اور اسی وجہ سے اس نے پادری کے عہدہ کو ترک کیا اور دنیائے کیمیا میں قدم رکھا - سنہ ۱۷۶۶ ع میں لندن کی رائل سوسائٹی نے ممبر منتخب کر کے اس کو عزت بخشی اور سنہ ۱۷۷۲ ع میں فرانس کے دبستان سائنس نے بھی اس کو اپنا ممبر بنایا - اس کے ایک ہی سال بعد وہ لارڈ شیلبرن کا ادبی سیکریٹری مقرر ہوا —

پریسٹلے مختلف طرح کے علمی مشاغل میں مصروف رہتا تھا - اس نے فلسفہ پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں مگر علم کیمیا پر اس کی تحریریں اور کتابیں نہایت مفید ہیں - مثلاً "مختلف قسم کی ہواوں پر تجربات" - اس کا خیال تھا کہ علمی انکشافات اتفاقیہ ہوا کرتے ہیں اور اسی وجہ سے بہت سے مصنف اس کو "اتفاق پرست" کہتے ہیں -

پریسٹلے کا سب سے نمایاں کار نامہ نیومٹک ٹرف (Neumatic trough) میں پانی کے بجائے پارے کا استعمال تھا - اس کی مدد سے وہ بہت سی ایسی گیسیں تیار کرسکا جو عام طور پر پانی میں حل ہوجاتی تھیں - جیسے

نمک کا ترشه (گیس) سلفر ڈائی آکسائڈ (Sulpher dioxide) اور امونیا وغیرہ۔ اس نے نمک کے ترشے کا نام ترشئی هوا رکھا اور ایمونیا کا نام اسا سی هوا (Basic air)۔ اس کا خیال تھا که دونوں کی آمیزش سے تعدیلی هوا (Neutral air) بن جاے گی اور اس طریقه سے اس نے ایمونیم کلورائڈ (نو شادر) تیار کیا ـ

اس نے ایمونیا سے برقی شرارہ (Electric spark) کے ذریعه سے هائڈروجن تیار کیا اور اس تجربه سے اُس نے امونیا کی بناوٹ سمجھانے کی کوشش کی مگر اس میں اس کو کچھه زیادہ کامیابی حاصل نه هو سکی ــ

پریسٹلے نے پودوں کے تنفس (Plant respiration) اور عام احتراق (Combustion) میں مشابہت دکھلانے کی کوشش کی اور سنه ۱۷۷۲ ع میں هی جب که اس نے آکسیجن کا انکشاف بھی نه کیا تھا انسانی اور پودھوں کی زندگی کا آپس میں مقابله کیا اور بتلایا که اگر ایک هوا میں جس میں که موم بتی جلتے جلتے بجھه جائے کسی پودے کو رکھا جائے تو پھر وهی هوا انسانی زندگی کے لئے کار آمد هوسکتی هے ۔ یعنی موجودہ نقطهٔ نظر سے یه بات ظاهر هوئي که پودھے کی غذا کاربن ڈائی آکسائڈ هے اور یه گیس پودھے میں جذب هونے کے بعد آکسیجن میں تبدیل هوجاتی هے ۔ اسی وجه سے پودوں کی صفائی کنندہ کہا جاتا هے ۔ اس طرح پریسٹلے نے ضیائی تالیف (Photo Synthisis) کی بنیاد ڈالی ــ

سنه ۱۷۷۴ ع میں اُس کو اتفاقاً ایک بہت بڑا اور عمدہ عدسه (Lens) هاتھه لگ گیا ۔ اور اس کی مدد سے اس نے قریب قریب هر ایک چیز کو جو اس کو مل سکی گرم کرنا شروع کیا ۔ اس طرح سے جو گیسیں تیار هوتی تھیں ان کو اکٹھا کرنے کا شوق اُس کو دن بدن بڑھتا هی گیا ۔ یه پہلے هی

بتلایا جا چکا ھے کہ نیومیٹک ٹرف میں پانی کے بجائے پارے کا استعمال پہلے اُس نے ھی شروع کیا تھا - ایک روز جب کہ پریسٹلے پارے کی سرخ آکسائڈ (Lead Oxide of Mercury) کو اپنے عدسہ کی مدد سے گرم کررھا تھا تو یکایک اُس کو ایک ایسی گیس ملی جس کا سانس لینے سے جسم بہت ھلکا اور طبیعت نہایت بشاش معلوم ھونے لگی اور سب سے زیادہ حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ اگر اِس نئی گیس میں کسی چوھے کو رکھا جائے تو وہ اس گیس میں ھوا کی بہ نسبت زیادہ اچھی طرح رہ سکتا تھا - پریسٹلے نے اپنی کتاب میں اس نئی تحقیق کا حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ھے —

" اس آلہ کی مدد سے میں نے کافی تجربے کیے جن کا مختصر حال کسی دوسری جگہ بیان کروں گا - ۱ اگست سنہ ۱۷۷۴ ع کو میں نے پارہ کے آکسائڈ سے ایک نئی گیس نکالی جو اس عدسہ کی مدد سے نہایت سہولیت کے ساتھہ تیار ھوتی ھے - اس گیس کو کافی مقدار میں تیار کرکے میں نے اس کو پانی میں حل کرنا چاھا مگر کیا دیکھا کہ یہ گیس پانی میں حل نہیں ھوتی - مگر ایک بات دیکھہ کر مجھے بہت ھی زیادہ تعجب ھوا جس کا بیان کرنا میرے قابو سے باھر ھے اور وہ یہ کہ ایک موم بتی نئی گیس میں بڑی چمک اور نہایت تیزی کے ساتھہ جلنے لگی - ان سب باتوں کو سمجھانے کی کوشش میں میں بالکل نا کام ھوں "

پریسٹلے نے نئی گیس کا نام " غیر فلوجستی (Dephilogistigated Air) رکھا - اس کا خیال تھا کہ جب کسی چیز کے گرم کرنے سے فلوجسٹن نکلتا ھے تو اس گیس میں مل جاتا ھے کیوں کہ اس میں فلوجسٹن نہیں

ہوتا ۔ اِس خیال کی مضبوطی پر نائٹروجن کا نام " فلوجسٹی ہوا " رکھا ۔ اگر واقعی یہ بات درست ہے تو چیزوں کے جلنے پر نائٹروجن نمودار ہونی چاہئیے مگر ایسا نہیں ہوتا اور نہ اس کو اس بات کا خیال ہی ہوا —

شیل کی طرح پریسٹلے بھی اپنی تحقیقاتوں کی اہمیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھہ نہ سکا ۔ اس کو فلوجسٹی نظریہ پر اتنا قوی یقین تھا کہ کبھی اُس کی مخالفت کا خیال بھی اُس کے دماغ میں نہ آیا اور نہ اس کو یہ ہی ٹھیک معلوم ہوتا تھا کہ چیزوں کے جلنے پر اُن سے کوئی چیز نکلنے کے بجاے ان میں کوئی چیزمل بھی سکتی ہے ۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وہ آخر تک لیواسیے کے نظریہ کا سخت مخالف رہا اور فلوجسٹی نظریہ کی ہی تائید کرتا رہا —

پریسٹلے کو فرانس کے انقلابی جھگڑوں میں پڑ کر انگلستان سے امریکہ بھاگ جانا پڑا ۔ کیونکہ انگلستان میں مخالف گروہ کے حامیوں نے اُس کے مکان اور گرجے وغیرہ کو جلا کر خاک کر ڈالا تھا ۔ اس وجہ سے اس نے بھاگ کرنارتھمبر لینڈ میں پناہ لی اور وہیں سکونت اختیار کر لی ۔ اسی جگہ ۱۴ فروری سنہ ۱۸۰۴ ع میں اُس کا انتقال ہوا ۔ پریسٹلے کی تحقیقات کو علم کیمیا کی بنیاد خیال کرنا چاہئیے اور اس کے بعد ہی اس علم نے اپنی اصلی صورت اختیار کی ۔ اس لیے وہ ابھی موجودہ علم کیمیا کا پیش رو خیال کیا جاتا ہے —

ہنری کیونڈش (۱۷۳۱ - ۱۸۱۰)

کیونڈش کی پیدائش سنہ ۱۷۳۱ ع میں نیس میں ہوئی ۔ یہ ڈیونشایر کے تیسرے ڈیوک کا بھتیجا تھا ۔ سائنس کے میدان میں بہت سے ایسے اشخاص نے حصہ لیا ہے جو کافی دولت مند تھے مثلاً رابرٹ بائل (Robert Boyle) اپنے زمانہ میں

کیونڈش کا شمار بھی وہاں کے رؤسا میں تھا - مگر اس کو علم سے خاص دلچسپی تھی اور یہ دلچسپی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اُس نے اپنے تمام عیش و آرام اور دولت کو ترک کردیا اور نہ شادی ہی کی بلکہ اپنی تمام زندگی حق کی تلاش میں صرف کی —

اس کی سب سے اعلیٰ تحقیق هائڈروجن کا معلوم کرنا ہے - حالانکہ اس گیس کے بارے میں پیراسلسس (Paracelsus) اور وان هیلمنٹ کو بھی کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور تھی مگر اس گیس کی کامل تحقیقات کا سہرہ کیونڈش کے ہی سر ہے - اس نے هائڈروجن کا نام " جلنے والی ہوا " رکھا کیونکہ یہ گیس آکسیجن کے ساتھ فوراً جلنے لگتی ہے - اس کا خیال تھا کہ شاید یہ ہی فلوجستی ہو - کیونکہ اگر کسی دھات میں فلوجستی شامل ہے تو ترشہ کے عمل سے اس سے فلوجستی نکلنی چاہیے - یہی وجہ ہے کہ جست پر گندھک کے ترشہ کے عمل سے هائڈروجن پیدا ہوتی ہے —

پریسٹلے کے آکسیجن بنانے کے بعد کیونڈش نے سنہ ۱۷۸۳ ع میں آکسیجن اور هائیڈروجن کی ملانے کی کوشش کی - اس تجربہ میں اس کو برقی شرارہ کی ضرورت پڑی اور اس طرح اس نے ثابت کیا کہ پانی میں کون کون سے اجزا شامل ہیں - یعنی آکسیجن اور هائیڈروجن کے ملنے سے پانی بن جاتا ہے یعنی پانی میں صرف آکسیجن اور هائڈروجن ہی شامل ہیں - اسی طرح سنہ ۱۷۸۵ ع میں ان تجربوں کے دوران میں اس کو معلوم ہوا کہ جب آکسیجن اور نائٹروجن کی آمیزش پر برقی شرارہ کا عمل کرتے ہیں تو ان کے ملنے سے جو گیس ملتی ہے وہ فوراً پانی سے مل کر شورہ کا ترشہ پیدا کردیتی ہے - یہ ایک بڑے تعجب کی بات ہے کہ جب کبھی اس نے ہوائی نائٹروجن سے تجربہ کیا تو اس میں کچھ نہ کچھ گیس

ہمیشہ باقی رہ جاتی تھی جو قریب قریب تمام حجم کا ایک سو بیسواں حصہ تھی - مگر تب بھی کیونڈش بہت سی ایسی گیسوں کا پتہ نہ لگا سکا جو اس باقی ماندہ حصے میں شامل تھیں جیسے آرگن (Argon) وغیرہ - ان گیسوں کا پتا سو برس بعد سر ولیم ریمزے نے لگایا —

گو کیونڈش نے ہائیڈروجن کو تیار کیا مگر افسوس وہ بھی پریسٹلے کی طرح فلوجسٹی نظریہ کا دل دادہ تھا - اس نظریہ کو غلط ثابت کردینے کے لیے اس کے پاس کافی سامان موجود تھا - پریسٹلے پہلے ہی سے آکسیجن کا نام " غیر فلوجسٹی ہوا " رکھہ چکا تھا اور چونکہ ہائڈروجن آکسیجن سے مل جاتی تھی اس لیے کیونڈش کو کامل یقین ہو گیا کہ ہائڈروجن فلوجسٹی ہے - وہ پریسٹلے کے بر خلاف لیوازیے کے نظریہ کا مخالف نہیں تھا تاہم وہ فلوجسٹی نظریہ کی تائید کرتا تھا —

کیونڈش کا دوسرا قابل تعریف کارنامہ ہوا کی تشریح (Analysis) پر ہوا - اس نے اپنے تجربوں سے دکھلایا کہ ہوا کی آکسیجن اور نائٹروجن میں ۲۰۶۸ : ۷۹۶۱۴ کی نسبت ہے - باوجودیکہ سائنس اتنے اونچے درجہ پر پہنچ چکی ہے اس نسبت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا - موجودہ نسبت یہ ہے ۲۰۶۹۹ : ۷۹۶۰۴

کیونڈش نے طبیعیات میں بھی اعلیٰ درجہ کی تحقیقاتیں کیں - اُس کا خاص کام زمین کی کثافت معلوم کرنا ہے اس کا یہ تجربہ اور اُس کا نتیجہ ابھی تک صحیح مانے جاتے ہیں - وہ ایک عجیب شخص تھا - وہ کسی سے ملاقات کرنا نہیں چاہتا تھا - وہ اتنا شرمیلا تھا کہ زندگی بھر کسی مجلس میں نہیں بولا - رائل سوسائٹی کی مجلسوں میں اگر کوئی اُس سے تقریر کرنے کی درخواست کرتا تو وہ فوراً گھر چلا جاتا - اُس کو اپنے مشاغل کے سوا کسی اور چیز میں

دلچسپی نہ تھی اور اتنا دولت مند ہوکر بھی نہایت سادہ طریقہ پر زندگی بسر کرتا تھا۔ دنیا میں ایسے اعلیٰ خیالات کے شخص شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں اور ہوتے ہیں تو ہمیشہ آئندہ نسلوں کے لیے ایک نئی مثال چھوڑ جاتے ہیں —

کیونڈش کا انتقال ۱۸۱۰ میں ہوا۔ اِس کی یادگار میں کیمبرج میں طبیعیات کا ایک نہایت عالی شان تجربہ خانہ قائم کیا گیا ہے۔ یہ تجربہ خانہ اپنی قسم کے تمام تجربہ خانوں میں اعلیٰ ہے اُس کے صدر کلارک میکسویل، لارڈ ریلے، سر جوزف تامسن اور لارڈ ردرفورڈ جیسے اشخاص ہوے ہیں جن کی تحقیقاتوں نے دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اِس وقت لارڈ ردرفورڈ اُس کے صدر ہیں —

کارل ولیم شیل دنیا میں شیل کے مرتبہ کے عالم بہت کم ہوے ہیں (۱۷۴۲ - ۱۷۸۶) تجربہ اور مشاہدہ کرنے کی صلاحیت جتنی شیل میں تھی اُتنی بہت کم عالموں میں پائی جاتی ہے۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ شیل اٹھارویں صدی عیسوی کا سب سے بڑا مکتشف تھا۔ اُس کی پیدائش ۱۹ دسمبر سنہ ۱۷۴۲ ع کو اسٹرال سنڈ کے ایک غریب خاندان میں ہوئی۔ وہ ۱۴ برس کی عمر میں ایک حکیم کے پاس نوکر ہو گیا۔ یہاں اُس نے آٹھ سال تک کام کیا۔ بعد ازاں سنہ ۱۷۶۴ ع میں میل موبل کے پاس چلا گیا اور سنہ ۱۷۷۰ ع سے سنہ ۱۷۷۵ ع تک اپسالہ میں رہا۔ پھر کوپنگ جاکر ایک مکان خریدا اور اُسی میں اپنا ایک چھوٹا سا تجربہ خانہ بنا لیا اور یہیں پر آخر دم تک کیمیائی انکشافات میں مصروف رہا —

شیل کی تحقیقاتیں

اول اول اُس نے بیریم (Barium) اور مینگنیز (Manganese) کے بنانے کا طریقہ بتلایا اور کلورین (Chlorine) و آکسیجن

کی تحقیق کی- اُس نے میلگنیز ڈائی آکسائڈ سے کئی قسم کے مرکبات تیار کئے جو اب بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں- دراصل شیل آکسیجن کو پریسٹلے سے دو سال قبل تین یا چار طریقوں سے تیار کر چکا تھا مگر اُس کے تحقیقی کارنامے چھپ نہ سکے تھے- اِسی وجہ سے یہ بات کہ آکسیجن پہلے کس نے تیار کی، مختلف فیہ ہے- بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اِس کا سہرا شیل کے سر ہے اور بعضوں کا قول ہے کہ نہیں آکسیجن کو اول اول پریسٹلے نے معلوم کیا —

شیل نے ٹنگسٹن (Tungsten) اور مالب ڈینم (Molybdenum) دھاتوں کو معلوم کیا- جن معدنیات سے اُس نے نکالا وہ اُس وقت تک گریفائٹ (Graphite) خیال کی جاتی تھیں- اُس نے ان دونوں میں فرق بتلایا اور دکھلایا کہ گریفائٹ ایک قسم کی کاربن ہے- پہلے پہل ہائڈروجن سلفائڈ (Hydrogen Sulphide) پر تشریح کے ساتھہ اُسی کی تحقیقاتیں ہیں- آرسینک (Arsenic) پر تجربہ کرتے ہوے اُسے ایک نئے رنگ کا پتہ چلا جو "شیل کا ہرا رنگ" کے نام سے مشہور ہے- آرسینک کا کم سے کم مقدار میں پتا لگانے کے لیے اُس نے آرسین (Arsine) تیار کی —

نامیاتی کیمیا کے میدان میں بھی اُس کے کارنامے کم نہیں ہیں- اُسی نے سب سے پہلے یورک ترشہ (Uric acid) اور گلی سرین (Glycerine) کو معلوم کیا اور نامیاتی ترشوں کے تیار اور صاف کرنے کا ایک طریقہ معلوم کیا جس پر اب تک عمل کیا جاتا ہے- وہ طریقہ یہ ہے کہ پہلے ان ترشوں کے کیلشیم نمک بنائے جائیں اور ان نمکوں کو گندھک کے ترشے کے ساتھہ گرم کیا جاے- اس طرح سے نامیاتی ترشہ الگ ہوجاے گا- اِس طریقے سے اسنے آکزیلک، سٹرک، میلک، گیلک اور ٹارٹرک ترشے وغیرہ تیار کئے اور کھٹے دودہ سے لیکٹک ترشہ

Lactic acid بنایا —

اُس کے کارناموں میں سے ایک خاص کام " پروشین نیل (Prussian Blue) کا تیار کرنا ہے کیوں کہ اسی سے ہائڈرو سیانک ترشہ تیار کیا گیا جس کی صفات کا ذکر اُس نے کافی تشریح کے ساتھ کیا ہے مثلاً اُس کی بو اور ذائقہ وغیرہ ۔ مگر اس کی اہمیت سے وہ واقف نہ تھا ۔ اِس کے مطالعہ سے یہ پتا چل جائے گا کہ شیل نے اِس قدر تھوڑے عرصہ میں کتنا زیادہ کام کیا —

سنہ ۱۷۷۷ ع میں اُس نے ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام " آتش اور ہوا " رکھا ۔ اِس کتاب میں اُس نے جلنے کی بابت اپنے خیالات کا پورا اظہار کیا ہے ۔ شیل نے ایسے بہت سے تجربے کئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا دو چیزوں سے مل کر بنی ہے ۔ ان میں سے ایک جلنے میں مدد کرتی ہے جس کا نام " آتشی ہوا " (Fire air) اور دوسری کا نام " خراب ہوا " (Impure air) رکھا ۔ ہوا کے ایک معلوم شدہ حجم کے اندر کسی چیز کو جلاکر بچی ہوئی شے کا حجم معلوم کرکے اُس نے دونوں کی نسبت معلوم کی ۔ بعد ازاں اُس نے احتراق کے نظریہ کو سمجھایا ۔ آتشی ہوا کیا ہوجاتی ہے ؟ جب کوئی چیز جلتی ہے تو روشنی اور حرارت پیدا ہوتی ہے ۔ اُس کا قول ہے کہ آتشی ہوا فلوجستی سے مل کر روشنی اور حرارت کی شکل میں خارج ہوجاتی ہے ۔ کیونکہ آتشی ہوا پانی میں بھی حل نہیں ہوتی ۔ فلوجستی نظریہ کو ٹھیک ثابت کرنے کے لیے اُس نے ایک اور تجربہ کیا اور وہ یہ کہ جب کاپر آکسائڈ (Copper Oxide) کو (جس میں فلوجستن نہیں ہے) شورہ کے ترشے میں ڈالتے ہیں تو کوئی گیس پیدا نہیں ہوتی کیوں کہ اس رد

عمل میں سرخ رنگ کا دھواں نکلتا ہے - اس نے یہ بھی بتلایا کہ چاندی کے نمکوں پر یعنی سیلور کلورائڈ پر روشنی کا کیا عمل ہے - اور اس عمل کو فلوجستی نظریہ سے ثابت کیا —

شیل کی تحقیقاتوں کو اتنی تھوڑی جگہہ میں بیان کرنا ایک نہایت مشکل امر ہے - یہ تو صرف مشتے نمونہ از خروارے ہے - اس فہرست ہی کو دیکھہ کر لوگوں کو یہ پتا لگ جاے گا کہ وہ کتنا بڑا عالم تھا - اُس کے دماغ سے اتنی باتوں کا ظاہر ہونا اور خاص کر ایک ایسے وقت میں کہ جب دنیائے کیمیا میں تاریکی چھائی ہوئی تھی کچھہ کم اہمیت نہیں رکھتا - اگر اس کا مقابلہ کسی اور ہستی سے کیا جاسکتا ہے تو وہ ایمیل فیشر ہے - سنہ ۱۷۸۶ ع میں صرف ۴۴ برس کی عمر میں شیل کا انتقال ہو گیا —

اینتوئین لورین لیواسیے (۱۷۴۳-۱۷۹۴)

اس کی پیدائش ۲۶ اگست سنہ ۱۷۴۳ ع میں بمقام پیرس ہوئی - اس نے ابتدائی تعلیم میزارن کالج میں حاصل کی - اس کا خاص کام فلوجستی نظریہ کو غلط ثابت کردینا ہے اور اس کی خاص وجہ کیمیائی تجربات میں ترازو کا استعمال ہے - اگر لیواسیے نے ترازو کا استعمال نہ کیا ہوتا تو شاید ہی اتنا کامیاب ہوتا کیونکہ بغیر ترازو کی مدد کے یہ بات کس طرح ظہور میں آتی کہ جلنے پر چیزوں کا وزن بڑھ جاتا ہے نہ گھٹتا ہے جیسا کہ فلوجستی نظریہ کے حامیوں کا دعویٰ تھا —

الکیمیائی دور کے عالموں کا خیال تھا کہ پانی سے مٹی بن سکتی ہے - سب سے پہلے لیواسیے نے اس کی مخالفت کی - اس نے قریب قریب تین مہینہ تک کانچ کے ایک برتن میں پانی گرم کیا - گرم کرنے سے پہلے

سب چیزوں کو تول لیا گیا اور اس بات کو مد نظر رکھا گیا کہ پانی اُڑنے نہ پائے۔ تجربہ کے بعد وزن کرنے سے معلوم ہوا کہ اس کے وزن میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے۔ پھر تمام پانی کو جلا دیا اور جو کچھ باقی بچا اس کو تول لیا گیا۔ پانی کا وزن پہلے ہی سے معلوم تھا۔ اس تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ پانی اور سفید شے (جو پانی کے جلنے سے بن گئی ہے) کا مجموعی وزن پانی کے وزن سے زیادہ ہے یعنی نئی چیز میں کوئی نہ کوئی چیز برتن سے خارج ہوکر مل گئی۔ پھر برتن کا وزن کیا گیا۔ برتن کا وزن اتنا ہی کم ہوگیا تھا جتنا کہ پانی اور سفید شے کے مجموعی وزن میں اضافہ ہوا تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ نئی چیز صرف پانی سے نہیں بلکہ پانی اور کانچ کے ملنے سے پیدا ہوئی ہے۔ اس بات کو شیل نے بھی اسی طرح سمجھایا تھا مگر چونکہ اس نے ترازو کا استعمال نہیں کیا تھا اسی وجہ سے اس کی کوئی اہمیت نہیں دی جاتی —

احتراق پر لیواسیے کی تحقیقات

ان تحقیقاتوں میں بھی اس نے ترازو کا استعمال کیا۔ ہر ایک چیز کا وزن لینے کا اس کو خاص شوق ہوگیا تھا۔ اور وزن کی ہی بنا پر اپنے خیالات ظاہر کرتا تھا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے یہ ہی اس کی کامیابی کی خاص وجہ تھی —

لیواسیے نے معلوم کیا کہ گندھک کا وزن جلنے کے بعد بجائے کم ہونے کے بڑھ جاتا ہے یعنی ایک پونڈ گندھک سے ایک پونڈ سے زیادہ گندھک کا ترشہ حاصل ہوتا ہے۔ اس وزن کے بڑھ جانے کی وجہ یہ ہے کہ جلتے وقت گندھک میں تھوڑی بہت ہوا بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے فوراً معلوم ہو جاے گا کہ کتنی صفائی اور عمدگی کے ساتھ

لیواسیے اپنے خیالات کو ظاہر کرتا تھا۔ وہ لکھتا ہے " میرا خیال ہے کہ سب چیزوں کا وزن جلنے کے بعد بڑھ جاتا ہے مثلاً گندھک و فاسفورس وغیرہ دھاتوں کا بھسم یا آکسائڈ کا وزن بڑھنے کی بھی یہی وجہ ہے۔ میں نے ایک بند برتن میں سیسے کے سرخ آکسائڈ کو خوب گرم کیا۔ گرم کرنے پر اس میں سے ایک قسم کی ہوا نکلی (پرانے زمانہ میں گیس کے لئے ہوا کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا) جس کا حجم اس چیز سے هزاروں گنا تھا اور سیسہ دھات پیدا ہو گئی —

اوپر کے بیان سے یہ صاف ظاہر ہے کہ لیواسیے نے ان تجربوں کو کتنی ہوشیاری اور قابلیت سے انجام دیا۔ اب یکے بعد دیگرے تجربے ہونے لگے۔ سنہ ۱۷۷۴ع میں اس نے رانگ کے جلنے کی بابت اپنی تحقیقات شائع کی۔ اُس نے دھات کا ایک مقررہ وزن کانچ کے ایک برتن میں بند کیا اور دونوں کا مجموعی وزن معلوم کیا۔ ان کو خوب گرم کرنے کے بعد پھر تولا مگر وزن میں کوئی فرق نہ معلوم ہوا۔ جب برتن کے منہ کو توڑا گیا تو یک بارگی ہوا برتن میں گھس گئی۔ اس تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ اندر کی ہوا کا کچھ حصہ رانگ کے جلنے پر آکسائڈ بننے پر صرف ہو گیا۔ اس نے یہ بھی دکھلایا کہ اگر زیادہ مقدار میں رانگ برتن کے اندر رکھا جائے تو اسے کتنا ہی گرم کیا جاوے پھر بھی کچھ نہ کچھ دھات باقی رہ جاتی ہے اور تمام ہوا صرف بھی نہیں ہوتی۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ہوا کا تھوڑا ہی حصہ جلنے میں صرف ہوتا ہے۔ اُس نے پھر پارے کے ساتھ تجربے شروع کئے اور دکھلایا کہ جتنا وزن پارے کو ہوا کے ساتھ گرم کرنے سے بڑھ جاتا ہے اتنا ہی سرخ آکسائڈ کو گرم کرنے سے گھٹ جاتا ہے یعنی پارے کی سرخ آکسائڈ پارے کے ہوا کے ساتھ ملنے سے بنتی ہے۔ سنہ ۱۷۷۷ع میں اُس نے جلنے کے نظریہ

کو اس طرح پیش کیا —

۱ - ہر ایک چیز کے جلنے پر روشنی و حرارت پیدا ہوتی ہے —

۲ - چیزیں صرف خالص ہوا میں ہی جلتی ہیں - یہ آکسیجن کا پہلا نام تھا —

۳ - یہ ہوا جلنے میں صرف ہوتی ہے اور جلنے والی چیز کا وزن اتنا ہی بڑھ جاتا ہے جتنا کہ ہوا کا وزن کم ہوجاتا ہے —

۴ - جلنے والی چیزیں زیادہ تر جل کر بھسم یا آکسائڈ میں تبدیل ہو جاتی ہیں —

گو لیواسیے اپنے خیالات کو ان تجربوں سے ثابت کر چکا تھا مگر پھر ایسے لوگ کم تھے جو اس کے خیالات سے متفق ہوتے - اس نے پانی کی ترکیب بھی معلوم کی - سنہ ۱۷۸۹ ع میں اس نے ایک کتاب تصنیف کی جس میں اس نے فلو جسٹی نظریہ کی پوری مخالفت کی اور اپنے نقطۂ نظر کو سمجھایا - لوگوں کے خیالات پر اس کتاب کا کافی اثر پڑا - اور اسی کو کیمیائی انقلاب کہتے ہیں کیوں کہ اس نے کیمیائی خیالات کو بالکل بدل دیا - اور اس وجہ سے لیواسیے کو موجودہ کیمیا کا بانی کہا جاتا ہے —

لیواسیے نے بقائے مادہ کے کلیہ (Law of the Conservation of mass) کو معلوم کیا - یعنی اس نے بتلایا کہ مادہ نہ تو پیدا کیا جا سکتا ہے اور نہ ضایع - اور اسی اصول پر اس نے کیمیائی مساوات کا طریقہ نکالا جس سے علم کیمیا کو بیحد فائدہ پہنچا - نامیاتی چیزوں کی تشریح میں وہ نہایت قابل اور مشاق تھا - کسی چیز میں کاربن اور ہائڈروجن کے معلوم کرنے کا موجودہ طریقہ اسی کا نکالا ہوا ہے یعنی نامیاتی چیز کو جلانا اور اس طرح

جلانے پر جو کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی حاصل ہوتا ہے اس کا وزن معلوم کرکے ریاضی کی مدد سے چیز کی ترکیب معلوم ہوسکتی ہے —

مذکورہ بالا نمبر ۴ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا خیال تھا کہ سب ترشوں میں آکسیجن ضرور ہونی چاہئے - اس کو " ترشوں کا نظریۂ آکسیجن " کہتے ہیں - اسی وجہ سے اس ہوا کا نام پہلے ترشئی ہوا پڑا تھا - آکسیجن کا لفظ ہی ترشہ سے لیا گیا ہے اس کا مطلب ہے ترشہ پیدا کرنے والا - حالانکہ یہ نام موجودہ زمانہ میں درست نہیں ہے کیونکہ آج کل آکسیجن کے بجاے ہائڈروجن ترشوں کا خاص جز ہے جیسا کہ ڈیوی نے بتلایا تھا - پھر بھی لیواسیے کے زمانہ میں یہ بالکل ٹھیک تھا —

لیواسیے نے زندگی کے مظاہر پر بھی نظر ڈالی - اُس کا خیال تھا کہ زندگی بھی کیمیائی عمل ہے یعنی جو غذا ہم کھاتے ہیں وہ پیٹ میں جا کر ہضم ہوجاتی ہے اور ہضم ہونے میں حرارت پیدا ہوتی ہے - اسی توانائی پر زندگی کا دار مدار ہے —

اُس نے ملکی کاموں میں بھی کافی حصہ لیا اور بہت سی ملکی انجمنوں کا ممبر منتخب کیا گیا تھا - جب فرانسیسی انقلاب شروع ہوا تو بہت سے فرانسیسی اُس کے خلاف ہوگئے اور اُس کا تجربہ خانہ جو کہ ساربون میں تھا جلا دیا - جمہوری سلطنت قائم ہونے پر اس پر مقدمہ چلایا گیا اور اس کو قتل کی سزا تجویز ہوئی اور ۸ مئی سنہ ۱۷۹۴ ع کو قتل کر دیا گیا - ایسا عالم کہ جس کے احسان سے دنیا اور خاص طور پر کیمیائی دنیا کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی اس بے رحمی کے ساتھہ ہمیشہ کے لیے اس ناپاک دنیا سے رخصت کردیا گیا —

لواسیے کو تمام دنیا موجودہ علم کیمیا کا بانی مانتی ہے اور

اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ اس نے ھی موجودہ کیمیا کی بنیاد ڈالی - اس بے رحمی کی مخالفت میں لیگرینج (ایک فرانسیسی سائنس داں) نے کہا تھا :

" گو اُس کا قتل کرنے میں ایک پل بھی صرف نہ ھوا مگر اُس کا ثانی پیدا کرنے میں صدیاں گذر جائیں گی "

ابوالوفا بوزجانی الحاسب

از

(جناب محمد زکریا صاحب مائل)

عرب علما کے غیر فانی علمی کارنامے دنیا کے لئے ہمیشہ مشعل ہدایت کا کام دیں گے - اور جب تک تہذیب و تمدن کا نام لینے والے موجود ہیں - یہ حقیقت بھی ثابت و قائم رہے گی کہ موجودہ عصر ترقی کی داغ بیل انہی عربوں کے آثار پر مبنی ہے - مگر ساتھہ ہی اس اثر کا اعتراف بھی ناگزیر ہے کہ مشرق نے اپنے ان باکمال اور بے نظیر عقل و دماغ والے ماہران فن کی یاد دل سے محو کردی تھی اور اپنے جمود و غفلت یا بے مائگی و مجبوری کے بدولت اسلاف کے بے بہا علمی ذخیرے دوسروں کے ہاتھہ میں دے دئے تھے - اس لئے ان کا ان علمی خزانوں سے محروم رہ جانا ایک قدرتی امر تھا - ان کے مقابل مغربی اقوام کو دیکھئے تو ان کے دامن اس نوع کے بے شمار جواہرات سے معمور نظر آئیں گے اس لئے اب جو کچھہ ہمیں اسلاف کے عظیم‌الشان اور شاندار مآثر کے متعلق ملتا یا معلوم ہوتا ہے اس میں زیادہ حصہ مستشرقین کی سعی و عرق ریزی کا ثمرہ سمجھنا چاہئے —

باوجود اس کے یہ دیکھہ کر تعجب ہوتا ہے کہ مستشرقین نے بہت

سے جلیل‌القدر عرب علما کے حالات پردۂ خفا میں رکھے - نہ ان کا کسی انسائکلو پیڈیا میں ذکر کیا نہ اور کسی تذکرہ یا مستقل کتاب میں ان کے حالات سے بحث کی - حالانکہ بعض یورپین علما کی ممتاز کتابیں ان کے افادات سے بھری ہوئی ہیں —

انھیں غیر معروف یا فراموش کردہ علما میں بعض علماے ریاضی بھی ہیں جن کا ذکر' ریاضیات کا سرمایۂ تاریخ بہت کم اور اس کے ماخذ نہایت مختصر ہونے کی وجہ سے عمومیت کے ساتھ جگہہ نہ پا سکا اور دنیاے ریاضی اچھی طرح ان کے جلالت قدر اور مہارت فن کا اعتراف نہ کرسکی —

ریاضی میں عربوں کا فضل تقدم سب کو تسلیم ہے - آج ریاضی کے جن معرکۃالآرا تحقیقاتی مباحث اور نظریوں نے مغرب کو ساری دنیا سے استاد منوا لیا ہے ان میں کمتر ایسے ہیں جو براہ راست یوروپین ریاضی دانوں کے زائیدہ فکر ہیں - فرما (Fermat) کا * مسئلہ جو مسئلۂ فرما کے نام سے موسوم ہے یا ڈیکارٹ اور ٹامس باکر (Descartes and Thomas Baker) کا مسئلہ † تیسرے درجہ کے معادلات متعلق یہ سب بظاہر نئے اور یوروپ کے قائم کئے ہوئے مسئلے معلوم ہوتے ہیں مگر خود علماے یوروپ کی زبانیں ان کی نسبت اعتراف کر چکی ہیں کہ ان کا اکتشاف عربوں ہی کا رہین منت ہے —

---

* الکاید صفحہ ۲۶۷ مئی سنہ ۱۹۲۸ ع وہ نظریہ یہ ہے " دو مکعب عددوں کا مجموعہ عدد مکعب نہیں ہوتا "

† کاجوری تاریخ ریاضیات سنہ ۱۹۲۴ ع جلد ۷۷ صفحہ (۱۰۷)

اسی سلسلہ میں یہ بات بھی نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں کہ بعض یوروپین مصنفوں نے اکثر مسائل ریاضیہ پر کتابیں لکھیں مگر جن مآخذ سے انہیں مرتب یا تالیف کیا ان کا کہیں ذکر نہیں کیا - اس طرز عمل سے ان کی نیت کا حال روشن ہے - وہ ان مولفات کو براہ راست اپنے ہی دماغ کی کاوش کا نتیجہ ظاہر کرنا چاہتے تھے اور دنیا کو یہ باور کرانے کے خواہشمند تھے کہ ریاضی کے کمال اور مہارت فن میں ہم کسی دوسری قوم کے ممنون نہیں ہیں - ورنہ ماخذوں کا ذکر یا حوالہ کتاب میں ضرور درج کرتے —

اس دعوے کے ثبوت میں لیونارڈ (Leonard of Pisa) جیسے نامور ریاضی داں کا نام لیا جانا کافی ہے - لیونارڈ نے علم جبر و ہندسہ پر جو کچھہ لکھا ہے اس کے متعلق واضح ہو چکا ہے کہ اس موضوع کی کتابیں لکھتے وقت بہت سی عربی مولفات اس کے پیش نظر رہی ہیں —

کارپنسکی (Karpinski) نے ثابت کیا ہے کہ لیونارڈ نے کتاب * جبرابی کامل سے بہت کچھہ اخذ کیا ہے - اسی طرح بعض علماے انگلستان نے چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں جو بعض کتابیں مثلثات پر لکھی ہیں وہ بھی عربی کتابوں سے ماخوذ تھیں † —

یوحناملر (John Muller) کی بہت سی تصنیفات ریاضی کا بھی یہی حال ہے - یہ شخص ریجیو مونتانوس (Regiomantanus) کے نام سے زیادہ مشہور تھا اور اس نے پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں بہت سی کتابیں مغربی ادب میں منتقل کی تھیں - اس کی تصنیفات میں سب زیادہ اہم کتاب (De Triangulis)

---

* کاجوری تاریخ ریاضیات سنہ ۱۹۲۴ ع جلد ۷۷ صفحہ (۱۲۱)

† صالح زکی - آثار باقیہ جلد اول صفحہ ۱۲۴

ہے جسے ہم المثلثات کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں - یہ کتاب پانچ بڑی بڑی فصلوں میں منقسم ہے - ان میں سے چار فصلیں مثلثات مستویہ کے متعلق ہیں اور ایک فصل مثلثات کرویہ کے متعلق - اب اگر کوئی یورپین اہل علم اس بات کا مدعی ہو کہ اس کتاب کے کل مسائل ملر ہی کی ایجاد ہیں تو یہ بدا ہتاً غلط ہوگا کیوں کہ ملر نے کتاب زیر بحث کی پانچویں فصل میں جن اصولوں کا اتباع کیا ہے یعنی مثلثات کرویہ کے اصول یہ بعینہ وہی اصول ہیں جو اس موضوع پر چوتھی صدی ہجری میں عربوں کے رہین منت ہوچکے تھے * کروی مثلثات کے علاوہ مثلثات کے اور مسائل بھی جو ملر کی طرف منسوب ہیں حال ہی میں ان کے متعلق ثابت ہوچکا ہے کہ وہ ملر کے نہیں بلکہ عربوں کے وضع کئے ہوے ہیں' جو ان مسائل پر بہت پہلے توجہ کرچکے ہیں † —

عرب ریاضی دانوں میں جن علما کو ممتاز اور بلند علمی حیثیت حاصل ہے؛ انہی میں ایک سے اہم ہستی ابوالوفا بوزجانی کی بھی ہے - یہ الحاسب کے نام سے مشہور تھے - ان کا نام محمد تھا سنہ ۳۲۸ ھ مطابق سنہ ۹۴۰ع میں بوزجان میں پیدا ہوے تھے جو ہزارہ اور نیشاپور کے مابین ایک چھوٹا سا شہر ہے ‡ —

ابوالوفا نے علم الاعداد و حساب کی تعلیم اپنے چچا ابو عمرو مغازلی اور اپنے ماموں ابو عبد اللہ محمد ابن عنبسہ سے پائی تھی - ابو عمرو مغازلی علم ہندسہ میں ابو یحییٰ ماوردی اور ابوالعلاء ابن کرنیب کے شاگرد

---

* صالح زکی - آثار باقیہ جلد اول صفحہ ۱۵۴ — † کاجوری تاریخ الرضیات صفحہ ۱۲۳ — ‡ معجم البلدان جلد اول صفحہ ۳۰۲ —

تھے * - جب ابوالوفا بیس سال کے ہوگئے تو بوزجان ترک کرکے بغداد میں سکونت اختیار کی اور وہاں اکثر کتابیں تالیف کیں —

ابوالوفا کے تاریخ وفات میں اختلاف ہے ' کتاب قاموس الاعلام کی روایت سے ان کا سال وفات سنہ ۳۷۶ ھ اور مدفن بوزجان معلوم ہوتا ہے اور کتاب آثار باقیہ میں سنہ وفات سنہ ۳۸۸ ھ اور مقام وفات بغداد درج ہے - آخری روایت سے ابن قفطی نے بھی استفادہ کیا ہے اور اپنی کتاب اخبار العلماء باخبار الحکما میں لکھا ہے " پھر ابوالوفا بغداد ہی میں مقیم رہا یہاں تک کہ ۳ رجب ۳۸۸ ھ کو وفات پائی " † - اور ہمارے نزدیک بھی دونوں روایتوں میں سے دوسری ہی کو ترجیح ہے - جس کے کئی وجوہ ہیں - ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں پہلی روایت کو لیا ہے مگر مقام وفات کا ذکر نہیں کیا - ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں اس کے متعلق کچھہ نہیں لکھا - کتاب الاعلام مولفہ خیرالدین زرکلی کی روایت ہے کہ ابوالوفا نے بغداد میں ۳۷۶ ھ میں انتقال کیا مگر انہوں نے اس روایت کا ماخذ نہیں لکھا - ان کے سوا انگریزی و امریکی مورخین کو لیا جاے تو یہ دوسری روایت کے موید ہیں لہذا ہم بھی عدم صحت اور عدم وثوق کی وجہ سے پہلی روایت کو نظر انداز کرکے دوسرے کو اختیار کرتے ہیں - اور اب نفس مضمون پر قلم اُٹھاتے ہیں —

ابوالوفا ان گنتی کے علما میں تھے جو فلکیات و ریاضیات کے

---

* ابن الندیم - الفہرست صفحہ ۳۹۴ —

† اخبار العلما باخبار الحکما مطبوعہ سنہ ۱۳۲۶ ھ صفحہ ۱۸۹ مولفہ ابن القفطی —

مجمع البحرین یا ان دونوں علوم کے مسلمہ و متبحر عالم تھے - انہوں نے ان علوم پر بلند پایہ کتابیں لکھیں جن کا ذکر مجملاً اس مضمون میں کسی جگہ درج کیا گیا ہے اور بعض کتابوں کے اہم حصوں پر روشنی ڈالی گئی ہے —

یوروپ کے بعض بلند رتبہ علماے ریاضی نے ان کی نسبت اعتراف کیا ہے کہ یہ علم هندسہ کے فاضلوں میں سب سے زیادہ کامل الفن اور مشہور تھے - ابن خلکان نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ " ابوالوفا نے علم هندسہ میں عجیب و غریب مسائل کا استخراج کیا ہے جو اس سے پہلے کسی نے نہ کیا تھا اور اوتار (جمع وتر) کے استخراج میں بھی ایک نہایت عمدہ کتاب تالیف کی تھی * —

بغداد میں ابوالوفا نے اپنی ساری زندگی تالیف و رصد و تدریس میں گزار دی - ان کا تمام وقت علمی مشاغل کے لیے وقف تھا - وہ تھوڑے ہی دنوں میں اپنی بے لوث علمی خدمت اور زبردست عالی دماغی کی بدولت بغداد کے ممتاز ترین علما میں شمار ہونے لگے اور ریاضی میں ان کی شخصیت نہایت اعلیٰ تسلیم کرلی گئی - اس کا اظہار اس طرح ہوا کہ ابوالوفا، رصد خانہ سواے شرف الدولہ کے رکن بنا ئے گئے † جو شرف الدولہ نے خود بڑے اهتمام سے بنایا تھا - ابوالوفا کو اس کی رکنیت سنہ ۳۷۷ ھ میں حاصل ہوئی —

ابوالوفا کو مبادی مثلثات میں بہت شغف تھا، وہ بڑے انہماک و توجہ

---

* وفیات الاعیان جلد دوم صفحہ ۸۱ - † علاوہ وفیات الاعیان کے کتاب آثار باقیہ جلد اول صفحہ ۱۹۶ اور تاریخ ریاضیات صفحہ ۱۰۵ سے بھی اس راویت کی تائید ہوتی ہے —

کے ساتھہ اس موضوع پر تحقیقات و اختراع میں مصروف رہتے تھے - ان کے اس انہماک کی بدولت اس شعبہ میں بہت سی نئی معلومات و اکتشافات کا اضافہ ہوا - جس سے نہ صرف اپنوں نے بلکہ یوروپ کے بیگانوں نے بھی خاطر خواہ استفادہ کیا - اور ابوالوفا کے علمی احسانات کا اعتراف کرتے ہوے تسلیم کیا کہ ابوالوفا پہلے ریاضی داں ہیں جنھوں نے سب سے پہلے مثلثات میں مماس کو داخل کیا (*) —

اس بیان کے آخری جزو کے متعلق علامہ ابوریحان البیرونی کا قول ہے " اس شکل (شکل ظلی یا مماس) کے استنباط میں سبقت بلا اختلاف ابوالوفا ہی کے حصہ میں آئی تھی † " - ابوالوفا کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ انھوں نے مثلثوں اور زاویوں کے قیاس میں مماس اور قواطع و نظایر وغیرہ کو سب سے پہلے استعمال کیا تھا - یورپ کے ایک ریاضی داں کا قول ہے کہ ابوالوفا نے کل اعداد مثلثہ اور ریاضی جدولوں کے عمل کو مماس اور نظیر مماس کے قاعدہ میں داخل کرلیا تھا ‡ -

جیبی جداول ریاضیہ کے عمل کا طریقہ بھی ابوالوفا ہی کا ایجاد کیا ہوا ہے - اس میں انھیں اتنی کامیابی ہوئی کہ انھوں نے زاویے کے جیب کی صحیح قیمت نصف درجہ سے تقریباً نو درجہ اعشاریہ تک دریافت کر کے اہل ریاضی کو حیران کردیا § - ریاضیات کی انگریزی کتابوں میں شکل

---

* انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا بیان مثلثات (Trigonometry)

† صالح زکی آثار باقیہ جلد اول صفحہ ۵۴

‡ بول - مختصر تاریخ الریاضیات سنہ ۱۸۸۱ ع صفحہ ۱۵۵

§ کجوری - تاریخ الریاضیات صفحہ ۱۰۶

کے متعلق ابوالوفا کا ایک مقالہ عمل ہندسی (Geometric Construction) کے نام سے ملتا ہے جس کا اصل عربی نام اور ترتیب یا ہندسی بنا کا حال معلوم نہ ہو سکا * -

ان مسلمات کی بنا پر اگر یہ استدلال کیا جاے کہ عرب دنیا کی پہلی قوم ہے جسے سطح کرہ پر شکل بنانے کا اصول معلوم ہوا تو یہ استدلال ذرا بھی بیجا اور نادرست نہ ہوگا اور اس کی شہادت تاریخ سے ملتی ہے کہ عربوں نے اس اصول کو معلوم کرکے سرسری نظر سے نہیں دیکھا اور اسے نظر انداز نہیں کیا بلکہ اس پر قابو پاکر اس میں نمایاں ترقی کی اور امتیازی مہارت پیدا کرکے امام فن بن گئے —

حرکت قمر میں بعض قسم کے خلل معلوم کرنے کی مہم بھی عربوں ہی کی سر کی ہوئی ہے ' مگر اس کے منسوب کرنے میں اہل مغرب کو اختلاف رہا ہے - بعض یوروپین ریاضی دان اسے تیخوبراهی کی طرف منسوب کرتے تھے اور بعض ابوالوفا سے نسبت دیتے تھے † - شکر ہے کہ کچھ مدت پہلے یہ اختلاف بھی رفع ہو گیا اور یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اس اکتشاف کا سہرا فقط ابوالوفا کے سر ہے ‡ -

ابوالوفا کی مہارت ریاضی کا ایک کارنامہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ انھوں نے چوتھے درجہ کے معادلات کو بھی نہ چھوڑا اور دو معادلوں کا ہندسی حل کر ڈالا —

ابوالوفا نے دسویں صدی عیسوی کے نصف میں علم حساب میں ایک

---

* کاجوری تاریخ الریاضیات صفحہ ۱۰۶

† فانڈیک - علم الهیئة صفحہ ۱۳۷ ‡ کاجوری - تاریخ الریاضیات - صفحہ ۱۰۵

کتاب لکھی جس میں ھندی رقمیں استعمال نہیں کیں *۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رقمیں حروف سے لکھتے تھے مگر ایسا عمل علماے عرب میں ابوالوفا کے سوا کسی نے نہیں کیا - اگر کیا بھی تو اس کی حیثیت الشاذ کالمعدوم کی ہے - مثلاً ایک نام کرخی کا اور ملتا ہے جس نے ابوالوفا کی طرح ھندی رقمیں لکھنا چھوڑدی تھیں —

ایسا کیوں تھا' اس کی تشریح کانتور (Cantor) نے خوب کی ہے - وہ کہتا ہے اس زمانہ میں اعداد کی کتابت کے دو مختلف مذھب پائے جاتے تھے - ایک کے یہاں ھندی طریقہ رائج تھا دوسرا یونانی طریقے کا اتباع کرتا تھا - یہ دونوں یعنی ابوالوفا اور کرخی انہی لوگوں میں سے ہیں جو یونانی طریقے کے پیرو تھے † - بہرحال کانتور کے سوا اور علما کو ابوالوفا اور کرخی کے ھندی رقوم ترک کرنے کا سبب معلوم نہ ہوسکا اسی لیے ہمیں عرب تذکرہ نویسوں کے یہاں اس خصوص میں کوئی بحث نہیں ملتی —

ابوالوفا کی بعض کتابیں

ابوالوفا نے اپنی بے نظیر قابلیت اور خدا داد روشن دماغی سے کام لے کر تالیفات کی شکل میں جو غیر فانی اور نادر علمی ذخیرہ فراہم کردیا تھا وہ دنیاے علم کے لیے ہمیشہ فخر و نازش کا سرمایہ بنا رہے گا۔ اہل علم و فضل اس کی ان کوششوں کو کبھی فراموش نہ کریں گے جو اس نے ریاضیات کی گتھیوں کے سلجھانے میں کیں اور آیندہ نسلوں کے لیے قابل ذکر سہولتوں کا دروازہ کھول دیا —

* کاجوری تاریخ الریاضیات طبع قدیم صفحہ ۱۰۷

† کا جوری تاریخ الریاضیات - طبع قدیم صفحہ ۱۰۷

چوتھی صدی ہجری یا دسویں صدی عیسوی کا زمانہ وہ زمانہ تھا جس میں علماے ریاضیات کی کوششیں بڑی حدتک عملی صورت میں عوام کے سامنے نہ آئی تھیں۔ ریاضی اور اس کے رموز و دقائق زیادہ تر علما تک محدود تھے۔ اس وقت تک یہ فن عمومی حیثیت سے سب کے لیے کار آمد نہ بن سکا تھا۔ ابوالوفا کی دور رس نگاہوں نے اس وقت کو پالیا اور عوام کی رہنمائی کے لیے ایک کتاب المنازل فی الحساب کے نام سے لکھی *۔ یہ کتاب اس دور کے لیے نہایت اہم اور بے حد ضروری تھی۔ لوگ ایسی کتاب کے لیے چشم براہ تھے۔ جو مشکلات حساب کے حل کرنے میں مدد دیتی اور وقت بے وقت پریشانی و سرگردانی سے بچاتی۔ جب ابوالوفا کی یہ کتاب مرتب ہوگئی تو سب نے اسے اپنی نوعیت کی پہلی اور مفید ترین کتاب سمجھ کر اس کی بیش از بیش قدر کی۔ اور اس سے کاتبوں اور منشیوں کی بہت سی دشواریاں دور ہوگئیں۔ اس زمانہ کے ساہوکار اور لین دین کرنے والے عموماً اسی کتاب سے مدد لیتے اور اسی کے اصول پر تمام معاملات کا دار و مدار رکھتے تھے۔ مولف کے بعد بھی بہت دن تک حساب پیشہ اشخاص اسی کتاب کو شمع ہدایت بنائے رہے —

" المنازل فی الحساب " سات بابوں پر تقسیم تھی اور ہر باب کا نام منزل رکھا تھا۔ یہ ابواب حسب ذیل تھے —

پہلی منزل	نسبت کے بیان میں
دوسری منزل	ضرب و تقسیم کے بیان میں
تیسری منزل	مساحتوں کے بیان میں

* صالح زکی آثار باقیہ جلد اول صفحہ ۱۶۳

چوتھی منزل　　　　اخراج کے عمل میں

پانچویں منزل　　　　مقاسات کے اعمال میں

چھٹی منزل　　　　حروت کے بیان میں

ساتویں منزل　　　　معاملات تجار میں *

یہ کتاب تو حساب کے لیے مخصوص تھی - اس کے علاوہ فن جبر و مقابلہ میں بھی ابوالوفا کی دو کتابوں کا حال معلوم ہوا ہے - ایک کا نام تفسیر ڈیوفنطس (Diophantus) اور دوسری کا نام تفسیر ابرخس ہے —

مولف کتاب آثار باقیہ نے دوسری کتاب کے نام کے متعلق لکھا ہے " ابوالوفا نے جس کتاب کی تفسیر لکھی ہے اس کے نام میں اختلاف ہے - فہرست العلوم کے بعض نسخوں میں ابرخس کا نام ابوحسن کی طرح † لکھا ہے اور تاریخ الحکما کے بعض نسخوں میں ابویحیی یا ابن یحیی درج ہے - ایک فہرست میں ابرخس پر بحث کرتے ہوے لکھا ہے " ابرخس کی ایک علمی یادگار " کتاب التعریفات " کے نام سے مشہور ہے - اس کتاب کا ترجمہ و تصحیح ابوالوفا نے کی ہے اور بعض ہندسی دلائل سے اُس کی شرح بھی لکھی ہے " —

اگر آخری قول کو تسلیم کر لیا جائے جس کے قرائن موجود ہیں تو ابوالوفا کی مذکورۂ بالا تفسیر بعینہ کتاب ابرخس کی تفسیر ثابت ہوتی ہے - رہے ابویحیی جن کا ذکر تاریخ الحکما میں ابرخس کے بجائے آیا ہے تو یہ غالباً ابویحیی ماوردی ہوں گے جنھوں نے ابوالوفا کے استاد کو حساب و

---

* ابن الندیم الفہرست صفحہ ۳۹۴ —

† غالباً فہرست العلوم کے مولف نے ابرخس اور ابوحسن میں تشابہ کی وجہ سے غلطی کی ہے —

ہندسہ کی تعلیم دی تھی مگر اس قول پر حصر دشوار ہے* —

ابن ندیم کی کتاب الفہرست میں ابرخس کی نسبت لکھا ہے " اس کی مصنفات میں ایک کتاب صناعت الجبر (علم جبر و مقابلہ) کے متعلق ہے - اس کتاب کی نقل و اصلاح ابوالوفا محمد ابن محمد الحاسب نے کی اور اس کی ایک شرح بھی لکھی جس میں ہندسی براہین و دلائل سے اصول کتاب کی تفسیر و تعلیل درج کی ہے " ‡ —

ابرخس کی اسی کتاب کو صاحب کشف الظنون نے ' ابوالوفا کے مصنفات میں کتاب الحدود کے نام سے لکھ کر ظاہر کیا ہے کہ یہ کتاب حکیم ارسطیقوس یونانی کی کتاب کا عربی ترجمہ ہے ' اسے کتاب الجبر بھی کہتے ہیں - ابوالوفا نے ترجمہ کے علاوہ اس کی اصلاح اور تشریح و تعلیل بھی کی ہے —

صناعوں اور دستکاروں کے لیے ایک مفید اور کتاب ابوالوفا کی مولفات میں اوپر منازل الحساب کا ذکر ہوچکا ہے جو افادیت کے نقطۂ نظر سے اپنی قسم کی پہلی کتاب تھی - اب ایک اور مفید تالیف کا ذکر کیا جاتا ہے جو ابوالوفا نے صناعوں اور دستکاروں کی سہولت اور ان کی فائدہ رسانی کے خیال سے ہندسی اعمال کے موضوع پر لکھی تھی - یہ کتاب بڑی نہایت کارآمد اور اچھی تھی - اس کا زمانۂ تالیف سنہ ۳۸۰ ھ اور سنہ ۳۸۸ ھ کے مابین ہے - اس کی تالیف میں بہاءالدولہ کے ایما کو بھی دخل تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اہل صناعت کو جو دشواریاں بالعموم پیش آتی رہتی ہیں وہ کسی ماہر فن ریاضی داں کی ہمت سے دور ہوجائیں - چونکہ یہ کتاب ایک طبقہ کے لیے مخصوص تھی اس لیے ابوالوفا نے اسے ریاضی دلائل

---

* صالح زکی آثار باقیہ جلد اول صفحہ ۱۹۳ و ۱۹۴ ‡ ابن الندیم الفہرست

سے خالی رکھا۔ اس کا ایک نسخہ اب بھی جامع ایا صوفیہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے —

اس کتاب کا نام صاحب کشف الظنون نے کتاب الہندسہ لکھا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ اس میں مسطر ' گونیا اور پرکار اور اشکال ہندسی کے طریقے بہت شرح وبسط سے لکھے ہیں اور کتاب کو تیرہ ابواب میں تقسیم کیا ہے —

ان کتابوں کے علاوہ ابوالوفا نے اور مفید کتابیں بھی لکھی تھیں جن میں سے بعض کا ذکر ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں کیا ہے - ذیل میں ان کے نام درج کیے جاتے ہیں —

۱ - تفسیر کتاب الخوارزمی فن جبرو مقابلہ میں

۲ - کتاب المدخل الارثما طیقی

۳ - ایک نا معلوم الاسم کتاب جو کتاب المدخل سے پہلے حفظ کرنے کے لیے لکھی تھی —

۴ - ایک نا معلوم الاسم کتاب جس میں دیوفنطس کے استعمال کیے ہوے قضایا کے دلائل و براہین پر بحث کی ہے

۵ - کتاب معرفۃ الدائرہ فلکیات میں۔

۶ - کتاب الکامل

یہ کتاب تین مقالوں میں تقسیم ہے

(پہلا مقالہ) ان امور کے بیان میں جن کا جاننا حرکات کواکب کا علم حاصل کرنے سے پہلے ضروری ہے

(دوسرا مقالہ) حرکات کواکب کے بیان میں

(تیسرا مقالہ) ان امور کے بیان میں جو حرکات کواکب کو لاحق ہوتے ہیں

۷ - کتاب استخراج ضلع المکعب

ان کتابوں کے علاوہ ابوالوفا کی جن کتابوں کا حال کتاب ابن القفطی' کتاب اخبار العلما باخبار الحکما اور کتاب آ ثا ر با قیہ میں ملتا ہے ا ن کے نا م یہ ہیں —

۱ - کتاب العمل بالجدول المتینی۔

۲ - کتاب استخراج الاوتار۔

۳ - کتاب الزیج الشامل۔

۴ - کتاب المجسطی۔

آخر الذکر کتا ب ابوالوفا کی نہایت مشہور یادگار ہے اور اس کا ایک نا قص نسخہ پیرس کے وطنی دار المطالعہ میں محفوظ ہے' غا لباً یہ نسخہ سنہ ۳۷۷ ھ کے بعد تالیف ہوا تھا —

مصنفات ابوالوفا کی یہ فہرست اور اس کے سوانح زیادہ تر قدری حافظ طوقان کے ایک مضمون مطبوعہ المقتطف سے ماخوذ ہیں۔ مگر ہمیں اس کے چند حصو ں سے اختلاف ہے جنہیں یہا ں واضح کردینا ضروری معلو م ہو تا ہے۔ مثلاً فاضل مضمون نگار نے ابوالوفا کے حالات میں لکھا ہے کہ " ہندی رقموں کا استعمال ابوالوفا اور کرخی کے سوا کسی نے نہیں کیا "۔ یہ بیان محل تا مل ہے۔ کیو ں کہ ابوالوفا اور ا س سے پہلے عمو ماً حروف سے اعداد کا کا م لیا جا تا تھا۔ ہندی رقوم کا ا ستعما ل تو عروج ا سلا م کے کئی صد ی بعد ہو ا۔ ا س وقت تک علما ے ر یا ضی با لعمو م یونانی طریقہ کا اتباع کرتے تھے۔ چنانچہ بعض زیجیں اور ریاضی کی جدولیں جو تیسری صدی اور اس سے پہلے کی بنی ہوئی ہیں ان میں حروف ہی اعداد کے بجاے لکھے ہوے ہیں۔ مصر کے عجائب خانہ میں تیسری صدی ہجری کا بنا ہوا ا یک اصطرلاب ا ب بھی محفوظ ہے جس میں تمام ا عدا د

حروف کی صورت میں منقوش ھیں - جرجی زیدان نے تاریخ آداب اللغۃ العربیہ میں اس کا فوٹو بھی شائع کیا ھے —

اس کے علاوہ مضمون متذکرۂ بالا میں کتاب الکامل اور کتاب الزیج الشامل کو دو جداگانہ کتابوں کی حیثیت سے درج کیا ھے - حالانکہ کتاب الکامل سرے سے ابوالوفا کی تالیف ھی نہیں ھے بلکہ اصل میں اس کی کتاب الزیج الشامل ھے، اس کی شرح کا نام کتاب الکامل ھے جو سید حسن ابن علی القومناتی نے لکھی تھی - اس سے پہلے سید حسن کے باپ سید علی القومناتی اسی زیج کی شرح لکھ چکے تھے - پھر سید حسن نے سلطان یلدرم بایزید کے لیے کتاب الکامل لکھی —

دلچسپ اقتباسات

(حضرت آدم و حوا کا قصہ اور آثار قدیمہ)

حضرت آدم و حوا کا قصہ کتب مقدسہ تورات و انجیل وغیرہ میں مذکور ہے ' اور نصرانی علما کا اس خیال پر اتفاق ہے کہ سفر تکوین جس میں یہ قصہ بیان کیا گیا ہے حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے تقریباً سنہ ۱۷۰۰ قبل مسیح میں تحریر فرمایا تھا۔ حال ہی میں کچھ آثار تقریباً دو ہزار سال پہلے کے بعض ماہران آثار قدیمہ کو ایسے دستیاب ہوے ہیں جن پر حضرت آدم و حوا کا قصہ منقوش ہے ـــ

یہ قصہ حقیقی ہو یا مجازی ؛ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کی اشاعت قدیم ترین زمانہ سے ہوتی چلی آئی ہے - اخلاف اپنے اسلاف سے اس روایت کو بتواتر نقل کرتے رہے ہیں - یہ قصہ توراۃ میں جس نہج سے مسطور ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ " اللہ تعالے نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کر کے ان کی ناک میں روح پھونکی - پھر ان کی رفاقت کے لیے حضرت حوا کو پیدا کیا - جس کی شکل یہ ہوئی کہ حضرت آدم پر نیند طاری فرمائی - جب وہ سو کر اٹھے تو اپنے ایک جانب حوا کو پایا ۔ حضرت آدم ان کے ساتھ جنت میں عیش و آرام سے بسر کرتے رہے ۔ جنت

میں جتنے پھول پھل اور میوے وغیرہ تھے ان میں سے کوئی چیز ان کے لیے ممنوع نہ تھی - البتہ ایک درخت کو چھونے اور اس کے پھل کھانے کی سخت ممانعت تھی جو خیر و شر کی معرفت کا درخت تھا - اس ممانعت نے دونوں کے دل میں اس کے پھل کھانے کی حرص پیدا کر دی - اس سے شیطان نے فائدہ اٹھایا اور سانپ کی صورت بن کر حضرت حوا کے پاس پہنچا اور انھیں شجر ممنوعہ کے پھل کھانے کی ترغیب دی - حضرت حوا اس کے بہکانے میں آ گئیں ۔ اس کے پھل خود بھی کھائے اور حضرت آدم کو بھی لالچ دلا کر کھلائے - اس نافرمانی سے دونوں پر خدا کا غضب نازل ہوا - یہ جنت سے نکال دیے گئے اور زمین بھی ان کے وجہ سے لعنت میں مبتلا ہوئی "۔

جزئیات کو چھوڑ کر نفس روایت قرآن کریم میں بھی تقریباً اسی طرح مذکور ہے اور دوسری اقوام قدیمہ کے یہاں بھی کم و بیش اسی قسم کی تفصیل پائی جاتی ہے - بہر حال قصہ کا خلاصہ جو زیادہ سے زیادہ ہو سکتا ہے اتنا ہی ہے جو اوپر بیان ہوا ' اب مضمون کے دوسرے اجزا سے بحث کی جاتی ہے —

علمائے آثار کا اتفاق ہے کہ انسان اول کا ظہور ان مشہور شہروں میں ہوا جو دو دریاؤں کے مابین واقع تھے اور روایات توریت کے تمام قرینے اس پر دلالت کرتے ہیں کہ باغ عدن ' خواہ اس سے مکان حقیقی مراد ہو یا مکان مجازی ایسی ہی جگہ تھا - اس مقام کی آب و ہوا وہاں کے چشمے اور کنوئیں اور پھل پھول وغیرہ سب چیزیں انسانی رغبت کے لحاظ سے بہترین تھیں —

حضریات کی تازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے آثار کو

کچھہ چیزیں ایسی دستیاب ہوئی ہیں جن سے قصہ آدم و حوا کی کامل تائید ہوتی ہے۔ یہ اشیا ایسے شہر کے کھنڈروں میں ملی ہیں جو بلاشبہ انسان کے آباد کئے ہوے شہروں میں سب سے زیادہ قدیم ہے یعنی شہر "تیب جورا" جو چھہ ہزار سال پہلے تعمیر ہوا تھا —

ان چیزوں میں ایک ٹھیکری کا ٹکڑا خصوصیت سے اہم اور قابل ذکر ہے' اس ٹکڑے پر ایک مرد اور ایک عورت کی شکل کندہ ہے۔ تصویر سے معلوم ہوتا ہے کہ رنج و ملال نے دونوں کی کمر جھکا دی ہے اور حزن و ملال کے آثار ان کے چہرہ سے نمایاں ہیں۔ یہ دونوں جنت سے برہنہ نکلے ہیں۔ ان کے پیچھے ایک سانپ کھڑا ہوا ان کی نگرانی کر رہا ہے جو گویا ان کی نحوست کی تصویر ہے جس کی بدولت یہ مصیبت میں مبتلا ہوے ہیں —

ان مرد اور عورت کا نام تو نہیں لکھا ہے لیکن تصویری قرائن دلالت کرتے ہیں کہ یہ دونوں سانپ کے جال میں پھنس گئے تھے جو ان کے جنت سے نکالے جانے کا باعث ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے عیش و راحت کی زندگی بسر کر رہے تھے —

اس امر کی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ جس نقاش نے اس شکل کو کندہ کیا ہے وہ تقریباً تین ہزار سات سو قبل مسیح یعنی اب سے کوئی پانچ ہزار سات سو برس پہلے موجود تھا۔ یہ زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصۂ تخلیق عالم اور قصۂ آدم و حوا کے لکھنے سے دو ہزار سال پہلے کا ہے۔ ٹھیکری پر جو نقش بنا ہوا ہے وہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ قصہ اس زمانہ میں بھی متداول تھا اور کچھہ بعید نہیں ہے کہ یہ قصہ اپنی نوعیت کا پہلا قصہ ہو جسے انسان نے اپنے جد امجد کی

سر گزشت کے طور پر نسلاً بعد نسل روایت کیا ہو اور اسے مختلف طریقوں سے محفوظ رکھنے کی سعی کی گئی ہو —

شہر " تیپ جورا " جس کا اوپر ذکر کیا گیا بلاد بین النہرین کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ جن لوگوں نے اس شہر کے کھنڈر دریافت کئے ہیں وہ ایک علمی مہم کے ممتاز ارکان ہیں۔ یہ مہم امریکہ کے کئی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اہتمام سے ڈاکٹر سپیزر مشہور ماہر آثار کی سرکردگی میں بھیجی گئی تھی —

اس مہم کے کئی سال شہر " اور " کی کھدائی میں صرف ہوئے۔ یہ وہی شہر تھا جس کے متعلق گمان ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کا مولد تھا۔ اور اب سے پہلے یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ " اور " ہی انسان کا بسایا ہوا قدیم ترین شہر ہے۔ جب یہ مہم شہر " اور " سے فارغ ہوئی تو دوران تلاش میں اسے شہر " تیپ جورا " کے کھنڈروں کا پتہ ملا جن کی کھدائی سے واضح ہوا کہ یہ شہر تو کلدانیوں کے شہر سے بھی زیادہ پرانا ہے بلکہ علمائے آثار نے پورے تجسس اور غور کرنے کے بعد بعض چھوٹے قریوں، غاروں کو مستثنیٰ کرکے انسان کا قدیم ترین شہر " تیپ جورا " ہی کو قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی قدامت معلوم ہونے کے بعد حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے قصہ والی تھیکری ماننے پر کوئی تعجب کی گنجائش نہیں رہتی —

جو لوگ نص تورات کے بنا پر اس عقیدہ کے قائل ہیں کہ باغ عدن بین النہرین واقع تھا ان کا عقیدہ توریت کی ان آیات سے ماخوذ ہے —

" شرقی عدن میں ایک باغ لگایا اور اس میں آدم کو رکھا۔

عدن سے ایک دریا نکلتا تھا جو اس باغ کو سیراب کرتا تھا اور

وہاں سے تقسیم ہو کر اس سے چار دریا بہنے لگے تھے۔ ایک دریاے فیشون جو سرزمین "حویلہ" کو محیط تھا جس میں سونا گوگل اور حجر الجزع (سنگ) پیدا ہوتا تھا۔ دوسرا دریاے جیحون جو سر زمین کوش کو احاطہ کئے ہوے تھا۔ تیسرا دریاے حداقل جو اشور کے جانب مشرق رواں ہے چوتھا دریاے فرات۔ (سفر تکوین الاصحاح ۲ : ۸)—

بعض مفسرین تورات کا خیال ہے کہ فیشون بحر ہند کا نام ہے۔ اور باغ عدن اس کے ساحل پر ہندوستان میں تھا۔ بعض کی رائے میں دریاے جیحون، دریاے نیل ہے اور یہ جنت اس کے کنارے مصر میں بنی تھی۔ مگر جمہور مفسرین کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ بتاکید بیان کرتے ہیں کہ جنت عدن بین النہرین واقع تھی یعنی کسی ایک دریا یا سمندر کے ساحل پر نہ تھی۔ اس کا محل وقوع دو کے درمیان تھا—

جب ماہرین آثار نے ان دریاؤں کے مابین، کھنڈروں کی کھدائی شروع کی تو وہ اشور بابل اور بلاد کلدان کی تاریخ سے بہت کم واقف تھے۔ ان کی معلومات کا زیادہ حصہ تورات کے بیان تک محدود تھا۔ اسی سے ان شہروں کے تمدن قایم ہونے اور ان کے تباہ ہونے کا پتہ چلا تھا۔ مگر ان کے آغاز و انجام کی شرح و کیفیت اور مدت مرور وغیرہ کی تاریخ سے بالکل ناواقف تھے۔ یہی صورت، کنعانیوں، فلسطینیوں اور عبرانیوں کے تمدن کی تھی، جن کا تعلق کچھ نہ کچھ مذکورہ تمدنوں سے رہا ہے۔ گزشتہ صدی کے نصف آخر میں علما نے وحشی اقوام کے آثار کھودنا شروع کئے اور ان کی مدنیت کے اسرار معلوم کرنے کی سعی کی۔ اس میں انہیں قابل ذکر کامیابی ہوئی اور بکثرت آثار کا پتہ چلا۔ ان کے مطالعہ سے عبرانی

تمدن کا وحشی اقوام کے تمدن سے صحیح تعلق اور رشتہ معلوم ہو گیا۔ خصوصاً اشوری اور بابلی تہذیب کا ربط اچھی طرح آشکارا ہو گیا۔ دوران تحقیق میں ان قوموں کی تاریخ اور روایات کی نسبت بہت سی چیزیں معلوم ہوئیں۔ جن میں ایک قصہ طوفان بھی ہے جو انھیں تمام و کمال بابلیوں کے قصص میں حاصل ہوا تھا۔ اس قصہ میں نوح علیہ السلام کے نام کی جگہہ ایک اور نام "اوت ناپشتیم" درج تھا۔ ساتھہ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل بابل' ارواح' ملائکہ' کروبیم' سرافیم وغیرہ کے وجود پر ایمان رکھتے تھے جو عبرانی مذہب کے مسلمات ہیں —

علماے آثار ان انکشافات کے بعد قصہ آدم و حوا علیہما السلام کے آثار پاکر چنداں حیران نہیں ہوے۔ کیونکہ بابلی اور عبرانی تمدن کے درمیان مضبوط علاقہ ہونے کی قوی دلیلیں پہلے سے موجود تھیں۔ علاوہ ازیں یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ ان قومی و مذہبی قصوں کا مصدر جنھیں بابلی اور عبرانی نقل کرتے آے ہیں اصل میں ایک ہو —

چند سال ہوے جب علماے آثار کو ایسے آثار اور بھی دستیاب ہوے تھے جن میں حضرت آدم و حوا کی حکایت کے غیر صریح اشارے پاے جاتے تھے۔ اور قرائن سے یہ ثابت ہوا تھا کہ حضرت آدم و حوا اور ان کے بھٹکنے کا قصہ اہل بابل کے یہاں بھی مشہور تھا۔ قرائن اور اشاروں کی حیثیت و شان البتہ علما کے مابین وجہ اختلاف رہی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ قرائن اس قصہ پر صریحاً دلالت کرتے' بعض انھیں غیر صریح سمجھتے ہیں۔ بہر حال نفس دلالت

کے سب قائل ہیں —

بابلی اور عبرانی روایات کے درمیان جو ربط معلوم ہوا ہے اس کے مبدء و منشا میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل جن کے متعلق علماے تورات کا بیان ہے کہ یہودیوں کی امت انھیں سے بنی، کلدانیوں کے شہر "اور" سے نکل آے تھے۔ یہ شہر ان کا مولد و مسقط الراس تھا۔ چونکہ اس کا نام ہی "کلدانیوں کا اور" ہے جو خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ حقیقت میں یہ شہر بابلی تھا اس لئے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم کے ساتھ بابل کی بہت سی روایتیں اور قصے بھی عبرانیوں میں منتقل ہوے ہوں گے۔ پھر یہود مرور زمانہ سے "ارض موعد" میں کنعانیوں سے جا ملے ہوں گے —

کنعانی اور فلسطینی لوگ اپنے نسب کو اہل بابل سے منسوب کرتے آے ہیں اور ان میں بابلیوں کے بہت سے قصے اور ان کے حالات جن میں مرور زمانہ سے تغیر و تحریف بھی ہوئی ہے، رائج ہیں۔ غالباً جب عبرانی کنعانیوں اور فلسطینیوں میں شامل ہوے ہوں گے تو انھیں کنعانیوں میں بابلی عقائد و اخبار دیکھ کر کوئی تعجب نہ ہوا ہوگا —

اس موقع پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلق آدم و حوا اور ان کے بھٹکنے کا قصہ اہل بابل کو کیونکر پہنچا کہ انھوں نے اس قصہ کو نقوش کی صورت میں مرتب کردیا۔ سر دست اس کا جواب مشکل ہے۔ غالباً مستقبل خود جواب دے لے گا۔ اس وقت تک جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ حضرت آدم و حوا کی پیدائش اور

ان کے غلطی میں مبتلا ہونے کا قصہ دنیائے بشریت کو کم از کم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دو ہزار سال پہلے بھی معلوم تھا۔ بلکہ غالباً اس سے بھی بہت پہلے بنی نوع انسان میں متداول تھا —

بہت زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اہل بابل (۵۷۰۰) پانچ ہزار سات سو سال پہلے تمدن میں اس درجہ ترقی کرچکے تھے کہ اپنے قصص اور عقائد دینیہ کو ٹھیکروں پر نقش کردیتے تھے - جس ٹھیکرے پر حضرت آدم و حوا کی تصویر کندہ ہے اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نقش نہایت باریک اور نفیس ہیں۔ حضرت آدم کی داڑھی نمایاں ہے، جسم برہنہ ہے، صرف سر پر ایک پوشش ہے۔ وہ جنت عدن سے نکل کر جا رہے ہیں - حضرت حوا بھی برہنہ ہیں اور آدم علیہ‌السلام کو پکڑے ہوے ہیں - دونوں کے بشرہ سے ندامت و مسکنت کے آثار عیاں ہیں۔ غرض تصویر اپنے نقوش کے ذریعہ سے توریت کی پوری روایت کا منظر سامنے کردیتی ہے —

ڈاکٹر سپیزر کو یہ تاریخی ٹھیکرا "تیپ جورا" کے کھنڈروں میں ملا تھا جن کے تفحص سے واضح ہوا ہے کہ اس مقام کے طبقات پر آٹھ شہر اور آباد ہوکر معدوم ہو چکے ہیں - ان کھنڈروں میں علماے آثار کو لوہے یا تانبے کے آلات و ظروف کا کوئی پتہ نہیں ملا - اس لئے شہر تیپ جورا بلا شبہ حجری زمانہ میں تعمیر ہوا ہو گا۔ ان سب باتوں سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تیپ جورا کے کھنڈر انسان کے دریافت کئے ہوے کھنڈروں میں سب سے زیادہ قدیم ہیں —

اس موقع پر یہ ذکر کردینا بھی مناسب ہوگا کہ اس شہر کے کھنڈر ترقی یافتہ تمدن پر دلالت کرتے ہیں - ان کھنڈروں کے مزید حالات یہ ہیں -

" شہر کے وسط میں ایک وسیع میدان ہے جس میں ایک بڑا مندر بنا ہوا تھا - اس مندر کے پاس ایک مضبوط قلعہ تھا - آثار سے ظاہر ہے کہ شہر کا جنوبی حصہ تونگروں کے سکونت کے لیے مخصوص تھا - شہر کے لیے با قاعدہ سڑکیں بنی ہوئی تھیں - جن میں سے ایک شاہراہ عام بھی تھی " —

یہ بھی ظاہر ہے کہ شہر کی تعمیر کرنے والے دور رس نگاہ رکھتے تھے - مختلف اطوار اور تمدن کے متنوع طرز پسند کرتے تھے - انہیں جنگ کے وقت حصار سے کام لینے کا اصول معلوم تھا - اسی لیے انہوں نے شہر کی فصیلوں کے اندر پانی کی خندق بنا رکھی تھی جس کی گہرائی ایک سو فٹ سے زیادہ تھی —

شہر کے ہندسی آثار اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اس قوم کا فن تعمیر نمایاں ترقی کرچکا تھا - شہر کے مکانوں میں سے کوئی گھر کھڑکیوں ، چھجوں اور مناروں وغیرہ سے خالی نہ تھا - یہ لوگ پل اور برجوں اور چوکیوں کی تعمیر کا راز جانتے تھے - یہ تمام معلومات ان کے ذوق سلیم اور فنی مہارت کی شاہد ہیں —

نیند کے اوہام و حقائق

امریکہ کے دو مشہور سائنس داں لایرڈ اور مولر نیند کے متعلق علمی نقطۂ نظر سے بہت کچھ تحقیق کرچکے ہیں - انہیں اسی سلسلہ میں

به کثرت حقائق معلوم هوے اور بہت سے اوهام کی لغویت کا ثبوت ملا - کچهه مدت هوئی دونوں نے اپنی متفقه تحقیقات کی رپورٹ شائع کی تهی - اس رپورٹ کا ملخص ذیل میں شائع کیا جاتا هے —

نیند کے متعلق یه بات بہت زیادہ مشہور هے که سونے والا پہلے گھنٹه میں بہت گہری نیند میں هوتا هے - اتنی گہری نیند بعد کے دوسرے گھنٹوں میں نہیں هوتی - جو آواز اسے دوسرے گھنٹه کی نیند سے بیدار کرنے کے لیے کافی هوسکتی هے وہ پہلے گھنٹه کی نیند سے اٹھانے کے لیے کافی نہیں هوتی - اسی طرح یه خیال بھی بہت عام هے که نصف شب کے پہلے حصه میں گھنٹه بھر سو لینا نصف آخر میں دو گھنٹه کی نیند کے برابر هے - یه خیالات بے بنیاد هیں - تحقیقات سے ثابت هوا هے که اگر چه انسان کی نیند پہلے گھنٹه میں گہری هوتی هے تا هم جسم کے عضلات دوسرے اور بعد کے گھنٹوں میں زیادہ ڈھیلے اور سست هوتے هیں - اس سے کم سے کم یه ظاهر هوتا هے که جسم کی چستی و تازگی کم اور پست هورهی هے - یہی کمی اور پستی گہری نیند کی لازمی شرط هے - حقیقت میں نیند کی حالت مدت کے لحاظ سے بہت اهم هے - اگر نیند میٹھی اور گہری هو تو چار گھنٹه کی نیند سے اتنا فائدہ هوتا هے جتنا نو گھنٹه کی اچاٹ نیند سے نہیں هوتا —

ریاضت اور نفسی اثرات

تحقیقات سے معلوم هوا که سونے سے پہلے بدنی ریاضت کرنے سے اونگھه غائب اور نیند اچاٹ هو جاتی هے - صبح کو جب آدمی سوکر اٹھتا هے تو پلکوں پر نیند کا بوجھه محسوس کرتا هے - فکری و دماغی ریاضت و محنت کا معامله اس کے برعکس هے ، کیونکه سونے سے پہلے قواے فکریه سے کام لینا نیند پر

کوئی نا گوار اثر نہیں ڈالتا - یہ حقیقت ہے کہ جب انسان کی نفسی حالت سوتے وقت پر سکون ہوگی ' اسے کسی نوع کی پریشانی یا کوفت نہ ہوگی تو اسے نیند بھی آرام و سکون سے آئے گی - اور اگر سوتے وقت کسی خوف یا آیندہ مصیبت و افتاد کے امیدوار ہوتے ہیں تو انہیں میٹھی نیند سونا نصیب نہیں ہوتا —

بھوک اور غذا کا نیند پر اثر بالغ نظر اشخاص کی رائے میں بے خوابی کے اہم اسباب تین ہیں —

(۱) ایسی غذا استعمال کرنا جو معدہ کے لیے نا مناسب ہو

(۲) کھانا ' نا کافی کھانا

(۳) دیر ہضم اور بہ مشکل ہضم ہونے والی غذا استعمال کرنا —

ان میں سے ہر سبب بے خوابی کا باعث ہے اور انسان کو میٹھی نیند سے محروم کر دینے کے لیے کافی ہے —

معدہ کا کام کھانا ہضم کرنا ہے - اس لیے وہ کھانے کے تقریباً چار گھنٹہ بعد خالی ہوجاتا ہے - کوئی شخص دن کا کھانا صبح کو آٹھ بجے کھاتا ہے اور رات کا شام کو سات بجے - ایسی صورت میں اس کا معدہ رات کو گیارہ بجے کے قریب خالی ہو جائے گا اور نو گھنٹے تک مسلسل خالی رہے گا - اس کا لازمی نتیجہ بے خوابی ہوگا - بالفرض اگر ایسا شخص سونے میں کامیاب ہوا تو بھی اسے آرام کی اور میٹھی نیند نہ آئے گی اور صبح کو جب اٹھے گا تو اس کی طبیعت سخت مکدر رہے گی اور دن بھر نیند کا غلبہ رہے گا —

بر خلاف اس کے اگر رات کا کھانا دیر کرکے کھایا جاے اور اس کا خیال رہے کہ غذا زود ہضم ہو اور بستر پر جانے سے پہلے معتدل حرارت کا کوئی میٹھا شربت ' دودھ یا ہلکی چاے وغیرہ پی لی جاے تو نیند خوب آئے گی -

جن عصبی مزاج اشخاص کو چائے خصوصیت سے نقصان پہونچاتی ہو ' انہیں چھوڑ کر باقی سب کے لیے رات کے کھانے کے ساتھہ چائے اور قہوہ کا استعمال بہت مناسب ہے - اس سے بے خوابی بالکل نہ ہوگی —

چائے اور قہوہ کے متعلق بہت سے اشخاص اسی وہم میں مبتلا ہیں کہ رات کو اس کا استعمال بے خوابی کا باعث ہوتا ہے - حالانکہ یہ وہم بے بنیاد ہے - اصل بات یہ ہے کہ جو بے خوابی کبھی کبھی کسی محرک چیز کے استعمال کرنے والوں کو ہو جاتی ہے اس کا سبب یہ چیز نہیں بلکہ کچھہ اور ہوتا ہے - مثلاً افراط حرکت یا سونے سے پہلے زیادہ دیر تک لہو و لعب میں مشغول رہنا - وغیرہ - اگر اس قسم کی حرکات سے بے خوابی کی شکایت ہوجائے - تو اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ گرم حمام کیا جائے - اس سے بہت فائدہ ہوگا اور نیند اچھی طرح آئے گی —

کمرہ کی فضا

کمرہ کی فضا کو نیند کے ساتھہ بڑا لگاؤ ہے - اسی طرح جسم کے درجۂ حرارت کو بھی اس باب میں نمایاں اہمیت حاصل ہے - اگر کوئی کہے کہ کمرہ کی فضا اس حد تک سرد ہونا چاہئے کہ لحاف یا بھاری کمبل وغیرہ اوڑھنے کی حاجت ہو تو اس کا یہ کہنا بڑی جہالت کی دلیل ہے - کیونکہ اوڑھنے کی یہ چیزیں سوتے میں عضلات کے اچھی طرح پھیلنے میں مزاحم ہوتی ہیں اور بدن پوری طرح ڈھیلا ہونے اور کافی آرام پانے سے قاصر رہتا ہے - اسی طرح اگر کمرہ بہت سرد ہو اور اوڑھنے کے لیے اتنی ہلکی پوشش سے کام لیا جائے کہ جسم میں معتدل گرمی نہ آے تو جسم ضرور مناسب درجہ حرارت قائم رکھنے کے لیے غیر معمولی جد و جہد کرے گا اور جب آدمی سوکر اٹھے گا اور اسے سردی محسوس ہوتی ہوگی تو اسے خود معلوم ہو جائے گا کہ وہ آرام کی نیند نہیں سو سکا —

آواز اور روشنی

تجربات نے ثابت کردیا ہے کہ جو تیز آواز سونے والے کے قریب بلند ہوتی ہے وہ اس کے عضلات پر ضرور اثر کرتی ہے اور قریب قریب اسے بیدار کردیتی ہے - جو لوگ ٹرامو‌ے اور ریلوں کی پٹری کے قریب سوتے ہیں یا اسی طرح کے اور مواقع پر سونے کی کوشش کرتے ہیں انھیں جیسی چاہئیے ویسی آرام کی نیند نہیں آسکتی - خواہ انھیں ٹرینوں اور مختلف سواریوں کے جھٹکے برداشت کرنے کی عادت ہو کیوں نہ ہو اور وہ سوتے میں ان جھٹکوں سے بیدار ہوتے ہوں یا نہ ہوتے ہوں - یہی صورت روشنی کی ہے کیونکہ اس کی شعاعیں سونے والے پر ضرور اثر انداز ہوتی ہیں اور اکثر نیند اڑا دیتی ہیں - تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ روشنی سونے کے کمرہ کی فضا میں نہایت سرعت سے گزرتی ہے اور اس کے اثر سے سویا ہوا شخص بے چین ہونے لگتا ہے - گو ظاہر میں خود اسے اس کا واضح او نمایاں شعور نہیں ہوتا —

اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ کمرہ کا رنگ بھی نیند پر خاصہ موثر ہے اور یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ نیند کی نوعیت اور راحت بخشی سے رنگوں کو بڑا تعلق ہے - اگر کمرہ کا غالب رنگ مائل بہ سبز یا سفید ہوگا تو اچھی طرح آئے گی اور اگر گہرا سیاہ یا کوئی اور گہرا رنگ ہوگا تو اس کا اثر برعکس ہوگا یعنی نیند اچاٹ رہے گی —

لباس اور جسم کی وضع

نیند کی نسبت سے لباس کا معاملہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے - بعض لباس اس وضع کا ہوتا ہے کہ اس سے اعضا کو اچھی طرح پھیلانے اور آرام لینے کا موقع نہیں ملتا اور بعض آرام دہ ہوتا ہے - ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ جو لوگ سوتے وقت کپڑے بالکل اتار دیتے ہیں انھیں خوب گہری نیند آتی ہے —

تخت یا پلنگ پر سوتے وقت کسی خاص وضع یا کروٹ سے لیٹنے کی کوئی اہمیت نہیں ہے - کیونکہ جسم حالت خواب میں تقریباً ہر پندرہ منٹ میں ایک وضع سے دوسری وضع پر ہوجاتا ہے - طبیعت خود اسے مناسب وضع پر متوجہ کردیتی ہے - اس لیے سونے والے کبھی پیٹ پر کبھی پیٹھ پر سوتے نظر آتے ہیں - کوئی داہنی کروٹ پر سونے کا عادی ہے کسی کو بائیں کروٹ سے سونے کی عادت ہے - بہر حال یہ ایک قطعی امر ہے کہ کم و بیش پندرہ منٹ تک ایک ہی وضع پر لیٹے رہنے کی نوبت بہت کم آتی ہے - یہ ضرور ہے کہ پیٹھ کے بل اور داہنے پہلو پر سونے سے جتنا فائدہ ہوتا ہے اتنا فائدہ پیٹ کے بل اور بائیں پہلو پر سونے سے نہیں ہوتا —

غذا اور خواب | علمائے نفسیات کی غالب رائے یہی ہے کہ رویا یا خواب کا اثر نیند پر زیادہ نہیں ہوتا - بعض لوگ البتہ کبھی کبھی ڈراونے خواب دیکھ کر خوف زدہ ہوجاتے ہیں لیکن ان پر عام حکم نہیں لگایا جاسکتا -

تازہ ترین علمی تحقیقات یہ ہے کہ جو شخص دن کو مصروفیت کی وجہ سے آرام کی طرف متوجہ نہیں ہونے پاتا اسے خواب بہت نظر آتے ہیں —

غذا کے متعلق واضح ہوچکا ہے کہ جس کھانے میں غذائیت زیادہ ہوتی ہے وہ کھانا جسم کی ان قوتوں کا بدل بن جاتا ہے جو بیداری میں زائل یا کم ہوتی رہتی ہیں - اگر کسی شخص کی کوئی رات بیداری میں کٹی ہو تو وہ اچھی غذا کی مدد سے ایک حد تک اس قوت کو بحال کرسکتا ہے جس کی توقع عموماً نیند ہی سے کی جاتی ہے - تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ شکر یا ایسی چیزوں کو

کثرت سے استعمال کرنا جن میں شکر زیادہ ہو ' ایک دو گھنٹہ زیادہ نیند لانے کا باعث ہوتا ہے - اس لیے جب آدمی سو کر اٹھے اور نیند کا غلبہ محسوس ہو تو اسے کچھہ شیرینی کھانا چاہیے کیونکہ یہ اس کی فوت شدہ نیند کی تلافی کر دے گی - اسی طرح اگر کوئی بہت سویرے اٹھہ بیٹھے اور اسے اس کا احساس ہو کہ کافی سونے کو نہیں ملا ہے تو وہ بھی کوئی ایسی چیز کھاکر باز رفتہ قوت حاصل کر سکتا ہے جس میں کاربوہائیڈریٹ (شکر) زیادہ شامل ہو - غرض اس خصوص میں مٹھائی عجیب و غریب چیز ہے - ضرورت ہو تو اس سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے —

شکر کی طرح کیلسیم کا اثر بھی اس مقصد کے لیے اچھا ہوتا ہے اور یہ چیز دودھ میں کافی ہوتی ہے - خلاصہ یہ ہے کہ اگر غذا کم ہو گی یا ایسی چیزیں کھانے میں آئیں گی جن میں غذائیت کم ہو تو گہری اور آرام کی نیند کم آے گی —

انفعالات اور اونگھہ

جو چیزیں نفسیاتی انفعالات کا باعث ہوتی ہیں وہ بھی بلا شبہہ نیند کے معاملہ میں خاص اثر رکھتی ہیں- جو شخص کسی اضطراب یا انفعال کی حالت میں سوتا ہے یا ایسا کام کرتے کرتے سو جاتا ہے جس میں تمام افکار و قویٰ مشغول ہوں تو اسے اچٹتی ہوئی نیند سے دو چار ہونا پڑتا ہے - ایسا شخص آرام سے نہیں سو سکتا برخلاف اس کے جس شخص کو صرف قواے بدنیہ سے کام لینے کی نوبت آے خواہ اس میں کتنی ہی مشقت کیوں نہ ہو ' اس شخص کو نیند خوب آے گی —

اہل علم کا تجربہ ہے کہ سونے سے پہلے کچھہ پڑھنا اور مطالعہ کرنا

نیند خوب لاتا ہے - اور بیداری کا اندیشہ کرنا اور اس کے خیال سے ڈرنا بے خوابی کا باعث ہوتا ہے - بیداری پر قابو پانے کا بڑا ذریعہ یہی کتاب اور اس کا مطالعہ ہے - اطبا نے بارہا اس کا تجربہ کیا اور اسے کامل الاثر پایا —

انسان غذا کو تو دنوں اور ہفتوں کے لیے چھوڑ دینے پر قدرت رکھتا ہے مگر وہ بغیر سوئے ہوے ایک ہفتہ بہ مشکل گزار سکتا ہے - بلکہ یہ بات اس کے قابو سے بالکل باہر ہے - اگر کوئی شخص مسلسل ایک ہفتہ تک نہ سوئے تو یقیناً ہلاک ہوجائے گا - پینتیس سال سے زیادہ عمر ہونے کے بعد سونے کی حاجت کم ہوتی ہے اور مدت خواب کے گھٹ جانے سے خطرہ بھی کم ہوجاتا ہے —

(م - ز - م)

دلچسپ معلومات

سفید فام زنگی

زنگیوں کے متعلق مسلمہ مسئلہ ہے کہ " بشستن نگردد سفید"۔ مگر اب زمانہ کی بوقلمونی اسے بھی جھٹلانے کے لیے تیار ہے ۔ آج کل امریکہ میں ایک زنگی کا رنگ تبدیل ہوجانے پر بڑے بڑے عقلا دنگ ہیں اور اس عجیب واقعہ سے بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے ۔ اسمیوں تو فن فام کا ایک زنگی ہائیٹی کا باشندہ ہے ۔ کچھ مدت سے مریض تھا ۔ اس نے ہائیٹی کے بعض جادو گروں کا علاج شروع کیا جس کا اثر یہ ہوا کہ اس کا بشرہ یکا یک سفید ہو گیا ۔ امریکی اطبا اور سائنس داں بڑی سرگرمی سے کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح اس دوا کی ترکیب وغیرہ معلوم کرلیں جس کا یہ عجیب و غریب اثر ظاہر ہوا ہے —

چھیا لیس درجہ کی حرارت

لاس انجلوس (امریکہ) کے ایک شفا خانہ میں اپنی قسم کی ایک نئی مریضہ زیر علاج ہے ' اس مریضہ کا درجہ حرارت چھیا لیس سنٹی گریڈ ہے ' باوجود اس کے زندہ ہے ! ۔ اب تک کی تحقیقات سے یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ جب درجہ حرارت بیالیس سنٹی گریڈ سے بڑھ جائے تو موت واقع ہوجاتی ہے۔ اطبا نے اس عجیب واقعہ کی توجیہ

یہ کی ھے کہ مریضہ کے اجزاے دماغ میں کسي جگہ تدانی (سل) ورم ھوگیا ھے جو طبعی کیفیت کے ساتھہ حرارت جسم کو منظم رکھنے سے مانع آتا ھے —

تیراک اور موٹر

مسٹر وارن والیمز نے لاس انجلوس میں ایک مشین ایجاد کی ھے جو بخاری کشتی کے موٹر سے مشابہ ھے۔ وہ اس موٹر کو اپنی پیٹھہ کے پیچھے رکھہ کر پانی میں اُترتے ھیں۔ جب خود تیرتے تیرتے تھک جاتے ھیں تو موٹر کو چالو کردیتے ھیں اور اس کے ذریعہ سے تیرنے لگتے ھیں —

پر دار بلیاں

حضرت سعدي کا مقولہ "گربۂ مسکیں اگر پر داشتے" والا بہت مشہور ھے جو ایک مسلمہ صداقت ھے۔ لیکن آج اس کایہ کا بھی استثنا موجود ھے۔ آکسفورڈ کے باغ حیوانات میں ایک بلی ھے جس کے دو برس پہلے اس بلی کا پتہ مسز ھیوز گریفتھہ کو ملا۔ ان کا بیان ھے کہ میں نے اس بلی کو ان پروں سے بالکل اسی طرح کام لیتے دیکھا ھے جس طرح پرندے اپنے پروں سے کام لیتے ھیں —

بغیر آواز اور دھوئیں کی بندوق

انگلینڈ کے ایک تجربہ کار ماھر جنگ نے یہ محسوس کیا کہ نشانہ اندازی کی تعلیم میں رنگروٹوں کو بندوق کی آواز اور اس کے دھوئیں سے بہت نقصان پہنچتا ھے، ان کے اعصاب مردہ ھو جاتے ھیں اور درد سر کا عارضہ مستقل ھو جاتا ھے۔ اس لیے اس نے ایک بندوق ایجاد کی جس سے نہ دھواں اُٹھتا ھے نہ آواز پیدا ھوتی ھے۔ سر ھوتے وقت نشانہ پر صرف ایک شعاع سي پڑ جاتی ھے —

زمین کا ھالہ

سب کو معلوم ھے کہ سورج اور روشن تاروں کے ارد گرد ھالے ھیں اور جن اجرام فلکیہ میں نور اصلی نہیں ھے ان

کے ہالے نہیں ہیں - مگر پروفیسر لارس و گارڈ معلم فلکیات جامعہ اوسلو نے
ایک نیا علمی نظریہ قائم کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کرۂ ارض کے
بھی ہالہ ہے جو فضائے محیط میں ۷۰ کیلو میٹر سے آٹھ سو کیلو میٹر
کی بلندی تک دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ ہالہ سورج کی شعاعیں کرۂ ارض پر
چھائی ہوئی گیسوں پر پڑنے سے پیدا ہوتا ہے - یا اس وقت وجود میں
آتا ہے جب نائٹروجن گیس کرۂ ارضی پر برقی رو کے گزرنے سے مشتعل
ہوتی ہے —

کمی اشتہا کا سبب علمی تجربات سے واضح ہوا ہے کہ انسان و حیوان
میں بھوک اس وقت کم ہوتی ہے جب غذا میں حیاتین
(ب) نہیں ہوتی۔ بسا اوقات اس مادہ کی کمی یا فقدان سے بھوک
بالکل ہی جاتی رہتی ہے اور کبھی ناگہانی موت بھی واقع ہو
جاتی ہے —

اجرام مختلفہ میں جاذبیت اجرام فلکی کے اختلاف سے قوت جاذبیت میں
اختلاف ہوجاتا ہے - مثلاً سورج میں زمین سے
بہت زیادہ قوی جاذبیت ہے - اگر کوئی معمولی تن و توش کا آدمی
جس کا وزن زمین پر ۱۴۰ پونڈ سے زیادہ نہ ہو بالفرض کرۂ شمس میں
منتقل ہوجائے تو وہاں اس کا وزن تقریباً تین ہزار نو سو پونڈ ہوجائے گا -
اور فقط اس کے ہاتھوں کا وزن تقریباً تین سو پونڈ ہوگا - یہ بوجھ
اتنا ہوگا کہ اس کے ہاتھ ہلانے سے معذور ہوں گے - اور اگر اسی شخص
کی رسائی کرۂ قمر میں فرض کی جائے جہاں قوت جاذبیت سورج کے
مقابلہ میں کم زور ہے تو وہاں اس کا وزن صرف (۳۲۰) تین سو بیس
پونڈ رہے گا - اور یہی وزن مریخ میں پہنچ کر صرف (۵۳) ترپن پونڈ

رہ جائے گا - کرۂ قمر اور کرۂ مریخ دونوں میں جست و خیز کی قوت بہت قوی اور سرعت سیر بے حد بڑھ جائے گی حتیٰ کہ جدید ترین تیز رفتار ترین بھی اس رفتار کا مقابلہ نہ کرسکے گی —

کرۂ ارض کا رنگ

امریکہ کے عالم فلکیات پروفیسر سلیور کا بیان ہے کہ اگر ہم کرۂ شمس تک پہنچ سکیں تو ہمیں زمین کے کرہ کا رنگ ارزق (نیلگوں) نظر آئے گا - ان کے اس قول کی تصدیق علمی ذرائع سے بھی ہوچکی ہے - پروفیسر موصوف نے یہ بھی کہا ہے کہ سیارہ پلوٹو کا رنگ جو نہایت روشن اور چمکیلا ہے ' سورج کی روشنی کو بڑی قوت سے لوٹا دیتا ہے اور اس میں اس درجہ لمعانیت پیدا ہوجاتی ہے کہ اس کے فوٹو کو دیکھ کر اس کا درجہ معلوم کرنا ناممکن ہے - اس موقع پر یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اجرام فلکیہ کے رنگ جرم مقابل کے اختلاف سے بدلتے رہتے ہیں کبھی سرخ نظر آتے ہیں کبھی نیلگوں اور کبھی کسی اور رنگ کے —

سانپ اور کھاری پانی

سانپ کے نسبت مشہور ہے کہ کھاری پانی یعنی سمندر کے پانی سے ڈرتا ہے اور اس کے قریب نہیں جاتا مگر میٹھے پانی کے دریاؤں میں خوشی سے تیرتا اور رہ سکتا ہے- لیکن علماے حیوانات نے ایک قسم کے سانپ کا ذکر کرتے ہوے لکھا ہے کہ وہ سمندر میں بہت تیرتا ہے بلکہ سواے سمندر کے پانی کے اور کسی پانی میں جاتا ہی نہیں- یہ قسم استوائی افریقیا کے سوا اور کہیں نہیں پائی جاتی-

فضا اور جنسی غدود

حیاتیات کے مباحث سے واضح ہے کہ فضا کے حوالی اور درجہ برودت و حرارت کو غددی افرازات میں عموماً اور جنسی غدد میں خصوصاً بڑا دخل ہے - معلوم ہوا ہے کہ جنسی

تازگی و توانائی جمہور کے اعتقاد کے خلاف بلاد بارده میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ اتنی بلاد حارہ (گرم ممالک) میں نہیں ہوتی۔ معتدل ممالک میں نسبتاً جو نسلی تناقص پایا جاتا ہے وہ فضا کے عوامل سردی و گرمی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق مدنیت کے مخصوص عوامل سے ہے۔

غدہ درقیہ کے افعال

یہ غدہ حنجرہ کے بالائی جانب رہتا ہے اور انسانی جسم میں اس کی بڑی قیمت ہے' اس کی بدولت جسم کے بہت سے کام انجام پاتے ہیں۔ اس غدہ کا حجم عمر اور فصلوں کے اختلاف سے کم و بیش ہوتا رہتا ہے۔ جرمنی کے ڈاکٹر وان کو لنٹز نے کئی اشخاص کے غدد درقیہ دیکھے اور تحقیقات سے معلوم کیا کہ یہ غدہ ۴۰ سال کی عمر تک حجم میں بڑھتا رہتا ہے پھر اس کا حجم کم ہونے لگتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی پتہ لگا کہ عورت کا غدہ درقیہ حجم میں مرد کے غدہ سے بڑا ہوتا ہے مگر عورت کے غدہ میں آیوڈائن کا عنصر کم ہوتا ہے۔ اس غدہ کا وزن ماہ اپریل سے ماہ جولائی تک بڑھتا ہے پھر ماہ اکتوبر تک اپنی حالت پر قائم ہوجاتا ہے بعد ازاں سال کے باقی مہینوں میں اس کے حجم میں کمی ہونے لگتی ہے۔ غدہ درقیہ کے متعلق یہ بیان تازہ ترین تحقیقات کا نتیجہ ہے —

مارفیا کا بدل

امریکہ کے ایک علمی جماعت کے اخبار مظہر ہیں کہ ڈاکٹر ناتان ایڈی جو شیگن یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں ایک ایسی نباتی دوا کے دریافت میں مصروف ہیں جو اعصاب کی تخدیر (سن کرنا) میں مارفیا کی پوری خاصیت رکھتی ہو ساتھ ہی مخدرات کے استعمال کی عادی بھی نہ ہونے دے۔ گویا مارفیا کا بے عیب بدل معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے اب تک جو تجربات کئے

ہیں وہ ان کی کامیابی کی توقع دلاتے ہیں - معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے مارفیا کا وہ جزو معلوم کر لیا ہے، جو خاصتاً مخدر ہے - اس کی مدد سے انہیں اپنے اکتشاف میں بہت مدد ملی —

عمل تنویم

ایک نئے طرز کا امریکہ میں عمل تنویم کے بعض عجیب حادثے پیش آ چکے ہیں - وہاں کے جرائم پیشہ لوگ تنویم سے بھی عجب عجب طرح کے کام لیتے ہیں - ایک واقعہ خود امریکی پولیس کے ساتھہ ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ دوران عمل میں ایک عجیب سیال دوا سے مدد لیتے تھے - پولیس نے یہ سیال امتحان و تجزیہ کے لیے ایک معمل میں بھیج دیا جس کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اس سیال میں جو عناصر شامل ہیں ان میں فیرونل اور پربیٹریک ایسڈ بھی ہیں - یہ سیال تنویم میں کام آنے والے مشہور سیالوں سے مختلف ہے - اس کا ایک نقطہ بھی فی الفور تنویم طاری کرنے کے لیے کافی ہے -

جراثیم اور امواج نور

ٹائفائڈ بخار کے متعدد علمی تجارب سے ثابت ہوا ہے کہ روشنی کی چھوٹی چھوٹی شعاعیں ٹائیفائڈ بخار کے جراثیم کو ہلاک کردیتی ہیں - امریکہ کے دو ڈاکٹر' فابین اور گراہم نے اس کا ثبوت دیا ہے کہ چھوٹی موجوں والی شعاعیں' علم الجراثیم کی بعض معلومہ قسموں اور ٹائفائڈ کے جرثوموں پر ڈالنے سے اس مرض کا استیصال ہوجاتا ہے - اس نظریہ کی بنا پر آج کل کے ڈاکٹر اس کوشش میں ہیں کہ ریڈیو کی چھوٹی موجوں سے خلا کو پاک کرنے کا طریقہ معلوم کریں اور ٹائفائڈ سے بچنے کے لیے ان کی تاثیر دریافت کریں —

مہلک شعاعیں

بعض امریکی سائنس دانوں نے اپنے جدید تجربات امریکن کیمکل سوسائٹی کے سامنے پیش کر کے اپنے اس دعوی کو

ثابت کیا کہ بالاے بنفشی شعاعیں نخزمایہ کے خلیوں کو فنا کردیتی ہیں اور اس جلسہ میں جو خلیے طحال سے اخذ کئے تھے انھیں پیش کر کے ان پر شعاعیں ڈالیں جن کا طول (۴۳۵۰) انگسٹرام سے (۲۲۳۵) انگسٹرام تک تھا - اس عمل کو ۱۵ منٹ بھی نہ ہوے تھے کہ تمام خلیے ہلاک ہوگئے اور ان کی غشاے خارجی پر باہلے سے نمودار ہونے کے بعد زندگی کا ذرا بھی اثر باقی نہ رہا —

جعلی نوٹ دریافت کرنے کا آلہ

جعلی پرامیسری نوٹ کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ایک انگریز نے ایک آلہ ایجاد کیا ہے جس کا تعلق فوٹو گرافی سے ہے - اس آلہ میں بالاے بنفشی شعاعیں پیدا کرنے والی مشین نصب ہے - جب کسی نوٹ کے اصلی ہونے میں شبہ ہوتا ہے تو اس نوٹ پر یہ شعاعیں ڈالی جاتی ہیں - پھر اگر وہ نوٹ حقیقت میں مصنوعی ہوتا ہے تو اس کے جن حصوں میں جعل کیا گیا ہے وہ صاف اور آشکارا نظر آنے لگتے ہیں —

ایک عجیب ٹیلیفون

آسٹریا کے دو انجینیروں نے ایک عجیب آلہ ایجاد کیا ہے جو ٹیلیفون کے پاس لگا دیا جاتا ہے - اس آلہ کی عجیب خصوصیت یہ ہے کہ جس کے گھر میں یہ لگا ہو اگر اس سے کوئی شخص ٹیلیفون سے بات کرے اور گھر والا موجود نہ ہو تو بجاے اس کے یہ آلہ جواب دیتا ہے اور جس وقت صاحب خانہ کے ملنے کا امکان ہے اس وقت سے مطلع کرتا ہے —

کالی کھانسی کا ٹیکہ

کالی کھانسی جسے بعض جگہہ کو کر کھانسی اور انگریزی میں ہو پنگ کف کہتے ہیں بچوں کو اکثر ہوجایا کرتی ہے اور سخت تکلیف دیتی ہے - اس کے لیے بعض

اطبا ' بعض قسم کے انجکشن (ٹیکہ) بھی دیتے ھیں مگر اب تک کوئی انجکشن ایسا نہیں ملا جو اس مرض کے لیے علاج شافی ثابت ہوتا —

حال ھی میں ڈاکٹر لیوس ساور (Dr. Louis Saur) نے جو امریکہ کے شہر ایونسٹن کے ایک کامیاب ڈاکٹر ھیں - امریکہ کی مجلس طبی میں اپنے ایجاد کردہ کھانسی کے ٹیکہ کا ذکر کیا اور اسے دوائے شافی ثابت کیا۔ اس کے بعد سے یہ ٹیکہ برابر استعمال ہوتا اور مفید ثابت ہوتا چلا جاتا ھے ۔ اب تک تین سو بچوں کو یہ ٹیکہ دیا جاچکا ھے اور تجربہ کے لیے تعدیہ کی کوشش کی گئی ھے مگر ان بچوں میں سے کسی کو اس کھانسی کی شکایت نہیں ہوئی - امریکہ کے ایک اخبار نے لکھا ھے کہ یہ ٹیکہ بعض جراثیم کے اجسام عضویہ سے تیار کیا جاتا ھے جنھیں " ھیموفیلوس پرتوسیس " کہتے ھیں - جو کالی کھانسی کے جراثیم سمجھے جاتے ھیں —

پہلا انسان اور کوہ ھمالیہ

سونٹ ایورسٹ کی سیاحت کے لیے جو مہم گئی ہوئی تھی اس کی رپورٹ اور دوسرے ذرائع تحقیق سے معلوم ہوا ھے کہ سلسلہ کوہ ھمالیہ برفستانی دور میں اتنا بلند نہ تھا جتنا اب ھے ' بلکہ اس زمانہ میں اس کی بلندی رو بہ ترقی تھی - حجری زمانہ کا انسان اس کی گفاوں اور غاروں میں سکونت رکھتا تھا - علماے آثار کو اس دور کے انسانوں کی بنائی ہوئی مختلف سنگین اشیا دستیاب ہوئی ھیں - جن میں تیز اور کاٹنے والے آلات زیادہ نمایاں ھیں - اسی سلسلہ میں بعض ھڈیاں اور بعض خوں خوار جانوروں کے سم بھی ملے ھیں جو اس دور میں ان پہاڑوں میں رہتے تھے —

(م - ز - م)

A Text Book of Heat for Junior Students از ڈاکٹر ایم این سہا و
بی این سریواستو، مطبوعہ انڈین پریس، الہ آباد، صفحات ۱۸ + ۵۴۱،
طباعت ۱۹۴۳ء قیمت پانچ روپیہ کلدار —

یہ کتاب در اصل اس بڑی کتاب کا اقتباس ہے جو مصنفین نے بی
ایس سی (آنرس) اور ایم ایس سی کی جماعتوں کے لیے لکھی ہے - جس
کا ذکر اس سے پیشتر ان صفحات میں آچکا ہے —

اس کتاب کے مضامین کی ترتیب تقریباً بڑی کتاب کی ترتیب کے مماثل
ہے - بعض عنوانات مثلاً مادہ کا نظریہ، تحرک، حرحرکیات اور اشعاع حرارت
پر جدید طریقوں سے بحث کی گئی ہے - حرارتی انجنوں اور گیسوں کی
اماعت کے متعلق علحدہ باب دئے گئے ہیں —

اگر چہ مصنفین کی رائے میں یہ بی ایس سی (پاس) کے طلبہ کے
لیے معیاری کتاب ہے لیکن ایسے بعض اہم مضامین بھی اس میں شریک
ہیں جو ایم ایس سی کے طلبہ کو تحقیقاتی تجربوں میں رہبری کرسکتے ہیں۔

بنا بریں یہ کتاب انٹرمیڈیٹ کے طلبہ کے لیے موزوں نہیں رہتی —

فی الحقیقت مصنفین نے اپنی بڑی کتاب لکھ کر کافی شہرت حاصل کرلی ہے - اس لیے نفس کتاب کے متعلق ان کا نام ہی اب کافی ضمانت ہے - البتہ اگر اس کتاب میں بھی حرارتی نظریوں کا ذکر کردیا جاتا تو بہت مناسب ہوتا—

بہر حال کتاب کے عمدہ اور اعلیٰ ہونے میں کوئی شبہہ نہیں - امید کہ طلبہ اس سے عام طور پر مستفید ہوں گے —

جدید نصاب طبیعیات

براے جماعت ہاے عثمانیہ میٹرک ، حصہ اول ، خواص مادہ ، از محمد سردار خاں بی اے (عثمانیہ) بی ٹی (علیگ) و ابوالمکارم فیض محمد صدیقی بی اے ، ڈپ ، ایڈ ، (عثمانیہ) مدرسین سائنس مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ ، دارالعلوم بلدہ حیدرآباد دکن ، صفحات ۱۵۶ مطبوعہ ۱۳۵۱ / ۱۹۳۳ قیمت ایک روپیہ —

جامعہ عثمانیہ نے جہاں دماغوں میں جنبش پیدا کردی ہے وہاں قلموں میں بھی حرکت پیدا کردی ہے چنانچہ کتاب زیر بحث کے ہر دو مصنفین جامعہ عثمانیہ ہی کے فارغ التحصیل ہیں اور اب مسند درس پر متمکن ہیں —

جامعہ عثمانیہ نے میٹرک کے نصاب میں جو تبدیلیاں کی ہیں اس کے مطابق لائق مصنفین نے یہ کتاب تیار کی ہے —

مضامین کی ترتیب بہت مناسب ہے ' زبان بھی صاف اور سہل استعمال

کی ہے - جا بجا مشقی سوالات بھی جمع کئے ہیں - اور کوشش کی ہے کہ ہر مضمون طالب علموں کی سمجھ میں اچھی طرح سے آ جائے - بہر حال لائق مصنفین کی یہ پہلی کوشش مستحق مبارکباد ہے - لیکن چونکہ یہ " نقش اول " ہے اس لیے چند امور گوش گذار کردینا مناسب ہوگا، تا کہ " نقش ثانی " بہتر ہو جاے —

سب سے پہلے کتاب کے متن کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے اور وہ یہ کہ چوتھے باب میں طول کی پیمائش کے سلسلے میں " سرل چاپ " کا ذکر کیا ہے، اور وہ بھی اس قدر مختصر کہ نہ ہونا بہتر تھا، سرل چاپ کے سلسلے میں " کسر پیما " کی تفہیم زیادہ بحث چاہتی ہے - اس کے علاوہ اگر مختلف قسم کے طولوں کی پیمائش کے طریقے بیان کیے جاتے تو اچھا ہوتا —

پانچویں باب میں رفتار کے سلسلے میں لکھا ہے " اگر کہا جاے کہ موٹر کی رفتار پچاس میل فی گھنٹہ ہے تو اس سے یہ سمجھا جاے گا کہ موٹر خاص سمت میں پچاس میل فی ساعت کی شرح سے فاصلہ طے کرتی ہے " —

چونکہ ہماری زبان میں ابھی " رفتار " اور " چال " کا باریک فرق عام فہم نہیں ہے اس لیے " پچاس میل فی ساعت " کی رفتار سے سمت کا مفہوم ذہن میں نہ آے گا - ایسی صورت میں مناسب ہوتا کہ کسی ایسی چیز کی مثال لی جاتی جس میں سمت کا تغیر زیادہ واضح ہوتا - سائنس کی کتابوں میں مسائل اور مثالوں میں ابہام نہ ہونا چاہئے - یہ ضرور ہے کہ اس قسم کی مثالیں کتاب میں زیادہ نہیں ہیں —

زبان کے متعلق یہ عرض ہے کہ اگرچہ بہ حیثیت مجموعی زبان صاف

اور سادہ استعمال کی گئی ہے ' تاہم محاورے اور زبان کی خامیاں متعدد ہیں - مثلاً

(۱) تم سمجھ گئے ہوں گے - " تم سمجھ گئے ہوگے " ہونا چاہئیے —

(۲) ... ایک ہی فضا میں " نہیں سمائی جا سکتیں " - " نہیں سما سکتیں " ہونا چاہئیے —

(۳) زمین پر کے تمام اجسام دیگر اجسام کی اضافت سے ساکن ہیں - یہ فقرہ واضح نہیں - جب تمام اجسام لے لیے گئے تو دیگر کی گنجائش نہ رہی - اس کو یوں ہونا چاہئیے : - " زمین پر تمام اجسام ایک دوسرے کی اضافت سے ساکن ہیں " —

طباعت اور املا کی غلطیاں اس کے علاوہ ہیں —

اصطلاحوں میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے - لفظ " طبعی " فطری یا نیچرل کے معنوں میں ہے - یہاں در اصل " طبیعی " مراد ہے جو فزیکل کا مرادف ہے —

" استخراجی " اکائیوں کی بجاے " ماخوذ " اکائیاں ہونا چاہئیے - "چپک" کی بجاے " التصاق" ہونا چاہئیے کہ منظور شدہ یہی لفظ ہے - بہرحال ہمارے نزدیک بہ حیثیت مجموعی کتاب قابل قدر اور طلبہ کے لیے قابل استفادہ ہے —

ہندوستانی بابت جولائی سنہ ۱۹۳۳ ع

ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کا مشہور سہ ماہی رسالہ ہے - جولائی نمبر ہمارے سامنے ہے - دیگر قابل قدر اعلیٰ مضامین کے ساتھ ایک مضمون " آگرہ کی ہوائی رصد گاہ " پر بھی ہے - واقعہ یہ ہے کہ بہت کم لوگ ہوں گے جن کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ آگرہ میں کوئی ہوا کی رصدگاہ بھی ہے - مسٹر

کرشن چندر صاحب ایم ایس سی نے یہ واقعی بڑا احسان کیا جو اردو میں اس کا پورا حال لکھہ دیا - اور ساتھہ ساتھہ متعدد فوٹو بلاک بھی ھیں جن سے مضمون اور بھی دلچسپ ھو گیا ھے —

اس کے متعلق ھمیں صرف یہی عرض کرنا ھے کہ اصطلاحات وضع کرنے کی بجائے جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحات سے کام لیا جاتا تو زیادہ بہتر تھا - مثلاً اب تو " ٹمپریچر " کی بجائے " درجہ حرارت یا حرارت " کانوں کو ناگوار معلوم ھوتا ھے - ان معنوں میں " تپش " زیادہ گوش آشنا ھے - " Humidity " کے لیے برودت صحیح نہیں - رطوبت یا مرطوبیت ھونا چاھئیے - تھرما میٹر کے لیے " تپش پیما " کی بجائے مقیاس الحرارت ثقیل ھی ھے - اسی طرح دیگر اصطلاحیں اصلاح طلب ھیں —

یہ صحیح ھے کہ فی الحال ایسی کوئی لغت تیار نہیں جس میں اس قسم کی جملہ اصطلاحیں یک جا مل سکیں - لیکن ایک حد تک یہ ضرورت اوراق " سائنس " کے مطالعہ سے بھی رفع ھو سکتی ھے —

طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی

کا

بے مثل ماہوار طبی رسالہ

طبیہ کالج میگزین

قدیم و جدید طب کے بلند پایہ مضامین شایع کرتا ہے۔ زبان سلیس اور شستہ ہوتی ہے۔ قدیم طب کو جدید طب کے ہم آہنگ بنانا میگزین کا خاص مقصد ہے۔ بعض مضامین مثلاً تجدید طب' بچوں کے امراض ' انکشافات مطب ' بے نالی کے غدد کے متعلق اصولی معلومات ' امراض چشم کی مسلسل اشاعت کی جارہی ہے۔ فوٹو اور متعدد ڈائی گرام بھی ہوتے ہیں۔ کاغذ عمدہ۔ کتابت طباعت نفیس۔ حجم کم و بیش ۶۴ صفحہ سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ سر ورق بہترین اور خوش نما ہوتا ہے —

نیرنگ خیال خاص نمبر

شائع ہوگیا ہے

نیرنگ خیال کا خاص نمبر چھپ گیا ہے - جس میں جناب حامداللہ صاحب افسر بی اے ' قاضی عبدالغفار مصنف لیلی کے خطوط ' حضرت جلیل قدوائی ایم - اے ' خان بہادر چودھری خوشی محمد صاحب ناظر بی - اے ' حضرت آرزو لکھنوی ' حضرت یاس یگانہ لکھنوی ' خان بہادر رضا علی خاں وحشت ' مولانا سہا ' حضرت وقار انبالوی ' پروفیسر محمد دین صاحب تاثیر ایم - اے کے تازہ افکار زینت رسالہ ہیں —

بہترین کاغذ-عمدہ لکھائی چھپائی - حجم تقریباً ۲۰۰ صفحات - متعدد رنگین تصاویر

ہندوستان کے بہترین رسالے کا یہ بہترین شاہکار ہے - دو سو صفحہ حجم میں ایک ہزار کتابی سائز کا چیدہ چیدہ انتخاب ہے - اور یہ خاص نمبر ہر پہلو سے کامیاب ہے - اس میں

لیلی کے خطوط

کی ایک تازہ قسط بھی درج کی گئی ہے جس کے مطالعہ سے آپ کے افکار دور ہوجائیں گے - اس مضمون کا ایک ایک حرف قابل مطالعہ ہے

نیرنگ خیال کا سالانہ چندہ صرف تین روپے چھ آنے ہے

اور جو لوگ جولائی سے خریدار ہوں گے - ان کو اسی چندہ میں یہ رسالہ ملے گا - گویا مفت ملے گا - اس لیے جولائی سے خریدار ہوجائیں - ورنہ بعد میں یہ نمبر ایک روپیہ میں آپ کو خریدنا پڑے گا —

ملنے کا پتہ

منیجر رسالہ نیرنگ خیال لاہور (شاہی محلہ)

سب سے خوش نصیب انسان وہ ہے جو نئے حقائق کا انکشاف کرتا ہے، اور دوسرے درجے پر وہ ہے جو پرانے تعصبات کی کرتا ہے
سائنس
انجمن ترقی اردو کا
سہ ماہی رسالہ

اطلاع

(۱) اشاعت کی غرض سے جملہ مضامین اور تبصرے بنام ایڈیٹر سائنس ۹۱۷ ' کلب روڈ ' چادر گھاٹ حیدر آباد دکن روانہ کئے جانے چاھئیں —

(۲) مضمون کے ساتھہ صاحب مضمون کا پورا نام مع ڈگری و عہدہ وغیرہ درج ھونا چاھئے تاکہ ان کی اشاعت کی جاسکے ' بشرطیکہ اس کے خلاف کوئی ھدایت نہ کی جاے —

(۳) مضمون صاف لکھے جائیں تاکہ ان کے کمپوز کرنے میں دقت واقع نہ ھو - دیگر یہ کہ مضمون صفحے کے ایک ھی کالم میں لکھے جائیں اور دوسرا کالم خالی چھوڑ دیا جائے - ایسی صورت میں ورق کے دونوں صفحے استعمال ھوسکتے ھیں —

(۴) شکلوں اور تصویروں کے متعلق سہولت اس میں ھوگی کہ علحدہ کاغذ پر صاف اور واضح شکلیں وغیرہ کھینچ کر اس مقام پر چسپاں کردی جائیں - ایسی صورت سے بلاک سازی میں سہولت ھوتی ھے —

(۵) مسودات کی ھر ممکن طور سے حفاظت کی جاے گی - لیکن اُن کے اتفاقیہ تلف ھوجانے کی صورت میں کوئی ذمہ داری نہیں لی جاسکتی -

(۶) جو مضامین سائنس میں اشاعت کی غرض سے موصول ھوں اُمید ھے کہ ایڈیٹر کی اجازت کے بغیر دوسری جگہ شائع نہ کئے جائیں گے -

(۷) کسی مضمون کو ارسال فرمانے سے پیشتر مناسب ھوگا کہ صاحبان مضمون ایڈیٹر کو اپنے مضمون کے عنوان ' تعداد صفحات تعداد اشکال و تصاویر سے مطلع کردیں تاکہ معلوم ھوسکے کہ اس کے لئے پرچہ میں جگہ نکل سکے گی یا نہیں - کبھی ایسا بھی ھوتا ھے کہ ایک ھی مضمون پر دو اصحاب قلم اٹھاتے ھیں - اس لئے اس توارد سے بچنے کے لئے قبل از قبل اطلاع کردینا مناسب ھوگا -

(۸) بالعموم ۱۵ صفحے کا مضمون سائنس کی اغراض کے لئے کافی ھوگا -

(۹) مطبوعات برائے نقد و تبصرے ایڈیٹر کے نام روانہ کی جانی چاھئیں - مطبوعات کی قیمت ضرور درج ھونی چاھئے —

(۱۰) انتظامی امور و اشتہارات و غیرہ کے متعلق جملہ مراسلت منیجر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن سے ھونی چاھئے —

——— () § * § () ———

جلد ۶ سائنس اکتوبر سنہ ۳۳ ع نمبر ۲۴

مرتبہ
مولوی محمد نصیر احمد صاحب عثمانی ام اے ۰ بی ایس سی (علیگ)
معلم طبیعیات کلیۂ جامعۂ عثمانیہ - حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

تخلیق حیات و انسان

پر

ایک مکالمہ

(۱)

اس سلسلے کے ابتدائی مضامین میں امریکہ کے متحف تاریخ طبعی کے مشہور سائنس داں ڈاکٹر ولیم کے گریگوری نے یہ بتلایا تھا کہ ایک ننھے سے زندہ ذرے سے جملہ حیات کا نشو و نما کیونکر ہوا ' اور پھر اس کا بتدریج ارتقا انسان پر کیونکر ختم ہوا - اس کے بعد کلیۂ نیو یارک کے شعبۂ حیاتیات کے ڈاکٹر ہربرٹ روکس نے یہ بتلایا کہ انسان اپنی خصوصیات اپنی اولاد میں کیونکر منتقل کرتا ہے - پچھلے نمبر میں جامعۂ کولمبیا کے صدر شعبۂ نفسیات ؛ ڈاکٹر اے تی پفن برگر نے یہ بتلایا کہ ہماری جذباتی زندگی خوف ' غصہ ' اور محبت پر مبنی ہے - آج کی گفتگو میں ڈاکٹر پفن برگر نے یہ بتلایا ہے کہ حالات اور تمدن کا اثر ہمارے انفرادی جذبات پر کیا پڑتا ہے - اور ایک انسان اشرالناس اور دوسرا مفید شہری کیونکر بنتا ہے —

مسٹر ماک :- ڈاکٹر پفن برگر صاحب - ایک روز ایک ماہر نفسیات نے مجھ سے کہا تھا کہ نپولین نے یورپ کی فوجوں کو

اس وجہ سے شکست دے دی کہ اس میں مخلوطۂ فروتری
(Inferiority Complex) موجود تھا - یہ مخلوطہ کیا بلا
ہے - میں آج کل اس کا بہت ذکر سنتا ہوں —

ڈاکٹر پفن برگر :- جو کچھ آپ سنتے ہیں اس پر ایمان نہ لے آئیے -
آپ کے ماہر نفسیات کے نظریہ کے بموجب نپولین نے
دنیا کو فتح کرنے کا ارادہ اس لیے کیا تھا کہ اس کو
اپنے قد کے پانچ فٹ دو انچ ہونے کی وجہ سے اس احساس
فروتری کو دور کرنا تھا - اس خیال میں سب سے بڑی
دقت یہی ہے کہ کوتاہ قد تو بہت سے ہیں ' لیکن
نپولین کوئی بھی نہیں - ممکن ہے کہ بونا پارٹ میں
مخلوطۂ فروتری ہو ' لیکن اس کی کامیابی کے اسباب
اور بھی تھے - اب میں آپ کے سوال کا جواب دیتا ہوں -
مخلوطۂ فروتری کسی شخص کی خواہش اظہار نفس میں
خلل اندازی کا نتیجہ ہوتا ہے —

مسٹر ماک :- ذرا اس کی تشریح فرما دیجئے ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- ابھی عرض کرتا ہوں - میں پہلے یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ
جن لوگوں میں مخلوطۂ فروتری ہوتا ہے ان کی شناخت
کیونکر کی جائے - سر سری طور پر ہم ان کو دو قسموں
میں تقسیم کرسکتے ہیں - ایک تو وہ ہیں جو بیداری
میں خواب دیکھا کرتے ہیں یعنی وہ " نوام الیوم "
(Day Dreamers) ہوتے ہیں - دوسرے وہ جو شیخی باز
ہوتے ہیں اور ڈھونس جمایا کرتے ہیں —

مسٹر ماک :- سبب ایک ہی ہے تو اس قدر مختلف نتیجے کیوں ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- جب زندگی میں کسی شخص کو کسی خاص موقع سے سابقہ پڑے اور وہ اس موقع کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہے تو پھر اس میں مخلوطۂ فروتری پیدا ہو جاتا ہے ۔ جو شخص اس طرح قاصر رہتا ہے وہ اپنے قصور کا بدل کسی دوسرے طریقے سے کرنا چاہتا ہے ۔ جس طریقہ سے وہ اس قصور کا بدل چاہتا ہے اس کو ہم عمل تلافی کہتے ہیں ۔ بعض اوقات مخلوطۂ فروتری کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ اس شخص میں از خود کسی کام کے کرنے کی صلاحیت کا فقدان ہوتا ہے ۔ اس کی قوت ارادی بالکل مفلوج ہوجاتی ہے ۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ایسے شخص کی زندگی مشین کی طرح ہوتی ہے ۔ ایسی صورتوں میں وہ بیداری میں خواب دیکھ کر اس کی تلافی کرتا ہے —

مسٹر ماک :- آپ کا مطلب یہ کہ وہ بس حیرتی بنا بیٹھا رہتا ہے —

ڈاکٹر پفن برگر :- نہیں بالکل ایسا تو نہیں ۔ اچھا ایک مثال پیش کرتا ہوں ۔ فرض کیجئے کہ نیو یارک کے ایک کارخانے کا ایک معمولی اہلکار ہے ۔ وہ کارخانے جارہا ہے ۔ وہ ٹرام کے ذریعے جاتا ہے ۔ ٹرام بالکل بھری ہوئی ہے ۔ وہ خود بھی لوگوں میں دبا ہوا ہے ۔ بایں‌ہمہ وہ ایک خوبصورت لڑکی کو نزدیک بیٹھی دیکھتا ہے ۔ اور اپنے بالکل سامنے ایک ایسے شخص کو بیٹھے دیکھتا ہے جس کی آنکھوں سے خونخواری ٹپکتی ہے ۔ گاڑی چلتی ہے تو وہ اپنے آپ کو بالکل

ایک معمولی شخص محسوس کرتا ہے - لیکن اس سب کے عقب میں
ایک خیال اس کے ذہن میں دوڑتا ہے کہ " اگرچہ میں ایک
معمولی آدمی ہوں لیکن فی الحقیقت میں عجیب و غریب
شخص ہوں - میری پوشاک ان ہی لوگوں جیسی ہے - اور
قدرتاً ان کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ میں کون ہوں -
اور کیا ہوں - لیکن ذرا اس بدنہاد کو اس لڑکی کو
چھیڑنے دیجئے - میں فوراً وہاں پہنچتا ہوں - اس پری کو
دیو کے پنجے سے چھڑاتا ہوں - دیو کو نیچے گراتا ہوں '
اور میدان میرے ہاتھ رہتا ہے - اب ہر شخص پوچھتا
ہے " یہ کون ہے " - " یہ کون ہے " - اب میرا موقع آیا "-
اب ہمارا ہیرو بیدار ہوتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے
کہ وہ اپنے مقام سے چھ مقام آگے نکل گیا ہے —

مسٹر ماک :- کیا ہم سب اس قسم کے خواب روز نہیں دیکھا کرتے -
مجھے یاد ہے کہ جب میں مدرسے میں پڑھتا تھا تو میں
اپنے آپ کو ایک کامیاب ڈراما نویس تصور کرتا تھا '
اور یہ خیال کرتا تھا کہ تھیٹر میں جب ڈراما کھیلا جائے گا
تو سارا تھیٹر بڑے بڑے لوگوں سے بھرا ہوگا اور ہر شخص
دریافت کرے گا کہ اس کا مصنف کون ہے —

ڈاکٹر پفن برگر :- جی ہاں - اس قسم کے منصوبے بچپنے اور عنفوان شباب
میں بہت قائم ہوا کرتے ہیں - ایک لڑکا یہ تصور کرتا
ہے کہ وہ ایک بڑا جرنیل ہے ' جو کسی جنگ سے کامیاب
ہوکر گھوڑے پر سوار ہوکر واپس آرہا ہے - دوسرا یہ

تصور کرتا ہے کہ جس دن اس کے بنائے ہوئے پل کا افتتاح ہوگا اس دن وہ ایک بڑا انجینیر مانا جائے گا۔ لڑکی اگر سخت گیر والدین کی اولاد ہے، تو بالعموم یہ تصور کرتی ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ سب جان لیں گے کہ وہ ایک شہزادی ہے جس کو ایک ملکہ راہ چلتے چھوڑ گئی ہے۔ بایںہمہ جوان ہونے پر اس قسم کے تصورات اُن ہی لوگوں میں زیادہ قائم رہتے ہیں جن میں مخلوطہ فروتری ہوتا ہے —

مسٹر ماک :— شیخی بازی اور دھونس کی نسبت کیا ارشاد ہے؟

ڈاکٹر پفن برگر :— شیخی بازی اور دھونس دونوں نفس پر بے اعتمادی کی تلافی کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایسی صورتوں میں وہ فرد دوسروں پر دھونس جما کر اپنی نظروں میں باوقعت بننا چاہتا ہے، اور اگر تھوڑا بہت اس نے کوئی کام انجام دیا ہے تو دوسروں کے سامنے اس کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے، یا پھر بالکل جھوٹ بول کر اپنی طرف ایسے امور کو نسبت دیتا ہے جو اس نے کبھی سر انجام نہیں دیے۔ جو شخص اپنی بہادری کی لمبی چوڑی داستانیں بیان کرتا ہے وہ در اصل اپنے بزدل ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ اس سے بھی لطیف تر شیخی کی اور صورتیں ہیں، مثلاً ضرورت سے زاید انکسار۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ "میں بھی کیا بے وقوف ہوں" وہ در اصل چاہتا ہے کہ آپ اس سے اتفاق نہ کریں۔ اور جب اس

سے یہ کہتے هیں کہ " اسے مشتہر کیوں کرتے هو " تو وہ خفا هو جاتا هے - مخلوطۂ فروتری والے لوگ هی اکثر آپے سے باهر هو جاتے هیں - چیختے هیں اور چلاتے هیں - جاہ اور شہرت طلبی اس کی دوسری علامت هے - جب کسی گروپ کا فوٹو لیا جا رہا هو اور کوئی شخص خواہ مخواہ مرکز میں آنا چاهے اس میں ضرور مخلوطۂ فروتری هوتا هے - اسی طرح آپرا کی وہ رقاصہ بھی اس مخلوطہ میں مبتلا هوتی هے ' جس کو مطلب میں ناکامی کی وجہ سے دورہ پڑ جاتا هے - وہ حوادث زندگی کا مقابلہ معقول طریقے پر نہیں کر سکتی —

مسٹر ساک :- تو کیا مخلوطۂ برتری (Superiority Complex) بھی کوئی چیز هے ؟ -

ڈاکٹر پفن برگر :- نام نہاد مخلوطۂ برتری کی صورتیں عام طور پر وہ صورتیں هوتی هیں جن میں ایک شخص اپنے احساس فروتری پر غالب آنے کا کوئی انوکھا اور دلگیر طریقہ اختیار کرتا هے - ایک کروڑپتی جو کالجوں میں نہایت فیاضی سے امداد دیتا هے ' ممکن هے کہ اس کی تعلیم بہت تھوڑی هو یا بالکل نہ هوئی هو - جو شخص اپنے ملازموں یا زیر دستوں کی خطائیں معاف نہیں کرتا ' غالباً ابتدا میں اس کے والدین ' اساتذہ یا اس کے پہلے بالادست نے اس پر بہت سختی کی هوگی - یا پھر ممکن هے کہ مدرسہ میں نمایاں طور پر

وہ برا طالب علم رہا ہو - ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں - جن میں برتری کا احساس بہت زبردست ہوتا ہے ' لیکن اس کا اظہار اس طریقے پر کرتے ہیں کہ احساس فروتری والے اشخاص کے طریقے سے بہت کم فرق رہ جاتا ہے —

مسٹر ماک :- آپ نے فرمایا تھا کہ مخلوطۂ فروتری کسی شخص کے تقاضاے اظہار نفس میں مزاحمت کا نتیجہ ہوتا ہے - یہ تقاضا کیا ہے ؟ کیا یہ بھی کوئی جذبہ ہے ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- ہرگز نہیں - پچھلی صحبت میں میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ ہماری جذباتی زندگی خوف ' غصہ اور محبت کے تین ابتدائی جذبات پر مبنی ہے - جذبات کے علاوہ محرکات یا تقاضے ہیں جو غالباً جذبات کی بنیاد ہیں -

مسٹر ماک :- " بنیاد " ہونے سے آپ کا کیا مطلب ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- ایک مثال سے مطلب واضح ہو جاے گا - جذبات کو آپ موٹر کے پہیے تصور کیجئے اور ان محرکات یا تقاضوں کو موٹر کا انجن قرار دیجئے جو پہیوں کو حرکت میں لاتا ہے - فرق یہ ہے - ایک مشین صرف بیرونی تحریک کا اثر قبول کرتی ہے ' چنانچہ آپ کی موٹر کا انجن پہیوں کو اس وقت تک نہیں چلاے گا جب تک کہ آپ اسٹارٹر پر پیر نہ رکھیں - اگر آپ پیر نہ رکھیں گے تو موٹر اپنی جگہ سے قطعاً نہ ہلے گی - اب انسانی یا حیوانی مشین کو لیجئے - یہ بھی بیرونی تحریکات کا اثر قبول کرتی ہے لیکن اس کے علاوہ وہ خود کار بھی ہے - ہم

کہہ سکتے ہیں کہ یہ مشین ان تحریکوں یا تقاضوں سے
بار دار ہے - بیرونی حادثہ اس بار کو حرکت میں لاسکتا
ہے' لیکن یہ بیرونی تحریک مفقود ہو تو بھی یہ
حرکت میں آ سکتا ہے—

مسٹر ماک :- مجھے اندیشہ ہے کہ میں ابھی آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا -

ڈاکٹر پفن برگر :- مجھے یقین ہے کہ آپ ذرا سی دیر میں سمجھ جائیں گے ۔
اچھا تو یوں دیکھئے کہ قوی ترین تقاضا تو بھوک کا ہے-
جب کوئی کتا بھوکا ہو اور آپ اس کے سامنے ایک پلیٹ
میں کھانا رکھ دیں تو وہ پلیٹ کی طرف جھپٹ کر
آے گا - یہ مثال ایک بیرونی تحریک کی ہے جو بار کو
حرکت میں لے آئی - آپ نے گویا اسٹارٹر پر قدم رکھ
دیا - اب فرض کیجئے کہ آپ کتے کو کھانے کو نہ دیں
اور اس کی بھوک بہت بڑھ جاے تو وہ کیا کرے گا—

مسٹر ماک :- وہ غذا کی تلاش میں نکل کھڑا ہوگا—

ڈاکٹر پفن برگر :- بالکل درست - یعنی کتا ایک خود کار مشین ہے - اور
بھوک وہ اندرونی تقاضا یا تحریک ہے جس نے کتے کو عمل
پر مجبور کر دیا—

مسٹر ماک :- اگر میں نے آپ کے مطلب کو صحیح سمجھا ہے تو وہ
غالباً یہ ہے کہ جب کتا کسی ہڈی پر لڑتا ہے یا بچہ
دودھ کے واسطے روتا ہے' تو غصے کا جذبہ جو کتے یا
بچے سے ظہور میں آتا ہے وہ بھوک کے تقاضے کا نتیجہ ہے-

ڈاکٹر پفن برگر :- درست - اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ تحریکیں یا

تقاضے جذبات کی بنیاد ہیں۔ گزشتہ صحبت میں میں نے آپ سے عرض کیا تھا، مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر واٹسن نے تجربے سے ثابت کیا ہے کہ نو زائیدہ بچے کو صرف دو ہی چیزیں غصے میں لا سکتی ہیں ایک تو بھوک اور دوسری حرکات و سکنات میں رکاوٹ۔ ایک صورت میں غصہ اگر بھوک کی تحریک کی بناء پر پیدا ہوتا ہے تو دوسری صورت میں تقاضائے فعالیت کا نتیجہ ہوتا ہے —

مسٹر ماک :- لیکن بچے کو غصہ کیوں آتا ہے؟ کیا ان تحریکات سے صرف غصے ہی کا جذبہ بروئے کار آتا ہے —

ڈاکٹر پفن برگر :- ہرگز نہیں۔ میں ابھی عرض کرچکا ہوں کہ حیوانی مشین ان تحریکوں یا تقاضوں سے بار دار یا بھری ہوتی ہے۔ یہاں نکتہ یہ ہے کہ اس بار کو خالی کر دینے سے اطمینان پیدا ہوتا ہے اور اس میں رکاوٹ بے اطمینانی پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے کو اگر وقت پر دودھ ملتا رہے اور اس کی حرکات و سکنات میں رکاوٹ نہ ہو تو وہ مطمئن رہتا ہے۔ اسی بنا پر جب اس کو وقت پر دودھ نہیں ملتا اور کھلائی اس کو گود میں لے کر دباتی ہے تو وہ غصے میں آجاتا ہے۔ جب آپ کو بھوک لگتی ہے تو کیا آپ بھی تنک مزاج ہوجاتے ہیں؟

مسٹر ماک :- تنک مزاج نہ کہیے۔ میں تو ایسے وقت چڑچڑا اور نا معقول سا ہوجاتا ہوں —

ڈاکٹر پفن برگر :- یہی میرا بھی حال ہے۔ یہ وہی بے اطمینانی ہے جو

بھوک کی تحریک کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی تحریک بچے کو بھی دودھ کے لیے رلاتی ہے۔ ہم میں اور بچوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ ہم کو اپنے تجربے سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ چیخنا چلانا ہمارے حق میں کھانے کے لیے مفید نہیں۔ بھوک کی اس تحریک کی بنیاد طبیعی ہے۔ اس کا سبب جسم کے نشو و نما کے لیے چند اشیاء کی کمی ہے۔ لہذا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا سبب کیمیاوی ہے۔ پیاس کی تحریک کی بھی یہی صورت ہے۔ حیوان ہو یا انسان دونوں پانی کی تلاش میں دوڑ دھوپ کرنے لگتے ہیں، جب کہ جسم کے اندر مائیت کم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح طبیعی بنیادوں پر دوسری تحریکیں اور دوسرے تقاضے کام کرتے ہیں۔ جسم میں چونکہ طبیعی توانائی ہوتی ہے اس لیے وہ اپنا ظہور چاہتی ہے۔ لہذا نقل و حرکت کا تقاضا پیدا ہوتا ہے، جس کا اظہار کھیل کود وغیرہ سے ہوتا ہے۔ آرام کی ضرورت بھی ایک تحریک ہے، جو جسم کے اندر تکانی سمیت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ کامل ایقان کے ساتھ تو نہیں، البتہ کسی قدر وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام نہاد صنفی تحریک (Sex drive) کی طبیعی بنیاد جسم کے اندر چند اشیاء مثلاً افرازات غدودی، ہارمون، یا دیگر کیمیاوی مادے کی کمی ہے۔ ان محرکات کے علاوہ متعدد دیگر تقاضے بھی ہیں جو

سب کے سب ہمارے وجود جسمانی کے عنصر ہیں، لیکن ان کے لیے ابھی تک ہم کوئی طبیعی بنیاد قرار نہیں دے سکے ہیں —

مسٹر ماک :— وہ دیگر تقاضے کون کون سے ہیں ؟

ڈاکٹر پفن برگر :— میں یہاں چند کا ذکر کرتا ہوں، جن کو آپ نے اپنے اندر یا دوسروں میں مشاہدہ کیا ہوگا۔ ضرورت مدنیت، ضرورت دوستی، ضرورت صحبت متاہلانہ، جو لوگوں کو گھرست بننے پر مجبور کرتی ہے۔ اور ضرورت پابندی وضع۔ پھر وہ تقاضا ہے جس کا میں نے ابتدا میں ذکر کیا تھا، یعنی دوسروں پر اپنی فوقیت ظاہر کرنے کی ضرورت۔ بالفاظ دیگر اظہار نفس کا تقاضا۔

مسٹر ماک :— کیا آپ ان ضرورتوں اور خواہشوں کو بھوک کی طرح کے محرکات کہیں گے ؟

ڈاکٹر پفن برگر :— یقیناً۔ ان میں سے بعض بھوک کی طرح زبردست نہ ہوں گے۔ لیکن ہیں سب کے سب بنیادی طور پر تقاضے۔ تمام طبیعی انسانوں میں یہ پائے جاتے ہیں اور ان کے برتاؤ پر اثر ڈالتے ہیں۔ ان کو محرکات ہم اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ان میں حرکت میں لانے کی قوت ہے۔ وہ فی الحقیقت ایک انسان کو مجبور کردیتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خاص خاص صورتوں میں ظاہر کرے —

مسٹر ماک :— آپ نے فرمایا کہ یہ تقاضے تمام طبیعی انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ میں ایک طبیعی انسان ہوں لیکن مجھ میں

وضع کی پابندی یا دوسروں کی طرح ہونے کی کوئی خواہش نہیں —

ڈاکٹر پفن بر گر :- کیا واقعی نہیں ہے ؟ کیا آپ گرمی میں بھی بھاری ٹوپی پہنے رہیں گے ؟ یا جاڑوں میں آپ پوستین کا لبادہ پہنے پھریں گے ؟ آپ اور ہم سب آخر آستینوں میں بٹن کیوں لگاتے ہیں ؟ عرض کروں کہ کیوں ؟ محض اس لیے کہ ہم سب وضع (فیشن) کے غلام ہیں - خواہ ہم اس کو تسلیم کریں یا نہ کریں —

مسٹر ماک :- میرے نزدیک تو اس پابندی کا سبب خوف تضحیک ہے —

ڈاکٹر پفن بر گر :- اچھا یوں ہی سہی - لیکن اگر پابندی وضع کا تقاضا آپ میں قوی نہ ہو تو آپ اس تضحیک سے نہ ڈریں گے - اس وقت بجائے وضع کی پابندی کے آپ خود ایک وضع قائم کردیں گے - اب ایک بالغ انسان کو لیجیے تو اس کے اندر ان محرکوں اور تقاضوں کی ایک پوٹ کی پوٹ ہوگی - وہ سوڈے میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی طرح اس کے اندر بند ہیں ' اور ہر وقت ابھرنے کے لیے تیار - ان کو اخراج کا موقع دینے سے انسان کو تسکین ہوتی ہے -

مسٹر ماک :- خود انسان کو اس کا موقع ملتا بھی ہے یا نہیں ؟

ڈاکٹر پفن بر گر :- ہمیشہ تو نہیں - تمدن و تہذیب کا قدم درمیان میں آجاتا ہے ' اور وہ مانع ہوتے ہیں - معاشری رسم و رواج ' اخلاق ' تمیز ' آداب اس کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں - مہذب معاشرہ (Society) اوسط انسان کے حق میں وہی

حیثیت رکھتا ہے جو دایہ بچے کے حق میں رکھتی ہے ' یعنی جس طرح دایہ بچے کو چمٹا کر دبا لیتی ہے اسی طرح معاشرہ بھی انسان کے ذاتی انداز کو دبا دیتا ہے —

مسٹر ماک :- اس کا نتیجہ ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- نتیجہ یہ کہ اس کو اپنے محرکات اور تقاضوں کا اظہار ترمیم شدہ صورت میں یا باصطلاح ماہران تجزیہ نفس (Psychoanalysis) تصعیدی شکل (Sublimated form) میں کرنا پڑتا ہے —

مسٹر ماک :- یہ تو آپ نے بڑا زبردست لغت استعمال کردیا - اس کے معنی کیا ہیں ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- اس کا مطلب یہ کہ انسان اپنے تقاضاؤں کو ایسے راستوں پر ڈالے جن کو دنیا پسند کرتی ہے - تعلیم و تربیت کا عمل در اصل ایک تصعیدی عمل ہے یعنی اپنے محرکات اور تقاضوں کو اچھے راستے پر ڈالنے کا عمل ہے —

مسٹر ماک :- لیکن تعلیم کو ہمیشہ اس میں کامیابی نہیں ہوتی - کیوں جناب —

ڈاکٹر پفن برگر :- بد قسمتی سے ایسا ہی ہے - لیکن اس کے متعلق میں ابھی عرض کروں گا - پہلے میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ تصعید سے کیا مراد ہے - مثال کے طور پر اظہار نفس کے تقاضے کو لیجئے - ابتدائی انسان میں یہ تقاضا جسمانی لڑائی کی صورت اختیار کرتا تھا - آج ایک شخص انتخابات

میں دوسرے شخص کو شکست دیتا ہے اور اس طرح
سیا سیات میں اپنا نام پیدا کرتا ہے - دوسرا شخص اپنے
حریفوں کو کاروبار میں نیچا دکھاتا ہے ' تیسرا شخص
سائنس اور ایجاد میں نام پیدا کرتا ہے ' چوتھا شخص
ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے میں سب سے سبقت لے جاتا ہے —

مسٹر ماک :- میں نے تو سنا ہے کہ شاہ انگلستان شاہ وراقین (Stamp Collector)
بھی ہیں - تو کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنے تقاضائے
اظہار نفس کو اس طرح پورا کرتے ہیں —

ڈاکٹر پفن برگر :- بے شک - آج کل بادشاہوں کے لیے اور طریقہ ہی کون
سا ہے - اگر وہ پانسو برس اُدھر ہوتے تو غالباً اُن
کو شاہ فرانس یا شاہ اسکاچستان سے جنگ کرنے کے لیے
جانا پڑتا - واقعہ یہ ہے کہ ہر قسم کی دھن کی تہ میں
یہی تقاضائے اظہار نفس ہوتا ہے - اور تمام مقابلوں کی
بنیاد بھی اسی پر ہے - ہر صورت میں انسان دوسروں
پر اپنی فوقیت اس طرح جتاتا ہے جو معاشرہ کے لیے
مفید ہوتا ہے اور خود اس کے نفس کو اطمینان بخشتا
ہے - ویانا کے مشہور ماہر نفسیات فروڈ اور ان کے
متبعین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ تمام شاعری ' نقاشی '
اور صورت تراشی تقاضاے صنفی (Sex) کی تصعیدی
شکل ہے ' یعنی اس کے اظہار کی ایک ترمیم
شدہ صورت ہے —

مسٹر ماک :- تو کیا عہد حاضر میں جملہ عشق و تعشق تقاضائے صنفی

کی تصعید نہیں ہے - مثلاً اگر کوئی اپنی محبوبہ کو ایک غزل لکھ بھیجے یا اس کو پھولوں کا ایک گلدستہ بھیجے تو کیا یہ نشانیاں انسان کے صورت اولین کے طریقوں کا بدل نہیں ہیں ' جب کہ وہ اپنی پسند کردہ دوشیزہ کو اپنے غار تک گھسیٹ لے جاتا تھا —

ڈاکٹر پفن برگر :- اصولاً یہ صحیح ہے لیکن واقعتاً اس سے بہت پیچیدہ ہے - آپ جانئے کہ عہد جدید کے تعشق میں صرف صنفیت ہی شامل نہیں ہے - اس میں خود نمائی کو بہت کچھ دخل ہے ' دوسروں کو خوش کرنے کی آرزو بھی اس میں موجود ہے ' احساس حسن بھی اس میں ہے اور نہ جانے کیا کیا ہے —

مسٹر ماک :- اچھا اگر اپنے محرکات اور تقاضوں کو ہم اچھے راستے پر نہ ڈال سکیں تو کیا ہوتا ہے ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- ابھی صرف تقاضائے اظہار نفس تک ہی محدود رہئے ' کیونکہ ہمارے بہت سے مسائل کی تہ میں یہی تقاضا ہے - جب تعلیم [جس میں بچپنے کی تربیت بھی شامل ہے] اس کو صحیح راستے پر ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوتی تو ہمیشہ دقتیں پیدا ہوتی ہیں - بچوں میں ضد کی صورت میں یہ نمودار ہوتی ہے - بالغوں میں یہی دھونس کی صورت اختیار کرتی ہے - اسی سے اشخاص جرائم پیشہ بھی بنتے ہیں اور تعارض مزمن میں مبتلا رہتے ہیں —

مسٹر ماک :- تعارض ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- جی ہاں - یہ بھی ایک مظہر ہے تقاضاے اظہار نفس کا - یہ ایک طریقہ ہے جس سے ایک شخص دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے - اب رہے جرائم پیشہ تو آج کل کے راہزنوں اور قطاعوں کے سرغنہ تقاضاے اظہار نفس کے غلط اطلاق کی بہترین مثالیں ہیں - بدنام زمانہ قمار باز راتھسٹائن نامی اور الکپون دونوں نے سرداری کی اہلیت کا ثبوت دیا ' لیکن بے محل - راتھسٹائن چاہتا تو سر برآوردہ بینکر بن سکتا تھا ' اسی طرح الکپون نے اپنی قابلیتوں سے اچھا کام لیا ہوتا تو ہم پلۂ نپولین ہو سکتا تھا ' یا پھر صنعتی یا سیاسی تنظیم اچھی طرح کرسکتا تھا —

مسٹر ماک :- جب تقاضائے صنفیت کو صحیح طریقے پر پورا نہیں کیا جاتا تو کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- ایسی صورتوں میں بے اطمینانی اور بے قراری پیدا ہوجاتی ہے ' اس کی سادہ ترین مثال آپ بچے میں دیکھتے ہیں جب کہ اس کے بازو دبا لیے جائیں - بد ترین صورت میں غیر طبعی برتاؤ کی نوبت آ جاتی ہے ' جس کو ہمارے اخلاق آداب قبول نہیں کر سکتے - اکثر ایسا ہوتا ہے کہ صنفیت سے نفرت ہوجاتی ہے - لوگوں میں " تصنع " (Prudery) کی یہی بنیاد ہے اور پھر یہی لوگ تنقید میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں —

مسٹر ماک :- کیا اسی کو امتناع (Repression) کہتے ہیں ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- ہاں امتناع سے مراد ان فطری تقاضوں کے پورا کرنے پر معاشری رسم و رواج کی پابندی ہے ۔ ان ہی کو نواہی (Taboo) کہتے ہیں —

مسٹر ماک :- تو کیا آپ کے نزدیک جملہ نواہی برے ہیں ؟ ۔

ڈاکٹر پفن برگر :- ہرگز نہیں۔ مدنیت میں معاشرہ کے لیئے ضروری ہے کہ فرد جماعت کی بہبودی کے لیے اپنی آزادی کا ایک حصہ ایثار کرے ۔ اس کو کس قدر ایثار کرنا چاہئیے ؟ اس کا تعین ایک ایسا معاشری مسئلہ ہے جس کا جواب اب تک نہیں دیا جا سکا ہے ۔ مختلف تاریخی معاشروں میں یہ تحدید مختلف رہی ہے اور اب بھی مختلف ملکوں میں یہ مختلف ہے حتیٰ کہ ایک ہی ملک کے مختلف معاشروں میں بھی یہ مختلف ہے —

مسٹر ماک :- امتناع اور اجتناب (Inhibition) میں کیا فرق ہے ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ امتناع باہر سے ہمارے محرکوں اور تقاضوں پر ایک پابندی ہے ۔ بالعموم ہمارے برتاؤ پر یہ پابندیاں عائد ہوتی ہیں ۔ اجتناب وہ پابندی ہے جو ہم خود اپنے نفسوں پر عائد کریں —

مسٹر ماک :- اور مخلوطہ کیا ہے ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- یہ نفس کی وہ حالت ہے جو مسلسل امتناع کی حالت میں رہنے سے پیدا ہو جاتی ہے —

مسٹر ماک :- تو کیا یہ طبعی حالت ہے ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- جی نہیں ۔ طبعی حالت تو امتناع سے نہیں پیدا ہوتی

بلکہ تصعید سے پیدا ہوتی ہے اور تصعید کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ یہ گویا ہمارے محرکوں اور تقاضوں کا کار آمد اور پسندیدہ طریقوں میں منتقل ہو جانا ہے ۔ اگر کوئی مخلوطہ اس قدر سنگین ہوجائے کہ اس کے علاج کی ضرورت لاحق ہو جائے تو پھر تصعید کے عمل سے یہ مخلوطہ " تحلیل " (Resolved) ہو جاتا ہے —

مسٹر ماک :۔ اس سے آپ کا کیا مطلب ہے اور یہ کیونکر انجام پاتا ہے ؟ ۔

ڈاکٹر پفن برگر :۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص تقاضاے جنس کے امتناع کی وجہ سے ایک مخلوطہ میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کا اظہار مختلف طریقوں سے ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اس حد تک پہنچ جائے کہ اس شخص کے اعصاب کو بالکل تباہ کردے ۔ ایسی صورت میں علاج یہ ہوگا کہ اس شخص کے ممتنع تقاضاے جنس کو عمل تصعید سے ایسے پسندیدہ امور میں لگا دیا جاے جیسے کہ فنون لطیفہ اور خدمت خلق ہیں یا پھر کسی ایسے مفید کام میں اس کو لگایا جاے جو خود اس شخص کو مرغوب اور پسندیدہ ہو ۔ اس قسم کے تبدلات میں بڑی ہوشیاری کی ضرورت ہے ۔ اس کو صرف ایک ماہر فن ہی انجام دے سکتا ہے ۔ ماہر کے لیے بھی لازمی ہے کہ وہ فطرت انسانی کا عمیق مطالعہ کرچکا ہو —

مسٹر ماک :۔ کیا اسی کو نفسی تجزیہ (Psychoanalysis) کہتے ہیں ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- جی ہاں - مخلوطوں کے سلسلے میں میں نے شروع ہی میں آپ سے عرض کیا تھا کہ مخلوطۂ فروتری کسی شخص کے تقاضاے اظہار نفس میں مزاحمت کا نتیجہ ہوتا ہے - اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا مطلب تقاضاے اظہار نفس کے امتناع کے نتیجہ سے تھا —

مسٹر ماک :- جی ہاں میں سمجھ گیا - آپ نے یہ فرمایا کہ طبعی انسانوں میں اظہار نفس کا تقاضا ہوتا ہے - تو پھر کیا وجہ ہے کہ بعض انسان میں ممتنع ہو جاتا ہے اور بعض میں نہیں ؟

ڈاکٹر پفن برگر :- زندگی کے ابتدائی سالوں میں جو تربیت ملتی ہے اس کو اس میں بہت کچھ دخل ہے - مثلاً ہر بچہ کسی نہ کسی وقت ، جن محرکوں یا تقاضوں میں مزاحمت پاتا ہے ، اُن کے اظہار کی کوئی نہ کوئی غیر اطمینان بخش صورت ضرور اختیار کرتا ہے - اس کی ادنیٰ مثال ضد کرنا اور مچلنا ہے - فرض کیجئے کہ ایک بچہ سے کہا گیا کہ وہ ایک خاص غذا کھاے - وہ بجاے کھانے کے مارے غصے کے فرش پر لیٹ جاتا ہے ، ہاتھ پیر مارتا ہے اور غل مچاتا ہے - ظاہر ہے کہ اس کے علاج کی ضرورت ہے -

مسٹر ماک :- تو نا تجربہ کار والدین کو آپ کیا راے دیں گے -

ڈاکٹر پفن برگر :- اس کے دفعیہ کی ایک ترکیب تو وہی پرانی ترکیب ہے یعنی ' ضرب ' کی گردان اچھی طرح کردی جاے - دوسری ترکیب یہ ہے کہ بچہ کی تمام حرکتوں سے بالکل انجان

بن جانا چاہئیے - اگر کچھ نہ کیا جاے گا تو حوادث زندگی کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک غیر طبعی طریقہ کی بنیاد پڑ جاے گی - اب گویا بچے کے ہاتھ میں ایسا ہتھیار آگیا ہے جس سے وہ اپنے تقاضوں کو جبراً پورا کرا سکتا ہے - اس میں دقت یہ ہوتی ہے کہ آگے چل کر جب زندگی میں وہ قدم رکھتا ہے تو وہ ہتھیار بے کار ہو جاتا ہے ' اس لیے وہ زندگی کے معمولی حوادث سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا - نتیجہ کیا ہوا ؟ اس میں مخلوطۂ فروتری پیدا ہو گیا ' جس کا اظہار میرے بیان کردہ طریقوں میں سے کسی نہ کسی ایک طریقے سے ہوتا ہے —

مسٹر ماک :- آپ کا مطلب یہ ہے کہ مخلوطۂ فروتری کی جملہ صورتیں بچپنے میں نامناسب تربیت سے پیدا ہوتی ہیں - اگر واقعی ایسا ہے تو دنیا میں اس کی کثرت ہونی چاہئیے یا ہم سب کو اس میں مبتلا ہونا چاہئیے —

ڈاکٹر پفن برگر :- آپ کا سوال دو جواب چاہتا ہے - پہلا تو یہ کہ اس کی کثرت دنیا میں اس سے زیادہ ہے جتنا کہ آپ کے خیال میں ہے - دوسرا یہ کہ ہم کو بالکلیہ یہ یقین نہیں ہے کہ بعض لوگ فروتری کی طرف پیدائشی میلان نہیں رکھتے - اس کو قطعی طور سے دریافت کرنا تقریباً ناممکن ہے - لیکن اتنا ہم جانتے ہیں کہ چند گھنٹوں کا نوزائیدہ بچہ بھی اتنا جان جاتا ہے کہ رونے

سے اس کی خواہشیں پوری ہو جائیں گی اور اس کو خوب پیار کیا جائے گا۔ ممکن ہے کہ اس طرح محرکوں اور تقاضوں کو پورا کرنے سے بالکل ایک غلط طریقہ کی بنیاد پڑجائے۔ اگر آپ اس کو یوں ہی چھوڑ دیں گے تو آپ بچے کو ایک غلط راستے پر ڈال دیتے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ آپ مخلوطۂ فروتری کی بنیاد ڈال دیں تو بعد میں چل کر اس شخص کے لیے بہت مضرت رساں ثابت ہو —

رنگ اور رنگ کی رویت

از

جناب پروفیسر منہاج الدین صاحب ' اسلامیہ کالج' پشاور

جب ہم اپنے ارد گرد کی اشیا پر نظر ڈالتے ہیں تو اُن میں تین طرح کے اختلاف دیکھتے ہیں - اول تو اُن کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں - دوسرے بعض اشیا تیز روشن ہوتی ہیں اور بعض مدھم - تیسرا اختلاف جس کے متعلق میں اس مضمون میں بحث کروں گا ' رنگوں کا اختلاف ہے - کوئی چیز سرخ ہے کوئی سبز اور کوئی بنفشئی —

ہماری حس باصرہ مختلف رنگوں میں تمیز کرسکتی ہے - اُس کی وجہ یہ ہے کہ آنکھ کے پردۂ اول پر ہر رنگ کی چیز کا اثر الگ ہوتا ہے - اسی طرح کان پر مختلف سروں کا اپنا اپنا اثر ہوتا ہے - جس کی وجہ سے ہم سروں میں تمیز کرسکتے ہیں —

سوال پیدا ہوتا ہے کہ رنگوں کا اثر مختلف ہونے کا طبیعی سبب کیا ہے - یعنی کیا وجہ ہے کہ کوئی چیز تو ہمیں سرخ نظر آتی ہے اور کوئی سبز - اس لیے پہلے میں طبعی نقطۂ نظر کو لے کر بتاؤں گا کہ چیزوں کے رنگ ان کی کس خاصیت کے ساتھ وابستہ ہیں —

رنگ کی ماہیت

مسلسل طیف ' اگر تاریک کمرے میں آفتاب کی شعاعیں باریک شگاف کے راستے داخل ہو رہی ہوں - تو سامنے کی دیوار پر سفید روشنی کی لکیر سی بن جائے گی - اب اگر ان شعاعوں کے راستے میں شیشے کا تکون یا منشور (م) رکھہ دیا جائے تو سفید کرنیں منشور میں سے گذرنے کے بعد مختلف رنگوں کی شعاعوں میں تبدیل ہو جائیں گی - اور دیوار پر ایک چوڑی رنگین دھاری نمودار ہوگی جس کے رنگ مندرجۂ ذیل ہوں گے -
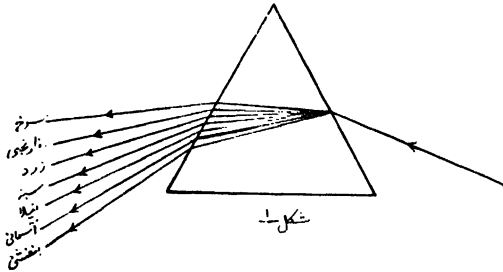
شکل ۱

سرخ - نارنجی - زرد - سبز - نیلا - آسمانی اور بنفشئی —

یہ رنگ وضاحت کے ساتھہ بالکل الگ الگ نظر نہیں آتے - بلکہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ایک رنگ کہاں ختم ہوا اور دوسرا کہاں سے شروع ہوا - اور دونوں کناروں پر بھی رنگ آہستہ آہستہ مدھم ہوتے جاتے ہیں - دھاری اور تاریکی کے درمیان کوئی واضح حد فاصل نہیں ہوتی —

رنگین دھاری جو آفتاب کی شعاعوں کے منشور میں سے گذرنے پر نمودار ہوتی ہے آفتاب کا طیف (Spectrum) کہلاتی ہے - طیف کا مقام دیکھنے پر معلوم ہوگا کہ وہ اُسی سمت میں نہیں ہے - جس میں آفتاب کی شعاعیں منشور پر پڑنے سے پہلے جاری تھیں - بلکہ منشور میں سے گذر کر سب شعاعوں کی سمت بدل گئی ہے - ان رنگوں میں سے بنفشئی شعاعوں کا انحراف سب سے زیادہ ہوا ہے - اور نیلے رنگ کا سبز رنگ سے زیادہ - سبز کا زرد سے زیادہ اور زرد کا سرخ سے زیادہ - سرخ شعاعوں کا انحراف

اور سب رنگوں سے کم ہے —

اب اگر پردہ میں اُس جگہ جہاں زرد رنگ کی دھاری بنتی ہے شگاف کردیا جاے تو زرد رنگ کی شعاعیں شگاف میں سے گذر جائیں گی - ان شعاعوں کے راستے میں ایک اور اُسی قسم کا منشور حائل کر دیا جاے جیسا کہ آفتاب کی روشنی کے راستہ میں حائل کیا گیا تھا تو اُس میں سے گذرنے میں زرد شعاعیں اتنی ہی منحرف ہوں گی جتنی پہلے منشور میں سے گذرنے میں منحرف ہوئی تھیں - لیکن ان کا رنگ زرد ہی رہے گا - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر منشور زرد شعاعوں میں معین انحراف پیدا کرتا ہے - اسی طرح ہر منشور سرخ شعاعوں میں معین انحراف پیدا کرتا ہے جو زرد شعاعوں کے انحراف سے کم ہوتا ہے وعلیٰ ھذا القیاس —

چونکہ سب رنگوں کی شعاعیں سفید نور سے حاصل ہوتی ہیں اس لیے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ معمولی سفید روشنی سات رنگوں پر مشتمل ہے - منشور میں سے گذرنے پر وہ مختلف رنگوں میں اس لیے پھٹ جاتی ہے کہ ہر رنگ کا انحراف مختلف ہوتا ہے - نور کے رنگوں میں اس طرح بٹ جانے کو انتشار نور کہتے ہیں —

ہم اپنی حس باصرہ کے ذریعے مختلف انحراف والی شعاعوں میں اُن کے رنگوں کو دیکھہ کر تمیز کرتے ہیں - مگر جن شعاعوں کو مثلاً ہم سبز رنگ کی شعاعیں کہتے ہیں اُن سب کا انحراف بالکل برابر نہیں ہوتا - بلکہ بعض کا کسی قدر کم ہوتا ہے اور بعض کا زیادہ - اس فرق کو ہماری آنکھہ محسوس نہیں کر سکتی - اس لیے ہم سب شعاعوں کو سبز کہتے ہیں - نیز بسا اوقات رنگ کی تمیز بھی مشکل ہو تی ہے - مثلاً سبزی مائل نیلے رنگ کو بعض لوگ نیلا کہدیتے ہیں اور بعض سبز - ان وجوہات کی بنا پر انحراف

کے ذریعے شعاعوں کو معین کرنے کا طریقہ زیادہ صحیح ہے —

اگر شعاعیں ایک واسطے (ہوا) سے دوسرے واسطے (شیشہ) میں گذریں تو اُن کی سمت بدلتی ہے - اس مظہر کو انعطاف نور کہتے ہیں - سفید روشنی میں مختلف قسم کی شعاعیں ہوتی ہیں - جن میں سے بعض زیادہ انعطاف پذیر ہوتی ہیں اور بعض کم - پس شعاع کو معین کرنے کے لیے صرف یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کس حد تک انعطاف پذیر ہے —

اب ہم اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں کہ انعطاف کا اختلاف کیوں ہوتا ہے - ہمیں معلوم ہے کہ نور کی خاصیات امواج کی سی ہیں - پس نور کی اشاعت کے لیے تموج کی ضرورت ہے - یہ تموج مبداء نور سے روانہ ہوتا ہے - اور اثیر * میں سے ہوکر آنکھ سے ٹکراتا ہے تو رویت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے —

مبداء نور سے امواج روانہ ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُس کے ذرے نہایت سرعت کے ساتھ تھرتھراتے ہیں - اور مختلف رنگوں کی روشنی کا اختلاف اس لیے ہوتا ہے کہ ذروں کی تھرتھراہٹ کی تیزی برابر نہیں ہوتی - مثلاً بنفشئی شعاعوں کا تعدد † ارتعاش سرخ شعاعوں کے تعدد ارتعاش سے تقریباً دگنا ہوتا ہے - اس لیے اگر ہمیں کسی خاص سبز شعاع کو متعین کرنا ہو جس کا انعطاف معلوم ہو تو ہم صرف اس شعاع کے متعلق

---

* موجودہ قیاس کے مطابق تمام فضائے بسیط میں ایک واسطہ موجود ہے جس کا نام اثیر ہے - اثیر سے کوئی جگہ خالی نہیں - نور اور لاسلکی امواج کی اشاعت اثیر کے ذریعے ہوتی ہے —

† جتنی مرتبہ کوئی ذرہ ایک ثانیہ میں تھرتھراتا ہے اُسے ذرہ کا تعدد ارتعاش کہتے ہیں —

ذروں کا تعدد ارتعاش بیان کردیں گے - اس ترکیب سے شعاع بالکل معین ہو جائے گی —

فضا یا ھوا میں نور کی رفتار تقریباً ۱۸۶۰۰۰ میل یا ۳۰۰۰۰۰ کلومیٹر فی ثانیہ ھے - اور جتنا فاصلہ کسی خاص رنگ کی شعاعیں ایک ارتعاش کے دوران میں طے کرلیتی ھیں اُس فاصلہ کو شعاعوں کا طول موج کہتے ھیں - پس اگر شعاع کے تعدد ارتعاش کو طول موج میں ضرب دیا جائے تو ایک ثانیہ میں طے کردہ فاصلہ یعنی رفتار نور حاصل ھوگی - اس سے ظاھر ھے کہ اگر کسی شعاع کا طول موج معلوم ھو تو اُس سے بھی شعاع متعین ھو جائے گی —

ھماری حس باصرہ صرف اُن امواج کو محسوس کرسکتی ھے جن کا طول موج خاص حدود کے درمیان واقع ھوتا ھے - مندرجۂ ذیل جدول میں مرئی شعاعوں کا طول موج دیا گیا ھے —

سرخ	۰۷۲۳۰ مائکروں *	سے	۰۶۴۷۰ مائکروں	تک
نارنجی	۰۶۴۷۰ "	سے	۰۵۸۵۰ "	تک
زرد	۰۵۸۵۰ "	سے	۰۵۷۵۰ "	تک
سبز	۰۵۷۵۰ "	سے	۰۴۹۲۰ "	تک
نیلا	۰۴۹۲۰ "	سے	۰۴۵۵۰ "	تک
آسمانی	۰۴۵۵۰ "	سے	۰۴۲۴۰ "	تک
بنفشئی	۰۴۲۴۰ "	سے	۰۳۹۷۰ "	تک

---

* مائکروں $\frac{1}{1000}$ ملی میٹر یا $\frac{1}{1000000}$ میٹر کے برابر ھوتا ھے —

یہی امواج جب آپس میں خلط ملط ہوکر آنکھہ سے ٹکراتی ہیں۔ تو سفید نور کا احساس ہوتا ہے - اگر اثیری امواج کا طول موج مذکورہ بالا حدود کے اندر نہ ہو تو اُن کا آنکھہ پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ لیکن اور مختلف طریقوں سے ان کا احساس ہو سکتا ہے۔ مثلاً سرخ شعاعوں سے زیادہ طول موج کی لہریں ہم حرارت کی شکل میں محسوس کرتے ہیں۔ اور بنفشئی شعاعوں سے کم طول موج کی شعاعوں کو اُن کے کیمیائی عمل سے شناخت کر سکتے ہیں۔ بہت لمبے طول موج کی شعاعیں بے تار پیام رسانی میں استعمال ہوتی ہیں۔ ان شعاعوں کا طول موج $\frac{1}{10}$ ملی میٹر سے ۱۳۰۰۰ میٹر تک ہوتا ہے —

ظاہر ہے کہ رنگوں کا اختلاف کوئی حقیقی اختلاف نہیں۔ محض ہمارے احساس کا اختلاف ہے۔ بعض آدمی نیلے اور آسمانی رنگ میں تمیز نہیں کر سکتے۔ ان کی حس باصرہ کے مطابق طیف کے چھہ رنگ ہوتے ہیں۔ بعض آدمیوں کی حس باصرہ اتنی کم زور ہوتی ہے کہ وہ اور رنگوں میں بھی صحیح طور پر تمیز نہیں کرسکتے —

خلا یا ہوا میں ہر رنگ کی روشنی کی رفتار برابر ہوتی ہے۔ لیکن کثیف واسطوں میں روشنی کی رفتار رنگ پر منحصر ہوتی ہے۔ یہی رفتار کا فرق ہے جس سے انعطاف کا اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔ کسی خاص رنگ کی شعاعوں کا طول موج مختلف واسطوں میں مختلف ہوتا ہے —

بخارات کا طیف

سورج کی کرنوں کا طیف مسلسل ہوتا ہے۔ اس میں سات رنگ ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھہ ساتھہ واقع ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہم گیس کا شعلہ روشن کریں اور کسی سلاخ میں نمک لگا کر شعلہ پر رکھہ دیں تو شعلہ کا رنگ زرد ہوگا۔ اور اُسے

منشور میں سے دیکھنے پر مسلسل طیف کی بجاے زرد خط نظر آے گا جو طیف کے خاص مقام پر واقع ہوگا۔ نمک سوڈیم کا مرکب ہے۔ شعلہ میں رکھنے سے سوڈیم کے بخارات بھڑک اُٹھتے ہیں۔ اور ان بخارات کا طیف ایک خط ہوتا ہے۔ یہی حال اور چیزوں کا ہے۔ جس عنصر کو شعلے میں رکھہ کر بخارات میں تبدیل کیا جاتا ہے اس کے طیف میں خاص خاص مقامات پر خاص رنگوں کے خط نظر آتے ہیں۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی عنصر بخارات میں تبدیل ہوکر بھڑک اُٹھتا ہے تو اُس سے خاص طول موج کی لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ اور اُنہی لہروں کے مطابق خطوط طیف میں پاے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر کسی مرکب کے طیف کو دیکھہ کر ہمیں معلوم ہوسکتا ہے کہ اُس میں کون سے عنصر موجود ہیں —

رنگ فرعی یا لون

وسیع معنوں میں رنگ کا اطلاق تنویر یعنی روشنی کی تیزی پر بھی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے رنگ کا اختلاف تین طرح سے ہوسکتا ہے —

۱ - حدت یا تنویر کا اختلاف -

۲ - سیری کا اختلاف یعنی رنگ خالص ہے یا اس میں سفید روشنی کی آمیزش ہے —

۳ - رنگ فرعی یا لون کا اختلاف -

آفتاب کی روشنی کو جس میں طیف کے تمام رنگ شامل ہوتے ہیں سفید رنگ کے نام سے موسوم کرتے ہیں —

رنگ فرعی یا لون سے مراد اصل رنگ سے ہے۔ مثلاً کوئی چیز سرخ ہو تو اُس کا رنگ فرعی سرخ ہے۔ اور سبز ہو تو اُس کا رنگ فرعی یا لون سبز ہے۔ عام اصطلاح میں صرف رنگ فرعی کو رنگ کہتے ہیں —

رنگ کی سیری کا مطلب یہ ہے کہ خالص رنگ میں سفید روشنی کس نسبت سے ملی ہوئی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شعلہ زرد شعلے اور سفید شعلے سے مل کر بنا ہو اور اُس میں زرد رنگ کے مطابق طول موج کی شعاعوں کی تیزی کل شعلہ کی تیزی کا نصف ہو تو شعلے کا رنگ زرد نظر آئے گا۔ مگر وہ خالص زرد نہ ہوگا۔ بلکہ اُس کی سیری ۵۰ فی صدی ہوگی —

رنگ کا تجزیہ اور ترکیب

رنگوں کا تجزیہ مرکب رنگ کو مفرد رنگوں میں تقسیم کرنے کے لیے طیف نما استعمال ہوتا ہے۔ اس آلہ کے اجزا حسب ذیل ہیں :—

۱ - منشور (م)۔ اگر زیادہ تشریح کی ضرورت ہو تو دو یا تین منشور استعمال ہوتے ہیں —
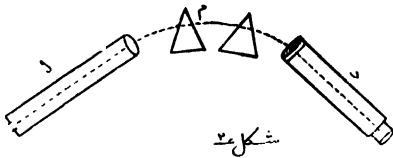
۲ - نلی (الف) جس کے ایک سرے پر باریک شگاف ہے اور دوسرے سرے پر محدب عدسہ۔ شگاف کے سامنے منور جسم رکھا جاتا ہے اور اس کی شعاعیں شگاف میں سے گذر کر آتی ہیں تو عدسہ انہیں متوازی کردیتا ہے۔ یہ متوازی شعاعیں منشور کے ذریعے مختلف رنگوں میں تقسیم ہوتی ہیں —

شکل ۲

۳ - (د) ایک چھوٹی سی دوربین ہے جو طیف کو دیکھنے کےلیے استعمال ہوتی ہے۔ دوربین منشور کے گرد گھوم سکتی ہے۔ اس لیے اُسی کو گھما کر طیف کے ہر حصہ کا معائنہ ہوسکتا ہے —

اگر طیف نما میں سوڈیم کا شعلہ دیکھا جائے تو دو باریک زرد خط

نظر آئیں گے - جو بالکل قریب قریب واقع ہوں گے - یہ خط سوڈیم کے مخصوص خط کہلاتے ہیں - سوڈیم کے شعلے کی شعاعیں منشور میں سے گذر کر پردے پر پڑیں تو صرف ایک خط نظر آتا ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ سوڈیم کے دونو خط پاس پاس ہوتے ہیں منشور میں سے گذرنے پر وہ علحدہ علحدہ نظر نہیں آتے - طیف نما میں الگ الگ نظر آجاتے ہیں —

اگر سوڈیم کی بجاے کسی اور عنصر کے بخارات کو بھڑکا کر طیف نما میں دیکھا جاے تو اس عنصر کے مخصوص روشن خط دکھائی دیں گے - لیکن اگر آفتاب یا برقی لمپ کی روشنی کا مشاہدہ کیا جاے - تو مسلسل طیف نظر آے گا - پھر اگر معمولی لمپ اور آفتاب کی روشنی کا مقابلہ کیا جاے تو معلوم ہو گا کہ آفتاب کی روشنی کا بنفشئی حصہ نہایت تیز روشن ہے اور لیمپ کی روشنی کا سرخ حصہ تیز روشن ہے اور بنفشئی حصہ مدھم - پس ہم طیف نما کے ذریعے نہ صرف یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کسی خاص مبداء نور میں سے کون کون سے طول موج کی امواج خارج ہو رہی ہیں؛ بلکہ یہ بھی معلوم کر لیتے ہیں کہ کن امواج کی تنویر زیادہ ہے اور کن کی کم —

طیف کے رنگوں کی ترکیب اگر طیف کے سامنے ایک محدب عدسہ مناسب فاصلے پر رکھا جاے تو عدسہ تمام رنگوں کی روشنی کو ایک مقام پر جمع کردے گا اور وہاں سات رنگوں کی دھاری کی بجاے سفید لکیر دکھائی دے گی —

طیف کے رنگوں کی ترکیب کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ طیف کو ایک بکس پر ڈالا جاے جس کے چاروں پہلوؤں پر آئینے لگے ہوں - اور پھر بکس کو گھمایا جاے - بکس کو گھمانے سے سب رنگ باری باری آنکھ

کے سامنے آتے جائیں گے۔ اور رویت کے استمرار کی وجہ سے آنکھ پر ان سب کا مجموعی اثر پڑے گا۔ ایسا معلوم ہوگا کہ آئنوں سے سفید روشنی منعکس ہو کر آ رہی ہے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک گول قرص پر نصف قطر کھینچ کر اُسے سات حصوں میں تقسیم کیا جائے اور ان قطعوں پر طیف کے رنگ ترتیب وار لگا کر قرص کو تیزی کے ساتھ گھمایا جائے۔ قرص کا رنگ دھندلا سفید یا مٹیالا سا نظر آئے گا۔

مذکورۂ بالا طریقوں میں طیف کے سب رنگ آپس میں خلط ملط ہوتے ہیں۔ اور ان کے باہم ملنے سے سفید نور یا خاکستری رنگ حاصل ہوتا ہے۔ لیکن رنگوں کی مکمل تحقیقات کے لئے ضروری ہے کہ خاص طول موج کی امواج کو طیف سے الگ کیا جائے اور پھر اُنھیں کسی اور طول موج کی امواج کے ساتھ ملا کر مشاہدہ کیا جائے۔ اس مطلب کے لیے سفید نور کے طیف میں سے خاص رنگوں کی روشنی لیکر انھیں باہم ملاتے ہیں۔ طیف پیدا کرنے کے لیے طیف نما استعمال کرتے ہیں۔ جس میں دوربین کی بجائے ایک عدسہ ہوتا ہے۔ عدسہ کے عمل سے واضح اور مسلسل طیف ط ط مقام پر حاصل ہوتا ہے۔ وہاں ایک پردہ رکھتے ہیں جس میں تین شگاف ہوتے ہیں۔ ان شگافوں کا مقام اور چوڑائی تبدیل کی جاسکتی ہے۔ طیف کے جن حصوں کی روشنی کو باہم ملانا مقصود ہوتا ہے۔ ان کے سامنے شگاف لے آتے ہیں۔ شگافوں کے سامنے عدسے ہوتے ہیں جو شگافوں کی روشنی پردے کے ایک معین مقام
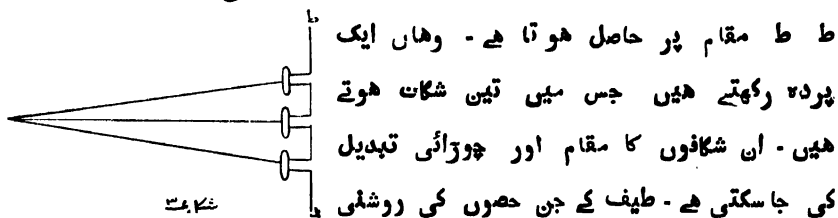
پر جمع کردیتے ہیں - جہاں طیف کے رنگوں کا مجموعی اثر مترتب ہوتا ہے۔
طیف کے رنگوں کی آمیزش سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوے ہیں -

سرخ روشنی + سبز روشنی = زردہ روشنی
سبز روشنی + آسمانی روشنی = طاوسی نیلی روشنی
آسمانی روشنی + سرخ روشنی = قرمزی روشنی

نیز یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ سرخ، سبز اور آسمانی رنگوں کی مناسب آمیزش سے ہر رنگ پیدا ہوسکتا ہے - اسی بنا پر رویت کا سہ رنگی نظریہ قائم ہوا ہے کہ آنکھہ کے شبکیہ میں تین قسم کے رنگ گیرندے ہیں - جن میں سے ایک سرخ رنگ کا احساس کرتا ہے دوسرا سبز رنگ کا اور تیسرا آسمانی رنگ کا - جب ان تینوں گیرندوں کو مناسب تحریک ہوتی ہے تو سفید رنگ کا احساس دماغ کو منتقل ہوتا ہے —

قرص الوان

مختلف رنگوں کی ترکیب کا سادہ طریقہ یہ ہے کہ ایک گول قرص لیں اور رنگوں کو جس نسبت سے ملانا مقصود ہو اسی نسبت سے نصف قطر کھینچ کر قرص کے حصے کر لیں - اور اُن پر رنگ لگا دیں - پھر قرص کو گھمائیں - رویت کے استمرار کی وجہ سے ایک رنگ کا اثر غائب ہونے سے پہلے دوسرے رنگ آنکھہ کے سامنے آتے جائیں گے اس لیے سب رنگوں کے مجموعی اثر کا احساس ہوگا —

اتمامی رنگ

ہر رنگ کی روشنی کے مطابق ایک ایسا رنگ ہوتا ہے - کہ جب دونو کو باہم ملایا جاتا ہے تو اُن کی ترکیب سے سفید روشنی کا احساس پیدا ہوتا ہے - ان رنگوں کو اتمامی یا تکمیلی رنگ کہتے ہیں - طیف کے اکثر حصوں کا اتمامی رنگ بھی طیف کا کوئی اور حصہ ہوتا ہے - جیسا کہ مندرجۂ ذیل جدول سے ظاہر ہے —

رنگ اور طول موج	اتمامی رنگ اور طول موج
سرخ ۶۵۶ء مائکرون	نیل گوں سبز ۴۹۲ء مائکرون
نارنجی ۶۰۸ء مائکرون	نیلا سبز ۴۹۰ء مائکرون
زرد ۵۸۵ء مائکرون	نیلا ۴۸۵ء مائکرون
سبزی مائل زرد ۵۶۴ء مائکرون	بنفشئی ۴۳۲ء مائکرون

مختلف طول موج کے رنگوں کی ترکیب سے وہ رنگ تو پیدا ہوسکتے ہیں جن کا طول موج اُن کے بین بین ہو۔ لیکن سرخ اور بنفشئی رنگ اور رنگوں کی ترکیب سے پیدا نہیں ہوتے۔ اس لیے ان دونوں رنگوں کو اصلی یا اساسی رنگ کہتے ہیں۔ سرخ اور بنفشئی کو ملانے سے قرمزی رنگ حاصل ہوتا ہے۔ اور ان کے ساتھہ سبز رنگ شامل کرنے سے سفید رنگ پیدا ہوتا ہے۔ پس سبز رنگ کا اتمامی رنگ قرمزی ہے —

رنگین شیشوں والے لمپ یا رنگ دار جسم کی جو روشنی آنکھوں میں پہنچتی ہے وہ عام طور پر خالص طیفی رنگوں پر مشتمل نہیں ہوتی۔ یعنی اس میں محدود طول موج کی امواج نہیں ہوتیں۔ بلکہ وہ مختلف امواج کے سلسلوں کی مرکب روشنی ہوتی ہے۔ اس قسم کی روشنی کی طبیعی تعیین کے لیے یہ دیکھتے ہیں کہ مرکب نور میں کون کون سے طول موج کی لہریں موجود ہیں اور ہر طول موج کی لہروں کی تنویر کیا ہے اگر یہ معلوم ہوجاے تو اسی رنگ کی روشنی کا پیدا کرنا کچھہ مشکل نہیں کیونکہ مناسب نسبت سے طیفی رنگوں کو ملانے سے جو روشنی حاصل ہوگی اس کا آنکھہ پر بےعینہ اسی رنگ کی روشنی کا سا اثر ہوگا —

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اگر دو جسموں کی روشنی کا آنکھہ پر بالکل یکساں اثر مترتب ہو تو ضروری نہیں کہ جو ماہیت پہلے جسم کی

روشنی کی ہے وہی دوسرے جسم کی روشنی کی ہو مثلاً طیفی سبز رنگ اور طیفی سرخ رنگ کو باہم ملانے سے ایسا زرد رنگ حاصل ہوتا ہے کہ آنکھ اس رنگ میں اور خالص طیفی زرد رنگ میں مطلق تمیز نہیں کر سکتی۔ اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے تین اساسی رنگوں کی مناسب آمیزش سے تمام رنگ بن سکتے ہیں۔

مثلث الوان

طیف کے مختلف رنگوں کی ترکیب سے جو لا تعداد رنگ حاصل ہوتے ہیں ان کو دکھلانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ شکل نمبر۴ کے مطابق مثلث الوان بنا لیا جائے۔ مثلث متساوی‌الاضلاع ہے۔ تین اساسی رنگ سرخ، سبز اور آسمانی اس کے کونوں پر ہیں۔ اساسی رنگوں کے اتمامی رنگ اضلاع کے وسط میں ہیں۔ اور سفید مرکز میں۔ طیف کے رنگ یعنی سرخ، نارنجی، زرد، زردی مائل سبز اور سبز اوپر کے ایک ضلع پر ہیں اور سبز اور نیلا دوسرے ضلع پر۔ قاعدہ پر سرخ، گلناری، ارغوانی، قرمزی اور نیلگوں بنفشئی رنگ ہیں۔
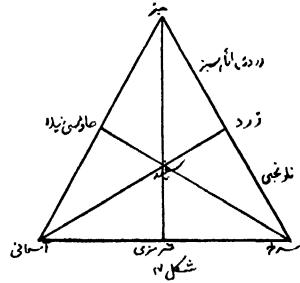
شکل ۴

خالص یا سیر رنگ تو پہلوؤں پر واقع ہیں۔ مدھم رنگ مثلث کے اندر سفید کے ارد گرد ہیں۔ مثلاً اگر ہم سرخ رنگ والے کونے سے مرکز کی طرف جائیں تو سرخ رنگ میں سفیدی ملتی جائے گی اور رنگ کی سرخی گھٹتی جائے گی۔ حتیٰ کہ مرکز پر رنگ سفید ہو جائے گا۔ مرکز سے گزر کر سفید رنگ میں کچھ نیلاپن پیدا ہوگا۔ جس کی سبزی بڑھتی جائے گی۔ پہلو پر پہنچ کر رنگ خالص طاؤسی نیلا ہوگا۔

دو رنگوں کی ترکیب سے جو رنگ حاصل ہوتا ہے وہ ان کے خط

واصل پر واقع ہوتا ہے - اگر دونو رنگوں کی تنویر برابر ہے تو ان کا مرکب رنگ خط واصل کے درمیانی نقطہ پر ہوگا - مثلاً سرخ اور سبز کا مرکب زرد ہے- جو پہلو کے وسط میں ہے - اگر ایک رنگ کی تنویر دوسرے سے زیادہ ہو تو ان کا مرکب خط و اصل کے عین درمیان میں نہ ہوگا- مثلاً اگر ایک رنگ کی تنویر دوسرے سے دگنی ہو تو مرکب رنگ کا مقام خط کو ایک اور دو کی نسبت میں قطع کریگا- زرد رنگ کو نیلے رنگ سے ملا کر سفید رنگ حاصل کرنا ہو تو شکل کے مطابق زرد کی تنویر نیلے رنگ سے دگنی ہونی چاہئیے-

سفید سیاہ اور خاکستری رنگ | سوال پیدا ہوتا ہے کہ سفید رنگ سے صحیح مراد کیا ہے- یعنی روشنی کا وہ کونسا معیار ہے جس پر ہم سفید روشنی کا اطلاق کر سکیں- آفتاب کی روشنی کو طیف نما میں دیکھیں تو صبح کے وقت مختلف رنگوں کی تنویر کچھ ہوگی- دوپہر کو کچھ اور شام کو کچھ اور- اسی طرح اگر کرۂ ہوائی میں گرد و غبار ہو تو تنویر میں فرق پڑ جاے گا- اس سے ظاہر ہے کہ اگر کسی خاص وقت اور خاص حالات میں آفتاب کی روشنی کو سفید روشنی کا معیار قرار دیا جاے تو حالات کے تبدیل ہونے سے رنگوں کی تنویر بدل جاے گی- اور روشنی سفید نہ رہے گی بلکہ اُس میں بعض رنگ اصلی معیار کے مقابلے میں زیادہ شوخ ہوں گے —

سفید روشنی کا اطلاق عام طور پر اس روشنی پر کیا جاتا ہے جو آفتاب سے دوپہر کے وقت مطلع صاف ہونے کی صورت میں آتی ہے- مصنوعی لیمپ جنھیں ہم سفید کے نام سے موسوم کرتے ہیں فی الواقع سفید نہیں ہوتے - ان میں نیلے رنگ کی کمی ہوتی ہے —

ہماری حس باصرہ اصلی سفید روشنی کی شناخت نہیں کرسکتی۔ اس کا تو یہ حال کہ دو اتمامی رنگوں کی مرکب روشنی اور طیف کے ساتوں رنگوں کی مرکب روشنی میں تمیز نہیں کرسکتی۔ حالانکہ دونو کے اجزاے ترکیبی میں زمین و آسمان کا فرق ہے —

اگر کوئی جسم سفید روشنی کا کچھہ حصہ جذب کر لے اور جذب انتخابی نہ ہو یعنی سب رنگوں کی روشنی کا تناسب قائم رہے تو جسم کا رنگ خاکستری نظر آے گا۔ اگر تمام روشنی جذب ہو جاے تو جسم کا رنگ سیاہ ہوگا —

رنگوں کی تقسیم و ترتیب

رنگوں کی کئی طرح سے تقسیم و ترتیب ہوسکتی ہے۔ اوستوالد (Ostwald) کی تقسیم نہایت سادہ ہے - اس تقسیم میں سفید اور سیاہ رنگوں کا نام مدھم رکھا گیا ہے۔ اور طیف کے سات رنگوں کا نام شوخ رنگ - مدھم رنگوں کے سلسلہ میں بھی شوخ رنگوں کی طرح تمام مدارج ہوسکتے ہیں۔ سیاہ اس سلسے کے ایک سرے پر ہوگا اور سفید دوسرے سرے پر۔ مختلف خاکستری رنگ درمیان میں واقع ہونگے۔ ایک خاکستری رنگ کا دوسرے خاکستری رنگ سے اختلاف اس طرح ہوسکتا ہے کہ دونو میں سفیدی اور سیاہی کی نسبت مختلف ہوگی - اگر دو خاکستری رنگوں کو ملایا جاے تو تیسرا خاکستری رنگ حاصل ہوگا جو ایک سے زیادہ روشن ہوگا اور دوسرے سے کم روشن۔ خاکستری سلسلہ کے تمام رنگوں کی تمیز ان کی ضو سے ہو سکتی ہے۔ یعنی اگر یہ معلوم ہوجاے کہ کتنے فی صدی روشنی منعکس ہوئی ہے تو ہمیں رنگ کا درجہ معلوم ہو جاے گا۔ مثلاً خاکستری رنگ نمبر ۹۵ وہ رنگ ہوگا جس سے واضح روشنی کا ۹۵ فی صدی حصہ منعکس ہوجاے۔ ایسا رنگ

سفید نظر آتا ہے اور خالص جست کے زنگ سے ملتا ہے - خاکستری نمبر ۸۰ خالص چاک کا رنگ ہوتا ہے - جو خاکستری رنگ ۴ فی صدی سے کم روشنی منعکس کریں انہیں سیاہ کہہ سکتے ہیں اور جن سے ۸۰ فی صدی سے زیادہ روشنی منعکس ہو ان پر سفید کا اطلاق ہوسکتا ہے —

طیف کے رنگ اور (خاکستری اور سفید کے علاوہ) اور سب رنگ جو ان کو ملا کر پیدا ہوتے ہیں شوخ رنگ کہلاتے ہیں - رنگوں کا یہ سلسلہ نہایت وسیع ہے - پہلے تو ہم طیف کے مختلف رنگوں کو باہم ملاکر بہت سے رنگ پیدا کر سکتے ہیں - پھر ایک رنگ لے کر کسی سفید یا خاکستری یا سیاہ رنگ کے ساتھ اس کو ترکیب دے سکتے ہیں - اور پھر جب ایک شوخ اور ایک مدھم رنگ انتخاب کرایں تو ان کو جس نسبت سے چاہیں ملا سکتے ہیں - اس لئے شوخ رنگوں کی ترتیب اور شناخت اس قدر آسان نہیں جیسی کہ مدھم رنگوں کی —

ہمیں طیف کے معائنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سرے پر سرخ رنگ ہے - وہاں سے شروع ہوکر رنگ کی سرخی بدلتی جاتی ہے - حتیٰ کہ وہ نارنجی ہوجاتا ہے - اس سے آگے نارنجی بتدریج زرد ہوتا ہے - اسی طرح بدلتے بدلتے بنفشئی رنگ ہو جا تا ہے - لیکن ہم نے کبھی غور نہیں کیا کہ بنفشئی کو بتدریج تبدیل کرنے سے سرخ رنگ بن سکتا ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ طیف کو خط مستقیم میں پھیلانے کی بجائے دائرے کی شکل میں پھیلا سکتے ہیں - اس دائرے پر کہیں
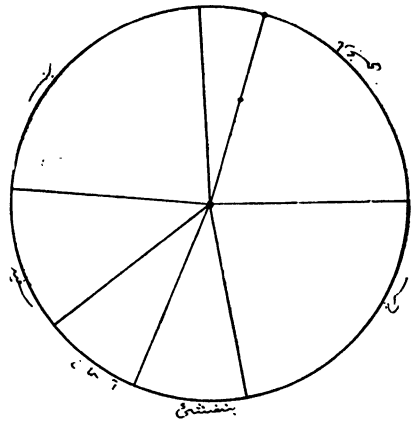
شکل نمبر ۵

سے روانہ ہوں مختلف رنگوں میں سے ہوتے ہوئے پھر وہیں پہنچ جائیں گے -

اور تمام سفر میں رنگوں کی تبدیلی بتدریج ہوگی-پروفیسر اوستوالد زرد رنگ کے عین وسط میں سے جہاں نارنجی اور سبز کا نشان تک نہیں ہوتا دائرہ شروع کرتے ہیں - اور اس سمت میں روانہ ہوتے ہیں - جس میں وہ پہلے سبز رنگ میں داخل ہوتے ہیں - اور وہاں سے نیلے بنفشئی سرخ اور نارنجی میں ہوتے ہوے پھر زرد رنگ میں آجاتے ہیں —

اوستوالد کا دائرہ ۱۰۰ برابر حصوں میں منقسم ہوتا ہے - اور ہر حصے میں طول موج کا اختلاف برابر ہوتا ہے - اس میں انتہائی رنگ ایک دوسرے کے مقابل واقع ہوتے ہیں - اگر زرد اور نیلے انتہائی رنگوں میں سے گذرتا ہوا قطر کھینچ دیا جاے تو ایک نصف دائرے میں زرد ، نارنجی ، سرخ ، بنفشئی اور آسمانی رنگ ہوں گے اور دوسرے نصف دائرے میں آسمانی ، نیلا اور سبز - مزید براں ہر ایک نصف دائرے کے رنگوں کی ترتیب ایسی ہے کہ ہر دو رنگوں کو ملا کر ان کا درمیانی رنگ بن جاتا ہے —

دائرے کے ۱۰۰ حصوں میں سے ہر حصے کا رنگ الگ قرار دیا جاسکتا ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ حصے کے اندر رنگ کا اختلاف اس قدر کم ہوتا ہے کہ نظر سے بالکل معلوم نہیں ہوسکتا - رنگوں کو صفر سے ۹۹ تک اعداد سے تعبیر کیا جاتا ہے - صفر رنگ گندھک کا سا زرد ہے - صفر سے ۲۴ تک زرد سے شنگرفی سرخ تک تمام رنگ ہیں - شنگرفی سرخ سے آسمانی تک رنگ ۲۵ سے ۴۹ تک ہیں - ۵۰ سے ۷۴ تک آسمانی سے شروع ہوکر نیلگوں سبز میں ختم ہوتے ہیں اور ۷۵ سے ۹۹ تک نیلگوں سبز سے گندھکی زرد تک —

جب سفید مدھم رنگ کو کسی شوخ رنگ کے ساتھ ملایا جاتا ہے تو

روشن شوخ رنگ حاصل ہوتا ہے - دائرہ کے سو رنگوں میں سے ہر ایک رنگ اس طرح سے شوخ رنگ میں تبدیل ہو سکتا ہے - مثلاً نمبر ۲۱ رنگ سرخ ہوتا ہے اس لیے ۲۱ سے مراد خالص سرخ رنگ ہوگا - لیکن ۲۱ ء ۷۵ سے مراد وہی سرخ رنگ ہوگا جس میں ۷۵ فی صدی اصلی رنگ ہو اور ۲۵ فی صدی سفید رنگ —

اسی طرح جب خالص رنگ کو سیاہ رنگ کے ساتھہ ملاتے ہیں تو تاریک شوخ رنگ بن جاتا ہے - اس سلسلہ میں ۲۱ ء ۷۵ سے یہ مراد ہوگی کہ ۷۵ فی صدی رنگ سرخ ہے اور ۲۵ فی صدی سیاہ - رنگ کے بیان کرنے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ رنگ روشن شوخ ہے یا تاریک شوخ - ۲۱ ء ۷۵ سے یہ بات معلوم نہیں ہوتی —

جس شوخ رنگ میں سفید اور سیاہ دونو رنگ ملے ہوں اسے مٹیالا رنگ کہتے ہیں - ایسے رنگ کے بیان کرنے میں تینوں رنگوں کی فی صدی نسبت دینی چاہئیے - اگر دو رنگوں کا فی صدی تناسب معلوم ہو تو تیسرے کا خود بخود نکل آتا ہے - مثلاً ۲۱ ء ۲۲ - ۴۰ سے مٹیالا سرخ رنگ مراد ہے - ۲۱ سے معلوم ہوا کہ رنگ سرخ ہے - ۲۲ کا مطلب یہ ہے کہ ۲۲ فی صدی خالص رنگ ہے - اور ۴۰ سے مراد یہ ہے کہ ۴۰ فی صدی سفید رنگ اس میں ملا ہوا ہے - ظاہر ہے کہ باقی ۳۶ فی صدی سیاہ رنگ ہوگا —

کسی خاص رنگ کی ترکیب معلوم کرنی ہو تو اوسٹوالڈ کے دائرۂ الوان کے رنگوں کو ملانے کا کوئی مناظری آلہ ہونا چاہئیے - قرص الوان اس مقصد کے لیے موزوں ہے - پہلے قرص الوان پر مختلف رنگ لگاکر اسے گھمائیں تو رنگ کی اصلیت معلوم ہو جائے گی - پھر اس میں سفید اور سیاہ کی

مختلف مقادیر ملا کر اسے دیے ہوے رنگ کے مطابق کرلینا چاہئیے —

یہ تو ایک رنگ ہوگیا - بہت سے ایسے رنگ بھی بن سکتے ہیں جن میں دو رنگوں کی جھلک ہو - اندازہ کیا گیا ہے کہ اس طرح سے ۴۵ لاکھ مختلف رنگ بن سکتے ہیں - مگر ہماری ضروریات کے لیے ۵۰۰ سے ۲۰۰۰ تک رنگ کافی ہیں - کیوں کہ جتنے رنگ زیادہ ہوں گے اُتنا ہی ایک دوسرے میں اختلاف کم ہوگا —

چونکہ رنگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اس لیے اوستوالڈ کی تقسیم و ترتیب رنگوں کی شناخت کے لیے نہایت ضروری اور مفید ہے —

اجسام کے رنگ

جب کسی جسم پر نور کی شعاعیں پڑتی ہیں تو اُن کے کچھہ اجزا جسم میں جذب ہو جاتے ہیں کچھہ جسم سے منعکس ہوتے ہیں اور کچھہ اُس میں سے گذر کر پار نکل جاتے ہیں - اس اعتبار سے مادی اجسام دو قسم کے ہوتے ہیں - ایک وہ ہیں جو نور کی شعاعوں کے لیے شفاف ہیں - ان اجسام میں جذب سے بچی ہوئی روشنی جسم میں سے پار نکل جاتی ہے - دوسری قسم میں غیر شفاف اجسام شامل ہیں - جو جذب سے بچی ہوئی روشنی کو منعکس کر دیتے ہیں —

سفید روشنی مرئی طیف کی مختلف امواج پر مشتمل ہوتی ہے - اگر اس روشنی میں کوئی جسم مثلاً سرخ کپڑا رکھہ دیا جاے تو وہ سرخ اس لیے نظر آتا ہے کہ طیف کے سرخ حصہ کے سواے اور سب رنگوں کی روشنی جذب کرلیتا ہے - اور سرخ روشنی اُس سے منعکس ہوجاتی ہے - جو جسم طیف کے تمام رنگوں کی روشنی برابر مقدار میں منعکس کردیتا ہے وہ سفید دکھائی دیتا ہے - سفید کاغذ اسی سبب سے سفید نظر آتا

ہے۔ جس جسم میں تمام رنگوں کی روشنی جذب ہو جاتی ہے وہ سیاہ نظر آتا ہے —

اگر ایک کاغذ پر سرخ رنگ لگا لیا جاے۔ اور پردہ پر طیف پیدا کرکے سرخ کاغذ اُس کے مختلف حصوں میں رکھا جاے تو وہ طیف کے سرخ حصہ میں سرخ دکھائی دےگا اور اُس کے سواے طیف کے باقی تمام رنگوں کی شعاعوں میں سیاہ نظر آے گا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سرخ کاغذ سرخ شعاعوں کے سواے اور سب شعاعوں کو جذب کرلیتا ہے —

عام طور پر رنگ دار جسم صرف ایک ہی رنگ کی روشنی منعکس نہیں کرتا۔ بلکہ منعکس شدہ روشنی میں اور رنگوں کی امواج بھی کم و بیش ملی ہوتی ہیں۔ مثلاً معمولی نیلی چیز نہ صرف نیلے رنگ کی شعاعیں منعکس کرتی ہے، بلکہ سبز، آسمانی اور بنفشئی شعاعیں بھی قلیل مقدار میں اُس سے منعکس ہوتی ہیں۔ اسی طرح زرد جسم کی منعکس شدہ شعاعوں میں سبز، نارنجی، اور سرخ رنگ بھی قلیل مقدار میں ملے ہوتے ہیں —

اکثر اجسام کی بیرونی سطح سے سفید نور کا کچھ حصہ تبدیل ہوے بغیر منعکس ہو جاتا ہے۔ لیکن زیادہ حصہ تھوڑی دور تک اندر چلا جاتا ہے۔ وہاں اندرونی انعکاس و انعطاف کی وجہ سے کئی رنگوں کی شعاعیں جذب ہو جاتی ہیں۔ اور بعض رنگوں کی روشنی منعکس ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اُن اجسام کے رنگ خالص رنگ نہیں ہوتے۔ بلکہ اُن میں سفید روشنی کی ملاوٹ ہوتی ہے —

اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ جسم کی سطح سے سفید روشنی کا انعکاس ہوتا ہے ایک رنگ دار شیشے کا ٹکڑا لے کر اُس کے ریزے

ریزے کر دیں - ریزے سفید نظر آئیں گے - وجہ یہ ہے کہ ریزے کرنے سے بہت سی نئی سطح پیدا ہو جاتی ہے - اور روشنی کا اتنا زیادہ حصہ ریزوں کی سطح سے منعکس ہو جاتا ہے کہ بہت کم روشنی کو اندر داخل ہونے کا موقعہ ملتا ہے - اس لیے انتخابی جذب کی نوبت نہیں پہنچتی - اب اگر ریزوں میں پانی یا تیل ملا دیا جاے - تو سطح انعکاس میں کمی واقع ہوجاتی ہے اور رنگ پھر نمایاں ہوجاتا ہے —

رنگ دار مائع کی سطح پر جو سفید جھاگ ہوتے ہیں وہ بھی سطحی انعکاس کی وجہ سے ظہور میں آتے ہیں - مائع جس کے جھاگ بنتے ہیں بذات خود رنگ دار ہوتا ہے - لیکن جھاگ کے بلبلوں کی سطح اتنی وسیع ہوتی ہے کہ روشنی کو اُن میں داخل ہونا نصیب نہیں ہوتا - اس لیے جھاگ کا رنگ سطحی انعکاس کی وجہ سے سفید نظر آتا ہے —

شفاف اجسام کا رنگ

شفاف اجسام کا رنگ سفید نور کے اُن اجزا پر منحصر ہوتا ہے جو جذب سے بچ کر پار نکل جاتے ہیں - مثلاً نیلے شیشے کا رنگ اس لیے نیلا ہوتا ہے کہ نیلے رنگ کی شعاعیں اُس میں سے گذر جاتی ہیں - اور باقی تمام رنگوں کی شعاعیں جذب ہو جاتی ہیں —

اگر کسی پردے پر طیف پیدا کر کے اُس کے راستے میں نیلا شیشہ رکھہ دیا جاے تو نیلے حصے کے سواے طیف کے اور سب رنگ غائب ہو جائیں گے - اس سے ظاہر ہے کہ شیشے میں سے صرف نیلی شعاعیں گذر کر پردہ پر پڑ رہی ہیں - باقی رنگوں کی شعاعیں اُس میں جذب ہو رہی ہیں - عام طور پر نیلے رنگ کے ساتھہ ایک دو اور رنگوں کی شعاعیں بھی قلیل مقدار میں شیشے سے پار نکل جاتی ہیں - سفید شیشے اور پانی میں سے تمام

رنگوں کی شعاعیں گذر جاتی ھیں - اس لیے وہ سفید نظر آتے ھیں —

اگر شفاف جسم کی موٹائی کم ھو تو اُس میں سے گذرنے والی شعاعوں کا رنگ خالص نہیں ھوتا - لیکن جوں جوں موٹائی بڑھتی ھے رنگ زیادہ خالص ھوتا جاتا ھے - چونکہ رنگ دار شفاف جسم میں سے خاص رنگ کی روشنی گذر سکتی ھے اس لیے وہ اُس روشنی کو الگ کرنے کے لیے استعمال ھو سکتا ھے - جب وہ جسم روشنی کے انتخاب کے لیے استعمال ھوتا ھے تو اُسے رنگ بین (لونی فلٹر) کہتے ھیں —

بعض چیزوں کی خاصیت ھے کہ اُن کی موٹائی کم ھو تو ایک رنگ کی روشنی اُن میں سے گذرتی ھے - لیکن اگر موٹائی بڑھ جاے تو پار گذرنے والی روشنی کا رنگ بدل جاتا ھے - اس مظہر کو اختلاف لون کہتے ھیں - مثلاً اگر کوبلت کی تختی باریک ھو تو اُس میں سے نیلی روشنی گذرتی ھے - لیکن اگر تختی موٹی ھو تو اُس میں سے سرخ روشنی پار نکلتی ھے- اس کی وجہ یہ ھے کہ کوبلت سرخ شعاعوں کو جذب نہیں کرتا نیلی شعاعوں کو کم جذب کرتا ھے - اور ان کے علاوہ اور سب رنگوں کی شعاعوں کو بالکل جذب کر لیتا ھے - اب اگر کوبلت کی باریک تختی ھو تو اُس میں سے سرخ روشنی گذرے گی اور اُس کے ساتھ نیلی روشنی کی کافی مقدار بھی گذر جاے گی - لیکن سرخ روشنی کی تنویر نیلی روشنی کے مقابلے میں بہت کم ھوتی ھے - اس لیے روشنی کا رنگ نیلا نظر آے گا - تختی موٹی ھو تو نیلی شعاعیں بھی اُس میں جذب ھوکر رہ جائیں گی - اس لیے صرف سرخ روشنی خارج ھوگی - بہت سے رنگ دار مادوں میں یہ خاصیت پائی جاتی ھے —

گو اکثر اجسام کے رنگ جذب نور کی وجہ سے ظہور میں آتے ھیں-

لیکن بعض چیزوں کا سطحی رنگ بھی ہوتا ہے - مثلاً سونے کا زرد رنگ سطحی ہوتا ہے - اگر سونے کا ورق لیکر دو شیشے کی تختیوں کے درمیان رکھا جائے اور اُس میں سے سفید روشنی کا معائنہ کیا جائے تو ورق سبز نظر آئے گا - جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سونے کا اصلی رنگ سبز ہے - یعنی سبز کے سوائے اور سب رنگوں کی روشنی اُس میں جذب ہوجاتی ہے - زرد رنگ سطح سے انعکاس کی وجہ سے نظر آتا ہے —

آسمان کا نیلا رنگ | آسمان کا نیلا رنگ نظر آنے کی وجہ یہ ہے کہ ہوا میں چھوٹے چھوٹے خاکی ذرات ہوتے ہیں جو آفتاب کی روشنی کو چاروں طرف بکھیر دیتے ہیں - نیلے رنگ کا طول موج کم ہوتا ہے - اس لیے ذرات کا اثر نیلے رنگ پر زیادہ ہوتا ہے - سرخ رنگ پر طول موج کے زیادہ ہونے کی وجہ سے ذرات کا عمل کم ہوتا ہے - پس ذرات سے منتشر ہوکر جو روشنی ہماری طرف آتی ہے وہ نیلی ہوتی ہے —

ظاہر ہے کہ انتشار سے بچ کر جو روشنی سیدھی گذر جائے گی وہ مقابلتاً سرخ ہوگی - اس میں نیلی اور دیگر چھوٹی امواج کی شعاعوں کی کمی ہوگی - یہی وجہ ہے کہ شام کو سورج کا رنگ سرخ نظر آتا ہے - سورج کی نیلی شعاعیں ادھر اُدھر بکھر جاتی ہیں - اور سرخ رنگ کی شعاعیں کرۂ ہوائی میں سے گذر آتی ہیں —

رنگوں کے آمیزے

اگر ہم ایک امتحانی نلی میں قرمزی رنگ دوسری میں زرد اور تیسری میں نیلا رنگ حل کرلیں اور پھر ایک اور نلی لے کر اُس میں قرمزی رنگ کو نیلے رنگ کے ساتھ ملائیں تو سرخ رنگ حاصل ہوگا - زرد کو نیلے رنگ کے ساتھ ملانے سے سبز رنگ بنے گا اور نیلے کو سرخ

کے ساتھہ ملانے سے ارغوانی رنگ - زرد اور نیلے رنگوں کو ملانے سے سبز رنگ بن گیا - لیکن ہمیں معلوم ہے کہ زرد اور نیلے طیفی رنگوں کا مرکب سفید ہوتا ہے - تو یہ اختلاف کیسے پیدا ہوا ؟

اختلاف کا سبب یہ ہے کہ طیفی رنگوں کی ترکیب سے جو رنگ پیدا ہوتے ہیں وہ اُن رنگوں کے مجموعی اثر سے مترتب ہوتے ہیں - لیکن رنگ دار مادہ کا رنگ وہ ہوتا ہے جو جذب ہونے سے بچ گیا ہو - مثلاً زرد مادہ اس لیے زرد نظر آتا ہے کہ سفید روشنی میں سے نیلے اور بنفشئی رنگوں کی شعاعیں جذب کرلیتا ہے - اور زرد روشنی منعکس کرتا ہے - لیکن کوئی زرد چیز ایسی نہیں جو صرف زرد روشنی کو منعکس کرے - بلکہ اُس کے ساتھہ سرخ اور سبز روشنی بھی منعکس ہوتی ہے - زرد رنگ کی تیزی کی وجہ سے سرخ اور سبز رنگ ماند پڑ جاتے ہیں - اس لیے مادے کا رنگ زرد نظر آتا ہے - اسی طرح نیلا رنگ دار مادہ اس لیے نیلا نظر آتا ہے کہ سرخ اور زرد رنگ جذب کرلیتا ہے - اور سبز رنگ کے ساتھہ ملی ہوئی نیلی روشنی منعکس کردیتا ہے - اب اگر زرد اور نیلے رنگوں کا آمیزہ تیار کیا جائے تو زرد رنگ نیلی شعاعیں بالکل جذب کرلے گا اور نیلا رنگ زرد روشنی جذب کرے گا - پس دونوں رنگوں کے متحدہ عمل سے سبز رنگ کے سوائے اور سب رنگوں کی شعاعیں جذب ہوجائیں گی - اس لیے آمیزہ کا رنگ سبز ہوگا - حقیقت میں سبز رنگ نیلے اور زرد رنگ کا مرکب نہیں ہے - بلکہ وہ رنگ ہے جو نیلے اور زرد رنگدار مادوں کے جذب سے بچ جاتا ہے —

رنگدار فلٹر

رنگدار مادوں کی ترکیب سے جو مختلف رنگ پیدا ہوتے ہیں اُن کے مطالعہ کے لیے رنگدار فلٹر ملتے ہیں - تین فلٹر اس طرح بنے ہوتے ہیں کہ پہلے فلٹر میں مسلسل طیف کا ایک طرف کا تہائی

حصہ ہوتا ہے، دوسرے میں بیچ کا تہائی حصہ، اور تیسرے میں دوسری طرف کا تہائی حصہ - پہلا سرخ نظر آتا ہے - دوسرا سبز اور تیسرا نیلا - تین اور رنگدار فلٹروں پر ان تینوں رنگوں کے اتمامی رنگ ہوتے ہیں - گویا ان میں سے ہر ایک طیف کا دو تہائی حصہ ہوتا ہے - سرخ کے اتمامی فلٹر کا رنگ طاوسی نیلا ہوتا ہے - سبز کے اتمامی فلٹر کا قرمزی اور نیلے کے اتمامی فلٹر کا زرد —

اب اگر نیلے اور زرد فلٹروں کو جوڑ دیا جاے تو اُن میں طیف کا مشترک حصہ سبز رنگ ہو گا - پس اُن کو باہم ملانے سے وہی رنگ حاصل ہو گا جو زرد اور نیلے رنگوں کی آمیزش سے حاصل ہوتا - اگر تیسرا اتمامی فلٹر بھی شامل کیا جاے - تو سب رنگ جذب ہو جائیں گے - یعنی رنگ سیاہ ہو جاے گا - مختلف فلٹروں کو باہم ملا کر یہ تحقیق ہوسکتا ہے کہ مختلف رنگوں کے آمیزوں کے رنگ کیا کیا ہوں گے —

[رنگدار مادوں کی آمیزش سے جو رنگ پیدا ہوتے ہیں وہ شکل ۹ (ج) سے ظاہر ہیں] —

رنگ پر تنویر کا اثر

اگر آنکھ کے چاروں طرف کسی خاص رنگ کی روشنی پڑ رہی ہو تو وہ اسی کے زیر اثر ہو جاتی ہے - یہی وجہ ہے کہ دن کی روشنی میں جو اختلاف پیدا ہوتے رہتے ہیں وہ عموماً نظر انداز ہو جاتے ہیں - بلکہ اگر ہم دن کی روشنی سے مصنوعی روشنی میں جائیں تو خاص فرق محسوس نہیں کرتے - البتہ اگر دونوں کا تقابل ہو جاے تو فرق نمایاں ہو جاتا ہے —

مختلف لمپوں کی روشنی میں اختلاف اسی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ تپش (ٹمپریچر) کی کمی بیشی سے مختلف طول موج کی شعاعوں کی طاقت

تنویر میں فرق ہو جاتا ہے - ہر مبداء نور کا رنگ اُس کی تپش پر منحصر ہوتا ہے - معمولی لمپ جن کی تپش کم ہوتی ہے زردی سائل سرخ ہوتے ہیں - اس سے زیادہ گرم کاربن کے برقی لمپ ہوتے ہیں - جن کا رنگ زرد ہوتا ہے - دھات کے سوت والے تیز روشن برقی لمپ جو آج کل عام طور پر استعمال ہوتے ہیں مقابلتاً سفید ہوتے ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زیادہ گرم ہوتے ہیں - اور ان میں نیلی اور بنفشئی شعاعیں بھی پیدا ہوتی ہیں - برقی قوس اور بھی گرم ہوتی ہے اور اس کا رنگ دیگر لمپوں کے مقابلے میں زیادہ سفید ہوتا ہے - اور زیادہ سفید لمپ گیس کے لمپ ہیں - جن میں حباب [Mantle] استعمال ہوتے ہیں - حباب کی ترکیب

شکل نمبر ۹ کا بلاک وقت پر تیار نہ ہوسکا اور رسالہ کے شایع ہونے میں دیر ہوتی تھی لہذا یہ شکل بلاک بن کر آنے کے بعد جنوری سنہ ۳۴ ع کے رسالے کے ساتھہ شایع کردی جائے گی —

رکھہ دیں گے ، کاغذ کا رنگ بھی وہی ہو جاے گا - مثلاً نیلی روشنی میں وہ نیلا نظر آے گا - اور سرخ روشنی میں سرخ - اس کا سبب یہ ہے کہ سفید کاغذ ہر رنگ کی روشنی منعکس کردیتا ہے - اگر سفید کاغذ کی بجاے سرخ کپڑا نیلی روشنی میں رکھا جاے تو سیاہ نظر آے گا - سرخ روشنی میں وہ تیز سرخ ہوگا اور زرد روشنی میں نیم زرد - نیلا سادہ سرخ نارنجی یا زرد روشنی میں سیاہ نظر آتا ہے - اور سبز روشنی میں

سبزی مائل - اس کی وجہ یہ ہے کہ نیلے مادہ میں سبز رنگ کلی طور پر جذب نہیں ہوتا ـــ

اگر رنگدار کپڑوں کا مشاہدہ لمپ کی روشنی میں کیا جاے تو ان کے رنگ وہی نظر نہیں آتے جو آفتاب کی روشنی میں نظر آتے ہیں - خاص طور پر نیلے کپڑوں کے رنگ میں نمایاں تبدیلی پائی جاتی ہے - مثلاً جو کپڑا دن کو نیلا نظر آتا ہے وہ معمولی لمپ کی روشنی میں تقریباً سیاہ نظر آے گا - سبب یہ ہے کہ وہ نیلے رنگ کے سواے اور رنگ جذب کر لیتا ہے - اور لمپ کی روشنی میں نیلا رنگ تقریباً مفقود ہوتا ہے ـــ

رنگ کی تبدیلی اُن کپڑوں میں اور بھی نمایاں ہوتی ہے جن سے کئی رنگوں کی روشنی منعکس ہوتی ہے - بعض کپڑے جو دن کی روشنی میں سبز یا نیلے نظر آتے ہیں لمپ کی روشنی میں بھورے یا سرخ دکھائی دیتے ہیں ـــ

روز نما لمپ

چونکہ مصنوعی سفید روشنی میں کپڑوں کے رنگ دن کی روشنی سے مختلف نظر آتے ہیں اور رنگوں کی شناخت نہیں ہوسکتی اس لیے بزازوں کو خاص ساخت کے لمپوں کی ضرورت پڑتی ہے - جن میں کپڑوں کے رنگ وہی نظر آئیں جو دن کی روشنی میں نظر آتے ہیں - ان لمپوں کو روزنما لمپ کہتے ہیں - ایک قسم کے 'روز نما' میں ایک معمولی برقی لمپ 'ل' ہے جس کے ایک طرف مجلا عکس انداز 'ع' ہے - جو لمپ کی روشنی منعکس کر کے رنگین عکس انداز ر ر پر ڈالتا ہے - رنگین
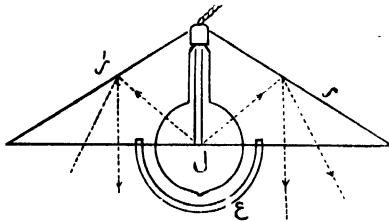
شکل ۷

عکس انداز پر مختلف رنگوں کے قطعے لگے ہوتے ہیں جن میں سبز اور نیلے رنگوں

کے قطعے زیادہ ہوتے ہیں - پس لیمپ کی روشنی کے سبز اور نیلے رنگ کے اجزا کا انعکاس نسبتاً زیادہ ہوتا ہے - اور رنگدار عکس انداز سے جو روشنی منعکس ہوکر آتی ہے وہ دن کی روشنی کے مشابہ ہوتی ہے —

رنگ کی رویت

رنگ ایک احساس ہے جو خاص طول موج کی شعاعوں کے شبکیہ یا آنکھ کے پردۂ اول پر عمل کرنے سے پیدا ہوتا ہے - یہ احساس دو باتوں پر منحصر ہوتا ہے - ایک تو نور کی طبیعی تحریک پر اور دوسرے اس امر پر کہ شبکیہ کے کس حصے پر عمل ہوا ہے - شبکیہ کا وسطی حصہ جو اور سب حصوں سے زیادہ حساس ہے زرد داغ کہلاتا ہے - اگر روشنی اس حصے پر پڑے تو یہ حصہ ۲۰۰ سے زیادہ رنگوں میں تمیز کرسکتا ہے - اس سے باہر درمیانی طبقہ میں صرف ان رنگوں کی تمیز ہوتی ہے جن کا طول موج زرد اور نیلے رنگوں کے آس پاس ہوتا ہے - اگر روشنی تیز ہو تو شبکیہ کے کناروں تک رنگ کا احساس ہوتا ہے —

سوال پیدا ہوتا ہے کہ رنگوں کا اختلاف ہم کیونکر محسوس کرتے ہیں - ممکن ہے کہ جب اثیر کے ارتعاشات کا سلسلہ شبکیہ کے ساتھ ٹکراتا ہو تو ان کے ہم آہنگ ارتعاشات نسوں کے سروں پر پیدا ہو جاتے ہوں - اور وہ دماغ کو منتقل ہوتے ہوں - اس صورت میں تسلیم کرنا پڑے گا کہ جب بہت سی مختلف امواج عمل کرتی ہیں تو ان کا متفقہ اثر دماغ کو منتقل ہوتا ہے یعنی یہ ارتعاشات باہم مل کر ایک اور ارتعاش پیدا کرتی ہیں - یا ممکن ہے کہ مختلف طول کی امواج حساس پردے پر پڑ کر اس کی کیمیائی تبدیلی کو تیز یا مدھم کردیتی ہوں - اور کیمیائی تبدیلی کا فرق حساس نسوں میں تبدیلی پیدا کرتا ہو - جس سے احساس کا

اختلاف پیدا ہوتا ہو —

رنگ کی بصارت کے متعلق نظریوں کا موازنہ کرنے کے لیے رنگ کے متعلق تمام محقق امور کو پیش نظر رکھنا چاہئے - مندرجۂ ذیل امور تحقیق ہو چکے ہیں —

۱ - سرخ ' زرد ' سبز اور نیلے رنگوں کا الگ الگ اثر ہوتا ہے - نیز سفید رنگ کا اثر ان سب رنگوں سے مختلف ہوتا ہے —

۲ - ۲۰۰ کے قریب فرعی رنگ ہیں جن میں آنکھ تمیز کرسکتی ہے —

۳ - مختلف رنگوں کی رویت اور تنویر امواج کے طول پر منحصر ہوتی ہے —

۴ - طیف کے تین رنگوں یعنی سرخ ' سبز اور آسمانی سے تمام فرعی رنگ پیدا ہوسکتے ہیں —

۵ - آنکھ کے شبکیہ کی ساخت اور اس پر روشنی کا عمل ہمیں بخوبی معلوم ہے —

۶ - جس چیز کا عکس پردۂ شبکیہ پر پڑتا ہے وہ چیز کے غائب ہونے کے بعد بھی ذرا سی دیر تک قائم رہتا ہے —

۷ - جب آنکھ پر ایک رنگ کی روشنی کا عمل کچھ دیر تک جاری رہے تو وہ اس رنگ سے اُکتا یا تھک جاتی ہے —

اب میں رنگ کے احساس کے متعلق دو نظریے بیان کروں گا - اور ان پر مختصر بحث کروں گا —

ہیلم ہولٹس [Helmholtz] کا نظریہ

اس نظریہ کی بنا سہ رنگی بصارت پر ہے - اس کا دعوی یہ ہے کہ شبکیہ میں تین قسم کے عصبی نظام ہیں - ان تینوں میں سے ایک نظام کی تحریک سے خالص سرخ

رنگ کا احساس پیدا ہوتا ہے - دوسرے نظام کی تحریک سے خالص سبز کا اور تیسرے کی تحریک سے آسمانی کا - ہر طول موج کی روشنی تینوں اعصاب میں تحریک پیدا کرتی ہے - لیکن رنگدار روشنی سے سب اعصاب کی تحریک برابر نہیں ہوتی —

لمبی امواج سے سرخ عصبی نظام کی تحریک خوب ہوتی ہے - لیکن سبز اور آسمانی اعصاب کی تحریک کم ہوتی ہے - درمیانی امواج سے سبز عصبی نظام کی تحریک زیادہ ہوتی ہے اور چھوتی امواج سے آسمانی عصبی نظام کی - شکل نمبر ۸ (ا) میں مختلف رنگوں کی شعاعوں سے سرخ نظام کی تحریک کا مقابلہ کیا گیا ہے - اسی طرح شکل (ب) میں سبز عصبی نظام اور شکل (ج) میں بنفشئی عصبی نظام کی تحریک کا منحنی کھینچا گیا ہے —
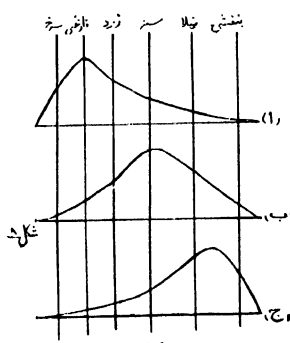
شکل ۸

ہیلم ہولٹس کے نظریہ کے مطابق طبیعی رنگوں کے احساسات کی تشریح یہ ہے :

۱ - سرخ رنگ سے سرخ عصبی نظام کی تحریک زبردست ہوتی ہے - لیکن باقی دونو نظاموں کی تحریک نہایت کم ہوتی ہے - اس لیے احساس سرخ ہوتا ہے —

۲ - زرد رنگ سے سرخ اور سبز دونو محرک ہوتے ہیں - لیکن نیلے اعصاب میں تحریک بالکل خفیف ہوتی ہے - اس لیے احساس زرد ہوتا ہے —

۳ - سبز رنگ سے سبز عصبی نظام کی تحریک خوب ہوتی ہے - لیکن

باقی دونو اعصاب کی کم - اس لیے احساس سبز ہوتا ہے —

۴ - نیلے رنگ سے سبز اور بنفشئی نظام دونو محرک ہوتے ہیں - لیکن سرخ اعصاب پر اثر خفیف ہوتا ہے - اس لیے احساس نیلا ہوتا ہے۔

۵ - بنفشئی رنگ سے بنفشئی نظام کی تحریک خوب ہوتی ہے لیکن سرخ اور نیلے اعصاب پر اثر کم ہوتا ہے - اس لیے احساس بنفشئی ہوتا ہے -

۶ - سفید رنگ سے تینوں قسم کے اعصاب کی تحریک برابر ہوتی ہے - اس لیے احساس سفید ہوتا ہے —

اس نظریہ کی رو سے تین رنگوں کے احساسات اساسی ہوتے ہیں اور ان تینوں کی مختلف تراکیب سے سب فرعی رنگ پیدا ہوتے ہیں - اگر بالکل خالص سرخ رنگ کی امواج شبکیہ سے ٹکرائیں تو اُسی رنگ کے متعلق عصبی نظام میں زیادہ تحریک پیدا ہوگی - اسی طرح سبز اور بنفشئی رنگوں سے ان کے متعلق اعصاب اثر پذیر ہونگے - لیکن اگر رنگوں کے کسی آمیزہ کی امواج شبکیہ پر پڑیں تو اس رنگ میں ہر عصبی نظام کے متعلق جتنی زور دار امواج ہونگی اسی نسبت سے وہ اثر قبول کرے گا۔ تینوں قسم کے اعصاب کے متفقہ عمل سے اس خاص رنگ کا احساس پیدا ہوجائے گا۔ جیسا کہ تینوں کی برابر تحریک سے سفید روشنی محسوس ہوتی ہے —

ہیرنگ (Hering) کا متضاد رنگی نظریہ

اگر ہم رنگوں کے نفسیاتی آثار کو مد نظر رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ طیف کے رنگوں میں سے چار رنگ یعنی سرخ، زرد، سبز اور نیلا نفسیاتی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں - ان کے علاوہ طیف کے اور رنگوں کا اثر اپنے قریب کے رنگوں کے بین بین ہوتا ہے۔ مثلاً نارنجی رنگ کو دیکھ کر ذہن فوراً سرخ اور

زرد رنگوں کی طرف منتقل ہوتا ہے - گویا نارنجی کا احساس سرخ اور زرد رنگوں کا یک جائی احساس ہے - بنفشئی رنگ بعض آدمیوں کو نیلے اور سرخ کے آمیزہ کے مشابہ معلوم ہوتا ہے - پس ذہنی نقطۂ نظر سے اساسی رنگ تین نہیں بلکہ چار ہیں -

ان چاروں رنگوں میں سے سرخ رنگ سبز کا انتہاسی رنگ ہے اور زرد نیلے کا - چونکہ سرخ اور سبز کو ملانے سے سفید روشنی پیدا ہوسکتی ہے اس لئیے سبز کو سرخ کا متضاد کہہ سکتے ہیں - اسی طرح زرد رنگ نیلے رنگ کی ضد ہے - اور سیاہ رنگ کو ہم سفید رنگ کا متضاد کہہ سکتے ہیں -

ان باتوں کو مد نظر رکھہ کر ہیرنگ نے متضاد رنگی نظریہ پیش کیا - نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ شبکی دماغی آلۂ احساس میں تین بصری جوہر موجود ہیں - ان میں ایک جس کا نام سفید سیاہ بصری جوہر ہے ہر طول کی امواج سے ان کی تنویر کے مطابق اجزا میں تقسیم ہوتا ہے اور روشنی کی عدم موجودگی یعنی تاریکی میں پھر ترکیب پاتا ہے - یہ کیمیائی تبدیلیاں سفید اور سیاہ کا احساس پیدا کرتی ہیں —

دوسرا بصری جوہر جو سرخ سبز کہلاتا ہے سرخ رنگ کے اثر سے اجزا میں منقسم ہوتا ہے اور سبز رنگ کے اثر سے ترکیب پاتا ہے - تیسرا بصری جوہر زرد نیلا ہوتا ہے اس کا زرد رنگ سے تجزیہ ہوتا ہے اور نیلے رنگ سے ترکیب —

جب کسی قسم کی روشنی آنکھہ پر عمل نہیں کرتی تو ہر بصری جوہر خود بخود اجزا میں تقسیم ہوتا رہتا ہے اور ترکیب پاتا رہتا ہے - گویا ہر بصری جوہر کے تجزیہ اور ترکیب میں توازن قائم رہتا ہے - اس لئیے

کسی روشنی یا رنگ کا احساس نہیں ہوتا —

اب فرض کرو کہ سرخ اور سبز رنگوں کی روشنی ایک ہی وقت پر آنکھ پر پڑتی ہے۔ دوسرے جوہر کا سرخ روشنی سے تجزیہ ہوگا اور سبز سے ترکیب۔ پس اس حالت میں اس میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوگی اور وہ کسی رنگ کا احساس کرنے سے قاصر ہوگا۔ البتہ سفید سیاہ جوہر دونوں رنگوں سے متاثر ہوگا اور خاکستری رنگ کا احساس پیدا ہوگا۔

نظریوں کا موازنہ

۱- رنگدار جسم کے سامنے سے ہٹ جانے کے بعد بھی آنکھ پر اثر باقی رہتا ہے۔ اس مظہر کی توجیہ متضاد رنگی نظریہ سے بخوبی ہوتی ہے۔ فرض کرو کہ شبکیہ پر سرخ روشنی کا عمل ہورہا ہے۔ اس سے دوسرے بصری جوہر کا تجزیہ ہوگا۔ اب اگر رنگ کو دور کرلیجئے کے بعد بھی جوہر کا تجزیہ کچھ دیر تک جاری رہے تو سرخ رنگ کا احساس ہوتا رہیگا۔ یعنی مثبت خیال پیدا ہوگا۔ اس کے بعد جوہر کو اپنی اصلی حالت پر آتا ہے۔ اس لئے اس کے اجزا کی باہم ترکیب شروع ہوگی جس سے سبز رنگ کا خیال یعنی منفی خیال پیدا ہوگا —

۲- اگر سرخ روشنی کا آنکھ پر مسلسل عمل جاری رہے تو رفتہ رفتہ دوسرے جوہر کا کلی تجزیہ ہوجانا چاہئے۔ اور اگر وہ ساتھ ساتھ پیدا بھی ہوتو سرخ روشنی کے زیر اثر اسے غایب ہو جانا چاہئے۔ اگر ایسا ہوتو سرخ رنگ کا احساس باقی نہ رہے گا۔ بلکہ سرخ روشنی آنکھ کو خاکستری نظر آنے لگے گی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ گو آنکھ کسی خاص رنگ سے اکتا جاتی ہے لیکن خاکستری رنگ نمودار نہیں ہوتا۔ یہ بات متضاد رنگی نظریہ کے مخالف ہے —

۳- متضاد رنگی نظریہ کا سہ رنگی نظریہ سے بڑا اختلاف یہ ہے کہ سفید رنگ کا

احساس اور رنگوں کے احساسات کے مجموعی اثر سے پیدا نہیں ہوتا - بلکہ بالکل جداگانہ احساس ہے - جو پہلے بصری جوہر کے تجزیہ سے پیدا ہوتا ہے - اور تاریکی میں اس جوہر کی ترکیب ہوتی ہے - اب اگر کچھہ دیر تک مکمل تاریکی چھائی رہے تو پہلا جوہر مکمل ہوجاے گا اور اس کی ترکیب بند ہوجاے گی - پس اس صورت میں تاریکی کا احساس جاتا رہے گا اور تاریکی میں خاکستری رنگ کا احساس مستقل طور قایم ہوجاے گا - مگر فی‌الواقع ایسا نہیں ہوتا متضاد رنگی نظریہ پر یہ بھی ایک بہت بڑا اعتراض ہے —

رنگ کوری

بعض آدمی رنگوں کی صحیح شناخت نہیں کرسکتے - انھیں رنگ کور کہتے ہیں - ان میں سے بعض کی بینائی اس قدر کمزور ہوتی ہے کہ وہ سرخ اور سبز میں مطلق تمیز نہیں کرسکتے - لیکن بعض کی آنکھیں بہتر ہوتی ہیں - اور وہ اچھی روشنی میں کم غلطی کرتے ہیں - لیکن جب تھکے ہوے ہوں یا روشنی کم ہو تو سرخ نارنجی اور سبز میں اور زرد اور سفید میں فرق نہیں کرسکتے —

یہ نقص مردوں میں عورتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے - ۵ فی صدی مرد مادر زاد رنگ کور ہوتے ہیں - لیکن ہزار عورتوں میں سے صرف چار اس مرض میں مبتلا ہوتی ہیں - بیماری موروثی اور لاعلاج ہوتی ہے اور عورتوں کی وساطت سے پھیلتی ہے - لیکن عورتوں پر اس کا اثر نہیں ہوتا —

بعض اوقات آنکھہ کی بیماریوں کے اثر سے بھی رنگ کا احساس ناقص ہوجاتا ہے - مثلاً تمباکو اور دیگر منشیات کی سمیت سے آنکھہ میں نقص پیدا ہوتا ہے - مگر یہ نقص مقامی ہوتا ہے یعنی شبکیہ کے خاص مقام

تک محدود ہوتا ہے —

یہ معلوم کرنا نہایت مشکل ہے کہ رنگ کور آدمی کے احساسات کیسے ہوتے ہیں - کیوں کہ ہمارے پاس سوائے اس کے اور کوئی ذریعہ نہیں کہ اپنے احساسات کا ان کے ساتھہ مقابلہ کریں - ہم نے اپنے احساسات کی بنا پر رنگوں کی طویل فہرست بنائی ہے - اور ان کے نام مقرر کئے ہیں رنگ کور آدمی بھی تنویر کی کمی بیشی اور شکلوں وغیرہ کو پیش نظر رکھہ کر اُن سب رنگوں کے نام سیکھہ سکتا ہے اور اگر تعلیم کے بعد اُس سے پوچھا جائے کہ فلاں رنگ کیا ہے تو وہ اپنے اندازے سے صحیح جواب دے گا - یہ ممکن ہے کہ سرخ رنگ کا نابینا کبھی غلطی سے سرخ کی بجائے سیاہ لباس پہن لے - اُس کی وجہ یہ ہے کہ سرخ رنگ کا اثر اُس کی آنکھوں پر برائے نام ہوتا ہے —

یہ سوال کہ آیا سرخ کور آدمی سبز رنگ کو بعینہ ویسا دیکھتا ہے جیسا کہ ہم نہایت مشکل ہے —

دو رنگی اور سہ رنگی بصارت

اگر بہت سے رنگ کور آدمیوں کا امتحان لیا جائے اور اُنھیں کہا جائے کہ رنگوں کے ذریعے طیف کے سب رنگ پیدا کرو تو وہ دو رنگوں کو مختلف تناسب سے ملا کر اپنی بصارت کے مطابق طیف کے سب رنگ اور سفید رنگ بنالیں گے - پھر اگر رنگ کور آدمیوں کا آپس میں مقابلہ کیا جائے - تو وہ دو قسموں میں تقسیم ہوجائیں گے - ایک قسم کے آدمی دو رنگوں کو معین نسبتوں سے ملاکر اور رنگ حاصل کریں گے اور دوسری قسم کے آدمی مختلف نسبتوں سے دو رنگوں کو ملائیں گے تو دوسرے رنگ حاصل ہوں گے - امتیاز کے لیے پہلی قسم کے آدمیوں کو گروہ الف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور دوسری قسم کے آدمیوں کو گروہ ب کے

نام سے چونکہ رنگ کور آدمی دو رنگوں سے سب رنگ پیدا کرسکتا ہے - اس لیے اُس کی بصارت کو دو رنگی بصارت کہہ سکتے ہیں - معمولی آدمی کی بصارت سہ رنگی ہوتی ہے - نیز چونکہ رنگ کور دو رنگوں کی مناسب ترکیب سے سفید روشنی پیدا کرسکتا ہے اور اُنھیں رنگوں سے سب رنگ بنا سکتا ہے اس لیے اُس کی رویت کے مطابق طیف کا کوئی حصہ ایسا بھی ہونا چاہئیے جو سفید رنگ سے ملتا جلتا ہو یعنی خاکستری ہو - اسے دو رنگی بصارت کا نقطۂ تعدیلی کہتے ہیں - گروہ الف کے آدمیوں میں اس نقطے کا طول موج ۴۸۹ء سائکرون ہوتا ہے اور گروہ ب کے آدمیوں میں تقریباً ۵۰۰ء مائکرون گویا دونوں کے تعدیلی نقطے نیلگوں سبز حصہ میں ہیں —

طیف کے مختلف رنگوں کی تنویر الف گروہ کے آدمیوں کو معمولی آدمیوں سے مختلف نظر آتی ہے - اُن کی بصارت کے مطابق طیف کا سب سے زیادہ روشن حصہ کسی قدر سبز رنگ کی طرف جھکا ہوا ہوتا ہے - ب گروہ کو تنویر تقریباً معمولی آدمیوں کی سی نظر آتی ہے —

رنگ کوری کی توجیہ

ہیلم ہولٹز کے نظریہ کے مطابق رنگ کوری کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ تین عصبی نظاموں میں سے ایک نظام مفقود ہوتا ہے - الف گروہ کے آدمیوں کا سرخ عصبی نظام غائب ہوتا ہے اس لیے وہ سرخ کور کہلاتے ہیں - ب گروہ کا سبز نظام نہیں ہوتا اس لیے وہ سبز کور ہوتے ہیں - اگر اس نظریہ کو صحیح مان لیا جائے تو بعض ایسے آدمی بھی ہونے چاہئیں جن کا آسمانی نظام نہ ہو - اُن کو سرخ اور سبز رنگ صاف نظر آئیں گے لیکن وہ نیلے رنگ اور زرد رنگ میں ٹھیک تمیز نہ کرسکیں گے - تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ چند اشخاص کی بصارت اس قسم کی ہوتی ہے —

اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض آدمیوں کے تینوں عصبی نظام الگ الگ نہ ہوں ۔ بلکہ ایک مرکزی نظام میں شامل ہوں ۔ ایسے آدمیوں کو رنگوں کی بالکل تمیز نہ ہوگی ۔ وہ صرف تصویر کے اختلات میں تمیز کر سکیں گے ۔ تجربہ سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ بعض آدمیوں کی رنگوں کی بینائي بالکل مفقود ہوتی ہے یعنی وہ مطلق رنگ کور ہوتے ہیں —

رنگ کوری میں اور بھی کئی قسم کے اختلافات پائے جاتے ہیں ۔ بعض آدمیوں کے شبکیہ کو سبز اور نیلے رنگوں سے اُتنی ہی تحریک ہوتی ہے جتنی کہ معمولی آدمیوں کو لیکن سرخ رنگ اُنہیں معمول سے زیادہ مدھم نظر آتا ہے ۔ اسی طرح بعض آدمیوں کو سبز رنگ نظر تو آتا ہے مگر نہایت مدھم ۔ البتہ سرخ اور نیلا رنگ طبیعی نظر کے مطابق شوخ دکھائی دیتے ہیں ۔ اس قسم کے آدمیوں کو جزوی رنگ کور کہتے ہیں ۔ اُن کے دو عصبی نظام بالکل صحیح سالم ہوتے ہیں ۔ لیکن تیسرا کم حساس ہوتا ہے —

ہیرنگ کے نظریہ سے رنگ کوری کی تشریح مشکل ہے —

رنگ کوری کا امتحان

اس امر کی خاص احتیاط رکھنی چاہئیے کہ رنگ کور آدمی کو ایسے پیشوں میں ملازمت نہ دی جائے جن میں رنگوں کے ذریعے اشارات کیے جاتے ہیں ۔ مثلاً ریل گاڑی کے ڈرائیور یا گارڈ اور جہازوں کے جہاز ران رنگ کور نہ ہونے چاہئیں —

اس مقصد کے حصول کے لیے امیدواروں کا امتحان لیا جاتا ہے ۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ گو بعض رنگ کور آدمیوں کا آسانی سے پتہ چل سکتا ہے لیکن بعض کا پوری تحقیقات کے بغیر کچھ علم نہیں ہوسکتا ۔ امیدوار جو امتحان میں پاس ہونے کے لیے کوشاں ہوتا ہے عام طور پر روشنی کی

کمی زیادتی سے رنگ کا اندازہ لگا لیتا ہے ۔ مثلاً اگر سرخ کور کو سرخ روشنی دکھائی جائے تو اُسے مدھم رنگ نظر آئے گا پس وہ غالباً روشنی کی کمی کو دیکھ کر صحیح رنگ بتلا دے گا —

رنگ کوری کے امتحان کے کئی طریق ہیں ۔ محکمۂ تجارت نے لالٹین کے ذریعے آنکھوں کے امتحان کا یہ طریقہ مقرر کیا ہے کہ امیدوار لالٹین کے پہلو کے دو سوراخوں کا آئینہ میں عکس دیکھتا رہے ۔ اُن کی جسامت وہ ہوتی ہے جو سگنلوں کی روشنی کی معین فاصلہ سے نظر آتی ہے ۔ سوراخوں کے رنگ جلد جلد بدلے جاتے ہیں اور اُن کی تنویر برابر رکھی جاتی ہے ۔ پھر امیدوار سے کہا جاتا ہے کہ رنگوں کے تبدیل ہونے پر اُن کے نام لیتا جائے —

—) ◆ (—

سر جگدیش چندر بوس

از

(محمد عبد الحی ' متعلم بی - یس سی کلاس - الہ آباد یونیورسٹی)

بچپن اور ابتدائی تعلیم

" بچپن آئندہ زندگی کا نمونہ ہے " یہی وجہ ہے کہ سیرت لکھتے وقت بچپن کے حالات لکھنا ضروری خیال کیا جاتا ہے - بچپن کی معصومانہ عادتیں اور لڑکپن کی طفلانہ حرکات آئندہ ہونے والی ہستی کے کردار پر کافی روشنی ڈالتی ہیں - ڈی وگنی (De Vigny) کا قول ہے کہ " اعلیٰ زندگی کیا ہے ؟ یہ اوائل عمر کے چند سالوں میں حاصل شدہ خیال ہے "- یہی وجہ ہے کہ بچے کے تخئیل اور مشاغل کو آئندہ زندگی کے بنانے میں کافی دخل ہے - علم النفس کی ترقی کے ساتھہ ساتھہ یہ تحقیق ہوتا جاتا ہے کہ انسان پر صرف اسلاف کی طبع و طینت کا ہی اثر نہیں پڑتا بلکہ بچپن کے مشاغل ' واہمات ' اور تخیلات بھی آئندہ زندگی کے بنانے یا بگاڑنے میں کارفرما ہوتے ہیں -

مشرقی بنگال کے دارالسلطنت ڈھاکہ کے مغرب میں وکرم پور ایک سرسبز و شاداب علاقہ ہے - اسی علاقہ کے موضع راوی کھال میں ۳۰ نومبر

سنہ ۱۸۵۸ ع کو جگدیش چندر بوس پیدا ہوے - بچپن فرید پور میں بسر ہوا - فرید پور میں ان کے والد بھاگبان چندر بوس ڈپٹی مجسٹریٹ تھے - ۱۸۶۹ ء میں جب جگدیش ۱۰ برس کے تھے ان کے باپ بردوان کے اسسٹنٹ کمشنر ہوگئے - جہاں وہ ۱۸۷۴ ء تک اس عہدہ پر فائز رہے - پھر ۱۸۷۵ میں کٹوا سب ڈویژن کے ایگزیکیو ٹیو افسر ہوگئے - اپنے کثرت کار اور مشاغل کی گونا گون نوعیت کے باوجود مسٹر بوس اپنے بچہ کی تعلیم سے غافل نہ رہے - تعلیم کی ذمہ داری کا بار اپنے هی اوپر رکھا - وہ اپنے بچہ جگدیش کے ایسے ایک رہنما دوست هی نہ تھے بلکہ فلاسفر بھی تھے - دن بھر کی محنت کے بعد باپ شام کا کھانا کھا کر اپنے بچہ کے پاس لیٹ جاتا - اور ان مختلف النوع سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کرتا جو یہ چھوٹا مستفسر کیا کرتا - یہ سوال خاص ہوتا تھا - " میں نے آج ایسا ایسا دیکھا - باپ یہ کیوں تھا '' - غرض هر بات کی تحقیق کرنے کے ایسے بچہ " کیوں ؟ اور کیسے ؟ " کی بھر مار کردیتا - اس کا جواب جہاں ممکن هوتا تھا باپ دے دیتا تھا ورنہ اکثر اس کا جواب یہی هوتا تھا " بیٹا ! میں نہیں جانتا - میں نہیں بتا سکتا - هماری معلومات بہت کم هیں " - اس قسم کے جوابات کی وجہ اکثر تو یہ هوتی تھی کہ بچہ ایسی باتیں جاننا چاهتا تھا جو اس کی سمجھ سے باهر تھیں - مگر کبھی کبھی ایسا بھی هوتا تھا کہ درحقیقت باپ کے دائرۂ معلومات سے دور سوالات کا جواب طلب کیا جاتا تھا - مگر کچھ بھی هو ان جوابات کا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ بچہ کی قوت استفسار کو بر قرار رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی - اس کے هر سوال کو غور سے سنا جاتا تھا اور حتی الوسع جواب دینے کی کوشش کی جاتی تھی - بر خلاف ان نا سمجھ باپوں کے جو اس قسم کے سوالات پر

بچوں کو اکثر ڈانٹ دیتے ہیں اور اس طرح ان کی قوت استفسار کو ہمیشہ کے لیے سردہ کر دیتے ہیں —

۵ سال کی عمر میں جگدیش کو اسکول بھیجا گیا - اگر چہ فرید پور میں ایک انگریزی اسکول بھی تھا مگر مسٹر بوس نے ان کو ورنا کیولر اسکول میں بھیجا - ان کا خیال تھا کہ بچہ کو پہلے اپنی مادری زبان اور اپنے ماحول سے مناسبت حاصل کرنا چاہئے - جگدیش کے اسکول کے ساتھی ملاحوں اور کسانوں کے لڑکے تھے - ان کی غریبانہ زندگی اور خانگی معاملات کے تذکروں نے جگدیش میں نہ صرف حب وطن کے جذبات پیدا کیے بلکہ ان کو هندوستان کی غریبانہ طرز معاشرت سے بھی آگاہ کردیا - اب جگدیش کی باری دوسرے اسکول میں جانے کی آئی - اس وقت ان کے باپ کا تبادلہ بردوان بہ حیثیت اسسٹنٹ کمشنر ہو چکا تھا - اب وہ سینٹ زیویر (St. Xavier) اسکول میں داخل کردیے گئے - یہ اسکول تقریباً انگریز بچوں کا تھا - وہاں جگدیش کو اجنبیت نے بہت پریشان کیا - دوسرے یہ کہ وہ ابھی دیہاتی زندگی سے نکل کر آئے تھے - شہری زندگی کے متعلق ان کو کچھ بھی تجربہ نہ تھا - چھیڑنے اور مذاق اڑانے کی مصیبت سے زیادہ پریشان کن اسکول اور بورڈنگ کی اجنبیت تھی —

کالج کی زندگی - کلکتہ اور انگلینڈ میں

سولہ سال کی عمر میں جگدیش اسکول سے فارغ ہوکر سینٹ زیویر کالج میں داخل ہوے - وہاں پروفیسر فادر کیفلت کی تعلیم سے میلان طبع طبعیات کی طرف ہوا - اس میلان طبع نے سفر انگلینڈ کے ابتدائی خیال میں اور بھی امنگیں پیدا کردیں اور یہ نوجوان طالب علم اپنی دنیائے خیال میں انگلینڈ اور اس کی اعلی تعلیمات کی سیر دیکھنے لگا - مگر اس وقت مسٹر بوس کی مالی حالت ٹھیک نہ تھی۔

ان کے قرض اور مزید برآں اقساط سود کی ادائی نے تمام پس انداز کرنے کے مواقع کو مسدود کردیا تھا - نو جوان بوس کو فی الحال ڈاکٹری پڑھنے کا شوق تھا اور وہ اس شوق کو سمندر پار جاکر پورا کرنا چاہتے تھے - مگر باپ کی مالی حالت کسی طرح اجازت نہ دیتی تھی - بالاخر اس مجبوری نے بوس کو اداس رہنے پر مجبور کردیا - اس اداسی کو ان کی شفیق اور علم دوست ماں برداشت نہ کر سکی اور با وجود تمام خاندان کی مخالفت کے اس امر پر مستعد ہوگئی کہ وہ اپنے تمام زیورات اور جواہرات فروخت کر ڈالے گی اور اپنے جگدیش کو تحصیل علم کے لیے انگلستان بھیجے گی —

لندن پہونچکر بوس نے میڈیکل کالج کا پہلا سال شروع کیا - طبعیات و کیمیا کے مضامین ان کے لیے نئے نہ تھے مگر حیوانیات کا نیا مضمون پروفیسر رے لنکاسٹر کے ماتحت ان کے لیے نئی دلچسپی کا باعث ہوا - مگر جب کالج میں تشریح البدن کی تعلیم شروع ہوئی تو بوس نعشوں کو چرتا ہوا نہ دیکھہ سکے چہ جائیکہ بذات خود ان کو چیرتے - ان کو اس کمرے کی بو سے بخار چڑہ آتا تھا - چنانچہ ڈاکٹر رنجر کے مشورہ پر ان کو اپنی ڈاکٹری کی تعلیم مسدود کرکے لندن کو خیر باد کہنا پڑا - اب وہ کیمبرج سائنس کی تعلیم کے لیے گئے - جنوری ۱۸۸۱ ع کو کرائسٹ کالج میں داخل ہو گئے - یہاں تھیو ڈور بک (جو بعد کو علیگڈہ کالج کے پرنسپل ہوئے) ' ڈارسی تھامسن اور دیگر اهل علم سے مراسم پیدا ہوگئے - یہاں بوس کالج کی تعلیم کے علاوہ متعدد تجربہ گاہوں کی سیر اور بہت سے اصحاب فن و ذوق کی صحبت سے فیضیاب ہوے - ان میں مائیکل فاسٹر ' فرانسس بالفور اور پروفیسر ہیوجز خاص طور سے قابل تذکرہ ہیں —

لندن اور کیمبرج کی اعلی ڈگریوں سے مالا مال ہوکر بوس کلکتہ واپس

آے۔ یہاں پریسی ڈنسی کالج میں طبعیات کے پروفیسر مقرر ہوے۔ مگر ان کی نظروں میں یہ انتہاے عروج نہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ابھی ان کو بہت کچھہ کرنا ہے۔ چنانچہ ۳۰ نومبر ۱۸۹۴ ع کی پینتیسویں سالگرہ کے بعد انھوں نے تہیہ کر لیا کہ اب وہ علمی انکشافات کی طرف متوجہ ہوں گے۔ تین ھی مہینے کے اندر بغیر کسی تجربہ گاہ کی مدد کے انھوں نے ایسے آلات بنا لیے جن کی مدد سے انھوں نے بجلی کے نہایت اہم انکشافات کی تکمیل کی۔ اس میں ان کو فوری کامیابی ہوئی۔ رائل سوسائیٹی نے ان کے انکشافات کی اشاعت کی اور ان تحقیقات کو آئندہ جاری رکھنے کی ہمت دلائی۔ ان کے انکشافات کو دیکھہ کر لندن یونیورسٹی نے بغیر کسی امتحان کے ڈاکٹریٹ آف سائنس کی ڈگری عطا کی —

تمام دن پڑھانے اور اس کی تیاری کرنے کے بعد جو کچھہ وقت ملتا تھا اسی میں وہ اپنی تحقیقات کیا کرتے تھے اور اپني ھي آمدنی سے اپنے تجربہ گاہ کا خرچ بھی برداشت کرتے تھے اگرچہ آخر میں ان کے کاموں کی اہمیت کا اندازہ کر کے گورنمنٹ نے ڈھائی ہزار روپیہ سالانہ کی امداد ان کی تحقیقات علمی کے اخراجات کے لیے منظور کردی تھی —

سر جگدیش چندر بوس کی تمام و کمال تحقیقات و انکشافات کی تفصیل کے لیے ایک بڑی ضخیم کتاب بھی شاید کفایت نہ کرے۔ ان کی مکمل فہرست پیش کرنا موجودہ مضمون کی وسعت سے باہر ہے۔ بہر حال ذیل میں ان کے کچھہ ایسے انکشافات کا مجملاً ذکر کیا جاتا ہے جنھوں نے دنیاے علم میں ایک گراں قدر معلومات کا اضافہ کیا ہے اور جن کی وجہ سے ہمارے ملک کا ایک فرد مغربی مہذب دنیا کے طبقۂ علم کے افراد کے لیے ایک قابل رشک ہستی بنا ہوا ہے —

بوس کے انکشافات کا اجمال یہ ھے کہ انھوں نے سب سے پہلے طبیعات کی دنیا میں قدم بڑھایا - اس کے بعد ان کی توجہ نباتیات میں فعلیات (فزیالوجی) کی جانب مبذول ھوئی - چونکہ وہ ایک اچھے ماھر طبیعیات رہ چکے تھے اور اس صنف میں ان کو انہماک بھی رھا تھا لہذا نباتیات میں بھی انھوں نے جو کچھہ کیا وہ بہت کچھہ طبیعیات کا پہلو لیے ھوے تھا - اور نباتیات کا یہ وہ رخ تھا جس کی طرف ابھی بہت کم دماغ مائل ھوے تھے - انھوں نے اس سلسلہ میں ایسے حیرت انگیز انکشافات کئے کہ دنیاے سائنس انگشت بدنداں رہ گئی - انھوں نے ایسی باتوں کو آنکھوں سے دکھا دیا جن کو سن کر کسی شخص کو یہ یقین نہ آے گا کہ وہ اصل حقیقت ھیں - جو باتیں اب تک افسانہ سے زیادہ اھمیت نہ رکھتی تھیں وہ دنیا نے آنکھوں سے مشاھدہ کر لیں —

اب تک اھل مغرب کا یہ خیال تھا کہ مشرق والے صرف تخیلات کے مرد میدان ھیں - ان کا ذھن مابعدالطبیعیات ' فلسفہ ' علم ھندسہ ' شاعری جیسی چیزوں سے آگے بڑہ کر تجربہ و مشاھدہ کی دنیا میں کچھہ نہیں دکھا سکتا - مگر بوس نے دنیا کو دکھا دیا کہ اھل مشرق بھی وہ کرسکتے ھیں جس پر اھل مغرب کو ناز ھے - رھی یہ بات کہ مواقع کے بہترین استعمال پر کس کو اختیار ھے ' اس سے انسان مجبور ھے - بہر حال بوس کے انکشافات میں حقیقی سائنٹفک روح کے ساتھہ مشرقی تخیل کی بھی چاشنی ھے اور یہی وہ فوقیت ھے جس نے بوس کو آسمان سائنس پر چاند بنا کر چمکایا ھے - نباتیات میں انھوں نے انکشافات کر کے بتلایا کہ درخت محسوس کرتے ھیں - ان کے دل ھوتا ھے - ان میں اعصاب کے ذریعہ بیرونی حوادث کا احساس ھوتا ھے - وہ بھی سنتے ھیں مگر ھم سے ۱۱ گنا تیز - وہ بھی دیکھتے ھیں

مگر ہم سے کہیں زیادہ - ہماری بینائی کا احساس محدود ہے - صرف ان مادوں تک جو سرخ ' نارنجی ' پیلے ' سبز ' نیلے ' اور اودے رنگ کی شعاعوں کو منعکس کرسکیں - اگر روشنی کا طول موج (Wave length) ایک مقررہ مقدار سے چھوٹا ہوتا ہے تو ہم دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں - اگر ہم بالا بنفشئی شعاعوں کو دیکھنا چاہیں تو طاقتور سے طاقتور خوردہ بین بھی ہم کو جواب دیدے گی - مگر درخت ان شاعوں کو بھی محسوس کرتے ہیں - ہمارا احساس اثیری تموج (Ethereal wave) سے متاثر نہیں ہوتا حالانکہ درخت اس اثیری تموج کو بھی محسوس کرتے ہیں جو لاسلکی کے باعث پیدا ہو - ہم حواس خمسہ کے علاوہ ایک چھٹی حس ' ادراک ' پر نازاں ہیں - درخت بھی اس حس سے محروم نہیں - ہماری رگوں میں خون دوڑتا ہے جس سے قلب کی حرکت نبض کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے - درختوں کی بھی " نبض " دیکھہ کر ان کے " قلب " کی ضربات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے —

اس کے علاوہ بوس نے درختوں کی رفتار نمو (Growth) کو دریافت کیا - انھوں نے بتلایا کہ درختوں میں نمو کی مقدار گھونگے (Snail) کی رفتار کا ۲ ہزار واں ($\frac{1}{2000}$) حصہ ہے - عام طور پر درختوں کے بڑھنے کی مقدار کا اوسط یہ ہے کہ وہ ایک ملین سکینڈ یا ۶۵۷۴۰۰۰ ۱۱ دن میں ایک انچہ بڑھتے ہیں - مگر بانس کا درخت سب درختوں سے جلد بڑھنے والا ہے - وہ صرف ۲۴ گھنٹہ میں ۹ انچہ سے لیکر ۱۲ انچہ تک بڑھتا ہے —

بوس کے حیرت افزا انکشافات کا اختتام صرف درختوں میں حس دریافت کرنے پر نہیں ہوتا بلکہ انھوں نے دکھلا دیا کہ دھاتوں میں بھی حس موجود ہے - دھات میں بھی " تازگی " " افسردگی " اور " موت " کی

کیفیات پائی جاتی ہیں۔ دھات زہر کے اثر سے مر جاتی ہے اور اگر عین وقت پر اس کو کوئی دوا ایسی دیدی جائے جو زہر کے اثر کو زائل کردے تو پھر سے " زندہ " ہوجاتی ہے اور اگر دیر تک زہر کا اثر رہے تو پھر کوئی دوا جلانے میں کار گر نہیں ہوتی -

یہ باتیں پڑھ کر ایک اجنبی کا حیرت و استعجاب اس درجہ بڑھے گا کہ وہ کسی طرح بھی ان نا ممکنات (اپنے ذہن و علم کے موافق) کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوگا - وہ ان کو صرف ایک افسانہ سمجھے گا - مگر سائنس کی دنیا وہ ہے جہاں کوئی بات اس وقت تک کبھی نہیں جاتی جب تک کہ وہ دکھلائی نہ جا سکے - یہاں واقعات پر اعتبار مشاہدات کے ذریعہ ہوتا ہے- صرف تخیلات کی مدد سے کسی امر کو نہیں منوایا جا سکتا ۔ چنانچہ بوس کے انکشافات کا بیان بھی اس عام قاعدہ سے علیحدہ نہیں - اس کے بیان کے لیے بھی تجارب و مشاہدات شاہد ہیں- اگرچہ ہمارے موجودہ مضمون کی وسعت اس امر کی حامل نہیں ہوسکتی کہ ہم تمام و کمال انکشافات و تجربات کی عملی اور نظری تفصیل پیش کر کے ناظرین کو مطمئن کرسکیں تاہم کچھہ مختصر اور عام فہم تشریح پیش کی جاتی ہے جس سے ان " معجزات " کے متعلق امکان کا گمان ہوسکے —

پودوں اور دھاتوں میں حس

دھاتوں اور پودوں میں حس دریافت کرنے کے لیے بوس نے جو آلہ استعمال کیا اس کی ساخت یا عمل کی تشریح یہاں بے محل ہوگی - صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ نامیاتی اور غیر نامیاتی اشیا میں برقی رو سے متاثر ہونے کی مقدار دریافت کرنے کے لیے بوس نے ایک خاص قسم کا رو پیما (Galvanometer) بنایا تھا جس کی سوئی کی حرکت سے کاغذ پر جو خطوط بشکل منحنی بنتے تھے ان سے اس

تاثر کا پتا لگتا تھا جو کہ اشیاء زیر عمل میں برقی رو کے لیے موجود تھا - چنانچہ اس اثر کو مختلف اشیاء میں مختلف صورتوں میں مشاہدہ کیا گیا اور اس سے عجیب و غریب نتائج اخذ کئے گئے -
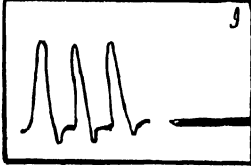
اس سے پہلے برقی رو کا اثر حیوانی اعصاب میں دریافت ہوچکا تھا اور اس کا منحنی بھی دریافت ہوگیا تھا - بوس نے انھی اصولوں میں کچھہ ردوبدل کرکے برقی رو سے متاثر ہونے کا منحنی پودوں میں دریافت کیا - پہلے اس نے اس رو سے متاثر ہونے کی مقدار کو باغ میں اگنے والے پودوں میں دریافت کیا پھر ان ترکاریوں میں جو بازار میں دستیاب ہوسکیں - ایک مرتبہ ایک ترکاری برقی رو سے بالکل متاثر نہ ہوئی - دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شہر لاتے وقت اس پر سخت برف باری ہوی تھی - دوسری مرتبہ جب اسی ترکاری کو تازہ حالت میں دیکھا گیا تو وہ حسب معمول رو سے متاثر ہوتی تھی - اس اثر کی مقدار اس منحنی سے معلوم ہوتی تھی جو رو پیما خود بخود کاغذ پر بنا سکتا تھا - اب اس نے دھاتوں پر تجربہ کیا اور ان کا بھی منحنی معلوم کیا - اب حیوانی اعصاب، پودوں اور دھاتوں کے منحنی جب ایک دوسرے کے مقابلے میں لائے گئے تو وہ اس درجہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے کہ ان میں امتیاز دشوار تھا (دیکھئے شکل نمبر ۱) - گویا کہ حیوانات نباتات اور فلزات برقی رو سے مساوی مقدار میں متاثر ہوسکتی تھیں - یا بالفاظ دیگر مادہ
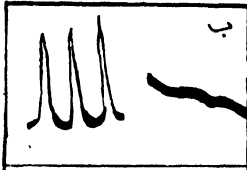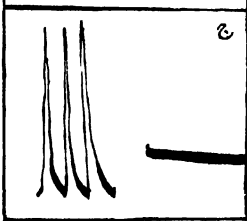
شکل نمبر ۱ کھڑے خطوط زھر دینے سے قبل کی حالت بتاتے ھیں اور مسلسل بڑے خطوط زھر دینے کے بعد حس کے بالکل مردہ ہوجانے کی کیفیت بتلاتے ھیں -
الف - حیوانی اعصاب پر زھر کا اثر
ب - پودوں پر زھر کا اثر
ج - دھاتوں پر زھر کا اثر
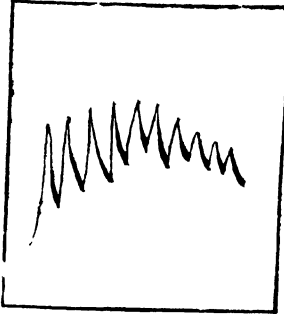
کی یہ تینوں شکلیں برقی رو کے احساس میں برابر تھیں —

اب ایسے پودوں یا دھاتوں پر تجربہ کیا گیا جو مسکرات، مخدرات یا زہر کے زیر اثر رہ چکی تھیں - چنانچہ کلو رو فارم (Chloroform) کے اثر سے پودوں میں برقی رو سے متاثر ہونے کی قوت اسی طرح جاتی رہی جس طرح جانداروں میں - اور جب ان پودوں کو دیر تک تازہ ہوا میں رکھا گیا تو پھر ان میں وہ احساس کی قوت عود کر آئی - پودوں پر زہر کا اثر بھی دیکھا گیا - زہر کے اثر سے پودوں میں برقی رو کو محسوس کرنے کی قوت رفتہ رفتہ کم ہوکر بالکل غائب ہوگئی گویا کہ وہ زہر سے مر گئے - اب بوس کو ایک بالکل نئی بات سوجھی - اس نے وہ کیا جس کی طرف آج تک کسی کا دماغ گیا ہی نہ تھا - اس نے دھات کو زہر دیا یعنی جست، تانبہ، پیتل، پلیٹینم وغیرہ دھاتوں کو مختلف زہروں میں رکھا - اور پھر جب ان میں برقی رو سے متاثر ہونے کی مقدار کا اندازہ لگایا تو ایک بڑی حیرت انگیز حقیقت کا انکشاف ہوا - کیونکہ دھاتوں نے بھی زہر سے وہی اثر لیا جو حیوانی اعصاب یا پودوں نے لیا تھا اور معلوم ہوا کہ زہر کے طویل اثر سے دھاتیں بھی گویا مرجاتی ہیں - زہر دی ہوئی دھاتوں کا منحنی بھی وہی تھا جو زہر دیے ہوئے حیوانی اعصاب یا زہر دیے ہوئے پودوں کا تھا - دھاتوں پر آگزیلک ترشہ (Oxalic Acid) کا زہریلا اثر بہت تیز ثابت ہوا —

شکل نمبر ۲ - دھات (رانگ) میں برقی رو سے متاثر ہونے کا منحنی - خطوط کے بتدریج گھٹنے سے دھات کے مضمحل ہونے کا پتہ لگتا ہے —
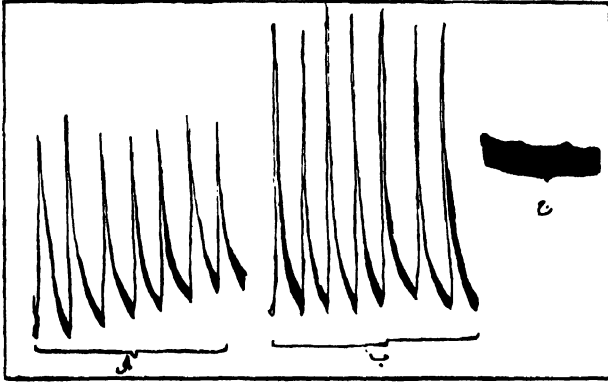
شکل نمبر ۳ خطوط ا و ب کے مقابلہ سے پتہ لگتا ھے کہ دھاتوں کو
تھوڑا سا زھر دینے کی وجہ سے کس طرح ان میں برقی رو
سے متاثر ھونے کی قوت بڑھ جا تی ھے - حالانکہ زھر کی زیادہ
مقدار سے وہ بالکل بے حس یا مردہ ھو جا تی ھیں -

بوس نے ۱۰ مئی ۱۹۰۱ ع کو رائل انسٹی ٹیوشن میں ان تجارب کی تشریح کرتے ھوے جو کچھہ کہا اس کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جا تا ھے —

" .... ان مختلف تجارب سے ھم نے یہ معلوم کر لیا کہ جس طرح جانداروں اور درختوں میں تھکاوٹ کے اثر سے (درختوں میں عموماً شام کو) برقی رو کا احساس کم ھو جا تا ھے اسی طرح دھاتوں میں بھی کام کرتے کرتے اضمحلال کے آثار پیدا ھو جاتے ھیں - جس طرح درختوں اور جانداروں کو تقویت بخش غذا دیدینے سے یہ احساس بڑھ جا تا ھے اسی طرح دھاتوں میں بھی یہ قوت تیز ھو جا تی ھے اور جس طرح حیوانی اعصاب اور پودے زھر کے اثر سے مرجاتے ھیں اسی طرح دھاتیں بھی زھر کے اثر سے مردہ ھو جا تی ھیں اور برقی رو سے کچھہ

بھی متاثر نہیں ہوتیں .... کیا ان مشاہدات سے ہم کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مادہ کی کچھہ خصوصیات عام ہیں ؟ .... کیا ہم ان سے یہ نہیں معلوم کرتے کہ حس جاندار اور بے جان دونوں میں موجود ہے ؟ .... کیا اس حقیقت سے اس خیال کی تصدیق نہیں ہوتی کہ تمام کائنات کے پس پردہ صرف ایک ہی ' حقیقت ' کام کر رہی ہے اور ایک ریت کا چمکتا ہوا ذرہ اور دنیا کو روشن کرنے والا آفتاب ایک ہی ' نور ' کے پر تو ہیں۔ .... اب زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اس دعوے کی حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے جو میرے اسلاف نے تیس صدیوں پیشتر دریاے گنگا کے کنارے کیا تھا۔ " وہ لوگ جو کائنات کی گونا گوں نیرنگیوں میں صرف ایک ہی ہستی کا جلوہ دیکھتے ہیں وہی درحقیقت ابدی صداقت کے عارف ہیں .... اور کوئی نہیں ! اور کوئی نہیں !! "

پودوں میں تاثر

پودے بیرونی حوادث یا اپنی ہی توانائی (Energy) سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ زندہ اجسام میں اس قسم کے تاثر کا پتہ نبض کی رفتار سے لگایا جاتا ہے۔ نبض کی رفتار کی نوعیت سے اس طاقت کی کمی و بیشی کا اندازہ ہوتا ہے۔ نبض کا سست ہونا طاقت یا بالفاظ دیگر حرارت غریزی کے کم ہونے کی علامت ہے۔ پودوں میں بھی اس حرارت غریزی کے کمی و بیشی کا اندازہ ان کی " ضربات نبض " سے ہو سکتا ہے۔ بوس نے ان ضربات نبض کو ٹھیک ٹھیک معلوم کرنے کے لیے ایک آلہ ایجاد کیا (دیکھیے شکل نمبر چار)۔ اس کا نام نبض نگار Pulse Recorder رکھا۔ اس کے عمل سے جو نتائج اخذ کیے گئے وہ بے انتہا
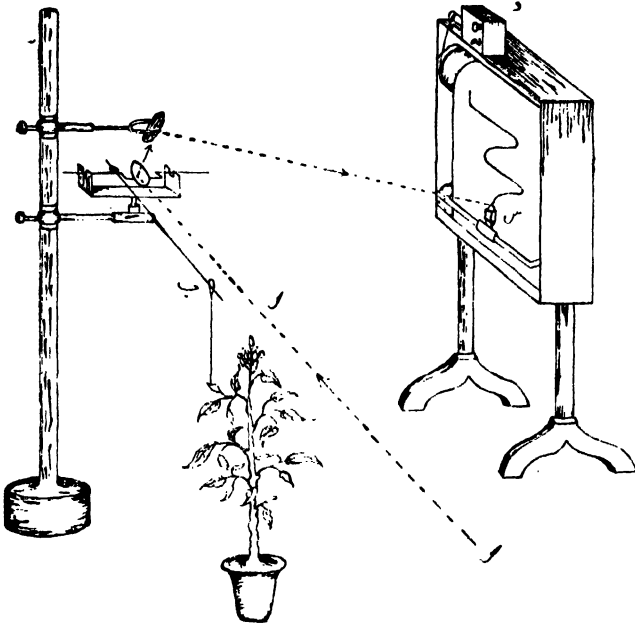
شکل نمبر ۴ – " نبض نگار " (Pulse Recorder)
ا – روشنی کی شعاع جو دو آئنوں سے منعکس ہو کر کاغذ پر پڑ رہی ہے –
ب – لیور – جو حرکت کرنے والے درخت کی پتی سے ملا ہوا ہے –
س – روشنائی کا ذخیرہ جس میں ایک باریک نوک کا قلم لگا ہے اور جو منعکس شعاع کے منحنی کو کاغذ پر بنا تا رہتا ہے –
د – گھڑی کی طرح ایک مقررہ رفتار پر خود بخود چلنے والی مشین – جو ان بیلنوں کو گھماتی رہتی ہے جن پر کاغذ لپٹا ہوا ہے ۔

حیرت انگیز ثابت ہوے ۔ اس آلہ نے ظاہر کیا کہ درخت جب کام کرنے کے بعد تھک جاتے ہیں تو کس طرح ان کی ضربات نبض مدھم ہوتی چلی جاتی ہیں ۔ (یہاں درختوں کے کام سے مراد دن بھر پتیوں کے ذریعے اپنے لیے غذا بہم پہنچانا ہے) اور جب ان درختوں کو غذا یا دوا کے ذریعہ تقویت پہنچائی جاتی ہے تو کس طرح ان میں زندگی اور طاقت کے آثار پیدا

ہوجاتے ہیں۔ (اشکال نمبر ۵ و ۶ ملاحظہ ہوں)۔
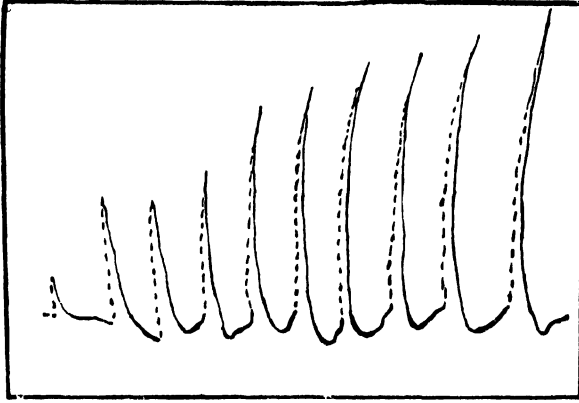
شکل نمبر ۵ - درخت میں مقدار حس کا مسلسل اضافہ - دیکھئے حس کے اضافہ کے ساتھہ نبض پیما کس طرح ضربات نبض کے بڑھنے کا پتہ دیتا ہے —
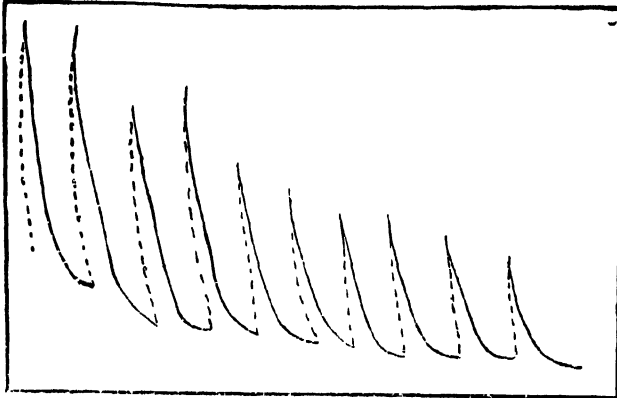
شکل نمبر ۶ - درخت میں مقدار حس کا مسلسل گھٹاؤ - دیکھئے تھکاوٹ کے آثار کو نبض پیما کس طرح ظاہر کرتا ہے -

اب تک سائنس دانوں کا خیال تھا کہ حیوانات کی موت نباتات کی زیست کا باعث ہے کیونکہ اجسام حیوانی کے گلنے سڑنے سے کاربن ڈائی اوکسائڈ گیس پیدا ہوتی ہے جو پودوں کی غذا ہے - مگر بوس نے دریافت کیا کہ اگرچہ کاربن ڈائی اوکسائڈ پودوں کی غذا ہے مگر جس طرح کاربن ڈائی اوکسائڈ کے زیر اثر جانوروں کا دم گھٹنے لگتا ہے اسی طرح پودے کی ضربات نبض بھی بہت مدھم ہوکر اس کے "دم گھٹنے" کا پتہ دیتی ہیں - اور جب پھر تازہ ہوا بہم پہونچائی جاتی ہے تو یہ ضربات پھر اپنی اصلی حالت پر آ جاتی ہیں - (شکل نمبر ۷ دیکھئے) - اوزون (Ozone) کے ماتحت ضربات نبض کا شمار اور بھی بڑھ جاتا ہے - پودوں میں غلیظ گیسوں سے متاثر ہونے کی قوت بہت تیز ہے - سلفیو ریٹڈ ہائڈروجن (Sulfurated hydrogen) کا خفیف جزو بھی پودوں کے لیے مہلک ہے -
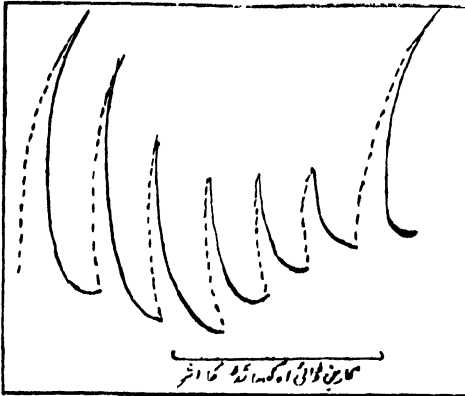
شکل نمبر ۷ - کاربن ڈائی اوکسائڈ کے زیر اثر ضربات نبض میں اضمحلال دیکھئے - پھر تازہ ہوا ملنے سے ضربات کس قدر بڑھ جاتی ہیں

پودے روشنی سے بھی متاثر ہوتے ہیں - سورج کی روشنی کی زیادتی سے ان کی ضربات نبض تیز ہوتی ہیں اور اس کی خفیف سی کمی سے بھی ان ضربات میں کمی ہو جاتی ہے - روشنی کے احساس میں پودے اس قدر زود حس ہیں کہ اگر بادل کا ایک ٹکڑا ان کے اوپر سے گذر جائے تو وہ روشنی کی اس کمی سے بھی متاثر ہوتے ہیں اور بادل آجانے سے ان میں

اضمحلال کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں (شکل نمبر ۸ دیکھئے) - اگر درخت زیادہ
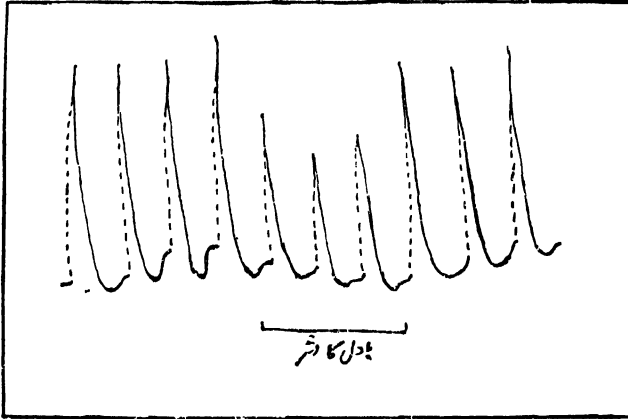
شکل نمبر ۸ - بادل آجانے سے ضربات نبض میں کمی

دیر تک تاریکی میں رہے تو رفتہ رفتہ وہ اپنے اضمحلال کو کم کردیتا ہے - بالکل اسی طرح جیسے کہ ہم یکبارگی اندھیرا چھا جانے سے کچھ نہیں دیکھ سکتے مگر کچھ دیر کے بعد اندھیرے میں بھی کچھ نظر آنے لگتا ہے —

درختوں کو زخم کا بھی احساس ہوتا ہے - اس احساس کا پہلا اثر نمو پر پڑتا ہے - اس کا ذکر کیا جاچکا ہے کہ بوس نے ایک آلہ نمونگار (Crescograph) درختوں کی مقدار نمو ناپنے کو بنایا تھا - چنانچہ اس نے ایک ایسے درخت میں جس کا نمو اس آلہ کے ذریعہ ناپا جارہا تھا ایک سوئی چبھوکر دیکھی تو معلوم ہوا کہ یکبارگی اس کی رفتار نمو چوتھائی رہ گئی اور پھر اصلی حالت پر آنے میں اس کو تقریباً
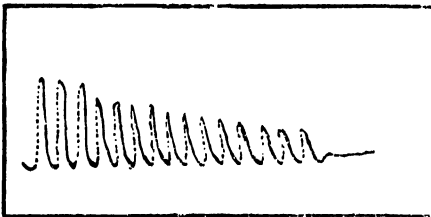
شکل نمبر ۹ - درخت کی موت کے قریب ضربات نبض کا بتدریج مدھم پڑنا اور بالآخر ختم ہوجانا —

۴ گھنٹہ لگے - پھر جب چاقو سے زخم الگ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رفتار نمو بالکل ختم ہو گئی اور بہت دیر کے بعد درخت دوبارہ اپنے عمل نمو کو جاری کر سکا —

درختوں کا سونا اس سوال کا جواب دینے میں کہ کنول (نیلو فر) رات کو کیوں جاگتا ہے اور دن کو کیوں سوتا ہے شاعر سائنس داں پر سبقت لے گیا - اس کے خیال میں کنول کے رات کو جاگنے کا سبب یہ ہے کہ " وہ چاند پر عاشق ہے اور جیسے ہی کہ اس کے محبوب کی پہلی کرن اس کی پتیوں پر پڑتی ہے وہ آنکھیں کھول دیتا ہے - اور پھر تمام رات اس کے دیدار سے شغل رکھتا ہے - اور صبح کو جیسے ہی سورج کی تند و تیز شعاعیں اس کے رخساروں پر پڑتی ہیں وہ اپنی پتیاں بند کر کے سو رہتا ہے"۔ گو شاعر نے پھول کے کھلنے اور بند ہونے کی وجہ بتائی مگر اس نے یہ نہ کیا کہ کسی اندھیری رات کو چراغ لیکر جاتا اور دیکھتا کہ چاند کی عدم موجودگی میں بھی کنول کی پتیاں کھلی ہوئی ہیں - شاعر سے ایسی امید کرنا ہی حماقت ہے - وہ صرف بیان پر قادر ہے توجیہ پر نہیں - کسی بیان کی صحت کے لیے مشاہدات و تجربات سے ثبوت حاصل کرنا سائنس داں کا حصہ ہے - پھر یہ کہ کنول سورج کی روشنی کے اثر سے بند بھی نہیں ہوتا - کیونکہ ایسے کنول بھی مشاہدہ کیے گئے جو ۱۱ بجے دن تک کھلے رہتے ہیں - لہذا کنول کھلنے اور بند ہونے کی شاعرانہ توجیہ تو پادر ہوا تھی ہی مگر ابھی تک کسی سائنس داں نے بھی کوئی صحیح وجہ بیان نہ کی تھی - اس مسئلہ پر سب سے پہلے بوس نے روشنی ڈالی —

بوس نے خیال کیا کہ شاید درجۂ حرارت کی کمی بیشی کے ساتھ

کنول کھلتا بند ہوتا ہے - چنانچہ اس نے پھول کے کھلنے اور بند ہونے کی رفتار کو بشکل منحنی واضح کیا - یہ منحنی ۲۴ گھنٹہ کا بنایا گیا - اور ساتھہ ہی ساتھہ دوسرا منحنی ۲۴ گھنٹہ میں درجۂ حرارت کی تبدیلی کا بنایا گیا - اب جو دونوں منحنی مقابلہ میں لائے گئے تو معلوم ہوا کہ واقعی کنول کا کھلنا اور بند ہونا درجۂ حرارت کے تغیر پر منحصر تھا - شام کے ۹ بجے کے بعد جب درجۂ حرارت گرتا گیا کنول کا پھول کھلتا گیا - یہاں تک کہ رات کو ۱۰ بجے پھول پورا کھل گیا - اور جب صبح کو ۹ بجے سورج کی گرمی سے درجہ حرارت بڑھنا شروع ہوا تو پھول بند ہوتا گیا یہاں تک کہ ۱۱ بجے جب خوب گرمی کا وقت ہو گیا تو پھول بالکل بند ہوگیا —

بنگال کے ایک ضلع فرید پور میں ایک خاص قسم کا تاڑ کا درخت پایا جاتا ہے - اس کی خاصیت ہے کہ شام کو غروب کے وقت جھک کر زمین پر آ رہتا ہے - گویا کہ سجدہ کر رہا ہے - صبح ہوتے ہی پھر سیدھا کھڑا ہوجاتا ہے - یہ درخت اپنے اس "عمل عبادت" کو روزانہ دہراتا ہے - اس عجیب و غریب خاصیت نے اس درخت کو اس علاقہ میں خاص اہمیت دے دی ہے اور یہ زائرین کا خاص مرجع ہو گیا ہے - اس تاڑ کا علمی نام Phoenixdactylifera - اس کا تنہ تقریباً ۵ $\frac{1}{2}$ گز لمبا اور ۱۰ - انچہ موٹا ہے —

اسی قسم کا ایک واقعہ لور پول (انگلینڈ) کے قریب بھی مشاہدہ کیا گیا - بوس کے ایک دوست نے وہاں کے ایک اخبار (مورخہ ۳۱ دسمبر - سنہ ۱۹۱۱ ع) کا مندرجۂ ذیل اقتباس ان کے پاس بھیجا —

"......... یہاں بید مجنوں (Willow) کا ایک درخت ہے جو بہت لانبا ہے اور جس کے تنے کا محیط تقریباً ۳ گز ہے .... دیکھا گیا

ہے کہ یہ درخت رات کو تمام کا تمام زمین پر دراز ہوجاتا ہے
اور صبح کو پھر سیدھا کھڑا ہوجاتا ہے۔ اگرچہ یہ عجیب
بات معلوم ہوتی ہے مگر یہ ایسا واقعہ ہے جس کو صدہا
آدمیوں نے تعجب سے دیکھا ہے"۔

ان عجیب و غریب واقعات کی طرف بوس کی توجہ بھی مبذول ہوئی۔ انھوں نے بہت سے مشاہدات کرنے کے بعد اس واقعہ کی توجیہ کی۔ مگر سائنس دانوں نے اس توجیہ کو ان مشاہدات و تجارب کا درست نتیجہ نہ ٹھیرایا جو انھوں نے اس سلسلہ میں کئے تھے۔ چنانچہ یہ بھید اب تک بھید ہی رہا اور کوئی مطمئن کن وجہ اس امر کی نہ بتائی گئی ــ

بوس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

پچپن سال کی عمر پوری ہونے کے بعد بوس کو سنہ ۱۹۱۳ ع میں پریسی ڈنسی کالج کی خدمات سے سبکدوش ہوجانا چاہیے تھا۔ مگر حکومت بنگال نے بوس کی شخصیت اور ان کے ان احسانات کا خیال کرتے ہوے جن سے کالج زیر بار تھا ان کو سنہ ۱۹۱۵ ع تک کالج سے علیحدہ نہ ہونے دیا۔ کالج سے علیحدہ ہوکر اگرچہ عمر کا تقاضا تھا کہ بوس اپنی باقی ماندہ زندگی سکون و آرام سے گذارتے مگر مدت سے ان کے دماغ میں ایک ایسا دارالتجربہ قائم کرنے کا خیال تھا کہ جس میں ہندوستانی طلبہ تحقیق و تدقیق کرسکیں۔ اس خیال نے ان کو نچلا نہ بیٹھنے دیا۔ آخر کار انھوں نے اپنی انسٹھویں سالگرہ ۳۰۔ نومبر سنہ ۱۹۱۷ ع کو اس دارالتجربہ کا افتتاح کیا ــ

دارالتجربہ کی شاندار عمارت عہد اسلامی سے قبل کے ہندوستانی طرز پر بنی ہوئی ہے۔ جس میں جا بجا فن و حرفت کے اعلی نمونے موجود ہیں۔ عمارت کے سامنے ایک چھوٹا سا خوشنما باغیچہ ہے جس میں

زیادہ تر حساس (Sensitive) پودے لگائے گئے ہیں - عمارت میں ایک وسیع ہال ہے جہاں شیشہ کی الماریوں میں وہ آلات قرینہ سے رکھے ہوے ہیں جن سے بوس نے طبیعیات اور نباتات میں تحقیقات کیں - باقی ماندہ عمارت مختلف شعبہ جات تحقیق پر مشتمل ہے - عمارت میں ایک بڑا لکچر ہال ہے جس میں ڈیڑھ ہزار (۱۵۰۰) سامعین کی گنجائش ہے - یہاں ہندوستان کے ہر طبقہ کے طلبا مختلف شعبہ جات سائنس میں تحقیقات کرتے ہیں - اور وہ وقت کچھہ دور نہیں جب کہ بوس کے لگائے ہوے اس " پودے " سے ایسے " پھل پھول " پیدا ہوں کہ جن سے ہندوستان صف علمی میں پھر نمایاں حیثیت حاصل کرسکے —

هوا

از
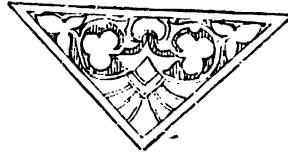
(جناب رفعت حسن صدیقی صاحب - ایم - ایس - سی

(علیگ) ریسرچ انسٹی ٹیوٹ طبیہ کالج دہلی)

ہوا کے راز نے صدیوں سے شعرا اور حکما کو محو حیرت بنا رکھا ہے - یہ امر واقعہ کہ ہم ایک نظر نہ آنے والی شے کے بحر بے کنار میں رہتے ہیں اس ابتدائی زمانہ سے معلوم ہے ' جب کہ انسان عالم وجود میں آیا ' اور اس نے ہوش سنبھالا اور بود و باش اختیار کی - احمق ترین وحشی انسان بھی اس کو بغیر محسوس کیے نہ رہ سکتا تھا کیونکہ اس نے اس شے کی قوت و توانائی کا مشاہدہ بڑی بڑی آندھیوں اور طوفان میں کیا جو بڑے سے بڑے درخت کو خس وخاشاک کی طرح پھینک دیتے ہیں - اور جن میں جنگل کے جنگل ایک آن میں تباہ و برباد ہوجاتے ہیں - لیکن وہ اس قوت عظیم کو اپنے معبودوں یعنی دیوتاؤں ' شیطانوں اور بھوت پریت کی غضب آلودہ جلوہ آرایاں تصور کرتا تھا جو آسمان پر اور فضاء میں سیر و تفریح کرتے پھرتے ہیں اور جن کی ناراضگی قضا و بربادی کا باعث ہوتی ہے - وہ ہوا کے تیز جھونکوں کو دیوتاؤں کی چھل پہل ' درختوں کی سنسناہٹ اور شائیں شائیں کو اُن روحوں کی آہ و زاری ؛ نالہ وشیون خیال

کرتا تھا جو تکلیف و مصیبت میں تھیں - اس کے نزدیک ارض و فلک سربستہ راز تھے - کوئی جگہ خوف و خطرہ سے خالی نہ تھی - ہر جگہ ایک نیا طلسم تھا —

آفرینش عالم کو ایک زمانہ گذر چکا ہے جس کا تعین بھی ممکن نہیں - تہذیب بھی ہے ' تمدن کو بھی فروغ ہے ' لیکن فی زماننا بھی عوام کی توہم پرستی بزبان حال بیان کر رہی ہے کہ الولد سر لابیہ - ہمارے مورث کے ضمیر میں جن اور بھوتوں کا ایسا خوف شامل ہوا تھا جو نہ نکلنا تھا اور نہ نکلا - ترکۂ جدی میں ہم بھی اس سے مستفیض ہوے - باوجود روشن دماغ عالی خیال ہونے کے ہم ان کا شفاف ' نظر نہ آنے والا ' غیر مادی وجود تصور کرتے ہیں - یہ وجود ہمیشہ شب گیسوے دراز کی تنہائی و تاریکی میں ہوا کے تیز و تند طوفانوں میں ' بجلی کی چمک ' بادل کی گرج ' موسلا دھار پانی میں جس وقت سناٹا چھایا ہوتا ہے اور ایک عجیب ہوکا عالم ہوتا ہے نمودار ہوتا ہے - اور پھر لطیف ہوا میں غائب ہو جاتا ہے - ان خیالات کی کچھہ حقیقت ہو یا نہ ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ زمانۂ جاہلیت کی یادگار ہیں اور نسلاً بعد نسل سینہ بہ سینہ منتقل ہوے ہیں —

یونانیوں کے دیوتا کیا ہیں ' جو اپنی قوت کو بادلوں ' بارش ' ژالہ باری اور برق و رعد کی شکل میں پیش کرتے ہیں - وہ صرف اسی ہوا کی پرستش کی یادگار ہیں - سنسان اور سرد شمالی خطہ کے جنگجو اور جری باشندے تمام قدرتی مظاہر کو دیوتاؤں کی طرف منسوب کرتے ہیں - چنانچہ حیرت انگیز افق شمالی کو جو گرج ' چمک اور زلزلہ کے ساتھہ آسمان کو روشن کر دیتا ہے دیوتاؤں کی قوت کا معجزہ قرار دیا گیا —

"The light thou beholdest
Stream through the heavens
In flashes of crimson
Is but my red beard
Blown by the night wind
Affrighting the nations!
Mine eyes are the lightning
The wheels of my chariot
Roll in the thunder;
The blows of my hammer
Ring in the earthquake."

یہ وہ الفاظ هیں جو بادشاہ الاف (Olaf) کے قصہ میں تهور (Thor) دیوتا کی طرف منسوب کئے جاتے هیں - اسی طریقہ پر کرۂ جلو‌ی کی باطل پرستی کے مطابق بجلی کی کڑک دیوتاؤں کی گاڑیوں کے پہیوں کی گڑ گڑاهت تصور کی جاتی هے جو آسمان پر نہایت تیزی سے چلتی هیں اور انهیں کی رگڑ سے آسمان کے فرش پر بجلی کی خیرہ کن چمک پیدا هوتی هے —

دنیا میں حیات و ممات کا سلسلہ ایک غیر متعین زمانہ سے جاری هے - یونانیوں کا فلسفہ، روما کا دبدبہ، مصریوں کا عروج، عربوں کا اقتدار، صرف ماضیء قریب کی یاد گار تصور کرنا چاهیے - شاید هی کوئی زمانہ ایسا گذرا هو جس میں کم و بیش علم و حکمت کا چرچہ نہ رها هو لیکن هوا کی ماهیت کا راز کبهی نہ حل هوسکا —

ابتدائی زمانہ میں یونانیوں میں یہ خیال پیدا هوا کہ هوا لطیف اور نظر نہ آنے والی شے هے - اس کی ساخت جوهری هے - وٹروویس (Vitruvius) نے

یقین کے ساتھہ بیان کیا کہ اس میں وزن ہے - ارسطو نے بھی ہوا کا وزن ثابت کرنے کی غرض سے خالی اور ہوا سے بھر کر تھیلی کا وزن کیا مگر اس کے نتائج امید افزا ثابت نہ ہوئے اس لیے کہ مناسب آلات موجود نہ تھے - اس کے بعد دنیا کے علمی افق پر دوہزار سال تک جہالت و ظلمت کی تاریک گھٹائیں منڈلاتی رہیں - اب فلسفہ مابعد الطبیعیات کا دور شروع ہوا - اس کو تجربہ سے نفرت تھی - انکشافات سے رغبت نہ تھی تو سائنس کی دستگیری ہوتی تو کیسے - ظلمت دور ہوتی تو کیونکر - تاریک افق منور ہوتا تو کیسے - نئی نئی مشکلات تھیں - نئے نئے مذہب تھے - لہذا سیکڑوں برس تک علم و حکمت (سائنس) کی تمام امیدیں سپرد خاک رہیں (ع) اے بسا آرزو کہ خاک شدہ - تجسس و تفتیش کے تمام در بند رہے - قدیم تہذیب و تمدن علوم فنون کا جنگجو وحشیوں نے قلع قمع کیا اور مذہبی رہنماؤں نے ثواب دارین حاصل کرکے اس کو اس سے بھی زیادہ ملیا میٹ کیا جو افواج اٹیلا (Attila) * سے

---

* چوتھی صدی کے ربع آخر میں ھنوں نے جنوبی و مشرقی یورپ پر قبضہ کرلیا - ایک عرصہ تک آپس میں ان لوگوں میں نفاق رھا مگر بعد ازاں سردار روگیلاس نے ان کو متحد کردیا - اس کی وفات پر اس کے دو بھتیجے بلیدا اور اٹیلا جانشین مقرر ھوئے - اٹیلا نے بلیدا کو قتل کرواڈالا اور خود تنہا حکمراں ھوا - حکومت کے پہلے آٹھہ سال میں تمام وحشی قوموں کو مطیع کیا اور قتل وغارت کا بازار گرم کیا - اس نے مشرقی سلطنتوں پر اور آرمینا ' شام ' دجلہ ' فرات وغیرہ پر کئی مرتبہ چڑھائی کی - ایران بھی اس کی زد میں آگیا تھا اور فدیہ دے کر آزاد ھوا - اٹلی پر بھی حملہ کیا تھا مگر سپاہ بیمار ھوگئی اور مجبوراً واپس آنا پڑا - کہا جاتا ھے کہ ایک لڑائی میں اس نے ایک دن میں ۱۷۵۰۰۰ یا ۳۰۰۰۰۰ آدمی قتل کروائے - پھر کیف بیس سال تک اس نے کیسپین سے رائن تک بغیر کسی کی مزاحمت کے حکومت کی —

سر زد هوا تھا —

پندرھویں سولھویں صدی عیسوی میں سائنس نے اپنی مشعل علم کو رفتہ رفتہ پھر بلند کرنا شروع کیا اور اس کے فروغ و ترقی سے هوا کی ساخت کے مسئلے میں بھی واقفیت بڑھتی گئی اور اضافه هوتا گیا —

هوا مادہ ہے اس میں وزن ھے ۔ اگرچه نظر نہیں آتی ہے لیکن حقیقتاً وہ ویسی ھی مادی شے ھے جیسے که پتھر یا سنگریزہ لیکھر کے چھوٹے سے کمرے میں بھی اس کے تیس چالیس ٹن ھوتے ھیں ۔ اگر کمرے کی یه سب هوا منجمد هوکر فرش پر چھت سے گرائی جائے تو نیچے جو چیز بھی هوگی وہ سفوف هوکر میدہ هوجائے گی اور گرنے کی آواز سیکڑوں گز کے فاصله تک سنائی دے گی ۔ اس کا اندازہ اس وقت زیادہ بہتر هوسکتا ھے جب اسی قدر لوھا برابر کی بلندی سے گرایا جائے تو جس شے پر بھی وہ گرے کا قطعاً چکنا چور هوجائے گی ۔ تمام کرۂ هوائی کا وزن تقریباً ۵۲۱۰ بلین ٹن ھے ۔ ھر ایک مربع گز زمین پر آٹھه یا نو ٹن هوا هوتی ھے —

اب سوال پیدا هوتا ھے که اگر هوا حقیقتاً مادی شے ھے تو کیا وجه ھے که هم اس کو نہیں دیکھه سکتے ۔ وہ نظر نہیں آتی ۔ وجه یه ھے که هم اس میں غرق ھیں ۔ وہ ھر طرف سے ھمارا احاطه کئے هوئے ھے ۔ هم پانی کو دیکھه سکتے ھیں لیکن غرق آب مچھلیاں اس کو محسوس نہیں کرسکتیں ۔ تاهم پانی میں هم هوا کے بلبلوں کو اسی طرح دیکھه سکتے ھیں جیسے هوا میں پانی ۔ نظر نه آسکنے کے لیے مادی شے میں حدود کا هونا لازمی ھے ۔ نظر آنے کے لیے یه بھی ضروری ھے که ماحول میں اور اس چیز کے رنگ و شکل میں کچھه فرق هو' جس کو دیکھنا ھے ۔ تاکه آنکھه اُس کو دیکھه سکے اور دماغ محسوس کرسکے ۔ هم کسی شے کو نہیں دیکھتے ھیں بلکه وہ

اس کے خواص هیں جن کو دماغ متمیز کرتا ہے - هوا چونکہ شفاف ہے اور اس میں کوئی رنگ ہے اور نہ اُس کی کوئی اپنی شکل ہے اس لیے هم اس کے دیکھنے سے قاصر هیں - اسی طریقہ پر همارے پس و پیش ' چپ و راست ایک ایسی شے ہے جس کو اثیر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو بھر بھرے پتھر (Granite) سے هزارها گنا زیادہ وزنی اور فولاد سے کرورها گنا زیادہ مضبوط ہے - حالانکہ هم اس کے وجود سے قطعاً ناواقف هیں - طبعی تجربات اس کے وجود کا پتہ دیتے هیں —

گیس کے اس متحرک بحر ذخار میں جس کو هم کرۂ هوائی کے نام سے موسوم کرتے هیں مادہ کا پیہم و مسلسل دوران اور اس کے تمام تغیرات نہایت سرعت کے ساتھہ جاری هیں - هوا کا یہ غلاف نہ هوتا تو تمام دنیا ایک ویرانہ هوتی - اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو معلوم هوگا کہ همارے خوبصورت جہان کی زیب و زینت ' آرائش و زیبائش ' بناو سنگھار ' سجاوٹ و مرصع کاری ' حسن و خوبی ' قصہ مختصر تمام مخلوق کی حیات کا گہوارہ یہی کرۂ هوائی ہے - اگرچہ اس کے بعض تغیرات نہایت غضبناک هوتے هیں اور هلاکت و تباهی کا موجب هوتے هیں لیکن زیادہ تراس کا سلوک مشفقانہ اور همدردانہ ہے - اسی کی وجہ سے هم فضا کی سردی سے محفوظ هیں - همارے جہان کے باهر طبقات بالا میں انتہائی سردی ہے - تپش - ۲۷۳° مئی ہے - اس سردی کا اندازہ اس وقت هوسکتا ہے جب کہ منطقۂ باردہ کی سرد و تاریک ترین شب کی تپش سے اس کا مقابلہ کیا جائے - جو برف کے نقطۂ اماعت سے بہت زیادہ نیچے نہیں گرتا ہے - اگر یہ غلاف ایک رات کے واسطے هٹا دیا جائے تو زمین ' چٹانیں ایسی یخ بستہ هوجائیں جس پر حیات حیوانی ممکن هی نہیں هوسکتی اور سلسلۂ حیات ایک دم منقطع هوجائے —

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں نہیں ہوتا - اس کی وجہ یہ ہے کہ کرۂ ہوائی زمین کی اس طرح حفاظت کیے ہوے ہے جیسے موسم سرما میں گرم کمبل - یہی وجہ ہے کہ ہم پر اس سردی کا اثر نہیں ہوتا - کرۂ ہوائی میں وہ سب خواص موجود ہیں جو شیشہ کے ایک گرم مکان میں ہوتے ہیں - سورج سے روشنی اور حرارت کی منور شعائیں سطح زمین تک آتی ہیں اور اس کو گرم کرتی ہیں لیکن حرارت کی تاریک شعاعیں اس میں ہوکر نہیں گذر سکتیں اور نہ زمین کی حرارت فضاء میں واپس جا سکتی ہے - اس طریقے سے سورج کی گرمی زمین پر جمع ہوتی رہتی ہے اور اس کو سرد ہونے سے بچائے رکھتی ہے جیسے کہ اور کوٹ سردی کے موسم میں ٹھنڈک سے محفوظ رکھتا ہے اور جسموں کو گرم کرتا ہے —

کرہ ہوائی ہم کو آسمانی گولہ باری سے بھی بچائے رکھتا ہے - ہوا میں ہماری تیز سے تیز گولی نصف میل فی ثانیہ کی رفتار سے بھی کم سفر کرتی ہے - لیکن فضاء کی خالی گہرائیوں میں بے شمار لوہے کے سنگ شہابی جن کے قد و قامت مختلف ہوتے ہیں حتیٰ کہ کہیں تو وہ انتہائی چھوٹے ہوتے ہیں اور کہیں ان کے مقابلہ میں پہاڑوں کی بھی کچھ وقعت نہیں بلکہ وہ بالکل ہیچ ہیں ' ایتھر میں بغیر کسی مزاحمت کے بیس تا سو میل فی ثانیہ کی رفتار سے سفر کرتے ہیں - اگر کرۂ ہوائی ہم کو ان سے نہ بچائے تو وہ دن رات بارش کی طرح سطح زمین سے اس زور سے ٹکرائیں کہ مضبوط ترین شے بھی چور چور ہو جائے اور پہاڑوں اور چٹانوں کی جگہ سو سو میل گہری وادیاں بن جائیں - ذرا غور کیجئے کہ بارہ انچ کی بندوق کی گولی جو صرف ایک تہائی میل کی رفتار سے نکلتی ہے وہ فولاد میں

سے اس طرح گزرتی هے جیسے کہ فولاد کاغذ کی دفتی هو ، تو یہ آسمانی گولے جن کی رفتار سیکڑوں گنی زائد اور جو قوت و توانائی اور قد و قامت میں هزاروں گنے زیادہ هیں ، وہ کس قدر زور سے ٹکرائیں گے اور ان کے ٹکرانے سے کیا حشر بپا هوگا - لیکن خوبی کی بات یہ هے ، اگرچہ تعجب خیز معلوم هوتی هے ، کہ زیادہ رفتار کی وجہ سے هی هم ان آسمانی پتھروں سے محفوظ هیں کیونکہ جس قدر تیزی سے وہ کرۂ هوائی میں داخل هوتے هیں اتنی هی ان کی مزاحمت هوتی هے - مزاحمت کی وجہ سے وہ سفید گرم هو جاتے هیں اور هم تک پہونچنے سے قبل هی جل کر خاکستر هو جاتے هیں - سنگ شہابی کا دفعتاً مشتعل هونا اور آسمان پر آهستگی سے نہایت چمک دمک کے ساتھہ گذر کر ختم هوجانا آسمانی گولے کا وجود آخری هوتا هے —

سو ، سوا سو میل کی بلندی پر شہابی پتھروں کو مشتعل پایا گیا هے - لہذا اتنی اونچائی پر بھی کافی هوا هوتی هے - ارهینیس کے تخمینہ کے مطابق کرۂ هوائی کی بلندی ۲۵۰ میل هے - لیکن بعض لوگوں کا خیال هے کہ ۵۰۰ میل هے - جو کچھہ بھی هو لیکن بہر کیف یہ ضرور هے کہ جتنا هم کرۂ هوائی میں زیادہ بلندی پر جاتے هیں اتنا هی هوا کی مقدار اور اس کے دباؤ میں کمی آتی جاتی هے - ۴۲۹۹ میٹر کی بلندی پر یعنی پوتاسی (Potasi) پر سطح سمندر کے مقابلے میں هوا کا دباؤ صرف ۶۲ ۰ رہ جاتا هے - گلیشیر (Glaishier) نے اپنے غباروں کے سفر میں معلوم کیا کہ چھہ سات میل کے درمیان کرۂ هوائی کا دباؤ تقریباً چہارم تھا - پچاس کلومیٹر یا اکتیس میل کی بلندی پر دباؤ ۳ ۶ ۰ مم رہ جاتا هے - جب کہ سطح سمندر کا ۷۶۰ مم هوتا هے - اسی طرح سو کلو گرام یا ۶۲ میل کی

اونچائی پر دباؤ صرف ۰۰۰۶ ء۲ مہر رہ جاتا ہے - لہذا ۶۰ میل کی اونچائی پر ہی ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ ہوائی پمپ سے حاصل ہوتا ہے - ایسی بلندی پر پہنچ کر انسان دفعتاً تشنج میں مبتلا ہوکر ختم ہوجائے گا اور اگر یکبارگی ہم ہوا کے دباؤ میں آجائیں ' جو فی مربع انچ پندرہ پاؤنڈ یا پورے جوان آدمی کے واسطے ۱۴ ٹن ہے ' تو ہمارے خون کی تمام نالیاں پھٹ جائیں گی اور دماغ ' کان ' ناک اور آنکھوں سے خون جاری ہو جائے گا۔ یہ حالت تو صرف ۶۰ میل کی بلندی کی ہے حالانکہ کرۂ ہوائی کی وسعت سیکڑوں میل ہے - ٹروبرج (Trowbridge) [از دی فورم جلد ۲۶ صفحہ ۵۶۱ سنہ ۱۸۹۸ فٹ نوٹ] کا بیان ہے کہ " ایسی نا معلوم فضاء عظیم موجود ہے جو سائنٹفک نقطۂ خیال سے قطب شمالی کے برفیلے خطوں سے بھی کہیں زیادہ دلچسپ ہے - ہوا کے بالائی طبقوں میں کسی کی بھی رسائی ممکن نہیں - اگر یہ فرض بھی کرلیا جاے تو سانس لینے کے واسطے اس کو کافی ہوا کی اور گرم رکھنے کے واسطے کافی ایندھن کی ضرورت ہوگی - کیونکہ صرف دس میل کی بلندی ہی پر ہوا اس قدر لطیف ہوتی ہے کہ تنفس میں دقت واقع ہوتی ہے اور اس قدر سردی ہوتی ہے کہ تپش پیما کا پارہ درجۂ صفر سے کہیں کم ہوگا - اگر کسی پہاڑ کی چوٹی کی یہ تپش ہو تو وہ ہمیشہ برف سے ڈھکی رہے گی - اس اونچائی پر ایک شخص اپنے غبارہ میں اپنے دوست کی آواز قریب کے غبارے میں سے نہیں سن سکے گا خواہ وہ اتنے قریب کیوں نہ ہوں کہ ہاتھ ملا سکیں - آواز کی امواج ایسی جگہ گشت نہیں کرسکتیں " —

پھر بھی ہوا کے یہ بالائی طبقے بغیر ساخت کے نہیں ہیں اور نہ قائم ہیں - بلکہ متحرک ہیں - اس فضا کا ہر ایک حصہ پیچیدہ گردش

کی حالت میں ہے وہاں زبردست ہوائیں ہمیشہ تقریباً ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہیں - کرۂ ہوائی کا مقابلہ ایک بڑی مشین سے کیا جاسکتا ہے جو سورج کی شعاعوں کی گرمی کی وجہ سے متحرک ہے - یہ مشین غیر محدود زمانہ سے چل رہی ہے اور اس میں سے مختلف پیچیدہ ہوائی رویں جاری ہیں جن کی مکمل تحقیق و تفتیش کے واسطے صدیاں درکار ہیں - جدید انکشافات نے ہوا کے بالائی طبقوں کے رموز میں اور بھی اضافہ کردیا ہے - اس لیے کہ یہ ثابت ہوا ہے کہ یہاں زبردست برقی رویں موجود ہیں جو ترو برج کے قول کے مطابق تمام زمین کا احاطہ کیے ہوے ہیں - یہ وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ بلند طبقوں کی لطیف ہوا برق کی ویسی ہی موصل ہے جیسے کہ بہترین دھاتیں موصل ہوتی ہیں - اس میں بھی شک نہیں کہ سورج غیر معین زمانہ سے کرۂ ہوائی کے بالائی طبقوں میں منفی بار کے ذرات مسلسل طریقہ سے شامل کر رہا ہے - برقی رووں کی وجہ سے ان کا رخ زمین کے قطبین کی طرف ہوجاتا ہے - شمالی طبقوں میں یہ جمع ہوجاتے ہیں اور ان سے ان عجیب و غریب قدرتی برقی مظاہر کا ظہور ہوتا ہے جس کو اُفق شمالی (Aurora Borealis) کے نام سے موسوم کرتے ہیں - جس کی بینجنی' سبز اور ارغوانی روشنی کے شرارے بھالوں کے مشابہ ہوتے ہیں - اور اسی وجہ سے بقول شخصے کہنا پڑتا ہے :—

" Fierce fiery warriors fight upon the clouds,

In ranks and squadrons and right form of war. "

کرۂ ہوائی کی گیس کے افزائش و پیدائش کا مسئلہ سائنس دانوں میں ایک عرصہ تک معرض بحث میں رہا ہے - اب یہ یقین کیا جاتا ہے کہ

کرۂ ہوائی کچھ بھی نہیں ہے سواے اس آتشی سحابیہ (Nebula) کے جس میں سے زمین، سورج اور نظام شمسی پیدا ہوے ہیں۔ ابتداءً ایک مشتعل گولا تھا لیکن ایک زمانہ کے بعد تپش کم ہو جانے پر ہماری دنیا عالم وجود میں آئی اور تپش اس قدر کم ہوگئی کہ غیر طیران پذیر اجزاء زمین کے مرکزی طبقوں میں مائع حالت میں جمع ہوگئے اور پھر تپش اور کم ہو جانے کی وجہ سے اس پر ایک جامد تہ بن گئی۔ اس طریقہ سے ہماری زمین کی ساخت عمل میں آئی۔ زیادہ طیران پذیر گیسیں اور بخارات جو باقی بچے وہ کرۂ ہوائی میں شامل ہوگئے۔ کرۂ ہوائی میں اس وقت سحابیہ کے وہ اجزا شامل ہیں جو سطح زمین کی موجودہ تپش میں گیسی حالت میں قائم رہ سکتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ سحابیہ کی تکثیف کا مسئلہ ابھی پورے طریقہ سے حل نہیں ہوا ہے۔ زمانۂ مستقبل میں جب کہ زمین کی تپش اور کم ہو جاے گی اور وہ سرد ہو جاے گی تو گیسی ہوا پہلے مائع شکل میں منتقل ہوجاے گی اور بعد ازاں جامد شکل اختیار کرلے گی۔ اس وقت ہم یہ کہہ سکیں گے کہ آتشی سحابیہ کی مکمل تکثیف ہوگئی ــ

یہ کیسی تعجب خیز بات ہے کہ موسم گرما کی باد سموم، موسم بہار کی باد نسیم اور موسم سرما کے سرد جھونکے جو دن رات کبھی فرحت و مسرت کا سامان مہیا کرتے ہیں اور کبھی باعث کلفت اور رنج و محن ہوتے ہیں ان کی عمر پرانی سے پرانی پہاڑیوں اور قدیم ترین سمندروں کے مقابلہ میں بہت ہی زیادہ ہے۔ یہ پہاڑ و سمندر کل کے بچے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ہوا اس وقت سے چلنا شروع ہوئی ہے جب کہ ہماری زمین کی کوئی شکل نہ تھی بلکہ گیسی وسعت تھی یا ایک میدان تھا، اور

اس وقت تک برابر چل رہی ہے اور شب و روز غیر معین زمانہ تک یوں ہی چلتی رہے گی جب تک کہ سورج سرخ شفق جیسی حالت میں نہ آجاے اور پھر شب تاریک کی طرح بالکل تاریک نہ ہوجاے۔ اس وقت اور صرف اس وقت کرۂ ہوائی کا دور دورہ ختم ہوگا اور ہمارے اردگرد سخت چٹانوں کی شکل میں اس کی تکثیف ہوجاے گی —

ہوا مختلف گیسوں کا آمیزہ ہے لیکن زیادہ تر مقدار نائٹروجن اور آکسیجن کی ہے جو ۴ : ۱ کے تناسب میں ہیں یعنی ۴ حصہ نائٹروجن کے اور ایک حصہ آکسیجن کا۔ ہوا کا عامل جز آکسیجن ہے جس سے ہمارے جسموں کا احتراق ہوتا ہے۔ نائٹروجن غیر عامل شے ہے جو نہ معین احتراق ہے اور نہ معین تنفس۔ دوسری گیسوں کا تناسب ہوا میں بہت ہی کم ہے۔ نقشۂ ذیل میں جدید انکشافات کی بناء پر ہوا کے اجزا کا تناسب دیا جاتا ہے —

نقشہ

خشک ہوا کے ایک مکعب میٹر (یا ۱۰۰۰ لٹر) میں [میٹر = ۳۹٫۳۷۱ انچ اور ایک پاونڈ = ۴۵۴ گرام] —

۷۸٫۰۳ لٹر	نائٹروجن	گیس	۹۷۵٫۸۰ گرام
۲۰٫۹۹ "	آکسیجن	"	۲۹۹٫۸۴ "
۰٫۹۴ "	آرگن	"	۱۶٫۷۹ "
۰٫۰۳ "	کاربن ڈائی آکسائڈ	"	۰٫۵۹ "
۰٫۰۱ "	ہائڈروجن	"	۰٫۰۱ "
۱۰۰۰ "			۱۲۹۳٫۰۰ "

ان گیسوں کے علاوہ دوسری غیر عامل گیسیں موجود ہیں جو حال ہی میں معلوم ہوئی ہیں :—

۰٫۰۱۵	لٹر	نیان (Neon)	۰٫۰۱۳۳۹	گرام
۰٫۰۰۱۵	"	هیلیم (Helium)	۰٫۰۰۰۲۷	"
۰٫۰۰۰۱۵	"	کرپٹن (Krypton)	۰٫۰۰۰۱۸	"
۰٫۰۰۰۰۰۰۶	"	زینان (Xenon)	۰٫۰۰۰۰۳	"

ان کے علاوہ اوزون ' اموئیم نائٹریٹ ' نائٹریٹ' سلفریٹیڈ هائڈروجن۔ خورد بینی جراثیم' ذرات خاک وغیرہ کی بھی انتہائی قلیل مقدار شامل ہے —

گریہم کی ایک تفصیل سے یہ توازن اور زیادہ واضح و صاف ہو جاتا ہے —

وہ بیان کرتا ہے کہ فرض کرو کہ هوا کے اجزا یک بیک علحدہ علحدہ ہو جائیں اور وہ ایسے علحدہ ہوں کہ آپس میں نہ مل سکیں اور ان کی کثافت اضافی کا بھی لحاظ ہو' تب سطح زمین پر یکے بعد دیگرے حسب ذیل غلاف ہوں گے —

پانی (مائع) ... ... ۱۵ انچ

کاربن ڈائی آکسائڈ ... ... ۱۳ فٹ

آرگن ... ... ۹۰ گز

آکسیجن ... ... ۱ میل

نائٹروجن ... ... ۴ میل

یہ اس وقت ممکن ہوسکتا ہے جب کہ یہ فرض کرلیا جائے کہ گیسیں ہر جگہہ کرۂ ہوائی کے دباؤ پر ہیں —

پانی کی مقدار جو ھوا میں بخارات کی شکل میں موجود ھے وہ کچھہ زیادہ نہیں ھے - ھوا کے سو حصوں میں ۳-۱ حصے آبی بخارات کے ھوتے ھیں - ھوا کے وزن کے اعتبار سے یہ ۸۴ء۰ فی صدی ھوگا - ھوا کے ایک مکعب میٹر میں دس گرام آبی بخارات ھوتے ھیں - ظاھرا یہ مقدار بہت ھی قلیل معلوم ھوتی ھے لیکن اگر ھم تمام کرۂ ھوائی پر اور پھر آبی بخارات
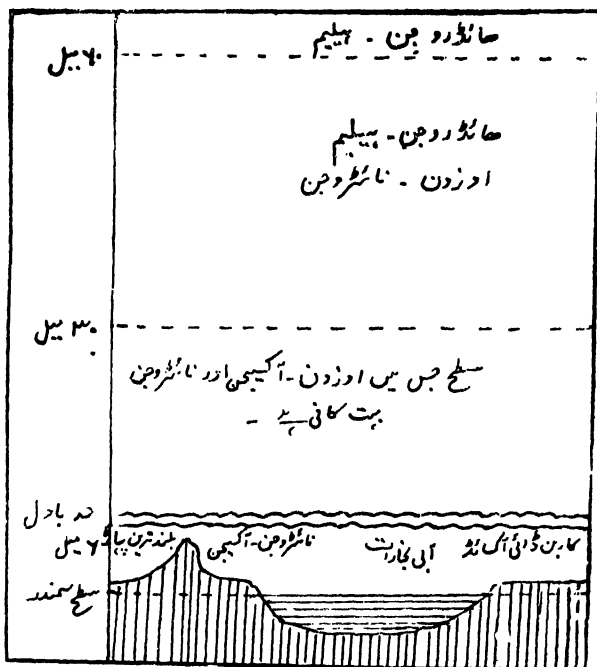
زمین کے کرۂ ھوائی کا ایک حصہ جس سے معلوم ھوتا ھے کہ بلندی پر کس طرح ترکیب مختلف ھوتی جاتی ھے --

پر غور کریں تو معلوم ھو کہ یہ کس قدر ھے - اس کے تقریباً پچاس بلین ٹن ھوں گے اور اس سے بارہ ھزار مربع میل کی ایک میل گہری جھیل بن سکتی ھے --

ان آبی بخارات کا دنیا کی آب و ہوا پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے اگر یہ سب دور ہو جائیں تو کرۂ ہوائی کی تپش تقریباً ۲۰ درجہ مئی کم ہو جاے اور سطح زمین کا بیشتر حصہ برف کے ایسے ویرانہ میں منتقل ہوجاے جیسا کہ منطقۂ باردہ میں موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آبی بخارات سورج کی منور شعاعوں کے واسطے شفاف ہیں لیکن غیر منور کے واسطے کثیف۔ اس میں سے ہوکر سورج کی شعاعیں زمین تک آتی ہیں اور اس کو گرم کرتی ہیں لیکن حرارت کی تاریک شعاعیں جو زمین سے خارج ہوتی ہیں وہ پھر فضاء میں واپس نہیں جا سکتیں۔ ان سب کو کرۂ ہوائی کے آبی بخارات اور کاربن ڈائی آکسائڈ روکے رکھتی ہے اور اس وجہ سے تمام سطح زمین کی اوسط تپش میں کمی نہیں پیدا ہونے پاتی۔

آبی بخارات ہوا سے بہت ہلکے ہوتے ہیں۔ مساوی الحجم خشک ہوا کے مقابلہ میں ان کا وزن ۰٫۶۲ ہوتا ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ وہ ہوا سے بہت ہلکے ہیں - وہ اتنے ہلکے ہوتے ہیں جیسے کول گیس (Coal gas) جو غباروں کے بھرنے میں کام میں آتی ہے - سبک پن ہی ابخروں سے بھری ہوئی ہوا کو کرۂ ہوائی کے بالائی سرد طبقوں کی طرف بھیجتا ہے - اور وہاں بخارات کی تکثیف پانی کے قطروں کی شکل میں ہو جاتی ہے اور یہی بادل ہیں جو آسمان پر گھومتے پھرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سطح زمین سے عام طور پر بہت زیادہ بلندی پر پائے جاتے ہیں۔ اب ذرا غور کیجئے کہ سائنس کے ایک ادنیٰ واقعہ سے کس قدر رموز وابستہ ہیں۔ مثلاً لیجئے اگر بخارات کا وزن خشک ہوا کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا تو مرطوب ہوا سطح زمین کو ہرگز نہ چھوڑتی۔ اس سے

ہماری زندگی پر بہت کچھ اثر پڑتا - ہماری آنکھیں نہ سورج کی روشنی کو دیکھ سکتیں اور نہ چرخ نیلگوں کا لطف اُٹھا سکتیں - ہم ہمیشہ کہر میں رہتے - ہم سیکڑوں فٹ موٹے کہر میں مقید ہوتے - دنیا کے تمام پر فضا و دلفریب مناظر کی ہم پر کوئی کیفیت نہ طاری ہوتی - نہ کسی پہاڑی کی گلکاریاں دیکھنے کا موقع ہوتا اور نہ کسی وادی کی سر سبزی و شادابی کا - ہر جگہ سنسان اُداس اور پائمال ہوتی - ہم صرف فاصلہ سے ہی آبشار نیاگرا اور سمندر ساحل کی امواج کا شور سن سکتے - زیادہ کہر کی وجہ سے کبھی بھی ہماری آنکھیں اس کو نہ دیکھ سکتیں - غالباً ہم کو ان کا سبب ہی نہ معلوم ہوتا - تمام بحر اور بحیروں پر کہر کی انتہائی موٹی چادر ہوتی - کسی نئی جگہ کا انکشاف نہ ہوا ہوتا - وہ تاریکی و ظلمت ہی میں اسوقت تک پڑی ہوتی - ہر جگہ بھید' اسرار' خوف اور ڈر سے پر ہوتی - اس میں شک ہے کہ ایسی صورت میں انسان خود بھی مہذب ہوا ہوتا یا نہیں -

ہوا میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار اگرچہ کم ہے (۰۰۳ء۰ فیصدی) لیکن وہ بھی بہت زیادہ اہم ہے - کیونکہ حیوانی و نباتی اشیاء کی سب کاربن اسی سے حاصل ہوتی ہے - اس کی مقدار ہر جگہ مختلف ہوتی ہے - قصبات کے مقابلے میں بڑے بڑے شہروں میں زیادہ ہوتی ہے اور سمندر کے مقابلے میں بڑے بڑے قصبات میں - سطح زمین کے مقابلہ میں (۰۰۲۹ء۰ فیصدی) کچھ بلندی پر زیادہ ہوتی ہے (۰۰۳۳ء۰ فیصدی) - اس کی وجہ یہ ہے کہ اوپری حصوں میں آتش فشاں پہاڑ اور اونچی اونچی چمنیاں ہوا میں ہمیشہ اس گیس کی بہت زیادہ مقدار شامل کرتی رہتی ہیں - اور بخلاف اس کے پودے نیچے کے حصوں میں سے اس کو حاصل کرتے رہتے

هیں - آدمی روزانہ اس گیس کی تقریباً ڈیڑھ ملین ٹن مقدار خارج کرتے هیں لیکن اس سے کہیں زیادہ مقدار دوسرے ذرایع سے، مثلاً نباتی و حیوانی مادے کے سڑنے و گلنے سے، آگ سے، آتش فشاں پہاڑوں سے، اور زمین کے درازوں اور شگافوں سے، خارج هو کر هوا میں شامل هوتی رهتی هے۔
اوزون کی مقدار بھی هوا میں هر جگہ مختلف هوتی هے۔ سطح زمین کے قریب بڑے بڑے شہروں میں وہ بالکل نہیں پائی جاتی لیکن جیسے هی هم کرۂ هوائی میں بلندی پر پہونچتے جائیں اس کی مقدار بہت تیزی سے بڑھنی شروع هو جاتی هے - بڑے بڑے پہاڑوں پر زمین کے مقابلہ میں چار گنی هوتی هے - بہت زیادہ بلندی پر جہاں انتہائی سردی اور بہت هی کم دباؤ هے برق کی بڑی بڑی رویں اور اوزون پیدا کرنے والی سورج کی بالا بنفشئی شعاعیں هوتی هیں، وهاں اس کی مقدار بہت هی زیادہ هوگی - ان طبقوں میں هوا کی آکسیجن اوزون میں منتقل هو جائے گی۔ اس گیس کی قلیل مقدار جو نیچے کے حصوں میں پائی جاتی هے وہ صرف اوپر سے چھن چھن کر شامل هو گئی هے -

کرۂ هوائی کی سبک ترین گیسیں جو همیشہ زمین سے نکل کر هوا میں شامل هوتی رهتی هیں وہ آهستہ آهستہ اوپر اٹھتی هیں لیکن انتہائی اونچے طبقوں میں پہونچتی هیں - لہذا سو ۱۰۰ کلو گرام یا ۶۲ میل کی اونچائی پر کرۂ هوائی میں $\frac{1}{2}$ ۹۹ فیصدی هائڈروجن اور نصف فیصدی هیلیم هوگی [از کتاب غیر نامیاتی کیمیا مصنفۂ ارتمان صفحہ ۳۴۷ سنہ ۱۹۰۶ ع خطبہ برٹش اسوسیشن از ڈیوار صفحہ ۲۰ سنہ ۱۹۰۲]۔ یہ واقعات خیالی نہیں هیں بلکہ مشاهدات کی بناء پر اخذ کیے گئے هیں اس لیے کہ سنگ شہابی جب سو میل کی بلندی پر مشتعل هو کر نظر آتے

هیں تو ان کے طیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہائڈروجن اور ہیلیم کے کرۂ ہوائی میں دوڑ لگا رہے ہیں -

اگر کسی طریقہ سے کوئی پہاڑ اسقدر بلند ہو جائے اور اس پر پہونچنا بھی کسی صورت سے ممکن ہوجائے پھر بھی کوئی جاندار اس پہاڑ کی چوٹی کی ہوا میں ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا - اس لیئے کہ سانس لینے کے واسطے آزاد آکسیجن نہیں ہوگی اور انسان دم گھٹ کر مر جائے گا ایسی جگہ کی ہوا میں موم بتی روشن نہیں ہوسکےگی اور کوئلہ اور کاغذ ایسے ہی غیر احتراق پذیر ہوں گے جیسے ایلنٹ یا پتھر -

یہ تعجب کی بات ہے کہ کمیاب اور وزنی کرپٹن نامی گیس سو میل سے زائد کی بلندی پر پائی جاتی ہے جیسا کہ افق شمالی کے طیف سے معلوم ہوتا ہے - ہائڈروجن کے مقابلے میں اس گیس کا جوہر ۴۱٫۸ گنا زیادہ وزنی ہوتا ہے اور اس لحاظ سے اس قدر بلندی پر اس کو جمع نہیں ہونا چاہئے تھا -

ہوا کے طبقات بالا کے متعلق بہت سے ایسے مسائل ہیں جو عجیب و غریب معلوم ہوتے ہیں - ان کے مسائل کا حل ہونا تو درکنار ہم ان کے متعلق ابھی تک کچھہ واقعات ہی جمع کر رہے ہیں -

معمولی حالت میں ہوا کی کوئی شکل نہیں ہوتی ہے - لیکن تاریک کمرے میں اگر کھڑکی وغیرہ کی دراز یا کسی سوراخ میں سے جس میں سے ہوکر روشنی گذرتی ہو؛ دیکھا جائے تو ہم کو وہ چمکیلی معلوم ہوتی ہے - اس میں ہزارہا خورد بینی ذرات متحرک نظر آئیںگے - کسی بڑے شہر پر ایسے ذرات کا ایک بڑا سمندر ہوتا ہے - کرۂ ہوائی کی بہت زیادہ بلندی جہاں کہ رسائی ممکن ہے وہاں بھی یہ موجود ہوتے ہیں لیکن وہاں

ان کی مقدار بہت کم ہوتی ہے - آخر یہ کہاں سے آتے ہیں؟ سطح زمین کے قریب یہ خاک کے ذرات ہوتے ہیں - ساحل سمندر کے قریب ریت اور نمک کے اور پھر ان میں مفید و مضر جراثیم شامل ہوجاتے ہیں - ہوا ان کو ہر جگہ اڑائے پھرتی ہے - اور کرۂ ہوائی میں خوردہ بینی ہونے کی وجہ سے یہ قائم رہتے ہیں -

کرہ ہوائی کے بلند طبقوں میں ان ذرات کے ہونے کی وجہ اور ہے- وہاں صدیوں سے اوپر کے طبقوں میں کرۂ ہوائی کی حددو سے باہر ذرات شامل ہوتے رہے ہیں اور سلسلہ تا ہنوز جاری ہے - یہ ذرات کائناتی (Cosmic) خاک کے ہیں کیونکہ ہمارے جہان میں ہر ایک ستارہ ، ہر ایک سورج ، اور تقریباً ہر ایک سیارہ خواہ وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ فضاء میں چھوٹے چھوٹے ذرات متواتر و مسلسل طریقہ سے داخل کر رہا ہے - کوہ آتش فشاں کے پھٹنے سے بھی کچھ خاک نکل کر فضاء میں جاپہنچتی ہے- سورج اور لکھو کھا دوسرے اجسام میں جو رات کے وقت آسمان کو منور کر دیتے ہیں ان کی سطح پر ہر لمحہ ایسے سیکڑوں دھماکے ہوتے ہیں جن کی آواز اور جن کا زور ارضی شدید ترین دھماکوں سے کہیں زیادہ ہوتا ہے - یہ سیکڑوں ٹن خاک فضاء میں شامل کر دیتے ہیں - اس طریقہ سے سورج ایک سال میں 'تین کھرب' ٹن خاک خارج کر کے فضا میں پہنچاتا ہے اور اتنے ہی وقفہ میں کم از کم بیس ہزار ٹن خاک کا زمین پر اضافہ ہوتا ہے —

تمام فضاء میں یہ سلسلہ غیر محدود زمانہ سے جاری ہے - تمام جہان ، جہاں تک دوربینیں کام دیتی ہیں ، خاک سے بھرا ہوا ہے - تمام خاک جو زمین یا سورج میں جمع ہے وہ ایک زمانہ میں فضاء میں گردش کرتی پھرتی تھی اور پھر ایک زمانہ گذرنے کے بعد ایک ہی مرتبہ نہیں بلکہ

بہت سی دفعہ پھر اسی میں گردش کرے گی ۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ سورج ختم نہیں ہوجاتے اس کی وجہ یہ ہے کہ جس قدر خاک وہ خارج کرتے ہیں اسی قدر ان میں آکر شامل بھی ہو جاتی ہے ۔ اسی وجہ سے جہان میں ایک توازن قائم ہے ۔ یہ خاک سورج یا ستارے سے نکلتے ہی ہزاروں میل فی سیکنڈ کی رفتار سے گردش کرتی پھرتی ہے ۔ بالاخر یہ ذرات متحد ہوجاتے ہیں اور ان سے سنگ شہابی بنتے ہیں (اور بعد ازاں ان کا وجود دمدار ستاروں (Comets) سحابیوں (Nebulae) سورج اور سیاروں میں منتقل ہوجاتا ہے ۔ ہر ایک سنگ شہابی (Meteorite) جو ہمارے کرہ میں داخل ہوتا ہے وہ پھر رگڑ سے خاک ہوجاتا ہے جو زمین پر آکر گر جاتی ہے —

اس میں سے زیادہ تر خاک برقائی ہوئی ہوتی ہے اور اس منفی برق کی حامل ہوتی ہے جو منطقۂ باردہ شمالی و جنوبی کے باشندوں کو حیرت میں ڈال دیتی ہے ۔ برق جو ہمارے کرۂ ہوائی میں آہستہ چلنے والی آتشی گیند کی صورت میں گردش کر رہی ہے وہ کچھہ تو سورج سے حاصل ہوتی ہے جس کا فاصلہ کروڑ ہا میل ہے اور کچھہ ستاروں سے خارج ہوتی ہے جو اس قدر فاصلہ پر ہیں کہ ان کا بعد مسافت انسان کے تخیل میں بھی نہیں آسکتا —

یہ خاک ہمارے واسطے بہت ہی مفید شے ہے ۔ اسی پر ہوا کے آبی بخارات کی بارش و بادلوں کی شکل میں تکثیف ہوتی ہے ۔ اگر ہوا میں مطلق خاک نہ ہوتی تو غالباً زمین خشک ہوتی ؛ بغیرپانی کا ویرانہ ہوتی ' کہیں بھی بارش نہ ہوتی اس لیے کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بغیر کسی مرکزہ (Nucleus) کے آبی بخارات کی تکثیف نظر آنے والے قطرات کی شکل

میں نہیں ہوسکتی —

جب ہم خاک کے ان چھوٹے چھوٹے ذرات کی حرکت و گردش پر غور کرتے ہیں تو ہم کو احساس ہوتا ہے کہ ہوا حقیقتاً اس سے بھی کہیں زیادہ پیچیدہ ہے جتنا کہ ہم نے خیال کیا تھا - اسی خاک نے یونان و ہندوستان کے حکما و فلاسفا کے دماغوں کو نظریہ جواہر کی طرف منتقل کیا - ہندی فلسفیوں کے مطابق ہر ذرہ کو چھہ مرتبہ تقسیم کرنے پر جواہر حاصل ہوسکتے تھے لیکن اب ہم کو معلوم ہے کہ جواہر ہزار ہا لکھو کھا مرتبہ تقسیم کے بعد حاصل ہوسکتے ہیں - اگر ہم ہوا کو کرور ہا گنا زیادہ بڑا کریں تا کہ اس کے سالمات اس قدر بڑے ہوجائیں کہ وہ نظر آسکیں تو اس کی پیچیدگی اور بھی زیادہ محو حیرت بنا دے گی - اس وقت خاک کا ایک ذرہ کہکشاں سے سیکڑوں کرور ہا گنا زیادہ بڑا ہوگا اور اس میں جواہر صرف اخروٹ کے قد و قامت کے نظر آئیں گے - یہ بہت ہی قریب ہوں گے اور نہایت سرعت کے ساتھہ متحرک ہوں گے - گردش کا سلسلہ پیہم و متواتر ہوگا - ذرہ کے ارد گرد ہر سمت میں ہوا کے بے شمار سالمات تقریباً ۴۸۵ میٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے ٹکرائیں گے - ہوا کے سب سالمات بھی ایک ہی طرح کے نہ ہوں گے بلکہ مختلف نوع کے ہوں گے - اگر ہم ایک جگہ بیٹھہ کر اس کی سیر کریں تو معلوم ہوگا کہ دس ہزار سالمات میں ۷۸۰۰ نائٹروجن کے ہیں ' ۲۱۰۰ آکسیجن' کے ۹۴ آرگن کے ' ۳ کاربن ڈائی آکسائڈ کے اور ایک ہائڈروجن کا - دوسروں کی مقدار اس قدر کم ہے کہ اگر ہوا کے سالمات ایک مرتبہ فی سیکنڈ کی رفتار سے گردش کریں تو زینان کے ایک سالمہ کو دیکھنا پانچ سال بعد نصیب ہوگا بشرطیکہ ہم دن و رات اس کو نہایت غور سے دیکھتے رہیں اور کرپٹن کا ایک سالمہ کا جلوہ

آٹھہ ماہ بعد نصیب ہوگا - ہیلیم کے سالمہ کے واسطے تین ماہ اور نیان کے واسطے تقریباً ایک ہفتہ درکار ہوگا - بخلاف اس کے ایک سنٹ میں نائٹروجن کی ۴۸ اور آکسیجن کی ۱۲ گردشیں ہوتی ہیں - کس قدر بڑا فرق ہے - اس حالت کا کچھہ اندازہ ہم کو اس وقت ہوسکتا ہے جب ہم ایک برف کے طوفان کا منظر اپنے پیش نظر رکھیں جس میں بہت ہی زیادہ ژالہ باری ہورہی ہو - اس میں ہم کو خیال کرنا پڑے گا کہ ہر ایک اولہ ۵۰۰ گز فی سیکنڈ کی رفتار سے متحرک ہے تاکہ اس کی رفتار ہوا کے سالمات کی رفتار کے برابر ہو جائے - ایسی حالت میں ہوا کے سالمات یا اولے بندوق کی گولیوں کی طرح نہایت ہی تیزی سے متحرک ہوں گے —

اب ذرا خیال کیجئے کہ ایک مکعب سنٹی میٹر ہوا میں کم از کم ۳۶ سنکھ (Sixty Trillion) سالمات ہوتے ہیں - اب ذرا کل کرۂ ہوائی کا خیال کرو جو ہر سمت میں میلوں دور تک پھیلا ہوا ہے - یہ اعداد و شمار بے انتہا زیادہ ہیں - خیال و وہم میں بھی نہیں آسکتے - اب ان زبردست ہوائی رؤں کا خیال کیجئے جو ہر سمت میں طوفانوں وغیرہ کی شکل میں آشکارہ ہوتی ہیں - ہوائیں بے شمار سالمات کے طوفان عظیم ہیں - جو ایک ہی سمت میں بپا ہوتے ہیں - اگر ایک ایسے پتنگے کا خیال کیا جائے جو ہوا کے صرف ایک سالمہ میں بالکل اس طرح سکونت پذیر ہو جیسے کہ ہم زمین پر ہیں تو اس پر چپ و راست نہایت تیزی سے گردش کرنے والے لکھوکھا سالمات کی وہی کیفیت طاری ہوگی جو کہکشاں کی زمین کے ہیئت دانوں پر ہوتی ہے - آخر اس پیچیدگی کی غرض و غایت کیا ہے اور اس کا اختتام کب ہوگا ؟ ہر سالمہ کی اپنی انفرادی ہستی ہے اور ہر ایک کا ایک سلسلۂ حیات ہے ہر ایک خاص قوانین کے ماتحت بدون خلاف ورزی

اسی طرح مصروف گردش ہے جیسے سیارے اپنے مدار پر سورج کے گرد گردش کرتے ہیں —

ہمارے باپ دادا کو جب کہ وہ جوان تھے یہ بتایا جاتا کہ مستقبل قریب میں نظر نہ آنے والی ہوا کو وہ چمکتی ہوئی مائع کی شکل میں دیکھہ سکیں گے جو برف کی تپش پر بھی جوش کھانے لگے گی، الکوحل کو منجمد کردے گی، تو ان کے تعجب و حیرت کی کوئی انتہا نہ رہتی - اور اس وقت تو حیرت سے مہر بہ سکوت ہوتے اگر ان سے کہا جاتا کہ بعد ازاں اس کو برف جیسی جامد شکل میں بھی حاصل کرلیا جائیگا - یہ اس قدر سرد ہوگی کہ صرف چھونے سے نہایت تیز آگ کی طرح جلنے لگے گی - اب ہم قارئین کو کچھہ جدید انکشافات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں جن کی بناء پر یہ عجیب و غریب نتائج حاصل ہوئے ہیں —

" دیوار (Dewar) کا بیان ہے کہ معمل میں مائع ہوا کا پیدا کرنا انتہائی دشوار امر ہے جیسے بھاپ سے پانی کا حاصل کرنا جب کہ وہ سفید حرارت (White heat) پر ہو اور ماحول و آلات بھی اسی بلند درجۂ تپش پر ہوں - اس میں صرف یہ دشواری نہیں ہے کہ انتہائی سردی کیسے پیدا کی جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ تیار ہونے کے بعد وہ ارد گرد کے نسبتاً گرم ماحول سے کیسے محفوظ رہے " - ایک صدی کی جانفشانیاں اور استقلال کے ساتھہ کاوشیں برداشت کرنے کے بعد انسان کو اس پر فتح حاصل ہوئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ مائع ہوا ایک مرتبہ میں صرف گیلنوں کی مقدار ہی میں تیار نہیں ہوسکتی ہے بلکہ وہ ہفتوں تک ایسے ظروف میں بھی رکھی جاسکتی ہے جن کو دیوار نے ایجاد کیا ہے، اور جن پر ماحول کی گرمی کا مطلق اثر نہیں ہوتا ہے —

هوا کی اماعت میں جن اصولوں کو دخل هے وہ بہت هی آسان هیں ' جب گیس کو دبایا جاتا هے تو حرارت پیدا هوتی هے - بخلاف اس کے جب اس کو آزادی سے اور دفعتاً پھیلنے دیا جاتا هے تو سردی پیدا هوتی هے - گیس کی ابتدائی تپش جس قدر کم هوگی پھیلنے میں اسی قدر زیادہ سردی حاصل هوگی - ان هی اصولوں پر هوا کی اماعت کے واسطے لنڈے (Linde) هامپسن (Hampson) ٹر پلر (Tripler) نے مشینیں تیار کی هیں - لنڈے کی مشین کا خاکہ شکل ۲ میں دیا گیا هے - معمولی تپش اور ۲۰۰ ایتھما سفیر کے دباؤ پر ایک مضبوط نلی الف ب ج ہ میں هوکر هوا داخل هوتی هے -
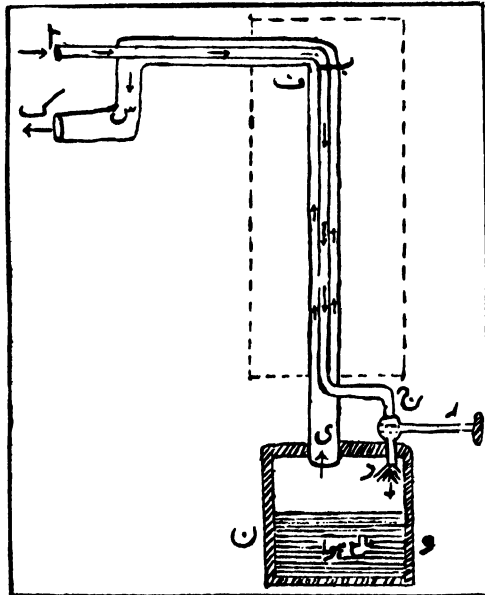
شکل ۲ هوا کی اماعت کے واسطے لنڈے کا آلہ

صمام (Valve) ر کو درست کرکے کمرۂ ن و میں جہاں کہ دباؤ صرف ۲۰ ایتھما سفیر هوتا هے - اس کو یک بارگی پھیلنے دیا جاتا هے - اس عمل میں

بہت سردی پیدا ہوتی ہے اور ہوا سرد ہوکر نلی ی ت س ک میں گذرتی ہے اور نلی الف ب ج د میں نئی داخل ہونے والی ہوا کو سرد کردیتی ہے - اس کے بعد یہ سرد کی ہوئی ہوا ج پر آکر پھیلتی ہے- اس کی تپش نسبتاً کم ہوتی ہے اور جب یہ نلی ی ت س ک میں گذرتی ہے تو داخل ہونے والی ہوا کو اور زیادہ ٹھنڈا کردیتی ہے - یہ سلسلہ جاری رہتا ہے یہاں تک کہ تپش اس قدر کم ہوجاتی ہے کہ ج پر پھیلتے ہی اس کی اماعت بے رنگ مائع میں ہوجاتی ہے جو نہایت تیزی سے کمرہ ن و میں جمع ہوجاتا ہے - سرد ہوا جو ی ت س ک میں ہوکر گذرتی ہے پھر نلیوں میں پھر نچائی جاتی ہے اور اس کو ۲۰۰ ایتماسفیر کے دباؤ پر دبایا جاتا ہے اور معمولی تپش پر پانی سے ٹھنڈا کیا جاتا ہے اس لئے کہ دبانے سے وہ بہت گرم ہوجاتی ہے - اور بعدازاں اس کو پھر داخل ہونے والی نلی میں گذارا جاتا ہے - چونکہ ان نلیوں میں اندر تپش انتہائی کم ہوتی ہے اس لئے ان کو باہر کی حرارت سے اون یا پروں کے ذریعہ سے بچائے رکھنا چاہیے - مشینوں میں نلیوں کے حصے ب اور ی کے درمیان سیکڑوں گز لمبے ہوتے ہیں لیکن ان کو مرغولہ کی طرح بنایا جاتا ہے اس لئے کم جگہہ میں آجاتے ہیں - مائع ہوا سے آکسیجن اور نائٹروجن کا علحدہ کرنا آکسیجن گیس کی تیاری کے سلسلہ میں بتایا جا چکا ہے -

مائع ہوا تیار ہونے کے بعد اس کا قائم رکھنا بھی کوئی آسان کام نہیں - یہ بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا پانی کو قائم النار کردینا - ڈیوار نے اس مسئلہ کو بھی حل کردیا - اس کے رکھنے کے واسطے اس نے دوہری دیواروں کے برتن تیار کئے - دیواروں کے درمیان کی جگہ میں پہلے ہی خلا کر دیا گیا تھا - خلا کی وجہ سے باہر کی حرارت کا مائع

هوا پر مطلق اثر نہیں هوتا هے اور وہ هفتوں تک اس میں رکھی جاسکتی هے - ایسے ظروف میں نقصان یا ضائع هونے کا ڈر نہیں هوتا اور وہ هزاروں میلوں کے فاصلے پر بھیجی جاسکتی هے حالانکہ جس ماحول میں کہ وہ هے وہ مقابلتاً سرخ گرم کہلائے جانیکا مستحق هے - اب ذرا ان عجیب و غریب امکانات پر بھی غور کیجئے جو دیوار کی صراحیوں نے پیدا کردیے هیں - صدیاں گذرنے کے بعد جبکہ دنیا کا کوئلہ تقریباً ختم هوجائے گا
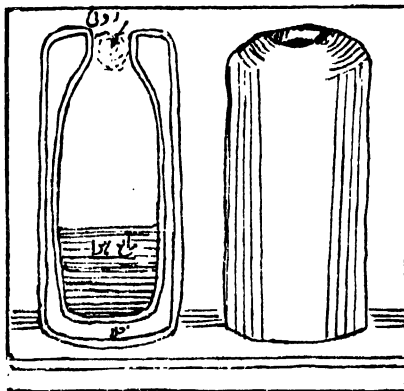
شکل ۳

مائع هوا رکھنے کا خلا دار ظرف - ایسی صراحیوں میں گرم یا سرد مائع ایک عرصہ تک رکھے جاسکتے هیں -

اور آگ کا روشن کرنا ایک امر گراں بہا هوگا اس وقت یہ خلا والے ظروف مائع چیزوں کو گرم یا سرد رکھنے میں عام طور سے استعمال هونے لگیں گے بلکہ مکانوں کی دیواروں پر بھی سردی یا گرمی کا کچھہ اثر نہ هوگا۔ بجائے اس کے کہ گرم چاء دن میں کئی مرتبہ تیار کی جائے مہینے میں ایک یا دو مرتبہ تیار کر لینا کافی هوگا - ایسے ظروف میں رکھنے سے وہ گرم رهے گی اور خواہ کبھی کیوں نہ پی جائے گرم هی ملے گی -

مائع ہوا پانی کے برابر وزنی اور ویسی ہی صاف اور شفاف ہوتی ہے ۔ کھلی ہوا میں وہ سفید کہر کی شکل میں معلوم ہوتی ہے اور صراحی سے خوبصورت بادل اٹھتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ منظر تقریباً بالکل وہی ہوتا ہے جو ابلتے ہوئے پانی کی بھاپ کا ہوتا ہے ۔ انتہائی سردی کی وجہ سے قریب کی ہوا کی رطوبت کے بادل بن جاتے ہیں —

دنیا میں کوئی دوسری شے سوائے مائع ہائڈروجن یا مائع ہیلیم کے

شکل ۴

مائع ہوا گرائی جا رہی ہے - جب کہ یہ مائع ہوا اس طرح گرائی جاتی ہے تو ماحول کی ہوا کی تمام رطوبت کی انتہائی سردی کی وجہ سے تکثیف ہوجاتی ہے اور بڑے بڑے بادل جیسے کہ شکل میں دکھائے گئے ہیں بن جاتے ہیں —

اس قدر سرد نہیں ہے جتنی کہ مائع ہوا ۔ مگر پھر بھی اس میں دھاتوں

ڈبویا جا سکتا ہے - یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہاتھ ملائم تکیہ پر ہے - یہ خلاف توقع ضرور ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ مائع ہوا کے مقابلہ میں ہاتھ بہت زیادہ گرم ہوتا ہے لہذا فوراً اس پر بخارات کا ایک غلاف چڑھ جاتا ہے اور اسی کی وجہ سے ہاتھ مائع کے متصل نہیں ہونے پاتا - پھر بھی ہاتھ ایک سیکنڈ سے زیادہ مائع میں نہیں رہنا چاہیے اس لیے کہ اگر زیادہ دیر تک رہا اور مائع سے متصل ہو گیا تو ایسا زبر دست زخم پڑ جائے گا جو مہینوں میں اچھا ہو سکے گا - آدمی کے ہاتھ پر صرف چند قطرات ہی وہ حالت پیدا کردیں گے جو سفید گرم لوہا پیدا کر سکے گا - اسی باعث عمل جراحی میں جہاں کہ داغنے (Cauterisation) کی ضرورت ہوتی مائع ہوا کو کام میں لایا جاتا ہے - فاسد گوشت آناً فاناً میں جل کر ختم ہو جاتا ہے - نیو یارک کے ایک مشہور طبیب نے اس سے سرطان کو جلایا - مریض کی حالت قابل علاج نہ تھی لیکن اس علاج سے وہ شفا یاب ہوا - اس سلسلہ میں امید افزا نتائج حاصل ہونے کا گمان ہے لیکن ابھی تک کسی کو اس طریقہ کے کامیاب بنانے کا خیال پیدا نہیں ہوا ہے —

شکل ۵

مائع ہوا کی کیتلی جو برف پر جوش کھا رہی ہے - مائع ہوا کے مقابلہ میں برف ۱۸۰ درجہ زیادہ گرم ہے - کیتلی بہت جلد پالے سے ڈھک جاتی ہے —

مائع کی انتہائی سردی کو بہت سے تجربوں سے دکھایا جا سکتا ہے برف جو ہم کو اس قدر سرد معلوم ہوتا ہے اس کی تپش بھی مائع ہوا کی تپش سے بقدر ۱۸۰ درجہ مئی زیادہ ہے - یا یوں سمجھیے کہ دونوں کی حالت میں اسی قدر فرق ہے جتنا ہماری حالت اور اس شے کی حالت میں

ہوتا ہے جو کڑھائی میں تلی جاتی ہو یا بھونی جارہی ہو یا جو کہ پگھلے ہوے سیسہ اور اُبلتے ہوے پانی میں ہوتا ہے - لہذا اگر مائع ہوا کو برف پر ڈالا جاے تو وہ ویسا ہی شور مچاے گی جو سرخ گرم لوہے پر پانی ڈالنے سے ہوتا ہے - اگر مائع ہوا کو چاء کی کیتلی میں بھر کر برف میں دبایا جاے تو فوراً ہوا نہایت تیزی سے جوش کھانے لگے گی اور بھاپ جیسے سفید بخارات ڈھکن وغیرہ سے نکلنے لگیں گے - اگر کیتلی کو روشن کوئلہ پر رکھا جاے تو مائع نہایت تیزی سے اُڑ جاے گا اور بھاپ کا فوارہ بہت زیادہ بلندی تک جاےگا - اگر مائع ہوا کے جوش کھا کر ختم ہوجانے کے بعد کیتلی میں پانی ڈالا جاے تو وہ فوراً برف ہوجاےگا اور کیتلی کی تلی میں کاربونک ترشہ منجمد ہو کر جمع ہو جاے گا - یہ سب باتیں اسی وقت تکمیل کو پہونچ جاتی ہیں جب کہ آگ برائے نام جل رہی ہو - اگر کوئی شخص مائع ہوا کے کھلے برتن میں پھونک مارے تو اس کی تمام رطوبت ایک دم منجمد ہوجائے گی - اسی طریقہ سے ابلے ڈالنے والی بھاپ بھی فوراً جامد شکل اختیار کرلے گی کیونکہ مائع ہوا اور بھاپ کی تپش میں ۳۰۰ درجہ مئی کا فرق ہوتا ہے - پارا بھی چاندی کی طرح چمکتی دھات کی شکل اختیار کرلے گا - اس وقت پارا گرینائٹ (Granite) کی برابر سخت ہوگا - اس کے اوزار و تلواریں نہایت آسانی سے بن سکیں گی - اگر ہتوڑے کی شکل کا دفتی کا ایک ڈبہ بنایا جائے اور اس میں پارا بھر کر بیچ میں لکڑی کا ایک دستہ لگا کر اس کو مائع ہوا میں رکھا جائے تو ویسا ہی عمدہ ہتورا بن جائے گا جو کہ سخت لکڑی میں کیلیں ٹھوکنے کے کام میں آتا ہے - یہ سب کی سب کیسی تعجب خیز باتیں ہیں --

ایسے تجربات سے فضا کی سردی کا کچھہ نقشہ همارے پیش نظر هو جاتا هے ۔ فضاء کی سردی کے مقابلہ میں مائع هوا کی سردی کوئی سردی نہیں هے ۔ اب ذرا غور کیجئے کہ اس شخص کے واسطے جو فضا کی ویران تاریکی و سردی میں رهتا هو همارے جہان کی حرارت کس غضب کی هوگی ۔ وهاں کا باشندہ همارے سیارے کے فرش پر قدم رکھتے هی بھن کر کباب هوجائے کا اور جل کر خاکستر هوجائے کا جیسے کہ گوشت تنور میں هوجاتا هے ۔ مسٹر ویلیس کے قول کے مطابق اگر یہ شخص خدا نخواستہ اپنے سرد و تاریک مسکن کو کسی طرح واپس هوجائے اور وهاں جاکر کتاب لکھنے بیٹھے تو وثوق و کامل یقین سے یہ ثابت کرے گا کہ ایسے جہان میں ' جیسے هماری دنیا ' حیات ممکن هی نہیں هوسکتی —

یہ واضح رهے کہ دوسری گرم چیزوں کی طرح سطح زمین سے بھی گرمی اور روشنی کی شعاعوں کا اخراج هوتا هے لیکن هماری آنکھیں اس کو محسوس نہیں کرسکتیں ۔ لابون (Lebon) کے مطابق * " صفر مطلق تک کی تپش پر بھی چیزوں سے روشنی کی امواج نکلتی هیں جن کو هم نہیں دیکھہ سکتے ۔ غالباً وہ جانور اس کو محسوس کرتے هوں گے جو تاریکی میں رهتے هیں ' دن کی روشنی سے اجتناب کرتے هیں اور شب کی تاریکی میں اپنی چهل پہل میں مصروف هوتے هیں ۔ ان کو ایک ذی حیات مخلوق کے جسم کے ارد گرد جس کی حرارت ۳۷ درجہ مئی هو ایک منور حلقہ معلوم هوتا هوگا جس کو هماری قوت بصارت دیکھنے سے قاصر هے ۔ حقیقتاً دنیا میں کوئی تاریک شے نہیں هے بلکہ یہ هماری کوتاہ نظری کا نتیجہ هے ۔ تمام اجسام نظر آنے والے اور پوشیدہ اشعاع کا مخرج هیں ۔ یہ ایک

---

* از دی اولیوشن آف فور سیز مصنفہ لابون صفحہ ۲۱۸ سنہ ۱۹۰۸ء

قسم کی هوں یا زیادہ لیکن همیشه روشنی کی شعاعیں هوتی هیں " —

مائع هوا کا درجهٔ حرارت ۱۸۰° مئی هے - بلند تپش پر وہ ویسے هی جوش کھانے لگے گی جیسے پانی سو درجه سے زائد کی تپش پر - جو رشته بھاپ اور پانی میں هے وهی هوا اور مائع هوا میں هے - سطح زمین کل تپش مائع هوا کے نقطهٔ جوش سے ۲۰۰ درجه مئی زائد هے - لہذا اس مائع اور سطح زمین میں بھی وهی رشته قائم هے جو کوئله کی آگ اور پانی میں هے - پس همارے چاروں طرف جو بهتی هے اس میں مائع هوا کو کھولنے سے وہ فوراً جوش کھانے لگے گی اور اس پانی کی طرح ' جس کے ارد گرد آگ هو ' بخارات پیدا کرے گی جن کے پھیلنے سے قوت حاصل کی جا سکتی هے - لہذا هم مائع هوا سے قوت محرک (Motive power) حاصل کرسکتے هیں —

مائع هوا کو گیسی شکل اختیار کرنے کے لیے بہت زیادہ دباؤ کی ضرورت هوتی هے - کوئی بند برتن اس کی تاب نہیں لا سکتا - اس کے سمجھنے میں اس وقت آسانی هوگی جب هم خیال کریں که ایک مکعب فٹ مائع هوا کی تکثیف ۷۵۰ مکعب فٹ هوا سے هوتی هے جو معمولی درجهٔ حرارت و دباؤ پر هو - اب اگر اس کو ماحول کی حرارت جذب کرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے تو وہ اسی قدر قوت سے پھیلے گی یا اگر اس کو ایک برتن میں بند کرکے روکا جائے تو معمولی تپش و دباؤ پر دس هزار پاونڈ (ساڑھے چارٹن) فی مربع انچ کے دباؤ سے مقید هوگی - اگر اس کو گرم کیا جائے تو دباؤ دس تا تیس ٹن فی مربع انچ هوگا - ایسے دباؤ کا بڑے سے بڑا جوشدان بھی متحمل نہیں هوسکتا - اگر یه قوت قبضهٔ قدرت میں آجائے تو انتہائی طاقت حاصل هو سکے گی - بعض لوگوں کا مشورہ هے که

یہ قوت ان بڑے بڑے انجنوں کے چلانے اور اڑانے میں مفید ثابت ہوگی
جہاں ہلکے پن کا خیال بھی ملحوظ ہو - اس کے استعمال میں صرف ایک
رکاوٹ ہے اور وہ اس کی اشیاء کو منجمد کردینے والی خاصیت ہے - مشین
پر نہایت تیزی سے ہوا کی رطوبت برف کی شکل میں منجمد ہو جاتی ہے -
بالخصوص اس جگہ جہاں سے کہ سرد ہوا باہر نکلتی ہے - اس سے باہر
خارج کرنے والی نلی بند ہوجائے گی اور اس کی وجہ سے مشین - اس کے علاوہ
اور بھی خرابیاں اور مشکلات ہیں جن کا یہاں بیان کرنا مناسب نہیں - مائع
ہوا کی پھیلنے والی قوت بھی ٹھیلا دکھائی جاسکتی ہے - ایک نہایت مضبوط
ڈاٹ سے بند کی ہوئی فولادی نال میں اس کو بند کرو - بہت ہی جلد
ڈاٹ بھناتا ہوا ایک دھماکہ کے ساتھہ ہوا میں سیکڑوں فٹ کے فاصلہ پر جاکر
گرے گا - اگر تانبے اور فولاد کی نلیوں میں مائع ہوا کو بند کرکے
سر بہ مہر کردیا جاے تو بہت جلدی وہ ڈائنامیٹ کے گولوں کی طرح
پھٹ جائے گی اور دھات کے ٹکڑے ہر سمت میں نہایت زور سے
اُڑ کر جائیں گے —

مائع ہوا پانی جیسی بے ضرر ہے - اور جب تک وہ مقید نہ ہو خود
دھماکہ پیدا نہیں کرے گی لیکن دوسری اشیاء کے ساتھہ ملنے سے اس قدر
عظیم دھماکہ پیدا ہوتا ہے جس کا ڈائنامیٹ بھی مقابلہ نہیں کر سکتا -
نیو یارک کے مسٹر ٹرپلر (Trippler) نے ایک تجربہ کیا - انہوں نے تیل
سے بھیگی ہوئی روئی کو مائع ہوا میں تر کرکے ایک لوہے کی نلی میں
رکھا جو دونوں جانب کھلی ہوئی تھی - یہ نلی ایک دوسری نلی میں رکھی
گئی اور وہ بھی دونوں جانب کھلی ہوئی تھی - جب کہ روئی کو فتیلے
(Detonating fuse) سے جلایا گیا تو اس قدر بڑا دھماکہ ہوا کہ صرف اندر

کی نلی هی ٹکڑے ٹکڑے نہیں هو گئی بلکہ باهر کی نلی میں بھی سوراخ هو گیا —

جرمنی میں اس کو کوئلہ کی کانوں کو اڑانے میں کام میں لایا گیا ۔ روئی میں پسا هوا کوئلہ بھرکر اس کو هوا سے تر کیا گیا اور کوئلے میں سوراخ کر کے اس کو رکھا اور سب کو فتیلہ (Detonator) کی مدد سے اڑایا ۔ دھماکہ ڈائنا میٹ سے کم نہ تھا لیکن اس کے نا گوار اثرات اس میں نہ تھے اور نہ کسی قسم کا خطرہ تھا ۔ اگر اس پر فتیلہ کا فوراً اثر نہ هو تو صرف پسا هوا کوئلہ اور روئی باقی رهے گی ۔ مائع هوا اڑ جاے گی ۔ یہی اس کے استعمال کی خوبی هے ۔ یہ وصف ڈائنا میٹ میں موجود نہیں ۔ اگر ڈائنا میٹ میں کسی وجہ سے دھماکہ نہ هو تو پھر اس کو هٹانا کوئی آسان کام نہیں ۔ اس میں سالانہ بہت سی زندگیاں تلف هوتی هیں —

مائع هوا کی یہ خاصیت آکسیجن کی وجہ سے هے جو اس میں نہایت هی مرتکز حالت میں موجود هوتی هے ۔ جب یہ کسی ایسی چیز سے ملائی جاے جو آکسیجن میں بہت تیزی سے جلتی هو اور آمیزہ کو فتیلہ سے روشن کیا جاے تو نہایت تیزی سے دھماکو احتراق شروع هو جاتا هے اور زیادہ حرارت پیدا هونے کی وجہ سے گیس اس قدر تیزی اور شور کے ساتھ نکلتی هے جیسے کہ کوئی گولا پھٹ گیا ۔ دونوں کے تعاملات میں بھی تقریباً کوئی فرق نہیں هے —

هوا میں ، جیسا کہ هم بیان کر چکے هیں ۲۱ حصے آکسیجن کے اور ۷۹ حصے نائٹروجن کے هوتے هیں ۔ وہ ۱۹۵ درجہ مئی پر جوش کھانے لگتی هے ۔ نائٹروجن کا نقطۂ جوش ۱۹۵ درجہ مئی هے ۔ پہلے نائٹروجن جوش

کھاتی ہے اور آکسیجن باقی رہ جاتی ہے تپش آہستہ آہستہ بڑھتی ہے یہاں تک کہ وہ ۱۸۳° درجہ سئی ہو جاتا ہے —

جیسے ہی نائٹروجن کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے مائع کا رنگ زیادہ نیلا ہو جاتا ہے اور وہ وزنی ہوی ہو جاتا ہے - اس تبدیلی کو ایک بوتل میں کچھہ پانی بھر کر اور اس میں مائع ہوا ڈال کر دکھایا جا سکتا ہے - ایک لمحہ تک وہ پانی پر تیرتی ہے اور نہایت تیزی سے جوش کھاتی ہے - جب کل نائٹروجن اُڑ جاتی ہے تو آکسیجن جو پانی سے زیادہ وزنی ہوتی ہے رو پہلے بلبلوں کی شکل میں تہ نشین ہو جاتی ہے - جو نہایت تیزی سے جوش ہو کر ختم ہو جاتے ہیں - مائع ہوا کے چند قطرے پانی میں پھینکتے ہی وہ اس کے ارد گرد منجمد ہو جاتا ہے اور یہ برف کی کشتیاں اُس وقت تک پانی میں تیرتی رہتی ہیں جب تک کہ مائع ہوا بالکل اُڑ نہ جائے - یوں کھلا رکھنے سے پہلے نائٹروجن اڑتی ہے اور آکسیجن کی مقدار رہ جاتی ہے اور یہ آکسیجن عجیب و غریب شے ہے - معمولی اونی ٹوپی آگ میں بہ مشکل تھام جلے گی لیکن اگر مائع آکسیجن میں یا صرف مائع ہوا میں ڈبایا جائے تو اسی قدر تیزی اور شور سے جلے گی جیسے دھماکو روئی - لکڑی کی ایک کوچی کو اگر مائع آکسیجن میں تر کر کے جلایا جائے تو وہ ٹارچ کی طرح نہایت ہی تیزی سے جلے گی - اگر چمکتی ہوئی کھپچ کو مائع ہوا میں ڈالا جائے تو فوراً ہی بڑا زبردست شعلہ پیدا ہو جائے گا - اور وہ برتن جس میں مائع ہے گرمی سے ریزہ ریزہ ہو جائے گا —

مائع ہوا فولاد کو بھی جلا دے گی - اس کو دکھانے کے لیے برف کا ایک گہرا برتن بنایا جاتا ہے اور وہ تقریباً نصف مائع آکسیجن

سے بھر دیا جاتا ہے - اب ایک فولادی کمانی پر ایک جلتی ہوئی دیا سلائی لگا کر سب کو برتن میں ڈالو - فولاد جلنے لگے گا - شرارے نکلیں گے اور چکاچوندہ پیدا کرنے والی چمک ہوگی - جلتے ہوے فولاد اور مائع آکسیجن میں تقریباً دو ہزار درجہ مئی کا فرق ہوتا ہے لیکن برت کے برتن پر کچھہ اثر نہیں ہوتا - احتراق شروع ہونے سے پہلے آکسیجن گیسی شکل اختیار کر لیتی ہے - بجاے فولادی کمانی کے بجلی کی روشنی کے کاربن کا سرخ گرم حصہ اسی قدر تیزی سے جلےگا - مائع ہوا کی انتہائی سردی اس کو جلانے سے قطعاً نہیں روکتی ہے —

مائع ہوا کو دیکھہ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ سرد جہان ہماری دنیا سے قطعاً مختلف ہوگا - ایسے کم درجۂ تپش پر تمام چیزوں کے خواص بالکل تبدیل ہو جائیں گے - دنیا کے تمام مہذب ملکوں میں مادے کے خواص کی ایسے سرد ماحول میں جانچ و پڑتال جاری ہے - لوہے اور فولاد کی مضبوطی بہت زیادہ ہوجاتی ہے لیکن ساتھہ ہی وہ اس قدر بھر بھرے ہو جاتے ہیں جیسے کہ شیشہ —

مائع ہوا اور مائع ہائڈروجن میں بیج مہینوں تک منجمد رہ سکتے ہیں لیکن خوبی یہ ہے کہ وہ ضائع نہیں ہوتے - اگر بعد ازاں ان کو بویا جاے تو وہ اُگ آتے ہیں اور ان کی بالیدگی میں بھی کوئی فرق نہیں آتا - ایسی سردی میں بہت سے جراثیم بھی نہیں مرتے ہیں - بے شمار مہلک جراثیم کو مائع ہوا میں چھہ مہینہ تک منجمد حالت میں رہنے کے بعد بھی جب نکالا گیا تو انھوں نے اپنی پہلی چہل پہل پھر شروع کردی - سر بہ مہر بند نلیوں میں پروفیسر میک کینڈرک (Mc Kendrick) نے گوشت اور دودھ وغیرہ کو ۱۸۲° مئی پر رکھا - جب ان کو کھولا گیا

تو خون کے درجۂ حرارت پر کئی دن رکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں تعفن موجود ہے - جراثیم عمل انجماد میں بھی نہیں مرے تھے - ایسی حالت میں حیاتی مادہ نہ مرتا ہے اور نہ زندہ رہتا ہے - یہ ایک درمیانی حالت ہے جس میں حیاتی رزم و بزم کچھہ مدت تک ملتوی ہو جاتی ہے - ہزار ہا برس تک وہ بغیر کسی تبدیلی کے پتھر کی طرح ساکت رہتا ہے اور مناسب تپش میں آتے ہی پھر ان کی تگ و دو شروع ہو جاے گی —

یہ سب صرف چھوٹی چھوٹی مخلوقات کے لیے ہے - بڑے بڑے جانور اس سردی کے متحمل نہیں ہو سکتے - وہ ان کو مار ڈالے گی - آدمی یا سور مائع ہوا میں منجمد ہو کر سخت اور بھر بھرا ہو جاے گا اور پھر اس خواب سے کبھی بیدار نہ ہوگا خواہ اس کو کتنے ہی بہتر ماحول میں لاکر کیوں نہ جگا یا جاے - البتہ یہ ضرور ہوگا کہ ان کا گوشت ایسی حالت میں بالکل تازہ رہے گا - دنیا کے مختلف حصص سے منجمد گوشت انگلستان کو روانہ کیا جاتا ہے - اس سلسلہ میں یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ میمتھہ (Mammoth) کی لاشیں جو کہ ایک قسم کا بالدار ہاتھی ہوتا تھا اور اب معدوم ہے، برف میں دفن پائی گئی ہیں اور ایسی تازہ حالت میں ہیں گویا کہ وہ کل مرے ہیں حالانکہ برف و یخ کے ویرانہ کی سردی میں مرے ہوے ان کو صدیاں گذر چکی ہیں - ان کا گوشت قطعاً خراب نہیں ہوا - آدمیوں نے اور بھیڑیوں نے ان کا گوشت کھایا ہے لیکن ان کو کسی قسم کا نقصان نہیں ہوا —

ان واقعات کا ایک بڑا دلچسپ پہلو ہے - ارھینیس (سویڈش کیمیا داں) کا بیان ہے کہ اسی حالت کی وجہ سے غیر محدود فضا میں ایک جہان سے جہان تک حیات کا ایک زبردست چشمہ بہہ رہا ہے - اس کے مطابق حیات کے

چھوٹے چھوٹے کیڑے، چھوٹے چھوٹے تخمک (Spores)، چھوٹے چھوٹے جراثیم هواؤں اور طوفانوں کی وجہ سے کرۂ هوائی کے بالائی حصوں میں پہنچ جاتے هیں اور پھر سورج کے اشعاعی دباؤ (Radiation pressure) کی وجہ سے فضاء کی تخئیل میں نہ آنے والی گہرائیوں میں پہنچ جاتے هیں - اس حالت میں وہ بہت متحرک هوتے هیں - ان کی رفتار سیکڑوں، نہیں بلکہ هزاروں میل فی سیکنڈ کی هوتی هے اور پھر فضاء کی مطلق سردی و تاریکی میں مقیم هوتے هیں- یہاں غیرمعین زمانہ تک وہ فضاء کے ویرانوں میں گردش کرتے رهیں گے- ان کو نہ سردی مار سکتی هے اور نہ وقت ان کو تباہ و برباد کرسکتا هے- وہ غیر محدود زمانہ تک یوں هی گردش کرتے رهیں گے یہاں تک کہ وہ بالکل سرد هو جائیں گے- تپش تقریباً اس وقت ۲۷۳ درجہ منفی هوگی- جدید انکشافات سے یہ معلوم هوا هے کہ ایسے جراثیم سورج کی روشنی کی بالا بنفشئی شعاعوں میں کرۂ هوائی کے حدود میں داخل هوتے وقت ختم هوجاتے هیں- اگر فرض کیا جاے کہ وہ زندہ رهیں گے تو وہ کسی دور و دراز کی دنیا کے کرۂ هوائی کے بالائی طبقوں میں ضرور پہنچ سکیں گے- ایسا سیارہ ان کی نشو و نما کے واسطے مناسب نہ هوگا یا تو وہ بہت گرم هوگا یا بہت سرد اور پس جراثیم یا تو ضائع یا خوابیدہ (Dormant) حالت میں هو جائیں گے اس حالت میں سیکڑوں هزاروں سال تک رهیں گے یہاں تک کہ ایک نوعی تبدیلی پیدا هوگی اور کارزار هستی کی جلوہ آرائیاں پھر شروع هو جائیں گی —

بعض مرتبہ یہ هوتا هے کہ جراثیم سیدھے ایسے سیارے میں پہنچتے هیں جہاں حیات کے واسطے مناسب کیفیت موجود هے- جب ایسا هوتا هے تو ایک کیڑے سے لکھوکہا مختلف قسم کی حیات کا سلسلۂ لا متناهی

شروع ہو جاتا ہے جو کہ ابتداءً سادہ ہوتا ہے اور پھر انتہائی پیچیدہ ہوجاتا ہے۔ اور ہم کو بقول شخصے کہنا پڑتا ہے:—

" From earth to lichen, herb to flowering tree,

From cell to creeping worm, from man to what shall be. "

اس طریقہ سے ایک سیارہ جو ابتداءً ویران تھا جہاں زندگی معدوم تھی، وہ چھوٹے چھوٹے جراثیم، بڑے بڑے جانور، پودوں، درختوں، چڑیوں اور کیڑے مکوڑوں سے پر ہوجاے گا جو خشکی و تری و سمندروں میں ہر جگھہ پھیل جائیں گے۔ ان سے نہ ہوا خالی ہوگی اور نہ سمندر کی گہرائیاں۔ یہاں تک کہ حیوان ناطق کا ظہور ہوگا۔ پھر تو بڑے بڑے شہر آباد ہو جائیں گے اور علوم و فنون کا چرچا ہوگا۔ تہذیب بھی ہوگی، تمدن بھی ہوگا، سیاست بھی ہوگی، تدبر بھی ہوگا—

ایک زمانہ گذرنے کے بعد پھر اس سیارے پر حیات کے موافق ماحول نہیں رہے گا اور رفتہ رفتہ وہ پھر ویرانہ ہو جاے گا۔ خاموشی پھر اس پر اپنا تسلط کرلے گی اور وہ جہان جو علم و حکمت کا گہوارہ تھا اس پر اب ہو کا عالم ہوگا اور ایک سناٹا ہوگا۔ غالباً ہمارا چاند یہ سب مراحل طے کرچکا ہے اور اب بغیر حیات کا خاموش ویرانہ ہے۔ ہمارا جہان بھی اور تمام دوسرے جہان جو اس وقت حیات کی سرگرمیوں میں منہمک ہیں ایک زمانۂ غیر معین کے بعد تباہ و برباد ہوجائیں گے—

اگرچہ بحالت موجودہ ہوا میں چار حصے نائٹروجن کے اور ایک حصہ آکسیجن کا ہے لیکن قارئین کو اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کر لینا چاہیے کہ ہوا کی ترکیب ہمیشہ یہی تھی۔ ہر چیز ہمیشہ آہستگی سے یا تیزی سے بدل رہی ہے اور جو اشیاء قائم معلوم ہوتی ہیں وہ صرف اُن کی

ظاہری کیفیت ہے۔ حقیقتاً یہ واقعہ نہیں ہے۔ ہوا بھی اس قاعدۂ کلیہ سے مستثنی نہیں۔ اس کی ترکیب بھی نہایت ہی آہستگی سے بدل رہی ہے لیکن اس تبدیلی کی رفتار اس قدر کم ہے کہ چھہ ہزار سال کی مدت میں کوئی خصوصی تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی ہے۔ یونانیوں اور رومیوں نے تقریباً اسی ترکیب کی ہوا میں سانس لی ہوگی جس میں ہمارا عمل تنفس جاری ہے۔ لیکن اگر ہم لکھوکھا اور کرورہا برس سے مقابلہ کریں تو حالت یقیناً مختلف ہوگی۔ آہستہ اور مسلسل تغیر جو مدت دراز سے جاری ہے اس کے تاثرات بھی تحیر افزا ہیں۔ فرض کیجیے کہ آکسیجن کی مقدار ہزار سال میں صرف $\frac{1}{1000}$ فی صدی کم ہوئی۔ یہ تغیر کسی حساب سے نہیں معلوم ہو سکتا۔ تاہم دس ہزار سال میں ایک فی صدی مقدار کم ہو جائے گی اور دو لاکھہ دس ہزار سال میں آکسیجن بالکل نہیں رہے گی۔ اب زمین کی عمر کرورہا سال سے بھی زائد ہے۔ اس وقفۂ دراز میں کرۂ ہوائی کی ساخت صرف ایک مرتبہ ہی نہیں بلکہ بارہا تبدیل ہو چکی ہوگی۔ ہم کو یہ وثوق کے ساتھہ معلوم ہے کہ زمانۂ گذشتہ میں ہوا کی ترکیب موجودہ ترکیب سے قطعی مختلف تھی۔ دنیا کی تاریخ کے اس تاریک اور مخفی زمانے میں جب کہ تمام سیارے کی سطح ایک سفید گرم پگھلی ہوئی چٹان کا ایک سمندر تھا تو ہوا کی ترکیب میں بھاپ' کاربن ڈائی آکسائڈ' نائٹروجن' مارش گیس اور غالباً ہائڈروجن اور ہیلیم شامل تھی۔ آزاد آکسیجن جو معین تنفس اور ممد حیات ہے اِس وقت قابل ذکر مقدار میں ہرگز نہ تھی—

اس ابتدائی زمانے کے کرۂ ہوائی کے متعلق بہت زیادہ مبہوت بنادینے

والی چیز کا ر بن ڈائی اکسائڈ کی مقدار ہے - اس گیس کی مقدار کثیر جو کہ اب چاک اور چونے کے پتھروں میں شامل ہے اس وقت آزادانہ طور پر ہوا میں شامل تھی - تمام وادیاں ' تمام غا ر و سو راخ اس سے پر تھے- زمین پر ہر جگہ اسی کا دور دورہ تھا - صرف اس گیس کا حجم موجودہ کرۂ ہوائی کے حجم سے سیکڑوں گنا زیادہ تھا - ہاگبوئم (Hogbom) اور چیمبرلین (Chamberlin) نے بہت ہی ہوشیاری سے حساب لگا کر معلوم کیا ہے کہ چاک اور ڈولومائٹ (Dolomite) میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار موجودہ کرۂ ہوائی کے حجم سے ۶۰۰ تا ۹۰۰ گنی زاید تھی- لیکن یہ مقدار بھی بہت کم ہے اس لئے کہ اس میں پیش کمبری (pre cambrian) زمانے کے چونے کے پتھروں کی مقدار کا حساب بالکل شامل نہیں کیا گیا ہے —

اس ابتدائی کرۂ ہوائی کے دباؤ سے بھی ہم کو حیرت ہوتی ہے - وہ غالباً پندرہ ٹن فی مربع انچ یا اٹھارہ ہزار فی مربع گز سے بھی زاید تھا- ایسی حالت میں اور ایسے کرۂ ہوائی میں کوئی متنفس ؛ جانور یا انسان جو فی زماننا دنیا میں اپنی سیر و تفریح میں مشغول ہے ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا —

یہ حالت بہت زیادہ زمانہ تک نہیں رہی - جیسے ہی زمین ٹھنڈی ہونی شروع ہوئی ' بھاپ کے رفتہ رفتہ بحر اور بحیرہ بن گئے اور ساتھ ہی ساتھ چٹانوں نے آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونے میں کاربن ڈائی آکسائڈ کو جذب کرلیا یہاں تک کہ اب موجودہ ہوا میں اس کی مقدار کے صرف اثرات ہی باقی ہیں (۰۰۳ء فی صدی) -

ابتدائی زمانے میں بہت ہی کم یا بالکل آکسیجن نہ تھی- یہ صرف تخیلات نہیں ہیں بلکہ واقعات پر مبنی ہیں اور اس کے متعلق شہادت موجود ہے -

پہلی بات یہ ہے کہ پگھلی ہوئی زمین میں دوسری اشیا کی اس قدر مقدار عظیم تھی کہ وہ آکسیجن سے متحد ہوگئیں اور تمام آکسیجن ختم ہوگئی - کیوں کہ کاربن کی موجودہ مقدار جو کوئلہ وغیرہ کی شکل میں جمع ہے وہ تمام موجودہ آکسیجن کی ۱۲۱۶ بلین ٹن کی مقدار سے متحد ہونے کے واسطے کافی ہے —

فلکی شہادت سے ان نتائج کی تصدیق ہوتی ہے - کیونکہ سورج کے کرۂ ہوائی میں آزاد آکسیجن اور ہائڈ روجن موجود ہے - زمین کا ابتدائي کرۂ ہوائی بھي بالکل اسي نوعیت کا تھا (ایک زمانے میں وہ بھی اس آتشی سحابیہ کا ایک جز تھا جس میں سے ہمارے سورج یا جہان کی تکثیف ہوئی ہے) اور اس میں ہائیڈ روجن موجود تھیں —

جیسے ہی کل نظام ٹھنڈا ہونا شروع ہوا آکسیجن اور ہائیڈروجن کے متحد ہونے سے پانی بن گیا لیکن آزاد ہائڈ روجن کی ایک بڑی مقدار کرۂ ہوائی میں باقی رہ گئی - غالباً ابتدائی کرۂ ہوائی میں مارش گیس اور ایتھین وغیرہ کی بھی بہت زیادہ مقدار موجود تھی کیوں کہ ان گیسوں کی موجودگی دمدار ستاروں میں جو کبھی کبھي نظام شمسی میں داخل ہوجاتے ہیں ، پائی جاتی ہے - مہلک سیانوجن گیس اور ہائڈرو سیانک ترشہ کے بخارات بھی قلیل مقدار میں اس میں شامل تھے - نائٹروجن کي مقدار میں غیر عامل ہونے کي وجہ سے کوئی فرق ضرور نہیں آیا ہے حالانکہ اس قدر زمانہ گذر چکا ہے - اس کی عمر بہت ہی زیادہ ہے —

ڈپسن کا خیال ہے کہ بہت سے بڑے بڑے پودے اور بہت سے جراثیم اس کرۂ ہوائی میں جس میں صرف کاربن ڈائی آکسائڈ اور ہائڈروجن ہوں نشو و نما پا سکیں گے - لہذا اس وقت بھي جب کہ ابتدائي زمانہ میں معتدبہ

آکسیجن ہوا میں موجود نہ تھی۔ سادہ پودے موجود تھے - بعض جراثیم کے واسطے آکسیجن مہلک ہے تو وہ تو صرف اسی وقت پھول پھل سکتے تھے جب کہ آکسیجن بالکل نہ ہوی —

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آکسیجن کہاں سے آگئی - یہ نباتی حیات کا نتیجہ ہے جو وسیع پیمانہ پر ابتدائی زمانہ میں سر سبز و شاداب تھی اور جس کے تباہ و بر باد ہونے سے تمام زمین بور گئی اس لیے کہ سبز پودے اپنی خوراک میں اس گیس کی انتہائی قلیل مقدار شامل کرتے ہیں - سورج کی روشنی میں کاربن ڈائی آکسایڈ کا تجزیہ ہو جاتا ہے - کاربن کو وہ جذب کرلیتے ہیں اور آکسیجن آزاد ہو جاتی ہے - کاربن سے درخت اور پودوں کا ڈھانچہ تعمیر ہوتا رہتا اور آکسیجن آزاد ہو کر ہوا میں شامل ہوتی رہتی ہے - ارھینیس کا خیال ہے کہ ابتدائی پودے جو بغیر آکسیجن کے کرہ ہوائی میں جس میں کاربن ڈائی آکسائڈ اور ہائڈروجن اور مارش گیس شامل تھی انھوں نے آھستہ آھستہ آکسی ہائڈروجن کو آزاد کیا اور برقی باروں کے اثر نے (اس لیے کہ اس ابتدائی دنیا میں بھی برق و رعد کی کڑک اور چمک موجود تھی) آزاد ہائڈروجن سے پانی بنا دیا اور مارش گیس اور ایتھین وغیرہ کی تکسید کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی میں ہوگئی - جب تک کہ وہ بالکل ختم نہ ہوگئیں - بے شمار زمانہ گذر چکا ہے - اس وقت سے لاکھوں پودے مسلسل طریقہ سے آکسیجن کی مقدار خاموشی سے کرۂ ہوائی میں شامل کر رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ ترکیب کا کرہ ہوائی بن گیا - موجودہ ترکیب حاصل کرنے کے واسطے تقریباً آکسیجن کے ۱۲۱۶ بلین ٹن درکار تھے - یہ کام موسم گرما کی چمکتی ہوئی گرم سورج کی روشنی نے تکمیل کو پہنچایا ہے - یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب کہ انسان کا وجود بھی نہ تھا - وہ صفحۂ ہستی پر ظاہر

نہیں ہوا تھا - اور نہ اس کی آواز نے جہاں کی خاموشی کو توڑا تھا - ماہرین نباتات کا خیال ہے کہ پودوں کی نشو ونما کے واسطے کچھہ آکسیجن لازمی ہے- ارھینیس اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ جب کہ آتشی سحابیہ سے دنیا کی پہلے پہل تکثیف ہوئی تو ہر جگہ تپش انتہائی زیادہ تھی اس کی وجہ سے سبک ترین گیسیں مثلاً ہائڈرو جن اور ہیلیم فضاء میں جا داخل ہوئیں اس لئے کہ زمین کی قوت جاذبہ اس قدر کافی نہ تھی کہ گیس کے انتہائی متحرک سالمات کو اس درجۂ تپش میں جو اس وقت موجود تھا روک سکتی - بخلاف اس کے نائٹروجن اور آکسیجن وزنی گیسیں جنکی رفتار بھی نسبتاً بہت کم تھی باقی رہگئیں لہذا زمین کے سخت ہونے سے قبل ہی ہائڈ روجن اور ہیلیم غائب ہوچکی تھیں اور زمین کی ٹھوس شکل کے فوراً ہی بعد آکسیجن ' نائٹروجن ' کاربن ڈائی آکسائڈ اور بھاپ تھی - لیکن اس بحث سے بھی نتیجہ جو اخذ کیا جا چکا ہے جس کا اشارہ پوسن نے اور اس سے قبل کوھیلے (Koehne) نے سنہ ۱۸۵۶ ع میں بروساز میں کیا تھا ' یعنی یہ کہ آکسیجن کو پودوں نے کاربن ڈائی آکسائڈ کا تجزیہ کر کے آزاد کیا ہے اس میں کوئی فرق نہیں آتا --

بہر کیف اس میں شک نہیں کہ حیات حیوانی کے واسطے آکسیجن کا وجود لازمی امر ہے - حیوان مثل طفیلیوں کے ہیں جن کی زندگی کا انحصار صرف پودوں پر ہے - بخلاف اس کے پودوں کو مناسب درجۂ حرارت کے علاوہ کاربن ڈائی آکسائڈ کی اور پانی کی ضرورت ہوتی ہے - یہ گیسیں غالباً تمام سیاروں کے کرۂ ہوائی میں موجود ہیں اور ان کے چمکتے ہوے حصص کے ٹھنڈے ہونے کی وجہ سے فضلہ کی شکل میں خارج ہوئی ہیں —

پس کرۂ ہوائی غیر عامل گیسوں کا مجموعہ نہیں ہے جس میں تغیر و تبدل نہ ہو۔ اس میں تبدیلی جاری ہے اور یہ تسلسل اس زمانے سے جاری ہے جب کہ وہ فضاء میں آتشی شکل میں گردش کرتی پھرتی تھی اور متحرک تھی - اس کی موجودہ حالت صدیوں کے بعد تدریجی ارتقاء سے حاصل ہوئی ہے - ہوا خود اپنے سفر کا ابتدا تا انتہا قصہ بیان کرسکتی ہے - اور وہ پریوں کے تمام فرضی فسانوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوگا —

کرۂ ہوائی کی قسمت کا آخر بھی رنج و الم کی ایک داستان ہے - بالآخر وہ سطح زمین سے قطعاً غائب ہو جائے گا - دو اثر ایسے ہیں جو تنہا یا مل کر اس کام کو انجام دیں گے - ان میں سے پہلا تو بیرونی زمین کا سورج کی اشعاعی قوت کے کم ہو جانے کی وجہ سے ٹھنڈا ہو جانا ہے - جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کرۂ ہوائی اس ابتدائی سحابیہ کا ایک حصہ ہے جس میں سے دنیا کی تکوین ہوئی ہے اور جو خود مائع یا جامد حالت میں اس وجہ سے نہیں آ سکا ہے کہ سطح زمین کی تپش اس قدر بلند ہے کہ اس کی گیسی حالت کو قائم رکھہ سکتا ہے - سطح زمین کی تپش کا انحصار سورج کی گرمی پر ہے جو اس سے خارج ہوتی ہے - چونکہ سورج بھی ٹھنڈی ہونے والی چیز ہے ' آھستہ آھستہ اس کی گرمی اور روشنی بھی کم ہوتی جائے گی اور بالآخر بالکل ختم ہو جائے گی - تب ہماری روشنی ختم ہو جائے گی اور تمام نظام شمسی سردی و تاریکی میں غرق ہو جائے گا - لہذا جیسے جیسے سورج کی حرارت کم ہوتی جائے گی ' زمین بھی سرد پڑتی جائے گی - پہلے تمام دنیا پر ایک کہر نمودار ہوگا اور تمام پانی منجمد ہو کر برف بن جائے گا - بعد ازاں ہوا کی حالت میں فرق آئے گا - پہلے وہ مائع ہوگی اور پھر جامد - یہ اس وقت ہوگا جب کہ سطح زمین کا درجۂ

حرارت ۱۸۰ درجہ منفی ہوگا۔ یہ تپش بہت زیادہ نہیں ہے اگر اس کا مقابلہ اس سے کیا جائے جو دنیا کے سرد ترین طبقوں میں موجود ہے۔ کپتان اموندسین (Amundsen) نے بوتھیا (Bothia) واقع کینیڈا میں سنہ ۱۹۰۵ ع میں ۶۷ء۹۱° منفی قلمبند کیا ہے۔ قطبین میں کبھی کبھی یہ ۹۰° منفی ہو جاتا ہے۔ اب ہوا کو مائع شکل میں لانے کے واسطے یہ خیال کیجئے کہ اسی قدر درجۂ تپش اور کم ہوگیا - جب کہ دنیا ٹھنڈا ہونا شروع ہوگی تو یقیناً ایک وقت ایسا آئے گا جب کہ ہوا کے بالائی طبقوں میں سفید بادلوں کی شکل میں ' جو کہ مائع ہوا کے قطرات سے بنے ہوں گے ' بستگی ہوگی۔ بعد ازاں ان کے اُوپلے ہلکے نیلے رنگ کے سمندر بن جائیں گے۔ یہ سمندر اس قدر سرد ہوں گے کہ پگھلے ہوے سیسہ کی طرح ہم کو جلا دیں گے - یہ سمندر وہاں بہنے لگیں گے جہاں آج کل بڑے بڑے بحر ہیں جن کا پانی ایک زمانہ پہلے منجمد ہو چکے گا اور سنگ مر مر یا کار پتھر کی طرح چمکتا ہوگا۔ انسان تو اس وقت ہوں گے نہیں۔ اگر ازرہ بہ اندام ہوے بھی تو اس کو انتہائی سردی کی وجہ سے بے حد خوفناک تصور کریں گے —

اس وقت جو پانی کا حال ہے وہ اس زمانے میں مائع ہوا کا ہوگا۔ اس وقت جیسے ہم بارش میں پانی کے قطرات پاتے ہیں اسی طرح اس زمانہ میں ۱۹۰° منفی پر مائع ہوا کی بارش و بوچھار ہوگی۔ زمین پر کہیں کہیں منجمد سفید ہوا ملے گی اور اس کی نوعیت وہی ہوگی جو کہ آج کل قطبین پر برف کی ہے۔ اور جامد ہوا مائع ہوا کے سمندروں میں برف کے پہاڑ کی شکل میں تیرتی پھرے گی —

جب کہ درجۂ حرارت ۲۱۰° منفی ہوگا ہوا ۳۵ فٹ موٹی شفاف چٹان کی شکل

میں منتقل هو جاے گی - زمین پر پھر کوئی کرۂ هوائی نہیں هوگا - وہ بالکل سرد تاریک ویرانہ هو جاے گی - پھر زمانہ هاے دراز کے بعد بڑی بڑی حرکتوں اور تبدیلیوں کے بعد همارے سیارے پر خاموشیٔ مطلق هوگی- نہ کہیں حرکت هوگی اور نہ کوئی آواز - اس کو قطعی آرام نصیب هوگا - اس لیے کہ جب اوپر هوائی غلاف نہ هوگا تو نہ هوا کی سنسناهٹ هوگی - نہ بجلی کی گرج هو گی - نہ مینہ کی بوچھاڑ کا پتہ هوگا - نہ کسی چشمہ کی آواز هوگی - آدمی ' پرند یا حیوان کی ایک آواز بھی شب کی سیاهی و تاریکی میں ابدی خاموشی کی مہر سکوت کو نہ توڑ سکے گی - دنیا کی سطح ایک مکمل خلا هو گی جیسی کہ دیوار کی خلا دار صراحیوں میں هو تی هے - ستارے کوئلے جیسے سیاہ آسمان سے مردہ جہاں پر جوکہ قضا کی گرفت میں بالکل سخت هو چکے گا چمکتے هوں گے اور تاریکی میں جلے هوے سورج کے ارد گرد گردش کرتے هوں گے - لیکن زمین کی چند میلوں کی گہرائی کے اندر بیرونی سردی کے مقابلہ میں بڑی بڑی بھٹیاں جو قوت و توانائی کا سر چشمہ هیں اب بھی چمکتی هوں گی - دنیا اس حالت میں صدیوں رهے گی اور فرق صرف اس وقت پڑے گا جب اس کا مادہ حل هو کر یا کسی صورت سے ایتھر میں نہ آجاے یا کسی کائناتی تکر میں وہ پھر ایک چمکتا هوا سحابیہ نہ هوجاے - ایسا هونے پر پھر حیات کا دورہ شروع هو جاے گا —

اگر سورج کی قوت اشعاع ایک غیر محدود زمانہ تک قائم رهے تو بھی زمین کے کرۂ هوائی کا خاتمہ ضروری هے اس لیے کہ زمین کی اندرونی حرارت کی وجہ سے بھی سطح زمین پر هوا کا ایک غلاف موجود هے - چند میل کی گہرائی میں سفید گرم چمکتی هوئی بھٹیاں اگر وهاں هوا یا پانی کا کوئی قطرہ پہنچ جاے تو اس کو فورا بھگا دیتی هیں -

اب اگر زمین کا اندرونی حصه، جوکه بالآخر ہو کر رہے گا، ٹھنڈا هوجائے تو تمام کرۂ ہوائی معه پانی کے اسی طریقه سے جذب هو جاے گا جیسے اسونیا کوئله میں یا پانی جاذب میں —

پس زمین جو اپنے تغیرات و تبدلات میں مصروف هے کرۂ هوائی بهی جو اس کے ارد گرد هے اس میں همیشه زبردست تبدیلیاں هوتی رهیں‌گی۔ کرۂ هوائی کا ایک عجیب و غریب ماضی رها هےاور اس کا مستقبل بهی نهایت دلچسپ و شاندار رہے گا —

حساب لگا کر معلوم کیا گیا هے که آسمان پر دس کروڑ سے زائد سورج موجود هیں۔ بعض کے متعلق طیف نمائی شهادت هے که ان کے بهی سیاری نظام هیں جو ان کے گرد گردش کرتے هیں۔ هر ایک کے ایک یا زیادہ سیارے موجود هیں۔ اس طریقه سے سیارے بهی کم از کم اسی قدر موجود هیں جو که همارى زمین سے مشابه هیں اور ستاروں کے نظام میں پهیلے هوے هیں۔ لهذا ان کے کرۂ هوائی کی ساخت کا دلچسپ سوال پیدا هو جاتا هے —

پهلا سوال یه پیدا هوتا هے که همارى زمین کے کرۂ هوائی کی طرح ان کے کرۂ هوائی هیں یا نهیں؟ اس کا جواب یه هے که ان جهانوں کے کرۂ هوائی هر اس ممکن ساخت کے هوسکتے هیں جن کا که هم خیال کرسکتے هیں۔ بعض پر وہ اشیاء جو همارے کرے پر بے انتها موجود هیں قطعاً نهیں هیں۔ اور بعض پر وہ چیزیں به افراط هیں جو همارے کرہ پر انتهائی قلیل مقدار میں موجود هیں۔ بعض سیاروں کا کوئی کرۂ هوائی نهیں هے۔ اس لیے کرۂ هوائی هونے کے واسطے جیسا که هم ابهی بیان کر چکے هیں یه لازمی شرط هے که اس کے سیارہ کا اندرونی حصه سرخ گرم یا سفید

گرم ہو یا بالفاظ دیگر اس قدر اندرونی حرارت ہونا چاہیے جو تمام گیسوں کو اندر سے نکال کر پھینک دے اور اس کی سطح پر قائم رکھ سکے —

ہر کرے کی ایک رفتار فاصل ہوتی ہے - اگر کوئی چیز رفتار فاصل سے یا اس سے زائد رفتار سے اوپر پھینکی جاے تو وہ پھر واپس نہیں آے گی - مثلاً زمین کی حالت لیجیے - اگر سات میل فی سیکنڈ کی رفتار سے کوئی گولی اوپر پھینکی جاے تو وہ واپس نہیں ہوگی لیکن اگر یہ رفتار جس سے کہ وہ انتصابی بلندی پر پرواز کرتی ہے سات میل فی سیکنڈ سے کم ہے تو وہ چیز ایک بلندی پر پہنچنے کے بعد واپس ہونی شروع ہوگی - جب کہ رفتار' رفتار فاصل سے زائد ہوتی ہے تو اس کا سفر جاری رہتا ہے اور پھر اس چیز کو زمین کی قوت جاذبہ واپس نہیں بلا سکتی - اب سب گیسوں کو جو ایک نہ ایک وقت سیاروں کی سطح پر ہوتی ہیں یہ فرض کر لینا چاہیے کہ اُڑنے والے سالمات ہیں اور اگر ان کو روکنے کے واسطے زمین کی قوت جاذبہ کافی نہیں ہے تو نہایت تیزی سے متحرک سالمات آہستہ آہستہ فضا میں چلے جائیں گے اور کرۂ ہوائی ان کو مستقل طریقہ سے کھو دے گا - ایک خاص قد و قامت کا سیارہ گیسی کرۂ ہوائی کو قائم رکھ سکتا ہے - ہر ایک نہیں رکھ سکتا - اس دعوے کی فلکی شہادتیں بھی تصدیق کرتی ہیں —

ڈاکٹر جان اسٹون اسٹونی نے دریافت کیا ہے کہ سبک گیسوں کے ذرات بہ نسبت وزنی گیسوں کے زیادہ تیزی سے سفر کرتے ہیں- اسی وجہ سے ہائڈروجن زمین پر قائم نہیں رہ سکتی - وجہ یہ ہے کہ معمولی تپش پر ہائڈروجن کے ذرات سات میل فی سیکنڈ کی رفتار یعنی زمین کی رفتار فاصل سے زائد

تیزی سے سفر کرتے ہیں اور اس لیے وہ فضا میں چلے جاتے ہیں - بخلاف اس کے کرۂ ہوائی کے دوسرے اجزاء مثلاً آکسیجن ' نائٹروجن ' آرگن ' اور کاربن ڈائی آکسائڈ زمین سے باہر نہیں جاتے - وہ ان کو برقرار رکھتی ہے —

چاند میں حالات بالکل مختلف ہیں - زمین کے مقابلے میں اس کی قوت جاذبہ $\frac{1}{6}$ ہے - لہذا اگر کسی گیسی سالمہ کی رفتار ۱۶۲۵ میل فی سیکنڈ ہے تو وہ اڑکر فضاء میں پہنچ جائے گا - چاند کی سطح کی زیادہ سے زیادہ تپش ۱۵۰ ہے - اس تپش پر ہائڈروجن کے سالمات کی رفتار ۱۶۳۵ میل فی سیکنڈ ہوگی یا بالفاظ دیگر یہ رفتار ' رفتار فاصل سے زائد ہوگی - لہذا ہائڈروجن چاند کے اس حصے سے جہاں کہ یہ تپش ہے غائب ہو جانا چاہیے - وہ برابر غائب ہوتی رہتی ہے جب تک کہ قطعاً ختم نہ ہوجائے اور یہی وجہ ہے کہ ہائڈروجن اگر وہ ہمارے سیارہ تابع (Satellite) میں تھی تو وہ بہت جلد ختم ہوگئی - یہی دلیل آکسیجن ' نائٹروجن اور کم و بیش آرگن کے لیے بھی ہے - لہذا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ چاند پر کوئی کرۂ ہوائی نہیں ہے - اس کی گہری وادیوں میں اور زمین دوز غاروں میں ممکن ہے اب بھی کاربن ڈائی آکسائڈ ہو - لیکن چاند کی سطح کا بیشتر حصہ ایسی مکمل خلا کی حالت میں ہے جو بہترین پمپ پیدا کرسکتے ہیں - اس کی چٹانی سطح پر بہت سے آتش فشانی دہانے ہیں جن کے ارد گرد گیارہ ہزار بارہ ہزار فٹ اونچی دیواریں ہیں - آبی بخارات کا ہمارے کرۂ ہوائی پر بہت کچھ دخل ہے - لیکن چاند پر اس کا ایک قطرہ بھی نہیں - اس وجہ سے اس کی وادیوں میں اور پہاڑ کی چوٹیوں پر نہ کہر ہے اور نہ بادل ہیں اور نہ نشیبی سطح پر دریا و سمندر ہیں - بعض دور حاضرہ کے مصنفین کا دعوی ہے کہ چاند کی سطح برف و یخ کے صندوق میں بند

ھے - بعض مثلاً ٹائی‌کو اور کوپرنی‌کس کے بڑے بڑے ڈھانوں سے برت جیسی شعاعیں یا چشمے نکلتے ھیں جن کے متعلق خیال ھے کہ یہ قدیم گلیشیر کے چشمے ھیں - یہی وجہ بڑے پہاڑ ارسٹارکس (Aristarchus) کی سفیدی کی بھی بیان کی جاتی ھے - بہر کیف چونکہ وھاں ھوا اور پانی نہیں ھے اس لیے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی سطح پر خاموشیء مطلق موجود ھے —

زھرہ (Venus) بھی زمین کے برابر ھے اور اس میں بھی تقریباً وھی گیسیں ھیں - اس کا کرۂ ھوائی زیادہ اونچا اور کثیف ھے - جس کا وزن ھمارے کرۂ ھوائی سے تقریباً دوگنا ھے - اس میں آبی بخارات موجود ھیں - تمام سیارے پر بھاپ کے زبردست بادل ھیں جو اس کی سطح کو چھپائے ھوئے ھیں اور اس وجہ سے دریا ' براعظم اور بحر اعظم نظر نہیں آتے ھیں - جدید انکشافات سے ظاھر ھے کہ ایک حصہ مستقل طریقہ سے سورج کے سامنے ھے اور گرم رھتا ھے اور دوسرا اس سے دور رھتا ھے اور سرد و تاریک ھے - اگر ایسا ھے تو زبردست ھوائیں گرم حصہ کی جانب سے سرد حصہ کی جانب چلنا لازمی ھیں اور گرم حصہ کا پانی سرد حصہ میں آکر بالکل منجمد ھوجائے گا —

ارھینیس کا خیال ھے کہ اوسط تپش ۴۰ درجہ مئی ھے اور یہ اس قسم کی زندگی کے واسطے بالکل مناسب ھے جیسی کہ ھماری زمین پر ھے - بڑے بڑے شہر مخلوق کی چہل پہل سے پُر ھوں گے - ذھین و ذکی مخلوق ھوگی - لیکن جب تک کہ بادل اس کی سطح کو چھپائے ھوئے ھیں کوئی انسانی آنکھ اس وجود کا پتہ نہیں لگا سکتی —

مریخ (Mars) زمین کے مقابلہ میں $\frac{1}{9}$ ھے - اس کی قوت جاذبہ بھی ایک تہائی ھے - لیکن یہ اس قدر کافی ھے کہ آکسیجن ' نائٹروجن ' آبی

بخارات اور کاربن ڈائی آکسائڈ کو روک سکے - باوجود چھوٹے ہونے کے اس کا ایک پتلا کرۂ ہوائی ہے جس کا ثقل اضافی ہمارے کرۂ ہوائی کے مقابلہ میں $\frac{1}{7}$ ہے - اس قدر لطیف ہونے پر بھی مریخی کرۂ ہوائی میں کہر موجود ہے اور بادل پائے جاتے ہیں۔ آخر اکتوبر سنہ ۱۸۹۴ع میں یورپ سے زائد حصہ بارش کے بادلوں سے ڈھکا رہا - صاف آسمان میں سورج نہایت چمک دمک سے چمکتا ہے اور اس کے چشمے اور پہاڑ اس کی دوپہر کی شان و شوکت کا ثبوت دیتے ہیں۔ کرۂ ہوائی کی گردش نہایت خاموشی سے جاری ہے تاکہ گرم ملک کی خاموشی پر کچھ ہرج واقع نہ ہو۔ پانی کرۂ ہوائی میں موجود ہے - طیف نما سے اس کا پتہ چلتا ہے اور اس کے برفیلے قطبین ' سمندر اور انجنیری کے بڑے بڑے کاموں کا پتہ چلتا ہے جن کے متعلق لوویل (Lowell) کا خیال ہے کہ وہ ہوشیار لوگوں کا کام ہے - سبزی بھی اس چھوٹے کرۂ پر موجود ہے اس لیے کہ میدانوں کا اور نہروں کا سال کے مختلف حصوں میں رنگ تبدیل ہو جاتا ہے۔ حال میں اس کے کرۂ ہوائی میں آکسیجن بھی دریافت ہوئی ہے - عطارد زمین کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہے اور اس کا کوئی کرۂ ہوائی نہیں ہے - اس کی رفتار فاصل صرف تین میل فی سیکنڈ ہے جب کہ زمین کی ۷ میل فی سیکنڈ ہے - لہذا وہاں بہت ہی کم آبی بخارات اور بہت ہی ہلکے ہوائی غلافات ہوں گے —

بڑے بڑے سیارے مشتری' زحل' یورانس' نیپتون' سب بہت گرم

معلوم ہوتے ہیں اور ان کا وجود یا تو گیسی ہے یا مائع حالت میں۔ ان کی سطحیں بھاپ کے زبردست بادلوں میں پوشیدہ ہیں۔ یہ سیارے بہت وزنی اور کثیف ہیں لہذا ہلکی گیسیں بھی وہاں ہوں گی۔ ان کے بالائی طبقوں میں بھاپ کے علاوہ ہائڈروجن، ہیلیم، نائٹروجن، کاربن ڈائی آکسائڈ، سلفر ڈائی آکسائڈ ہوگی۔ ان کے نیچے کے طبقے سفید گرم ہیں اور ان میں غالباً دھاتیں مثلاً لوھا یا کیلسیم وغیرہ گیسی حالت میں ہوں گی۔ طیف نما سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کرۂ ہوائی میں ایسے نامعلوم عناصر موجود ہیں جو ہماری زمین پر نہیں پائے جاتے ہیں۔ مشتری اور زحل کے طیف میں ایک سرخ حلقہ پایا جاتا ہے اور یہ کسی زمین کے عنصر سے نہیں ملتا۔ یورانس اور نپٹون کی روشنی میں دیگر نامعلوم عناصر کا وجود پایا جاتا ہے —

سورج زمین سے ۳۳۲,۰۰۰ گنا زیادہ بڑا ہے اور وہ سبک ترین گیسی سالمات کو قبضہ میں رکھہ سکتا ہے۔ قبل اس کے کہ وہ آزاد ہوں ان کے سالمات کی رفتار ۳۹۱ میل فی سیکنڈ ہونی چاہیے۔ بہت کم گیسی سالمات کی یہ رفتار ہے۔ پس سورج کا کرۂ ہوائی بہت ہی زیادہ بڑا ہے۔ اس کے بالائی طبقوں میں ہائڈروجن، ہیلیم اور دوسری ہلکی گیسوں کی جو ہماری دنیا میں نہیں پائی جاتی ہیں بڑی زبردست مقدار موجود ہے۔ ہائڈروجن سے اوپر نامعلوم کورونیم (Coronium) موجود ہے جس کی روشنی نہایت صاف سبز ہوتی ہے۔ سورج کے نیچے کے طبقوں میں گیسی لوھا، کیلسیم؛ میگنسیم، اور دوسری دھاتیں موجود ہیں کیوں کہ سورج کی تپش انتہائی

زیادہ ہے جس میں دھاتیں جوش کھا کر اسی طرح اُڑ کر سطح پر آجاتی ہیں جیسے سائع ہوا اُڑ کر ہماری زمین پر بادلوں کی شکل میں چھا جاتی ہے —

فضا میں اور بھی بے شمار جہاں موجود ہیں جو کہ ہم کو نظر نہیں آتے - ہم کو ان کے کرۂ ہوائی کا مطلق علم نہیں اور نہ ان کے دیکھنے یا معلوم کرنے کی کوئی اُمید ہے —

بعض کے کرۂ ہوائی ایسے ہوں گے جیسے ہماری زمین کے۔ دوسروں کے گیسی غلاف ہوں گے لیکن نظام شمسی سے بالکل جدا گانہ۔ ان عجیب و غریب دور کے جہانوں میں جو رموز پوشیدہ ہیں وہ ہر اس بات سے زیادہ دلچسپ ہوں گے جو ہمارے تخیل میں آ سکتی ہے —

اس میدان میں عقل فکر کے جس قدر بھی گھوڑے دوڑائے ہماری مشکلات میں اضافہ ہی ہوتا گیا - ہم نے یہ ضرور محسوس کیا کہ ایک گتھی ہے - یہ ضرور معلوم کیا کہ ایک عقدہ ہے لیکن یہ مشکل کہ وہ گتھی کیوں کر سلجھے اور وہ عقدہ کیوں کر حل ہو ہماری فہم و ذکا سے کہیں بالاتر ہے۔ ان صفحات میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے دراصل یہ ہمارے لیے بچوں کے خوش نما کھلونوں کے مانند ہیں جن کی بیرونی سطح ملمع کاری سے چمک دمک رہی ہے - بچے جس طرح خوش رنگ اور خوش منظر نئے نئے کھلونوں کو دیکھ کر خوش ہوا کرتے ہیں اسی طرح ہماری آنکھوں کے سامنے جب کائنات ہستی کا کوئی نیا خوش منظر شگوفہ کھلتا ہے تو ہم پر اس سطحی اور خوش رنگ منظر سے

تحیر اور خوشی کا ایک عجیب عالم طاری هو جاتا هے - رها یہ امر کہ همیں اس خوش نما شگوفہ کی اصل حقیقت کا کہاں تک علم هے تو لا علمی کی انتہائی مجبوری اور مایوسی میں همیں اقرار کرنا پڑتا هے کہ حقیقت کا علم بس خدا هی کو حاصل هے —

محمد ابن موسیٰ خوارزمی

از

(جناب محمد زکریا صاحب مائل)

سابقہ اشاعت میں ابوالوفا بوز جانی کے حالات اور ان کے ساتھ اہل مغرب کی سرد مہری کا ذکر ہوچکا ہے اب دنیائے ریاضی کی ایک اور اہم شخصیت کے سوانح و کمالات حوالۂ قلم کئے جاتے ہیں —

اس حقیقت کا اظہار ناگزیر ہے کہ ایسی عالی مرتبہ اور ناقابل فراموش ہستیوں کے ذکر جمیل اور علمی خلود کی طرف سے بے پروائی برتنے کی بڑی ذمہ داری زیادہ تر ہمیں پر عائد ہوتی ہے - ادب و تاریخ کے بڑے بڑے نامور رکن جن پر مشرق کو بجا طور پر فخر و ناز کا موقع ہے ہمارے مشرقی ہونے کے باوجود اس طرح ہمارے تساہل و سہل انگاری کا شکار ہوچکے ہیں کہ دنیا ان کے نام و نشان تک سے نا واقف ہے - اگر ہم اس عبرت ناک جمود و غفلت میں مبتلا نہ ہوتے تو خدا جانے کتنے ماہرین ریاضی و طبعیات اور دوسرے اہم علمی شعبوں کے باکمال حاملوں کے خزائن تحقیق و نتائج فن ہمارے سامنے ہوتے اور آج کسی کو یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہ ہوتی کہ " عرب کبھی مخترع اور موجد کی حیثیت نہ حاصل کرسکے - انھوں نے ہمیشہ غیر اقوام کی نقالی کی اور دوسروں کا سرمایۂ کمال تراجم کے ذریعے سے اپنے یہاں منتقل

کرلیا" - حالانکہ یونان اور ہندوستان کے علوم سے استفادہ کے ماسوا عربوں نے بیشتر علوم اور احسان مدنیت میں اتنے اہم اور عظیم‌الشان اضافے اور ایجادیں کیں جو بلا اختلاف مغرب کی حضارت موجودہ کا اساس شمار کی جاتی ہیں - جن کی بنا پر عربوں کی فضیلت ذکر و بحث کی محتاج نہیں رہی - خود مغربی مصنفین نے کھلے دل سے علم کیمیا و جبر و مقابلہ اور مثلثات و فلکیات وغیرہ میں ان کا فضل تقدم تسلیم کیا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ عربوں نے فلکیات کو اپنے یہاں لینے کے بعد اس میں بہت سے اضافے کئے اس کے اصول مدون و مرتب کئے - اسی طرح جبر و مقابلہ کو مکمل کیا جو تکمیل واستیعاب کے ساتھہ یونانیوں کو معلوم نہ تھا - اس کے بہت سے نظریے بنائے جو آج دنیا کو معلوم ہیں اور جن کے ذریعہ سے حل اشکال وغیرہ کی مختلف ترکیبیں اور معادلات کے متعدد حل واضح ہوگئے ہیں - علم حساب میں بھی بہت سے اہم اضافے کئے خصوصاً نظریۂ اعداد میں - چنانچہ عام طور پر مشہور ہے کہ لفظ صفر ٹھیک انہی معنوں میں جن میں آج مستعمل ہے سب سے پہلے عربوں ہی نے استعمال کیا - مثلثات میں نہایت کمال و مہارت پیدا کی اور اس فن میں عجیب عجیب اختراعیں کیں - جیبوں کے قانون تناسب کی دریافت اور مثلثات کرویہ کے حل کا عام قانون انہیں کی عقل و بیداری دماغ کا ممنون ہے' مماس التمام' قاطع اور قاطع التمام کے لیے جد اول ریاضیہ سب سے پہلے انہیں نے وضع کیں - غرض ان تمام امور میں عربوں کے لیے فخر و مباہات کا کافی مواد موجود ہے —

حاصل تمہید یہ ہے کہ انہیں فاضل ہستیوں میں ایک محمد ابن موسی خوارزمی بھی ہیں اور علوم ریاضیہ کے تقدم و ترقی میں انہیں بڑا درجہ حاصل ہے - انہوں نے ریاضی کی سب سے اہم شاخ جبر و مقابلہ کے اصول

مرتب کرنے میں بہت مہارت و دماغ سوزی کا ثبوت دیا - ان کے متعلق ایک یوروپین فاضل کا مقولہ ہے کہ " محمد ابن موسی عرب کا سب سے بڑا ریاضی داں تھا جو مامون کے عہد میں ناسور ہوا " * اور حقیقت میں یہ مقولہ ذرا بھی غلط نہیں ہے —

مغربی سوانح نگاروں نے محمد ابن موسی اور ابو جعفر محمد ابن موسی ابن شاکر کو ایک سمجھہ کے خلط مبحث کردیا ہے ' کیونکہ موخرالذکر بھی ایک مدت سے ابو جعفر کے نام سے مشہور تھا —

محمد ابن موسی خوارزمی ترکی الاصل تھے † - خراسان میں پیدا ہوے اور بغداد میں سکونت و اقامت اختیار کی - یہ اس مہم کے ایک ممتاز رکن تھے جو مامون رشید نے بحث و تحقیق کے لیے افغانستان بھیجی تھی - مختلف علوم میں ان کی متعدد تالیفات ہیں خصوصاً ریاضیات اور فلکیات میں - یہ علوم اولین سے واقفیت پیدا کرنے کے بڑے شائق تھے اور ان پر بہت زیادہ غور و بحث کیا کرتے تھے - ان خصوصیات میں وہ اپنے معاصر علما کے دوش بدوش تھے - اسی مہارت مطالعہ اور زبردست شوق تحقیق کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے علم جبر و مقابلہ میں " کتاب المختصر فی حساب الجبر و المقابلہ " جیسی اہم اور قابل قدر کتاب یادگار چھوڑی —

کہا جاتا ہے کہ خوارزمی پہلے شخص میں جنھوں نے جبر و مقابلہ کو علمی شکل سے وضع کیا اور اس فن میں سب سے پہلے تالیف کا کام کیا - گو بظاہر اس بیان میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے لیکن جب مورخین کے اقوال

* اسمتھہ تاریخ الریاضیات صفحہ ۱۷۰ —

† صالح زکی آثار باقیہ جزء دوم صفحہ ۲۳۷ —

پر نظر پڑتی ہے تو اس کی صداقت چنداں مشتبہ نہیں رہتی - یہاں چند اقوال درج کیے جاتے ہیں - علامہ ابن خلدون اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں - " خوارزمی سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے جبر و مقابلہ میں کتاب لکھی " —

ابو کامل شجاع ابن اسلم نے کتاب " الوصایابالجبر والمقابلہ " کے مقدمے میں لکھا ہے - خوار زمی ہی نے سب سے پہلے علم الجبر کو مدون و مرتب کیا * —

پھر انھیں ابو کامل نے " کتاب الجبر و المقابلہ " کے مقدمے میں اس حقیقت کا صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ خوار زمی جبر و مقابلہ کے موضوع پر کتاب لکھنے میں مجھہ سے سبقت لے گئے † اور لکھا ہے کہ " میں نے جبر و مقابلہ میں ایک کتاب جو تالیف کی اور اس میں بعض معلومات محمد ابن موسی کی درج کیں جو انھوں نے اپنی کتاب میں لکھی تھیں اور ان کی شرح لکھی ' جن بیانات کو محمد ابن موسی نے بلا شرح و وضاحت کے درج کیا تھا میں نے ان کی تشریح و توضیح کی " —

اس اعتراف سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ " کتاب الخوار زمی " کے بعض دقیق مسائل کی شرح لکھے جانے سے کتاب الخوار زمی کی قدر و قیمت کم نہیں ہوئی بلکہ اور بڑھ گئی —

خوار زمی کی وہ کتاب جس پر اس وقت ہمیں کچھہ لکھنا ہے ' بہت سے وجوہ سے تالیف کی گئی تھی جن میں سے بڑا سبب یہ ہے کہ

* صالح زکی آثار باقیہ جزو دوم صفحہ ۴۸ —

† ایضاً آثار باقیہ جزو دوم صفحہ ۲۴۹

محمد ابن موسی خوار زمی نے دیکھا کہ لوگوں کو ایک ایسی کتاب کی سخت ضرورت ہے جو تجارتی معاملات ' اراضی کی پیمائش اور دشوار حسابی مسائل کے حل میں سہولت پیدا کرے ' اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے یہ کتاب لکھی —

اس موقع پر یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سب سے پہلے لفظ " جبر " کا استعمال مروجہ اصطلاحی معنوں میں خوار زمی ہی نے کیا - اس کے بعد اہل فرنگ نے اپنے یہاں لے کر اس علم کا نام " الجبرا " رکھا —

کتاب متذکرۂ بالا کا نام " کتاب المختصر فی حساب الجبر والمقابلہ " ہے اور یہ پانچ ابواب میں منقسم ہے —

پہلا باب - اس میں پہلے اور دوسرے درجہ کے معاملات اور ان کے حل کرنے کا بیان ہے - اس میں معادلات کو چھ قسموں میں تقسیم کیا ہے - ب س۲ = ح س و ب س۲ = د ' م س = د ' ب س۲ + ح س = د ' ب س۲ + د = ح س ' ب س۲ = ح س + د —

خوار زمی نے صحیح طور پر مثبت جذر نکالے وہ اس سے بے خبر نہ تھے کہ دوسرے درجہ کے معادلہ کے دو جذر ہوتے ہیں - چنانچہ معادلہ کے دونوں جذر نکال کر دکھا دیے —

دوسرے باب میں بعض قواعد جبر و مقابلہ کے دلائل حسابی طریقہ سے لکھے ہیں - تیسرے باب میں اسی علم کے مقداروں کو ضرب دینے کے نظریہ پر بہت مفصل بحث ہے - مثلاً (س - ب) کو (س - ح) سے ضرب دینا —

چوتھے باب میں معادلات کے ہندسی حل بہت سے طریقوں سے واضح کیے ہیں

اس بحث کی اہمیت سمجھنے کے لئے حسب ذیل مثال پر غور کرنا چاہئے -

$س^۲ + ۸س = ۲۰$

فرض کرو [ح ب] = س
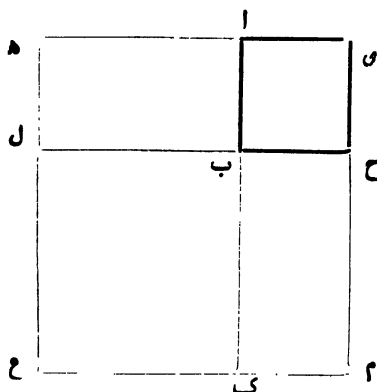
ح ب پر ایک مربع ب ح ی ا بناؤ۔ اور ی ا کو ہ تک اور ی ح کو م تک خارج کرو۔ اور ا ہ = ح م = $\frac{۱}{۲}$ × ۸ = ۴ ، اب شکل ہ ع م ی مکمل کرو —

مربع ا ح = س × س = $س^۲$

مستطیل ب ہ = $۲^۲$ × س = ۲ × ۲ س

مستطیل ب م = $۲^۲$ × س = ۲ × ۲ س

اس لئے $س^۲$ + ۸ س برابر ہے مربع ا د اور دو مستطیلوں ب ہ ، ب م کے مجموعہ کے لیکن $س^۲$ + ۸ س = ۲۰ اس لئے مربع ا د اور دو مستطیلوں ب ہ اور ب م کا مجموعہ برابر ہے ۲۰ کے

مگر مربع ب ع = ۴×۴ = ۱۶

جب ہم نے ب ع کی پیمائش ہر طرف سے بڑھادی تو نتیجہ نکلا

$س^۲$ + ۸س + ۱۶ = مربع ا ح + مستطیل ب ہ + مستطیل ب م + مربع ب ع۔

لیکن $س^۲ + ۸س + ۱۶ = ۲۰ + ۱۶ = ۳۶$

اور مربع ا م اور دونوں مستطیل ب ھ ، ب م اور مربع ب ع کے برابر ھے مربع ی ع کے ۔ اس لئے مربع ی ع = ۳۶ یعنی ضلع ی م برابر ھے ۶ کے مگر ی م برابر ھے س + ۴ کے اس لئے س + ۴ = ۶ ∴ س = ۲

چوتھا باب مقالہ پر جبر و مقابلہ کے قواعد و جمع وغیرہ پر مشتمل ھے اس میں تفریق و ضرب و تقسیم کے طریقے بھی بیان کئے ھیں۔

آخری باب میں ریاضی کے بعض مسائل اور بعض نظریات کی تطبیق کی ھے جن میں سے بعض بعض مدارس ثانوی کی درسی کتابوں میں نظر سے گزرے ھیں —

" کتاب المختصر فی حساب الجبر و المقابلہ " کو بڑی تاریخی اھمیت حاصل ھے ۔ کیوں کہ اس کتاب کے بعد جتنی کتابیں علما نے لکھی ھیں وہ سب اسی کے آثار پر مبنی ھیں ۔ لاطینی زبان میں اس کا ترجمہ رابرٹ آف چسٹر (Robert of Chester) نے بارھویں صدی عیسوی میں کیا * ۔ یہ شخص ریاضیات میں مشرقی مآثر سے اتنی دل بستگی رکھتا تھا کہ اس نے بڑے اھتمام کے ساتھ اپنی غرض پوری کرنے کے لئے اندلس کا سفر کیا اور برشلونہ میں ریاضی کی تعلیم پائی ۔ لاطینی زبان میں قرآن مجید کا پہلا ترجمہ بھی اسی رابرٹ کا کیا ھوا ھے † —

لاطینی میں جبر و مقابلہ کا ترجمہ ھوجانے سے قرون وسطیٰ اور قرون جدیدہ کے بہت سے علما نے اس علم سے استفادہ کیا ۔ اور یہ علم ان کی ریاضی کی تحقیقات اور مطالعہ کا مدار علیہ قرار پا گیا ۔ اس سلسلے میں جن

---

* اسمتھ تاریخ الریاضیات صفحہ ۱۷۰ † اسمتھ تاریخ الریاضیات صفحہ ۲۰۳

لوگوں کو شہرت حاصل ہوئی وہ یہ ہیں : فیبوناشی (Fibonace)' لوقا دو بورغو (Lucas de Burgo)' پاچیولی (Paccioli) 'قاردان (Cardan)' تار تا غلیا (Tartaglia) اور فراری (Ferrari) وغیرہ *-

عبداللہ ابن حسن ابن الحاسب صیدلانی نے "کتاب المختصر" کی شرح لکھی اس کا یہ نام رکھا "کتاب شرح کتاب محمد ابن موسی الخوارزمی فی الجبر" اسی طرح سنان ابن فتح حرانی نے بھی اسی کتاب کی ایک شرح لکھی اور اس نام "کتاب الجبر و المقابلہ الخوارزمی" رکھا -

اس کے علاوہ محمد ابن موسیٰ خوارزمی کی مشہور تالیفات میں ایک کتاب کتاب الحساب الہندی کے نام سے ہے جو انھوں نے کتاب المختصر کے بعد تالیف کی تھی - عجیب بات ہے کہ یہ کتاب مفقود ہے اور اسامی کتب کی مشہور فہرستوں میں اس کا نام نہیں ملتا -

بارھویں صدی عیسوی میں انگلینڈ میں ایک شخص اڈلارڈ آف باتھ (Adelard of Bath) کا نام یونان و مصر اور بعض بلاد عرب کی سیاحت میں بہت مشہور ہوا اور ساتھ ہی یہ شہرت بھی ہوئی کہ یہ شخص علوم مشرقیہ سے استفادہ کی جد و جہد میں مصروف ہے ۔ اس شخص نے بہت سی عربی کتابیں لاطینی زبان میں ترجمہ کیں - ان منتقل شدہ کتابوں میں کتاب ہندسہ اقلیدس اور کتاب المختصر في حساب الهندی الخوارزمی ہے جس کا عنوان (Algoritimi de Numero Indorum) کے نیچے لکھا ہے اور لفظ غور یتھمی (Algoritimi) مولف کتاب خوارزمی کی نسبت استعمال کیا ہے —

* صالح زکی آثار باقیہ صفحہ ۲۵۱- † اسمتھ تاریخ الریاضیات صفحہ ۱۷

حساب کی یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو یورپ میں آئی۔ اسی لئے علم حساب ایک مدت تک یورپ میں غوریسموس (Algorismus) ‡ کے نام سے، موسوم رہا جو غور یتیمی یعنی (Algoritimi) سے ماخوذ ہے۔ چونکہ ان دونوں کتابوں کو تاریخی اور ریاضیاتی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت حاصل تھی اس لئے ان کی بدولت ان کے مولف کی بہت شہرت ہوئی اور ان کا نام اور کارنامہ ہمیشہ کے لئے یاد گار ہوگیا —

ان کتابوں کے علاوہ خوارزمی کی اور مولفات بھی ہیں - یہاں صرف ان کا نام درج کرنا کافی معلوم ہوتا ہے -" زیج الخوارزمی "، " کتاب الرخامہ " کتاب العمل بالاصطرلاب اور کتاب التاریخ — (ماخوذ)

‡ صالح زکی آثار باقیہ صفحہ ۲۵۱

فن دباغت

از

حضرت دباغ سیلانوی

(۴)

کھال کی خرید فروخت

کھال کی خرید و فروخت کو اس مضمون سے زیادہ تعلق نہیں ہے مگر عملی میدان میں جو کچھ تجربہ میں آیا ہے اس کے نتائج سے واقف ہوتے ہوئے اس کو نظر انداز کرنا بڑی غلطی ہوگی۔ اس لیے چند معمولی طریقے جن کا منڈی میں رواج ہے مختصر طور پر لکھے جاتے ہیں۔ ہندوستان کی موجودہ رفتار صنعت و حرفت اور تجارت کو دیکھتے ہوئے نہ مالک کارخانہ کو الزام دے سکتے ہیں کہ وہ ایک ماہر فن سے تاجر، منشی، محاسب، وغیرہ سب کا کام کیوں لیتا ہے، اور نہ کسی فن کے واقف کار کو ہی کوئی الزام لگا سکتے ہیں۔ مالک کارخانہ (سرمایہ دار) اول تو صنعت و حرفت اور کوئی اس قسم کا کام کرنا پسند نہیں کرتا اور کبھی کسی کے کہنے سننے یا اپنے شوق تجارت میں کرتا بھی ہے تو یہ سمجھتا ہے کہ ٹینر صاحب کو معقول تنخواہ دی جاتی ہے اور یہ جاپان، انگلستان، امریکہ اور جرمنی کے تعلیم یافتہ ہیں اس لیے ان کو ان کے فن کے متعلق خرید و فرخت، لین دین سب

میں مہارت ہونا لازمی ہے اور اس لیے جتنا کام چاہو ماہر صاحب سے لے لو۔
ماہر فن جن کی قابلیت کی قدر کرنے کے لیے ملک بالکل تیار نہیں ہے
یہ سمجھ کر کہ اگر کسی کام کے لیے نفی میں جواب دیتا ہے تو مالک صاحب
اُسے نا قابل سمجھیں گے اور ملازمت ملنا دشوار ہوگا اس لیے ان سے جو
سوال کیا جاتا ہے فرماتے ہیں کہ اگر میں اس کو نہیں جانتا تو دنیا میں
اور کون اُسے جان سکتا ہے۔ چنانچہ یہ ہر فن مولا ہو جاتے ہیں۔ قصہ
مختصر یہ کہ یہ دونوں صاحب اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں اور ان کی
اس ہٹ دھرمی کا برا نتیجہ کارخانہ کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ اس حد تک
تو زیادہ افسوس نہیں ہوتا۔ کیونکہ ملک میں جدید صنعت و حرفت قایم
کرنے کے لیے ہم کو بہت سی قربانیاں کرنا لازم ہے اور اس کے بعد کی
نسل ہماری ان ناکامیوں سے فائدہ اُٹھاے گی۔ مگر سرمایہ دار صاحب اور
ماہر فن کی غلطی سے کوئی برا نتیجہ پیدا ہو تو ملک کے اور احباب
جو اس بات کے منتظر تھے کہ فلاں صاحب کا کاغذ کا کارخانہ یا شکر کا
کارخانہ یا چمڑے کا کارخانہ اگر کامیاب ہوا تو اللہ کا دیا ہمارے پاس بھی بہت
سرمایہ ہے اور ہم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کر سکتے ہیں، وہ سب کے سب
پست ہمت ہو جاتے ہیں اور ہماری صنعت و حرفت کی رفتار برسوں کے لیے
بند ہوجاتی ہے اور ملک اور قوم کو بجاے فائدہ کے سخت نقصان ہوتا ہے —

کھال سے چمڑا پکا کرنا اور بات ہے۔ خرید و فروخت، لین، دین، لوٹ و
پھیر وغیرہ سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ ماہر فن کا کام یہ ہونا چاہیے
کہ کھال سے جو ملک میں نہایت کثرت سے ہوتی ہے، عمدہ سے عمدہ چمڑا
بنائے اور اس کی لاگت ایسی کم ہو کہ کارخانہ کا مال چمڑے کی منڈی
میں اوروں کے مقابلہ میں آسانی سے اور نفع سے جلد فروخت ہوجائے۔ اگر

یہ صاحب کچھہ سمجھہ رکھتے ھیں تو شروع ھی سے اس کا پورا پورا خیال رکھیں گے کہ مال کی لاگت کم آئے ورنہ مال تو بہت عمدہ ھوگا اور ملتی میں نہایت خوشی سے سوداگر خرید بھی لیں گے ' مگر بازار کے نرخ سے فروخت کرنے میں بجائے نفع کے کارخانہ کو نقصان ھوگا - تجربہ کہتا ھے کہ کھال کی خرید اور پکے چمڑے کی نکاسی (فروخت) سے واقف نہ ھونے کی وجہ سے ھندوستان کے بہت سے کارخانوں کو سنہ ۱۹۰۴ع سے اس وقت تک سخت نقصان اٹھانا پڑا ' چنانچہ بہت سے بند ھو گئے ھیں - مالی دشواریاں اور مالک کارخانہ و ماھر فن کی بدگمانیاں بھی اس ناکامی کی بڑی حد تک ذمہ دار ھیں - اس کے برعکس کھال کے فروخت کرنے والے اور چمڑے کے خریدنے والے نسبتاً فائدہ میں رھتے ھیں ' کیونکہ یہ تمام عمر صرف ایک کام کرتے رھتے ھیں اور اس کی اونچ نیچ سے مالک کارخانہ اور دباغ صاحب سے زیادہ واقف ھوتے ھیں - جس کارخانہ کا مالک یا ماھر کھال کی خرید و فروخت سے واقف ھوتا ھے اس کی سب سے بڑی مشکل آسان ھو جاتی ھے- جس کو کارخانہ کی بڑی کامیابی سمجھنا چاھئے - اس لیے کارخانہ میں تقسیم فرائض اور ان کی باقاعدہ انجام دھی نہایت ضروری ھے - جو کارخانے بڑے پیمانے پر چلائے جاتے ھیں وھاں تقسیم فرائض کا انتظام بہت ھوشیاری سے کیا جاتا ھے - اس میں جو ماھر ھیں وہ کارخانہ کے ایسے صیغوں میں سے صرف ایک میں کمال رکھتے ھیں اور برسوں ایک کارخانہ میں صاحب کمال سمجھے جاتے ھیں - مگر اس کے دوسرے صیغوں سے بالکل ناواقف ھوتے ھیں اور جس خوبی اور کمال کے ساتھہ اپنے صیغہ کا کام انجام دیتے ھیں اسی کارخانہ کے کسی دوسرے صیغہ کو اس خوبی اور کمال کے ساتھہ نہیں چلا سکتے —

کھال کی خرید و فروخت کے کئی طریقہ ھیں - ان میں سے چند، جن کا زیادہ رواج ھے، درج کئے جاتے ھیں —

۱ - کمیشن پر مال خریدنا :- قصاب کار خانہ کی ضرورت کے مطابق گاے بھینس کی کھال کمیلہ سے خریدتا ھے اور اگر کار خانہ اُسی شہر میں ھوا تو جلد از جلد مال کو وھاں بھیج دیتا ھے لیکن اگر کار خانہ شہر سے فاصلہ پر ھے اور مال ریل سے جاتا ھے تو کھال کو کمیلہ سے مکان پر لاتا ھے - اُس کو خوب دھو کر کھانے کا نمک لگاتا ھے اور جب وہ اس قابل ھو جاتا ھے کہ ھفتہ دو ھفتہ سفر میں خراب نہ ھو تو اس کو ریل سے روانہ کردیتا ھے - کمیلہ سے مکان پر لانا، نمک لگانا، گٹھری باندھنا، اور ریل پر مال چڑھانا، اس کے کل اخراجات کار خانہ کے ذمہ ھوتے ھیں اور عام طور پر قصاب کو اس کا معنتانہ چار آنے فی فرد گاے اور آٹھ آنے فی فرد بھینس کے حساب سے دیے جاتے ھیں - بعض کار خانہ دار آڑھت سے کام کرتے ھیں جس کے یہ معنی ھیں کہ خرید کرنے والا اور مال فروخت کرنے والے کے درمیان ایک اور صاحب ھوتے ھیں جن کو آڑھتیا یا کمیشن دار کہتے ھیں اور زیادہ تعداد میں کام کرنے والے ان کی معرفت اپنی ضرورت کا مال خریدتے ھیں - اس صورت میں کمیشن دار ایک حد تک دونوں فریق کا خیال رکھتا ھے اور بعض اوقات یہ بھی دیکھا گیا ھے کہ آپس میں کوئی قرار نہ بھی ھو تو بھی کار خانہ میں اگر مال میں کوئی عیب نکل آیا، تو بیچ بچاؤ کر کے کار خانہ کے ساتھ کچھ رعایت کرا دیتا ھے —

۲ - خرید مکرر :- خرید مکرر اُس کو کہتے ھیں جس میں قصاب کھال کو اُٹھا کر اُس کے وزن اور جچائی کا اندازہ کرنے کے بعد اس کی قیمت

طے کرکے مال خرید لیتا ھے —

۳ - تیسرا طریقہ یہ ھے کہ ذبح کے بعد کھال کا وزن کر لیا جاے اور فی من یا سیر سے جو قیمت طے ھو ادا کردی جاے —

۴ - بہترین طریقہ کار خانہ کے لیے چونہ کے وزن پر کھال خریدنے کا معلوم ھوتا ھے - کیونکہ اس طریقہ میں جب کھال کے بال چھیچھڑے وغیرہ صاف کردیے جاتے ھیں تو اس وقت اس کی کل خوبیاں خامیاں آسانی سے معلوم ھوجاتی ھیں - اس کے مطابق مال کو پرکھہ کر اس کا وزن کرکے قیمت ادا کی جاتی ھے - بالوں میں کھال کے عیب پوشیدہ رھتے ھیں جس کو صرف وھی لوگ تاڑ جاتے ھیں جو عمر بھر اس کام کو کرتے رھے ھیں مگر تازہ ولایت دباغ صاحب کو یہ عیب اُسی وقت معلوم ھوسکتے ھیں جب مال چونہ سے صاف کیا جاے - اور اب قیمت چونکہ ادا ھو چکی اس اس لیے ان کے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ھوتا —

چونے کے وزن کا طریقہ

اس طریقہ سے مراد وہ طریقہ ھے جس میں مال کو چونے سے نکال کر تیار ھونے پر چھیلا جاتا ھے اور پھر اصل چھڑا وزن کیا جاتا ھے - کمیلہ سے آنے کے بعد بھی کسی قدر باریک گوشت جھلی یا جھنی لگی رھتی ھے جو اُس وقت یعنے تازہ ھونے کی حالت میں چھڑے سے علحدہ نہیں ھو سکتی - یعنے ھاتھہ کی گرفت میں نہیں آتی - اس کو چونہ سے تیار ھوجانے کے بعد چھری سے چھیل دیتے ھیں اور کھری ' دم ' چھوٹی اگر الگی ھو سب کاٹ دیتے ھیں - اس کا نرخ پاونڈ فی روپیہ میں پیشتر سے طے ھوجاتا ھے اور پرکھائی ' چھائی یا اول ' دویم ' سویم ' داغی کا الگ الگ نرخ طے

ہوجاتا ہے۔ یہ بہترین طریقہ ہے جو ہندوستان میں رائج ہے۔ اور گورنمنٹ ٹینری کانپور میں بھی یہی طریقہ کام میں لایا جاتا ہے۔ تجربہ بتلاتا ہے کہ چونہ کا وزن کمیلہ کے تازہ چمڑے کے وزن سے دو پونڈ فی چمڑا بھینس میں اور ایک پونڈ فی چمڑا گائے میں کم ہوجاتا ہے۔ بعد ذبح گوشت نکال کر چمڑا بالکل صاف کرکے پانی سے دھویا جائے اور خون وغیرہ سے صاف کرکے دم، چوٹی، کھری کاٹ کر پانی نکال دینے کے بعد وزن کیا جاوے تو چونہ میں یہ ہی وزن آوے گا —

۵ - مردار یا سکتی گوکھہ اور بھینس من کے نرخ سے فروخت ہوتا ہے اور ولایت کے خریدار بھی جو ہندوستان میں خریدتے ہیں وہ بھی من کے نرخ سے خریدتے ہیں —

۶ - مصالحہ یعنی فرمے کا گوکھہ بھینس بیس بیس پونڈ کے نرخ سے فروخت ہوتا ہے۔ ولایت مال بھجوانے والے بھی بیس پونڈ ہی پر نرخ طے کرتے ہیں۔ بھاری بھیڑ ی اور بکری کا عام رواج فی سیکڑہ پر ہے۔ ہندوستان اور ولایت ہر جگہ فی سیکڑہ کا نرخ رائج ہے۔ فی سیکڑہ کا نرخ ناپ پر ہوتا ہے خواہ وہ گیلی ہو خواہ وہ خشک۔ پٹنہ بنی ہوئی ہو سب کا نرخ ناپ پر سے ہوتا ہے —

بکری کی ناپ اس طرح ہوتی ہے :- چھوٹی (Kid، ۲۸ — ۳۰ انچ) ہلکی (Light ۳۰ — ۳۲، انچ)، درمیانہ (Medium، ۳۲ — ۳۶ انچ)، بھاری (Heavy، ۳۶ — ۴۰ انچ) ڈبل بھاری (Extra Heavy ۴۰ سے اوپر) —

اب ان پیمائشوں پر نرخ طے ہوجاتا ہے۔ ایسی خوردہ فروش بھی جیسا کہ عام رواج ہے فرد فرد فروخت کرتے ہیں —

پانی

پانی جس کثرت اور افراط کے ساتھہ چمڑا پختہ کرنے کے لیے کار خانوں میں استعمال ہوتا ہے اس کا اندازہ کرنا نہایت ضروری ہے ورنہ کار خانہ کو دن بھر میں لاکھہ دو لاکھہ مشک پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سے کم کا انتظام کیا جاتا ہے - اس لیے اس کا لحاظ کر کے انتظام کرنا چاہیے کہ کنویں میں گرمی کے موسم میں بھی کار خانہ کی ضرورت سے بہت زیادہ پانی ہونا چاہیے اور ذخیرہ کے حوض میں جمع کرنے کے لیے اگر انجن کنویں یا ندی پر لگایا جاے تو اس میں کافی سوت ہونے چاہئیں - پانی کے ذرایع ندی، کنویں وغیرہ کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتے - کیونکہ نلوں سے پینے کا پانی لینا نہایت گراں ہوگا - اس لیے کار خانہ کو اپنا انتظام آپ کرنا نہایت ضروری ہے —

پانی عام طور سے ہلکا اور بھاری کہا جاتا ہے - ہلکا پانی وہ سمجھا جاتا ہے جس سے کھانا جلد ہضم ہو اور جس کے استعمال سے کوئی بیماری نہ ہوتی ہو - ہندوستان کے مختلف حصوں (اور ہندوستان ریاست کے) بعض صوبہ کے متعلق یہ اکثر سنا گیا ہے کہ وہاں کا تبادلہ تو کالے پانی کا تبادلہ سمجھنا چاہئیے - اس کے معنے سمجھہ میں یہ آتے ہیں کہ ان مقامات کا پانی صحت کے لیے خراب ثابت ہوا ہے - اور جانے والوں کو بخار وغیرہ امراض کی شکایت ہو جاتی ہے - بعض مساوی الحجم پانیوں کو وزن کر کے اندازہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پانی ہلکا ہے یا بھاری - سمجھہ دار لوگ بھاری یا خراب پانی کو ہمیشہ جوش دے کر ٹھنڈا ہونے کے بعد استعمال میں لاتے ہیں - جوش کرنے کے بعد بہت سے نمک پانی کی تہہ میں بیٹھہ جاتے ہیں اور ممکن ہے کہ یہ مضر صحت ہوں —

پانی سب سے اچھا اور صاف ستھرا وہ سمجھا جاتا ہے جو بارش کے

موسم میں زمین پر گرنے سے پیشتر جمع کیا جاتا ہے - اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ موسم باران میں ایک نہایت صاف دھوبی کی دھلی ہوئی چادر کو خیمہ کی طرح میدان میں تان دیا جائے اور اس کے نیچے ایک صاف قلعی دار برتن رکھہ دیا جائے تاکہ بارش کا پانی چھن کر اس برتن میں جمع ہوجائے - اس کو استعمال کیا جائے - دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انجن کی بھاپ کو کسی ترکیب سے سرد کرکے جمع کرلیا جائے یا قرنبیق کے ذریعہ سے پانی کشید کیا جائے - یہ طریقے چلد نفوس کے لئے اور دوا سازوں کے لیے مفید ہوسکتے ہیں مگر تجارتی پیمانہ پر جہاں پانی کا لاکھوں مشک روزانہ صرف ہوتا ہو وہاں ان کا گذر نہیں ہوسکتا - قدرت نے جہاں اچھا پانی عنایت کیا ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے —

بارش کا پانی زمین پر بہہ کر اور اس میں جذب ہو کر کنووں میں جمع ہوتا ہے - زمین میں بہت سے نمک، جو قدرت نے کسی مصلحت سے اس میں رکھے ہیں وہ اس پانی میں گھل کر شریک ہو جاتے ہیں - کسی کنویں کا پانی کھارا کسی کا سیٹھا اور کسی کا بد ذائقہ کہا جاتا ہے - اس کی وجہ نمک، شورہ، سوڈا، کی موجودگی ہوسکتی ہے - زمین کے بہت سے نمکوں میں سے بعض نمک کارخانہ کے لیے مفید نہیں ہوتے اس لیے کارخانہ کے لیے عمدہ پانی کا افراط سے ہونا نہایت ضروری ہے —

نمک اور اسی قسم کی اور چیزیں اگر پانی میں ہوتی ہیں تو چھال؛ پتی، اور دیگر کارخانہ کی قیمتی چیزوں کو پھاڑ کر بیکار کر دیتے ہیں اور قلیل مقدار میں موجود ہوں تو جب مال پختہ ہوکر گودام میں آتا ہے، تو اس میں عیب آجاتے ہیں، جو آسانی

سے اور بلا خرچہ کے دور نہیں ہوسکتے ، اس لیے کارخانہ کے قیام کے وقت پانی کی جانچ پرتال نہایت ضروری ہے۔ کیمیاوی طریقہ سے پانی کی اصل خرابی کو دور کیا جاسکتا ہے مگر اس پر جو صرفہ ہوگا وہ کارخانہ کے لیے مفید ثابت نہیں ہوسکتا —

اور وجوہات کے علاوہ جہاں تک خیال کیا جاتا ہے واقعات اس کے شاہد ہیں کہ کانپور ، لاہور ، جالندھر ، پھگواڑہ ، کرانچی ، بمبئی ، مدراس حیدرآباد دکن ، اور میسور وغیرہ کے پختہ چمڑے کی جو تعریف هندوستان ، انگلستان ، جرمنی اور امریکہ میں کی جاتی ہے اس میں پانی کا بڑا حق ہے - پختہ چمڑا بنانے والے کارخانوں کو اس سے فائدہ ہوا - نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس پر زیادہ توجہ نہیں کی گئی کہ هندوستان کے ایسے مقامات پر جہاں خاص خاص صنعتیں زیادہ فروغ پاتی ہیں ، وہاں ایسی کیا خصوصیات ہیں کہ کارخانے اس خاص مقام پر زیادہ کثرت سے قایم ہوتے ہیں ، ورنہ سائنس ضرور امداد کرتی اور ملک کو معلوم ہوجاتا کہ کانپور اور دیگر مقامات کا پختہ چمڑا کیوں مشہور ہے ، اور اس میں اچھے پانی کا کس قدر حصہ ہے - موجودہ صورت حال میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ اور اسباب کے علاوہ ان مقامات کا پانی بھی اس صنعت و حرفت کے لیے نہایت مفید ثابت ہوا ہے —

پانی خواہ ندی سے لیا جاے یا کنویں سے اس کو کارخانہ میں ایک بڑا ذخیرہ بنا کر جمع کرنا چاہئے تاکہ مٹی وغیرہ ہو تو اس کی تہہ میں بیٹھہ جاے اور اگر انجن میں کوئی

خرابی ہوجائے یا کوئی اور رکاوٹ پیدا ہو تو یہ کار آمد ثابت ہو۔ یہ ذخیرے کا حوض کارخانے کے سب گوداموں سے کافی اونچا ہونا چاہئیے تاکہ کارخانے کے ہر گودام اور حصے میں نہایت آسانی سے پانی نل کے ذریعہ سے وہاں ہر وقت پہنچ سکے اور کارخانے کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں پانی لانے لے جانے کا بالکل صرفہ نہ ہو —

تحلیل و تخریب اشیا اور اس کا تدارک

از

(جناب حضرت دباغ سیلانوی)

دنیا کی جس قدر چیزیں ہیں وہ سب فانی کہی جاتی ہیں۔ بعض گھنٹوں میں، بعض چند دنوں میں، بعض چند ماہ میں اور بعض سال بھر میں غرض گھنٹوں سے لے کر سالوں تک جملہ اشیا میں کوئی نہ کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ اس وقت زیادہ رونما ہوتی ہے جب کوئی جز اپنے کل سے علحدہ ہو یا اس کو علحدہ کیا جاے۔ مثلاً دودھ وغیرہ اور اسی قسم کی اور چیزیں۔ دودھ جب تک گاے بھینس کے تھن میں رہتا ہے تب تک اُس کو کوئی چیز خراب یا بگاڑ نہیں سکتی مگر دودھ جہاں نکالا تو اس کا گرم کرنا لازمی ہوا تاکہ وہ زیادہ ٹھیر سکے۔ اس کو وقت پر استعمال کر لیا تو ٹھیک ورنہ پھٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اونٹ کا دودھ گاے بکری وغیرہ کے دودھ سے بھی جلد خراب ہوجاتا ہے۔ گوشت پوست کا بھی یہی حال ہے۔ جب تک جانور زندہ ہے تب تک یہ بگڑتے اور خراب نہیں ہوتے لیکن جہاں جانور اپنی موت مرا یا ذبح کیا گیا وہاں گوشت پوست میں ابتری شروع ہوئی اور اگر ان کا فوری تدارک نہ کیا گیا تو نہ گوشت

کھانے کے قابل رہتا ہے اور نہ کھال سے کوئی تجارتی فائدہ پہنچ سکتا ہے - اس لئے ان کو یا تو فوراً استعمال میں لانا چاھئے یا ان کو خراب ہونے سے بچانے کی فکر کرنا چاھئے ورنہ یہ سب مٹی ہوجاے گا —

جاڑے کے موسم میں جب کہ جانور بارش کے بعد نہایت تندرست اور توانا ہوتا ہے، سردی کی وجہ سے گوشت پوست وغیرہ کے بگڑنے اور خراب ہونے کا کم اندیشہ ہوتا ہے - اس موسم میں آگرہ وغیرہ سے نمک وغیرہ لگاکر بہت کثرت سے گوشت برما اور ان مقامات کو بھیجا جاتا ہے جہاں فوج کا قیام ہوتا ہے یا جہاں کے باشندے گوشت خور ہوتے ہیں اور گوشت اُن کے یہاں کم ہوتا ہے یا اچھا نہیں ہوتا - اس کی اچھی خاصی تجارت ہوتی ہے - کھال بھی مختلف طریقہ سے محفوظ کرکے ممالک غیر کو روانہ کی جاتی ہے جس کا کہیں اور ذکر کیا گیا ہے - اس موقع پر صرف یہ بتانا منظور ہے کہ کھال وغیرہ کے بگڑنے کے اسباب کیا ہیں اور ان کی خرابی کی روک کس طرح ہوسکتی ہے - اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے کھانے پینے اور آرام کی بے حساب نعمتیں دنیا میں پیدا کی ہیں اور یہ اپنی روزانہ کی ضرورت نہایت آسانی سے پوری کرسکتا ہے - مگر دیوانہ انسان کچھ ایسا طامع اور غاصب واقع ہوا ہے کہ ہر روز کی ضرورت کو روزانہ پورا کرکے مطمئن نہیں ہوتا بلکہ چاہتا ہے کہ تمام دنیا اور اس کا کل سامان اپنے اکیلے کے لیے جمع کرلے - اور اپنے ہی قبضہ میں رکھے - اس کو خوب معلوم ہے کہ یہ خود اس سے بیس تیس سال سے زیادہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا - مگر یہ اسی دھن میں، اس فضا میں رہتا ہے، اس میں لڑتا جھگڑتا ہے، نفع نقصان دونوں اُٹھاتا ہے ؟ دنیا سے نالاں ہے، اس پر بھی اس سے علاحدہ ہونا اس کو منظور نہیں ہے - چنانچہ اسی اُدھیڑبن میں عمر تمام ہو جاتی ہے اور بالآخر ایک روز دنیا

سے رخصت ہو جاتا ہے - روزانہ یہی ہوتا رہتا ہے —

پھل ' پھول ' گوشت ' پوست وغیرہ ایسی چیزیں واقع ہوئی ہیں جو بہت جلد خراب ہوجاتی ہیں - انگور کو لیجئے - یہ جنت کا میوہ کچھہ دنوں اچھا رہ سکتا ہے مگر جلد خراب ہونا شروع ہوجاتا ہے - لیکن کشمش پر غور کیجئے جو خشک انگور ہوتے ہیں اور جن کو خشک انگور کہنا بیجا نہ ہوگا - یہ کئی ماہ تک اچھی حالت میں رہتا ہے اور یہی حال خشک ترکاریوں اور امچور وغیرہ کا ہوتا ہے - لیکن اگر ہم کو آم ' سیب وغیرہ کو خشک کی بجائے ترو تازہ یا کچھہ اصلی حالت میں زیادہ عرصہ تک محفوظ رکھنا ہے تو ہم کو اور طریقہ اختیار کرنا ہوگا - ہم ان کا مربہ اچار وغیرہ بنا کر ان کو رکھہ سکتے ہیں - یا پھر انگریزی طریقہ پر ڈبوں میں بند کرکے ان کو محفوظ رکھہ سکتے ہیں تاکہ بے موسم کے زمانہ میں ان سے لطف اُٹھائیں - مربہ شکر کی چاشنی میں اور اچار تیل وغیرہ میں بنائے جاتے ہیں اور کم از کم ایک سال تک خراب نہیں ہوتے لیکن ان کو چاشنی یا تیل سے علحدہ کرکے زیادہ عرصہ تک اچھی حالت میں نہیں رکھہ سکتے کیونکہ ان پر پھپھوند آنا شروع ہوجاتی ہے اور یہ جلد خراب ہوجاتے ہیں اور کھانے کے قابل نہیں رہتے —

اوپر جو کچھہ بیان کیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ترچیزیں جلد خراب ہوجاتی ہیں اور خشک خراب نہیں ہوتیں - اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی چیز کو خراب ہونے سے بچانا منظور ہے تو اُسے خشک کرکے بچایا جاسکتا ہے - اور یہ ممکن نہیں ہے تو چاشنی ' شہد اور تیل وغیرہ میں رکھہ کر ان کو محفوظ رکھا جاسکتا ہے - یہ وہ عمل ہے جو ہر ادنیٰ اور اعلیٰ گھرانوں میں موسم کے لحاظ سے عمل میں آتا ہے جس کا سب کو تجربہ ہے - اچار' مربہ ' کشمش ' امچور وغیرہ کے دیکھنے سے یہ نتیجہ

نکلتا ہے کہ یہ چیزیں پانی کی تری یا نمی اور ہوا کی موجودگی میں خراب ہوجاتی ہیں۔ اس لیے اگر ان کو اچھی حالت میں رکھنا منظور ہے تو ان کو یا تو خشک کرلینا چاہیے تاکہ نہ ان میں نمی ہو اور نہ یہ خراب ہوں اور اگر یہ ممکن نہیں ہے تو شکر کی چاشنی، شہد، تیل وغیرہ ایسی چیز میں رکھ دیا جائے تاکہ ان تک ہوا کا گذر نہ ہو اور یہ خراب نہ ہو سکیں —

پھپھوند جس کا ذکر آیا ہے اس کو ایک قسم کا خمیر سمجھنا چاہئے جو کائی کی طرح گوشت وغیرہ کے شوربہ پر آجاتی ہے جس کا اندیشہ پیدا ہوتے ہی باورچی اور ہوٹل والے اس کو خوب جوش دے کر کچھ دیر کے لیے ٹھیرا لیتے ہیں تاکہ یہ کسی کے کام آجائے اور پھینکنے کی نوبت نہ آئے۔ لیکن یہ آگ سے علحدہ ہونے کے بعد زیادہ نہیں ٹھیر سکتا ہے اس لیے اگر جلد استعمال نہ ہوا اور کچھ نمی اس میں باقی رہی تو یہ پھر خراب ہو جاتا ہے اور ایسی صورت میں اس کا استعمال خلاف اصول صحت ہوتا ہے۔ اسی طرح مچھلی وغیرہ جو جلد خراب ہو جاتی ہیں ان کو یا تو بھون کر یا تیل وغیرہ میں تل کر دیر تک اچھی حالت میں رکھ سکتے ہیں یا مچھلی کو برف میں رکھ کر ہم محفوظ رکھ سکتے ہیں اور شملہ وغیرہ مقامات پر جہاں قدرتی برف کثرت سے دستیاب ہوسکتا ہے وہاں مچھلی وغیرہ کو برف میں رکھنا معمولی بات ہے۔ بمبئی کی مشہور مچھلی جس کو پام فریٹ کہتے ہیں؛ اسی طرح برف میں رکھ کر بمبئی سے باہر بھیجی جاتی ہے۔ اسی اصول کے مطابق امسال ہندوستان کا مشہور میوہ آم ولایت کو روانہ کیا گیا اور بڑی قیمت سے ولایت میں فروخت ہوا۔ بمبئی کا مشہور آم (الفانسو) ھاپوس وغیرہ ایک مشین میں جس کو کیلو ینیٹر (Kelvinator) کہتے ہیں یا اسی قسم کا کوئی اور آلہ یا (Ice chamber) برف کی کوٹھری میں رکھ کر ولایت روانہ

کیے گئے - اس مشین کی حرارت ایسی ہوتی ہے کہ اگر اس میں معمولی پانی رکھہ دیا جاے تو وہ برف بن جاتا ہے - اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خرابی پیدا کرنے والی چیز خواہ وہ خمیر ہو یا پھپھوند وغیرہ ہو کسی چیز کو اس وقت تک خراب نہیں کرسکتی جب تک یہ چیز بالکل خشک ہے یا یہ برف میں رکھی ہوتی ہے - ان دو صورتوں میں خمیر وغیرہ کا اس پر کچھہ برا اثر نہیں ہوتا اور یہ عرصۂ دراز تک اچھی حالت میں محفوظ رہ سکتی ہیں۔ خشک آٹے میں کبھی خمیر کا اٹھنا نہیں سنا مگر اس کو پانی سے گوندھا جاتا ہے تو اُس میں خمیر اٹھہ آتا ہے اور اس کی روٹیاں اچھی ہوتی ہیں لیکن اگر خمیر حد سے زیادہ ہوا تو روٹی بد ذائقہ اور ترش ہو جاتی ہے اس لیے خمیر ہمارے لیے مفید بھی ہوتا ہے اور مضر بھی۔ ہم کو اس کے منافع سے فائدہ اٹھانا ہے اور اس کی مضرتوں سے بچنا چاہئے —

سائنس یہ کہتی ہے کہ یہ خمیر اور پھپھوند جس کو خرابی کا باعث سمجھا جاتا ہے یہ کسی جاندار چیز کے وجود سے پیدا ہوتا ہے اور ہوا ' نمی اور دیگر غذاؤں کی موجودگی میں بڑی سرعت سے ٹڈی دل کے طرح بڑھتے رہتے ہیں - مگر ان کی بقا کے لئے نمی ' تری اور ہوا کا ہونا نہایت ضروری ہے - ان کی بقا کی ضرورت کے اسباب میں سے کسی ایک چیز کو کسی ترکیب سے بند کر دیا جاے تو ان کا جینا دشوار ہو جاتا ہے - خمیر کا آٹا زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکتا مگر خمیری روٹیاں خمیر کے آٹے کے مقابلہ میں زیادہ ٹھیر سکتی ہیں ۔اسی طرح مرغی کے انڈے بھی عرصۂ دراز تک اچھے نہیں رہ سکتے اور گندے ہو جاتے ہیں لیکن اگر وہ کُڑک مرغی کے نیچے رکھہ دیے جائیں تو اکیس بائیس روز میں ان میں

سے بچے نکل آتے ھیں۔ اس سے ثابت ھوتا ھے کہ گرمی، حرارت، یا سورج کی تپش حیات کے لیے کس قدر ضروری ھے اور قدرت کی ایک بے جان چیز میں جان ڈال دیتی ھے۔ اگر انڈوں کو مرغی کے جسم کی حرارت ایسی جگہ یا کسی ایسے آلہ میں جس میں مرغی کی حرارت کسی ترکیب سے قایم رکھنے کا انتظام ھو سکتا ھے رکھا جاے تو انڈوں میں سے بلا مرغی کے بٹھاے بچے نکل سکتے ھیں اور اسی اصول پر ولایت والوں نے وہ مشین یا آلہ ایجاد کیا ھے جس کی امداد سے بلا مرغی کے انڈوں سے بچے نکالے جاتے ھیں —

قدرت کی چیزوں کے خراب ھونے اور بگڑنے کے اسباب اور ان کی روک تھام کے موٹے موٹے اصول اس لیے بیان کئے گئے ھیں کہ کھال، جو قدرت کا ایک عجیب کرشمہ ھے، اس کو یہ سب مشکلات پیش آنے والی ھیں۔ ان کا حل کرنا اور کھال کو زیادہ کار آمد بنانا اصلی مقصد سمجھنا چاھئے۔ چرم خام سے لے کر پختہ چمڑا ھونے تک اس کو مہینوں روزانہ خمیر اور پھپھوند وغیرہ سے سابقہ پڑتا رھے گا۔ مہینوں اُن کے مضر اثر سے بچا کر اس کو کار آمد بنانا اور اس گردش میں جہاں اور جس صیغۂ عمل میں خمیر وغیرہ سے مفید یا مضر کا سامنا پڑے اُس سے بچنے اور فائدہ اٹھانا ضروری سمجھنا چاھئے —

انھیں اصول کے مطابق ھم کھال کی حفاظت کرتے ھیں تاکہ یہ خراب نہ ھونے پاے۔ شکر کی چاشنی، شہد اور تیل وغیرہ اس قدر قیمتی اجزا ھیں کہ ھم کسی حالت میں ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ آگ پر رکھ کر خشک کرنا کھال کو تباہ کرنے سے کسی طرح کم نہیں اور برف میں رکھ کر اس کو خرابی سے بچانا خیال خام سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا —

تجارتی اصول کی بنا پر ملک کی وہ چیز جو افراط سے ملک میں پیدا ہوتی ہو ' اور نہایت کم قیمت سے ملتی ہو اس کو کام میں لانا یہی کامیابی کا پہلا زینہ سمجھنا چاھئے - اس لیے کھانے کا نمک ' کھاری نمک ' اور ریہ * (ریو) وغیرہ جو نہایت کثرت سے ھندوستان میں پیدا ہوتی ھے ان کا استعمال زیادہ مفید معلوم ہوتا ھے - کھانے کا نمک اور کھاری نمک کھال میں سے پانی اور رطوبت کو کھینچ کر نکال دیتا ھے اور یہ دونوں کھال میں خرابی پیدا کرنے والی چیزوں کے لیے ایک حد تک قاتل ثابت ہوئے ھیں - کھاری نمک یا پتنہ کے نمک میں جز و اعظم ایک دوا ہوتی ھے جس کو سوڈیم سلیفیٹ (Soaium sulphate) کہتے ھیں —

کھال کو کئی طرح سے نقصان پہنچتا ھے مگر خاص طور پر دو قابل ذکر معلوم ہوتے ھیں - ایک وہ کرم یا کیڑا جس کو معمولی طور سے دیکھ سکتے ھیں دوسرے وہ کرم جن کو بلا امداد خوردبین نہیں دیکھ سکتے - اکثر دیکھا جاتا ھے کہ اگر کھال کی دیکھ بھال وقت پر نہیں کی گئی تو اس کو کرم کھا جاتے ھیں اور کھال خراب ہوجاتی ھے - اس لیے گودام میں عام رواج ھے کہ مال کی صفائی رکھی جاتی ھے - ورنہ مال کرم خوردہ ہوکر کم قیمت کا ہو جاتا ھے - اسی وجہ سے فرمہ وغیرہ کے مال کو سردی کے موسم میں ہوا اور صبح کی دھوپ میں بانس کے

---

* یہ وہ مٹی ھے جس کو دھوبی لوگ کپڑا دھونے میں استعمال کرتے ھیں اور سردی کے موسم میں ندی ' نالوں کے کنارے کثرت سے سپھد برف کے جیسے زمین کے اندر سے باھر کی سطح پر جمع ہوتی ھے —

چوکھٹے پر تان کر خشک کرلیا جاتا ہے اور خوب اچھی طرح خشک ہو جانے کے بعد اس کو سنکھئیے کے پانی میں غوطہ دے دیا جاتا ہے کہ کرم اس کو کھا کر نقصان نہ پہونچائے اور جو کرم اس کی جرأت کرے ان کو سنکھیا ہلاک کردیتا ہے - وہ کرم جن کو دیکھہ نہیں سکتے وہ نمی نہ ہونے اور سنکھیا اور کھاری نمک وغیرہ کی وجہ سے پیدا نہیں ہوسکتے - لیکن جہاں کھال میں کسی قسم کی نمی آئی اور یہ ٹڈی دل اس پر ٹوٹ پڑتا ہے —

تعلیل عظمت کا جدید نظریہ

از

(جناب محمد زکریا مائل صاحب)

حجم دماغ سے ذکاوت کو کوئی علاقہ نہیں

عوام میں یہ خیال بہت زیادہ رائج ہے کہ حجم دماغ اور ذکاوت کے مابین نمایاں ترین علاقہ ہے ' عوام ہی نہیں بلکہ بعض متعلم بھی اس خیال کے موید نظر آتے ہیں - یہ لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان کا دماغ جتنا بڑا ہوگا اتنی ہی اس کی عقل قوی اور بڑی ہوگی - " سر بڑا سردار کا " ایک پرانی ضرب المثل ہے ؛ اس کی عمارت بھی تقریباً اسی خیال پر قائم ہے - رہا امثال و شواہد کا معاملہ تو بظاہر بہت سی مثالیں اس خیال کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہیں مگر ساتھ ہی بہت سی مثالیں ایسی بھی ہیں جن سے اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی —

دنیا میں عظمت و ناموری کا راز معلوم کرنے کے لیے عہد حاضر کے مفکر علما نے پیہم کوششیں کیں اور آخر اس کی لم ہی معلوم کرکے چھوڑی اور تحقیقات سے ثابت کردیا کہ عامی اور عالم کے دماغوں میں نہایت واضح فرق پایا جاتا ہے —

اس سلسلہ میں یہ بھی واضح ہوگیا کہ فرق خواہ کتنا ہی نمایاں

ہو ' اس کا تعلق حجم دماغ یا تلافیف دماغ (دماغ کی لپیٹین) (Convolutions) سے کوئی نہیں - برخلاف اس کے دماغ میں پہنچنے اور اس کا تغذیہ کرنے والے خون سے اس فرق کو نہایت قوی علاقہ ہے - خون کی یہی مقدار یا کمیت ممتاز ذکاوت کا سبب واضح کرتی ہے اور کسی شخص میں دوسروں سے زیادہ جو خاص قابلیت یا کمال پایا جاتا ہے اس کا راز فاش کرتی ہے —

جن علما نے دماغ اور ذکاوت و عظمت کے باہم تعلق کا علم حاصل کیا ان میں ڈونالڈسن سب سے پیش پیش ہیں - یہ فیلاڈلفیا کے ویسٹر کالج میں علم تشریح کے پروفیسر ہیں - انھوں نے کئی سال ' متوفی علما کے دماغوں کا مطالعہ کرنے میں گزارے اور عام اشخاص کے دماغوں سے مقابلہ کرکے ان کا فرق اور عظمت کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی - ان کا دستور تھا کہ وہ ان دماغوں کے مقیاس و اوزان ' ان کی شکلیں اور ان میں پہنچنے والے خون کی مقدار وغیرہ پر غور کیا کرتے اور علمی نقطۂ نظر سے ہر بات کی تعلیل و توجیہہ کرتے - آخر وہ اپنی اس محنت میں کامیاب ہوے اور انھیں قطعی طور پر یہ معلوم ہوگیا کہ جو خون دماغ کو لپیٹنے والی غشاء وعائی (جوف دار جھلی) اور حبل شوکی (وہ نکاس جو مہروں کی پشت پر کانٹے کی شکل کا ہوتا ہے Spine) کے واسطہ سے دماغ میں پہنچتا ہے اور جسے اطبا کی اصطلاح میں غشاء لین * یا ام رقیق (Piamater) کہتے ہیں ' وہی خون عظمت و ذکاوت کا باعث ہوتا ہے - یہ غشا نہایت باریک شفاف اور

---

* غشاء لین دماغ کے نرم اور باریک پردہ کو کہتے ہیں جو بھیجے کے اوپر لپٹا ہوا ہے —

سگریٹ کے کاغذ سے زیادہ پتلا ہوتا ہے اور پورے دماغ پر اپنے ابھاروں کے ساتھہ چھایا ہوا ہوتا ہے اور جو خون اوعیہ دمویہ (خون پہنچانے والے جوت) سے اپنی جانب کھینچتی ہے اسی سے دماغ کا تغذیہ کرتی ہے —

اگر بچھڑے یا گوسالہ کے دماغ کو چیر کر دیکھا جاے تو اس میں جمے ہوے خون کی باریک باریک پھٹکیاں ملیں گی اور ان میں سے کسی کو جدا کرنے کی کوشش کی جاے تو معلوم ہوگا کہ وہ پھٹکی ایک باریک تانت کے ذریعہ سے اور پھٹکیوں سے بندھی ہوئی ہے۔ یہی غشاء لین ہے جس کے تمام تار باہم بٹے ہوے ہیں اور ان کے مجموعہ سے نہایت نازک پردہ سا بن جاتا ہے۔ اسی میں وفات کے بعد خون کی ننھی ننھی پھٹکیاں موجود ہوتی ہیں —

ڈاکٹر رونالڈسن نے ایک مردہ شخص کے دماغ پر تحقیقات کرتے ہوے، غشاء لین کو علحدہ کرکے ایک طرف رکھہ دیا تاکہ دماغ کے دوسرے حصوں پر کام کرنے کے بعد اس غشاء پر خصوصیت سے غور و خوض کریں —

اس موقع پر ڈاکٹر نے جدید علمی تحقیقات اور اس کے مسلمات سب کو پیش نظر رکھا۔ ڈاکٹر کو معلوم تھا کہ غشاء مذکور میں اوعیہ دمویہ (تجاویف خون) کی ترتیب، اشخاص کے اختلاف سے، مختلف ہوتی ہے اور اس اختلاف کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے۔ حقیقت میں منطقی دلائل ہمیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ دماغ جن مختلف مادوں سے مرکب ہے ان مادوں کو دماغ کے حجم و شکل میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اور قرائن بھی سب اس پر دلالت کرتے ہیں کہ خون ہی وہ قوت ہے جس پر دماغ کی حرکت و حیات منحصر

ہے۔ اسی لیے جو عوامل و اسباب دماغ میں خون پہنچاتے ہیں انہیں نظام جسم میں نمایاں حیثیت دی جاتی ہے۔ دماغ کی نسبت سے خون کی جو قیمت ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اگر دماغ سے خون نکال لیا جائے تو بے ہوشی واقع ہو جاتی ہے۔ اور آدمی بری طرح نڈھال ہوجاتا ہے —

ڈاکٹر ہیڈز نے ترکیب اوعیہ دماغ کی تحقیق کی تو اس ترکیب اور قوائے عقلیہ کے درمیان بڑا علاقہ معلوم ہوا۔ یہ امر خوب واضح ہوگیا کہ جب یہ قوی اعلی و اکمل ہوں گے تو غشاءاین میں اوعیۂ دمویہ کی ترکیب ضرور پیچیدہ اور بہت باریک نظر آے گی۔ اور جب اوعیہ دمویہ زیادہ و پیچیدہ ہوں گی تو اعصاب کے خلیوں کا تغذیہ بہت کافی اور اَتم ہوگا —

ان تمام حقائق کو سامنے رکھ کر ڈاکٹر رونالڈسن نے یہ منطقی نتیجہ نکالا کہ "دماغ جسم کے ہر عضلہ کی طرح اسی وقت بہت اچھا کام کرتا ہے جب اس کا تغذیہ کرنے والے خون کی مقدار بہت ہوتی ہے" بالفاظ دیگر "خون اور قوت عقل کے مابین جو علاقہ قائم ہے' اس کا انکار ناممکن ہے" —

اب ایک اور مفروضہ پر نظر کرنا ضروری ہے جو یہ ہے کہ مادہ کی کمیت میں نہیں بلکہ خود مادۂ دم کی ترکیب میں قوت عقل کے ساتھ مضبوط اور گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ بعض علما نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دماغ جو خون حاصل کرتا ہے وہ اعصاب دماغ کے خلیوں میں نمایاں طور پر اثر انداز ہوکر اس میں واضح ترین تغیرات کا باعث ہوتا ہے ور یہ تغیرات' وظیفۂ دماغ کے تغیرات سے بالکل متفق ہوتے ہیں۔

مگر اس تمام تحقیق و تلاش کے باوجود، یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ نتیجہ کے لحاظ سے ہنوز اس منزل کی طرف پہلا قدم ہے اور علم یا سائنس غشاءلین (Piamater) میں اوعیہ دمویہ کی تعداد بڑھانے سے عاجز نظر آتا ہے۔ اب تک صرف اتنا ہوسکا ہے کہ خون کے خلیوں میں پہنچنے اور اس کو بہتر بنانے والے خون کی نوعیت بہتر کرنے کے لیے مواد غذائی معین کردیے گئے۔ اس سے زیادہ کوئی خاص فائدہ حاصل نہ ہوسکا —

اس موقع پر یہ بیان کردینا بھی ضروری ہے کہ علمائے فراست کا کچھ مدت پہلے تک عقیدہ تھا کہ بعض لوگوں کے دماغوں میں دماغ کے تمام ابھارون اور قمحدوہ * (گدی کی ہڈی) کے ساتھ قوائے عقلیہ کے رتبہ کا نہایت قوی لگاؤ دیکھا جاتا ہے۔ مگر ان کا یہ عقیدہ جویائے تحقیق مفکرین کے لیے کافی نہ تھا اس لیے انھوں نے بحث و تفحص سے افراد کے مابین قوائے عقلیہ کے فرق معلوم کرنے کی مہم جاری رکھی —

علما کے اس گروہ کے مقابل ایک مخالف گروہ بھی تھا۔ جس نے اُنیسویں صدی کے نصف اول میں کوشش کی تھی کہ کاسۂ سر کی شکل اور قوائے عقلیہ کے درمیانی تعلق کو دلائل سے ثابت کرے۔ اس گروہ کا پیشوا "فرانز جول" تھا۔ اس نے کاسۂ سر کے ساتھ کھوپڑی کے تمام ابھاروں کو بھی اس تعلق میں شریک کردیا تھا —

اس کا مقولہ تھا کہ کھوپڑی کے بالائی ابھار دماغ کے اندرونی ابھاروں کے مقابل ہیں اور ہر ابھار کا ایک فرض یا عمل مقرر ہے۔ مگر فرانز

* External Occipetal Eminence.

جول اور اس کے گروہ کی کوششیں مشکور نہ ہوئیں اور یہ نظرئے جمہور علما کے نظر میں قابل قبول نہ ٹھیرے۔ تاہم فرانز جول کی جد و جہد سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ علماے فراست کی توجہ بجاے چہرے کے دماغ پر مبذول ہوگئی ـــ

جب فرانز جول والا گروہ اپنی نوبت پوری کر چکا تو اس گروہ کے علما میدان میں آے جس نے دعوی کیا کہ دماغ کے وزن اور قواے عقلیہ میں شدید علاقہ ہے۔ اس لئے دماغ انسانی جتنا وزنی ہوگا اتنی ہی اس کی عقلی قوتیں زیادہ اور قوی ہوں گی۔ یہ نظریہ حالات کے زیادہ مطابق تھا۔ ایسی صورتیں بہت رونما ہوتی تھیں جن سے اس کی تصدیق ہوتی رہتی تھی مگر چونکہ مستثنیات کی بھی کثرت تھی اس لئے علما اس کی صحت و صداقت میں شک کرنے لگے۔ مثالیں دیکھئے تو دونوں طرح کی ملتي ہیں۔ جیسے لارڈ بیرن جو انگلستان کے چوٹی کے شاعر تھے ان کا دماغ بہت بڑا تھا، اس کے مقابل نپولین اور اناطول فرانس وغیرہ عظماے تاریخ کے دماغ چھوٹے تھے۔ لوئیس اگا سیز مشہور امریکی سائنس‌داں کا سر بڑا تھا۔ لیکن جب وہ مرا اور اس کے دماغ کو تولا گیا تو نہایت ہلکا اور خفیف وزن نکلا ـ

اس کے بعد اس نظریہ کی باری آئی جو "نظریۂ تلافیف دماغ" یا دماغ کے لپیٹوں والا نظریہ کہے جانے کا مستحق ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دماغ کی تلافیف جس قدر زیادہ اور پیچیدہ ہونگی اسی قدر قواے عقلی ترقی یافتہ اور کامل ہوں گے۔ مگر اس نظریہ کی نسبت بھی یہ لکھنا نا گزیر ہے کہ بعض حالات میں اس کی تصدیق ہوتی ہے اور بعض میں نہیں ہوتی ـــ

ان سب نظریوں کے بعد جو نظریه قایم کیا گیا وہ بہت عظیم‌الشان ھے اور اب تک نہایت اھمیت سے دیکھا جاتا ھے۔ اس کی اصل یه ھے که دماغ میں چند مرکز ھیں اور ھر مرکز کا ایک کام یا وظیفه معین ھے۔ مثلاً ایک سماعت کے لئے ھے، ایک بصارت کے لئے ھے، ایک گویائی کے لئے، ایک حافظه کے لئے ایک زبانیں سیکھنے کے لئے ھے۔ اسی پر اور قوتوں کو قیاس کر لیجئے —

جب سے یه نظریه وجود میں آیا ھے بہت سے لوگ مرنے سے پہلے وصیت کرنے لگے ھیں که ھمارے دماغ بعد وفات علمی اداروں کو دے دئے جائیں تاکه علما ان کا مطالعه و تحقیق کرکے فرق مراتب عقل کا راز معلوم کریں۔ اس نوع کے مطالعه و تحقیق کے لئے آج کل یورپ و امریکه میں متعدد ادارے کھل گئے ھیں جن کا خاص کام دماغ پر تحقیقات کرنا ھے۔ ان میں سب سے بڑا ادارہ کورنیل یونیورسٹی امریکه کا ھے اور اسی کے برابر و سٹر کالج کا ادارہ تحقیقات دماغ ھے۔ اِسی آخرالذکر ادارہ میں ڈاکٹر ڈونالڈسن نے اپنی تحقیقات جاری کی جس کے ذکر میں یه مضمون مرتب کیا گیا ھے۔

ڈاکٹر موصوف نے بہت سے عظما کے دماغوں پر تحقیقات کی، ان کا وزن کیا؛ ان پر قیاس دوڑایا، ان کی ترکیب اور اپیٹوں کا مطالعه کیا، حجموں اور شکلوں پر غور و فکر کر کے نتیجے نکالے۔ اس تمام جد و جہد کے بعد انھوں نے یه عقیدہ قایم کیا که تمام قرینے اس پر دلالت کرتے ھیں که جو عامل یا سبب قوائے عقلیه میں کار فرما ھوکر انھیں ضعیف یا قوی کرتا ھے وہ اسي خون کی مقدار ھے جو غشاے لین میں اوعیه دمویه کے واسطه سے دماغی خلیوں کا تغذیه کرتا ھے، ان کا یه بھی عقیدہ ھے که بعض دماغوں کا ثقل ان دماغوں کے اعصابی خلیوں کے ثقل سے پیدا ھوتا ھے۔ اور بعض

دماغوں کے حجم کی بڑائی انھیں اسباب نمو کی کثرت کی دلیل ہے اور دماغ یا کاسۂ سر کے بھاری ہونے سے قواے عقلیہ کو ذرا بھی نسبت نہیں ہے - برخلاف اس کے قواے عقلیہ کا گہرا تعلق اس خون کی مقدار سے ہے جو غشاے لین کے اوعیہ دمویہ کے ذریعہ سے دماغ کا تغذیہ کرتا ہے —

(ماخوذ)

—*—

دل چسپ اقتباسات

ریڈیم اور اس کے محیرالعقول کرشمے

جدید انکشافات کی موجودہ رفتار کی بنا پر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے اس بے حقیقت سیارے پر ہی خدا کے بے شمار عطیوں میں سے کوئی ایسی شے ہاتھ نہ لگ جائے گی جو زندگی اور موت کے مسئلوں کو یکسر بدل دے۔ ہم نے جن چیزوں کو مسلمہ اور واجب سمجھ کر اپنے افعال کو ایک نہج پر ترتیب دیا ہے ممکن ہے کہ کسی نئی دریافت کی روشنی میں ان میں ایک انقلابی تغیر لازم آجائے - اس سلسلہ میں سر فریڈرک ہاپکنس کے الفاظ قابل توجہ ہیں جو انہوں نے مانچسٹر ہال میں برطانوی سائنٹفک ایسوسی ایشن کوخطاب کرتے ہوے اپنے صدارتی خطبہ میں فرمائے۔حیاتی کیمیا (Boichemistry) کی جدید ترین تحقیقات ہر سمت میں ترقی کر رہی ہے - انسانی اغراض و مقاصد پر اس کا اثر بہت واضح ہوگا .... جہاں جدید سائنس فلسفہ کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے وہاں ان امور پر چند معرکۃالارا مقالات میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انسانی ذہن اور نفسیاتی عمل طبیعات کے ساتھ کس حد تک وابستہ ہیں اور خود خدا کی ذہنی تشکیل پر ظن آرائی کہاں تک ممکن ہے۔ حیاتیات کے علم اور عمل کا تعلق جو معاشرتی ترقی کے سلسلہ میں نہایت اہم ہے افسوس ہے کہ اب بڑی توجہ کا محتاج ہے ... ... جو لوگ تغذیہ اور صحت پر چھان بین کر رہے ہیں عرصہ ہوا اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ انسان کے لئے مناسب ترین یا مفید ترین غذا اب تک دریافت

نہیں ہوئی - یہ کہ انسب غذا وہ ہوگی جو انحطاط اور فنا کا سد باب کرسکے بالکل قرین قیاس ہے - نسل کا موجودہ تغذیہ کے ساتھہ اب تک چلے جانا کوئی دلیل نہیں کہ آئندہ ترقی کی گنجائش نہیں —

زندہ اجسام پر کیمیاوی ترکیب کا اثر بہت دور رس ہے اور انکشات کا میدان نہایت وسیع - اس بنا پر کچھہ بعید نہیں کہ کسی نئی تحقیق پر ہمارا زاویۂ نگاہ زندگی اور اُس کے لوازم کی بابت بالکل بدل جائے - ہم مادی اشیا کے خواص اور اُن کے کیمیاوی امکانات اس قدر محدود طور پر جان سکے ہیں کہ کوئی تعجب نہیں کہ حوادث کے مقابلہ میں ہماری بے بسی ویسی ہی ہے جیسی مثلاً دو ہزار برس قبل تھی - دنیا ایک غیر محدود معمل ہے اور انسان محقق - کسر صرف اتنی ہے کہ محقق کو اشیا کا باقاعدہ جائزہ نہیں دیا گیا - لہذا اُسے جو کچھہ مشاہدات اور تجربات کرنا ہیں اپنی ارادی تحریک سے کرنا ہوں گے اور نتائج میں کامیابی اُسی حد تک ہوگی جس حد تک معمل کے ارکان معملی ضوابط پر کاربند ہوں گے - تجربات کا منشا انسانیت کی تکمیل ہے —

موجودہ صدی کے انکشافات میں سے فضا کی تسخیر کے علاوہ کوئی انکشات اس قدر حیرت انگیز نہیں جتنی ریڈیم کی دریافت ' جسے سنہ ۱۸۹۸ ع میں پروفیسر و میڈیم کیوری نے حسب اتفاق معلوم کرلیا - اس طرح اگرچہ اس کا راز اُنیسویں صدی کے آخر میں کھلا لیکن چونکہ اس کے مختلف خواص بتدریج ہی حاصل ہوسکے ہیں اس لیے فی الحقیقت اُسے بیسویں صدی سے منسوب کرنا زیادہ مناسب ہوگا - ریڈیم کے متعلق عام طور پر لوگ صرف دو باتیں جانتے ہیں - ایک تو اس کی کمیابی اور بیش قرار قیمت ' دوسرے اس کی مخصوص حدت - لیکن اس کے امکانات اور دیگر خواص سے ماہرین اور اہل سائنس کے

علاوہ کم لوگ واقف ہیں لہذا اس عجوبۂ روزگار معدنی جوہر کے متعلق یہ چند سطور دلچسپی سے خالی نہ ہوں گی —

حقیقت یہ ہے کہ رنتگنی (Rontgen) شعاعوں کی دریافت کے بعد سے اہل فکر ریڈیو کے عمل تابکاری (Radio activity) کی بابت نئے نئے امکانات پر ظن آرائی کرنے لگے اور بالآخر پروفیسر کیوری نے تابکاری کے اس عظیم الشان خزانہ سے دنیا کو روشناس کرایا - یہ ایک تابکار دھات ہے اور برخلاف نور کی اور شکلوں کے اس میں اس قدر طاقت ہے کہ کثیف (Opaque) اجسام میں سے روشنی اور حدت گزار دیتی ہے - تابکار اشیاء بعض اور بھی ہیں مثلاً تھوریم اور یورانیم - مگر یورانیم ہماری بحث کے سلسلہ میں اس لیے کار آمد ہے کہ ریڈیم کا وجود اُن ہی مادی ذخائر میں ہوگا جن میں اس کے معینہ اجزا شامل ہوں گے - چنانچہ فی‌الحقیقت یورانیم وہ عنصر ہے جو تابکاری کا ماخذ ہے - اس گراں قدر دھات کے ذخائر اس قدر جستجو اور کاوش و محنت کے بعد ملتے ہیں کہ ۱۵ ہزار پونڈ فی گرام بھی یقیناً اس کے لیے کم قیمت ہے - زیکو سلاقیہ ، وسط افریقہ ، آسٹریلیا کو لوروڈو اور پرتگال میں بعض خام معدنیات ہوتے ہیں جن سے یورانیم اور بالآخر ریڈیم حاصل ہوتے ہیں - اور ۶ ٹن یا ۱۶۵ من خام دھات میں سے صاف کرنے پر ایک گرام ریڈیم نکل سکتا ہے - لیکن عملاً ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کسی معدنی ذخیرہ میں ۵۰ فی صدی یورانیم موجود ہو - چنانچہ خام دھات کے ۱۰ ٹن (۲۷۵ من) میں بھی اگر گرام بھر ریڈیم برامد ہوجائے تو اس ذخیرے کو غنیمت سمجھا جاتا ہے اور بعض اوقات دو سو ٹن میں سے ایک گرام بھی نکل آئے تو اس معدن پر کام کیا جاتا ہے —

ریڈیم نکالنے کے طریقوں میں اب تک کوئی مزید ترقی نہوسکی - اسی

لیے یہ عوام کی دسترس سے باہر ہے اور انسان کی زندگی اس سے کافی طور پر مستفید نہ ہو سکی —

ریڈیم کی شکل کیا ہے؟ یہ ایک سیسہ کی نلکی میں رکھا جاتا ہے جس کے اندر کی جانب ایک باریک سا شیشے کا پردہ ہوتا ہے۔ یہ شیشہ سیر بین والا ہوتا ہے اور اس کے اندر آلپین کے سرے کی برابر ایک مدھم پیلی روشنی ہوتی ہے۔ یہ ہے لاکھوں روپیہ کی قیمت کی حقیقت! تاریکی میں یہ روشنی بہت تیز ہو جاتی ہے اور دور سے دکھائی دیتی ہے۔ اس کا نور متزلزل یا عارضی نہیں ہوتا بلکہ اشعاعی قوت ہوتی ہے۔ جس میں صدیوں اور قرنوں تک کوئی فرق نہیں آ سکتا بلکہ اپنے محدود وقت کی نسبت سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمیشہ برقرار رہے گا۔ اس میں اتنی حدت ہوتی ہے کہ اسی قدر وزن کے پانی کو گھنٹہ بھر میں اُبال دے گا۔ یہ عمل ہزار برس تک جاری رہ سکتا ہے۔ اس کی حدت تپش کے کسی تغیر کے تحت کیوں نہ دیکھی جائے ہمیشہ یکساں رہے گی۔ لا شعاعوں کی نفوذی طاقت کو سیسہ کی ایک خاص دبازت روک دیتی ہے۔ لیکن ریڈیم کا نور پتھر کی دیواروں اور جہازوں کی فولادی پلیٹوں میں سے بھی نفوذ کر جائے گا۔ کہتے ہیں کہ ریڈیم کے ایک ٹیوب کو انسانی درد کو دور کرنے کے لیے پچاس نسلوں تک کام میں لایا جا سکتا ہے۔ اس زبردست قوت سے انسانی زندگی میں کس قدر انقلاب ہو سکتا ہے۔ قیاس کرنے کی بات ہے —

فی الحقیقت ریڈیم کے شفا بخش عمل کے ساتھ جو وہ زندہ اجسام پر کرنے کے قابل ہے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کی جا رہی ہیں۔ اس وقت تک تمام عالم کے جید اطبا اور حفظان صحت کے ماہرین سرطان کے مرض کو لا علاج سمجھتے رہے ہیں اور اس سے شفا یابی تقریباً محال سمجھی گئی ہے

لیکن ریڈیم کے ماہرین نے بالآخر موت کے اس زبردست گماشته کو بھی مسخر کرلیا اور خون کی تحریک و تولید سے قطع نظر درد اور تکلیف کو بالکل زائل کردیا ہے ۔ چنانچه اکثر عمل جراحی کی ضرورت اس کی وجه سے دور ہوگئی ۔ مضر اندرونی بالیدگی پر اس کا اثر فوری ہوتا ہے حالانکه دوسرے حصوں کو ماؤف ہونے سے روکنا اب تک ممکن نہیں ہوا ۔ گوشت خوره (Rodent ulcer) کے علاج میں ریڈیم کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے اور فی الحقیقت وه ماہرین طب ہمارے شکریه کے مستحق ہیں جو مختلف انسانی کمزوریوں پر اس کو آزما رہے ہیں ۔ ممکن ہے که مستقبل قریب میں شاندار نتائج پیدا ہوں —

مگر انسانی کمزوریوں کے علاج کے ماسوا تندرست جسموں پر اس کا عمل زیاده بارآور ہوگا ۔ حال ہی میں یه بات منکشف ہوئی ہے که کولوروڈو میں ریڈیم کی کانوں میں کام کرنے والے مزدور عموماً نہایت تندرست رہتے ہیں ۔ ایک امریکن طبی ماہر نے کئی سال تک اُس مقام پر اپنے مشاہدات قایم رکھے اور آخر کار اس نتیجه پر پہنچا ہے که کان کنوں کی عمده صحت کا راز یه ہے که اُس مقام کے پانی میں ریڈیم کا خفیف اثر آگیا ہے ۔ اس دریافت کے بعد سے ماہرین نے ریڈیم زده گولیاں اور ٹکیاں تیار کی جن کا استعمال عمر رسیده اور ضعیف اشخاص کے لیے نہایت مفید اور صحت بخش ثابت ہوا ۔ بعض صورتوں میں برسوں کا درد کچھه دنوں کے استعمال سے رفع ہوگیا ۔ مریض کی بھوک کھل گئی اور زندگی کے نئے ولولے پیدا ہوگئے ۔ بالفاظ دیگر شباب کا دوباره حاصل ہونا اور برقرار رکھنا اس کی بنا پر قرین فہم ہوگیا ہے ۔ ممکن ہے که آئنده ریڈیم اور غدود کے ایک مشترکه طریقهٔ علاج سے ہم اسی برس کے نوجوان پیدا کرسکیں ۔ اس کو بیجا امید پرستی پر محمول نه کرنا چاہئے ۔ آج جو باتیں ہم دیکھه اور

سن رہے ہیں اگر پچاس برس اُدھر کسی پرجوش فردائی سے کہتے تو وہ بھی ہمیں ' بیوقوفوں کی بہشت ' کا مستحق قرار دیتا۔ حقیقت میں مستقبل کے امکانات کی کوئی حد بندی نہیں کر سکتا —

قیمتی پتھروں اور جواہرات پر ریڈیم کا عمل اور زیادہ حیرت انگیز ہے۔ لعل ، پکھراج ، نیلم وغیرہ کے معمولی رنگ بوجہ اندرونی لوثوں کے ایسے معلوم ہوتے ہیں ورنہ خالص ہونے پر اُن کی آب و تاب نہایت نظر فریب ہوتی۔ چنانچہ ریڈیم کی شعاعوں سے جب ان کو متواتر جلا دی جاتی ہے تو اندرونی لوثیں دور ہو جاتی ہیں۔ اُس وقت وہ جواہرات حقیقت میں اپنی قیمت کے اہل ہوتے ہیں —

غرض کہ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ ریڈیم کے خواص آئندہ کس طور پر انسان کی کار براری میں حصہ لیں گے اور طبیعی زندگی کس حد تک اس کی رہین منت ہوگی۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جب میڈیم کیوری وغیرہ نے دنیا کے آگے اس گراں بہا کھلونے کو پیش کیا تو اُنھوں نے اپنے ہم نسلوں کی ایک زبردست خدمت کی اور سائنس کی ترقی میں مستقل حصہ لیا۔ ہم خدا کی اس عجیب ترین نعمت سے محض سطحی طور پر آگاہ ہوے ہیں اور زندگی کے لوازم میں سے صرف چند چیزوں پر اسے تجربہ کیا ہے۔ یقین ہے کہ جتنا زیادہ ہم اسے جانیں گے اُتنا ہی زیادہ حیرت کا مقام ہوگا اور اس درمیان میں دوسری ترقیوں کے دوش بدوش نہ معلوم کہاں تک پہنچ جائیں گے —

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جاے گی

(ع - ا - ع)

دلچسپ معلومات

بینک کی ایجاد

عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ بینک جدید تمدن کی پیداوار ہے ، مگر کچھ مدت ہوئی جب ارضیاتی تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بینک کا طریقہ قدما میں بھی رائج تھا ۔ عراق میں جو آثار برآمد ہوئے ہیں ان سے پتہ چلا ہے کہ اہل بابل دو ہزار سات سو برس پہلے بینک کی قسم کا لین دین کرتے تھے —

ان آثار میں پختہ اینٹ کی جو تختیاں لکھی ہوئی دستیاب ہوئی ہیں ان سے استدلال کیا گیا ہے کہ شہر بابل میں (۷۰۰) سال قبل مسیح ایک بینک " ایجبی بی اور شرکا " کے نام سے تھا جو مروجہ بینکوں سے بالکل مشابہ تھا اس میں حسابات جاریہ ، معاہدات ، دستاویزیں ؛ حصص وغیرہ سب کی معاملت ہوتی تھی —

چونکہ اس زمانہ تک کاغذ ایجاد نہیں ہوا تھا اس لیے لوگ پکی اینٹ پر عبارت کندہ کرکے حرارت کے ذریعہ سے تحریر کو محفوظ کر لیتے تھے اور عبارت اتنی پختہ اور محفوظ ہوجاتی تھی کہ اب بھی اسی طرح اچھی حالت میں نظر آتی ہے —

سب سے بڑی کتاب

دول یوروپ میں کتاب کے اوپر بھی بڑی منافست اور مقابلہ رہا ہے ۔ ہر ایک نے اس کی کوشش کی کہ ہمارے

یہاں سب سے بڑی کتاب ہو —

یہ بڑی کتابیں زیادہ تر توراۃ و انجیل ہوتی ہیں مگر اب معلوم ہوا ہے کہ جرمنی کی روسٹوک یونیورسٹی میں جو یوروپ کی سب سے پرانی یونیورسٹی ہے ایک کتاب سب سے بڑی محفوظ ہے جس کا طول دو میٹر اور عرض سوا میٹر ہے۔ اس کتاب کو اتنے عمدہ نقش و نگار اور فنی خوبیوں سے مزین کیا گیا ہے کہ اس کا شمار نادر تحائف میں ہوتا ہے - کتاب کی موجودہ زیب و زینت سولھویں صدی کے ماہر دستکاروں کی رہین منت ہے - موضوع کے لحاظ سے یہ کتاب مختلف علوم پر حاوی ہے ' جغرافیائی ؛ ہندسی ؛ ادبی اور تاریخی معلومات کا اچھا ذخیرہ ہے - اس کے اوراق نہایت اچھی حالت میں باریک کپڑے پر چسپاں ہیں اور اس کی حفاظت کے لیے خاص اہتمام و انتظام کیا جاتا ہے ' اور اسے دیمک وغیرہ سے محفوظ رکھنے کے لیے تازہ ترین ایجادوں سے کام لیا جاتا ہے۔ تاکہ کتاب کو کسی قسم کا نقصان نہ پہونچ سکے —

مچھلیوں کا انجماد

مچھلیوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ جم کر برف کے ٹکڑے کی طرح ہوجاتی ہیں اور پھر بھی زندہ رہتی ہیں - اس کے ماننے میں بعض سائنس دانوں کو شک ہوا اور فرانس کے ایک عالم نے میٹھے پانی کی مچھلیاں جمع کرکے ان پر تجربات کیے - مچھلی اور برف کو ملا کر ایک ٹکڑا جما لیا اور مقررہ احتیاطوں کے بعد اُسے توڑا مگر جب برف پگھلی تو مچھلی میں جان آگئی اور تیرنے لگی - واضح رہے کہ اس تجربہ میں درجۂ انجماد صفر سے نیچے ۲۰ درجہ سے زیادہ نہ ہونا چاہئے —

دماغوں کا عجائب خانہ

وائنا میں ایکو نو مو نام کے ایک ڈاکٹر نے بڑے بڑے عالی رتبہ آدمیوں کے دماغوں کا ایک عجائب خانہ بنایا ہے -

اس ڈاکٹر کا یہ کام ھے کہ وہ ماھرین فن، عالموں، ادیبوں اور باکمال جنرلوں اور سیاست دانوں کے دماغ جمع کرتا رھتا ھے۔ جو دماغ اسے ملتا ھے اسے ایک شیشہ کے صندوقچہ میں محفوظ کرکے جس شخص کا دماغ ھے اس کا نام اور دماغ کاوزن وغیرہ لکھہ دیتا ھے اور اس کی بڑی حفاظت کرتا ھے۔ ڈاکٹر ایکونومو کو اب تک کچھہ بہت زیادہ دماغ نہ مل سکے۔ مگر اب وہ ھر قوم کے مشاھیر سے مراسلت کرکے توجہ دلا رھا ھے کہ وہ لوگوں کو وصیت کردیں کہ ھمارے مرنے کے بعد ھمارا دماغ اس عجائب خانہ کو بھیج دیا جاے۔ دنیا کی جدت پسندی یقین دلاتی ھے کہ تھوڑے ھی دنوں میں یہ عجائب خانہ بہت وسیع اور قابل دید ھو جاے گا اور لوگ بڑے ذوق و شوق کے ساتھہ اس کی سیر کیا کریں گے —

ابھی ھندوستان کے لوگ دور حاضرہ کے سب سے بڑے علمی و قومی رھنما سر سید مرحوم کو نہ بھولے ھوں گے جن کے متعلق عام شہرت تھی کہ بارھا ان کے دماغ کی قیمت لگ چکی ھے اور انگریز اس کی بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار تھے۔ اسی مناسبت سے جرمنی کے شاعر اعظم ھر ماں سو درماں کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ھوگا جس کے انتقال کو ابھی زیادہ زمانہ نہیں ھوا۔ اس شخص نے انتقال سے پہلے وصیت کی تھی کہ میرا دماغ "کایزر فلہلم" برلن کے ایک ادارہ کو دے دیا جاے۔ اگر اس وقت واڈنا والا دماغوں کا عجائب خانہ موجود ھوتا تو بلا شبہ جرمنی شاعر کا دماغ اسی کے حصہ میں آتا —

سگریٹ کے ڈبوں کا محل

ولہم ویدماں جرمنی کے ایک ۸۰ سال والے بڈھے شخص کے دل میں مدت سے دیواروں کو کاغذوں سے سجانے کا خیال جاگزیں ھے، بہت دن سے وہ اسی مشغلہ میں تھا،

پھر اسے خیال آیا کہ سگریٹ کے ڈبوں سے قصر سانسوسے کے نمونہ کا ایک محل بنائے جو فریڈرک اعظم نے پو تسدام میں بنایا تھا۔ اس خیال کی تکمیل میں اس کے ۸ سال گزرے مگر آخر وہ اس ارادہ میں کامیاب ہوا اور بالکل اسی نمونہ کا محل تیار کرلیا۔ اس واقعہ سے اس کی مہارت و استقلال کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتاہے —

اندھوں کی عینک

ڈاکٹر ولیم فنیلوم امریکی نے سات سال کی مسلسل تحقیق کے بعد دوربین کی ایک عینک ایجاد کی ہے جسے وہ لوگ استعمال کرکے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جن کی قوت بینائی ۲ فی صدی ہو۔ یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ جس شخص کی قوت بینائی ۲ فی صدی ہو وہ اندھا شمار کیا جاتا ہے —

صفر مطلق

درجہ صفر مطلق وہ درجہ ہے جس کے اثر سے ہر حرکت سرد ہوجاتی ہے یہاں تک کہ جوھرفرد اور برقیرے بھی اپنی حرکت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ غالباً یہی وہ درجہ ہے جو ابھی تک انسانی دسترس سے باہر ہے۔ یہ دنیا کے کل جوانب اور اجرام فلکیہ کے ہر جرم میں پایا جاتا ہے۔ علما نے صناعی تدبیروں سے اسے حاصل کرنے کی کوشش کی تو صرت ۴۵۹'۱ فارن ھیت تک پہنچ سکے۔ جو درجہ صفر مطلق ۲۷۳ سنٹی گریڈ یا ۴۵۹'۸ سے سات اعشاریہ کم ہے۔ علما ھنوز تدابیر سے غافل نہیں ہیں اور برابر اسی کوشش میں لگے ہوے ہیں کہ آخری درجہ اپنے انتھک تجربات سی معلوم کر لیں۔ اس درجہ کو معلوم کرنے کی زیادہ کوشش اس لیے ہے کہ اس کی بدولت بہت سی علمی مشکلات حل ہوجائیں گی۔ منجملہ ان کے علمی نقطۂ نظر سے خلاے تام حاصل کرنا ہے اور سخت اور نہایت مضبوط قسم کا فولاد بنانا مدنظر ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے

مسائل بھی ھیں جو آخری درجۂ صفر مطلق معلوم ہونے پر خود بخود حل ہوجائیں گے —

عنصر ایلینیوم یہ مادی عناصر کا اکسٹھواں عنصر ہے جسے علما اب تک نہ جدا کرسکے تھے۔ حال کی علمی خبروں سے معلوم ہوا ہے کہ پروفیسر موریسی کوری (پروفیسر کوری مکتشف عنصر ریڈیم کے بھائی) نے پروفیسر تکفوریان کی مدد سے عنصر ایلینیوم بھی علحدہ کر دکھایا ہے۔ یہ عنصر ان مشہور عناصر میں سے ہے جو بیش قیمت ارضیات کہے جاتے ھیں، اور معدنی اوکسائڈ کے مرکبات ھیں۔ اس عنصر کے جو خواص معلوم ہوے ھیں وہ ریڈیم سے بہت مشابہ ھیں —

حرارت شمس ڈاکٹر چارلس ایبٹ ایک امریکی عالم کا بیان ہے کہ جو حرارت سورج سے پیدا ہوتی ہے وہ آیندہ دو سال میں بہت کم ہو جائے گی۔ یہ کمی اس صدی کے آغاز سے منسوب ہوگی۔ مگر آفتاب کی حرارت کی یہ کمی زمین کے حالات پر کچھ اثر نہ کرے گی کیونکہ یہ حالات بہت سے دوسرے عوامل و اسباب سے وابستہ ھیں —

لکڑی کو سخت بنانے کا نیا طریقہ بعض اہل سویڈن نے نرم لکڑی کو دباؤ دے کر اسے معدنی اشیا کی طرح سخت بنانے کا طریقہ دریافت کیا ہے۔ نرم لکڑی لے کر خاص طریقوں سے اس کے داخلی خلیوں کی تمام ہوا جذب کرلی جاتی ہے۔ پھر ان خلیوں پر میکانکی طاقت سے دباؤ پہنچایا جاتا ہے جس کی بدولت لکڑی نہایت سخت اور لوھے کی طرح مضبوط ہو جاتی ہے۔ مخفی نہ رہے کہ لکڑی کو سخت کرنے کا ایک طریقہ اور بھی وہاں مشہور ہے اور وہ یہ ہے کہ لکڑی کے ریشے تلے اوپر رکھ کر

ان پر ایک دم زبردست دباو ڈالا جاتا ہے جس سے لکڑی نہایت سخت ہوجاتی ہے اور معمولی لکڑی سے بوجوہ چند بہتر و افضل ہوتی ہے خصوصاً اس کا وزن نہایت کم ہوتا ہے - اور اس طرح بنائی ہوئی لکڑی لوہے پیتل وغیرہ کی مانند اچھی طرح صیقل کی جاسکتی ہے —

نور آفتاب اب تک علما کا خیال تھا کہ جو روشنی محیط آفتاب سے خارج ہوتی ہے وہ اپنی تابش اور چمک میں مرکز آفتاب سے صادر ہونے والی روشنی کے برابر ہے - مگر جدید علمی تحقیقات اور رصد گاہوں کی رپورٹیں ظاہر کرتی ہیں کہ محیط آفتاب کی روشنی مرکز کی روشنی سے بہت کم زور ہوتی ہے —

کوتاہ قد چمپانزی علماے حیوانیات نے دریاے کانگو کے جنوبی علاقہ میں چمپانزی بندر کی ایک نئی قسم معلوم کی ہے - اس صنف کے بندر بہت کوتاہ قد ہیں - چمپانزی بندروں میں ان سے چھوٹا بندر کوئی نہیں ہوتا - اس بندر کی آنکھیں اور کان امتیازی طور پر چھوٹے ہیں اور اس کی آواز تمام بندروں کی آواز سے مختلف ہے - چند سال قبل بعض امریکی علما نے اس نوع کو معلوم کرکے خیال کیا تھا کہ یہ چمپانزی سے جدا صنف کا بندر ہے مگر جدید دریافت سے یہ خیال دور ہوگیا —

دستاویزوں کا جعل و فریب معلوم کرنے کا طریقہ آسٹریا کے ایک عالم کیمیا نے دستاویزوں کا جعل معلوم کرنے کا ایک طریقہ دریافت کیا ہے جس سے سرکاری کاغذات اور دستاویزوں کا جعل و فریب بآسانی ظاہر ہوجاتا ہے - یہ طریقہ آسٹروی گورنمنٹ کو بہت مفید معلوم ہوا اور وہاں اس قسم کے حوادث میں اسی طریقہ سے کام لیا جاتا ہے —

اس کی تفصیل یہ ہے کہ دنیا کی تمام روشنائیاں کسی نہ کسی شکل کا کلورائڈ مادہ رکھتی ہیں - فرق کمیت کا ہوتا ہے (معمولی نمک بھی ایک کلورائڈ ہے) - یہ مادہ ورق میں پھیل کر کاغذ کے خلیوں میں بتدریج جذب ہوجاتا ہے لیکن محض آنکھ اسے دیکھنے سے قاصر رہتی ہے - اگر کسی نوشتہ پر کیمیائی عمل کیا جائے تو کلورائڈ کا اثر ورق پر اتنا واضح ہوتا ہے کہ اس سے تاریخ نوشتہ معلوم کرسکتے ہیں - مثلاً اگر تحریر ایک گھنٹہ پہلے کی ہے تو کلورائڈ کے آثار نہایت واضح اور جلی ہوں گے ' ایک دن پہلے کی ہوگی تو یہ آثار واضح مگر ان کے خطوط عریض نظر آئیں گے - چاردن پہلے کی ہوگی تو غیر جلی - اور دو مہینہ یا سال دو سال پہلے کی تحریر پر دوسری علامات واضح طور پر نظر آئیں گی - اس طریقہ سے جعل و فریب کا عمل دستاویزوں پر چھپانا بہت دشوار ہوگیا ہے —

عجیب مرض

امریکہ کے ایک علمی رسالہ کی خبر ہے کہ کیپٹن چارلس مارٹل نام کا ایک ملازم جہاز ایک عجیب مرض میں مبتلا ہوگیا جس نے تمام اطبا کو حیران کردیا ہے - یہ شخص اضافی غدہ درقیہ کے ورم میں مبتلا ہوا جس سے اس کی ہڈیاں چھوٹی ہونے لگیں یہاں تک کہ اس کا قد چند روز میں بارہ انچ کم ہوگیا - اس کے بعد اس کی ہڈیوں میں انکسار کی کیفیت بہت بڑھ گئی - ذرا سے صدمہ میں ہڈی ٹوٹ جاتی تھی - ڈاکٹروں نے اس کی ہڈیوں کی اصلاح کے لیے آٹھ عمل جراحی کئے جن میں سے آخر کے چار آپریشن خود کیپٹن مارٹل کی خواہش سے ہوے کیوں کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس تھا اور چاہتا تھا کہ اطبا اس کے عجیب مرض کا راز معلوم کریں - اطبا نے اسے ڈرایا بھی کہ اس صورت میں تم جلد مرجاؤگے مگر وہ آپریشن کئے جانے پر اصرار کرتا رہا اور

وصیت کی کہ میرا جسم وفات کے بعد کسی طبی ادارہ کو دے دیا جاے ۔ بہر حال آپریشن ہوے اور وہ مر گیا مگر اب تک اطبا اس کے مرض کا راز نہ معلوم کرسکے —

ذیابیطس کے مریض کہا جاتا ہے کہ ذیا بیطس یا بول شکری کے مریض جن کا علاج انسولین (Insulin) سے ہوا ہے صرف یوروپ اور ولایت امریکہ میں ایک ملین سے زیادہ ہیں —

دوران خواب میں پرواز کے لیے ایک نئی مشین ایک انگریز انجینئر ایڈورڈ ہومز نے ایک نئی مشین مصنوعی طیارچی کے نام سے ایجاد کی ہے جس کی بدولت طیارچی دوران پرواز میں آرام سے سو سکے گا ۔ اور یہ مشین اس کا کام کرتی رہے گی ۔ دو فوجی طیارچی جانیورڈ اور نیکولیٹز نے اس مشین کا تجربہ کیا اور ہوائی سفر میں نہایت آرام سے سوئے ۔ توقع ہے کہ اس ایجاد کا اثر پرواز کے مستقبل پر بہت اچھا پڑے گا —

بھک سے اڑ جانے والے مادوں سے بچنے کے لیے لباس اکثر جرائم پیشہ اشخاص بم اور دوسرے آتشگیر مادے ڈاک کے پارسلوں میں بھیج دیا کرتے ہیں اور یہ پارسل دوران تفتیش میں دفعتاً پھٹ کر بھک سے اڑ جایا کرتے ہیں ۔ اس بلا سے محفوظ رہنے کے لیے برلن میں ایک خاص لباس تیار کیا گیا ہے جسے ڈاک خانہ کے ملازم مشکوک پارسلوں کے تفتیش کے وقت پہن لیتے ہیں اور حادثہ کے وقت خطرہ سے محفوظ رہتے ہیں —

ہرن کی سرعت رفتار امریکہ کی ایک جغرافیائی مہم تحقیقات کی غرض سے موٹر پر صحراے گوبی کی سیاحت کر رہی تھی '

اتفاقاً ایک ھرن موٹر کے سامنے آکے بھاگنے لگا - اس موقع پر ارکان مہم کو اندازہ ہوا کہ ھرن پہلے تین کیلو میٹر مسافت میں ۴۵ کیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلا پھر ۳۳ کیلو میٹر فی گھنٹہ مسافت طے کی اس لیے ھرن کی اوسط رفتار (۲۰) کیلو میٹر کے فاصلہ میں، فی گھنٹہ ۲۵ کیلو میٹر ہوئی اور موٹر کی متوسط رفتار بھی تقریباً اتنی ھی ہے —

ایک نئے ستارہ کا انکشاف

حال ھی میں رصد خانہ جوھانسبرگ نے ایک نئے ستارہ کا پتہ لگایا ہے جو ان کے اندازہ میں زمین سے تین سو ملین کیلو میٹر کی بلندی پر ہے - یہ ستارہ بہت چھوٹا ہے، اور اس کا قطر سو میٹر ہے - اس ستارہ سے پہلے جو ستارہ دریافت ہوا تھا اس کی مسافت زمین سے ۱۰ ملین کیلو میٹر تھی —

سزاے قتل کا نیا طریقہ

ولایت نیوڈا کی مجلس داخلی (ھوم ڈپارٹمنٹ) نے سزاے قتل کے ایک نئے طریقے کو رواج دینے کی منظوری نافذ کی ہے - اور اسے جملہ ممالک متحدہ امریکہ میں بھی رواج دینے کے لیے واشنگٹن کی جنرل کانگرس میں پیش کیا ہے —

وہ طریقہ یہ ہے کہ واجب القتل مجرم کو وقت و مقام سزا کی اطلاع دیے بغیر ایک آخری تحقیقات اور باز پرس کے بہانہ سے ایک کمرہ میں لے جاتے ھیں جو بہت آراستہ ہوتا ہے اور اس میں بہت سے مہکتے ہوے پھول گلدانوں میں رکھے ہوتے ھیں - مجرم کمرہ میں داخل ہوتے ھی تین منٹ کے اندر سو جاتا ہے، مگر یہ خواب حقیقت میں خواب مرگ ہوتا ہے - کیونکہ گلدانوں کے پھول زھریلے ہوتے ھیں، ان کی سمیت آمیز خوشبو خواب مرگ سے ھمکنار کر دیتی ہے —

اس طریقہ کو اس لیے ترجیح دی گئی ہے کہ مجرم آخر وقت تک

اپنی موت سے بے خبر رہتا ہے - حکام اسے معافی کے وعدہ سے اطمینان دلاتے رہتے ہیں - اور جب سزا بھگتنے کے لیے اس کمرہ میں داخل ہوتا ہے اس وقت بھی اسے کسی درد یا تکلیف کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ایک سرور و بیخودی کے عالم میں قالب تہی کرتا ہے —

ریڈیو کی چوری

ریڈیو کی چوری زیادہ تر انگلستان و امریکہ میں رائج ہے - کیونکہ ان ممالک میں ریڈیو استعمال کرنے والے بہت ہیں - ریڈیو کی چوری اس طرح ہوتی ہے کہ ہر شخص بغیر کسی کے اطلاع کے ریڈیو کا ایک چھوٹا آلہ اپنے گھر میں نصب کرکے مرکز بلکہ تمام دنیا کی ریڈیو والی خبروں اور گانوں سے استفادہ کرسکتا ہے اور محصول سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا —

ایسی چوری زیادہ تر موسم سرما میں کی جاتی ہے کیونکہ لوگ عموماً کھڑکیوں کو بند رکھتے ہیں اور آواز باہر نہیں جانے پاتی - لیکن موسم گرما میں ایسا نہیں ہوتا اور رات کو پہرہ دینے والی پولیس ریڈیو کی آواز سن کر ریڈیو کے با قاعدہ خریداروں اور حصہ داروں سے دریافت کرتی ہے اور مجرم کا پتہ لگا لیتی ہے - امریکہ میں ریڈیو کی چوری کے لیے دس ڈالر جرمانہ مقرر ہے - اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ سال بھر میں اس قسم کی دس ہزار چوریاں ہوتی ہیں - اس طرح ہر سال حکومت کو ایک لاکھ ڈالر جرمانہ ریڈیو کی مد میں وصول ہوجاتے ہیں جو ہندوستانی سکہ سے تیس لاکھ روپے کے برابر ہوے —

(م - ز - م)

گل صد رنگ

یعنی

ادبی، علمی، تاریخی، تعلیمی، صنعتی اور حفظان

صحت کے متعلق بہترین مضامین کا بہترین مجموعہ

حیرت انگیز فسانے - دلچسپ ڈرامے - پاکیزہ نظمیں

نظم و نثر کے ۱۶۳ نادر مضامین، قدیم و موجودہ انشا پردازوں کے ایک سو نایاب فوٹو - متعدد سہ رنگی تصاویر - مشاہیر ادب اُردو کے ہاتھ کی تحریروں کے قیمتی عکس اس مجموعہ کی زینت ہیں - (ملک کے قریباً ڈیڑھ سو فاضلوں اور ادیبوں نے اس کی تیاری میں حصہ لیا ہے -) سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ ضخامت قریباً ۷۵۰ صفحات - لکھوائی چھپائی بہترین - متعدد صفحات رنگین —

ہمارا پر زور دعویٰ ہے کہ

اس سے زیادہ شاندار اور ضخیم مجموعۂ مضامین اب تک اُردو زبان میں شائع نہیں ہوا - اس کی تیاری میں آٹھ ہزار روپیہ نقد خرچ کیا گیا ہے —

اگر آپ نے

ادب اُردو کی اس انسائیکلو پیڈیا کو فوراً نہ منگوایا تو یقیناً آپ پچھتائیں گے - کسی وجہ سے بھی ناپسند ہو تو بلا تامل واپس فرماویں —

قیمت باوجود اتنی بڑی ضخامت اور اس قدر فوٹوؤں کے

صرف دو روپیہ آٹھ آنے - مجلد ۳ روپیہ ۴ آنے

ملنے کا پتہ

ماسٹر جگت سنگھ پرو پرائٹر رسالۂ رہنمائے تعلیم - لاہور - رام گلی - نمبر ۵۵۰

سائنس

۱ - یہ رسالہ انجمن ترقی اُردو کی جانب سے جنوری ' اپریل ' جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے —

۲ - یہ رسالہ سائنس کے مضامین اور سائنس کی جدید تحقیقات کو اُردو زبان میں اہل ملک کے سامنے پیش کرتا رہے گا - یورپ اور امریکہ کے اکتشافی کارناموں سے اہل ہند کو آگاہ کرے گا اور اِن علوم کے سیکھنے اور ان کی تحقیقات میں حصہ لینے کا شوق دلائے گا —

۳ - ہر رسالے کا حجم تقریباً ایک سو صفحے ہوگا —

۴ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر آٹھ روپے سکۂ انگریزی ہے (نو روپے چار آنے سکۂ عثمانیہ)

۵ - تمام خط و کتابت :- آنریری سکریٹری - انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے ہونی چاہئے —

(باہتمام محمد صدیق حسن منیجر انجمن اُردو پریس اُردو باغ اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا)

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۲
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلی فون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ آٹھ آنے

سب رس

جلد ۹	بابت ماہ نومبر و ڈسمبر ۱۹۴۶ء	شمارہ ۱۱ و ۱۲

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے دستگیر پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

عرض حال

اس پرچے کی اشاعت کے ساتھ سب رس کی زندگی کا نواں سال ختم ہوتا ہے اور اب وہ اپنی زندگی کی دسویں منزل میں قدم رکھ رہا ہے۔ علم و ادب کی دنیا میں نو سال کا عرصہ شاید کچھ زیادہ نہ معلوم ہوتا ہو لیکن ایک ادبی رسالہ کے لئے یہ مدت یقیناً قابل لحاظ ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر و بیشتر رسالے ابتدا میں تو بڑی آب و تاب کے ساتھ شایع ہوتے ہیں اور چند سال بلکہ چند ماہ بھی گزرنے نہیں پاتے کہ ان کا وہ طمطراق باقی نہیں رہتا اور بہت جلد وہ اپنی زندگی کی آخری منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ادبی دنیا میں ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ شمالی ہند اور حیدرآباد کے کئی رسالے ایسی ہی گمنامی کا شکار ہو چکے ہیں اور بہت کم خوش قسمت رسالے ایسے ہیں جو دنیائے ادب میں اب تک اپنے وجود کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

سب رس نے بھی ان تمام کٹھن اور دشوار گزار منزلوں کو طے کرتے ہوئے اپنے وجود کو قائم رکھنے میں دامن استقامت ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ادارے کو بعض وقت ایسی رکاوٹیں درپیش ہوئیں کہ سب رس کا شایع کرانا دشوار معلوم ہونے لگا۔

بالخصوص یہ سال سب رس کی زندگی میں بہت منحوس اور نا سازگار ثابت ہوا۔ کاتبوں کا تساہل، مطابع کا بر وقت کام انجام نہ دینا اور کاغذ کی فراہمی میں تاخیر ایسے اسباب تھے کہ کام کرنے والوں کے جی چھوٹ گئے اور رسالہ حسب دلخواہ اور پابندی سے نہ چھپ سکا۔ سب رس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں شایع ہو جاتا تھا لیکن اس سال وہ اپنی اس خصوصیت کو برقرار نہ رکھ سکا۔ تاخیر کو دور کرنے کے لئے ایک دو شمارے مشترکہ بھی شایع کئے گئے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ باایں ہمہ اس مشکل پر قابو نہ پا سکے۔ چونکہ سال ختم ہو رہا تھا اس لئے نومبر و ڈسمبر کے شمارے بھی مشترک طور پر شایع کئے جا رہے ہیں تاکہ آنے والے سال میں رسالہ ہر ماہ وقت پر شایع ہو سکے۔ اگر خدا نے چاہا تو جنوری سنہ ۱۹۴۷ء کا پرچہ دوسرے ہفتے میں چھپ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائے گا اور پھر ہر ماہ پہلے ہفتہ میں اس کی اشاعت ہوتی رہے گی۔

ادارہ سب رس کے قدردانوں سے معذرت خواہ ہے کہ اس سال ان کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔ اکثر اصحاب نے سب رس کی دیر رسی کی شکایت بھی کی اور وہ حق بجانب ہیں۔ امید ہے کہ وہ ہماری غیر اختیاری مجبوریوں کے پیش نظر ہم کو معاف فرما دیں گے۔ اور محض اس شکایت کی بنا پر سب رس کی سرپرستی اور معاونت میں دریغ نہ فرمائیں گے۔ ہم انتہائی کوشش کر رہے ہیں آئندہ قارئین سب رس کو کسی قسم کی شکایت کا موقع پیدا نہ ہونے پائے۔

ادارہ

پیامِ اقبال

دم بہ دم نالہ نہ کر مثلِ سپند	آتشِ غم کا مداوا زہر خند
فرضِ انساں سعی و صبر و ذکر و فکر	چند روزہ زندگی کے کام چند
ہر مسرت آشکارا اجرِ کار	ہر مصیبت ایک پنہاں تلخ پند
طالبِ حق مطمئن، مستِ عمل	طالبِ زر خوار و مایوس و نژند
نورِ ایماں باعثِ آرامِ جاں	بے یقینی وجہ صد رنج و گزند
زورِ بازو آزمانے کے لئے	ڈال مہر و ماہ و انجم پر کمند
جسم کی پابندیاں کچھ بھی نہیں	رکھ تخیل کو سدا بے قید و بند
دوسروں کی آنکھ سے دنیا نہ دیکھ	ہو تری اپنی نظر، اپنی پسند
مردِ مومن کی متاعِ زندگی	سادگی، فکرِ رسا، عزمِ بلند
جستجو میں گرمیٔ برقِ تپاں	گفتگو میں کیفِ روحِ شہد و قند

فاش کر دیتی ہے اسرارِ حیات

سو دبستاں اک نگاہِ ہوشمند

سکندر علی وجدؔ

خواتین اور سماج

سماج پر خواتین کے احسانات اور خواتین کے سماجی فرائض بتانے سے پہلے میں اس کی تشریح ضروری سمجھتی ہوں کہ سماج ہے کیا چیز؟

سماج کا لفظ ہمارے کانوں کے لئے غیر مانوس نہیں - آئے دن ناولوں اور فلموں میں سماج کے مظالم کا حال پڑھتے اور دیکھتے ہیں۔ بالخصوص ہندوستانی فلموں میں ہیرو اور ہیروئن کی جدائی کا باعث یہ کم بخت سماج ہی ہوا کرتا ہے۔ ہر افسانے میں سماج کو برا بھلا کہنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج انسانوں کی اس جماعت کا نام ہے جو شعوری طور پر جغرافی، لسانی یعنی اپنی بول چال اور وجدانی ضروریات کی خاطر متحد اور مل جل کر رہتی ہو۔ اور جو ان افراد کے اعمال و افعال پر اپنی نگرانی رکھتی ہے جو اس کے حلقۂ اثر میں ہوں۔ اب قدرتی طور پر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خواتین کو ان امور سے کیا تعلق! ان کی زندگی کو قفس کی تیلیوں سے سر ٹکرانے بسر ہوتی ہے ان کو معاشرہ کی سود و بہبود سے کیا واسطہ لیکن واقعہ یہ نہیں۔ خواتین کا سماج سے اتنا ہی گہرا تعلق ہے جتنا زندگی سے۔ ہوا، پانی اور غذا کا۔ کیونکہ سماج کی تشکیل عورت ہی کی رہین منت ہے۔ اس کی تعمیر میں بھی اس کا دست عمل کارفرما ہے ورنہ حضرت انسان دور حجریہ کی طرح آج بھی اپنا اسباب سر پر اٹھائے خانہ بدوش زندگی بسر کرتے۔ گھر کا تصور عورت کی وجہ سے پیدا ہوا اس لئے کہنا چاہئے کہ اجتماعی زندگی کی ابتدا عورت کے ہاتھوں پڑی اور ظاہر ہے جب فرد کا کوئی مرکز ہی نہ ہوتا اور وہ دربدر کی خاک چھانتا تو سماج کی ابتدا کیونکر ہوتی جس طرح عورت نے سماج کی ابتدا کی اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کے ارتقا اور نشو و نما میں حصہ لیا اس نے انسانوں کو ماں کی حیثیت سے ان فرائض اور ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جو کسی معاشرہ کی صورت میں اس پر عاید ہوتی ہیں۔ اس نے ہی ایسی شخصیتوں کو جنم دیا جنھوں نے سماج کے تخیل کو اجاگر کیا اور سماج کو انسانی کوششوں کا محور بنایا اس طرح دیکھا جائے تو ایک بہتر اور برتر سماج کی آفرینش عورت ہی کے ہاتھوں پڑ سکتی ہے وہ فرعون اور شداد جیسے لوگوں کو بھی جنم دے سکتی ہے اور حضرت محمدؐ، مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰ وغیرہ جیسی مقدس اور پاک ہستیوں کو بھی وہ اپنے اشارۂ ابرو سے ہیلن اور کلیوپٹرا کا روپ دھار کر سماجی نظام کو تہ و بالا بھی کر سکتی ہے اور فلارنس نائٹ انگیل، فاطمہ بنت عبداللہ، چاند بی بی، نورجہاں کی طرح سماج کے مقاصد کو اپنے خون جگر سے سینچ بھی سکتی ہے۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی عورت کا سماج پر بڑا اثر ہے سماجی قوت اور اہمیت کو برقرار رکھنے کا موجب بھی عورت ہی ہے۔ عورت کو سماج کے لعن طعن کا بڑا خیال رہتا ہے اور وہی سماج میں نام و نمود حاصل کرنے کے لئے فضول رسومات اور فضول خرچی کا باعث ہوتی ہے۔ علم سماج کے ماہر بیان کرتے ہیں کہ سماجیت کا وجود انسان کے جذبۂ تقلید، شیخت، نمود داری کی وجہ سے ظہور میں آتا ہے۔ مثلاً اس نظریہ کے تحت کہ پیدائش اور موت کے بعد کی رسوم اگر نہایت شان و شوکت سے ادا کی جائیں تو بڑا نام ہوتا ہے۔ سماج میں نام اور امتیاز حاصل کرنے کے لئے لوگ یہ رسومات بہت دھوم سے کرتے ہیں اور ان کو اس عمل پر اکسانے والی خواتین ہی ہوتی ہیں گویا فرد کو سماجی سانچے میں ڈھالنے والی بھی عورت ہی ہوتی ہے۔ گالزوردی (Golsworthy) اور ایچ جی ویلز کا یہ خیال بالکل ٹھیک ہے کہ خواتین ہمیشہ ہیئت اجتماعی اور تمدن کی علمبردار رہی ہیں۔

علم سماج کے ماہرین نے سماجی ذہنیت میں تبدیلی کی کوشش کو "تفرید" کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ تفرید تعمیری بھی ہوتی ہے اور تخریبی بھی۔ دونوں صورتوں میں مخالفتوں کا سامنا ہوتا ہے ــــ بالعموم دیکھا گیا ہے کہ تعمیری تفرید میں زیادہ دقتوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ تخریبی تفرید کی بنیاد چونکہ خود غرضی پر ہوتی ہے اس لئے دوسروں کے نقصان سے اپنا فائدہ چاہنے والے افراد ہاں میں ہاں ملانے لگتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو سماجی باغی کہا جاتا ہے۔ تاریخ عالم کے صفحات پر نظر ڈالیں تو تخریبی تفرید میں کسی خاتون کا نام نہیں ملتا۔ اس کے برخلاف تعمیری تفرید اکثر و بیشتر خواتین کی رہین منت ہے اگر وہ پیش منظر پر نہ بھی آئے تو پس منظر میں اس کا دست عمل ضرور کارفرما رہتا ہے۔

علاوہ ازیں معاشرہ میں کوئی تبدیلی بغیر عورت کی تائید کے نہیں حاصل کی جا سکتی۔ سماج کا یہ طبقہ عقائد ہی کی حفاظت کو سماجی خدمت سمجھتا ہے اور پوری قوت سے نئے خیالات کی مخالفت کرتا ہے۔ اسی لئے ٹیگور نے عورت کو قدامت پسند کہا ہے۔ عورت سماج کی آنکھ ہے جس طرح بغیر آنکھ کے انسانی جسم بے کار ہے، اسی طرح بغیر عورت کے انسانی معاشرہ بے کار ہے۔ لیکن یہ خواتین کا فرض ہے کہ وہ اپنی اس اہمیت کو پہچانیں۔ موجودہ جمہوری دور میں افراد بجائے خود کوئی چیز نہیں۔ جب تک وہ سماج سے وابستہ نہ ہوں، اسی طرح جس طرح موج دریا کے باہر کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ چنانچہ اب سماج ہی آمر بھی ہے اور مامور بھی۔ کارفرما بھی ہے اور کارگزار بھی۔ سماج کی اہمیت کے مدنظر فرانس کے مفکر اگسٹ کانٹ نے اسے باقاعدہ 'علم' بناکر عمرانیات کے نام سے اٹھارھویں صدی میں اہل دنیا کے سامنے پیش کیا۔ خواتین کا فرض ہے کہ وہ اس علم سے کما حقہ واقفیت حاصل کریں اور معاشرہ میں اپنا صحیح مقام پہچانیں۔ حالیہ زمانے میں خواتین کو سماج میں خاص اہمیت دی گئی ہے۔ موجودہ سماج نے خواتین کو مرد کا نصف بہتر تسلیم کرکے سیاسیات میں بھی حصہ لینے کا موقع دیا۔ اس نظریہ سے خواتین خود بھی سماج کی کارآمد و مفید رکن بن سکتی ہیں اور سماج کے لئے کارکن اور کارفرما افراد کو بھی جنم دے سکتی ہیں۔

اس کے علاوہ خواتین دیگر سماجی کام بھی بحسن و خوبی انجام دے سکتی ہیں۔ کیونکہ مرد کا زیادہ تر وقت فکر معاش میں بسر ہوتا ہے۔ وہ اپنا زیادہ وقت سماج کی فلاح و بہبود میں صرف نہیں کرسکتا۔ اس کے برخلاف عورتیں چونکہ اس فکر سے بری رہتی ہیں اس وجہ سے وہ آسانی سے اپنا وقت سماجی فلاح و بہبود کے کاموں میں دے سکتی ہیں۔ تعلیم بالغان ہی کے مسئلے کو لیجئے۔ عورتیں گھر میں بیٹھے بیٹھے زیادہ سے زیادہ افراد کو تعلیم دے سکتی اور ملک کی ان گنت تعداد کو مفید شہری بنا سکتی ہیں۔ عورت کے دل کو آبگینہ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس لئے کہ وہ دوسروں کے درد کو بہت جلد محسوس کرلیتا ہے۔ وہ بھی قلب میں احساس رکھے تو اپنے سماج کے ان معذور اشخاص کے لئے روزی فراہم کرسکتی اور ان کی آسائش کے اسباب مہیا کرسکتی ہے جو سماج کی گردن کا بوجھ بنے ہوئے ہیں لیکن یہ امر قابل حیرت ہے کہ سوشیل ریفارمروں یعنی سماجی مصلحوں اور کارگزاروں میں خواتین ممبروں کی تعداد بہت کم ہے۔ حیدرآباد کی حد تک مسز سروجنی نائیڈو۔ بیگم رستم جنگ۔ مس پدمجا نائیڈو۔ بیگم رحمت اللہ۔ بیگم امیر حسن اور خود شہزادیاں والا شان کی سماجی امور سے گہری دلچسپی اور انہماک کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ لیکن ابھی اس فہرست میں اضافے کی ضرورت ہے۔ مجھے امید ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی وہ طالبات جنھیں موقع حاصل ہے اس میدان عمل کو اپنی جولان گاہ بنائیں گی۔

(حیدرآباد ریڈیو سے پڑھا گیا)

رفیعہ سلطانہ

کافرانہ بے نیازی

کافر سے مراد وہ حسیں ہے — فی الحال جو حُسن آفریں ہے
اللہ رے بے نیاز کافر — ہر ڈھنگ سے رنگِ حُسن ظاہر
نورِ دل و جان و پیکرِ نُور — پیرایۂ جلوہ ہائے مستور
سر دفترِ دلبرانِ خوش رُو — سرنامۂ داستانِ دل جُو
پیمانۂ آرزوئے گلفام! — افسانۂ جستجوئے خوش کام

ہیں حُسنِ مجسم اس کے جلوے
چومیں مہ و مہر اس کے تلوے

ہر آن میں شانِ بے نیازی — ہر شان میں آنِ بے نیازی
خود سر خود دار خود نگر دوست — خوشترِ خوش کام خوش بیر دوست
یہ دوست خزانہ دارِ عرفان — یہ دوست فسانہ سازِ ایماں
کس دشمنِ جاں کو کہہ دیا دوست، — کہنا ہی پڑا! کہ جاں ہمہ اوست
کہتا ہے مآلِ حُسنِ فطرت — نظارۂ حُسن ہے عبادت

نیچر کی عطا بُتِ حسیں ہے
معبود اسے پوجنا نہیں ہے

بینش سے ملا جو ذوقِ دانش — جائز ہوئی حُسن کی پرستش

مقصود بصیرت و بصارت — کیا ہے؟ دل و چشم کی طہارت

جب تزکیۂ دل و نظر ہو — یہ کافرِ قدس جلوہ گر ہو

ہے حسنِ نظر کا مدعا کیا — میں دیکھ کے اس کو دیکھتا کیا

حسنِ بتِ کافر اور دیکھوں — جانچوں اسے اس کے طور دیکھوں

اس کی ہر ادا ہے پیاری پیاری
مشکل ہے بہت ادا شماری

اس پر بھی میں کچھ نہ کچھ کہوں گا — ہاں جائزہ اس حسیں کا لوں گا

سوجھیں کبھی شوخیاں جو اس کو — بے چین دل اور مضطرب ہو

ہنس دے یہ حسیں تو چاند شرمائے — چاند ابر میں دل میں یہ جگہ پائے

جھینپے تو نگاہ اور چمکے! — چھپ جائے غلاف میں حرم کے

سہمے تو خدائے دلبری ہو — مسجودِ بتانِ آذری ہو

اس حسن پہ یہ ادا طرازی
بے جا نہیں اس کی بے نیازی

علی منظور

بوڑھا کسان

دن ڈھلے پردیسیوں کے گیت پنگھٹ پر نہ تھے
بھیگتے بازو نہ تھے چھلکے ہوئے گاگر نہ تھے

آ چکی تھیں، دخترانِ کوہ و صحرا اپنے گھر
گا چکے تھے گیت چرواہے ہوا کے ساز پر

بھولے بھٹکے قافلوں کی رہگزاروں کے چراغ
دور افق پر جھلملاتے تھے ستاروں کے چراغ

وادیاں کھولے ہوئے تھیں دوش تک شانوں پہ بال
ظلمتیں پگڈنڈیوں پر بُن رہی تھیں اپنا جال

کھل چکے تھے کالے کالے بادلوں کے بادباں
ایک چاندی کا سفینہ تھا اندھیرے میں رواں

پھیلتے جاتے تھے کھیتوں پر تھپیڑے رات کے
ڈوبتے جاتے تھے کچے راستے دیہات کے

ناگہاں اک شخص یوں آیا نظر صرفِ خرام
لے رہے تھے جس کے سورج سے اندھیرے انتقام

کھو چکی تھی جس کی پیری ٹھوکریں کھانے کی تاب
جس کا چلنا تھا قیامت جس کا گرنا تھا عذاب

ڈگمگاتی ایک میّت لڑکھڑاتی ایک لاش
جس کے ہر احساس پر بیتے زمانوں کی خراش

گر چکا تھا جو پتنگوں کی نظر سے وہ چراغ
جس کو ہونٹوں سے لگا کر پھینک دیں ایسا ایاغ

ایک سمجھوتہ ہنسی اور آنسوؤں کے درمیاں
اپنے مستقبل کی ذلت اپنے ماضی کی فغاں

صبح کا اک ماتمی، اک چاندنی کا سوگوار
سانس لیتی ایک تربت چلتا پھرتا اک مزار

نبض ڈوبی، دل فسردہ، حوصلے چھوٹے ہوئے
ایک ایسا ساز جس کے تار سب ٹوٹے ہوئے

مجھ سے کہتا تھا "سنا ہے اختتام جنگ پر
لوٹ کر میداں سے آتے ہیں سپاہی اپنے گھر"

"موت کو بیچا ہے میں نے سیکڑوں صبحوں کا نور
اپنی فصلوں کی امانت، اپنے کھیتوں کا غرور

ایک مادر کا کلیجا، ایک دلہن کا سہاگ
ایک دریا کا کنارہ اور اک شعلے کی آگ

ایک بچی کا تبسم جس کے سر سایہ نہیں
ایک ایسا پھول ہنسنا تک جسے آیا نہیں

گولیوں کے دام گھر کی ساری دولت بیچ دی
میں نے تاریکی میں آنکھوں کی بصارت بیچ دی

دیکھتے ہو راستوں پر کس قدر اندھیر ہے
صبح ہونے کے لئے اب اور کتنی دیر ہے؟"

شور

غزل

دل درد سے معمور ہے معلوم نہیں کیوں
زخموں سے جگر چور ہے معلوم نہیں کیوں

اک آتشِ دل سوز اور اک آہِ شرر بار
ہر سانس میں مستور ہے معلوم نہیں کیوں

یوں لب پہ تبسم ہے کہ ہیں آنکھوں میں آنسو
دنیا مری مجبور ہے معلوم نہیں کیوں

گرداب بلا میں رہے امیدوں کی کشتی
قسمت کو یہ منظور ہے معلوم نہیں کیوں

لب تک جو نہ آئی کبھی وہ دل کی کہانی
ہر بزم میں مشہور ہے معلوم نہیں کیوں

ملتی ہے یہاں نیکی کے بدلے میں برائی
دنیا کا یہ دستور ہے معلوم نہیں کیوں

تاریک ہے گو شدتِ غم سے مری دنیا
سینہ مرا پُر نور ہے معلوم نہیں کیوں

ہر وادی ہے اب میرے لیے وادیٔ سینا
ہر کوہ وہی طور ہے معلوم نہیں کیوں

خاور کو بجا ناز ہے شوریدہ سری پر
تو عقل پہ مغرور ہے معلوم نہیں کیوں

خاور درانی

وقت

وقت بہتا ہوا سمندر ہے
سال ہیں اس کی بے پناہ موجیں
کتنی ڈوبی ہیں، کتنی ڈوبیں گی
آ کے اس میں جہان کی فوجیں

جو کوئی اس کی زد میں آتا ہے
وہ عدم کو سدھار جاتا ہے
اس کی پُر پیچ و تُند موجوں نے
شاہ زوروں کا بَل نکالا ہے
خوں بہا کر نہ جانے کس کس کا
لمحے لمحے کو اپنے پالا ہے
اس کو ہر کام میں مہارت ہے
اس کی چپ چاپ میں حرارت ہے

میں سمجھتا ہوں وقت کی امواج
خونِ انسانیت کی دھاریں ہیں
کیا خبر ہے عمیق تر کتنی
اس کی گہرائیوں میں غاریں ہیں
کون آئے گا جو بنائے گا؟
وہ تو خود اس میں ڈوب جائے گا!

جمیل ملک

برسات

بادل کا آنچل لہراتی بجلی کے کنگن چمکاتی !
دامن کی نمناک ہوا سے دل کو آتش زار بناتی !

آئی لو برسات پھر آئی
آئی لو برسات پھر آئی

نیل کنول نے لی انگڑائی کلیوں نے گویائی پائی
دُور کہیں مستانہ لَے میں چرواہے نے تان اڑائی

آئی لو برسات پھر آئی
آئی لو برسات پھر آئی

ویرانوں میں آئیں بہاریں جنگل جنگل، مور پکاریں
دھرتی کے پیاسے ہونٹوں پر امرت کی پڑتی ہیں پھواریں

آئی لو برسات پھر آئی
آئی لو برسات پھر آئی

کھیتوں پر آیا ہے جوبن ہر وادی مالن کا دامن
رنگ و بو کی ارزانی سے جنتِ در جنت ہر گلشن

آئی لو برسات پھر آئی
آئی لو برسات پھر آئی

میخواری پھر عام ہوئی ہے توبہ غرقِ جام ہوئی ہے !
آؤ، پیو، میخانے وا ہیں وقت سے پہلے شام ہوئی ہے

آئی لو برسات پھر آئی
آئی لو برسات پھر آئی

رم جھم رم جھم پانی برسے چھم چھم کرتی آجا گھر سے
آجا، آجا دید کو تیری آخر کوئی کب تک ترسے

آئی لو برسات پھر آئی
آئی لو برسات پھر آئی

سلیمان اریب

ناکام آنسو

بچہ ہاتھ میں کٹورا لئے جا رہا تھا۔ پیچھے سے ایک موٹر آئی...... ہارن گرجا۔ ہٹتے ہٹتے موٹر کا دھکا اسے لگ ہی گیا ــــــ وہ گر پڑا۔

مٹی پر دودھ ایک سیاہ کار کے سفید لباس کی طرح پھیل گیا۔

موٹر رکی اور چند خوش پوش اترے۔ بچے کو صحیح سلامت دیکھ کر ان کے چہروں پر آئے ہوئے تردد کے آثار مسکراہٹوں کے پیچھے گم ہو گئے۔

ایک نے کہا "گدھے!! سڑک تیرے باپ کی ہے جو یوں بیچ بیچ میں سے چلتا ہے؟"

دوسرے نے کہا "قسمت اچھی تھی جو بچ گیا ورنہ مر جاتا"

بچے کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے ــــــ اس لئے نہیں کہ چوٹ سے اس کے پاؤں میں تکلیف ہو رہی تھی ــــــ اس لئے کہ اس کی مشقت کا معاوضہ اس کی آخری پونجی جو وہ اپنی بیمار ماں کے لئے لیجا رہا تھا اس سڑک پر پھیلی ہوئی تھی جس میں ابھی تک اس کے مرحوم باپ کی محنتیں جھلک رہی تھیں۔

آنسو ضائع ہو رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا۔ سڑک باپ کی ہے؟ وہ خوش قسمت ہے؟ ماں بیمار ہے!!!

وہ واپس ہو گئے۔ موٹر چلی۔ انجن کی آواز کے ساتھ قہقہوں کی صدا بھی پیچھے چھوڑتی گئی۔

ہنسنے والے ملک قہقہے لگاتے ہیں اس لئے ان کی آواز دور تک سنائی دیتی ہے لیکن رونے والے [illegible]

روشن ظہیر

غمگسار

اُف...... یہ دن بھر کی محنت ــــــ کاغذات رجسٹر، مسلیں۔ گالیاں...... اور تنخواہ برآئندہ ــــــ بیوی کو بھی آج ہی میکہ جانا تھا؟ اس سے باتیں کرنے میں کچھ تو دل بہلتا...... تسکین ہوتی۔ تکان دور ہوتی...... دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ــــــ بدقسمتی..!

ــــــ رات بھیانک ہو چلی ہے سو جانا چاہیے۔

گلی میں یہ کون گفتگو کر رہا ہے؟ اتنی رات گئے؟؟ اس سنسان گلی میں؟؟؟

"میری موہنی ــــــ ٹھیر کہاں جاتی ہے۔ آ تجھے ایک بار چوم تو لوں"

بدمعاش!!...... "کسی" کو لے آیا ہے۔

"کتنا سکون ہوتا ہے جب تجھے گلے سے لگا لیتا ہوں سب کچھ بھول جاتا ہوں"

جھوٹا۔ فریبی۔ کسی کو میٹھی میٹھی باتوں میں پھانس رہا ہے۔ منہ سے الفاظ برابر نکل بھی نہیں رہے ہیں۔ شاید خوب پی لی ہے۔

"خوب جانتا ہوں...... تیری بے چینی کا سبب جانتا ہوں...... خوب...... یہ آوارہ اس گلی کو گھناؤنی کر دے گا ــــــ ٹھیرو خبر لیتا ہوں۔

میں غصہ میں بھرا ہوا باہر نکل آیا ــــــ

!!!...... چیتھڑوں میں ملبوس ایک نحیف بوڑھا گود میں ایک کریہہ صورت لاغر بلی کو لئے بیٹھا تھا اور کہہ رہا تھا

"کل تو مجھے کہیں سے روٹی مل ہی جائے گی۔ پھر ضرور تجھے آدھی کھلاؤں گا۔ آخر تیرے سوا میرا ہے کون؟

روشن ظہیر

ماں

اس کے خوبصورت سفید ہاتھ دعا کے لئے بلند تھے اور وہ سراپا حزن بنی آہستہ آہستہ اپنے معبود سے التجا کر رہی تھی۔ شفق کی ہلکی تابناک سرخی میں اس کا مضمحل چہرہ چمک رہا تھا۔ چڑیوں کے شیریں نغمات حسینہ سحر کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ چنبیلی کی نازک بیلیں ہوا کے نرم جھونکوں سے جھوم رہی تھیں۔ گلاب کی پتیوں پر شبنم چمک رہی تھی جیسے کسی کے رخسار پر ڈھلکا ہوا آنسو غرض صبح طلوع ہو رہی تھی۔ صبح یعنی ازل کائنات کی اولین منزل اور قدرت کا پہلا ورق۔

اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہاتھ دعا کے لئے بلند تھے۔ ناگہاں اس نے آنکھیں کھولیں اور اس کی نظر سامنے پھیلی ہوئی ندی پر پڑی جہاں روشن آفتاب سطح آب سے آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا اس کی زریں کرنیں ہر طرف بکھر رہی تھیں اور بادلوں کا ہر ٹکڑا گل مہر کے پھولوں کی طرح شعلہ دار تھا۔ رخسانہ کی آنکھیں اس حسین منظر کو دیکھ کر چمک اٹھیں اور وہ حزن جو اس کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا تھوڑی دیر کے لئے غائب ہو گیا۔ وہ اپنے ماحول سے یکسر غافل ہو کر قدرت کی حسن کاریوں میں کھو گئی مگر جلدی ہی آج سے بہت پہلے کی ایک حسین صبح اسے یاد آئی اور ماضی کے دھندلے نقوش ابھرنے لگے۔

آج سے بہت پہلے۔ جبکہ رخسانہ باپ کی شفقت و محبت سے محروم نہیں ہوئی تھی۔ ایسی ہی رنگین صبح تھی۔ رخسانہ اپنی بالکونی میں کھڑی حسین منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ بہت مسرور تھی کیونکہ میٹرک کا امتحان اس نے امتیاز کے ساتھ پاس کیا تھا اور آج اسی خوشی میں اس کی سہیلیاں آنے والی تھیں وہ اپنی کامیابی پر مسکرا رہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا: بابا —— کہہ کر وہ مڑی اور اس کا سر اپنے باپ کے سینے سے لگ گیا۔ "رخسانہ۔ میری بچی" وہ شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے "آج میں بہت خوش ہوں رخسانہ۔ تمہاری اس کامیابی سے میرے حوصلے بڑھ گئے ہیں۔ میں تمہیں بہترین تعلیم دلواؤں گا۔ اعلیٰ تعلیم اور عمدہ تربیت سے تم میں بہترین صلاحیتیں پیدا ہوں گی۔ تم ملک کی مایۂ ناز لڑکی بنو گی۔ مجھے تقدیر نے کرنے نہیں دیا وہ تم پورا کرو گی۔ میرا نصب العین تمہارے ذریعہ پورا ہو گا"۔ "ہاں بابا۔ میں اپنے آپ کو ایسا ہی ثابت کر دکھاؤں گی۔ میرے دل میں سوائے قومی درد و فلاح کے کچھ نہ ہو گا۔ خدا مجھے ایک طویل اور کامیاب زندگی دے۔ ایسی زندگی کہ جس کا مقصد خود تکلیف اٹھانا اور دوسروں کو سکھ پہنچانا ہو"۔ انھوں نے آہستہ سے آمین کہا اور زیر لب مسکراتے چلے گئے۔

مگر آہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ اپنی بیوی نازو اور رخسانہ کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔ ماں غم سے پاگل سی ہو رہی تھی۔ بیس سالہ ساتھی ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا تھا اور رخسانہ دیکھ رہی تھی کہ "رشتہ دار" ان کے غم کی پرواہ کئے بغیر آہستہ آہستہ ان کی چیزوں پر قبضہ جما رہے تھے۔ آہ یہ حریص دنیا۔ غم تازہ ہی تھا اور ان کو ترکے کی فکر پڑی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے وراثت کی تقسیم ہو جائے۔ ماں کو اتنا ہوش نہ تھا کہ کچھ خیال کرتی اور رخسانہ سب کچھ سمجھ رہی تھی اور بے بس تھی۔ اس کی پھوپی نے دوسروں کو اپنے موافق کر لیا اور وہ مکان جو نہ جانے کتنی آرزوؤں سے بنایا گیا تھا جس مکان میں رخسانہ کا بچپن گزرا تھا۔ کامیاب اور پر مسرت، وہ اب دوسروں کے قبضے میں تھا۔ پھوپی نے اسے باپ کے ترکے سے محروم کر کے مکان پر قبضہ کر لیا اور وہ اپنے باپ کی اس ایک چیز سے بھی محروم کر دی گئی جس وقت اسے معلوم ہوا کہ یہ گھر اس کی پھوپی کا ہو

تو وہ غم اور غصے سے پاگل ہوگئی۔ "کیا حق تھا کسی کو مکان لینے کا۔ میرا ہے یہ مکان" وہ غصے سے چیخ اٹھی مگر جب اس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں سے وصیت نامہ دیکھا تو اس کی بھیگی آنکھیں جھک گئیں اور ان سے آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی۔ "جعلی وصیت نامہ" اس کے دل نے آواز دی مگر وہ مجبور و بے بس تھی۔

آہستہ آہستہ دن گزرتے گئے، مکان پر اب پھوپی کا قبضہ تھا۔ دوسروں کی نگاہوں میں اپنے کو ہمدرد جتانے کے لئے انھوں نے رخسانہ اور اس کی ماں کو اسی مکان میں رہنے دیا تھا مگر ان کی حیثیت مالک کی سی نہیں تھی۔ رخسانہ کے سپرد اس کے پھوپی زاد بھائی بہن تھے اور نازو دن بھر گھر کے دوسرے کاموں میں مصروف کر دی گئی تھی۔ رخسانہ بظاہر اپنی زندگی سے خوش تھی۔ وہ اپنی ماں کے سامنے ہمیشہ خوش رہتی مگر رات کی تنہائیوں میں مصنوعی خوشی کا نقاب اس کے چہرے سے ہٹ جاتا اور وہ پریشان خیالات میں گم ہوجاتی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی ماں کے چہرے پر مشکلات اور غم کی پرچھائیاں پڑ رہی ہیں۔ وہ دن بھر کام میں مصروف رہتیں ایک مشین کی طرح۔ ان کے احساسات اور جذبات فنا ہو چکے تھے مگر رخسانہ کو دیکھ کر انھیں اپنے شوہر کی آرزوئیں اور ان کے الفاظ یاد آجاتے وہ کہا کرتے تھے "نازو ..... جب ہم بوڑھے ہوجائیں گے تو رخسانہ کی کامیاب زندگی کو دیکھ کر کتنے مسرور ہوں گے۔ وہ ملک کی ایک نامور لڑکی ہوگی۔ ایک عظیم قوم کی عظیم بیٹی ——— آہ وہ ارمان اور ان کی حقیر آرزوئیں!"

رخسانہ اس زندگی کی عادی ہوگئی تھی مگر ایک خیال ہمیشہ اسے بے چین کر دیتا۔ وہ اپنے باپ کی آرزوؤں کی تکمیل کے متعلق سوچا کرتی اور اسے وہ صبح یاد آجاتی جبکہ انھوں نے رخسانہ کے ذریعہ اپنی خواہشات کی تکمیل چاہی تھی۔ وہ رخسانہ سے ملک و قوم کی خدمت کروانا چاہتے تھے۔ وہ بڑے شوق سے تانتیا کی سرگزشت پڑھتے جس نے انتہائی شجاعت وبہادری سے تختۂ دار پر اپنی جان دیدی۔ اور جس کی یاد محترم اور پائندہ ہے۔

آخر سوچتے سوچتے ——— رخسانہ نے ایک ترکیب نکالی۔ وہ قوم وملک کی خدمت اپنے قلم کے ذریعے کرے گی۔ اور وہ اپنے خیال کی تکمیل میں مصروف ہوگئی۔ اس کے افسانوں میں ملک کی محبت اور قوم کا درد ہوتا۔ غریبوں کے دکھوں کی جیتی جاگتی تصویریں ہوتیں۔ ان میں سماج اور انسانی معاشرت کی غلط کاریوں کا اظہار ہوتا۔ وہ جو کچھ لکھتی اپنے گرد وپیش سے متاثر ہو کر لکھتی۔ سماج اور اس کے ظالم افراد نے اس کے دل میں جو گہرے زخم ڈالے تھے انھیں وہ صفحۂ قرطاس پر اتارتی۔ یہی وجہ تھی کہ کم عمری میں وہ کامیاب افسانہ نگار سمجھی جانے لگی کیونکہ اس کے افسانے حقیقت کے آئینہ دار ہوتے تھے۔

ایک دن وہ سب کاموں سے فارغ ہو کر اپنی کوٹھری میں بیٹھی ایک مضمون مکمل کر رہی تھی۔ یہ وہی کوٹھری تھی جس میں کسی زمانے میں اس کے ابا رہا کرتے تھے۔ اور جو اب رخسانہ کو ملی تھی۔ وہ اپنے ادھورے مضمون "ماں" کو ختم کرنا چاہتی تھی کہ اماں اندر داخل ہوئیں۔ رخسانہ نے نگاہیں اوپر اٹھائیں اور اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔ ان کا سرخ وسفید چہرہ جو ہر وقت تبسم رہتا تھا زرد پڑ گیا تھا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی مگر اس مسکراہٹ کے پیچھے نہ جانے کتنے آنسو پوشیدہ تھے۔ رخسانہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں مگر ماں نازو اس کے آنسو دیکھ چکی تھیں۔ "نازو بیٹی تم ہر وقت نہ جانے کیا لکھتی رہتی ہو۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تمھاری صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ میں آج ہی تمھاری پھوپی سے کہوں گی کہ کسی ڈاکٹر کو دکھائیں۔ میری ہر چیز کی وہ مالک ہوجائیں مگر میری بچی اچھی رہے۔ یہی میرے لئے بہت ہے۔"

"ہاں۔ اے ماں تو کتنی پیاری اور مقدس ہستی ہے۔"

تو ایثار و قربانی کی دیوی۔ صبر و برداشت کا مجسمہ۔ محبت و خلوص کی سرچشمہ ہے تو اولاد کے لئے کیا کچھ نہیں سہتی' ماں"۔ رخسانہ خلاء میں جانے کیا کیا دیکھتی ہوئی بڑبڑا رہی تھی اور نازو حیران و مبہوت اسے دیکھ رہی تھی۔

رخسانہ اپنی مختصر سی زندگی میں نئے نئے تجربات سے روشناس ہو رہی تھی۔ پھوپی کے برتاؤ میں اب وہ پہلی سی محبت نہ رہی تھی۔ وہ بظاہر اس سے محبت کرتیں مگر انھیں یہ پریشانی بھی تھی کہ کہیں رخسانہ اپنے باپ کی وراثت کے لئے دعویٰ نہ کر دے' اس کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ان کا یہ اندیشہ بھی بڑھ رہا تھا۔ رخسانہ ان کے اس اندیشہ سے بے خبر اپنی پریشانیوں میں گم تھی۔ اس سے اپنی ماں کی حالت پوشیدہ نہ تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ نازو کی صحت روز بروز گرتی ہی جا رہی ہے۔ اگر کچھ دن ان کا علاج نہ کیا گیا تو ـــــ اس کے آگے وہ سوچ نہ سکتی۔

پھوپی کی لاپروائیوں اور نازو کی زندگی سے بے زارگی نے آخر نازو کو سخت بیمار کر دیا۔ رخسانہ جیسے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ دن رات وہ ماں کی تیمارداری میں مصروف رہتی۔ اسے اپنے کھانے کی بھی پرواہ نہ تھی۔

وہ ایک لمحے کے لئے بھی اپنی ماں کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سب کچھ بھول کر اپنی ماں میں کھوئی ہوئی تھی۔ پھوپھی اب بھی چاہتی تھیں کہ وہ ان کے بچوں کی دیکھ بھال کرے مگر رخسانہ کو جیسے کسی بھی چیز کا ہوش نہ تھا۔ وہ تمام وقت اپنی ماں کے پلنگ کے پاس زمین پر بیٹھی اس کے زرد چہرے کو دیکھا کرتی۔ ایک دن نازو کی حالت زیادہ خراب تھی۔ وہ بیہوشی میں جانے کیا کیا بک رہی تھی۔ رخسانہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی اور اس کے بال اس کے مغموم زرد چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اپنی ماں کے بیمار چہرے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ اسے اپنی بے بسی کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ آہ کہیں اس کی ماں بھی تو اس سے جدا نہیں ہو رہی ہے۔؟ اس نے "ایک" ان دیکھی بے پناہ قوت کے سامنے عاجزی سے سر جھکا دیا اور آہستہ آہستہ رک رک کر اپنے مالک سے التجائیں کرنے لگی۔ "نہیں۔ نہیں میرے مالک۔ میری ماں کو مجھ سے جدا نہ کر۔ ان کی محبت کے سوا میرے لئے دنیا میں اور کچھ نہیں۔ انھیں مجھ سے مت چھین۔ آہ یہ وسیع و عریض دنیا۔ اس میں مجھے تنہا اور بے سہارا نہ چھوڑ۔ مجھے ماں کی محبت سے محروم نہ کر۔ میرے معبود ـــــ"

نجمہ سمیع

سرِراہے

رباب کا سا تموّج، ستار کی سی لَے — کہیں کہیں وہ چھلکتا ہوا پیالۂ مے

کوئی ڈھلی ہوئی دھوپ اور کھنچی ہوئی تلوار — کوئی تلاطمِ دریا، کوئی نسیمِ بہار

کوئی وہ موسمِ سرما کی چاندنی کم کم — کوئی وہ رقصِ جواں، ناتمام و پیہم

کوئی دھواں سا مچلتا ہوا فضاؤں میں — کوئی وہ لکۂ ابرِ رواں ہواؤں میں

کوئی وہ موجِ رسیدہ جیسے قمار کہیں — کوئی وہ سروِ خمیدہ جیسے بہار کہیں

کوئی حجاب درونِ حجاب و پردۂ ساز — کوئی تمام تکلّم، کوئی فقط اِک راز

کوئی وہ لہجہ جو داؤد کی زبور میں ہے — کوئی وہ تلخیٔ احساس جو شعور میں ہے

کوئی وہ فکر جو آواز میں بدل جائے — کوئی وہ عقدہ جو برپا نہ ہو پگھل جائے

کوئی خیال کی جولانیوں میں ایک قرار — کوئی ہزار کتابوں میں ایک ہی اظہار

کوئی سرور کے عالم میں بے دلی کم کم — کوئی ہجومِ تمنّا و کاکُلِ برہم

کوئی تبسّمِ ابرِ بہار و موسمِ گُل — کوئی سرشکِ مژہ اور خندۂ قلقل

کوئی وہ میرؔ کی افسردگی میں تازہ نہال — کوئی تغزلِ خسروؔ میں آریوں کا جمال

کوئی وہ برف جو کرنوں کے انتظار میں ہو — کوئی وہ بات جو الجھے ہوئے شرار میں ہو

کوئی وہ قصہ جو اکثر دراز ہو جائے — کوئی وہ لَے جو بڑھے اور ساز ہو جائے

یہ رنگ روپ، یہ سائے، یہ دھوپ چھاؤں، یہ جال
کہیں شریکِ دو عالم، کہیں خیالِ محال

خورشید الاسلام

کون جانے!

اور پھر میں البم کا وہ صفحہ نہ الٹ سکا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کمرے میں غیر اختیاری طور پر ٹہلنے لگا۔ سامنے میز پر تصویروں کا البم کھلا پڑا رہا۔ اور میرا ذہن ماضی کے دھندلکوں میں ڈوبتا چلا گیا

"چرواہی" یہ اس تصویر کا نام تھا جو البم کے کھلے صفحے پر میری نظروں کے سامنے پڑی تھی۔ بیتے ہوئے دنوں کا ایک بہت مختصر سا واقعہ اس تصویر نے آج یاد دلا دیا تھا! مختصر ہی تو تھا وہ لیکن پھر بھی میں اسے آج تک نہ بھلا سکا، اس کی یاد جو ذہن کے کسی نامعلوم گوشے میں دبی پڑی تھی آج اس تصویر کو دیکھتے ہی ابھر آئی تھی ...... ماضی کے سیکڑوں نقوش دماغ میں ابھرتے چلے آئے اور وقت کی ایک ہی جست کے ساتھ کئی برس پہلے کا ایک دن میرے ذہن میں گھوم گیا........

وہ برسات کی ایک حسین شام تھی۔ آسمان کے نیلے سمندر میں سرمئی رنگ کے سیکڑوں بادل تیر رہے تھے۔ سورج کے غروب ہونے میں ابھی کوئی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ زمین پر حد نگاہ تک سبزہ ہی سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ درختوں کی شاخوں اور لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں سے ہوا گیت گاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ جھاڑیوں میں خرگوش پھدک رہے تھے اور درختوں پر اڑتی ہوئی گلہریاں اور چڑیوں کا غل مچا ہوا تھا۔ فضا میں بے خودی اور سرشاری گھلی ہوئی تھی۔ میں سائیکل سے اتر گیا اور سڑک سے ہٹ کر سیدھے ہاتھ کو جانے والی پگڈنڈی پر ہو لیا۔ سامنے ایک اونچی سی پہاڑی کھڑی تھی اور میرا جی اس پر پہنچنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔

مسلسل پانچ گھنٹے سائیکل پر بیٹھے بیٹھے دل اکتا گیا تھا۔ میں شہر سے اپنے گاؤں آ رہا تھا۔ کالج میں تین چار روز کی چھٹیاں تھیں اور موسم کی دلفریبیاں عروج پر۔ میں پنجرہ سے بھاگے ہوئے نو گرفتار پرندے کی طرح اپنے کھیتوں کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ راستے میں ایک جگہ ہلکی سی بارش بھی ہو گئی تھی۔ لیکن میں بجائے کسی درخت کی آڑ لینے کے بارش میں بھیگتا ہی رہا، جیسے مجھ میں اور بارش میں ایک ضد سی ہو گئی ہو .... لیکن بارش کو ہارنا ہی پڑا۔ اور پھر ذرا سی دیر میں پورب کی طرف لہراتی ہوئی قوس قزح نے بارش کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ ہوا کے بدمست جھونکوں نے میرے کپڑے خشک کر دئے۔ تارکول کی بھیگی ہوئی سڑک پر سائیکل کے تیزی سے گھومتے ہوئے پہیوں سے ایک مستقل سر پیدا ہو کر فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ کہیں کہیں سڑک کے کنارے اور کھیتوں کے آس پاس گڑھوں میں بارش کا سرخ گدلا پانی جمع ہو گیا تھا جس میں بمشکل سے ٹوٹتی ہوئی بلبلیں پڑی لوٹ رہی تھیں۔ راستے میں کسی گاؤں سے گزر جاتا تو بھیگے ہوئے گوبر کی بو دماغ میں چھپنے لگتی۔ بھنبھناتے ہوئے کوڑے کو کریدتے ہوئے گاؤں کے غلیظ کتے ایک نظر اٹھا کر میری طرف دیکھ لیتے .... لیکن میں گاؤں کے امر بنوں کے سائے میں پڑے ہوئے جھولوں کو دیکھنے لگتا۔ جھولے کی ہر پینگ کے ساتھ سارا درخت جھوم جاتا اور آم کے پتوں پر ٹھیرا ہوا پانی موٹی موٹی بوندوں کی ایک چادر پھیلا دیتا .... ٹپ ٹپ ٹپ۔ اور پھر ایک لمحہ کے لئے جھولا جھولتی ہوئی گاؤں کی الھڑ دوشیزاؤں کے دبے دبے لیکن پر مستی ساون کے گیت فضا میں منتشر ہو جاتے۔ میرا جی چاہتا اس مسحور کن فضا کو کچھ دیر کے لئے سمیٹ کر اپنے دل میں رکھ لوں .... لیکن اتنی دیر میں میں بہت آگے

بڑھ چکا ہوتا اور اب فضا میں ان گیتوں کی بجائے طوطوں اور میناؤں کا شور اور کوئل کی فریاد پھیل جاتی۔ پر تولتے ہوئے کووں کی قطاریں وقفہ وقفہ سے کائیں کائیں کا ایک غل مچا دیتیں اور مجھے پھر وہ ساون کا گیت یاد آجاتا...... جا رے کاگا پی کے دیس۔

تو میں سائیکل سے اتر کر پیدل اس پہاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ پگڈنڈی کی دونوں جانب جھکی ہوئی جھاڑیوں کے پتے ان پر ٹھیرے ہوئے پانی کے بوجھ سے دبے جا رہے تھے۔ میں ان سے بچتا بچاتا اوپر چڑھے جا رہا تھا۔ کوٹ اتار کر میں نے کندھوں پر ڈال لیا تھا اور پتلون کو پیٹ پر کافی اوپر کھینچ لیا تھا۔ سائیکل کی موجودگی اس چڑھائی میں تکلیف تو بہت دے رہی تھی لیکن پہاڑی پر پہنچنے کی زبردست خواہش کے آگے یہ بے حقیقت تھی۔ بالآخر میں آخری چٹان کے پہلو سے ہوکر ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ گیا۔

سائیکل کو زمین پر لٹاکر میں ایک پتھر پر سیدھا کھڑا ہوگیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے سامنے میلوں تک پھیلی ہوئی کائنات میرے قدموں کے نیچے ہے۔ جیسے درختوں پر منڈلاتے ہوئے یہ ہُد ہُد اور نیل کنٹھ مجھ تک نہ پہنچ سکیں گے، جیسے میں اچک کر سر پر اڑتے ہوئے ان بادلوں کے ٹکڑوں کو پکڑ لوں گا۔ جیسے یہ غیر متناہی آسمان ابھی کچھ دیر میں جھک کر مجھ سے سرگوشیاں کرنے لگے گا....... اور میں ویسے ہی کھڑا رہا۔ مغرب کی طرف غروب آفتاب کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ بادلوں کے کنارے اپنا رنگ بدل رہے تھے اور دور افق تک پھیلے ہوئے سبزے پر سرخی کی کرنیں پھوٹ پڑی تھیں۔ گنجان درختوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی سڑک کسی تصویر میں بنائے ہوئے لہراتے دریا کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ہوا پہاڑی کے خودرو پھولوں کی خوشبو سے بوجھل سی ہو گئی تھی...... میں سوچنے لگا شاید ایسے ہی کسی منظر کو لافانی کرکے خدا نے جنت کی تخلیق کی ہوگی۔ میں نگاہوں کے رستے اس ماحول کو پی جانا چاہتا تھا۔

اور اسی لمحے مجھے اپنے پیچھے سے ایک آواز سنائی دی "شٹر ڈر"۔ میں نے مڑکر دیکھا، لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ کچھ قدم آگے بڑھ کر میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر ایک مرتبہ ویسی ہی آواز آئی اور اب کی دفعہ میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ ایک چرواہی تھی۔ ہاتھ میں ایک لمبی سی درانتی لئے وہ ایک درخت پر چڑھی پتے توڑ رہی تھی۔ میں اس کے قریب چلا گیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ جوانی اور صحت کا ایسا مکمل امتزاج میں نے اسی دن دیکھا تھا۔ وہ سانولے سے رنگ کی ایک الھڑ سی لڑکی تھی، میلے سرخ رنگ کا پیرہن جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ بارش میں بھیگ کر سر کے لمبے لمبے بالوں کی لٹیں چہرے پر ادھر ادھر یوں لٹک رہی تھیں جیسے برگد کی جڑیں۔ کانوں میں پڑی ہوئی بالیاں گردن کے ہر جھٹکے کے ساتھ آپس میں ٹکرا کر ایک لطیف جھنکار پیدا کر دیتیں۔ اس کے چہرے کی سب سے نمایاں چیز اس کی آنکھیں، بڑی بڑی بے چین سی، جیسے کچھ کہنے کے لئے بے تاب ہوں۔ وہ کچھ ایسی حسین نہ تھی لیکن حسن کا دوسرا نام شاید جوانی اور صحت ہی تو ہے...... میں اسے دیکھتا اور قریب چلا گیا۔ درانتی اس کے ہاتھوں میں رک گئی اور اس نے جلدی سے اپنی ننگی بانہہ کو پیرہن کی پھٹی ہوئی آستین کھینچ کر ڈھک لیا۔ وہ درخت پر ایسی جگہ کھڑی ہوئی تھی جہاں اصل تنے سے ایک اور موٹی شاخ پھوٹ نکلی تھی۔ دائیں طرف درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں نے اس کے گرد ایک سبز جال سا بن دیا تھا۔ پس منظر میں نیلے آسمان پر نقرئی کناروں والے سرمئی رنگ کے بادل جھول رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں درانتی تھامے اور دوسرے سے برابر کا ٹہنا پکڑے، گردن اٹھائے وہ یوں کھڑی تھی جیسے کوئی یونانی مجسمہ۔

دفعتاً میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں دوڑتا
ہوا جاکر سائیکل سے اپنا کیمرہ کھول لایا۔ وہ وہیں کھڑی
ہوئی میری ان عجیب حرکتوں کو تک رہی تھی۔ میں نے
اسے خاموش کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور اس کی
تصویر اتار لی۔ اس کی سمجھ میں یہ کچھ نہ آیا۔ وہ درخت
سے نیچے کود آئی اور میرے قریب آکر کیمرہ کو غور سے
دیکھنے لگی۔

" یہ کیمرہ ہے' اس سے تصویر کھینچی جاتی ہے۔"
میں اسے سمجھانے لگا۔

" تصویر!" اور وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ شائد اس کے
ذہن میں گاؤں کے کسی میلے کے سفری فوٹو گرافر کی دکان
گھوم گئی ہوگی۔ وہ اور زیادہ حیرت سے کیمرہ کو گھورنے
لگی۔

" اس سے میں نے تمھاری تصویر اتاری ہے۔" میں نے
کہا۔ "میری تصویر .... مجھ سے کہے بنا کیوں کھینچ لی
تم نے؟" غصہ اور شرم سے اس کے گالوں کی رنگت ایسی
ہی ہوگئی جیسی اس وقت پورب کی طرف آسمان کی ہو رہی
تھی۔ "تو اس میں ہرج کونسا ہے؟" اور میں اس کے
ہاتھوں سے گری ہوئی درانتی لے کر درخت کے پتے توڑنے
لگا۔ اس کی لمبی لمبی پلکیں بڑی تیزی سے حرکت کر رہی
تھیں۔ شائد وہ سوچ رہی تھی "ہاں! اس میں ہرج
کونسا ہے؟"......... اور پھر وہ اپنے میلے اور ننگے
پیروں اور پھرن کے پھٹے ہوئے حصوں کو دیکھنے لگی۔

" مگر میری تصویر کا تم کیا کرو گے؟" اس کا غصہ اور شرم
اب ایک قسم کی دبی ہوئی خوشی میں بدلنے لگے تھے۔

" میں اسے اخبار میں بھیجوں گا۔"

" اخبار"؟

" ہاں۔ تمھاری تصویر چھپے گی، سب لوگ دیکھیں گے'
تمھاری تعریف کریں گے' اور تمھیں انعام ملے گا۔" اس کی پلکوں
کی حرکت اب اور تیز ہوگئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر شائد مسکراہٹ
پھیلنے کی کوشش کر رہی تھی جسے وہ بمشکل روکے ہوئے تھی۔

" مگر تصویر تو میری ہے' انعام تمھیں کیوں ملے گا؟"
میں سٹ پٹا گیا۔ اب اسے کیسے سمجھاؤں کہ یہ یوں ہی
ہوتا ہے۔

" بھئی کھینچی تو میں نے ہے!...... اس لئے
انعام مجھی کو ملے گا۔"

" واہ! یہ بھی کوئی بات ہوئی' تصویر میری اور انعام
تمھیں ملے!"

" دیکھو نا! یہ کیمرہ میرا' اس کے اندر کی فلم میری'
اور پھر محنت کر کے تصویر اتارنے والا بھی میں.......
انعام تو......."

" مگر تصویر کھنچوانے والی میں' میں نہ ہوتی تو
تصویر کس کی اتارتے؟"

" اچھا بھئی۔ انعام ملے گا تو سارے کا سارا تمھیں
لا دوں گا۔"

اور میں ہنس پڑا' وہ بھی ہنس پڑی۔ مجھے ایسا محسوس
ہوا جیسے ماحول کے ذرے ذرے نے ایک قہقہہ لگایا ہے۔

" تم چرواہی ہو؟"

" ہاں"

" تو تمھاری بھیڑیں' بکریاں کہاں ہیں؟"

" انھیں میرا بھائی لیجاتا ہے' میں روز شام کو
تھوڑے سے پتے اکٹھے کر کے بکریوں کے بچوں کے لئے
لیجاتی ہوں۔" اس نے توڑے ہوئے پتے جمع کرتے
ہوئے کہا۔ میں جاکر اپنی سائیکل اٹھا لایا۔

" تمھارا گاؤں کونسا ہے؟" میں نے کیمرہ سائیکل
سے باندھتے ہوئے پوچھا۔

" وہ رہا سامنے' چندر نگر۔"

" تو چلو' میرا راستہ بھی وہیں سے جاتا ہے!"
اور وہ پتوں کا گٹھا سر پر رکھے میرے ساتھ ساتھ
پہاڑی پر سے اترنے لگی۔ ہمارے چلنے سے پگڈنڈی پر

بیٹھے ہوئے جنگل کے کیڑے مکوڑے پھدک پھدک کر برابر کی جھاڑیوں میں چھپتے جا رہے تھے، آسمان کی سرخی اب سیاہی میں بدلنے لگی تھی......

سائیکل کا بریک دبا کر میں نے اتار پر سے اترتے ہوئے اسکو اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر سے میں چرواہی کی طرف دیکھ لیتا۔ میری نظریں اپنی طرف اٹھی ہوئی دیکھ کر وہ اپنی نظریں زمین میں گاڑ دیتی، لیکن جب میں بہت دور افق کے قریب ابھرے ہوئے پہاڑوں کے سلسلے کو دیکھنے لگتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ وہ مجھے گھور رہی ہے۔ کچھ دیر ہم اسی طرح خاموش چلتے رہے۔

"تم نے اپنی تصویر اس سے پہلے بھی کبھی کھنچوائی ہے؟" خاموشی کو توڑتے ہوئے میں نے کہا۔

"اوہوں۔" اور نفی میں اپنا سر بھی ہلا دیا۔

"تو یہ تمھاری پہلی تصویر ہے" جیسے میں نے اپنے آپ سے کہا" اب کی مرتبہ شہر سے آؤں گا تو تمھاری یہ تصویر تمھیں بھی دے جاؤں گا۔"

"ابھی کیوں نہ دیدو؟" اس کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ میں ہنس پڑا۔" ابھی تو اسے بہت دن لگیں گے، شہر جا کر بنانی پڑے گی" لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ اسے اس کا یقین نہ آسکا۔

"شہر میں نوکر ہو؟" بڑی دیر بعد اس نے ایک سوال کیا۔

"نہیں تو—— پڑھتا ہوں بی۔ اے میں۔"

"بی۔ اے؟" اس کا چہرہ ایک سوالیہ نشان بن گیا" یہ بی۔ اے کیا ہوا؟"

"بی۔ اے...... ہُم...... یوں سمجھ جاؤ ...... یہ بی۔ اے ایک کھیت ہے جہاں کی پیداوار دفتروں میں بھیجی جاتی ہے۔"

"دفتر؟!" اور اس وقت وہ پوری کی پوری ایک سوالیہ نشان تھی۔

"ہاں...... آں...... یہ دفتر ایک پتھر ہوتا ہے جہاں آدمی سر پھوڑ پھوڑ کر مر جاتے ہیں۔"

"اپنی خوشی سے؟"

"ہاں۔ اور کیا!"...... لیکن اس کا اطمینان نہ ہو سکا۔

پتوں کا گٹھا اب اس نے سر سے اتار کر کندھے پر رکھ لیا تھا۔ ہم اتنے قریب قریب چل رہے تھے کہ ہوا کے ایک جھونکے سے اس کے بال اڑ کر میرے چہرے پر آگرے۔

"دیکھو تو، تمھارے بال کس قدر ملائم ہیں ریشم کے تار جیسے، مگر تم نے انھیں برباد کر رکھا ہے" اور اس نے اپنے منتشر بال پھر اکٹھے کر لئے "کبھی کنگھی بھی کرتی ہو؟" نہیں، وہ خاموش رہی۔ جواب اس کے بالوں کی حالت سے خود ظاہر تھا۔

اب ہم پہاڑیوں سے اتر آئے تھے۔ ایک کچا راستہ اس کے گاؤں کی طرف جا رہا تھا، میرا ارادہ تھا کہ اس کے گاؤں تک پیدل جاؤں، وہاں سے بائیں ہاتھ کو مڑ کر پھر سڑک پر ہو لوں گا۔

چلتے چلتے دفعتاً ایک خیال میرے ذہن میں آگیا۔ اس کی طرف مڑ کر کہنے لگا۔" آؤ تمھیں سائیکل کی سیر کرا دوں!" وہ کچھ بدحواس سی ہو گئی۔ کوئی جواب بن نہ پڑا۔ دل میں تو چاہتی ہوگی مگر ظاہرا کیسے کہتی، ...... "اوہوں۔ گاؤں کا کوئی آدمی دیکھ لے گا...... تو......" "لیکن میں تمھیں گاؤں شروع ہونے سے پہلے ہی اتار دوں گا...... آؤ ...... آؤ......"

اور میں نے اسے کچھ اور کہنے یا سوچنے کا موقعہ ہی نہ دیا۔ سہارا دے کر اس کو آگے ڈنڈے پر بٹھا لیا۔ پتوں کا گٹھا اس نے آگے ہینڈل پر رکھ دیا۔ اتنی دیر سستانے سے نئی طاقت آگئی تھی، پورے زور سے

سائیکل چلانے لگا۔

سڑک بہت خراب حالت میں تھی اس لئے بار بار سائیکل اچک جاتی اور اس کا سر میرے سینے سے آ ٹکراتا۔ اس کے نرم نرم بال چہرے پر پھیل کر گدگدی سی کرنے لگتے۔ اور ساتھ ہی وہ اور سکڑ جاتی۔ ایک جگہ سڑک کچھ ہموار تھی۔ میں نے سائیکل پوری رفتار سے چلا دی۔ سامنے سے آتے ہوئے ہوا کے زور کے جھونکوں کی وجہ سے شائد اس کے پیٹ میں گدگدی ہو رہی تھی، اس کی ہر منٹ کی بے چینی سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بڑی مشکل سے ہنسی کو روکے ہوئے ہے۔ بالآخر تھک ہار کر بولی۔

"بس، بس۔ اب روکو بھی ...... میرے گدگدیاں ہو رہی ہیں" ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے بدن کا سارا خون اس کے چہرے پر جمع ہو گیا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے ہینڈل کو مضبوطی سے پکڑے وہ کہے جا رہی تھی" میں ...... ارے ارے مجھے ہول آ رہا ہے ...... مجھے اتار دو ...... مجھے "

لیکن میں نے رفتار اور بڑھا دی۔

" اوہ ...... روکو، روکو ...... نہیں تو میں کود جاؤں گی!" اس کی بے چینی اب بہت بڑھ گئی تھی" ہائیں ...... خبردار، کودنا مت، ورنہ ہاتھ پیر ٹوٹ جائے گا"

لیکن اب اس کی حالت قابل رحم ہو گئی تھی۔ میں نے سائیکل روک لی۔ وہ کود کر نیچے اتر آئی۔ ایک دفعہ آنکھوں کے کونوں سے میری طرف جھانک کر دیکھا ...... ان ہی بے چین نظروں سے ...... اور پھر ایک دم ہنس پڑی، معلوم نہیں کیوں!

اس کا گاؤں اب بہت قریب آ گیا تھا۔ میں نے کوٹ کا کالر وغیرہ درست کر لیا۔ اور اس پر ایک آخری نظر ڈال کر سائیکل آگے بڑھا دی۔ وہ ایک درخت کے نیچے گٹھا زمین پر ڈالے میری طرف گھور رہی تھی، وہی بڑی بڑی آنکھیں اب بھی کچھ کہہ رہی تھیں ...... جانے کیا!

کچھ دور جا کر میں نے مڑ کر دیکھا، وہ وہیں کھڑی اب تک مجھے گھور رہی تھی، میں آگے بڑھ گیا۔ پھر ایک مرتبہ پلٹ کر دیکھا، وہ اسی طرح کھڑی تھی، پھر ایک مرتبہ میں نے مڑ کر دیکھا، اور پھر ایک مرتبہ اور ...... اور وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ لیکن میرے پیر پیڈل پر حلقے بناتے ہوئے اور ہم میں فاصلہ بڑھتا رہا۔ کئی بار دل نے کہا کہ ایک دفعہ واپس چلو۔ لیکن میں آگے بڑھتا ہی گیا۔ حتیٰ کہ ایک موڑ پر وہ نظروں سے غائب ہو گئی۔ اور پھر میں تیزی سے سائیکل چلانے لگا۔ سات میل منٹوں میں طے کر کے میں اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ لیکن راستے بھر مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے دو بڑی بڑی اور مضطرب سی آنکھیں میرا تعاقب کرتی رہی ہیں، جیسے وہ آنکھیں کچھ کہتی رہی ہیں، اور جیسے میں ان نظروں کی پہنچ سے باہر نکل سکوں گا ......

ور پھر دو دن بعد جب میں واپس شہر جا رہا تھا تو خیدر نگر کے قریب سڑک سے ہٹ کر میں نیچے رستے پر ہو لیا ...... ہاں غیر اختیاری طور پر ہی! چاہتا تھا سیدھا اپنے رستے پر چلا جاؤں لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ صبح کے کوئی سات یا آٹھ بجے کا وقت تھا، میں گاؤں کے بالکل قریب سے گزر رہا تھا۔ کوئی تیس چالیس جھونپڑوں کا معمولی سا گاؤں تھا۔ جھونپڑیاں پار کر کے میں دوسرے کنارے پر پہنچ گیا لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔ مایوس ہو کر میں دائیں جانب پہاڑی کی طرف مڑنے ہی لگا تھا کہ وہ نظر آ گئی۔ وہ سامنے کھیتوں کی طرف سے آ رہی تھی۔ آگے آگے بکری کے دو سفید بچے کلیلیں کرتے دوڑے آ رہے تھے ...... اس وقت وہ ایک زرد رنگ کی پھرن پہنے ہوئے تھی جو پہلے پھرن سے ذرا اچھی حالت میں تھی، اور اس کے سر کے بال، ادھر ادھر اڑنے کی بجائے ایک جگہ مضبوطی سے بندھے

ہوئے تھے۔ شانوں میں تیل ڈال کر کنگھی بھی کی گئی تھی۔

.... وہ اس وقت بڑی خوش نظر آ رہی تھی اور بکری کے دونوں بچوں کے پیچھے انہی کی طرح قلانچیں مارتی ہوئی میری طرف چلی آ رہی تھی۔

لیکن میں ایک عجیب سے نامعلوم جذبے کے تحت ایک جھاڑی کی آڑ میں ہو گیا، میں نے ایسا کیوں کیا؟ یہ خود مجھے بھی نہیں معلوم۔ لیکن وہ میرے پاس سے گزری چلی گئی اور میں سائیکل تھامے جھاڑی کے پیچھے کھڑا رہا۔ وہی بے چین آنکھیں اب بھی کچھ کہہ رہی تھیں، .... شاید۔ لیکن میں انہیں اسوقت اچھی طرح نہ دیکھ سکا تھا.........

اس کے بعد میں چلا گیا۔ پہاڑی کے دامن سے، کھیتوں کے بیچ میں سے، دیہاتوں کے سامنے سے اور باغوں کے کنارے سے، جہاں کہیں سے بھی میں گزرا ایک سوال برابر میرے ذہن میں گھومتا رہا ....

اس نے وہ بال کیوں گوندھ رکھے تھے؟ ....

کیا......... کیا.........

لیکن میں یہاں آ کر رک جاتا اور پھر شروع سے سوچنے لگتا۔

شہر پہنچا تو کچھ دن اور اسی سوال کو دہراتا رہا۔

پھر رفتہ رفتہ میں اس واقعہ کو بھول گیا، اس سفر کو بھول گیا، اس پہاڑی کو بھول گیا، اس چرواہی کو بھول گیا......... وہ سوال بھی میرے ذہن میں جانے کہاں وقف ہو گیا! .... بی اے کا امتحان دیکر جب میں لاری میں اپنے گاؤں جا رہا تھا تو چندر نگر کے قریب سے بھی گزرا تھا۔ لیکن میں سب کچھ بھول چکا تھا۔ مجھے یاد ہے، لاری میں اپنے کسی دوست کے ساتھ باتوں میں میں ایسا محو تھا کہ مجھے یہ بھی خبر نہ رہی کب چندر نگر آیا اور کب گزر گیا......... اور پھر ہر بار ایسا ہی ہوتا رہا۔

ہاں، وہ تصویر میں نے دھلوا کر اپنے البم میں لگوائی تھی جو آج تک ویسی ہی پڑی ہے۔ آج برسوں کے بعد اپنا البم دیکھ رہا تھا کہ اچانک نظروں کے سامنے وہ تصویر آ گئی اور میرے ذہن کے سارے تار جیسے کسی نے جھنجھوڑ ڈالے اس واقعہ کی یاد ذہن کی سب سے نچلی تہہ سے ابھر آئی اور پھر میں البم کا وہ صفحہ نہ الٹ سکا.........

جانے وہ اب کہاں ہو؟ کیسی ہو؟ .... شاید اب پھر اس کے بال بکھر گئے ہوں اور شاید اس کی وہ بے چین آنکھیں اب بے چین نہ رہی ہوں، شاید اب وہ کچھ نہ کہتی ہوں .... یا شاید اب بھی وہ کچھ کہتی ہوں......... کون جانے!

جی۔ جیلانی

محبت کی چھاؤں :- مرزا اظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ہر فسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کارفرما ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی یہ تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔ اس کا حسین و جمیل سرورق دیکھتے ہی اس کتاب کے بیباک اسلوب اور اس کے افسانوں کے بے پناہ شوخی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد عہ

ایک سوال

زمیں کے تاریک گہرے سینے میں پھینک دو اس کا جسمِ خاکی!
یہ بیگوں نرم نرم کرنیں
جو ماہ و انجم سے پھوٹتی ہیں
یہ نیلگوں آسماں کی دنیا
یہ شرق اور غرب کے کنارے
یہ میوہ ہائے لذیذ و شیریں
یہ حسنِ بے نام کے اشارے
کبھی نہ اس کو جگا سکیں گے!
جوان و دلکش حسین چہرے سے، چھین لی غم نے تابناکی!
کھلی ہوئی بد نصیب آنکھیں
یہ دیکھتی تھیں کہ آدمی نے
اک اپنے ہی جیسے آدمی پر
تمام دروازے بند کر کے
بہیمیت کو جگا دیا ہے!
لذیذ انبار نعمتوں کے
سیاہ پردوں میں دب گئے ہیں
اور آخرش راندۂ جہاں سے، زمیں کی آغوش نے وفا کی!
اسی لئے کیا اُگا کریں گے
یہ نرم پودے یہ نرم شاخیں
کہ ان کو اک روز ہم اٹھا کر
خزاں کی آغوش میں سلا دیں؟

اختر الایمان

محبت کی جیت

عزیز احمد بیرسٹر کی کوٹھی میں غیر معمولی چہل پہل ہے کیونکہ ان کے ہاں چائے پر کچھ مہمان مدعو ہیں اور یہ پارٹی شفیق احمد کو لندن سے واپسی کی خوشی میں دی جا رہی ہے۔ کوٹھی کو خوب سجایا گیا ہے۔

ڈرائنگ روم میں ایک نوجوان نیلے سوٹ میں ملبوس بے چینی سے کسی کا منتظر ہے۔ کھلتا ہوا رنگ کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں ایک صوفے پر دراز کچھ ایسی بے التفاتی سے اخبار پڑھ رہا ہے کہ گویا وقت گزارنے کی ناکام کوشش میں ہے۔ ریڈیو لگا ہوا ہے لیکن شفیق ہر بار چہرے پر سے اخبار ہٹا کر ہر آہٹ کو بغور سنتا ہے۔ بے چینی کا یہ عالم ہے کہ سگریٹ پر سگریٹ سلگاتا ہے لیکن اس کو یہ بھی خبر نہیں کہ آیا وہ اس کو پی بھی رہا ہے یا یونہی جلائے جا رہا ہے۔

اتنے میں ایک اور نوجوان (جو گفتگو سے شفیق کا بے تکلف دوست معلوم ہوتا ہے) داخل ہوتا ہے۔ اسوقت ریڈیو پر یہ گیت گایا جا رہا تھا

"ایک ندی کے دو کنارے ملنے سے مجبور"

شفیق اسی گیت کے سننے میں کچھ ایسا محو تھا کہ شاہد کے داخل ہونے کی اس کو خبر تک نہ ہوئی۔ شاہد نے اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "کہو یار" شفیق گویا کسی گہرے خواب سے چونک پڑا اور شاہد سے بڑے تپاک سے مصافحہ کیا۔ نہیں بھئی کوئی خاص بات نہیں بس یونہی تمہارے انتظار میں.....

شاہد نے بات کاٹ کر کہا میرے انتظار میں یا کسی اور کے۔ نہیں شاہد تمہارا ہی انتظار تھا۔ شفیق نے کہا۔ ارے تو یہ نعیم۔ طاہر۔ انور کا تو اب تک پتہ نہیں۔ یہ ہندوستانی بھی بڑے وعدے کے پابند ہوتے ہیں!

شفیق نے منتظر نگاہوں سے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شاہد۔ تو کیا تم ہندوستانی نہیں ہو جو ہندوستانیوں پر طنز کرتے ہو۔ انگلستان کا کیا چکر لگا آئے ہو بس گویا اپنے آپ کو بھی یوروپین تصور کرنے لگے۔ واللہ شفیق مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ خدا کرے تمہارے خیالات بالکل ہی نہ بدل گئے ہوں۔ ورنہ کسی کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔

شفیق نے بے چینی سے کہا "نہیں نہیں شاہد! تم کو غلط فہمی ہوئی میرے خیالات وہی ہیں جو آج سے چھ سال قبل تھے۔ لیکن شاید مجھے اب اپنے خیالات تبدیل کرنے پڑیں۔"

"کیوں خیر تو ہے آج تم کچھ ایسی ویسی باتیں کر رہے ہو" شاہد نے کہا۔ خیر چھوڑو بھی اس جھگڑے کو اب انور۔ نعیم وغیرہ کو میرے خیال میں فون کرنا پڑے گا کہ آیا وہ آ رہے ہیں یا نہیں" شفیق نے بات کا پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ شاہد۔ ارے یار دیکھو فون کرنے کی زحمت کیوں گوارا کرتے ہو۔ وہ رہے انور، نعیم وغیرہ۔

شفیق اور شاہد بڑھ کر سب کو یکے بعد دیگرے لاتے ہیں۔ شفیق سے تو ہر ایک بطور خاص ملاقات کر رہا ہے۔ کیونکہ آج کی دعوت کا مرکز ہی وہی تھا۔ یہی گفتگو اور چائے سے فارغ ہو کر تمام دوست کچھ خوش گپیوں کے بعد رخصت ہو گئے۔ اس طرح سات بجتے بجتے شفیق اور شاہد تنہا رہ گئے۔ لیکن شاہد موقع کی تلاش میں تھا کہ شفیق کی رنجیدگی کا حال کسی طرح معلوم کرے۔ چنانچہ شاہد اپنی جگہ سے اٹھ کر شفیق کے بازو بیٹھ گیا اور بے تکلفی سے گلے میں باہیں ڈال کر پوچھا کہ "بھیا شفیق آج تو تمھیں اپنی غائب دماغی یا رنجیدگی کا اصل واقعہ سنانا ہوگا۔ تمہاری کوئی بات مجھ سے تو پوشیدہ نہیں واللہ تم کو یہاں سے اٹھنے نہ دوں گا جب تک کہ سارا حال نہ کہہ ڈالو" شفیق نے کہا "شاہد مجھے خود تم سے مشورہ لینا ہے۔ اس وقت میری جان عجیب

مشکل میں ہے۔ تم کو معلوم ہی ہے کہ میں انگلستان جانے
سے پہلے کیسے خیالات رکھتا تھا اور وہاں کے قیام کے
زمانے میں بھی جو امیدوں کے شجر لگائے تھے اور جن کی
آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی تھی، خزاں کی نذر ہوتے
معلوم ہو رہے ہیں۔ میری بدقسمتی تو دیکھو کہ میرے
انگلستان پہنچنے کے چند روز بعد ہی ابا جان اس جہانِ
فانی سے کوچ کر گئے۔ اب رہیں امی تو ان بیچاری
کا حال غم کی وجہ سے پہلے ہی سے ابتر ہے "اس پر مرے پر
سو درے" کے مصداق چچی صاحبہ کی پوشیدہ
کارروائیاں ان کے لئے سوہانِ روح ثابت ہو رہی
ہیں۔

شاہد (بات کاٹ کر)۔ "تمھاری چچی صاحبہ کو تو
ایسے وقت میں تمھاری والدہ صاحبہ سے اور بھی زیادہ
ہمدردی اور غمگساری کرنی چاہیے تھی۔"

شفیق نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے
کہا۔ "ہاں شاہد تمھارا کہنا بالکل ٹھیک ہے لیکن
ان کو ظاہرا کوئی تکلیف نہیں۔ لیکن تم کو یاد ہوگا کہ
میرے انگلستان جانے سے قبل چچا صاحب نے اپنی
اکلوتی لڑکی شمیمہ کو مجھ سے منسوب کر دیا تھا۔ اور
ابا مرحوم سے وعدہ بھی کر چکے تھے۔ اور یوں بھی مجھے بچپن سے
نہ جانے کیوں اس لڑکی سے کچھ انس سا ہے۔ لیکن
اب جب کہ ابا جان نے رحلت فرمائی چچی صاحبہ کے
خیالات بالکل بدل گئے ہیں۔ وہ یہ چاہتی ہیں کہ
شمیمہ غیر گھر میں بیاہ دی جائے اور وہ ہیں مسٹر
ماجد"۔ شاہد نے کہا۔ "کیا تمھارا مطلب اکبر حسین
جاگیردار کے لڑکے سے ہے۔"

"شفیق۔ ہاں۔ سنا ہے کہ ان کے ہاں بڑی
جاگیریں ہیں۔ ابا مرحوم کی ساری جائداد کے تو چچا
ہی مالک ہوں گے۔ کچھ حصہ ہمیں بھی مل جائے گا۔
لیکن ماجد کی تو پوری جائداد اس طرح ان کے ہاتھ
لگ جائے گی۔" شاہد نے کہا۔ "میرے خیال میں ان کو
تم سے بہتر اور صالح لڑکا ملنا دشوار ہے۔" شفیق بولا۔
"تمھارے خیالات کا دوسروں سے متفق ہونا دشوار ہے۔"

شاہد۔ "شفیق دشوار نہیں بلکہ ضروری ہے کیونکہ
سب کی رائے تمھارے متعلق اچھی ہے۔ بلکہ تمھارا انگلستان
جانا سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ اگر چچی جان تم کو کھو دیں گی تو
سمجھ لو کہ انھوں نے دنیا کی انمول شے کھو دی۔ شاید
وہ یہ نہیں جانتیں کہ "ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔"

شفیق بولا۔ "ہاں تو شاہد میں کیا کہہ رہا تھا کہ
میرے لئے گھر میں کوئی دلچسپی سوائے امی کے باقی
نہیں رہی۔ البتہ شمیمہ کا وہی طرز اور اطوار اب بھی
بدستور ہے کیونکہ اس کو اس تبدیلی کا علم ہی نہیں۔
مجھے یہ لڑکی فرشتہ صفت معلوم ہوتی ہے۔ اس
کی آنکھوں میں نہ جانے کیوں میرے لئے محبت کھیلتی
رہتی ہے۔ اس کی ہر حرکت سے یہ معلوم ہوتا ہے
کہ وہ میری واپسی پر بہت خوش ہے۔ لیکن بیچاری
معصوم کو ان جھگڑوں سے کیا سروکار۔ کل میں نے
ان حالات کا اس سے ذکر کیا تو وہ بہت پریشان ہوئی۔
اور اس وقت سے ہر لحظہ رنجیدگی اس کے معصوم چہرہ کا
طواف کر رہی ہے۔ اس کا پھول سا چہرہ کملا گیا ہے۔
امی جان نے اب تک اس کے کانوں کان خبر نہ کی
تھی۔ آخر میرا اور اس کا معاملہ تھا میں نے کل
ڈرتے ڈرتے اس ذکر کو چھیڑ ہی دیا۔ وہ اتنا سنتے
ہی اس قدر متاثر ہوئی کہ بس طبیعت بگڑی بخار
ہی چڑھ آیا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ اس صورت میں میں
کیا کر سکتا ہوں۔

"تم کو اپنے چچا صاحب کی رائے بھی معلوم
کر لینی چاہیے تھی۔"

شاہد نے کہا۔ اور اگر تم مناسب سمجھو تو شمیمہ
کے خیالات بھی ماجد کے متعلق دریافت کر لینا۔

شفیق۔ ارے بھئی چچا ابا کو تو پوچھئے مت چچی جان نے ان کو کٹ پتلی بنا رکھا ہے۔ وہ تو ہر بار یہی کہتے ہیں کہ میں اپنے بھائی کی واحد یادگار کو کسی صورت جدا نہ کروں گا۔ اور اپنا وعدہ پورا کروں گا۔ شاہد نے کہا "اماں پھر تمہیں ڈر کس بات کا ہے۔"

شفیق۔ سنو آج ہی صبح چچا صاحب نے مجھ کو بلا کر کہہ دیا کہ "میں نے تمہاری چچی سے اس معاملہ میں لاکھ تمہاری طرف داری کرنی چاہی لیکن افسوس کہ تمہاری چچی کسی طرح راضی نہیں ہوتیں۔ میں مجبور ہوگیا۔" اور اب تو ماجد سے بات چیت پکی بھی ہو چکی ہے۔

شاہد۔ شمیمہ اگر ناراض ہو بھی تو کیا یہ کام ہو سکتا ہے۔ شفیق۔ کیوں نہیں۔ بلکہ اس کو مجبور کیا جائے گا۔ اس بیچاری کی کون سنتا ہے۔ تم شمیمہ سے پھر ایک بار مل کر اس بات کی ترغیب دلاؤ کہ وہ انکار کردے۔ اسی میں تم دونوں کی بہتری ہے۔

شفیق۔ مجھے یقین ہے کہ شمیمہ جیسی اعلیٰ ظرف اور شریف لڑکی اس بات کو گوارا نہ کرے گی۔ اگر وہ انکار کرے تو ہندوستان کے سماجی قانون کے لحاظ سے اس کے لباس معصومیت پر دھبہ سا لگ جاتا ہے۔ گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ ملازم نے آکر کہا کہ "حضور بڑی بیگم صاحبہ آپ کا کھانے پر انتظار کر رہی ہیں اور آپ کو یاد فرماتی ہیں۔"

شفیق شاہد سے رخصت ہو کر اندر آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ میز پر سوائے اس کی والدہ کے کوئی نہیں۔ شفیق نے پوچھا "امی سب کہاں ہیں اور شمیمہ......" "بیٹا آج صبح سے شمیمہ کمرے سے باہر نہیں نکلی اس کی طبیعت ناساز ہے بخار کچھ تیز ہوگیا ہے۔ اس لئے تمہاری چچی جان شائد وہیں ہوں۔ میں بھی ابھی ابھی تمہارے کھانے کے انتظام کے لئے آگئی۔" "امی آپ میرے کھانے کی فکر نہ کیجئے میں کچھ دیر ٹھیر کر کھا لوں گا ابھی مجھے کپڑے بھی تو تبدیل کرنے ہیں۔ آپ شمیمہ کے پاس جائیے، اگر ڈاکٹر کی ضرورت ہو تو اطلاع دیجئے۔" "بیٹا وہ تم کو صبح سے یاد بھی کر رہی تھی۔ اگر تم ہی ہو آؤ تو بہتر ہے۔" "اچھا امی جان آپ کا حکم ہو تو میں جاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر شفیق شمیمہ کے کمرے میں آتا ہے ایک آراستہ کمرے میں ایک حسین دوشیزہ جس کی عمر ۱۵۔۱۶ کے لگ بھگ ہے، مسہری پر آنکھیں بند کئے لیٹی ہے، بال پریشان ہیں۔ دوپٹہ شانوں سے ڈھلک کر آگیا ہے۔ سرخ و سفید رنگ۔ شربتی آنکھیں۔ الجھی ہوئی زلفیں اس کی پیشانی پر اس طرح بکھری ہوئی ہیں گویا وہ اس کے معصوم چہرے کی بلائیں لے رہی ہیں۔ پائینتی کریمن بیٹھی کچھ باتیں کر رہی ہے۔

"شمیمہ کیا ہم اندر آسکتے ہیں۔" شفیق بولا۔

شمیمہ (جیسے کسی سہانے خواب سے بیدار ہوئی ہے اپنی شربتی آنکھیں کھول کر) "آئیے شفیق بھیا۔ مجھے آپ کا بہت انتظار تھا۔" "ارے شمیمہ تم نے دو روز میں اپنی یہ کیا حالت بنالی ہے۔" کریمن نے کہا "چھوٹے میاں۔ دیکھئے ہم ڈیڑھ گھنٹے سے بی بی کو دوا پلانے کی کوشش کر کے تھک گئے۔ آخر کو چھوٹی بیگم صاحبہ تو کسی کام سے اوپر چلی گئیں۔ بھلا میری تو کیا سنتے۔ ذرا آپ ان کو سمجھائیے۔"

"اچھا کریمن تم ہٹ جاؤ۔ اب ہم کوشش کرتے ہیں دیکھیں شمیمہ کیسے نہیں مانتی۔" شفیق نے آرام کرسی مسہری کے قریب کرلی۔ "شمیمہ دیکھو بھئی اگر تم نے دوا نہ پی تو ہم تمہارے کمرے میں نہ آئیں گے۔ ہر بار کی ضد اچھی نہیں۔ تم دوا پیئو گی تو جلد اچھی ہو جاؤ گی۔ پھر تم کو ہماری لائی ہوئی دلچسپ کتابیں پڑھنے کا موقع ملے گا۔ دیکھو نا تم تو پوری مریضہ معلوم ہو رہی ہو۔"

شمیمہ (گھبرا کر) "شفیق بھیا میں دوا پیئے لیتی ہوں

خدارا آپ یہاں آنا نہ چھوڑیئے۔" پھر جلدی پی بھی لو۔ ورنہ ہم چلے۔"

شفیق نے شمیمہ کو سہارا دے کر دوا خود پلائی۔ شمیمہ بولی بھیا جب کبھی آپ میرے کمرے میں آجاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہے۔ دو تین روز سے تو عجیب ہی کش مکش میں مبتلا تھی۔ لیکن آج آپ کے درشن ہوتے ہی ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ساری الجھنیں دور ہو گئیں۔

"ہاں شمو یہ ٹھیک ہے لیکن جہاں تم میرا اتنا خیال رکھتی ہو وہاں ایک اور بات مان لو تو ہم سب باتوں کو ٹھیک جانیں۔" شمیمہ نے بے چینی سے کہا "بھیا بتائیے تو وہ کیا بات ہے کیا میں نے کبھی آپ کی بات ٹالی ہے۔" "وہ یہ کہ تم اپنی حالت بہت جلد درست کر لو۔ اور ہاں یہ تم نے کالج جانا کیوں چھوڑ دیا۔" شفیق نے سوال کیا۔

"کیا کہوں بھیا میرا دل کالج میں بالکل نہیں لگتا۔ صبیحہ۔ دلشاد۔ کملا بھی مجھ سے یہی کہتی ہیں۔" شمیمہ نے معصومانہ انداز سے کہا۔ "کل سے تم کالج جایا کرو تمام بیماری دفع ہو جائے گی اور ہماری شمو صحت مند ہو جائے گی۔" شمیمہ نے کچھ سوچ کر کہا "تو اب مجھے صحت مند ہو کر کیا کرنا ہے بھیا؟"۔

شفیق نے جذبات کو ضبط کرتے ہوئے کہا "وہ بیچارہ ماجد تو روز و شب تمھاری صحت کے لئے دست بدعا ہو گا نہ جانے کتنی منتیں مان رکھی ہوں۔"

شمیمہ "شفو بھیا! آپ ہرگز اس کا نام زبان پر نہ لائیے۔ وہی تو میری بیماری کا سبب بنا ہوا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ بھی اس کا نام زبان پر لانا نہیں چاہتے لیکن آج پھر کیوں اس کا ذکر چھیڑا۔"

شفیق نے کہا۔ "شمو اب تو تم کو اسی کے ساتھ زندگی ...." الفاظ گلے میں اٹک کر رہ گئے۔ گلوگیر آواز میں ...... "تم کو زندگی اسی کے ساتھ گزارنا ہے۔ اب تمھیں ہم کو بھلانے کی کوشش کرنی چاہیے۔" شمیمہ نے کہا "میں نے جو تہیہ کر لیا ہے وہ پورا ہی کروں گی۔ اور انشاء اللہ اپنے منصوبے پر مضبوطی سے قائم رہوں گی۔"

"اری شمو کیا تم بھی اب مضبوط منصوبے باندھنے لگی ہو۔ کیا تم وہی الھڑ لڑکی ہو جو بارہا کاغذ کی ناؤ بنا کر پھر خود ہی پھاڑ دیتی تھیں اور ریت کے گھروندے بنا کر اپنی ایک ٹھوکر سے پھر اس کو برباد کر دیتی تھیں۔ تم میں اتنی قوت کیسے پیدا ہو گئی۔"

شمیمہ۔ "ہاں بھیا منصوبے باندھنا آپ کی کل کی گفتگو نے سکھایا اور آپ کی محبت نے اس میں مضبوطی پیدا کر دی۔ گھروندوں اور ناؤ کا معاملہ عارضی کھیل تھا لیکن یہ معاملہ میری دائمی زندگی کا کھیل ہے۔ تمھیں یہ بھی تو یاد ہو گا کہ پھر آپ میری ناؤ کو جوڑ بھی دیتے اور گھروندے کو دوبارہ بنا دیا کرتے تھے۔"

"وہ زمانہ اور تھا شمو، دنیا کو ایک پہلو قرار نہیں۔"

شمیمہ نے معصوم انداز سے کہا۔ "معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ قدرت ہم سے کھیل رہی ہے۔"

شفیق۔ "ہماری زندگی قدرت کے ہاتھ کا کھلونا ہے۔" یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ نازو۔ انور (شمیمہ کی ماموں زاد بہنیں) آگئیں۔ ان کی تتلی باتوں سے شمیمہ اور شفیق بڑی دیر تک ہنستے رہتے۔ انور کی تو چھوباجی کہتے زبان نہ سوکھتی تھی۔ (اتنے میں شمیمہ کی والدہ انور کو ڈھونڈتی ہوئی آتی ہیں) "ارے انور چل میں تجھے ڈھونڈتے ہوئے کب سے مارے مارے پھر رہی ہوں۔ چھوباجی کی طبیعت ٹھیک نہیں انھیں آرام کرنے دے۔" شمیمہ نے کہا "امی اسے رہنے دیجئے اس کی باتیں ایسی پیاری ہیں کہ میرا دل بہل جاتا ہے۔" "بیٹی تمھیں حرارت تھی نا

آرام کرو۔" (ماتھے پر ہاتھ رکھ کر) خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بخار اتر گیا اب تو خوشی کے دن نزدیک ہی معلوم ہوتے ہیں۔ بیٹے شفو تم کھڑے کیوں ہو بیٹھ جاؤ نا۔ میں جاتی ہوں۔ شمیمہ کی ماں کیا آئیں ان دونوں کی خوشیوں کو اپنے ایک فقرے کے ساتھ بہالے گئیں۔ دس بج رہے تھے۔ شفیق بہت کچھ تسلی دیکر شمیمہ سے رخصت ہوا۔

جوں ہی شمیمہ کو صحت ہوئی اس کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ آخر وہ دن بھی آگیا جب کہ شمیمہ کو مانجھے بٹھایا جانے والا تھا۔ شفیق کی ماں نے لاکھ وعدے یاد دلائے لیکن سب بے سود ثابت ہوئے۔ آج پھر "عشرت منزل" میں چہل پہل ہے اور کوٹھی کو سجا کر دلہن بنادیا گیا ہے۔ شفیق سب کچھ دیکھ رہا ہے لیکن زبان نہیں ہلا سکتا۔

شمیمہ زرد لباس میں ملبوس اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ ماں کو بڑی آرزو تھی کیونکہ شمیمہ اکلوتی لڑکی تھی۔ مال و دولت کی کمی نہ تھی۔ گیارہ دن کے لئے مانجھے بٹھایا گیا کہ دل کے ارمان نکلیں۔ شفیق اور شمیمہ کی تمنائیں آخری ہچکیاں لیتی معلوم ہو رہی تھیں۔

ریڈیو دھیما چل رہا ہے لیکن شمیمہ کسی خیال میں گم بت بنی بیٹھی ہے۔ اتنے میں پیچھے سے کسی کے چاپ کی آواز آتی ہے اور ساتھ ہی شفیق کی رنج و اندوہ میں ڈوبی ہوئی آواز "شمو کیا ہم اندر آسکتے ہیں" شمیمہ (چونک کر) ارے شفو...... الفاظ گلے میں اٹک گئے (پھر کچھ سنبھل کر) آئیے آنکھیں آپ کا انتظار دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں۔ پانچ چھ دن سے آپ کی صورت کو ترس گئی۔

شفیق میں ضرور آتا۔ پہلے تو یہ کہ تم کو مہمانوں سے کب چھٹکارا ملتا ہے۔ دوسری چیز یہ کہ اب تم کو اس چیز کا عادی بھی بننا ہے۔ اسی خیال سے ادھر نہیں آیا ورنہ کوئی بات نہ تھی۔ اتنا سنتے ہی شمیمہ کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

شفیق۔ اری شمو تم یہ کیا کہہ رہی ہو۔ دیکھو تمھارے سرخ گال دو روز میں تمھارے کپڑوں کی طرح زرد پڑ گئے ہیں۔ اور تمھاری اداس صورت کسی غیر معمولی واقعہ کا پتہ دے رہی ہے کم از کم دنیا والوں کو دکھانے کے لئے اپنی حالت سنبھالو ورنہ بدنام ہو جاؤں گی۔

شمیمہ یہ سب کچھ جو دنیا کے لئے برداشت کر رہی ہوں کیا یہ کچھ کم ہے جو آپ اس میں اضافہ چاہتے ہیں۔

شفیق۔ اچھی شمو تم کو رنج ضرور ہوگا لیکن نئے گھر میں اپنے جیون ساتھی اور اپنے ناز برداروں میں رہ کر کبھی نہ کبھی تمھارا غم غلط ہو جائے گا لیکن کیا میری حالت تم سے زیادہ قابل رحم نہیں ہے کہ ابا کو سدھار کر ابھی ایک برس بھی نہ گزرا تھا کہ دوسرا جانکاہ حادثہ پیش آیا۔ لیکن دیکھو قہر درویش بر جان درویش سب سہار رہا ہوں۔ جانتی ہو کس کی خاطر۔ تم کو چاہیئے کہ صبر کرنے میں میرا ساتھ دو۔ تم کو ایک جیون ساتھی مل رہا ہے۔ میرا جیون ساتھی بھی تم نے مہیا کر دیا۔ یہی احسان کیا کم ہے۔ عین اسی وقت ریڈیو پر یہ ریکارڈ بج رہا تھا۔

" تو نے دیا ہے غم مجھے اس لئے غم سے پیار ہے "

سنتی ہو شمو "غم" میرا جیون ساتھی ہے جس طرح میں اپنے اس ساتھی کے سامنے سر تسلیم خم کروں گا اسی طرح تم کو اپنے جیون ساتھی ماجد کے آگے...... ..

اس دوران میں شمیمہ روتے ہی گئی اور شفیق کی آنکھیں بھی پرنم ہو گئیں۔ شمو تم کو میری قسم آنسو نہ بہانا .... کیا تم اپنے شفو کی ایک اور آخری بات نہ مانوگی۔ وہ یہ کہ آج جو کچھ بھی تھوڑا

وقت ملا ہے اس کو اچھی طرح گزار دو۔ اور مجھ سے وعدہ کرو کہ تم مجھ کو بھلانے کی کوشش کرو گی۔

"لیکن میں اس میں شائد ناکام رہوں گی"

شمیمہ نے کہا۔ تم کو اپنی زندگی کامیاب بنانے کے لئے اس کے ہر پہلو کو کامیاب بنانا پڑے گا۔ اور تم ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کرنا، شمیمہ "حکم تو بہت سخت ہے لیکن چونکہ آپ نے بھی جان کی بازی لگا دی ہے اس طرح اگر مجھ کو بھی اسی قیمت پر وہ شئے حاصل ہوتی ہو تو مجھے کوئی دریغ نہیں۔

شفیق (پریشان ہو کر) نہیں نہیں شمو میرا مطلب یہ نہ تھا کہ تم جان ہاتھ دھو دو بلکہ تمہاری زندگی اور تمہاری خوشی میری خوشی اور تمہارا دکھ میرا دکھ ہوگا۔

شمیمہ۔ شفو بھیا آج آخری موقع ہے۔ شمو سے آپ کو کوئی شکایت باقی نہ رہ جائے کہیئے اور کیا حکم ہے۔

شفیق۔ شمو بس یہی کافی ہے۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اسی کو نباہنے کی کوشش کرو۔ دیکھو ڈومنیاں بھی شائد آگئی ہیں۔ چچی جان آ رہی ہیں۔ پھر مجھے امی جان کو بھی تو تسکین دینی ہے ان کی حالت بڑی خراب ہے۔

شمیمہ۔ ہاں بڑی اماں کو میرے ہاں بھجوایئے تاکہ تنہائی میں ان سے بھی مل لوں۔ لیکن جب تک تم آنسو نہ پونچھ لو میں ہرگز نہ جاؤں گی۔ شمیمہ نے آنچل سے آنسو خشک ہی کئے تھے کہ پھر بہہ نکلے۔ بھیا ان کو رکوانے کی ناکام کوشش نہ کیجئے۔ آج ہی کا تو دن ہے بہہ لینے دیجئے۔ وہ میرے اختیار میں بھی تو نہیں

شفیق۔ اری دیوانی ناکام کوشش کی کامیابی پر ہی تو حقیقی خوشی حاصل ہوا کرتی ہے۔ اچھا خدا حافظ وہ دیکھو امی بھی آ رہی ہیں۔ شفیق تھوڑی دیر بعد شمیمہ سے رخصت ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔

آج جلوہ کی رسم ادا ہونے والی ہے۔ لیکن حقیقت میں شفیق اور شمیمہ کے ارمانوں کا جنازہ نکلنے والا ہے۔

شمو کی والدہ خوش ہیں کہ آخر اپنی مرضی کی شادی کر کے رہیں۔ حالانکہ وہ یہ بھی نہ جانتی تھیں کہ جو ان کا داماد بن رہا ہے اس کے پوشیدہ حالات کیا ہیں۔ عزیز احمد بھی اس شادی سے بالکل بے لاگ ہیں۔ اور کمرے میں تنہا لیٹے ہیں۔

شب گذشت کو دولہا بڑی دھوم دھام سے "عشرت منزل" میں داخل ہوا۔ برات کا پرجوش استقبال کیا گیا۔ صرف قاضی صاحب کچھ انتظار کے بعد آتے ہیں۔

اتنے میں باہر کچھ شور و شغب سنائی دیتا ہے۔ ہر ایک عزیز احمد کو بلانے دوڑ رہا ہے۔ جب ان کو معاملہ کی اطلاع ملی تو وہ باہر نکلے۔ پورے واقعات معلوم کرنے سے قبل ہی یکایک ایک اجنبی شخص ان کے پیروں پر گر پڑا۔ عزیز احمد نے گھبرا کر اس کو اٹھایا اور ماجرا دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ماجد میاں جو اس وقت نوشہ بنے ہوئے ہیں اس اجنبی شخص کی بہن زرینہ کو بیاہ چکے ہیں اور وہ شادی بھی اسی دھوکے میں کی کہ ان کے ہاں مال و دولت بہت ہے۔ لیکن بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ ان کی سب جاگیر ان کے بڑے بھائی کے قبضے میں ہے۔ اور میاں ماجد کو سوائے گزر معاش کے کچھ نہیں ملتا۔ اس شخص نے کہا اس وقت میری بہن سخت بیمار ہے کل اس کے لڑکی پیدا ہوئی۔ جس کا انتقال ہو گیا۔ اب زرینہ کا آخری وقت ہے اگر ماجد آجائیں تو دیدار نصیب ہو جائے گا۔ اتنا سنتے ہی عزیز احمد کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ دوڑے ہوئے بیوی کے پاس آئے سارا حال سن کر بیوی نے سر پیٹ لیا کہ ہائے میں لٹ گئی۔ اب برات کا لوٹانا بھی جگ ہنسائی کا باعث تھا۔ لیکن دانشمند عزیز

تھی فوراً شوہر کو ایک طرف لیجا کر کچھ ایسا سمجھایا کہ وہ الٹے پاؤں واپس چلے گئے۔ ادھر آحد میاں ہیں کہ پریشانی کے عالم میں ساری باتیں جھٹلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

شمیمہ کا حال ابتر ہے اب تک دو تین بار تو بے ہوش ہو چکی ہے۔ تمام سہیلیاں اور ہم عمر بہنیں بیٹھی تسلی دے رہی ہیں۔ شام کو دولہا میاں آرسی مصحف کے لیے بلائے گئے۔ ہر ایک دولہے کو دیکھنے کا مشتاق تھا۔ لیکن سہرا ان کے چہرے پر ایسے چھایا ہوا تھا کہ صورت دیکھنا دشوار تھا۔ سہیلیوں اور بہنوں نے ہر قسم کا مذاق کیا لیکن دولہا کی طرف سے جواب ندارد۔ کسی نے کہا کہ ارے توبہ اس دولہے نے تو گویا گونگے کا گڑ کھا لیا ہے۔ غرض جتنی منہ اتنی باتیں۔

آرسی مصحف کے بعد دلہن رخصت کر دی گئی۔ دلہن کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ وہ جس گھر میں آئی ہے کس قسم کا ہے۔ وہاں کے لوگ کیسے ہیں۔ وہ کمرے میں تنہا اداس بیٹھی ہے کہ اتنے میں اس کے کان میں کسی کی دلربا آواز گونجتی ہے۔ "شمو کیا ہم اندر آسکتے ہیں۔" آواز جانی پہچانی تھی لیکن شمیمہ کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آتا تھا۔ حیرت و استعجاب سے نگاہیں خود بخود اوپر اٹھ گئیں تو شفیق کو اپنے جواب کا منتظر پایا۔

زبیدہ (عثمانیہ)

دیسی مرغا مرغی مجلس قانون ساز

غلے کی سب سے بڑی منڈی کے میدان میں افسر خوراک کی اجازت بغیر ایک ہی رات میں سندھ کے احرار نے ایک وسیع پنڈال "آل انڈیا دیسی مرغا مرغی مجلس قانون ساز" کے اجلاس کے لئے تیار کر دیا تھا، تمام مسلم لیگی رضاکار تہجد کے وقت سے اس پنڈال کی حفاظت کے لئے کمربستہ موجود تھے، پنڈال کا صدر دروازہ دیسی مرغیوں کے انڈوں سے بنایا گیا تھا اور صدر مجلس کے لئے "تخت سیمرغ" بچھایا گیا تھا،

مجلس کی صدر محترمہ بیگم صاحبہ ملا رموزی نمبر ۲ تھیں جو بین الاقوامی مرغا مرغی کی یورپی مجلس میں ہندوستانی مرغا مرغیوں کی نمایندگی کے فرائض انجام دے چکی ہیں، مجلس کے سرکاری ممبروں کے مقابل آج کی تحریک کے محرک مشہور مرغے خور حضرت ملا رموزی صاحب تھے۔

صدر صاحبہ کی میز کے برابر برابر ہندوستان کے ہر صوبے کے دیسی مرغا مرغیوں کے سیکڑوں ٹاپے رکھے ہوئے تھے اور ہر ٹاپے کے اوپر ایک نمونہ کا انڈا تھا، صبح کو جیسے ہی کہ تمام آل انڈیا دیسی مرغوں نے اذانوں کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے اپنی یورپی مسندوں کے مطابق اطالوی نمایندے اور مجلس قانون ساز کے اطالوی ممبر پنڈال میں داخل ہوئے۔

صدر صاحبہ دن کے کوئی گیارہ بجے کھانے دانے سے فارغ ہو کر تشریف لائیں اور اطالوی اراکین مجلس سے اپنی ملکی کاہلی کی معافی چاہی، اس کے بعد ہندوستانی اراکین مجلس کا سلسلہ شروع ہوا جو عصر کی نماز کے وقت تک جاری رہا۔ اس پر اطالوی نمایندوں نے ہندوستانیوں کی روایتی کاہلی اور غیر قانونی زندگی پر احتجاج کے طور پر اطالوی مرغا مرغیوں کے تمام ٹاپے پنڈال سے باہر نکلوا دیئے، صرف چند بی آپاس مرغیوں کے ٹاپے رکھ لئے گئے۔ اس کے بعد صدر صاحبہ نے خاکی برقعہ کے اندر سے مجلس کا ایجنڈا پڑھ کر حضرت ملا رموزی کو اپنی تحریک پیش کرنے کی اجازت دی۔

حضرت ملا رموزی آج ایک بڑے دیسی مرغے کے سرخ پروں کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی عادت کے مطابق سخت بحث فرمائیں گے۔ ملا رموزی صاحب کے کھڑے ہوتے ہی تمام اطالوی مرغا مرغیوں نے خطرہ کی وہ آوازیں بلند کیں جو بلی اور بلے کو دیکھ کر مرغا مرغی کیا کرتے ہیں، اس کے بعد ملا رموزی صاحب نے ذیل کی تحریک پڑھ کر سنائی۔

"ہرگاہ اس مجلس کے عوامی اراکین کے علم و مشاہدہ میں یہ بات آئی ہے کہ ہندوستانی لباس اور ہندوستانی زبان و ادب کی طرح اب ہندوستانی مرغا مرغیوں کی قدیم نسل بھی اس طرح ضائع کی جا رہی ہے کہ جنگ کے زمانے کی بلیک مارکیٹ قسم کی آمدنی سے چند ہندوستانی جو قدرے قلیل "نو دولتیے" ہو گئے ہیں اب وہ مارے چند روزہ ثروت کے دیسی مرغا مرغیوں کے گوشت اور انڈوں سے نفرت کرنے لگے ہیں اور اطالوی مرغا مرغیوں کی نسل بڑھانے میں مصروف ہیں چونکہ اس طرح ملک کی ایک قابل قدر نسل ہی ضائع نہیں ہوتی بلکہ اس طرح ہر غیر ملکی چیز سے موانست اور ملکی چیز سے نفرت عام ہونے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ لہذا یہ مجلس حکومت سے سفارش کرتی ہے کہ آئندہ ہندوستان سے جو پہلا ہندوستانی سفیر اٹلی میں مقرر کیا جائے اسکو

ہدایت کی جائے کہ وہ اطالوی حکومت کے
اس معاہدہ کو منسوخ کرانے کی کوشش
کرے جو برطانوی حکومت کے عہد میں
حکومت ہند کے نام سے ہوا تھا۔"

اس تحریک کی تائید میں حضرت ملا رموزی نے ایک بیحد موٹے مرغے کو بغل میں دبا کر ہندوستان میں مرغا کھانے پھر مرغے لڑانے پھر انڈے کھانے اور پھر اطالوی مرغا مرغیوں کی آمد اور ان کے انڈوں کی ترقی کے تمام تاریخی اسباب اس کمال جامعیت سے پیش فرمائے کہ عصر سے عشاء کا وقت ہوگیا مگر ایک مسلمان ممبر نے بھی احتجاج کی ہمت نہ کی کہ دو نمازیں قضا ہو چکی ہیں۔

اس کے بعد ملا رموزی نے اپنی بغل میں دبے ہوئے مرغے کا ٹیٹوا دبا کر اس کی آواز کی گرج سنوائی اور کہا کہ ہم ہندوستانی چونکہ چوکھٹ سے چوکھٹ جوڑ کر گھمسان کے مکان بنا کر رہنے کے عادی ہیں اس لئے صبح کو ایک پورے محلہ کی آبادی کے لئے تنہا ایک دیسی مرغ کی اذان کافی ہوتی ہے لہذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس سے بڑی آواز کے مرغوں پر اپنی محدود دولت کو صرف کریں، اس جگہ اطالوی نما بندہ نے ثبوت کے طور پر اپنے مرغے کا ٹیٹوا دبا کر کہا کہ ہمارے مرغوں کی آوازیں تمام بستی کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ لہذا صبح خیزی کے لئے اطالوی مرغوں کی ہندوستان میں ضرورت ثابت ہے لیکن ملا رموزی صاحب نے برجستہ فرمایا کہ ہندوستان میں دولت مند طبقہ تین بجے شب تک جوا و تاش کھیلتا ہے یا یورپی کھیل تماشوں میں مصروف رہتا ہے اس لئے وہ تین بجے شب کے بعد سوتا ہے لہذا مرغوں کی آواز تو ایک طرف وہ توپوں کی گرج سے بھی دس بجے دن سے پہلے جب بیدار نہیں ہوتا تو اطالوی مرغوں کی اذان بیکار او اطالوی مرغیوں کے انڈوں کی نالائقی ثابت۔

اس موقع پر صدر صاحبہ نے ملا رموزی صاحب سے ان کے اس فقرہ کی شرح چاہی کہ "اطالوی مرغیوں کے انڈوں کی نالائقی ثابت۔"

اس پر ملا رموزی صاحب نے فرمایا کہ:۔

محترمہ! اطالوی مرغیوں کے انڈوں کی نالائقی سے میری مراد یہ ہے کہ علم طب میں یہ بحث و تحقیق ہو چکی ہے کہ مرغ کا گوشت اور مرغی کے انڈے مقوی ہیں لہذا جس انسان کو مرغا مرغیوں کے گوشت اور انڈوں کی طاقت حاصل ہو وہ پھر طلوع آفتاب سے پہلے اگر بیدار ہو کر کاروبار میں مصروف نہ ہو اور دن کے گیارہ بجے تک سوتا رہے تو اس کا مطلب صاف ہے کہ پھر گویا اطالوی مرغوں کے گوشت اور ان کی مرغیوں کے انڈوں میں طاقت کے عوض ضعف ہے جس کی بے بسی کی وجہ سے لوگ دن کے دس بجے تک بستروں سے حرکت کے قابل نہیں ہو سکتے اس لئے جب اطالوی مرغا مرغیوں کے گوشت اور انڈے نوش فرما کر بھی ہندوستانی طلوع آفتاب سے پہلے بیدار نہ ہوں اور دوسری غیر ہندوستانی قوموں کے برابر ڈٹ کر کام نہ کریں تو ایسے کاہل ہندوستانیوں کے لئے یورپی مرغا مرغیوں پر دولت صرف کرنا بیکار۔

عین اسی طرح علم طب سے ثابت ہے کہ عمدہ قسم کے مرغ کے گوشت کی دھاتوں میں سونے فولاد اور جواہر کے جو قسم اعلیٰ کے عناصر شامل ہوتے ہیں ان سے انسان کے دماغی قویٰ کو جلا ملتی ہے لہذا ایک ضابطہ یہ بھی قرار پاتا ہے کہ جو ہندوستانی اطالیہ کی موٹی مرغی کے انڈے کھائے اور قسم اول کے اطالوی مرغے اڑائے اس میں دوسرے ہندوستانیوں کے مقابل زیادہ ذہانت ہو لیکن ہندوستان میں لاکھوں اطالوی مرغا مرغیوں کے گوشت اور انڈے کھا لینے کے بعد بھی آج جو ہندو مسلم فسادات ہو رہے ہیں ان سے ثابت ہے کہ ہندوستانیوں کے دماغوں میں اعلیٰ درجہ کے اطالوی مرغے کھا کر اور عمدہ

قسم کی اطالوی انڈے اڑا کر بھی کوئی لائق امتیاز ذہانت پیدا نہیں ہوئی بلکہ اطالیہ کے عمدہ نسل کے مرغے اور انڈوں کے استعمال سے ہندوستانیوں میں بربریت اور بہیمیت کے ہیجانات اور جذبات میں اضافہ ہوگیا جنھوں نے ہندو مسلمانوں کے فسادات کی صورت اختیار کرلی۔ لہذا اس دلیل سے اب میری تحریک اقتصادی حد سے بڑھ کر سیاسی اعتبار سے بھی اس قابل ہوچکی کہ گورنمنٹ آف انڈیا فوراً دیسی مرغا مرغیوں کو ترقی دینے کی خاطر غیر ملکی مرغا مرغیوں اور غیر ہندوستانی انڈوں یا غیر ہندوستانی انڈوں سے بنی ہوئی دوسری ہر نوع کی غذائی درآمد کو روک دے، ملا رموزی صاحب نے جیسے ہی کہ دیسی مرغا مرغیوں کے حق میں یہ زبردست دلیل بیان فرمائی تمام دیسی مرغا مرغیوں کے ٹاپوں میں ایک عظیم حرکت پیدا ہوگئی اور تمام دیسی مرغے اذانیں دینے لگے۔

اس موقع پر صدر صاحبہ نے شب کا کھانا کھانے اور نمازیں قضا ہونے اور ان کے ادا کرنے کے وقفہ کا اعلان فرمایا۔

اس موقع پر اطالوی نمائندے سائینور راندا نے جنھوں نے حبشہ کی فتح کے بعد تمام حبشی انڈوں کے اطالیہ پہنچانے کے تجربہ کا ٹھیکہ لیا تھا کوشش کی کہ اجلاس جاری رہے اور انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے بعض ایسے شاعروں اور ایسی اسلامی انجمنوں کے اجلاسوں کی اطلاعات پیش کیں جن کے دوران میں نمازوں کے اوقات گزر گئے مگر نہ صدر مشاعرہ نے نماز کے لئے اجلاس برخاست کیا نہ شرکا نے اس کی پروا کی، لیکن ملا رموزی صاحب کی مداخلت سے صدر محترمہ نے اطالوی نمائندے کی کوشش کے خلاف اجلاس کو برخاست کیا جانا ضروری قرار دیا۔

ملا رموزی

غزل

وحشت پیمائے محبت ہوں نہ چھیڑو مجھکو
ہمہ تن مائل وحشت ہوں نہ چھیڑو مجھکو

نہ شفا سے مجھے مطلب نہ مسیحا سے غرض
میں مریض غم فرقت ہوں نہ چھیڑو مجھکو

نہ تو تکلیف کا احساس نہ راحت سے غرض
ہمہ تن درد محبت ہوں نہ چھیڑو مجھکو

عیش و آرام کہاں صحبت احباب کہاں
میں گرفتار محبت ہوں نہ چھیڑو مجھکو

دوست احباب بھی ہوتے ہیں غرض مند عزیز
میں تو لبریز شکایت ہوں نہ چھیڑو مجھکو

عزیز یار جنگ

تصویروں میں احساسِ اصول

عمیق مطالعہ کی اہمیت

شاعری کے فلسفی ایمرسن کا بیان ہے کہ اس نے بہترین نظم لکھنے کی خاطر ارضیات کا مطالعہ کیا تھا۔

اس فقرے کے دونوں غیر متعلق عناصر نظم اور ارضیات، پہلے ہی قدم پر کچھ دیر کے لئے ہمیں حیرت زدہ بنا دیتے ہیں۔ لیکن جونہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ تخیل کی بلند پروازی سے شاعر آسمان پر چڑھ کر وہاں سے عرش کی خبر تو لاتا ہے، لیکن فرش پر نظر آنے والی چیزوں کی باطنی کیفیت سے بالکل بے خبر ہوتا ہے تو ہمارا استعجاب چشم زدن میں کافور ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعر کی نظر اشیاء کی صرف بیرونی سطح ہی تک محدود رہے گی، تو اس کے کلام میں استادی شان ہرگز پیدا نہ ہوگی۔ پس شاعر کو چاہیے کہ وہ اپنے مشاہدے کو مکمل تر بنانے کے لئے مختلف علوم کی مدد سے اشیاء کی باطنی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

شاعر جس وقت لفظی تصویر کشی کرتا ہے تو ارضیات، نباتیات، قواعد صرف و نحو، عروض وغیرہ سب کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے، تاکہ یہ اصولی ذخیرہ ابتداء ہی سے اس کی بے ساختہ آمد میں رکاوٹ نہ بن جائے۔ جب وہ اپنی طبیعت کی روانی کو ظاہر کر چکتا ہے، تب وہ اس کے معیار کو جانچنے کے لئے مذکورۂ بالا اصول کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

آرٹ میں قانونِ ارتقاء

"آرٹ میں قانونِ ارتقاء" کا مصنف رقم طراز ہے کہ:۔

"ہمارے آرٹ میں سائنس ہی ایک ترقی پذیر عنصر ہے .... یہ سچ ہے کہ مصور سائنس داں ہونے کی وجہ سے مشہور نہیں ہوا کرتے، تاہم وہ سائنسی بننے پر مجبور ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مصورین نے پیشہ ہی ایسا اختیار کر رکھا ہے جس کی حدود میں سائنس قدرتاً داخل ہے۔ پس جس بات پر میں زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ ایک زبردست حقیقت ہے کہ پھولنے پھلنے اور آگے بڑھنے والا علم سائنس خود فنِ مصوری کی حدود میں موجود ہے، اور یہی اس کا اہم ترین اور ترقی پذیر جزو ہے۔"

یہ قول بالکل صحیح ہے کہ:۔

"ہر شخص جو لکھنا سیکھ سکتا ہے، وہ نقاشی بھی سیکھ سکتا ہے۔"

پس جو نقاشی سیکھتا ہے، اسے چاہیے کہ تصویروں کو ترتیب دینا بھی سیکھے۔ اساتذۂ سلف کے زمانے سے لے کر آج تک، جن قابل اور خوش ادا نقاشوں نے اپنے تخیلات سے پردۂ تصویر (کریج) یا صفحۂ قرطاس کو مزین کیا ہے، اِن کے کارناموں میں بس یہی ایک چیز، ترتیب دیکھنے میں نہیں آتی۔ حالانکہ ان تصویروں میں جزئیات کو تفصیل کے ساتھ ہویدا کرنے کی قابلیت، تصویر کے ہر حصے اور ہر جزو سے عیاں ہے۔ جزئیات نگاری ہی کی وجہ ہے کہ مصور کے ابتدائی خیال میں ان تفصیلی اجزاء کا جو حقیقی زور تھا، وہ تصویر کے ان حصوں کی اجتماعی ہیئت میں ضم ہو کر کمزور پڑ گیا۔

علمِ ترتیب دراصل علم الاجتماع ہے، اور یہ قول ؎

نہال اس گلستاں میں جتنے بڑے ہیں　　ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں

دُنیا کا آرٹ ترقی کرتا گیا ہے۔ یعنی مصورین، طفلِ شیر خوار کی طرح پہلے پہل، اشیاء کی شکل سے واقف ہوئے۔ زاں بعد تصویری مواد (Material) سے، اور آخر میں رنگ اور روپ، دونوں کی ترکیب یا ہیئت اجتماعی سے (Synthesis) نشاۃ جدیدہ نے حُسن کاروں کے ایسے کارنامے جو دُنیا کی ساری تصویروں میں اپنی نظیر نہیں رکھتے، ان میں بھی مذکورۂ بالا ترقی کی تدریجی کیفیت کو بتلایا جا سکتا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ تدریجی ارتقا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، ان بے نظیر شاہکاروں کو جب نشاتی آرٹ کے کثیر حصے کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا ہے، تو اچھے کے ساتھ بُرے کام میں جو نسبت دکھائی دیتی ہے، اسی نسبت کو دورِ حاضر کا آرٹ نسبتِ معکوس میں پیش کرتا ہے۔

ترتیب اور رنگ کی اہمیت

ترتیب یعنی تصویر کی اجتماعی ہیئت کے متعلق ہم کسی بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے۔ البتہ قدیم اور جدید آرٹ پر روشنی ڈالنے والی ایک ایسی ظاہری مثال کو پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں، جو آرٹ کے متلاشی، خواہ وہ عامی ہو، یا پیشہ ور حُسن کار، دونوں کے لئے یکساں طور پر دلچسپ ہے۔ وہ یہ کہ تماشائی جب یورپ کی کسی قدیم آرٹ گیلری سے گذرتے ہوئے، جدید آرٹ کی گیلری میں قدم رکھتا ہے تو اس کی دماغی انقباضی کیفیت میں ایک دم سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ اچانک تبدیلی اس امر کا ثبوت ہے کہ جدید آرٹ گیلری میں، متوازن خطوط، متوازن کمیتوں، اور متوازن رنگ کے ساتھ عام طور پر ایسی سادگی بھی پائی جاتی ہے، جو تصویری ہم آہنگی کے لئے نہایت ضروری ہوتی ہے۔ پس ظاہر ہے کہ رنگ، روپ اور ترتیب ارکان ہی ہم آہنگی پیدا کرنے والے عناصر ہوتے ہیں۔ لیکن قدیم آرٹ میں ترتیب کی خامی ہی اس کی کمزوری کا سبب بن جاتی ہے۔ یاد رہے کہ ترتیب کی خامیوں کو الفاظ میں بیان کرنا آسان نہیں، اس لئے قدیم آرٹ کے اس جزو کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اور جہاں تک رنگ کا تعلق ہے، یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ امتدادِ زمانہ کے اثرات نے اُن شہرۂ آفاق شاہکاروں میں جو کیست لونی ہم آہنگی پیدا کر دی ہے، اس کو بھی ہم با دلِ ناخواستہ ہی شاید کسی اور چیز سے بدلنے پر راضی ہوں۔

متقدمین میں گروپ بندی اور متاخرین میں دوپیکری ترتیب اچھی ہوتی ہے

ہر حُسن کار اچھی طرح واقف ہے کہ ایک، تین اور کثیر پیکروں کی ترتیب سے دو پیکری ترتیب بے حد مشکل ہوتی ہے۔ اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے صرف دو پیکری تصویروں کو لے کر ان کی ترتیب پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ترتیب کی اس صنف میں متقدمین سے متاخرین بہت پیش پیش نظر آتے ہیں اس مثال سے یہ نہ سمجھ لینا کہ متاخرین کو متقدمین پر بہر صورت فضلیت حاصل ہے۔ اسی لئے دو پیکری تصویروں کے ساتھ ترتیب کی دوسری اصناف کا علم رکھنا بھی ضروری ہے، تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ منظری ارکان کی گروپ بندی اور منظر کے اندر حیوانی یا انسانی پیکروں کو نہایت خوش اسلوبی سے موزوں کرنے کا لطیف ترین احساس، آرٹ کی دنیا میں سلف کے باکمال اساتذہ فن ہی کی بدولت واصل ہوا ہے۔ بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ کثیر پیکروں والی تصویروں کی ماہرانہ ترتیب کی بعض مثالوں میں میکائل انجیلو، روبینس، کوریجیو، اور ونیس کے دوسرے قائدین فن پر، آج تک کوئی سبقت نہ لے جاسکا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جہاں ہم ان اساتذہ کی نمایاں کامیابیوں کی ستائش کرتے ہیں، وہاں ہمیں ان کی فروگذاشتوں، یا ان کے معاصر حُسن کاروں کی ترتیبوں میں سہو نظری کو فراموش نہ کرنا چاہیے۔

تنقید ہمدردانہ ہو

ایسے قارئین جن کی تعلیم اساتذہ سلف کے کمالوں کی اساس پر یا ان کے مسلمہ مسلک کے مطابق ہوئی ہو، اور ایسی تعلیم کو انھوں نے بلا چون وچرا تسلیم بھی کرلیا ہو، ان سے ہماری استدعا ہے کہ وہ اپنے دل کو قدیم روایاتی تعصب سے بالکل پاک کردیں، اور ہر تصویر کو مصور کے نام یا تاریخی حوالے کی مدد سے جانچنے کی بجائے "خوش ترتیبی" کے اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کارناموں کے حُسن و قبح کو دیکھیں تو بہتر ہوگا۔ ایسی تصدیق کے لئے غیر جانب دارانہ نقطۂ نظر کی سخت ضرورت ہے، اور ایسا نقطۂ نظر ہمدردی سے خالی نہ ہو، اور ایسا ہونا بھی نہ چاہیے۔ ورنہ صدہا سال کے جمع شدہ ذخیرۂ تصاویر کو جوش عقیدت سے دیکھتے رہنے کے سبب ناظر کے خیالات میں قدامت پرستی کا جو میلان پیدا ہو جاتا ہے، وہ میلان زیر غور تصویر کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیتا ہے، اور تصویر مستحقہ ستایش سے محروم ہو جاتی ہے۔

جدید تصویریں قدیم نمونے عیب پیدا کر دیتے ہیں

فن ترتیب پر اب تک جتنی اہم تصانیف دستیاب ہوئی ہیں، ان سب میں برنٹ کی کتاب "نور و ظلمت" قدیم تر ہے۔ یہ اس زمانے کی تصنیف ہے، جب قدیم اساتذہ کے اثرات کا زور تھا، اور عموماً یہ استدلال پیش کیا جاتا تھا کہ اساتذۂ قدیم کی تصویریں، اپنی ترتیبی خوبیوں کے اعتبار سے ہرگز مورد الزام نہیں قرار پاسکتیں، اور چونکہ بانی چیلی، رفائل، پال پاٹر، ادورنس، کوئپ، ڈامی نی چینو، ڈیورر، ٹیبنیا وغیرہ سب قدیم اساتذہ ہیں، اس لئے ہم ان کے شاہکاروں کو نفیس ترتیب کے بے نظیر

نمونے تسلیم کرتے ہیں، جن کی پیروی ہر زمانے میں کی جانی چاہیے۔ اس خوش اعتقادی کے تحت، اساتذۂ قدیم سے مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے حسن کار، جب ان اساتذہ کے نمونوں کو آزادی سے اپنی تصویروں میں استعمال کر جاتے ہیں، تو ان کا بہترین کام بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔ دورِ حاضر کے مصورین کی بھی یہی کیفیت ہے، جو اساتذۂ قدیم سے بالکل مختلف انداز میں کام کرتے ہیں، لیکن اپنی سادہ لوحی سے قدیم اساتذہ کے نمونوں پر اعتماد کرتے ہوئے انھیں اپنے کارناموں میں استعمال کر کے عملی حیثیت سے ایسی بے میل اور ناقابلِ برداشت چیز کو تصویر میں داخل کر دیتے ہیں جن کو نقادانِ فن بلکہ تصویر کے ناشرین تک پسند نہیں کرتے۔

گزشتہ تین سو سال کے دوران میں، فنِ مصوری کے احاطۂ عمل کی حدود میں جو خفیف سی ترقی رونما ہوئی ہے، وہ حقیقت میں قدیم اساتذہ کے آرٹ ہی کی بدولت ہے۔ آخر اس طویل عرصہ کی لگاتار جد و جہد کے بعد بھی آرٹ کی دنیا میں کسی قسم کی ترقی نہ ہو، تو واقعی بڑی حیرت کی بات ہوگی۔

وہ جو تصویر نہیں

نقاشی اور رنگ جس طرح تصویر کی مدافعتی چٹانیں خیال کی جاتی ہیں، اسی طرح ترتیب بھی دیواری گچ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ظاہر ہے بغیر گچ کے محض پتھروں کو کوئی وقعت حاصل نہیں ہوتی۔ دیوار سازی میں گچ ہی ان پتھروں میں وحدت و چسپیدگی پیدا کرنے والا عنصر ہوتا ہے، جس کی عدم موجودگی سے سارے پتھر پراگندہ اور غیر منظم اکائیاں بن جاتے ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ ترتیب ہی تصویر کے تمام ارکان کو آپس میں مربوط کر کے ان میں وحدت پیدا کر دیتی ہے۔ اس طرح ناظر جب تصویری وحدت کے اصول کو تسلیم کر لیتا ہے، تو ضمناً وہ یہ بھی مان لیتا ہے کہ جن تصویروں میں ترتیب پائی نہیں جاتی، انھیں تصویروں کے زمرے سے نکال پھینکا جائے۔ باترتیب اور بے ترتیب تصویروں کی جماعت بندی میں ذیل کی ساری توضیحات خود بخود تصویروں کے زمرے سے خارج ہو جاتی ہیں:—

۱۔ ایسی سائنٹفک توضیحات کا بیشتر حصہ، جس کا اصل مقصد کسی حادثے، واقعہ، مقام کا اظہار یا جغرافیائی منظر کشی ہوتا ہے۔ یا

۲۔ ایسے عکسی گروپ یا ان کی نقل، جن میں تصویر کا ہر فرد اپنی حیثیت میں دوسرے کی برابری کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایسی مساوات کی وجہ سے تصویر مختلف پیکروں کا مجموعہ بن جاتی ہے۔ اور

۳۔ ایسی توضیحات جنھیں روزانہ اخباروں میں دیکھا جاتا ہے۔ جن میں تصویر کشی کے موقع کو نمایاں کرنے کی بجائے یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ قاتل کس جگہ سے فرار ہوا، مقتول کہاں گرا، فلاں شخص کہاں غرق ہوا، اور لطف یہ کہ ان واقعات و حادثات کو تصویر میں تیر نما یا ستارہ نما علامات کے ذریعہ بتایا بھی جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذکورۂ بالا تمام توضیحات تصویریں نہیں ہوتیں، وہ تو صرف مقامی واردات یا حادثات کے منظری نقشے ہوا کرتے ہیں۔

۴۔ ان کے علاوہ فن مصوری کی عمل کاری کے میدان میں کبھی کبھی مصور کی ایسی ماہرانہ کارستانیاں بھی دیکھنے میں آتی ہیں، جو بجائے خود رنگ اور فن کاری (ٹکنک) کے لحاظ سے تو بڑی دلچسپ ہوتی ہیں، لیکن ایسی دست کاریوں سے ایک متوازن دماغ کو کبھی مسرت حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایسی کارستانیوں میں توازن اور ہم آہنگی کے ایسے بدیہی اصولوں کا فقدان پایا جاتا ہے، جو کائنات میں ہر جگہ کار فرما نظر آتے ہیں۔
اسی لئے تو کہتے ہیں کہ جب آپ نیچر سے اصول توازن کو الگ کر لوگے تو اسے ہم آہنگی سے محروم کر دوگے، اور جب ہم آہنگی کو نکال لوگے تو ظاہر ہے انتشار و پراگندگی پیدا ہو جائے گی۔

تصویر کی تعریف

آدمی، گھوڑا، درخت، باڑھ، پہاڑ، رہ گزر وغیرہ کئی ایک چیزیں تصویر کے اجزائے ترکیبی ہوسکتے ہیں۔ لیکن یہ اچھی طرح یاد رہے کہ ان سب اشیاء کو کاغذ یا پردۂ تصویر پر اکٹھا کر دینے سے تصویر نہیں بنا کرتی، اور یقیناً اس وقت تک نہیں بنتی جب تک ان سب اشیاء میں ایک باقاعدہ نظم و ترتیب نہ پیدا کر دی جائے۔
حاصل کلام یہ کہ بغیر ترتیب کے تصویر ناممکن ہے، اور تمام تصویری اکائیوں کی من حیث الکل ترتیب ہی کو تصویر کہتے ہیں۔

توازن، تناظر، تقابل، وحدت اور ہم آہنگی، ترتیب کے اجزاء ہیں

یہ بات ناممکن نہیں کہ کوئی شخص تصویری ترتیب میں توازن اور وحدت کے اصولوں کی سادگی کو دیکھتے ہوئے انھیں بالکل ہی مضحکہ خیز چیز سمجھ بیٹھے۔ کیونکہ ہمیں خود بھی یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف تو ابتدائی دور کے ایسے باکمال اساتذہ جن کے شاہ کار بہ اعتبار فن چوٹی کے شمار ہوتے ہیں، ترتیب کے اصول اپنی کو بھلا دامے کر نظروں سے اوجھل ہو گئے، اور دوسری طرف نیچر پرست یا ارتسام نگاری کے جدید تصویری دبستان نے انہی اصولوں کو اپنی دانست میں غیر اہم سمجھ بیٹھا۔ یہ انکار ہی تھا جس کی وجہ سے تمام ارتسامئین مندرجۂ ذیل ترتیب کے اصول سے اتفاق نہیں کرتے۔ حالانکہ اس اصول کی اس خوبی کو دیکھتے ہوئے جو اس کی ایک غیر منفک خصوصیت ہے، ارتسامئین کے دعوے کی تردید میں ثبوت ملتا ہے۔
یعنی جوابی باقاعدگی (Symmetry) توازن، ترکیبی اجزا میں تنظیم، خالی جگہ کی پُرکاری جیسے ترتیب کے بہترین قانون کی یہ کیتنی بڑی بدقسمتی ہے، جو اس کی مخالفت میں یوں لب کشائی کی جاتی ہے :۔

> "کیا نیچر خود اشیاء میں ترتیب پیدا نہیں کرسکتی، حالانکہ اسی ترتیب کو وہ اپنے خوش آئند انداز میں دس ہزار گنا بہتر طریقہ پر پیش کرسکتی ہے۔"

ایسا دعویٰ کرنا کہ ترتیب نیچر کے قانون کا ایک غیر منفک جزو ہے اور جو ترتیب اس کے ذریعہ عمل میں آتی ہے، بہترین ہوتی ہے، تو اسی سانس میں ہم ایک ہجو نگار کا ایسا طنز بھی سُن لیتے ہیں۔ جو نہ صرف اس بے بنیاد دعوے کی تردید کرتا ہے، بلکہ سرے سے دعوے ہی کو کالعدم کر دینا چاہتا ہے، جو یہ کہتا ہے کہ اسی مفروضہ دعوے کی لعنت کے زیر اثر ہم اپنی تصویروں میں سے یکے بعد دیگرے ایسے عناصر کو (یعنی توازن، وحدت و

ہم آہنگی) علٰحدہ کئے دیتے ہیں، جن پر یہ تصویریں بنائی گئی تھیں، اور آخر میں اس سے جو نتیجہ برآمد ہوگا (یعنی پراگندگی) اس کو "نیچر پرست مصوری" کے مصنف مسٹر بیٹس کے ملاحظہ میں پیش کر دیں گے۔

نیچر ہمیشہ غلط ہوا کرتی ہے

وہسلر کہتا ہے:۔

"مصور اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ قدرتی عناصر کے انتخاب میں انتہائی احتیاط اور ذوقِ سلیم سے کام لیتے ہوئے سائنس کی مدد سے ان عناصر میں ایسی ترتیب پیدا کر دے جس سے حسین ترین نتیجہ برآمد ہو۔ یہ عمل اسی طرح ہونا چاہیے جس طرح پر ایک نغمہ ساز مطرب منتخبہ سُروں کو جمع کرتے ہوئے، ان کے خوش آہنگ ملاپ کو دریافت کرتے ہوئے اپنی طرزیں یہاں تک ایجاد کرتا چلا جاتا ہے کہ آخر شِ بے ہنگم شوریں سے ایک عظیم الشان ہم آہنگی پیدا کرنے میں وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ پس نیچر کی پیش نہادہ صورت کو بجنسہٖ قبول کرنے کی مصور کو تاکید کرنا ایسا ہی بے معنی ہے جیسے کسی ساز نواز کو پیانو پر چڑھ بیٹھنے کا حکم دینا، جس سے بہ یک وقت سارے سُروں کے بجنے سے خوش آہنگی کی بجائے بے ہنگم شور پیدا ہو جائے گا۔ یہ کہنا کہ نیچر ہمیشہ صحیح ہوتی ہے' بہ اعتبار فن مصوری، صداقت سے بعید، صرف دعوٰی ہی دعوٰی ہے۔ اس دعوے میں وہی غلطی پائی جاتی ہے' جو عام طور پر کسی دعوے کو محض اپنی خوش فہمی سے صحیح ہوا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ نیچر عموماً غلط ہوا کرتی ہے۔ یا نیچر میں مطلوبہ اشیاء کے ایسے حالات و کیفیات جن سے تصویری ضروریات کے مناسب حال کامل ہم آہنگی پیدا ہو سکے، بجز شاذ صورتوں کے ہرگز عام نہیں ہوتے"۔

مکتبی تعلیم مصور نہیں بنا سکتی

زندہ معمول اور بے جان نمونوں کی شبیہہ کشی کراتے ہوئے، نگار خانے طلبہ کو برابر تاکید کئے جاتے ہیں کہ شبیہہ کشی کرو۔ اگر تم نے شبیہہ کشی پر قابو پالیا تو سمجھو کہ تم ہر چیز کی تصویر بنا سکتے ہو۔ نگار خانوں کی اس دیرینہ نصیحت کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا لائف کلاس، جس میں مدرسہ کا معمول (ماڈل) مکتبی انداز میں کھڑا یا بیٹھا رہتا ہے اور وہی معمول جب کسی منظر کے اندر، خیال کے اظہار کا جز واعظم بن جاتا ہے، تو ان دونوں صورتوں کی تصویر کشی میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ لائف اسکول کی سالہا سال کی صبر آزما تربیت کے باوجود اکثر طلبہ مذکورۂ بالا نگار خانوں کی نصیحت کی نیم صداقت سے متاثر ہو کر آن واحد میں تصویر سازی کی منزل میں در آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جونہی وہ اس منزل میں قدم رکھتے ہیں' ان کی کوتاہیاں اور خامیاں ان پر واضح ہو جاتی ہیں کہ روزانہ مشق کے ذریعہ بڑی ہوشیاری دکھلاتے ہوئے جو کچھ انھوں نے مدرسہ میں بنانا سیکھا تھا، وہ دراصل تصویر سازی کی نہایت آسان ترین شکل تھی، اور اب جبکہ اسی پیکر کو اپنے ماحول (پیش منظر یا پس منظر) میں موزوں کرنے کا وقت

آیا ہے، مکتبی تعلیم نے ساتھ چھوڑ دیا ہے، اس لئے انھیں سخت سے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک طالبِ فن جو سات سال تک غیر ملکی نگار خانوں میں کام کر چکا تھا، یہی شکایت کرتا ہے کہ:-

"میں نے آرٹ کو اس لئے ترک نہیں کیا کہ مجھے تصویر کھینچنی نہیں آتی، بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ مجھے جو معلومات تھیں، ان کو استعمال میں لانے کے طریقوں سے مدرسہ میں مجھے لاعلم رکھا گیا تھا۔"

شائقینِ فن ہی نہیں، اکثر شبیہ کش مصور بھی صمیمِ قلب سے اس امر کا صاف صاف اعتراف کرتے ہیں کہ حقیقت میں انھیں پیکری موضوع کو اس کے مناسب حال تصویری ماحول میں ٹھیک طور پہ ثبت (تملای) کرنے کے لئے بڑی بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پس یہ بڑا دلچسپ اور غور طلب مقام ہے کہ شبیہ کش مصور کو صرف ایک ہی پیکر کی تصویر سازی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اس تنہا پیکر کو بھی وہ موزوں طریقہ پر تصویری ماحول میں ثبت کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پیکر کو اُجاگر کرنے کے لئے جب پس منظر سے اسے کافی تائید نہیں ملتی، تو وہ پیکر خود ہی اپنی ناموزوں تنصیب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے تنقید کو مشتعل کر دیتا ہے۔

عامی جماعت کے لوگ شاید اس اصول کو اچھی طرح نہ سمجھ سکیں اور بظاہر یہ اصول انھیں غیر معقول اور بے معنی نظر آئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس گُر کو وہی لوگ اچھی طرح سے سمجھ سکتے ہیں، جو تصویر رنگنا جانتے ہیں۔

بغیر مہارت کے جزئیات یا تفصیل نگاری ممکن نہیں

ہر تصویر معلوم اور نامعلوم، دو اجزاء پر مشتمل ہوتی ہے جس میں انسانی پیکر اپنی اثر انگیز قوت کے ساتھ شئے معلومہ (Known) کا تشبیہی پیش کش ہوتا ہے۔ اس کے برعکس پس منظر ایسے نامعلوم (Unknown) فاصلۂ بعید میں گھسے چلے جانے یا کشادہ ہونے والی جگہ ہوتی ہے، جو بڑھتے بڑھتے گوشۂ نہی (Fancy) پیدا کرنے والے مقام میں جذب ہو جاتی ہے۔ تصویر کشی کے وقت اس اصول کو ضرور پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ کیونکہ جس طرح موسیقی میں صوتی سُروں کے مد و جزر کی خاص کیفیات ہی نغمہ کا اہم ترین جزو ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح تصویری موضوع کے محاسن کو نمایاں کرنے کا دار و مدار بھی اجزاء کے تقابل و توازن پر ہوتا ہے۔ اس اصول کو نظر انداز کرنے سے تصویر غیر متوازن اور بے آہنگی کا نمونہ بن کر رہ جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم توازن اور تقابل کے اصول کی تحقیق کی طرف رجوع ہوتے ہیں تو ہمیں صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اصل موضوع کی تصویر کشی سے کہیں زیادہ مہارت اس کے ضمنی اور ذیلی لوازمات کو بنانے میں درکار ہوتی ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اصولِ تقابل کے ذریعہ اصل موضوع کو زیادہ سے زیادہ اُجاگر کرنے کا پورا دار و مدار تصویر کے ضمنی لوازمات و تفصیلات ہی پر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جب ہم تفصیل نگاری پر غور کرتے ہیں تو راست اصول ترتیب (یعنی تناظر، تقابل، توازن) کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔

طباع حسن کا فن پر قدرت رکھتا ہے، الفاظ پر نہیں

مختلف تصویروں کے گوناگوں اثرات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد سرجوشوا رینالڈز کہتا ہے :-

"طوعاً و کرہاً ہی سہی، دوسرے اثرات کی مانند، ایک صاحب جودت (Genius) کے کارناموں کو بھی چند قاعدوں کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ جب یہ معلوم کرنے کے بعد کہ ان تاثیرات کی کوئی نہ کوئی علت ضرور ہوتی ہے، تو پھر ان کے لئے خاص خاص قاعدوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ایسی مستقل نوعیت کی خوبیاں یا محاسن محض اتفاقات کی بناء پر تو پیدا نہیں ہوا کرتے۔ یہ تمام خوبیاں ضرور کسی نہ کسی تحقیق اور اس تحقیق پر استقلال سے جمے رہنے کی بدولت پیدا ہوئی ہیں۔ پس ان محاسن کی نوعیت ہرگز اتفاقی نہیں ہوسکتی۔ بڑے بڑے قابل افراد، اور ایسے افراد جنھیں صاحبانِ فطنت (Genius) کہا جاتا ہے، انہی قاعدوں کی مدد سے کام کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ ایسے قاعدے ہیں جن کو یا تو وہ اساتذہ اپنے مخصوص اندازِ مشاہدہ کی بدولت، خود ہی دریافت کرلیتے تھے، یا ان کی بناوٹ (Texture) کے اثرات ہی میں ایسی نفاست و نزاکت پائی جاتی تھی، جس کو بہ آسانی الفاظ کا جامہ پہنایا نہیں جاسکتا تھا۔ یہ بیان کردینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مصوروں کی ایک بڑی اکثریت خصوصیت کے ساتھ اپنے خیالات کے لفظی پیش کش میں ماہر نہیں ہوتی۔ یہ قاعدے بادی النظر میں کتنے ہی غیر اہم کیوں نہ معلوم ہوتے ہوں، اور ان کو ضبط تحریر میں لانا کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو، پھر بھی مصور اپنے نفس میں انھیں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، اور انہی کی مدد سے ایسے کامل یقین کے ساتھ کام کرتا ہے، گویا وہ صاف صاف صفحۂ قرطاس پر مجسم بن چکے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان نازک اور نفیس ترین اصولوں کو ہمیشہ اس انداز سے محسوس نہیں کرایا جاسکتا، جس انداز سے آرٹ کے موٹے موٹے اور بھدے قاعدوں کو محسوس کرایا جاسکتا ہے۔ تاہم مذکورہ بالا بیان سے اس کے سوائے اور کوئی لازمی نتیجہ نہیں نکلتا کہ نفس کو اس انداز سے تربیت دی جانی چاہیے کہ وہ ایک ایسے سائینٹفک احساس کی مدد سے تصویر کے موضوع کا ادراک کرسکے، جس کی موزونیت کو الفاظ عمدگی سے ادا نہیں کرسکتے۔"

یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ سائنس کا تعلق تمام تر صداقت سے ہوتا ہے، اور آرٹ کا صداقت اور حسن، دونوں سے۔ لیکن تصویر کی ترتیب کے وقت ان دونوں میں جب حقِ ترجیح کا سوال پیش آتا ہے، تو

ایک نظر

از وفا امتھوی

دیکھنے کو تجھے، بیتاب ہوا جاتا ہوں!
جیسے اک پیکرِ سیماب ہوا جاتا ہوں!
تپشِ شوق سے، پیہم ہی پھنکا جاتا ہوں!
شعلۂ عشق سے، جلتا ہوں بھنا جاتا ہوں!

سامنے آکہ تجھے ایک نظر دیکھوں گا!

روسیہ رات کی بکھری ہیں گھنیری زلفیں!
بھیچ گئیں، نور کو آغوش میں لیکر پلکیں!
اور یہ سہما ہوا، سمٹا ہوا، منظر شاید
آگیا شہرِ خموشی سے گذر کر، شاید!

سوچتا ہوں اس اندھیرے میں کدھر دیکھوں گا!
سامنے آ ________ !

دل کی دھڑکن کے سوا ساری فضا ہے خاموش!
جیسے کوئی نہیں دنیا میں ہے منت کشِ ہوش
ہاں مگر ایک تو ہے جس سے نہیں جی کو لگاؤ!
نیلی ندی میں شکستہ سی وہ چاندی کی ہے ناؤ

اتنی فرصت ہے مگر کب؟ جو ادھر دیکھوں گا
سامنے آ ________ !

گاہے احساس دلاتا ہے، مسلسل یہ سکوت!
مجھ میں ناچیں گے ابد تک ترے تخئیل کے بھوت
اس تخاطب سے معاً، دہشت ہی کانپ اٹھتا ہوں
کانپ اٹھتا ہوں کبھی کانپ کے ہانپ اٹھتا ہوں

خود کو کب تک؟ یونہی محرومِ اثر دیکھوں گا!
سامنے آ ________ !

جانِ مستغنی آرام ہے، آنکھیں بے خواب!
آرزو وقفِ خلش، اور تمنا بیتاب!
جرأتیں اب تو ہوئی جاتی ہیں پامال! افسوس!
پڑتی جاتی ہے مرے دیدۂ امید پہ اوس!

کس طرح! تجھ کو سوئے راہ گذر دیکھوں گا!
سامنے آ ________ !

اہمیتِ صحرا اور موجودہ حالت پر نظرِ ثانی

کوئی گناہ کی پھٹکار جو قدرت کے خلاف عمل میں لائی گئی ہو، اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی کہ دھرتی ماتا کو اس کی سبز پوشش سے ہٹایا جائے۔ جنگلات بالواسطہ اور بلاواسطہ زندگی کا مصرف ہیں۔ اول الذکر بلحاظ اپنی پیداوار کے، موخر الذکر بسبب موسم، باقاعدگی نمی و حفظ صحت اور خوبی اثرات کے۔

بالواسطہ مصرف صحرا کو پیداوار کلی و ذیلی میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پیداوار کلی چوبینہ، ہیزم اور کوئلہ پر مشتمل ہے۔ قطع نظر لکڑی کے صحرا سے بے شمار پیداوار، مثلاً چھال (جو عموماً دباغت کے کام آتی ہے) گوند، شہد، موم، لاک، بانس، بید، پتے، پھول، بیج، گھاس وغیرہ برآمد ہوتے ہیں۔ یہ تمام پیداوار ذیلی میں شمار کئے جاتے ہیں۔ دراصل پیداوار ذیلی بہ نسبت پیداوار کلی کے زیادہ قیمتی ہے۔ پیداوار ذیلی کا بیشتر حصہ بغیر صحرائی چوبینہ کو نقصان پہنچائے صحرا سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہر وقت اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اکثر ہم کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ آیا ہم اپنے جنگلات سے چوبینہ حاصل کریں گے یا کوئی ذیلی پیداوار۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، بالواسطہ فوائد کے علاوہ صحرا کے بلاواسطہ بہت سے فوائد ہیں جو کسی طرح بالواسطہ فوائد سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔ بعض صورتوں میں بلاواسطہ فوائد بہ نسبت بالواسطہ فوائد کے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک زمین کا ٹکڑا جو سبز پوش ہے، مختلف اسباب طبعی کو خوشگوار بنا کر سورج کی گرمی کو کم اور ہوا کو جو پرتِ زمین سے متصل ہے معتدل کرتا ہے۔

ان اسباب کو حسب ذیل طریق پر اختصار سے بیان کیا جاتا ہے:۔

الف۔ درختوں کا گھنا تاج زمین سے کسی قدر بلندی پر ایک چھت بناتا ہے جو سورج کی شعاعوں اور برسات کے پانی کو زمین پر گرنے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ یہ شامیانہ ہوا کے جھونکوں کو روکتا، اور رات کے وقت گرمی کو کم کرتا ہے۔

ب۔ پتے اور گھاس گرمی کا مقابلہ کر کے پرتِ زمین کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہوا اور پانی جو اس میں جذب ہوتے ہیں اس پر بڑا اثر کرتے ہیں۔

ج۔ درختوں کی جڑیں زمین کے اندر پھیلتی اور اس کی ساخت کو مضبوط رکھ کر مٹی کے بہہ جانے کو روکتی ہیں۔ اس کے برخلاف یہی جڑیں ایسی زمین کو جو سخت ہے ڈھیلی کرتی ہیں۔

ان کارکنوں کے اثرات پر ہمیشہ غور کیا جا چکا ہے اور بعض صورتوں میں ایسے زمانے کی بھی تحریرات محفوظ ہیں کہ جن کا ٹھیک پتہ نہیں چلایا جا سکتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ صحرائی اثر کے فرق کو ان کارکنوں کے

مقابلے میں کس طرح پہچانا جائے۔ کیونکہ ہر ماحول میں مختلف النوع اسباب وقت واحد میں سرگرم کار ہیں۔ مثال کے طور پر صحرائی اثر مختلف وجوہ سے اعتدال پذیر ہوتا ہے۔ جیسے جغرافی محل وقوع سطح سمندر سے بلندی۔ ڈھال۔ عام ہیئت بالائی و زیریں پرت زمین کی قدرتی ساخت اور وسعت جنگلات وغیرہ۔

ملے جلے اسباب کی وجہ سے جو وقت واحد میں سرگرم کار ہیں، اور معلومات کی کمی کی وجہ سے بعض تجربے قومی معاشرہ میں اہمیت صحرا کے متعلق مبالغہ آمیز ہوگئے ہیں۔ حالانکہ دیگر ممالک اس کی اہمیت کی طرف مائل نظر آتے تھے۔ یہی تجربے بیاکورل کو فرانس میں اور نار ڈلنجرا ور کینیرل کو جرمنی میں رہبری کے موجب ہوئے۔ اس کے بعد انہی تجربات کو تیتھو نے فرانس میں اور رابرسیر نے جرمنی میں وسعت دی۔ ان تجربوں کے نتائج اس قدر دلچسپ ثابت ہوئے کہ دوسرے ملکوں نے ان کی تقلید کی۔ ان تجربات کی تفصیل میں جانا غیر ضروری ہے۔ ہمارے مطلب کے لئے یہ بات کافی ہے کہ ۱۹۳۵ء میں جو صحرائی برٹش امپائر کمیٹی منعقد ہوئی تھی اس کے اقتباس کو جو تمام مشاہدات کا امتحان کرنے کے بعد مقرر ہوئی تھی درج کیا جائے۔

موسم پر صحرائی اثر

الف۔ حرارت: پودے ہوا کی حرارت کو کم کرتے ہیں۔ زندہ پودے اس قدر جلد گرم نہیں ہوتے جتنا کہ چٹان یا کھلی زمین۔ پودوں کے نیچے کی زمین سورج کی شعاعوں سے بہت زیادہ گرم نہیں ہوتی، کیونکہ یہ سبز شامیانے سے ڈھکی ہوتی ہے۔ پس صحرا زمانۂ بالیدگی میں ہوا کی حرارت کو ان کے اطراف اور اندر کم کرتا، اور سبز زمین کی حرارت کو کم کر کے برودت پیدا کرتا ہے۔ صحرا عام طور پر موسم سرما میں سردی کو کم کرتا ہے جیسا کہ شدت گرمی سے اکثر نقصانات ہوتے ہیں، اس کی تلافی سردی سے جو صحرائی اثر کے تحت ہے، بہت زیادہ مفید ہوتی ہے۔

ب۔ ہوا: صحرا ہوا کا زور کم کر کے حرارت میں کمی اور ہوا میں خلا پیدا ہونے نہیں دیتے۔ صحرا مقامی ہواؤں پر اثر پذیر ہوتے ہیں، اس لئے کہا گیا ہے کہ صحرا ہوائی برے اثرات کو زائل کرنے میں بالکلیہ مفید ہیں۔

ج۔ بارش: بہ نسبت گنجان صحرا کے کسی مقام کی جغرافی ہیئت اصلی بارش پر بہت زیادہ اثر پذیر ہوتی ہے، اس کے برخلاف صحرا ان ہواؤں کی گرمی کو جو رطوبت سے بھری ہوئی ہیں، کم کر کے مقامی بارش پر اثر انداز ہوتا ہے۔

د۔ فضائی رطوبت: گنجان درختوں کی وجہ سے بہ نسبت میدان کے صحرا میں ہوائی نمی بلند رہتی ہے۔ انتقال حرارت کا سلسلہ خود بخود صحرا کے اندر قریب کی

نمی کو بڑھانا اور حرارت کو گھٹا کر انتہائی درجۂ حرارت پر لے جاتا ہے ۔

۷ ۔ بھاپ : تجربوں سے ظاہر ہوا کہ زمینی حرارت بہ نسبت کھلے میدان کے صحرا میں کم ہے ۔ جس قدر ہوا زیادہ ہوگی اسی قدر حرارت بلند اور نمی نیچے ہو کر زمینی حرارت کو بڑھائے گی ۔ نتیجہ کے طور پر صحرا حرارت کو کم اور قریبی نمی کو بڑھا کر ہوا کی رفتار کو کم کر کے حرارت میں کمی کرتا ہے ۔ تجربے یہ بھی بتلاتے ہیں کہ میدان اور صحرا کے مقابلے میں پانی کی سطح پر حرارت کم ہوتی ہے ۔ پودوں کی خاصیت سے حرارت میں اختلاف ہوتا ہے لیکن پھر بھی باوجود مختلف درختوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کے صحرائی خاصیت سطح زمین سے حرارت کو کم کرتی ہے ۔

مقامی موسم پر صحرا کی تباہی کے اثر کو کمیٹی نے اختصار و صحت سے حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے :-

"موسم ، باوجود ان تمام اسباب کا مجموعہ ہونے کے صحرا کو تباہ کر کے بلا شبہ زمین کے ایک بہت بڑے حصہ کو برباد کرتا ہے ۔ ایسی صورت میں کسی ملک کی آب و ہوا کو قدرے نو پیدائش صحرا ہی برداشت کر سکتا ہے ۔ وسیع قدرتی صحرائی رقبوں کی مسلسل تباہی نتیجہ ہے سطح زمین کا خشک ہو کر پھٹ جانا اور افلاس پیدا کرنا ۔"

پس اس سے صاف ظاہر ہے کہ صحرا ، قدرت اور معاشرہ میں اہم حصہ لیکر انسان کے لئے بعض ضروری مفید اشیاء مثلاً ہیزم ، تیل ، گوند ، گھانس وغیرہ فراہم کرتے ہیں ۔

یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ صحرا انسانی سلامتی کے لئے ضروری ہے ، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملک کے رقبے کا کتنے فی صد رقبہ صحرائی رکھا جائے ۔

ہمارے ملک میں جو ہیزم استعمال کیا جاتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ایک اوسط خاندان کے لئے جو پانچ آدمیوں پر مشتمل ہو ، روزانہ (۵) پونڈ سے (۱۰) پونڈ تک ہیزم کی ضرورت ہوتی ہے ۔ یہ شہری اعداد و شمار ہیں جہاں ہیزم کے استعمال کی معاشرہ کو شدید ضرورت ہے ، جو صرف پکوان کی حد تک استعمال میں لایا جاتا ہے ۔ دیہات میں عموماً لوگ زیادہ ہیزم استعمال کرنے کے عادی ہیں ۔ شہر اور دیہات میں ہیزم کی کچھ مقدار اشیاء کو گرم کرنے کے کام میں لائی جاتی ہے ۔ کم سے کم گھریلو ضروریات کے لئے فی یوم (۸) پونڈ ہیزم ایک خاندان کے لئے کافی ہے ۔ جیسا کہ ممالک محروسہ کی اوسط آبادی فی مربع میل (۱۹۶) ہے تو سالانہ ایک مربع میل میں بسنے والے خاندانوں کو (۱۴۳۰۸۰) پونڈ یا (۶۴) ٹن لکڑی کی ضرورت ہوگی ۔ اب ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ جنگل کا کتنا رقبہ (۶۴) ٹن ہیزم پیدا کر سکتا ہے ۔ ہندوستان کے کھلے صحرا میں ایک ایکڑ میں اوسط ½ ٹن ہیزم برآمد ہوگا ۔ لہذا (۶۴) ٹن کے لئے (۱۲۸) ایکڑ صحرا کی ضرورت ہوگی ۔ بہ الفاظ دیگر ہر ایک مربع میل میں (۱۲۸) ایکڑ یا صرف گھریلو ضروریات کے لئے ہیزم پیدا ہونے کے لئے (۲۰) فی صد رقبہ کی ضرورت ہے ۔ گھریلو ضروریات کے علاوہ ہیزم کو

بہت سی ضروری بنیادی صنعتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً اینٹ بنانا۔ چونا جلانا اور لوہا پگھلانا وغیرہ۔ یہ کام ملک کے ہر گاؤں میں ہوتے رہتے ہیں۔ خاصکر شہری لوگ بجائے ہیزم کے کوئلہ زیادہ مقدار میں جلا رہے ہیں اور یہ بہت اچھا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ کوئلہ ہیزم کی جگہ لے، دیہات میں لوگوں کی عادت اور ان کے چولھوں کی بناوٹ ایک عرصہ تک یوں ہی قایم رہے گی۔ بڑے شہروں میں کوئلہ کا استعمال عام ہوتا جا رہا ہے۔ ہیزم کی مانگ سے نجات دلانے کا یہ شگون نیک ہے۔ ہیزم کے علاوہ ہماری آج کل کی اعلیٰ مخلوط سوسائٹی میں چوبینہ بھی زیادہ استعمال میں آرہا ہے۔ در اصل چوبینہ کا استعمال اس قدر کثرت سے ہے کہ یہ خیال کرنا ممکن ہے کہ انسان بغیر لکڑی کے نہیں رہ سکتا۔ چوبینہ کے بڑھتے ہوئے کثرتِ استعمال کا یہ مطلب ہوا کہ علاوہ ہیزم کے ہم کو ایک بہت بڑا صحرائی رقبہ درکار ہے۔ چوبینہ کے علاوہ ذیلی پیداوار کثرت سے استعمال میں لائی جا رہی ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ ذیلی پیداوار چوبینہ و ہیزم کی پیداوار پر اثر انداز ہوتی ہے۔ پس اس سے ظاہر ہوا کہ جملہ صحرائی رقبہ (۲۰) فی صد سے زاید ہونا چاہیے جس سے ہیزم برآمد ہوگا۔ ہماری یہ غلطی نہ ہوگی اگر ہم اس رقبہ کو (۲۵) فی صد بڑھائیں۔

ایک دوسرا سوال یہ ہے کہ کسی ملک کی ضرورت کے لئے کم سے کم کس قدر رقبہ صحرائی رکھا جائے۔ یورپ کے ممالک میں بلحاظ آبادی فی نفر ایک ایکڑ جنگل کی ضرورت ہے۔ اس طرح حیدرآباد میں فی مربع میل (۱۹۶) ایکڑ صحرا کی ضرورت ہے۔ اس کا اوسط (۳۰) فی صد ہوگا۔

مذکورۂ بالا اعداد و شمار کو ممالک یورپ و امریکہ کے حوالوں سے جانچا جا سکتا ہے۔ یہ معلوم کیا گیا ہے کہ فرانس اور جرمنی میں (۲۵) فی صد صحرائی رقبہ کی ضرورت ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ کے متعلق ایک مصنف نے یوں خامہ فرسائی کی ہے:۔

> "قوموں کی ضروریاتِ زندگی کے لئے زمین کی خیالی تقسیم قدرتاً بہت زیادہ ہوگی۔ معیارِ زندگی میں صنعتی و معاشرتی ترقی کے لحاظ سے ممالک متحدہ امریکہ میں حسب ذیل اعداد و شمار بلحاظ اوسط ضرورت فی ½ ایکڑ زمین برائے کاشت، ۳ ایکڑ برائے جنگلات ضروری ہے۔ یہ اعداد و شمار مشرقی ممالک کے لئے کم ہونا چاہیے، کیونکہ یہاں کا معیارِ زندگی گھٹا ہوا ہے۔ کسی گنجان آبادی کے ملک میں صحرائی زمین اور چرائی کے قدرتی ذریعے کم اعداد و شمار سے پہچانے جا سکتے ہیں۔"
>
> (ڈاکٹر آر۔ ایم۔ گوری)

اس طرح حساب کرنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں کل زمین کا (۲۵) فی صد رقبہ صحرائی ہونا چاہیے۔ اگر زراعتی و معاشرتی ترقی حاصل کرنا مقصود ہو تو بعض مستثنیات ہیں۔ مثلاً برطانیہ۔ ہالینڈ۔ بلجیم اور ڈنمارک۔ برطانیہ کی حالت جداگانہ ہے، وہ ہمیشہ اسکنڈینیویا کے ممالک اور ماتحت سلطنتوں سے درآمد کرتا ہے۔ لیکن تاہم برطانیہ بھی گزشتہ جنگ کے تجربوں کے بعد سے

یہ ضروری خیال کرتا ہے کہ اپنا صحرائی رقبہ بڑھایا جائے۔ خاص اسباب کی بناء پر ہالینڈ بلجیم، ڈنمارک میں افزایش صحرا خارج از بحث ہے۔

اب ہم کو حیدرآباد کی حالت پر غور کرنا چاہیے۔ حسب ذیل تختہ سے مختلف قسم کے صحرائی رقبہ کا حال معلوم ہوتا ہے:۔

ممالک محروسہ کے صحرائی ڈویژن

نمبر شمار	نام ضلع	نام ڈویژن	ضلع کا رقبہ مربع میل میں	صحرائی رقبہ مربع میل میں: صحرائے محصورہ	صحرائے محفوظہ	صحرائے بیرونی	جملہ	ضلع کا موجودہ صحرائی رقبہ
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹
۱	شہر حیدرآباد	x	۵۳	x	x	x	x	x
۲	اطراف بلدہ	x	۲۶۵۱	x	x	x	x	x
۳	ورنگل	ورنگل	۷۹۴۴	۱۶۲	۱۱۸۴٫۴۰	۷٫۱۵	۳۱۱۹٫۵۵	۲۶٫۶۸
		کھمم پیٹھ	x	۲۰۶٫۷۱	۵۱۶٫۳۴	۲۰۲٫۶۳		
۴	کریم نگر	کریم نگر	x	۴۵۷٫۴۱	۳۷۹٫۶۲	۲۴۴٫۳۴		
		سرسلہ	۵۷۲۲	۹۵٫۳۵		۶٫۹۵		
۵	عادل آباد	آصف آباد	۴۲۹۴	۱۳۰٫۷۳	۱۶۰۶٫۰۰	۴۳٫۵۰	۳۱۸٫۹۴	
		نرمل	x	۳۴۶٫۷[illegible]	۹[illegible]	۱۰۲٫۲۵		
۶	میدک	میدک	۳۱۹۸	۱۳۹٫۶۱	۱۳۴٫۶۲	۵۱٫۶۱	۳۲۵٫۸۸	۱۰٫۱۹
۷	نظام آباد	نظام آباد	۳۲۶۵	۵۸٫۳۳	۲۴۵٫۰۷	۱۹٫۱۰	۳۳۶٫۸۰	۱۰٫۳۲
		دیگلور	x	x	x	۱۴٫۳۱		
۸	نلگنڈہ	نلگنڈہ	۶۰۴۹	۴۳٫۲۶	۲۶۸٫۵۵	۸۱٫۹۷	۳۹۳٫۷۸	۶٫۳۱
۹	محبوب نگر	محبوب نگر	۵۳۲۶	۲۸٫۳۰	۹۰۶٫۶۸	۲۳٫۲۳	۹۵۸٫۲۱	۱۸٫۰۰
۱۰	اورنگ آباد	اورنگ آباد	۶۲۱۲	۱۸٫۲۵	۲۶۰٫۶۶	۶٫۸۵	۲۸۵٫۷۶	۴٫۶۰
۱۱	بیڑ	اورنگ آباد	۴۱۳۲	۷٫۳۷	۴۳٫۲۵	۵٫۶۵	۵۱٫۲۷	۱٫۲۴
۱۲	ناندیڑ	ناندیڑ	۵۱۲۵	۸۵٫۵[illegible]	۶۴٫۵۴	۲۶٫۰۹	۱۴۹٫۱۳	۲٫۵۲
۱۳	پربھنی							
۱۴	گلبرگہ	گلبرگہ	۶۹۷۵	۴۸٫۸۱	۱۴۷٫۴۵	۳۹٫۸۰	۲۳۶٫۰۶	۳٫۳۸
۱۵	عثمان آباد	”	۳۵۲۶	x	x	x	x	x
۱۶	رائچور	”	۶۶۳۷	۱٫۱۴	۱۱۰٫۰۷	۱۱٫۴۸	۱۲۲٫۹۶	۱٫۸۵
۱۷	بیدر	”	۴۸۲۵	۳٫۲۳	۷٫۶۹	۴٫۷۱	۱۵٫۶۳	۰٫۳۲
	میزان		۸۲۶۹۸	۱۶۷۵٫۶۴	۶۹۵۲٫۵۸	۷۲۸٫۸۱	۹۳۵۷٫۳۰	۱۱٫۳۱

ممالک محروسہ کا رقبہ (۸۲۶۹۸) مربع میل ہے جس کے منجملہ صرف (۹۳۵۷٫۳) مربع میل رقبہ صحرائی ہے۔ اس میں خانگی جنگلات کا رقبہ بھی شریک ہے! اس سے متعلق صحیح امداد و شمار معلوم نہ ہو سکے لیکن اندازاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ خانگی جنگلات کا صحرائی رقبہ سرکار عالی کے صحرائی رقبہ کا ۲۵ فی صد ہے۔ سوائے

بڑی جاگیرات اور ریاستوں کے خانگی صحرا کی حالت تباہی کی طرف تیزی سے بڑھتی جارہی ہے۔ دوسری بدقسمتی یہ ہے کہ سرکاری و خانگی صحرا کا ۵۰ فی صد رقبہ پہاڑوں اور چٹانوں پر واقع ہونے سے ناقابل پیدا وار ہے۔

ہمارے صحراؤں کے رقبہ کی کمی کو معلوم کرنے کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے یہ امر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اس کا مقابلہ برٹش انڈیا کے مختلف صوبوں سے کیا جائے۔

۱۹۴۰-۴۱ء میں سرکار عظمت مدار کا صحرائی رقبہ مربع میل میں

صوبے	جملہ رقبہ	ممالک محروسہ کا صحرائی رقبہ			خانگی صحرا	جملہ	فیصد صحرائی رقبہ بمقابلہ صوبوں کے بلحاظ خانہ نمبر ۲
		صحرائی رقبہ	دوسرے جنگلات	جملہ			
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸
اجمیر مارواڑہ	۲،۳۶۷	..	۷۳	۷۳	..	۷۳	۳
انڈیمان نکوبار	۲،۵۰۸	۱،۳۹۸	۷۹۱	۲،۱۸۹	..	۲،۱۸۹	۸۷
آسام	۵۵،۳۴۵	۲۲،۸۴۱	..	۲۲،۸۴۱	..	۲۲،۸۴۱	۴۱
بلوچستان	۵۲،۹۲۵	..	۲،۲۱۸	۲،۲۱۸	..	۲،۲۱۸	۴
بنگال	۷۸،۷۰۸	۶،۳۳۹	۵،۹۵۴	۱۲،۲۹۳	۱،۵۹۶	۱۳،۸۸۹	۱۷
بہار	۶۹،۳۴۸	۱،۷۰۱	۶۳۱	۲،۳۳۲	۷،۵۸۵	۹،۹۱۷	۱۴
بمبئی	۷۶،۰۲۶	۶،۵۵۴	۶،۳۶۶	۱۲،۹۲۰	..	۱۲،۹۲۰	۱۷
سی پی اور برار	۹۸،۵۷۳	۱۴،۴۴۳	۸،۶۳۱	۲۳،۰۷۴	۲۴،۳۱۲	۴۷،۳۸۶	۴۸
کورگ	۱،۵۸۲	۵۱۷	۳۱۸	۸۳۵	۳۴۷	۱،۱۸۳	۷۵
مدراس	۱،۲۵،۱۶۳	۶،۵۳۹	۱۲،۲۶۹	۱۸،۸۰۸	۱۴،۸۶۱	۳۳،۶۶۹	۲۷
شمال مغربی صحرائی صوبے	۱۳،۰۹۹	۱۴۶	۳۱۴	۴۶۰	۱۳۳	۵۹۳	۵
اڑیسہ	۳۲،۳۹۸	۱،۴۵۴	۸۱۴	۲،۲۶۸	۶،۷۷۸	۳،۹۴۵	۱۲
پنجاب	۹۶،۸۳۰	۱،۹۷۷	۴،۳۲۴	۶،۳۰۱	۲۰۲	۶،۵۰۳	۷
سندھ	۴۷،۱۵۵	۱،۱۳۵	..	۱،۱۳۵	..	۱،۱۳۵	۲
متحدہ صوبے	۱،۰۶،۲۴۸	۳،۴۹۱	۱۰،۷۸۴	۱۴،۲۷۵	۳،۰۹۷	۱۷،۳۷۲	۱۶
میزان	۸،۵۸،۳۷۵	۶۸،۶۳۵	۵۳،۳۸۶	۱،۲۲،۰۲۱	۵۳،۸۲۱	۱،۷۵،۸۴۲	۲۰

بقیہ مضمون ملاحظہ ہو صفحہ (۴۱) پر

ادارہ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے	پائی
سرگزشت حاتم	۱۲۸	۲	۰	۰
سرگزشت غالب	۹۴	۰	۸	۰
نظام الملک	۴۰	۰	۶	۰
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خان	۱۶	۰	۲	۰
سر سالار جنگ	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر	۲۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۳	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰	۰
حیدرآباد	۸۵	۰	۱۰	۰
عماد الملک	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۶	۰
" " دوسری کتاب	۵۶	۰	۶	۰
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	-	۰
کاغذ کی ناؤ	۱۴۰	۱	۴	۰
فن تقریر	۹۲	۰	۱۲	۰
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۳	۱	۰	۰
ہندوستانی تمدن	۱۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی	۸۰	۰	۱۰	۰
مہ لقا	۱۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۶	۰
رسائل طیبہ	۳۹۰	۲	۸	۰
سلک گوہرین	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو	۱۷۲	۱	۸	۰
اشوک اعظم	۵۶	۰	۸	۰
باتیں	۸۴	۱	۰	۰
یورپ جنگ سے پہلے	۲۱۸	۲	۸	۰
شہ د ‌ـبال	۱۷۹	۲	۸	۰
. یائی زبان‌ـن	۱۰۲	۱	۰	۰
ظ‌م علی خان	۳۰	۰	۴	۰
‌ـدرہ اردو ـ مخطوطات جلد اول	۲۹۶	۵	۰	۰
عرب اور عربستان	۵۶	۰	۱۰	۰
سچ کا جادو	۴۸	۰	۴	۰
طبیعاتی کائنات	۹۸	۰	۸	۰
متاع سخن	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
معراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۴۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵تصاویر)	۵۰۰	۵	۰	۰
" " دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
معروم ذمہ	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن	۱۵۳	۱	۴	۰
روح غالب	۱۴۰	۲	۸	۰
عاصمہ	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۴	۱	۱۲	۰
نمود زندگی	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگزشت ادارہ	۳۰۰	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۲۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان	۳۲	۰	۳	۰
خطابیات	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار	۱۶۸	۱	۸	۰
تشمش دانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
کارمان دتاسی	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت	۵۲	۰	۸	۰
ادارہ سنہ ۱۹۴۱ع میں	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ	۲۴	۰	۴	۰
افضل الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خان	۳۲	۰	۴	۰

(ماہ نامہ)

سب رس

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳

نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰

ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹

چندۂ سالانہ چار روپے آٹھ آنے

بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

خواجہ حمید الدین ایم اے

سکینہ بیگم

سب رس

جلد ۹ — بابت ماہ جنوری ۱۹۴۶ء — شمارہ ۱

فہرست مضامین

اردو میں سائنسی ادب

شمس الامراء اور شاہان اودھ کے بعد اردو کو علمی موضوعات سے روشناس کرانے کی باضابطہ اور منظم کوشش دہلی کالج میں کی گئی۔ اس کا دائرۂ عمل ان دونوں سے زیادہ وسیع اور منظم تھا۔ خوش قسمتی سے اس کو ایسے ذی علم اصحاب مل گئے تھے جنھوں نے اردو کے ہی۔ دامن کو مغربی علوم کے جواہر پاروں سے مالا مال کر دیا۔ چونکہ اس کالج کا ذریعہ تعلیم اردو تھا اس لئے نصابی ضروریات کے تحت سائنس اور دیگر مغربی علوم کی کئی کتابوں کے ترجمے کئے گئے اور اس کے فیض یافتوں نے بھی اس قسم کی کتابیں تالیف کیں۔ مختلف علوم اور سائنس کی اشاعت کے لئے سنہ ۱۸۴۳ء میں دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جس نے پہلی دفعہ ترجمے کے ایسے اصول مرتب کئے جو ترجمے کی مشکلات کو دور کرنے میں بڑی حد تک ممد و معاون ثابت ہوئے۔

اگرچہ یہ کالج سنہ ۱۷۹۲ء میں قائم ہوا لیکن اس کے ابتدائی (۳۰) سال کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ البتہ یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس عرصہ تک اس میں انگریزی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ مثل دوسرے مدارس کے عربی فارسی کی مروجہ تعلیم ہوتی ہوگی۔ مجلس تعلیم عامہ کی سفارش پر ۱۸۲۵ء میں اس کالج کے لئے پانسو روپے ماہانہ مقرر کئے گئے اور باضابطہ تعلیم کا انتظام عمل میں آیا۔

۱۸۲۸ء میں چارلس مٹکاف کی سفارش پر ایک انگریزی جماعت کھولی گئی۔ نواب اعتماد الدولہ سید فضل علی خاں بہادر وزیر بادشاہ اودھ نے ۱۸۲۹ء میں ایک لاکھ ستر ہزار روپے تعلیمی اغراض کے لئے وقف کر دیے۔

اس کالج کی سب سے بڑی خصوصیت اور اس کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ یہاں ذریعہ تعلیم اردو تھا اور سوائے انگریزی کے دوسرے تمام مضامین مثلاً ریاضی، فلسفہ ہیئت

(دہلی کالج کی خدمات)

اور سائنس کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ مغربی علوم کو اردو میں پڑھانے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ ان علوم پر اردو میں کتابیں نہیں لکھی گئی تھیں۔ اردو کے حامیوں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے سنہ ۱۸۲۳ء میں ایجوکیشنل کمیٹی قائم کی۔ اس سے قبل اسکول بک سوسائٹی کی طرف سے ہزاروں نصابی کتابیں تیار ہو کر شائع ہوئیں لیکن یہ سب ابتدائی قسم کی کتابیں تھیں۔ سنہ ۱۸۳۱ء میں ایجوکیشنل کمیٹی کے تحت ایک ذیلی کمیٹی کا قیام عمل میں آیا جس میں ایسے اصحاب کا انتخاب عمل میں آیا جو انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ کرنے کے اہل تھے۔ کمیٹی نے یہ طے کیا کہ درسی کتابوں میں یکسانیت اور ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے کتابیں پہلے انگریزی میں منگوائی جائیں اور پھر ان کا اردو میں ترجمہ کرایا جائے۔

دہلی ورنیکلر سوسائٹی کے قیام کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ جدید ترین کتابوں کی تالیف اور ترجمے کے ذریعہ سے اردو زبان کو ترقی دی جائے۔ اس مقصد کو آگے بڑھانے میں ہندوستانی اور انگریز برابر کے شریک تھے۔ اس سوسائٹی کے اخراجات کی پابجائی کے لئے چندے اور عطیے لئے گئے۔ شاہ اودھ، ان کے صاحبزادے اور ان کے متعدد امراء نے بھی عطیے دیے۔ اسی طرح حیدرآباد دکن سے نواب سراج الملک بہادر نے بھی رقمی عطیوں سے اس سوسائٹی کی مالی امداد کی۔ اس سوسائٹی کے سکرٹری مسٹر بتروس پرنسپل دہلی کالج تھے۔

سوسائٹی نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے جو قواعد وضع کئے تھے ان کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

(۱) سائنس کا کوئی ایسا لفظ جس کا مترادف اردو میں نہ ملے تو ایسے لفظ کو اردو میں بجنسہ لے لینے میں کوئی قباحت نہیں۔ مثلاً سوڈیم، کلورین وغیرہ۔

(۲) اگر سائنس کا کوئی لفظ ایسا ہے جس کا مترادف اردو میں موجود ہے تو اردو لفظ ہی استعمال کیا جائے جیسے

آکسیجن کے لئے مولدِ حموضہ، ہائیڈروجن کے لئے مولدِ ماء، نائٹروجن کے لئے مولدِ شورہ، سلفر کے لئے گندھک وغیرہ۔

(۳) یہ ضروری نہیں کہ جو انگریزی الفاظ اردو میں لئے جائیں ان کو بجنسہ لکھا جائے بلکہ انہیں اردو میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے مثلاً جسٹس آف دی پیس کو اردو میں جسٹس پیس کہہ سکتے ہیں۔

(۴) سائنس کی کتابوں کا ترجمہ چونکہ انگریزی ہی سے کیا جائے گا اس لئے انگریزی الفاظ کا اردو میں استعمال ناگزیر ہے۔ بعض الفاظ ایسے ہیں کہ جن کے مترادف کسی نہ کسی صورت میں اردو میں پائے جاتے ہیں تاہم انگریزی الفاظ اردو میں منتقل کر لئے جائیں تو کوئی ہرج نہیں مثلاً (Genus, Species, Order) وغیرہ

(۵) یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ جہاں تک آسانی سے ممکن ہو، انگریزی الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا جائے۔ جو شخص کسی سائنس کی کتاب کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ اس سائنس پر جو کتابیں اردو میں اس سے قبل لکھی جا چکی ہیں انھیں پیش نظر رکھے اور وہی اردو الفاظ اور اصطلاحیں استعمال کرے جو ان کتابوں میں استعمال ہوئی ہیں۔

(۶) اگر انگریزی جملے میں کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ ہو جس سے اہل ہند ناواقف ہوں تو مترجم کو چاہیے کہ حاشیہ پر یا مناسب ہو تو متن میں مختصر طور پر اس کی تشریح کر دے۔

(۷) ترجمہ لفظی نہ ہو بلکہ اردو میں مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۸) کیمسٹری کی اصطلاحات کو بجنسہ اردو میں لے لیا جائے۔ البتہ کیمیائی عناصر جن کے نام اردو میں موجود ہیں تو انھیں برقرار رکھا جائے لیکن مرکبات کے نام انگریزی ہی میں رہیں جیسے ہائیڈرو سلفرک۔ سلفرک ایسڈ وغیرہ۔

دہلی کالج نے اردو میں سائنس کی جو کتابیں شائع کیں ان کی اشاعت میں مسٹر بتروس پرنسپل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے یہ کام چھوٹے پیمانہ پر شروع کر دیا تھا جب سوسائٹی قائم ہوئی تو اس کا کام بھی کالج والے ہی کرتے تھے۔ ورنیکلر سوسائٹی ٹرانسلیشن سوسائٹی اردو سوسائٹی۔ لائبریری آف یوسفل نالج وغیرہ سب اسی کے نام ہیں۔ مسٹر بتروس کے وظیفہ پر ڈاکٹر اسپرنگر پرنسپل ہوئے جو ان کے صحیح معنوں میں جانشین تھے۔

اس انجمن کے قیام سے قبل دہلی کالج میں ترجمہ کا کام شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس کالج کے تین طالب علم (جن میں ماسٹر رامچندر پیش پیش تھے) اوقات درس کے بعد فلسفہ اور ریاضی وغیرہ کی کتابوں کا ایک ایک صفحہ اردو میں ترجمہ کر کے مسٹر بتروس کو دکھاتے اور وہ اس ترجمے کی اصلاح کرتے تھے۔ اس طرح جب ترجمہ مکمل ہو جاتا تو طباعت کے بعد نیچے کی جماعتوں کے نصاب میں داخل کر دیا جاتا۔ دہلی کالج میں تراجم کی ابتدا سنہ ۱۸۴۱ء میں ہوئی جبکہ مسٹر بتروس کا تقرر کالج کی پرنسپلی پر ہوا۔ ۱۸۴۵ء تا ۱۸۵۳ء کے نصاب کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ سائنس کی تعلیم کس درجے تک تھی۔ ۱۸۵۰ء میں تو سائنس کی جماعت الگ قائم ہو گئی تھی اور جماعت اول تا ششم کی اردو میں سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی۔

غرض دلی کالج ہی ایک ایسی درسگاہ تھی جہاں مغربی علوم مثلاً ہیئت، ریاضیات، فلسفہ وغیرہ کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی اور نتائج ہر سال اچھے رہتے تھے۔ چنانچہ مسٹر کارگل پرنسپل دلی کالج نے اپنی رپورٹ بابت سنہ ۱۸۵۲ء میں یہ لکھا ہے کہ

"مشرقی شعبے کا طالب علم اپنے مغربی شعبے والے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھا ہوا ہے۔"

اس رپورٹ پر لفٹنٹ گورنر بہادر نے اس طرح اظہار خوشنودی کیا ہے۔

"طلبہ (شعبہ مشرقی) کی سائنس کی ترقی کے متعلق

ہے کہ اگر بروقت مطالعہ کے اس کی رطب و یابس پر مطلع ہوں تو اس خاکسار کی کم استعدادی پر نظر کر کے اغماض نظر اس سے واجب جانیں بیت

بپوشش گر بہ خطائی رسی وطعنہ مزن
کہ ہیچ نفس بشر خالی از خطا نہ بود

یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت اہم اور معیار کے اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ اس ضخیم کتاب میں مترجم نے بڑی محنت اور کاوش سے پورا مواد یکجا کر دیا ہے۔ ہر مسئلہ کو نہایت وضاحت کے ساتھ سمجھایا گیا ہے۔ ہندسی اشکال اور مثالوں سے اس کی تشریح کی گئی ہے۔

"علم مثلث مستقیم الاضلاع بالہندسہ" کے تحت جدول مثلثی بنانے اور مثلثوں کے سوالات حل کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ "علم مثلث مستقیم الاضلاع بالجبر" میں جیب مستوی وجیب التمام کے جدول بنانے کی ترکیب، مثلث قائم الزاویہ۔ حادۃ الزاویہ اور منفرجہ الزاویہ کے سوالات حل کرنے کے طریقے اور پیمایش مثلثی وغیرہ کے سوالات مع امثلہ و اشکال درج کئے گئے ہیں۔ اس حصے کی ایک عبارت یہ ہے جس میں طالب علم کو تمرین کے یاد کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

"اگر طالب علم خوب مہارت پیدا کیا چاہوے علم مثلث میں اور خوب واقف ہوا چاہوے فوائد صورتوں مذکورہ بالا کے سے اور بوسیلہ ان صورتوں کے اور صورتیں پیدا کرنے کی قوت حاصل کیا چاہوے تو لازم ہے اسے کہ بہت مشق کرے اور ہر قیمت جس لاا ورجم لاا اور سکس کا مفصلہ ذیل کو خوب سمجھے اور بغیر اعانت کسی کے ثابت کرے:

اس کتاب میں جو سوالات درج ہیں ان میں سے ایک کی عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے:۔

"معلوم ہیں تینوں ضلع ایک مثلث کے۔ چاہئے ہم دریافت کرنا نصف قطر اس دائرہ کا جو بنایا جاوے بیچ اس مثلث کے۔"

"علم مثلث کروی" کے تحت قائم الزاویہ مثلثوں اور غیر قائم الزاویہ کروی مثلثوں کے سوالات حل کرنے کے طریقے بتشریح بیان کئے گئے ہیں۔

"تراشیں مخروطی" کے تحت تین قسم کے خطوط کا حال درج ہے جن کو قریب البیضوی۔ بیضوی اور بعید البیضوی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور ہر خط کے متعلق ضروری معلومات و اشکال دی گئی ہیں۔

"علم ہندسہ بالجبر" میں علامات جبریہ کے ذریعہ سے مقادیر ہندسی معلوم کرنے کی ترکیب، مساوات خط مستقیم و تراشہائے مخروطی وغیرہ کا تفصیلی بیان ہے۔

"تتمہ" کی سرخی کے تحت قوس، دائرہ، کرہ و مخروط کی مساوات کا حال درج ہے۔

اس کتاب کا اسلوب بیان تقریباً وہی ہے جو اس سے پہلے کی کتابوں کا ہے۔ عربی الفاظ کا جگہ جگہ استعمال ہوا ہے مثلاً "علی الاستقامت۔ فی النسبت۔ متقاطع علی القوایم مابین اور منطبق" وغیرہ۔ مناکو ماتا۔ ہاتھ کو ہات۔ لوکارثم کو لوکارسم لکھا ہے۔

صفحہ (۲۶) کے بعد کتاب کے آخری صفحات (۱۱۳ تا ۱۴۱) غلطی سے لگ گئے ہیں۔ یہ کتاب کتبخانہ جامعہ عثمانیہ میں نمبر (۵۱۰) پر رکھی ہوئی ہے۔

م

(باقی آئندہ)

خواجہ حمید الدین

صحیفہ مشین پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شایع ہوا۔

ترقی پسند فن کار سے

اے ہمصفیر! گو تری پرواز ہے بلند — لیکن بتا، کسی کو ترقی ہے ناپسند ؟
میری نظر سے تیرے مقاصد نہاں نہیں — تیرے خلوصِ عزم سے میں بدگماں نہیں
ہے تلخیٔ حیات سے معمور تیرا جام — تیری نظر میں قہر ہے بے ربطیٔ نظام
تیری نوا میں جذب ہے آوازِ زندگی — تیرے تفکرات ہیں دم سازِ زندگی
دل تیرا کائنات کا آئینہ دار ہے — تیری صدا شکستہ دلوں کی پکار ہے
فطرت کو تو نے طرزِ تکلم سکھا دیا — احساسِ زندگی کو ادب میں بسا دیا

لیکن، سمجھ رہا ہے یہ سارا زمانہ کیا ؟
"کہنی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا" ؟

سن! میں بتاؤں اصل حقیقت عتاب کی — اور اہلِ فن کی برہمی و اجتناب کی
وابستہ ہے جو شیشہ گرانِ ہنر سے تو — ہے دور دور اس لئے اہلِ نظر سے تو
رشحاتِ فکرِ خام کا تو پردہ دار ہے — مہمل نگارشات کا خواستگار ہے
چھوٹے مگوں کی عام ہوئیں ریزہ کاریاں — نااہلیت بھی زعمِ ہنر میں ہے سرگراں
سطحِ ادب تباہی کی آماجگاہ ہے — اور شرمسار عفتِ قلب و نگاہ ہے
تنگ آگئی ہے فکرِ فرومایہ سے نظر — ہے مرگِ ذوق، یہ ترا اندازِ درگزر!
فہرس میں کرگسوں کے جو شاہیں کا نام ہو — چرچا نہ کیوں ضمیر فروشی کا عام ہو
محصور کر رہا ہے تجھے تیرا حسنِ ظن — تو دل شکن نہیں، ترا عنوان ہے دل شکن!
ہے مضمحل ضمیر ترا قید و بند میں — ناحق الجھ رہا ہے پسند ناپسند میں
اس طرح اپنے خونِ جگر کو تلف نہ کر — فطری صلاحیت کے تحفظ پہ کر نظر

"جس کی بہار تو ہو یہ ایسا چمن نہیں
قابل تری نمود کے یہ انجمن نہیں"

ہر دور اپنے دور میں خود مجتہد رہا — مقصد حیات نو کا سدا متحد رہا
فرق و تمیز رنگ و اثر ناگزیر ہے — ہر ذوقِ تندرست، ترقی پذیر ہے
تابندہ یہ جو کاخِ علوم و فنون ہے — دیکھ، اس کے بند بند میں کس کس کا خون ہے!
تیرے بیان، تیرے قلم کی ہے جو زباں — وہ خود ہے انقلابِ مسلسل کی داستاں
نقشِ دوام گرمیٔ خونِ جگر سے ہے — یہ ارتقائے فن، تب و تابِ ہنر سے ہے
کسبِ کمال، سلسلۂ ناتمام ہے — معماریٔ سلف کا تو قائم مقام ہے
اسرارِ کائنات کا فنکار ہے امیں — اخلاصِ عالمی سے ہے پیدا دمِ یقیں
شاہیں کو احتیاجِ نشیمن، نہ انجمن — ہے شاہ باز کے لئے سارا جہاں چمن

تو اپنی جاں فشانی کا عنواں بدل کے دیکھ!
جوہر پھر اپنی ندرتِ فکر و عمل کے دیکھ!

بن کر سحابِ فیض، زمانے پہ چھائے جا — انسانیت نواز، ترانے سنائے جا
افکارِ نو میں وحدتِ نوعی تلاش کر — اور سرمدی حیات کے اسرار فاش کر
تیرا پیامِ فکر و نظر عالمی رہے — سر رشتۂ فروغِ عمل باہمی رہے
پیدا جہانِ تازہ ہو تیری نگاہ سے — روشن ہو چشمِ دہر تری جلوہ گاہ سے
وابستہ تیرے دم سے ہے رنگینیٔ حیات — تیرے لہو سے گرم و رواں روحِ کائنات
احسان کر، رعونتِ احساں کو بھول جا — سوزِ یقیں میں شہرتِ ارزاں کو بھول جا

ذوقِ سفر پہ عشرتِ منزل حرام ہے!
تیرا تو ہر مقام سے آگے مقام ہے!

بشیر النساء بیگم بشیر

"دھبہ"

افراتفری میں الٹے سیدھے پاؤں دوڑی آئی تو چوکھٹ سے ٹکرا گئی۔ گرتے پڑتے کمرے میں داخل ہو دروازہ بند کر لیا۔ سینما جانے کے جنون میں ایک ایک کرکے سب کپڑے اتار ڈالے۔ ننگ کا احساس ہوا تو بازوؤں والی کرسی میں جلدی سے دبک کر بیٹھ گئی، کرسی میں بیٹھی بیٹھی وہ جوڑا جو اس نے پہن کر جانے کے لئے سوچا تھا "وارڈروب"[1] میں دیکھنے لگی۔

سہیلیاں باہر کھڑی تھیں۔ فضا میں ایک نگین سا قہقہہ کروٹیں لیتا مختلف سروں میں اس کا پیچھا کرتا رہا۔ الفاظ ایک ہی مفہوم لئے بیک وقت اس طرح ادا ہو رہے تھے "عجیب بھولی بھالی ہے اپنی وسیم..... اس کو تو بات بھی بنا نہیں آتی۔ یہ بھی تو نہیں سمجھتی اس کا اثر دوسروں پر کیا ہوگا..... اس کو تو کالج کی ہوا نے چھوا تک بھی نہیں!"

سہیلیاں بے وقت اور بغیر اطلاع کے آگئی تھیں۔ ان کو کسی نے بیٹھے بٹھلائے ایک چل سی دیدی تھی کہ وہ "گڈ ارتھ"[2] فلم ضرور دیکھیں۔

وہ چھوٹی چھوٹی گول سڈول چھاتیوں کے ہوتے "سٹیز"[3] پہننے کے بہت خلاف تھی، پھر بھی اس نے زرد، تربوزی اور نیم گلابی رنگ کی کئی سٹیز بطور فیشن کے خرید کر رکھی تھیں، بازوؤں والی کرسی میں دبکی اور سکڑی بیٹھی کو نیم گلابی رنگ کی سٹیز کچھ بھلی بھلی معلوم دی، للچا سا پیدا ہوا۔ اس نے سوچا سب سے پہلے سٹیز ہی کیوں نہ پہن لے۔ سہیلیوں کا خیال اور جلدی بھی تھی، اور پھر تھیٹر میں وقت سے کچھ پہلے اندر جا کر سستانے اور لطف اندوز ہونے کا خیال بھی گزر رہا تھا۔ لڑکیاں جب کبھی سینما دیکھنے جاتیں تو ٹکٹ بھی اسے ہی خریدنے پڑتے تھے، وسیم تھی تو بیس اکیس سال کی مگر شکل و صورت سے ابھی چودہ پندرہ کی نظر آتی تھی، بھولی بھالی سمجھ کر سب اسے آگے دھکیل دیتے تھے۔ سہیلیوں کو تجربہ ہو گیا تھا کہ اسے ٹکٹ اور راستہ ایک لمحے میں مل جاتا ہے..... اسے خود بھی بھیڑ میں گھس گھسا اور آگے پیچھے ہونے میں کچھ لطف محسوس ہوتا تھا۔ آج تو جلدی میں اسے اپنی ذمہ داری کا احساس بہت ہی ستا رہا تھا۔

خیالات میں کھوئی ہوئی، موتیا شلوار ڈھونڈھ ڈھونڈھ نکالنے میں مصروف تھی، اس روا رَوِی میں جوڑا بدلنے کا مقصد بھی محض موتیا شلوار ہی تھا۔ تنہائی میں سا تھیوں کے انتظار کے خیال اور ان کی کھسر پھسر سے تلملا رہی تھی تو وہ کسی نامعلوم جذبے کے زیر اثر ہاتھ بڑھا دیا اور نیم گلابی سٹیز کھینچ کر پھر بازوؤں والی کرسی میں دبک کر بیٹھ گئی۔ اور بڑے اطمینان سے سٹیز کے بازو اپنے گرد پھیلا سٹیز پہننے لگی، ایک دفعہ نیچے اوپر کرکے دیکھا، بند کستی پھر ڈھیلے کر دیتی..... ہائے گھڑی نے دو بجائے، میٹنی شو کے لئے ابھی وقت کافی تھا۔ تمام بند پورے اتار چڑھاؤ کا خیال رکھتے سلیقے سے بندھتے گئے، جب سٹیز باندھ چکی، تو گردن آگے کی طرف جھک گئی، ایک لمبا سانس لے کر کھڑی ہو گئی، ننگ کا احساس کھو چکی تھی، سینے گرما رہے تھے۔ لپک کر وارڈروب میں موتیا شلوار تلاش کرنے لگی.....

ایک ایک کرکے تمام کپڑے بازوؤں والی کرسی پر ڈال دیئے..... موتیا شلوار کی تلاش میں ایک بہت بڑی کوفت محسوس کر رہی تھی، جو ہاتھ آتا الٹ پلٹ کرکے ادھر ادھر پھینک رہی تھی۔ ہونٹ کھلے کے کھلے تھے، گویا کسی طویل لمس کی لذت سے محروم ہیں، رگ رگ سے اوس پڑی ہوئی زمین کی طرح ہلکی ہلکی نمی ظاہر تھی، بالوں کی دو ایک لٹیں انگیٹھی پر گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہل رہی تھیں..... رانوں کی مچھلیاں بھی اسی صورت میں پھڑک رہی تھیں.....

جب کچھ بس نہ چلا، اور سوچتی بچا اور تلاش سے ساتھ

---

[1] wardrobe [2] Good Earth [3] Stays

نہ دیا تو دروازہ کھٹکھٹانے لگی، ماما کو زور زور سے آوازیں دیں۔۔۔۔ ماما دروازے کے باہر آکر رکی۔

"میری موتیا شلوار کہاں ہے؟"۔۔۔۔ ماما کا رنگ زرد پڑ گیا، بیچاری سہم کر دروازے کے ساتھ لگ گئی۔ وسیم پھر زور سے چلائی۔۔۔۔ "میری موتیا شلوار۔۔۔۔"
ماما نہایت نرم لہجے میں بولی "بڑی بی بی نے شاید میلے کپڑوں میں ڈال دیا ہو۔۔۔۔" اسے سخت غصہ آیا، اور جھنجھلا کر کہا وہ ہر صورت میں اس کی موتیا شلوار تلاش کر کے لائے۔

ماما شلوار تلاش کر کے لائی تو گورا گورا نیم گلابی بازو نکال کر شلوار کو پکڑ لیا۔ وسیم کے ننگے بازو پر شلوار رکھتے ہوئے ماما کے جسم میں ایک سرسراہٹ سی دوڑ گئی، جیسے چھوٹی بی بی کے ننگ سے دوچار ہو گئی ہے!
شلوار لے کر وسیم کو ایک اطمینان اور سکون حاصل ہوا۔۔۔۔
ڈرائنگ روم سے گزر کر ماما مسکراتی جا رہی تھی۔ سیڑھیوں پر چڑھ رہی تھی کہ وسیم کی سہیلیوں نے پوچھا "وسیم کہاں ہے؟"۔۔۔۔ ماما کے ہونٹ پھر پھڑپھڑائے اور وہ یہ کہہ کر اوپر چلی گئی "صرف موتیا شلوار پہننی باقی ہے!"

کچھ دن ہوئے تھے کہ وسیم کی موتیا شلوار پہ پان کا داغ لگ گیا تھا، اور کچھ اس طرح سے گرا تھا کہ داغ اگر بے پروائی سے بھی دیکھا جائے تو انگور کا گچھا سا پتا معلوم دیتا تھا۔ وسیم پان کھانے کی عادی نہ تھی کسی نے دیا تھا اور وہ غلطی سے چبا گئی تھی۔ جب داغ اس کی موتیا شلوار پر پڑا تھا تو اسے اپنی قیمتی شلوار کے خراب ہو جانے کا بے حد صدمہ ہوا تھا۔ یہ موتیا شلوار اسے اپنی [illegible] شلواروں میں سب سے زیادہ عزیز تھی، وہ اسے اسی وقت پہنتی تھی، جب کبھی کچھ مسرور ہوتی یا اہمیت محسوس کرتی تھی۔
وسیم اپنی سہیلیوں کے ساتھ [illegible] بہت گہری [illegible] تانگے میں [illegible] بیٹھی تھی سب سے زیادہ

تازہ دم اور خوبصورت معلوم دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک بشاشت کھیل رہی تھی، سینما جانے اور "گڈ ارتھ" فلم دیکھنے کا احساس لیے ہوئے نہایت خوش تھی۔
تانگہ جب آخری موڑ مڑا، تو اس کی آنکھوں کے سامنے بالوں کی ایک لٹ آگئی۔ اس نے اس کو ہاتھ سے پرے ہٹا دیا۔ اور بازار کی آمد و رفت پر حقیرانہ طور پر سخت نکتہ چینی کرنے لگی، سب نے اس کی طرف دیکھا، ایسی طنز اور نکتہ چینی وسیم کی فطرت کے خلاف تھی۔۔۔۔ دو بچے اور آٹھ لڑکیاں دو تانگوں میں تماشا دیکھنے جا رہے تھے۔ اس مختصر سے قافلے پر ہر راہ گزر کی نظر پڑ رہی تھی۔ یہی بات وسیم کی نکتہ چینی، اور طنز کا باعث تھی، وہ چاہتی تھی برقعہ الٹ دے اور بے نقاب ہو جائے، اور دیکھے کون اس کی طرف دیکھنے کی جرأت کرتا ہے۔
تانگہ کھٹ سے تھیٹر کے سامنے آکر رکا۔ وسیم کو ایک دھکا سا لگا۔ اس کے خیالات کا تسلسل رک گیا۔ وہ بھونچکا سی ہو کر اتری........ وہ سب خوش خوش اوپر بھاگتی اپنی اپنی جگہ پر جا بیٹھیں اور لوگوں کا بڑے دلفریب زاویوں سے مطالعہ کرنے لگیں۔ وہ ہر آنے جانے والے کا جائزہ لے رہی تھیں۔۔۔۔ نفسیاتی لذت سے ہم کنار ایک ایک پر تنقید کرتی تھیں۔ آس پاس بیٹھنے والوں کا بیٹھنا دوبھر کر دیا تھا۔ ہر نگاہ ان پر اٹھ رہی تھی۔ اور ہر نگاہ ایک خوشگوار تعجب ظاہر کر کے ایک دوسرے سے جگہ بدلنے میں مصروف تھی۔ وسیم خوب بے تکلفانہ انداز میں کھل کر اپنی "سیٹ" پر بیٹھی تھی۔ اسے ساتھ والیوں کی حرکات سے کوئی سروکار تھا، اور نہ کوئی گہری دلچسپی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے ارادتاً موتیا شلوار کا داغ جس کا رنگ کچھ سیاہی مائل سا ہو گیا تھا، بڑی احتیاط سے واضح کر دیا، اور گھٹنا کر ان کے اوپر کر لیا۔ پھر خود بخود ذرا متین بن کر بیٹھ گئی اور چور نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ کر اس بات کا انتظار کرنے لگی، دیکھیں آج سب سے پہلے اس داغ کا ذکر کون چھیڑتا ہے۔

رعنا۔ نینا۔ بدما اور روزا، اپنی اپنی دھن میں محو تھیں، وہ محسوس بھی نہ کر سکیں کہ وسیم کیوں چپ چپ ہے، اور اس کے خیالات اسے کہاں سے کہاں لیے جا رہے ہیں ــــــ

وسیم ان سب کے درمیان بھولی بھالی ما نو بلی کی مانند تھی۔ اس کے سامنے وہ بہت سی باتیں کرتی ہوئی جھجک بھی جاتی تھیں، اور جب کسی اہم بات سے انھیں لذت حاصل ہوتی تھی اور وہ برداشت کر جاتی تھیں تو ایک دوسری کو اعتماد میں لے کر کہہ اٹھتی تھیں، وسیم کو ان جنسیاتی رجحان سے باخبر کرنے کی ضرورت نہیں۔

وسیم اور اس کی سہیلیاں آج سے ایک ہفتہ پہلے اسی تھیٹر میں ایک امریکن فلم دیکھنے آئیں تھیں، وسیم نے اس روز بھی یہی موتیا شلوار پہن رکھی تھی، ــــ اور پان کا داغ اس کی شلوار پر ایک شام پہلے ہی لگا تھا۔ آج سے ایک ہفتہ پہلے جب یہ جھنڈ کا جھنڈ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھا تھا تو سب سے پہلے نینا کی نگاہ اس پان کے داغ پر پڑی تھی۔ وہ پان کے داغ کا ذکر کرتے کرتے اس کی ران پر ہاتھ رکھے داغ کو مسلنے لگی تھی، پھر دوسری اور پھر تیسری اسی طرح باری باری سب نے داغ کو مسلا اور اس کا ذکر کیا تھا۔ اور اس کی قیمتی شلوار کے خراب ہو جانے کا افسوس ظاہر کیا تھا۔ جوں جوں اس کی موتیا شلوار کے داغ پر بات چلتی گئی، اس کی رانوں پر پہلے ایک پھر دوسرا اور پھر تیسرا ہاتھ حرکت کرتا رہا۔ اس مسلنے اور حرکت کرنے سے اس کے تمام جسم میں ایک نامعلوم سی سرسراہٹ رینگتی رہی ــــ

وسیم چاہتی تھی، یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔ فلم بند ہو جائے۔ لائٹ فیل ہو جائے، پر اس کے داغ کا ذکر چلتا رہے اور مختلف ہاتھ اس کو مسلتے رہیں ــــ پان کا داغ دونوں رانوں کے درمیان لگا تھا۔ تیغے سے تقریباً کوئی بالشت بھر نیچے، چاہتی تو اسے اندر کی طرف سرکا کر چھپا دیتی یا اس روز وہ اپنی موتیا شلوار نہ پہنتی، داغ کی مدد سے اس کے جسم میں زندگی کی بالیاں پھوٹ اٹھی تھیں ــــ وہ کسی صورت بھی، اپنی مسرت کا اظہار دوسروں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔

پان کا داغ چھوٹے انگور کے پتے کی شکل نما تھا۔ اور ایسا معلوم دیتا تھا، جیسے چھینٹا پڑ جانے کے ساتھ ہی کسی نے دبا دیا ہے یا کسی بچے نے کاغذ پر سیاہی گرا کر کاغذ میں شکن ڈال کر ایک موہوم سی شکل بنا دی ہے۔ آج ہال کے اندر وہ اٹھتی بیٹھتی چپ سادھے رہی، اور ہلکی ہلکی باتیں کرنے لگی، مگر پان کا داغ کسی کی نگاہ کا مرکز نہ بن سکا۔ راستے میں جب تانگے کے پہیے گھوم رہے تھے، تو وہ ایک مضحکہ خیز آزمائش میں سے گزر رہی تھی، اس کا خیال اور نگاہیں پان کے داغ کا پیچھا کر رہی تھیں، اگر تانگہ کسی وجہ سے دھیما پڑ جاتا تھا۔ تو اس کا ہاتھ بغیر سوچے سمجھے رانوں کے درمیان کچھ ٹٹولنے لگتا تھا۔ شکلیں بن بن کر مٹتی اور گم ہوتی جا رہی تھیں، اس نے ذرا تن کر ٹانگوں میں اکڑا پیدا کر لیا اس کا ہر سانس تانگے کی آواز کے ساتھ چلتا جاتا تھا۔ اور وہ بڑے پیار سے کبھی نینا سے اور کبھی روزا سے لگ جاتی تھی۔

فلم پوری رفتار سے سکرین پر چل رہی تھی، ہر لمحہ ایک نیا منظر آنکھوں کے سامنے آتا تھا۔ ہر کوئی اپنے اپنے مذاق کے مطابق مسرور ہو رہا تھا۔ ساتھ والیاں بھی کافی سے زیادہ لطف اندوز ہو رہی تھیں لیکن وسیم کے خیالات کا تسلسل ہر بار ٹوٹتا اور بنتا تھا۔ کبھی بیٹھے بیٹھے جمائی لینے لگتی۔ جیسے مضمحل ہوتی جا رہی ہو، اور کبھی سیٹ پر اپنا آپ پھیلا دیتی، اور پان کا داغ نمایاں کر کے بیٹھ جاتی۔

انٹرول ہوتے ہی اس نے داغ اور بھی نمایاں کر دیا، داغ کو دیکھ کر اس کے اندر کچھ ہیجان سا اٹھ رہا تھا۔ کاش یہ ہیجان طوفان کی صورت اختیار کر لیتا اور اس میں وسیم بہہ جاتی، مایوسی نے اس کے چہرے کو مرجھا دیا تھا۔ اور آنکھیں بند ہوتی معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے سر سے پاؤں تک رطوبت کھینچ لی گئی ہو ــــ

گو نسیم کچھ ضرورت سے زیادہ پیچھے ہٹی بیٹھی تھی — اور بازو ڈھیلے چھوڑ رکھے تھے، پیچھے سے روزا نے نسیم کو زور سے جھنجھوڑا اور کہا "سب تیری طرف دیکھ رہے ہیں، رات بھر جاگتی رہی تھی کیا — تیرے جمائیاں لینے کا یہی وقت ہے؟"

نسیم کے ساتھ والی سیٹ پر دو عورتیں بیٹھی تھیں، ایک کی گود میں بچہ تھا۔ بچہ چابیوں سے کھیل رہا تھا دوسری نسیم کو بڑے لاڈ سے دیکھ رہی تھی۔ اسے متوجہ پاکر دوسری بھی دیکھنے لگی — دونوں نسیم کے بھولے پن سے نہایت متاثر ہوئیں اور اسے دوسروں سے مختلف پایا۔ عورتوں کی نگاہ پان کے داغ پر جا پڑی، داغ اس گھڑی کچھ پُر اسرار سا بن گیا، پہلی نے دوسری کے چٹکی لیتے ہوئے کہا "بچی جو ہوئی، نادان ہی تو ہے — انجان پن میں خون کا دھبہ لگ گیا ہے، غریب کے!"

انٹرول کے بعد فلم پھر چلنے لگا۔ ہال میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، وہ آگے کی طرف جھکتی ہوئی سکڑ کر بیٹھ گئی جیسے بازوؤں والی کرسی میں دبک کر اپنے آپ کو ننگا محسوس کر رہی ہو۔ اس کی چھوٹی چھوٹی چھاتیاں سڈول اور تناؤ لئے ہوئے نیم گلابی سٹینز میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہو رہی تھیں — خاموش اور ساکن — فلم تیزی سے چل رہی تھی!

چغتائی

نوید زندگی

جب نظر انتخاب ہو جائے — منتخب لاجواب ہو جائے
زندگی کو بھی جی کے بتلا دے — جبکہ جینا عذاب ہو جائے
ضبطِ گریہ ہو گر تو ایسا ہو — صبر بھی آب آب ہو جائے
عقل و تدبیر کے تعاون سے — ہر عمل کامیاب ہو جائے
روشنی ہو وہ حسنِ ایماں میں — دل بھی اک آفتاب ہو جائے
یہی آغاز ہو بھلائی کا — کام کوئی خراب ہو جائے
گونج اٹھے صدائے حق اس سے — دل کی حرکت رباب ہو جائے
عزم راسخ ہو جس کی فطرت میں — فضلِ حق ہم رکاب ہو جائے
گر تو پا جائے نفس پر قابو — رازِ حق بے نقاب ہو جائے
گر پڑے اشکِ انفعال اگر — پاک فردِ حساب ہو جائے
ہے عمل ہی میں زندگی کی بقا — ورنہ جینا حباب ہو جائے
گر تو سمجھے حیات کا مقصد — ہر سکوں اضطراب ہو جائے
نہ ہو گر موجزن جو الفتِ دوست — زندگانی سراب ہو جائے

تیری فطرت میں تھا یہی روحی
شاعرِ بو تراب ہو جائے

"روحی"

جھلکیاں

پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہوں، لکھتے لکھتے طبیعت اچٹ جاتی ہے یا کبھی فکرِ آرام کو جی چاہتا ہے تو سونے کے کمرے میں ورا آتا چلا آتا ہوں اور دھڑام سے بستر پر چاروں خانے چت کہ اس قلابازی سے تعاقب کرنے والے خیالات کے ہجوم کو دھکا سا لگے اور کچھ دیر کے لئے ان سے نجات پاؤں۔ چت لیٹ کر چھت کی باتیں گننے لگتا ہوں۔ گھوم پھر کر نظر ایک جگہ اٹک سی جاتی ہے، مکڑی کے جالے میں۔ مہین مہین سا زرتار، پیلا پیلا، اجلا اجلا جال ——— جو لرز لرز کر متحرک کرا ور زیادہ حسین اور جاذبِ نظر ہو جاتا ہے۔ بیچوں بیچ جیسے ڈرائنگ روم ہو، بی مکڑی بیٹھی ہیں۔ بے ڈھنگی سی مکروہ لیکن اک ذرا چمک دار — مکڑی پر نظریں جم جاتی ہیں۔ اگرچہ "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست" کا معاملہ نہیں لیکن ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ مکڑی کی قوتِ ارادی نے میری آنکھوں پر جادو کر دیا ہے کہ ہٹتی ہی نہیں جھپکتی ہی نہیں۔ میری ساری حسیات باصرہ میں سمٹ آتی ہیں اور مکڑی پر مرتکز ہو جاتی ہیں ——— مکڑی پھیلنے لگتی ہے۔ کبھی جالا نظروں سے اوجھل سا ہوا جاتا ہے، کبھی مکڑی پھیلتے پھیلتے جالے سے پرے نکل جاتی ہے اور صرف مکڑی ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر مکڑی سمٹنے لگتی ہے اور ایک نقطہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ نقطہ۔ موٹا، باریک مہین ——— اپنی تمام تر معنوی و صوری کیفیات و تعریفات کا حامل۔ چمکتا ہے، جھلملاتا ہے، لرزتا ہے، مدھم پڑتا ہے۔ روشن ہو جاتا ہے، ڈوبتا ہے اور ابھرتا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ جالا پھیلنے لگتا ہے، لرز لرز کر، چمک چمک کر بے نام نقوش بنتے، بگڑتے، ابھرتے اور دھندلاتے ہیں۔ نقطے میں حرکت سی ہوتی ہے اور چھک سے روشن، جیسے میگنیشیم کا فیتہ آن کی آن میں جلے، چمکے اور پھر تاریکی چھا جائے اور اب نقطے کی جگہ ——— گوری گوری چمپئی رنگت، چوڑا ماتھا، کھنچی ہوئی بھنویں، کسی قدر چھوٹی لیکن تارہ جیسی روشن آنکھیں کہ قلب و نظر کو برما جائیں۔ تنگ دہانہ، گلاب جیسے ہونٹ ان پر اودی اودی مسی کی دھڑی، گالوں پر چمپئی کا کلیں، آڑی مانگ، ناک میں جھل جھل کرتی ہیرے کی کیل، سونے کے تکے، جڑاویں کرن پھول، ہاتھ میں جڑاؤ، پاؤں میں پازیب۔ موتیا رنگ کی بڑے بڑے رسیلے پھولوں والی ساری، اسی کا جمپر ——— اجلا اجلا فرش، فرش پر قالین، دیوار سے گاؤ تکیہ لگا، اور یہ اس سے تکیہ لگائے بیٹھی ہیں، سامنے کٹاؤ پاندان، ادھر خاص دان، ادھر اگالدان سراپا عمر خیام کی رباعی، بھرپور جوانی، تیز و تند شراب، خود ہی بدمست و سرشار۔ پاس ہی ان کی رازدار سہیلی خیر بیٹھی ہیں۔ چہرہ مہرہ بالکل علین میں ویسا ہی۔ بہن کہو تو کسی کو شبہ نہ ہو سہیلی کہو تو قسمیں کھانے پر کوئی یقین نہ کرے۔ ہاں یہ ایک ذرا متین ہیں لیکن پیٹ میں گن بھرے ہیں، ہیں شیطان کی خالہ آفت کی پرکالہ۔ بنتی ہیں بڑی معصوم۔ کچھ راز کی باتیں ہو رہی ہیں، دھیرے دھیرے کہ کسی کو بھنک نہ پڑ جائے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں شرارت لوٹ رہی ہے.......... ٹرن ٹرن، سیکل کی گھنٹی نے اپنے مخصوص بول نکالے اور انھوں نے خیر کو چمکے سے اشارہ کیا۔ کمرے کا وہ دروازہ دھیرے سے بند کر دیا گیا جس کے بند ہونے سے یہ حصہ مکان سے بالکل علیحدہ ہو جاتا ہے اور پھر یہاں کیا کچھ نہ ہو جائے کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ مجھے دیکھتے ہی سرو قد اٹھ کھڑی ہوئیں، سر پر آنچل ڈال لیا، منہ پر بہار چھا گئی، آنکھوں میں حیا لوٹ گئی اور گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ گردن خم ہوئی پنجۂ مرجانی پیشانی تک پہونچا ——— سلام کرتی ہیں۔ میں کچھ کہہ بھی نہ پایا تھا کہ بولیں "سرتاج راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں آپ تو روٹھ ہی گئے اپنی کنیز سے۔" یہ سریلے بول

کانوں ہی میں نہ پڑے دل و روح کی گہرائیوں میں بھی سما گئے۔ ترنم، شعریت اور نقوش سبھی تو جاگ اٹھے تھے۔ لیکن ہونٹوں کی مسی، پور پور مہندی اور گلے کی کالی پوت پر نظر پڑتے ہی دل سن سا ہوا ـــــ صغرا کی تو شادی ہو چکی۔ !! اندھیرا سا چھانے لگا آنکھوں میں۔ جب یہ تاریکی دھیرے دھیرے چھٹ گئی اور اجلا فرش، ایرانی قالین گداؤ پائدان، سرو قامت لچکیلا جسم، دمکتے عارض، گلابی ہونٹ تحلیل سے ہو گئے مسی کی اداہٹ میں تو ایسی اداہٹ میں وہی نقطہ ابھرنے لگا۔ باریک سا، مہین مہین، چمکتا دمکتا، ابھرتا ڈوبتا ـــــ پھر وہی مکڑی کا جال، مکڑی کریہہ منظر، چمکتی، دمکتی، اجلی اجلی مٹیالی مکڑی ـــــ

پھر نظریں جمنے لگیں مکڑی پر، پھر نقطہ سامنے لگا۔ وہی ڈوبتا، ابھرتا، چمکتا لرزتا نقطہ۔ چمکا، ڈوبا، ابھرا اور پھر غائب۔ اب جو ابھرا تو پھیلنے لگا۔ رکھشا کے بند تک پھیلے، ابھرے، پھیلے، سمٹے۔ رکھشا حرکت کرنے لگا ـــــ چھریرا بدن، میانہ قد، نکھرا ناک نقشہ، تیکھے خط و خال، بڑی بڑی بادامی آنکھیں، گھنی پلکوں سے ایسی جھانک رہی ہیں جیسے پہاڑوں میں جھرنا جھل جھل کر رہا ہو۔ آنکھیں، شوخ چنچل جیسے کچھ کہہ رہی ہوں، کچھ گنگنا رہی ہوں، کچھ یاد دلا رہی ہوں، بھولی ہوئی کہانیاں ـــــ کانوں میں میں صرف لمبے لمبے ایرنگ، گلے میں چندن ہار، ہاتھ میں دو دو چوڑیاں، ننھی سی سنہری گھڑی کلائی پر۔ سبز کنجالی ساری لپٹی لپٹی سی، چست بلاؤز ایسا کہ سینہ و کمر کا ہر نقش اور ابھار واضح اور جاذب نظر ہو گیا ہے۔ آواز بھاری بلکہ لونڈ پن اگر لوچ نہ ہو تو دور کا آدمی نہ پہچانے کہ مرد بولا کہ عورت۔ رکھشا میں اکیلی تنہا بہ تقدیر، پیچھے کا پردہ ایک طرف سے کھلا، ایک لمحے کو چلمن نہیں۔ پردہ اٹھا، آنکھیں ملیں، کچھ کہہ گئیں، کچھ یاد دلا گئیں کچھ بھلا گئیں ـــــ پھر ویسے ہی یہ لمبے گراونڈ ہے، وہ بارہ دری، سلک ٹاکیز پیچھے رہ گئی یہ سامنے نیا پل رہا۔ اب کی دیکھا تو آنکھیں کہہ رہی ہیں چلے آؤ برابر، کچھ کہہ سن لیں۔ سیکل رکھشا کے برابر تھی۔ بازو کا پردہ نیچے ہٹا دیا گیا، بالکل نظر کے سامنے تھیں جیسے اگلے وقتوں کی جان پہچان ہے۔ اور تھی بھی یہی بات نظریں بھلا دیں تو کیا من پہچان ہی جاتا ہے، اس کی نظریں نہیں چوکتیں۔ سلام و تعارف کی ضرورت ہی کیا۔ انسان ہی کہتے تو ہیں۔ کہنے لگیں "تو آپ کا نام ...... میاں ہے نا؟"

میں چکرایا۔ یا اللہ یہ تو دنیا دیکھی معلوم ہوتی ہیں میرا خیال شائد صحیح ہو، ہو نہ ہو محبوب ہی ہو۔ چھ سال پہلے کی بات ہے کہ پیک بڑی تھی، پھر ایسی اوجھل ہوئیں نظروں سے کہ جیسے وجود ہی نہیں ان کا۔ کچھ یقین نہ آتا تھا کہ وہی ہیں کہ کوئی اور۔ ناک نقشہ، بات چیت کا انداز، آواز بالکل وہی لیکن وہ ذرا دبلی دبلی نازک نازک نہیں۔ الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے بوکھلا کے جواب دیا "جی ہاں ـــــ لیکن آپ"

وہ ہنس پڑیں "یہ شائد نہ معلوم ہو سکے آپ کو"

میں اور بوکھلا گیا لیکن متانت سے کہا "اچھا دیکھیں گے"

ذرا بل کھاتے ہوئے جواب دیا "تو کیا خدائی ظلم ہے آپ کا۔ بے ٹھلئے"۔

میں نے کہا "تو حاضر ہوتا ہوں پھر"

اب وہ چکرائیں، اس چڑیمار کی طرح جس کے لیے دار بانس میں چڑیا چھپٹے چھپٹے پھڑپھڑا کر نکل جائے۔ سڑک کا خیال رہا اور نہ راہگیروں کا، چلائیں "سنئے تو ـــــ اے صاحب...... میاں، ایک ذرا سنتے تو جائیے میری بات"

لیکن ہم پلٹ چکے تھے۔ نام معلوم کرنے کی دھن سوار تھی سیدھے راشننگ کی دوکان پر پہونچے، میاں عزیز تھے۔ نام معلوم کرنے کچھ دیر نہ لگی۔ وہی نکلیں جن کا شبہ تھا۔ واہ ری عورت، وہ دن گئے کہ بچی جاتی تھیں، سائے کی طرح چمٹی رہتی تھیں اور ہم بھاگے بھاگے پھرتے تھے کہ آپا نہیں گی تو کیا کہیں گے!؟ وہ دن اور آج کا دن۔ دنیا ہی بدل گئی۔ کیا یہی عورت کی نفسیات ہے اور یہی اس کی محبت۔ اکی طرف بڑھئے تو طوطے کی طرح آنکھیں پھیرلے اور اپنا من

چاہے تو قدموں پر گر پڑے، لاکھ بھاگئے پر پیچھا نہ چھوڑے! الجھن بڑھنے لگی، تاریکی سی چھانے لگی...... بیسیوں نقطے تھرکنے لگے ناچنے لگے اس تاریکی میں۔ آن کی آن میں سب ڈوب سے گئے اور صرف ایک نقطہ رہ گیا وہی تھرکتا، چمکتا، ابھرتا ڈوبتا ——— پھر وہی جالا تھا، وہی مکڑی، کریہہ منظر مٹیالی، چپلیکی مکڑی ———

پھر نظریں جمنے لگیں۔ نقطہ سا بننے لگا۔ ڈوبا، ابھرا، چمکا پھر غائب ——— وہ سامنے بیٹھیں ہیں، گدگدا جسم، بوٹا سا قد، سانولی سلونی رنگت، تیکھے خط و خال، بڑی بڑی ٹھہرا آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں اک ذرا موٹے ہونٹ اودے اودے، ملیاقی چہرہ، گال پر دوچار مہاسے۔ اودی قور کی سفید سفید براق ساری، اسی رنگ کا کرتا چھوٹے دامنوں کا، پف ابھرے ہوئے۔ پورے آستین پھنسے پھنسے، کلائی میں چنت، رو پہلی چوڑیاں ہاتھوں میں جیسی تن کی اجلی ویسی ہی من کی لیکن کتقل کے کان موم کی ناک، ماں اور بہن نے جدھر چاہا موڑ لیا۔ جانتی ہیں کہ بہن ڈنک مار رہی ہیں لیکن یہ مسکرا رہی ہیں۔ کچھ من کی کمزور کچھ سعادت مندی کا گھمنڈ۔ استانی ہیں، انھیں سے گھر چلتا ہے۔ ماں بڑی بیٹی پر بچھی جاتی ہیں۔ وارے نیارے ہو رہے ہیں، بچے نہ چلو تیلی میں چلو، انھیں کوئی پوچھتا نہیں لیکن کیا مجال کہ پیشانی پر کوئی بل تک آجائے۔ بلکہ بظاہر خود بھی شریک ہیں اس لاڈ میں۔ جو کھلا دیا کھا لیا، جو پہنا دیا پہن لیا، نہ شکوہ نہ شکایت لیکن اندر والا بھی تو مانے، گھلی جاتی ہیں اندر ہی اندر۔ بائیس کا سن ہے، ماں کہتی ہیں ابھی بچہ ہے اور یہ دل پر پتھر رکھے چپ ——— کوئی بچھا جاتا ہے، لیکن یہ نہیں بولتیں، ماں کو جو پسند نہیں اور ماں کو کیا پسند ہے یہ خود انھیں بھی نہیں معلوم۔ سارے خاندان کے لیلیٰ مجنوں مشہور ہیں لیکن یہ ادھر چپ اور وہ ادھر خاموش۔ جانے کب چھوٹے یہ جوا لکھی؟ پیام سلام بس آنکھوں کی زبانی۔ اللہ اللہ خیر صلّا۔ وہ چار سال سے انھیں پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں ادھر ان کا بھی کچھ نہیں

ہوتا۔ جانے کیا بات ہے ——— ہاں تو وہ بیٹھی ہیں۔ ہاتھ میں "سب رس" ہے۔ میں ان کے سلیقوں کا خلاصہ بنا رہا ہوں۔ پڑھتے پڑھتے بولیں "اللہ یہ کیسے لکھتے ہیں آپ، ہمیں بھی لکھا دیجئے نا۔" میں نے جملہ چست کیا "تو اجازت لے لی ہے اپنی اماں سے۔"

تلملا ہی گئیں۔ چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں، ہونٹ خشک ہونے لگے، کھسیانی ہنسی ہنسیں، آنکھ میں آنسو بھر آئے، کہنے لگیں "میں ہندوستانی لڑکی ہوں ——— اور اسی کو نباہ رہی ہوں، کیوں اس ساز کو چھیڑئیے گا جس میں فریاد کے سوا کچھ نہیں ———"

میں نے کہا "جی ہاں۔ اور دنیا کو فریاد کی ضرورت نہیں۔"

وہ رونے لگیں، گنگا جمنا ابل پڑیں، ہچکیاں بندھ گئیں۔ کانوں کے ایرنگ ہلنے لگے۔ سنہرے ایرنگ کاڑی کے جال والے، باریک باریک ہلین نہین مکتے سے جال، میرے پیچ مکڑی ——— میں سوچنے لگا۔ لڑکیاں بھی تو بس مکڑیاں ہی ہیں۔ نازک نازک سی، چپکیلی، بھڑکیلی، دبلی، موٹی، چپکیلی شوخ بے آزار اور بس بھری۔ کوئی موقع پا چکی ہے، کوئی گھات لگائے بیٹھی ہے اور کوئی جھپٹ چکی ہے شکار پر۔ کوئی قلم کے زور سے جال پھیلا رہی ہے، کوئی مرد پر طنز کر کے لیس ہو رہی ہے، کوئی کہتی ہے "اگر میں مرد ہوتی" ——— جیسے ہم نے بڑا تیر مار امرد ہو کے اور جو وہ مرد ہوتیں تو سارے جہاں کے مردوں کی کمزوریاں دھو ڈالتیں ———

کاش کوئی انھیں سمجھائے۔ ماں، بیوی اور بہن بنیں تو سب کچھ بن گئیں۔ مرد کی ساری "مردانگی" قربان ہے تم پر لیکن یہاں تو ہیلن، کلیو پترا، قرۃ العین اور رادھا رانیوں کی کمی نہیں ——— اف یہ لڑکیاں۔ اور مکڑیاں بھی تو بھانت بھانت کی ہوتی ہیں، اجلی اجلی، لال لال، مٹیالی، دبلی، موٹی بے آزار اور زہریلی ———

بالوں کی ننھی سی لٹ مچلی اور کانوں پر بکھر گئی، ایرنگ کو گھیر لیا اپنے زنجیرے میں، کچھ اس انداز سے جیسے بہشتی

طالب علم ہندوستان کا نقشہ اتارنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے یہ کالا زنجیرا، یہ سنہرا جال اور مکڑی سامراج، لیگ و کانگریس اور دلی والا صاحب ہیں اور چالیس کروڑ مکھیاں، پھوکی، اس دہرے جال میں پھنسیں بھنبھنا رہی ہوں۔ کچھ دم توڑ چکی ہیں۔ جیسے جلیان والا باغ کے شہید اور کیورکے چار کسان، کچھ سوکھ چکی ہیں صرف ڈھیر ہی ڈھیر رہ گیا ہے۔ جیسے بنگال کی ۵۰ لاکھ فاقے کی شکار جن کا کچھ نیم جان ہیں جیسے ہم اور آپ، مزدور اور کسان۔ لیکن ان کے ٹکو کھے ہاتھ بھینچے ہوئے ہیں، مٹھیاں کسی ہوئی ہیں، وحشی ہوئی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے زرد چہروں پر عزم کی ہیبت چھائی ہوئی ہے۔ یکبارگی بھنبھناہٹ میں شور ہوا۔ حرکت، تڑپ اور ایک جھکولا ——— مکڑی نیچے آ رہی۔ جال ٹوٹ چکا تھا سنہرا بھی سیاہ بھی۔ اور مکھیاں آزاد بھنبھناہٹ اور بڑی۔ میں چونک سا گیا ———

بانسوں میں وہی جالا تنا تھا، مکڑی بیچوں بیچ بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے دو مکھیاں، ایک ذرا بھوری اور دوسری سیاہ، ایک دوسرے سے گتھی ہوئی تھیں۔ اڑتیں، بھنبھناتیں، گتھ جاتیں۔ اب کی بہت دیر تک گتھی رہیں، پھر بڑی تیزی سے الگ ہو گئیں۔ سامنے ہی جالا تھا، دونوں اس میں چپک سی گئیں۔ مکڑی نے حرکت کی کبھی ادھر کو اور کبھی ادھر کو جیسے کہتی ہو ہماری مانو، ہم تمہارے لیڈر ہیں۔ لیکن وہ پھر بھنبھنانے لگیں جیسے کہتی ہوں امن کی سنو میری اور آؤ ——— سر...... ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ دھڑل سے دروازہ کے دونوں پٹ کھل گئے اور پردہ لہرا کر چھت کو چھونے لگا۔ آن کی آن میں جالا ٹوٹ گیا۔ مکڑی فرش پر گر پڑی، چڑیا نے جھٹ سے اچک لیا۔ بکھرے ہوئے جال ایک سرا ہوا میں لہرا کر عجیب عجیب شکلیں اور نقش بنا رہا تھا۔ رام راج کا نقشہ، پاکستان کے حدود سکھ استان کی سرحد، گاندھی، جناح، ویول، کرپس، برلا کے کارٹون۔ دھیرے دھیرے یہ نقوش دھندلا سے گئے جیسے ریڈیو پر کسی فیچر میں آواز پس منظر میں ڈوب جاتی ہے اور نئی آواز نئی تان چھا جاتی ہے۔ ننھے ننھے سبز ہلالی ترنگے جھنڈے لہرائے، ان سب پر سرخ پرچم سایہ کیے تھا۔ آسمان سے باتیں کر رہا تھا اور ہوا میں فراٹے بھر رہا تھا۔ اسے چالیس کروڑ ہاتھ تھامے ہوئے تھے مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھ بھاری بھرکم اور مضبوط۔ میں پلنگ سے اچھل پڑا۔ جالا لہرا لیتا ہنسیا کی شکل بناتا ہوا میں تیر رہا تھا۔ میں گنگنانے لگا۔

"جب دست و قدم آگے بڑھیں گے چالیس کروڑ انسانوں کے"

حسینی شاہد

محبت کی چھاؤں :- مرزا ظفرالحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے تمام افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ہر فسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کارفرما ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔ اس کا حسین و جمیل سرورق دیکھتے ہی اس کتاب کے بے باک اسلوب اور اس کے افسانوں کی بے پناہ شوخی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد عہ

نکہت برباد

کسی نے پوچھا۔ افسانہ کیسے بنتا ہے؟ اس سوال کا جواب سنئے: "بس ایسے ہی جیسے عورت اپنے بالوں میں کنگھی کرتی ہے۔" پھر سوال ہوا "یہ بات کس کتاب میں لکھی ہوئی ہے؟" جواب ملاحظہ فرمائیے "یہ میرا طبع زاد خیال ہے۔ کنگھی کا ایک ایک لمس جس کی تاریخ دنیا کے قدیم ترین مصور کے فن سے بھی پرانی ہوگی۔ ہر عورت کے ذہن میں ایک احساس برتری پیدا کر دیتا ہے اور کنگھی چوٹی کے ان گنت ڈھنگ رائج ہیں دیس دیس میں۔ افسانہ لکھنے کے ان گنت ڈھنگ ہیں۔" تو یوں ہے یہ قصہ۔ یا افسانہ بھی لکھا نہیں لکھوایا جا رہا ہے۔ اس ترقی پسند زمانہ میں ہر تجربہ ترقی پسند ہی کہلاتا ہے —— ہاں تو ——

بیتے جاتے تھے دن، مہینے، سال، اگر یہ جنگ جاری رہتی تو شاید صدیاں بیت جاتیں۔ کشت و خون کی آندھیاں تمناؤں کی ہولی۔ آرزوؤں کے جنازے، جانے کتنے اور نکلتے۔ کتنی تمناؤں سے پالا تھا اس کے والدین نے اس کو۔ برسوں بعد تو اولاد ہوئی تھی۔ آرزو ارمان کا درخت مرجھانے لگا۔ جبری بھرتی کے احکام نکلے۔ خسرو نے خوشی خوشی اپنا نام لکھوا دیا۔ جان کی بازی لگانے سے جانباز ہی اپنا سر پیش کرے۔ اپنے ملک اور اپنی قوم پر بھینٹ چڑھنا کتنی زبردست قربانی، کتنا روح پرور ایثار۔ اس کی خود اعتمادی جرأت و شجاعت کے جذبات پر والدین کو فخر سا ہونے لگا۔ اپنی قسمت پر اس ہونہار سپوت کے غازیانہ اقدام پہ ——

محمود —— اس سے صرف دو ہی سال چھوٹا تھا۔ وہ کیا جانے جام شہادت کا مزہ۔ قربانیوں کا ذائقہ۔ موت کے فرشتے سے آنکھیں چار کرنا —— بڑی عاجزی کی۔ کہ بھیا نہ جاؤ۔ ہماری دنیا تم بن سونی ہو جائے گی۔ اتی کا روتے روتے برا حال ہوگا۔ ابا کی زندگی کا چراغ جھلملانے لگا ہے۔ مگر خسرو نے اس کی بزدلانہ التجاؤں کو ٹھکرا دیا۔

بچپن گیا نہیں۔ سمجھ نہیں آئی۔ مورکھ کہیں کا ——

والدین کی ایک اور بھی تو تمنا تھی۔ رضوانہ کی شادی خسرو سے ہو جائے۔ سہرا تو دیکھ لیں گے۔ پھر جانے قسمت میں کیا لکھا ہے۔ کون جیتا ہے اس کی واپسی تک۔ رضوانہ اور خسرو آپس کے ساتھ کھیلے، جوں جوں سیانے ہوئے محبت کی بیل بھی ساتھ ہی ساتھ منڈھے چڑھتی گئی۔

خسرو کی فوج میں بھرتی —— ؟ رضوانہ پر سنتے ہی جیسے بجلی گری۔ جنگ گویا الارم ہے موت کا۔ اس سے وابستہ اقدار کی طرف ذہن انسانی کے کمزور و بزدل پہلو نہیں جاتے —— اب رہی محبت —— اس کی قسمت میں تو ٹھوکریں۔ پشیمانی۔ ناکامی۔ ذلت۔ سب ہی رکھے دھرے ہیں۔ تو پھر اب ڈر ہی کا ہے کا۔ قسمت —— یہ بزدلوں کی ڈھارس۔ کوشش جہاں دم توڑ دیتی ہے تمنا جہاں یاس سے بدل جاتی ہے، امیدیں جہاں ایک ایک کر کے ساری کی ساری سلب ہو جاتی ہیں، صبح معقول ہیں سے منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید۔

ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

اپنا روپ دکھاتی ہے۔ قسمت وہاں جلوہ فرما ہو کر تسلی دینے لگتی ہے۔ یہ تقدیر کی دیوی۔ ارے اس کے تو آنکھیں کبھی نہ آئیں گی۔

روح میں کہیں چھپی ڈھکی تھی خسرو کی محبت۔ اب جو ابھیا تو رضوانہ کی ساری ہستی پر چھا گئی تھی۔ محبت کی دلکشی نے غم و الم پالے تھے۔ والہانہ کسک صدمہ سے بدل چکی تھی۔ اشتیاق و بیتابی خلش پنہاں سے معنون ہو چکی تھی۔ اس کے جانے کے صرف خیال ہی سے اس کی دنیا اندھیری اندھیری ہو جاتی۔ وہ تصور میں نہ جانے کتنی مرتبہ مر چکی تھی۔ جنگ پر جانے والوں کا کیا بھروسہ۔ ان کے لوٹنے کی بہت کم امید رہتی ہے۔ جیسے کوئی کسی بہت زیادہ خطرناک بیماری سے بچ اٹھے۔ مردوں کو دغا دیکر بچ جائے۔ لیکن رضوانہ اس عہد کے بندھن سے بہت پہلے ہی خسرو کی ہو چکی تھی۔

عقد و شادی ــــــ یہ سب خود فریب دنیا کے ظاہرا ڈھکوسلے ہیں۔ روح تو منسلک ہوجاتی ہے۔ بہت پہلے ہی ــــــ میں کیا کروں گی اس سنسار میں رہ کر ــــــ خسرو کے بغیر زندگی۔ موت کیوں نہ کہوں اس زندگی کو۔ غرض یہ آنے جانے والے خیالات تھے۔ اور رضوانہ کی مضطرب اندھیاریاں راتیں، اس کی زندگی کے بے مقصد سے دن ــــــ یہی سوچتے بیتتے جاتے۔

خسرو کی مہم بھی کچھ کم کٹھن نہ تھی۔ ایک طرف عزت و شہرت جیسے انمول رتن تھے ــــــ دوسری جانب محبت جس کی آج تک کوئی قیمت ہی نہ لگ سکی۔ زندگی کے اس دوراہے پر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کونسا رخ اختیار کرے۔ محبت کی موڑ پر صرف رضوانہ تھی ــــــ یکہ و تنہا ــــــ ایک دولت بیدار لئے ہوئے۔ عزت و شہرت کے رخ پر ساری دنیا تھی۔ دنیا والے تھے۔ سماج کی نکتہ چیں نظریں تھیں۔ ملک کی امیدیں تھیں۔ قوم کی آرزوئیں تھیں ــــــ وہ اب کرے تو کیا کرے۔ بڑی بے بسی کا عالم تھا۔ اس نے جیسے اپنی سوجھ بوجھ ساری کھو دی ہو۔ اس نے سوچا محبت تو ایک وقتی جذبہ ہے۔ جہاں عقل کے پاسبان نہیں اسکتے یہ وہ مقام ہے۔ یہ شعلہ جیسے جلدی سلگتا ہے، اس سے زیادہ تیزی و تندی سے بجھ بھی جاتا ہے۔ ٹھنڈا بھی ہوجاتا ہے۔ خصوصاً تمنا جب پوری ہوجاتی ہے، تو پھر کچھ بھی نہیں رہتا ۔۔ں میں۔ رہتے دو اس شرر کو یوں ہی سلگتے۔ بجھتے۔

پھر اس نے یہ بھی تو سوچا۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا کتنی جرأت انگیز گھڑی ہوگی۔ محبت تو ان بھی سکتی ہے۔ لیکن ایسا انمول موقع زندگی میں بار بار نہیں آتا۔ نہ جانے پھر کب جنگ چھڑے۔ شاید بوڑھا بھی ہوجاؤں اس وقت تک۔ جوانی کا مقصد اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ ملک و قوم کے دیوتا مجھے اپنے چرنوں میں جگہ دیں ــــــ ان کے مقابلہ میں کیا ہے یہ زندگی ــــــ یہ محبت ــــــ اس کی حفاظت میرا دل کرتا رہے گا۔

کل شادی ہوجائے گی۔ اور پرسوں ــــــ خسرو محاذ جنگ کی جانب قدم بڑھائے گا۔ بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ ایک جنگ پر جانے والے دولہا کی شادی۔ شادیانوں میں ایک غمگین سا نغمہ بھی چھپا چھپا تھا۔ جس کو کسی اور نے نہیں۔ صرف رضوانہ کے دل کی دھڑکنوں نے سنا۔ زندگی سنور رہی تھی بگڑنے کے لئے۔ قسمت کا بندھن دونوں کو ایک ہی دھاگہ میں باندھ رہا تھا۔ لیکن جدائی کا تخیل جان لیوا طور پر روح فرسا تھا۔ مہمانوں کی کثرت تھی۔ اس کی جانبازی نے اس کو ہیرو بنا دیا تھا۔ اور اس ہیرو کو دیکھنے ملک کے گوشے گوشے سے مخلوقت چلی آتی تھی۔ پھول کے ہاروں نے اس کے قد و قامت کو ڈھک لیا تھا ــــــ

بس کہ ہیں ہم اک بہار ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

پھولوں کی زبان کون سمجھے۔ پھول سے پھول کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن کیا ــــــ؟ شادی کے تحفوں میں امام ضامنیں بھی تھیں۔ حرز جان کی تعویذیں بھی تھیں۔ غرض دوسرے ہی دن خسرو روانہ ہوا۔ اس کے پیچھے کیا ہوا۔ یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے۔ اور اس کا اعادہ ایک دور از کار سی بات ــــــ دن، مہینے، سال، ایک دو نہیں، چھ سات سال گزر گئے۔ آنکھیں پتھرا گئیں ــــــ

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے

تین چار سال تک تو خط آتے رہے۔ اس کے بعد سکوت۔ افواہیں در و دیوار سے سرگوشیاں کرنے لگیں۔ جاپانی قیدی تھا۔ نہیں اتنے آزاد ہو سکتے ہیں کہ خط لکھیں۔ وہاں تو بات پر زبان کٹتی ہے۔ کسی نے کہہ دیا زندہ ہوتے تو خط لکھتے۔ غرض بے سر و پا قصے۔ ہوشربا تنقیدیں عقل کی بارگاہ سے بھٹکی ہوئی تخیل آرائیاں۔

رضوانہ جیسے جیتے جی مر چکی تھی۔ اس خبر نے اس کی رہی سہی دنیا بھی لوٹ لی۔ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اس پر لیکن

انسان میں برداشت کی قوت پیدا ہو جائے تو بڑی سی بڑی مصیبت بھی اس کی ہمتوں کے آگے اپنا سر کچل کر رکھ دیتی ہے۔ مصائب و آلام خود اتنے خوفناک نہیں ہوتے جتنا ان کا تخیل ہوتا ہے! بہادری و شجاعت صرف مرد کی میراث ہی نہیں۔ یہ عورت کا بھی جوہر ہے۔ ایک بزدل عورت ایک شجیع و جانباز سپوت کو کیسے جنم دے سکتی ہے۔

رضوانہ نے جہاں اس کی جدائی گوارا کر لی تھی، اب اس کی دائمی جدائی کو سہارنا بھی گو اس کے بس کی بات نہ تھی — لیکن سہنے کے لئے خود کو بے بس پاتی۔ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ تقدیر کے سامنے انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ قدرت کے اٹل قانون کیسے بدل سکتے ہیں مشیت ایزدی —

اور کیا —

دھیرے دھیرے محمود کی ہمدردی رضوانہ سے بڑھتی جاتی تھی۔ ہمدردی شاید محبت کا پہلا زینہ ہے۔ لیکن — رضوانہ کے دل میں محمود نے وہ جگہ نہ لی جو خسرو کی ہو چکی تھی۔ یوں مروت و اخلاق کے کارن وہ اس سے جبراً و قہراً متوجہ بھی ہو جاتی۔ لیکن عورت شاید زندگی میں ایک ہی مرتبہ محبت کر سکتی ہے۔

والدین محمود کے بھی وہی تھے جو خسرو کے تھے۔ ان کی تو یہ دونوں آنکھیں تھیں۔ انھوں نے سوچا خسرو تو اب اس سنسار میں نہیں۔ محمود سے رضوانہ کا عقد کر دینا بہتر ہوگا۔ ورنہ بدنامی — اور سماج — اس کا کون مقابلہ کرے۔ بزدل قسم کی مخلوق "سماج" سے بہت ڈرتی ہے۔ کاش اتنا ہی خوف انھیں ضمیر کا ہوتا۔ اور یہ سماج — اسکی روح فرسائیوں سے خدا نہ پالا ڈالے۔

خسرو اس دنیا میں نہ ہو۔ لیکن رضوانہ کے دل سے اس کو کون نکالے۔ ادھر والدین کی دھمکیاں۔ پھر ساتھ ہی ساتھ پیار اور چمکار کی باتیں۔ غرض سب ہی کچھ۔

محمود اور رضوانہ کا عقد ہو جاتا ہے۔ بغیر کسی قسمت کے نازیبا دریافت میں یہ سمجھتے ہوئے کہ خسرو تو اب اس دنیا میں نہیں۔

رضوانہ ایک مجرم کی طرح بندی بندی رہتی ہے۔ ہنسنا بولنا تو وہ بھول ہی چکی تھی۔ اس کے قہقہے — سات سال ہوئے انھیں دفن ہو کر۔

یہ نام نہاد، دنیا دکھاوے کی شادی ہوتے ۲ ماہ گزرے ہوں گے کہ جنگ امن سے بدل گئی۔ ماں باپ کے ولولے جاگ اٹھے۔ نت نئے خواب، اپنے اپنے لڑکوں کی واپسی کا حسین تخیل ان کے دل و دماغ کی پامال روشوں میں گھومنے لگا۔

خسرو کے والدین کی تو آس ٹوٹ چکی تھی انھیں تو اب کسی کا انتظار نہ تھا۔ اسی بنا پر رضوانہ محمود کی تمناؤں کی بھینٹ چڑھا دی گئی تھی۔ باوجود انکار اور جد و جہد کے اس کی ساری التجائیں ٹھکرا دی گئیں۔ زبان رکھتے ہوئے بھی اس سے اس قسم کا سلوک جیسے بے زبانوں سے ہوتا ہے۔

ہندوستانی لڑکی کی تمنا اس کی "اپنی تمنا" ہی کب ہوتی ہے؟ اس کے ارمانوں سے تو جوا کھیلا جاتا ہے۔ اس کے "اپنے دل میں" اس کی "اپنی خواہش" تو کوئی چیز ہی نہیں ہوتی۔ اور پھر طنز نگاروں کا طعنہ ہے کہ عورت بے وفا ہے، مکار ہے۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں نہیں۔ اس کی بات کا کیا بھروسہ۔ خیر — رونا اس کا ہے کہ قلم دشمن کے ہاتھ میں ہے۔

ع۔ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

لیکن اس کی تو آرزو ہی رہ گئی۔

خسرو الطوق تمناؤں کی دنیا کامیابی کا سہرا لئے ہوئے وطن واپس ہوتا ہے۔ وہ جیتا جاگتا ہے۔ صحیح و سالم ہے۔ رضوانہ اس کے حدود تخیل سے ایک لمحہ کو ہٹ نہ سکی لیکن یہاں آکر اپنے چمن حیات کو گلچیں کی دست برد سے پامال و برباد دیکھ کر اس کا دل اس کے قابو میں نہیں رہتا ……

سارے گھر پر مردنی سی چھا جاتی ہے — والدین کے دلوں میں اب کس قسم کی امنگیں ہوں گی؟ رضوانہ کے قلب کی بے پناہ دھڑکنوں میں کس نوعیت کی کیفیت کا

احساس ہوگا؟
محمود کے ضمیر اور اس کی اپنی جلد بازی کا آخر کیا نتیجہ ہو سکتا ہے؟ رضوانہ اب درحقیقت کس کی ہو سکتی ہے؟ اصولاً و شرعاً —— ؟ اس کا فیصلہ —— کون کرے۔

جہاں بانو

(نشرگاہ حیدرآباد سے نشر ہوا)

احتراز

اُن کی محفل میں نہ جاؤں گا نہ جاؤں گا کبھی

وہ مجھے بندۂ بے دام سمجھتے ہیں ہنوز
وہ مجھے نقش تہِ گام سمجھتے ہیں ہنوز
زر کے زہریلے سپولوں سے ڈراتے ہیں مجھے
اپنی محفل میں وہ ہنس ہنس کے رلاتے ہیں مجھے
حسنِ معصوم کی سوگند ستمگر ہیں وہ
میری نظروں میں خدا ہو کے بھی کافر ہیں وہ
وہ مرے فن کو سمجھتے ہیں جواہر کا عوض
سنگریزے کبھی ہوتے نہیں شاعر کا عوض
وہ مجھے شاعرِ خوددار سمجھتے ہی نہیں
وہ تو تلوار کو تلوار سمجھتے ہی نہیں

میں اگر جاؤں تو محفل تہہ و بالا کر دوں
ساغرِ عیش بہر طاق الٹ کر رکھ دوں
بزمِ شادی کو عزا خانہ بنا کر رکھ دوں
ہر چراغِ شبِ عشرت کو بجھا کر رکھ دوں
نوعِ آدم ہوں فرشتوں کو بھی حیراں کر دوں
شاہِ خاور کے بھی دامن کو گریباں کر دوں
میری تقدیر کی مشکل اگر آساں نہ ہوئی!
فطرتِ حسن اگر پھر بھی پشیماں نہ ہوئی
اور پھر بھی وہ اگر سر بہ گریباں نہ ہوئے
اپنے محبوب مشاغل سے گریزاں نہ ہوئے
مستقل طور پہ ہے میرا ارادہ ساقی
اُن کی محفل میں نہ جاؤں گا نہ جاؤں گا کبھی

ساقی صدیقی

فیشن

انسان خواہ وہ کتنا ہی اچھا کام کیوں نہ ہو مسلسل کرتے کرتے تھک جاتا ہے اور اس میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے تبدیلی ضروری ہوتی ہے اور اسی تبدیلی کا نام فیشن ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

فیشن کا بدلنا ضروری ہے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے نئی نئی ایجادیں ہو رہی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ ہمیں معلوم ہو رہا ہے کہ فلاں چیز ہمارے لئے مفید ہے اور فلاں مضر۔ بعض مروجہ فیشن میں دقتیں پیش آنے لگتی ہیں اس لئے اس کو ترک کرکے نیا فیشن اختیار کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں رواج کا ہر زمانے کے ساتھ بدلنا بدرجۂ اتم ضروری ہے۔ مثلاً پچیس تیس سال قبل ہندوستان میں الکٹریسٹی کا رواج نہ تھا۔ مکان میں دیئے اور شمعیں جلائی جاتی تھیں لیکن جب بجلی کی خصوصیات اور اس کے استعمال کی سہولتیں معلوم ہوئیں تو بجائے لیمپ کے معمولی معمولی گھروں میں بجلی کی روشنی آ گئی۔

ملک کی فضا اور موسم کا بھی فیشن پر اثر پڑتا ہے۔ ہر ملک کے فیشن جدا ہوتے ہیں۔ ممکن ہے جو چیز ہندوستان میں پسند کی گئی ہو کہ انگلستان میں خراب قرار دیں مثلاً مغربی ممالک میں بال کاٹنا فیشن ہے۔ ہندوستان میں لانبے بال رکھنا خوبصورتی میں شامل ہے۔ مغربی ممالک میں دن میں تین چار مرتبہ کپڑے بدلنا تہذیب ہے اور یہاں اس طرح کرنا وقت کی بربادی تصور کرتے ہیں۔ آج کل عموماً فیشن کے معنی صرف کپڑوں کی حد تک لیتے ہیں لیکن دراصل اس کا پتہ انسان کی زندگی کے ہر شعبے سے چلتا ہے۔ مثلاً بود و باش، کپڑے کھانا پینا وغیرہ۔

ہماری معاشرت میں آج کل بناوٹ بہت زیادہ ہو گئی ہے اور ہماری طرز زندگی میں تکلف اور نمائش بہت داخل ہو گئے ہیں۔ تہذیب و تمدن اور فیشن کا مطلب غلط سمجھا گیا ہے اور یہ بات فرض کر لی گئی ہے کہ جب تک ظاہری ٹیپ ٹاپ سے سادگی اور بے تکلفی کا خون نہ کیا جائے انسان مہذب (Civilized) نہیں رہتا۔ اس طرح ہماری زندگی ایک دکھاوا بن کر رہ گئی اور ہمارے ہر معمولی کام میں بناوٹ اور تصنع داخل ہو گیا مثلاً ملنے جلنے میں، کھانے پینے میں الغرض زندگی کے ہر شعبے میں۔

وہی فیشن اچھا اور قابل تقلید ہے جس میں ہمیں آرام و چین نصیب ہو جس سے لوگوں کو انگشت نمائی کا موقع نہ ملے۔ آج کل بیسیوں عمدہ عمدہ رواج ہیں اور ان فیشنوں پر چلنے سے ہماری زندگی بہت اچھی ہو گئی ہے۔ مثلاً مکانات جو سو سال پہلے بنائے جاتے تھے عموماً بے ترتیب اور صحت کے لئے خراب ہوتے تھے لیکن آج کل کے خوبصورت مکان میں رہائش کے علاوہ حفظان صحت کا بھی بہت کچھ لحاظ رکھا جاتا ہے۔ ایسے مکانات بنانے کی تقلید ہندوستانیوں نے بھی کی اور وہ اس حد تک اچھی بھی تھی لیکن جرمن وضع کے مکان جن کا حیدرآباد میں بہت رواج ہے میرے خیال میں ہندوستانیوں کے لئے موزوں نہیں۔ کیوں کہ ایسے مکانوں کی چھت بہت نیچی ہوتی ہے جو مغربی ممالک کے لئے کافی ہے کیونکہ وہاں کا موسم بھی بہت سرد رہتا ہے اور پست مکان گرم ہوتے ہیں لیکن حیدرآباد میں اسکی تقلید کرنا کہاں تک مناسب ہے؟

کسی دوسرے ملک کے فیشن کی اندھی تقلید کرکے تختۂ مشق بننے سے پہلے بہتر یہ ہے کہ ہم سوچیں کہ ان لوگوں نے کیوں اس قسم کا فیشن اختیار کیا۔ ہمارے لئے اس کی تقلید میں کیا برائی اور کیا بھلائی ہے۔ اگر اس پر غور کرکے ہم کوئی چیز اختیار کریں گے تو بجائے انگشت نمائی کے ہم قابل تعریف ہوں گے۔ ہم میں اور انگریزوں میں یہی فرق ہے! وہ ہماری اچھی چیز بیسا چھین کر اپنا لیتے ہیں اور ان کا استعمال سلیقہ سے کرتے ہیں برخلاف اس کے ہم بدھو کی طرح بغیر سوچے سمجھے ان کی پیروی کرتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے"۔

ہمارے دوسرے ہندوستانی بھائی ہم پر ہنستے ہیں اور انگریز بھی بیوقوف سمجھتے ہیں۔ اس بھونڈی تقلید سے ہم اپنی انفرادیت کھو دیتے ہیں۔

ایک صاحب کیا خوب فرماتے ہیں کہ فیشن کا دوسرا نام "ایک حمام میں سب ننگے" کا ہے بظاہر تو کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ فیشن کی اندھی تقلید کہئیے یا بھونڈی نقالی ہندوستان کی بربادی اور تباہی کا باعث ہے۔

دنیا کا ہر ملک دوسرے ممالک کی اچھی چیز کی پیروی کرتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں تقلید اس طرح پھیلی ہے کہ دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے۔ بہت کم ہندوستانی ایسے نظر آئیں گے جو اپنی خاص وضع پر قائم ہوں ورنہ عام طور پر غیر ممالک کی تقلید اس حد تک کرتے ہیں کہ اچھائی اور برائی کا بھی امتیاز باقی نہ رکھا۔ یورپ سرد ملک ہونے کی وجہ سے وہاں شراب کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستانیوں نے اس کی نقل شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گردے اور پھیپھڑے خراب ہوگئے۔ باوجود اس کے وہ خوش ہوتے ہیں کہ ہم میں اور انگریزوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

یورپی دنیا میں فیشن کا مرکز کئی سال سے فرانس رہا۔ یہاں جو فیشن رواج پاتا ہے ساری دنیا میں اسی کی تقلید ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل حیدرآباد ہندوستان کا پیرس بنا ہوا ہے۔ یہاں کسی دعوت یا جلسہ میں جائیے قسم قسم کے لوگ نئے نئے روپ میں نظر آتے ہیں اور لطف تو یہ کہ خواہ انھیں وہ لباس اچھا معلوم ہو یا برا۔ انگریزوں کا لباس عریاں نہیں تو نیم عریاں تو ضرور ہے۔ ان کے گلے اور آستین چھوٹے رہتے ہیں۔ ہم بغیر غور کئے اس نمونے کے لباس پہنتے ہیں۔ اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ ہم فیشن کی خاطر عریاں ہو رہے ہیں اس لئے ہمیں چاہیے کہ کسی فیشن کو اختیار کرنے سے پہلے امتیاز کریں آیا وہ اچھا ہے یا برا۔

جب کوئی برگزیدہ ہستی یا کوئی شہزادی کسی چیز کو اختیار کرتی ہے تو لوگ اس کی تقلید کرنے لگ جاتے۔ اسی طرح نئے نئے فیشن وجود میں آتے ہیں۔ یہ طریقہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اسٹیل نے اپنے ایک مضمون (Fashionable affectations) میں اس مسئلہ پر کافی بحث کی ہے۔ مثلاً سکندر اعظم کی گردن ایک طرف ذرا سی جھکی ہوئی تھی لوگ اس کی تقلید کرنے لگے۔

فیشن کے واسطے یہ ضروری نہیں کہ وہ کوئی نئی طرز اختیار کریں۔ آج کل پرانے فیشن کی طرف بہت میلان پایا جاتا ہے۔ اگر ہندوستانی نقالوں کے سامنے چند بدترین چیزیں فیشن بنا کر پیش کی جائیں تو وہ اس کو فوراً قبول کریں گے۔ ہم لوگوں پر تقلید اس قدر غالب آگئی اور ہر چیز پر اس قدر بناوٹ غالب ہے کہ ہم خود مصنوعی ہوگئے ہیں۔ ہم ہر چیز میں انگریزوں کی پیروی کرتے ہیں مثلاً ہندوستانی مٹھائی کے بجائے چاکلیٹ پسند کرتے ہیں۔ روٹی مسکے کو بریانی پر ترجیح دیتے ہیں۔ گو دل تو چاہتا ہے کہ بریانی چکھیں لیکن فیشن کے خیال سے روٹی مسکہ کھاتے ہیں۔ یہ ہے ہماری معاشرت کا رنگ۔

رہنے سہنے کے طریقوں میں بھی بہت نقل کرتے ہیں۔ مغربی ممالک کے لوگ فرش پر نہیں بیٹھتے بلکہ صوفوں پر اپنی عمر گزارتے ہیں۔ لیکن اس کا سبب بھی ہے۔ وہاں فرش اس وجہ سے استعمال نہیں ہوتا کہ وہاں کا موسم بہت سرد ہوتا ہے اور پتھروں کی ٹھنڈک سے بیمار پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستان جیسے گرم ملک میں ہمیشہ صوفہ پر بیٹھنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن کیا کریں فیشن ایبل کہلانے کی خاطر سب کچھ گوارا کر لیتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں اپنے آپ کو بیمار رکھنا شائد ایک فیشن سمجھا جاتا ہے کچھ زمانہ پہلے جس کسی کو دیکھو وہ درد گردہ میں مبتلا ہے چاہے درد اس کے پاؤں میں ہوتا ہو چاہے سر میں لیکن ہمیشہ وہ خود کو اس مرض میں مبتلا کہتا ہے۔ اب تو

ٹانسلز کی شکایت عام ہو گئی ہے ممکن ہے آئندہ صحت مند لوگ ٹانیفائڈ میں مبتلا نظر آئیں!!!

آج کل سینما لوگوں کی زندگی کا ایک حصہ بن گئے ہیں سینما کا اثر فیشن پر بہت پڑ رہا ہے۔ اونچے اخلاق والوں پر سینما کا اچھا اثر پڑتا ہے لیکن کمزور اطوار والے چال ڈھال بات چیت، الغرض ہر ایک چیز میں ایکٹروں کی تقلید کرتے ہیں۔

باوجود ان تمام باتوں کے فیشن کا ہونا ضروری ہے۔ اگر ہم اس کو اچھی طرح عمل میں لائیں تو یہ ایک بہت اچھی چیز ہے۔ یکسانیت کی زندگی سے موت بہتر۔ ترقی کے لئے تبدیلی ضروری ہے لیکن کس قسم کی تبدیلی ——— وہ تبدیلی ہمارے موافق ہو اور اس سے ہمیں راحت و آرام ملے نہ کہ تقلید جو ممکن ہے ہمیں پیریں کی طرح انجمنیں بنانے کی اجازت دے اور ہماری حالت اس شعر کے مصداق ہو جائے۔

ہوئے اس قدر مہذب کہ نہ دیکھی گھر کی صورت
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

فریدہ

خوش آمدید

یہ کون جھجکتا آتا ہے! — کیوں آتے ہوئے شرماتا ہے
انداز تو چلنے کے ہیں وہی — ہر گام پہ ہے اک موسیقی
ہے قد میں وہی ڈالی کی لچک — سو آئی نظر بندوں کی چمک
وہ ہاتھ بڑھے ساغر کھنکے — ناہید نے چھیڑے ساز نئے
خوشبو کی لپٹیں آتی ہیں — دامانِ فضا مہکاتی ہیں
لو آ ہی گئے وہ آ ہی گئے — اور دیدہ و دل پر چھا ہی گئے

اب جانے کہاں کھو جاؤں گا
میں ان پہ فدا ہو جاؤں گا

دو قطعے

۲

گر نہیں تیرے لئے سطوتِ بہاراں نہ سہی
عیش و عشرت نہ سہی بزم و شبستاں نہ سہی
ہو مبارک یہ جوانمردوں کا جینا تجھ کو
ہمتِ مور تو ہے ملکِ سلیماں نہ سہی

لطفِ ساحل نہ سہی تلخیٔ طوفاں ہی سہی
نورِ ایماں نہ سہی ظلمتِ عصیاں ہی سہی
ہائے محرومیٔ جاوید کہ یہ بھی تو نہیں
زندگی خواب سہی خوابِ پریشاں ہی سہی

محسوسات

نگاہوں میں خمار آتا ہوا محسوس ہوتا ہے
تصور جام چھلکاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

خرامِ ناز' اور ان کا خرامِ ناز، کیا کہنا!
زمانہ ٹھوکریں کھاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

تصور ایک ذہنی جستجو کا نام ہے شاید!
دل ان کو ڈھونڈھ کر لاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

کسی کی نقرئی پازیب کی جھنکار کے صدقے
مجھے سارا جہاں گاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

تھرکتا ہے گھٹا کا عکس موجوں کی روانی پر
کوئی آنچل سا لہراتا ہوا محسوس ہوتا ہے

لچکتا جسم رقصِ بیخودی میں دیکھنے والو
سنہرا سانپ بل کھاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

قتیلؔ اب دل کی دھڑکن بن گئی ہے چاپ قدموں کی
کوئی میری طرف آتا ہوا محسوس ہوتا ہے

قتیل شفائی

مشرق

(از موپساں)

جیسے ہی میرا نشہ شروع ہوتا ہے میں اپنے دوست کو یاد کرنے لگتا ہوں جو بہت دور ایشیا کی سرحد پر رہتا ہے۔

پچھلی دفعہ میں اس سے ملنے گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ دوبارہ اس سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ آج سے تین سال قبل ستمبر کی بات ہے کہ میں ایشیا گیا تھا، میں نے وہاں اس کو اپنے دیوان خانے میں افیون کے نشہ میں نیم خوابی کی حالت میں پایا۔

اس نے بغیر حرکت کئے کہنا شروع کیا، بیٹھ جاؤ پھر تم جو کچھ پوچھو گے میں اس کا جواب دیتا جاؤں گا۔ لیکن میں حرکت نہیں کر سکتا، میں بیٹھ گیا اور پیرس کے متعلق ہزاروں باتیں کہہ ڈالیں۔ لیکن اس نے کہا "تم کیا کہہ رہے ہو مجھے اس سے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں کیونکہ میں ایسے ممالک کا دلدادہ ہوں جو دوسرے آسمانوں تلے بستے ہیں۔

اوہ بیچارا کاٹرائیو نے مشرق دیکھنے کی خواہش میں جان دیدی۔ تم نہیں جانتے کہ یہ ملک کس طرح مسحور کرتا ہے۔ یہ تمہاری آنکھوں کی راہ تمہارے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے اور اپنی محبت کے غیر مرئی دھاگے میں باندھ لیتا ہے۔ میں یہاں افیون کی رنگینیوں سے کھیلتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کیں۔

میں کہا "تمہیں زہر میں کیا مزہ ملتا ہے۔ تمہیں اس سے کیا جسمانی لذت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ یہ تمہارا ایک نہ ایک دن خاتمہ کر کے رہے گا" بات کاٹتے ہوئے اس نے کہا۔

"یہ جسمانی لذت نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر حسین شئے ہے۔ افیون تمام دنیوی جھگڑوں سے دماغ کو نجات دلاتی ہے۔" "کیا تم جاننا چاہتے ہو مجھے کون کونسی چیزیں پسند ہیں۔ لو سنو! ایک تو ہے افیون اور دوسرے ہے مشرق۔ میں جب افیون کھا کر لیٹ جاتا ہوں تو پہلے ہلکا ہلکا سا نشہ ہوتا ہے اس کے بعد تمام اعضاء پر یہ اثر چھا جاتا ہے۔

اس کے بعد میں بالکل بے خود ہو جاتا ہوں، مجھے بے اندازہ مسرت ہوتی ہے جس کو میں بیان نہیں کر سکتا، میں خیالات کے اتھاہ سمندروں میں بہتا ہوا مسرت و انبساط سے ہمکنار رہتا ہوں۔ دوبارہ اس نے آنکھیں بند کیں۔

میں نے کہا "تم جو مشرق سے اتنی محبت کرتے ہو وہ صرف اس نشہ کی وجہ سے ورنہ کوئی کیونکر اس وحشی ملک کو پسند کرے گا جہاں دماغ بے حس ہیں، جہاں خیالات پر صدیوں کی روایتوں کا بار ہے، جہاں جد حیات نام کو نہیں۔

"میں جس سے محبت کرتا ہوں وہ خواب ہے، وہ حسین ہے تم کہتے ہو "مشرق ایک وحشی ملک ہے" خاموش، بدتمیز آدمی یہ ایک فرشتوں کا ملک ہے، وحشی ہم مغرب کے لوگ ہیں جو اپنے آپ کو متمدن اور شائستہ سمجھتے ہیں، ہم قابل نفرت وحشی ہیں جو وحشیوں سے بدتر زندگی گزارتے ہیں۔

ہمارے پتھر سے بنے ہوئے شہروں اور خوبصورت فرنیچر کی طرف دیکھو ہماری ساری زندگی نمائش ہے۔ گھروں کے دود کشوں کو دیکھو جن میں سے خون کو جما دینے والی ٹھنڈی ہوائیں اتنی کافی آتی ہیں کہ ان سے چکی چل سکتی ہے۔ ہماری ساری زندگی کرسیوں پر گزرتی ہے۔ کتنی مضحکہ خیز چیز ہے...... ہماری دماغی زندگی پر بھی نظر ڈالو جو کتنی مصیبتوں اور کشمکشوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ آئے دن لڑائیاں ہوا کرتی ہیں ہر طرف تباہی کا بازار گرم ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا پھر کہنا شروع کیا: میں اس مکان کو جانتا ہوں جس کو قریب میں خریدنے والا ہوں، وہ ایک مشرقی وضع کا بنا ہوا لکڑی کا مکان ہے۔ تم اس مکان سے سمندر کو بآسانی دیکھ سکتے ہو۔ سفید بادبان تھرتھراتے ہوئے دکھائی دیں گے، ترکوں اور یونانیوں کی کشتیاں نظر آئیں گی۔ مکان میں چھوٹا سا چمن ہے جس میں ٹھنڈی ٹھنڈی معطر ہوائیں سرسراتی ہیں، درختوں کی شاخوں سے فوارے ابلتے ہیں اور آبشار کی صورت

میں ایک حوض میں گرتے ہیں جس کی تہہ سونے کی بنی ہوئی ہو وہاں میں ہر وقت نہاؤں گا۔ میں کوئی نوکر نہیں رکھوں گا اس لئے کہ وہ اپنے میلے پیروں کی ٹھوکروں سے فرش کو خراب کرتے ہیں۔ میں اب فرش پر کبھی بھی جوتوں کی آواز نہیں سن سکتا، میں خوبصورت کالی عورتوں کو نوکر رکھوں گا جو سفید برقعوں میں ننگے پیر قالین پر تھرکتی رہیں گی۔ میرے مکان کی دیواریں ایسی صاف اور چکیلی ہوں گی جیسے ایک حسین عورت کا شفاف سینہ۔

جب میں ان تمام حسین اور دلکش مسرتوں سے تھک جاؤں گا، جب میری خوشی میں تھوڑی سی کمی ہوگی کسی سفید یا سیاہ گھوڑے پر سواری کروں گا۔ میں شام کی خاموش فضا ملل میں گھوڑے پر سوار دیوانہ وار ڈوبتے سورج کی طرف دوڑوں گا...... ہر چیز گلابی ہوگی — پہاڑ — ریت — عربوں کے کپڑے — اور گھوڑوں کے سفید کپڑے۔ انسانوں کو سیاہ کپڑے پہنے ہوئے تکلیف دہ کرسیوں پر بات چیت کرتے ہوئے سڑکوں کے کنارے یا ہوٹلوں میں کبھی بھی نہیں دیکھنا چاہتا میں اپنے حسن و دلکش مکان میں اطمینان سے زندگی بسر کروں گا۔ تمام دنیوی ہنگاموں سے — اور بہت دور۔ میری چار پانچ بیویاں ہوں گی جو قیمتی قیمتی لباسوں میں ملبوس رہیں گی۔ یہ دنیا کے مختلف گوشوں سے آئیں گی اور مجھے دنیا کی ہر نسل کی نسوانی خوبصورتی اور لذت کا مزہ چکھائیں گی۔

ایک دم وہ خاموش ہوگیا اور کہنے لگا۔ مجھے چھوڑ دو — مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا اس کے بعد پھر اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ تین مہینے کے بعد اس نے ایک خط لکھا جس میں فقط یہی درج تھا "میں خوش ہوں"

اس کا خط روح پرور خوشبو میں ڈوبا ہوا تھا۔

محمود قادری

دھوکے

میں جانتا ہوں تخیل میں کیا نہیں ہوتا	شبابؔ شعر کی دنیا، شراب کی بستی
وفورِ صبحِ گل افشاں، نشاطِ شامِ نجوم	زمیں سے عرش تلک ایک بے پناہ مستی
ہر ایک چیز نہاں زیرِ دامنِ امکاں	نگاہِ ذوقِ طلب پر ہر ایک شئے سستی
وہ چند لمحے تصور کی وسعتوں سے لطیف	وہ ہر وجود سے اک بوجھ سی مری ہستی
ندیم کاش یہ لمحے ہی زندگی ہوتے!	کہ میرے دل کو نہ ڈستی مری تہی دستی

میں اس زمین سے کچھ دور ہو گیا ہوتا
اسی جہانِ تخیل میں کھو گیا ہوتا

اقبال متین

محمد قلی قطب شاہ اور رومانیت

محمد قلی قطب شاہ کا عہد تاریخ گولکنڈہ کا وہ دور ہے جبکہ دکن ہند اسلامی ثقافت و تمدن کا سنگم بنا اور ہندو مسلم آرٹ کا ایک حسین امتزاج پیدا ہوا۔ چنانچہ محمد قلی قطب شاہ پہلا دکنی مسلمان بادشاہ ہے جس نے ہندوؤں کے لباس اور طرز ماند و بود کو اختیار کیا۔ اسی یگانگت اور میل ملاپ کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد قلی کے دربار اور محلات شاہی میں ہندوؤں نے بار پانا شروع کیا اور قلی کی حسن پرست طبیعت نے ایک عجیب و غریب رومانی فضا پیدا کر دی۔

کلیات محمد قلی قطب شاہ اٹھا کر دیکھیے تو اکثر و بیشتر نظمیں ایسی ملیں گی جن کے پیچھے ہمیں محمد قلی کے دربار میں حسن و عشق کے ڈرامے کھیلے جاتے نظر آئیں گے۔ یہ دربار کیا تھا گویا حریم ناز تھی اور یہ نظمیں کیا ہیں گویا اس حریم ناز کی زندہ اور چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ ان رومان آگیں فضاؤں میں محمد قلی کا دل جو زندگی اور کائنات میں سوا حسن و عشق کے کسی اور حقیقت کو کارفرما نہیں دیکھتا چوہیں گھنٹے تیرتا نظر آتا ہے۔ محمد قلی میں حسن و عشق کا احساس بچپن ہی سے قدرت نے ودیعت کیا تھا اور رومانیت کا ایک شدید حسی کیف (Hyper Sensitiveness) اس کی ساری زندگی میں رواں دواں نظر آتا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کا کلیات دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک میں نظموں کا طویل مجموعہ ہے اور دوسرے میں غزلیات ہیں۔ غزل اور نظم اگرچہ صنعت کے اعتبار سے دو علٰحدہ چیزیں ہیں، لیکن یہ دونوں راگ "کلیات محمد قلی قطب شاہ" میں ایک ہی اسپرٹ سے نکلتے ہیں اور وہ اسپرٹ رومانیت (Romanticism) ہے۔ غزلوں میں یہ اسپرٹ رمزیت کے پردہ میں جھلکتی ہے اور محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کے عام پہلو اس میں دکھائی دیتے ہیں۔ شاعر کے جذبہ و خیال کا ایک دھندلا سا عکس ان غزلوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن نظم کا حصہ خاص طور پر محمد قلی کے دربار سے وابستہ ہے جس سے حسن و عشق کی ایک عجیب و غریب (Physical world) ہویدا ہے۔ اس دنیا میں محمد قلی گم ہو کر ساری کائنات سے بے خبر ہو جاتا ہو۔ فلسفہ اور حکمت اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہاں اگر اہمیت ہے تو اپی کیورس (Epicurus) کے قول کے مطابق "کھاؤ پیو اور عیش کرو" کی حد تک۔ چنانچہ علم کی نارسائی کا شکوہ کرتے ہوئے عیش کا ترانہ وہ یوں گاتا ہے:

دنیا کا حکمت نا بوجھیں ہرگز حکیماں علم سوں
گا تو ترانہ عیش کا ہر دم پیا کے نام پر

اس ترانۂ عیش کے لئے وہ اپنی "پیاریوں" کی محفل جماتا ہے۔ اور ان کے لئے محل تعمیر کرواتا ہے۔ ان محلوں میں ہر وضع کی نازنیناں بے تکلفی کے ساتھ اپنے حسن و جمال اور آرائش و زیبائش میں مصروف و منہمک اور عشق و مستی کی عجیب و غریب کیفیتوں اور ہجر و وصال کے لئے بے پناہ جذبات کے مظاہرے کرتی رہتی ہیں۔ محمد قلی کی پیاریوں میں ننھی، سانولی، پیاری، گوری، چھبیلی، لالا، بلقیس زمانی، ہندی چھوری، پدمنی، سندر، مشتری اور بھاگ متی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں کیونکہ ان پر محمد قلی نے مستقل نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے حسن و جمال کی داد دی ہے اور ان کے ساتھ اپنے عاشقانہ تعلقات کا اظہار کیا ہے۔ محمد قلی کو ان پیاریوں سے جو لگاؤ تھا اس کا اظہار ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بھاگ متی کی خاطر محمد قلی نے موسی ندی کی تیز و تند طغیانی میں اپنا گھوڑا ڈال دیا اور اپنی پیاری بھاگ متی کی جان بچائی۔ اس جرم کی پاداش میں اس کو محل میں چند روز قید بھی رہنا پڑا۔ اپنی پیاریوں کے حسن و جمال اور غمزہ و عشوہ کی تصویر محمد قلی نے اپنی نظموں میں کھینچی ہے اس کے چند اشعار ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

ننھی :-

وو ٹکر لاج سوں انچل وو ننھی نکلی چمن
اس ننھی ڈال او پر کیوں لگیا ہے سیو لیوں

سو کا سوں کریں جو غصہ و ناز کی باتیں
جب ہونٹاں تے جھڑے پھوپی جو منگے سکوں سکن

(شرح :- جب چمن میں ننھی محو خرام ہوتی ہے تو شرم کے مارے آنچل ڈال لیتی ہے۔ معلوم نہیں کہ اس ننھی ڈالی پر ابھی سے شباب کے پھل کیوں لگ گئے۔ جب وہ غصہ یا ناز سے خط سر ملکے اشارہ سے بات کرتی ہے اور اس کے ہونٹ عرق آلود ہو جاتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ اس کو گن دیکھوں)

کنولی :-

تازگی تے تازہ چنچل آئی میرے بر منے
بیل کوں لے سبز آنچل پھول جیغہ پر منے

کنولی پیاری پہلی باری ڈاو ساری دادسوں
نین ناری رنگ و ھاری مدخماری سر منے

نیہہ دھن کا ناز ٹھن کا پاوں جھنکاریوں ہے
آس من کا عیش تن کا ذوق کن کا ہر منے

(شرح :- شگفتہ چنچل پھر میرے یہاں سبز آنچل اوڑھے اور پھولوں کی کلغی لگائی ہوئی آئی۔ اس کی الہڑ چال سے شراب کا خمار اور آنکھوں میں رنگ کے ڈورے نظر آ رہے ہیں۔ اس حسین کی محبت اور اس کے پاؤں کی جھنکار دل کے لئے امید، تن کے لئے عیش اور کان کے لئے ذوق کا باعث ہے)

پیاری کے متعلق لکھتا ہے :-

رین دن کوں ج جانے نا جو کوئی جیو عاشق ہے تیرا
لگیا ہے یاد یوں تیرا کہ نئیں کچ یاد آئے گی

(شرح :- جو دل سے تیرا عاشق ہے اس کو رات اور دن کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا۔ تیری یاد کچھ اس طرح لگی ہوئی ہے کہ پھر کچھ بھی یاد نہیں آتا) محبوب کی یاد اور اس کی مرکزیت کی شکل ہمیں مومن میں ملتی ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مشتری کے متعلق لکھتا ہے :-

ترا ہستی اسی کا نانو ہے تن میں حیا ہو
تو تج مستی ملے تا ابد لگ باصفا ہو

اسی مستی کے تیئں توں جب پیا ہو دیں دل میں
ہزاراں شکر و سجدے کر کہ تج سو مر جیا ہے

ہمن دل کے گنوارے میں سجن کا نور دستا
سورج کرناں کی ڈوریاں سوں جھلکتا خوشنما ہے

(شرح :- زندگی اسی کا نام ہے کہ جسم میں دل ہو اور ہمارا دل ہمارا معشوق ہے جس میں عشق کی ابدی مستی ہے جس کی وجہ سے وہ ہمارے دل میں عرصہ سے جگہ لئے ہوئے ہے۔ جہاں اس کا نور سورج کی شعاعوں سے زیادہ خوشنما اور روشن ہے)

ان اقتباسات کے علاوہ ہمیں کلیات محمد قلی قطب شاہ میں بیسیوں نظمیں ایسی ملیں گی جو محمد قلی کی حسن افروز اور عشق لبریز زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ اپنی پیاریوں کی محبت میں محمد قلی نے جذبات و احساسات کا اظہار جس حسن کارانہ انداز میں کیا ہے وہ محض تخیلی قلا بازیاں نہیں ہیں بلکہ سچی تصویریں ہیں۔ ڈاکٹر زور صاحب نے کلیات کے مقدمہ میں بڑی درست اور عمیق بات لکھی ہے کہ

" دنیا کا کوئی شاعر اپنے کلام میں اپنی زندگی کو اتنا عریاں نہیں پیش کر سکتا تھا جتنا کہ محمد قلی نے کیا۔ اس کا کلام قلب کی گہرائیوں سے

نکلتا تھا۔ اس کو مبالغہ، تصنع یا آورد کی
ضرورت ہی نہ تھی۔"

ایک اور مقام پر زور صاحب یوں رقمطراز ہیں :۔
"شباب کی رنگا رنگیوں اور جذبات کی جولانیوں کے اظہار میں اس کا قلم غیر معمولی قدرت رکھتا تھا۔ اور یہ قدرت تخیلی یا فرضی عشق و عاشقی سے نہیں پیدا ہو سکتی۔ محمد قلی صحیح معنوں میں اس میدان کا مرد تھا۔ اس کے رفیع الشان محل نہ تھے بلکہ اصل میں یہ قومی حسن و نغمہ کی وسیع اور آراستہ و پیراستہ نمائش گاہیں تھیں۔"

محمد قلی کی ان نظموں کا مقابلہ ہم اردو ادب کے شباب کے پیغمبر جوش ملیح آبادی کی نظموں سے کر سکتے ہیں۔ دونوں میں ہمیں وہی رومانیت کا شدید ترین احساس مشترک طور پر ملتا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ محمد قلی میں عریاں واقعیت ہے اور جوش میں جس کو غالباً محمد قلی جیسا جمالیاتی ماحول نصیب نہیں تخیلیت اور واقعیت کا امتزاج ہے۔ محمد قلی نے پیاریوں کے ذکر میں بعض راز و نیاز کے معاملات بھی اس انداز سے پیش کئے ہیں کہ موجودہ ترقی پسند ادب کے بعض عریاں افسانوں اور نظموں کو بھی شرم آنے لگے۔ لیکن یہ محمد قلی پر کوئی الزام نہیں کیوں کہ جیسا کہ ہم نے بتایا ہے محمد قلی اپنی زندگی کے ہر پہلو کو عریاں سے عریاں انداز میں اور پوری پوری واقعیت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ وہ شعر و سخن کا شوق ادبیات میں کوئی خاص مقام حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے جذبۂ عشق کی تسکین کے لئے کرتا ہے اور یہ مقصد بے مقصود یا کانٹ کے الفاظ میں

(Purposiveness without purpose)

اس کو صحیح معنوں میں ایک بڑا حسن کار بنا دیتا ہے۔ خواہ اس کا پیرایۂ اظہار عریاں ہی کیوں نہ ہو چلے۔ چنانچہ "نقشۂ وصال"، "عیش وصال" اور "بعد وصال" وغیرہ اس کی عریاں نگاری کی مثالیں ہیں۔ اپنی پیاریوں کے ناز و انداز پر بھی اس کا قلم جذب و کیف کے ساتھ رواں رواں ہے۔ "ناز نین"، "اسرارِ شباب"، "انداز شباب"، "چنچل نین"، "ماہ ابرو"، "کعبہ رخ"، "سرو خوش قد"، "چاندنی اور سجن"، "چاندنی اور پیا"—— ان تمام نظموں میں شباب کی لذتیں اور عیش کی وسعت گیر رعنائیاں اپنے انتہائی نقطہ پر نظر آتی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ محمد قلی کی عشق و عاشقی اس کے مادی ماحول (یعنی اپنی پیاریوں کی زلفوں میں) الجھ کر رہ گئی۔ بلکہ محمد قلی اس سے بھی آگے بڑھتا ہے۔ اس کی محبت کی ابتدا عورت سے ہوتی ہے لیکن انتہا اس پر جس کو خدا کہتے ہیں۔ (Great She)

When a man loves a woman,
Then He Knows God's secret and
secret of The world (Oskar Wilde)

اگرچہ آسکر وائلڈ کی طرح میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ محمد قلی کی اس عشق و عاشقی نے اس پر کائنات کے سارے راز فاش کر دیے تھے۔ اور نہ میں اس کا قائل ہوں کہ ایک رومانی شاعر کہاں تک فلسفہ طرازی کر سکتا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جس مادی ماحول کی محمد قلی نے اپنے کلام میں عکاسی کی ہے وہ اپنی پوری گہرائیوں کے ساتھ اس میں موجود ہے اور پھر حافظ کے مطالعہ نے محمد قلی کی طبیعت پر تصوف و عرفان کا کچھ ایسا رنگ جما دیا تھا کہ بعض نظمیں حافظ کی غزلیات کا بالکل ترجمہ معلوم ہوتی ہیں۔

محمد قلی نے معلوم اپنی پیاریوں کے تعلق سے یا کسی اور سیاسی وجوہ کی بنا پر باشندگان دکن سے کچھ ایسے قریبی اور گہرے روابط پیدا کر لئے تھے کہ "مرج البحرین یلتقیان" کے مصداق اسلامی اور ہندو کلچر کے دو دھارے گولکنڈہ کی سرزمین میں بہنے لگے۔ چنانچہ اس نے بعض ایسی عیدیں اور تہوار رائج کئے جو صرف اس کی رومان پسند طبیعت میں ترنگیں پیدا کرتے تھے بلکہ اس کی رواداری اور

سیاسی قابلیت کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ "نوروز" "بسنت" "شب برات" بقرعید اور دوسری عیدوں پر محمدؐ قلی نے جو نظمیں لکھی ہیں ان میں ان دو نوں پہلوؤں کا اظہار ہوتا ہے۔ خاص کر "نوروز" اور "بسنت" میں محمدؐ قلی دلچسپی سے حصہ لیتا اور عیش و طرب کی داد دیتا تھا۔ ان موضوعات پر محمدؐ قلی قطب شاہ کے نہایت بلند پایہ قصیدے اور نظمیں ملتی ہیں جو اس کی انتہائی مسرت کی ترجمانی کرتی ہیں۔

بسنت کی عید میں محمدؐ قلی کی ہندوستانیت پرستی جھلکتی ہے اور یوں بھی عیش و طرب کے لئے (جو فطرتاً محمدؐ قلی میں جذبہ موجود تھا) بسنت سے بڑھ کر کون سا موسم ہو سکتا ہے۔ ان نظموں میں اس نے جس بے ساختگی اور رنگینی کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔

شب برات پر ایک نظم میں لکھتا ہے :-

ہر یک دھن ہر یک گلبدن پہل نورتن کے ابر میں
پی مدن جھلکا بدن، شہ یک چمن کوں آئے ہیں
سوں مکھ شاب کے رنگ آب کوں، آفتاب جل تاب کا
دکھلائے کر مہتاب کوں بے تاب کر بجلائے ہیں
سو دھن لٹک کے جب جھلک، دونوں الک کے سو مہک
مہکیا فلک پر تھے ملک، لے سدھ ہو لک لک آئے ہیں
چھاتی اپر چھاتی سندر، لٹ سیام بھر پچ بس بھتر
جانے کر کالے ابر ڈونگر پہ چڑھنے آئے ہیں

(شرح :- ہر طرف سے ہر ایک نازنین نورتن کا لباس پہن آئی ہے تاکہ بادشاہ کے ساتھ چمن میں نکلے۔ شراب عشق پینے سے ان کے جسم جھلکنے لگے ہیں۔ اور اپنے نوجوان چہروں کے آب و رنگ اور آفتاب جیسی جھلک سے مہتاب کو بے تاب بنا کر پگھلا رہی ہے۔ نازنین اس انداز سے محو خرام ہے کہ اس کی زلفوں کے لہرانے کی وجہ سے خوشبو آسمان تک پہنچی ہے اور سارا آسمان مہک گیا ہے۔ ایک سے ایک کے پستان زیادہ خوبصورت ہیں جن پر سیاہ بالوں کی لٹیں ایسی نظر آتی ہیں جیسے پہاڑیوں پر کالے کالے بادل چڑھائی کرنے آئے ہیں)۔

بسنت پر ایک قصیدے کے چند اشعار ہیں :-

پلا ساقی سرا مدے کہ تا ہوئے کشف ہمنا کوں
کہ اس مے تے دلیسے منج کوں سدا سب راز پنہانی
عنبر ہور عود و مشک و زعفراں کا رُت آیا
اسی تے باس انو کا جگ میں کرتا ہے گلستانی
بسنت پھل کا حمایل پہن کر آئی انگن میں دلھن
سو پھل سنگار کے نقشاں منے حیران ہے مانی

(شرح :- اے ساقی! شراب پلاتا جا تاکہ مجھ کو کشف ہونے لگے کیونکہ شراب کی وجہ سے مجھے پوشیدہ راز بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ عنبر، عود، مشک، زعفران کی رت آئی ہے۔ اس وجہ سے ان سب کی خوشبو دنیا کو گلستاں بنا دیتی ہے۔ بسنت کے پھولوں کی مالا پہن کر وہ دلہن چمن میں نکل آئی ہے جس کے پھولوں کے نقش و نگار کو دیکھ کر مانی بھی حیران ہے)

اسی طرح عید میلاد نبی، شب معراج، شب برات، عید سوری، عید غدیر اور غیرہ پر محمدؐ قلی کی بلند پایہ نظمیں ملتی ہیں۔ ان نظموں کی ایک خاص خصوصیت اس کی منظر نگاری اور محاکاتی پہلو ہے۔ بعض بعض مقامات پر موسم کی کیفیتوں کو اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ کلیں ورڈسورتھ کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ اور اپنی پیاریوں کی وہ تصویریں (Poses) جو عیش و طرب کی حالت میں اس کے پیش نظر ہوں اس انداز سے اتنی عکاسی کرتا ہے کہ اس کی مثال مشکل سے ہمارے ادب میں ملتی ہے۔

حسن کا یہ پرستار محمدؐ قلی جو پایہ اپنی شاعری میں رکھتا ہے وہ رتبہ دکن کی معاشرت اور تمدن کی تعمیر کاری میں بھی اسے حاصل ہے۔ اپنے عہد حکومت میں اس نے بعض ایسے

رسم و رواج کی بنیاد رکھی جو اس کے مرنے کے بعد بھی عرصۂ دراز تک دکن میں قائم رہیں۔ چنانچہ اب بھی شادی بیاہ کی رسومات میں جلوہ اور مہندی محمد قلی کی ہی روایت پروار ہیں۔ ان رسومات پر بھی محمد قلی کا قلم حسن افشانی کرتا چلا جاتا ہے۔

محمد قلی کے اسٹائیل اور خیال میں وہ سادگی اور رنگینی پائی جاتی ہے جس کا تقابل ہم یا تو جوش کی شاعری اور نیاز کے رومانی افسانوں سے کر سکتے ہیں یا پھر آسکر وائلڈ، بالزک اور والٹر پیٹر وغیرہ کے شاہکار وں سے۔ اندازِ بیان میں فطری بہاؤ ہے۔ کہیں بھی ہمیں یہ دھوکا نہیں ہوتا کہ شاعر نے خواہ مخواہ خیال آرائی کی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ محمد قلی کی شاعری تخیل کی بلند پروازیوں سے خالی ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے تخیل کے پاؤں اس کے جمالیاتی ماحول میں محو خرام ہیں تو اس کے پر شاعری اور خیال کی بلند فضاؤں میں پرواز کرتے ہیں۔

محمد معین الدین

غزل

فریبِ پیہم سہی یہ جینا، مگر کہاں تک فریب کھائیں
یہی جو ہے زندگی کا حاصل، تو کیوں نہ جینے سے باز آئیں

جنوں کو کچھ اور آزمائیں، حضور جی بھر کے مسکرائیں
مرے نشیمن کے تنکے تنکے پہ شوق سے بجلیاں گرائیں

غمِ گزشتہ کا تذکرہ کیوں، کشاکشِ بیم و آرزو کیا
وہ دیکھو اٹھی ہیں پھر گھٹائیں اٹھاؤ ساغر پئیں پلائیں

مجھے غمِ عشق دینے والے فسانۂ غم پہ ہنس رہے ہیں
الٰہی! ایسا بھی وقت آئے، مرا فسانہ مجھے سنائیں

مری طرف آپ دیکھیے تو جھکی جھکی سی ہیں کیوں نگاہیں
اگر جفاؤں پہ منفعل ہیں، مری وفاؤں کو بھول جائیں

مرے جنوں سے نہ مٹ سکے جو انھیں زمانہ مٹا سکے گا کیا
مری وفاؤں کے نقش ہیں یہ مٹائیں آپ تو مٹائیں

کبھی جو تھیں زندگی کا حاصل ظفر وہ اب خواب ہو گئی ہیں
وہ روح پرور سہانی راتیں، وہ بھیگی بھیگی ہوئی فضائیں

مظفر الدین ظفر

فریبِ مسلسل

(محبت بھرے دل کے ساتھ — اپنی تسنیم چغتاری
کے نام ——!)

جنگل میں جب کوئی بڑا سا جانور مرجاتا ہے تو چاروں طرف سے گدھ ٹوٹ پڑتے ہیں —— کوئی شہد کی مکھی مرجاتی ہے تو اسے بیسوں چیونٹیاں گھسیٹ لے جاتی ہیں سمندر میں بڑی مچھلی ہزاروں ننھی منی مچھلیوں کو ہضم کرجاتی ہے —

سود کھانے والے مہاجن خود پھولتے چلے جاتے ہیں اور جن سے وصول کرتے ہیں وہ جلدی جلدی سوکھ کر قبر کے کنارے جا پہونچتے ہیں ——

ہمارے جنت نشان ہندوستان میں جہاں کوئی مرا مثلاً بھائی —— بھتیجا — چچا یا اور کوئی رشتہ دار — اور یہ فکر لاحق ہوئی کہ حق داروں کو خانہ بدوش بناکر خود مالِ غنیمت پر قبضہ کریں۔ بقول شاعر ع

کسی بےکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا

راشدہ کا سہاگ لٹا تو جیٹھ صاحب کو فوری فکر جو پڑی وہ مکان کی تھی —— صحن میں دوگنی زمین اپنی طرف کرکے دیوار کھینچ دی —— اس ظلم کی داد تھی نہ فریاد؟ بچی دو سال کی تھی اور بچہ دو مہینے کا —— جس نے باپ کی شکل تک بھی نہ دیکھی تھی۔ باپ کے مرنے کے دوسرے مہینے دنیا میں قدم رکھا تھا۔ تیرہ سال کی راشدہ بیاہی گئی تھی اور پانچ سال بادشاہت کی۔ سترہ اٹھارہ سال کی کمسن لڑکی منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ دنیا کے مکر و فریب سے ناآشنا —— کچھ خدا کا خوف کرکے کچھ دنیا کی شرم کرکے چار روپے گزارہ کے باندھ دئے۔ جیسے بہت بڑا احسان فرمایا ہو ——

راشدہ خدا معلوم کس بے زبان ماں کی بچی تھی جس نے یہ تمام مصیبتیں چپکے چپکے سہہ لیں۔ پندرہ سال تک متواتر —— فاقہ پہ فاقہ کرتی تھی اور اپنے دونوں بچوں پر آنچ نہ آنے دیتی تھی۔ پسائی پیس کر چرخہ کات کر۔ سلائی سی کر اس نے اپنے بچے کو پڑھایا۔ ثمینہ کا تو اس نے غریب گھرانہ میں نکاح کردیا۔ گویا فرض سے سبکدوشی حاصل کی —— اور بچے کی فکر میں لگ گئی اب اس کی یہ کوشش تھی کہ میرا بچہ کہیں نوکر ہو جائے۔ انٹرنس تک ہی مشکل سے کرایا تھا آگے کو تو بھلا ہمت ہی کیا ہوتی ...... دو تین سال اور اسی کشمکش میں گزر گئے۔ خیر خدا خدا کرکے اقبال اس قابل ہوا کہ وہ لکھنؤ کی دکان پر ملازم ہوگیا — یہ خوش خبری ناقابلِ بیان تھی۔ راشدہ مسکراتی تھی۔ خدا کا شکر ادا کرتی تھی۔ زندگی تو چار روپیوں میں گزارہ کی تھی اب اکٹھے پچیس روپے ماہوار ملا کریں گے؟ یہ خیال ہی بس دلکش تھا۔ پہلی تنخواہ اقبال نے ماں کو بھیجی — دوسرا مہینہ پورا بھی نہ ہونے پایا کہ ماں ختم —— دو روز بخار آیا تیسرے دن کھڑے سے جو غش آیا تو تڑاخ سے گر پڑی۔ گرتے ہی دل فیل ہوگیا —— اس کے دلِ ناتواں میں رکھا ہی کیا تھا؟ سترہ اٹھارہ سال فریبی سسرال کے چرکے کھاتے کھاتے محض پتلا سا رہ گیا تھا۔ خون کا چہرے پر نام تک نہ تھا۔ صرف نقشہ سے پتہ اتنا چلتا تھا کہ یہ مسکراتا ہوا چہرہ کبھی حسین ضرور ہوگا۔ پینتیس سال کی عمر میں تمام مدارج طے ہو گئے ——

شادی —— جوانی —— سہاگ —— بچے —— پرورش

شادی —— تعلیم —— آرزو —— ملازمت ——

حسرت بھری موت۔ جس وقت ماں کے مرنے کا تار اقبال کو ملا تو وہ اپنی ماں کی صورت کا عاشق مچھلی کی طرح تڑپ کر آیا لیکن وہ غریب تو لاکھوں من مٹی کے نیچے دب چکی تھی —— گھر خالی پڑا رہ گیا تھا۔ مختصر سا بچھونا — دالان منہ سے

ابھی اہلِ دل بھی باقی ہیں؟

قسمت دھکے دیتی ہے تو دئے چلی جاتی ہے۔ یکساں قسم کی ٹھوکریں ــــ دکھ ــــ بے بسی۔ محتاجی اور جب پلٹتی ہے ــــ تاش کے پتوں کی طرح ــــ الٹی چال ــــ تو مہربانی کا پانسہ سیدھا پھینکتی ہے۔ اقبال کے دن جب پھرے تو ایک دنیا اسے اپنا اپنا رشتہ دار بتانے لگی ــــ رستہ چلتے خود بخود "آپ تو میرے چچا زاد بھائی ہیں"

"ارے آپ تو ہمارے بہت قریب کے رشتہ دار ہوتے ہیں ــــ"

"آپ کے والد سے تو میری بہت دوستی تھی"

"آپ بے حد محبت والے ہیں۔ ہم تو آپ کی دادی کی بہن کے پوتے ہیں اتنا قریبی رشتہ ہے"

یہ آوازیں ــــ یہ دعوے پرانے زخم ہرے کر ڈالتے ایسا لگتا جیسے کوئی ہزاروں پتھر کھینچ کھینچ کر مار رہا ہو۔

جنگ ۱۹۱۴ء کی بہت ہی بھاگوان ہوئی ــــ بہتوں کو تو بے گھر، بے در، یتیم بیوہ بنا گئی لیکن بے سہاروں کو زندگی کا عملی سبق بھی دے گئی ــــ

اقبال نے جس وقت نام لکھوایا تو یہ سمجھ کر کہ میرا کوئی رونے والا تو ہے نہیں ــــ چلو یونہی سہی ــــ اگرچہ وہ خیالات میں بے حد آزاد تھا اور غلامی کو موت سے بدتر سوچا کرتا تھا لیکن نہ جانے کیوں فوج میں چلا گیا۔ جوں توں کرکے دو سال وہ مختلف جگہوں پر رہتا رہا۔ پھر مصر، عدن وغیرہ گھوم کر وطن لوٹا ــــ اس بدتمیز وطن کی طرف جہاں وہ سگے تائے کے ہاتھوں خانہ بدوش ہوا تھا۔ جہاں اسے ٹھوکریں نصیب ہوئی تھیں جہاں سترہ اٹھارہ سال ماں کے ساتھ وہ فاقہ کشی کرچکا تھا ــــ ہاں اس وطن میں اس نے اس انداز میں قدم رکھا۔ چمکتے ہوئے بٹن اس کی وردی میں تھے ــــ ٹوپی میں ستارہ چمک رہا تھا ــــ بازو پر امتیازی نشانات تھے۔ سینے پر تمغہ لٹک رہا تھا ــــ پاؤں میں بھاری بھاری جوتے ــــ لفٹ رائٹ کے انداز سے قدم اٹھتے ہوئے ــــ جیسے یہ ساری دنیا کو سرنگوں کرنے کا اعلان فرما رہے ہوں ــــ

اب وہ خاصا خوبصورت جوان نکلا تھا۔ البتہ ماتھے پر چند شکنیں پڑ چکی تھیں جو ثبوت دیتی تھیں کہ دل نے جو تلخیاں سہی ہیں ان کا گہرا اثر چہرہ پر نمایاں ہوگیا ــــ

جو اپنے پرائے پرچھائیں سے بھوت کی طرح خوف کھائے تھے اب قریب رہنے کے لئے مختلف ہتھیار لے کر آگے بڑھے ــــ کوئی ہمدردی کی باتیں لے کر ــــ کوئی رشتہ داری کے بہانے ــــ کوئی مبارک بادی کے سنہرے الفاظوں کے ساتھ ــــ کوئی دعوت کا مکروہ بہانہ کرکے غرض سب نے فریب کے جال تیار کرکے قسمت آزمائی کی ــــ

اقبال بھولا نہ تھا اسے سب کچھ یاد تھا۔ ایک ایک سلوک اس کے کلیجہ پر ناسور بنا ہوا اب بھی موجود تھا ــــ جب دنیا کو اس کی ضرورت نہ تھی تو اب اقبال کو مطلق ان مکار لوگوں کی حاجت نہ تھی ــــ

اس نے سب سے بے رخی کا برتاؤ کرکے منہ پھیر لیا۔ فریبی رشتہ دار اپنے اپنے مکر و جال پھندے لے کر الٹے پاؤں پلٹ گئے ــــ

اقبال نے اپنی شادی کی بات براہ راست خود ایک غریب لیکن شریف گھرانے سے طے کی اور شادی کے بعد ان ہی لوگوں میں رہنے سہنے لگا۔ وہ لوگ بھی اپنے بیٹے کی طرح سمجھتے ــــ بیوی قناعت کے ساتھ شوہر کی دلداری میں مصروف رہتی۔ صحیح معنوں میں سچی ہمدرد، محبت پرست، نیک سیرت۔

جو کچھ فوج کی ملازمت سے لایا تھا اس روپے سے

اس نے تجارت شروع کی نہایت کامیاب رہا — چند سال میں اس کے پاس سب کچھ ہو گیا تھا — مکان، دکان، نوکر چاکر، عیش و عشرت۔ بچے، سکون و اطمینان — ہاں کبھی کبھی گزشتہ تکلیفیں یاد آکر ضرور تڑپا دیا کرتی تھیں۔ ان تاروں کا حلیہ کیا ہوا؟ خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ بخار آیا۔ بہت تیز ہوا، ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ یہ علامت ہے کہ چیچک حملہ کرے۔

آخر کو وہی ہوا۔ چیچک نکلی اور ایسی زور و شور کی کہ سانس لینا محال ہو گیا۔ زندگی سے سب ہاتھ دھو بیٹھے۔ پاس کھڑا ہوتا ناممکن تھا۔ بے حد تعفن تھی۔ اچھے تو خیر ہو گئے لیکن تمام جسم بدگوشت کی طرح۔ آنکھیں چیچک کی نذر ہو گئیں — گھر کا گھر خدمت سے گھبرانے لگا۔ یوں مارے باندھے اگر تھوڑا بہت لحاظ کیا بھی تو کیا؟ کالا داغ بہت زور شور سے اٹھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ اس غریبی دنیا میں غریبوں سے تو بہ کرانے آیا ہے۔ تین جوان جوان لڑکے منٹوں میں لوٹ پوٹ ہو کے رہ گئے۔ گویا قسمت کی باپ نے گناہوں میں بے گناہ پس گئے۔ بڑھاپا پھر اندھاپن۔ یہ داغ دہکتے ہوئے انگارے تھے۔ جن پر ہر وقت تڑپنا تھا۔ دراصل اٹھتا تھا —

ایک لڑکی رہ گئی تھی۔ اس کا بھی غریب سے نکاح پڑھا دیا۔ باپ تو نوکری سے بیٹھ ہی چکے تھے۔ دانے دانے کو محتاج ہاتھ پاؤں سے کچھ تھوڑی بہت بیوی خدمت کرنے کو تھی لیکن مفلسی نے اس کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا۔ آئے دن بیمار رہنے لگی۔

ایک دن پچھلی سستی بک رہی تھی وہ لے لی۔ خدا جانے کئے دن کی سڑی گلی تھی۔ پکا کر بھوک میں کھا لی۔ اب قدرت نے نئے ڈھنگ سے انتقام لیا دونوں کا جسم پھوٹ نکلا۔ اور ہر دیکھنے والے نے توبہ توبہ کر کے دوری اختیار کی۔

گھر کی چیزیں تو اندھے پن کے بعد ہی سب نیلام کر کر کے ختم کر ڈالی تھیں — اب تو صرف مٹی کے چند ٹھیکرے پڑے رہ گئے تھے اور یا وہ عالی شان کھنڈر کھڑا رہ گیا تھا جس کے دروازے سے اقبال ٹھوکریں کھاتا ہوا فریادی نکلا تھا۔

مدتوں سے مرمت طلب مکان یوں ہی کھڑا تھا — اچانک بارشیں ہوئیں — ایسی ایسی موسلا دھار کہ پختہ پختہ منزلیں سر بسجدہ ہو کے ڈھیر ہو گئیں۔ ایک رات کو پڑا رہنے کا ذرا ٹھکانا تھا وہ بھی گیا — ورنہ سارے دن تو لکڑی کے سہارے دونوں بڈھے بڑھیا گلی کوچوں میں بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ کبھی کبھی شہر کی طرف بھی نکل جاتے — جہاں بعض آنکھیں اب بھی ان ہستیوں کو پہچان لیتی تھیں۔

برسات جب رو رو کر اقبال کے مکان کو بالکل ڈھا گئی صرف بنیادیں چھوڑ گئیں یا وہ لیموں کا شاداب چھوٹا سا درخت جو بڑھ کر اب چھت سے بھی اونچا ہو چکا تھا تو موسم نے ایک اور کروٹ لی — یعنی سردیاں تو بہ کرانے آن پہونچیں —

ایک دن حسب معمول چیتھڑے لگائے بھیک مانگنے جا رہے تھے — آہٹ پا کر بڈھے نے دردناک صدا لگائی بابا دے کچھ — اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے اقبال کا دل چاہا کہ چیخ مار کر بھاگ جائے — یا دونوں کی گردن دبا دے — کمبخت اب بھی کچھ اور فریب دینا چاہتے ہیں کیا؟ لیکن اچانک دل کانپ گیا۔ نیکی نیک راہ۔ بدی بیش راہ۔ جھٹ دس کا نوٹ پکڑا آگے بڑھ گیا — لیکن پاس ہی کوئی محلے کا نوجوان کھڑا تھا بولا او بڑھیا! بڈھے کی تو خیر اندھی آنکھیں ہیں وہ تو بھلا کیا پہچانتا؟ کچھ تو نے بھی پہچانا یہ کون تھا؟ وہی اقبال — اقبال

جس کو تم لوگوں نے حق سے ناحق کیا — سمجھے —
ڈوب مرو کہیں چلو بھر پانی میں —— نوٹ بڑی جلدی
سے پکڑ لیا ہے"۔
یہ سنتے ہی دونوں کو گویا سانپ سونگھ گیا ——
نوجوان نے ایک اور تیر پھینکا —— "اگر میں تم لوگوں
کا بھتیجا ہوتا تو ابھی مارے جوتوں کے تم دونوں کا بھیجہ
پلپلا کر ڈالا ہوتا — تم دونوں تو بس اس محلہ سے ہی
دفان ہو جاؤ —— اندھے کوڑھی —— تمام محلہ
کی آب و ہوا گندی کر رکھی ہے —— لعنت کے ماروں
نے موت بھی کہیں تم سے دور بھاگ چکی ہے شاید۔"
آج کا دن شاید خدا نے انصاف کے لئے رکھا جب
دودھ کا دودھ پانی کا پانی دنیا کو نمایاں دکھانا
تھا —— رات آئی — اور اپنے ساتھ جاگتا ہوا
انصاف لائی — ایسا انصاف — جو دنیا والوں
سے نہ ہو سکا نہ قانون سے ہو سکا۔ نہ بڑے بڑے
عبا و قبا والے فتویٰ دے سکے کہ مظلوم کے لئے کیا
ہونا چاہئے تھا۔ قدرت نے چند منٹ میں خود ہی کر دیا۔
برسوں کی پانی کھائی دیواریں تو ڈھیر ہو چکی تھیں۔
بغلی کوٹھڑی ذرا کچھ دم خم والی کھڑی تھی اسی میں
یہ فریبی مکار بڈھا معہ بیوی کے پڑا رہتا تھا۔
آج بھی سردی میں دونوں سکڑے ہوئے دیوار سے
لگے لیٹے تھے — اچانک ایک دھماکے کے ساتھ دیوار
اڑا .... اڑا دھم ہو کر آ پڑی —— خوفناک چیخیں
بلند ہوئیں اور ختم —— کسے غرض پڑی تھی کہ رات کو
دو بجے لحافوں میں سے نکل کر دوڑتا اور مدد کے لئے
محلے والوں کو جمع کرتا ——
یوں ہی سسک سسک کر دم صبح تک اٹکا رہا ——
جب تک کہ پولیس آ گئی —— ملبہ ہٹایا گیا ——
آخری سانس آ او رجا رہی تھی۔
بڈھے کے مدھم بول نکل رہے تھے ..... آہ اقبال پر
میں نے ظلم کیا تھا ...... بہت بھاری ظلم ....
بدلہ مل گیا —— ظلم کیا تھا۔ مکا چھینا تھا ....
بے گھر کیا تھا ....
اقبال کو خبر لگی — بھاگا چلا آیا —— اس کے
سینے میں انسانی دل کھٹ کھٹ کرنے لگا ——
نفرت کا جذبہ ختم ہو گیا ——
کفن دفن کا انتظام کیا۔ اور بڈھے کی بیٹی کو اطلاع
دینی چاہی معلوم ہوا وہ تو مدت ہوئی زچگی میں ختم
ہو چکی۔ اب یہ کھنڈر جس کے لئے در در کی ٹھوکریں
کھا چکا تھا اسے ہرگز دیکھنا بھی پسند نہ آیا۔
کھڑے کھڑے معہ اپنے مکان کے اللہ نام پر
پانچ چھے بیکس بیواؤں کو تقسیم کر دیا ——
اس طرح خدا خدا کر کے مسلسل فریب کے ٹکڑے
ہو گئے ——

شفیق بانو

تجلّیات

راز جور و جفا نہیں معلوم ‏ درد دل کی دوا نہیں معلوم

اے مسیحا! تری عنایت سے ‏ درد کیوں بڑھ گیا نہیں معلوم

عشق کی ابتدا تو میں نے کی ‏ عشق کی انتہا نہیں معلوم

ہائے! اُس شوخیٔ نظر کا عتاب ‏ کیا غضب ڈھائے گا نہیں معلوم

مجھ کو اللہ پر بھروسہ ہے ‏ کرم ناخدا نہیں معلوم

اُن کی بیگانگی عظیم آخر
رنگ لائے گی کیا نہیں معلوم

عظیم حیدرآبادی

ہسپتالوں اور صحتی اداروں میں نرسوں کی کمی

(نرسوں کے لئے بہتر انتظامات اور اعلیٰ تعلیم و تربیت)

قحط کے تحقیقاتی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ اگر زراعت پیشہ لوگ بیماری کے باعث جسمانی اور ذہنی طور پر کمزور ہو چکے ہوں تو وہ بحیثیت جماعت ترقی نہیں کر سکتے۔ یہ بات شہری آبادی پر بھی صادق آتی ہے۔ مگر ہندوستان ابھی تک علاج معالجہ اور صحت وصفائی کے انتظامات کے لحاظ سے دوسرے متمدن اور ترقی یافتہ ملکوں سے بہت پیچھے ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ صوبائی حکومتیں ان سروسوں پر اپنی آمدنی کا اوسطاً ساڑھے پانچ فی صدی حصہ صرف کرتی ہیں۔ لیکن امید ہے کہ مرکزی حکومت کی مالی امداد کے ساتھ صوبے ترقی کی بہتر اسکیموں پر عمل درآمد کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ان سروسوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ نرسوں کی تعداد میں بھی زبردست اضافے کی ضرورت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ زمانۂ جنگ میں نرسنگ سروسوں کو ترقی دینے کے لئے بہت کچھ کیا گیا لیکن ابھی تک ایسی نرسوں کی کمی شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے جو عمدہ اور اعلیٰ تربیت حاصل کر چکی ہوں۔

نرسنگ سروسوں کی ترقی کا آغاز ۱۹۳۹ء میں ہوا اور انڈین ملٹری نرسنگ سروس قائم کی گئی۔ مگر وہ بڑھتی ہوئی جنگی ضرورتوں کو پورا نہ کر سکی۔ اس کے بعد سرکاری رجسٹرڈ نرسیں اور شہری ہسپتالوں کی نرسیں بھرتی کی گئیں لیکن اس کے باوجود ہندوستانی فوجوں کے بیماروں اور زخمیوں کی خبرگیری کے لئے مزید نرسوں کی ضرورت محسوس کی گئی اور ۱۹۴۲ء میں آکزیلری نرسنگ سروس آف انڈیا قائم ہوئی۔ جس میں ہندو، مسلمان اور عیسائی خواتین شامل ہوئیں۔ اس کے علاوہ برطانیہ سے بھی نرسوں کے دستے آتے رہے۔ مگر مذکورہ کوششوں کے باوجود نرسوں کی بدستور کمی ہے۔

نرسوں کی کمی

۲۰ نومبر ۱۹۴۵ء کو ٹرینڈ نرسز ایسوسی ایشن آف انڈیا کی چوتھی کانفرنس کا جو اجلاس منعقد ہوا اس میں تعلیم و صحت و اراضی کے ممبر آنریبل سر جوگندر سنگھ .... نے بھی نرسوں کی کمی کے متعلق اظہار خیال فرمایا۔ اس سلسلہ میں آپ نے اس امر پر زور دیا کہ نرسوں کے رہنے سہنے اور ان کی تعلیم و تربیت کے متعلق بہتر انتظامات کئے جائیں اور یہ امید ظاہر کی کہ اگر سروس کے حالات کو ترقی دی جائے تو ہسپتالوں میں کام کرنے کے لئے تعلیم یافتہ خواتین کافی تعداد میں اپنی خدمات پیش کر دیں گی۔

اس کمی کا سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں نرسنگ سروس اور اس کی معاون سروسوں نے اتنی تیزی سے ترقی نہیں کی جتنی تیزی سے طبی سروسوں نے ترقی کی ہے۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بڑے ہسپتالوں میں ۵۱ ہزار بیمار ہیں جن کی تیمار داری کے لئے ۱۷ ہزار نرسیں ہونی چاہئیں۔ مگر ان کی موجودہ تعداد ۷ ہزار ہے جن میں سے صرف نصف تربیت یافتہ ہیں اور چھوٹے ہسپتالوں میں تو حالت اور زیادہ خراب ہے۔

بہرکیف سروس کے حالات کو سدھارنے کے لئے زبردست کوششیں کی جا رہی ہیں ——

کل ہند نرسنگ کونسل کے قیام کے لئے مرکزی اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں ایک مسودۂ قانون پیش ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ نرسنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک ہندوستانی اسکول قائم کرنے کا مسئلہ بھی زیرِ غور ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اسکول جلد کالج بن جائے جس میں انسٹرکٹروں کا نصاب پڑھایا جائے اور صحت عامہ کی نرسنگ کے متعلق بھی تربیت دی جائے۔

تعلیم و تربیت کے بہتر انتظامات

حکومت ہند نے نرسنگ کے متعلق صوبوں کے لئے چند معیار تجویز کئے تھے۔ صوبائی حکومتیں ان سے دلچسپی ظاہر کر رہی ہیں۔ چنانچہ بمبئی اور صوبہ متحدہ میں نرسنگ سروس کی نگران خواتین مقرر کی جا چکی ہیں۔ مدراس میں نرسنگ کی سپرنٹنڈنٹ ۱۹۴۱ء ہی میں مقرر کر دی گئی تھی اور اب بنگال میں بھی اس کا تقرر عمل میں آنے والا ہے۔

بیرونی ملکوں میں نرسوں کی اعلیٰ تربیت کا سردست چھوٹے پیمانہ پر بندوبست کیا گیا ہے۔ برطانیہ کے بعض ممتاز ہسپتالوں میں ہر سال ۳۲ ہندوستانی نرسوں کو تربیت دی جائے گی اور ان آموزکار نرسوں کے لئے وہی سہولتیں اور آسائشیں مہیا کی جائیں گی جو برطانی آموزکار نرسوں کے لئے مہیا کی جاتی ہیں۔ (۵) طالبات برطانیہ پہنچ چکی ہیں جن میں سے دو "سسٹر ٹیوٹر" کے نصاب کی تکمیل کریں گی۔ حکومت ہند نے بنگال کی ایک خاتون مس سورہ ما بسواس کو بھی رائل کالج آف لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا ہے۔

دو سال ہوئے سر جوزف بھور کے زیرِ صدارت ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی تاکہ وہ صحت عامہ کا جائزہ لے اور اپنی سفارشیں پیش کرے۔ توقع ہے کہ یہ کمیٹی اپنی رپورٹ جلد پیش کر دے گی اور صحت عامہ کی منصوبہ بندی میں بھی نرسنگ سروس کی ترقی کو خاص اہمیت دی جائے گی۔

ہلت وزیٹر خواتین

اس ضمن میں ڈائرکٹر جنرل میڈیکل سروس و صدر انجمن تپ دق ہندوستان لفٹننٹ جنرل جے۔ بی۔ ہانس کی وہ تقریر بھی دلچسپی سے پڑھی جائے گی جو انھوں نے تپ دق کے ہلت وزیٹروں کی کلاس کا افتتاح کرتے ہوئے حال ہی میں فرمائی ہے۔ یہ کلاس تپ دق کے کلینک نئی دہلی میں قائم کیا گیا ہے۔

اس میں آپ نے ہلت وزیٹروں کی اہمیت نہایت پرزور الفاظ میں بتائی، جن میں خواتین کثیر تعداد میں شامل ہوں گی اور اس امر پر زور دیا کہ "سینیٹوریموں" کے علاوہ "کلینک" بھی کثیر تعداد میں قائم کئے جائیں جو تپ دق کے ابتدائی درجوں کے علاج کے لئے نہایت ضروری ہیں اور ہر کلینک میں کئی اعلیٰ تربیت یافتہ مائی اور سرگرم ہلت وزیٹروں کو مقرر کیا جائے۔

اس کام کے لئے بھی ہندوستانی خواتین کی خدمات درکار ہیں اور وہ انسداد تپ دق کے متعلق بھی نہایت مفید خدمات انجام دے سکتی ہیں۔

از محکمۂ اطلاعات ہند

نئی کتابیں

۱۔ ہمارا قائد (نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے حالات) از محمد احمد خاں حجم ۲۱۰ صفحے قیمت عالہ پتہ قائد ملت اکادمی فیل خانہ قدیم حیدرآباد دکن
۲۔ پیمانے (مختلف شعرا کا مجموعہ کلام) مرتبہ اکبر وفاقانی و علی اشرف حجم ۱۸۴ صفحے قیمت عالہ۔ پتہ قوم اکادمی۔ حیدرآباد دکن۔
۳۔ مسکراہٹیں (مزاحیہ مضامین) از کوثر چاند پوری حجم ۲۴۰ صفحے قیمت ہے۔ پتہ ادارۂ اشاعت اردو۔ "
۴۔ فتراک (مختلف مضامین) از جہاں بانو بیگم۔ " ۲۰۴ " " عالہ " مکتبۂ ابراہیمیہ۔ عابد روڈ "
۵۔ سر بریدہ (افسانے) از ساحل بلگرامی قیمت عہ پتہ رضوی اینڈ کمپنی۔ نظام شاہی روڈ "
۶۔ سرخ پرچم تلے (روسی افسانے) مترجمہ سردار امام عہ راج پبلشنگ ہاؤس۔ سلطان بازار۔ "
۷۔ دور اسیری (وجے لکشمی پنڈت کی خود نوشت سوانح) مترجمہ ظفر جاوید۔ پبلشنگ ہاؤس۔ سلطان بازار۔ حیدرآباد دکن
۸۔ جہنم کے دیوتا (ہندی افسانے) مترجمہ سیدہ سلمیٰ راشد۔ قیمت عالہ۔ پتہ مکتبۂ عزیزیہ۔ حویلی قدیم۔ "
۹۔ نقش امروز (مجموعہ کلام) از علی اشرف۔ حجم ۱۸۳ صفحے " عالہ " عبد الحق اکیڈیمی۔ اردو گلی۔ "
۱۰۔ اردو پارے (تنقیدی تقریریں) از ضیاء الاسلام حجم ۱۰۹ صفحے قیمت عالہ پتہ حلقۂ ادب ۱۳۔ اسٹینلی روڈ۔ الٰہ آباد
۱۱۔ روسی ظرافت (افسانے) مترجمہ مسلم ضیائی۔ حجم ۲۰۵ صفحے۔ قیمت عالہ۔ پتہ اردو محل۔ معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد دکن
۱۲۔ نیر ہدایت (مجرب نسخے) مرتبہ حکیم محمد ظفر الدین حجم ۲۱۰ صفحے۔ قیمت عالہ۔ پتہ مینجر رسالہ حکیم دکن شفاخانہ حکمت نگر حیدرآباد دکن
۱۳۔ نئے ترک اور ترکی باتصویر از محمد عبد الرشید خاں " ۴۴۳ " " صہ۔ " نذیر حسین نظام الرحمٰن تاجران کتب۔ دریبہ کلاں دہلی
۱۴۔ آئین جغرافیہ از پروفیسر ایم۔ اے علوی۔ حجم ۳۴۴ صفحے قیمت سے۔ پتہ مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ
۱۵۔ پریشان جلوے (افسانے) از حیات ترین " ۲۴۰ " " عالہ پتہ عباسیہ اکادمی بغداد الجدید۔ بھوپال
۱۶۔ ایشیاء کی سب سے بڑی شخصیت (جناح کے حالات) از محمد عبد اللہ منہاس۔ حجم ۶۴ صفحے۔ قیمت ۱۲ پتہ مکتبۂ راست گفتار۔ ہال بازار امرتسر
۱۷۔ ہندوستانی موسیقی کی کشش از مسز مانی ساہوکار۔ قیمت عہ پتہ ٹھیکر اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ بمبئی
۱۸۔ نیا راگ (مشہور شعرا کا منتخب کلام) مرتبہ ذکیہ سلطانہ ساغر قیمت عہ۔ پتہ ٹھیکر اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ بمبئی
۱۹۔ یاد اقبال (نظمیں جو اقبال کی وفات پر لکھی گئیں) مرتبہ غلام سرور نگار حجم ۱۲۸ صفحے قیمت عہ پتہ اقبال اکیڈیمی۔ لاہور
۲۰۔ جھلکیاں (افسانے) از رہبر پٹیالوی حجم ۱۹۲ صفحے قیمت عالہ پتہ مکتبہ سلطانی۔ بھنڈی بازار بمبئی ۳
۲۱۔ کاشت ترکاری از رحمت خاں " ۲۸۸ " " عالہ " کسان اینڈ کمپنی چیمبرلین روڈ۔ لاہور
۲۲۔ برہنہ (ناول) از قیسی رام پوری قیمت عالہ۔ پتہ ماڈل ایجوکیشنل بک ڈپو۔ اردو بازار۔ دہلی
۲۳۔ رونق (") از قیسی رام پوری " سے " " " " "
۲۴۔ اس نظم میں (منتخب نظمیں) از میرا جی " سے " ساقی بک ڈپو۔ دہلی
۲۵۔ پائل (گیت) از سلام قیمت عہ " " " " "
۲۶۔ چالیس کروڑ بھکاری (افسانے) از ابراہیم جلیس قیمت عالہ پتہ نفیس اکیڈیمی۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن
۲۷۔ صد پارۂ دل (مضامین) از عزیز حسن بقائی دہلوی قیمت عالہ " مینجر رسالہ پیشوا۔ جامع مسجد۔ دہلی

مرزا سیف علی خاں

نظارے

میں صبح سے مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ ٹھیک طور سے تو کہہ نہیں سکتا کہ میں جو مارا مارا پھرتا رہا تو وہ آخر کس سلسلے میں تھا۔ کوئی چیز خریدنی نہ تھی، کسی کی تلاش نہ تھی، کسی کا گھر دریافت کرنا نہ تھا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں کسی خاص وجہ کے تحت مارا مارا نہیں پھر رہا تھا۔ فرصت تھی، ہاں خوب یاد آیا، فرصت تھی۔ دفتر بند تھا اور گھر میں بیٹھے بیٹھے طبیعت اکتا گئی تھی۔ وقت گزارنے کے لئے گھر سے نکلا تو بس مارا مارا پھرتا رہا، ایک جگہ لوگ بھیڑ لگائے کھڑے تھے، میں بھی رک گیا اور ایک تماشائی کے کاندھے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے میری اس حرکت پر ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی گردن موڑ لی۔ ارے وہ تو میرے ہم محلہ شیخ صاحب تھے۔ "کہئے شیخ صاحب اچھے تو ہیں آپ، یہ کیا تماشا ہو رہا ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے شیخ صاحب سے پوچھا۔ شیخ صاحب کا بگڑا ہوا چہرہ بتدریج اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ "کچھ نہیں وہ کوئی ہمالیہ کی طرف سے آئے ہیں بعض جڑی بوٹیاں بہت خاص ہیں ان کے پاس۔ دیکھئے آپ بھی۔ دیکھئے خدا کی قدرت"۔ شیخ صاحب نے اپنی گردن پھیر لی۔ وہ ہمالیہ کے باشی مجمع کے بیچ میں ایک کپڑا بچھائے، اس پر جڑی بوٹیوں کا ڈھیر لگائے کھڑے تھے۔ میں بھی دیکھنے لگا اور میں نے دیکھا اس شخص نے تماشائیوں کو ایک گلاس بتایا، خالی گلاس، اس کے بعد اس نے اس میں پانی ڈالا۔ پھر تھیلی میں سے ایک جڑی نکالی۔ کہنے لگا "بھائیو! یہ جڑی ہمالیہ کے دامن میں دستیاب ہوتی ہے اور اس کو پانے کے لئے پانچ سال میں نے جنگلوں میں گزارے، پانچ سال بھائیو۔ میں اس کی تعریف نہیں کرتا۔ اس کا کرشمہ دکھاتا ہوں"۔ اس نے وہ جڑی پانی میں ڈال دی۔ تھوڑی دیر بعد سارے تماشائی پھٹے ہوئے دیدوں سے دیکھ رہے تھے کہ پانی جمنے لگا۔ دوا کا کرشمہ دکھانے کے بعد اس نے کھنکار کر چاروں طرف فتحمندانہ نظر ڈالی اور ایک دفعہ پہلے سے بھی زیادہ زوردار کھنکار لگا کر کہنا شروع کیا "اس کے گن بھی سن لو۔ یہ ۔ بوڑھے کو......." میں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور لاحول پڑھتا ہوا اپنی راہ پر لگ گیا۔ پل پر سے گزرنے لگا تو کئی راہ گیر ایک جگہ جمع ہوتے جا رہے تھے اور جھانک جھانک کر نیچے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں بھی رک گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ لوگ آخر کیا دیکھ رہے ہیں۔ میں نے بھی جھانک کر نیچے دیکھا، ندی بہہ رہی تھی۔ صرف ندی بہہ رہی تھی۔ میں نے اپنے بازو والے صاحب سے پوچھا "کیا بات ہے جناب"۔ کہنے لگے "میں بھی ابھی آیا ہوں۔ آپ سے پوچھئے"۔ ان صاحب کے بازو جو صاحب کھڑے تھے ان سے میں نے رکتے رکتے پوچھا "آپ کو معلوم ہے جناب، یہاں یہ سب کیوں جمع ہیں"۔ "جی جی" کہتے ہوئے انھوں نے پلٹ کر ادہر ادہر دیکھا۔ "ارے" وہ کہنے لگے۔ "ارے ۔ دیکھئے جناب بات دراصل یہ ہے کہ یہاں ایک صاحب جھانکتے کھڑے تھے اور ان کے ساتھ ہم سب بھی جھانکنے لگے۔ وہ صاحب چلدئے کہیں۔ ورنہ ان سے پوچھ لیتے۔ ہم کو تو کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ ندی تو البتہ بہہ رہی ہے مگر صاحب کچھ تو ہوگا۔ کچھ تو ہوگا ضرور۔ تب ہی تو وہ بے چارے دیکھنے لگے" "خودکشی کے امکانات پر غور کر رہے ہوں گے وہ"۔ میں نے وہاں سے ہٹتے ہوئے اپنے دل میں سوچا، مجھے تو وقت گزارنا تھا۔ میں کیوں پل پر سے ندی میں جھانکتا رہوں۔ پل کے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے دو فقیر آپس میں تکرار کر رہے تھے۔ ایک کہتا تھا کہ خوانچہ والے کے تو نے ٹانگ کیوں ماری۔ دوسرا کہتا ......" اور تو نے کیوں سارے بھیجے اس کے

ہڑپ کر لیئے۔" میں جو ان کے قریب پہونچا تو وہ دونوں مسکین صورت بنائے سوال کرنے لگے۔ میں اپنی تانگوں کو بچاتا دور ہی دور سے جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتا رہا۔ میں آگے بڑھ گیا تو وہ پھر باتیں کرنے لگے۔ "ایک روپیہ کا چلّر ہے تیرے پاس؟"......... دوسرے نے کہا "چار آنے کم ہیں۔ شام تک دیدوں گا۔ یہ لے بارہ آنے"۔ ایک تانگہ پان کی دکان کے آگے کھڑا تھا۔ تانگے والا پان سگریٹ خرید رہا تھا۔ ایک صاحب نے تانگے والے سے پوچھا "کرایہ کروگے"۔ تانگے والے نے جواب دیا "کہاں چلنا ہے صاب"۔ ان صاحب نے کہا "گلزار حوض"۔ تانگے والے نے پان چباتے ہوئے کہا "ایک روپیہ دلوائیے صاب" ان صاحب نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا "ایک روپیہ نہیں تین آنے دیں گے"۔ تانگے والے نے سڑک پر پیک تھوکی۔ وہ صاحب آگے بڑھ گئے۔ تانگے والا کہتا رہا "چنا مہنگا، گھاس مہنگا۔ اور گلزار حوض تک کا کرایہ ایک روپیہ نہیں تین آنے"۔ اس کے بعد اس نے انھیں کچھ کہا۔ کرایہ چکانے والے صاحب تو آگے بڑھ گئے تھے۔ ساری باتیں مجھی کو سننی پڑیں۔ میں نے سوچ لیا کہ گلزار حوض جانا ہو تو تانگے والے کو تین آنے پر چلنے کے لئے نہ کہوں گا۔ ایک سڑک زیر تعمیر تھی، مزدور پتھر اٹھا رہے تھے اور مزدورنیاں گتہ دار صاحب کے پیچھے پیچھے ندی سے پانی لانے جا رہی تھیں۔ ایک صاحب سیکل پر تیزی سے چلے آرہے تھے۔ دوسرے صاحب دوسری طرف سے ان سے بھی زیادہ تیزی سے آئے۔ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ چاروں گرے۔ دو سیکل سوار اور دو سیکلیں دونوں نے ایک دوسرے کو بہ غور دیکھا۔ کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھے۔ سیکلیں سنبھالیں اور اپنی اپنی سمت چپ چاپ چل نکلے۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میری فرصت کا وقت ٹھیر گیا ہے، کٹتا کٹتا نہیں۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر چلنے لگا۔ دو اخبار بیچنے والے لڑکے آوازیں لگاتے بازو سے گزرے۔ میں نے ایک کو روک کر اخبار خریدا۔ ایک صاحب بوکھلائے ہوئے میری طرف آنے لگے۔ "جناب"! "جی آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟" میں نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "دیکھئے جناب آپ یہاں کب سے کھڑے ہیں؟" میں نے کہا "ایسی کچھ دیر تو نہیں ہوئی"۔ "تو آپ نے ادھر سے کسی رکشا والے کو جاتے دیکھا۔ کچھ سامان تھا اس رکشا میں۔ کبوتروں کی ایک ڈکری بھی تھی۔ دیکھی ہے آپ نے"؟ میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا "مجھے یاد تو نہیں۔ البتہ ایک رکشا......" "جی بس شکریہ ادھر ہی کو گئی ہے نا" میں نے بے بسی کے عالم میں گردن ہلا دی۔ وہ اس طرف کو دوڑ پڑے۔ وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ ایک رکشا کچھ سامان تھا جس میں، ایک کبوتروں کی ڈکری تھی جس میں میرے سامنے آکر رکی۔ رکشا والے نے پوچھا "صاحب ادھر سے کوئی صاحب گزرے دبلے سے عینک لگائے ہوئے چھوٹی سی ڈاڑھی"، میں مسکرا پڑا۔ وہ جانے کیا سمجھا۔ واپس ہونے لگا۔ میں نے جلدی سے کہا "ارے بھائی ادھر ہی کو گئے ہیں وہ تجھے ڈھونڈتے ہوئے، کدھر بھٹکا رہا ہے انھیں"۔ رکشا والے نے کہا "صاحب ایک دکان سے کچھ خریدنے کو گئے تو بس لاپتہ ہیں"۔ میں نے کہا "اس طرف چلے جاؤ، وہ ابھی گئے ہیں تمہیں مل جائیں گے۔" میں نے اخبار کھولا اور پڑھنے لگا۔ میں درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ کوئی چیز اوپر سے عین اخبار کے صفحہ پر گری۔ میں نے اوپر نظر اٹھائی۔ ایک کوا ڈالی پر بیٹھا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ میں نے اخبار پھینک دیا اور پھر سے چلنے لگا۔ ایک کتا بھی میرے ساتھ ہو گیا کبھی کبھی وہ

مجھ سے بہت آگے نکل جاتا ۔ لیکن وہ کسی پتھر یا دیوار کو سونگھتا کھڑا رہ جاتا تو میں آگے نکل جاتا۔
پھر ہم دونوں ساتھ ہو جاتے ۔ ایک دفعہ تو میں نے اسے دھتکارا بھی ۔ لیکن وہ تو جیسے شرط باندھ کر
میرے ساتھ دوڑ رہا تھا ۔ ایک گھر سے بلی نکلی تو وہ اس کے پیچھے لپکا ۔ بلی ایک موری میں گھس گئی
تو وہ موری کے آگے کھڑا رہ گیا اور میری طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ دیکھئے اس
موری میں گئی ہے بلی ۔ وہ کتا بھی میری طرح بیکار نظر آرہا تھا ۔ جیسے صرف وقت گزارنا تھا۔ اس نے
اب میرا ساتھ چھوڑدیا اور ایک ہوٹل کے باورچی خانے کی طرف چلا گیا ۔ ایک صاحب کالے اطلس کی صدری
پہنے گاتے ہوئے آئے ۔ بلبل آ تو بھی گا ۔ جوں جوں وہ مجھ سے قریب ہوتے گئے ان کی آواز بھی دھیمی
ہوتی گئی ۔ جب وہ میرے بالکل پاس پہونچے تو چپ ہوگئے اور آگے بڑھتے گئے تو پھر سے گانے کی لے
اونچی ہوتی گئی ۔ بلبل آ ۔ آ ۔ آ ۔ آ ۔ ایک بھکارن اپنے دو مردہ نما بچوں کو سامنے ڈالے راہ گیروں کے
آگے دستِ سوال دراز کر رہی تھی ۔ "دو دن کے بھوکے ہیں" آفریں ہے اس ماں پر جو دو دن کی بھوکی ہو۔
اس کے دو بچے دو دن کے بھوکے ہوں اور وہ ان بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے بھیک مانگے ۔ گلا گھونٹ کر
مار نہیں ڈالا ـــــ آفریں ہے اس ماں پر۔

حلوائی کی دکان مٹھائیوں سے سجی ہوئی تھی ۔ دھڑا دھڑ تازہ تازہ مٹھائیاں نکل جارہی تھیں ۔ گاہک
ٹوکریاں سنبھالے ہوئے بھیڑ سے نکل رہے تھے ۔ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور توندیلا سیٹھ اپنے نوکروں پر برس
رہا تھا ۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی گدی پر نیم دراز خراٹے لینے لگا ۔ مٹھائی تیار کرنے ۔ جمانے اور تولنے والے ملازم
کالے چیتھڑوں میں ملبوس اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے ۔ دکان کے آگے دو بھکارن لڑکیاں کھڑی تھیں
ان میں سے ایک کے ہاتھ میں مٹھائی کی پھینکی ہوئی ٹوکری تھی ۔ جس پر سے وہ دھیرے دھیرے دھاگہ کھونٹی
جارہی تھی ۔ وہ بل جو ان کی آنتوں میں پڑے تھے ان میں کچھ اور پیچ پڑتے جا رہے تھے ۔ مٹھائی کی ٹوکری سے
لپٹا ہوا قوام قطرہ قطرہ زمین پر ٹپک رہا تھا ۔ بعض گاہک دکان پر ہی مٹھائی سے کام و دہن کی تواضع کر
رہے تھے ۔ گرم گرم جلیبیاں اور تازہ تازہ امرتیاں ۔ بھکارن لڑکیوں کے ہاتھ آگے بڑھے ہوئے تھے ۔ جھوٹے
کاغذ اور پتے پھینکے جارہے تھے ۔ ڈکاریں لی جا رہی تھیں ۔ چٹخارے بھرے جارہے تھے ۔ لیکن ان بھکارن
لڑکیوں کے ہاتھ پھیلے کے پھیلے ہی رہے ۔ ایک لڑکی کچھ اور آگے بڑھی ۔ سیٹھ کی آنکھ لگ گئی تھی ۔ ایک
مکھی ان کی ناک میں گھس گئی تھی ۔ "سیٹھ" اس لڑکی نے پکارا 'چل بھاگ' اور انھوں نے اپنی چوکی
کے نیچے سے ایک چھوٹا سا ڈھیلا اٹھا کر لڑکی کی طرف دے مارا ۔ سیٹھ صاحب نے ان بھیک منگوں
کو مار بھگانے کے لئے اپنی چوکی کے نیچے چھوٹے چھوٹے ڈھیلوں کا ایک ڈھیر سا جمع کر رکھا تھا ۔
ان ڈھیلوں کے بازو ہی پیسوں کا صندوق دھرا رہتا ۔ لڑکی ڈھیلے کی چوٹ کھا کر سر تھام کر بیٹھ گئی ۔
دوسری لڑکی ایک موٹر کے پردہ کے پاس بھیک مانگتی کھڑی رہی ۔ اسے ایک پیسہ ملا ۔ دوسری لڑکی کے پہنچتے
پہنچتے موٹر چلی گئی ۔ ایک پردے لگا ہوا تانگہ گزرنے لگا تو اس میں سے ایک چھوٹے بچے نے سر نکالا اور
مٹھائی کے لئے مچل گیا ۔ تانگہ رکوایا گیا ۔ اور مٹھائی لینے کے بعد پھر سے چل پڑا ۔ وہ دونوں لڑکیاں
اس تانگے کے پیچھے بھاگنے لگیں ۔ ان کے پاؤں اور زبانیں مشین کی طرح چل رہی تھیں ۔ دو بھکاری

لڑکیوں اور ایک تازہ دم گھوڑے کا مقابلہ تھا۔ میں دور تک ان کو دیکھتا رہا۔ آخر ایک لڑکی ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ میں نے اپنی گردن پھیر لی اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ایک دکان پر بھیڑ لگ رہی تھی۔ معلوم ہوا سستے غلہ کی دکان ہے، پیسے دے کر ایسی مشکل سے اناج ملے۔ یہ عذاب الٰہی نہیں تو پھر کیا ہے۔ بوڑھے کتنا رہے ہیں جوان آگے بڑھ رہے ہیں۔ عورتیں ان کے پیچھے جگہ نکال رہی ہیں لیکن سارے مجمع میں ایک سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ اناج بہر صورت حاصل کرنے کا مصمم اور خوفناک ارادہ ان کے چہروں سے ابلا پڑتا تھا۔ پیٹ! تیری جے۔ ایک سیٹھ صاحب اپنے گاہک سے پوچھ رہے تھے۔ "کیوں بھائی کچھ سنا ہٹلر زندہ ہے کہتے ہیں" گاہک نے جواب دیا۔ "ہٹلر نہیں مر سکتا سیٹھ صاحب" سیٹھ صاحب نے کہا "تو پھر جنگ بھی ہوگی" "ہاں" گاہک نے جواب دیا۔ "اچھا چاول کا کیا بھاؤ ہے" سیٹھ صاحب نے کہا "چاول نہیں ہیں ہمارے پاس" گاہک آگے بڑھ گیا۔ مزدوروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ایک لاری سامنے سے گزری۔ مزدور گاتے ہوئے جا رہے تھے۔ انھیں مزدوریاں بھی بڑھی چڑھی مل رہی تھیں اور سواری کے لئے موٹر بھی۔ گر غلہ؟ .... مر جائے ہٹلر خدا کرے!! جب میں ایک ہوٹل کے قریب پہونچا تو مجھے وہ ریکارڈ سنائی دیا جس کی موسیقی میرے دل پر جادو کرتی تھی۔ مجھے اس گانے کے بول یاد نہ تھے۔ طرز یاد ہوگئی تھی۔ میں گنگنا سکتا تھا گا نہیں سکتا تھا۔ میں ایک درخت کے نیچے ٹھیر گیا اور اس کے بول ذہن نشین کرنے لگا۔ ریکارڈ ختم ہوگیا تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ مجھے پورا گیت حرف بہ حرف یاد ہوگیا تھا۔ لیکن آگے بڑھتے ہوئے اسے گنگنانے کی جو کوشش کرتا ہوں تو ہائیں طرز ہی بھول گیا۔ تانگوں، رکشاؤں اور سائیکل سواروں کو دیکھتے دیکھتے میرا سر گھومنے لگا۔ دنیا کی ہر چیز حرکت کر رہی تھی اور میں چاہتا تھا کہ ساری دنیا تھم جائے۔ سناٹا چھا جائے اور میں اکیلا دل بہلاتا ہوا ہر چیز کا معائنہ کرتا پھروں۔ تانگے اپنے اڈوں پر کھڑے رہیں۔ رکشائیں ٹھیر جائیں — سیکلیں رک جائیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند پڑے رہیں۔ وہ دوا فروش ہمالیہ کی چوٹی پر چلا جائے۔ ریکارڈ بجتا رہے اور میں ٹہلتا ہوا یا تیز تیز چلتا ہوا یا دوڑتا ہوا چاروں طرف گھوموں۔ چاروں طرف پھروں اور میری فرصت کا وقت گزرتا جائے۔ لیکن دنیا کے کاروبار کبھی بند نہیں ہوتے۔ یہ کل کبھی رکتی نہیں۔ میں کچھ مضمحل اور بہت زیادہ بے کیف اپنے گھر میں داخل ہوا۔ ایک بوجھ سا میرے دل سے اتر گیا۔ سات بج چکے تھے اور مجھے سوائے رات کا کھانا کھا کر سو جانے کے اور کوئی کام نہ تھا۔

رشید قریشی

ابراہیم ظفر

(اس افسانہ کا پلاٹ ان قصوں اور کہانیوں سے لیا گیا ہے جو زرل کی پہاڑی بستی میں مشہور ہیں) مجید

"جہاں پناہا ہمارے جاسوسی نظام کے ذریعہ جو مملکت حیدرآباد کے طول و عرض میں جال کی طرح پھیلا ہوا ہے اس مرتبہ نہایت ہی اہم خبریں وصول ہوئی ہیں۔ جن میں سب سے پہلے پرگنہ زرل سے متعلق یہ کہ ابراہیم نامی ایک نوجوان نے زرل میں حکومت کے خلاف رعایا کو اکسادیا ہے اور اگر اس طرف جلد توجہ نہ کی جائے تو بغاوت کا اندیشہ ہے"

سراج حیدرآباد کے طبقہ امرا کا ایک مشہور فرد تھا جس نے دربار آصف جاہی میں یہ کیفیت پیش کرنے کی عزت حاصل کی۔

"ہم بہت جلد توجہ کریں گے سراج" اعلیٰ حضرت نے ارشاد فرمایا اس کے بعد دوسرے اور اہم معاملات پیش کئے گئے۔

زرل ایک پہاڑی بستی ہے۔ کئی تالاب دائرہ کی شکل میں اس کو گھیرے ہوئے ہیں، ان تالابوں کے سروں پر چاروں طرف سیاہ دیوہیکل پہاڑ زرل کے سنتری کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ بائیس سال قبل سپاہیوں کا ایک گروہ زرل آیا تھا۔

"یہ سامنے کونسی بستی ہے؟" سردار نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا۔ "یہ بستی زرل کہلاتی ہے سردار" بڑا ہی روح افزا مقام معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہے چند دن یہیں قیام کیا جائے" یہ سنتے ہی سبھوں نے یہیں سکونت اختیار کرلی اور تجارت کو ذریعۂ معاش بنالیا۔ ان کا شمار متمول گھرانوں میں ہونے لگا۔ سردار کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام ابراہیم رکھا گیا۔ ابراہیم زرل ہی کو اپنے اسلاف کا وطن سمجھتا تھا۔

"وطنی مجلس" کے صدر ابراہیم اور مجلس کی متفقہ طور پر یہ رائے قرار پائی کہ زرل کے حکام کو سزا دی جانی چاہئے۔ اس لئے کہ شاہِ وقت دوسرے کاموں میں مشغول تھے اور ان حکام کو جیسے قید سے رہائی مل گئی۔ رشوت ستانی کا بازار گرم تھا۔ رعایا سے من مانی مالگزاری وصول کی جارہی تھی۔ پہلے پہل تو "وطنی مجلس" نے خفیہ طور پر کام جاری رکھا اور جب رعایا کو کافی اکسا دیا گیا تو باضابطہ طور پر کھلم کھلا تقریریں ہونے لگیں، جلسے منعقد کئے جانے لگے، ابراہیم ان سب کا راہ نما تھا۔ عوام اس کے اشارے پر ناچتے تھے۔ بالآخر بغاوت ہوگئی، واسدیو حاکم زرل معہ اپنے ساتھیوں کے قتل کردیا گیا۔

سورج مغربی پہاڑیوں کے پیچھے تیزی سے بھاگا چلا جارہا تھا، آسمان پر گلابی ٹکڑے ادھر سے ادھر منڈلا رہے تھے۔ ایک سوار صبا رفتار گھوڑے پر زرل سے نکلا اور شمالی پہاڑیوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا بیس میل پر ایک گاؤں میں جاکر دم لیا۔ گھوڑا پسینے میں شرابور تھا، گھوڑے کی پیٹھ تھپکی اور ایک معمولی سے مکان میں داخل ہوا۔

"فاطمہ"

"کون؟ ابراہیم! تم آگئے میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔ میں تو آج بہت پریشان تھی، سنا ہے زرل میں بغاوت ہوگئی۔ ابراہیم! تم یہ سب کیا کررہے ہو، بغاوت کردینا آسان ہے اور اس کا نتیجہ؟ ابراہیم! یہ تم کیا کررہے ہو؟ اپنی جان کو جان بوجھ کر خطرے میں ڈالنا کوئی عقلمندی نہیں!"

"فاطمہ! تم اس کی فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ارے میں نے تو تم کو اصل بات بتائی ہی نہیں، سنوگی تو پاگل ہوجاؤگی۔ کہدوں؟"

"ہاں ہاں"

"اب تم ملکہ ہو" اور اس نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔ وہ کھڑی اس کا منہ تک رہی تھی پھر یکایک اس نے کہا۔

"اب میں تمہارے بغیر یہاں نہیں رہ سکتی، اکیلے میں جی بہت گھبراتا ہے، خوفناک خیالات ستاتے ہیں۔ رات کو کئی مرتبہ چیخ کر جاگ گئی"

"فاطمہ! مگر میں اب تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا۔ زرل میں ہر طرف بغاوت کی آگ پھیلی ہوئی ہے۔ گو شاہ حیدرآباد کو جلد ہی اطلاع ہوجائے گی لیکن وہ ابھی اس طرف

متوجہ ہونے کے قابل نہیں ہیں ۔ وہ آج کل سلطنت کے دوسرے اور اہم معاملات میں الجھے ہوئے ہیں" پھر لہجہ بدل کر "زرل میں کل ماہدولت کی رسم تاج پوشی منائی جائے گی اور ملکۂ عالیہ کی خدمت میں تحفے روانہ کئے جائیں گے ۔ فاطمہ! تم خواہ مخواہ افسردہ ہو رہی ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے ۔ کل تمہارے ابراہیم کی رسم تاج پوشی ہے اور ہاں میں تو یہ کہنا بھول ہی گیا کہ سال یا ڈیڑھ سال کے بعد ہماری شادی بھی ...." اور اس نے مسکرا کر فاطمہ کی طرف دیکھا' فاطمہ کے رخسار انگاروں کی طرح تپ رہے تھے ۔

ابراہیم نے کپڑے اتارے اور چارپائی پر لیٹ گیا ۔ فاطمہ اس کے لئے گلاس میں دودھ لے آئی اور اس نے مسکراتے ہوئے اسے لے کر پی لیا ۔ کچھ دیر آرام کے بعد وہ رخصت ہونے لگا ۔ ستارے آسمان پر نکل آئے تھے ۔ ان کی چھاؤں میں دونوں خراماں گھر سے نکلے ۔ پھر ایک جگہ رک گئے ۔

"ہم بہت جلد ملیں گے فاطمہ! ارے، تمہاری آنکھوں میں آنسو ہیں؟ چھی! سپاہی کی بیوی اور آنسو؟ فاطمہ! تم سپاہی کی ہونے والی بیوی ہو"

اور فاطمہ کی آنکھیں جیسے ان آنسوؤں کو پی گئیں ۔ "اچھا! اب ذرا ہنس دو" اس نے کہا اور وہ مسکرا دی' چاند بادل کے پیچھے چھپ گیا ۔

"ابراہیم ظفرالدولہ" کی رسم تاج پوشی بڑے تزک و احتشام سے منائی گئی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا گیا' زرل کے ہر بسنے والے کے چہرے پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی' مسکراہٹیں قہقہے' چہل پہل' نوبت نقارے' زرل دلہن کی طرح سجایا گیا تھا ۔

باضابطہ طور پر حکومتی نظام قائم ہو گیا ۔ ایک ہی سال کے اندر اندر رعایا خوش حالی کی زندگی بسر کر رہی تھی ۔ اس سے فارغ ہوتے ہی ابراہیم ظفر نے حفاظتی تدابیر شروع کیں کیونکہ خطرہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا ۔ تازہ آئی ہوئی خبروں سے جنگ کا امکان قوی تر ہوتا جا رہا تھا ۔

زرل کے اطراف' خندقوں' قلعوں' مورچوں وغیرہ کی تعمیر شروع ہو گئی اور فوج میں بھرتی بھی ۔ تین چار مہینوں کے اندر اندر تقریباً دس ہزار فوج باقاعدہ زرل کی حفاظت کے لئے تیار تھی ۔

"جہاں پناہ! وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا' خدمت عالی میں آج سے ڈیڑھ سال قبل یہ عرض کیا تھا کہ زرل میں ابراہیم نامی ایک شخص رعایا کو حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کی ترغیب دے رہا ہے اور اب وہی "ابراہیم ظفر" کے نام سے وہاں حکومت کر رہا ہے ۔ زرل اس کا پایۂ تخت ہے ہمارے نمائندوں کو قتل کر دیا گیا ہے"

"بہت عالی ہمت شخص معلوم ہوتا ہے" اعلیٰ حضرت نے ارشاد فرمایا ۔ "حضور! باغی کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے غلام کو اجازت مرحمت فرمائی جائے"

"یہ تو بہت معمولی سا کام ہے سراج! خیر ہم تمہیں اجازت دیتے ہیں" اور پھر دربار ختم کرتے ہوئے سراج سے مسکرا کر فرمایا "اس کی رگوں میں بھی بہادروں کا خون معلوم ہوتا ہے سراج!"

ایک ہی ہفتے میں سراج نے اپنی فوج کو تیار کر کے زرل کی طرف کوچ کیا ۔ ابراہیم ظفر کو جاسوسوں نے سراج کی آمد کی اطلاع دی اور زرل میں بھی طبل جنگ بج گیا ۔

سراج انتہائی تیزی سے تین ہی دن میں زرل پہونچ گیا اور دریائے گوداوری کے دوسرے کنارے پر پڑاؤ ڈال دیا ، دوسرے ہی دن "شام گڑھ" پر حملہ ہوا ۔ دن تمام خونریز لڑائی ہوتی رہی ۔ ایک طرف سے گونڈوں کے بے حد پریشان کن حملے دوسری طرف شام گڑھ کے اونچے قلعے سے آتش باری' سراج کی فوج میں سراسیمگی کے آثار نمایاں ہونے لگے ۔ رات ہو گئی اور لڑائی دوسرے دن کے لئے ملتوی ہو گئی ۔

دوسرے دن صبح سراج نے اپنے دو جرنیل اور دو مشیران خاص ڈیروں میں مردہ پائے' بڑی حیرانی ہوئی ۔ سراج نے خود فوج کی کمان لی لیکن دوپہر ہونے ہونے تک آتش باری' پہاڑوں کی گرمی اور سب سے زیادہ گونڈوں کے عجیب طرز جنگ نے سراج کو ہراساں کر دیا اور رات ہونے ہونے تک سراج اپنی فوج لے کر زرل سے بھاگ رہا تھا ۔ ابراہیم ظفر کے گونڈ کپتان نے کئی میل تک اس کا پیچھا کیا ۔

سراج اپنی شکست پر اتنا رنجیدہ اور نادم تھا کہ اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے کی کئی روز تک جرأت نہ کر سکا۔ بالآخر اعلیٰ حضرت نے بہ عطوفت شاہانہ خود سراج کو یاد کیا۔

"سنا! تمہیں ابراہیم ظفر نے شکست دی!"

"جہاں پناہ"

"اس کی رگوں میں بہادروں کا خون رواں ہے سراج، ہم نے اس سے پیشتر تم سے کہا تھا"

"عالم پناہ"

"خیر! ایک مرتبہ اور کوشش کرو"

اور چند ہی دن بعد سراج ایک زبردست فوج، بہترین توپ خانہ اور اسلحہ کے ساتھ زحل پر حملہ آور ہوا لیکن وائے بدقسمتی کہ اس مرتبہ بھی وہ شام گڑھ سے آگے نہ بڑھ سکا اور شکست کھا کر بھاگ آیا۔

"جوش بہت زیادہ اور قوت عمل کم، حیدرآبادی امرا کی یہ سب سے بڑی کمزوری ہے" اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

"درست جہاں پناہ"

"قوت عمل پیدا کرو اور تم اپنے آپ کو پہلے سے بھی زیادہ اپنے شاہ کا وفادار پاؤگے"

"جہاں پناہ"

"اب کی دفعہ ہم شاہی فوج کو زحل پر حملہ کے لئے بھیجتے ہیں"

"فاطمہ!"

"میرے سرتاج!"

"اب ہمیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے گا، تمہاری معصوم دعائیں بارگاہ رب العزت میں قبول ہوئیں اور میں نے دوسری مرتبہ سراج کو شکست دے کر اپنی طاقت کا لوہا منوالیا ہے۔ سارے حیدرآباد میں ہلچل سی مچ گئی ہے اور ہر شخص کی زبان پر "ابراہیم ظفر" ہے .... اب جلد ہی ہم ایک بندھن میں ...."

"خدائے بزرگ و برتر آپ کو ایسے کئی مسرت کے دن دکھائے، میرے سرتاج!"

"آمین"

"ابراہیم ظفر الدولہ ظفر الملک، شاہ زحل کی شادی کی تیاریاں بڑے ہی زور شور پر جاری ہیں، سارا زحل رشک فردوس بنا ہوا ہے۔ دن رات نوبت نقارے دھوم مچا رہے ہیں، روزانہ جشن چراغاں ہو رہے ہیں کہ جنوب کی طرف سے ایک سوار تیز تیز آتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے داخل ہوتے ہی شام گڑھ، تیس گڑھ اور تمام قلعوں پر طبل جنگ بجنے لگتا ہے اور تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر ہر طرف آگ کی طرح پھیل جاتی ہے کہ زحل پر کوئی حملہ ہونے والا ہے، ابراہیم ظفر مسکرا دیتا ہے۔

"شکست سے ابھی طبیعت سیر نہیں ہوئی سراج کی"

ایک جاسوس آکر اطلاع دیتا ہے۔

"جہاں پناہ! سراج اس فوج میں موجود نہیں، شاہی کماندار اس فوج کی کمان کر رہا ہے"۔

"تب تو مقابلہ سخت ہے" ابراہیم ظفر نے مقابلہ کی اہمیت محسوس کر لی۔

حملہ شروع ہوا، گونڈ جرنیل نے چار گھنٹوں کی لڑائی میں شاہی توپ خانہ کی آتشباری اور شاہی فوج کے سخت حملوں کی تاب نہ لاکر "شام گڑھ" چھوڑ دیا اور شہر پناہ میں داخل ہوا۔

"پل اٹھا دیا جائے" ابراہیم ظفر خود کمان کر رہا تھا۔

"سامنے کے مورچے پر چار توپیں اور چڑھا دو — دو دستے پچھلی جانب سے — اسد خاں! دو دستے سرنگ کے راستے سے — احمد! بایاں بازو کمزور ہو رہا ہے ——" وہ ہدایات دیتے چلا جا رہا تھا اور اس کی فوج جانبازانہ لڑائی لڑ رہی تھی۔

"اگلا مورچہ چھوڑ دو —— پیچھے ہٹتے جاؤ —— بائیں بازو سے گھیر دو ——" لڑائی اپنی پوری شدت کے ساتھ جاری تھی۔ شاہی کماندار اس کوشش میں تھا کہ رات ہونے تک کسی طرح بھی ہو اپنی کامیابی مکمل کر لے لیکن ایسا نہ ہو سکا اور لڑائی دوسرے دن کے لئے ملتوی ہو گئی۔

شاہی فوج کے کیمپ میں رات "دو قاتل جاسوس" پکڑے گئے۔ یہ قاتل جاسوس ابراہیم ظفر کی تربیت شدہ ایک خاص جماعت تھی جس کا کام نہ صرف جرنیلوں کو قتل کرنا تھا بلکہ دوسری اور ضروری معلومات بھی حاصل کرنا تھا۔

صبح ہوتے ہی پھر لڑائی شروع ہو گئی اور دوپہر تک اپنے شباب پر تھی۔ اسلحہ کی جھنکار، بندوقوں کی ٹھائیں ٹھائیں، توپوں کی گرج، چیخ پکار، نعرے عجیب عجب تماشا

منظر تھا، ابراہیم ظفر مجبور ہو گیا اور اس نے اپنی فوج کا بیشتر حصہ بتیس گڑھ پہونچا دیا - شاہی فوجوں نے بتیس گڑھ کا محاصرہ کر لیا -

"حضور! صلح کر لینی بہتر ہے" ایک فوجی افسر نے کہا
"جنگ جاری رکھو جبار!"
"جہاں پناہ!"
"یہ میرا حکم ہے"
"مگر حضور ...."

ٹھائیں اور جبار اس کی فوج کا ایک افسر زمین پر خون میں لوٹ رہا تھا -

"ہم اپنے آخری قطرۂ خون تک جنگ جاری رکھیں گے اسد!"

"بے شک، جہاں پناہ"

"ہم بہادروں کی موت مرنا پسند کرتے ہیں"

ابراہیم ظفر خود چار دستوں کے ساتھ ایک سرنگ کے ذریعہ سے شاہی فوج کے پچھلے حصے پر نمودار ہوا، شاہی فوج آسانی سے بکھر گئی، شاہی کماندار پریشان ہو گیا - لیکن جلد ہی اپنی فوج کو اس نے دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور لڑائی نے شدت اختیار کر لی - ابراہیم ظفر اپنے ایک جرنیل کے سپرد یہ کام کر کے قلعہ میں واپس آ گیا -

"اوہ! توپچی دیکھتے نہیں ہو، کیا کر رہے ہو؟"
وہ شیر کی طرح غرّایا -

"ہماری فوج کے اس حصے پر زیادہ دباؤ پڑ رہا ہے توپوں کے دہانے اس طرف پلٹ دو، تم ہٹ جاؤ، گدھے ہو تم" اور اس نے توپچی کی جگہ سنبھالی - آتشباری تیز سے تیز تر ہو گئی، نرلی جرنل جو میدان میں شاہی فوج سے مقابلہ کر رہا تھا اپنی جگہ پر جما ہوا تھا -

"قلعہ کی اس طرف کی توپ سے" شاہی کماندار نے بائیں طرف اشارہ کیا "بہت زیادہ آتشباری ہو رہی ہے ہماری فوج پریشان ہو رہی ہے، خدانخواستہ کہیں —— اس توپچی کو ختم کر دو" اور ایک افسر اس توپچی کی تاک میں لگا ہوا تھا۔ نرلی جرنل بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا تھا - قلعہ کی طرف سے آتشباری میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا - ابراہیم ظفر کا چہرہ کھِل گیا - وہ اپنی جگہ سے اٹھا تاکہ دوسری طرف سے آتشباری تیز کرنے کا حکم دے -

ٹھائیں!

آہ! اسد، دائیں طرف کی آتش باری ....
اور تیز ...... کر دو"

"جہاں پناہ! یہ کیا ہو گیا حضور کو"

"جاؤ اسد .... تم جاؤ ...... پہلے جاؤ"

اور ابراہیم ظفر دھم سے زمین پر گر گیا -

"میرے سرتاج!"

"کون .... فاطمہ .... میری فاطمہ ....
تم یہاں کیسے آ گئیں ...."

لڑائی زوروں پر جاری تھی -

"میرے سرتاج یہ کیا ہو گیا آپ کو؟ اف خدایا ..
........"

اور ابراہیم ظفر مسکرانے لگا -

"فاطمہ - ہنسو - ہنسو، ایک بار ....." "میں بہادروں .... کی موت ...... مر رہا ہوں -

فاطمہ! میں ...... بہت خوش ہوں ..... بہت" اس کا سر فاطمہ کی گود میں تھا - سینے سے خون بہہ رہا تھا اور وہ مسکرا رہا تھا -

فاطمہ! وطن کی خاطر سب کچھ ...."

ایک ہی گھنٹہ بعد آصفی پرچم "بتیس گڑھ" پر لہرا رہا تھا اور ابراہیم ظفر —— اپنی محبوبہ کی آغوش میں ابدی نیند سو رہا تھا -

عبدالمجید (عثمانیہ)

وضعِ جسمانی

اس سے قبل کی تقریر میں میں نے بچپن کے زمانے کی وضعِ جسمانی کی نوعیت کو ضروری توضیحات کے ساتھ پیش کرکے اس کے اصلاحی پہلو کو واضح کیا تھا۔ آج کی تقریر میں زمانۂ بلوغ کی وضعِ جسمانی پر روشنی ڈالی جائے گی۔ میں اس امر کی توضیح کی کوشش کروں گا کہ زمانۂ بلوغ زندگی میں کس قدر اہم ہے اس زمانہ میں وضعِ جسمانی کی پرورش کس نوعیت پر ہونی چاہیے اور وہ کونسے ایسے داخلی اور خارجی امور ہیں جو زمانۂ بلوغ وضعِ جسمانی پر خوش گوار یا غیر خوش گوار اثرات مترتب کرتے ہیں اور جس سے جوانی ادھیڑپن اور بڑھاپے کے زمانے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

بلوغ کا دور مختلف ممالک میں آب و ہوا کے لحاظ سے مختلف ہے۔ سرد ممالک میں بالعموم بچے ۱۹، ۲۰ اور ۲۱ سال کے درمیان زمانۂ بلوغ میں قدم رکھتے ہیں۔ لیکن گرم ممالک میں بچے کسی قدر قبل ہی بالغ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں بچے بالعموم ۱۶، ۱۷، ۱۸ اور ۱۹ سال کے درمیان بلوغ کے دور میں آجاتے ہیں اور لڑکیاں ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ سال کے درمیان بلوغ کے زمانے میں پہونچ جاتی ہیں جغرافی حالات کے علاوہ غذا اور اس کی نوعیت کا تعلق بھی بلوغ کے دور سے بہت زیادہ ہے۔ گرم مسالہ دار اور چٹ پٹی غذا کھانے والے بچے اس سے بھی جلد زمانہ بلوغ کو پہونچتے دکھائی دیتے ہیں۔ قطع نظر اس تخیلات کو بھی اس زمانے کے قبل از قبل آغاز سے زیادہ تعلق ہے۔ جنسی میلان اور اس کے متعلق معلومات کی فراہمی ہر بچے میں فطرتاً موجود ہے۔ ایسی معلومات کے حصول میں اگر اس کی صحیح رہبری نہ ہو تو وہ خود اس کی کھوج میں لگا رہتا ہے، عام حالات اور اس کے نتائج کے اعتبار سے یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ اس قسم کی کھوج اور اس کے راستے یا بالواسطہ کھوج کے طریقے بالعموم گمراہ کن ہی ہوا کرتے ہیں۔ وہ تمام اعلیٰ اور مقدس تخیلات جو جنسی اعتبار سے دل اور دماغ میں پرورش پانے چاہئیں ان کی بجائے وہ نفسانی خواہشات کا شکار ہو کر اپنی انسانی قدر و قیمت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہر مذہب میں بلوغ کے آغاز کے ساتھ ہی ہر انسان پر مذہبی پابندیاں عائد کردی گئی ہیں۔ جنسی تعلقات تو اس قدر نازک ترین حالت میں واضح کئے گئے ہیں جن میں ذرا سی لغزش ایک گناہِ کبیرہ بن جاتی ہے۔ بہرحال اس خصوص میں میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا بلکہ صرف اس قدر اشارہ کئے دیتا ہوں کہ بچے کے بزرگوں کا یہ فرض ہے کہ اس میں جنسی تخیلات اور اس کی فراہمی کے طریقے اس پیرایہ میں مہیا کریں جن کے ذریعہ ایک پاک اور مقدس خیال اس کے دماغ پر مسلط ہو جائے تاکہ وہ گمراہی سے بچ جائے اور اپنی زندگی کو تباہ و برباد نہ ہونے دے۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت ہر ترقی یافتہ ملک میں جو اپنے نونہالوں کو تندرست اور قوی تر بنانا چاہتے ہیں، جنسی تعلیم ان بچوں کے لئے عام اور لازمی کردی گئی جو زمانۂ بلوغ کے قریب تر ہوں۔ غرض مجھے یہاں یہ بتانا مقصود تھا کہ قبل از قبل جنسیاتی تخیلات کی پیدائش سے بھی بلوغ کے زمانے کا آغاز کسی لڑکے یا لڑکی پر ہونے لگتا ہے۔

زمانۂ بلوغ دراصل بچپن اور جوانی کے درمیان کا حدِ فاصل ہے۔ انسان تعیشات کے لاانتہائی پہلو یا بڑا یا معاشی تخیلات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنی زندگی کا مقصد کچھ ہی متعین کرے لیکن قدرت انسان سے کچھ اور ہی توقع رکھتی ہے۔ زمانۂ بلوغ میں انسان میں جنسی میلان کی پیدائش قدرت کی جانب سے ہوتی ہے۔ اس میلان کو پیدا کرنے کا یہ منشا ہے کہ انسان اس بات کی تیاری کرے کہ آئندہ اس کو ایک باپ یا ماں بننا ہے اور اس خصوص میں صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے تاکہ اس کی ہونے والی پود توانا اور طاقتور ہو سکے۔

ابھی ہم نے بتایا کہ بلوغیت کا زمانہ تیاری کا زمانہ ہے۔

اگر ان کا قد ۵ فٹ ۵ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۱۲۷ پونڈ ہو

،، ،، ۵ ،، ۶ ،، ،، ،، ،، ۱۳۰ ،،

،، ،، ۵ ،، ۷ ،، ،، ،، ،، ۱۳۲ ،،

،، ،، ۵ ،، ۸ ،، ،، ،، ،، ۱۳۶ ،،

،، ،، ۵ ،، ۹ ،، ،، ،، ،، ۱۴۰ ،،

،، ،، ۵ ،، ۱۰ ،، ،، ،، ،، ۱۴۵ ،،

،، ،، ۵ ،، ۱۱ ،، ،، ،، ،، ۱۵۰ ،،

،، ،، ۶ ،، ،، ہو تو ان کا معیاری وزن ۱۵۷ ،،

یہ ہوا لڑکوں کا معیاری وزن جو زمانۂ بلوغ میں ہونا چاہیے۔ لڑکیوں کا سن بلوغیت لڑکوں سے کسی قدر قبل ہی آغاز ہوتا ہے کیونکہ جنسی تخیلات کی پیدائش لڑکیوں میں پہلے ہی ہونے لگتی ہے۔ ہمارے ملک میں یہاں کی آب و ہوا اور غذا کے مدنظر لڑکیوں کا سن بلوغ ۱۵۔ ۱۶ اور ۱۷ سال کے درمیان بالعموم واقع ہوتا ہے۔ اب ہم ان ہی سالوں کے لحاظ سے قد کے تناسب کے مدنظر ان کا معیاری وزن واضح کرتے ہیں۔ پہلے ہم ۱۵ سال کی لڑکیوں کا معیاری وزن بتاتے ہیں۔

اگر ۱۵ سال کی لڑکیوں کا قد ۴ فٹ ۹ انچ ہو تو انکا معیاری وزن ۸۶ پونڈ ہو

،، ۱۵ ،، ،، ،، ۴ ،، ۱۰ ،، ،، ،، ،، ۹۰ ،،

،، ۱۵ ،، ،، ،، ۴ ،، ۱۱ ،، ،، ،، ،، ۹۵ ،،

،، ۱۵ ،، ،، ،، ۵ ،، ،، ،، ،، ۱۰۰ ،،

،، ۱۵ ،، ،، ،، ۵ ،، ۱ ،، ،، ،، ۱۰۶ ،،

،، ۱۵ ،، ،، ،، ۵ ،، ۲ ،، ،، ،، ۱۱۱ ،،

،، ۱۵ ،، ،، ،، ۵ ،، ۳ ،، ،، ،، ۱۱۵ ،،

،، ۱۵ ،، ،، ،، ۵ ،، ۴ ،، ،، ،، ۱۱۹ ،،

،، ۱۵ ،، ،، ،، ۵ ،، ۵ ،، ،، ،، ۱۲۲ ،،

،، ۱۵ ،، ،، ،، ۵ ،، ۶ ،، ،، ،، ۱۲۴ ،،

،، ۱۵ ،، ،، ،، ۵ ،، ۷ ،، ،، ،، ۱۲۷ ،،

،، ۱۵ ،، ،، ،، ۵ ،، ۸ ،، ،، ،، ۱۳۰ ،،

،، ۱۵ ،، ،، ،، ۵ ،، ۹ ،، ،، ،، ۱۳۳ ،،

اگر ۱۵ سال کی لڑکیوں کا قد ۵ فٹ ۱۰ انچ ہو تو انکا معیاری وزن ۱۳۶ پونڈ ہو

،، ۱۵ ،، ،، ،، ۵ ،، ۱۱ ،، ،، ،، ،، ۱۴۰ ،،

،، ۱۵ ،، ،، ،، ۶ ،، ،، ،، ،، ۱۴۵ ،،

اب ہم ۱۶ سال کی لڑکیوں کا وزن اور ان کے قد کے تناسب کو پیش کرتے ہیں۔

اگر ۱۶ سال کی لڑکیوں کا قد ۴ فٹ۔ ۱۰ انچ ہو تو انکا معیاری وزن ۹۴ پونڈ ہو

،، ۱۶ ،، ،، ،، ۴ ،، ۱۱ ،، ،، ،، ۹۶ ،،

،، ۱۶ ،، ،، ،، ۵ ،، ،، ،، ،، ۱۰۲ ،،

،، ۱۶ ،، ،، ،، ۵ ،، ۱ ،، ،، ،، ۱۰۸ ،،

،، ۱۶ ،، ،، ،، ۵ ،، ۲ ،، ،، ،، ۱۱۳ ،،

،، ۱۶ ،، ،، ،، ۵ ،، ۳ ،، ،، ،، ۱۱۶ ،،

،، ۱۶ ،، ،، ،، ۵ ،، ۴ ،، ،، ،، ۱۲۰ ،،

،، ۱۶ ،، ،، ،، ۵ ،، ۵ ،، ،، ،، ۱۲۳ ،،

،، ۱۶ ،، ،، ،، ۵ ،، ۶ ،، ،، ،، ۱۲۶ ،،

،، ۱۶ ،، ،، ،، ۵ ،، ۷ ،، ،، ،، ۱۲۸ ،،

،، ۱۶ ،، ،، ،، ۵ ،، ۸ ،، ،، ،، ۱۳۲ ،،

،، ۱۶ ،، ،، ،، ۵ ،، ۹ ،، ،، ،، ۱۳۵ ،،

،، ۱۶ ،، ،، ،، ۵ ،، ۱۰ ،، ،، ،، ۱۳۸ ،،

،، ۱۶ ،، ،، ،، ۵ ،، ۱۱ ،، ،، ،، ۱۴۲ ،،

،، ۱۶ ،، ،، ،، ۶ ،، ،، ،، ،، ۱۴۷ ،،

اب ہم ۱۷ سال کی لڑکیوں کا معیاری وزن ان کے قد کے تناسب سے بتاتے ہیں۔ جو لڑکیاں ۱۷ سال کی عمر میں سن بلوغ میں داخل ہوتی ہیں وہ بالعموم بہت توانا اور تندرست رہتی ہیں ایسی لڑکیاں عمدہ اور صحت مند بچوں کی مائیں ہوا کرتی ہیں ان میں نسوانی کمزوریاں جو ان کی صحت کو تباہ کرتی ہیں۔ بہت کم پیدا ہوتی ہیں اور ان کے بچے بھی نہایت توانا اور مضبوط قویٰ کے ہوتے ہیں۔ بچپن کی اموات بہت کم ہوا کرتی ہیں۔ اب ۱۷ سال کی لڑکیوں کا معیاری وزن بغور سنیئے۔

۱۷ سال کی عمر رکھنے والی لڑکیوں کا وزن اگر وہ ۴ فٹ

۱۱ انچ کا قد رکھتی ہوں تو ان کا معیاری وزن ۹۸ پونڈ ہو۔
۵ فٹ کا قد رکھتی ہوں تو ان کا معیاری وزن ۱۰۴ پونڈ ہو۔
۵ 〃 ۱ انچ کا قد رکھتی ہوں تو ان کا معیاری وزن ۱۰۹ پونڈ ہو

۵ 〃 ۲ 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۱۴ 〃
۵ 〃 ۳ 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۱۸ 〃
۵ 〃 ۴ 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۲۱ 〃
۵ 〃 ۵ 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۲۴ 〃
۵ 〃 ۶ 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۲۷ 〃
۵ 〃 ۷ 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۲۹ 〃
۵ 〃 ۸ 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۳۳ 〃
۵ 〃 ۹ 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۳۶ 〃
۵ 〃 ۱۰ 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۳۹ 〃
۵ 〃 ۱۱ 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۴۲ 〃
۶ فٹ 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۴۸ 〃

ہم نے زمانۂ بلوغ اور اس زمانے میں بچوں اور بچپن کا بلحاظ عمر معیاری وزن بتادیا ہے۔ معیاری وزن در اصل صحت جسمانی اور عمدہ وضع جسمانی کا ایک معیار ہے اور اسی سے کسی کی عمر کا بھی تخمینہ کیا جاتا ہے اسی وجہ سے اکثر بیمہ کمپنیاں بیمہ کے وقت عمر اور وزن کے تناسب کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ فوجی خدمات کے سلسلہ میں بھی معیاری وزن کو بطور خاص پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ بہرحال اب ہم صرف زمانۂ بلوغ میں وضع جسمانی کے بعض حالات پر روشنی ڈالیں گے جس سے وضع جسمانی کی نوعیت صحت جسمانی کے اعتبار سے واضح ہوسکے۔ بلوغ کے دور میں جسم کے ہر عضو میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور یہ تبدیلی خاطر خواہ اس وقت ہوگی جب کہ اس خصوص میں بطور خاص خیال رکھا جاکر اس کے صحیح نشو و نما کے لئے مناسب اور صحت بخش ماحول پیدا کیا جائے۔ اس میں سب سے اہم غذا کا سوال ہے۔ انڈا۔ گوشت۔ مچھلی۔ پھل۔ ترکاریاں زمانۂ بلوغیت میں وضع جسمانی کے نشو و نما میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ دودھ کا استعمال اس زمانے میں بچوں کو اگر کرایا جائے تو ان کے عام نشو و نما میں بڑی ترقی ہوتی ہے۔ غذا کے ساتھ اس زمانہ میں ورزش کا سوال بھی بہت اہم ہے۔ بالعموم اس زمانے میں خود بخود بچے کے دل میں جسمانی طاقت کے حصول کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھنا کہ جسمانی توانائی اور وضع جسمانی کو قوی کرنے کے لئے کس قسم کی ورزشیں کرائی جائیں۔ ہم نے معیاری وزن تبلا دیا ہے اس کو پیش نظر رکھ کر اور یہ دیکھئے کہ اپنا وزن معیاری سے کم ہے یا زیادہ۔ کم ہونے کی صورت میں ایسی ورزشیں کی جائیں جو عضلات اور اعصاب کو تقویت پہونچا سکتے ہیں جن میں غیر آلاتی ورزشیں بہت سود مند ہیں۔ سیدھی سادھی ورزشیں بہ لحاظ صورت کسی ماہر وضع جسمانی سے تیار کرائی جائیں اور اس کے حسب ہدایات روزانہ صبح و شام ان ورزشوں کو کرتے رہیں۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ ضرور یاد رہے کہ کم وزن رکھنے والے بچے کھیلوں میں زیادہ حصہ لیں۔ ہلکی ورزشیں جو بہت کم تھکاتی ہیں اور جن کو بہت دیر کرسکتے ہیں کرتے رہیں۔ وزنی ورزشیں جو بہت جلد تھکا دیتی ہیں ہرگز نہ کریں۔ کیونکہ اس قسم کی ورزشیں عضلات اور اعصاب پر بار ڈالتی ہیں اور اس قسم کے بارسے ان میں تھکن زیادہ پیدا ہوجاتی ہے اور اس سے عضلات اور اعصاب کے نشو و نما میں رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے۔ بظاہر انسان تو ایسی ورزشوں سے موٹا تازہ دکھائی دیتا ہے لیکن اس کا اثر دوران خون ہاضمہ اور عصبی نظام پر بہت برا پڑتا ہے۔ وقت سے پہلے ہی اعضا کمزور ہونے لگتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وزنی ورزشیں مثلاً۔ ڈمبل۔ بار اور رنگ اور بگا تار ڈنڈ اور بیٹھک انسان کے جسم کو بہت جلد تیار کردیتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ انسان کو اس قسم کی تیاری کی ضرورت ہے یا نہیں۔ بے ضرورت تیاری سے سوائے نقصان کے اور کچھ نہیں۔ وزنی ورزشیں بھی اپنی خاص خصوصیات اور افادیت رکھتی ہیں بشرطیکہ ان سے مناسب اور ضرورت کے لحاظ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ جسم کی تیاری کا مفہوم ہمیشہ معیاری وزن رہے۔ اگر آپ کو اپنا معیاری وزن

ل گیا تو یہ سمجھئے کہ آپ نے وضع جسمانی کی پوری قابلیتوں کو حاصل کر لیا ہے۔ کم وزن رکھنے والے وضع جسمانی میں کئی نقائص پیدا ہوتے ہیں۔ بالخصوص زمانۂ بلوغ میں بینائی پر اثر پڑتا ہے۔ بھوک اڑ جاتی ہے۔ دماغی کام میں دل نہیں لگتا۔ حافظہ بھی کچھ ایسا ویسا ہی ہوتا ہے۔ قوت مدافعت میں فتور آجاتا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے بھی ان میں کئی ایک خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چڑچڑاپن پیدا ہونے لگتا ہے۔ بار بار معمولی باتوں پر غصہ آنے لگتا ہے۔ صبر و تحمل اور طبیعت میں استقلال بہت کم رہتا ہے۔ جب جسمانی اور دماغی اعتبار سے انسان اپنی کمزوریوں کو محسوس کرنے لگتا ہے تو اس میں ایک عام پستی رونما ہونے لگتی ہے جس سے اس کے آئندہ دور زندگی کے منازل میں بڑی بڑی رکاوٹیں پیدا ہونے لگتی ہیں بالآخر وہ ایک کمزور شخصیت کے تحت ایک ناکام زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح معیاری وزن کے اعتبار سے جن کا وزن زیادہ ہو وہ اور بھی زیادہ توجہ کے قابل ہیں اگر موٹاپے کو حسب حال رکھا جائے تو نہ صرف بظاہر وضع جسمانی بھدی معلوم ہونے لگتی ہے، بلکہ اس میں خرابیوں کا ایک لا متناہی سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ موٹے پن کا پہلا اثر قوت ہاضمہ پر پڑتا ہے۔ بتدریج خوراک کم ہونے لگتی ہے۔ پانی زیادہ پیا جاتا ہے۔ دوران خون اور اعصاب پر بیجا دباؤ پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں جسم کے اندرونی اعضا بیجا دباؤ سے بیزار ہو کر بغاوت کر بیٹھتے ہیں۔ ذیابیطس۔ خون کا دباؤ۔ نیز نظام ہاضمہ اور دوران خون سے متعلق جو امراض ہیں بتدریج حملہ آور ہوتے جاتے ہیں۔ زمانۂ بلوغ میں اگر موٹاپے پر قابو پا لیا جائے تو آئندہ زندگی میں ان مہلک امراض سے سابقہ نہ پڑے گا جو بچے معیاری وزن سے زیادہ وزن رکھتے ہوں وہ غذا کے معاملہ میں بہت احتیاط کریں۔ ترکاریوں اور پھلوں کا استعمال زیادہ کریں۔ پانی کم پئیں۔ پسینہ آور ورزشیں اور کھیل زیادہ کھیلیں۔ ان کے لئے تھوڑی بہت وزنی ورزشیں موزوں ہوتی ہیں لیکن ہلکی ورزشوں کے ساتھ ان ورزشوں کو ملا کر کریں۔ بہرحال موٹاپا نہ صرف وضع جسمانی کو بھدا کر دیتا ہے بلکہ ایسے وضع جسمانی کی تمام کیفیات اور خیالات بھی کچھ نہ کچھ بھدا پن ضرور لیے ہوئے ہیں۔

زمانۂ بلوغ میں وضع جسمانی کی تعمیر میں متوازن غذا اور موزوں ورزشوں کے علاوہ عادات کو بھی زیادہ دخل حاصل ہے۔ اس زمانہ میں اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ بچہ اپنے آپ کو بچہ کم سمجھنے لگتا ہے اس میں عقل و تمیز کا تصور زیادہ پیدا ہو جاتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ اس کے بڑے یا بزرگ کیا کرتے ہیں۔ اسی تصور میں وہ اپنے بڑوں کی عادات کو دیکھ کر ان ہی عادات کو حاصل کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم جو اپنے آپ کو بچوں کے بزرگ و سرپرست سمجھتے ہیں، کئی ایک ناقص عادات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہمارے کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے کی عادات میں صحت نہیں ہوتی۔ اس خصوص میں میں نے اس سے قبل کی تقریروں میں بہت کچھ توضیح کی ہے لیکن زمانۂ بلوغیت کے اعتبار سے بچوں کو جن عادات سے باز رکھنا ہے ان میں سگریٹ نوشی، چائے نوشی، پان کا استعمال بہت پیش پیش ہیں۔ یہ عادتیں صحت بخش کسی طرح نہیں۔ بظاہر کچھ لطف آجاتا ہے لیکن اس لطف کے پس پردہ کئی آفتیں پنہاں ہیں۔ ان عادتوں سے وضع جسمانی اور اس کی صحت بخش حالت پر کافی برا اثر پڑتا ہے۔ بلوغ جو تیاری کا زمانہ ہے اس میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ ان عادتوں کے متعلق تفصیل سے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ لیکن اس قدر بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان عادتوں سے جنسی تخیلات میں فتور پیدا ہوتا ہے اور کئی ایک جنسی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ لباس کی وضع قطع بھی اس زمانہ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ جہاں تک ہو سکے تنگ کپڑے نہ پہنے جائیں۔ لڑکیوں کا حد سے زیادہ بناؤ سنگھار کا خیال، اونچی ایڑی کے جوتوں کا متواتر استعمال ان کی قدرتی جنسی حالت میں رکاوٹ ڈالنے کا

باعث ہوتے ہیں۔

زمانۂ بلوغ میں سب سے اہم بات جو وضاحت طلب ہے اس زمانے کی شادیاں ہیں جو زمانۂ بلوغ میں وضع جسمانی کی ترقی میں سدراہ ہوتی ہیں۔ کم عمری میں شادیوں کے باعث وضع جسمانی کا پورا نشوونما اپنی جگہ رک جاتا ہے۔ ایک تو خود اپنی وضع جسمانی کی بربادی ہوئی اور دوسرے وقت سے پہلے اولاد ہونے کے باعث بچے ننھے کمزور اور ناتوان پیدا ہوتے ہیں جو بہ مشکل زندہ رہتے ہیں۔ اگر زندہ رہ بھی گئے تو کمزور اور ناتوان۔ ظاہر ہے کہ ایسی کمزور وضع جسمانی رکھنے والے بچے آئندہ قومی ترقی میں کیا خاک ہاتھ بٹائیں گے۔ غرض ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کی نگہداشت بلوغ کے زمانے میں خاص طور سے کریں تاکہ وہ آئندہ ایک صحت مند ماں اور باپ بن کر طاقتور اولاد پیدا کریں۔

(لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے پڑھا گیا)

محمد غوث الدین

حسین گماں!

دھیمی دھیمی ہے ہوش کی قندیل
آرزو نگاہوں میں کچھ خلل سا ہے
ہو رہی ہے جنون کی تکمیل
ہر عمل میرا بے عمل سا ہے

---

(۲) تیرے ان نرگسی کٹوروں میں
میرے ماضی کا خون چھلکتا ہے
اور ان سرخ سرخ ڈوروں میں
ایک آنچل ہے جو جھلکتا ہے
میری زینت کا سرخ سرخ آنچل
اس کے شانوں پہ یوں سرکتا تھا
جس طرح زیست کا نقاب اٹھے
اور وہ مرمریں گداز سا جسم
مدغم کیف مست ناز سا جسم
میری باہوں میں یوں تھرکتا تھا
جوں تڑپ کر حسیں حباب اٹھے
میری امید ہو گئی بے کل

---

(۳) ہو رہا ہے گمان پلکوں پر
دل شکن، دلنواز پلکوں کا
تیری جادو بیان پلکوں پر
ان نکیلی دراز پلکوں کا

---

(۴) تیری نظریں ہیں موج ہائے جنوں
اے مری غمگسار، زندہ باد
پوچھ مت مجھ سے میرا حال زبوں
اے سراپا بہار، زندہ باد
تشنگی اور بھی ہو جس سے فزوں
وہ نظر بار بار زندہ باد

افسر آذری

نتیجہ امتحان اردو دانی (دوم) بابتہ ۱۹۴۵ء

حسب ذیل امیدواروں نے علی الترتیب سب سے زیادہ نشانات حاصل کئے۔

۲۱۴۔ دیا شنکر دیویدی اول (بلدہ فوج)
۳۷۸۔ شوکت جہاں بیگم دوم (نظام آباد)
۱۶۱۔ شیخ بوبکر باشراحیل سوم (بلدہ فوج)

بلحاظ رول نمبر

مرکز بلدہ (اناث)

(کامیاب باامتیاز)

۳۔ خدیجہ بیگم
۴۔ غوثیہ بیگم
۵۔ مریم بی
۷۔ ہاجرہ بی
۸۔ رابعہ بی

(کامیاب)

۱۔ کنیزہ عائشہ
۹۔ صالحہ بیگم

مرکز بلدہ (ذکور)

(کامیاب)

۱۰۔ محمد حسین
۱۱۔ محمد عبدالوہاب انصاری
۱۲۔ رام سوامی
۱۴۔ حیات خاں
۱۵۔ ڈوی ستیارام
۱۶۔ ابوالحسن محمد ریاض الدین
۱۷۔ جے رام ناتھم

مرکز بلدہ (فواج)

(کامیاب باامتیاز)

۲۱۔ نوراحمد
۲۲۔ عبدالعزیز خاں
۲۴۔ محمد عثمان
۲۶۔ محبوب خاں
۳۱۔ چندر ناتھ پرشاد
۴۰۔ احسان احمد خاں
۴۹۔ امتیاز حسین خاں
۵۱۔ شام سندر
۵۹۔ سید سلطان محی الدین
۶۲۔ عبدالحق خاں
۶۳۔ منور علی خاں
۶۹۔ عبدالحفیظ
۷۰۔ احمد حسین خاں
۷۶۔ محمد عبدالرحیم
۸۰۔ منور خاں
۸۱۔ محمد اسحٰق
۸۷۔ احمد حسین
۸۸۔ مارکھنڈے سنگھ
۸۹۔ رنگیا
۹۴۔ شیخ ابراہیم
۱۰۲۔ شیخ محبوب
۱۱۷۔ نارائن سنگھ
۱۱۹۔ عبدالرشید
۱۲۱۔ محمد فاضل
۱۲۲۔ سید غوث
۱۲۴۔ محمد باشاہ
۱۲۵۔ محمد عبدالغفور
۱۳۱۔ میر حسن علی
۱۳۲۔ محمد خواجہ
۱۵۰۔ سید افضل
۱۶۱۔ شیخ بوبکر باشراحیل
۱۶۴۔ اجواویر
۱۶۹۔ حسن
۱۷۲۔ غلام صمدانی
۱۹۱۔ کنیا پرشاد
۱۹۲۔ محمد یعقوب
۲۰۳۔ محمد بیگ
۲۰۸۔ محبوب شریف
۲۱۴۔ دیا شنکر دیویدی
۲۱۶۔ عبدالقادر
۲۱۹۔ یوسف خاں
۲۲۰۔ عبدالعزیز
۲۲۳۔ مہابیر پرشاد
۲۹۷۔ محمد عمر خاں

(کامیاب)

۱۹۔ رامیا
۲۰۔ محمد عبدالرحیم
۲۳۔ شیخ چاند
۲۷۔ محمد حفیظ اللہ
۳۰۔ محمد عبدالجبار
۳۲۔ محمد الیاس
۳۳۔ شیخ تاج الدین
۳۴۔ سید حسین

۳۸۔ محمد احمد
۳۹۔ سید رسول
۴۰۔ [illegible]
۴۱۔ مصطفیٰ خاں
۴۲۔ عبدالقیوم
۴۳۔ محمد [illegible]
۴۴۔ سید نورالدین
۴۶۔ غلام مصطفیٰ خاں
۴۷۔ غلام محی الدین
۵۲۔ محمد [illegible] خاں
۵۳۔ محمد [illegible]
۵۵۔ سید جعفر
۵۶۔ محمد عبدالرحیم
۵۷۔ امین الدین خاں
۵۸۔ محمد [illegible] الدین
۶۰۔ [illegible] خاں
۶۱۔ عبدالرؤف خاں
۶۲۔ سلیمان [illegible]
۶۵۔ محمد عبدالقادر
۶۶۔ آغا خاں
۷۱۔ قدرت اللہ بیگ
۷۲۔ محمد سلیمان
۷۳۔ عبدالحکیم خاں
۷۴۔ عبدالرحیم خاں
۷۵۔ شیخ عبدالقدوس
۸۰۔ محمد عبداللطیف
۸۱۔ مسعود خاں
۸۲۔ محمد عبدالحفیظ
۸۳۔ شیخ محبوب
۸۴۔ محمد سلطان

۸۸۔ شیخ محی الدین
۹۰۔ بھابیر
۹۱۔ محمد شہاب الدین
۹۲۔ گارگیڈین
۹۳۔ طاہر علی
۹۵۔ عبدالواسع
۹۶۔ مشتاق حسین
۹۷۔ حاجی خاں
۱۰۰۔ مرزا قیصر بیگ
۱۰۱۔ محمد ابراہیم
۱۰۳۔ محمد یعقوب
۱۰۴۔ محمد شفیع الدین خاں
۱۰۵۔ ابوالخلیل بن سعید
۱۰۶۔ علی احمد
۱۰۸۔ عبدالجبار خاں
۱۰۹۔ محمد عظیم الدین
۱۱۰۔ شیخ نور اسحٰق
۱۱۱۔ شاہ راز خاں
۱۱۲۔ عبدالکریم
۱۱۳۔ محمد حنیف
۱۱۴۔ احسان اللہ خاں
۱۱۶۔ غفار خاں
۱۱۹۔ سید رسول
۱۲۰۔ محمد مولانا
۱۲۳۔ کے۔ کے۔ جوزف
۱۲۸۔ غلام رسول
۱۲۹۔ محمد ابراہیم
۱۳۳۔ محمد نظام الدین
۱۳۵۔ محمد عبدالوہاب
۱۳۶۔ محمد پاشاہ

۱۳۷۔ غوث الدین
۱۳۸۔ انور خاں
۱۳۹۔ غلام حسین
۱۴۱۔ رام رتن پرشاد
۱۴۴۔ نذیر احمد
۱۴۵۔ وحید الدین
۱۴۷۔ سرور خاں
۱۵۱۔ عوض بن سعید ابی الیل
۱۵۲۔ عبدالقادر صاعری
۱۵۳۔ عمر باحمید
۱۵۴۔ سید عمر بغدادی
۱۵۵۔ احمد عبیس
۱۵۶۔ علی عکبری
۱۵۷۔ سالم بلشرم
۱۵۸۔ حبیب عبدالرحمٰن بغدادی
۱۵۹۔ حبیب خاں
۱۶۰۔ محمد خاں
۱۶۲۔ عامر باجرائی
۱۶۳۔ احمد بغدادی
۱۶۵۔ محمد بادبج
۱۶۷۔ صالح مثقال
۱۶۸۔ احمد باحشوان
۱۷۰۔ تیسیر
۱۷۱۔ عبدالرحمٰن
۱۷۲۔ محمد
۱۷۳۔ سعید
۱۷۴۔ عمر
۱۷۶۔ عبدالحق
۱۷۷۔ عبدالقادر
۱۷۸۔ محمود

۳۰۳۔ محمد قاسم
۳۰۶۔ کرشنا راؤ
۳۰۹۔ محمد عظیم الدین
۳۱۰۔ پی۔ وینکٹ راؤ
۳۲۰۔ محمد جہانگیر
۳۲۱۔ پی۔ نرہیت ریڈی
۳۲۲۔ غلام غوث خاں
۳۱۰۔ غلام [illegible]

مرکز ناگر کرنول (اناث)
(کامیاب بہ امتیاز)
۳۳۱۔ عائشہ بی
(کامیاب)
۳۳۵۔ زینب بی

مرکز نظام آباد (ذکور)
(کامیاب بہ امتیاز)
۳۳۰۔ مجتبیٰ حسین
۳۴۰۔ محمد اعجاز الدین قریشی
۳۴۶۔ محمد عبدالغفور
(کامیاب)
۳۳۹۔ نصیر الدین
۳۳۰۔ نظام الدین
۳۴۲۔ محمد عبدالمجید خاں
۳۴۳۔ عبدالخالق
۳۴۴۔ کلیم الدین احمد
۳۴۵۔ منظور احمد
۳۴۷۔ احمد حسین
۳۵۰۔ افتخار علی خاں
۳۵۱۔ محمد نصیر الدین
۳۵۳۔ عبدالقدیر
۳۵۴۔ شجاعت علی خاں
۳۵۵۔ شیخ محمد حنیف الدین
۳۵۶۔ محمد مولانا
۳۵۷۔ سید وحید الدین
۳۵۸۔ محمد علی
۳۶۰۔ گنگارام
۳۶۱۔ کے ویرگپتا
۳۶۲۔ وی۔ رامیشور راؤ گپتا
۳۶۳۔ دیوا سنگھ
۳۶۵۔ پی۔ نرسیا
۳۶۶۔ نرسلو
۳۶۷۔ وینکٹ راملو

مرکز نظام آباد (اناث)
(کامیاب بہ امتیاز)
۳۷۸۔ شوکت جہاں بیگم
۳۷۹۔ امتہ المجیب
۳۸۳۔ جمیل النساء بیگم
۳۸۴۔ رقیہ اختر جہاں
(کامیاب)
۳۶۸۔ شانتا بائی
۳۶۹۔ کلاوتی
۳۷۰۔ رکھمنی بائی
۳۷۳۔ دورپتی بائی
۳۷۴۔ گنگو بائی
۳۷۵۔ راجمنی بائی
۳۷۶۔ طاہرہ بیگم
۳۷۷۔ رضیہ بیگم
۳۸۰۔ امتہ الحمید
۳۸۲۔ افسر پاشاہ
۳۸۶۔ حمید النساء بیگم
۳۸۸۔ نجم النساء بیگم
۳۸۹۔ عابدہ بیگم

مرکز بمبئی: ۷ دسمبر ۱۹۴۵ء کو صبح ۴ بجے بمبئی پہنچا اور اسٹیشن کے قریب انجمن اسلام کو گیا اور وہاں قریشی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ قریشی صاحب نے میری آمد سے قبل ہی جناب مولوی عبدالعزیز صاحب رضوی کو میرے استقبال کے لئے اسٹیشن روانہ کیا تھا لیکن میری بدقسمتی سے اسٹیشن پر ملاقات نہ ہو سکی۔ اقامت خانہ انجمن اسلام میں میرے لئے ایک کمرہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ ۹ دسمبر ۱۹۴۵ء کو سویرے ہی سے قریشی صاحب اور ان کے رفقائے کار امتحان کے کمرہ کے انتظامات میں منہمک تھے۔ چونکہ نہایت معقول انتظام تھا ٹھیک ۱۰ بجے حاضری کے بعد پرچے تقسیم کئے گئے اور وقت سے پہلے ہی امیدواروں نے جوابی بیاضات دے دیئے۔ قریشی صاحب کی خواہش پر میں نے زبانی امتحان لیا۔ اس کے بعد تمام جوابی پرچوں کو لفافہ میں بند کرکے مہر لگا دی گئی۔ امتحان گاہ کے انتظامات کی تعریف نہ کرنا بے انصافی ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کا سہرا جناب قریشی صاحب کے سر ہے۔ حقیقت میں یہی امتحان کی روح رواں ہیں اور ان کے رفقائے کار کے سر ہے۔ جن دشواریوں کا مقابلہ کرکے قریشی صاحب نے تعلیم بالغان کی طرف کامیابی کے ساتھ توجہ کی ہے وہ قابل تحسین اور حوصلہ افزائی ہے۔ آخر میں میں قریشی صاحب اور ان کے رفقاء کی مہمان نوازی کا دلی شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا بالخصوص بلگرامی صاحب کا جن کو میرے قیام کی وجہ سے اپنا کمرہ چھوڑنا پڑا۔ جناب قریشی صاحب کی توجہ اور انہماک سے آئندہ سال ان امتحانات کو بہت ترقی ہوگی۔ میری بدقسمتی تھی کہ جناب اسمٰعیل صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی کیونکہ وہ کسی کام پر بمبئی سے باہر گئے ہوئے تھے۔

"نظامی"

ادارۂ ادبیات اردو کی چند دلچسپ ادبی کتابیں

گریہ و تبسم :- صاحبزادہ میکش کی نظموں اور غزلوں کا بہترین مجموعہ ہے۔ جناب میکش حیدرآباد کے نوجوان شعرا میں ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں۔ وہاں ان کا کلام بہت مقبول ہے۔ عالیجناب ڈاکٹر زورصاحب کا دیباچہ عمومی اور جناب پروفیسر سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ جدید شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ صفحات ۲ ۸ ۱، طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر سنہری نام۔ قیمت عاں

نمود زندگی :- حضرت سید علی منظور حیدرآبادی کے کلام کا مجموعہ ہے جو نہایت سلیقہ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں (۱۰۱) نظمیں (۱۸) غزلیں اور (۵) رباعیات ہیں۔ سید علی منظور صاحب حیدرآباد کے پختہ مشق مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی شاعری کے قدردان دور دور پھیلے ہوئے ہیں اردو کا کوئی مشہور و مستند رسالہ ایسا نہیں جس میں آئے دن ان کی غزلیں اور نظمیں نہ چھپتی ہوں اور پھر یہ نظمیں ایک رسالے سے دوسرے رسالے میں نقل کی جاتی ہیں۔ علی منظور صاحب عہد حاضر کے ان چند کامیاب شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں زندگی کی صحیح ترجمانی کی اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی صفحات (۲۱۲) قیمت عہ

انوار :- حضرت علی اختر حیدرآبادی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام سے آب و تاب کے ساتھ شائع کیا گیا ہے علی اختر صاحب ہندوستان کے ان شاعروں میں سے ہیں جن کا پایہ بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پرگو شاعر ہیں بلکہ صداقت اور شباب پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شعر ان کے دھڑکتے ہوئے دل کی [illegible] از بستہ ہوگا زمانے میں سوائے جوش کے [illegible]

اس مجموعے کی اشاعت سے جدید اردو شاعری میں ایک گرانبہا اضافہ ہوا ہے۔ صفحات ۲۸۰ قیمت عہ

ارمغان جذب :- پنڈت رانگھو نیدر راؤ صاحب جذب (عالم پوری) کی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ اس کے ذریعہ سے سنسکرت اور بھاشا کی شاعری کے اخلاقی اور ناصحانہ پہلو کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ اکثر رباعیاں سنسکرت اور بھاشا کے شعرا کے خیالات کا عکس ہیں اور بعض خود ان کے دل و دماغ کی فکر و کاوش کا نتیجہ ہیں۔

سادگی، سلاست، خیالات سلجھے ہوئے اور طرز بیان اس قدر سادہ اور بے تکلف کہ معمولی سمجھ کا انسان بھی سمجھ سکے۔ ہر رباعی دل کی دھڑکن ہے جو شعر مجسم بن گئی ہے۔ ابتدا میں جناب ماہر القادری صاحب کا ایک بسیط اور معلومات آفریں مقدمہ ہے جس میں انھوں نے سنسکرت اور ہندی شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ صفحات (۱۲۰) قیمت مجلد ۱۲

ماہ لقا :- مولوی عزیز احمد صاحب بی اے آنرز (لندن) پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ مصنف شہزادی درشہوار کی طویل نظموں کا مجموعہ ہے۔ جن میں یورپ کی شاعری کے مفید اثرات جلوہ گر ہیں۔ جدید یا ترقی پسند اردو شاعری کے دلدادہ اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ صفحات (۱۰۰) قیمت عہ

فیض سخن :- میر شمس الدین محمد فیض اردو شاعری کے مسلم الثبوت استاد مانے جاتے تھے۔ وہ ایک صاحب دل بزرگ تھے۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز ہے۔ وہ ایک خاص مکتب شاعری کے بانی بن گئے تھے جو عاشقانہ شاعری میں تصوف کی رنگ آمیزی کرتا ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے حضرت فیض کے کلام کا بہترین انتخاب شائع کیا ہے۔ اس کے ساتھ ان کا ایک بصیرت افروز مقدمہ بھی ہے جس میں فیض کی حیات اور شاعری پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔

اس کتاب میں غزلیات کے علاوہ فیض کی مثنویاں اور دیگر کلام کا بھی انتخاب شامل ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ میر درد اور شاہ سراج اورنگ آبادی کے بعد تصوف وعرفان اور شعر وسخن کا امتزاج جتنا اچھا حضرت فیض کے کلام میں موجود ہے کسی اور اردو شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ تعداد صفحات (۱۴۴) مع تصویر مرقد حضرت فیض قیمت ۱۲؍

بادۂ سخن :- ڈاکٹر احمد حسین مائل کے کلام کا دلچسپ اور معیاری انتخاب ہے۔ ان کے کلام میں سادگی اور صفائی اور بے تکلفی ہے اس انتخاب کے ساتھ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کا معرکتہ الآرا مقدمہ بھی شریک ہے۔ جس میں داغ اور مائل کے معرکوں کا بھی تذکرہ درج ہے۔ صفحات ۱۲۷ قیمت ۱۲؍

متاعِ سخن :- نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز داغ دہلوی کے شاگرد اور حیدرآباد کے ایک پختہ مشق شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں ادبی لطافت اور زبان کی پاکیزگی نمایاں ہوتی ہے۔ اس انتخاب کے ساتھ جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا مقدمہ بھی ہے جس میں ان کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ شاعری اور زبان کا مذاق رکھنے والے اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ تعداد صفحات ۱۲۹ مع تصویر شاعر قیمت ۱۲؍

مرقع سخن جلد اول :- یہ دکن کے پچیس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے جامعہ عثمانیہ کے متعدد اساتذہ طلبہ فارغین اور اہل قلم نے اس تذکرہ کی تالیف میں حصہ لیا ہے۔ یہ تذکرہ پانچ دوروں پر منقسم ہے ہر دور کے شروع میں ایک تمہید ہے جس میں اس کی ادبی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے ہر عہد کے مشاہیر شعرا کے حالات ان کے کلام کا نمونہ اور اس پر تبصرہ ہے ان شاعروں کے تذکرہ کے ساتھ دیگر ہم عصر دکنی اور شمالی ہند کے شعرا کے نام دیئے گئے ہیں تاکہ اردو شاعری کا تاریخی تسلسل معلوم ہوسکے۔ شاعروں کی تصویروں کے علاوہ فرمانروایان دکن اور قدردان ادب وشعر کی بھی تصویریں شریک ہیں۔ (۵۰۰) صفحات ۵۵ تصاویر قیمت (عہ)

مرقع سخن جلد دوم :- پچاس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے اس کی ترتیب بھی اسی ڈھنگ پر ہے جیسی پہلے کی ہے ہر شاعر کے سوانح حیات اور نمونۂ کلام کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ ان دونوں کتابوں سے حیدرآباد کی گزشتہ اور موجودہ شاعری کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ صفحات ۴۳۱ ۴۹ تصاویر۔ ۵ قیمت عہ

تاریخ گولکنڈہ :- حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں علم وفضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ بڑی سائز سوا تین سو سے زیادہ صفحات قیمت (سے)

مقدمۂ تاریخ دکن :- یہ کتاب بھی پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کی ہے اس میں انھوں نے سرزمین دکن کے پچیس حکمران خاندانوں کے آغاز، ارتقاء، عروج اور زوال کے متعلق تعارفی معلومات کے علاوہ حکمرانوں کا پورا شجرۂ نسب اور حکمرانوں کی تاریخیں بھی قلمبند کر دی ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں ایک مبسوط اشاریہ بھی ہے۔ متوسط تقطیع ۲۴۴ صفحات قیمت (عہ)

سپہ سالار جنگ اعظم :- یہ کتاب ادارہ کے شعبۂ تالیف وترجمہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے مولف مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے ایم ایڈ ہیں جن کو سوانح نگاری کا خاص ملکہ ہے اور مفید معلومات کو بڑے دلچسپ اور سادہ پیرایہ میں قلمبند کر دیا ہے۔ یہ کتاب مدرسوں کے طلبہ اور عوام کے مطالعہ کے لئے بہت ضروری ہے۔ چھوٹی تقطیع ۸۴ صفحات قیمت مجلد (۱؍)

عماد الملک :- نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی عالم وفاضل ہونے کے علاوہ مدبر اور مقرر بھی تھے۔ وہ آخر عمر تک

سیاسی سازشوں اور ہنگامہ آرائیوں سے بچے رہے۔ انھوں نے حیدر آباد کو علم کی ایسی دولت سے مالا مال کر دیا جس کی وجہ سے ان کا نام رہتی دنیا تک اس ملک کی تاریخ میں زندہ رہے گا۔ مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے ایم ایڈ نے ان کے سوانح حیات بڑے قرینے سے مرتب کئے ہیں طلبا اور عوام کے لئے اس کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ چھوٹی تقطیع ۴۰ صفحات قیمت ۶؎

میر محمد مومن :- عہد محمد قلی قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ میں پیشوائے سلطنت اور وزیر مطلق تھے۔ دنیوی عروج کے علاوہ ان کی مذہبی سیادت و فضیلت بھی بہت مشہور ہے۔ انھوں نے ہزارہا روپے کے صرفے سے ایک دائرہ بنایا تھا جس میں خاک کربلائے معلیٰ بچھا دی تھی۔ اور یہ دائرہ اب تک "دائرہ میر مومن" کے نام سے حیدر آباد میں مشہور و معروف ہے۔ میر محمد مومن صاحب اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر بھی تھے اور حیدر آباد آنے سے قبل شاہ ایران کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ ان کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالات زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اپنے دلچسپ اور مقبول عام اسلوب میں تحریر فرمائے ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات مع تصاویر قیمت عالی۔

مدراس میں اردو :- اس کتاب میں مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل نے مدراس میں اردو کے نشو و نما اور اس کے ارتقا کی تاریخ پیش کی ہے۔ کتاب کو نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر دور کے شاعروں اور نثر نگاروں کے سوانح حیات اور نمونۂ کلام تفصیل سے درج ہے۔ تاریخ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ صفحات ۲۰۰ قیمت مجلد عہ۔

تاریخ ادب اردو :- اردو زبان اور ادب کی کوئی اچھی تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی اگرچہ اس موضوع پر دو چار کتابیں چھپ چکی ہیں لیکن ان سے نہ عالموں کی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں اور نہ عوام اور طلبہ کی۔ اردو ادب کی کوئی مکمل تاریخ اس سے قبل لکھی بھی نہ جا سکتی تھی کیونکہ گزشتہ ربع صدی میں اردو کتابوں، شاعروں اور ادیبوں سے متعلق ایسی نئی نئی معلومات حاصل ہوتی جا رہی تھیں کہ اس وقت جو بھی کوشش کی جاتی وہ نامکمل رہ جاتی اب اردو کی گزشتہ تاریخ بڑی حد تک بے نقاب ہو چکی ہے اور بہت سی ایسی کڑیاں مل گئی ہیں جن کی وجہ سے ایک مربوط اور مسلسل تاریخ مرتب کر لی جا سکتی ہے۔ اس سہولت کے پیش نظر ادارہ نے یہ تاریخ مرتب کرائی ہے۔ یہ تاریخ صرف طلبہ اور عوام کے لئے لکھی گئی ہے۔ اردو صحافت اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے جملہ اصحاب کے لئے تاریخی معلومات کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگی۔ چھوٹی تقطیع ۱۷۶ صفحات۔ قیمت عہ۔

اردو مثنوی کا ارتقاء :- بڑی عالمانہ و محققانہ کتاب ہے جس کے افادہ اور معیار کے اظہار کے لئے صرف اس کے مصنف پروفیسر عبد القادر صاحب سروری کا نام ہی کافی ہے۔ سروری صاحب کی نظر اردو شاعری کی تاریخ پر اتنی وسیع اور باریک بیں ہے کہ اس خصوص میں عہد حاضر کے کسی محقق و ادیب کو ان کی ہمسری نصیب نہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جو اپنے موضوع اور اہمیت کے لحاظ سے سب سے پہلی کامیاب ترین کوشش ہے۔ یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے جن سے اس کی اہمیت اور تلاش و جستجو کا اندازہ ہو سکے گا۔ بڑی سائز (۱۴۳) صفحات قیمت عہ ۱۲

مغربی تصانیف کے اردو تراجم :- یہ کتاب ادارہ کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف مولوی میر حسن صاحب ایم اے نے ان تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے جو صدیوں سے اردو زبان کو مالا مال کرنے کے لئے دوسری زبانوں کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے سلسلے میں کی جاتی رہی ہیں۔ یہ تذکرہ نہایت ہی محنت اور تحقیق سے لکھا گیا ہے اس لئے مستند بھی ہے اور مفید بھی۔ نقد ادب اور تاریخی طریقۂ تنقید کے علاوہ ماخذوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں ایسی کتابوں کی خاص

اہمیت ہوتی ہے۔ چھوٹی تقطیع ۲۸۰ صفحات قیمت مجلد عہ

آریائی زبانیں:۔ یہ کتاب اردو کی ابتدائی تاریخ اور اس کے ماخذوں کا مستند تذکرہ ہے جس کو ادارہ کے لئے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور صاحب ایم اے ڈی لٹ پروفیسر سنسکرت و لسانیات نے خاص طور پر مرتب کیا ہے۔ صفحات ۱۰۴ قیمت عہ۔

شعرائے عثمانیہ:۔ سلسلہ مرقع سخن کی چوتھی جلد ہے جس میں چھبیس شعرائے جامعہ عثمانیہ کے کلام کا پاکیزہ انتخاب درج ہے۔ یہ مختلف نظموں اور غزلوں کا گلدستہ رنگ و بو ہے۔ ابتدا میں ہر شاعر کے کلام پر ایک مختصر مگر جامع تنقید کی گئی ہے۔ تقریباً بیس سال سے یہ جواہر پارے بکھرے پڑے تھے جن کو مولوی سید معین الدین صاحب قریشی ایم اے اور مولوی عبدالقیوم خاں صاحب باقی ایم اے (ریسرچ اسکالر) نے نہایت سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ کہیں خیالات کا لطف ہے تو کہیں زبان کا کہیں جذبات کی تازگی اور بلندی ہے تو کہیں اسلوب بیان کی جدت۔ کلام کا انتخاب اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ ہر شاعر کی عظمت اور اس کا معیار پورے طور پر سامنے آجاتا ہے۔ جدید اردو شاعری کے رجحانات کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے ایک کمیاب اور کارآمد تحفہ ہے۔ رائل سائز (۲۳۱) صفحات باتصویر قیمت مجلد عال۔

محمد حسین آزاد:۔ اردو کے اس بڑے شاعر اور انشا پرداز کے مکمل حالات زندگی اب تک شائع نہیں ہوئے تھے۔ اس کتاب کو محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے لکچرار اردو کلیہ اناث جامعہ عثمانیہ نے نہایت شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ قلمبند کیا ہے یہ کتاب سات ابواب میں تقسیم کی گئی ہے جن میں آزاد کی زندگی، شاعری اور تصانیف سے متعلق مکمل معلومات شامل ہیں۔ مع تصویر آزاد (۲۰۰) صفحات قیمت عال۔

گارساں دتاسی:۔ اردو کے پہلے پروفیسر فرانس کے مشہور مستشرق اور ہندوستانیوں کے سچے بہی خواہ کے علمی و ادبی کارناموں، طریقہ تعلیم، تلامذہ، کتب خانہ اردو کی حمایت اور تبلیغ کی کوششوں اور اس کے عہد کی یورپ کی درس گاہوں، اردو کے پروفیسروں اور بہی خواہوں کا ایک اجمالی تذکرہ ہے۔ اس کتاب کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے نہایت تحقیق اور جانفشانی سے تالیف کیا ہے۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب صفحات (۱۲۸) قیمت عہ۔

نذر ولی:۔ اس میں دکن کی چار گریجویٹ خواتین انشا پرداز محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ، محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ، محترمہ نعیم النساء بیگم صاحبہ اور محترمہ نجم النساء بیگم صاحبہ کے دلچسپ مضامین ہیں جو بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کے حالات زندگی اور خصوصیات کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں ولی کی معلومات، ان کے تخیل، ان کے فن شعر اور ذوق عرفان کے علاوہ ان کے اسلوب زبان اور انتخاب الفاظ کے متعلق بھی نہایت مفید اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ ولی کے متعلق یہ پہلی مستقل اور جامع کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ تشنگان ادب کی تسلی کا باعث ہوگا۔ صفحات ۲۴۰ طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر دو جگہ سنہری نام قیمت مجلد عال۔

محبت کی چھاؤں:۔ مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ہر فسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کارفرما ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔

چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد عہ

ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن سے طلب فرمائیے۔

ادارۂ ادبیات اُردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے	پائی
من کی بیتا	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر) ...	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب	۱۲۰	۱	۱۲	۰
یورپ جنگ سے پہلے ...	۲۱۸	۲	۸	۰
تاریخ سیاسیات	۲۷۲	۳	۸	۰
سرسالار جنگ	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف اردو کے تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی ...	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰	۰
سرگزشت حاتم	۱۲۸	۲	۰	۰
عماد الملک	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب ...	۵۶	۰	۵	۰
" دوسری کتاب ...	۵۶	۰	۵	۰
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر	۶۲	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰
ہندستانی تمدن	۳۳۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی	۸۰	۰	۰	۰
مہ لقا	۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۴	۰
رسائل طبیہ	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو	۷۶		۸	۰
رفیق اردو داں	۲۲۴	۱	۱۲	۰
اشوک	۵۶		۸	۰
حیدرآباد	۸۸	۰	۱۰	۰
شاد اقبال	۱۷۶	۲	۸	۰
آریائی زبانیں	۱۰۴		۰	۰
[illegible]	۳۱	۰	۴	۰
تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰	۰
عرب اور عربستان	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے	پائی
سحر کا جادو	۴۸	۰	۴	۰
طبیعیاتی کائنات	۶۸	۰	۸	۰
متاع سخن	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن ...	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو ...	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ	۱۱۲	۲	۰	۰
نذر دکن	۱۵۴	۱	۴	۰
روح غالب	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصم	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء ...	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان	۳۲	۰	۳	۰
خطابات	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر ...	۸۰	۰	۱۲	۰
انوار	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش نانی (۴) تصاویر ..	۸۰	۰	۱۰	۰
گارساں دتاسی	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ	۲۴	۰	۴	۰
بلانمی	۵۶	۰	۱۰	۰
ادارہ سنہ ۱۹۴۲ء میں ...	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
افضل الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خان	۳۴	۰	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

سـ ۱۹۵۶

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

جلد ۹ — بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۶ء — شمارہ ۱

فہرست مضامین

اردو میں سائنسی ادب

شمس الامراء اور شاہان اودھ کے بعد اردو کو علمی موضوعات سے روشناس کرانے کی باضابطہ اور منظم کوشش دہلی کالج میں کی گئی۔ اس کا دائرۂ عمل ان دونوں سے زیادہ وسیع اور منظم تھا۔ خوش قسمتی سے اس کو ایسے ذی علم اصحاب مل گئے تھے جنھوں نے اردو کے تہی دامن کو مغربی علوم کے جواہر پاروں سے مالامال کر دیا۔ چونکہ اس کالج کا ذریعۂ تعلیم اردو تھا اس لئے نصابی ضروریات کے تحت سائنس اور دیگر مغربی علوم کی کئی کتابوں کے ترجمے کئے گئے اور اس کے فیض یافتوں نے بھی اس قسم کی کتابیں تالیف کیں۔ مختلف علوم اور سائنس کی اشاعت کے لئے ۱۸۴۳ء میں دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جس نے پہلی دفعہ ترجمے کے ایسے اصول مرتب کئے جو ترجمے کی مشکلات کو دور کرنے میں بڑی حد تک مدد و معاون ثابت ہوئے۔

اگرچہ یہ کالج ۱۷۹۲ء میں قائم ہوا لیکن اس کے ابتدائی (۳۰) سال کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ البتہ یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس عرصہ تک اس میں انگریزی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔ مثل دوسرے مدارس کے عربی فارسی کی مروجہ تعلیم ہوتی ہوگی۔ مجلس تعلیم عامہ کی سفارش پر ۱۸۲۵ء میں اس کالج کے لئے پانسو روپے ماہانہ مقرر کئے گئے اور باضابطہ تعلیم کا انتظام عمل میں آیا۔

۱۸۲۸ء میں چارلس مٹکاف کی سفارش پر اس درس گاہ میں ایک انگریزی جماعت کھولی گئی۔ نواب اعتمادالدولہ سید فضل علی خاں بہادر وزیر بادشاہ اودھ نے ۱۸۲۹ء میں ایک لاکھ ستر ہزار روپے تعلیمی اغراض کے لئے وقف کر دیے۔

اس کالج کی سب سے اہم خصوصیت اور اس کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ یہاں کا ذریعۂ تعلیم اردو تھا اور سوائے انگریزی کے دوسرے تمام مضامین مثلاً ریاضی، فلسفہ، ہیئت

(دہلی کالج کی خدمات)

اور سائنس کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ مغربی علوم کو اردو میں پڑھانے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ ان علوم پر اردو میں کتابیں نہیں لکھی گئی تھیں۔ اردو کے حامیوں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ۱۸۴۰ء میں ایجوکیشنل کمیٹی قائم کی۔ اس سے قبل اسکول بک سوسائٹی کی طرف سے ہزاروں نصابی کتابیں تیار ہو کر شایع ہوئیں لیکن یہ سب ابتدائی قسم کی کتابیں تھیں۔ ۱۸۴۲ء میں ایجوکیشنل کمیٹی کے تحت ایک ذیلی کمیٹی کا قیام عمل میں آیا جس میں ایسے اصحاب کا انتخاب عمل میں آیا جو انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ کرنے کے اہل تھے۔ کمیٹی نے یہ طے کیا کہ درسی کتابوں میں یک جہتی اور ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے کتابیں پہلے انگریزی میں لکھوائی جائیں اور پھر ان کا اردو میں ترجمہ کرایا جائے۔

دہلی ورنیکلر سوسائٹی کے قیام کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ جدید ترین کتابوں کی تالیف اور ترجمہ کے ذریعہ سے اردو زبان کو ترقی دی جائے۔ اس مقصد کو آگے بڑھانے میں ہندوستانی اور انگریز برابر کے شریک تھے۔ اس سوسائٹی کے اخراجات کی پابجائی کے لئے چندے اور عطیے لئے گئے۔ شاہ اودھ، ان کے صاحبزادے اور ان کے وزراء و امراء نے بھی عطیے دیے۔ اسی طرح حیدرآباد دکن سے نواب سراج الملک بہادر نے بھی رقمی عطیوں سے اس سوسائٹی کی مالی امداد کی۔ اس سوسائٹی کے سکریٹری مسٹر بتروس پرنسپل دہلی کالج تھے۔

سوسائٹی نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے جو قواعد وضع کئے تھے ان کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

(۱) سائنس کا کوئی ایسا لفظ جس کا مترادف اردو میں نہ ملے تو ایسے لفظ کو اردو میں جذب کر لینے میں کوئی قباحت نہیں۔ مثلاً سوڈیم۔ کلورین وغیرہ۔

(۲) اگر سائنس کا کوئی لفظ ایسا ہے جس کا مترادف اردو میں موجود ہے تو اردو لفظ ہی استعمال کیا جائے جیسے

آئرن کے لئے لوہا، سلفر کے لئے گندھک وغیرہ۔

(۳) یہ ضروری نہیں کہ جو انگریزی الفاظ اردو میں لئے جائیں ان کو بجنسہ لکھا جائے بلکہ انہیں اردو میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے مثلاً جیٹس آف دی پیس کو اردو میں جیٹس پیس کہہ سکتے ہیں۔

(۴) سائنس کی کتابوں کا ترجمہ چونکہ انگریزی ہی سے کیا جائے گا اس لئے انگریزی الفاظ کا اردو میں استعمال ناگزیر ہے۔ بعض الفاظ ایسے ہیں کہ جن کے مترادف کسی نہ کسی صورت میں اردو میں پائے جاتے ہیں تاہم انگریزی الفاظ اردو میں منتقل کر لئے جائیں تو کوئی ہرج نہیں مثلاً (Genus, species, order) وغیرہ

(۵) یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ جہاں تک آسانی سے ممکن ہو، انگریزی الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا جائے۔ جو شخص کسی سائنس کی کتاب کا ترجمہ کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ اس سائنس پر جو کتابیں اردو میں اس سے قبل لکھی جا چکی ہیں انھیں پیش نظر رکھے اور وہی اردو الفاظ اور اصطلاحیں استعمال کرے جو ان کتابوں میں استعمال ہوئی ہیں۔

(۶) اگر انگریزی جملے میں کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ ہو جس سے اہل ہند ناواقف ہوں تو مترجم کو چاہیے کہ حاشیہ پر یا مناسب ہو تو متن میں مختصر طور پر اس کی تشریح کر دے۔

(۷) ترجمہ لفظی نہ ہو بلکہ اردو میں مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۸) کیمسٹری کی اصطلاحات کو بجنسہ اردو میں لے لیا جائے۔ البتہ کیمیائی عناصر جن کے نام اردو میں موجود ہیں تو انھیں برقرار رکھا جائے لیکن مرکبات کے نام انگریزی ہی میں رہیں جیسے ہائیڈرو سلفرک۔ سلفرک ایسڈ وغیرہ۔

دہلی کالج نے اردو میں سائنس کی جو کتابیں شائع کیں ان کی اشاعت جب مسٹر بتروس پرنسپل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے یہ کام چھوٹے پیمانہ پر شروع کر دیا تھا۔ جب سوسائٹی قائم ہوئی تو اس کا کام بھی کالج والے ہی کرتے تھے۔ ورنیکلر سوسائٹی، ٹرانسلیشن سوسائٹی، اردو سوسائٹی۔ لائبریری آف یوسفل نالج وغیرہ سب اسی کے نام ہیں۔ مسٹر بتروس کے وظیفہ پر ڈاکٹر اسپرنگر پرنسپل ہوئے جو ان کے صحیح معنوں میں جانشین تھے۔

اس انجمن کے قیام سے قبل دہلی کالج میں ترجمہ کا کام شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس کالج کے تین طالب علم (جن میں ماسٹر رامچندر پیش پیش تھے) اوقات درس کے بعد فلسفہ اور ریاضی وغیرہ کی کتابوں کا ایک ایک صفحہ اردو میں ترجمہ کرکے مسٹر بتروس کو دکھاتے اور وہ اس ترجمے کی اصلاح کرتے تھے۔ اس طرح جب ترجمہ مکمل ہو جاتا تو طباعت کے بعد نیچے کی جماعتوں کے نصاب میں داخل کر دیا جاتا۔ دہلی کالج میں تراجم کی ابتدا ۱۸۴۱ء میں ہوئی جبکہ مسٹر بتروس کا تقرر کالج کی پرنسپلی پر ہوا۔ ۱۸۴۲ء تا ۱۸۵۲ء کے نصاب کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ سائنس کی تعلیم کس درجے تک تھی۔ ۱۸۵۰ء میں تو سائنس کی جماعت الگ قائم ہو گئی تھی اور جماعت اول تا ششم کی اردو میں سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی۔

غرض دلی کالج ہی ایک ایسی درسگاہ تھی جہاں مغربی علوم مثلاً ہیئت، ریاضیات، فلسفہ وغیرہ کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی اور نتائج ہر سال اچھے رہتے تھے۔ چنانچہ مسٹر کارگل پرنسپل دلی کالج نے اپنی رپورٹ بابت ۱۸۵۲ء میں یہ لکھا ہے کہ

"مشرقی شعبے کا طالب علم اپنے مغربی شعبے والے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھا ہوا ہے"

اس رپورٹ پر لفٹنٹ گورنر بہادر نے اس طرح اظہار خوشنودی کیا ہے:۔

"طلبہ (شعبۂ مشرقی) کی سائنس کی ترقی کے متعلق

جو یقین دلایا گیا ہے اس سے بیحد مسرت ہوگی۔"

دلی کالج اور ورنیکلر سوسائٹی نے جو ترجمے اور تالیفات شایع کیں ان کی فہرست درج ذیل کی جاتی ہے:-

(۱) اصول علم مثلث و تراش ہائے مخروطی و علم ہندسہ بالجبر۔ رامچندر سنہ ۱۸۴۳ء۔
(۲) رسالہ مساحت مستعمل و علم مثلث۔ پنڈت اجودھیا پرشاد سنہ ۱۸۴۴ء۔
(۳) رسالہ در بیپمایش انگریزی بوسیلہ تھیوڈولائٹ کے۔ ہردیو سنگہ سنہ ۱۸۴۷ء۔
(۴) اصول قواعد مابعات۔ پنڈت اجودھیا پرشاد سنہ ۱۸۵۰ء
(۵) جبر و مقابلہ۔ مولوی کریم بخش۔ سنہ ۱۸۴۴ء
(۶) ہندسہ بالجبر۔ رام چندر۔ سنہ ۱۸۵۰ء
(۷) رسالہ مقناطیس (لائبریری آف یوزفل نالج کے رسالے کا ترجمہ) سید کمال الدین حیدر۔ سنہ ۱۸۵۲ء
(۸) تحریر اقلیدس (مقالہ ۱ تا ۶ و ۱۱ تا ۱۲)
(۹) الجبرا (ترجمہ برجز)
(۱۰) عملی علم ہندسہ
(۱۱) اصول علم ہیئت (ترجمہ علم ہیئت ہرشل)
(۱۲) رسالہ کیمسٹری (ترجمہ پارکر)
(۱۳) استعمال آلات ریاضی
(۱۴) تحلیلی علم ہندسہ
(۱۵) میکانیات (لارڈنر)
(۱۶) مساحت (ترجمہ تھیوڈولک)
(۱۷) طبیعیات (ترجمہ ارناٹ) سنہ ۱۸۴۷ء
(۱۸) رسالہ طب (انگریزی سے) پنڈت رام کشن دہلوی سنہ ۱۸۴۸ء
(۱۹) رسالہ جراحی۔
(۲۰) حرکیات و سکونیات
(۲۱) علم المناظر (ترجمہ فلپ)

(۲۲) حرارت (لائبریری آف یوزفل نالج کے رسالہ کا ترجمہ)
(۲۳) ہائیڈرالکس (" " " ")
(۲۴) Double refraction and Polarization of Light
(۲۵) رسالہ علم برق (ترجمہ راجٹ)
(۲۶) گالوانزم (" ")
(۲۷) رسالہ اصول حساب (ترجمہ ڈی مورگن) بابو ہردیو سنگہ

کالج کے اساتذہ میں مولوی مملوک علی۔ ماسٹر رامچندر، پنڈت اجودھیا پرشاد۔ پنڈت رام کشن دہلوی۔ بابو ہردیو سنگہ نے ریاضی۔ سائنس اور طب پر مختلف کتابیں لکھیں۔ ماسٹر رامچندر نے ایک کتاب شایع کی جس میں تفرقی احصاء (Differential Calculus) کا ایک نیا طریقہ بیان کیا۔ اس پر پروفیسر کلانڈ (اڈنبرا یونیورسٹی) اور پروفیسر فشر (سیلین اینڈ ریوس) نے بہت اچھی رائے دی۔ ماسٹر رامچندر نے جو طریقے ایجاد کئے یورپ اور ہندوستان کے کالجوں میں رائج ہو گئے۔ ڈاکٹر سید سجاد صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے اس کتاب کا ایک نسخہ دہلی سے لاکر کتب خانۂ جامعہ عثمانیہ میں داخل کیا تھا مگر ہم کو اس کا پتہ نہ چلا۔ اس کتاب کے دیباچہ میں ماسٹر رامچندر نے لکھا تھا کہ "اس کتاب کی کاپیاں انگریزی زبان میں مطبع میں بیٹھ کر میں خود لکھتا تھا" یہ کتاب انگریزی زبان میں لیتھو میں چھپی تھی۔ ان کی ایک دوسری کتاب کلیات و جزئیات (Maxima & Minima) کلکتہ میں چھپی۔ اس کتاب کے کئی نسخے انگلستان بھیجے گئے اور پروفیسر مارگن پروفیسر ریاضیات لندن یونیورسٹی نے اس کتاب کی بہت قدر کی۔ پروفیسر موصوف نے ان کے چیرمن کرنل سائیکس کو ایک خط لکھا جس میں ماسٹر رامچندر کی اس ایجاد کی بہت تعریف کی تھی اور یہاں تک لکھا تھا کہ اس کتاب کے انتخابات انگلستان کی ابتدائی تعلیم کے نصاب میں شریک کئے جائیں۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز (ایسٹ انڈیا کمپنی) کے معزز ممبروں نے ایک خلعت پنج پارچہ اور دو ہزار روپے نقد بطور انعام ماسٹر رامچندر کے لئے

لہ دیکھو مرحوم دہلی کالج

منظور رکھتے اور یہ خلعت وانعام ۱۸۵۹ء کے ایک جلسہ میں ماسٹر رامچندر کو ان کی علمی و تعلیمی خدمات کے صلے میں عطا کیا گیا

کالج کے قدیم طلبہ میں ماسٹر رامچندر نے جو بعد میں دہلی کالج کے مدرس ہو گئے تھے سائنس کی کئی کتابیں لکھیں۔ شمس العلماء ذکاء اللہ نے ریاضی کی تمام شاخوں پر ادنیٰ سے اعلیٰ درجے تک نیز طبیعیات وغیرہ پر بے شمار کتابیں لکھی ہیں جو بجائے خود ایک چھوٹا سا کتب خانہ بن سکتی ہیں۔ ہم ان کی کتابوں کا آئندہ باب میں تفصیل سے ذکر کریں گے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی وجہ سے دہلی تباہ ہو گئی۔ کالج (۷) سال تک بند رہا اور ۱۸۷۷ء میں حکومت ہند نے اس کو لاہور کالج میں مدغم کر دیا اور جو مفید علمی و ادبی کام ہو رہا تھا اس کا خاتمہ ہو گیا۔ مولوی ڈاکٹر عبدالحق صاحب اپنی کتاب "مرحوم دہلی کالج" میں اس طرح اپنے دلی تاثرات کا اظہار کرتے ہیں:۔

"اس نے تعلیم کا وہ صحیح طریقہ اختیار کیا تھا جس سے بہتر کوئی اور ہمارے ملک کے حق میں ہو نہیں سکتا۔ اگرچہ اس کے مٹتے ہی یہ طریقہ بھی مٹ گیا لیکن اتنی مدت کے تجربے کے بعد ہماری یونیورسٹیاں رفتہ رفتہ پھر اسی طرف عود کر رہی ہیں اور آخر وہی ڈھنگ اختیار کرنا پڑے گا۔ ایسی حالت میں اسے مرحوم تو کیا شہید بھی کہیں تو بجا ہے۔ کیونکہ وہ بلا وجہ اور بغیر کسی الزام کے ملکی اور سیاسی مصلحتوں کے بھینٹ چڑھا دیا گیا۔"

باوجود کوشش اور تلاش کے ہم کو دہلی کالج کی مطبوعات میں سے صرف (۹) کتابوں کا پتہ چلا۔ اب ان کتابوں کے متعلق تفصیلی معلومات درج کی جاتی ہیں۔

اصول علم مثلث و تراشہائے مخروطی و علم ہندسہ بالجبر

تقطیع ۱۰½/۷، صفحات (۲۱۷) سنہ طباعت ۱۸۴۴ء مترجم رام چندر سرورق پر انگریزی اور اردو دونوں میں کتاب اور مترجم کے نام درج ہیں۔ مطبع کے نام کا کہیں حوالہ نہیں۔ سرورق کی اردو عبارت یہ ہے:۔

"اصول

علم مثلث و تراشہائے مخروطی و علم ہندسہ بالجبر کے ترجمہ رامچندر اسکالر اعلیٰ دہلی کالج کے نے تصنیفات ہٹن صاحب اور بوشارلٹ صاحب اور سمسن صاحب کے سے کئے۔"

صفحہ (۲) اور (۳) پر "نقشہ فہرست" کی سرخی کے تحت کتاب کو حسب ذیل عنوانات پر تقسیم کیا گیا ہے:۔

(۱) علم مثلث مستقیم الاضلاع بالہندسہ (اس میں دو باب ہیں)
(۲) علم مثلث مستقیم الاضلاع بالجبر (اس کے نو ابواب ہیں)
(۳) علم مثلث کروی (جو چار ابواب پر مشتمل ہے)
(۴) تراشیں مخروطی (" " ")
(۵) علم ہندسہ بالجبر (اس میں آٹھ ابواب ہیں)
(۶) تتمہ

مترجم کے دیباچہ کا اقتباس درج ذیل ہے:۔

"...... باعث تالیف کرنے اس رسالہ کا...... بیان کرتا ہوں...... کہ صاحب عالی مراتب والا مناقب جناب بوٹروس صاحب بہادر پرنسپل مدرسہ دہلی کو منظور نظر یہ ہے کہ جمیع کتب علمیہ انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ ہو کر طلبہ عربی اور فارسی خواں کو پڑھائی جاویں اور طلبہ مدرسہ فارسی کا بھی میل طبیعت طرف تحصیل علم ریاضی کے بسبب ان کی سعی بلیغ کے نیچ سیکھنے رسالہ جبر و مقابلہ کے جو اسی خاکسار نے پہلے تالیف کیا ہے۔ دریافت ہوا اس سبب سے اس ہیچمدان نے قصد اس رسالہ کی تالیف کا کیا اور ہٹن صاحب اور سمسن صاحب اور بوشارلٹ صاحب کے مصنفات سے استعانت چاہی۔ باعث اس کا یہ ہے کہ بہت سی کتابیں علم ہیئت اور علم ادات کی زبان انگریزی میں ایسی ہیں کہ بغیر جانے علم مثلث اور فروع ریاضی کی سمجھنا ان کا متعذر ہوتا ہے۔ پس اول بیان کرنا ان مطالب ضروری کا جو کتب مذکورہ الصدر میں سے اخذ کی گئی ہیں لازم پڑا...... امید ناظرین اس کتاب کے سے یہ

ہے کہ اگر بروقت مطالعہ کے اس کی رطب و یابس پر مطلع ہوں تو اس خاکسار کی کم استعدادی پر نظر کر کے اغماض نظر اس سے واجب جانیں۔ بیت

بپوشش گر بہ خطائی رسی و طعنہ مزن
کہ ہیچ نفس بشر خالی از خطا نہ بود

یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت اہم اور معیار کے اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ اس ضخیم کتاب میں مترجم نے بڑی محنت اور کاوش سے پورا مواد یکجا کر دیا ہے۔ ہر مسئلہ کو نہایت وضاحت کے ساتھ سمجھایا گیا ہے۔ ہندسی اشکال اور مثالوں سے اس کی تشریح کی گئی ہے۔

"علم مثلث مستقیم الاضلاع بالہندسہ" کے تحت جدول مثلثی بنانے اور مثلثوں کے سوالات حل کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ "علم مثلث مستقیم الاضلاع بالجبر" میں جیب مستوی و جیب التمام کے جدول بنانے کی ترکیب، مثلث قائم الزاویہ، حادۃ الزاویہ اور منفرجہ الزاویہ کے سوالات حل کرنے کے طریقے اور پیمایش مثلثی وغیرہ کے سوالات مع امثلہ و اشکال درج کیے گئے ہیں۔ اس حصے کی ایک عبارت یہ ہے جس میں طالب علم کو صورتوں کے یاد کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

"اگر طالب علم خوب مہارت پیدا کیا چاہوے علم مثلث میں اور خوب واقف ہوا چاہوے فوائد صورتوں مذکورۂ بالا کے سے اور بوسیلہ ان صورتوں کے اور صورتیں پیدا کرنے کی قوت حاصل کیا چاہوے تو لازم ہے اسے کہ بہت مشق کرے اور ہر قیمت جس لا اور جم لا اور مکس لا مفصلہ ذیل کو خوب سمجھے اور بغیر اعانت کسی کے ثابت کرے"۔

اس کتاب میں جو سوالات درج ہیں ان میں سے ایک کی عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے:۔

"معلوم ہیں ہمیں تینوں ضلع ایک مثلث کے۔ چاہتے ہیں ہم دریافت کرنا نصف قطر اس دائرہ کا جو بنایا جاوے بیچ اس مثلث کے"۔

"علم مثلث کروی" کے تحت قائم الزاویہ مثلثوں اور غیر قائم الزاویہ کروی مثلثوں کے سوالات حل کرنے کے طریقے بتشریح بیان کیے گئے ہیں۔

"تراشہائے مخروطی" کے تحت تین قسم کے خطوط کا حال درج ہے جن کو قریب البیضوی، بیضوی اور بعید البیضوی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور ہر خط کے متعلق ضروری معلومات اور اشکال دی گئی ہیں۔

"علم ہندسہ بالجبر" میں علامات جبریہ کے ذریعہ سے مقادیر ہندسی معلوم کرنے کی ترکیب، مساوات خط مستقیم و تراشہائے مخروطی وغیرہ کا تفصیلی بیان ہے۔

"تتمہ" کی سرخی کے تحت قوس اور کرہ و مخروط کی مساوات کا حال درج ہے۔

اس کتاب کا اسلوب بیان تقریباً وہی ہے جو اس سے پہلے کی کتابوں کا ہے۔ عربی الفاظ کا جگہ جگہ استعمال ہوا ہے مثلاً "علی الاستقامت۔ فی النسبت۔ متقاطع علی القوائم مابین اور منطبق" وغیرہ مانا کو ماتا۔ ہاتھ کو ہات۔ لوکارثم کو لوکارسم لکھا ہے۔

صفحہ (۲۶) کے بعد کتاب کے آخری صفحات (۳۱۱ تا ۳۱۷) غلطی سے لگ گئے ہیں۔ یہ کتاب کتبخانہ جامعہ عثمانیہ میں نمبر (۵۱۰ م) پر رکھی ہوئی ہے۔

(باقی آئندہ)

خواجہ حمید الدین

صحیفہ مشین پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شایع ہوا۔

ترقی پسند فن کار سے

اے ہمصفیر! گو تری پرواز ہے بلند — لیکن بتا، کسی کو ترقی ہے ناپسند؟
میری نظر سے تیرے مقاصد نہاں نہیں — تیرے خلوصِ عزم سے میں بدگماں نہیں
ہے تلخئ حیات سے معمور تیرا جام — تیری نظر میں قہر ہے بے ربطئ نظام
تیری نوا میں جذب ہے آوازِ زندگی — تیرے تفکرات ہیں دم سازِ زندگی
دل تیرا کائنات کا آئینہ دار ہے — تیری صدا شکستہ دلوں کی پکار ہے
فطرت کو تو نے طرزِ تکلم سکھا دیا — احساسِ زندگی کو ادب میں بسا دیا

لیکن، سمجھ رہا ہے یہ سارا زمانہ کیا — ؟
"کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا" — ؟

سُن! میں بتاؤں اصل حقیقت عتاب کی — اور اہلِ فن کی برہمی و اجتناب کی
وابستہ ہے جو شیشہ گرانِ ہنر سے تو — ہے دُور دُور اس لئے اہلِ نظر سے تو
رشحاتِ فکرِ خام کا تو پردہ دار ہے — مہمل نگارشات کا خواستگار ہے
چھوٹے نگوں کی عام ہوئیں ریزہ کاریاں — نااہلیت بھی زعمِ ہنر میں ہے سرگراں
سطحِ ادب تباہی کی آماجگاہ ہے — اور شرمسارِ عظمتِ قلب و نگاہ ہے
تنگ آ گئی ہے فکرِ فرومایہ سے نظر — ہے مرگِ ذوق، یہ ترا اندازِ درگزر!
فہرس میں کرگسوں کے جو شاہیں کا نام ہو — چرچا نہ کیوں ضمیر فروشی کا عام ہو
محسور کر رہا ہے تجھے تیرا حسنِ ظن — تو دل شکن نہیں، ترا عنوان ہے دل شکن!
مضمحل ضمیر ترا قید و بند میں — ناحق الجھ رہا ہے پسند ناپسند میں
اس طرح اپنے خونِ جگر کو تلف نہ کر — فطری صلاحیت کے تحفظ پہ کر نظر

۸

"جس کی بہار تو ہو، یہ ایسا چمن نہیں
قابل تری نمود کے یہ انجمن نہیں"

ہر دور اپنے دور میں خود مجتہد رہا
مقصد حیاتِ نو کا سدا متحدد رہا

فرق و تمیز رنگ و اثر ناگزیر ہے
ہر ذوقِ تندرست، ترقی پذیر ہے

تابندہ یہ جو کاخِ علوم و فنون ہے
دیکھ، اس کے بند بند میں کس کس کا خون ہے!

تیرے بیان، تیرے قلم کی ہے جو زباں
وہ خود ہے انقلابِ مسلسل کی داستاں

نقشِ دوام گرمیٔ خونِ جگر سے ہے
یہ ارتقائے فن، تب و تابِ ہنر سے ہے

کسبِ کمال، سلسلۂ ناتمام ہے
معمارِیٔ سلف کا تو قائم مقام ہے

اسرارِ کائنات کا فن کار ہے امیں
اخلاصِ عالمی سے ہے پیدا دمِ یقیں

شاہیں کو احتیاجِ نشیمن، نہ انجمن
ہے شاہ باز کے لئے سارا جہاں چمن

تو اپنی جاں فشانی کا عنواں بدل کے دیکھ!
جوہر پھر اپنی ندرتِ فکر و عمل کے دیکھ!

بن کر سحابِ فیض، زمانے پہ چھا جا
انسانیت نواز، ترانے سنائے جا

افکارِ نو میں وحدتِ نوعی تلاش کر
اور سرمدی حیات کے اسرار فاش کر

تیرا پیامِ فکر و نظر عالمی رہے
سررشتۂ فروغِ عمل باہمی رہے

پیدا جہانِ تازہ ہو تیری نگاہ سے
روشن ہو چشمِ دہر تری جلوہ گاہ سے

وابستہ تیرے دم سے ہے رنگینیٔ حیات
تیرے لہو سے گرم و رواں روحِ کائنات

احسان کر، رعونتِ احساں کو بھول جا
سوزِ یقیں میں شہرتِ نازاں کو بھول جا

ذوقِ سفر پہ عشرتِ منزل حرام ہے!
تیرا تو ہر مقام سے آگے مقام ہے!

بشیر النساء بیگم بشیر

"دھبہ"

افراتفری میں الٹے سیدھے پاؤں دوڑی تو چوکھٹ سے ٹکرا گئی۔ گرتے پڑتے کمرے میں داخل ہو دروازہ بند کرلیا۔ سینما جانے کے جنون میں ایک ایک کرکے سب کپڑے اتار ڈالے۔ ننگ کا احساس ہوا تو بازوؤں والی کرسی میں جلدی سے دبک کر بیٹھ گئی، کرسی میں بیٹھی بیٹھی وہ جوڑا جو اس نے پہن کر جانے کے لئے سوچا تھا "وارڈروب" میں دیکھنے لگی۔

سہیلیاں باہر کھڑی تھیں فضا میں ایک رنگین سا قہقہہ گردش میں لیتا مختلف سروں میں اس کا پیچھا کرتا رہا۔ الفاظ ایک ہی مفہوم لئے بیک وقت اس طرح ادا ہو رہے تھے۔

"عجیب بھولی بھالی ہے اپنی وسیم...... اس کو تو بات بھی بنا نہیں آتی۔ یہ بھی تو نہیں سمجھتی اس کا اثر دوسروں پر کیا ہوگا...... اس کو تو کالج کی ہوا نے چھوا تک بھی نہیں!"

سہیلیاں بے وقت اور بغیر اطلاع کے آگئی تھیں۔ ان کو کسی نے بیٹھے بٹھلائے ایک چپ سی دے دی تھی کہ وہ "گڈ ارتھ" فلم ضرور دیکھیں۔[2]

وہ چھوٹی چھوٹی گول سڈول چھاتیوں کے ہوتے ہوئے پر سٹیپر[1] پہننے کے بہت خلاف تھی پھر بھی اس نے زرد، تربوزی اور نیم گلابی رنگ کی نئی سٹیپر بطور فیشن کے خرید کر رکھی تھیں، بازوؤں والی کرسی میں دبکی اور سکڑی بیٹھی بیٹھی کو نیم گلابی رنگ کی سٹیپر کچھ بھلی بھلی معلوم دی، للچا سا پیدا ہوا اس نے سوچا سب سے پہلے سٹیپر ہی کیوں نہ پہن لے، سہیلیوں کا خیال اور جلدی بھی تھی، اور پھر تھیٹر میں وقت سے کچھ پہلے اندر جاکر ستانے اور لطف اندوز ہونے کا خیال بھی گزر رہا تھا۔ لڑکیاں جب کبھی سینما دیکھنے جاتیں تو ٹکٹ بھی اسے ہی خریدنے پڑتے تھے، وسیم تھی تو بیس اکیس سال کی مگر شکل و صورت سے ابھی چودہ پندرہ کی نظر آتی تھی، بھولی بھالی سمجھ کر سب اسے آگے دھکیل دیتے تھے۔ سہیلیوں کو تجربہ ہو گیا تھا کہ اسے ٹکٹ اور راستہ اکیلے مل جاتا ہے...... اسے خود بھی بھیڑ میں گھس گھیرا اور آگے پیچھے ہونے میں کچھ لطف محسوس ہوتا تھا۔ آج تو جلدی میں اسے اپنی ذمہ داری کا احساس بہت ہی ستا رہا تھا۔ خیالات میں کھوئی ہوئی، موتیا شلوار ڈھونڈنے میں مصروف تھی، اس روا رواوی میں جوڑا بدلنے کا مقصد بھی محض موتیا شلوار ہی تھا۔ تنہائی میں ساتھ والیوں کے انتظار کے خیال اور ان کی کھسر پھسر سے تلملا رہی تھی تو کسی نامعلوم جذبے کے زیر اثر ہاتھ بڑھا دیا اور نیم گلابی سٹیپر کھینچ کر پھر بازوؤں والی کرسی میں دبک کر بیٹھ گئی۔ اور بڑے اطمینان سے سٹیپر کے بازو اپنے گرد پھیلا سٹیپر پہننے لگی، ایک دفعہ نیچے اوپر کرکے دیکھا، بند کستی پھر ڈھیلے کر دیتی...... بارہ گھڑی نے دو بجائے، پکچر شو کے لئے ابھی وقت کافی تھا، تمام بنا پورے آثار چڑھاؤ کا خیال رکھتے سلیقے سے باندھتی گئی، جب سٹیپر باندھ چکی تو گردن آگے کی طرف جھک گئی، ایک لمبا سانس لے کر کھڑی ہوگئی، ننگ کا احساس کھو چکی تھی، سینے کو کیا رسے کستے اٹھا کر وارڈروب میں موتیا شلوار تلاش کرنے لگی......

ایک ایک کرکے تمام کپڑے بازوؤں والی کرسی پر ڈال دیئے...... موتیا شلوار کی تلاش میں ایک بہت بڑی کوفت محسوس کر رہی تھی، جو ہاتھ الٹ پلٹ کر رہے ہوں اور وہ ہمت ہار رہی تھی۔ ہونٹ کھلے کے کھلے تھے گویا کسی طویل لمس کی لذت سے محروم ہیں، رگ رگ سنسناہٹ پڑتی ہوئی زمین کی طرح ہلکی ہلکی سی ظاہر تھی، بالوں کی دو ایک لٹیں آنکھوں پر گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہل رہی تھیں...... رانوں کی مچھلیاں بھی اسی صورت میں تھرا پھڑک رہی تھیں......

[illegible] سورج بھیا راور [illegible]

---

[1] Stamp

[2] Good Earth

[3] Wardrobe

نہ دیا تو دروازہ کھٹکھٹانے لگی، ماما کو زور زور سے آوازیں دیں۔۔۔۔ ماما دروازے کے باہر آکر رکی۔

"میری موتیا شلوار کہاں ہے؟"۔۔۔۔ ماما کا رنگ زرد پڑ گیا، بیچاری سہم کر دروازے کے ساتھ لگ گئی، وسیم پھر زور سے چلائی۔۔۔۔ "میری موتیا شلوار۔۔۔۔"

ماما نہایت نرم لہجے میں بولی "بڑی بی نے شاید میلے کپڑوں میں ڈال دی ہو۔۔۔۔" اسے سخت غصہ آیا، اور جھنجھلا کر کہا وہ ہر صورت میں اس کی موتیا شلوار تلاش کرکے لائے۔

ماما شلوار تلاش کرکے لائی تو گورا گورا نیم گلابی بازو نکال کر شلوار کو پکڑ لیا۔ وسیم کے ننگے بازو پر شلوار رکھتے ہوئے، ماما کے جسم میں ایک سرسراہٹ سی دوڑ گئی، جیسے چھوٹی بی بی کے انگ سے دوچار ہو گئی ہے! شلوار لے کر وسیم کو ایک اطمینان اور سکون حاصل ہوا۔۔۔۔ ڈرائینگ روم سے گزر کر ماما مسکراتی جارہی تھی، پیر پھول پر پڑ رہے تھے کہ وسیم کی سہیلیوں نے پوچھا "وسیم کہاں ہے؟"۔۔۔۔ ماما کے ہونٹ پھر پھڑائے اور وہ یہ کہہ کر اوپر چڑھ گئی "صرف موتیا شلوار پہننی باقی ہے!"

کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ وسیم کی موتیا شلوار پر پان کا داغ لگ گیا تھا۔ اور پیک کچھ اس طرح سے گری تھی کہ داغ اگر بے پرواہی سے بھی دیکھا جائے تو انگور کا چھوٹا سا پتا معلوم دیتا تھا۔ وسیم پان کھانے کی عادی نہ تھی، کسی نے دیا تھا، اور جب تھوکی گئی تھی، یہ داغ اس کی موتیا شلوار پر پڑا تھا تو اسے اپنی قیمتی شلوار کے خراب ہو جانے کا کافی صدمہ ہوا تھا۔ موتیا شلوار اسے اچھی، پر شلوار پہنانے تک اسے ہر بات کی شلوار سے بھی زیادہ۔۔۔ اور وہ اسے اسی وقت پہنتی تھی جب کبھی کچھ مسرور ہونے کی اہمیت محسوس کرتی تھی۔

وسیم اپنی سہیلیوں کے ساتھ برآمدے میں کھڑی بے تابی سے تانگے کا انتظار کر رہی تھی۔ سب سے زیادہ تازہ دم اور خوبصورت معلوم دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک بشاشت کھیل رہی تھی، سینما جانے اور "گڑیا رستم" فلم دیکھنے کا احساس لئے ہوئے نہایت خوش تھی۔

تانگہ جب آخری موڑ مڑا، تو اس کی آنکھوں کے سامنے بالوں کی ایک لٹ آگئی۔ اس نے اس کو ہاتھ سے پرے ہٹا دیا۔ اور بازار کی آمد و رفت پر حقیرانہ طور پر سخت نکتہ چینی کرنے لگی، سب نے اس کی طرف دیکھا، ایسی طنز اور نکتہ چینی وسیم کی فطرت کے خلاف تھی۔۔۔۔ دو بچے اور آٹھ لڑکیاں دو تانگوں میں تماشا دیکھنے جا رہے تھے اس مختصر سے قافلے پر ہر راہ گزر کی نظر پڑ رہی تھی۔ یہی بات وسیم کی نکتہ چینی اور طنز کا باعث تھی، وہ چاہتی تھی برقعہ الٹ دے اور بے نقاب ہو جائے، اور دیکھے کون اس کی طرف دیکھنے کی جرأت کرتا ہے۔

تانگہ کھٹ سے تھیٹر کے سامنے آکر رکا۔ وسیم کو ایک دھکا سا لگا۔ اس کے خیالات کا تسلسل رک گیا۔ وہ بھونچکا سی ہو کر اتری۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ سب خوش خوش اور ہم مچاتی اپنی اپنی جگہ پر جا بیٹھیں اور لوگوں کا بڑے دلفریب زاویوں سے مطالعہ کرنے لگیں۔ وہ ہر آنے جانے والے کا جائزہ لے رہی تھیں۔۔۔۔ نفسیاتی لذت سے ہم کنار ایک ایک پر تنقید کرتی تھیں۔ آس پاس بیٹھنے والوں کا بیٹھنا دوبھر کر دیا تھا۔ ہر نگاہ ان پر پڑ رہی تھی۔ اور ہر نگاہ ایک خوشگوار تعجب ظاہر کرکے ایک دوسرے سے جگہ بدلنے میں مصروف تھی۔ وسیم خوب بے تکلفانہ انداز میں کھل کر اپنی "سیٹ" پر بیٹھی تھی، ساتھ والیوں کی حرکات سے کوئی سروکار نہ تھا، اور نہ کرلی کسی کی پروا معلوم ہوتی تھی۔ اس نے ارادتاً موتیا شلوار کا داغ جس کا رنگ کچھ سیاہی مائل سا ہو گیا تھا، بڑی احتیاط سے واضح کر دیا، اور کھسکا کر ران کے اوپر کر لیا۔ پھر خود بخود ذرا ضمیمن ہو کر بیٹھ گئی اور چور نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ کر اس بات کا انتظار کرنے لگی، دیکھیں آج سب سے پہلے اس داغ کا ذکر کون چھیڑتا ہے۔

رعنا۔ نینا۔ پدما اور روزا، اپنی اپنی دھن میں محو تھیں، وہ محسوس بھی نہ کر سکیں کہ وسیم کیوں چپ چپ ہے، اور اس کے خیالات اسے کہاں سے کہاں لئے جا رہے ہیں ——

وسیم ان سب سہیلیوں میں بھولی بھالی مانو بلی کی مانند تھی، اس لئے سامنے وہ بہت سی باتیں کرتی ہوئی جھجک بھی جاتی تھیں، اور جب کسی اہم بات سے انھیں لذت حاصل ہوتی تھی اور وہ برداشت کر جاتی تھیں تو ایک دوسری کو اعتماد میں لے کر کہہ اٹھتی تھیں، وسیم کو ان جنسیاتی ہیجان سے باخبر کرنے کی ضرورت نہیں۔

وسیم اور اس کی سہیلیاں آج سے ایک ہفتہ پہلے اسی تھیٹر میں ایک امریکن فلم دیکھنے آئی تھیں، وسیم نے اس روز بھی یہی موتیا شلوار پہن رکھی تھی —— اور پان کا داغ اس کی شلوار پر ایک شام پہلے ہی لگا تھا۔ آج سے ایک ہفتہ پہلے جب یہ جھنڈ کا جھنڈ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھا تھا تو سب سے پہلے نینا کی نگاہ اس پان کے داغ پر پڑی تھی۔ وہ پان کے داغ کا ذکر کرتے کرتے اس کی ران پر ہاتھ رکھے داغ کو مسلنے لگی تھی، پھر دوسری اور پھر تیسری اسی طرح باری باری سب نے داغ کو مسلا اور اس کا ذکر کیا تھا، اور اس کی قیمتی شلوار کے خراب ہو جانے کا افسوس ظاہر کیا تھا۔ جوں جوں اس کی موتیا شلوار کے داغ پر بات چلتی گئی، اس کی رانوں پر پہلے ایک پھر دوسرا اور پھر تیسرا ہاتھ حرکت کرتا رہا۔ اس مسلنے اور حرکت کرنے سے اس کے تمام جسم میں ایک نامعلوم سی سرسراہٹ رینگتی رہی —— وسیم چاہتی تھی، یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔ فلم بند ہو جائے۔ لائٹ فیل ہو جائے، پر اس کے داغ کا ذکر چلتا رہے اور مختلف ہاتھ اس کو مسلتے رہیں —— پان کا داغ دونوں رانوں کے درمیان لگا تھا۔ نیفے سے تقریباً کوئی بالشت بھر نیچے، چاہتی تو اسے اندر کی طرف سرکا کر چھپا دیتی یا اس روز وہ اپنی موتیا شلوار نہ پہنتی، داغ کی وجہ سے اس کے جسم میں زندگی کی بالیاں پھوٹ اٹھی تھیں —— وہ کسی صورت بھی، اپنی مسرت کا اظہار دوسروں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔

پان کا داغ چھوٹے انگور کے پتے کی شکل نما تھا۔ اور ایسا معلوم دیتا تھا، جیسے چھینٹا پڑ جانے کے ساتھ ہی کسی نے دبا دیا ہے یا کسی بچے نے کاغذ پر سیاہی گرا کر کاغذ میں شکن ڈال کر ایک موہوم سی شکل بنا دی ہے۔ آج ہال کے اندر وہ اٹھتی بیٹھتی چپ سادھے رہی، اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگی، مگر پان کا داغ کسی کی نگاہ کا مرکز نہ بن سکا۔ راستے میں جب تانگے کے پہیئے گھوم رہے تھے، تو وہ ایک مضحکہ خیز آزمائش میں سے گزر رہی تھی، اس کا خیال اور نگاہیں پان کے داغ کا پیچھا کر رہی تھیں، اگر تانگہ کسی وجہ سے دھیما پڑ جاتا تھا تو اس کا ہاتھ بغیر سوچے سمجھے رانوں کے درمیان کچھ ٹٹولنے لگتا تھا۔ شکلیں بن بن کر مٹتی اور گم ہوتی جا رہی تھیں، اس نے ذرا تن کر ٹانگوں میں اکڑا پیدا کر لیا، اس کا ہر سانس تانگے کی آواز کے ساتھ چلتا جاتا تھا۔ اور وہ بڑے پیار سے کبھی نینا سے اور کبھی روزا سے لگ جاتی تھی۔

فلم پوری رفتار سے سکرین پر چل رہی تھی، ہر لمحہ ایک نیا منظر آنکھوں کے سامنے آتا تھا۔ ہر کوئی اپنے اپنے مذاق کے مطابق مسرور ہو رہا تھا ساتھ والیاں بھی کافی سے زیادہ لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ لیکن وسیم کے خیالات کا تسلسل ہر بار ٹوٹتا اور بنتا تھا۔ کبھی بیٹھے بیٹھے جمائی لینے لگتی۔ جیسے مضمحل ہوتی جا رہی ہو، اور کبھی سیٹ پر اپنا آپ پھیلا دیتی، اور پان کا داغ نمایاں کر کے بیٹھ جاتی۔

انٹرول ہوتے ہی اس نے داغ اور بھی نمایاں کر دیا، داغ کو دیکھ کر اس کے اندر کچھ ہیجان سا اٹھ رہا تھا۔ کاش یہ ہیجان طوفان کی صورت اختیار کر لیتا اور اس میں وسیم بہہ جاتی، مایوسی نے اس کے چہرے کو مرجھا دیا تھا۔ اور آنکھیں بند ہوتی معلوم ہو رہی تھیں۔ جیسے سر سے پاؤں تک رطوبت کھینچ لی گئی ہو ——

گرسیم کچھ ضرورت سے زیادہ پیچھے ہٹی بیٹھی تھی ـــــ اور بازو ڈھیلے چھوڑ رکھے تھے، پیچھے سے روزا نے وسیم کو زور سے جھنجوڑا اور کہا "سب تیری طرف دیکھ رہے ہیں، رات بھر یاد آتی رہی تھی کیا ـــ تیرے جمائیاں لینے کا یہی وقت ہے؟"

وسیم کے ساتھ والی سیٹ پر دو عورتیں بیٹھی تھیں، ایک کی گود میں بچہ تھا۔ بچہ چابیوں سے کھیل رہا تھا، دوسر وسیم کو بڑے لاڈ سے دیکھ رہی تھی۔ اسے متوجہ پاکر دوسری بھی دیکھنے لگی ـــــ دونوں وسیم کے بھولے پن سے نہایت متاثر ہوئیں اور اسے دوسروں سے مختلف پایا۔

عورتوں کی نگاہ پان کے داغ پر جا پڑی، داغ اس گھڑی کچھ پُر اسرار سا بن گیا، پہلی نے دوسری کے چٹکی لیتے ہوئے کہا: "بچی جو ہوئی، نادان ہی تو ہے ـــــ انجان پن میں خون کا دھبہ لگ گیا ہے، غریب کے!"

انٹرول کے بعد فلم پھر چلنے لگا۔ ہال میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، وہ آگے کی طرف جھکتی ہوئی سکڑ کر بیٹھ گئی، جیسے بازوؤں والی کرسی میں دبک کر اپنے آپ کو نمایاں ہونے سے بچانا چاہتی ہو۔ محسوس کر رہی ہو، اس کی چھوٹی چھوٹی چھاتیاں سڈول اور تناؤ لئے ہوئے نیم گلابی سٹینر میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہو رہی تھیں ـــــ خاموش اور ساکن ـــــ فلم تیزی سے چل رہی تھی!

چغتائی

نوید زندگی

جب نظر انتخاب ہو جائے
منتخب لاجواب ہو جائے

زندگی کو بھی جی کے تنہا دے
جبکہ جینا عذاب ہو جائے

ضبط گریہ ہو گر، تو ایسا ہو
صبر بھی آب آب ہو جائے

عقل و تدبیر کے تعاون سے
ہر عمل کامیاب ہو جائے

روشنی ہو وہ حسن ایماں میں
دل بھی اک آفتاب ہو جائے

یہی آغاز ہو بھلائی کا
کام کوئی خراب ہو جائے

گونج اٹھے صدائے حق اس سے
دل کی حرکت رباب ہو جائے

عزم راسخ ہو جس کی فطرت میں
فضل حق ہمرکاب ہو جائے

گر تو پا جائے نفس پر قابو
رازِ حق بے نقاب ہو جائے

گر پڑے اشکِ انفعال اگر
پاک فردِ حساب ہو جائے

ہے عمل ہی میں زندگی کی بقا
ورنہ جینا حباب ہو جائے

گر تو سمجھے حیات کا مقصد
ہر سکوں اضطراب ہو جائے

نہ ہو گر موجزن جو الفتِ دوست
زندگانی سراب ہو جائے

تیری فطرت میں تھا یہی روحی
شاعرِ بوتراب ہو جائے

"روحی"

جھلکیاں

پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہوں، لکھتے لکھتے طبیعت اچٹ جاتی ہے یا کبھی فکرِ آرام کو جی چاہتا ہے تو سونے کے کمرے میں دراتا چلا آتا ہوں اور دھڑام سے بستر پر چاروں خانے چت کہ اس قلابازی سے تعاقب کرنے والے خیالات کے ہجوم کو دھکا سا لگے اور کچھ دیر کے لئے ان سے نجات پاؤں۔ چت لیٹ کر چھت کی بانسیں گننے لگتا ہوں۔ گھوم پھر کر نظر ایک جگہ اٹک سی جاتی ہے، مکڑی کے جالے میں۔ مہین مہین سا زرتار، پیلا پیلا، اجلا اجلا جال —— جو لرز لرز کر، تھرک تھرک کر اور زیادہ حسین اور جاذبِ نظر ہو جاتا ہے۔ بیچوں بیچ جیسے ڈرائنگ روم ہو، بی مکڑی بیٹھی ہیں۔ بے ڈھنگی سی، مکروہ لیکن اک ذرا چمک دار —— مکڑی پر نظریں جم جاتی ہیں۔ اگرچہ "کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست" کا معاملہ نہیں لیکن ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ مکڑی کی قوتِ ارادی نے میری آنکھوں پر جادو کر دیا ہے کہ ہٹتی ہی نہیں، جھپکتی ہی نہیں۔ میری ساری حسیات باصرہ میں سمٹ آتی ہیں اور مکڑی پر مرتکز ہو جاتی ہیں —— مکڑی پھیلنے لگتی ہے۔ کبھی جالا نظروں سے اوجھل سا ہوا جاتا ہے، کبھی مکڑی پھیلتے پھیلتے جالے سے پرے نکل جاتی ہے اور صرف مکڑی ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر مکڑی سمٹنے لگتی ہے اور ایک نقطہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ نقطہ۔ موٹا، باریک مہین —— اپنی تمام تر معنوی و صوری کیفیات و تعریفات کا حامل۔ چمکتا ہے، جھلملاتا ہے، لرزتا ہے، مدھم پڑتا ہے۔ روشن ہو جاتا ہے، ڈوبتا ہے اور ابھرتا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ جالا پھیلنے لگتا ہے، لرز لرز کر، چمک چمک کر نئے نام نقوش بنتے، بگڑتے، ابھرتے اور دھندلاتے ہیں۔ نقطے میں حرکت سی ہوتی ہے اور چمک سے روشن، جیسے میگنشیم کا فیتہ آن کی آن میں جلے، تڑکے اور پھر تاریکی چھا جائے اور اب نقطے کی جگہ —— گوری گوری چمپئی رنگت، چوڑا ماتھا، کھنچی ہوئی بھویں، کسی قدر چھوٹی لیکن تارہ جیسی روشن آنکھیں کہ قلب و نظر کو برما جائیں۔ تنگ دہانہ، گلاب جیسے ہونٹ ان پر اودی اودی مسی کی دھڑی، گالوں پہ چیلتی کا کلیں، آڑی مانگ، ناک میں جھل جھل کرتی ہیرے کی کیل، سونے کے تنگے، جڑاویں کرن پھول، ہاتھ گلے جڑاؤ، پاؤں میں پازیب، دھانی رنگ کی بڑے بڑے رپہلے پھولوں والی ساری، اسی کا جمپر —— اجلا اجلا فرش، فرش پر قالین، دیوار سے گاؤ تکیہ لگا، اور یہ اس سے تکیہ لگائے بیٹھی ہیں، سامنے کٹاؤ پاندان، ادھر خاص دان، ادھر اگالدان۔ سراپا عمر خیام کی رباعی، بھرپور جوانی، تیز و تند شراب، خود ہی بدمست و سرشار۔ پاس ہی ان کی رازدار سہیلی نیر بیٹھی ہیں۔ چہرہ مہرہ بالکل عین مین ویسا ہی۔ بہن کہو تو کسی کو شبہ نہ ہو سہیلی کہو تو قسمیں کھانے پر کوئی یقین نہ کرے۔ ہاں یہ ایک ذرا متین ہیں لیکن پیٹ میں گن بھرے ہیں، ہیں شیطان کی خالہ آفت کی پرکالہ، بنتی ہیں بڑی معصوم۔ کچھ راز کی باتیں ہو رہی ہیں، دھیرے دھیرے کہ کسی کو بھنک نہ پڑ جائے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں شرارت لوٹ رہی ہے ...... ٹرن ٹرن، سائیکل کی گھنٹی نے اپنے مخصوص بول نکالے اور انھوں نے نیر کو جھمکے سے اشارہ کیا۔ کمرے کا دروازہ دھیرے سے بند کر دیا گیا جس کے بند ہونے سے یہ حصہ مکان سے بالکل علیحدہ ہو جاتا ہے اور پھر یہاں کیا کچھ نہ ہو جائے کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ مجھے دیکھتے ہی سروقد اٹھ کھڑی ہوئیں، سر پر آنچل ڈال لیا، منہ پر بہار چھا گئی، آنکھوں میں حیا لوٹ گئی اور گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ گردن خم ہوئی پنجۂ مرجان پیشانی تک پہونچا —— سلام کرتی ہیں۔ میں کچھ کہہ بھی نہ پایا تھا کہ بولیں "سرتاج راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں آپ تو روٹھ ہی گئے اپنی کنیز سے۔" یہ سریلے بول

کانوں ہی میں نہ پڑے دل و روح کی گہرائیوں میں بھی سما گئے۔ ترنم، شعریت اور نقوش سبھی تو جاگ اٹھے تھے۔ لیکن ہونٹوں کی مسی، پور پور مہندی اور گلے کی کالی پوت پر نظر پڑتے ہی دل سن سا ہو گیا —— صغرا کی تو شادی ہو چکی۔ [illegible] آنکھوں ہیں۔ جب یہ تاریکی [illegible] چھٹ گئی اور اجلا فرش، ایرانی قالین، اگالدان، پاندان، سرو قامت لچکیلا جسم، دمکتے عارض، گلابی ہونٹ تحلیل سے ہو گئے۔ مسی کی اداہٹ میں تو ایسی اداہٹ میں وہی نقطہ ابھرنے لگا۔ باریک سا، مہین مہین، چمکتا دمکتا، ابھرتا ڈوبتا —— پھر وہی مکڑی کا جال، مکڑی کر رہی ہے منظر، چمکتی، دمکتی، اجلی اجلی مٹیالی مکڑی ——

پھر نظریں جمنے لگیں مکڑی پر۔ پھر نقطہ سا بننے لگا۔ وہی ڈوبتا، ابھرتا، چمکتا لرزتا نقطہ چمکا، ڈوبا، ابھرا اور پھر غائب۔ اب جو ابھرا تو پھیلنے لگا۔ رکھشا کے بے رنگ پھیپھڑے ابھرے، پھیلے، سمٹے۔ رکھشا حرکت کرنے لگا ——

چھریرا بدن، میانہ قد، گلابی ناک نقشہ، تیکھے خط و خال، بڑی بڑی بادامی آنکھیں، گھنی پلکوں سے ایسی جھانک رہی ہیں جیسے پہاڑوں میں جھرنا جھل جھل کر رہا ہو۔ آنکھیں، شوخ چنچل جیسے کچھ کہہ رہی ہوں، کچھ گنگنا رہی ہوں، کچھ یاد دلا رہی ہوں، بھولی ہوئی کہانیاں —— کانوں میں صرف لمبے لمبے آویزے، گلے میں چندن ہار، ہاتھ میں دو دو چوڑیاں، ننھی سی سنہری گھڑی کلائی پر، سبز کنچالی ساری لپٹی لپٹی سی، چست بلاؤز ایسا کہ سینہ و کمر کا ہر نقش ابھرا واضح اور جاذب نظر ہو گیا ہے۔ آواز بھاری بلکہ لونڈ پن اگر لوچ نہ ہو تو دور کا آدمی نہ پہچانے کہ مرد بولا کہ عورت۔

رکھشا میں اکیلی تنہا۔ یہ تقدیر پیچھے کا پردہ ایک طرف سے کھلا، ایک لمحے کو چین نہیں۔ پردہ اٹھا، آنکھیں ملیں، کچھ کہہ گئیں، کچھ یاد دلا گئیں کچھ بھلا گئیں —— پھر ویسے ہی یہ پلے گراؤنڈ ہے، وہ بارہ دری، سلک ٹاکیز پیچھے رہ گئی یہ سامنے نیا پل رہا۔ اب کی دیکھا تو آنکھیں کہہ رہی ہیں چلے آؤ برابر، کچھ کہہ سن لیں۔ سبیکل رکھشا کے برابر تھی۔ بازو کا پردہ پیچھے ہٹا دیا گیا، بالکل نظر کے سامنے تھیں جیسے اگلے وقتوں کی جان پہچان ہے۔ اور تھی بھی یہی بات نظریں بھلا دیں تو کیا من پہچان ہی جاتا ہے، اس کی نظریں نہیں چوکتیں۔ سلام و تعارف کی ضرورت ہی کیا۔ انسان ہی کہہ سکتے ہیں۔ کہنے لگیں "تو آپ کا نام ...... میاں ہے نا"

میں چکرا یا۔ یا اللہ یہ تو دنیا دیکھی معلوم ہوتی ہیں میرا خیال شاید صحیح ہو، ہو نہ ہو محبوب ہی ہو۔ چھ سال پہلے کی بات ہے کہ پیک بڑی تھی کچھ ہی اوجھل ہوئیں نظروں سے کہ جیسے وجود ہی نہیں ان کا۔ کچھ یقین نہ آتا تھا کہ وہی ہیں کہ کوئی اور۔ ناک نقشہ، بات چیت کا انداز، آواز بالکل وہی لیکن وہ ذرا دبلی دبلی نازک نازک تھیں۔ الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے بوکھلا کے جواب دیا "جی ہاں —— لیکن آپ"

وہ ہنس پڑیں "یہ شاید نہ معلوم ہو سکے آپ کو"

میں اور بوکھلا گیا لیکن متانت سے کہا "اچھا آپ بھی"

ذرا بل کھاتے ہوئے جواب دیا "تو کیا خدائی ظلم ہے آپ کا لے تھلئے"

میں نے کہا "تو جا خدا جو تا ہوں پھر"

اب وہ چکرائیں، اس چڑیمار کی طرح جس کے لیے دار بانس میں چڑیا چمٹے چمٹے پھڑ پھڑا کر نکل جائے۔ سڑک کا خیال رہا اور نہ راہ گیروں کا۔ چلائیں "سنیے تو ——

اے صاحب ...... میاں، ایک ذرا سنتے تو جائیے میری بات"

لیکن ہم پلٹ چلے تھے۔ نام معلوم کرنے کی دھن سوار تھی۔ سیدھے راشننگ کی دوکان پر پہونچے، میاں عزیز تھے۔ نام معلوم کرنے کچھ دیر نہ لگی۔ وہی تھیں جن کا شبہ تھا۔ واہ ری عورت، وہ دن گئے کہ کبھی جاتی تھیں، سائے کی طرح چمٹی رہتی تھیں اور ہم بھاگے بھاگے پھرتے تھے کہ آپا نہیں گی تو کیا کہیں گے! ؟ وہ دن اور آج کا دن۔ دنیا ہی بدل گئی۔ کیا یہی عورت کی نفسیات ہے اور یہی اس کی محبت؟ ادھر اس کی طرف بڑھئے تو طوطے کی طرح آنکھیں پھیرلے، اور اپنا من

چاہے تو قدموں پر گر پڑے، لاکھ بھاگئے پر پیچھا نہ چھوڑے!
الجھن بڑھنے لگی، تاریکی سی چھانے لگی...... بہیولے نقطے
تھرکنے لگے ناچنے لگے اس تاریکی میں۔ آن کی آن میں سب
ڈوب سے گئے اور صرف ایک نقطہ رہ گیا وہی تھرکتا، چمکتا،
ابھرتا ڈوبتا ——— پھر وہی جالا تھا، وہی مکڑی، زہریلی نظر
متیالی، چپکیلی مکڑی ———

پھر نظریں جمنے لگیں۔ نقطہ سا بننے لگا۔ ڈوبا، ابھرا،
چمکا، پھر غائب ——— وہ سامنے بیٹھی ہیں، گدگدا جسم،
بوٹا سا قد، سانولی سلونی رنگت، تیکھے خط و خال، بڑی بڑی شہلا
آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، ذرا موٹے ہونٹ اودے اودے
طباقی چہرہ، گال پر دو بہار رہا ہے۔ اودی تور کی سفید سفید برا
ساری، اسی رنگ کا کرتا چھوٹے دامنوں کا، پیٹ ابھرے
ہوئے۔ پورے آستین پھنسے پھنسے کلائی میں چست، روپہلی
چوڑیاں ہاتوں میں، جیسی تن کی اجلی ویسی ہی من کی لیکن
کنقل کے کان موم کی ناک، ماں اور بہن نے جدھر چاہا موڑ
لیا۔ جانتی ہیں کہ بہن ڈنک مار رہی ہیں لیکن یہ مسکرا رہی ہیں۔
کچھ من کی کمزور کچھ سعادت مندی کا گھمنڈ۔ استانی ہیں،
انھیں سے گھر چلتا ہے۔ ماں بڑی بیٹی پر بچھی جاتی ہیں۔ وارے
نیارے ہو رہے ہیں، پیچھے نہ جاؤ ہتیلی میں چنو، انھیں کوئی پوچھتا
نہیں لیکن کیا مجال کہ پیشانی پر کوئی بل تک آجائے۔ بلکہ
بظاہر خود بھی شریک ہیں اس لاڈ میں۔ جو کھلا دیا کھا لیا، جو
پہنا دیا پہن لیا، نہ شکوہ نہ شکایت لیکن اندر والا بھی تو
مانے، گھلی جاتی ہیں اندر ہی اندر۔ بائیس کا سن ہے، ماں
کہتی ہیں ابھی بچہ ہے اور یہ دل پر پتھر رکھے چپ ———
کوئی بچھا جاتا ہے، لیکن یہ نہیں بولتیں، ماں کو جو پسند نہیں
اور ماں کو کیا پسند ہے یہ خود انھیں بھی نہیں معلوم۔ ہمارے
خاندان کے لیلیٰ مجنوں مشہور ہیں لیکن یہ ادھر چپ اور وہ
ادھر خاموش۔ جانے کب چھوٹے یہ جوا لکھی؟ پیام سلام
بس آنکھوں کی زبانی اللہ اللہ خیر صلا۔ وہ چار سال سے
انھیں پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں ادھر ان کا بھی کچھ یہی سا

ہوتا۔ جانے کیا بات ہے ——— ہاں تو وہ بیٹھی ہیں۔
ہاتھ میں "سب رس" ہے۔ میں ان کے سلیقوں کا خلاصہ
بنا رہا ہوں۔ پڑھتے پڑھتے بولیں "اللہ یہ کیسے لکھتے
ہیں آپ، ہمیں بھی لکھا دیجئے نا۔" میں نے جملہ چست کیا"
تو اجازت لے لی ہے اپنی اماں سے۔"

تلملا ہی گئیں۔ چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں، ہونٹ
خشک ہونے لگے، کھسیانی ہنسی ہنسیں، آنکھ میں آنسو بھر
آنے لگیں "میں بہت ستائی لڑکی ہوں ——— اور
اسی کو نبا رہی ہوں، کیوں اس ساز کو چھیڑیے گا جس میں
فریاد کے سوا کچھ نہیں ———"

میں نے کہا "جی ہاں اور دنیا کو فریاد کی ضرورت نہیں۔"

وہ رونے لگیں، گنگا جمنا ابل پڑیں، ہچکیاں بندھ
گئیں۔ کانوں کے ایرنگ ہلنے لگے۔ سنہرے ایرنگ مکڑی کے
جال والے، باریک باریک مہین مہین دمکتے سے جال، بیچوں
بیچ مکڑی ——— میں سوچنے لگا، لڑکیاں بھی تو بس مکڑیاں
ہی ہیں۔ نازک نازک سی، چمکیلی، بھڑکیلی، دبلی، موٹی، چکیلی
شوخ بے آزار اور بس بھری۔ کوئی موقع پا چکی ہے، کوئی
گھات لگائے بیٹھی ہے اور کوئی جھپٹ چکی ہے شکار پر۔
کوئی قلم کے زور سے جال پھیلا رہی ہے، کوئی مرد پر طنز کرکے
لیس ہو رہی ہے، کوئی کہتی ہے "اگر میں مرد ہوتی" ———
جیسے ہم نے بڑا تیر مار مرد ہو کے اور جو وہ مرد ہوتیں تو
سارے جہاں کے مردوں کی کمزوریاں دھو ڈالتیں ———
کاش کوئی انھیں سمجھائے۔ ماں، بیوی اور بہن بنیں تو
سب کچھ بن گئیں۔ مرد کی ساری "مردانگی" قربان ہے تم پر
لیکن یہاں تو ہیلن، کلیوپیٹرا، قرۃ العین اور رانیاں
کی رٹ لگی ہے ——— اف یہ لڑکیاں۔ اور مکڑیاں بھی تو بھانت
بھانت کی ہوتی ہیں، اجلی اجلی، لال لال، متیالی، دبلی،
موٹی بے آزار زہریلی ———

بالوں کی [illegible] لٹ [illegible] اور کانوں پر بکھر گئی، ایرنگ
کو گھیر لیا اپنے [illegible] نوشتہ

نکہت برباد

کسی نے پوچھا۔ افسانہ کیسے بنتا ہے؟ اس سوال کا جواب سنئے۔ "بس ایسے ہی جیسے عورت اپنے بالوں میں کنگھی کرتی ہے۔" پھر سوال ہوا "یہ بات کس کتاب میں لکھی ہوئی ہے؟" جواب ملاحظہ فرمائیے "یہ میرا طبعزاد خیال ہے۔ کنگھی کا ایک لمس جس کی تاریخ دنیا کے قدیم ترین مصور کے فن سے بھی پرانی ہوگی۔ ہر عورت کے ذہن میں ایک احساس برتری پیدا کر دیتا ہے اور کنگھی چوٹی کے ان گنت ڈھنگ رائج ہیں۔ دیس دیس میں۔ افسانہ لکھنے کے ان گنت ڈھنگ ہیں"۔ تو یوں ہے یہ قصہ۔ یہ افسانہ بھی لکھا نہیں لکھوایا جا رہا ہے۔ اس ترقی پسند زمانہ میں ہر تجربہ ترقی پسند ہی کہلاتا ہے —— ہاں تو ——

بیتے جاتے تھے دن، مہینے، سال، اگر یہ جنگ جاری رہتی تو شاید صدیاں بیت جاتیں۔ کشت و خون کی آندھیاں، تمناؤں کی ہولی آرزوؤں کے جنازے، جانے کتنے اور نکلتے۔ کتنی تمناؤں سے پالا تھا اس کے والدین نے اس کو! برسوں بعد تو اولاد ہوئی تھی۔ آرزو ارمان کا درخت لہرانے لگا۔ جبری بھرتی کے احکام نکلے۔ خسرو نے خوشی خوشی اپنا نام لکھوا دیا۔ جان کی بازی لگانے سے جانباز کیا پس و پیش کرے۔ اپنے ملک اور اپنی قوم پر بھینٹ چڑھنا، کتنی زبردست قربانی، کتنا روح پرور ایثار۔ اس کی خود اعتمادی جرأت و شجاعت کے جذبات پر والدین کو فخر سا ہونے لگا۔ اپنی قسمت پر، اس ہونہار سپوت کے غازیانہ اقدام پر ——

محمود —— اس سے صرف دو ہی سال چھوٹا تھا۔ وہ کیا جانے جام شہادت کا مزہ۔ قربانیوں کا ذائقہ۔ موت کے فرشتے سے آنکھیں چار کرنا —— بڑی عاجزی کی۔ کہ بھیا نہ جاؤ۔ ہماری دنیا تم بن سونی ہو جائے گی۔ امی کا روتے روتے برا حال ہوگا۔ ابا کی زندگی کا چراغ جھلملانے لگا ہے۔ مگر خسرو نے اس کی بزدلانہ التجاؤں کو ٹھکرا دیا۔ بچپن گیا نہیں، سمجھ نہیں آئی۔ مورکھ کہیں کا ——

والدین کی ایک اور بھی تو تمنا تھی۔ رضوانہ کی شادی خسرو سے ہو جائے۔ سہرا تو دیکھ لیں گے۔ پھر جانے قسمت میں کیا لکھا ہے۔ کون جیتا ہے اس کی۔ آپس میں رضوانہ اور خسرو آپس کے ساتھ کھیلے، جوں جوں سیانے ہوئے محبت کی بیل بھی ساتھ ہی ساتھ منڈوے چڑھتی گئی۔

خسرو کی فوج میں بھرتی ——؟ رضوانہ پر سنتے ہی جیسے بجلی گری۔ جنگ گویا الارم ہے موت کا۔ اس سے وابستہ افکار کی طرف ذہن انسانی کے کمزور و بزدل پلک نہیں جاتے —— اب رہی محبت —— اس کی قسمت میں تو ٹھوکریں، پشیمانی، ناکامی، ذلت۔ سب ہی رکھے دھرے ہیں۔ تو پھر اب ڈر ہی کاہے کا۔ قسمت —— یہ بزدلوں کی ڈھارس۔ کوشش جہاں دم توڑ دیتی ہے تمنا جہاں یاس سے بدل جاتی ہے، امیدیں جہاں ایک ایک کر کے ساری کی ساری سلب ہو جاتی ہیں، ہیچ معقول ہیں ——

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

اپنا روپ دکھاتی ہے۔ قسمت وہاں جلوہ فرما ہو کر تسلی دینے لگتی ہے۔ یہ تقدیر کی دیوی۔ ارے اس کے تو آنکھیں کبھی نہ آئیں گی۔

روح میں کہیں چھپی دبکی تھی خسرو کی محبت۔ اب جو بکھری تو رضوانہ کی ساری ہستی پر چھا گئی تھی۔ محبت کی دلکشی نے غم و الم پا لئے تھے۔ والہانہ کشش صدمہ سے بدل چکی تھی۔ اشتیاق دبی خواہش پنہاں سے معنون ہو چکی تھی۔ اس کے جانے کے صرف خیال ہی سے اس کی دنیا اندھیری اندھیری ہو جاتی۔ وہ تصور میں نہ جانے کتنی مرتبہ مر چکی تھی۔ خسلہ پر نباشدہ انوار کا کیا بھروسہ۔ ان کے لوٹنے کی بہت کم امید رہتی ہے۔ جیسے کوئی کسی بہت زیادہ خطرناک بیماری سے بچ اٹھے۔ مردوں کو دغا دیکر بچ جائے۔ لیکن رضوانہ اس عقد کے بندھن سے بہت پہلے ہی خسرو کی ہو چکی تھی

اقتدار و شادابی ——— یہ سب خود فریب دنیا کے ظاہری ڈھکوسلے ہیں۔ روح تو منسلک ہو جاتی ہے۔ بہت پہلے ہی ——— تمنا کیے ہوؤں کی اس سنسار میں رہ کر ——— خسرو کے بغیر زندگی۔ موت کیوں نہ کہوں اس زندگی کو۔ غرض یہ آنے جانے والے خیالات تھے۔ اور رضوانہ کی مضطرب نڈھال روح [illegible] اس کی زندگی کے بے مقصد سے دن ——— یہی سوچتے بیتے جاتے۔

خسرو کی مہم بھی کچھ کم کٹھن نہ تھی۔ ایک طرف عزت و شہرت جیسے انمول رتن تھے ——— دوسری جانب محبت جس کی آنچ [illegible] کوئی قیمت ہی نہ لگ سکی۔ زندگی کے اس دوراہے پر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کون سا رخ اختیار کرے۔ محبت کی موڑ پر صرف رضوانہ تھی ——— یکہ و تنہا ——— ایک دولت بے پایاں لیے ہوئے۔ عزت و شہرت کے رخ پر ساری دنیا تھی۔ دنیا والے تھے۔ سماج کی نکتہ چیں نظریں تھیں۔ ملک کی امیدیں تھیں۔ قوم کی آرزوئیں تھیں ——— وہ اب کرے تو کیا کرے۔ بڑی بے بسی کا عالم تھا۔ اس نے جیسے اپنی سوجھ بوجھ ساری کھو دی ہو۔ اس نے سوچا محبت تو ایک وقتی جذبہ ہے۔ جہاں عقل کے پاسباں نہیں پہنچتے۔ وہ وہ مقام ہے یہ شعلہ جیسے جلدی سلگتا ہے، اسی سے زیادہ [illegible] جلد بجھ بھی جاتا ہے۔ ٹھنڈا بھی ہو جاتا ہے [illegible] جب پوری ہو جاتی ہے۔ تو پھر کچھ بھی نہیں رہتا [illegible] دو اس شرر کو یوں ہی سلگتے جلتے۔

پھر اس نے یہ بھی تو سوچا۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا کتنی جرأت انگیز گھڑی ہوگی۔ [illegible] بھی سکتی ہے۔ لیکن ایسا انمول موقع زندگی میں بار بار نہیں آتا۔ [illegible] جنگ چھڑے۔ شاید بوڑھا بھی ہو جاؤں [illegible] تک جوانی کا مقصد اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے [illegible] قوم کے دیوتا جیسے اپنے چرنوں میں جگہ دیا ——— [illegible] کے مقابلہ میں کیا ہے یہ زندگی ——— اور محبت ——— [illegible] کی حفاظت میرا دل کرتا رہے گا۔

کل شادی ہو جائے گی۔ اور پرسوں ——— خسرو محاذ جنگ کی جانب قدم بڑھائے گا۔ بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ ایک جنگ پر جانے والے دولہا کی شادی۔ شادیانوں میں ایک غمگین سا نغمہ بھی چھپا چھپا تھا۔ جس کو کسی اور نے نہیں۔ صرف رضوانہ کے دل کی دھڑکنوں نے سنا۔ زندگی سنور رہی تھی بگڑنے کے لیے۔ قسمت کا بندھن دونوں کو ایک ہی دھاگہ میں باندھ رہا تھا۔ لیکن جدائی کا تخیل جان لیوا طور پر روح فرسا تھا۔ مہمانوں کی کثرت تھی۔ اس کی جانبازی نے اس کو ہیرو بنا دیا تھا۔ اور اس ہیرو کو دیکھنے ملک کے گوشے گوشے سے مخلوقات چلی آتی تھی۔ پھول کے ہاروں نے اس کے قد و قامت کو ڈھک لیا تھا ؎

بس کہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

پھولوں کی زبان کون سمجھے۔ پھول سے پھول کچھ کہہ رہا تھا لیکن کیا ——— ؟ شادی کے تحفوں میں امام ضامنیں بھی تھیں۔ حرز جان کی تعویذیں بھی تھیں۔ غرض دوسرے ہی دن خسرو روانہ ہوا۔ اس کے پیچھے کیا ہوا۔ یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے۔ اور اس کا اعادہ ایک دور از کار سی بات ——— دن، مہینے، سال، ایک دو نہیں، چھ سات سال گزر گئے۔ آنکھیں پتھرا گئیں ؎

تے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

تین چار سال تک تو خط آتے رہے۔ اس کے بعد سکوت۔ افواہیں در و دیوار سے سرگوشیاں کرنے لگیں۔ جاپانی قیدی بھی کہیں اتنے آزاد ہو سکتے ہیں کہ خط لکھیں۔ وہاں تو بات پر زبان کٹتی ہے۔ کسی نے کہہ دیا زندہ ہوتے تو خط لکھتے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہوشربا تنقیدیں عقل کی بارگاہ سے عجیب و غریب تخیل اڑا رہی تھیں۔

رضوانہ جیتے جی مر چکی تھی۔ اس خبر نے اس کی رہی سہی دنیا بھی لوٹ لی۔ غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اس پر لیکن

انسان میں برداشت کی قوت پیدا ہو جائے تو بڑی سی بڑی مصیبت بھی اس کی ہمتوں کے آگے اپنا سر کچل کر رکھ دیتی ہے۔ مصائب و آلام خود اتنے خوفناک نہیں ہوتے جتنا ان کا تخیل ہوتا ہے! بہادری و شجاعت صرف مرد کی میراث ہی نہیں۔ یہ عورت کا بھی جوہر ہے۔ ایک بزدل عورت ایک شجیع و جانباز سپوت کو کیسے جنم دے سکتی ہے۔

رضوانہ نے جہاں اس کی جدائی گوارا کر لی تھی! اب اس کی دائمی جدائی کو سہارنا بھی، گو اس کے بس کی بات نہ تھی ——— لیکن سہنے کے لئے خود کو بے بس پاتی۔ وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ تقدیر کے سامنے انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ قدرت کے اٹل قانون کیسے بدل سکتے ہیں مشیت ایزدی ———

اور کیا ———

دھیرے دھیرے محمود کی ہمدردی رضوانہ سے بڑھتی جاتی تھی۔ ہمدردی شاید محبت کا پہلا زینہ ہے۔ لیکن ——— رضوانہ کے دل میں محمود نے وہ جگہ نہ لی جو خسرو کی ہو چکی تھی۔ یوں مروت و اخلاق کے کارن وہ اس سے جبراً و قہراً متوجہ بھی ہو جاتی۔ لیکن عورت شاید زندگی میں ایک ہی مرتبہ محبت کر سکتی ہے۔

والدین محمود کے بھی وہی تھے جو خسرو کے تھے۔ ان کی تو یہ دونوں آنکھیں تھیں۔ انھوں نے سوچا خسرو تو اب اس سنسار میں نہیں۔ محمود سے رضوانہ کا عقد کر دینا بہتر ہوگا۔ ورنہ بدنامی ——— اور سماج ——— اس کا کون مقابلہ کرے۔ بزدل قسم کی مخلوق 'سماج' سے بہت ڈرتی ہے۔ کاش اتنا ہی خوف انھیں 'ضمیر' کا ہوتا۔ اور یہ سماج ——— اسکی روح فرسائیوں سے خدا نہ پالا ڈالے۔

خسرو اس دنیا میں نہ ہو۔ لیکن رضوانہ کے دل سے اس کو کون نکالے۔ ادھر والدین کی دھمکیاں۔ پھر ساتھ ہی ساتھ پیار اور چمکار کی باتیں۔ غرض سب ہی کچھ۔

محمود اور رضوانہ کا عقد ہو جاتا ہے۔ بغیر کسی دقت کے۔ اپنی دانست میں یہ سمجھتے ہوئے کہ خسرو تو اب اس دنیا میں نہیں۔

رضوانہ ایک مجرم کی طرح بندھی بندھی [illegible] تو وہ بھول ہی چکی تھی۔ ارکس کے قہقہے ——— [illegible] ہوئے انھیں دفن ہو کر۔

یہ نام نہاد 'دنیا دکھاوے' کی شادی ہوئے ۶ ماہ گزرے ہوں گے کہ جنگ امن سے بدل گئی۔ ماں باپ کے ولولے جاگ اٹھے۔ نت نئے خواب، اپنے اپنے لڑکوں کی واپسی کا حسین تخیل ان کے دل و دماغ کی پامال روشوں میں [illegible]

خسرو کے والدین کی تو آس ٹوٹ چکی تھی [illegible] اب کسی کا انتظار نہ تھا۔ اسی بنا پر رضوانہ محمود کی [illegible] بھینٹ چڑھا دی گئی تھی۔ باوجود انکار [illegible] ساری التجائیں ٹھکرا دی گئیں۔ زبان رکھتے ہوئے بھی اس [illegible] اس قسم کا سلوک جیسے بے زبانوں سے ہوتا ہے۔

ہندوستانی لڑکی کی تمنا اس کی 'اپنی تمنا' ہی کب ہوتی ہے؟ اس کے ارمانوں سے تو جوا کھیلا جاتا ہے۔ اس کے اپنے دل میں، اس کی "اپنی خواہش" تو کوئی چیز ہی نہیں ہوتی اور پھر طنز نگاروں کا طنز ہے کہ عورت بے وفا ہے مکار ہے۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں نہیں۔ اس کی بات کا کیا بھروسہ۔ خیر ——— رونا اس کا ہے کہ قلم دشمن کے ہاتھ میں ہے۔

ع۔ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

لیکن اس کی تو آرزو ہی رہ گئی۔

خسرو لاکھوں تمناؤں کی دنیا کامیابی کا سہرا لیے ہوئے وطن واپس ہوتا ہے۔ وہ جیتا جاگتا ہے۔ صحیح و سالم ہے۔ رضوانہ اس کے حدود تخیل سے ایک لمحہ کو ہٹ نہ سکی لیکن یہاں آکر اپنے چمن حیات کو گلچیں کی دست برد سے پامال و برباد دیکھ کر اس کا دل اس کے قابو میں نہیں رہتا ———

سارے گھر پر مردنی سی چھا جاتی ہے ——— والدین کے دلوں میں اب کس قسم کی امنگیں ہوں گی؟ رضوانہ کے قلب کی بے پناہ دھڑکنیں ہیں کس نوعیت کی کیفیت کا

احساس ہوگا؟ محمود کے ضمیر اور اس کی اپنی جلد بازی کا آخر کیا نتیجہ ہو سکتا ہے؟ رضوانہ اب درحقیقت کس کی ہو سکتی ہے؟ اصولاً و شرعاً ——— ؟ اس کا فیصلہ ——— کون کرے۔

جہاں بانو

(نشرگاہ حیدرآباد سے نشر ہوا)

احتراز

ان کی محفل میں نہ جاؤں گا نہ جاؤں گا کبھی

وہ مجھے بندۂ بے دام سمجھتے ہیں ہنوز
وہ مجھے نقش تہہ گام سمجھتے ہیں ہنوز
زر کے زہر بجھے تیروں سے ڈراتے ہیں مجھے
اپنی محفل میں وہ ہنس ہنس کے رلاتے ہیں مجھے
حسن معصوم کی سوگند ستم گر ہیں وہ
میری نظروں میں خدا ہو کے بھی کافر ہیں وہ
وہ مرے فن کو سمجھتے ہیں جواہر کا عوض
سنگریزے کبھی ہوتے نہیں شاعر کا عوض
وہ مجھے شاعر خوددار سمجھتے ہی نہیں
وہ تو تلوار کو تلوار سمجھتے ہی نہیں

میں اگر چاہوں تو محفل تہہ و بالا کر دوں
ساغر عیش بھر طاق الٹ کر رکھ دوں
بزم شادی کو عزا خانہ بنا کر رکھ دوں
ہر چراغ شب عشرت کو بجھا کر رکھ دوں
نوع آدم ہوں فرشتوں کو بھی حیراں کر دوں
شاہ خاور کے بھی دامن کو گریباں کر دوں
میری تقدیر کی مشکل اگر آساں نہ ہوئی!
فطرت حسن اگر پھر بھی پشیماں نہ ہوئی
اور پھر بھی وہ اگر سر بہ گریباں نہ ہوئے
اپنے محبوب مشاغل سے گریزاں نہ ہوئے
مستقل طور پہ ہے میرا ارادہ ساقی
ان کی محفل میں نہ جاؤں گا نہ جاؤں گا کبھی

ساقی صدیقی

فیشن

"انسان خواہ وہ کتنا ہی اچھا کام کیوں نہ ہو مسلسل کرتے کرتے تھک جاتا ہے اور اس میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے تبدیلی ضروری ہوتی ہے اور اسی تبدیلی کا نام فیشن ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

فیشن کا بدلنا ضروری ہے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے نئی نئی ایجادیں ہوتی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ ہمیں معلوم ہو رہا ہے کہ فلاں چیز ہمارے لئے مفید ہے اور فلاں مضر۔ بعض مروجہ فیشن میں دقتیں پیش آنے لگتی ہیں اس لئے اس کو ترک کرکے نیا فیشن اختیار کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں رواج کا ہر زمانے کے ساتھ بدلنا بدرجۂ اتم ضروری ہے۔ مثلاً پچیس تیس سال قبل ہندوستان میں الکٹریسٹی کا رواج نہ تھا۔ مکان میں دیئے اور شمعیں جلائی جاتی تھیں لیکن جب بجلی کی خصوصیات اور اس کے استعمال کی سہولتیں معلوم ہوئیں تو بجائے لیمپ کے معمولی معمولی گھروں میں بجلی کی روشنی آئی۔

ملک کی فضا اور موسم کا بھی فیشن پر اثر پڑتا ہے۔ ہر ملک کے فیشن جدا ہوتے ہیں۔ ممکن ہے جو چیز ہندوستان میں کی گئی ہو کہ انگلستان میں خراب قرار دیں مثلاً مغربی ممالک میں بال کاٹنا فیشن ہے۔ ہندوستان میں لانبے بال رکھنا خوبصورتی میں شامل ہے۔ مغربی ممالک میں دن میں تین چار مرتبہ کپڑے بدلنا تہذیب ہے اور یہاں اس طرح کرنا وقت کی بربادی تصور کرتے ہیں۔ آج کل عموماً فیشن کے معنی صرف کپڑوں کی حد تک لیتے ہیں لیکن در اصل اس کا پتہ انسان کی زندگی کے ہر شعبے سے چلتا ہے۔ مثلاً بود و باش، کپڑے کھانا پینا وغیرہ۔

ہماری معاشرت میں آج کل بناوٹ بہت زیادہ ہو گئی ہے اور ہماری طرزِ زندگی میں تکلف اور نمائش بہت داخل ہو گئے ہیں۔ تہذیب و تمدن اور فیشن کا مطلب غلط سمجھا گیا ہے اور یہ بات فرض کر لی گئی ہے کہ جب تک ظاہری ٹیپ ٹاپ سے سادگی اور بے تکلفی کا خون نہ کیا جائے انسان مہذب (civilized) نہیں رہتا۔ اس طرح ہماری زندگی ایک کھلا ہوا ڈھکوسلہ بن گئی اور ہماری ہر معمولی کام میں بناوٹ اور تصنع داخل ہو گیا مثلاً ملنے جلنے میں، کھانے پینے میں الغرض زندگی کے ہر شعبے میں۔

وہی فیشن اچھا اور قابلِ تقلید ہے جس میں ہمیں آرام و چین نصیب ہو جس سے لوگوں کو انگشت نمائی کا موقع نہ ملے۔ آج کل بیسیوں عمدہ عمدہ رواج ہیں اور ان فیشنوں پر چلنے سے ہماری زندگی بہت اچھی ہو گئی ہے۔ مثلاً مکانات جو سو سال پہلے بنائے جاتے تھے عموماً بے ترتیب اور صحت کے لئے خراب ہوتے تھے لیکن آج کل کے خوبصورت مکان میں رہائش کے علاوہ حفظانِ صحت کا بھی بہت کچھ لحاظ رکھا جاتا ہے۔ ایسے مکانات بنانے کی تقلید ہندوستانیوں نے بھی کی اور وہ اس حد تک اچھی بھی تھی لیکن جرمن وضع کے مکان جن کا حیدرآباد میں بہت رواج ہے میرے خیال میں ہندوستانیوں کے لئے موزوں نہیں۔ کیوں کہ ایسے مکانوں کی چھت بہت نیچی ہوتی ہے جو مغربی ممالک کے لئے کافی ہے کیونکہ وہاں کا موسم بھی بہت سرد رہتا ہے اور پست مکان گرم ہوتے ہیں لیکن حیدرآباد میں اس کی تقلید کرنا کہاں تک مناسب ہے؟

کسی دوسرے ملک کے فیشن کی اندھی تقلید کرکے تختۂ مشق بننے سے پہلے بہتر یہ ہے کہ ہم سوچیں کہ ان لوگوں نے کیوں اس قسم کا فیشن اختیار کیا۔ ہمارے لئے اس کی تقلید میں کیا برائی اور کیا بھلائی ہے۔ اگر اس پر غور کرکے ہم کوئی چیز اختیار کریں گے تو بجائے انگشت نمائی کے ہم قابل نہیں ہوں گے۔ ہم میں اور انگریزوں میں یہی فرق ہے۔ وہ ہماری اچھی چیزیں چھین کر اپنا لیتے ہیں اور ان کا استعمال سلیقہ سے کرتے ہیں برخلاف اس کے ہم بدھو کی طرح بغیر سوچے سمجھے ان کی پیروی کرتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے"۔

ہمارے دوسرے ہندوستانی بھائی ہم پر ہنستے ہیں اور انگریز بھی بیوقوف سمجھتے ہیں۔ اس بھونڈی تقلید سے ہم اپنی انفرادیت کھو دیتے ہیں۔

ایک صاحب کیا خوب فرماتے ہیں کہ فیشن کا دوسرا نام "ایک حمام میں سب ننگے" کا ہے بظاہر تو کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ فیشن کی اندھی تقلید کہئے یا بھونڈی نقالی ہندوستان کی بربادی اور تباہی کا باعث ہے۔

دنیا کا ہر ملک دوسرے ممالک کی اچھی چیز کی پیروی کرتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں تقلید اس طرح پھیلی ہے کہ دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے۔ بہت کم ہندوستانی ایسے نظر آئیں گے جو اپنی خاص وضع پر قائم ہوں ورنہ عام طور پر غیر ممالک کی تقلید اس حد تک کرتے ہیں کہ اچھائی اور برائی کا بھی امتیاز باقی نہ رکھا۔ یورپ سرد ملک ہونے کی وجہ سے وہاں شراب کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستانیوں نے اس کی نقل شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گردے اور پھیپھڑے خراب ہوگئے۔ باوجود اس کے وہ خوش ہوتے ہیں کہ ہم میں اور انگریزوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

یورپی دنیا میں فیشن کا مرکز کئی سال سے فرانس رہا۔ یہاں جو فیشن رواج پاتا ہے ساری دنیا میں اسی کی تقلید ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج کل حیدرآباد ہندوستان کا پیرس بنا ہوا ہے۔ یہاں کسی دعوت یا جلسہ میں جائیے قسم قسم کے لوگ نئے نئے روپ میں نظر آتے ہیں اور لطف تو یہ کہ خواہ انھیں وہ لباس اچھا معلوم ہو یا برا۔ انگریزوں کا لباس عریاں نہیں تو نیم عریاں تو ضرور ہے۔ ان کے گلے اور آستین چھوٹے رہتے ہیں۔ ہم بغیر غور کئے اس نمونے کے لباس پہنتے ہیں۔ اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ ہم فیشن کی خاطر عریاں ہو رہے ہیں اس لئے ہمیں چاہیے کہ کسی فیشن کو اختیار کرنے سے پہلے امتیاز کریں کہ آیا وہ اچھا ہے یا برا۔

جب کوئی برگزیدہ ہستی یا کوئی شہزادی کسی چیز کو اختیار کرتی ہے تو لوگ اس کی تقلید کرنے لگ جاتے۔ اس طرح نئے نئے فیشن وجود میں آتے ہیں۔ یہ طریقہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اسٹیل نے اپنے ایک مضمون (Fashionable affectations) میں اس مسئلہ پر کافی بحث کی ہے۔ مثلاً سکندر اعظم کی گردن ایک طرف ذرا سی جھکی ہوئی تھی لوگ اس کی تقلید کرنے لگے۔

فیشن کے واسطے یہ ضروری نہیں کہ وہ کوئی نئی طرز اختیار کریں۔ آج کل پرانے فیشن کی طرف بہت میلان پایا جاتا ہے۔ اگر ہندوستانی نقالوں کے سامنے چند بدترین چیزیں فیشن بنا کر پیش کی جائیں تو وہ اس کو فوراً قبول کریں گے۔ ہم لوگوں پر تقلید اس قدر غالب آگئی اور ہر چیز پر اس قدر بناوٹ غالب ہے کہ ہم خود مصنوعی ہوگئے ہیں۔ ہم ہر چیز میں انگریزوں کی پیروی کرتے ہیں مثلاً ہندوستانی مٹھائی کے بجائے چاکلیٹ پسند کرتے ہیں۔ روٹی بسکٹ کو بریانی پر ترجیح دیتے ہیں۔ گو دل تو چاہتا ہے کہ بریانی چکھیں لیکن فیشن کے خیال سے روٹی مسکہ کھاتے ہیں۔ یہ ہے ہماری معاشرت کا رنگ۔

رہنے سہنے کے طریقوں میں بھی بہت نقل کرتے ہیں۔ مغربی ممالک کے لوگ فرش پر نہیں بیٹھتے بلکہ صوفوں پر اپنی عمر گزارتے ہیں۔ لیکن اس کا سبب بھی ہے۔ وہاں فرش اس وجہ سے استعمال نہیں ہوتا کہ وہاں کا موسم بہت سرد ہوتا ہے اور پتھروں کی ٹھنڈک سے بیمار پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستان جیسے گرم ملک میں ہمیشہ صوفہ پر بیٹھنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن کیا کریں فیشن ایبل کہلانے کی خاطر سب کچھ گوارا کر لیتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں اپنے آپ کو بیمار بتانا شاید ایک فیشن سمجھا جاتا ہے کچھ زمانہ پہلے جس کسی کو دیکھو وہ درد گردہ میں مبتلا ہے چاہے درد اس کے پاؤں میں ہوتا ہو چاہے سر میں لیکن ہمیشہ وہ خود کو اس مرض میں مبتلا کہتا ہے۔ اب تو

ٹانسلز کی شکایت عام ہو گئی ہے ممکن ہے آئندہ صحت مند لوگ ٹائیفائڈ میں مبتلا نظر آئیں!!!

آج کل سینما لوگوں کی زندگی کا ایک حصہ بن گئے ہیں سینما کا اثر فیشن پر بہت پڑ رہا ہے۔ اونچے اخلاق والوں پر سینما کا اچھا اثر پڑتا ہے لیکن کمزور اطوار والے چال ڈھال بات چیت، الغرض ہر ایک چیز میں ایکٹروں کی تقلید کرتے ہیں۔

باوجود ان تمام باتوں کے فیشن کا ہونا ضروری ہے۔ اگر ہم اس کو اچھی طرح عمل میں لائیں تو یہ ایک بہت اچھی چیز ہے۔ یکسانیت کی زندگی سے موت بہتر۔ ترقی کے لیے تبدیلی ضروری ہے لیکن کس قسم کی تبدیلی ——— جو تبدیلی ہمارے موافق ہو اور اس سے ہمیں راحت و آرام ملے نہ کہ تقلید جو ممکن ہے ہمیں پیرس کے کی طرح انجمنیں بنانے کی اجازت دے اور ہماری حالت اس شعر کے مصداق ہو جائے۔

ہوئے اس قدر مہذب کہ نہ دیکھی گھر کی صورت
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

فریدہ

خوش آمدید

یہ کون جھجکتا آتا ہے! | کیوں آتے ہوئے شرماتا ہے
انداز تو چلنے کے ہیں وہی | ہر گام پہ ہے اک موسیقی
ہے قدمیں وہی ڈالی کی لچک | سوآئی نظر بندوں کی چمک
وہ ہاتھ لیے ساغر کھنکے | ناہید نے چھیڑے ساز نئے
خوشبو کی لپٹیں آتی ہیں | دامانِ فضا مہکاتی ہیں
لو آہی گئے وہ آہی گئے | اور دیدہ و دل پر چھا ہی گئے

اب جانے کہاں کھو جاؤں گا
میں ان پہ فدا ہو جاؤں گا

دو قطعے

گر نہیں تیرے لئے لطفِ بہاراں نہ سہی
عیش و عشرت نہ سہی بزم و شبستاں نہ سہی
ہو مبارک یہ جوانمردوں کا جینا تجھ کو
ہمتِ مور تو ہے ملکِ سلیماں نہ سہی

لطفِ ساحل نہ سہی تلخیٔ طوفاں ہی سہی
نورِ ایماں نہ سہی ظلمتِ عصیاں ہی سہی
ہائے محرومیٔ جادہ کہ یہ بھی تو نہیں
زندگی خواب سہی، خوابِ پریشاں ہی سہی

سلیمان اریب

محسوسات

نگاہوں میں خمار آتا ہوا محسوس ہوتا ہے
تصور جام چھلکاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

خرامِ ناز، اور ان کا خرامِ ناز، کیا کہنا !
زمانہ ٹھوکریں کھاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

تصوّر ایک ذہنی جستجو کا نام ہے شاید !
دل ان کو ڈھونڈھ کر لاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

کسی کی نقرئی پازیب کی جھنکار کے صدقے
مجھے سارا جہاں گاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

تھرکتا ہے گھٹا کا عکس موجوں کی روانی پر
کوئی آنچل سا لہراتا ہوا محسوس ہوتا ہے

لچکتا جسم رقصِ بیخودی میں دیکھنے والو
سنہرا سانپ بل کھاتا ہوا محسوس ہوتا ہے

قتیلؔ اب دل کی دھڑکن بن گئی ہے چاپ قدموں کی
کوئی میری طرف آتا ہوا محسوس ہوتا ہے

قتیلؔ شفائی

مشرق

(از موپاساں)

جیسے ہی سرما شروع ہوتا ہے میں اپنے دوست کو یاد کرنے لگتا ہوں جو بہت دور ایشیا کی سرحد پر رہتا ہے۔

پچھلی دفعہ میں اس سے ملنے گیا تھا، میں جانتا ہوں کہ دوبارہ اس سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ آج سے تین سال قبل ستمبر کی بات ہے کہ میں ایشیا گیا تھا، میں نے وہاں اس کو اپنے دیوان خانے میں افیون کے نشے میں نیم خوابی کی حالت میں پایا۔

اس نے بغیر حرکت کئے کہنا شروع کیا "بیٹھ جاؤ، پھر تم جو کچھ پوچھو گے میں اس کا جواب دیتا جاؤں گا، لیکن میں حرکت نہیں کر سکتا" میں بیٹھ گیا اور پیرس کے متعلق ہزاروں باتیں کہہ ڈالیں۔ لیکن اس نے کہا "تم کیا کہہ رہے ہو مجھے اس سے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں کیونکہ میں ایسے ممالک کا دلدادہ ہوں جو دوسرے آسمانوں تلے بستے ہیں۔ اوہ بیچارا کاٹر اینو نے مشرق دیکھنے کی خواہش میں جان دیدی، تم نہیں جانتے کہ یہ ملک کس طرح مسحور کرتا ہے۔ یہ تمہاری آنکھوں کی راہ تمہارے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے اور اپنی محبت کے غیر مرئی دھاگے میں باندھ لیتا ہے۔ میں یہاں افیون کی رنگینیوں سے کھیلتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کیں۔

میں کہا "تمہیں زہر میں کیا مزہ ملتا ہے۔ تمہیں اس سے کیا جسمانی لذت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ یہ تمہارا ایک نہ ایک دن خاتمہ کر کے رہے گا۔" بات کاٹتے ہوئے اس نے کہا۔

"یہ جسمانی لذت نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کوئی شئے ہے۔ افیون تمام دنیوی جھگڑوں سے دماغ کو نجات دلاتی ہے۔" "کیا تم جاننا چاہتے ہو مجھے کون کونسی چیزیں پسند ہیں۔ لو سنو! ایک تو یہ افیون اور دوسرے یہ مشرق۔ میں جب افیون کھا کر لیٹ جاتا ہوں تو پہلے ہلکا ہلکا سا نشہ ہوتا ہے اس کے بعد تمام اعضاء پر یہ اثر چھا جاتا ہے۔

اس کے بعد میں بالکل بے خود ہو جاتا ہوں، مجھے بے اندازہ مسرت ہوتی ہے جس کو میں بیان نہیں کر سکتا، میں خیالات کے اتھاہ سمندروں میں بہتا ہوا مسرت و انبساط سے ہمکنار رہتا ہوں۔ دوبارہ اس نے آنکھیں بند کیں۔

میں نے کہا تم جو مشرق سے اتنی محبت کرتے ہو وہ صرف اس نشہ کی وجہ سے ورنہ کوئی کیونکر اس وحشی ملک کو پسند کرے گا جہاں دماغ بے حس ہیں، جہاں خیالات پر صدیوں کی روایتوں کا بار ہے، جہاں جدِ حیات نام کو نہیں۔

"میں جس سے محبت کرتا ہوں وہ خواب ہے، وہ حسین ہے تم کہتے ہو "مشرق ایک وحشی ملک ہے" خاموش، بدتمیز آدمی یہ ایک فرشتوں کا ملک ہے وحشی ہم مغرب کے لوگ ہیں جو اپنے آپ کو متمدن اور شائستہ سمجھتے ہیں، ہم قابلِ نفرت وحشی ہیں جو حبشیوں سے بدتر زندگی گزارتے ہیں۔

ہمارے پتھر سے بنے ہوئے شہروں اور خوبصورت فرنیچر کی طرف دیکھو ہماری ساری زندگی نمائشی ہے۔ گھروں کے دود کشوں کو دیکھو جس میں سے خون کو جما دینے والی ٹھنڈی ہوائیں اتنی کافی آتی ہیں کہ ان سے چکی چل سکتی ہے۔ ہماری ساری زندگی کرسیوں پر گزرتی ہے۔ کتنی مضحکہ خیز چیز ہے ...... ہماری دماغی زندگی پر بھی نظر ڈالو جو کتنی مصیبتوں اور کشمکشوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ آئے دن لڑائیاں ہوا کرتی ہیں ہر طرف تباہی کا بازار گرم ہے۔ وہ تھوڑی دیر کیلئے خاموش ہو گیا پھر کہنا شروع کیا: میں اس مکان کو جانتا ہوں جس کو قریب میں خریدنے والا ہوں وہ ایک مشرقی وضع کا بنا ہوا لکڑی کا مکان ہے۔ تم اس مکان سے سمندر کو آسانی سے دیکھ سکتے ہو، سفید بادبان تیرتے ہوئے دکھائی دیں گے، ترکوں اور یونانیوں کی کشتیاں نظر آئیں گی۔ مکان میں چھوٹا سا چمن ہے جس میں ٹھنڈی ٹھنڈی معطر ہوائیں سرسراتی ہیں، درختوں کی شاخوں سے فوارے ابلتے ہیں اور آبشار کی صورت

میں ایک حوض میں گرتے ہیں جس کی تہہ سونے کی بنی ہوئی ہو وہاں میں ہر وقت نہاؤں گا۔ میں کوئی نوکر نہیں رکھوں گا اس لئے کہ وہ اپنے میلے پیروں کی ٹھوکروں سے فرش کو خراب کرتے ہیں۔ میں اب فرش پر کبھی بھی جوتوں کی آواز نہیں سن سکتا، میں خوبصورت کالی عورتوں کو نوکر رکھوں گا جو سفید برقعوں میں ننگے پیر قالین پر تھرکتی رہیں گی۔ میرے مکان کی دیواریں ایسی صاف اور چکیلی ہوں گی جیسے ایک حسین عورت کا شفاف سینہ۔

جب میں ان تمام حسین اور دلکش مسرتوں سے تھک جاؤں گا، جب میری خوشی میں تھوڑی سی کمی ہوگی کسی سفید یا سیاہ گھوڑے پر سواری کروں گا۔ میں شام کی خاموش فضا ملگجا میں گھوڑے پر سوار دیوانہ وار ڈوبتے سورج کی طرف دوڑوں گا.... ہر چیز گلابی ہوگی —— پہاڑ —— ریت —— عربوں کے کپڑے —— اور گھوڑوں کے سفید کپڑے۔ انسانوں کو سیاہ کپڑے پہنے ہوئے تکلیف دہ کرسیوں پر بات چیت کرتے ہوئے سڑکوں کے کنارے یا ہوٹلوں میں کبھی بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں اپنے حسن و دلکش مکان میں اطمینان سے زندگی بسر کروں گا۔ تمام دنیوی ہنگاموں سے —— اور بہت دور۔ میری چار پانچ بیویاں ہوں گی جو قیمتی قیمتی لباسوں میں ملبوس رہیں گی۔ یہ دنیا کے مختلف گوشوں سے آئیں گی اور مجھے دنیا کی ہر نسل کی نسوانی خوبصورتی اور لذت کا مزہ چکھائیں گی۔

ایک دم وہ خاموش ہوگیا اور کہنے لگا۔ مجھے چھوڑ دو —— مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا اس کے بعد پھر اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ تین مہینے کے بعد اس نے ایک خط لکھا جس میں فقط یہی درج تھا "میں خوش ہوں"

اس کا خط روح پرور خوشبو میں ڈوبا ہوا تھا۔

محمود قادری

دہوکے

میں جانتا ہوں تخیل میں کیا نہیں ہوتا — شباب شعر کی دنیا شراب کی بستی
وفورِ صبح گل افشاں، نشاطِ شام نجوم — زمیں سے عرش تلک ایک بے پناہ مستی
ہر ایک چیز نہاں زیرِ دامنِ امکاں — نگاہِ ذوقِ طلب پر ہر ایک شئے سستی
وہ چند لمحے تصور کی وسعتوں سے لطیف — وہ ہر وجود سے اک بوجھ سی مری ہستی
ندیم کاش یہ لمحے ہی زندگی ہوتے! — کہ میرے دل کو نہ ڈستی مری تہی دستی

میں اس زمین سے کچھ دور ہو گیا ہوتا
اسی جہانِ تخیل میں کھو گیا ہوتا

اقبال متین

محمد قلی قطب شاہ اور رومانیت

محمد قلی قطب شاہ کا عہد تاریخ گولکنڈہ کا وہ دور ہے جبکہ دکن ہند اسلامی ثقافت و تمدن کا سنگم بنا اور ہندو مسلم آرٹ کا ایک حسین امتزاج پیدا ہوا۔ چنانچہ محمد قلی قطب شاہ پہلا دکنی مسلمان بادشاہ ہے جس نے ہندوؤں کے لباس اور طرز ماند و بود کو اختیار کیا۔ اسی یگانگت اور میل ملاپ کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد قلی کے دربار اور محلات شاہی میں ہندوؤں نے بار پانا شروع کیا اور قلی کی حسن پرست طبیعت نے ایک عجیب شعر بیسا رومانی فضا پیدا کر دی۔

کلیات محمد قلی قطب شاہ اٹھا کر دیکھیے تو اکثر و بیشتر نظمیں ایسی ملیں گی جن کے پیچھے ہمیں محمد قلی کے دربار میں حسن و عشق کے ڈرامے کھیلے جاتے نظر آئیں گے۔ یہ دربار کیا تھا گویا حریم ناز تھی اور یہ نظمیں کیا ہیں گویا اس حریم ناز کی زندہ اور جاگتی پھرتی تصویریں ہیں۔ ان رومان آگیں فضاؤں میں محمد قلی کا دل جو زندگی اور کائنات میں سوائے حسن و عشق کے کسی اور حقیقت کو کارفرما نہیں دیکھتا چوبیس گھنٹے تیرتا نظر آتا ہے۔ محمد قلی میں حسن و عشق کا احساس بچپن ہی سے قدرت نے ودیعت کیا تھا اور رومانیت کا ایک شدید حسی کیف (Hyper Sensitiveness) اس کی ساری زندگی میں رواں دواں نظر آتا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کا کلیات دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک میں نظموں کا طویل مجموعہ ہے اور دوسرے میں غزلیات ہیں۔ غزل اور نظم اگرچہ صنعت کے اعتبار سے دو علیحدہ چیزیں ہیں لیکن یہ دو قوالب رنگ تغزل "کلیات محمد قلی قطب شاہ" میں ایک ہی اسپرٹ سے نکلتے ہیں اور وہ اسپرٹ رومانیت (Romanticism) ہے۔ غزلوں میں یہ اسپرٹ رمزیت کے پردہ میں جھلکتی ہے اور محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کے عام پہلو اس میں دکھائی دیتے ہیں۔ شاعر کے جذبہ و خیال کا ایک دھندلا سا عکس ان غزلوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن نظم کا حصہ خاص طور پر محمد قلی کے دربار سے وابستہ ہے جس سے حسن و عشق کی ایک عجیب و غریب دنیا (Physical world) ہویدا ہے۔ اس دنیا میں محمد قلی گم ہو کر ساری کائنات سے پرے نکل جاتا ہو۔ فلسفہ اور حکمت اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہاں اگر اہمیت ہے تو اپی کیورس (Epicurus) کے قول کے مطابق "کھاؤ پیو اور عیش کرو" کی حد تک۔ چنانچہ علم کی نارسائی کا شکوہ کرتے ہوئے عیش کا ترانہ وہ یوں گاتا ہے۔

دنیا کا حکمت نا بوجھیں ہرگز حکیماں علم سوں
گا تو ترانہ عیش کا ہر دم پیا کے نام پر

اس ترانۂ عیش کے لئے وہ اپنی "پیاریوں" کی محفل جماتا ہے۔ اور ان کے لئے محل تعمیر کرواتا ہے۔ ان محلوں میں ہر وضع کی نازنیناں بے تکلفی کے ساتھ اپنے حسن و جمال اور آرائش و زیبائش میں مصروف و منہمک اور عشق و مستی کی عجیب و غریب کیفیتوں اور جوانی و رعنائی کے لئے بے پناہ جذبات کے مظاہرے کرتی رہتی ہیں۔ محمد قلی کی پیاریوں میں ننھی، ساؤنلی پیاری، گوری، چھبیلی، لالا، بلقیس زمانی، ہندی چھوری، پدمنی، سندر، مشتری اور بھاگ متی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں کیونکہ ان پر محمد قلی نے مستقل نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے حسن و جمال کی داد دی ہے اور ان کے ساتھ اپنے عاشقانہ تعلقات کا اظہار کیا ہے۔ محمد قلی کو ان پیاریوں سے جو لگاؤ تھا اس کا اظہار ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بھاگ متی کی خاطر محمد قلی نے موسیٰ ندی کی تیزی و طغیانی میں اپنا گھوڑا ڈال دیا اور اپنی پیاری بھاگ متی کی جان بچائی۔ اس جرم کی پاداش میں اس کو محل میں چند دنوں قید بھی رہنا پڑا۔ اپنی پیاریوں کے حسن و جمال اور غمزہ و عشوہ کی تصویر محمد قلی نے اپنی نظموں میں کھینچی ہے اس کے چند اشعار ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

شمع :-
وونڈکر لاج سوں انچل وڈنیں لٹکی چمن
اس شمع ڈال اوپر کیوں لگیا ہے سیو لیاں

سوکاسوں کریں جو غصہ و ناز کی بات
جب ہونٹاں تے جھڑے پھوپی یہو منظا سکوں

(شرح :- جب چمن میں شمع محو خرام ہوتی ہے تو شرم کے مارے آنچل ڈال لیتی ہے۔ معلوم نہیں کہ اس شمع ڈالی پر ابھی سے شباب کے پھل کیوں لگ گئے۔ جب وہ غصہ یا ناز سے خط مہر کے اشارہ سے بات کرتی ہے اور اس کے ہونٹ عرق آلود ہوجاتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ اس کو گلی دیکھوں)

کنولی :-
تازگی تے تازہ چنچل آئی میرے برسنے
بیل کوں لے سبز آنچل پھول جیغہ پر منے

کنولی پیاری پہلی باری ڈاوساری دادوں
نین نار نرنگ و مداری امد خماری سرسنے

نیہہ وھن کا ناز گن کا پاوں جھنکایوں ہے
آس من کا عیش تن کا ذوق کن کا ہے

(شرح :- یہ شگفتہ چنچل پھر میرے یہاں سبز آنچل اوڑھے اور پھولوں کی کلغی لگائی ہوئی آئی۔ اس کی اٹھر چال سے شراب کا خمار اور آنکھوں میں رنگ کے ڈورے نظر آتے ہیں۔ اس حسین کی محبت اور اس کے پاؤں کی جھنکار دل کے لئے امید، تن کے لئے عیش اور کان کے لئے ذوق کا باعث ہے)

پیاری کے متعلق لکھتا ہے :-
رین دن کوں جانے تا جو کوئی جیو عاشق ہے تیرا
لگیا ہے یادیوں تیرا کہ بھی کچ یاد آئے نگی

(شرح :- جو دل سے تیرا عاشق ہے اس کو رات اور دن کچھ بھی سجائی نہیں دیتا۔ تیری یاد کچھ اس طرح لگی ہوئی ہے کہ پھر کچھ بھی یاد نہیں آتا) محبوب کی یاد اور اس کی مرکزیت کی مثال نہیں موتمن میں ملتی ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مشتری کے متعلق لکھتا ہے :-
ترا ہستی اسی کا نور ہے تن میں حیا ہو
تو تج ہستی مجھے تا ابد لگ باصفا ہو

اسی ہستی کے تئیں توں جب پیا ہو ویں دل میں
ہزاراں شکر و سجدے کر کہ تج سو مرحبا ہے

ہمن دل کے گنوارے میں تجن کا نور دستا
سورج کرناں کی ڈوریاں سوں جھلکتا خوش کھی

(شرح :- زندگی اسی کا نام ہے کہ جسم میں دل ہو اور ہمارا دل ہمارا معشوق ہے جس میں عشق کی ابدی مستی ہے جس کی وجہ سے وہ ہمارے دل میں عرصہ سے جگہ پائے ہوئے ہے۔ جہاں اس کا نور سورج کی شعاعوں سے زیادہ خوشنما اور روشن ہے)

ان اقتباسات کے علاوہ ہمیں کلیات محمد قلی قطب شاہ میں بیسیوں نظمیں ایسی ملیں گی جو محمد قلی کی حسن افروز اور عشق لبریز زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ اپنی پیاریوں کی محبت میں محمد قلی نے جذبات و احساسات کا اظہار جس حسن کارانہ انداز میں کیا ہے وہ محض تخیلی قلابازیاں نہیں ہیں بلکہ سچی تصویریں ہیں۔ ڈاکٹر زور صاحب نے کلیات کے مقدمہ میں بڑی درست اور عمیق بات لکھی ہے کہ

" دنیا کا کوئی شاعر اپنے کلام میں اپنی زندگی کو اتنا عریاں نہیں پیش کر سکا تھا جتنا کہ محمد قلی نے کیا۔ اس کا کلام قلب کی گہرائیوں سے

کھلتا تھا۔ اس کو مبالغہ، تصنع یا آورد کی
ضرورت ہی نہ تھی۔"

ایک اور مقام پر زور صاحب یوں رقمطراز ہیں:۔

"شباب کی رنگا رنگیوں اور جذبات کی جولانیوں
کے اظہار میں اس کا قلم غیر معمولی قدرت رکھتا تھا۔ اور یہ
قدرت تخیلی یا فرضی عشق و عاشقی سے نہیں پیدا ہو سکتی۔ محمد قلی
صحیح معنوں میں اس میدان کا مرد تھا۔ اس کے رفیع الشان
محل نہ تھے بلکہ اصل میں یہی قومی حسن، نغمہ کی وسیع اور
آراستہ و پیراستہ نمائش گاہیں تھیں۔"

محمد قلی کی ان نظموں کا مقابلہ ہم اردو ادب کے شباب
پیغمبر جوش ملیح آبادی کی نظموں سے کر سکتے ہیں۔ دونوں میں
ہمیں وہی رومانیت کا شدید ترین احساس مشترک طور پر
ملتا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ محمد قلی میں عریاں واقعیت
ہے اور جوش میں جس کو غالباً محمد قلی جیسا جمالیاتی ماحول
نصیب نہیں تخیلیت اور واقعیت کا امتزاج ہے۔ محمد قلی
نے پیاریوں کے ذکر میں بعض راز و نیاز کے معاملات بھی
اس انداز سے پیش کئے ہیں کہ موجودہ ترقی پسند ادب
کے بعض عریاں افسانوں اور نظموں کو بھی شرم آنے لگے۔
لیکن یہ محمد قلی پر کوئی الزام نہیں کیوں کہ جیسا کہ ہم نے بیان
کیا ہے محمد قلی اپنی زندگی کے ہر پہلو کو عریاں سے عریاں
انداز میں اور پوری پوری واقعیت کے ساتھ پیش کرتا ہے
وہ شعر و سخن کا شوق ادبیات میں کوئی خاص مقام حاصل
کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے جذبۂ عشق کی تسکین کے لئے کرتا
ہے اور یہ مقصد بے مقصود یا کانٹ کے الفاظ میں
(Purposiveness without purpose)
اس کو صحیح معنوں میں ایک بڑا حسن کار بنا دیتا ہے۔ خواہ
اس کا پیرایۂ اظہار عریاں ہی کیوں نہ ہو چلے۔ چنانچہ
"نقشۂ وصال"، "عیش و وصال" اور "بعد و وصال"
وغیرہ اس کی عریاں نگاری کی مثالیں ہیں۔ اپنی پیاریوں
کے ناز و انداز پر بھی اس کا قلم جذب و کیف کے ساتھ
رواں ہے۔ "نازنین"، "اسرار شباب"، "انداز شباب"،
"چنچل مین"، "ماہ ابرو"، "کعبہ رخ"، "سرو خوش قد"، "چاندنی
اور سجن"۔

چاندنی اور پیا ـــــ ان تمام نظموں میں شباب
کی لذتیں اور عیش کی وسعت گیر رعنائیاں اپنے انتہائی نقطہ
پر نظر آتی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مدعا نہیں کہ محمد قلی کی عشق
و عاشقی اس کے مادی ماحول (یعنی اپنی پیاریوں کی زلفوں
میں) الجھ کر رہ گئی۔ بلکہ محمد قلی اس سے بھی آگے بڑھتا ہے۔
اس کی محبت کی ابتدا عورت سے ہوتی ہے لیکن انتہا اس
(Great She) پر جس کو خدا کہتے ہیں۔

When a man loves a woman,
Then He Knows God's secret and
secret of the world. (Oskar Wilde)

اگرچہ آسکر وائلڈ کی طرح میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ محمد قلی
کی اس عشق و عاشقی نے اس پر کائنات کے سارے راز فاش
کر دیے تھے۔ اور نہ میں اس کا قائل ہوں کہ ایک رومانی
شاعر کہاں تک فلسفہ طرازی کر سکتا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ
جس مادی ماحول کی محمد قلی نے اپنے کلام میں عکاسی کی ہے وہ
اپنی پوری گہرائیوں کے ساتھ اس میں موجود ہے اور پھر حافظ
کے مطالعہ نے محمد قلی کی طبیعت پر تصوف و عرفان کا کچھ ایسا
رنگ جما دیا تھا کہ بعض نظمیں حافظ کی غزلیات کا بالکل ترجمہ
معلوم ہوتی ہیں۔

محمد قلی نے نہ معلوم اپنی پیاریوں کے تعلق سے یا کسی اور
سیاسی وجوہ کی بنا، پر باشندگان دکن سے کچھ ایسے
مذہبی اور گہرے روابط پیدا کر لئے تھے کہ "مرج البحرین
یلتقیان" کے بمصداق اسلامی اور ہندو کلچر کے دو دھارے
گولکنڈہ کی سرزمین میں بہنے لگے۔ چنانچہ اس نے بعض ایسی
عیدیں اور تہوار رائج کئے جو حضرت اس کی رومان پسند
طبیعت میں ترنگیں پیدا کرتی تھیں بلکہ اس کی رواداری اور

سیاہی قابلیت کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ "نوروز" "بسنت" "شب برات"، بقرعید اور دوسری عیدوں پر محمد قلی نے جو نظمیں لکھی ہیں ان میں ان دونوں پہلوؤں کا اظہار ہوتا ہے۔ خاص کر "نوروز" اور "بسنت" میں محمد قلی دلچسپی سے حصہ لیتا اور عیش و طرب کی داد دیتا تھا۔ ان موضوعات پر محمد قلی قطب شاہ کے نہایت بلند پایہ قصیدے اور نظمیں ملتی ہیں جو اس کی انتہائی مسرت کی ترجمانی کرتی ہیں۔ بسنت کی عید میں محمد قلی کی ہندوستانیت پرستی جھلکتی ہے اور یوں بھی عیش و طرب کے لئے (جو فطرتاً محمد قلی میں جذبہ موجود تھا) بسنت سے بڑھ کر کون سا موسم ہو سکتا ہے۔ ان نظموں میں اس نے جس بے ساختگی اور رنگینی کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔

شب برات پر ایک نظم میں لکھتا ہے :-

ہر ایک دھن ہر یک کدھن، پہل نورتن کے ابرا ہیں
پی مدمدن جھلکا بدن، شہ یک چمن کوں آئے ہیں
سوں مکھ شباب کے رنگ آب کوں، آفتاب جھلاتا تا
دکھلائے کر مہتاب کوں، بے تاب کر بجلائے ہیں
سو دھن لٹک کے جب جھلک، دونوں الک کے سو مہک
مہکیا ملک پر تھے فلک، بے سد ہو لک لک آئے ہیں
چھاتی اپر چھاتی سندر، لٹ سیاہ بھر پیچ بس بھتر
جانے گر کالے اژدو نگر پہ چڑ لنے آئے ہیں

(شرح :- ہر طرف سے ہر ایک نازنین نورتن کا لباس پہن کر آئی ہے تاکہ بادشاہ کے ساتھ چمن میں نکلے۔ شراب عشق پینے سے ان کے جسم جھلکنے لگے ہیں۔ اور اپنے نوجوان چہروں کے آب و رنگ اور آفتاب جیسی جھلک سے مہتاب کو بے تاب بنا کر پگلا رہی ہے۔ نازنیں اس انداز سے محو خرام ہے کہ اس کی زلفوں کے لہرانے کی وجہ سے خوشبو آسمان تک پہنچی ہے اور سارا آسماں مہک گیا ہے۔ ایک سے ایک کے پستان زیادہ خوبصورت ہیں جن پر سیاہ بادلوں کی لٹیں ایسی نظر آتی ہیں جیسے پہاڑیوں پر کالے کالے بادل چڑھائی کرنے آئے ہیں)۔

بسنت پر ایک قصیدے کے چند اشعار ہیں :-

پلا ساقی مرا مدے کہ تا ہوئے کشف ہم نا کون
کہ اس مے تے دیسے منج کوں سدا سب راز پنہانی
عنبر ہور عود و مشک و زعفراں کا رت آیا
اسی تے باس ان کا جگ میں کرتا ہے گلستانی
بسنت پھل کا مالا پہن کر آئی انگن میں دھن
سو پھلی سنگار کے نقشاں سنے حیران ہے مانی

(شرح :- اے ساقی! شراب پلاتا جا تاکہ مجھ کو کشف ہونے لگے کیونکہ شراب کی وجہ سے مجھے پوشیدہ راز بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ عنبر، عود، مشک، زعفران کی رت آئی ہے۔ اس وجہ سے ان سب کی خوشبو دنیا کو گلستاں بنا دیتی ہے۔ بسنت کے پھولوں کی مالا پہن کر وہ جیسی چمن میں نکل آئی ہے۔ جس کے پھولوں کے نقش و نگار کو دیکھ کر مانی بھی حیران ہے)

اسی طرح عید میلاد نبی، شب معراج، شب برات، عید گری، عید غدیر، وغیرہ پر محمد قلی کی بلند پایہ نظمیں ملتی ہیں۔ ان نظموں کی ایک خاص خصوصیت اس کی منظر نگاری اور محاکاتی پہلو ہے۔ بعض بعض مقامات پر موسم کی کیفیتوں کو اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ ہمیں ورڈسورتھ کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ اور اپنی پیاریوں کی وہ تصویریں (Panorama) جو عیش و طرب کی حالت میں اس کے پیش نظر ہوتیں اس انداز سے اتنی عکاسی کرتا ہے کہ اس کی مثال مشکل سے ہمارے ادب میں ملتی ہے۔

حسن کا یہ پرستار محمد قلی جو پایہ اپنی شاعری میں رکھتا ہے وہ رتبہ دکن کی معاشرت اور تمدن کی تعمیر کاری میں بھی اسے حاصل ہے۔ اپنے عہد حکومت میں اس نے بعض ایسے

رسم و رواج کی بنیاد رکھی جو اس کے مرنے کے بعد بھی عرصہ دراز تک دکن میں قائم رہیں۔ چنانچہ اب بھی شادی بیاہ کی رسومات میں جلوہ اور مہندی، محمد قلی کی ہی روایت بردار ہیں۔ ان رسومات پر بھی محمد قلی کا قلم حسن افشانی کرتا چلا جاتا ہے۔

محمد قلی کے اسٹائل اور خیال میں وہ سادگی اور رنگینی پائی جاتی ہے جس کا تقابل ہم یا تو جوش کی شاعری اور نیاز کے رومانی افسانوں سے کر سکتے ہیں یا پھر آسکر وائلڈ، بالزک اور والٹر پیٹر وغیرہ کے شاہکاروں سے۔ انداز بیان میں فطری بہاؤ ہے۔ کہیں بھی ایسا دھوکا نہیں ہوتا کہ شاعر نے خواہ مخواہ خیال آرائی کی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ محمد قلی کی شاعری تخیل کی بلند پروازیوں سے خالی ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے تخیل کے پاؤں اس کے جمالیاتی ماحول میں محو خرام ہیں تو اس کے پر شاعری اور خیال کی بلند فضاؤں میں پرواز کرتے ہیں۔

محمد معین الدین

غزل

فریب پیہم ہی سہی یہ جینا، مگر کہاں تک فریب کھائیں
یہی جو ہے زندگی کا حاصل، تو کیوں نہ جینے سے باز آئیں

جنوں کو کچھ اور آزمائیں، حضور جی بھر کے مسکرائیں
مرے نشیمن کے تنکے تنکے پہ شوق سے بجلیاں گرائیں

غم گزشتہ کا تذکرہ کیوں، کشاکش بیم و آرزو کیا
وہ دیکھو اٹھی ہیں پھر گھٹائیں اٹھاؤ ساغر پئیں پلائیں

مجھے غم عشق دینے والے فسانۂ غم پہ ہنس رہے ہیں
الٰہی! ایسا بھی وقت آئے، مرا فسانہ مجھے سنائیں

مری طرف آپ دیکھیے تو جھکی جھکی سی ہیں کیوں نگاہیں
اگر جفاؤں پہ منفعل ہیں، مری وفاؤں کو بھول جائیں

مرے جنوں سے نہ مٹ سکے جو انھیں زمانہ مٹائے گا کیا
مری وفاؤں کے نقش ہیں یہ مٹا سکیں آپ تو مٹائیں

کبھی جو تھیں زندگی کا حاصل ظفر وہ اب خواب ہو گئی ہیں
وہ روح پرور سہانی راتیں، وہ بھیگی بھیگی ہوئی فضائیں

مظفر الدین ظفر

فریب مسلسل

(محبت بھرے دل کے ساتھ —— اپنی نسیم چھتاری کے نام ——!)

جنگل میں جب کوئی بڑا سا جانور مرجاتا ہے تو چاروں طرف سے گدھ ٹوٹ پڑتے ہیں —— کوئی شہد کی مکھی مرجاتی ہے تو اسے بیسوں چیونٹیاں گھسیٹ لئے جاتی ہیں

سمندر میں بڑی مچھلی ہزاروں ننھی منی مچھلیوں کو ہضم کرجاتی ہے ——

سود کھانے والے مہاجن خود پھولتے چلے جاتے ہیں اور جن سے وصول کرتے ہیں وہ جلدی جلدی سوکھ کر قبر کے کنارے جا پہونچتے ہیں ——

ہمارے جنت نشان ہندوستان میں جہاں کوئی مرا مثلاً بھائی —— بھتیجا —— چچا یا اور کوئی رشتہ دار —— اور یہ فکر لاحق ہوئی کہ حق داروں کو خانہ بدوش بنا کر خود مالِ غنیمت پر قبضہ کرلیں۔ بقول شاعر ع

کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا

راشدہ کا سہاگ لٹا تو جیٹھ صاحب کو فوری فکر جو پڑی وہ مکان کی تھی —— صحن میں دوگنی زمین اپنی طرف کرکے دیوار کھینچ دی —— اس ظلم کی داد تھی نہ فریاد؟ بچی دو سال کی تھی اور بچہ دو مہینے کا —— جس نے باپ کی شکل تک بھی نہ دیکھی تھی۔ باپ کے مرنے کے دوسرے مہینے دنیا میں قدم رکھا تھا۔ تیرہ سال کی راشدہ بیاہی گئی تھی اور پانچ سال بادشاہت کی۔ سترہ اٹھارہ سال کی کمسن لڑکی منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ دنیا کے مکر و فریب سے نا آشنا —— کچھ خدا کا خوف کرکے کچھ دنیا کی شرم کرکے چار روپے گزارہ کے باندھ دئے۔ جیسے بہت بڑا احسان فرمایا ہو ——

راشدہ خدا معلوم کس بے زبان ماں کی بچی تھی جس نے یہ تمام مصیبتیں چپکے چپکے سہہ لیں۔ پندرہ سال تک متواتر —— فاقہ پہ فاقہ کرتی تھی اور اپنے دونوں بچوں پر آنچ نہ آنے دیتی تھی۔ پسائی پیس کر چرخہ کات کر۔ سلائی سی کر اس نے اپنے بچے کو پڑھایا۔ نمینہ کا تو اس نے غریب گھرانہ میں نکاح کردیا۔

گویا فرض سے سبکدوشی حاصل کی —— اور بچے کی فکر میں لگ گئی اب اس کی یہ کوشش تھی کہ میرا بچہ کہیں نوکر ہو جائے۔ انٹرنس تک ہی مشکل سے کرایا تھا آگے کو تو بھلا ہمت ہی کیا ہوتی —— دو تین سال اور اسی کشمکش میں گزر گئے۔ خیر خدا خدا کرکے اقبال اس قابل ہوا کہ وہ لکھنؤ کی دکان پر ملازم ہوگیا —— یہ خوش خبری ناقابل بیان تھی۔ راشدہ مسکراتی تھی۔ خدا کا شکر ادا کرتی تھی۔ زندگی تو چار روپیوں میں گزارہ کی تھی اب اکٹھے پچیس روپے ماہوار ملا کریں گے؟ یہ خیال ہی بس دلکش تھا۔ پہلی تنخواہ اقبال نے ماں کو بھیجی —— دوسرا مہینہ پورا بھی نہ ہونے پایا کہ ماں ختم —— دو روز بخار آیا تیسرے دن کھڑے سے جو غش آیا تو تڑاخ سے گریں۔ گرتے ہی دل فیل ہوگیا —— اس کے دلِ ناتواں میں رکھا ہی کیا تھا؟ سترہ اٹھارہ سال فریبی سسرال کے چرکے کھاتے کھاتے محض پتلا سا رہ گئی تھی۔ خون کا چہرے پر نام تک نہ تھا۔ صرف نقشہ سے پتہ اتنا چلتا تھا کہ یہ مسکراتا ہوا چہرہ کبھی حسین ضرور ہوگا۔ پینتیس سال کی عمر میں تمام مدارج طے ہو گئے ——

شادی —— جوانی —— سہاگ —— بچے —— پرورش۔

شادی —— تعلیم —— آرزو —— ملازمت ——

حسرت بھری موت۔ بس وقت ماں کے مرنے کا تار اقبال کو ملا تو وہ اپنی ماں کی صورت کا عاشق مچھلی کی طرح تڑپ کر آیا لیکن وہ غریب تو لاکھوں من مٹی کے نیچے دب چکی تھی —— گھر خالی پڑا رہ گیا تھا۔ مختصر سا چھپر پڑا —— دالان منہ سے

فریادی تھا کہ اس کی مالکہ گھر سونا کر گئی ——
در و دیوار وحشت سے خاموش تھے —— اداسی کی غمناک گھٹا چھائی ہوئی تھی —— بھولا سا درخت سر جھکائے منتظر تھا کہ نازک ہاتھ توڑیں گے
—— مرغیاں دانے کو ڈھونڈتی پھر رہی تھیں ——
محبت سے دانہ پانی دینے والی اب کہاں تھی ؟ مضطرب ہو کر بلاتی —— اقبال دیوار سے لگ لگ کر روتا تھا - کپڑے پھاڑتا تھا - آوازیں دیتا تھا ——

اماں ! —— اماں —— ہائے میری اماں ——

اب وہ اماں کہاں تھی جو بے چین ہو کر پہلی ہی آواز پر دوڑ پڑتی تھی ؟ ہزاروں آنسو گرتے تھے اور خاموش —— بہن دو چار دن کو آئی ہوئی تھی لیکن وہ بھی سسرال کی دبی ہوئی تھی - زیادہ نہ رہ سکی اور بھائی کو تڑپتا چھوڑ چار و ناچار ساس کے حکم سے واپس چلی گئی ——

اب اقبال اس کھنڈر میں لاوارث سا پڑا رہتا - تائے صاحب تائی صاحبہ کا حکم بھی بجا لاتا ——

ایک دن اقبال نے کہا تائے ابا یہ جو صحن میں میرے والد کی زمین آپ نے ادہر کر لی - ہو سکے تو اس کا کچھ روپیہ دے دیجئے تاکہ میں بیاری بیکاری میں کچھ کام چلا سکوں

اتنے جملے کہنے کی تاب بھلا بے ایمان بے مروت بے درد تائے ابا کو کب ہو سکتی تھی - ہزاروں گالیاں دیں مارنے کو ڈنڈہ دوڑے —— چار روپے مہینہ کا طعنہ دیا - سرپرستی کا زمانہ یاد دلایا - احسانات گنائے —— اقبال نے جل کر کہا اس چار روپے کے بدلے میری ماں سے تمام گھر کا کام جو لے لیا جاتا تھا کیا جب بھی معاوضہ پورا نہ ہوا ؟ یہ جواب پا کر تلملا گئے —— عاقبت سے بے خبر، خوف خدا سے نا آشنا بڈھے تائے نے جوان بھتیجے کا ہاتھ پکڑ دن دھاڑے نکال باہر کیا - اور اس کا سامان کچھ تو توڑ پھوڑ دیا اور کچھ سڑک پر یہ کہہ کر پھینک دیا —— لے جاؤ یہ کاٹ کباڑ —— اور جاؤ دعویٰ کرو —— میرے بھائی کا مال ہے - میں مالک ہوں - اقبال نے کھڑے اور پڑے اپنا سر پیٹ ڈالا - اپنی بے بسی سے مجبور ہو کر تائے کے پاؤں پکڑ لیئے لیکن اب بھلا کہاں ترس آ سکتا تھا —— ؟ جنون چڑھ چکا تھا - ٹھوکر ماری تو سر سے خون پھوٹ پڑا ——
دو من کی زندہ لاش اژدہے سانپ کی طرح "فوں فوں" کر رہا تھا ——

محلے والے یہ تماشا دیکھتے رہے اور نہ بولے - گھر کے چھوٹے بڑے سب یہ منظر ہنس ہنس کر دیکھتے رہے اور دل نہ پسیجا ——

اب اقبال خانہ بدوش ہو چکا تھا وہ آسرا دیکھ رہا تھا کہ کوئی اسے سہارا دے ؟

تمام تکلیفیں تو اٹھا چکا تھا - فاقے کر چکا تھا - ماں کے ساتھ گھنٹوں رو رو کر چپ ہو چکا تھا پر گھر کی مصیبت آج نئی تھی -

تائے ابا نے یہ فریب سے حاصل کیا ہوا مکان کھٹ سے اپنی بیٹھک بنا لیا —— عالی شان مکان میں اور اضافہ ہو لیا ——

کئی روز تک اقبال گھر کے لئے ایک ایک کا منہ تکتا پھرا - آخرکار اس کی رشتہ کی ایک غریب بہن کو ترس آ گیا - اس نے اس مصیبت میں اپنا ہاتھ بڑھایا —— اپنے مختصر سے ٹوٹے ہوئے مکان میں محبت سے بلا لیا مکان اگرچہ ٹوٹا پھوٹا تھا لیکن دل تنگی تھا - دل میں جذبہ تھا - درد تھا - ہمدردی تھی - فریب کا دخل نہ تھا —— انسانیت فخر کر رہی تھی —— محبت سر اٹھائے کھلی شہادت دے رہی تھی کہ لاکھوں فریبیوں کے درمیان

ابھی اہل دل بھی باقی ہیں؟
قسمت دھکے دیتی ہے تو دئے چلی جاتی ہے۔ یکساں
قسم کی ٹھوکریں ——— دکھ ——— بے بسی۔ محتاجی اور
جب پلٹتی ہے ——— تاش کے پتوں کی طرح ——— الٹی چال
——— تو مہربانی کا پانسہ سیدھا پھینکتی ہے۔ اقبال
کے دن جب پھرے تو ایک دنیا اسے اپنا اپنا رشتہ دار
بتانے لگی ——— رستہ چلتے خود بخود "آپ تو میرے
چچا زاد بھائی ہیں"
"ارے آپ تو ہمارے بہت قریب کے رشتہ دار
ہوتے ہیں ———"
"آپ کے والد سے تو میری بہت دوستی تھی"
"آپ بے حد محبت والے ہیں۔ ہم تو آپ کی
دادی کی بہن کے پوتے ہیں اتنا قریبی رشتہ ہے"
یہ آوازیں ——— یہ دعوے پرانے زخم ہرے کر ڈالتے
ایسا لگتا جیسے کوئی ہزاروں پتھر کھینچ کھینچ کر مار رہا ہو۔
جنگ ۱۹۱۴ء کی بہت ہی بھاگوان ہوئی ———
بہتوں کو تو بے گھر، بے در، یتیم بیوہ بنا گئی لیکن
بے سہاروں کو زندگی کا عملی سبق بھی دے گئی ———
اقبال نے جس وقت نام لکھوایا تو یہ سمجھ کر
کہ میرا کوئی رونے والا تو ہے نہیں ——— یونہی
سہی ——— اگرچہ وہ خیالات میں بے حد آزاد تھا
اور غلامی کو موت سے بدتر سوچا کرتا تھا لیکن نہ جانے
کیوں فوج میں چلا گیا۔ جوں توں کر کے وہ سال وہ
مختلف جگہوں پر رہتا رہا۔ پھر مصر، عدن وغیرہ
گھوم کر وطن لوٹا ——— اس بدتمیز وطن کی طرف
جہاں وہ سگے تائے کے ہاتھوں خانہ بدوش ہوا تھا۔
جہاں اسے ٹھوکریں نصیب ہوئی تھیں جہاں سترہ
اٹھارہ سال ماں کے ساتھ وہ فاقہ کشی کر چکا تھا ...
ہاں اس وطن میں اس نے اس انداز میں قدم رکھا۔
چمکتے ہوئے بٹن اس کی وردی میں تھے ——— ٹوپی میں
ستارہ چمک رہا تھا ——— بازو پر امتیازی نشانات
تھے۔ سینے پر تمغہ لٹک رہا تھا ——— پاؤں میں
بھاری بھاری جوتے ——— لفٹ رائٹ کے انداز سے
قدم اٹھتے ہوئے ——— جیسے یہ ساری دنیا کو سرنگوں
کرنے کا اعلان فرما رہے ہوں ———

اب وہ خاصا خوبصورت جوان نکلا تھا۔ البتہ
ماتھے پر چند شکنیں پڑ چکی تھیں جو ثبوت دیتی تھیں
کہ دل نے جو تلخیاں سہی ہیں ان کا گہرا اثر چہرہ پر نمایاں
ہو گیا ———
جو اپنے پرائے پرچھائیں سے بھوت کی طرح خوف
کھاتے تھے اب فریب دینے کے لئے مختلف ہتھیار لے کر
آگے بڑھے ——— کوئی ہمدردی کی باتیں لے کر
——— کوئی رشتہ داری کے بہانے سے۔ کوئی مبارک باد
کے سنہرے الفاظوں کے ساتھ ——— کوئی دعوت کا
مکر وہ بہانہ کر کے غرض سب نے فریب کے جال تیار کر کے
قسمت آزمائی کی ———
اقبال بھولا نہ تھا اسے سب کچھ یاد تھا۔ ایک ایک سلوک
اس کے کلیجہ پر ناسور بنا ہوا اب بھی موجود تھا ———
جب دنیا کو اس کی ضرورت اگر نہ تھی تو اب اقبال کو
مطلق ان مکار لوگوں کی حاجت نہ تھی ———
اس نے سب سے بے رخی کا برتاؤ کر کے منہ پھیر پھیر لیا۔
فریبی رشتہ دار اپنے اپنے گھر جال پھندے لے کر
الٹے مایوس ہو گئے ———
اقبال نے اپنی شادی کی بابت براہ راست خود
ایک غریب لیکن شریف گھرانے میں کر لی اور شادی کے
بعد ان ہی لوگوں کو اپنا رشتہ سمجھنے لگا۔ وہ لوگ بھی
اپنے بیٹے کی طرح سمجھتے ——— بیوی قناعت کے
ساتھ شوہر کی دلداری میں مصروف رہتی۔ صحیح معنوں
میں سچی ہمدرد، محبت پرست، نیک طبیعت۔
جو کچھ فوج کی ملازمت سے پایا تھا اس روپے سے

اس نے تجارت شروع کی نہایت کامیاب رہا ــ
چند سال بعد اس کے پاس سب کچھ ہو گیا تھا ــ
مکان، دکان، نوکر چاکر، عیش و عشرت ۔ بچے،
سکون و اطمینان ۔ ہاں کبھی کبھی گزشتہ تکلیفیں
یاد آکر ضرور تڑپا دیا کرتی تھیں۔ ان تائے کا علیہ
کیا ہوا؟ خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ بخار آیا۔
بہت تیز ہوا، ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ یہ علامت ہے
کہ چیچک حملہ کرے ۔
آخر کو وہی ہوا۔ چیچک نکلی اور ایسی زور و شور کی
کہ سانس لینا محال ہو گیا۔ زندگی سے سب ہاتھ دھو
بیٹھے ۔ پاس کھڑا ہونا ناممکن تھا۔ بے حد تعفن تھی۔
اچھے تو خیر ہو گئے لیکن تمام جسم بدگوشت کی طرح۔
آنکھیں چیچک کی نذر ہو گئیں ــــــ گھر کا گھر خدمت
سے گھبرانے لگا۔ یوں بارت یا ندھے اگر تھوڑا بہت
لحاظ کیا بھی تو کیا؟ کالا کا بہت زور شور اٹھا۔
ایسا معلوم ہوا کہ وہ اس فریبی دنیا میں فریبیوں
سے توبہ کرانے آیا ہے۔ تین جوان لڑکے
منٹوں میں لوٹ پوٹ ہو کے رہ گئے۔ گویا تیماں ئی
باپ کے گناہوں میں بے گناہ پس گئے۔ بڑھاپا
پھر اندھا پن۔ یہ داغ دہکتے ہوئے انگارے تھے۔
جن پر ہر وقت تڑپتا تھا اور جل اٹھتا تھا ــــــ
ایک لڑکی رہ گئی تھی۔ اس کا بھی غریب سے نکاح
پڑھا دیا۔ باپ تو نوکری سے بیٹھ ہی چکے تھے۔
دانے دانے کو محتاج ہاتھ پاؤں سے کچھ تھوڑی بہت
بیوی خدمت کرنے کو تھی لیکن مفلسی نے اس کی صحت
پر بہت برا اثر ڈالا۔ آئے دن بیمار رہنے لگی۔
ایک دن پچھلی سستی کیک رہی تھی وہ لے لی۔ خدا جانے
کتنے دن کی سڑی گلی تھی۔ بھنا کر بھوک میں کھا لی۔
اب قدرت نے نئے ڈھنگ سے انتقام لیا دونوں کا
جسم پھوٹ نکلا۔ اور ہر دیکھنے والے نے توبہ توبہ
کرکے دوری اختیار کی ۔

گھر کی چیزیں تو اندھے پن کے بعد ہی سب نیلام
کرکر کے ختم کر ڈالی تھیں ــــ اب تو صرف مٹی کے
چند ٹھیکرے پڑے رہ گئے تھے اور یا وہ عالی شان
کھنڈر کھڑا رہ گیا تھا جس کے دروازے سے اقبال
ٹھوکریں کھاتا ہوا فریادی نکلا تھا۔
مدتوں سے مرمت طلب مکان یوں ہی کھڑا تھا ــ
اچانک بارشیں ہوئیں ــــــ ایسی ایسی موسلا دھار
کہ پختہ پختہ منزلیں سر بسجدہ ہو کے ڈھیر ہو گئیں۔
ایک رات کو پڑا رہنے کا ذرا ٹھکانا تھا وہ بھی گیا ــ
ورنہ سارے دن تو لکڑی کے سہارے دونوں بڈھے
بڑھیا گلی کوچوں میں بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ کبھی
کبھی شہر کی طرف بھی نکل جاتے ــــ جہاں بعض آنکھیں
اب بھی ان ہستیوں کو پہچان لیتی تھیں ۔
برسات جب رو رو کر اقبال کے مکان کو بالکل ڈھا
گئی صرف بنیادیں چھوڑ گئیں یا وہ لیموں کا شاداب
چھوٹا سا درخت جو بڑھ کر اب چھت سے بھی اونچا
ہو چکا تھا تو موسم نے ایک اور کروٹ لی ــــ یعنی
سردیاں توبہ کرانے آن پہونچیں ــــــــ
ایک دن حسب معمول چیتھڑے لگائے بھیک
مانگنے جا رہے تھے ــــ آہٹ پاکر بڈھے نے دردناک
صدا لگائی بابا دے کچھ ــــ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے
اقبال کا دل چاہا کہ چیخ مار کر بھاگ جائے ــــــ یا
دونوں کی گردن دبا دے ــــ کمبخت اب بھی
کچھ اور فریب دینا چاہتے ہیں کیا؟ لیکن اچانک دل
کانپ گیا۔ نیکی نیک راہ۔ بدی پیش راہ۔ جھٹ دس
کا نوٹ پکڑا آگے بڑھ گیا ــــــ لیکن پاس ہی
کوئی محلے کا نوجوان کھڑا تھا بولا او بڑھیا! بڈھے کی
تو خیر اندھی آنکھیں ہیں وہ تو بھلا کیا پہچانتا؟ کچھ تو نے
بھی پہچانا یہ کون تھا؟ وہی اقبال ــــ اقبال

جس کو تم لوگوں نے حق سے ناحق کیا — سمجھے — ڈوب مرد کہیں چلّو بھر پانی میں —— نوٹ بڑی جلدی سے پکڑلیا ہے؟"
یہ سنتے ہی دونوں کو گویا سانپ سونگھ گیا ——
نوجوان نے ایک اور تیر پھینکا —— " اگر میں تم لوگوں کا بھتیجا ہوتا تو ابھی مارے جوتوں کے تم دونوں کا بھیجہ پلپلا کرڈالا ہوتا — تم دونوں تو بس اس محلہ سے بھی دفان ہو جاؤ —— اندھے کوڑھی —— تمام محلہ کی آب و ہوا گندی کر رکھی ہے — لعنت کے ماروں نے موت بھی کہیں تم سے دور بھاگ چکی ہے شاید۔"
آج کا دن شاید خدا نے انصاف کے لئے رکھا جب دودھ کا دودھ پانی کا پانی دنیا کو نمایاں دکھانا تھا —— رات آئی — اور اپنے ساتھ جاگتا ہوا انصاف لائی — ایسا انصاف — جو دنیا والوں سے نہ ہوسکا نہ قانون سے ہوسکا۔ نہ بڑے بڑے عبا و قبا والے فتویٰ دے سکے کہ مظلوم کے لئے کیا ہونا چاہئے تھا۔ قدرت نے چند منٹ میں خود ہی کردیا۔
برسوں کی پانی کھائی دیواریں تو ڈھیر ہو چکی تھیں۔ بغلی کوٹھڑی ذرا کچھ دم خم والی کھڑی تھی اسی میں یہ فریبی مکار بڈھا معہ بیوی کے پڑا رہتا تھا۔
آج بھی سردی میں دونوں سکڑے ہوئے دیوار سے لگے بیٹھے تھے — اچانک ایک دھماکے کے ساتھ دیوار اڑا .... اڑا دھم ہوکر آپڑی — خوفناک چیخیں بلند ہوئیں اور ختم —— کسے غرض پڑی تھی کہ رات کو دو بجے لحافوں میں سے نکل کر دوڑتا اور مدد کے لئے محلے والوں کو جمع کرتا ——
یونہی سسک سسک کر دم صبح تک اٹکا رہا — جب تک کہ پولیس آگئی — ملبہ ہٹایا گیا ——
آخری سانس آ اور جا رہی تھی۔
بڈھے کے مدھم بول نکل رہے تھے ..... آہ اقبال پر میں نے ظلم کیا تھا ...... بہت بھاری ظلم ...... بدلہ مل گیا —— ظلم کیا تھا۔ مکا چھینا تھا ... بے گھر کیا تھا ....
اقبال کو خبر لگی — بھاگا چلا آیا —— اس کے سینے میں انسانی دل کھٹ کھٹ کرنے لگا —— نفرت کا جذبہ ختم ہو گیا ——
کفن دفن کا انتظام کیا۔ اور بڈھے کی بیٹی کو اطلاع دینی چاہی معلوم ہوا وہ تو مدت ہوئی زچگی میں ختم ہو چکی۔ اب یہ کھنڈر جس کے لئے در در کی ٹھوکریں کھا چکا تھا اسے ہرگز دیکھنا بھی پسند نہ آیا — کھڑے کھڑے معہ اپنے مکان کے اللہ نام پر پانچ چھے بیکس بیواؤں کو تقسیم کردیا ——
اس طرح خدا خدا کرکے مسلسل فریب کے ٹکڑے ہو گئے ——

شفیق بانو

تجلّیات

رازِ جور و جفا نہیں معلوم	دردِ دل کی دوا نہیں معلوم
اے مسیحا! تری عنایت سے	درد کیوں بڑھ گیا نہیں معلوم
عشق کی ابتدا تو میں نے کی	عشق کی انتہا نہیں معلوم
ہائے! اُس شوخیٔ نظر کا عتاب	کیا غضب ڈھائے گا نہیں معلوم
مجھ کو اللہ پر بھروسہ ہے	کرمِ ناخدا نہیں معلوم

اُن کی بیگانگی عظیمؔ آخر
رنگ لائے گی کیا نہیں معلوم

عظیمؔ حیدرآبادی

ہسپتالوں اور صحتی اداروں میں نرسوں کی کمی

(نرسوں کے لئے بہتر انتظامات اور اعلیٰ تعلیم و تربیت)

قحط کے تحقیقاتی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ اگر زراعت پیشہ لوگ بیماری کے باعث جسمانی اور ذہنی طور پر کمزور ہو چکے ہوں تو وہ بحیثیت جماعت ترقی نہیں کرسکتے۔ یہ بات شہری آبادی پر بھی صادق آتی ہے۔ مگر ہندوستان ابھی تک علاج معالجہ اور صحت و صفائی کے انتظامات کے لحاظ سے دوسرے متمدن اور ترقی یافتہ ملکوں سے بہت پیچھے ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ صوبائی حکومتیں ان سروسوں پر اپنی آمدنی کا اوسطاً ساڑھے پانچ فی صدی حصہ صرف کرتی ہیں۔ لیکن امید ہے کہ مرکزی حکومت کی مالی امداد کے ساتھ صوبے ترقی کی بہتر اسکیموں پر عمل درآمد کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ان سروسوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ نرسوں کی تعداد میں بھی زبردست اضافے کی ضرورت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ زمانۂ جنگ میں نرسنگ سروسوں کو ترقی دینے کے لئے بہت کچھ کیا گیا لیکن ابھی تک ایسی نرسوں کی کمی شدت کے ساتھ محسوس کی جارہی ہے جو عمدہ اور اعلیٰ تربیت حاصل کر چکی ہوں۔

نرسنگ سروسوں کی ترقی کا آغاز ۱۹۳۹ء میں ہوا اور انڈین ملٹری نرسنگ سروس قائم کی گئی۔ مگر وہ بڑھتی ہوئی جنگی ضرورتوں کو پورا نہ کرسکی۔ اس کے بعد سرکاری رجسٹرڈ نرسیں اور شہری ہسپتالوں کی نرسیں بھرتی کی گئیں لیکن اس کے باوجود ہندوستانی فوجوں کے بیماروں اور زخمیوں کی خبرگیری کے لئے مزید نرسوں کی ضرورت محسوس کی گئی اور ۱۹۴۲ء میں آگزیلیری نرسنگ سروس آف انڈیا قائم ہوئی۔ جس میں ہندو، مسلمان اور عیسائی خواتین شامل ہوئیں۔ اس کے علاوہ برطانیہ سے بھی نرسوں کے دستے آتے رہے۔ مگر مذکورہ کوششوں کے باوجود نرسوں کی بدستور کمی ہے۔

نرسوں کی کمی

۲۰ نومبر ۱۹۴۵ء کو ٹرینڈ نرسز ایسوسی ایشن آف انڈیا کی چوتھی کانفرنس کا جو اجلاس منعقد ہوا اس میں تعلیم و صحت و اراضی کے ممبر آنریبل سر جوگندر سنگھ . . . . نے بھی نرسوں کی کمی کے متعلق اظہار خیال فرمایا۔ اس سلسلہ میں آپ نے اس امر پر زور دیا کہ نرسوں کے رہنے سہنے اور ان کی تعلیم و تربیت کے متعلق بہتر انتظامات کئے جائیں اور یہ امید ظاہر کی کہ اگر سروس کے حالات کو ترقی دی جائے تو ہسپتالوں میں کام کرنے کے لئے تعلیم یافتہ خواتین کافی تعداد میں اپنی خدمات پیش کردیں گی۔

اس کمی کا سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں نرسنگ سروس اور اس کی معاون سروسوں نے اتنی تیزی سے ترقی نہیں کی جتنی تیزی سے طبی سروسوں نے ترقی کی ہے۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بڑے ہسپتالوں میں ۵۱ ہزار بیمار ہیں جن کی تیمارداری کے لئے ۱۷ ہزار نرسیں ہونی چاہئیں۔ مگر ان کی موجودہ تعداد ۷ ہزار ہے جن میں سے صرف نصف تربیت یافتہ ہیں اور چھوٹے ہسپتالوں میں تو حالت اور زیادہ خراب ہے۔

بہرکیف سروس کے حالات کو سدھارنے کے لئے زبردست کوششیں کی جارہی ہیں ــــ ــ ــ

کل ہند نرسنگ کونسل کے قیام کے لئے مرکزی اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں ایک مسودۂ قانون پیش ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ نرسنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک ہندوستانی اسکول قائم کرنے کا مسئلہ بھی زیر غور ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اسکول جلد کالج بن جائے جس میں انسٹرکٹروں کا نصاب پڑھایا جائے اور صحت عامہ کی نرسنگ کے متعلق بھی تربیت دی جائے۔

تعلیم و تربیت کے بہتر انتظامات حکومت ہند نے نرسنگ کے متعلق صوبوں کے لئے چند معیار تجویز کئے تھے۔ صوبائی حکومتیں ان سے دلچسپی ظاہر کر رہی ہیں۔ چنانچہ بمبئی اور صوبہ متحدہ میں نرسنگ سروس کی نگران خواتین مقرر کی جا چکی ہیں۔ مدراس میں نرسنگ کی سپرنٹنڈنٹ ۱۹۴۱ء ہی میں مقرر کر دی گئی تھی اور اب بنگال میں بھی اس کا تقرر عمل میں آنے والا ہے۔

بیرونی ملکوں میں نرسوں کی اعلیٰ تربیت کا سردست چھوٹے پیمانہ پر بندوبست کیا گیا ہے۔ برطانیہ کے بعض ممتاز ہسپتالوں میں ہر سال ۳۲ ہندوستانی نرسوں کو تربیت دی جائے گی اور ان آموزکار نرسوں کے لئے وہی سہولتیں اور آسائشیں مہیا کی جائیں گی جو برطانی آموزکار نرسوں کے لئے مہیا کی جاتی ہیں۔ (۵) طالبات برطانیہ پہنچ چکی ہیں جن میں سے دو "سسٹر ٹیوٹر" کے نصاب کی تکمیل کریں گی۔ حکومت ہند نے بنگال کی ایک خاتون مس سورما بسواس کو بھی رائل کالج آف لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا ہے۔

دو سال ہوئے سر جوزف بھور کے زیر صدارت ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی تاکہ وہ صحت عامہ کا جائزہ لے اور اپنی سفارشیں پیش کرے۔ توقع ہے کہ یہ کمیٹی اپنی رپورٹ جلد پیش کر دے گی اور صحت عامہ کی منصوبہ بندی میں بھی نرسنگ سروس کی ترقی کو خاص اہمیت دی جائے گی۔

ہلتھ وزیٹر خواتین اس ضمن میں ڈائرکٹر جنرل میڈیکل سروس و صدر انجمن تپ دق ہندوستان لفٹننٹ جنرل جے۔ بی۔ ہانس کی وہ تقریر بھی دلچسپی سے پڑھی جائے گی جو انھوں نے تپ دق کے ہلتھ وزیٹروں کی کلاس کا افتتاح کرتے ہوئے حال ہی میں فرمائی ہے۔ یہ کلاس تپ دق کے کلینک نئی دہلی میں قائم کیا گیا ہے۔

اس میں آپ نے ہلتھ وزیٹروں کی اہمیت نہایت پرزور الفاظ میں بتائی جن میں خواتین کثیر تعداد میں شامل ہوں گی اور اس امر پر زور دیا کہ "سینیٹوریوں" کے علاوہ "کلینک" بھی کثیر تعداد میں قائم کئے جائیں جو تپ دق کے ابتدائی مریضوں کے علاج کے لئے نہایت ضروری ہیں اور ہر کلینک میں کئی اعلیٰ تربیت یافتہ لائق اور سرگرم ہلتھ وزیٹروں کو مقرر کیا جائے۔

(۲) کام کے لئے بھی ہندوستانی خواتین کی خدمات درکار ہیں اور وہ انسداد تپ دق کے متعلق بھی نہایت مفید خدمات انجام دے سکتی ہیں۔

از محکمۂ اطلاعات ہند

نئی کتابیں

۱- ہمارا قائد (نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے حالات) از محمد احمد خاں حجم ۲۰۱ صفحے قیمت عا پتہ قائد ملت اکادمی فیل خانہ قدیم حیدرآباد دکن
۲- پیمانے (مختلف شعرا کا مجموعہ کلام) مرتبہ اکبر وفا قانی و علی اشرف حجم ۱۸۴ صفحے قیمت عا پتہ قیوم اکادمی۔ حیدرآباد دکن۔
۳- مسکراہٹیں (مزاحیہ مضامین) از کوثر چاندپوری حجم: ۲۴ صفحے قیمت ۴؍ پتہ ادارۂ اشاعت اردو۔ 〃
۴- فتراک (مختلف مضامین) از جہاں بانو بیگم۔ 〃 ۲۰۴ 〃 〃 عا 〃 مکتبۂ ابراہیمیہ۔ عابد روڈ 〃
۵- سربریدہ (افسانے) از ساحل بلگرامی قیمت ۸؍ پتہ رضوی اینڈ کمپنی۔ نظام شاہی روڈ 〃
۶- سرخ پرچم تلے (روسی افسانے) مترجمہ سردار اہام 〃 راج پبلشنگ ہاؤس۔ سلطان بازار۔ 〃
۷- دور اسیری (وجے لکشمی پنڈت کی خود نوشت سوانح) مترجمہ ظفر جاوید پبلشنگ ہاؤس۔ سلطان بازار۔ حیدرآباد دکن
۸- جہنم کے دیوتا (ہندی افسانے) مترجمہ سیدہ سلمیٰ راشد۔ قیمت ۸؍ پتہ مکتبۂ عزیزیہ۔ حویلی قدیم۔ 〃
۹- نقش امروز (مجموعہ کلام) از علی اشرف۔ حجم ۱۸۳ صفحے 〃 عا 〃 عبدالحق اکیڈیمی۔ اردو گلی 〃
۱۰- اردو پارے (تنقیدی تقریریں) از ضیاء الاسلام حجم ۱۰۹ صفحے قیمت عا پتہ حلقۂ ادب ۱۳۔ اسٹینلی روڈ۔ الہ آباد
۱۱- روسی ظرافت (افسانے) مترجمہ مسلم ضیائی۔ حجم ۲۰۵ صفحے۔ قیمت ۴؍ پتہ اردو محل۔ معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد دکن
۱۲- نیر ہدایت (مجرب نسخے) مرتبہ حکیم محمد ظفر الدین حجم ۲۱۰ صفحے۔ قیمت عا۔ پتہ مینجر رسالہ حکیم دکن شفاخانہ حکمت نگر حیدرآباد دکن
۱۳- نئے ترک اور ترکی با تصویر از محمد عبدالرشید خاں 〃 ۳۴۴ 〃 〃 ۵ 〃 نذیر حسین نظام الرحمٰن تاجران کتب۔ دریبہ کلاں دہلی
۱۴- آئین جغرافیہ از پروفیسر ایم۔ اے علوی۔ حجم ۴۴۳ صفحے قیمت ۳؍ پتہ مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ
۱۵- پریشان جلوے (افسانے) از حیات زرین 〃 ۲۴۰ 〃 〃 عا پتہ عباسیہ اکادمی بغداد الجدید۔ بھوپال
۱۶- ایشیا کی سب سے بڑی شخصیت (جناح کے حالات) از محمد عبداللہ منہاس۔ حجم ۶۴ صفحے۔ قیمت ۱۲؍ پتہ مکتبۂ راست گفتار۔ ہال بازار امرتسر
۱۷- ہندوستانی موسیقی کی کشش از مسز رانی ساہوکار۔ قیمت عہ پتہ تھیکر اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ بمبئی
۱۸- نیا راگ (مشہور شعرا کا منتخب کلام) مرتبہ ذکیہ سلطانہ ساغر قیمت عہ پتہ تھیکر اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ بمبئی
۱۹- یاد اقبال (نظمیں جو اقبال کی وفات پر لکھی گئیں) مرتبہ غلام سرور نگار حجم ۱۲۸ صفحے قیمت عہ پتہ اقبال اکیڈیمی۔ لاہور
۲۰- جھلکیاں (افسانے) از رہبر پٹیالوی حجم ۱۹۲ صفحے قیمت عا پتہ مکتبۂ سلطانی۔ بھنڈی بازار بمبئی ۳
۲۱- کاشت ترکاری از رحمت خاں 〃 ۲۸۸ 〃 〃 عا 〃 کسان اینڈ کمپنی۔ چیمبرلین روڈ۔ لاہور
۲۲- برہنہ (ناول) از قیسی رام پوری قیمت عا پتہ رائل ایجوکیشنل بک ڈپو۔ اردو بازار۔ دہلی
۲۳- رونق (〃) از قیسی رام پوری 〃 ۳؍ 〃 〃 〃 〃 〃
۲۴- اس نظم میں (منتخب نظمیں) از میراجی 〃 ۳؍ 〃 ساقی بک ڈپو۔ دہلی
۲۵- پائل (گیت) از سلام قیمت عہ 〃 〃 〃 〃 〃
۲۶- چالیس کروڑ بھکاری (افسانے) از ابراہیم جلیس قیمت عا پتہ نفیس اکیڈیمی۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن
۲۷- صد پارۂ دل (مضامین) از عزیز حسن بقائی دہلوی قیمت عا 〃 مینجر رسالہ پیشوا۔ جامع مسجد۔ دہلی

مرزا سیف علی خاں

نظارے

میں صبح سے مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ ٹھیک طور سے تو کہہ نہیں سکتا کہ میں جو مارا مارا پھرتا رہا تو وہ آخر کس سلسلے میں تھا۔ کوئی چیز خریدنی نہ تھی، کسی کی تلاش نہ تھی، کسی کا گھر دریافت کرنا نہ تھا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں کسی خاص وجہ کے تحت مارا مارا نہیں پھر رہا تھا۔ فرصت تھی، ہاں خوب یاد آیا، فرصت تھی۔ دفتر بند تھا اور گھر میں بیٹھے بیٹھے طبیعت اکتا گئی تھی۔ وقت گزارنے کے لیے گھر سے نکلا تو بس مارا مارا پھرتا رہا، ایک جگہ لوگ بھیڑ لگائے کھڑے تھے، میں بھی رک گیا اور ایک تماشائی کے کندھے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے میری اس حرکت پر ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی گردن موڑ لی۔ ارے وہ تو میرے ہم محلہ شیخ صاحب تھے۔ "دیکھیے شیخ صاحب اچھے تو ہیں آپ، یہ کیا تماشا ہو رہا ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے شیخ صاحب سے پوچھا۔ شیخ صاحب کا بگڑا ہوا چہرہ بتدریج اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ "کچھ نہیں وہ کوئی ہمالیہ کی طرف سے آئے ہیں بعض جڑی بوٹیاں بہت خاص ہیں ان کے پاس۔ دیکھیے آپ بھی۔ دیکھیے خدا کی قدرت" شیخ صاحب نے اپنی گردن پھیر لی۔ وہ ہمالیہ کے باشی مجمع کے بیچ میں ایک کپڑا بچھائے اس پر جڑی بوٹیوں کا ڈھیر لگائے کھڑے تھے۔ میں بھی دیکھنے لگا اور میں نے دیکھا اس شخص نے تماشائیوں کو ایک گلاس بتایا، خالی گلاس، اس کے بعد اس نے اس میں پانی ڈالا۔ پھر تھیلی میں سے ایک جڑی نکالی۔ کہنے لگا "بھائیو! یہ جڑی ہمالیہ کے دامن میں دستیاب ہوتی ہے اور اس کو پانے کے لئے پانچ سال میں نے جنگلوں میں گزارے، پانچ سال بھائیو۔ میں اس کی تعریف نہیں کرتا۔ اس کا کرشمہ دکھاتا ہوں۔" اس نے وہ جڑی پانی میں ڈال دی۔ تھوڑی دیر بعد سارے تماشائی پھٹے ہوئے دیدوں سے دیکھ رہے تھے کہ پانی جمنے لگا۔ دوا کا کرشمہ دکھانے کے بعد اس نے کھنکار کر چاروں طرف فاتحانہ نظر ڈالی اور ایک دفعہ پہلے سے بھی زیادہ زور دار کھنکار لگا کر کہنا شروع کیا "اس کے گن بھی سن لو۔ یہ۔ بوڑھے کو......" میں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور لاحول پڑھتا ہوا اپنی راہ پر لگ گیا۔ پل پر سے گزرنے لگا تو کئی راہ گیر ایک جگہ جمع ہوتے جا رہے تھے اور جھانک جھانک کر نیچے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں بھی رک گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ لوگ آخر کیا دیکھ رہے ہیں۔ میں نے بھی جھانک کر نیچے دیکھا، ندی بہہ رہی تھی۔ صرف ندی بہہ رہی تھی۔ میں نے اپنے بازو والے صاحب سے پوچھا "کیا بات ہے جناب؟" کہنے لگے "میں بھی ابھی آیا ہوں۔ آپ سے پوچھیے" ان صاحب کے بازو جو صاحب کھڑے تھے ان سے میں نے رکتے رکتے پوچھا "آپ کو معلوم ہے جناب، یہاں یہ سب کیوں جمع ہیں؟" "جی جی" کہتے ہوئے انھوں نے پلٹ کر ادھر ادھر دیکھا "ارے" وہ کہنے لگے۔ "ارے۔ دیکھیے جناب بات دراصل یہ ہے کہ یہاں ایک صاحب جھانکتے کھڑے تھے اور ان کے ساتھ ہم سب بھی جھانکنے لگے۔ وہ صاحب چلے گئے کہیں۔ ورنہ ان سے پوچھ لیتے۔ ہم کو تو کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔ ندی تو البتہ بہہ رہی ہے مگر صاحب کچھ تو ہوگا۔ کچھ تو ہوگا ضرور۔ تب ہی تو وہ بے چارے دیکھنے لگے" خودکشی کے امکانات پر غور کر رہے ہوں گے وہ۔" میں نے وہاں سے ہٹتے ہوئے اپنے دل میں سوچا، مجھے تو وقت گزارنا تھا۔ میں کیوں پل پر سے ندی میں جھانکتا رہوں۔ پل کے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے دو فقیر آپس میں تکرار کر رہے تھے۔ ایک کہتا تھا کہ خوانچہ والے کے تو نے ٹانگ کیوں ماری۔ دوسرا کہتا...... "اور تو نے کیوں سارے پیسے اس کے

ہڑپ کرنے"۔ میں جو ان کے قریب پہونچا تو وہ دونوں مسکین صورت بنائے سوال کرنے لگے۔ میں اپنی ٹانگوں کو بچاتا دور ہی دور سے جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتا رہا۔ میں آگے بڑھ گیا تو وہ پھر باتیں کرنے لگے۔ "ایک روپیہ کا چلّر ہے تیرے پاس"........ دوسرے نے کہا "چار آنے کم ہیں۔ شام تک دیدوں گا۔ یہ لے بارہ آنے"۔ ایک تانگہ پان کی دکان کے آگے کھڑا تھا۔ تانگے والا پان سگریٹ خرید رہا تھا۔ ایک صاحب نے تانگے والے سے پوچھا "کرایہ کروگے"۔ تانگے والے نے جواب دیا "کہاں چلنا ہے صاب"۔ ان صاحب نے کہا "گلزار حوض"۔ تانگے والے نے پان چباتے ہوئے کہا "ایک روپیہ دلوائیے صاب"۔ ان صاحب نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا "ایک روپیہ نہیں تین آنے دیں گے"۔ تانگے والے نے سڑک پر پیک تھوکی۔ وہ صاحب آگے بڑھ گئے۔ تانگے والا کہتا رہا "چنا جھنگا، گھاس تھنگا۔ اور گلزار حوض تک کا کرایہ ایک روپیہ نہیں تین آنے"۔ اس کے بعد اس نے انھیں کچھ کہا۔ کرایہ چکانے والے صاحب تو آگے بڑھ گئے تھے۔ ساری باتیں مجھی کو سننی پڑیں۔ میں نے سوچ لیا کہ گلزار حوض جانا ہو تو تانگے والے کو تین آنے پر چلنے کے لئے نہ کہوں گا۔ ایک سڑک زیر تعمیر تھی مزدور پتھر اٹھا رہے تھے اور مزدورنیاں گنہ دار صاحب کے پیچھے پیچھے ندی سے پانی لانے جا رہی تھیں۔ ایک صاحب سیکل پر تیزی سے چلے آرہے تھے۔ دوسرے صاحب دوسری طرف سے ان سے بھی زیادہ تیزی سے آئے۔ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ چاروں گرے۔ دو سیکل سوار اور دو سیکلیں دونوں نے ایک دوسرے کو بغور دیکھا۔ کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھے۔ سیکلیں سنبھالیں اور اپنی اپنی سمت چپ چاپ چل نکلے۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میری فرصت کا وقت ٹھیر گیا ہے۔ کٹتا کٹتا نہیں۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر چلنے لگا۔ دو اخبار بیچنے والے لڑکے آوازیں لگاتے بازو سے گزرے۔ میں نے ایک کو روک کر اخبار خریدا۔ ایک صاحب بوکھلائے ہوئے میری طرف آنے لگے۔ "جناب!" "جی آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟" میں نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "دیکھئے جناب آپ یہاں کب سے کھڑے ہیں؟" میں نے کہا "ایسی کچھ دیر تو نہیں ہوئی"۔ "تو آپ نے ادہر سے کسی رکشا والے کو جاتے دیکھا۔ کچھ سامان تھا اس رکشا میں۔ کبوتروں کی ایک ٹوکری بھی تھی۔ دیکھی ہے آپ نے"۔ میں نے سوچتے ہوئے جواب دیا "مجھے یاد تو نہیں۔ البتہ ایک رکشا......" "جی بس شکریہ ادہر ہی کو گئی ہے نا"۔ میں نے بے بسی کے عالم میں گردن ہلا دی۔ وہ اس طرف کو دوڑ پڑے۔ وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ ایک رکشا کچھ سامان تھا جس میں کہ ایک کبوتروں کی ٹوکری تھی جس میں میرے سامنے آکر رکی۔ رکشا والے نے پوچھا "صاحب ادہر سے کوئی صاحب گزرے دبلے سے عینک لگائے ہوئے چھوٹی سی ڈاڑھی"۔ میں مسکرا پڑا۔ وہ جانے کیا سمجھا۔ واپس ہونے لگا۔ میں نے جلدی سے کہا "ارے بھائی ادہر ہی کو گئے ہیں وہ تجھے ڈھونڈھتے ہوئے، کدہر بھٹکا رہا ہے انھیں"۔ رکشا والے نے کہا "صاحب ایک دکان سے کچھ خریدنے کو گئے تو بس لاپتہ ہیں"۔ میں نے کہا "اس طرف چلے جاؤ، وہ ابھی گئے ہیں تمہیں مل جائیں گے"۔ میں نے اخبار کھولا اور پڑھنے لگا۔ میں درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ کوئی چیز اوپر سے عین اخبار کے صفحہ پر گری۔ میں نے اوپر نظر اٹھائی۔ ایک کوا ڈالی پر بیٹھا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ میں نے اخبار پھینک دیا اور پھر سے چلنے لگا۔ ایک کتا بھی میرے ساتھ ہو گیا کبھی کبھی وہ

مجھ سے بہت آگے نکل جاتا۔ لیکن وہ کسی پتھر یا دیوار کو سونگھتا کھڑا رہ جاتا تو میں آگے نکل جاتا۔ پھر ہم دونوں ساتھ ہو جاتے۔ ایک دفعہ تو میں نے اسے دھتکارا بھی۔ لیکن وہ تو جیسے شرط باندھ کر میرے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ ایک گھر سے بلی نکلی تو وہ اس کے پیچھے لپکا۔ بلی ایک موری میں گھس گئی تو وہ موری کے آگے کھڑا رہ گیا اور میری طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ دیکھئے اس موری میں گئی ہے بلی۔ وہ کتا بھی میری طرح بیکار نظر آ رہا تھا۔ جیسے صرف وقت گزار رہا تھا۔ اس نے اب میرا ساتھ چھوڑ دیا اور ایک ہوٹل کے باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔ ایک صاحب کالے اطلس کی صدری پہنے گاتے ہوئے آئے۔ بلبل آ تو بھی گا۔ جوں جوں وہ مجھ سے قریب ہوتے گئے ان کی آواز بھی دھیمی ہوتی گئی۔ جب وہ میرے بالکل پاس پہونچے تو چپ ہو گئے اور آگے بڑھتے گئے تو پھر سے گانے کی لے اونچی ہوتی گئی۔ بلبل آ۔آ۔آ۔آ۔ ایک بھکارن اپنے دو مردہ نما بچوں کو سامنے ڈالے راہ گیروں کے آگے دست سوال دراز کر رہی تھی۔ "دو دن کے بھوکے ہیں" آفریں ہے اس ماں پر جو دو دن کی بھوکی ہو۔ اس کے دو بچے دو دن کے بھوکے ہوں اور وہ ان بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے بھیک مانگے۔ گلا گھونٹ کر مار نہیں ڈالا —— آفریں ہے اس ماں پر۔

حلوائی کی دکان مٹھائیوں سے سجی ہوئی تھی۔ دھڑا دھڑ تازہ تازہ مٹھائیاں نکل رہی تھیں۔ گاہک ٹوکریاں سنبھالے ہوئے بھیڑ سے نکل رہے تھے۔ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور توندیلا سیٹھ اپنے نوکروں پر برس رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی گدی پر نیم دراز خرانٹے لینے لگا۔ مٹھائی تیار کرنے۔ جمانے اور تولنے والے ملازم کالے چیتھڑوں میں ملبوس اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ دکان کے آگے دو بھکارن لڑکیاں کھڑی تھیں ان میں سے ایک کے ہاتھ میں مٹھائی کی پھینکی ہوئی ٹوکری تھی۔ جس پر سے وہ دھیرے دھیرے دھاگہ کھولتی جا رہی تھی۔ وہ بل جو اس کی آنتوں میں پڑے تھے ان میں کچھ اور پیچ پڑتے جا رہے تھے۔ مٹھائی کی ٹوکری سے لپٹا ہوا قوام قطرہ قطرہ زمین پر ٹپک رہا تھا۔ بعض گاہک دکان پر ہی مٹھائی سے کام و دہن کی تواضع کر رہے تھے۔ گرم گرم جلیبیں اور تازہ تازہ امرتیاں۔ بھکارن لڑکیوں کے ہاتھ آگے بڑھے ہوئے تھے۔ جھوٹے کاغذ اور پتے پھینکے جا رہے تھے۔ ڈکاریں لی جا رہی تھیں۔ چٹخارے بھرے جا رہے تھے۔ لیکن ان بھکارن لڑکیوں کے ہاتھ پھیلے کے پھیلے ہی رہے۔ ایک لڑکی کچھ اور آگے بڑھی۔ سیٹھ کی آنکھ لگ گئی تھی۔ ایک مکھی ان کی ناک میں گھس گئی تھی۔ "سیٹھ" اس لڑکی نے پکارا "چل بھاگ" اور انھوں نے اپنی چوکی کے نیچے سے ایک چھوٹا سا ڈھیلا اٹھا کر لڑکی کی طرف دے مارا۔ سیٹھ صاحب نے ان بھیک منگوں کو مار بھگانے کے لئے اپنی چوکی کے نیچے چھوٹے چھوٹے ڈھیلوں کا ایک ڈھیر سا جمع کر رکھا تھا۔ ان ڈھیلوں کے بازو ہی پیسوں کا صندوق دھرا رہتا۔ لڑکی ڈھیلے کی چوٹ کھا کر سر تھام کر بیٹھ گئی۔ دوسری لڑکی ایک موٹر کے پردہ کے پاس بھیک مانگتی کھڑی رہی۔ اسے ایک پیسہ ملا۔ دوسری لڑکی کے پہنچتے پہنچتے موٹر چلی گئی۔ ایک پردے لگا ہوا تانگہ گزرنے لگا تو اس میں سے ایک چھوٹے بچے نے سر لٹکا لا اور مٹھائی کے لئے مچل گیا۔ تانگہ رکوایا گیا۔ اور مٹھائی لینے کے بعد پھر سے چل پڑا۔ وہ دونوں لڑکیاں اس تانگے کے پیچھے بھاگنے لگیں۔ ان کے پاؤں اور زبانیں مشین کی طرح چل رہی تھیں۔ دو بھکاری

لڑکیوں اور ایک تازہ دم گھوڑے کا مقابلہ تھا۔ میں دور تک ان کو دیکھتا رہا۔ آخر ایک لڑکی ٹھوکر
کھا کر گر پڑی۔ میں نے اپنی گردن پھیر لی اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ ایک دکان پر بھیڑ لگ رہی
تھی۔ معلوم ہوا سستے غلے کی دکان ہے۔ پیسے دے کر بھی مشکل سے اناج ملے۔ یہ عذاب الٰہی
نہیں تو پھر کیا ہے۔ بوڑھے [illegible] رہے ہیں جوان آگے بڑھ رہے ہیں۔ عورتیں ان کے پیچھے
جگہ نکال رہی ہیں لیکن سارے مجمع میں ایک سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ اناج بہر صورت حاصل
کرنے کا مصمم اور خوفناک ارادہ ان کے چہروں سے ابلا پڑتا تھا۔ پیٹ! تیری جے۔ ایک سیٹھ صاحب
اپنے گاہک سے پوچھ رہے تھے "کیوں بھائی کچھ سنا ہٹلر زندہ ہے کہتے ہیں" گاہک نے جواب دیا۔
"ہٹلر نہیں مر سکتا سیٹھ صاحب" سیٹھ صاحب نے کہا "تو پھر جنگ بھی ہوگی" "ہاں" گاہک نے
جواب دیا۔ "اچھا چاول کا کیا بھاؤ ہے" سیٹھ صاحب نے کہا "چاول نہیں ہیں ہمارے پاس"
گاہک آگے بڑھ گیا۔ مزدوروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ایک لاری سامنے سے گزری۔ مزدور گاتے ہوئے
جا رہے تھے۔ انھیں مزدوروں [illegible] جا رہی تھیں اور سواروں کے لئے موٹر بھی۔ مگر ملا؟ ....
مر جائے ہٹلر خدا کرے!! جب میں ایک ہوٹل کے قریب پہونچا تو مجھے وہ ریکارڈ سنائی دیا جس کی موسیقی میرے
دل پر جادو کر رہی تھی۔ مجھے اس گانے کے بول یاد نہ تھے۔ طرز یاد ہو گئی تھی۔ میں گنگنا سکتا تھا گا نہیں
سکتا تھا۔ میں ایک درخت کے نیچے ٹھیر گیا اور اس کے بول ذہن نشین کرنے لگا۔ ریکارڈ ختم ہو گیا تو میری
خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ مجھے پورا گیت حرف بہ حرف یاد ہو گیا تھا۔ لیکن آگے بڑھتے ہوئے اسے گنگنانے کی جو
کوشش کرتا ہوں تو ہائیں طرز ہی بھول گیا۔ تانگوں، رکشاؤں اور سائیکل سواروں کو دیکھتے دیکھتے میرا سر
گھومنے لگا۔ دنیا کی ہر چیز حرکت کر رہی تھی اور میں چاہتا تھا کہ ساری دنیا تھم جائے۔ سناٹا چھا جائے اور میں
اکیلا دل بہلاتا ہوا ہر چیز کا معائنہ کرتا پھروں۔ تانگے اپنے اڈوں پر کھڑے رہیں۔ رکشائیں ٹھیر جائیں ——
سائیکلیں رک جائیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند پڑے رہیں۔ وہ دوا فروش ہمالیہ کی چوٹی پر چلا جائے۔
ریکارڈ بجتا رہے اور میں ٹہلتا ہوا یا تیز تیز چلتا ہوا یا دوڑتا ہوا چاروں طرف گھوموں۔ چاروں طرف چہروں
اور میری فرصت کا وقت گزرتا رہے۔ لیکن دنیا کے کاروبار کبھی بند نہیں ہوتے۔ یہ کل کبھی رکتی نہیں۔
میں [illegible] اور بہت زیادہ بے کیف اپنے گھر میں داخل ہوا۔ ایک بوجھ سا میرے دل سے اتر گیا۔ سات
بج چکے تھے اور مجھے سوائے رات کا کھانا کھا کر سو جانے کے اور کوئی کام نہ تھا۔

رشید قریشی

"تھالی کا بینگن" — حیدرآباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی ایم اے کے افسانوں کا نفیس مجموعہ ہے۔ افسانوی
ادب سے دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں کتاب بہت دلچسپ اور انداز بیان نہایت
شگفتہ ہے۔ افسانہ بلند خیالی اور رنگینیٔ بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو کے نئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور ترقی پسند
افراد اس کتاب کے (?) مطالعہ سے ضرور محظوظ ہوں گے۔ جو اصحاب اردو کے جدید ترین افسانوں کا مطالعہ
کرنا چاہتے ہیں وہ اس نوجوان مصنف کے ان پرکیف افسانوں سے ضرور لطف اندوز ہوں گے صفحات (۱۶۰) قیمت مجلد عہ
سب رس کتاب گھر خیریت آباد سے طلب فرمائیے۔

ابراہیم ظفر

(اس افسانہ کا پلاٹ ان قصوں اور کہانیوں سے لیا گیا ہے جو نرمل کی پہاڑی بستی میں مشہور ہیں) مجید

"جہاں پناہ! ہمارے جاسوسی نظام کے ذریعہ جو مملکت حیدرآباد کے طول و عرض میں جال کی طرح پھیلا ہوا ہے اس مرتبہ نہایت ہی اہم خبریں وصول ہوئی ہیں۔ جن میں سب سے پہلے پرگنہ نرمل کے متعلق یہ کہ ابراہیم نامی ایک نوجوان نے نرمل میں حکومت کے خلاف رعایا کو اکسایا ہے اور اگر اس طرف جلد توجہ نہ کی جائے تو بغاوت کا اندیشہ ہے" سراج حیدرآباد کے طبقۂ امرا کا ایک مشہور فرد تھا جس نے دربار آصف جاہی میں یہ کیفیت پیش کرنے کی عزت حاصل کی۔

"ہم بہت جلد توجہ کریں گے سراج" اعلیٰ حضرت نے ارشاد فرمایا اس کے بعد دوسرے اور اہم معاملات پیش کئے گئے۔

نرمل، ایک پہاڑی بستی ہے۔ کئی تالاب دائرے کی شکل میں اس کو گھیرے ہوئے ہیں، ان تالابوں کے سروں پر چاروں طرف سیاہ دیوہیکل پہاڑ نرمل کے سنتری کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ بائیس سال قبل سپاہیوں کا ایک گروہ نرمل آیا تھا۔

"یہ سامنے کونسی بستی ہے؟" سردار نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا۔ "یہ بستی نرمل کہلاتی ہے سردار" بڑا ہی روح افزا مقام معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہے چند دن یہیں قیام کیا جائے" یہ سنتے ہی سبھوں نے یہیں سکونت اختیار کرلی اور تجارت کو ذریعۂ معاش بنالیا۔ ان کا شمار متمول گھرانوں میں ہونے لگا۔ سردار کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام ابراہیم رکھا گیا۔ ابراہیم نرمل ہی کو اپنے اسلاف کا وطن سمجھتا تھا۔

"وطنی مجلس" کے صدر ابراہیم اور مجلس کی متفقہ طور پر یہ رائے قرار پائی کہ نرمل کے حکام کو سزا دی جانی چاہئے۔ اس لئے کہ شاہ وقت دوسرے کاموں میں مشغول تھے اور ان حکام کو جیسے قید سے رہائی مل گئی۔ رشوت ستانی کا بازار گرم تھا۔ رعایا سے من مانی مالگزاری وصول کی جارہی تھی۔ پہلے پہل تو "وطنی مجلس" نے خفیہ طور پر کام جاری رکھا اور جب رعایا کو کافی اکسا دیا گیا تو باضابطہ طور پر کھلم کھلا تقریریں ہونے لگیں، جلسے منعقد کئے جانے لگے، ابراہیم ان سب کا راہ نما تھا۔ عوام اس کے اشارے پر ناچتے تھے۔ بالآخر بغاوت ہوگئی، واسدیو حاکم نرمل معہ اپنے ساتھیوں کے قتل کردیا گیا۔

سورج مغربی پہاڑیوں کے پیچھے تیزی سے بھاگا چلا جا رہا تھا، آسمان پر گلابی ٹکڑے ادھر سے ادھر منڈلا رہے تھے۔ ایک سوار صبا رفتار گھوڑے پر نرمل سے نکلا اور شمالی پہاڑیوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا بیس میل پر ایک گاؤں میں جاکر دم لیا۔ گھوڑا پسینے میں شرابور تھا، گھوڑے کی پیٹھ تھپکی اور ایک معمولی سے مکان میں داخل ہوا۔

"فاطمہ؟"

"کون؟ ابراہیم! تم آگئے میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔ میں تو آج بہت پریشان تھی، سنا ہے نرمل میں بغاوت ہوگئی۔ ابراہیم! تم یہ سب کیا کر رہے ہو، بغاوت کردینا آسان ہے اور اس کا نتیجہ؟ ابراہیم! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ اپنی جان کو جان بوجھ کر خطرے میں ڈالنا کوئی عقلمندی نہیں!"

"فاطمہ! تم اس کی فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی میں نے تو تم کو اصل بات بتائی ہی نہیں، سنوگی تو پاگل ہو جاؤ گی۔ کہہ دوں؟"

"ہاں ہاں"

"اب تم ملکہ ہو" اور اس نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔ وہ کھڑی اس کا منہ تک رہی تھی پھر یکایک اس نے کہا۔

"اب میں تمہارے بغیر یہاں نہیں رہ سکتی، اکیلے میں جی بہت گھبراتا ہے، خوفناک خیالات ستاتے ہیں۔ رات کو کئی مرتبہ چیخ کر جاگ گئی"

"فاطمہ! اگر میں اب تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا۔ نرمل میں ہر طرف بغاوت کی آگ پھیلی ہوئی ہے۔ گو شاہ حیدرآباد کو جلد ہی اطلاع ہوجانے گی لیکن وہ ابھی اس طرف

متوجہ ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ وہ آج کل سلطنت کے دوسرے اور اہم معاملات میں الجھے ہوئے ہیں" پھر لہجہ بدل کر

"زرل میں کل مابدولت کی رسم تاج پوشی منائی جائے گی اور ملکۂ عالیہ کی خدمت میں تحفے روانہ کئے جائیں گے۔ فاطمہ! تم خواہ مخواہ افسردہ ہو رہی ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے۔ کل تمہارے ابراہیم کی رسم تاج پوشی ہے اور ہاں میں تو یہ کہنا بھول ہی گیا کہ سال یا ڈیڑھ سال کے بعد ہماری شادی بھی ...." اور اس نے مسکرا کر فاطمہ کی طرف دیکھا، فاطمہ کے رخسار انگاروں کی طرح تپ رہے تھے۔

ابراہیم نے کپڑے اتارے اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ فاطمہ اس کے لئے گلاس میں دودھ لے آئی اور اس نے مسکراتے ہوئے اسے لے کر پی لیا۔ کچھ دیر آرام کے بعد وہ رخصت ہونے لگا۔ ستارے آسمان پر نکل آئے تھے۔ ان کی چھاؤں میں دونوں خراماں گھر سے نکلے۔ پھر ایک جگہ رک گئے۔

"ہم بہت جلد ملیں گے فاطمہ! ارے، تمہاری آنکھوں میں آنسو ہیں! سپاہی کی بیوی اور آنسو؟ فاطمہ! تم سپاہی کی ہونے والی بیوی ہو"

اور فاطمہ کی آنکھیں جیسے ان آنسوؤں کو پی گئیں۔ "اچھا! اب ذرا ہنس دو" اس نے کہا اور وہ مسکرا دی، چاند بادلوں کے پیچھے چھپ گیا۔

"ابراہیم ظفر الدولہ" کی رسم تاج پوشی بڑے تزک و احتشام سے منائی گئی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا گیا، زرل کے ہر بسنے والے کے چہرے پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی، مسکراہٹیں قہقہے، چہل پہل، نوبت نقارے، زرل دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔

باضابطہ طور پر حکومتی نظام قائم ہو گیا۔ ایک ہی سال کے اندر اندر رعایا خوش حالی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس کے فارغ ہوتے ہی ابراہیم ظفر نے حفاظتی تدابیر شروع کیں کیونکہ خطرہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ تازہ آئی ہوئی خبروں سے جنگ کا امکان قوی تر ہوتا جا رہا تھا۔

زرل کے اطراف، خندقوں، قلعوں، مورچوں وغیرہ کی تعمیر شروع ہو گئی اور فوج میں بھرتی بھی۔ تین چار مہینوں کے اندر اندر تقریباً دس ہزار فوج باقاعدہ زرل کی حفاظت کے لئے تیار تھی۔

"جہاں پناہ! وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا، خدمت عالی میں آج سے ڈیڑھ سال قبل یہ عرض کیا تھا کہ زرل میں ابراہیم نامی ایک شخص رعایا کو حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کی ترغیب دے رہا ہے اور اب وہی "ابراہیم ظفر" کے نام سے وہاں حکومت کر رہا ہے۔ زرل اس کا پائے تخت ہے ہمارے نمائندوں کو قتل کر دیا گیا ہے"

"بہت عالی ہمت شخص معلوم ہوتا ہے" اعلیٰ حضرت نے ارشاد فرمایا۔ "حضور! باغی کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے غلام کو اجازت مرحمت فرمائی جائے"

"یہ تو بہت معمولی سا کام ہے سراج! خیر ہم تمہیں اجازت دیتے ہیں" اور پھر دربار ختم کرتے ہوئے سراج سے مسکرا کر فرمایا "اس کی رگوں میں بھی بہادروں کا خون معلوم ہوتا ہے سراج!"

ایک ہی ہفتے میں سراج نے اپنی فوج کو تیار کر کے زرل کی طرف کوچ کیا۔ ابراہیم ظفر کو جاسوسوں نے سراج کی آمد کی اطلاع دی اور زرل میں بھی طبل جنگ بج گیا۔

سراج انتہائی تیزی سے تین ہی دن میں زرل پہونچ گیا اور دریائے گوداوری کے دوسرے کنارے پر پڑاؤ ڈال دیا۔ دوسرے ہی دن "شام گڑھ" پر حملہ ہوا۔ دن تمام خونریز لڑائی ہوتی رہی۔ ایک طرف سے گونڈوں کے بے حد پریشان کن حملے دوسری طرف شام گڑھ کے اونچے قلعے سے آتش باری، سراج کی فوج میں سراسیمگی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ رات ہو گئی اور لڑائی دوسرے دن کے لئے ملتوی ہو گئی۔

دوسرے دن صبح سراج نے اپنے دو جرنیل اور دو مشیران خاص ڈیروں میں مردہ پائے، بڑی حیرانی ہوئی۔ سراج نے خود فوج کی کمان لی لیکن دوپہر ہونے ہوتے تک آتش باری، پہاڑوں کی گرمی اور سب سے زیادہ گونڈوں کے عجیب طرز جنگ نے سراج کو ہراساں کر دیا اور رات ہونے ہوتے تک سراج اپنی فوج لے کر زرل سے بھاگ رہا تھا۔ ابراہیم ظفر کے گونڈ کپتان نے کئی میل تک اس کا پیچھا کیا۔

سراج اپنی شکست پر اتنا رنجیدہ اور نادم تھا کہ اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے کی کئی روز تک جرأت نہ کرسکا۔ بالآخر اعلیٰ حضرت نے بہ عطوفتِ شاہانہ خود سراج کو یاد کیا۔

"سنا! تمہیں ابراہیم ظفر نے شکست دی!"

"جہاں پناہ"

"اس کی رگوں میں بہادروں کا خون رواں ہے سراج، ہم نے اس سے پیشتر تم سے کہا تھا"

"عالم پناہ"

"خیر! ایک مرتبہ اور کوشش کرو"

اور چند ہی دن بعد سراج ایک زبردست فوج، بہترین توپ خانہ اور اسلحہ کے ساتھ زحل پر حملہ آور ہوا لیکن وائے بدقسمتی کہ اس مرتبہ بھی وہ شام گڑھ سے آگے نہ بڑھ سکا اور شکست کھا کر بھاگ آیا۔

"جوش بہت زیادہ اور قوتِ عمل کم، حیدرآبادی امرا کی یہ سب سے بڑی کمزوری ہے" اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

"درست جہاں پناہ"

"قوتِ عمل پیدا کرو اور تم اپنے آپ کو پہلے سے بھی زیادہ اپنے شاہ کا وفادار پاؤگے"

"جہاں پناہ"

"اب کی دفعہ ہم شاہی فوج کو زحل پر حملہ کے لئے بھیجتے ہیں"

"فاطمہ!"

"میرے سرتاج!"

"اب ہمیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے گا، تمہاری معصوم دعائیں بارگاہِ رب العزت میں قبول ہوئیں اور میں نے دوسری مرتبہ سراج کو شکست دے کر اپنی طاقت کا لوہا منوالیا ہے۔ سارے حیدرآباد میں ہلچل سی مچ گئی ہے اور ہر شخص کی زبان پر "ابراہیم ظفر" ہے.............. اب جلد ہی ہم ایک بندھن میں.............."

"خدائے بزرگ و برتر آپ کو ایسے کئی مسرت کے دن دکھائے، میرے سرتاج!"

"آمین"

"ابراہیم ظفر الدولہ ظفر الملک" شاہ زحل کی شادی کی تیاریاں بڑے ہی زور شور پر جاری ہیں، سارا زحل رشکِ فردوس بنا ہوا ہے۔ دن رات نوبت نقارے دھوم مچا رہے ہیں، روزانہ جشنِ چراغاں ہو رہے ہیں کہ جنوب کی طرف سے ایک سوار تیز تیز آتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے داخل ہوتے ہی شام گڑھ، تیس گڑھ اور تمام قلعوں پر طبلِ جنگ بجنے لگتا ہے اور تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر ہر طرف آگ کی طرح پھیل جاتی ہے کہ زحل پر کوئی حملہ ہونے والا ہے، ابراہیم ظفر مسکرا دیتا ہے۔

"شکست سے ابھی طبیعت سیر نہیں ہوئی سراج کی"

ایک جاسوس آکر اطلاع دیتا ہے۔

"جہاں پناہ! سراج اس فوج میں موجود نہیں، شاہی کماندار اس فوج کی کمان کر رہا ہے"

"تب تو مقابلہ سخت ہے" ابراہیم ظفر نے مقابلہ کی اہمیت محسوس کرلی۔

حملہ شروع ہوا، گو نڈر جرنیل نے چار گھنٹوں کی لڑائی میں شاہی توپ خانہ کی آتشباری اور شاہی فوج کے سخت حملوں کی تاب نہ لاکر "شام گڑھ" چھوڑ دیا اور شہر پناہ میں داخل ہوا۔

"پل اٹھا دیا جائے" ابراہیم ظفر خود کمان کر رہا تھا۔

"سامنے کے مورچے پر چار توپیں اور چڑھا دو ـــ دو دستے پچھلی جانب سے ـــ اسد خاں! دو دستے سرنگ کے راستے سے ـــ احمد! بایاں بازو کمزور ہو رہا ہے ـــ" وہ ہدایات دیتے چلا جا رہا تھا اور اس کی فوج جانبازانہ لڑائی لڑ رہی تھی۔

"اگلا مورچہ چھوڑ دو ـــ پیچھے ہٹتے جاؤ ـــ بائیں بازو سے گھیرو ـــ" لڑائی اپنی پوری شدت کے ساتھ جاری تھی۔ شاہی کماندار اس کوشش میں تھا کہ رات ہونے ہونے تک کسی طرح بھی ہو اپنی کامیابی مکمل کرلے لیکن ایسا نہ ہوسکا اور لڑائی دوسرے دن کے لئے ملتوی ہوگئی۔

شاہی فوج کے کیمپ میں رات "دو قاتل جاسوس" پکڑے گئے۔ یہ قاتل جاسوس ابراہیم ظفر کی تربیت شدہ ایک خاص جماعت تھی جس کا کام نہ صرف جرنیلوں کو قتل کرنا تھا بلکہ دوسری اور ضروری معلومات بھی حاصل کرنا تھا۔

صبح ہوتے ہی پھر لڑائی شروع ہوگئی اور دوپہر تک اپنے شباب پر تھی۔ اسلحہ کی جھنکار، بندوقوں کی ٹھائیں ٹھائیں، توپوں کی گرج، چیخ پکار، نعرے عجیب عبرتناک

منظر تھا، ابراہیم ظفر مجبور ہوگیا اور اس نے اپنی فوج کا بیشتر حصہ بنتیس گڑھ پہونچا دیا - شاہی فوجوں نے بنتیس گڑھ کا محاصرہ کرلیا -

"حضور! صلح کرلینی بہتر ہے" ایک فوجی افسر نے کہا

"جنگ جاری رکھو جبار!"

"جہاں پناہ!"

"یہ میرا حکم ہے"

"مگر حضور ...."

ٹھائیں اور جبار اس کی فوج کا ایک افسر زمین پر خون میں لوٹ رہا تھا -

"ہم اپنے آخری قطرۂ خون تک جنگ جاری رکھیں گے اسد!"

"بے شک، جہاں پناہ"

"ہم بہادروں کی موت مرنا پسند کرتے ہیں"

ابراہیم ظفر خود چار دستوں کے ساتھ ایک سرنگ کے ذریعہ سے شاہی فوج کے پچھلے حصے پر نمودار ہوا، شاہی فوج آسانی سے گھر گئی، شاہی کماندار پریشان ہوگیا - لیکن جلد ہی اپنی فوج کو اس نے دو حصوں میں تقسیم کردیا اور لڑائی نے شدت اختیار کرلی - ابراہیم ظفر اپنے ایک جرنیل کے سپرد یہ کام کرکے قلعہ میں واپس آگیا -

"اوہ! توپچی دیکھتے نہیں ہو، کیا کر رہے ہو؟"

وہ شیر کی طرح غرّایا -

"ہماری فوج کے اس حصے پر زیادہ دباؤ پڑ رہا ہے توپوں کے دہانے اس طرف پلٹ دو، تم ہٹ جاؤ، گدھے ہو تم"

اور اس نے توپچی کی جگہ سنبھالی - آتشباری تیز سے تیز تر ہوگئی، نرلی جرنل جو میدان میں شاہی فوج سے مقابلہ کر رہا تھا اپنی جگہ پر جما ہوا تھا -

"قلعہ کی اس طرف کی توپ سے" شاہی کمان دار نے بائیں طرف اشارہ کیا "بہت زیادہ آتشباری ہورہی ہے ہماری فوج پریشان ہورہی ہے، خدانخواستہ کہیں ——

اس توپچی کو ختم کردو" اور ایک افسر اس توپچی کی تاک میں لگا ہوا تھا - نرلی جرنل بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا تھا - قلعہ کی طرف سے آتشباری میں اضافہ ہوتا جارہا تھا - ابراہیم ظفر کا چہرہ کھیل گیا - وہ اپنی جگہ سے اٹھا تاکہ دوسری طرف سے آتشباری تیز کرنے کا حکم دے -

ٹھائیں!

آہ! اسد، دائیں طرف کی آتش باری ....

اور تیز ...... کردو"

"جہاں پناہ! یہ کیا ہوگیا حضور کو"

"جاؤ اسد .... تم جاؤ ...... پہلے جاؤ"

اور ابراہیم ظفر دھم سے زمین پر گر گیا -

"میرے سرتاج!"

"کون .... فاطمہ .... میری فاطمہ .... تم یہاں کیسے آگئیں ...."

لڑائی زوروں پر جاری تھی -

"میرے سرتاج یہ کیا ہوگیا آپ کو؟ اف خدایا .. .."

اور ابراہیم ظفر مسکرانے لگا -

"فاطمہ - ہنو - ہنو، ایک بار ....." "میں بہادروں .... کی موت ..... مر رہا ہوں -

فاطمہ! میں ..... بہت خوش ہوں .... بہت" اس کا سر فاطمہ کی گود میں تھا - سینے سے خون بہہ رہا تھا اور وہ مسکرا رہا تھا -

فاطمہ! وطن کی خاطر سب کچھ ...."

ایک ہی گھنٹہ بعد آصفی پرچم "بنتیس گڑھ" پر لہرا رہا تھا اور ابراہیم ظفر —— اپنی محبوبہ کی آغوش میں ابدی نیند سو رہا تھا -

عبدالمجید (عثمانیہ)

وضع جسمانی

اس سے قبل کی تقریر میں میں نے بچپن کے زمانے کی وضع جسمانی کی نوعیت کو ضروری توضیحات کے ساتھ پیش کرکے اس کے اصلاحی پہلو کو واضح کیا تھا۔ آج کی تقریر میں زمانۂ بلوغ کی وضع جسمانی پر روشنی ڈالی جائے گی۔ میں اس امر کی توضیح کی کوشش کروں گا کہ زمانۂ بلوغ زندگی میں کس قدر اہم ہے۔ اس زمانہ میں وضع جسمانی کی پرورش کس نوعیت پر ہونی چاہیے اور وہ کونسے ایسے داخلی اور خارجی امور ہیں جو زمانۂ بلوغ وضع جسمانی پر خوش گوار یا غیر خوش گوار اثرات مترتب کرتے ہیں اور جس سے جوانی ادھیڑپن اور بڑھاپے کے زمانے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

بلوغ کا دور مختلف ممالک میں آب و ہوا کے لحاظ سے مختلف ہے۔ سرد ممالک میں بالعموم بچے ۱۹۔ ۲۰۔ اور ۲۱ سال کے درمیان زمانۂ بلوغ میں قدم رکھتے ہیں۔ لیکن گرم ممالک میں بچے کسی قدر قبل ہی بالغ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں بچے بالعموم ۱۶۔ ۱۷۔ اور ۱۸ سال کے درمیان بلوغ کے دور میں آجاتے ہیں اور لڑکیاں ۱۵۔ ۱۶ اور ۱۷ سال کے درمیان بلوغ کے زمانے میں پہونچ جاتی ہیں جغرافی حالات کے علاوہ غذا اور اس کی نوعیت کا تعلق بھی بلوغ کے دور سے بہت زیادہ ہے۔ گرم مسالہ دار اور چٹ پٹی غذا کھانے والے بچے اس سے بھی جلد زمانہ بلوغ کو پہونچتے دکھائی دیتے ہیں۔ قطع نظر اس تخیلات کو بھی اس زمانے کے قبل از قبل آغاز سے زیادہ تعلق ہے۔ جنسی میلان اور اس کے متعلق معلومات کی فراہمی ہر بچے میں فطرتاً موجود ہے۔ انہی معلومات کے حصول میں اگر اس کی صحیح رہبری نہ ہو تو وہ خود اس کی کھوج میں لگا رہتا ہے۔ عام حالات اور اس کے نتائج کے اعتبار سے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس قسم کی کھوج اور اس کے براہ راست یا بالواسطہ کھوج کے طریقے بالعموم گمراہ کن ہی ہوا کرتے ہیں۔ وہ تمام اعلیٰ اور مقدس تخیلات جو جنسی اعتبار سے دل اور دماغ میں پرورش پانے چاہئیں ان کی بجائے وہ نفسانی خواہشات کا شکار ہو کر اپنی انسانی قدر و قیمت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہر مذہب میں بلوغ کے آغاز کے ساتھ ہی ہر انسان پر مذہبی پابندیاں عائد کردی گئی ہیں۔ جنسی تعلقات تو اس قدر نازک ترین حالت میں واضح کئے گئے ہیں جن میں ذرا سی لغزش ایک گناہِ کبیرہ بن جاتی ہے۔ بہرحال اس خصوص میں میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا بلکہ صرف اس قدر اشارہ کئے دیتا ہوں کہ بچے کے بزرگوں کا یہ فرض ہے کہ اس میں جنسی تخیلات اور اس کی فراہمی کے طریقے اس پیرایہ میں مہیا کریں جن کے ذریعہ ایک پاک اور مقدس خیال اس کے دماغ پر مسلط ہو جائے تاکہ وہ گمراہی سے بچ جائے اور اپنی زندگی کو تباہ و برباد نہ ہونے دے۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت ہر ترقی یافتہ ملک میں جو اپنے نونہالوں کو تندرست اور قوی تر بنانا چاہتے ہیں، جنسی تعلیم ان بچوں کے لئے عام اور لازمی کردی گئی جو زمانۂ بلوغ کے قریب تر ہوں۔ غرض مجھے یہاں یہ بتانا مقصود تھا کہ قبل از قبل جنسیاتی تخیلات کی پیدائش سے بھی بلوغ کے زمانے کا آغاز کسی لڑکے یا لڑکی پر ہونے لگتا ہے۔

زمانۂ بلوغ دراصل بچپن اور جوانی کے درمیان کا حدِ فاصل ہے۔ انسان تعیشات کے لاتناہی پھیر میں پڑ کر یا معاشی تخیلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی زندگی کا مقصد کچھ ہی تعین کرے لیکن قدرت انسان سے کچھ اور ہی توقع رکھتی ہے۔ زمانۂ بلوغ میں انسان میں جنسی میلان کی پیدائش قدرت کی جانب سے ہوتی ہے۔ اس میلان کو پیدا کرنے کا یہ منشا ہے کہ انسان اس بات کی تیاری کرے کہ آئندہ اس کو ایک باپ یا ماں بننا ہے اور اس خصوص میں صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے تاکہ اس کی ہونے والی پود توانا اور طاقتور ہو سکے۔

ابھی ہم نے بتایا کہ بلوغیت کا زمانہ تیاری کا زمانہ ہے۔

اس زمانے میں وضع جسمانی میں کئی ایک تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ ہڈیوں میں نمو ہوتا ہے اس لئے اسی مناسبت سے گوشت میں اضافہ ہوتا ہے۔ عصبی نظام پر بھی اس کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ گویا جسم اور دماغ ہر دو میں تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ بلوغ کا زمانہ جس قدر مختصر ہے اسی قدر زیادہ اہم بھی ہے۔ اس زمانے میں اگر وضع جسمانی کی دیکھ بھال نہ کی جائے تو اس کا برا اثر جوانی اور اس کے بعد ادھیڑپن اور بوڑھاپے پر ضرور پڑتا ہے۔ دور بلوغ میں سب سے پہلے وضع جسمانی کی جانچ قد کے نمو اور جسم کے وزن سے کی جاتی ہے۔ ماہران وضع جسمانی نے عمر کے لحاظ سے قد اور وزن میں مختلف تجربات کی بناء پر خاص تناسب مقرر کر دیئے ہیں جن کو کسی خاص عمر کا معیاری وزن کہا جاتا ہے۔

معیاری وزن کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سے وضع جسمانی کی موزوں نشو و نما کا اندازہ قائم کیا جاتا ہے۔ معیاری وزن کا تعلق بھی کسی مقام کی آب و ہوا اور غذا کی نوعیت پر منحصر ہے۔ اب ہم آپ کو اپنے ملک کی آب و ہوا اور نوعیت غذا کے مد نظر واضح کرتے ہیں کہ زمانۂ بلوغ میں وزن کا معیار کیا ہونا چاہئیے۔ سب سے پہلے ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ لڑکوں کا معیاری وزن بہ زمانۂ بلوغ عمر اور قد کے لحاظ سے کیا ہونا چاہیے۔

۱۴ سال کی عمر والے بچے

اگر ان کا قد ۴ فٹ ۱۰ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۹۰ پونڈ ہو

فٹ	انچ	پونڈ
۴	۱۱	۹۴
۵ فٹ		۱۰۰
۵	۱	۱۰۴
۵	۲	۱۰۶
۵	۳	۱۱۳
۵	۴	۱۱۷
۵	۵	۱۲۲
۵	۶	۱۲۶
۵	۷	۱۳۰

اگر ان کا قد ۵ فٹ ۸ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۱۳۴ پونڈ ہو

فٹ	انچ	پونڈ
۵	۹	۱۳۸
۵	۱۰	۱۴۲
۵	۱۱	۱۴۶
۶ فٹ		۱۵۰

یہ ہوا ۱۶ سال کی عمر والے بچوں کا معیاری وزن اب ہم ۱۸ سال کی عمر والے بچوں کا، ان کے قد کے لحاظ سے معیاری وزن بتلاتے ہیں۔

اگر ان کا قد ۴ فٹ ۱۱ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۹۵ پونڈ ہو

فٹ	انچ	پونڈ
۵		۱۰۰
۵	۱	۱۰۵
۵	۲	۱۱۰
۵	۳	۱۱۵
۵	۴	۱۲۰
۵	۵	۱۲۵
۵	۶	۱۳۰
۵	۷	۱۳۵
۵	۸	۱۴۰
۵	۹	۱۴۵
۵	۱۰	۱۵۰
۵	۱۱	۱۵۳
	۶	۱۵۵

اسی طرح اب ہم ۲۰ سال کے بالغ بچوں کا ان کے قد کے لحاظ سے معیاری وزن ظاہر کرتے ہیں۔ ۲۰ سال میں بالغ ہونے والے بچوں کا قد بالعموم عمدہ ہوتا ہے ان کا قد ۵ فٹ ۱ انچ سے اکثر کم نہیں ہوتا۔ اب ان کا بھی معیاری وزن سنیئے۔

اگر ان کا قد ۵ فٹ ۱ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۱۱۰ پونڈ ہو

فٹ	انچ	پونڈ
۵	۲	۱۱۵
۵	۳	۱۲۵
۵	۴	۱۲۱

اگر ان کا قد ۵ فٹ ۵ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۱۲۷ پونڈ ہو

〃 〃 ۵ 〃 ۶ 〃 〃 〃 〃 ۱۳۰ 〃
〃 〃 ۵ 〃 ۷ 〃 〃 〃 〃 ۱۳۲ 〃
〃 〃 ۵ 〃 ۸ 〃 〃 〃 〃 ۱۳۶ 〃
〃 〃 ۵ 〃 ۹ 〃 〃 〃 〃 ۱۴۰ 〃
〃 〃 ۵ 〃 ۱۰ 〃 〃 〃 〃 ۱۴۵ 〃
〃 〃 ۵ 〃 ۱۱ 〃 〃 〃 〃 ۱۵۰ 〃
〃 〃 ۶ 〃 〃 ہو تو ان کا معیاری وزن ۱۵۷ 〃

یہ ہوا لڑکوں کا معیاری وزن جو زمانۂ بلوغ میں ہونا چاہیے۔ لڑکیوں کا سنِ بلوغیت لڑکوں سے کسی قدر قبل ہی آغاز ہوتا ہے کیونکہ جنسی تخیلات کی پیدائش لڑکیوں میں پہلے ہی ہونے لگتی ہے۔ ہمارے ملک میں یہاں کی آب و ہوا اور غذا کے مدنظر لڑکیوں کا سنِ بلوغ ۱۵۔ ۱۶ اور ۱۷ سال کے درمیان بالعموم واقع ہوتا ہے۔ اب ہم ان ہی سالوں کے لحاظ سے قد کے تناسب کے مدنظر ان کا معیاری وزن واضح کرتے ہیں۔ پہلے ہم ۱۵ سال کی لڑکیوں کا معیاری وزن بتاتے ہیں۔

اگر ۱۵ سال کی لڑکیوں کا قد ۴ فٹ ۹ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۸۶ پونڈ ہو

〃 ۱۵ 〃 〃 〃 ۴ 〃 ۱۰ 〃 〃 〃 ۹۰ 〃
〃 ۱۵ 〃 〃 〃 ۴ 〃 ۱۱ 〃 〃 〃 ۹۵ 〃
〃 ۱۵ 〃 〃 〃 ۵ 〃 〃 〃 ۱۰۰ 〃
〃 ۱۵ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۱ 〃 〃 ۱۰۶ 〃
〃 ۱۵ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۲ 〃 〃 ۱۱۱ 〃
〃 ۱۵ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۳ 〃 〃 ۱۱۵ 〃
〃 ۱۵ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۴ 〃 〃 ۱۱۹ 〃
〃 ۱۵ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۵ 〃 〃 ۱۲۲ 〃
〃 ۱۵ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۶ 〃 〃 ۱۲۴ 〃
〃 ۱۵ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۷ 〃 〃 ۱۲۷ 〃
〃 ۱۵ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۸ 〃 〃 ۱۳۰ 〃
〃 ۱۵ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۹ 〃 〃 ۱۳۳ 〃

اگر ۱۵ سال کی لڑکیوں کا قد ۵ فٹ ۱۰ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۱۳۶ پونڈ ہو

〃 ۱۵ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۱۱ 〃 〃 〃 ۱۴۰ 〃
〃 ۱۵ 〃 〃 〃 ۶ 〃 〃 〃 ۱۴۵ 〃

اب ہم ۱۶ سال کی لڑکیوں کا وزن اور ان کے قد کے تناسب کو پیش کرتے ہیں۔

اگر ۱۶ سال کی لڑکیوں کا قد ۴ فٹ ۱۰ انچ ہو تو ان کا معیاری وزن ۹۴ پونڈ ہو

〃 ۱۶ 〃 〃 〃 ۴ 〃 ۱۱ 〃 〃 〃 ۹۶ 〃
〃 ۱۶ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۰ 〃 〃 〃 ۱۰۲ 〃
〃 ۱۶ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۱ 〃 〃 〃 ۱۰۵ 〃
〃 ۱۶ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۲ 〃 〃 〃 ۱۱۳ 〃
〃 ۱۶ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۳ 〃 〃 〃 ۱۱۷ 〃
〃 ۱۶ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۴ 〃 〃 〃 ۱۲۰ 〃
〃 ۱۶ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۵ 〃 〃 〃 ۱۲۳ 〃
〃 ۱۶ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۶ 〃 〃 〃 ۱۲۶ 〃
〃 ۱۶ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۷ 〃 〃 〃 ۱۲۸ 〃
〃 ۱۶ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۸ 〃 〃 〃 ۱۳۲ 〃
〃 ۱۶ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۹ 〃 〃 〃 ۱۳۵ 〃
〃 ۱۶ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۱۰ 〃 〃 〃 ۱۳۸ 〃
〃 ۱۶ 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۱۱ 〃 〃 〃 ۱۴۲ 〃
〃 ۱۶ 〃 〃 〃 ۶ 〃 〃 〃 ۱۴۷ 〃

اب ہم ۱۷ سال کی لڑکیوں کا معیاری وزن ان کے قد کے تناسب سے بتاتے ہیں۔ جو لڑکیاں ۱۷ سال کی عمر میں سنِ بلوغ میں داخل ہوتی ہیں وہ بالعموم بہت توانا اور تندرست رہتی ہیں ایسی لڑکیاں عمدہ اور صحت مند بچوں کی مائیں ہوا کرتی ہیں ان میں نسوانی کمزوریاں جو ان کی صحت کو تباہ کرتی ہیں۔ بہت کم پیدا ہوتی ہیں اور ان کے بچے بھی نہایت توانا اور مضبوط قویٰ کے ہوتے ہیں۔ بچپن کی اموات بہت کم ہوا کرتی ہیں۔ اب ۱۷ سال کی لڑکیوں کا معیاری وزن بغور سنیئے۔

۱۷ سال کی عمر رکھنے والی لڑکیوں کا وزن اگر وہ ۴ فٹ

۱۱ انچ کا قد رکھتی ہوں تو ان کا معیاری وزن ۹۸ پونڈ ہو۔
۵ فٹ کا قد رکھتی ہوں تو ان کا معیاری وزن ۱۰۴ پونڈ ہو۔
۵ ″ ۱ انچ کا قد رکھتی ہوں تو ان کا معیاری وزن ۱۰۹ پونڈ ہو

۵ ″ ۲ ″ ″ ″ ″ ″ ۱۱۴ ″
۵ ″ ۳ ″ ″ ″ ″ ″ ۱۱۸ ″
۵ ″ ۴ ″ ″ ″ ″ ″ ۱۲۱ ″
۵ ″ ۵ ″ ″ ″ ″ ″ ۱۲۴ ″
۵ ″ ۶ ″ ″ ″ ″ ″ ۱۲۷ ″
۵ ″ ۷ ″ ″ ″ ″ ″ ۱۲۹ ″
۵ ″ ۸ ″ ″ ″ ″ ″ ۱۴۳ ″
۵ ″ ۹ ″ ″ ″ ″ ″ ۱۳۶ ″
۵ ″ ۱۰ ″ ″ ″ ″ ″ ۱۳۹ ″
۵ ″ ۱۱ ″ ″ ″ ″ ″ ۱۴۲ ″
۶ فٹ ″ ″ ″ ″ ″ ۱۴۰ ″

ہم نے زمانۂ بلوغ اور اس زمانے میں بچوں اور بچیوں کا بلحاظ عمر معیاری وزن بتا دیا ہے۔ معیاری وزن در اصل صحت جسمانی اور عمدہ وضع جسمانی کا ایک معیار ہے اور اسی سے کسی کی عمر کا بھی تخمینہ کیا جاتا ہے اسی وجہ سے اکثر بیمہ کمپنیاں بیمہ کے وقت عمر اور وزن کے تناسب کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ فوجی خدمات کے سلسلہ میں بھی معیاری وزن کو بطور خاص پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ بہر حال اب ہم صرف زمانۂ بلوغ میں وضع جسمانی کے بعض حالات پر روشنی ڈالیں گے جس سے وضع جسمانی کی نوعیت صحت جسمانی کے اعتبار سے واضح ہو سکے۔ بلوغ کے دور میں جسم کے ہر عضو میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور یہ تبدیلی خاطر خواہ اس وقت ہو گی جب کہ اس خصوص میں بطور خاص خیال رکھا جائے اس کے صحیح نشو و نما کے لئے مناسب اور صحت بخش ماحول پیدا کیا جائے۔ اس میں سب سے اہم غذا کا سوال ہے۔ انڈا۔ گوشت۔ مچھلی۔ پھل۔ ترکاریاں زمانۂ بلوغیت میں وضع جسمانی کے نشو و نما میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ دودھ کا استعمال اس زمانے میں بچوں کو اگر کرایا جائے تو ان کے عام نشو و نما میں بڑی ترقی ہوتی ہے۔ غذا کے ساتھ اس زمانہ میں ورزش کا سوال بھی بہت اہم ہے۔ بالعموم اس زمانے میں خود بخود بچے کے دل میں جسمانی طاقت کے حصول کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھنا کہ جسمانی توانائی اور وضع جسمانی کو قوی کرنے کے لئے کس قسم کی ورزشیں کرائی جائیں۔ ہم نے معیاری وزن تبلا دیا ہے اس کو پیش نظر رکھئے اور یہ دیکھئے کہ اپنا وزن معیاری سے کم ہے یا زیادہ۔ کم ہونے کی صورت میں ایسی ورزشیں کی جائیں جو عضلات اور اعصاب کو تقویت پہونچا سکتے ہیں جن میں غیر آلاتی ورزشیں بہت سود مند ہیں۔ سیدھی سادھی ورزشیں بہ لحاظ صورت کسی ماہر وضع جسمانی سے تیار کرائی جائیں اور اس کے حسب ہدایات روزانہ صبح و شام ان ورزشوں کو کرتے رہیں۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ ضرور یاد رہے کہ کم وزن رکھنے والے بچے کھیلوں میں زیادہ حصہ لیں۔ ہلکی ورزشیں جو بہت کم تھکاتی ہیں اور جن کو بہت دیر کر سکتے ہیں کرتے رہیں۔ وزنی ورزشیں جو بہت جلد تھکا دیتی ہیں ہرگز نہ کریں۔ کیونکہ اس قسم کی ورزشیں عضلات اور اعصاب پر بار ڈالتی ہیں اور اس قسم کے بارسے ان میں تھکن زیادہ پیدا ہو جاتی ہے اور اس سے عضلات اور اعصاب کے نشو و نما میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ بظاہر انسان تو ایسی ورزشوں سے موٹا تازہ دکھائی دیتا ہے لیکن اس کا اثر دوران خون ہاضمہ اور عصبی نظام پر بہت برا پڑتا ہے۔ وقت سے پہلے ہی اعضا کمزور ہونے لگتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وزنی ورزشیں مثلاً۔ ڈمبل۔ بار اور رنگ اور لگاتار ڈنڈ اور بیٹھک انسان کے جسم کو بہت جلد تیار کر دیتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ انسان کو اس قسم کی تیاری کی ضرورت ہے یا نہیں۔ بے ضرورت تیاری سے سوائے نقصان کے اور کچھ نہیں۔ وزنی ورزشیں بھی اپنی خاص خصوصیات اور افادیت رکھتی ہیں بشرطیکہ ان سے مناسب اور ضرورت کے لحاظ سے فائدہ اٹھایا جائے۔ جسم کی تیاری کا مفہوم ہمیشہ معیاری وزن رہے۔ اگر آپ کو اپنا معیاری وزن

ل گیا تو یہ سمجھئے کہ آپ نے وضع جسمانی کی پوری قابلیتوں کو حاصل کر لیا ہے۔ کم وزن رکھنے والے وضع جسمانی میں کئی نقائص پیدا ہوتے رہیں۔ بالخصوص زمانۂ بلوغ میں بینائی پر اثر پڑتا ہے۔ بھوک اڑ جاتی ہے۔ دماغی کام میں دل نہیں لگتا۔ حافظہ بھی کچھ ایسا ویسا ہی ہوتا ہے۔ قوت مدافعت میں فتور آجاتا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے بھی ان میں کئی ایک خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چڑچڑا پن پیدا ہونے لگتا ہے۔ بار بار معمولی باتوں پر غصہ آنے لگتا ہے۔ صبر و تحمل اور طبیعت میں استقلال بہت کم رہتا ہے۔ جب جسمانی اور دماغی اعتبار سے انسان اپنی کمزوریوں کو محسوس کرنے لگتا ہے تو اس میں ایک عام پستی رونما ہونے لگتی ہے جس سے اس کے آئندہ دور زندگی کے منازل میں بڑی بڑی رکاوٹیں پیدا ہوتے لگتی ہیں بالآخر وہ ایک کمزور شخصیت کے تحت ایک ناکام زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح معیاری وزن کے اعتبار سے جن کا وزن زیادہ ہو وہ اور بھی زیادہ توجہ کے قابل ہیں۔ اگر موٹاپے کو حسب حال رکھا جائے تو نہ صرف بظاہر وضع جسمانی بھدی معلوم ہونے لگتی ہے، بلکہ اس میں خرابیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ موٹے پن کا پہلا اثر قوت ہاضمہ پر پڑتا ہے۔ تدریج خوراک کم ہونے لگتی ہے۔ پانی زیادہ پیا جاتا ہے۔ دوران خون اور اعصاب پر بیجا دباؤ پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں جسم کے اندرونی اعضا بیجا دباؤ سے بیزار ہو کر بغاوت کر بیٹھتے ہیں۔ ذیابیطس۔ خون کا دباؤ۔ تیز نظام ہاضمہ اور دوران خون سے متعلق جو امراض ہیں بتدریج حملہ آور ہوتے جاتے ہیں۔ زمانۂ بلوغ میں اگر موٹاپے پر قابو پا لیا جائے تو آئندہ زندگی میں ان مہلک امراض سے سابقہ نہ پڑے گا جو بچے معیاری وزن سے زیادہ وزن رکھتے ہوں وہ غذا کے معاملہ میں بہت احتیاط کریں ترکاریوں اور پھلوں کا استعمال زیادہ کریں۔ پانی کم پئیں۔ پسینہ آور ورزشیں اور کھیل زیادہ کھیلیں۔ ان کے لئے تھوڑی بہت وزنی ورزشیں موزوں ہوتی ہیں لیکن ہلکی ورزشوں کے ساتھ ان ورزشوں کو ملا کر کریں۔ بہرحال موٹاپا نہ صرف وضع جسمانی کو بھدا کر دیتا ہے بلکہ ایسے وضع جسمانی کی تمام کیفیات اور خیالات بھی کچھ نہ کچھ بھدا پن ضرور لئے ہوئے ہیں۔

زمانۂ بلوغ میں وضع جسمانی کی تعمیر میں متوازن غذا اور موزوں ورزشوں کے علاوہ عادات کو بھی زیادہ دخل حاصل ہے۔ اس زمانہ میں اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ بچہ اپنے آپ کو بچہ کم سمجھنے لگتا ہے اس میں عقل و تمیز کا تصور زیادہ پیدا ہو جاتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ اس کے بڑے یا بزرگ کیا کرتے ہیں۔ اسی تصور میں وہ اپنے بڑوں کی عادات کو دیکھ کر ان ہی عادات کو حاصل کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم جو اپنے آپ کو بچوں کے بزرگ و سرپرست سمجھتے ہیں، کئی ایک ناقص عادات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہمارے کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے کی عادات میں صحت نہیں ہوتی۔ اس خصوص میں میں نے اس سے قبل کی تقریروں میں بہت کچھ توضیح کی ہے لیکن زمانۂ بلوغیت کے اعتبار سے بچوں کو جن عادات سے باز رکھنا ہے ان میں سگریٹ نوشی، چائے نوشی۔ پان کا استعمال بہت پیش پیش ہیں۔ یہ عادتیں صحت بخش کسی طرح نہیں۔ بظاہر کچھ لطف آجاتا ہے لیکن اس لطف کے پس پردہ کئی آفتیں پنہاں ہیں۔ ان عادتوں سے وضع جسمانی اور اس کی صحت بخش حالت پر کافی برا اثر پڑتا ہے۔ بلوغ جو تیاری کا زمانہ ہے اس میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ ان عادتوں کے متعلق تفصیل سے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ لیکن اس قدر بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان عادتوں سے جنسی تحریکات میں فتور پیدا ہوتا ہے اور کئی ایک جنسی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ لباس کی وضع قطع بھی اس زمانہ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ جہاں تک ہو سکے تنگ کپڑے نہ پہنے جائیں۔ لڑکیوں کا حد سے زیادہ بناؤ سنگھار کا خیال، اونچی ایڑی کے جوتوں کا متواتر استعمال ان کی قدرتی جنسی حالت میں رکاوٹ ڈالنے کا

باعث ہوتے ہیں۔

زمانۂ بلوغ میں سب سے اہم بات جو وضاحت طلب ہے اس زمانے کی شادیاں ہیں جو زمانۂ بلوغ میں وضع جسمانی کی ترقی میں سد راہ ہوتی ہیں۔ کم عمری میں شادیوں کے باعث وضع جسمانی کا پورا نشو و نما اپنی جگہ رک جاتا ہے۔ ایک تو خود اپنی وضع جسمانی کی بربادی ہوئی اور دوسرے وقت سے پہلے اولاد ہونے کے باعث بچے اتنے کمزور اور ناتوان پیدا ہوتے ہیں جو بہ مشکل زندہ رہتے ہیں۔ اگر زندہ رہ بھی گئے تو کمزور اور ناتوان۔ ظاہر ہے کہ ایسی کمزور وضع جسمانی رکھنے والے بچے آئندہ قومی ترقی میں کیا خاک ہاتھ بٹائیں گے۔ غرض ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کی نگہداشت بلوغ کے زمانے میں خاص طور سے کریں تاکہ وہ آئندہ ایک صحت مند ماں اور باپ بن کر طاقتور اولاد پیدا کریں۔

(لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے پڑھا گیا)

محمد غوث الدین

حسین گماں!

دھیمی دھیمی ہے ہوش کی قندیل
آ و نگاہوں میں کچھ خلل سا ہے
ہو رہی ہے جنون کی تکمیل
ہر عمل میرا بے عمل سا ہے

---

(۲) تیرے ان نرگسی کٹوروں میں
میرے ماضی کا خوں چھلکتا ہے
اور ان سرخ سرخ ڈوروں میں
ایک آنچل ہے جو جھلکتا ہے
میری زیست کا سرخ سرخ آنچل
اس کے شانوں پہ یوں سرکتا تھا
جس طرح زیست کا نقاب اٹھے
اور وہ مرمریں گداز سا جسم
مدغم کیف، مست ناز سا جسم
میری باہوں میں یوں تھرکتا تھا
جوں تڑپ کر حسیں حباب اٹھے
میری امید ہو گئی بے کل

---

(۳) ہو رہا ہے گمان پلکوں پر
دل شکن، دلنواز پلکوں کا
تیری جادو بیان پلکوں پر
ان نکیلی دراز پلکوں کا

---

(۴) تیری نظریں ہیں موج ہائے جنوں
اے مری غمگسار، زندہ باد
پوچھ مت مجھ سے میرا حال زبوں
اے سراپا بہار، زندہ باد
تشنگی اور بھی ہو جس سے فزوں
وہ نظر بار بار زندہ باد

افسر آذری

اندھیرا

دور سے ڈھیڑے کی المناک آواز برابر کانوں میں آ رہی تھی۔ نہ جانے کس کی ارتھی تھی۔ لوگ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے شمشان کی طرف جا رہے تھے۔ سب کے چہرے موت کے خوف سے زرد تھے۔ ایک عورت سر جھکائے سسکیاں لیتی جنازے کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔ دم بدم اس کی سسکیاں تیز ہو رہی تھیں۔ یہ بیوہ تھی۔ دکھوں کی ماری غریب عورت۔ اس کے ساتھ ہی اس کا بچہ ہانڈی میں آگ لئے جا رہا تھا۔ نادان نہیں جانتا تھا کہ آگ کس لئے لیجا رہا ہے۔ وہ اپنی روتی ہوئی ماں کے ساتھ خاموش چل رہا تھا۔ مگر جب اس کے باپو کی سوکھی ہڈیوں کو آگ سے جلانا شروع ہوا تو وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چیخنے لگا۔ عورت نے آگے بڑھ کر جلدی سے اسے گود میں اٹھا لیا اور سینے سے لگا کر زور زور سے رونے لگی۔ یہی اب اس کا سہارا تھا۔ بچہ اس کے سینے سے لگ کر خاموش ہو گیا۔ اس نے چتا کی طرف دیکھا۔ لوگ سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ شعلوں کے درمیان اسے اب بھی رامو کا سوکھا جلتا ہوا جسم نظر آ رہا تھا۔ سرخ سرخ شعلوں نے اسے گزرے ہوئے دن یاد دلا دیئے اور وہ ماضی کی یاد میں کھو گئی۔

وہ نئی نئی بیاہ ہو کر آئی تھی۔ دن بھر وہ اور رامو ساتھ ساتھ کام کرتے۔ بنجارہ ہلز پر نئے نئے مکان بن رہے تھے اور مزدوروں کی بہت ضرورت تھی۔ وہیں ایک جگہ ان دونوں کو کام مل گیا تھا۔ انہوں نے مالک سے تھوڑی سی جگہ مانگ کر اپنی جھونپڑی بنا لی تھی۔ صبح ہی صبح بھونپو کی آواز سن کر وہ جلد جلد نامکمل مکان کی طرف روانہ ہو جاتے اور دن بھر ساتھ ساتھ کام کرتے۔ ایک دوسرے کے قریب رہنے سے انہیں کچھ زیادہ تھکن محسوس نہیں ہوتی۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے کام کرتے۔ کبھی رامو شرارت سے اس کے کان میں کچھ کہہ دیتا اور وہ شرما کر سر جھکا لیتی۔ اسی طرح دن آہستہ آہستہ گزر جاتا اور شام میں وہ دونوں لوٹتے۔ وہ کھانا پکانے لگتی اور رامو بچے سے کھیلنے لگتا — دن یونہی گزرتے رہے۔

ہولی آئی اور آشائیں جاگ اٹھیں۔ چھٹی کے دن رامو بازار سے گلال اور کاغذ کے گجرے خرید لایا۔ اس نے اپنی شادی کی ساڑی پہنی۔ سوت کی موٹی سرخ ساڑی۔ اس کے ہاتھوں میں پیتل کے دو کڑے تھے۔ یہی اس کا زیور تھا۔ رامو نے اپنے لائے ہوئے گجرے اسے پہنا دیئے اور خود بھی ایک اپنے گلے میں ڈال لیا۔ پاس کی جھونپڑیوں سے بھی مرد اور عورتیں نکل آئیں اور سب نے مل کر ہولی کھیلی۔ پھر عورتیں ہولی کا گیت گانے لگیں۔ زیادہ رات گئے تک یہی ہنگامہ رہا پھر سب اپنی اپنی جھونپڑیوں کی طرف واپس آئے۔ وہ بھی تھکی ہوئی اپنی جھونپڑی میں داخل ہوئی۔ رامو نے پیچھے سے آ کر اس کے چہرے پر گلال مل دیا۔ سرخ سرخ گلال چتا کے شعلوں کی طرح۔

مکان کا کام تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ رامو کو پھر مزدوری کی فکر لگ گئی تھی۔ آخر کار اسے ایک گرانی میں نوکری مل گئی مگر پہلے کی طرح وہ ساتھ نہیں رہ سکے۔ وہ کہیں اور مزدوری کے لئے جانے لگی۔ شام ہی دونوں ساتھ مل کر لوٹتے۔

رامو اب پہلے جیسا تندرست نہ رہا تھا۔ گرنی کے کثیف دھوئیں سے اس کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ وہ رات بھر کھانسی سے پریشان رہتا۔ وہ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ مزدوری کرتی تاکہ رامو کا اچھی طرح علاج ہو سکے۔ وہ اپنے پیتل کے کڑے بیچ کر اس کا علاج کرواتی رہی مگر اس کی حالت گرتی ہی گئی۔

ایک دن وہ اس گھر میں گئی جس کے بنانے میں ان دونوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ وہ مالکہ سے التجائیں کرتی رہی کہ اس کے رامو کے علاج کے لئے کچھ روپیہ قرض دے مگر اسے ناکام لوٹنا پڑا۔ اس نے جاتے ہوئے سنا۔ اس کی مالکہ کہہ رہی تھی "یہیں پر فضا بنگلہ کو بھی ان لوگوں نے اپنی غلاظت سے بدنما کر رکھا ہے۔ ان کی یہ بوسیدہ غلیظ جھونپڑیاں اور ان سے ہر وقت نکلتا ہوا کثیف دھواں۔ ساری فضا خراب ہو جاتی ہے"

وہ گالیاں سن کر ناکام لوٹ آئی۔ وہ سوچتی یہاں کی آب و ہوا بہتر سمجھی جاتی ہے مگر رامو کو کیوں اس سے فائدہ نہیں۔ شاید اس کا بھی اثر ان لوگوں پر پڑتا ہے جو دولت مند ہیں۔ اچھی غذا اور اچھی ہوا۔ پھر وہ رامو کے لئے کیا کرے۔ وہ سوچتی ہی رہ گئی اور رامو اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ اور اس کا بچہ سسکنے کے لئے رہ گئے۔ پھر اس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ چتا کے شعلے بجھ چکے تھے۔ فضا میں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ایسا ہی اندھیرا اس کی زندگی پر بھی چھا گیا تھا اور ٹٹولنے کے باوجود اسے رستہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ کسی جانے پہچانے ہاتھ کی متلاشی تھی جو اس کا ہاتھ تھام لے اور پھر دونوں ایک دوسرے کے سہارے زندگی کا راستہ طے کریں۔ مگر وہ اندھیرے میں بھٹکنے کے لئے تنہا رہ گئی۔

نجمہ صبیح اللہ

تنقید و تبصرہ

اسلام کے معاشی تصورات

مرتبہ غلام دستگیر رشید ایم اے
ناشر۔ ادارۂ ادب جدید حیدرآباد دکن۔ قیمت ۳ روپے ۱۲ ۸ سر عثمانیہ ۳ روپے ۴ سکہ دار۔ حجم ۲۵۸ صفحے۔

غلام دستگیر رشید صاحب نے بائیس مقالوں کو ایک کتاب کی صورت میں ترتیب دیا ہے۔ ہر مقالہ اپنی جگہ نہایت اہم اور قابل غور ہے۔ آج کل عام طور خصوصاً نوجوان طبقہ نظام اشتراکیت سے بہت متاثر ہے اور اسلامی نظام پر اسے فوقیت دیتا ہے۔ لائق مرتب نے اس مجموعہ کی اشاعت سے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر مضمون میں اسلام کے معاشی نظام کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر عبید اللہ اور علامہ اقبال کے مضامین میں اشتراکیت اور اسلام کا بہترین موازنہ موجود ہے۔ مسلمانوں کو موجودہ معاشی پیچیدگیوں کا حل ڈھونڈنے کے لئے اس کتاب کو رہبر بنانا چاہئے۔

اسلام کے سیاسی تصورات

مرتبہ غلام دستگیر رشید ایم اے
ناشر نفیس اکیڈیمی عابد روڈ حیدرآباد دکن۔ قیمت ۱۲ سکہ عثمانیہ عالیہ کلدار۔ حجم ۱۴۲ صفحے

زیر نظر مجموعہ میں دس مقالے شامل ہیں۔ اسلامی سیاست کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ نظم عالمگیر سیاسی نظام بن سکتا ہے اور وہ اصلاحی نظام ہے۔ مقالہ نگار بھی انتخاب ہیں۔ ہر شخص کے لئے اسلامی سیاست سے واقف ہونا بے حد ضروری ہے اور اس سے واقف ہونے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

سالنامہ آجکل باتصویر

قیمت سالنامہ ۱۲ سالانہ چندہ دس روپیہ
حجم ۲۱۵ صفحے۔ حجم کاپیاں ۔ ادارۂ مطبوعات تعمیر۔ پوسٹ بکس ۱۶ دہلی

رسالہ آج کل اردو کا پندرہ روزہ رسالہ ہے۔ اس رسالہ کی مقبولیت اس امر کی شاہد ہے کہ رسالہ عام فہم اور دلچسپ ہے اس میں معلوماتی مضامین خاص طور پر شامل کئے جاتے ہیں۔ مستند اور مشہور لکھنے والوں کے مضامین بھی سالنامہ میں موجود ہیں۔ خالص ادبی اعتبار سے تو یہ رسالہ بہت بلند نہیں لیکن معلوماتی لحاظ سے یہ ہندوستان کا واحد مفید رسالہ ہے۔ زیر نظر سالنامہ میں تاریخی، سوانح، تنقیدی، علمی، معاشیاتی مضامین افسانے، ڈرامے اور نظمیں سب ہی شامل ہیں۔ زبان عام فہم ہے۔ ہر رنگ و مذاق کے مضامین موجود ہیں۔

نئی صبح

ترجمہ ل۔ احمد ناشر۔ قومی دارالاشاعت بمبئی ۴
حجم ۴۶ صفحے قیمت ۸

"نئی صبح" ایک روسی افسانہ کا ترجمہ ہے۔ افسانہ خیالی نہیں زندہ حقیقت ہے۔ اس میں ایک روسی عورت کی داستان حیات قلمبند کی گئی ہے جس نے انقلاب میں مردوں کے برابر حصہ لیا اور اپنی عزت اور عورت کی قربانی قومی آزادی کے لئے کی۔ انقلاب سے پہلے اور بعد کی روسی زندگی کا اچھا مطالعہ ہے۔

ابوجعفر منصور

تالیف ابوالقاسم رفیق دلاوری
ناشر۔ اقبال اکیڈیمی، ظفر منزل تاج پورہ۔ لاہور۔ حجم ۱۵۱ صفحے۔ قیمت بے جلد ۱۲

تاریخ کی اہم شخصیتوں کی سوانح عمریاں شائع کرنا قومی معیار اخلاق کو بلند کرنے اور بنانے کے لئے ضروری ہے۔ یہ بھی اسی قسم کی سوانح عمری ہے۔ طرز بیان دلچسپ ہوتے تو اچھا تھا کیونکہ نوجوان طبقہ نصیحت میں دلچسپی کو ڈھونڈتا ہے۔

"ز۔ س"

نتیجہ امتحان اردودانی (دوم) بابتہ سنہ ۱۹۴۵ء

حسب ذیل امیدواروں نے علی الترتیب سب سے زیادہ نشانات حاصل کئے۔

۲۱۴۔ دیا شنکر دلویدی اول (بلدہ فوج)
۳۷۸۔ شوکت جہاں بیگم دوم (نظام آباد)
۱۶۱۔ شیخ بوبکر باشراحیل سوم (بلدہ فوج)

بلحاظ رول نمبر

مرکز بلدہ (اناث)

(کامیاب بامتیاز)

۳۔ خدیجہ بیگم
۴۔ غوثیہ بیگم
۵۔ مریم بی
۷۔ ہاجرہ بی
۸۔ رابعہ بی

(کامیاب)

۱۔ کنیزہ عائشہ
۹۔ صالحہ بیگم

مرکز بلدہ (ذکور)

(کامیاب)

۱۰۔ محمد حسین
۱۱۔ محمد عبدالوہاب انصاری
۱۲۔ رام سوامی
۱۳۔ حیات خاں
۱۵۔ ٹوی ستیہ رام
۱۶۔ ابوالحسن محمد ریاض الدین
۱۷۔ جے رام ناتھم

مرکز بلدہ (فوج)

(کامیاب بامتیاز)

۲۱۔ نور احمد
۲۲۔ عبدالعزیز خاں
۲۴۔ محمد عثمان
۲۶۔ محبوب خاں
۳۱۔ چندر ناتھ پرشاد
۴۴۔ احسان احمد خاں
۴۹۔ امتیاز حسین خاں
۵۱۔ شام سندر
۵۹۔ سید سلطان محی الدین
۶۲۔ عبدالحق خاں
۶۴۔ منور علی خاں
۶۹۔ عبدالحفیظ
۷۰۔ احمد حسین خاں
۷۹۔ محمد عبدالرحیم
۸۰۔ منور خاں
۸۱۔ محمد اسحٰق
۸۷۔ احمد حسین
۸۸۔ ارجن داس سنگھ
۸۹۔ رنگیا
۹۴۔ شیخ ابراہیم
۱۰۲۔ شیخ محبوب
۱۱۵۔ نارائن سنگھ
۱۱۹۔ عبدالرشید
۱۲۱۔ محمد فاضل
۱۲۲۔ سید غوث
۱۲۴۔ محمد پاشاہ
۱۲۵۔ محمد عبدالغفور
۱۳۱۔ میر حسن علی
۱۳۲۔ محمد خواجہ
۱۵۰۔ سید افضل
۱۶۱۔ شیخ بوبکر باشراحیل
۱۶۴۔ احمد اویس
۱۶۹۔ حسن
۱۷۲۔ غلام صمدانی
۱۹۱۔ کنہیا پرشاد
۱۹۲۔ محمد یعقوب
۲۰۳۔ محمد بیابانی
۲۰۸۔ محبوب شریف
۲۱۴۔ دیا شنکر دلویدی
۲۱۶۔ سید القادر
۲۱۹۔ یوسف خاں
۲۲۰۔ عبدالعزیز
۲۲۳۔ جواہر پرشاد
۲۹۷۔ محمد یوسف خاں

(کامیاب)

۱۹۔ راما
۲۰۔ محمد عبدالرحیم
۲۳۔ شیخ چاند
۲۷۔ محمد حفیظ احمد
۳۰۔ محمد عبدالجبار
۳۲۔ محمد شفیع
۳۳۔ شیخ تاج الدین
۳۴۔ سید حسین

۱۸۱۔ شیخ نظام الدین
۱۸۴۔ وہاب خاں
۱۸۸۔ محمد جہانگیر
۱۸۹۔ عبدالعزیز
۱۹۵۔ محمود علی
۱۹۶۔ محمد خاں
۱۹۷۔ غوث الدین
۱۹۹۔ علی بن محمد یمانی
۲۰۰۔ نرسیا
۲۰۱۔ محمد امام الدین
۲۰۴۔ محمد عباد اللہ
۲۰۵۔ سید یوسف
۲۰۷۔ بندہ علی
۲۰۹۔ شیخ جعفر
۲۱۰۔ محمد حسین
۲۱۱۔ شیخ معین الدین
۲۱۳۔ محمد یلیین
۲۱۵۔ محمود علی
۲۱۷۔ فیاض علی
۲۱۸۔ سید چاند
۲۲۰۔ محمد غوث
۲۲۳۔ گوپال جی
۲۹۳۔ محمد عبدالرشید
۲۹۴۔ کریم خاں
۲۹۵۔ محمد اسمٰعیل دوم
۳۱۹۔ محمد غوث الدین
۲۹۸۔ نارائن سنگھ
۴۰۰۔ عبدالمجید خاں

مرکز بمبئی

(کامیاب بہ امتیاز)

۲۴۳۔ فلی کوہانا

(کامیاب)

۲۲۶۔ جعفر خاں
۲۲۸۔ جوزف
۲۲۹۔ جوزف روونات
۲۰۳۔ زینل
۲۳۳۔ شہباز خاں
۲۳۵۔ شیخ محبوب
۲۳۶۔ شیخ محبوب
۲۳۹۔ عبدالمجید
۲۴۹۔ محمد قتال
۲۵۰۔ محمد مولانا
۲۵۵۔ مختار احمد خاں

مرکز دوم کنڑہ (ذکور)

(کامیاب بہ امتیاز)

۲۶۶۔ پیڑمری سیتا رام مورتی
۲۷۰۔ ڈی۔ سدیا
۲۷۸۔ پیڑمری برام مورتی

(کامیاب)

۲۶۰۔ سعید
۲۶۱۔ کشٹیا
۲۶۲۔ سری بھاشیم
۲۶۵۔ ستیا نارائن راؤ
۲۶۷۔ پوودری ناگیا
۲۶۸۔ دیکنڈہ جھوٹیا
۲۶۹۔ ڈیی ویریا
۲۷۱۔ گوتا بالیا
۲۷۲۔ نرسہوان راؤ
۲۷۳۔ ایوار نرسیا
۲۷۴۔ آسانی راملو

۲۷۵۔ گنگنڈیا
۲۷۶۔ بے سبوراما مورتی
۲۸۰۔ ایم بالسیا
۲۸۱۔ ستیہ اچندریا
۲۸۲۔ پوبیرا راسیا
۲۸۳۔ اندر سے نرسیا
۲۸۴۔ وی نارائن
۲۸۵۔ وی وی چتیا
۲۸۶۔ نور محمد فولا
۲۸۷۔ پی ایم بالیا
۲۸۸۔ سال اپنگیا
۲۸۹۔ کواٹرا پاپیا
۲۹۰۔ وشنو تھم بعلی
۲۹۱۔ مولکوری وشنوتاتھم
۲۹۳۔ ایم نارائن

مرکز دوم کنڑہ (اناث)

(کامیاب بہ امتیاز)

۲۹۲۔ بے۔ پی۔ سو سلیمہ بائی

مرکز ناگر کرنول (ذکور)

(کامیاب بہ امتیاز)

۳۰۳۔ محمد احتشام
۳۲۴۔ محمد عبدالکریم
۳۲۹۔ سید وزیر الدین

(کامیاب)

۲۹۴۔ محمد عبدالعزیز
۲۹۷۔ محمد مظفر الدین
۲۹۹۔ خواجہ اسمٰعیل
۳۰۰۔ عبدالخالق
۳۰۱۔ سید غیاث الدین
۳۰۲۔ شیخ داؤد

٣٠٣. محمد قاسم
٣٠٦. کرشنا راؤ
٣٠٩. محمد عظیم الدین
٣١٠. پی. وینکٹ راؤ
٣٢٠. محمد جہانگیر
٣٢١. بی. نرہری ریڈی
٣٢٢. غلام غوث خاں
٣٢٨. غلام دستگیر

مرکز ناگر کرنول (اناث)

(کامیاب بہ امتیاز)

٣٣١. عائشہ بی

(کامیاب)

٣٣٣. زینب بی

مرکز نظام آباد (ذکور)

(کامیاب بہ امتیاز)

٣٣٧. مجتبیٰ حسین
٣٣٨. محمد اعجاز الدین قریشی
٣٤٦. محمد عبدالغفور

(کامیاب)

٣٣٩. [illegible]

٣٤٠. نظام الدین
٣٤٢. محمد عبدالمجید خاں
٣٤٣. عبدالخالق
٣٤٤. کلیم الدین احمد
٣٤٥. منظور احمد
٣٤٧. احمد حسین
٣٥٠. افتخار علی خاں
٣٥١. محمد نصیر الدین
٣٥٢. عبدالقدیر
٣٥٤. شجاعت علی خاں
٣٥٥. شیخ محمد حنیف الدین
٣٥٦. محمد مولانا
٣٥٧. سید وحید الدین
٣٥٨. محمد علی
٣٦٠. گنگا رام
٣٦١. کے. ویر گپتا
٣٦٢. وی. رامیشور راؤ گپتا
٣٦٤. دیوا سنگھ
٣٦٥. بی. نرسیا
٣٦٦. نرسلو

٣٦٧. وینکٹ راملو

مرکز نظام آباد (اناث)

(کامیاب بہ امتیاز)

٣٧٨. شوکت جہاں بیگم
٣٧٩. امۃ المجیب
٣٨٣. جمیل النساء بیگم
٣٨٤. رقیہ اختر جہاں

(کامیاب)

٣٦٨. شانتا بائی
٣٦٩. کلاوتی
٣٧٠. رکھمنی بائی
٣٧٣. دروپتی بائی
٣٧٤. گنگو بائی
٣٧٥. راجمنی بائی
٣٧٦. طاہرہ بیگم
٣٧٧. رضیہ بیگم
٣٨٠. امۃ الحمید
٣٨٢. افسر پاشاہ
٣٨٦. حمید النساء بیگم
٣٨٨. نجم النساء بیگم
٣٨٥. عابدہ بیگم

مرکز بمبئی [illegible] دسمبر ١٩٤٥ء کو صبح [illegible] بمبئی پہنچا [illegible] کے قریب انجمن اسلام کو گیا [illegible] قریشی صاحب سے ملاقات ہوئی قریشی صاحب [illegible] میری آمد سے قبل ہی جناب مولوی عبدالعزیز صاحب [illegible] کے استقبال کے لئے اسٹیشن روانہ کیا تھا لیکن میری بدقسمتی سے اسٹیشن پر ملاقات نہ ہو سکی۔ اقامت خانہ انجمن اسلام میں [illegible] کا انتظام کیا گیا تھا۔ [illegible] دسمبر ١٩٤٥ء کو سویرے ہی سے قریشی صاحب [illegible] کار امتحان کے کمرے [illegible] مصروف تھے [illegible] ٹھیک [illegible] بجے حاضری لے کر پرچے تقسیم کئے گئے [illegible] وقت سے پہلے ہی امیدواروں نے جوابی بیاضات [illegible] قریشی صاحب کی [illegible] امتحان لیا۔ اس کے بعد [illegible] جوابی پرچوں کو لفافہ میں بند کر کے مہر لگا دی گئی۔ امتحان گاہ [illegible] نہیں رہ سکتا اس کا سہرا جناب قریشی صاحب [illegible] میں امتحان کی روح رواں ہیں [illegible] کا متفاضی [illegible] صاحب نے تعلیم بالغان کی غرض [illegible] قابل تحسین [illegible] افزائی ہے۔ آخر میں قریشی صاحب [illegible] کی مہمان نوازی کا دلی شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا [illegible] صاحب کا [illegible] جناب قریشی صاحب کی توجہ [illegible] امتحانات کو بہت ترقی ہوگی۔ میری بدقسمتی تھی کہ جناب [illegible] صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی [illegible] بمبئی سے [illegible]

قاضی [illegible]

ادارۂ ادبیاتِ اردو کی چند دلچسپ ادبی کتابیں

گریہ و تبسم :- صاحبزادہ میکش کی نظموں اور غزلوں کا بہترین مجموعہ ہے۔ جناب میکش حیدرآباد کے نوجوان شعرا میں ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں اور ان کا کلام بہت مقبول ہے۔ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب کا دیباچہ عمومی اور جناب پروفیسر سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ جدید شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ صفحات ۲۰۰ طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر سنہری نام۔ قیمت عالہ

نمود زندگی :- حضرت سید علی منظور حیدرآبادی کے کلام کا مجموعہ ہے جو نہایت سلیقہ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں (۱۰) نظمیں (۶۱) غزلیں اور (۵) رباعیات ہیں۔ سید علی منظور صاحب حیدرآباد کے پختہ مشق مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی شاعری کے قدردان دور دور پھیلے ہوئے ہیں اردو کا کوئی مشہور و مستند رسالہ ایسا نہیں جس میں آئے دن ان کی غزلیں اور نظمیں نہ چھپتی ہوں اور پھر یہ نظمیں ایک رسالے سے دوسرے رسالے میں نقل نہ ہوتی ہیں۔ علی منظور صاحب عہد حاضر کے ان چند کامیاب شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں زندگی کی صحیح ترجمانی کی اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔ صفحات (۱۱۲) قیمت عہ

الواح :- حضرت علی اختر حیدرآبادی کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ علی اختر صاحب ہندوستان کے چوٹی کے شاعروں میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام انسان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کا ترجمان ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پرگو شاعر ہیں بلکہ [illegible] ان کی نظر بہت [illegible] ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شعر ان کے دل سے نکلا ہوا [illegible] زمانے میں سوائے جوش کے کسی شاعر [illegible] کا [illegible]۔

اس مجموعے کی اشاعت سے جدید اردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا ہے۔ صفحات ۱۶۸ قیمت عہ

ارمغان جذب :- پنڈت رگھوبیندر راؤ صاحب جذب (عالم پوری) کی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ اس کے ذریعہ سے سنسکرت اور بھاشا کی شاعری کے اخلاقی اور ناصحانہ پہلو کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ اکثر رباعیاں سنسکرت اور بھاشا کے شعرا کے خیالات کا عکس ہیں اور بعض خود ان کے دل و دماغ کی فکر و کاوش کا نتیجہ ہیں۔

سادگی، سلاست، خیالات سلجھے ہوئے اور طرز بیان اس قدر سادہ اور بے تکلف کہ معمولی سمجھ کا انسان بھی سمجھ سکے۔ ہر رباعی دل کی دھڑکن ہے جو شعر مجسم بن گئی ہے۔ ابتدا میں جناب ماہر القادری صاحب کا ایک بسیط اور معلومات آفریں مقدمہ ہے جس میں انھوں نے سنسکرت اور ہندی شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ صفحات (۱۲۰) قیمت مجلد ۱۲؍

ماہ لقا :- یہ مولوی عزیز احمد صاحب بی اے آنرز (لندن) پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ و معتمد شہزادی درشہوار کی طویل نظموں کا مجموعہ ہے جن میں یورپ کی شاعری کے مفید اثرات جلوہ گر ہیں۔ جدید یا ترقی پسند اردو شاعری کے دلدادہ اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ صفحات (۱۰۰) قیمت عہ

فیض سخن :- میر شمس الدین محمد فیض اردو شاعری کے مسلم الثبوت استاد مانے جاتے تھے۔ وہ ایک صاحب دل بزرگ تھے۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز ہے۔ وہ ایک خاص مکتب شاعری کے بانی بن گئے ہیں جو عاشقانہ شاعری میں تصوف کی رنگ آمیزی کرتا ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے حضرت فیض کے کلام کا بہترین انتخاب شائع کیا ہے۔ اس کے ساتھ ان کا ایک بصیرت افروز مقدمہ بھی ہے جس میں فیض کی حیات اور شاعری پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔

اس کتاب میں غزلیات کے علاوہ فیض کی مثنویوں اور دیگر کلام کا بھی انتخاب شامل ہے۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ میر درد اور شاہ سراج اورنگ آبادی کے بعد تصوف وعرفان اور شعر و سخن کا امتزاج جتنا اچھا حضرت فیض کے کلام میں موجود ہے کسی اور اردو شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ تعداد صفحات (۱۴۴) مع تصویر مرقد حضرت فیض قیمت ۱۲ ؍

بادۂ سخن:۔ ڈاکٹر احمد حسین مائل کے کلام کا دلچسپ اور معیاری انتخاب ہے۔ ان کے کلام میں سادگی اور خداداد بے تکلفی ہے اس انتخاب کے ساتھ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کا معرکتہ الآرا مقدمہ بھی شریک ہے۔ جس میں داغ اور مائل کے معرکوں کا بھی تذکرہ درج ہے۔ صفحات ۱۲۰ قیمت ۱۲ ؍

متاع سخن:۔ نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز داغ دہلوی کے شاگرد اور حیدر آباد کے ایک پختہ مشق شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں ادبی لطافت اور زبان کی پاکیزگی نمایاں ہوتی ہے۔ اس انتخاب کے ساتھ جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا مقدمہ بھی ہے جس میں ان کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ شاعری اور زبان کا مذاق رکھنے والے اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ تعداد صفحات ۱۲۶ مع تصویر شاعر قیمت ۱۲ ؍

مرقع سخن جلد اول:۔ یہ دکن کے پچیس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے جامعہ عثمانیہ کے متعدد اساتذہ طلبہ فارغین اور اہل قلم نے اس تذکرہ کی تالیف میں حصہ لیا ہے۔ یہ تذکرہ پانچ دوروں پر منقسم ہے ہر دور کے شروع میں ایک تمہید ہے جس میں اس کی ادبی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے ہر عہد کے مشاہیر شعرا کے حالات ان کے کلام کا نمونہ اور اس پر تبصرہ ہے۔ ان شاعروں کے تذکرہ کے ساتھ دیگر ہم عصر دکنی اور شمالی ہند کے شعرا کے نام دیدیئے گئے ہیں تاکہ اردو شاعری کا تاریخی تسلسل معلوم ہو سکے۔ شاعروں کی تصویروں کے علاوہ فرمانروایان دکن اور قدردان ادب و شعر کی بھی تصویریں شریک ہیں۔ (۵۰۰) صفحات ۵۵ تصاویر قیمت (للعہ)

مرقع سخن جلد دوم:۔ پچاس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے اس کی ترتیب بھی اسی ڈھنگ پر ہے جیسی پہلے کی ہے۔ ہر شاعر کے سوانح حیات اور نمونۂ کلام کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ ان دونوں کتابوں سے حیدرآباد کی گزشتہ اور موجودہ شاعری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ صفحات ۴۳۱ تصاویر ۵۰ قیمت للعہ

تاریخ گولکنڈہ:۔ حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے۔ ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں، علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ بڑی سائز سوا چھ سو سے زیادہ صفحات قیمت (للعہ)

مقدمۂ تاریخ دکن:۔ یہ کتاب بھی پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کی ہے اس میں انھوں نے سرزمین دکن کے پچیس حکمران خاندانوں کے آغاز، ارتقا، عروج اور زوال کے متعلق تعارفی معلومات کے علاوہ حکمرانوں کا پورا شجرہ نسب اور حکمرانوں کی تاریخیں بھی قلمبند کر دی ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں ایک مبسوط اشاریہ بھی ہے۔ متوسط تقطیع ۴۴۳ صفحات قیمت (للعہ)

سپہ سالار جنگ اعظم:۔ یہ کتاب ادارہ کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے مولف مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے ایم ایڈ ہیں جن کو سوانح نگاری کا خاص ملکہ ہے اور مفید معلومات کو بڑے دلچسپ اور سادہ پیرایہ میں قلمبند کر دیا ہے۔ یہ کتاب مدرسوں کے طلبہ اور عوام کے مطالعہ کے لئے بہت ضروری ہے۔ چھوٹی تقطیع ۸۰ صفحات قیمت مجلد (۶ر)۔

عماد الملک:۔ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی عالم و فاضل ہونے کے علاوہ مدبر اور فرزین تھے۔ وہ آخر عمر تک

سیاسی سازشوں اور ہنگامہ آرائیوں سے بچے رہے۔ انھوں نے حیدرآباد کو علم کی ایسی دولت سے مالامال کردیا جس کی وجہ سے ان کا نام رہتی دنیا تک اس ملک کی تاریخ میں زندہ رہے گا۔ مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے ایم ایڈ نے ان کے سوانح حیات بڑے قرینے سے مرتب کئے ہیں طلبا اور عوام کے لئے اس کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ چھوٹی تقطیع ۴۰ صفحات قیمت ۸؍

میر محمد مومن :- عہد محمد قلی قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ میں پیشوائے سلطنت اور وزیر مطلق تھے۔ دنیوی عروج کے علاوہ ان کی مذہبی سیادت و فضیلت بھی بہت مشہور ہے۔ انھوں نے ہزارہا روپے کے صرفے سے ایک دائرہ بنایا تھا جس میں خاک کربلائے معلیٰ بچھادی تھی۔ اور یہ دائرہ اب تک "دائرہ میر مومن" کے نام سے حیدرآباد میں مشہور و معروف ہے۔ میر محمد مومن صاحب اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر بھی تھے اور حیدرآباد آنے سے قبل شاہ ایران کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ ان کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالات زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اپنے دلچسپ اور مقبول عام اسلوب میں تحریر فرمائے ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات مع تصاویر قیمت عال۔

مدراس میں اردو :- اس کتاب میں مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل نے مدراس میں اردو کے نشو و نما اور اس کے ارتقا کی تاریخ پیش کی ہے۔ کتاب کو نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر دور کے شاعروں اور نثر نگاروں کے سوانح حیات اور نمونہ کلام تفصیل سے درج ہے۔ تاریخ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ صفحات ۴۰۰ قیمت مجلد عہ

تاریخ ادب اردو :- اردو زبان اور ادب کی کوئی بھی تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی اگرچہ اس موضوع پر دو چار کتابیں چھپ چکی ہیں لیکن ان سے نہ عالموں کی ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں اور نہ عوام اور طلبہ کی۔ اردو ادب کی کوئی مکمل تاریخ اس سے قبل لکھی بھی نہ جاسکتی تھی کیونکہ گزشتہ ربع صدی میں اردو کتابوں، شاعروں اور ادیبوں سے متعلق ایسی نئی نئی معلومات حاصل ہوتی جارہی تھیں کہ اس وقت جو بھی کوشش کی جاتی وہ نامکمل رہ جاتی اب اردو کی گزشتہ تاریخ بڑی حد تک بے نقاب ہوچکی ہے اور بہت سی ایسی کڑیاں مل گئی ہیں جن کی وجہ سے ایک مربوط اور مسلسل تاریخ مرتب کرلی جاسکتی ہے۔ اس سہولت کے پیش نظر ادارہ نے یہ تاریخ مرتب کرائی ہے۔ یہ تاریخ صرف طلبہ اور عوام کے لئے لکھی گئی ہے۔ اردو صحافت اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے جملہ اصحاب کے لئے تاریخی معلومات کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگی چھوٹی تقطیع ۱۷۶ صفحات۔ قیمت عہ۔

اردو مثنوی کا ارتقا :- بڑی عالمانہ و محققانہ کتاب ہے جس کے افادہ اور معیار کے اظہار کے لئے صرف اس کے مصنف پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا نام ہی کافی ہے۔ سروری صاحب کی نظر اردو شاعری کی تاریخ پر اتنی وسیع اور باریک بیں ہے کہ اس خصوص میں عہد حاضر کے کسی محقق و ادیب کو ان کی ہمسری نصیب نہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جو اپنے موضوع اور اہمیت کے لحاظ سے سب سے پہلی کامیاب ترین کوشش ہے۔ یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے جن سے اس کی اہمیت اور تلاش و جستجو کا اندازہ ہوسکے گا۔ بڑی سائز (۲۴۳) صفحات قیمت عہ

مغربی تصانیف کے اردو تراجم :- یہ کتاب ادارہ کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف مولوی احمد حسن صاحب ایم اے نے ان تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کو ایک جگہ جمع کردیا ہے جو صدیوں سے اردو زبان کو مالامال کرنے کے لئے دوسری زبانوں کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے سلسلے میں کی جاتی رہی ہیں۔ یہ تذکرہ نہایت ہی محنت اور تحقیق سے لکھا گیا ہے اس لئے مستند بھی ہے اور مفید بھی۔ نقاد ادب اور تاریخی طریقۂ تنقید کے علاوہ ماخذوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں ایسی کتابوں کی خاص

اہمیت ہوتی ہے۔ چھوٹی تقطیع ۴۸ا صفحات قیمت مجلد عہ

آریائی زبانیں:۔ یہ کتاب اردو کی ابتدائی تاریخ اور اس کے ماخذوں کا مستند تذکرہ ہے جس کو ادارہ کے لئے ڈاکٹر سد ہیشور ورما صاحب ایم اے ڈی لٹ پروفیسر سنسکرت و لسانیات نے خاص طور پر مرتب کیا ہے۔ صفحات ۱۰۴ قیمت ؎۔

شعرائے عثمانیہ:۔ سلسلہ مرقع سخن کی چوتھی جلد ہے جس میں چھبیس شعرائے جامعہ عثمانیہ کے کلام کا پاکیزہ انتخاب درج ہے۔ یہ مختلف نظموں اور غزلوں کا گلدستہ رنگ و بو ہے۔ ابتدا میں ہر شاعر کے کلام پر ایک مختصر مگر جامع تنقید کی گئی ہے۔ تقریباً بیس سال سے یہ جواہر پارے بکھرے پڑے تھے جن کو مولوی سید معین الدین صاحب قریشی ایم اے اور مولوی عبدالقیوم خاں صاحب باقی ایم اے (ریسرچ اسکالر) نے نہایت سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ کہیں خیالات کا لطف ہے تو کہیں زبان کا کہیں جذبات کی تازگی اور بلندی ہے تو کہیں اسلوب بیان کی جدت۔ کلام کا انتخاب اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ ہر شاعر کی عظمت اور اس کا معیار پورے طور پر سامنے آتا ہے۔ جدید اردو شاعری کے رجحانات کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے ایک کمیاب اور کار آمد تحفہ ہے۔ رائل سائز (۲۴۱) صفحات با تصویر قیمت مجلد عال۔

محمد حسین آزاد:۔ اردو کے اس بڑے شاعر اور انشا پرداز کے مکمل حالات زندگی اب تک شائع نہیں ہوئے تھے۔ اس کتاب کو محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے لکچرار اردو کلیہ اناث جامعہ عثمانیہ نے نہایت شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ قلمبند کیا ہے یہ کتاب سات ابواب میں تقسیم کی گئی ہے جن میں آزاد کی زندگی، شاعری اور تصانیف سے متعلق مکمل معلومات شامل ہیں۔ مع تصویر آزاد (۲۰۰) صفحات قیمت عال۔

گارساں دتاسی:۔ اردو کے پہلے پروفیسر فرانس کے مشہور مستشرق اور ہندوستانیوں کے سچے بہی خواہ کے علمی و ادبی کارناموں، طریقۂ تعلیم، تلامذہ، کتب خانہ اردو کی حمایت اور تبلیغ کی کوششوں اور اس کے عہد کی یورپ کی درس گاہوں، اردو کے پروفیسروں اور بہی خواہوں کا ایک اجمالی تذکرہ ہے۔ اس کتاب کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے نہایت تحقیق اور جانفشانی سے تالیف کیا ہے۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب صفحات (۱۲۸) قیمت عہ۔

نذر ولی:۔ اس میں دکن کی چار کہنہ مشق خواتین انشا پرداز محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ، محترمہ لطیف النسا بیگم صاحبہ، محترمہ نسیم النسا بیگم صاحبہ اور محترمہ نجم النسا بیگم صاحبہ کے دلچسپ مضامین ہیں جو بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کے حالات زندگی اور خصوصیات کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں ولی کی معلومات، ان کے تخیل، ان کے فن شعر اور ذوق عرفان کے علاوہ ان کے اسلوب زبان اور انتخاب الفاظ کے متعلق بھی نہایت مفید اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ ولی کے متعلق یہ پہلی مستقل اور جامع کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ تشنگان ادب کی تسلی کا باعث ہوگا۔ صفحات ۲۴۸ طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر دو رنگہ سنہری نام قیمت مجلد عال۔

محبت کی چھاؤں:۔ مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے کل افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ہر فسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کار فرما ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العین معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔

چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد عہ

ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن سے طلب فرمائیے۔

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
من کی بیتا	٨٠	٠	٨	٠
سرگزشت غالب	٦۴	٠	٨	٠
نظام الملک	۴٠	٠	۴	٠
تاریخ گولکنڈہ	۳۳٠	۳	٨	٠
ریڈیو نمبر (٨ تصاویر) ...	١٩٠	١	٠	٠
ارمغان جذب	١٢٠	١	١٢	٠
یورپ جنگ سے پہلے ...	۴١٨	٢	٨	٠
تاریخ سیاسیات	٢٧٢	۳	٨	٠
سرسالار جنگ	۴٨	٠	٦	٠
مغربی تصانیف اردو کے تراجم	١۴۵	١	۴	٠
محبت کی چھاؤں	١۳٢	١	۴	٠
اقبال نمبر	١٦٨	١	۴	٠
سائنس کے کرشمے	١١٢	١	٠	٠
شعرائے عثمانیہ	٢۳٠	٢	١٢	٠
مکتوبات شاد عظیم آبادی ...	۳٠٠	٢	٨	٠
دادا بھائی	١٦	٠	٢	٠
اردو نامہ	٢٠٠	٢	٠	٠
سرگزشت حاتم	١٢٨	٢	٠	٠
عماد الملک	۴٠	٠	٦	٠
اردو دانی کی پہلی کتاب ...	۵٦	٠	۵	٠
" " دوسری کتاب...	۵٦	٠	۵	٠
محمد حسین آزاد	٢٠٠	٢	٠	٠
کاغذ کی ناؤ	١٢٠	١	۴	٠
فن تقریر	٩٢	٠	٨	٠
مقدمہ تاریخ دکن	١۴۴	١	٠	٠
ہندستانی تمدن	۳۴٠	۳	٨	٠
پودوں کی کہانی	٨٠	٠	٠	٠
مہ لقا	[illegible]	١	٠	٠
پانی کی کہانی	۴٨	٠	٦	٠
رسایل طبیہ	۳١٢	٢	٨	٠
سلک گوہر	۴٠	٠	۴	٠
تاریخ ادب اردو	٧٦		٨	٠
رفیق اردو داں	٢٢۴	١	١٢	٠
اشوک	۵٦		٨	٠
حیدرآباد	٨٨	٠	١٠	٠
شاد اقبال	١٧٦	٢	٨	٠
آریائی زبانیں	١٠۳	١	٠	٠
نظام علی خاں	۳٢	٠	۴	٠
تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول	۳٩٦	۵	٠	٠
عرب اور عربستان	۵٦	٠	١٠	٠

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
سچ کا جادو	۴٨	٠	۴	٠
طبیعیاتی کائنات	٦٨	٠	٨	٠
متاع سخن	١٢۴	٠	١٢	٠
کیف سخن	١٢٢	٠	١٢	٠
بادہ سخن	١٢٧	٠	١٢	٠
سراج سخن	١۵٢	٠	١٢	٠
ایمان سخن	١٢٠	٠	١٢	٠
فیض سخن	١۴۴	٠	١٢	٠
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵٠٠	۵	٠	٠
" " دوم (۵٠) "	۴۳٢	۵	٠	٠
نقد سخن	١٧۵	١	٠	٠
نذر ولی	٢۴٨	٢	٨	٠
گریہ و تبسم	١٩٢	٢	٠	٠
مشاہیر قندھار دکن ...	١٨۴	١	٠	٠
من کی دنیا	١۴۵	١	٠	٠
مدراس میں اردو ...	١٩٦	١	٨	٠
محرم نامہ	١١٢	٢	٠	٠
نذر دکن	١۵۴	١	۴	٠
روح غالب	٢۴٠	۳	٨	٠
عاصم	٢٠٠	١	۴	٠
دفتری معلومات	۵٦	٠	٦	٠
آبدوز کشتیاں اور سرنگ ...	۴٨	٠	٦	٠
اردو مثنوی کا ارتقاء ...	١۴۳	١	١٢	٠
نمود زندگی	٢١٦	١	٨	٠
سرگذشت ادارہ	۳٠۴	٠	١٢	٠
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳١٢	٢	٨	٠
بلقان	۳٢	٠	۳	٠
خطابیات	١١۳	٠	١٢	٠
علم خانہ داری	١۵٠	١	٠	٠
چیونٹی (١٦) تصاویر ...	٨٠	٠	١٢	٠
انوار	١٩٨	١	٨	٠
کشمش نانی (۴) تصاویر ...	٨٠	٠	١٠	٠
گارساں دتاسی	١٢٨	١	٠	٠
رات کا بھولا	١٩٨	١	٠	٠
سکندر جاہ	٢۴	٠	۴	٠
تلاش	۵٦	٠	١٠	٠
ادارہ سفر ١٩۴٢ء میں ...	٢٠٠	٠	٨	٠
ناصر الدولہ	۳٢	٠	۴	٠
افضل الدولہ	۳٢	٠	۴	٠
نواب میر محبوب علی خاں	۳۴	٠	۴	٠

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان پتہ آصفیہ ۱۵۳
نشان پتہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

جلد ۹ — بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۴۶ء — شمارہ ۲

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے صحیفہ مشین پریس میں طبع ہو کر خیریت آباد سے شائع ہوا

بات سندھ نی جاتی ہے۔

حضرت امیر خسرو کی مثال یہاں کافی ہوگی، جو سلطان علاء الدین خلجی کے درباری امیر تھے۔ یہ نہ صرف ماہر فن موسیقی داں تھے بلکہ اچھے شاعر، سپاہی اور سیاس بھی۔ اسی وجہ سے متواتر دو سلاطین کے عہد حکومت میں عہدۂ وزارت پر فائز رہے۔ آپ کا تبحر علمی اور شاعری سے جیسا کچھ لگاؤ تھا، ہر کس و ناکس پر عیاں ہے۔ حضرت سلطان شیخ نظام الدین اولیاء سے آپ کو بیعت کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ مرشد قبلہ کے بہت مقبول نظر تھے عوام میں بھی ہر دلعزیز۔ آپ ایران کی طرف سے آئے تھے اور ایرانی موسیقی سے خوب واقف تھے۔ ہندی گانا سنتے ہی آپ کو بہت پسند آیا اور اسے تفصیل سے سیکھنے کی خواہش آپ میں پیدا ہوئی۔ اور بہت جلد آپ نے ہندی موسیقی پر عبور حاصل کر لیا۔ اور وہ کمال پیدا کیا کہ آپ اپنے وقت کے نایک مانے جانے لگے۔ چنانچہ سلطنت وجیانگر کے گوپال نایک نے بھی آپ کی نایکی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔

نایک اس شخص کو کہتے ہیں جس نے علم سنگیت پڑھا ہو اور دوسروں کو بھی اچھی طرح سمجھا کر پڑھا سکے۔ کل راگ راگنیوں سے واقف ہو اور انھیں وہ خود ہی گاتا بھی ہو اور دوسرے کو بھی اچھی طرح گانا سکھا سکے۔ استادان سلف کی بہت سی چیزیں ان کی تصنیف سے یاد ہوں اور ان پر طرح رکھ سکتا ہو۔ نہایت تجربہ کار ہو۔ اس کے شاگرد بھی نامی گرامی ہوں اور فن میں اجتہاد کر سکتا ہو۔ حضرت امیر خسرو نے اسی معیار کے مطابق اجتہاد سے کام لیا۔ ایرانی اور ہندی موسیقی کی موزوں ترکیب سے کئی نئے راگ اختراع کیں۔

اس موقع پر یہ جاننا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت امیر خسرو ایرانی موسیقی سے واقف تھے تو انھیں ہندی موسیقی سیکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ہندوستان کی نئی موسیقی کو سن کر اس کی قدر کیوں کرنے لگے؟ ان سوالات کا حل دریافت کرنے سے پہلے ایرانی موسیقی پر ایک سرسری نظر ڈال لینا ضروری ہے، ورنہ بات صاف طور پر سمجھ میں نہ آسکے گی۔

ایرانی موسیقی کی بنیاد علم نجوم پر رکھی گئی ہے۔ بارہ برج کے لحاظ سے (۱۲) مقام قرار دیے گئے ہیں۔ یہی ایرانی راگ ہیں۔ راگنی کو فارسی میں شعبہ کہتے ہیں۔ دن رات کے ۲۴ گھنٹوں کے اعتبار سے بارہ مقام کے (۲۴) شعبے وضع کیے گئے اور ہر شعبے میں چند نغمے ہوتے ہیں۔ ہر مقام یعنی راگ کے (۴) پتر ہوتے ہیں، جن کو گوش یا گوشہ کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے (۱۲) راگوں کے (۴۸) گوش ہوئے۔ ہندی موسیقی میں بھی (۴۸) پتر ہوتے ہیں۔ ان دونوں تقسیموں میں فرق ہے تو صرف اسی قدر کہ ایرانی موسیقی میں (۱۲) راگوں کے (۴۸) پتر ہوتے ہیں اور ہندی میں (۶) راگوں کے۔ اس لیے کہ ہندی موسیقی ہر راگ میں (۸) پتر بتلاتی ہے۔ اس کے علاوہ (۶) آوازے ہوتے ہیں جو (۶) اصلی ہندی راگ کے مماثل سمجھے جاتے ہیں۔ ایرانی موسیقی میں (۱۷) تالیں ہوتی ہیں لیکن ہندی موسیقی کے مانند (۱۵) تالیں ہی زیادہ معروف و مستعمل ہیں۔ انھیں بحر یا ضرب کہتے ہیں۔ اس خلاصے اور تقابل سے ہندی اور ایرانی فن موسیقی کی مماثلت اور قربت واضح ہے۔ ان بارہ مقامات کے نام بھی درج ذیل ہیں۔

(۱) راست (۲) اصفہانک (۳) عراق (۴) کوچک (۵) بزرگ (۶) حجاز (۷) بوسلیک (۸) عشاق (۹) حسینی (۱۰) زنگولہ (۱۱) نوا (۱۲) رہاوی۔ باقی تقسیم کو بخوف طوالت حذف کیا جاتا ہے۔

بعض ایرانی راگ راگنیوں میں بڑی حد تک ہندی راگ راگنیوں کی سی مشابہت اور کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ

(۱) مقام راست کو نٹ نارائن۔ مقام عراق کو بھیروں

کو چند کوبلیان، بندگ کو ایمن شدھ۔ زنگولہ کو گونڈ سے قریبی نسبت ہے۔

(ب) اسی طرح شعبوں میں مخالعت کو رام کلی منگلوبا کو بھیماس، عشیران کو بسنت سری اور دوتہاسری، چارگاہ کو اساوری، نوروز کو بنے جے ونتی اور للت سے قریبی تعلق ہے۔

(ج) ایسے ہی گوشوں میں۔ نبات کو کانہڑا، کرشمہ کو بہاگراہ، یک رنگ کو بار۔ نرت کو سور بٹھ۔ رایت کو کیدارا۔ نوروز عجم کو ٹوڈی راگنی سے قریبی تعلق ہے۔ اور لطف یہ کہ عراق ... مخالعت کو ملا کر گایا جائے تو مالکوس کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

بس یہی مماثلت تھی جس کی وجہ سے ہندی گانا سنتے ہی حضرت امیر خسرو نے اسے پسند کیا اور تفصیلی تحصیل فن کی طرف توجہ فرمائی۔ اس فن میں اختراع پردازی اور جودت طبع دکھلانے کے وسیع امکانات انھیں نظر آئے۔ مماثلت و مشابہت کی وجہ سے بھی سیکھنے میں بہت سہولت معلوم ہوئی۔ طرفہ یہ کہ طبیعت بھی بڑی رسا پائی تھی۔ فوراً تکمیل فن کرکے دونوں فنون کو ایک دوسرے میں سمونے لگے۔ اس میں انھیں بڑی کامیابی ہوئی جو ان سے پیشتر کسی نایک کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے ان کی نایکی کا ڈنکا چار وانگ عالم میں بجنے لگا۔ کئی جدید راگ راگنیاں ایجاد کرکے ہندی موسیقی کی حدود کو وسیع کیا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندی موسیقی ہندوستان کی چار دیواری کے اندر ہی مقید و محصور نہ رہے بلکہ ایران اور دیگر ممالک میں بھی پھیل جائے۔ جدید امتزاج کے سبب سے اس میں جو لطف پیدا ہو گیا ہے، وہ قریبی مماثلت کی وجہ سے ایرانیوں کے لئے سہل الفہم اور سہل الحصول بن جائے۔ اور ایک حد تک ایسا ہوا بھی۔ مگر افسوس کہ ہندوستان کے جمود اور قدامت پسندی کو یہ کہاں گوارا ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے علوم کو ملک کے باہر قدم رکھنے دیتی۔

ہندوستان کے باشندوں نے ذرا آنکھ کھول کر نہیں دیکھا کہ دونوں ملک کے فنون میں اس قدر مشابہت اور قریبی تعلق کیوں پایا جاتا ہے؟ ذرا تاریخ کی ورق گردانی کرتے تو فوراً معلوم ہو جاتا کہ ایران میں بھی آریا ہی تو آباد ہیں۔ یہ وہی راگ راگنیاں تھیں جو وسط ایشیا سے گھوم کر ایران سے ہوتے ہوئے پھر ہندوستان میں داخل ہوئی تھیں۔ البتہ گمشدہ چیز ذرا رنگ بدل کر ہاتھ آئی ہے۔ شکل وہی، روپ وہی، صرف رنگ ذرا سفید ہو گیا تو کہہ دیا کہ یہ وہ چیز نہیں دوسری ہے! یہ نہ دیکھا کہ آواز وہی، سر وہی، لے وہی، تان وہی ہے۔ اس نکتہ کو حضرت امیر خسرو نے ہندوستان میں قدم رکھتے ہی پہچان لیا اور دونوں کو بڑی سہولت کے ساتھ کامیاب طریقہ پر ہم آہنگ کر دکھایا۔ خیال، ترانہ اور قوالی کی طرزیں ایجاد کیں۔ سرگم کے مانند، کشتی رانوں، کہاروں، ڈولی برداروں کے لئے ترویٹ، اور ہنڈی رانوں جیسے ان پڑھوں کے لئے تالہ کی طرزیں بنائیں۔ بین میں اصلاح کرکے ستار ایجاد کیا۔ ان کی ایجاد کی ہوئی چند راگنیوں کی تحلیل درج ذیل ہے، جو ایرانی راگنیوں کی رہین منت ہیں۔

(۱) پوربی، گورا، گنکلی اور ایک ایرانی راگ کو ملا کر سازگری بنائی
(۲) ہنڈول کے ساتھ گوشہ نیریز کو اکٹھا کرکے یمن ترتیب دیا
(۳) سارنگ اور بسنت کو مقام نوا کے ساتھ مخلوط کرکے عشاق بنایا
(۴) ٹوڈی، مالوی، نغمہ دوگاہ اور حسینی کو ملا کر موافق "
(۵) پوربی میں تھوڑی سی ترمیم کرکے اس کا نام غنم رکھا
(۶) گورا اور ایک ایرانی راگ کی آمیزش سے مجیر ایجاد کی
(۷) شہناز ... کو کھٹ راگ سے ملا کر زیلف بنایا
(۸) گنکلی اور گورا کو ایک دوسرے میں سمو کر فرغانہ یا فرغنہ مرتب کیا
(۹) سارنگ، بیلاول اور مقام راست کی آمیزش سے سرپردہ اختراع کیا
(۱۰) دیسی کار اور ایک ایرانی راگ کو جوڑ کر باخرز یا باخرزی بنائی
(۱۱) کانہڑا، پوربی، گوری اور ایک ایرانی راگ کی آمیزش سے فرودست ہے
(۱۲) خیال کے ساتھ ایک ایرانی راگ کی آمیزش کرکے اس کا نام صنم رکھا

راگ درپن کے مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ سازگری باقرار عشاق اور موافق بہ حضرت امیر خسرو نے بڑا کمال دکھایا ہے۔ قوالی، ترانہ، نقش نگار، بسیط، تلانہ، سہلا وغیرہ بھی حضرت امیر خسرو ہی کی طبع رسا کی ایجادات ہیں۔

مذکورۂ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ حضرت امیر خسرو نے اپنے تطبیقی مطالعہ کی مدد سے ہندی موسیقی میں بڑی وسعت اور ترقی کے ساتھ جدت بھی پیدا کر دی۔ ہر طبقے میں موسیقی کا مذاق پیدا کیا اور اسے ہر دلعزیز بنانے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

اس موقع پر یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس گوناگوں امتزاج کی بدولت غیر شعوری طور پر ہندی موسیقی میں عربی موسیقی کا عنصر بھی داخل ہو گیا۔ چنانچہ عراق، حجاز، عشاق، حسینی، عشیران، نگار وغیرہ (۲۷) راگ راگنیاں عربی الاصل ہیں، جو ایرانی موسیقی میں پہلے ہی سے شامل تھیں۔ اور اختلاط کی وجہ سے ان کے اجزا بھی ہندی موسیقی کا جزو بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی موسیقی کے بعض ٹکڑوں کو سننے سے ہندی مطرب کو اس لئے دلچسپی ہوتی ہے کہ پہلے ہی سے اس کے کان ان ٹکڑوں سے آشنا ہوتے ہیں۔

اب ہم ہندی موسیقی کی اثر پذیری کی داستان کو ختم کرتے ہوئے اس کی اس اثر آفریں قوت پر نظر ڈالتے ہیں جو عربی اور فارسی عناصر کی آمیزش سے اس میں پیدا ہوئی تھی، اس اثر آفرینی کے ثبوت میں ہم نواب نظام الدولہ مروان علی خاں رئیس مراد آباد (جو اس فن کے ماہر اور مصنف بھی رہیں) کا قول نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں، جو یوں رقمطراز ہیں کہ:-

"بعض ایرانی اور افغانستانی گانے بجانے والے جو یہاں آگئے تھے انھوں نے ہندوستانی راگ راگنیوں سے استنباط کر کے بعض بعض اپنے ملکی و فارسی مقام کو مرکب کر کے نئے طور پر خوش آئند بنا لیا ہے۔ اب اہل فرنگ کے باجوں میں بھی اکثر حرکات مثل نغمہ ہندی کے اور بعض ٹون (Tone) ہندی راگنیوں سے اخذ کر کے بنائی گئی ہیں۔ غرض اس طرح ایجاد اور رواج ہوتا چلا آیا ہے۔"

بیان بالا سے ظاہر ہے کہ تطبیقی مطالعہ سے اپنے اور دوسرے علوم کو بے حد فائدہ پہنچتا ہے۔ علوم کی ترقی کے لئے ایسا مطالعہ بے حد ضروری چیز ہے۔ امیر خسرو کو دوسرے نائکوں پر اس لئے بھی فوقیت حاصل ہے کہ یہ دونوں فنون سے واقف تھے جس کی بدولت ان کی ذات سے ہندی موسیقی میں نہ صرف مستقل وسعت اور ترقی ہوئی بلکہ دوسرے ممالک کی موسیقی پر اثر انداز ہونے کی قابلیت و صلاحیت بھی اس میں پیدا ہو گئی۔ لیکن افسوس کہ بعد میں اس طرف کسی نے توجہ نہ کی اور نہ ان کی خدمات کو اس نظر سے دیکھا۔

اب رہا اہل فرنگ کی موسیقی کا ہندی رنگ پکڑنا بھی ان کے علما و محققین کے تطبیقی مطالعہ ہی کا نتیجہ ہے۔ یہاں بھی دوبارہ یہی کہنا پڑتا ہے کہ اہل فرنگ بھی تو آریائی نسل سے ہونے کی وجہ سے ہماری برادری میں داخل ہیں۔ اسی وجہ سے ہر دو اقوام کی قدیم ثقافتی روایات و فنون کی باقیات آپس میں لڑ جاتی ہیں۔ اور وہیں سے تطبیقی مطالعہ اور تحقیقات کی بنا پڑتی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ انھیں ہمارے علوم سے استفادہ کرنے میں ذرا بھی عار نہیں ہوتا تو ہمیں کیوں ہونا چاہیے؟ علم و فن کا معاملہ کلیتاً نوع انسان سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے اس خصوص میں تعصب و تنگ نظری فضول ہے۔

ایسے ہی موسیقی میں پوربی راگ چین اور چین ہندی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ چینی اور منگولیوں کی آمد سے ہندی موسیقی ضرور متاثر ہوئی ہے۔ ممکن ہے یہ اثر بہت زیادہ نہ ہوا ہو تاہم ہوا ضرور ہے۔

اسی طرح سکندر اعظم کی آمد اور مستقل یونانی حکومت کا اثر بھی ہندوستانی موسیقی پر ضرور پڑا۔ سلیوکس یونانی کے زمانے [illegible]

چندرگپت کے ساتھ بیاہی گئی تھی۔ یہ یالہ بیوی کی راگ راگنیوں میں بھی سنجوگ ہوکر پتر و بھار جائیں (بیٹے بہو) پیدا ہوئے اور بیٹے ہوں گے۔ کیونکہ میگاس تھنیز اس کے دربار میں عرصہ دراز تک سفیر رہا، جس کی وجہ سے پاٹلی پتر میں اکثر یونانیوں کی آمدورفت اور بود و باش بھی رہا کرتی تھی۔ تاریخی شہادتیں موجود ہیں کہ ہندوستانی فنونِ لطیفہ میں یونانی اثرات علانیہ طور پر نمایاں ہیں۔ ایسی صورت میں یہ ناممکن ہے کہ موسیقی اس اثر سے محفوظ رہی ہو، البتہ یہ امر کہ کس حد تک متاثر ہوئی تھی، اس کا پتہ چلانا ماہرانِ فن کے ذمہ ہے۔ فیثاغورث یونانی موسیقی کا موجد ہے۔ اس نے مثل تان سین کے یونانیوں کے لئے ایک موسیقی کا نظام مرتب کیا تھا۔ ہندی موسیقی میں ۲۲ سرتیاں شمار ہوتی تھیں لیکن یونانیوں کے ہاں ۲۴ اور مکس اوڈی لک (Mixo-lydic) اور ڈورک (Doric) سرگم ہندوستانی سرگم سے بہت مشابہ تھے۔

امجد علی

فتراک[۱] دیکھ کر

افکارِ نو میں تاباں، اندازِ محرمانہ　　　اسلوب "ج نقوی" ہے سازِ جاودانہ

بے ساختہ تاثر، بیتاب سی نگاہیں　　　جیسے سکوتِ گل سے پیدا ہوں سرد آہیں

تصنیف تازہ یعنی "فتراک" سامنے ہے　　　گویا کسی کا قلبِ صد چاک سامنے ہے

حسنِ نظر سفینہ فطرت کا کھے رہا ہے　　　دل، وارداتِ دل کی تصویر لے رہا ہے

بیتابیٔ مسلسل مصروفِ جستجو ہے　　　فکر و نظر کی دنیا سرگرمِ آرزو ہے

سوزِ حیات، دل کا مطلوب بن گیا ہے　　　فطرت کا ذوقِ شعری اسلوب بن گیا ہے

اعجاز کاریاں ہیں، یا دل کی داستاں ہے　　　محسوس ہو رہا ہے جذبات کی زباں ہے

کیا نذر دوں میں آخر، اے جذبۂ تلافی
تاریخ طبع کہہ دے، "فتراکِ شعر بافی"
۱۳۶۴ھ

بشیر النساء بیگم بشیر

[۱] محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ نقوی کے مضامین کا مجموعہ۔

تعارف

(کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس کی کامیاب نظم)

میں اک ترقی پسند شاعر ہوں اور مرا امتیاز یہ ہے
کہ مجھ کو اوروں کی طرح آتا نہیں حقایق سے منہ چھپانا

مرا تخیل فلک سے اونچا، مری نظر عرش سے بھی آگے
مگر مرے واسطے ہے مشکل زمین والوں کو بھول جانا

لیا ہے فطرت سے درس میں نے، جو دل میں ہوگا لب پہ ہوگا
مجھے کسی نے نہیں سکھایا خوشی میں بھی غم کے گیت گانا

وطن کا چہرہ اداس دیکھا ہے میں نے اور مائل فغاں ہوں
مری زباں پر نہ آ سکے گا مسرتوں کا کوئی ترانا

میں واقعاتِ چمن کا نباض ہوں گوارا نہیں ہے مجھ کو
خیال میں آشیاں بنانا، خیال کی بجلیاں گرانا

یہ خدمتِ فن، یہ شوقِ تحسیں، نہیں ہے منزل نہیں ہے میری
تھکے ہوئے ساتھیوں سے کہہ دو، مجھے تو ہے اور دور جانا

مرے بزرگوں کی مصلحت نے حیات کو لوریاں سنائیں
مگر مرے نغمہ ہائے مستی سے جاگ اٹھنے کو ہے زمانا

جن آرزوؤں کو یادِ ماضی تھپک تھپک کر سلا چکی تھی
اب ان کو بیدار کر رہا ہے نئے حوادث کا تازیانا

مری محبت کی پرورش زندگی کی آغوش میں ہوئی ہے
میں جانتا ہوں کہ زشتنی ہے مری محبت کا ہر نشانا

ہنسی میں بے وجہ میرے آنسو، میں یہ حقیقت سمجھ چکا ہوں
کہ جذبۂ سرخوشی کی توہین ہے غلاموں کا مسکرانا

جو دیکھتا ہوں وہ کہہ رہا ہوں مجھے غرورِ بیاں نہیں ہے
مرا سخن شرحِ زندگی ہے، سنی ہوئی داستاں نہیں ہے

شاہد صدیقی

اردو میں سائنسی ادب

رسالہ مساحت مستعمل و علم مثلث

تقطیع ۹ × ۵½ صفحات (۶۰) سنہ طباعت ۱۸۴۵ء

مترجمہ پنڈت اجودھیا پرشاد۔ اس رسالے میں علم مساحت، علم مثلث، علم تراش مخروط و نقشہ جیب مستوی کی مبادیات کو یکجا کر دیا گیا ہے جس کتاب کا یہ ترجمہ ہے اس کا نام کہیں بھی درج نہیں۔ سرورق پر انگریزی اور اردو میں کتاب کا عنوان اور مترجم کا نام لکھا ہوا ہے۔ یہ کتاب مولوی محمد باقر صاحب کے دہلی اردو اخبار پریس میں پنڈت موتی لال پرنٹر اور پبلشر کے اہتمام سے مطبع ہوئی۔ "فہرست مطالب کتاب" کی سرخی کے تحت دیباچہ اور حدود کے علاوہ سات ابواب قائم کئے گئے ہیں۔ کتاب کے ختم پر "تتمہ" کی سرخی کے تحت دو صفحات میں خط نصف النہار کے مقام کو دریافت کرنے اور کسی زمین کا نقشہ بالحاظ عرض میں کمی یا زیادتی کر کے کاغذ پر بنانے کی ترکیب بتائی گئی ہے اور ایک صفحہ پر ایک ہی زمین کے چھوٹے بڑے دو نقشے دیئے گئے ہیں۔ کتاب کے آخری (۱۵) صفحات میں جیب مستوی کی جدول شامل ہے۔

مترجم نے دیباچہ میں کتاب کی غرض و غایت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

"مطلب اس کتاب سے یہ ہے کہ وہ اشخاص جنھوں نے کہ علم ریاضی تحصیل نہیں کیا ہے اس کے چند فوائد سے مطلع ہو جاویں ...... صرف چند قواعد علم ریاضی اور نقشہ ملحقہ کے بنانے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے باوجودیکہ نقشہ جیب مستوی وغیرہ کا جو اس کتاب کے آخر میں لگایا گیا ہے، ناتمام ہے پھر بھی یہ نقشہ بطریق استعمال میں لانے نقشہ جیب مستوی وغیرہ بنانے کے لئے کافی ہے۔" رسالہ کے شروع میں "حدود" کی سرخی کے تحت کسور اعشاریہ اور ان علامات کو سمجھایا گیا ہے جو جبر و مقابلہ میں استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً

— منہائی کی علامت ہے۔

+ ایزادی " "

. اعشاریہ " " وغیرہ وغیرہ

علم مساحت کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی ہے:-

"علم مساحت کار آمدنی ایک ترکیب مرتسم کرنے اشکال علم ریاضی جیسے رول یا پرکار یا کسی اور آلہ سے جو کہ اس مطلب کے واسطے اور تشخیص کرنے ابعاد ثلاثہ کے لئے کام آتی ہیں" باب اول میں اشکال کی سطح سے بحث کی گئی ہے اور سطح مستوی زاویہ، دائرہ، مثلث اور مستطیل وغیرہ کو بیان

دہلی کالج کی خدمات (بسلسلہ گزشتہ)

کر کے ان کو اشکال کے ذریعہ سے سمجھایا گیا ہے۔ بعض عمل کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ مثلاً

"چاہتے ہیں کہ خط مفروضہ اب کو تنصیف کریں"

"نقطہ الف اور ب کو مرکز گردان کر کسی فاصلہ پر جو کہ نصف اب سے بڑا ہو دو قوسیں کھینچو اس طریق سے کہ وہ نقاط ن اور م پر تقاطع کریں۔ درمیان ان نقطوں کے خط ن م واصل کرو۔ نقطہ س جہاں کہ وہ خط، خط اب کو کاٹتا ہے۔ بیچ میں خط اب کے ہوگا"

دوسرے باب میں مثلثوں کے خواص بیان کرنے کے بعد چند مسائل سمجھائے گئے ہیں۔ مسئلہ دوم کی عبارت یہاں درج کی جاتی ہے:-

"چاہتے ہیں کہ ایک اونچے مینار کی بلندی زمین پر سے پیمائش کریں مثلاً مینار د س کی ترکیب اس کی پیمائش کی یہ ہے کہ خط ب س کو پیمائش کرو اور جبکہ ایک قطر دائرہ کا عین مقابل س کے بر نقطہ ب سے دوسری قطر کے کی سیدھ پر اس طریق سے کہ زاویہ ب پیمائش ہو سکے لاؤ۔ چونکہ د س زمین پر عمود ہے تو زاویہ س قائمہ ہوگا۔ اس صورت میں بعد پیمائش زاویہ ب کے ایک خط اور دو زاویے ب اور س متصل اس کے معلوم ہوئے ......"

تیسرے باب میں مستطیل، مثلث، مخروط، کثیر الاضلاع اور دائرے کی سطح معلوم کرنے کے قاعدے بیان کئے گئے ہیں۔ سطح دریافت کرنے کے سلسلے میں ایک آلہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

"سپرٹ لیول ایک شیشہ کی نلی ہے وہ قریب قریب ست شراب سے بھری ہوئی ہے ...... اس نلی میں صرف ایک چھوٹا سا ہوا کا بلبلہ رہتا ہے ... اور ... تمام بند کرتے ہیں۔ چونکہ ہوا ... رکھی جاتی ہے تو وہ ہمیشہ ... بلند مقام پر ...

اسی سبب سے جبکہ نلی کے بیچ کا رخ ہموار مقام پر ہے تو پانی کا سطح اس کے ہموار ہوگا اور اس وقت ہوا کا بلبلہ وسط نلی میں ہوگا۔"

چوتھے باب میں مجسم اشکال مثلاً متوازی۔ منشور۔ مخروط اور کرہ وغیرہ کی تعریفیں اور ان کی جسامت معلوم کرنے کے طریقے مثالوں کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔

باب پنجم میں علم مثلث سے بحث کی گئی ہے۔ چھٹے باب میں خطوط منحنی اور ساتویں باب میں تراش مخروط کو وضاحت اور تفصیل سے سمجھایا گیا ہے۔

کتاب کے ختم پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے :۔

"جن شخصوں کو کہ فرصت تحصیل کرنے علم ریاضی کی نہیں ہے اور نہ ان کی طبع اس کی تحصیل کی طرف راغب ان کے واسطے اس رسالہ میں خیالات مشہور درباب علم مساحت کا مادی کے اور علم پیمایش اور علم ہمواری کے لکھے ہیں۔ ...... جو اشخاص کہ خاص تحصیل علم مساحت و پیمایش کی کیا چاہتے ہیں ان کو لازم ہے کہ ہٹلی فر صاحب کی اور ریونی گیمبل صاحب کی کتاب کو درباب ان علوم کے تحصیل کریں۔"

اس رسالہ میں ایسے کئی الفاظ ملتے ہیں جو اب ہماری زبان میں متروک ہو چکے ہیں۔ مثلاً

نابود (نابود) نقصان کرنا (تفریق کرنا) کیا چاہو (کرنا چاہو) وغیرہ

بعض الفاظ کا املا اس طرح لکھا گیا ہے :۔

سفر (صفر) پونچھ (پہونچ) جانتے (جاننے)
کنوا (کنواں) کثر (کسر) وغیرہ

"لامحدود" اور "بے انتہا" کو "بے محدود" اور "لا انتہا"، "دونوں" اور "تینوں" کو "بغیر ن" کے اور "بیان کی ہے" کی بجائے "بیان کیں ہیں" لکھا ہے۔ "ضرور" بمعنی ضروری اور "شبہ" بمعنی مشابہ استعمال ہوا ہے۔

ریاضی کی بعض انگریزی اصطلاحوں کو اردو میں جوں کا توں لکھا گیا ہے۔ مثلاً

سپرٹ لیول۔ پیریلل۔ اور بلی تیٹ۔ ہائپربولا۔

یہ کتاب بھی کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں موجود ہے جس کا نمبر (۵۱۰ ؍ ا ام) ہے۔

رسالہ درباب پیمایش انگریزی بوسیلہ تھیوڈولائٹ کے

تقطیع ۸½ × ۶½ ؟ صفحات حصہ اول (۸۰) حصہ دوم (۴۷) سنہ طباعت ۱۸۴۸ء۔ مولفہ ہردیو سنگھ لائبریرین دہلی کالج۔ مطبوعہ مطبع العلوم مدرسہ دہلی قیمت ایک روپیہ۔

اس رسالہ میں زمین کی پیمایش کرنے کے اصول اور طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ سرورق پر رسالہ، مولف اور مطبع وغیرہ کے نام اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں درج ہیں۔ ہردیو سنگھ نے سید قادر علی سینیر اسکالر فرسٹ عربک کلاس کی مدد سے اردو میں تالیف کیا اور سید اشرف علی کے اہتمام سے مطبع العلوم دہلی میں چھپا۔ زیر نظر نسخہ اس رسالہ کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ اس سے قبل ایک ایڈیشن شائع ہو چکا تھا لیکن یہ پتہ نہ چل سکا کہ کتنے عرصہ پہلے شائع ہوا تھا۔ رسالہ کے آغاز میں فہرست اور دیباچہ نہیں ہے۔ صفحہ (۱) سے اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔

ابتدا میں ان آلوں کا ذکر ہے جن سے زمین کی پیمایش میں مدد ملتی ہے۔ مثلاً تھیوڈولائٹ۔ جریب۔ کروس اسٹاف۔ اوف سٹ شاف اور کمپاس یا قطب نما۔

تھیوڈولائٹ علم ریاضی کا ایک آلہ ہے جو دریا، جھیل، جنگل، راستے، گاؤں اور شہر کی پیمایش میں کام آتا ہے۔ اس آلے کے متعلق تفصیلی معلومات درج ہیں۔ اس کے بعد پیمایش اور نقشہ بنانے کا طریقہ سمجھایا گیا ہے۔ نقشہ بنانے والے کو حسب ذیل امور کا بطور خاص خیال رکھنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

(۱) جس مقام کی پیمایش کرنی مقصود ہو اول اس کا نام لکھ لیا جائے۔

(۲) گردو نواح کی جاگیر یا جاگیرداروں کے نام خسرہ میں لکھنا۔

(۳) بڑی بڑی سڑکیں جو اس زمین میں سے گزرتی ہیں

اور ان شہروں کے نام جہاں سے وہ آتی ہیں۔

(۴) پرانے رکستوں کے نام۔

(۵) ایک ایسے آدمی کو اپنے ساتھ رکھنا جو وہاں کی سرحدوں سے واقف ہو۔

(۶) اکثر اوقات ایک جاگیردار کی زمین کا کچھ حصہ دوسرے کی جاگیر میں مل جاتا ہے اس کو بھی خسرہ میں درج کرنا ضروری ہے اور نقشہ بناتے وقت اس کا ایک الگ نقشہ بنانا۔

(۷) جریب کا ... اندراجات کرنا۔

دو صفحات میں ... کا ... دیا گیا ہے۔ پھر خسرہ کی مدد سے نقشہ تیار کرنے کی ترکیب بتائی گئی ہے جس زمین کا نقشہ بنایا جاتا ہے اس کی ... اور دوسرے قطعات کو نقشے میں واضح کرنے کے لئے ... خاص علامتیں اور نشانات معین کر دیئے گئے ہیں۔ آبادی۔ نالا۔ سرحد۔ کنوئیں۔ سڑک۔ دریا۔ مسجد۔ شوالہ۔ باغ اور پل وغیرہ کو مختلف علامتوں سے دکھلایا گیا ہے۔ دریا کا پاٹ معلوم کرنے کا طریقہ مع مثال سمجھایا گیا ہے۔ راستوں۔ دریاؤں اور نہروں کی پیمائش اور مختلف شکلوں کے کھیتوں کی پیمائش دریافت کرنے کے طریقے مثالوں کے ساتھ سمجھائے گئے ہیں۔ منحرف اور کثیر الاضلاع اشکال کا رقبہ دریافت کرنے کے لئے حسب ذیل طریقہ بتلایا گیا ہے:

"ہر شکل تین ضلع سے زیادہ کی منقسم ہو سکتی ہے مثلثوں میں چاہیے مثلثوں میں تقسیم کر کے بموجب اس قاعدہ کے جو مساحت مثلث میں بیان کیا گیا ہے مثلثوں کی پیمائش کریں اور سب مثلثوں کے مساحت کو جمع کرنے سے اس شکل کی مساحت حاصل ہو جائے گی اگر کوئی شکل مساوی الاضلاع ہو دے مثلث نہ ہووے یا مربع یا مخمس یا مسدس بارہ ضلع تک تو اس کے ایک ضلع کے مربع کو ان اعداد میں جو اس فہرست اس کے مقابل لکھی ہوئی ہیں ضرب کرو۔ حاصل ضرب رقبہ اس شکل کا ہوگا۔"

تعداد اضلاع اشکال کی	نام شکلوں کے	تعداد اعداد مضروب فیہ کی
۳	مثلث	۴۳۳۰۱۳ و ۱
۴	مربع	۰۰۰۰۰ و ۱
۵	پانچ ضلع کی شکل	۷۲۰۴۷۷ و ۱
۶	چھ " "	۵۹۸۰۷۶ و ۲

اسی طرح بارہ ضلع کی شکل تک جدول دی گئی ہے۔

دائرے کا رقبہ معلوم کرنے کے مختلف طریقے بتائے گئے ہیں مثلاً دائرہ کا فقط قطر معلوم ہو تو قطر کے مربع کو ۷۸۵۴ء میں ضرب کرنے سے رقبہ حاصل ہوگا۔ مستطیل۔ معین اور منحرف کے رقبہ کے مساوی مربع بنانے اور منحرف و مخمس کے رقبہ کے برابر مثلث تیار کرنے کے قاعدے بیان کر کے متفرق سوالات حل کر کے سمجھائے گئے ہیں۔

"عمل علم مثلث کا" کی سرخی کے تحت حسب ذیل اصطلاحات کی فہرست درج ہے۔

جس	واسطے جیب مستوی کے
جم	واسطے جیب التمام کے
مس	واسطے مماس کے
مم	واسطے مماس التمام کے
نق	واسطے نصف قطر کے
لوگ	واسطے لوگارتم کے

حصہ اول کے ختم پر ۶ صفحات میں مختلف آلات کے نقشے لیتھو میں چھاپے گئے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں: پیرلل رولر۔ پروٹریکٹر۔ سکیل یعنی مقیاس تھیوڈولائٹ وغیرہ۔

حصۂ دوم میں حصہ اول کے صفحہ (۴۶) پر جو نقشہ دیا گیا ہے اس کے بنانے کا طریقہ سمجھایا گیا ہے اور کئی ضمنی نقشے وضاحت کے لئے دیئے گئے ہیں۔ چھوٹے نقشوں سے بڑے نقشے تیار کرنے کا

ترکیب بتدئی گئی ہے۔ پھر پہاڑ اور مینار کی بلندی دریافت کرنے کا حال لکھا ہے۔ اور وضاحت کے لیے مثالیں اور نقشے دیئے گئے ہیں۔ آخر میں عمارت کی زمین کی پیمائش اور اس کا نقشہ بنانے میں جن باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ بیان کی گئی ہیں۔

اس کتاب کی زبان قدیم اردو کا نمونہ ہے جو اس زمانے میں دہلی میں بولی یا لکھی جاتی تھی اس کا اسلوب بیان ویسا ہی ہے جیسا کہ حکمیاتی مضامین کا ہوتا ہے۔ جملوں کی ساخت اور ترکیب کے چند نمونے یہ ہیں :۔

" وقت کھولنے جریب کے "

" [illegible] بناتے ہیں "

" کہاں کو جائے گا ۔۔۔ جہاں کو جاتی ہے "

بعض ہندی الفاظ کی فارسی ترکیب پر صفت بنائی گئی ہے جیسے کمیت [illegible] وغیرہ۔

[illegible] کو [illegible] اور [illegible] کو جستی [illegible] لکھا ہے۔

عکس کی تحت الاسفل ہوتی چاہیئے لیکن اس کی جمع الاکوں بنائی گئی ہے۔

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں اس کا ایک نسخہ نمبر (۵۱۱۶۹) پر موجود ہے۔

اصول قواعد مایعات

تقطیع [illegible] صفحات (۲۴۵) سنہ طباعت ۱۸۵۰ء لکھنؤ میں چھپی ہے۔

یہ ماسٹر وسٹن ایم اے کی کتاب [illegible] کا ترجمہ ہے جسے پنڈت اجودھیا پرشاد مدرس [illegible] [illegible] دہلی نے کیا اور محمد حسین پرنٹر و پبلشر کے اہتمام سے ۱۸۵۰ء میں [illegible] اردو اخبار پریس سے شائع ہوا۔ کتاب کے اندرونی اور بیرونی سرورق پر انگریزی و اردو میں کتاب، مصنف، مترجم اور مطبع وغیرہ کے نام اور سنہ طباعت درج ہیں۔ اجودھیا پرشاد کے نام کے نیچے " مدرسہ دہلی " لکھا ہے لیکن اس کی کہیں بھی وضاحت نہیں کہ آیا یہ کتاب دہلی کالج کی مطبوعات کے سلسلہ کی ہے یا انفرادی طور پہ شائع کرائی گئی تھی۔ البتہ کتاب کی سائز چھاپہ اور طرز تحریر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہوگی۔

مترجم نے دیباچہ کے بغیر اصل کتاب شروع کر دی ہے۔ یہ کتاب (۷) ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کے تحت ذیلی سرخیاں قائم کر کے متعلقہ مسائل سمجھائے گئے ہیں۔ پہلے باب میں " خواص اجسام سیال " کو (۱۹) ذیلی سرخیوں میں بیان کیا گیا ہے۔ پہلی سرخی میں موضوع سے متعلق لکھا ہے کہ:۔

" اس رسالہ میں آئین حرکت مایعات اور گیز بیان ہوں گے یعنی جن شرائط کے موافق مایعات اور جمیع اقسام ہوا [illegible] ہوتی ہیں ان کو اس میں درج کریں گے اور طرق استعمال ان شرائط کا دریافت پانے اور تیرنے اجسام اور مختلف آلات اور کلوں میں کہ موقوف مایعات کی حرکت اور معدلت پر ہیں مذکور ہوگا "

اس باب میں جن مسائل سے بحث کی گئی ہے ان میں سے چند یہ ہیں :۔

" سیال کی تعریف۔ مایع اور مجسم کا فرق۔ مایع اور گیس کا فرق۔ حرارت کا اثر مجسم۔ مایع اور گیس پر۔ اجزائے اجسام سیال۔ مقدار کشش۔ لچک " وغیرہ وغیرہ۔

مایع اور گیس کی تعریف مترجم کے الفاظ میں یہ ہے :۔

" اجسام سیال مایع اور گیز پر منقسم ہیں۔ فرق عظیم دونوں میں یہ ہے کہ مایع میں کشش اتصال تھوڑی سی پائی جاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اجزا، گیز میں بجائے کشش اتصال کے زور مدافعت پایا جاتا ہے اور اس باعث سے گیز جسامت میں زیادہ ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس صورت میں تعریف مایع کی یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں خود بخود میل پھیلنے کا نہیں مگر گیز میں یہ بات پائی جاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

جسم سیال میں داب اور لچک کی قابلیت کے بارے میں کنیٹن صاحب اور پرکن صاحب کے تجربوں کو بیان کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں " معدلت سیال " کی سرخی کے تحت

ان کے خواص حرکت کی تشریح کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں اجسام سیال پر کشش ثقل کے اثر کو بتلایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل امور کی وضاحت کی گئی ہے۔

(۱) ٹھیرے ہوئے پانی کی سطح کے ہر نقطہ پر داب مساوی ہوگا۔

(۲) ٹھیرے ہوئے سیال کی سطح ہمیشہ ہموار ہوگی۔

(۳) شہروں میں آبرسانی کے لئے چشمہ ایسے مقام پر بنانا جو سب سے بلند ہو۔ ان تمام بیانات کو مثالوں اور ہندسی شکل سے واضح کیا گیا ہے۔

باب چہارم تا ششم داب معدلت سیال اور مرکز داب اور پانی میں تیرنے والے اجسام کی معدلت کا بیان ہے۔ باب ہفتم میں مایعات کے مخصوص اوزان بتائے گئے ہیں اور "ہاڈرومیٹر" کے آلے سے وزن دریافت کرنے کا طریقہ اور اس آلے کے بنانے کی ترکیب سمجھائی گئی ہے۔ سایک صاحب اور نیکلسن صاحب کے ہاڈرومیٹر کی ساخت اور ان کے اعمال کی تشریح کی گئی ہے۔

باب ہشتم میں لچک دار اجسام سیال کے قواعد کے تحت "ہوا کے زور لچک" پر تفصیلی معلومات درج کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں ایرپمپ۔ سافن تیج سمٹن صاحب کا ایرپمپ۔ کرٹ برٹ سن صاحب کا ایرپمپ کنڈینسر۔ اور ہوا کی بندوق وغیرہ کی ساخت اور ان کے اعمال کی تشریح مثالوں اور نقشوں سے کی گئی ہے۔

باب نہم میں "ہوائے محیط زمین" پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور بتلایا ہے کہ تمام سطح اشیائے مادہ سے پر ہے۔ اس ضمن میں توریسیلا اور پاسکل صاحب کے تجربات پیش کئے گئے ہیں۔ بیرومیٹر بنانے کی ترکیب اور اس کے اعمال کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ پیمہ دار بیرومیٹر کے سلسلے میں لکھا ہے کہ "حال موسم کا دریافت کرنے کے لئے اکثر کام آتا ہے۔ موافق تبدیلی موسم کے پارہ کی بلندی میں کمی بیشی واقع ہوتی رہتی ہے"۔ دسویں باب میں کلوں کے ذریعہ سے پانی کو اوپر چڑھانے کے طریقے بیان کئے گئے ہیں یعنی مص کا پمپ۔ اوٹھانے کا پمپ۔ فورسنگ پمپ اور پلنجر پول پمپ" کے اشکال دے کر پانی کو بلندی پر چڑھانے اور گہری کانوں سے پانی کو خارج کرنے کے طریقے سمجھائے گئے ہیں۔ اسی سلسلے میں آگ بجھانے کی کل اور زنجیر دار پمپ کو بھی سمجھایا گیا ہے۔ باب یازدہم کو غلطی سے دوازدہم لکھا ہے اور غلط نامہ میں بھی تصحیح نہیں کی گئی ہے۔ اس باب میں حرکت سیال اور مقدار حرکت مایع دریافت کرنے کے متعلق لکھا گیا ہے۔ بارھویں باب میں براہما صاحب کی کل کا بیان ہے جو کسی چیز کو دابنے کے کام آتی ہے۔ اس کل کی ساخت کی ترکیب بھی تبلادی گئی ہے۔ ہر فن میں یہ آلہ کام آتا ہے۔ مثلاً جہاز کے موٹے رسوں کی مضبوطی اور دھات کی طاقت دریافت کرنے۔ میخ اور درخت اکھاڑنے اور ان عمارتوں کو اٹھانے کے لئے جو زمین دوز ہوگئی ہیں۔

تیرھویں باب میں حرارت کے اثر اور گرمی کی مقدار معلوم کرنے کے طریقے سمجھائے گئے ہیں۔ اسی سلسلے میں پارے کے تھرمومیٹر کی ساخت اور اس کے متعلق بحث کی گئی ہے۔ چودھویں باب میں دخان اور اس کے استعمال کے طریقوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ پندرھویں باب میں بخارات کا بیان ہے۔ اس ضمن میں برف جمانے کی ترکیب بتائی گئی ہے۔ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ کس قدر پانی خاص درجہ حرارت میں بخار بن جاتا ہے۔ سولھویں باب میں ہوا کے بیان کے لئے وقف ہے۔ اس ضمن میں طوفان۔ ہوائے تجارتی اور موسموں کی تبدیلی کا حال درج ہے۔ آخری باب میں نلیوں کی کشش پر بحث کی گئی ہے۔ کشش اتصال اجزائے مایع اور کشش انفصال مابین اجزائے مایع اور نلی وغیرہ کو سمجھایا گیا ہے۔ لاپلاس اور دوسرے سائنس دانوں کے تجربوں کے اختلافات کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

کتاب کے ختم پر "نقشہ وزن مخصوص۔ نقشہ زور لچک دخان اور نقشہ زور لچک بخارات" دیے گئے ہیں۔

عبارت کے نمونے کے لئے بارہویں باب کے آغاز ی جملے یہاں درج کئے جاتے ہیں :-

" مایعات مثل مجسمات کے مطیع قوانین کشش کے ہیں اور حرکت مایعات کی بروقت گرمی کے زمین پر بعینہ موافق حرکت مجسمات کے متزاید ہوتی ہے اور صدمہ اس کا مساوی ہوتا ہے۔ حاصل ضرب وزن اور اس کی رفتار کے .... "

مترجم نے سائنس کی اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ جوں کا توں ان کو اردو میں منتقل کر لیا۔ پوری کتاب میں صرف دو ترجمے ملتے ہیں اور وہ یہ ہیں :-

هیڈرواسٹاٹکس ۔ مایعات

سپرٹ ۔ الکوہال

بقیہ اصطلاحیں مثلاً فیدم ۔ کاربونک ایسڈ۔ سون سون ۔ ہائڈرالک ریم اوکسیجن گیز۔ نائٹروجن گیز وغیرہ انگریزی تلفظ کے مطابق اردو میں لکھ دی گئی ہیں ۔

" غوطہ خور " بمعنی غوطہ زن اور تکرار بمعنی اختلاف استعمال ہوا ہے ۔

طویل جملے ۔ فارسی ترکیبیں اور عربی الفاظ کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں۔ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں نمبر (۵۳۲ / ۱) پر یہ کتاب مل سکتی ہے ۔

جبر و مقابلہ

تقطیع ۱/۴ ۱۱ × ۷ ، صفحات (۴۹۰) سنہ طباعت ۱۸۵۲ء مولفہ

مولوی کریم بخش مدرس سوم فارسی مدرسہ دہلی ۔

یہ کتاب بھی دہلی کالج کی مطبوعات کی ایک کڑی ہے جو مطبع العلوم سے شایع ہوئی ۔ ابتدا میں " فہرست مطالب " کی سرخی کے تحت جبر و مقابلہ کے جن مسائل سے بحث کی گئی ہے ان کی ایک طویل فہرست دو صفحات میں دی گئی ہے ۔ مولف نے اس کتاب کی اشاعت کے بارے میں حمد و نعت کے بعد یہ لکھا ہے کہ

" اس سے پہلے ایک جبر و مقابلہ مولفہ استادی مخدومی مکرمی جناب ماسٹر رامچندر صاحب کا چھپا تھا چونکہ اس میں مطالب بہت مفید اور دلچسپ تھے اس سبب سے لوگوں کو اس کے پڑھنے سے اس فن کی طرف بہت رغبت ہوئی اور جس قدر نسخے جبر و مقابلہ کے چھپے تھے سب بک گئے اکثر آدمی اس کے مشتاق تھے اس واسطے جناب ماسٹر صاحب نے مجھ کمترین کو کہ نام میرا کریم بخش ہے اور میں ادنیٰ ترین ان کے شاگردوں میں سے ہوں ارشاد فرمایا کہ ایک جبر و مقابلہ مرتب کرنا چاہیئے ...... اس واسطے اس کمترین نے یہ جبر و مقابلہ مرتب کیا اور جو مطالب مفیدہ تھے جناب ماسٹر صاحب کی صلاح سے اس میں داخل کئے .... اور اس جبر و مقابلہ میں مطالب ان کتابوں سے جمع کئے ہیں ۔ وڈ صاحب کا جبر و مقابلہ بلینڈ صاحب کا جبر و مقابلہ بریج الجبرا یولر الجبرا اور اور کتابیں اس فن کی جو انگریزی زبان میں مشہور ہیں "

کتاب کو (۵) ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر باب میں کئی فصلیں ہیں ۔

" باب اول بیان حدود کا " اس میں چار فصلیں ہیں جن میں جمع ۔ تفریق ۔ ضرب ۔ تقسیم کے قاعدے مثالوں کے ساتھ سمجھائے گئے ہیں ۔ دوسرے باب میں کسور کا بیان ہے جو آٹھ فصلوں پر مشتمل ہے ۔ تحویل کسور کی جمع ۔ تفریق ۔ ضرب ۔ تقسیم ۔ جذر اور کعب نکالنے کے قاعدے مثالوں کے ساتھ درج کئے گئے ہیں ۔ تیسرا باب مساوات کے لئے وقف ہے ۔ اس میں (۷) فصلیں اور کئی ذیلی سرخیاں ہیں ۔ چوتھے باب میں مختلف ریاضی کے مسائل کو سمجھایا گیا ہے ۔ مثلاً نیوٹن کا نظریہ ۔ لوگارتم وغیرہ ۔ پانچویں باب میں سوالات غیر منقطع کا بیان ہے ۔ صفحات (۴۶۱ تا ۴۹۰) میں سوالات کی ایک طویل فہرست درج ہے جو وڈ صاحب کے جبر و مقابلہ سے نقل کی گئی ہے ۔

یہ کتاب غالباً نصابی ضروریات کے تحت لکھی گئی تھی تاکہ طلبہ اردو میں جبر و مقابلہ کی تحصیل کریں ۔ اس میں یورپی ریاضی دانوں کے مختلف نظریوں کو بھی بیان کیا گیا ہے اور ہندسی اشکال دیگر جبر و مقابلہ سے حل کرنے کے طریقے سمجھائے

گئے ہیں جو اصطلاحیں اس کتاب میں استعمال کی گئی ہیں وہ آج بھی استعمال ہوتی ہیں۔ جملوں کی ترکیب اور ساخت کا اندازہ مندرجۂ ذیل جملوں سے ہو سکتا ہے:۔

"قاعدہ جمع کرنے کسور کا"

"چاہتے ہیں ہم ثابت کرنا اس امر کا"

"بیعہ شراب کا واسطے ۴۸ روپے کے"

صفحہ (۱۵۹) سے اول درجہ کی مساوات کا ایک سوال ہم یہاں نقل کرتے ہیں:۔

"ایک شخص قاصد کہ ۶۰ میل ایک روز میں چلتا ہے ایک جانب روانہ کیا گیا تھا لیکن بعد پانچ روز کے ایک اور قاصد واسطے اس کے بلانے کے بھیجا گیا اور قاصد دوم ۷۵ کوس روز چلتا ہے تو بتاؤ کتنے روز میں قاصد اول کو پکڑے گا"

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں نمبر ۱۲ ج پر یہ کتاب موجود ہے۔

ہندسہ بالجبر تقطیع [illegible] صفحات (۲۴۴) یہ کتاب واڈ صاحب کی (Algebraical Geometry) کا اردو ترجمہ ہے جس کو ماسٹر رام چندر اور رادھا کشن سکالر اعلیٰ دہلی کالج نے کیا تھا۔ کتاب میں کہیں بھی سنہ طباعت درج نہیں ہے۔ البتہ سرورق پر حسب ذیل قلمی عبارت درج ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رسالہ 18??ء سے قبل طبع ہوا تھا:۔

"ہندسہ بالجبر تمام صفحہ ۲۴۴ مع ... کے اور ایک ورق اول میں فہرست کا اور ۲ صفحہ آخر میں غلط نامہ کے تاریخ [illegible] اکتوبر …ء

د شیر خاں"

سرورق پر انگریزی اور اردو میں کتاب، مصنف، مترجمین اور مطبع وغیرہ کے نام درج ہیں۔ یہ کتاب مولوی محمد حسین آزاد کے اہتمام سے مطبع دہلی اردو اخبار سے شائع ہوئی ہے۔ سرورق پر جو انگریزی اردو عبارت ہے اس کے دو ترجمے قابل غور ہیں مثلاً

"علوم انگریزی" (European Sciences)

"دہلی مدرسہ" (Delhie College)

کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصے میں (۱۴) اور دوسرے حصے میں (۹) ابواب ہیں۔ باب اول میں "آغاز" کی سرخی کے تحت جو عبارت درج ہے اس کا اقتباس یہ ہے:۔

"اس رسالہ کی تالیف سے یہ غرض ہے کہ حل کریں ہم اشکال اور مسئلوں ہندسی کو جبر و مقابلہ کے ذریعہ سے واضح ہو کہ جس وقت میں جبر و مقابلہ نے ملک یورپ میں رواج پایا اس کے تھوڑی مدت بعد اکثر سوالات ہندسی بذریعہ جبر و مقابلہ کے حل کئے گئے اس طرح سے کہ بجائے خطوط کے حروف فرض کر کے عمل جبر و مقابلہ کے جاری کئے گئے لیکن اس طریقہ کے حل کرنے سے کچھ فائدہ عظیم و توسیع نہیں آیا کس واسطے کہ موافق اس طریق کے ہر سوال میں نئی نئی ترکیبیں واسطے حل کرنے ہر سوال کے نکالنے پڑتے ہیں اور اسی واسطے کوئی قاعدہ کلیہ اس طریق سے نہ نکلا۔ موجد اس طریقہ عام کا جس کے ذریعہ سے جبر و مقابلہ کی مدد سے سب قسم کے سوالات ہندسی حل ہو سکتے ہیں۔ مہندس ڈسکارٹیز تھا۔ اس نے دو مقداریں مجہول لا اور ع فرض کیں اور بعد نکالنے ایک ایسی مساوات کے جس میں یہ دو مقداریں مجہول پائی جاتی تھیں ان سے یہ بات ثابت کر دی کہ یہ مساوات متعلق ہے ایک سلسلہ نقاط سے جن کے یہ خطوط وتر ہیں یعنی یہ مساوات تعلق رکھتے ہیں ایک خط منحنی سے جو مرکب ہے ان سب نقاط سے اور اس خط منحنی کو لوکس مساوات مذکورہ کی کہتے ہیں"

اس کتاب میں ہندسی مسائل کو جبر و مقابلہ سے حل کرنے کے طریقے سمجھائے گئے ہیں۔ جگہ جگہ ہندسی اشکال کھینچ کر جبر و مقابلہ کی مدد سے ان کو حل کیا گیا ہے۔ حصہ اول میں جن مسائل سے بحث کی گئی ہے ان میں سے چند یہ ہیں:۔

نقطہ اور خط مستقیم۔ دائرہ۔ تحویل مساوات درجہ دوم

مساوات جیفنوی۔ بعید الجیفوی۔ تراش ہائے مخروطی۔ خطوط منحنی وغیرہ۔

حصہ دوم کے بعض مسائل یہ ہیں:۔

کرہ اور وہ مجسمات جو گردش منحنی سے پیدا ہوتے ہیں۔ سطوح منحنی استوانہ مخروط وغیرہ۔ اس کتاب میں ریاضی کے ایسے مسائل سمجھائے گئے ہیں جو اعلیٰ جماعتوں کے نصاب میں داخل ہوتے ہیں۔ ہر بحث کو نہایت تفصیل اور تشریح کے ساتھ سمجھایا گیا ہے۔ ان یوروپی ریاضی دانوں کے نام اور حوالے بھی دیے گئے جنھوں نے علم ریاضی میں کوئی نیا نظریہ یا آلہ ایجاد کیا۔ "تراش ہائے مخروطی" کے بیان سے ایک عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے:۔

"...... اور بیان ان کا اکثر ریاضی دانوں نے افلاطون کے وقت سے کیا ہے اور یہ خطوط منحنی افلاطون کے مدرسہ میں دریافت کئے گئے تھے اور جب کہ اس کے شاگردوں کو اکثر خواص ان خطوط منحنی کے معلوم ہوئے تو انھوں نے بخوبی ان کا امتحان کرکے اکثر کتابیں ان کے باب میں چھپوائیں ان کتابوں میں سے وہ کتاب جو کہ اپولونیس باشندہ پرگا نے تصنیف کی ہے۔ موجود ہے اس کے آٹھ باب ہیں چار آسان اور چار مشکل ...."

ریاضی کی جو اردو اصطلاحیں استعمال ہوئی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:۔

اوتار التمام اعظم۔ قریب البیضوی۔ بعید البیضوی۔ نقطہ آتشی قطبی مساوات۔ خط متنفر الملاقات وغیرہ۔

بعض انگریزی اصطلاحوں کے ساتھ ساتھ ان کے ترجمے بھی درج ہیں مثلاً

"جینیٹرکس۔ خط متحرک
ڈائی رکٹرکس۔ خط منحنی"

اس کتاب کی زبان اور انداز بیان ویسا ہی ہے جیسا عام طور پر حکمیاتی مضامین کی کتابوں کا ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے لیکن عبارت میں ترجمہ پن نہیں پایا جاتا۔ عربی الفاظ اور فارسی ترکیبیں عبارت میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ جملوں کی ساخت کے چند نمونے یہ ہیں:۔

"قبل از تمام کرنے اس باب کے"

"مشکل اور پراکس فرع اس علم کی ہے"

کتاب کے آخر میں (۱۰) صفحات کا غلط نامہ شریک ہے۔

(کتاب خانہ جامعہ عثمانیہ نمبر کتاب ۵۱۹)

رسالہ علم طب میں

یہ رسالہ سید اشرف علی کے اہتمام سے ۱۸۴۳ء میں مطبع العلوم مدرسہ دہلی میں چھپا۔ سرورق پر اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں رسالہ کا نام اور قیمت وغیرہ درج ہے۔ اردو عبارت یہ ہے:۔

"رسالہ علم طب میں
انگریزی سے اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا حصہ اول
(۱۷۴) صفحہ"

اصل کتاب کے مصنف اور مترجم کا نام کہیں بھی درج نہیں اس لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ کونسی انگریزی کتاب سے کس نے ترجمہ کیا شاید رام کشن ہو۔ ابتدا میں "کلیات" کی سرخی کے تحت یہ بیان کیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر شئے تغیر پذیر ہے اور موت سے پہلے ہر ذی حیات کو مختلف آفات اور بیماریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ امور خارجیہ مثلاً غذا اور حرارت کی افراط تفریط سے انسان کے مزاج میں خلل واقع ہوتا ہے اور جب کوئی چیز حد اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو وہی مرض کا باعث بنتی ہے۔ بعض انسان پیدائشی کمزور ہوتے ہیں اور یہ کمزوری ان اعضا کی حرکات اور ان کے افعال جسمانی میں ایسا خلل ڈال دیتی ہے کہ وہ مرض کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ علم الامراض (Pathology) اور علم افعال (Physiology) میں مرض کی وجہ دریافت کی جاتی ہے۔

امراض کی دو اقسام بتائی گئی ہیں ایک افعالی جس کو عضوی بھی کہتے ہیں اور دوسری ترکیبی۔ اس کے بعد اسباب امراض پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ علم الامراض کے تحت الامراض نا

کی تعریف۔ علامات مرض۔ اسباب مرض اور معالجہ مرض کو بیان کیا گیا ہے۔ اس بات کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ مرض کا لاحق ہونا بیشتر طبیعت پر موقوف ہے۔

"علم علامت الامراض" کی سرخی کے تحت مرض معلوم کرنے کے طریقوں کو وضاحت سے سمجھایا گیا ہے اور تشخیص مرض کو سب سے اہم قرار دیا ہے چونکہ تشخیص مرض میں چہرہ۔ نبض۔ قلب۔ سینہ اور پیٹ سے بڑی مدد ملتی ہے اس لئے ان سب کے متعلق ضروری معلومات درج کر دی گئی ہیں۔

"معالجات عامہ" کی سرخی کے تحت یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اکثر امراض قدرت ایزدی سے خود بخود رفع ہو جاتے ہیں کیونکہ جسم کے اندر مدافعت مرض کی ایک قوت موجود ہے جو "قوۃ طبیعہ" کہلاتی ہے۔ لیکن ہر مرض میں قدرت ایزدی پر اعتماد کر کے علاج سے غافل رہنا بعض دفعہ مضر اثرات پیدا کرتا ہے اس لئے علاج کی طرف توجہ کرنی ضروری ہے۔ علاج کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مرض کو دفع کر دیا جائے یا کم از کم اس کے زور کو گھٹا دیا جائے۔

اس کے بعد "جریان خون اور اخراج خون" پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ "کلیات استسقاء" کی تمام ضروری باتوں کو بیان کر کے "معالجہ استسقاء" کو سمجھایا گیا ہے۔ اس کے بعد جلن۔ اقسام جلن اور اس کی تشخیص کے متعلق ضروری امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں خواب آور دواؤں کا ذکر درج ہے۔

علم طب مغربی پر غالباً اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں علم الامراض اور علم افعال سے بحث کی گئی ہے چونکہ یہ کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے اس لیے عبارت میں روانی اور بے ساختہ پن نہیں ہے۔ اس کی زبان ویسی ہی ہے جو عام طور پر علمیاتی مضامین کی ہوتی ہے۔ آج جب کہ اردو زبان کافی ترقی کر چکی ہے اس میں طب مغربی کی کتابوں کی کمی ہے چنانچہ عثمانیہ میڈیکل کالج میں انگریزی کتابوں ہی کی مدد سے تعلیم دی جاتی ہے اس لئے تقریباً سو برس پہلے طب مغربی کو اردو میں منتقل کرنے کی یہ کوشش ایک مبارک اقدام کہلائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں اکثر انگریزی اصطلاحات کے ترجمے کئے گئے تھے جن میں سے چند یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

- غیر مزمن (A-cute)
- مزمن (Chronic)
- امراض ریحیہ (Rheumatism)
- علم المداوی (Therapeia)
- عضو (Organ)
- امراض العام (Epidemic)
- مرض متعدی (Contagious)
- تشخیص مرض (Deiagnosies)

جن انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ نہ ہو سکا ان کو اردو میں تلفظ کے تغیر کے ساتھ منتقل کر لیا گیا تھا مثلاً

- اسٹمک پمپ (Stomach Pump)
- ہیسٹریا (Hysteria)

جملوں کی ساخت اور ترکیب میں قدامت پائی جاتی ہے مثال کے طور پر چند پیش کئے جاتے ہیں:۔

"ظہور علامات کا"۔ "ہمیشہ رہنا ان کا"۔ "بباعث نہ پایا جانے بعضے امور" وغیرہ۔

عبارت کا نمونہ:۔

"استصاص جو ایک صورت جذب مذکور کی ہے تمام غشاؤں جسم سے کہ وہ کیسے ہی مختلف درجوں میں ہوئے تعلق رکھتا ہے یعنی بعض غشا ربہ نسبت بعض کے زیادہ طاقت جوسنے کی رکھتے ہیں۔ تیزی استصاص کی اور بھی سمت اس کی بلحاظ لچک دار پوشش ایک رگ کے جو رطوبت سے گھری ہوئی ہو اور جس میں رطوبت ایک درجہ خاص غلظت پر موجود ہو بموجب مختلف مراتب تمدید رگ مذکور کے مختلف ہوگی۔۔۔۔"

اس رسالہ کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

(۱۲۹)

طب ڈاکٹری

رسالہ اعمال جراحی

تقطیع ۱۰/۴، صفحات (۱۱۹) سنہ طباعت ۱۸۴۴ء

یہ رسالہ بھی رسالہ طب کی سائز پر سید اشرف علی کے اہتمام سے مطبع [illegible] ڈاکٹر جیمس ہنری بٹلر [illegible] اسسٹنٹ سرجن [illegible] کمپنی نے کوپر کی انگریزی کتاب [illegible] اردو میں ترجمہ کیا [illegible] انگریزی اور اردو دونوں میں [illegible] درج ہیں اردو عبارت یہ ہے۔

"رسالہ بیچ بیان اعمال جراحی کے"

"یہ اعمال فن جراحی کے سیموئیل کوپر صاحب کی کتاب سے ڈاکٹر جیمس ہنری بٹلر صاحب نے زبان اردو میں ترجمہ کئے"

یہ رسالہ فن جراحی پر اردو میں دوسرا رسالہ ہے کیونکہ اس سے پہلے ۱۸۴۳ء میں ڈاکٹر جیمس مونٹ کے انگریزی رسالہ کا ترجمہ "[illegible] الجراحین" کے نام سے [illegible] شائع ہوا ہے۔ اس رسالے میں ایک صفحہ پر انگریزی [illegible] دوسرے صفحہ پر اس کا ترجمہ ہے۔ اس طرح علم جراحت پر اردو زبان میں یہ قدیم رسالہ ہے جو اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ رسالے کے آغاز میں فہرست نہیں ہے اور مترجم نے دیباچہ کے بغیر اصل کتاب شروع کر دی ہے۔ ابتدا میں اعمال فن جراحی سے متعلق ان (۱۰۱) قاعدوں کا ذکر ہے جن کا آپریشن سے پہلے خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس کے بعد کھوپڑی اور رسولی کے آپریشن کے متعلق ضروری ہدایات قلمبند کر دی گئی ہیں۔ آلات جراحی کی بھی تفصیل دی گئی ہے اس کے بعد جسم کے مختلف اعضا مثلاً آنکھ، جبڑہ، سینہ وغیرہ کے آپریشن کرنے کے طریقے مندرج ہیں۔

مترجم نے اردو رسم الخط میں انگریزی اصطلاحات کثرت سے استعمال کی ہیں اور کتاب کے نیچے حاشیہ پر ان اصطلاحات کو انگریزی میں لکھا گیا ہے۔ بعض جگہ انگریزی اصطلاح کے ساتھ اس کی تشریح بھی کر دی گئی ہے۔ جملوں کی ساخت اور ترکیب میں قدامت پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں متروک الفاظ بھی نظر آتے ہیں۔ عبارت کے نمونے درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

"مثلاً وسط پیشانی میں بہ سبب محدب ہونے شاخ ہڈی اسفنجیہ کے کہ جو شکل نمار کے ہے ٹریفین لگانے کو اچھی جگہ نہیں۔ اور اگر لگتا ہے تو بیو دسے میٹر کو وندا ملل سے نقصان ہوتا ہے لیکن اگر اسی جگہ دست کاری کرنی ہو تو جراح کو لازم ہے جب گول ہڈی جدی ہونے کے قریب ہو تو لیوسٹیز سے کام نکالے"

Infrontis Duramatic Elevator

صفحہ (۲۶) کی ایک عبارت کا اقتباس یہ ہے۔

"عمل پولیپا جب کہ بیماری الویولاری پروسس یعنی نمانہ دندان میں ہووے اور زیادہ سرایت نہ کی ہو تو اول چاہئے کہ رسولی کو قطع کرے اور جہاں سے رسولی کٹی ہے اس کے وسط میں ایک زخم سیدھا چھری کرے اور زخم پر ایک گدی خشک کپڑے کی باندھے اور اگر خون بہت جاری ہو تو گدی کپڑے کو ٹنکچر میوریٹ میں کہ یہ عرق لوہے کا ہوتا ہے تر کرکے زخم پر باندھے"

(۱۳۰ کتب خانہ آصفیہ)

طب ڈاکٹری

خواجہ حمید الدین

اعلان :- خریدار اصحاب سے نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ براہ کرم چندہ سالانہ بلعجہ روانہ فرما کر شکریہ کا موقع دیجئے۔ سب رس تقسیم کرنے والے سے مطبوعہ رسید لے کر چندہ دیا جا سکتا ہے۔

روس اور مذہب

روس میں عیسائی مذہب کی اشاعت کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے جس میں ایک غور طلب صداقت کا پہلو پوشیدہ ہے۔ ایک قدیم تاریخی تذکرے کے مطابق شہزادہ ولادمیر نے جو دسویں صدی کے آخر میں کیوف کا حکمران تھا، عمائدین ملک سے مشورہ اور سوچ بچار کے بعد دس عقلمند افراد کو پڑوسی ممالک میں روانہ کیا تاکہ وہ پتہ لگائیں کہ کونسا مذہب وہاں کے متداول مذاہب میں سب سے بہتر ہے۔ اس زمانے میں نواحات روس کے مروجہ مذاہب میں یونانیوں کی "راسخ الاعتقادی" (orthodox) جرمنی اور جزیرہ نمائے اسکنڈے نیویا کی لاطینی عیسائیت "عرب کا اسلام اور دریائے والگا اور ڈان کے ساتھ ساتھ اسٹیپ میں پھیلے ہوئے خزاروں کی یہودیت" شامل تھے۔ ان تمام مذاہب کے مطالعے کے بعد وفد نے واپس آکر بہ یک زبان یونانیوں کی "راسخ الاعتقادی" کی حمایت کی۔ انھوں نے کہا کہ "مقدس عشائے ربانی" قسطنطنیہ کے سنٹ صوفیا میں اس حسن و اہتمام کے ساتھ منایا گیا کہ تھوڑی دیر کے لئے انہیں اس کا بھی ہوش نہ رہا کہ آیا وہ زمین پر ہیں یا ملاءِ اعلیٰ کی رفعتوں میں پہنچا دیے گئے ہیں۔

اس قصے میں صداقت کا یہ پہلو مضمر ہے کہ اس سے حسن کے متعلق روسیوں کے گہرے احساس کا پتہ چلتا ہے جب کہ اس کی سطوت اور اثر انگیزی میں مذہب سے متعلق ہونے کے بعد اور اضافہ ہو گیا ہو۔ روسی دیہاتیوں کے مذہبی جوش و اعتقاد کی بتدریج نشو و نما اسی مذہب "راسخ الاعتقادی" کے زیر سایہ ہوئی۔ سرزمین یورپ میں عظیم تغیرات برپا کرنے والے افکار جدید کی لہریں ——— مذہب ملائیت، نشاۃ ثانیہ، سولھویں صدی کی اصلاح دینی مسیحیت (جس سے پروٹسٹنٹ مذہب کی بنا پڑی) اور اس کا ردِ عمل ——— روس تک کبھی نہ پہنچ سکیں۔ اور روس کی مذہبی زندگی تمام بیرونی اثرات سے معریٰ صدیوں تک قوت و ترقی کی جانب مائل رہی۔

۱۹۱۷ء کا بولشویک انقلاب روس کی مذہبی زندگی کے لئے زبردست مزاحمت ثابت ہوا۔ قائدین انقلاب ایک خاص مادی حکومت کا خاکہ تیار کر چکے تھے۔ ۲۳ جنوری ۱۹۱۸ء کے قانون کی رو سے کلیسا اور حکومت دو علیحدہ چیزیں قرار پائیں اور قدیم روسی کلیسا جدید روس کا قومی کلیسا نہ رہا۔

مارکسی نظریات کا مذہب کے متعلق رجحان جس پر ہم آگے چل کر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے یہ تھا کہ کسی طرح روس سے منظم مذہب کے تصور کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا جائے۔ اس بارے میں جو کوششیں کی گئیں وہ اپنی جگہ مکمل اور موثر تھیں۔ اشتراکیوں کو کوئی وجہ نظر نہ آئی کہ کیوں کلیسائی جائداد اور دوسری املاک میں فرق کیا جائے۔ لہٰذا کلیسا کی تمام جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔ مذہبی اداروں کو معاشی کاموں مثلاً امداد باہمی اور خیرات خانوں کو اپنے قبضے میں رکھنے یا ان کا انتظام کرنے سے سختی سے باز رکھا گیا۔ کلیسا کے خلاف ان اقدامات سے مقصود یہ تھا کہ معتقدین مذہب کی اعانت کے علاوہ آمدنی کے دوسرے ذرائع سے ان کو محروم کر دیا جائے۔ مدارس کو کلیساؤں سے بالکل علیحدہ کر دیا گیا۔

ارباب کلیسا پر جنھوں نے اس کی مخالفت کی مقدمے چلائے گئے اور ان کی اس حرکت کی پاداش میں سخت سزائیں دی گئیں۔ گو حکومت کی کلیسا دشمنی کا نتیجہ یہ نکلا کہ روس کے چار بڑے مذہبی مراکز جو کیوف، ماسکو، پیٹروگراڈ اور کازان میں تھے بند ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود حکومت نے پہلے پہل خانگی مذہبی تعلیم پر کوئی پابندی نہیں عائد کی۔ مگر ۱۰ مئی ۱۹۲۹ء کو اشتراکی کانگریس نے ایک دستوری تبدیلی کی۔ ابتدا میں حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ "ہر شہری کو مذہب کی موافقت یا مخالفت میں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے"۔ تبدیل شدہ دستور میں یہ فقرہ تھا۔ "مذہبی معتقدات اور مخالف مذہب پروپگنڈے کو پوری آزادی دی جاتی ہے"۔ اس طرح سے منظور شدہ مذہب صرف عبادت تک محدود ہو کر رہ گیا۔ عوام کو مذہبی مسائل پر مخاطب کرنا منع تھا۔

مگر لامذہب عقلئین کو اپنے پروپگنڈے کے لیے پوری آزادی حاصل تھی جس کا استعمال وہ اپنے قائد "یاروسلافسکی" کے تحت پورے زور و شور سے "ملحد جماعت" کی طاقت اور اقتدار بڑھانے کے لئے کرتے رہے۔ اس طرح مذہب کے خلاف عظیم اقدامات اخباروں، رسالوں اور ادبی گروہوں کے ذریعے جاری رہے۔ اور اتحاد کے پرستاروں کو اس مخالفت کے لئے خاص مشق و تربیت حاصل ہوتی رہی۔ اس پس منظر کو پیش نظر رکھنے کے بعد سوویٹ حکومت کی مذہب کے متعلق تبدیل شدہ حکمت عملی کو بالکل وقتی کہا جا سکتا ہے۔ اس تبدیلی کی وجوہات کا تجزیہ کرنے سے قبل بہتر ہے کہ ہم روس میں مذہب کی موجودہ صورت حال کا سرسری مطالعہ کریں۔ ماسکو اور روس کے دوسرے تمام علاقوں میں عہدۂ بطریق کا پھر سے احیاء کیا گیا ہے۔ ملحدوں کی انجمن کو توڑ دیا گیا ہے۔ پادریوں کو حق رائے دہی عطا کیا گیا ہے۔ اتوار کو تعطیل: یعنی عیسائی ہفتے کو پھر سے اختیار کر لیا گیا ہے۔ عمالی تنظیم میں کچھ آسانی پیدا کی گئی ہے تاکہ دہقان و مزدور بڑے تہوار منا سکیں۔ مخالف مذہب امتحانات جو گزٹیڈ فوجی اور سیول عہدہ داروں کے لئے ضروری تھے ختم کر دیے گئے ہیں۔ درسی کتابوں کے اس حصے کو خارج کر دیا گیا ہے جو معتقدین مذہب کی دل آزاری کا باعث تھا۔

عمرانی نظریات کا جب سائنٹفک نظریات سے مقابلہ کیا جائے تو ضرور ان میں ایک خامی نظر آئے گی۔ سائنٹفک نظریات کا ثبوت آسانی سے ایک تجربہ خانہ میں دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے برعکس عمرانی نظریوں کو جن کا تعلق ایک عظیم انسانی گروہ سے ہے اول الذکر کی طرح آسان تجربوں سے ثابت کرنا مشکل ہے۔ بہرحال روسی قائدین انقلاب نے اپنے نظریۂ مذہب کے موافق جس خوبی سے کام انجام دے کر اپنے کمال کا ثبوت دیا ہے وہ حقیقت دنیا کے عظیم پیمانے کے عمرانی تجربوں کے سلسلے میں ایک قیمتی کوشش ہے۔

یہاں نامناسب نہ ہوگا اگر ہم ان "مفروضات" پر ایک نظر ڈال لیں جن کو پیش نظر رکھ کر یہ تجربے کئے گئے۔

انقلابی تحریک کے مفکرین مارکس اور اینگلز اور روسی انقلاب کے رہنما مثلاً لینن دراصل سائنٹفک مادیت پرست تھے۔ لینن کے نزدیک تصوری فلسفہ کی وہ تمام تعلیمات جو مادیت کے مقابلہ میں مذہب کی مدافعت کے طور پر پیش کی گئی بالکل غلط تھیں۔ اینگلز نے دعوی کیا کہ مذہب کی اصلیت کچھ بھی نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف عوام کے دلوں پر ان بیرونی قوتوں کے اثرات کی ایک پرچھائیں ہے جو روزمرہ زندگی میں ان پر مسلط ہیں۔ یہ وہ اثرات ہیں جن کی بدولت دنیاوی قوتیں مافوق الفطرت ہستیوں کا بھیس اختیار کر گئی ہیں۔ عہد قدیم کا انسان اس خدا کی عبادت کرتا تھا جو اس کے نزدیک برق جہاں سوز کے پردے میں ظاہر ہوتا تھا۔ موجودہ دور کے انسان نے سرمایہ داری کی لائی ہوئی بدبختی اور پریشان حالی سے بھاگ کر خدا اور حیات بعد الممات کے پردے میں پناہ لی ہے جو اس کی نظر میں دنیاوی زندگی کوتاہیوں کی تلافی کر دیں گے۔ اسی دور میں منظم مذہبی تحریک حکمران طبقوں کے زیر اثر آ گئی۔ جنھوں نے اس کی مدد سے اپنے ضمیر کی تسلی کی خاطر برائے نام خیرات کی تائید کی۔ اور دوسری طرف کام کرنے والے نچلے طبقے کے حیات بعد الممات پر اعتقاد کو تقویت پہنچانی شروع کی۔

حالات کے اس تجزیہ کے پیش نظر ضروری ہے کہ منظم مذہب کے طریق کار کو ختم کر دینا چاہیئے۔ جب پیدائش دولت کے ذرائع مزدور طبقے کے ہاتھ میں آجائیں گے تو آدمی اپنی قسمت کا مالک ہو جائے گا اور مذہبی رجحان خود بخود حرف غلط کی طرح مٹ جائے گا۔ غرض یہ تھی اینگلز کی منطق مذہب کے خلاف۔

روس میں موجودہ مذہبی رجحان کے احیاء کی تحریک کو مندرجہ بالا نظریے کی تکذیب سمجھنا غیر دانشمندی پر محمول ہوگا۔ مذہبی اداروں پر جو تنقیدیں کی گئی ہیں ان میں صداقت کے بعض اہم پہلو مضمر ہیں۔ روسی کلیسا کی آزادی جس کی بدولت ملک سولھویں صدی عیسوی کے ہیجانی دور سے

گزرنے کے بعد امن و سکون سے ہمکنار ہو گیا تھا پیٹر اعظم کے دور حکومت میں سلب کر لی گئی۔ پیٹر اعظم کسی دوسری قوت کو اپنی رقابت پر آمادہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ پہلے تو اس نے بطریقیت کی علامت کے زوال کے حالات پیدا کر دیے پھر کلیسا کو ایک سیول عہدہ دار کی نگرانی میں کر دیا جس کو وہ معنی خیز طور پر "زار کی آنکھ" کہتا تھا۔ انقلاب تک روس میں مذہب کی سماجی جڑیں ناکارہ ہو چکی تھیں۔ اور اس کی حالت ایک زائد محکمہ پولس کی سی ہو گئی تھی۔ پادریوں سے ہمیشہ اس چیز کا خدشہ رہتا کہ وہ اپنے ملنے کی رعایا کی باتوں کو پولس تک پہنچا دیں گے۔ بعض اوقات پادری حکومت سے سنسر شدہ خطبے پڑھتے۔ آزاد خیال پادریوں پر سختی کی جاتی اور بعض دفعہ قید کی سزا بھی دی جاتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہب کی مخالف تحریک نے منظم مذہب کی بہت سی خرابیوں کو دور کرنے میں بڑی مدد کی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے اس کا بھی پرچار کیا کہ مذہب اور توہمات میں بہت بڑا فرق ہے۔ مذہب کا مقصد انسان کی وفا شعاری کو بیدار کرنا ہے جو بلند ہمتی اور انسانیت پرستی کی توثیق کرتی ہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں جبکہ مخالف مذہب حملے شدید صورت اختیار کر گئے تھے مخالفت کے بانی لیونا کارسکی وزیر تعلیمات کو ماننا پڑا کہ "مذہب ایک کیل ہے جتنی شدید ضرب تم اس پر لگاؤ گے اتنی ہی گہری یہ لکڑی میں دھنسی جائے گی"۔

"رڈاسکویر" کی ایک درگاہ میں جہاں پہلے کنواری آئیریا کی تصویر تھی انقلابی لیڈروں نے ایک تختی مارکس کا یہ جملہ کندہ کر کے لٹکا دی تھی "مذہب عوام کی افیون ہے"۔ اب اس تختی کو وہاں سے ہٹا دیا گیا ہے اور کنواری آئیریا کی تصویر وہاں دوبارہ آویزاں کی گئی ہے۔ روس میں ہم آہنگ معتدل عقلیت پسندی اور مذہبی رجحان کا ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے۔

احسان اللہ ۔ ۔ ۔

مشرق کا ستارہ سحری

میری آبادی سے کوسوں دور ہے
مضمحل خاموش جیسے چور ہے
روح ہے لیکن بہت مجبور ہے
ایک تازہ رات کے پچھلے پہر

حسن کی دنیا میں مجھ سے آ ملا
عالم امکاں میں صدیوں گم رہا
زندگی کی راہ میں کھویا ہوا
بجھ رہی ہے اس کی قندیل حیات

میں نکل آیا جہان خاک میں
رہ گیا یہ منزل افلاک میں
اشک بن کر دیدۂ نمناک میں
اس میں ہے آمیزش خون جگر

اب یہ ڈوبا جا رہا ہے کیا کروں
پھر اندھیرا چھا رہا ہے کیا کروں
جی مرا گھبرا رہا ہے کیا کروں
آ کہاں ہے اے سکون کائنات

دیکھ سوز زندگی دیتا ہوں میں
تجھ کو اپنی روشنی دیتا ہوں میں
زیست کی تابندگی دیتا ہوں میں
ہاں ابھر اے نقش ہستی پھر ابھر

پی ۔ پیام

دو غزلیں

ٹکرا نہ سکے کہساروں سے اور چاک گریباں کر نہ سکے
ہم خود بھی پشیماں ہو نہ سکے ان کو بھی پشیماں کر نہ سکے

اک تم جو شبِ تنہائی میں تسکین کا ساماں کر دیتے
کیوں ایسی بھیانک راتوں میں تارے بھی چراغاں کر نہ سکے

وہ فصلِ بہاراں کی آمد پر سیرِ بہاراں کر نہ سکے
جو اپنے لہو کی بوندوں سے زنداں کو گلستاں کر نہ سکے

یہ وقت کی طوفانی لہریں لڑتی ہی رہیں کٹتی ہی رہیں
ساحل پہ جو عیش بداماں تھے اندازۂ طوفاں کر نہ سکے

ہنسنے کا طریقہ یاد نہیں رونے کا سلیقہ بھول گئے
اے دردِ جنوں ہو خیر تری ہم جانے کیا کیا بھول گئے

سانسوں میں کسک سینے میں کھٹک آنکھوں میں اندھیرا چھایا ہے
انجامِ تمنا سامنے ہے آغازِ تمنا بھول گئے

یہ صحنِ قفس یہ شکستہ پری یہ دردِ اسیری کیا کہیے
صیاد! دعا دیتے ہیں تجھے ہم لطفِ چمن کا بھول گئے

دکھ درد کے پھندے کٹ نہ سکے وہ بزمِ تصور ہی میں رہے
ہم بھولنے کو بھولے ہیں انہیں پر دل سے بھلانا بھول گئے

وہ میرے تصور میں آئے کچھ کہہ بھی گئے کچھ سن بھی گئے
اب اس کی خبر کس کو نازش کیا یاد رہا کیا بھول گئے

نازش پرتاپ گڑھی

چاندنی رات

جب میں سینما سے رات کے ایک بجے واپس ہو رہی تھی تو کوئی سڑک کے بیچوں بیچ لیٹا ہوا نظر آیا۔ موٹر روک کر ٹارچ کی مدد سے دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گئی۔ انسانی جسم لیکن ہڈیوں کے پنجرے سے بدتر۔ کچھ ہی دیر پہلے سینما ہال میں زندگی ایک مجسم رنگینی ایک مسلسل قہقہہ تھی۔ اور سینما ہال سے باہر انسانیت کی یہ خستہ حالیاں میرا دل بیٹھ گیا۔ میں نے اسے اپنی موٹر میں بٹھا لیا۔ وہ دیوانہ۔ قسمت کی بیرنگیوں پر آنسو بہاتے بہاتے تھکنے والا اب زندگی کی پرچھائیں سے بھی گھبراتا تھا۔ میں نے اس کے زخم کی مرہم پٹی کی۔ پر اس گھاؤ کا علاج کس کے پاس تھا جو اسے اندر ہی اندر کھائے جاتا تھا۔ ایک دن میں نے اس کی زندگی کے بارے میں پوچھا۔ بڑے اصرار کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔

ایک رات ہم سب دوستوں نے ایک چمن میں چاندنی رات منائی۔ کچھ ہی دیر بعد چمن کے جنوبی حصہ سے ایک بہت ہی پیاری اور سریلی آواز آئی۔ کوئی بڑی میٹھی لے میں گا رہا تھا۔ ہم اس طرف چلے۔ حسین اور نوجوان لڑکیوں کا ایک جمگھٹا کھل رہا تھا۔ ان میں کی ایک جس کی خمار آلود آنکھیں چاند کو ٹکٹکی باندھے تک رہی تھیں گا رہی تھی۔ مستانہ وار! کہہ نہیں سکتا۔ اس ایک نظر نے کیا غضب ڈھایا۔ دوسرے ہی دن میں نے پتہ لگا لیا کہ وہ ایک امیر گھرانہ کی لڑکی ہے۔ کلیہ طبیہ میں اس کی تعلیم کا پہلا سال ہے اور اس کا بھائی یوسف ہمارے ہی کالج میں ہے۔ میں نے یوسف سے دوستی کر لی۔ کیوں؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کہاں میں۔ کہاں وہ۔

دو ہفتے بعد میں یوسف کے بنگلہ پر پہونچا لیکن اس وقت یوسف کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا رہا۔ کوئی دس منٹ گزرے ہوں گے کہ وہ گنگناتی ہوئی باہر آئی۔ میری طرف دیکھا۔ میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور گھبرا کر بولا "جی میں سلمان ہوں۔ بی۔ اے یوسف کا دوست!!" اس نے جواب دیا۔ جی واقعی؟" اور چلی گئی۔ مجھے اپنی حماقت پر بے حد غصہ آیا۔ بھلا کون پوچھتا تھا مجھ سے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ بہت شرمندہ ہوا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ یوسف نے بارہا اصرار کیا کہ میں اس کے گھر آؤں لیکن ہمت نہ پڑی۔ آخر دو مہینے بعد وہ مجھے زبردستی لے گیا۔ بہت خاطر مدارات کی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی عزیز بہن سے میرا تعارف بھی کروایا۔ اس وقت محمودہ نے مسکرا کر کہا "آپ مسٹر سلمان بی۔ اے یوسف کے دوست۔ یوسف نے سمجھا ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں لیکن میں دل ہی دل میں شرمندہ ہوا جا رہا تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ اس دن سے میری زندگی میں ایک تغیر برپا ہو گیا۔ ہر وقت اسی کا خیال۔ پڑھائی کے اوقات اسی کے سہانے تصور میں گزرنے لگے۔ اور میں یہ بھی سمجھا ہوا تھا کہ میری طرح محمودہ بھی محبت کی آگ میں جل رہی ہے۔ لیکن وہاں معاملہ ہی اور تھا۔ جدید تہذیب و تمدن کی فضا میں سانس لینے والی لڑکی کے لئے مجھ جیسے ان گنت پجاری تھے۔ اس کو میری محبت تو کجا شکل بھی یاد نہ تھی۔

میری تعلیم کا خاتمہ ہو گیا۔ پے در پے ناکامیوں نے میری کمر توڑ دی لیکن دل پر زیادہ اثر نہ ہو سکا کیونکہ وہ تو محمودہ کی شاندار کامیابیوں پر مسرور اور نازاں تھا۔ کالج میں وہ ایک ممتاز حیثیت کی مالک ہو گئی۔ میرے لئے اس کی کامیابی اور نیک نامی ایک بیش بہا دولت تھی۔ مجھے اور کیا چاہئے تھا: میں اس سے بے لوث اور بے غرض محبت کرتا تھا۔ میری محبت کا صلہ مجھے منظور نہ تھا۔ اس لئے میں نے کبھی اظہار کی جرأت نہ کی۔

وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید اپنے آنسو پی جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بے چین ہو کر پہلو بدلا وہ کہنے لگا۔" ہاں تو میں نے اپنی محبت کا اظہار کبھی نہ کیا۔ کبھی بھی نہیں!!۔ وہ اب ڈاکٹر محمودہ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ہو گئی تھی۔ خوشی سے میں پھولوں نہ سماتا تھا۔ مجھے

یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں امتحان میں ناکام رہا ہوں۔ اسی اثنا میں والد کے انتقال کی خبر ملی۔ دیہات میں سارے معاملات طے کرکے شہر آیا تو معلوم ہوا کہ اس نے باضابطہ پریکٹس شروع کردی ہے اور اپنے دواخانہ کا نام "سلمان ہسپتال" رکھا ہے۔ میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان تصور کرنے لگا۔ اب تو مجھے یقین ہوگیا کہ وہ بھی میری طرح محبت کی آگ میں جل رہی ہے ورنہ کیوں وہ میرا نام منتخب کرتی؟ فرط انبساط سے جھومتا ہوا اس کے ہسپتال پر پہونچا۔ برسات کے ابتدائی دن تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار ہو رہی تھی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ سورج کی کرنیں بھی نم تھیں۔ میں نے اس کے کمرۂ خاص میں اس کا انتظار کیا جب وہ چند مریضوں کو دیکھ چکی تو میرے پاس آئی۔ سادہ سوتی لباس لیکن پھر بھی الٰہ کے پتوں کو نیچا دکھاتے ہوئے وہ مسکرا کر کہنے لگی "کہیے جناب کیسے تشریف لائے آپ؟" میں نے کہا "آپ کو مبارک باد دینے"۔ "اوہ شکریہ"۔ "ہسپتال کا نام نہیں سنا آپ نے؟" میں نے شرارتاً کہا۔ "جی نہیں"۔ اور اس کی نگاہوں میں کچھ ڈھونڈھنے لگا لیکن وہاں کوئی خاص بات نظر نہ آسکی۔ "آپ کو معلوم ہے اتنا اچھا نام میں نے کہاں سے پایا؟" "نہیں تو" لیکن ابھی محویت میں قدرہ برابر فرق نہ آیا۔ کہنے لگی: "اچھا سنیئے میرے بھائی کے ایک دوست تھے ان کا نام تھا سلمان۔ میرے بھائی ان کو بہت پیار کرتے تھے۔ میں بھی ان کی کافی عزت کرتی تھی۔ مگر نہ معلوم بیچارے کدھر غائب ہوئے کہ چار یا پانچ سال سے صورت نہ دکھائی۔ ممکن ہے کہ بھائی ان سے ملتے بھی ہوں لیکن میں نے اپنی مصروفیت کی بنا پر ایک عرصہ سے انھیں نہیں دیکھا۔ بھیا ہی کے مشورہ سے میں نے اپنے ہسپتال کا یہ نام رکھا۔ میرے ہوش وحواس کہاں قائم تھے جو اس کی باتوں کا کوئی جواب دیتا۔ اتنے میں باہر سے گھنٹی بجی اور وہ مریض کو دیکھنے چلی گئی۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ غلط فہمی کا تصور ایک دیمک کی طرح میری ساری ہستی کو زیروزبر کر رہا تھا۔

اس کے بعد میں نے اپنے عزیز وطن کو خیرباد کہہ دیا اور ایک ضلع کے مدرسے میں استاد ہوگیا۔ میری آمدنی کا آدھے سے زیادہ حصہ اخباروں و رسائل کی نذر ہوجاتا کیوں کہ ان کے صفحوں پر میں اپنے دل کے ٹکڑوں کو بکھیرتا تھا۔ ایک دن میں نے اخبار میں دیکھا کہ مخمور کی منگنی ڈاکٹر شیرازی سے ہوگئی! میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ غریب اور ذلیل انسان۔ مجھے نہ دل تھا نہ دل میں کوئی تمنا۔ مجھے تو برباد ہی ہونا تھا۔ چند ہفتوں بعد اخبار میں آیا۔ مخمور کی شادی بھی ہوگئی۔ میں بھی آخر انسان تھا۔ پہلو میں دل اور دل میں درد رکھتا تھا۔ کب تک صبر کرتا۔ میری شرافت، صبر اور ایثار کا پیمانہ چھلک گیا۔ میں رات کے سمے گھر سے نکل گیا۔ میرا کام گشت لگانا تھا اور میں گشت لگاتا تھا۔ آگے بڑھتا تھا اور بڑھتا جاتا تھا۔ میری حالت اس مسافر کی تھی جس کی منزل ہی خود بھٹک گئی ہو۔ اس دن سے لوگ مجھے دیوانہ سمجھنے لگے۔ بچے مجھ پر پتھر پھینکتے۔ جوان مضحکہ اڑاتے اور بوڑھے مجذوب تصور کرتے۔ آہ دنیا والے مجبور وبیکس انسان کے دل کا حال کیا جانیں؟۔ ایک رات میں بھٹکتا ہوا ایک چمن میں گھس گیا۔ چاندنی رات تھی!۔ یکایک کسی نغمے گانے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ میں ٹھٹکا۔ آج سے پانچ سال پہلے کا سماں میری آنکھوں میں کھنچ گیا۔ یاخدا! یہ مخمور ہی تو تھی جو اپنے شوہر کے آگے بیٹھی۔ وہی راگ الاپ رہی تھی جس نے میری زندگی کو پھونک ڈالا تھا۔ آج کی رات اور وہ رات دونوں میں کتنا فرق تھا۔ زمین وآسمان کا فرق۔ میں دوڑ کر ان کے سامنے پہونچا اور کہنے لگا "بند کرو اپنا گانا۔ مخمور!! بند کرو اپنا گانا۔ اس کے تیسرے دن جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو سلمان ہسپتال میں پڑا پایا۔ میری پیشانی پر زخم آیا تھا۔ کیونکہ میں بیہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ یہ زخم کبھی اچھا نہ ہوا۔ میری حالت وحشیوں کی طرح بدتر تھی۔ مجھے کیسے پہچان سکتی تھی؟ نہ پہچاننا اچھی ہی ہوا مجھے ہوش آنے کے ایک گھنٹہ بعد رات کے وقت میں چوری سے بھاگ نکلا۔ اور پھر وہی آوارہ گردی شروع ہوگئی کہ آپ مجھے پکڑ لائیں۔ میں آپ جیسی خاتون کا احسان عمر بھر نہ بھولوں گا اور سچ تو یہ ہے کہ اسی احسان کی وجہ سے میں نے اپنے دل کا راز آپ سے کہہ دیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ لیکن وہ مسکرا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں۔ دوسری رات اس کے دل کی حرکت یکایک بند ہوگئی۔ مرنے کے بعد بھی اس کی نیم وا آنکھوں میں ... نے شکریہ کا اظہار رکھا تھا۔

میں نے مخمور کو اطلاع کروائی۔ وہ بھی اس کے یکایک بھاگ جانے سے پریشان تھی۔ اس خبر کو سن کر اپنے شوہر اور بھائی کے ساتھ آئی [illegible] تھا۔

[illegible]

عزیزہ [illegible] بیگم

بات پوشیدہ رکھوں" آج سے چھ سال قبل جب کہ میں دس سال کی تھی اپنے والدین کے ساتھ کہیں جا رہی تھی، دوران سفر میں ایک حادثہ پیش آیا۔ زنانہ ڈبہ میں چند بدمعاش گھس آئے اور کئی عورتوں کے سونے کے زیورات لیکر چلتی ٹرین سے کود کر کہیں غائب ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد ایک چھوٹا سا اسٹیشن آیا۔ ٹرین وہاں رکی عورتیں رو رہی تھیں۔ خوب شور و غل برپا تھا۔ ایک دوسرے کی کچھ خبر نہیں ملتی تھی۔ اسی وقت اگلی ٹرین روانہ ہوئی۔ میں رو رہی تھی ایک حسین لڑکی میرے پاس آئی اور مجھے اپنے ساتھ لیکر اپنی والدہ کے پاس گئی وہ بہت اچھی تھیں مجھے پیار کیا اور اپنے ساتھ ٹرین میں لائیں مجھے والدین بہت یاد آ رہے تھے میں سوچتی تھی کہ جلد ہی مجھے والدین مل جائیں گے۔ میں ان لوگوں کے ساتھ یہی خیال کرتے لکھنؤ پہونچ گئی۔ ہر صبح ایک نئی امنگ ولولہ اور امید کے ساتھ اٹھتی۔ ہزاروں قسم کے ہوائی قلعے بناتی لیکن بادِ خزاں کے ظالم جھونکے میری امیدوں کا بنا بنایا نازک قصر مسمار کر دیتے۔ اسی امید میں پانچ سال گزر گئے۔ میں اپنی محسنہ کو خالہ کہتی تھی وہ مجھے بیحد پیار کرتی تھیں۔ انھوں نے مجھے گھر پر اتالیق رکھ کر اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ ان کی چار لڑکیاں تھیں۔ دو شادی شدہ تھیں اور دو زیر تعلیم تھیں۔ گرمی کی چھٹیوں میں ہم لوگ سیر کو نکلے۔ ارادہ تھا کہ بمبئی آئیں گے اور یہاں کی خوب سیر کریں گے اس لئے ہم لوگ پہلے پونہ گئے پھر سورت آئے۔ سورت کے بعد فیلیا میں ہم نے چاندنی رات میں کشتی کی سیر کا پروگرام بنایا اور چار کشتی ڈلوا ہم سب اپنی اپنی کشتی پر روانہ ہو گئے؟ کچھ دور گئے تھے کہ ہوا زور سے چلنے لگی۔ بڑی باجی نے کہا کہ "اب واپس ہونا چاہیے کہیں ہم لوگ مصیبت میں نہ پھنس جائیں"۔ منجھلی باجی نے بھی تائید کی لیکن چھوٹی باجی نے کہا "تم لوگ اتنی ہوا سے ڈر گئیں، کتنی بزدل ہو" پھر وہ مجھ سے بولیں: "چلو نسرین ہم لوگ آگے چلیں گے۔ دیکھیں کون آگے نکلتا ہے۔ میں نے اپنی کشتی کو آگے کر دیا۔ بہت دیر تک ہم دونوں کا مقابلہ ہوتا رہا۔ چھوٹی باجی مجھ سے آدھ میل پیچھے رہ گئیں۔ میں نے دیکھا کہ سب واپس جا رہی ہیں اور مجھے سب ہاتھ کے اشارے سے

واپس بلا رہی تھیں۔ میری کشتی بیچ منجدھار میں تھی کہ وہی تیز ہوا خوفناک طوفان کی صورت اختیار کر لی۔ میرے کان پانی کے شور و غل سے بہرے ہو چکے تھے۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ ہر طرف پانی ——— اور پھر طوفان۔ میرے دماغ کا توازن بھی درست نہیں رہا کہ میں کچھ سوچ سکتی۔ بالآخر تھک کر کشتی میں بیٹھ گئی کچھ دیر بعد ایک دھکا سا لگا اور میری کشتی حیات غرق سمندر ہو گئی۔ مجھے نہیں معلوم پھر کیا ہوا ———"

اس نے اپنا افسانۂ غم ختم کر کے نجمی کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ نجمی کے رخسار پر آنسو ڈھلک رہے ہیں۔ وہ بولی: "مجھے اس بات کی حد سے زیادہ خوشی ہے کہ آپ جیسے نیک اور ہمدرد انسان نے مجھے بچایا۔ میں اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کروں کم ہو گا!" نجمی اپنے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا "شاید تم کو میرے ساتھ خوشی حاصل نہ ہو سکے کیونکہ میں ایک غریب انسان ہوں!" نسرین نے کہا: "خدا نہ کرے، میں اتنی احسان فراموش نہیں ہوں جو اپنی خوشی کا خیال کروں اور آپ کا کچھ بھی نہیں!"

ابھی نجمی نے کچھ بھی جواب نہیں دیا تھا کہ بمبئی کے رئیس اور سب سے بڑے تاجر شوکت حیدری کا ملازم کار لے کر آ گیا اور اس نے بتایا کہ شوکت صاحب نے انھیں یاد فرمایا ہے۔ نجمی فوراً ملازم کے ساتھ "شوکت منزل" روانہ ہو گیا! شوکت صاحب نجمی سے بہت محبت سے ملے۔ وہ نجمی کے حسن اخلاق اور لیاقت سے بہت خوش تھے اور نجمی کو بیٹے کی طرح چاہتے تھے۔ نجمی کو دیکھ کر فرمانے لگے: "بیٹا طبیعت بہت گھبرا رہی تھی اور تم سے کچھ کام بھی تھا اس لئے بلایا۔ تمھیں تو معلوم ہے کہ میرا بائیس سالہ اکلوتا لڑکا لندن سے واپس آتے ہوئے حرکت قلب کے بند ہو جانے سے مر گیا۔ اب تو صرف خورشید میری زندگی کا سہارا ہے۔ وہ یورپ سے واپس آ چکی ہے۔ لیکن سیر کی غرض سے کشمیر گئی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اپنی جائداد کا کچھ حصہ تمھارے نام لکھ دوں ———!" نجمی نے جھجکتے ہوئے کہا "لیکن ——— لیکن۔ کیا میں اس قابل ہوں ——— ؟" شوکت صاحب نے افسوسناک لہجہ میں کہا "نجمی میں تم کو ہمیشہ اپنے بیٹے کی طرح چاہا۔ تم ایک حسین خوش اخلاق

اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو تم میں وہ خوبیاں ہیں جو آج کل کے نوجوانوں میں نام
کو نہیں ہیں۔ مجھے خبر ملی کہ میرا اکلوتا بیٹا اس دنیا سے چل بسا
تو میں نے تمھیں دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ تم کو میں ہمیشہ کی طرح
اب بھی چاہتا ہوں۔ میں نے اور تمھاری خالہ (بیگم شوکت)
نے قطعی طور پر ارادہ کر لیا ہے کہ دو کمپنیاں تمھارے نام لکھ دیں۔
آج سے تم ان کے مالک ہو گئے اور باقی وہ اپنی لڑکی خورشید
کے نام میرے بعد وہ ان دونوں کی مالک ہوگی۔ تمھاری کیا رائے
ہے۔" نجمی نے سر جھکا کر ادب کے ساتھ کہا ـــ "آپ کی خوشی
کو اپنی خوشی سمجھنا میرا فرض ہے۔"
شوکت:۔ "تم یہ نہ سوچو کہ اگر تم کو میری رائے سے اتفاق نہیں
ہوا تو میری محبت میں کمی آ جائے گی!"
نجمی:۔ "آپ میرے بزرگ ہیں اور ہر کام سوچ کر میری بھلائی
کے لئے کریں گے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن ــــ؟"
شوکت صاحب نے زور دیتے ہوئے کہا "ہاں بولو۔ رک کیوں گئے۔
شرماؤ نہیں بیٹا ــــ!" نجمی شرم سے سر جھکائے بولا "میرا مطلب
خورشید سے ہے ان کی رائے بھی تو بہت ضروری ہے!" شوکت صاحب
اس کے دل سے شک نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "تم اس
کی طرف سے مطمئن رہو۔ اس نے کبھی میرے کسی حکم کو نہیں ٹالا ہے۔
وہ زیادہ تر یورپ میں رہی لیکن مشرقی خاتون کا وقار اب تک
اس کے دل میں قائم ہے وہ بہت نیک خدمت گزار، خوش طبع،
اور باوفا بیوی ثابت ہوگی!" نجمی نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے کہا "
میری خوش نصیبی ہے۔ میں آپ کا ممنونِ احسان ہوں!" شوکت صاحب
نے کہا "اچھا اب تم جا کر آرام کرو۔ ضرورت ہوگی تو پھر بلا لیں گا۔"
نجمی نے سلام کیا اور دعاؤں کے ساتھ گھر واپس چلا گیا!

موسم ابر آلود تھا۔ صبح کا سہانا وقت بہت ہی دلفریب
و دلآویز تھا۔ نجمی اور نسرین ساحل کی طرف سے سیر سے واپس
آ کر ناشتہ کے لئے میز پر بیٹھے تھے کہ ایک کار آ گئی۔ "ڈاکٹر" کہہ کر
نجمی میز پر سے اٹھ گیا۔ نجمی نے ڈاکٹر صاحب کو سلام کیا اور
اندر ڈائننگ روم میں لے گیا۔ ڈاکٹر نے مریضہ کی مزاج پرسی
کی۔ پھر نجمی سے کہنے لگے۔ "مسٹر نجمی! مجھے افسوس ہے کہ ہم اتنے
قریب رہتے ہوئے بھی اب تک ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔
میرا خیال ہے کہ یہ کوٹھی بمبئی کے رئیس اعظم شوکت حیدری صاحب
کی ہے۔!"
نجمی نے کہا "جی ہاں آپ کا خیال صحیح ہے۔ وہ مجھے بہت چاہتے
ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے یہ عالیشان کوٹھی مجھ تنہا انسان کے
رہنے کے لئے دی۔" ڈاکٹر نے تعجب سے پوچھا "تنہا ــــ؟
کیا آپ کے ساتھ اور کوئی نہیں سوائے نسرین کے ــــ؟"
نجمی نے اپنا غم چھپاتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب بدنصیبوں کا
دنیا میں کوئی نہیں رہتا ہے جو اپنے رہتے ہیں وہ بھی غیروں
کی طرح سلوک کرتے ہیں وہ ایک بدنصیب کم حیثیت انسان
سے ملنا شایانِ شان سمجھتے ہیں۔" ڈاکٹر صاحب نے اصرار
کے ساتھ کہا "کیا آپ اپنے متعلق کچھ بتانے کی تکلیف کریں گے؟"
نجمی نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا "آپ کے اصرار سے مجبور
ہوں ورنہ میں نہیں چاہتا کہ اپنا افسانۂ غم کسی کو سنا کر اپنے
غم میں شریک کروں۔ لیجئے سنئے۔ میری عمر تیرہ سال کی تھی اس وقت
میں انگریزی کی نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میرے والد صاحب
بہت بڑے رئیس تھے ان کی زمین، کوٹھیاں تھیں اور بھی بہت
بڑی جائداد کے مالک تھے۔ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ مسرت
کے گہوارہ میں جھولتے گزرتا تھا۔ ہمارے شہر میں اس وقت ہیضہ
کی وبا پھیلی ہوئی تھی والدین کو میں اکلوتا تھا اس لئے انھوں نے
مجھے پاس کے ایک گاؤں میں اپنے قریبی رشتہ دار کے پاس
بھیج دیا تھا۔ لیکن موت کے ظالم پنجہ سے وہ نہیں بچ سکے اور
دونوں یکے بعد دیگرے جنت کو سدھارے۔ اس کے بعد ہی ہمارے
چچا، ماموں وغیرہ جائداد پر قابض ہو گئے۔ اب میرا دنیا میں
کوئی سہارا نہیں تھا۔ میں فرطِ غم سے بیمار ہو گیا۔ مجھے اور رشتہ دار
اذیت پہنچاتے۔ لیکن جن کے گھر میں میں تھا وہ بہت نیک دل
بزرگ تھے۔ حالانکہ ان کے صاحبزادے وغیرہ مجھ سے حسد کرتے
تھے۔ تاہم اس نیک خصلت بزرگ نے مجھے میٹرک اور میٹرک
کے بعد ایف اے کروا دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ہمیشہ ان کے
ساتھ رہوں لیکن میں اب زیادہ تکالیف برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

اس لئے ایک دن بمبئی کی راہ لی۔ یہاں مجھے چند معزز اور امیر گھرانوں میں ٹیوشن کا کام مل گیا جس کے ذریعہ میں ہر ماہ تین سو کما لیتا۔ میں نے پرائیویٹ طور پر بی۔اے کیا اور پھر کالج میں داخلہ کروا کر ایم۔اے کر لیا۔ حالانکہ مجھے ٹیوشن کرنا بالکل پسند نہیں لیکن مجبوراً اعلیٰ تعلیم کے شوق میں یہ بھی کیا۔ پھر میں نے ٹیوشن کرنا بند کر دیا۔ مگر آپ جانیں کہ زندگی اگر بے محور ہو جائے تو مصروفیت بے پناہ بڑھ جاتی ہے۔ کار بیکاراں بسیار بے قاعدہ زندگی کی اکتاہٹ کا سبب وافر درجہ کی مشغولیت ہوتی ہے۔ میرا نظریہ ہے کہ بیکار نوجوان اس لئے خودکشی کر لیتے ہیں کہ گونا گوں مصروفیتوں سے تنگ آ جاتے ہیں۔ فطرت خاص اصول پر کاربند ہے۔ [illegible] بہار و خزاں، روز و شب، شباب و شیب ——— سب میں نظام ہے۔ انسانی زندگی میں انضباط کا فقدان، ہمارے سحر و شام کے بے ڈھب انداز فطرت کے باضابطہ قوانین سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ زندگی دنیا میں اجنبیت محسوس کرتی ہے۔ اپنا محور بدلنے کے لیے مجبور ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات اس کوشش میں خود کو مٹا بیٹھتی ہے۔ میں چند روز تلاش معاش میں پریشان حال رہا۔ آخر خدا کو میری بھلائی منظور تھی۔ مجھے شوکت صاحب کی کمپنی میں اسسٹنٹ منیجر کی جگہ مل گئی پھر مجھے ترقی ہوئی اور اب منیجر ہوں ———!"

ڈاکٹر:- "آپ کو یہاں آئے کتنے سال ہوئے ———؟"

نجمی:- "نو سال ہو گئے!" ڈاکٹر:- "واقعی جب والدین کا سایہ سر سے اٹھ جاتا ہے تو عزیز بھی منہ موڑ لیتے ہیں!"

نجمی:- "ڈاکٹر صاحب منہ موڑ لیتے تو مجھے [illegible] نہیں تھی لیکن وہ لوگ میری جان کے [illegible] چاہتے تھے۔ خدا کسی دشمن کو بھی ایسے ظالم خود غرض [illegible] عزیز نہ دے!"

ڈاکٹر صاحب نے بات کا پہلو بدلتے ہوئے دریافت کیا "کیا آپ محترمہ نسرین صاحبہ سے متعلق کچھ بتائیں گے کہ یہ آپ کی کون ہیں۔ ہاں۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم شریف کیا تھا ———؟"

نجمی:- "والد مرحوم کا نام علی حیدر تھا۔ نسرین ———؟" ڈاکٹر [illegible]

اب یہ میری بہن ہے۔ میں تنہا تھا خدا نے اپنے اس بیش بہا عطیہ سے میری تنہائی کو دور کر دیا!" پھر نجمی نے نسرین کے تمام شروع سے آخر تک کے واقعات ڈاکٹر صاحب کو سنا دیئے۔ ڈاکٹر صاحب کا چہرہ وفور مسرت سے کھل گیا۔ اور ان کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ انھوں نے نجمی کو سینہ سے لگا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگے "بیٹا تیرا ظالم و گنہگار چچا میں ہی ہوں۔ اور تم نے جسے بہن بنایا ہے واقعی وہ تمہاری بہن ہے۔ میری بیٹی ہے۔ اسے جلدی بلاؤ!"

جب نسرین کو اپنے والد کے متعلق معلوم ہوا تو وہ [illegible] باپ سے لپٹ گئی۔ ڈاکٹر احسان علی نیازی نے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ [illegible] انتظار سے کائنات کا ذرہ ذرہ [illegible] مسرت و خوشی کے ترانے گانے لگے!

نسرین اور نجمی [illegible] ڈاکٹر نیازی اپنی بیگم سے ملانے گئے۔ بہت خوشیاں منائی گئیں ———!

ڈاکٹر نیازی [illegible] نسرین کو اپنی خدمت کے لئے [illegible] لیکن نجمی [illegible] دل [illegible] ایک دن [illegible] شوکت صاحب کی طرف سے اس کی شادی کے [illegible] چچا بھی پر اوس پڑ گئی۔ نسرین دل و جان سے نجمی کو چاہتی تھی۔ لیکن نجمی اسے ایک بہن کی طرح چاہتا تھا۔ نسرین کے والدین تو سمجھ رہے تھے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن ان کا خیال غلط نکلا!

[illegible] لیکن آپ کی بھی اور شوکت صاحب کی [illegible]

[illegible]

[illegible] شوکت منزل میں جمع ہو گئیں [illegible] بڑے [illegible] آئی اور نہایت مسرت و عزت و احترام [illegible] استقبال کیا گیا۔ دوسرے دن نکاح ہو گیا اور جب شور و غل میں کمی ہوئی تو بیگم شوکت نے سب کا تعارف ایک

دوسرے سے کروا دیا جس وقت انھوں نے دہلی کے نواب کی بیگم سے لکھنؤ کے ڈپٹی کمشنر کی بیگم اور لڑکیوں سے تعارف کروایا نسرین متعجب نگاہوں سے انھیں دیکھ رہی تھی گویا دریا میں موتی کی تلاش کی جا رہی تھی۔ اور وہ یکایک اپنی جگہ سے اٹھ کر "باجی" کہتی ہوئی ایک حسین لڑکی سے جا لپٹی۔ "ارے نسرین تم ——؟" کہتی ہوئی بڑی اور منجھلی باجی اور خالہ جان قریب آگئیں۔ اندر سے باہر تک شور سا مچ گیا۔ نسرین نے تمام واقعہ سنایا اور کہا کہ جس نیک ہستی نے مجھے بچایا اسی کی تقریبِ شادی میں آج ہم سب شریک ہیں!"

دوسرے روز شوکت صاحب نے اعلیٰ پیمانہ پر ٹی پارٹی دی۔ دل کھول کر خوشیاں منائی گئیں۔ پھر بیگم نیازی نے بیگم حمید کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دوسرے دن اپنے گھر جانے پر مدعو کیا۔ بیگم شوکت اور دیگر بیگمات کو نسرین کے بچپن کا اور والدین سے ملنے کا واقعہ سن کر بہت خوشی ہوئی اور سب نے بیگم نیازی کو مبارکباد دی اور رخصت ہو گیا۔ پھر بختی اپنی حسین بیگم خورشید کو ساتھ لیکر اپنی کوٹھی واپس آگیا —— اب وہ مینیجر نہیں بلکہ دو کمپنیوں کا تنہا مالک اور رئیس اعظم کا داماد تھا۔ وہ اکثر اپنے اس انقلاب زندگی پر سوچا کرتا ——!

سلطانہ بیگم حور

غزل

ہر بار نازِ حسن تو جلووں کو وا کرے — مانگو دعا کہ عشق بھی وعدہ وفا کرے

اس بے وفا کو رحم تو آتا ہے عشق پر — آخر غریب گرمیٔ انداز کیا کرے؟

تسخیرِ ہفت چرخ بھی کیا کچھ محال ہے — یہ شوقِ آرزو بھی کہیں اکتفا کرے؟

کتنے ہی دشت و در ابھی ہوتے ہیں لالہ زار — کچھ صبر بھی تو بلبلِ رنگیں نوا کرے

خوں نابہ بار اشک کی پرسش نہیں وہاں — یوں چاہے ہے رنگ و نور کا دریا بہا کرے

کیا صدمہ ہائے ہجر کی مر کر ملے گی داد؟ — یا جب کہ دل کی تیزِ خلش انتہا کرے

تنگ آگیا ہوں کثرتِ امید و بیم سے
اس کشمکش میں حشر چھپا ہو خدا کرے

حرماں خیرآبادی

قانون کی ابتداء

"ڈین پاؤنڈ" کے الفاظ میں قانون دراصل اس معاشرتی دباؤ یا سوشل کنٹرول کا نام ہے جو ایک منظم سیاسی معاشرے کے ذریعہ باقاعدہ طور پر عمل کرتا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو قانون کا دائرۂ عمل منظم قانونی تہدیدوں ہی سے عبارت ہے۔ جس معاشرے میں قانونی تہدیدیں نہیں ہوتیں وہاں افراد پر جو پابندیاں اور فرائض عائد ہوتے ہیں، وہ قانون کی نہیں، بلکہ رسم ورواج کی بناء پر ہوتے ہیں۔ اس لئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ سادہ معاشروں میں قانون نہیں ہوتا گو کم و بیش تمام معاشروں میں رسم ورواج کی پابندی ہوتی ہے اور ان کے پیچھے کچھ تہدیدیں بھی ہوتی ہیں۔

موجودہ زمانے کے قانون میں دیوانی اور فوجداری کا جو امتیاز کیا جاتا ہے، اسے قدیم ان پڑھ سماج کے مطالعہ میں پیش نظر رکھنا مشکل ہے۔ قدیم اور ابتدائی قانون کو دراصل عام جنایات اور خانگی یا خاص جنایات کے لحاظ سے دیکھنا چاہیئے۔ بات یہ ہے کہ کوئی فعل اس وقت عام جنایت سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ اس کی وجہ سے پوری قوم یا سماجی اقتدار کے دستوری نمائندوں کی جانب سے کوئی باقاعدہ اور منظم ضابطہ معین ہو جائے اور اسی ضابطہ کے ذریعہ قوم کے کسی فرد پر کوئی ذمہ داری یا وجوب عاید ہو سکے۔ اور اگر اس کی خلاف ورزی ہو تو قوم یا اس کے نمائندے خلاف ورزی کرنے والے کو سزا دے سکیں یہ ضابطہ جسے تعزیری تہدید کہا جا سکتا ہے، دراصل اس قوم کی طرف سے خاطی فرد کے خلاف ایک رد عمل کا نتیجہ ہے کیونکہ وہ ایک قوی اور معین اخلاقی جذبے کو ٹھیس لگاتا اور اسی طرح سماج کو دکھ پہنچاتا ہے۔ اس کا فوری اثر تو یہ ہوتا ہے کہ اجتماعی طور پر "اخلاقی غصہ" کے جذبات ظاہر ہوتے ہیں اور اس طرح سماج کے نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے۔ اور اس کا آخری اثر یہ ہوتا ہے کہ اس اخلاقی جذبے کو قوم کے تمام افراد کے دلوں میں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔

ما قبل تحریر زمانے کے معاشروں میں تعزیری تہدید کا کم پتہ چلتا ہے ابتدائی قسم کے سادہ معاشروں میں وہ نالشیں جو عام جنایات کے تحت آتی تھیں زیادہ تر عورت مرد کے نازیبا تعلقات پر مشتمل تھیں۔ سحر یا سفلی جادو، قبائلی رسوم کا مسلسل توڑا جانا، اور متبرک اور پاک چیزوں کی چوری اور اسی طرح کے بعض افعال قابل سزا سمجھے جاتے تھے لیکن غور کیا جائے تو تعزیری تہدیدیں صرف اسی صورتوں کے لئے یعنی جبکہ عام متبرک رسم کے خلاف کوئی حرکت کی جائے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ تہدید کو بھی مذہبی یا اخلاقی تقدس حاصل رہے۔ مذہبی یا رسمی تہدید کی ابتداء غالباً اس طرح ہوئی کہ بعض افعال کی وجہ سے کسی فرد یا جماعت کو مذہبی یا ذہنی طور پر ناپاک اور اچھوت قرار دیا جاتا اور اس ناپاکی کو دور کرنے کے لیے پراشچت کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ تصور یہ ہے کہ کسی فرد کے فعل قبیح سے پوری قوم متاثر ہو جاتی ہے بعد میں جب سیاسی یا حاکمانہ اقتدار کسی شخص یا جماعت کو حاصل ہو گیا، گو وہ سادہ شکل ہی میں ہی تو اس کے اقتدار سے انحراف یا اس کے احکام کی خلاف ورزی بھی عام جنایت ہو گئی۔ اور اگر اس مقتدر ہستی کی ذات کے خلاف کوئی فعل ہو تو اس کے لیئے بھی تعزیری تہدید تھی۔ نیز ایسا فعل بھی جو عموماً خانگی جنایت کی حد تک پہنچتا تھا، اس سردار کے خلاف کئے جانے پر عام جنایت تصور کیا جانے لگا۔

خانگی یا خاص جنایات کی صورت میں جب کوئی فرد یا جماعت کسی ضرر نقصان یا ہرجے سے متاثر ہوتی ہے اور اس کے جائز حقوق پر ضرب لگتی ہے تو وہ عدلیہ کی مقتدر ہستی کے روبرو چارۂ کار کے لیئے درخواست کرتی ہے۔ یہ مقتدر ہستی اسی قوم کے کسی دوسرے فرد یا جماعت کو مورد الزام ٹھیرائی اور حکم دیتی ہے کہ مدعی علیہ مدعی کے نقصان کی خاطر خواہ تلافی کرے۔ اور یہ تلافی اکثر و بیشتر تاوان یا ہرجے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، خانگی جنایت ایک ایسا فعل ہے جس کے لئے "بازدہی" یا "بھراؤ" (Restitution)

کی تہدید ہوتی ہے۔ اور اسی لئے ماقبل تحریر زمانے کے خانگی جنایات کے قانون کو موجودہ قانون ملک یا سیول لا کے مماثل سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن ان دونوں میں دراصل اہم فرق بھی ہے۔ موجودہ قانون کے لحاظ سے سیول لا کے تحت صرف ایسے ہی افعال آسکتے ہیں جن کے لئے ہرجانہ دیا جائے البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان افعال کو پوری قوم کے خلاف نہیں سمجھا جاتا۔

گو دیوانی یا سیول قسم کی تہدیدوں سے مدعی علیہ ہرجانہ ادا کرتا" اور رقمی لحاظ سے نقصان اٹھاتا ہے تاہم اس کے لئے یہ تادیبی سزا نہیں ہوتی۔ موجودہ سیول لا میں بھی خاص صورتوں میں حاکم عدالت تادیبی سزا میں دے سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ جو مضرت پہنچائی گئی وہ پوری قوم کے خیال میں عظیم ہونی چاہیے۔ موجودہ قانون میں جب کوئی فعل اخلاق کے خلاف سرزد ہو" اور ساتھ ساتھ مضرت بھی پہنچے تو ایسے فعل کے خلاف دیوانی اور فوجداری دونوں قسم کے چارۂ کار ہیں۔ چوری یا قتل کے لئے جو سزا دی جاتی ہے اس میں زیادہ زور اس چیز پر دیا جاتا ہے کہ وہ پوری قوم کے خلاف ایک جرم ہے۔ نہ اس پر کہ اس فعل کی وجہ سے جن اشخاص کو تکلیف یا مضرت پہنچی ان کو اس کا بدل دیا جائے۔

ماقبل تحریر زمانے کے معاشروں میں خانگی یا خاص جنایات عام طور پر چار یا پانچ چیزوں پر مشتمل تھے۔ جان سے مارنا، زخمی کرنا، چوری، زنا، قرضہ ادا نہ کرنا۔ ان افعال کے متعلق ایک تصور یہ ہے کہ یہ قوم کے کسی فرد کے خلاف سرزد ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی دوسرا تصور یہ ہے کہ یہ خلاف معاشرہ افعال بھی سمجھے جاتے ہیں جو اخلاق عامہ کو ٹھیس لگاتے ہیں۔ ایسے افعال کے خلاف بازدہی اور دباؤ دونوں تہدیدیں ہوتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ایک طرف تو متضرر کے نقصان کی تلافی کا خیال ہوتا ہے اور دوسری طرف اس شخص کی سزا کا جس نے ضرر پہنچایا۔ مثال کے طور پر بعض افریقی قبیلوں میں یہ رواج ہے کہ جب کوئی شخص دوسرے کا مال چرائے تو مسروقہ شئے کی دوگنی قیمت مالک کو واپس کرنی پڑتی ہے۔ اگر سوتے

دیکھا جائے تو خانگی جنایات کا قانون دراصل ایک ضابطہ ہے جس کے ذریعہ معاشرہ یا قوم کے اندرونی جھگڑوں سے پیدا ہونے والے "معاشرتی مرض" (dysphoria) کا علاج کیا جاتا ہے۔ ایک فرقے کے کسی فرد نے دوسرے فرد کے خلاف کوئی فعل کیا ہو اور اس سے اس دوسرے فرد کو محسوس ہو کر اسے مضرت پہنچی تو اس سے عام معاشری زندگی میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جب تک متضرر کے نقصان کی تلافی نہ کی جائے، یہ دور نہیں ہوتا۔ اسی لئے افریقہ کے مقامی قانون کے لحاظ سے جب تک حاکم عدالت تمام متعلقہ فریقوں کی تشفی نہ کرے اس وقت تک اس کا فیصلہ خلاف انصاف سمجھا جاتا ہے۔

بہرحال عام جنایات اور خانگی یا خاص جنایات کے فرق سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ قانون کی ابتدا ایک نقطے سے نہیں ہوئی۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فعل جو قوم کے کسی فرد کے خلاف عمل میں آئے اور جس کی وجہ سے قوم کا اخلاقی جذبہ متاثر ہو، اس کے پیچھے تین تہدیدیں ہوتی ہیں۔ عام یا اخلاقی تہدید جس کی وجہ سے قوم خاطی کی ہر طرح مخالفت کرتی ہے اور اسے خطاوار سمجھتی ہے۔ دوسرے رسمی یا مذہبی تہدید جس کی وجہ سے خاطی کے اندر مذہبی ناپاکی یا اچھوت پن کی ایک ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ خود اس کے لئے" اور پھر ان سب کے لئے جن سے اس کا تعلق رہتا ہے، بڑا خطرہ رہتا ہے۔ ایسی صورت میں رسم کے مطابق مذہبی طریقوں سے اس کو پاک کیا جاتا ہے۔ یعنی پاپ کا پراشچت ہوتا ہے۔ اگر یہ کفارہ ادا نہ ہو تو خیال یہ ہوتا ہے کہ اس گناہ کی وجہ سے وہ بیمار ہو جائے گا یا مر جائے گا۔ تیسرے تعزیری تہدید ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قوم بعض اشخاص کے ذریعہ جن کو وہ عدلیانہ اختیار عطا کرتی ہے، خطاکار کو سزا دیتی ہے اور اس سزا کو یا تو اس فعل ناجائز کے خلاف عام اور اجتماعی طور پر اخلاقی غصہ کا مظہر سمجھا جاتا ہے یا اس مذہبی یا تخیلی پاپ کو رد کرنے یا اسے دور کرنے کا ایک ذریعہ۔ یا پھر دونوں۔

اس کے خلاف اگر کسی فعل کا اثر یہ ہو کہ کسی شخص یا مجموعہ

اشخاص کے حقوق متاثر ہوں، تو متضرر مواخذہ یا جزا کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور جب رسم بھی ایسے مواخذہ اور بدلنے کو جائز تصور کرے اور اس کے لئے چارۂ کار بھی مہیا کرے تو ظاہر ہے کہ مواخذہ بھی تہدید کا اثر رکھے گا۔ ما قبل تحریر معاشرے میں جنگ کے لئے ہی ایسی تہدید تھی چنانچہ بعض قوموں میں جنگ کو ہی مواخذہ سمجھا جاتا تھا جسے ایک فریق دوسرے خاطی فریق کے خلاف اختیار کرتا ہے۔ اس کے لئے چند رسوم بھی ضابطے کے طور پر رائج تھے جو موجودہ قانون بین اقوام سے مشابہ ہیں۔ چنانچہ آسٹریلیا کے بعض قبیلوں میں جنگ کے متعلق آج تک یہی تصور ہے۔ باضابطہ اور منظم طور پر بدلہ لینے کا طریقہ بھی اسی "مواخذہ" کی تہدید کی ایک مثال ہے۔ اگر کوئی آدمی جان سے مارا جائے خواہ وہ ارادی طور پر ہو یا حادثۃً ہو، تو اس سے اس کے خاندان، قبیلے یا فرقے کو جو مضرت پہنچی ہے اس کی تلافی ضروری ہے۔ یہ متضرر گروہ کا حق سمجھا جاتا ہے کہ "بدلہ" لے بلکہ اکثر و بیشتر تو یہ اس کا فرض ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ مواخذہ کو رسم کی طرف سے جواز ملتا تھا۔ بعد میں (Lex Talionis) "قانون مواخذہ" کے لحاظ سے یہ اصول بن گیا کہ جس قدر مضرت پہنچائی جاتی ہے اس کی پوری تلافی ہونی چاہیے اور اجتماعی ذمہ داری کے اصول کے لحاظ سے تو بدلہ لینے والوں کے لئے یہ بھی کافی ہو گیا کہ خود قاتل کی بجائے کسی اور کو قتل کر دیں مثلاً اس کے بھائی کو یا بعض صورتوں میں قبیلے کے کسی فرد کو۔ جب "بدلہ" کا یہ ادارہ بہت منظم ہو گیا تو ایک قاتل گروہ اپنے کسی فرد کی موت کو بدلے میں گوارا کرنے لگا۔ لیکن اس کے بعد بھی "مواخذہ" کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مواخذہ کی تہدید اس صورت میں بھی استعمال ہوتی ہے جبکہ ایک شخص دوسرے کو کوئی مضرت پہنچاتا ہے چنانچہ [illegible] جبکہ [illegible] کو حق پڑتا ہے کہ کسی دوسرے کو دو دل لڑنے کی دعوت دیتا ہے۔ آسٹریلیا کے قبیلوں میں جب کوئی فرد [illegible] تو متضرر کا حق

ہے کہ بزرگوں کی اجازت کے بعد ضرر پہنچانے والے سے مماثل قسم کا بدلہ لے لے۔ مثلاً اس پر برچھی یا بھالا پھینک دے یا جسم کے ایسے حصہ پر جو جان لیوا نہ ہو، مثلاً ران پر برچھی چبھو دے۔ مواخذہ کی تہدید کی تمام مثالوں میں رسم کا ایک ضابطہ معلوم ہوتا ہے کہ متضرر کے نقصان کی تلافی کی جائے اور اس کے لئے عام طور پر ضرر رساں شخص کو مماثل قسم کا ضرر پہنچایا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حق پر حملہ ہو تو اس کی تلافی کی جاتی ہے اور متضرر شخص کے ذہن سے یہ بات نکال دی جاتی ہے کہ اسے ضرر پہنچایا یا یہ کہ اسے بدلہ لینا ہے۔ بہت سے معاشروں میں مواخذہ کی بجائے تاوان کی قرارداد کا بھی ایک طریقہ کار ملتا ہے یعنی ضرر پہنچانے والے اشخاص متضرر فریق کو چند قیمتی اشیاء دے دیتے اور اس کو نقصان کی حد تک مطمئن کر دیتے ہیں۔ اس طریقہ پر متضرر کی اطمینان دہانی ما قبل تحریر معاشروں میں کافی رائج معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان سے آج تک کوئی نظام قانون نمو نہ پا سکا۔

قانون کی ابتدا اور اس کے ارتقا کو سمجھنے کے لئے ان قدیم قبیلوں کا مطالعہ بہت دلچسپ اور مفید ہو سکتا ہے جو آج بھی اپنی قدیم روایتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ مثال کے طور پر شمالی کیلیفورنیا کے بعض شکاری قبیلے جو "یورک" کے نام مشہور ہیں اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ یہ چھوٹے دیہاتوں میں بستے ہیں اور ان کی کوئی سیاسی تنظیم نہیں۔ قوم کے خلاف کوئی فعل یا جرم سرزد ہو جائے تو اس کے لئے ان کے ہاں کوئی ضابطہ مقرر نہیں اور اسی لئے ان کے ہاں عام جنایات کا کوئی قانون موجود نہیں ہے۔ اگر ایک دوسرے کو مضرت پہنچائے یا ایک شخص [illegible] تاوان کی قرارداد [illegible] کی جاتی ہے۔ اگر کسی شخص کو [illegible] یا مقتول کے قریبی رشتہ دار [illegible] ہوتا ہے۔ اگر [illegible] تو جنگ [illegible]

فریق کے مقتول لوگوں کا خون بہا ادا کرے۔ صرف امر واقعہ اور
ہرجانہ کی تقرری دیکھی جاتی ہے اور نیت، ارادے، کینہ، غفلت
یا حادثہ پر غور نہیں ہوتا۔ اگر ایک مرتبہ تاوان قبول کر لیا جائے
تو متضرر شخص اسی ضرر کی بابت مزید شکایت کا مجاز نہیں۔
چونکہ "تاوان" متعلقہ اشخاص کے مابین مصالحت کی بناء
پر طے ہوتے ہیں اور کسی عدلیہ کے حاکم کے پاس معاملہ نہیں
جاتا اس لئے یہاں صحیح معنوں میں خانگی جنایات کا وجود
نہیں۔ ٹھیک اسی طرح فلپائن کے بعض قبیلوں کی حالت بھی
بڑی دلچسپ ہے۔ شمالی لوزان (Luzon)
کے پہاڑی علاقوں میں اناج بونے والے لوگ جن کو "افوگاؤ"
کے نام سے یاد کیا جاتا ہے سیاسی لحاظ سے پست قوم ہیں اور
ان میں خاندانوں یا قبیلوں کا بھی کوئی نظام نہیں۔ اس کا
اثر یہ ہے کہ مضرتوں کی صورت میں معاشرہ کوئی سزا تجویز
نہیں کرتا بلکہ رائے عامہ ہی سزا کا کام کرتی ہے۔ دوسرے
الفاظ میں ان کے ہاں عام جنایات کا کوئی قانون نہیں
پایا جاتا۔ اور کوئی حقیقی تعزیری تہدید بھی موجود نہیں۔ تاہم
بعض اصول قابل ذکر ضرور ملتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص اپنے
خاندان کے کسی فرد پر جادو کر دے تو اسے خاندان والے
موت کی سزا دیتے ہیں۔ لیکن بھائی بہن سے فعل بد کا مرتکب
ہو تو یہ کوئی جرم نہیں سمجھا جاتا۔ پدر کشی یا برادر کشی کی صورت
میں بھی کوئی سزا نہیں دی جاتی گو ممکن ہے کہ ان افعال
کی روک تھام کے لئے اہم مذہبی تہدیدیں موجود ہوں۔ اگر
ایک شخص دوسرے پر حملہ کر دے یا ایک دوسرے کے حق کو
متاثر کرے تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دونوں افراد کے خاندان
ایک دوسرے کے حق کو متاثر کرے تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ
دونوں افراد کے خاندان ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑے
ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں ماں اور باپ دونوں طرف کے
تین درجوں تک کے رشتہ دار تو لازمی طور پر فریق بن جاتے
ہیں۔ قتل، زنا، قصداً تاوان کی ادائی وغیرہ کی صورت
میں مواخذہ یہی ہے کہ خاطی یا اس کے خاندان کے کسی فرد کو
موت کے گھاٹ اتارا جائے۔ دوسرے افعال کے لئے تاوان
کی ادائی کافی سمجھی جاتی ہے۔ ان قبیلوں میں عدلیہ کی کوئی
ایسی ہستی موجود نہیں جس کے روبرو نزاعات لائے جا سکیں۔
عام طور پر تصفیے ایسے بزرگ کے ذریعہ ہوتے ہیں جس کو متعلقہ
فریقین سے کوئی تعلق نہ ہو۔ بعض اشخاص اپنی دیانت داری
اور غیر جانب داری کے باعث شہرت بھی رکھتے ہیں اور ان
ہی کے پاس بہت سی نزاعات فیصلے کے لئے آتی ہیں لیکن
یہ اشخاص کسی طرح مقتدر نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ پوری
قوم کی کسی طرح نمائندگی کرتے ہیں۔ تنازعہ کے دوران میں
دونوں فریق ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے مخالف تصور
کئے جاتے ہیں لیکن جب باعث نزاع دور ہو جائے یا
باہمی تصفیہ ہو جائے تو پھر صلح ایک خاص رسم کے ساتھ
ہوتی ہے۔ تصفیوں کے لئے رسم و رواج ہی کوئی معیار مقرر
کرتا ہے۔ اور خاص صورتوں میں تو اشخاص کی حیثیت
کے لحاظ سے یہ معیار بدلتا بھی رہتا ہے۔ مثلاً مالدار کے لئے
ایک، اوسط طبقہ کے لئے ایک اور غریب کے لئے ایک ہی
افوگاؤ کی عدل گستری نظام کا رہے اس سے کوئی نظم
قانون ترتیب نہ پا سکا کیونکہ کسی عدلیانہ اقتدار کا وجود
ہی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ جب مسلمہ ثالث یا حاکم عدالت
موجود ہوں اور وہ شہادت کی جانچ پڑتال کے بعد جرمانہ
یا ہرجانہ کی بابت فیصلہ کریں تو اس سے ایک نظام قانون
کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ البتہ ایسی صورت میں صرف
اس عاملانہ اقتدار کی کمی ہوتی ہے جو ان فیصلوں کی پابندی
کروا سکے۔ اگر غور کیا جائے تو بعض معاشروں میں خانگی
یا خاص جنایات کے تصفیوں کے ذریعہ ہی کوئی نظام قانون
نشوونما پاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں تصفیے ثالثوں کے
سامنے آتے ہیں اور ثالث رسم کے بنائے ہوئے قواعد
عمل کا اعلان کرتے ہیں اور پیش شدہ معاملہ پر اس کو
منطبق کرتے ہیں۔ ثالثوں کی یہی عدالتیں رفتہ رفتہ
باقاعدہ قانونی عدالتیں بن جاتی ہیں اور پھر معاشرے

میں ایک خاص ضابطہ بھی نو پا جاتا ہے جس کے ذریعہ فیصلوں کی تعمیل کروائی جاتی ہے۔

مشرقی افریقہ کے بعض قبیلوں کا بھی مطالعہ کیا جائے تو قانون کا نشو و نما اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اکمبا، گکویا، نخرو کا اور باتو لوگوں کے علاوہ آمذ جو موئنٹ کنیا کے جنوب اور جنوب مشرق میں رہتے ہیں اس سلسلے میں دلچسپ ہیں۔ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں، مویشی اور بکریاں پالتے اور اناج بوتے ہیں۔ ان میں کوئی سردار یا بزرگ خاندان نہیں ہوتا اور یہ لوگ عمر کے لحاظ سے مختلف طبقوں میں منقسم ہیں۔ ان میں ایک طبقہ معمر اور بزرگ لوگوں پر بھی مشتمل ہے جو مذہبی پیشوائی اور عدلیہ دونوں کے فرائض انجام دیتا ہے۔ جب کسی شخص کو یہ باور کرنے کی وجہ ہو کہ کسی دوسرے نے اسے کسی قسم کی مضرت پہنچائی ہے یا اس کے حقوق متاثر ہوئے ہیں تو ضرر پہنچانے والے اور متضرر دونوں فریقوں کی طرف سے ان کے دیہات یا ضلع کے جہاں وہ رہتے ہیں، تمام بزرگ بلوائے جاتے ہیں اور اس طرح اس عدالت کے روبرو معاملہ پیش ہوتا ہے۔ یہ عدالت ابتدا میں تو صرف ثالثی کے طور پر کام کرتی ہے اور عام رسم کے قائم کردہ اصول انصاف کے مطابق تصفیہ کرتی ہے اور تصفیہ کے بعد اپنے فیصلہ کی تعمیل کروائے بغیر معاملہ کو خود متضرر فریق کے سپرد کرتی ہے کہ وہ خود اپنے حریف سے نمٹ لے۔ البتہ بعض خاص اور سنگین معاملوں میں جب کہ کسی حملہ یا فعل سے پورا فرقہ یا قوم متاثر ہوتی ہے، یا جب کہ ملزم کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ عادی مجرم ہے، یا یہ کہ قوم کے لیئے اس کا وجود خطرناک ہے اور اس طرح اس ایک فرد کے فعل کو پوری قوم کے خلاف سمجھا جاسکتا ہے تو پھر بزرگوں کی یہ جماعت عاملانہ اقتدار استعمال کرتی اور خود اپنے فیصلے کی تعمیل کرواتی ہے۔ یہ بزرگ دراصل اپنے مذہبی اقتدار سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص ان کے فیصلے کو ماننے سے انکار کرے تو اس پر لعنت یا پھٹکار بھیجتے ہیں جس سے ان کے عقیدے کے مطابق مافوق فطری سزا اتر آتی ہے۔ ایک خاندان کے کسی فرد کو دوسرے خاندان کا کوئی فرد جان سے مار دے، خواہ ارادی طور پر یا حادثے میں، تو "بزرگوں کی عدالت" اس فعل کو خانگی یا خاص جنایت سمجھتی ہے اور مقتول کے رشتہ داروں کو تاوان دے کر مطمئن کرتی ہے اور یہ تاوان قاتل یا اس کے رشتہداروں سے دلوایا جاتا ہے۔ عام جنایات سے متعلق بھی ان بزرگوں کو ایک ضابطہ کے تحت اختیارات ہوتے ہیں جسے کنگال یا مونگ (Kingolle or M……ge) کہا جاتا ہے۔ اگر کسی شخص پر جادو کا الزام ہو، یا وہ عادی مجرم ہو اور اس طرح اس کا وجود عوام کے لئے خطرناک ہو، تو بزرگوں کو اختیار ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو موت کی سزا دیں یا اس کے گھر بار کو تباہ کرکے اسے اپنے ضلع سے باہر کردیں۔ لیکن ایسی سخت سزا سے پہلے یہ ضروری ہوتا ہے کہ دور دور کے تمام بزرگ اکٹھے ہوکر اس کا فیصلہ کریں۔ نیز خاطی کے اہل خاندان کا بھی اس پر رضامند ہونا ضروری ہے۔

اکمبا لوگوں کے برخلاف مغربی افریقہ کے اشانتی فرقہ میں عام جنایات کا ایک منظم قانون ملتا ہے جو مقامی زبان میں ایک خاص لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کے معنی ہیں "امور جو قبیلے میں نفرت سے دیکھے جاتے ہیں"۔ ان میں یہ چیزیں شامل ہیں۔ یعنی قتل، خودکشی، نسلی یا ازدواجی رشتوں میں بعض جنسی تعلقات، خاص قسم کی گالی گفتار، جان پر حملہ، چوری، کسی سردار پر پھٹکار بھیجنا، بغاوت، بزدلی، جادوگری، مسلمہ قبائلی رسم و رواج کی خلاف ورزی اور مرکزی اقتدار کے حکم کی خلاف ورزی۔ اشانتی تصور قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ تمام افعال دراصل مقدس یا مافوق فطری طاقتوں کے خلاف سرزد ہوتے ہیں، اور ان ہی طاقتوں پر پوری قوم کی بقا ہے اور جب تک ان ناجائز افعال کو خاطی کی سزا کے ذریعہ روکا نہ جائے، پورا قبیلہ مبتلائے آلام رہے گا۔ عدلیانہ اقتدار کے متعلق تصور یہ ہے کہ یہ بادشاہ یا سردار کو حاصل ہوتا ہے جو

ایک مقدس تخت یا چوکی پر انصاف کرنے بیٹھتا ہے۔ اسی کے سامنے خاطی کو سزا سنائی جاتی ہے۔ زیادہ سنگین افعال کی صورت میں سر کاٹنا ہی ایک سزا ہے گو بعض صورتوں میں خاطی اور اس کے رشتہ دار خاطی کا "سر خرید سکتے ہیں"، دوسرے الفاظ میں ہرجانہ یا نقصان ادا کر کے اس کی جان بچائی جاتی ہے۔ بزرگوں کی عدالتیں خانگی یا خاص جنایات کی صورت میں کوئی اقتدار استعمال نہیں کرتیں بلکہ یہ گھریلو نزاعات "ہیں جن کے تصفیئے یا تو خاندان کے صدر کرتے ہیں یا آپس کے سمجھوتے سے نزاع ختم کی جاتی ہے۔ خانگی جنایات سے متعلق بھی کوئی نزاع سردار کے سامنے لائی جا سکتی ہے۔ مثلاً کسی متعلقہ فریق نے قسم اٹھائی ہو تو وہ عام جنایات میں داخل ہے اور اسی لئے سردار کے روبرو یہ معاملہ پیش کیا جاتا ہے۔

بہر حال ان قبیلوں کے مطالعہ سے بعض کام کی باتیں ضرور معلوم ہو جاتی ہیں۔ اگر کمبا کے بزرگ خانگی جنایات سے تعلق رکھتے ہیں تو اشانتی کے سردار عام جنایات کی صورت میں اپنا اقتدار استعمال کرتے ہیں۔ افریقہ اور دوسرے ملکوں میں بعض قبیلے اور فرقے ایسے بھی بستے ہیں جن کے سردار یا بادشاہ ان دونوں قسم کے قوانین پر اقتدار رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مرکزی اقتدار خانگی اور عام جنایات دونوں پر قابو رکھتا ہے۔ ان مختلف فرقوں میں ضابطہ کے لحاظ سے فرق بھی کیا جا سکتا ہے۔ خانگی جنایات کے قانون میں اشخاص یا اشخاص کے گروہوں کے مابین تنازعوں کی صورت میں قانون عدالت کے روبرو معاملہ لایا جاتا ہے۔ عام جنایات کے قانون کے لحاظ سے خود مرکزی اقتدار کی جانب سے اقدام ہوتا ہے اور خود اپنی طرف سے مرکز کی مقتدر ہستی ملزم کے خلاف چارہ کار اختیار کرتی ہے۔ راست طور پر موجودہ تعزیری اور دیوانی قانون، علی الترتیب عام جنایات اور خانگی جنایات کے قوانین سے ماخوذ ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ جو افعال آج عام جنایات کے تحت آتے ہیں، جیسے قتل، یا چوری، یہی افعال بہت سے ماقبل تحریر معاشروں میں خانگی جنایات کے تحت آتے تھے۔ اور ٹھیک اسی طرح وہ افعال جو ان معاشروں میں عام جنایات تھے ان میں جادوگری اور بدکاری اور متبرک چیزوں کی چوری بھی شامل تھی۔

اپنی ابتدائی منزلوں میں قانون دراصل سحر یا جادو اور مذہب کا دوسرا نام تھا اور قانونی تہدیدیں دراصل مذہبی تہدیدیں تھیں۔ اسی لئے سادہ معاشروں میں قانون کی ابتدا کو سمجھنے کے لئے معاشری تہدیدوں کے تمام نظاموں کا متقابلہ مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

اس مضمون کی تیاری میں ذیل کی کتابوں سے مدد لی گئی ہے:-

(۱) ایمیل درک ہائیم:- دولا دیژن دو ترا وئیل سوشل (پیرس سنہ ۱۸۹۳ء)
(۲) البرٹ کوکورک اور دیگر:- ایوولیوشن آف لا - ۳ جلد (بوسٹن سنہ ۱۹۱۵ء - ۱۹۱۸ء)
(۳) سڈنی ہارٹ لینڈ:- پری مٹیو لا (لندن سنہ ۱۹۲۴ء)
(۴) مالی نوو سکی:- کرائم اینڈ کسٹم ان سیویج سوسائٹی (نیویارک سنہ ۱۹۲۶ء)
(۵) جیرالڈ وہیلر:- دی ٹرائب اینڈ انٹر ٹرائبل ریلیشنز ان آسٹریلیا (لندن سنہ ۱۹۱۰ء)
(۶) ہابلی:- بانٹو بلیفز اینڈ میجک (لندن سنہ ۱۹۲۲ء) سنہ ۱۹۲۹ء
(۷) راٹ ٹرے:- اشانتی لا اینڈ کانسٹی ٹیوشن (آکسفورڈ)
(۸) ایل مارڈے:- افریکن ریسس (لندن سنہ ۱۹۳۰ء)

عبدالحفیظ صدیقی

میٹھے ٹھگ

کروی جنھوں نے ظاہرانیوں سے بے نیازی وہ بھی جتا رہے ہیں اب اپنی پاک بازی
عصرِ جدید کیا ہے؟ عہدِ ریا طرازی ہے فن کی حیثیت سے رائج زمانہ سازی
اُن دہریوں سے کرتا کیونکر نہ میں کنارا
مہر و وفا کی رسمیں ہیں جن کو ناگوارا

داتا۔ شریف داتا۔ کہتے چلے ہیں جھٹ پٹ آقا۔ عزیز آقا۔ ہر آن ہے یہی رٹ
کیوں کھیلتی نہ ان کے چہروں پہ مسکراہٹ ہے جلبِ منفعت کا راز ان کی ہر بناوٹ
دیوانی ہے انھیں زر ان کی زمانہ سازی
ہیں خوگر خوشامد مصروفِ دل نوازی

ظالم دکھا رہے ہیں اس شان کا تحمّل غیظ و غضب سے گویا ناآشنا ہیں بالکل
بیجا خوشامدوں سے دیتے نہیں کسے جُل جُل دے کے ڈھونڈھتے ہیں یہ حلقۂ گل و مُل
سامانِ عیش و عشرت کرتے ہیں یوں فراہم
طومار باندھتے ہیں کذب و ریا کا باہم

بے سود پیش کرتے کیوں شکل اعتراضی مفتی ہے ان کے بس میں ان کے اثر میں قاضی
حال ان سے بن رہا ہے ہیتو کا عہدِ ماضی ہر شخص کو یہ میٹھے ٹھگ کر رہے ہیں راضی
غمخوار بن کے جن کو دیتے رہے دلاسے
بیتے ہیں جان اسی کی عبرت فزا ادا سے

علی منظور

کالج کی لاری

ذکیہ کالج کی لاری کا انتظار کرتی ہوئی پارک میں ٹہل رہی تھی۔ ہم بھی اسی طرف نکل پڑے۔ ہم کو دیکھتے ہی ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ہم ان کے قریب پہنچے۔ ذکیہ ادھر دیکھو۔ ہماری طرف ——— ان کا چہرہ اور بھی سرخ ہو گیا۔ تیز لہجہ میں انھوں نے کہا ——— ہم آپ سے ناراض ہیں۔ سخت ناراض۔ آپ کی حرکت ہمیں پسند نہیں۔ کیوں آپ نے ہماری سہیلیوں کو چھپ چھپ کر دیکھا؟ ۔ اوہو اتنی سی بات۔ خوب اتنی سی بات انھوں نے طنز کی۔ ہم ہنس پڑے۔ توبہ توبہ ہم سے بڑی بھول ہوئی۔ خدا بچائے ان لڑکیوں سے، انھیں دیکھ کر میری آنکھیں دکھنے لگیں ——— مس فربہ، انھیں دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہاتھی جھوم رہا ہے۔ مس فیشن! وہ تو سوسائٹی کا عجیب نمونہ تھی۔ ان کے وہ ترشے ہوئے بال، تھپا ہوا پوڈر، چنٹ سکے ہوئے ناخن، ان کا لنگڑا کر چلنا، بات بات پر قہقہے، ہر قہقہہ پر بل کھانا۔ انھیں دیکھ کر مجھے ہول ہونے لگی ——— بس کیجئے۔ اب میں نہیں سن سکتی ——— بیزاری کے لہجہ میں انھوں نے کہا۔

ارے صاحب اور سنیئے، وہ آپ کی مس فلسفہ! ان کی وہ دھنسی ہوئی آنکھیں لمبوترا چہرہ، چڑھی ہوئی عینک پچکے ہوئے گال، بغل میں موٹی موٹی کتابیں، مطالعہ کا غیر معمولی شوق۔ اف بچاری خدا جانے وہ زندہ کیسے ہے۔ ارے وہ آپ کی مس شاعرہ! انھیں تو میں بھول ہی گیا مجھے وہ تو کوئی سٹھیائے ہوئے شاعر کی نانی، دادی جیسی معلوم ہوتی ہیں۔ نہ کپڑوں کا سلیقہ اور نہ اٹھنے بیٹھنے کا تمیز ——— غیر شاعرانہ انداز، کرخت آواز۔ بے ڈھب لہجہ، غیر قافیہ کلام، بے معنی، فضول ان کا اکڑا اکڑا کا پڑھنا۔ واہ واہ پر جھومنا ——— میں نے تو اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں۔ میرا سر چکرانے لگا۔ سچ کہتا ہوں ذکیہ تمھاری سہیلیوں کو دیکھ کر بجائے مسرت کے سخت تکلیف ہوئی۔

بس کیجئے، میں اپنی سہیلیوں کی توہین برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ ہیں کون ان کی برائیاں گنانے والے۔ کبھی اپنے دوستوں پر بھی غور کیا ہے ——— مجنون نما لڑکے۔ سکڑے ہوئے بدن، پھٹے ہوئے لباس۔ لڑکیوں جیسے بال، اترے ہوئے چہرے، پتلی پتلی گردنیں۔ دھنسی ہوئی آنکھیں۔ ہونٹوں میں سگریٹ۔ زبان پر ہر وقت لڑکیوں کے تذکرے ——— ہم نے قہقہہ لگایا۔

ثریا ادھر آ نکلی ——— کیا ہو رہا ہے۔ آپا کیا گاڑی ابھی تک نہیں آئی ——— دیکھا ثریا یہ میری سہیلیوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ ان کی برائیاں گناتے ہیں۔ ثریا ہنس پڑی۔ بھائی صاحب بتایئے تو صحیح، ان میں سے آپ نے کونسی لڑکی پسند کی ——— ہم بتائیں ——— ہم نے نہایت مسرت سے کہا۔ وہ لڑکی جس کی انگلی میں انگوٹھی ہے ——— ذکیہ شرما گئی۔ ثریا، ذکیہ کو گدگدانے لگی ——— لاری کی کرخت آواز سنائی دی۔ دونوں آواز کی طرف دوڑ گئیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری ساری خوشیاں ان کے ساتھ چلی گئیں، میں لاری کو دیکھتا رہا۔

سید محی الدین احمد

ایک شام

دور ــــــ کہیں دور سے مغرب کی اذاں رات کی آمد کی خبر دے رہی تھی۔ خاموش فضا میں اس دلفریب آواز کو سن کر درخت گویا جھوم اٹھے اور اپنا سر اس مالکِ حقیقی کے سامنے جھکا دیا تھا۔ میں بھی قدرت کی یہ معبودیت دیکھ کر سجدہ ریز ہو گئی۔

مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر میں اوپر بالاخانے پر چلی آئی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی...... ایک حسین خاموشی میں بھی کتنی دلفریبیاں پوشیدہ ہوتی ہیں...... !! اسی خاموشی کی بدولت ہر چیز آج دوگنی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ پارک کی طرف سے ایک مدھم موسیقی کی لہر اس خاموشی کو چھیڑتی مگر اس کے حسن کو دوبالا کرتی گزری.... شائد کسی نے ریڈیو لگایا تھا۔ شام کے وقت قدرت کتنی حسین اور معصوم ہوتی ہے...... غم، رنج، موت، بے کسی، مایوسی، آنسو، مسکراہٹ۔ ہر ایک سے بے نیاز قدرت ہمیشہ حسین رہتی ہے۔ وہاں دور تاریل کے اونچے اونچے درخت، موسیقی کی لے کے ساتھ جھومتے ہوئے کتنے دلکش معلوم ہوتے ہیں اور ابھی شائد پندرہ دن بھی نہیں گزرے جبکہ ہاں ! وہیں تو آگ کے شعلے بلند تھے...... اُف..... ! وہ خون آشام شعلے ! جنہوں نے گویا عہد کر لیا تھا کہ جبتک ہر چیز کو جلا کر بھسم نہ کر دیں گے، چین نہ لیں گے...... یا اللہ وہ دن جبکہ قدرت کو اپنے پورے قہر و غضب کی حالت میں ہم نے دیکھا تھا اور اس کے سامنے کتنی ہی خوبصورت اور عالی شان عمارتوں نے سر جھکا دیا تھا...... آج بھی وہ منظر یاد آ گیا تو روح لرز گئی...... کتنا دل ہلا دینے والا نظارہ تھا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی تمام عمر کی پونجی جل رہی تھی۔ خاک ہو رہی تھی اور غریب لوگ چیخنے چلانے کے سوا کچھ کر نہیں سکتے تھے..... اور اس ہیبت ناک ڈرامے کو دیکھنے کی خاطر ہمارے سبھی ہمسائے اسی بالاخانے پر تو جمع ہو گئے تھے۔ سائنس بھی جس پر کمزور انسانوں کو بہت ناز ہے تھوڑی دیر کے لئے ہمت ہار گئی تھی۔ پہلے ایک پھر دو، تین...... پورے سات مشین ایک ساتھ کام کر رہے تھے اور آگ کے شعلوں کو یہ انجنوں کا پانی گویا سمندِ ناز پر تازیانہ تھا...... اور آج کتنی خاموشی چھائی ہوئی ہے...... لیکن اس قیامت خیز دن وہ ہنگامہ جبکہ ستون آگ کی تاب نہ لا کر دھماکے سے گرتے تھے اور اس دھماکے سے ہم اتنی دور کھڑے ہوئے بھی لرز جاتے...... کیسے کیسے تناور درخت جل کر بیٹھ رہے تھے..... اے آر پی والوں کا ہجوم...... ریڈ کراس کی لاریاں...... زخمیوں کی چیخ پکار، گھر کے مالکوں کے دلدوز نعرے...... ماؤں کا اپنے بچوں کے لئے تڑپ جانا...... رعنا تو چیخیں مار مار کر رونے لگی تھی...... اور پروین ہر درخت کے گرنے پر ایک ہائے کے ساتھ آنکھیں بند کر لیتی تھی...... میرے خدا...... ! نہ جانے کیسے بے حس ہیں وہ لوگ جو ایسے منظر کو دیکھتے ہوئے بھی ہنس سکتے ہیں...... رعنا رونے لگی تو امی نے سمجھانے کی کوشش کی.... مگر بیگم طاہرہ ہنس پڑیں۔ میں حیرت سے منہ تکنے لگی تھی "اری دیوانی تم کیوں رو رہی ہو۔ تمہارا گھر تو جلا نہیں جا رہا ہے...... کیسی چھوٹی بچی بنتی ہو" اور یہ سب ہنس ہنس کر..... میرا دل چاہتا تھا کہ کوئی ان کو ایک طمانچہ لگا دے.... مگر میں نے سوائے انتہائی نفرت سے منہ پھیر لینے کے اور کچھ نہ کہا اور پھر ان شعلوں کو تکنے لگی تھی...... اُف ! وہ خون سے زیادہ لال اور تلوار سے زیادہ تیز شعلے کس کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے.... اور اس کڑکتی دھوپ میں ہم نے خدا کے دربار میں ہاتھ اٹھا دیئے تھے کہ یا اللہ اپنے ان بندوں پر رحم کر اور پھر دیوانہ وار آسمان پر ابر کو تلاش کرنے لگے مگر وہاں ابر کا نام و نشان نہ تھا.... اور آگ برابر بڑھتی گئی اور بیگم طاہرہ مسکراتی رہیں.... آخر عارفہ نے چیخ مار کر آنکھیں بند کر لی تھیں اور اس امید موہوم پر نیچے بھاگے کہ شائد ان بے کسوں کی کچھ مدد کر سکیں۔

مگر بیگم طاہرہ تو مسکراتی ہی رہیں اور "کتنا خوبصورت منظر ہے" کے سوا اور کچھ نہ کہا......... اور یقیناً ایسا ہی تو تھا مگر انسانوں کی مصیبت نے اس خوبصورتی کو دیکھنے کی فرصت نہ دی تھی۔

اور اتنا جلد ہی پھر سکون اور اطمینان چھا گیا ہے۔ فطرت پھر مسکرانے لگی ہے...... اس حسین و پرکیف ماحول میں وہ سب ایک پریشان سا خواب معلوم ہوتا ہے...... کاش کہ وہ سچ مچ ہی خواب ہو سکتا مگر وہ تو حقیقت ہے۔ ایک تلخ اور ہوشربا حقیقت...... اب بھی جبکہ فطرت اتنی جاذب نظر ہو کر گویا ان زخموں کا اندمال کرنا چاہ رہی ہے کتنے ایسے لوگ ہوں گے جن کی زندگیاں صرف اس ایک دن میں تباہ ہو کر رہ گئیں۔ عارف ہی نے تو شام کو لوٹ کر بتایا تھا کہ رشید صاحب دلیری سے آگ میں کود کر اپنا "سیف" اٹھا لائے جس میں ہزاروں روپیوں کے نوٹ تھے۔ مگر جب تک وہ اندر گھس کر اپنا ایک اور صندوقچہ بھی اٹھا لائیں وہ لوگ سارے کو اٹھا کر کھسک گیا...... اور اس دوہرے صدمے کی تاب نہ لا کر احمد میاں بیہوش ہو کر گر پڑے......... اور عبدالصمد صاحب بڑی مشکل سے اپنا "سیف" باہر اٹھا لائے اور اب اسی پر بیٹھے ہیں۔ کسی کو قریب بھی نہیں آنے دیتے تھے کہ کہیں یہ بھی چلا نہ جائے۔ کوئی ہمدردی ظاہر کرتا ہے تو صرف آنسو بہنے لگتے ہیں۔ آدمیوں کا ہجوم ہے۔ لوگ جلتے مکانوں سے سامان لا کر پھینکتے ہیں جو فوراً ہی غائب ہو جاتا ہے

عارف کی آواز سے شوخی مفقود ہو چکی تھی، ان کا شریر اور مسکراتا ہوا چہرہ بے حد غمگین اور تھکا ہوا نظر آتا تھا۔

اور سچ مچ وہ مصیبت...... !! کیا یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ سامنے ہزاروں انسانوں کی زندگیاں تباہ ہوتی رہیں، اور پھر بھی مسکرایا جائے ہاں اگر بیگم طاہرہ ایسی ہوں تو.... مگر یہ کیا! میں یہ کیا سوچنے لگی......... یہ دلفریب اور خوشگوار شام ان رنجیدہ خیالوں کے لئے تو نہیں......... اور پھر بیگم طاہرہ کے نرم دل یا سخت دل ہونے سے آگہ تو بھی نہ تھی......... میں نے سر کی ایک جنبش سے ان خیالوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اور چونکہ اندھیرا ہونے لگا تھا، اس اداسی کو دور کرنے کی خاطر جو ان فلسفیانہ خیالوں سے پیدا ہو گئی تھی ایک فلمی طرز نہایت ہی بے پرواہ انداز سے گاتی ہوئی نیچے اترنے لگی۔ امی جان ابھی نماز سے فارغ نہ ہوئی تھیں۔ بنگلہ آج بہت خاموش نظر آ رہا تھا۔ ابا جان اور الطاف بھیا کسی کام پر صبح ہی سے گئے ہوئے تھے۔ رشید اور سلیم بھی انہیں کے ساتھ تھے اور دراصل ان دو شریروں کی غیر موجودگی ہی کے باعث آج اتنا سکون اور شاید افسردگی بھی چھائی ہوئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔ گو قریب قریب اندھیرا ہونے لگا تھا مگر کھڑکی میں سے باہر قدرت کی لطافت اور نیرنگیاں نظر آ رہی تھیں...... ریڈیو کونے میں گویا زبانِ حال سے خاموشی پر ماتم کرتا نظر آ رہا تھا۔ مگر دل نے نہ چاہا کہ ریڈیو لگاؤں۔

شمیمہ اسمٰعیل شریف

رات کا بھولا اور دیگر افسانے :- پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو فارسی و عربی مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں مثلاً دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں۔

طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات ۱۶۸ قیمت عہ

غزل!

ابھی محبت کی ابتدا ہے دلوں کے ارماں نکل رہے ہیں
ابھی ہے آغاز مستیوں کا شراب کے دور چل رہے ہیں

عجیب برسات کا سماں ہے، نظر کو ہر وقت یہ گماں ہے
کہ حسن انگڑائی لے رہا ہے حسین کپڑے بدل رہے ہیں

ابھی جوانی پہ ہیں امنگیں، دلوں میں ہیں سیکڑوں تمنّائیں
جو دو چراغ آج بجھ رہے ہیں تو دس چراغ اور جل رہے ہیں

خدا ہی جانے کہ رنگ بدلیں گے ولولے عہدِ نو کے کتنے
ابھی تو گہوارۂ تمدن میں دل کے ارمان پل رہے ہیں

وہ دیکھ! ماضی کے دوش پر ہیں ہزارہا ایسی داستانیں
جنھوں نے دل قوم کا جلایا وہ نارِ دوزخ میں جل رہے ہیں

نہ آمریت کے گا ترانے، یہ راگ اب ہو چکے پرانے
مذاقِ عالم بدل چکا ہے نظام سارے بدل رہے ہیں

قدم قدم پر تھا خوفِ طوفاں، جگہ جگہ تھا فنا کا ساماں
مگر زہے عشق تیری ہمت مرے ارادے اٹل رہے ہیں

تھے جن کے اسلاف عیش پرور، ہیں ان کے اخلاف اب گداگر
امیر زادوں کے دل کے ٹکڑے یتیم خانوں میں پل رہے ہیں

سلگ رہے ہیں ابھی ہمارے دلوں کے آتش کدے مسلسل
جلا چکے تھے ابھی جو ہم کو اب ان کی باری ہے جل رہے ہیں

نہیں زمانے سے کوئی شکوہ گلہ ہمیں ہے تو صرف یہ ہے
تری نظر میں ابھی ہم برنگِ شکایتِ بے محل رہے ہیں

ہوئی سحر ختم پر ہے محفل، اٹھو کہ افسرؔ اچاٹ ہے دل
نہ حسن میں اب وہ دل کشی ہے نہ زلف میں اب بل رہے ہیں

افسر

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو پشاور)

نواب ڈاکٹر سر امین جنگ بہادر

(جو اُردو کتب خانۂ اسلامیات کے افتتاحی جلسہ منعقدہ ۶ ربیع الاول ۱۳۶۵ھ کو پڑھا گیا)

یور اکسلنسی، خواتین و حضرات!

مجھے اجازت دی جائے کہ میں سب سے اوّل اپنے مکرم و محترم دوست عالی جناب ڈاکٹر سر سعید الملک بہادر بالقابہٗ کا شکریہ ادا کروں کہ یہاں تشریف فرما ہو کر اس کتب خانۂ اردو کے حامی و معاونین کی ہمت افزائی فرمائی۔ ثانیاً میں اپنے کرم فرما ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ صاحب کی کوشش کی تحسین کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک ولی اللہ کے مزار مبارک کی خانقاہ شریف کو فیض بخش بننے اور ہمیشہ کے آباد رکھنے کے لئے یہاں ایک اردو کتب خانۂ اسلامیات قائم کیا۔ اردو زبان میں علوم اسلامی کافی تعداد میں موجود ہیں اور ضرورت تھی کہ ایک ایسا مرکز قائم ہوتا جہاں اردو کی تمام اسلامی کتابیں محفوظ رہتیں۔ ثالثاً میں ان طلبہ اور اصحاب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جن کو مطالعہ و کتب بینی کے شوق نے کتابوں کے کیڑے کہے جانے کا مستحق بنا دیا ہے۔ ان کے واسطے میں خود اپنی نظیر پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

اگر آپ حضرات ایک ہشتاد و چہار سالہ (۸۴) بوڑھے کی خودی یا خودستائی معاف کریں تو میں اپنے کتب خانہ کی مختصر کیفیت بیان کروں گا کہ کب اور کس طرح مجھے کتابوں سے محبت پیدا ہوئی اور میں کس طرح ان کے جمع کرنے کے شوق میں مبتلا رہا۔ ستّر سال قبل میرے مدرسے کے تقسیم انعامات کے جلسے میں کوئین وکٹوریہ کے چچا ڈیوک آف بکنگھم گورنر مدراس کے ہاتھ سے مجھ ۱۲، ۱۳ سالہ لڑکے کو ایک چھوٹی سی کتاب بطور انعام دوم ملی۔ اس جلسے اور کتاب کا میرے دل پر ایسا اور اس قدر اثر ہوا کہ میں نے اسی وقت اپنے دل میں ٹھان لی اور پکا ارادہ کر لیا کہ ہر سال ہر جماعت میں اور ہر امتحان میں پہلا یا دوسرا ہو کر کتابوں کا انعام لیتا رہوں گا۔ اس کے بعد چند ہی سالوں میں میرے ارادے کا ارتقاء ہوا۔ انعام کی کتابوں سے دو ایک صندوق یا الماری بھر دی جائے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس کا فضل و کرم ایسا میرے حال میں شامل رہا کہ مجھے ہر سال ہر کلاس میں ہر امتحان میں بچوں کی جماعتوں سے شروع کر کے ایم اے کی جماعت تک مڈل اسکول کے امتحان سے شروع ہو کر ایم اے کے امتحان تک اول، دوم یا سوم درجے کے انعامات کتب کے علاوہ رقمی انعامات مثلاً کو رنگھم برسری، ماہانہ دس روپے کی، ملرس پرائز نقد سو روپے کا وغیرہ ملتے رہے۔ حتیٰ کہ مدراس یونیورسٹی کا بڑے سے بڑا (گورنرس اسکالرشپ) ماہانہ (۳۹) روپے کلدار کا بھی مسلسل چار سال تک ملتا رہا۔ میرے والد ماجد نے مجھے اجازت دیدی کہ میں اپنے اسکالرشپ کی رقم جیسا چاہوں خرچ کروں پھر کیا تھا کہ میں اس ماہانہ رقم کا نصف اپنے ساتھی غریب طالب علموں کے کتب اور فیس کے واسطے دے کر دوسرے

نصف سے اپنی خواہش اور ضرورت کی کتابیں جمع کرتا رہا۔ اس زمانے سے اب تک پچاس سال سے زیادہ عرصے تک ماہانہ کم از کم پچاس روپے کے کتب خرید کر جمع کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج میں ایک چھوٹا موٹا یعنی کارآمد اور مفید کتب خانے کا مالک ہونے کا ناز کرتا ہوں اور اپنے کتب خانے کو اپنا خزانہ کہتا ہوں۔ جس روز ڈاکٹر سر رابندر ناتھ ٹیگور کتب خانے کا ماجرا سن کر اسے دیکھنے آئے تھے تو ان سے میں نے انگریزی میں کہا کہ دنیا میں اس کتب خانے کے سوا کوئی چیز نہیں ہے جس پر مجھے ناز ہو۔ میرا بڑا بیٹا کیمبرج کا آنرز ایم اے۔ خطیب محمود حسین مرحوم جو میری محبت کا دم بھرتا تھا، اس کو میری بات ناگوار ہوئی تو اس نے فی الفور پوچھا کہ "باوا جان میں آپ کے ناز میں کہاں ہوں" میں نے جواب دیا کہ "بابا تم چیز نہ ہو آدمی ہو۔ دنیا میں تمہارے سوائے کوئی آدمی نہیں جس پر مجھے ناز ہو" رابندر ناتھ ٹیگور صاحب نے خوب ہنس کر ہم دونوں کو مبارکباد دی اور فرمایا "دونوں پر آپ کا ناز بالکل بجا ہے۔"

میرے کتب خانے میں عجیب، نادر یا قدیم کتب نہیں ہیں۔ اس قسم کے کتب جمع کرنے کا مجھے کوئی شوق نہ رہا۔ فقط کارآمد کتابیں جمع کی ہیں جن سے روزمرہ سیاسی، سماجی و معاشی مسائل کا جواب مل سکے اور علمی و ادبی مشکلات حل ہو سکیں۔ میرے انتخابی کتب فقط اتنے ہیں جتنے مستعار لے جانے والوں کی قزاقی سے بچ سکے۔ ان کے علاوہ مصنفین کے ہدیہ کے کتب ہیں جن کا شکریہ کے ساتھ معترف ہوں کہ جامعہ عثمانیہ کے تراجم و تالیفات جو مجھے تحفۃً دی جاتی ہیں اور ان کی دو الماریاں کتب خانے کو رونق بخشتی ہیں۔ مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی انجمن اردو کی بھی بہت سے کتابیں ہیں۔ اس انجمن کا میں لائف ممبر کیا مادام الحیات اسیر احسان ہوں۔

ایک افسوس کے سوا اپنے کتب خانے سے مجھے خوشی ہی خوشی حاصل ہوتی ہے اور وہ افسوس یہ ہے کہ بہت سے احباب اور اشخاص میری کتابیں پڑھ کر ان کو واپس لا دینے کے وعدوں سے لے گئے مگر لا کر دینا بھول گئے یا لاپتہ ہو گئے۔ اگر اپنے آپ کو وعدے کے سچے ثابت کرتے ہوتے تو میرے کتب خانے کا نصف حصہ جس میں علمی و ادبی کتابیں رکھی ہیں وہ آج دگنا ہوتا۔ ایسے اشخاص سے آئندہ بچنے کے واسطے میں نے اپنی کتابوں پر انگریزی قطعہ کا ترجمہ چسپاں کر رکھا ہے جس کا ترجمہ میرے لئے ڈاکٹر زور صاحب نے یوں کیا ہے جس کو میں اپنی اردو، عربی، فارسی کتابوں پر لگا کر رکھوں گا۔

"اے کتاب تو خوش آئند ثابت ہو گی اگر میرے دوست مجھ سے مستعار لے کر تجھے پڑھے، سمجھے، واپس کرے، نہ کہ کسی اور کو مستعار دے۔"

غرض مجھے اطمینان اور شکر اس بات کا ہے کہ اللہ نے میری بچپن کی خواہش کو پورا کیا جس سے میرے بڑھاپے میں میرے اوقات بسر ہو جاتے ہیں۔ مجھ پر اپنا وقت گراں نہیں گزرتا۔ امید ہے میرے دوست و احباب مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں کہوں کہ ان کا یہ خیال کہ میں (معمول سے زیادہ نہیں تو) کتب پڑھتے ہیں) غلو و مبالغہ سے خالی نہیں۔ میں اتنا

(کتب پڑھنے والا) نہیں ہوں جتنا کہ (کتب جمع کرنے والا) ہوں۔ مجھے پڑھنے کے شوق سے زیادہ کتابوں کی مناسب تقسیم کرکے ان کو جوڑ کر موقع و محل پر رکھنے کا شوق رہا ہے۔ میں اپنے وطن وانمباڑی کا موروثی خطیب ہوں۔ خطبہ خوانی میرا آبائی پیشہ ہے۔ اب تک میں نے خودستائی سے آپ کی مغزخراشی جو کی ہے وہ محض تشبیب ہے اس قصیدہ یا خطبہ خوانی کی کہ۔

(۱) مدرسوں میں تقسیم انعامات کے جلسے بے جا و بے کار نہیں ہوتے بلکہ ان کا اثر بچوں کے دلوں پر بہت گہرا اور دیرپا ہوتا ہے جیسا کہ مجھ پر ہوا۔

(۲) آدمی کا مصمم ارادہ ذرّے کو بھی پہاڑ بنا دیتا ہے جیسا کہ انعامات لینے کا ارادہ امتحانوں میں کامیاب کرکے مجھ ناچیز کو ایک چیز بنا دیا۔

(۳) معمولی آمدنی والے، اوسط درجے کے اشخاص بھی تھوڑی سی کوشش سے اپنے گھروں میں ایک مختصر کتب خانہ اپنے اور اپنے بچوں کے واسطے مہیا کرکے اس کے فوائد سے بہرہ اندوز ہوسکتے ہیں۔

(۴) انفرادی و خانگی کتب خانوں کے کتابوں کی ترتیب جمع، تفریق، تقسیم۔ ارتقاء کے اصول پر کیسے کی جا سکتی ہے۔ میں پہلے تین باتوں کی "قصیدہ یا خطبہ خوانی" یعنی تعریف و توصیف و ترغیب میرے عزیز و معزز دوست جو اس کتب خانے کے نائب صدر ہیں نواب لیاقت جنگ بہادر کے واسطے چھوڑ دیتا ہوں۔ فقط چوتھی بات کی قصیدہ خوانی سے یعنی کتب کی مناسب و سہل ترتیب کے تذکرے سے جو میرے سالہاسال کے تجربوں پر مبنی ہے اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں۔

کتب خانہ آصفیہ جیسے بڑے شاندار کتب خانوں کی ہزارہا کتابوں کی تجمیع، تفریق و ترتیب کے طریقے جو اہم و پیچیدہ ہیں ان کی تقلید معمولی اور خانگی کتب خانوں کے لئے مناسب نہیں ہوسکتی۔ ایسے کتب خانوں کے واسطے ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے جو کتابوں کی تقسیم ان کے مضمون کے لحاظ سے بہت کم شعبے اور شاخوں میں ہو اور جملہ کتب اس طور سے الماریوں میں رکھی جائیں کہ جس سے ایک اجنبی بھی سہل طور سے اپنی خواہش کی کتاب دو تین منٹ میں نکال کر پڑھ سکے۔ پچاس سالہ تجربے نے مجھے بتایا ہے کہ فقہ اور قانون کے کتب، ڈکشنریاں، سائیکلو پیڈیا وغیرہ جیسے فقط "حوالے کی کتابیں" ایک طرف الگ کرکے دوسرے تمام "مطالعے کی کتابیں" محض دو (الف) و (ب) شعبوں میں تفریق کردے کر اور ہر شعبے کو تین شاخوں میں تقسیم کرنا چاہئے۔ دوسرے الفاظ میں (حوالے کے کتب) (متفرقات) کے نام سے الگ رکھ دے کر باقی جملہ

مطالعے کے کتب کے
دو شعبے شعبۂ علم و شعبۂ ادب

(الف) شعبۂ علم کی تین شاخیں
- ایک (مذہب و فلسفہ)
- دوسری (ہیئت و ہندسہ)
- دونوں کے بیچ میں (سائنس و فنون)

(ب) شعبۂ ادب کی تین شاخیں
- ایک (شعر و سخن)
- دوسری (قصص و افسانے)
- دونوں کے بیچ میں تاریخ و سوانح و سیاحت
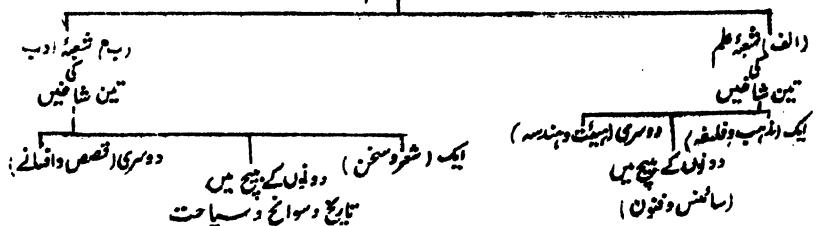
اگر ذرا غور کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ ادھر ادھر کبھی کبھی پڑھنے کے قابل کتب، لغت و دوائر المعارف جن کا نام میں نے (حوالے کے کتب) رکھا ہے ان کو ایک طرف رکھ دے کر شروع سے اخیر تک یکساں مطالعہ کرنے کے قابل کتابیں جن کا نام میں نے (مطالعہ کے کتب) رکھا ہے، یہ سب کی سب چھے شاخوں میں منقسم ہو جاتی ہیں۔ پہلا (الف) شعبۂ علم کی تین شاخوں میں ایک (مذہب و فلسفہ) دوسری (ہیئت و ہندسہ) اور تیسری شاخ یعنی بیچ کی شاخ (سائنس و فنون) کی ہوگی۔ یہ جملہ مطالعہ کی کتابیں مصنفوں کے نام کے سر حرف کے سلسلے سے تین یا چھے صندوقوں یا الماریوں میں رکھی جا سکتی ہیں تا کہ ایک اجنبی بھی اپنے مطلب کی کتاب دو تین منٹ میں چن کر اٹھا سکے اور اسی طرح دوسرا (ب) شعبۂ ادب کی تین شاخیں ہیں اس کی پہلی شاخ (شعر و سخن) کی ہوگی اس میں کلیات دواوین، تبصرہ و تنقید کی کتابیں رکھی جا سکتی ہیں۔ شعرا و مصنفین کے تذکرے اور مشاہیر کے سوانح تو تیسری یعنے بیچ کی شاخ (تاریخ و سوانح و سیاحت) میں ہوں گے۔ شعبۂ ادب کی دوسری شاخ میں ہر قسم کے ناول و قصص اور کہانیاں ہوں گی اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے فقہ، قانون، نقشے وغیرہ ایک جداگانہ ساتویں شاخ (متفرقات) کے نام سے رکھے جا سکتے ہیں۔

القصہ آج میرا اصلی مقصد اسی قدر ہے کہ اس کتب خانے کی افتتاح کی رسم کی ادائی کے وقت کتابوں کی ترتیب، تقسیم و تفریق کا ایک سہل طریقہ بتا دوں۔ اس کو میں نے بقول شخصے جیسا سد و بھائی اپنا کان بتلاتے ہیں ویسا ایک ٹیڑھے، ترچھے گھما گھماتے طور سے بتا دیا۔ اس سے اگر میں نے اس جلسے کا وقت ضائع کیا ہے تو اس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں، میرا بوڑھاپا ہے۔ اس ذمہ داری میں ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کا بھی بڑا حصہ ہے جنہوں نے اس تقویم پارینہ کو مخلصانہ اصرار سے صدارت کے لئے آمادہ کیا۔ اب میں عالی جناب صدر اعظم باب حکومت سے ملتمس ہوں کہ اپنے دست مبارک سے اس اردو کتب خانۂ اسلامیات کا افتتاح فرما کر حامیانِ کتب خانہ کو ممنون اور حاضرین جلسہ کو مسرور فرمائیں اور میرا دلی شکریہ دوبارہ قبول فرمائیں۔

میر محمد مومن عہد محمد قلی قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ میں پیشوائے سلطنت اور وزیر مطلق تھے۔ دنیوی عروج کے علاوہ ان کی مذہبی سیادت و فضیلت بھی بہت مشہور ہے۔ انھوں نے ہزارہا روپے کے صرفے سے ایک دائرہ بنایا تھا جس میں خاک کربلائے معلیٰ بچھا دی تھی۔ اور یہ دائرہ اب تک "دائرہ میر مومن" کے نام سے حیدرآباد میں مشہور و معروف ہے۔ میر محمد مومن صاحب اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر بھی تھے اور حیدرآباد آنے سے قبل شاہ ایران کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ ان کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالات زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے اپنے دلچسپ اور مقبول عام اسلوب میں تحریر فرمائے ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات مع تصاویر قیمت عالہ

حضرت شاہ ابوالبرکات رفاعی

حضرت حافظ سید شاہ ابوالبرکات غلام محمد زعمؔ قدس سرہٗ سادات کاظمی سے تھے۔ آپ کے اجداد میں حضرت سید احمد کبیر معشوق اللہ رفاعیؒ اور حضرت سید علی سانگڑے سلطان مشکل آسانؒ بہت مشہور و معروف گزرے ہیں۔ موخرالذکر کی درگاہ قندھار شریف ضلع ناندیڑ میں زیارت گاہِ خواص و عام ہے اور انہی کی اولاد و احفاد اور اعزہ آج تک ممالک محروسہ سرکارِ عالی کے اضلاع اور دیہات میں قاضی، خطیب، مفتی اور محتسب جیسی دینی خدمات پر فائز ہے جس کے تذکرے تاریخ قندھار دکن اور تاریخ مشاہیر قندھار میں شایع ہو چکے ہیں۔

حضرت شاہ ابوالبرکات کے دادا مولانا سید شاہ بدیع الدین رفاعی حضرت مولانا انوار اللہ خاں فضیلت جنگ علیہ الرحمۃ کے استاد تھے اور والد حضرت صاحب عالم حاجی سید شاہ عنایت اللہ حسینی شہید ایک صاحبِ باطن بزرگ اور حضرت پیر الہٰی بخش قدس سرہٗ کے رفیق طریقت تھے۔ ان کے حالات زندگی اور کشف و کرامات کا تذکرہ دکن کے مشہور مورخ منشی شمس الدین امیر حمزہ مرحوم نے ایک کتاب روضۂ شہید زاہد غریق میں لکھ کر مطبع مفید دکن سے ۱۳۲۶ھ میں شایع کیا تھا۔

حضرت شاہ ابوالبرکات ۵ محرم ۱۲۹۵ھ کو تولد ہوئے اور جب ان کے پھوپا قاضی محمد امیرالدین پونیری نے مدرسۂ نظامیہ کی بنا ڈالی تو اس میں مولانا محمد عبدالکریم افغانی سے تفسیر اور مولانا محمد یعقوب ہندی سے فقہ اور مولانا محمد عبدالوہاب محدث نقشبندی استاد حضرت سید نورالدین شاہ قادریؒ سے حدیث کی تعلیم پائی۔ عنفوانِ شباب میں شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہوا تو میر تراب علی زورؔ مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ چنانچہ زعمؔ تخلص انہی کا عطا کردہ ہے۔ شاعری کے علاوہ نیو الفریڈ کمپنی جیسی ناٹکوں کے لئے ڈرامے بھی لکھے۔ لیکن پچیس سال کی عمر میں قبرستان کی ایک آواز اور مولانا عبدالوہاب محدث کے فیض صحبت سے طبیعت نے یکایک پلٹا کھایا اور قرآن شریف حفظ کر لیا۔ اس کے بعد اپنے دیوان اور ڈراموں کو نذرِ آتش کر کے اور صدر محاسبی کی سرکاری ملازمت ترک کر کے ۱۳۲۳ھ میں وعظ و رشد و ہدایت کی خاطر حیدرآباد سے نکل کھڑے ہوئے۔

آپ کو اپنے والد ماجد سے سلسلۂ رفاعیہ و قادریہ کی، مولانا عبدالوہاب محدث سے سلسلۂ نقشبندیہ کی اور مولانا فضیلت جنگ سے سلسلۂ چشتیہ کی بیعت و خلافت حاصل تھی۔ جب آپ کے وعظ اور رشد و ہدایت سے خلق اللہ فیض یاب ہونے لگی اور لوگ جوق در جوق مرید ہوتے گئے اور بہت سے لوگ آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تو آپ کے بعض احباب و معتقدین نے حضرت فضیلت جنگؒ سے کہہ کر آپ کو سرکاری واعظ مقرر کر کے تنخواہ روپے ماہوار دلانی چاہی مگر آپ نے اس قید و بند کو پسند نہ فرمایا اور اپنی خاندانی جاگیر اور زمینات کی مختصر آمدنی اور توکل پر اکتفا کیا اور اپنے جدِ امجد حضرت سانگڑے سلطانؒ کی طرح تمام عمر سیر و سیاحت اور رشد و ہدایت میں صرف کی۔ اسی مناسبت سے علاقہ مرہٹواڑی کے بعض معتقدین آپ کو سانگڑے سلطان ثانی کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

حضرت نہایت نیک باطن تھے۔ ہر شخص سے سادگی اور خلوص سے ملتے اور بڑے سے بڑے دنیادار کے آگے بھی صاف گوئی اور پند و موعظت سے دریغ نہ کرتے تھے۔ جو دل میں ہوتا وہی زبان پر ہوتا۔ کبھی دنیاداری اور شان و شوکت کو پسند نہ کیا اور نہ اصحاب جاہ و ثروت کو خاطر میں لائے۔ ہمیشہ خوش پوشاک اور خوش خوراک رہے۔ انتہے سرخ و سفید اور وجیہ تھے کہ ۱۹۱۶ء کے جنگ عظیم کے دوران میں جب شہر مدراس میں آپ کی مجالس وعظ میں سارا شہر ٹوٹ پڑنے لگا تو انگریز عہدہ داروں کو شبہ ہوا کہ آپ ترک ہیں اور سلطان ترکی نے جاسوسی اور ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا موید بنانے کے لئے آپ کو ہندوستان روانہ کیا ہے۔ اس لئے آپ کو نظر بند کر دیا گیا تھا لیکن جب مولانا فضیلت جنگؒ نے حکومت مدراس کو یقین دلایا کہ حضرت ان کے عزیز ہیں اور حیدرآبادی ہیں تو نظر بندی سے رہائی پائی۔

حضرت شاہ ابوالبرکات ہمیشہ نماز باجماعت ادا کرتے اور رات میں بہت کم سوتے تھے۔ آپ کا ارشاد تھا کہ آدھی رات کے بعد کی عبادت اور دعا خدا کے پاس بہت مقبول ہوتی ہے۔ عشاء کی نماز کے بعد آپ مسجد ہی میں دیر تک اوراد و وظائف میں مشغول رہ کر بڑی رات کو گھر واپس ہوتے اور گھنٹہ دو گھنٹے آرام کر کے تہجد و اشراق کے لئے پھر مسجد تشریف لے جاتے۔ جب کبھی حیدرآباد میں ہوتے تو عصر کی نماز سے مغرب کی نماز کے بعد تک اپنے والد حضرت صاحب عالم شہیدؒ کی طرح چوک کی مسجد ہی میں تشریف رکھتے۔ سواری کے مقابلہ میں پیدل چلنے کو پسند فرماتے اور جہاں کہیں سفر پر تشریف لے جاتے تو امیروں اور عہدہ داروں کے مقابلے میں غریبوں کے یہاں قیام کرنے کو ترجیح دیتے۔

حضرت کی آواز میں خاص درد اور اثر تھا اور طرز بیان اتنا با اثر ہوتا تھا کہ آپ کی مجلس وعظ میں سامعین پر بے اختیار رقت طاری رہتی تھی۔ چونکہ حافظ قرآن ہونے کے سوا حضرت اعلیٰ پائے کے قاری بھی تھے اس لئے ہر رمضان میں آپ کے معتقدین تراویح کے لئے دور دور سے بلاتے اور آ کر لے جاتے تھے۔

دور دراز کے دیہات اور دشوار گذار مقامات تک پہنچ کر رشد و ہدایت کرنے میں حضرت نے جو زحمتیں اٹھائیں اور ہزارہا مسلمانوں کو جو اصلاح حال کی طرف راغب کیا اور سیکڑوں کو حلقۂ اسلام میں شامل کیا ان سب کی تفصیلات حضرت کے خود نوشتہ سوانح حیات میں درج ہیں جو چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور حضرت کے فرزند ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

حضرت کی یہ آپ بیتی چالیس پچاس سال قبل کے مذہبی و معاشرتی حالات کا ایک آئینہ ہے کیونکہ اس میں ہر مقام کی تفصیلی خصوصیات اور وہاں کے مسلمانوں کے حالات شرح و بسط سے بیان کئے گئے ہیں۔ حضرت نے نہ صرف ممالک محروسہ ہی کے اضلاع اور دیہات کو اپنے مواعظ حسنہ سے فیض یاب کیا بلکہ سندھ سے آسام اور صوبۂ سرحد سے لنکا تک کے طویل دورے کئے۔ برما اور جزائر شرق الہند میں بھی اپنا فیض پہنچایا۔ یوں تو ہر شہر اور قصبے میں آپ کے مرید و معتقد موجود ہیں لیکن مدراس، میسور، ترچناپلی، بمبئی، پونا، ناگپور، کلکتہ، کراچی، بیدر، گلبرگہ اور اورنگ آباد میں آپ کے مریدین کثیر تعداد میں ہیں۔

غرض حضرت شاہ ابوالبرکات نے مسلسل چالیس سال سیر و سیاحت اور پند و موعظت میں گزار دیئے۔ کبھی چند روز کے لئے حیدرآباد تشریف لاتے تو یہاں بھی مختلف محلوں میں مجالس وعظ کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اور

جب کبھی عید وطن میں ہوتی تو حضرت پرانی عیدگاہ قطب شاہی میں وہاں گئے متولی شاہ عبدالعزیز مرحوم کے اصرار پر نماز پڑھاتے ۔ یہ سلسلہ حضرت کی علالت اور وفات تک برابر جاری رہا۔ آخر کار ۸ ار صفر ۱۳۶۵ھ کو حضرت کا وصال ہوا اور مسلم جنگ پل کے محاذی حضرت کی نشان دادہ جگہ پر تدفین عمل میں آئی ۔ جس پر ایک گنبد تعمیر ہو چکا ہے ۔
حضرت کا عرس ہر سال ۵، ۶ اور ۷ ربیع الاول شریف کو ہوتا ہے ۔

حضرت شاہ ابوالبرکات قدس سرہٗ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے نبیرہ سید شاہ تقی الدین احمد صاحب قادری ابن ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کو سجادہ مقرر فرمادیا تھا اور ان کو اپنے والد حضرت سید شاہ عنایت اللہ حسینی شہیدؒ کے نام پر "عنایت پاشاہ" سے مخاطب فرماتے تھے اور ہدایت تھی کہ میاں ابھی کم سن ہیں ان کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے ۔

استاد العلما علامہ حضرت مولانا مولوی محمد عبدالقدیر صاحب صدیقی حسرتؔ سابق صدر شعبۂ دینیات جامعۂ عثمانیہ مدظلہ العالی ۱۳۶۵ھ کے عرس شریف میں تشریف فرما ہوئے ۔ تو میاں عنایت پاشاہ صاحب ممدوح کو طلب فرماکر اپنے دست مبارک سے سجادگی کی تکمیل فرمائی ۔ اس موقع پر علما و مشائخین اور عمائد شہر مثلاً حضرت مولانا سید محمد بادشاہ حسینی صاحب معتمد مجلس علماء دکن مولانا سید شاہ ولی اللہ حسینی صاحب معتمد انجمن پیشوایان مذاہب مولانا پیر محمود مجددی صاحب جناب سجادہ صاحب لنگر حوض، نواب عزیز نواز جنگ بہادر صدرالمہام صرف خاص مبارک، نواب معین نواز جنگ بہادر معتمد سیاسیات، مولوی قاضی محمد زین العابدین صاحب ناظم آبکاری، مولانا سید احمد حسین صاحب امجد، مولوی سید محمد حسین صاحب آزاد، مولوی محمد منیرالدین صاحب قاضی پربھنی درگاہ شریف میں شریک مجلس تھے ۔

شفا مجددی

مشاہیرِ قندہار دکن

اس تذکرہ میں مولوی اکبرالدین صدیقی صاحب ایم اے نے دکن کے مشہور و معروف اور مردم خیز خطۂ قندہار شریف کے معزز خاندانوں اور ان کے باکمال و مایہ ناز افراد کا اجمالی خاکہ کھینچا ہے پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی استاد تاریخ جامعہ عثمانیہ کا بصیرت افروز مقدمہ اس کے ساتھ شائع ہوا ہے ۔

قندہار شریف دکن کا بلگرام سمجھا جاتا ہے اور محمد تغلق کے زمانے سے آج تک وہاں کی سرزمین سے بڑے بڑے اولیاء، علماء، شعرا اور مشاہیر پیدا ہوتے رہے ہیں دکن کے مختلف شہروں اور قصبوں میں قاضیوں، خطیبوں، محتسبوں اور دیگر اہلِ خدمات شرعیہ کے جو خاندان آباد ہیں ۔ ان میں سے اکثروں کا تعلق قندہار شریف ہی کے بزرگوں سے ہے اس لئے یہ کتاب دکن کے شرفا اور بزرگوں کا ایک مستند اور مبسوط تذکرہ سمجھی جاسکتی ہے اور اس کے مطالعہ سے یہاں کی علمی و ادبی چہل پہل کا اندازہ ہوسکتا ہے (قیمت عمہ)

احساس

وہ مرے واسطے بے تاب و پریشاں ہوگی

بزمِ تنہائی میں وہ سرگریاں ہوگی
میری فرقت میں محبت سے پشیماں ہوگی
اس کو رہ رہ کے مری یاد ستاتی ہوگی
دلِ معصوم پہ بجلی سی گراتی ہوگی
خوفِ دنیا اُسے رونے بھی نہ دیتا ہوگا
دردِ دل راتوں کو سونے بھی نہ دیتا ہوگا

شکوہ وہ کاتبِ تقدیر سے کرتی ہوگی
چھپ کے باتیں مری تصویر سے کرتی ہوگی

کسی پہلو بھی اُسے چین نہ آتا ہوگا
سوزِ فرقت دلِ مضطر کو جلاتا ہوگا
رازِ ہمجولیوں سے کہہ بھی نہ سکتی ہوگی
وہ بغیر آہ و فغاں رہ بھی نہ سکتی ہوگی
چاند کے سینے میں ظلمت نظر آئی ہے مجھے
بے قراری مرے دل کی یہ بتاتی ہے مجھے

وہ مرے واسطے بیتاب و پریشاں ہوگی

جبریل

ادارہ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے	پائی
سرگزشت حاتم	۱۲۸	۲	۰	۰
سرگزشت غالب	۹۴	۰	۸	۰
نظام الملک	۴۰	۰	۶	۰
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سونیلی ماں	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خاں	۱۶	۰	۲	۰
سرسالار جنگ	۴۸	۰	۶	۰
عربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر	۲۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۳	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰	۰
حیدرآباد	۸۵	۰	۱۰	۰
عماد الملک	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۶	۰
" دوسری کتاب	۵۶	۰	۶	۰
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ	۱۴۰	۱	۴	۰
فن تقریر	۹۲	۰	۱۲	۰
مختصر تاریخ دکن	۱۴۳	۱	۰	۰
ہندوستانی تمدن	۱۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی	۸۰	۰	۱۰	۰
مہ لقا	۱۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۶	۰
رسائل طیبہ	۳۹۰	۲	۸	۰
سلک گوہرین	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو	۱۷۲	۱	۸	۰
اشوک اعظم	۵۶	۰	۸	۰
باتیں	۸۴	۱	۰	۰
یورپ جنگ سے پہلے	۲۱۸	۲	۸	۰
شاد اقبال	۱۷۹	۲	۸	۰
آریائی زبانیں	۱۰۲	۱	۰	۰
نظام علی خاں	۳۰	۰	۴	۰
تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	۲۹۰	۵	۰	۰
عرب اور عربستان	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے	پائی
سچ کا جادو	۴۸	۰	۴	۰
طبیعاتی کائنات	۶۸	۰	۸	۰
متاع سخن	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۴۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵ تصاویر)	۵۰۰	۵	۰	۰
" " دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن	۱۵۳	۱	۴	۰
روح غالب	۱۴۰	۲	۸	۰
عاصمہ	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نبرد زندگی	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگزشت ادارہ	۳۰۰	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۲۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان	۳۲	۰	۳	۰
خطابیات	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش دانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
کارسان دتاسی	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت	۵۲	۰	۸	۰
ادارہ سنہ ۱۹۴۱ع میں	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ	۲۴	۰	۴	۰
افضل الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خان	۳۲	۰	۴	۰

سب رس

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

نشان ٹپہ مصفیہ ۳۲ ۱۵
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵
ٹیلیفون نمبر ۲۰۹ ۲
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم

جلد ۹ | بابت مئی ۱۹۴۶ء | شمارہ ۵

خواجہ حمید الدین شاہد ایم اے کے اہتمام سے محمودیہ مشین پریس میں چھپکر منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

شعر و نغمہ

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام تو ہے عرفانِ محبت عام نہیں

اب لطف و بیاں سب ختم ہوئے اب دیدہ و دل کا کام نہیں
اب عشق ہے خود پیغام اپنا اب عشق کا کچھ پیغام نہیں

یا رب یہ مقامِ عشق ہے کیا گو دیدہ و دل ناکام نہیں
تسکین ہے اور تسکین نہیں آرام ہے اور آرام نہیں

کیوں مستِ شرابِ عیش و طرب تکلیفِ توجہ فرمائیں
آوازِ شکستِ دل ہی تو ہے آوازِ شکستِ جام نہیں

آنا ہے جو بزمِ جاناں میں پندارِ خودی کو توڑ کے آ
اے ہوش و خرد کے دیوانے یاں ہوش و خرد کا کام نہیں

ہر خلدِ تصور پیشِ نظر ہر جنتِ نظارہ حاصل
پھر بھی ہے وہ کیا شے سینے میں ممکن ہی جسے آرام نہیں

زاہد نے کچھ اس انداز سے پی ساقی کی نگاہیں پڑنے لگیں
میکش یہی اب تک سمجھے تھے شائستۂ دورِ جام نہیں

عشق اور گوارا خود کر لے بے شرط شکستِ فاش اپنی
دل کی بھی کچھ ان کے سازش تھی تنہا یہ نظر کا کام نہیں

اس حسن کا شکوہ کیا کیجے محدود ہے جس کی اک دنیا
اُس سعیٔ طلب کو کیا کہیے جو سعیٔ طلب ناکام نہیں

سب جس کو اسیری کہتے ہیں وہ تو ہے اسیری ہی لیکن
وہ کونسی آزادی ہے یہاں جو آپ خود اپنا دام نہیں

پینے کو تو سب پیتے ہیں جگرؔ میخانۂ فطرت میں لیکن
محرومِ نگاہِ ساقی ہے وہ رند جو دُرد آشام نہیں

جگرؔ مرادآبادی

مرسلہ اشفاق حسین صدیقی
(مرادآباد)

ترقی پسند ادب

(ایڈیٹر کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں)

ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ زندگی اور وہ بھی غلام اقوام کی زندگی ہمیشہ عبوری دور سے گزرتی نظر آتی ہے۔ لمحے ہر آن اور ہر دم ایک نئی کروٹ اور ایک نیا رخ اختیار کرتی ہے۔ ایسے نت نئے پہلو بدلنے والی زندگی کب قدامت کو خاطر میں لا سکتی۔ لئے ہر پرانی چیز سے عداوت ہو جاتی ہے۔ اس کے خیال میں (چاہے یہ خیال غلط ہو یا درست) یہی قدامت غلامی کے بندھنوں کو مضبوط رکھتی ہے۔ اس لئے ایسی فضا میں رہنے والا انسان اور ایسے بندھنوں میں جکڑا ہوا انسان ہر وقت اور ہر لمحہ اچھی چیزوں کو بری نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ ہر شئے کو تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھتا اور یہ سوال کرتا ہے کہ یہ چیز آزادی کی راہ میں ممد و معاون ہے یا مشکلات کا باعث بن رہی ہے۔

اس نقطۂ نظر سے اچھی چیزوں کو حیات نو بخشی جاتی ہیں اور بری چیزوں کو تمسخر ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا جاتا ہے۔ آج اردو ادب ایک نیا روپ اختیار کر رہا ہے۔ ترقی پسند ادیب مجسم انقلاب بن چکے ہیں۔

ترقی پسند ادب اور اس سے پہلے کے ادب میں مابہ الامتیاز چیز یہ ہے کہ ترقی پسند ادب میں طبقہ سوم یا پست ترین طبقے کی زندگی کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد اس طبقے کی ناگفتہ بہ حالت کو پیش کرکے قوم کو اس کی اصلاح کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ یہ اس لئے بھی اہم ہے کہ دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ افلاس زدہ افراد پر مشتمل ہے اور یہ کیفیت بالخصوص ہندوستان میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

آج کل دنیا کے بدلتے ہوئے حالات طبقۂ اسفل کو انتہائی اہم مقام دیئے چلے جا رہے ہیں جن کی طرف ماضی میں طبقۂ اعلیٰ نے کسی قسم کی توجہ کرنا خلاف شان سمجھا۔ آج مزدوروں کی بین الاقوامی انجمنیں قائم ہیں اور ان میں بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ اسی لئے ان کی آواز پر بہت زیادہ توجہ دی جانے لگی ہے۔ موجودہ صنعتی دور یا مشینی دور میں مزدوروں کی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے خود سرمایہ دار بھی ان پر رحم و کرم کی نظر رکھنا اپنی بقا کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔

جرمنی کا مشہور فلسفی شوپنہار دنیا میں کمزوروں پر مظالم کو دیکھ کر یہ نظریہ قائم کرنے پر مجبور ہوا تھا کہ قدرت اندھی ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی کہ دنیا میں ظلم و استبداد اور ناکامی و حسرت و یاس کیوں غریبوں اور کمزوروں کے حصے میں آئے ہیں اور کیوں ہر شخص کو اس کی محنت کا صلہ یا معاوضہ صحیح اصول پر نہیں دیا جاتا جس کی وجہ سے غریبوں کی غربت میں اور امیروں کی امارت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ شوپنہار کی آنکھوں نے ہر جگہ انصاف کا خون ہوتا ہوا دیکھا اور کمزور پر طاقتور کے مظالم کا مشاہدہ کیا۔ اسی وجہ سے دنیا کے حالات سے وہ مایوس سا ہو گیا اور قنوطیت اس کے دل و دماغ میں راہ پا گئی۔

لیکن جرمنی ہی کے ایک فلسفی حکیم نطشے کا خیال ہے کہ دنیا میں کمزوروں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اور زندگی کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم اقتدار حاصل کریں کشمکش برائے اقتدار کو وہ لازمۂ حیات سمجھتا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ پستی ہمیشہ بلندی کی دشمن رہی ہے لیکن بلندی نے پستی کا ہمیشہ خیال رکھا اور اس کی اصلاح و ہمدردی میں کوشاں رہی ہے۔

دنیا میں دولت مند طبقہ مختصر رہا ہے لیکن اس کا وجود بہرحال ہر زمانے میں رہا اور اس کا رہنا ضروری بھی ہے۔ سماج میں فرق مراتب ہمیشہ رہا ہے اور رہے گا۔ اگر سماج میں تمام افراد کو غذا فراہم کرنے کے انتظامات

بھی میسر ہو جائیں تو پھر بھی فرق مراتب نظام زندگی کو چلانے کے لئے بیحد ضروری ہے۔

قوموں کی قیادت کے لیے طبقۂ اعلیٰ ہی میں سے بہتر افراد اٹھے ہیں اور قیادت کی باگ دراصل ان ہی کے ہاتھوں میں ہونی بھی چاہیے جو بہترین دماغ رکھتے ہوں پست طبقے کے افراد سے ایسی توقعات والبتہ نہیں کی جاسکتیں۔ اگر کبھی قوموں کی قیادت طبقۂ اسفل کے افراد میں سے کسی نے کی بھی ہے تو اسی صورت میں جبکہ اس میں طبقۂ اعلیٰ کی بہترین خصوصیات پیدا ہوئیں۔ یعنی اچھی ذہنی صلاحیت پاکیزہ اخلاق، جرأت و ہمت، وسعت نظر وغیرہ۔

قوم کے افراد بھیڑ بکریاں ہیں۔ ان کی گلہ بانی کرنے کے لئے ایک گلہ بان کی ضرورت ہوتی ہے۔ قوم میں لیڈر کا ہونا بہرحال ضروری ہے جس کے حکم کے آگے سب بلا امتیاز سر تسلیم خم کردیں۔

اگوسٹ نے طبقۂ اعلیٰ اور طبقۂ اسفل کے لئے ایک بہت اچھی مثال دی ہے۔ وہ انھیں انسانی جسم کے اعضا سے تشبیہ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی جسم میں سر بلند مقام پر ہوتا ہے اور پیر نیچے ہی ہوتے ہیں۔ سر کا بلند مقام پر ہونا ضروری ہے۔ اور پیر نیچے ہی رہیں تو اپنا فرض بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ دماغ کو اس لیے بلند مقام پر رکھا گیا ہے کہ وہ انسان کی بہت اہم خدمت انجام دیتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ ہمیں پیر کی اہمیت سے انکار ہے۔ ہمیں پیر کی پرواہ نہیں ہے۔ ہم انھیں بھی اپنی بقا کے لئے ایسا ہی ضروری سمجھتے ہیں جیسے دماغ کو۔ لیکن ہمارا کہنا صرف اس قدر ہے کہ سر اپنے مقام پر اور پیر اپنے مقام ہی پر رہیں تو زندگی کی یہ گاڑی بخیر و خوبی چل سکتی ہے ورنہ سارا نظام زندگی درہم و برہم ہو جائے گا۔

ترقی پسند ادیب اپنے مخالفوں سے مزدوروں کی تائید میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یقین رکھئے کہ پاؤں کبھی سر بننا نہیں چاہتے لیکن ان کی حفاظت آپ کا ہمارا اور سب کا فرض ہے۔ اگر انھیں یوں ہی برہنہ چھوڑ دیا جائے گا اور محض یہ سمجھ کر کہ ان کا کام ہی چلنا ہے تو پھر یہ گرد آلود ہو جائیں گے اس پر بھی چشم پوشی کی جائے گی تو ان میں آبلے پڑ جائیں گے اور نتیجۃً آپ چلنے پھرنے سے معذور ہو جائیں گے۔ اور اس سے آپ ہی کی رفتار ترقی میں خلل واقع ہو گا۔ اس لئے پیر کی حفاظت کیجئے تاکہ آپ نہایت تیز رفتاری سے میدان عمل میں گامزن ہوں۔ پاؤں کو توڑیئے نہیں کیونکہ انھیں توڑ کر آپ اپنی ہی تباہی کا سامان کریں گے۔

ترقی پسند ادب کے متعلق ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس کی بنیاد عریانیت پر رکھی گئی ہے۔ اس کے متعلق یہ عرض کرنا بہت کافی ہے کہ سماج کے جس طبقے کو اس ادب میں پیش کیا جا رہا ہے وہ خود اخلاق کی حدیں توڑ چکا ہے۔ اس لئے اگر جدید ادب کے اس حصے میں عریانیت آجائے تو ناک بھوں چڑھانا کوئی اچھی بات نہیں جب اس طبقے کی اصلاح ہو جائے گی تو ادب بھی اصلاح پا جائے گا۔

ترقی پسند ادب کے حامی یہ کہتے ہیں کہ وہ اس ادب کے ذریعے انسانوں کی زندگی کو پیش کرتے ہیں۔ ایسے انسانوں کی جن کی تعداد سوسائٹی میں عموماً بہت زیادہ ہوتی ہے اور یہ کہ ادب کو انسانوں سے متعلق رہنا چاہیئے، انسانوں سے ہٹ کر جس چیز کو پیش کیا جائے گا، وہ نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔ لیکن ان کے اس خیال کی تردید میں یہ حقیقت بیان کی جاتی ہے کہ ادب کو اس طرح محدود موضوع کا پابند نہ کیجئے ادب عالمگیر ہوتا ہے۔ اس میں ساری کائنات کو سمو دیا جا سکتا ہے۔ اور سمو دیا جانا چاہیئے۔ ادب میں انسانوں کی زندگی ضرور پیش کی جاسکتی ہے لیکن انسان کا تعلق صرف انسانوں ہی سے نہیں ہے بلکہ چونکہ وہ صاحب عقل اور تمام مخلوقات میں اشرف و افضل ہے اس لئے وہ ساری دنیا سے اپنے آپکو متعلق پاتا ہے۔ فطرت کے حسین مناظر اس کے دل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو آئین قدرت اس کی مزاحمت کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مختلف موسم اس کی طبیعت پر مختلف

اثرات پیدا کرتے ہیں۔ جذبۂ انسانی بیت کی نیرنگیاں، جذبات رنج، مسرت اور فطری مناظر سے متاثر ہونے کی صلاحیت سے اس کا دل کبھی مسرور رہا اور کبھی مغموم ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر جذبۂ محبت جو انسان، حیوان، نباتات و جمادات الغرض کائنات کی بے شمار چیزوں سے انس کی وجہ سے حرکت میں آتا ہے اس کے دل و دماغ کے ساکن سمندر میں احساس و تخیل کی لہریں پیدا کرتا ہے جن کے اظہار پر وہ اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ اسی لئے ہماری شاعری بلکہ دنیا کی تمام زبانوں کی شاعری میں قدرتی مناظر کے پرستار، موسم بہار کے مدح، برسات کی برکتوں کو بیان کرنے والے حسین مناظر سے لطف اندوز ہونے والے اپنے بیش بہا تاثرات کو پیش کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ تمام جذبات ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کئے گئے ہیں جو امتداد زمانہ سے یا دوسری وجوہ سے کبھی فنا نہیں ہو سکتے

اس کے برخلاف ایسے موضوعات کو شاعری کا واحد موضوع بنانا جو وقتی اور ہنگامی ہیں جن کی اہمیت عارضی ہے جیسے مزدوروں کی مشکلات اور ان کے مصائب یا کسانوں کی ناگفتہ بہ حالت یا ملک میں جہالت کا دور دورہ جو بالکل ہنگامی ہیں اور جنھیں تھوڑے سے کی کش مکش اور جد و جہد کے بعد دور کیا جا سکتا ہے ادب جیسی بلند مرتبہ اور اعلیٰ ترین شئے کے شایان شان نہیں۔ ادب میں لافانی احساسات و جذبات اور تاثرات کو بیان کیا جاتا ہے ادب کا موضوع محدود نہیں ہوتا۔ وہ کسی ایک سماج کی ترجمانی نہیں کرتا۔ وہ کسی ملک کے ایک خاص طبقے کی نمائندگی نہیں کرتا۔ وہ سب کے لئے ہوتا ہے۔ وہ ہر دور اور ہر زمانے کے لئے ہوتا ہے۔ وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ ادب مذہب و ملت، رنگ و نسل کی تفریق سے بھی زیادہ بلند مقام پر ہوتا ہے۔ بہترین ادب چاہے وہ کسی زبان میں ہو اور کسی قوم کی ملک ہو، کبھی اس زبان اور اس ملک یا قوم کی میراث ہو کر نہیں رہتا بلکہ وہ سورج کی طرح بلند ترین مقام پر پہونچ کر اپنی شعاعوں سے دنیا کے چپہ چپہ کے انسانوں کے دماغوں اور دلوں کی تاریکی کو دور کرتا ہے۔ ایسے ہی ادب کو اعلیٰ ترین ادب کہا جا سکتا ہے۔ اور ایسے ہی ادب کے پیدا کرنے والوں کی ہمت افزائی کی جا سکتی ہے۔ موسموں کے تغیرات، انسانی طبائع کے تغیرات، عمر کی زیادتی یا کمی ان میں سے کوئی چیز بھی ایسے ادب کی ضرورت اور لطف و اثر کو کم نہیں کر سکتی۔

ترقی پسند ادیب سرمایہ داروں کے دشمن ہیں۔ ان سے دولت چھین کر وہ طبقۂ اسفل میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں لیکن سوسائٹی کو سرمایہ داروں کی ضرورت ہے۔ طبقۂ اسفل کی اصلاح بہت نیک مقصد ہے۔ ان کے معیار زندگی کو واقعی بلند کرنا چاہیئے۔ ان میں زندگی کا احساس اور سوسائٹی میں ان کی اہمیت کا صحیح احساس پیدا کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس کے بجائے اگر ہم بلندی پر رہنے والے چند افراد کو پستی کی طرف کھینچ لائیں تو اسے کسی طرح ترقی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ہمیں تو پستی کو بلندی کی طرف لے جانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر بلندی کو بھی پستی کے برابر کر دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ انسانیت ہزاروں سال کی جد و جہد کے بعد جس مقام تک پہنچ چکی ہے وہاں سے اسے پیچھے کی طرف چلنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ ترقی معکوس کسی قوم کے لئے بھی فال نیک نہیں۔ آگے بڑھنے میں زندگی ہے اور پیچھے ہٹنے میں موت۔ مہذب اقوام نے محنت شاقہ سے اپنی ایک تہذیب اور اپنا ایک تمدن پیدا کیا ہے۔ کیا انھیں پھر اسی دور جاہلیت کی طرف لے جایا جائے گا جب انسان پہاڑوں اور درختوں کی کھو میں بسیرا کرتا تھا۔ فرش خاک پر بے تکلف ہو جاتا تھا۔ ضروریات زندگی انتہا درجے محدود تھیں۔ مختصر یہ کہ تہذیب کا مفہوم ہی متعین نہیں ہوا تھا۔ وہ دن انسانیت کی تاریخ میں المیہ ہوگا جب انسانیت کو اس کے ارفع و اعلیٰ مقام سے اس بری طرح گرانے کی کوشش کی جائے گی۔ ترقی پسند ادیبوں کو جان لینا چاہیے کہ انہیں انسانیت کے شیرازے کو بکھیرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے بلکہ ان کا فرض تو یہ ہونا چاہیے کہ بعض خودغرض افراد کی جن کوتاہیوں اور لغزشوں کی وجہ سے انسانیت کا شیرازہ منتشر

ہوتا نظر آرہا ہے۔ ان کی طرف اپنے زور قلم سے سارے انسانوں کو متوجہ کریں اور ان کے دل میں احساس کی آگ مشتعل کردیں تاکہ انسانیت اپنے بلند ترین نصب العین کو پالے اور مستقبل کی دنیا خطرات سے جہاں تک ہو سکے محفوظ تر ہوتی چلی جائے۔

اسی سلسلے میں ترقی پسند ادیبوں کی ایک اور کوشش کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ ان ادیبوں کا خیال ہے کہ تحریر میں جہاں تک ہوسکے سادگی پیدا کی جائے تاکہ ان کے مضامین ہر شخص پڑھے اور سمجھے۔ چنانچہ اسی تحریک کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے ایک خطبہ صدارت میں یوں اظہار خیال فرمایا ہے۔

"اسی لئے جہاں سادہ لکھنے کی ترجیح پکار رہے وہاں اپنے ملک کی جہالت رفع کرنے اور علم کے پھیلانے کی کوشش بھی کرنی چاہیئے۔ جب کچھ ناخواندہ طبقہ ذرا اوپر اٹھے گا اور ہمارے ادیب اور مصنف ذرا نیچے جھکیں گے۔ اس طرح دونوں کے درمیان تفاوت کم رہ جائے گا اور وہ ایک دوسرے کی بات آسانی سے سمجھنے لگیں گے۔"

ملک کی جہالت رفع کرنے اور علم کے پھیلانے کے خیال کی پر زور تائید کی جاسکتی ہے۔ اور یہ ہر اس شخص کا فرض اولین ہے جسے اپنے ملک کی ترقی کا خیال لگا رہتا ہے۔ لیکن ناخواندہ طبقے کی خاطر ادیبوں اور مصنفوں سے ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ وہ اپنے بلند مقام سے "ذرا نیچے" اتر آئیں کوئی وزن نہیں رکھتا۔ کیونکہ بلند پایہ ادیبوں کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے اعلیٰ مقام سے عوام کی خاطر پست سطح پر آجائیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ عوام کی ذہنی سطح پست ہوتی ہے اور وہ ان ادیبوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ انھیں سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے۔ ملک میں تعلیم کے عام ہونے اور جہالت کی تاریکی کے دور ہونے کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ ہر شخص میں اعلیٰ ادبی ذوق پیدا ہو چکا ہے اور ہر شخص اعلیٰ پایہ کا ادب پڑھتا، سمجھتا اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ کیا انگلستان میں تعلیم کے عام ہونے کا یہ مطلب لیا جاسکتا ہے کہ وہاں کا ہر شخص شکسپیر، ملٹن، ورڈسورتھ اور دوسرے بڑے شعراء کے کلام کو پڑھتا، سمجھتا اور لطف اندوز ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ آپ عوام سے اس قسم کی توقع بھی نہیں کرنی چاہیے کہ وہ فکر معاش جیسے اہم کام سے بے پرواہ ہوکر اعلیٰ ادب کا مطالعہ کریں۔ عوام کے لئے لائٹ لٹریچر (Light Literature) کی ضرورت ہے اور اس کی فراہمی کے لئے اعلیٰ ادیبوں کو اپنے بلند مقام سے اترنے کی ضرورت نہیں بلکہ دوسرے بیسیوں ادیب ایسے ہیں جو عوام کے مذاق اور ان کی اپنی ذہنی سطح کا لحاظ کرتے ان کی تفریح طبع کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ ایسے ادیبوں کی تعداد عوام ہی کی طرح حشرات الارض کی مانند ہے۔ یہ درجہ سوم کے ادیب ہیں جن کی تحریر میں سطحی پن یا خامیاں بہت ہوا کرتا ہے۔ جس کے مطالعے کے لئے عوام کو اپنے دماغ پر زیادہ بار ڈالنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یورپ میں ہر سال ایسی ہزاروں کتابیں شائع ہوتی ہیں جن کی کوئی ادبی اہمیت نہیں ہوتی بلکہ جو فوجی سپاہیوں اور عام لوگوں کی تفریح طبع کی خاطر لکھی جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ اعلیٰ ادب کبھی عوام کے لئے نہیں لکھا جاتا۔ جیسا کہ کہا گیا ہے:

"There is no such thing as literature for the masses"

ترقی پسند ادیبوں کی طرف سے قدیم ادب کے متعلق کبھی کبھی اس خیال کا اظہار ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ادیب مجبور تھے کہ جاگیردارانہ نظام اور شاہی کے خلاف کچھ نہ لکھیں۔ کیونکہ دربار کا اثر ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دوسرے خیالات کی طرح ان کا یہ خیال بھی صحیح نہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے کے ادیبوں

میں سیاسی شعور بیدار نہ ہوا تھا۔ اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ان کے اصلی فرائض کیا ہیں۔ اسی لئے انھوں نے کبھی اپنے ماحول سے تنگ آ کر صدائے انقلاب بلند نہیں کی۔ ورنہ اگر سیاسی شعور ہو، فرض کا احساس ہو اور قومی عزت و وقار کو بلند کرنے کی دھن ہو تو بقول اقبال ع

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق

کے اصول پر عمل کرنے کا خیال دامن گیر ہوتا ہے۔ کیا آج کے ادیبوں پر پابندیاں عاید نہیں ہیں اور کیا آج بیرونی حکومت ان کے دل و دماغ پر بھی حکمرانی نہیں کر رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اقبال اور جوش اور دوسرے شعرا نے ایسی چیزوں کو بیان کیا جن میں پابندیوں اور بندشوں کے اس دور میں کبھی بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خود اقبال اسی چیز کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ع

سخنے نہ گفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

سچ تو یہ ہے کہ جو الزام قدیم ادیبوں پر لگایا جاتا ہے وہ زیادہ صحیح طور پر موجودہ ادیبوں پر صادق آتا ہے۔ آج ترقی پسند ادیب اپنے دور کے ادیبوں کو مجبور کر رہے ہیں کہ ادب کو پروپگنڈے کے روپ میں پیش کیا جائے۔ سرخ پرچم کے اونچا ہونے کی دعا کی جائے۔ عوام کی زندگی اگر وہ بھی ایسی زندگی پیش کی جائے جو ہر لحاظ سے نظر انداز کرنے کے قابل ہے جو ادیب ان کے اس "عظیم مقصد" کا ساتھ نہیں دیتا اسے رجعت پسند، قدامت پسند اور مختلف دوسرے نازیبا اور ناشائستہ القاب کے ساتھ یاد کر کے دل کی بھڑاس نکالی جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ ان ادیبوں کے سر میں عجیب سودا سمایا ہے۔ وہ ادب میں عوام کو پیش کرنا چاہتے ہیں اور اسی کوشش میں ان کی تحریروں میں عامیانہ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ یقیناً ادب میں زندگی کو پیش کر رہے ہیں لیکن ایسی زندگی کو جسے دیکھ کر زندگی ہی سے جی بیزار ہو جائے۔ وہ حقیقت نگار ضرور ہیں لیکن ان کی حقیقت نگاری اخلاق و مذہب کی سرحدیں پار کر چکی ہے۔ اور عریاں نگاری کے روپ میں نظر آ رہی ہے۔

اگر کوئی شخص جدید ادب پڑھنے سے پیشتر جدید ادیبوں کی ان تنقیدوں کو پڑھے جو جدید ادب پر کی گئی ہیں تو اسے یقین ہوتا ہے کہ جدید ادب واقعی بہت اعلیٰ پائے کی چیز ہوگی لیکن اس ادب کے مطالعے کے بعد یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ جس ادب کے متعلق ایسی اعلیٰ پائے کی تنقیدیں لکھی گئی ہیں وہ خود کوئی اعلیٰ پایہ کی چیز نہیں۔ گویا اس لحاظ سے یہ تنقیدیں گمراہ کن ہیں۔ لیکن اگر جدید ادب کم از کم اس سطح پر آ جائے جس پر یہ تنقیدیں نظر آتی ہیں تو یہ بھی بہت غنیمت ہے۔

ہماری یہ خواہش ہے کہ جدید ادب کو کم از کم اس سطح پر آنا چاہیے جس پر اس کی تنقیدیں آ چکی ہیں۔ اگر یہ ہو جائے تو جدید ادب واقعی قابلِ قدر چیز ہو گی۔ ورنہ میرے نزدیک موجودہ حالت میں اس کی ہمت افزائی کرنا ادبی گناہ سے کم نہیں۔

محمد منظور احمد

صحرائی درندے

(ایک تصویر)

یہ صحرائی کہ ہے شہروں میں رسوا جن کی خونخواری ۔۔۔ نہ ان کا کفر نیلامی، نہ ان کا دین بازاری
نہ یہ "نیچے"، نہ یہ "پنڈت"، نہ یہ "ملا"، نہ یہ صوفی ۔۔۔ نہ یہ "نازی" نہ یہ "تازی"، نہ یہ مصری نہ یہ کوفی
نہ دامِ معبد و ہیکل، نہ فتراکِ کلیسائی ۔۔۔ نہ تسبیحوں کے پھندے ہیں، نہ زناروں کی گہرائی
کسی مسجد میں یہ جھوٹی حدیثیں گڑھ نہیں سکتے ۔۔۔ کسی منبر کے اوپر یہ درندے چڑھ نہیں سکتے
نہ یہ افغاں، نہ یہ سید، نہ شیخ و گبر و نصرانی ۔۔۔ نہ سینہ ہے کوئی کالا، نہ ماتھا کوئی نورانی
نہ عصمت کی کوئی منڈی، نہ دلالوں کے پھیرے ہیں ۔۔۔ نہ صبح ذکر و قوالی، نہ چکلوں کے اندھیرے ہیں
نہ سجدوں کے نشانوں سے کوئی مغرور پیشانی ۔۔۔ نہ ہاتھوں پر کسی کے خون سے قشقوں میں تابانی
نہ ہونٹوں پر ہنسی جھوٹی، نہ زہرآلودہ دلداری ۔۔۔ نہ اخلاقوں کی عیاری، نہ آدابوں کی پرکاری
نہ سکوں کی تلاوت ہے، نہ کفر و دین کی ذلت ۔۔۔ نہ یہ چاندی کے پیغمبر، نہ یہ جاگیر کی امت
شمار ان کا نہیں "زر" کے تراشیدہ کمینوں میں ۔۔۔ نہ صبحیں ان کے ہونٹوں پر، نہ راتیں ان کے سینوں میں
کلاہِ "یارجنگی" ہے نہ کفشِ "آسماں جاہی" ۔۔۔ نہ زنجیروں کی تاریکی، نہ قندیلِ شہنشاہی
ضمیر و قلب کو "سونے" کی لو پگھلا نہیں سکتی ۔۔۔ ہوائے بام و در دشت و جبل تک آ نہیں سکتی
کسی ملبوسِ زریں سے نظر دھوکا نہیں کھاتی ۔۔۔ گلاب و عطر کی بدبو کہیں پائی نہیں جاتی

یہ حیواں جن کا تاج و تخت سے کوئی نہیں ناتا
انھیں خود اپنی نسلوں کو نگل جانا نہیں آتا

شور

وجہی اور ابن نشاطی کے اسالیب کا موازنہ

زیرِ نظر مضمون میں ہم وجہی اور ابن نشاطی کے اسلوبِ بیان اور زبان کا مطالعہ صرف صنفِ مثنوی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کر رہے ہیں۔ ان کے نثری کارناموں اور دیگر اصنافِ سخن سے فی الحال ہمیں بحث نہیں ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ولی اورنگ آبادی سے قبل دکنی زبان میں اگر کسی صنفِ سخن کو معراجِ کمال پر پہنچنے کا موقع ملا تو وہ صنفِ مثنوی ہے۔ اردو ادب کا سرمایہ عرصۂ دراز تک غزل رہی ہے اور وہ بھی دیگر اصنافِ سخن کی طرح منت کشِ فارسی ہے۔ غزل کی اردو میں ترقی اور عروج کی غالباً ایک بڑی وجہ اس کی رمزیت ہے اور جس طرح مشرقی شعرا کا معشوق پردہ کی رسم و رواج کی وجہ سے "حجاب اندر حجاب" بنا رہا اسی طرح شاعر کا ہر جذبہ و خیال رمزیت کا پیرایہ اختیار کرتا گیا۔ غزل کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے (واضح ہو کہ میں صنفِ غزل کی مخالفت نہیں کر رہا ہوں) کہ وہ شاعر کے محض اندرون کی آئینہ داری کرتی ہے اور اس بیرونی دنیا (objective world) کا، ہمیں اس میں کوئی نقش نہیں ملتا جس میں خود شاعر اٹھتا بیٹھتا، غور و فکر کرتا اور ہر جذبہ و خیال کا ادراک کرتا ہے۔ غزل کے برخلاف مثنوی میں اتنی وسعت ہے کہ اس میں شاعر کا اندرون اور بیرون یا اس کے داخلی اور خارجی دونوں عناصر بار پا سکتے ہیں۔ اور پھر جہاں تک مثنوی کی ٹکنیک کا تعلق ہے وہ ردیف و قافیہ کے تسلسل سے بھی آزاد ہے۔ ہر شعر کا قافیہ اور ردیف دوسرے شعر سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ صنفِ مثنوی اپنے اندرون کے اعتبار سے بھی کچھ اتنی وسعت گیر واقع ہوئی ہے کہ اس میں تمام اصنافِ سخن کی خصوصیات سما سکتی ہیں۔ غزل کا سوز و گداز، قصیدے کی تشبیب کا چمن، ڈرامے کی کردار نگاری، نیچرل شاعری کی مرقع نگاری، غرض ہر خیال اور ہر جذبہ جو شاعر کے سینہ میں موجزن ہو اس میں بآسانی ظاہر ہو سکتا ہے۔ غالباً یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے مثنوی کی صنف کو دکن میں بہت جلد ترقی حاصل ہوئی۔ دکن کے مشہور مثنوی نگاروں میں نصرتی، غواصی، وجہی، ابن نشاطی، رستمی، غلام علی وغیرہ کے نام نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ دکنی مثنویات کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے موضوع اور پلاٹ کے اعتبار سے اورجنل ہیں اور دوسرے وہ جو فارسی یا ہندی مثنویات کا ترجمہ ہیں۔ چنانچہ ہمارے پیش نظر مثنویوں "قطب مشتری" اور "پھولبن" میں اول الذکر اورجنل اور سلطان محمد قلی قطب شاہ کی داستانِ حسن و عشق پر مبنی ہے۔ اور موخر الذکر فارسی مثنوی "بساتین" سے ماخوذ بلکہ بڑی حد تک اس کا ترجمہ ہے۔

جہاں تک ان دونوں مثنویوں کے اسلوبِ اظہار کا تعلق ہے ہم اک ذرا ان مثنویوں کے لکھنے والوں یعنے ابن نشاطی اور وجہی ہی سے کچھ سن لیں۔ ابن نشاطی 'پھولبن' میں لکھتا ہے۔

اسے انشا پو میرا میل دائم
طبیعت کو مری ہے حظ ملائم

جس سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ ابن نشاطی کو اپنی شاعری سے زیادہ نثر نگاری یا "انشاء پردازی" پر ناز تھا۔ یا دوسرے الفاظ میں مثنوی "پھولبن" آمد نہیں بلکہ آورد کا نتیجہ ہے۔ ابن نشاطی نے اپنے اندرونی جوہر کو پیش نظر رکھے بغیر محض اپنی طبیعت پر زور دے کر 'پھولبن' لکھی ہے۔ اس کے برخلاف وجہی اپنی مخصوص شاعرانہ تعلی کے لہجے میں اپنے آپ کو ایک بڑا شاعر بتاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میں نے "قطب مشتری" میں وہ

وہ باتیں لکھی ہیں کہ لاکھ برس تک بھی انسان اس کو سمجھ نہیں پائے گا ؎

جو لک برس کوئی سر پیوے رنج کوں | پناوے کد ہیں اس چھپے گنج کوں
ہوا جیو جب شعر یو بولنے | خزینے لگیا غیب کے کھولنے
اگر غوطے لک برس غواص کھائے | تو یک گو ہر اس دھات اموک نپائے
یو موتی نہیں وو جو غواص پائیں | یو موتی نہیں وہ جو کس ہات آئیں

پھر کہتا ہے کہ میرے اشعار کو سن کر لوگوں کا دل اس طرح پگھلنے لگتا ہے جس طرح مصری پانی میں پگھلتی ہے ؎

ترا شعر سن دل پگلتا ہے یوں | کہ پانی تے ابلو ج مصری گھلتا ہے جیوں

وجہی کی یہ تعلّی کوئی مجذوب کی بڑ نہیں بلکہ درحقیقت خودداری اور انفرادیت کے احساس پر دال ہے۔ "قطب مشتری" کسی فارسی یا ہندی مثنوی کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ یہ محض وجہی کے ذوق اور اندرونی خواہش کی پیداوار ہے۔ بلا شبہ وجہی کی یہ مثنوی اپنے بلند شاعرانہ اور فلسفیانہ موضوعات اور نکات کے اعتبار سے اردو ادب کا بہت بڑا شاہکار ہے جس تک "پھولبن" کسی طرح لگا نہیں کھا سکتی۔ لیکن جہاں تک شعر کے ظاہری محاسن کا تعلق ہے ہم "پھولبن" کی شاعرانہ ندرتوں کو "قطب مشتری" کے مقابلہ میں کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ ابن نشاطی نے ایک بڑا مفکر نہ ہوتے ہوئے بھی کچھ ایسی شعریت پائی تھی کہ ہمیں اس کے شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں (گو وہ شعریت کے اعتبار سے بھی وجہی کی ٹکر کا شاعر نہیں ہے) ابن نشاطی نے کچھ ایسا انداز بیان پایا تھا کہ بسا اوقات ہمیں اس کی آورد پر بھی آمد کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ بلکہ ہر مقام پر وہ روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے جو وجہی سے کسی طرح کم درجہ نہیں۔ اور پھر زبان بھی اس کو ایک ایسے دور کی زبان ملی تھی جو وجہی سے بہت آگے نکل چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سلاست اور صفائی و سادگی جو ابن نشاطی کے دور کی خصوصیات ہیں وجہی کی "قطب مشتری" میں نہیں ملتیں۔

جدت اور اپج ۔ جیسا کہ ہم نے گزشتہ سطور میں بیان کیا ہے مثنوی "پھولبن" فارسی مثنوی "بساتین" سے ماخوذ اور اسی کا ترجمہ ہے۔ لیکن ایک ذرا سی جدت ابن نشاطی نے اس میں یہ دکھائی ہے کہ "مناجات" کا حصہ اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے۔ یوں تو اور بھی ایسے مقامات ہیں جہاں کہیں کہیں ابن نشاطی کے انفرادی رنگ کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ خصوصاً مذہبی موضوعات پر جب وہ قلم اٹھاتا ہے تو اس کا اندرونی سوز و گداز اور مذہبی جوش و خروش ظاہر ہونے لگتا ہے۔ لیکن "مناجات" اس مثنوی کا ایسا حصہ ہے جس میں ابن نشاطی کی ذاتی جدت و اختراع پوری شان کے ساتھ ہویدا ہے۔ لیکن اگر "پھولبن" کے اس حصہ کو نظر انداز کر کے جب ہم "قطب مشتری" سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں کوئی بات سوائے ایک دو مثالوں کے نئی نظر نہیں آتی۔ "قطب مشتری" یوں بھی پلاٹ اور موضوع کے اعتبار سے اوریجنل ہے۔ لیکن جو خیالات و جذبات وجہی نے اس میں ظاہر کئے ہیں وہ ماخوذ یا ترجمہ نہیں اس کی ذاتی اور انفرادی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ کہیں تو وہ شاعری کے بلند موضوعات، اس کے اندرون اور اس کی اسپرٹ پر تنقید کرتا ہے تو کہیں حسن کی حقیقت و ماہیت کی تعریف کرنے لگتا ہے۔ مثلاً شاعری کی سب سے بڑی خوبی وجہی کے نزدیک اس کا تاثر ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بغیر تاثر کے شاعری محض بیکار ہے۔ پھر وہ بیان کرتا ہے کہ شاعری کی عبارت بہت سادہ ہو اور الفاظ اس طرح استعمال کئے جائیں کہ عبارت کا مطلب بآسانی سمجھ میں آسکے۔ لیکن یہی الفاظ پر اثر بھی ہوں۔

پھر وہ حسن کی تعریف یوں بیان کرتا ہے کہ "حسن، معشوق یا کسی شئے کے اعضا و اجزا میں نہیں ہوتا بلکہ خود دیکھنے والے کی چشم بینش میں اس کی جھلک موجود ہوتی ہے۔ حسن کا تعلق رنگ و بو سے نہیں، بلکہ وہ ایک اضافی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

نہ یک جنس لک جنس محبوب ہے جو بھاوے اپس کوں وہی خوب ہے
جو عاشق لبدتا ہے دیک آس تے وہ کچھ تھارج ہے رنگ اور باس تے

ایک اور مقام پر وجہی نے عشق کی ماہیت سے بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ایک ایسا سوز ابدی ہے کہ اس کی حقیقت اور کنہ آج تک انسان کو معلوم نہ ہوسکی۔

ع "یو کیا بھید ہے کوئی کہتا نہیں"

اور پھر وہ اس حقیقت نامعلوم کو مانتے ہوئے اس کی تاثیر کے متعلق کہتا ہے کہ "جذبات"، "عقلیت" سے بڑھ کر قوت رکھتے ہیں۔

ع "کہ آدم پہ غالب ہے دل کیا سبب؟"

اس قسم کے بیسیوں اور بحثل موضوعات "قطب مشتری" کی جان ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ "پھولبن" اس طرح کے عمیق اور اوبحثل موضوعات سے خالی نظر آتی ہے۔

معاشرت کے عناصر

شاید ہی کوئی ایسا مقام ہوگا جہاں وجہی نے "قطب مشتری" کے افسانوی پردہ میں اپنے دور کی معاشرت پر تنقید نہ کی ہو۔ محمد قلی قطب شاہ کو اس داستان کا ہیرو بنا کر وجہی نے دکن کے تمام سیاسی، معاشری اور ثقافتی اقدار و معیار پر روشنی ڈالی ہے۔ اور ایک تہذیب یافتہ طبقے کے خیالات کو قلم بند کیا ہے۔ "پھولبن" میں یہ (Social Elements) مشکل ہی سے کہیں پائے جاتے ہیں۔ شاید ہی ایک دو مثالیں ہم ایسی پیش کرسکیں جن میں ابن نشاطی نے اپنے دور کی زندگی کو سمویا ہو۔ اور عام سیاسی معاشری رجحانات پر روشنی ڈالی ہو۔ مثلاً ابن نشاطی جہاں سمن کے جزیرے کے محل کا نقشہ کھینچتا ہے تو اس کی دیواروں پر قطب شاہی بزم کی تصویریں بھی دکھاتا ہے۔ اسی طرح سمن برکے کردار کے پیچھے ہمیں ابن نشاطی کے دور کی حسین دوشیزائیں نظر آنے لگتی ہیں۔ ان ایک دو مثالوں کے قطع نظر ہمیں مشکل سے "پھولبن" میں دکن کی خارجی زندگی کے حقائق ملیں گے۔ اس کے برخلاف وجہی نے ایک ناقد اور مفکر شاعر کی حیثیت سے اپنے دور کی زندگی پر جگہ جگہ تنقید کی ہے۔

محاکات اور کردار نگاری

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن نشاطی نے افسانے کے مختلف کرداروں کے ربط و تعلق اور ان کے موقع و محل کو خوب سمجھا ہے اور ان میں وہ تمام خصوصیات پیدا کردی ہیں جو ایک ڈرامے کے کردار میں موجود ہونی چاہئیں۔ لیکن پھر بھی "قطب مشتری" اس خصوص میں "پھولبن" سے بہت آگے نکل جاتی ہے۔ اس کے کردار زندہ انسان اور چلتی پھرتی تصویریں معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ہر کردار اس خوبی سے پیش کرتا ہے کہ ان کے ہر موقع و محل کی گفتگو اور حرکات و سکنات بالکل فطری معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور ان کرداروں پر ہمیں ایک اداکار کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ تصنع یا تکلف یا آورد "قطب مشتری" کے کسی کردار میں ہمیں نہیں دکھائی دیتی۔ برخلاف اس کے "پھولبن" میں کہیں کہیں تصنع اور تکلف کا شائبہ پایا جاتا ہے۔

اور پھر جب ہم محاکات پر غور کرتے ہیں تو "قطب مشتری" ایک لاجواب مثنوی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایک ایسے دور میں جبکہ اردو ادب عہد طفولیت سے گزر رہا ہو، وجہی کا ایک ایسا اور بے مثل شاہکار پیش کرنا معجزہ سے کم نہیں۔ خصوصاً محاکات کا تو وجہی باوا آدم معلوم ہوتا ہے۔ اگر ذرا میر حسن کے باغ کے سین اور وجہی کے باغ کے سین دونوں کو پیش نظر رکھ کر غور کیجئے تو باوجود زبان کی ابتدائی کوتاہیوں کے ہم وجہی کو کسی طرح میر حسن سے پیچھے نہیں دیکھتے بلکہ بعض اعتبارات سے وہ ان سے بھی بہت آگے نکل گیا ہے۔

تشبیہ و استعارہ

اگر زبان کے ایک تھوڑے سے تغیر کے ساتھ وجہی کی تشبیہات و استعارات پیش کی جائیں تو ہمیں ان کے جدید ہونے میں کوئی شبہ نہ ہوگا۔ ایسی جدت اور انوکھاپن ان تشبیہات میں پایا جاتا ہے کہ وجہی کے دور کا خیال کرتے ہوئے ہمیں تعجب ہے کہ یہ جدید رنگ کیسے ان میں چلا آیا۔ مثال کے طور پر وجہی نے باغ کے سین میں جو نازک تشبیہات باندھی ہیں ان کے چند نمونے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) اچھیں نین اس کیس کالے منے　　کہ مچھلیاں دو سنپڑیاں ہیں جالے منے

یعنی زلفیں چہرے پر بکھر گئی ہیں تو ان کالے بالوں میں دو آنکھیں ایسی معلوم ہو رہی ہیں جیسے دو مچھلیاں جال میں پھنس گئی ہوں۔

(۲) اچھلتیاں ہیں بجلیاں اجالاں تلے　　کہ نیناں جھمکتے ہیں بالاں تلے

یعنی آنکھیں بالوں میں ایسی چمک رہی ہیں جیسے بادلوں میں بجلی۔

(۳) سو دھن کے سوا ویدوسے یوں گہر　　کہ بیٹھے ہیں جگنے مگر سرو پر

یعنی معشوق کے بدن پر گوہر ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے سرو پر جگنو۔

(۴) رہی چوٹی یوں پیٹ پر اچھب سوں آ　　پٹی پر اچھے جیوں الف ثلث کا

یعنی پیٹھ پر پڑی ہوئی چوٹی گویا تختی پر خط ثلث کے الف کی طرح معلوم ہوتی ہے۔

"قطب مشتری" کی ان تشبیہوں کو دیکھنے کے بعد جب ہم "پھولبن" پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ یکسر اس لطف و نزاکت سے خالی نظر آتی ہیں۔ ان میں وہی پرانا پن اور روایت پسندی معلوم ہونے لگتی ہے جو قدیم دور کی خصوصیات ہیں۔

زبان

"قطب مشتری" کا سن تصنیف سنہ ۱۰۱۸ھ ہے اور پھولبن کا سنہ ۱۰۶۶ھ ہے۔ اس طرح ان کے درمیان ۴۸ برس کی خلیج حائل ہے جس کے دھاروں پر زبان مختلف انقلابات سے دوچار ہوتی رہی۔ ملا وجہی محمد قلی قطب شاہ کے دور کا درباری شاعر تھا اور ابن نشاطی عبداللہ قطب شاہ کے دور کا۔ ادوار کے اس ظاہری فرق سے ہمیں وجہی اور ابن نشاطی کے لسانی اختلافات اور تبدیلیوں کا پتہ ملتا ہے۔

وجہی یا محمد قلی قطب شاہ کے دور میں دکن بیرونی حملوں کے خطرہ سے آزاد، اور ملک میں ہر طرف خوشحالی اور امن و امان کا دور دورہ تھا۔ یوں تو وہ "رشتۂ اتحاد" جس کا سنگ بنیاد "حسن" کے ساتھ "گنگو بہمنی" کے جوڑنے پیدا کر دیا تھا روز بروز مستحکم ہو رہا تھا لیکن اندرونی اطمینان اور امن کی وجہ سے یہ اتحاد اور یگانگت محمد قلی قطب شاہ کے دور میں اپنے انتہائی نقطہ کو پہنچ چکی تھی۔ محمد قلی قطب شاہ کی دکن زدگی کا تو یہ عالم تھا کہ اس نے لباس اور طرز

ماندو پولو تک ہندوؤں ہی کی اختیار کر لی تھی۔ اس یگانگت اور میل ملاپ کا ایک بڑا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اردو ادب (میری مراد دکھنی ادب سے ہے) میں دکن کے مقامی عناصر تیزی کے ساتھ داخل ہوتے گئے۔ چنانچہ وجہی کی 'قطب مشتری' میں اور 'سب رس' میں مختلف زبانوں کے محاورے، الفاظ اور ضرب الامثال اسی اثر کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ جن خاص طور پر سنسکرت، ہندی بھاشا، تلنگی اور مرہٹی زبانیں قابل ذکر ہیں۔ وجہی نے بیسیوں ایسے الفاظ اور محاورے استعمال کئے ہیں جو عام طور پر دکن میں بولے اور سمجھے جاتے تھے اور جن کا تعلق بڑی حد تک (Colloquial) زبان سے تھا۔ اس کے برخلاف ابن نشاطی کے دور میں دکنی عناصر سے زیادہ شمالی ہند کے عناصر یعنی فارسی الفاظ و محاورے کثرت سے داخل ہو رہے تھے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے اندازہ کے مطابق وجہی کے دور میں ہندی بھاشا اور فارسی عربی الفاظ کا تناسب ڈھائی اور ایک کا تھا۔

دکنی زبان کی ابتدا (Mahenjodaro) تو بلا شبہ ہندی بھاشا سے جا ملتی ہے لیکن الفاظ کے نقل مقام اور مرور ایام کی وجہ سے ان میں ایسی تبدیلیاں پیدا ہو چکی تھیں جن کا تعلق نہ ہندی بھاشا سے تھا اور نہ عربی و فارسی سے بلکہ خالص دکنی زبان کی انفرادی خصوصیات سے تھا۔ کہیں الفاظ کے تلفظ میں تبدیلیاں ہو گئی تھیں تو کہیں ان کے لہجے اور بیرونی ہیئت ہی بدل گئی تھی۔ کہیں کچھ حروف کا اضافہ ہوا تھا تو کہیں اختصار پیدا ہو گیا تھا۔ مثلاً 'بوجھنا' اور 'دودھ'، جس میں (ھ) ایک (Short Vowel) کے طور پر استعمال ہوا ہے متغیر ہو کر 'بوجنا' اور 'دود' ہو گئے۔ اسی طرح آنکھ، آنک، بن گئی۔ بعض عربی اور فارسی کے ایسے الفاظ جن کا صحیح تلفظ دکنی عوام میں نہیں پایا جاتا تھا، وجہی اور دیگر دکھنی ادیبوں نے ان کو اسی غلط تلفظ کے تحت باندھا ہے۔ حالانکہ وہ اس غلطی سے آگاہ تھے۔ مثلاً وضع، صبح، اور عقل کے بجائے وجہی وضا، صبا، اکل لکھتا ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی تغیرات کا ہمیں پتہ ملتا ہے۔ جن کا تعلق خالص دکنی معاشرت، دکنی تہذیب، اور دکنی زبان سے ہے۔ جب تک دکن کی سرزمین بیرونی حملوں سے محفوظ رہی یہ تغیرات بڑھتے رہے لیکن جب مغلوں کے ساتھ دکن میں مغلوں کی زبان نے قدم جمائے تو دکھنی زبان میں بجائے دکھنی عناصر کے شمالی ہند کے عناصر داخل ہونے لگے۔

چنانچہ ابن نشاطی کے دور میں عبداللہ قطب شاہ نے شاہجہاں کی اطاعت قبول کر لی تھی اور ملکی آزادی کا خاتمہ ہونے لگا تھا۔ شمال کی سیاست دکن پر تیز گام ابر کی طرح چھائے جا رہی تھی۔ شمال کی تہذیب و تمدن اور ثقافت و زبان دکن میں تیزی کے ساتھ پھیلتے چلے جا رہے تھے! چنانچہ شمالی ہند کی وہ زبان جو فارسی سے متاثر اور اس کی آفریدہ تھی، دکنی زبان میں داخل ہونے لگی۔ لیکن پھر بھی ایسے بیشتر الفاظ و محاورات جو دکھنی زبان میں رس بس گئے تھے۔ ان کا نکالنا بہت مشکل تھا۔ یہاں یہ نہ سمجھا جائے کہ شمال کے اس عنصر کے داخل ہونے سے دکنی زبان میں کوئی لسانی انحطاط پیدا ہو رہا تھا، بلکہ اس کا خوش گوار نتیجہ بھی برآمد ہوا کہ دکنی زبان روز افزوں ارتقا پانے لگی۔ ابن نشاطی کے دور میں اب وہ تعقید اور ثقالت باقی نہیں رہی تھی جو وجہی کے دور کی خصوصیت تھی۔ وجہی کی زبان میں بلا شبہ او بیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے لیکن اس کو کیا کہیے کہ وجہی کو وہ سادہ و سلیس زبان نہیں ملی جو بعد میں منجھ منجھ کر ابن نشاطی کے دور میں عوام الناس کی زبان پر بھی چڑھ گئی تھی۔ اگر ہم آج ہم 'قطب مشتری' اور 'پھولبن' کا پہلو بہ پہلو مطالعہ کرتے ہیں تو دونوں کی زبان ہمارے لئے ایک ہی قسم کی دشواریاں پیش کرتی ہے۔ لیکن 'پھولبن'

کا انداز خود بتائے دیتا ہے کہ یہ وجہی کے بہت بعد کی صاف اور نکھری ہوئی زبان ہے۔ سچ پوچھئے تو "پھولبن" کو "قطب مشتری" پر اگر کسی اعتبار سے ترجیح دی جا سکتی ہے تو وہ پھولبن کا سادہ و سلیس اور رواں دواں طرزِ تحریر ہے۔ ابن نشاطی میں وہ بلند پایہ ادبی خصوصیات تو نہیں پائی جاتیں جو وجہی کی اپنی انفرادی خصوصیات ہیں لیکن جہاں تک زبان، اور طرزِ اظہار کا تعلق ہے ابن نشاطی زیادہ قادر الکلام شاعر کہا جا سکتا ہے۔ جذبات کی حقیقی تصویر اُس کے لفظی اور معنوی صنایع بدایع کے پردوں میں چھپ جاتی ہے۔ پوری مثنوی "پھولبن" مرصع ہے لیکن اس کو اعجازِ سخن کہیئے یا کچھ اور کہ ابن نشاطی نے کہیں بھی سلاست و روانی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

بہرحال جہاں تک شعر کی معنویت اور اس کے اندرون کا تعلق ہے ابن نشاطی وجہی سے کسی طرح لگا نہیں کھا سکتا۔ اور جہاں ہم شعر کے بیرون یعنی زبان اور زبان کے ظاہری و معنوی محاسن پر نظر کرتے ہیں تو ہم ابن نشاطی کے مقابلہ میں وجہی کو بہت پیچھے دیکھتے ہیں۔ ابن نشاطی کی طبیعت میں جودت اور تیزی کا ایک بڑا جوہر موجود تھا۔ اور زبان میں وہ جدتیں اور ندرتیں پیدا کرتا تھا کہ ہم کو اس کی بہت کم مثالیں وجہی میں ملتی ہیں۔ لیکن وجہی کی سی پختگی اور تجربہ کاری سے وہ عاری تھا۔ وجہی ایک شاعر اور صاحب ذوق شاعر کے ساتھ ساتھ ایک مفکر اور حساس انسان بھی تھا، اور یہی وہ ایسی خصوصیات ہیں جو اس کی تصنیفات کو ادبیاتِ عالیہ میں شمار ہونے کے قابل بنا دیتی ہیں۔

محمد معین الدین

نقادوں سے!

تو یہ سچ ہے کہ میں نے جب بھی اپنا ساز چھیڑا ہے — مرے نغموں میں غیروں کے تخیل مسکرائے ہیں؟

ابھی تک جب بھی میں نے آئینے میں خود کو دیکھا ہے — مرے چہرے پہ نامعلوم سائے جھلملائے ہیں؟

ابھی تک جب بھی اپنا ہاتھ پھولوں تک بڑھایا ہے — کسی نے کہہ دیا چپکے سے "ٹھیرو، یہ پرائے ہیں!"؟

مگر یہ بھی تو سوچو اے مرے بے رحم نقادو! — کہ میں نے کس طرح "یہ نامکمل گیت" گائے ہیں

بڑی مشکل سے ٹکرائے ہیں آنسو چاند تاروں سے — بڑی مشکل سے ویرانے میں غنچے لہلہائے ہیں

بڑی مشکل سے روشن رہ سکی افکار کی محفل — ہوا تو کیا بگولے شمع کے دامن تک آئے ہیں

ابھی کیا ہے؟ مجھے بس اک ذرا زندہ تو رہنے دو — ہوائیں تیز ہیں، یہ شمع تابندہ تو رہنے دو!!

سلام مچھلی شہری

وہ دو عورتیں

یہ مراٹھی کے مشہور افسانہ نگار وامن چورگھڑے کا افسانہ ہے۔ وامن چورگھڑے مراٹھی کے ان افسانہ نگاروں میں ہیں جنھوں نے مراٹھی افسانہ میں ایک جدید راہ نکالی۔ اس سے پہلے میں نے ان کا ایک افسانہ ترجمہ کرکے "شاہکار" میں بھیجا تھا جو ڈیڑھ سال پہلے چھپ چکا۔ ایک مجلہ عثمانیہ میں بھی "آرٹ اور زندگی" کے نام سے چھپا۔ اب یہ تیسرا افسانہ آپ کی خدمت میں مرسل ہے۔ کرشن چندر نے بھی جو "نئے افسانے" مرتب کی ہے اور اس میں ہر زبان کے چوٹی کے افسانہ نگاروں کے افسانے شامل کئے ہیں اس میں چورگھڑے کا بھی ایک افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ٹکنیک اور طرز کے لحاظ سے خاص حیثیت رکھتا ہے۔ عورتوں کی بھی مزدور پیشہ طبقہ کی عورتوں کی شوخی، ظرافت کو جس انداز سے بیان کیا ہے وہ اسی کا حق ہے۔ (مترجم)

اور اس کے بعد وہ تیزی سے اٹھی، اس نے اس کے اس پتھر کے نیچے ہمیشہ کی طرح دھوپ کھک جانے پر کپڑا دھونا بند کر دیا۔ گھر میں کچھ آواز ہوئی اسی لئے ہاتھ کا کام وہیں چھوڑ کر وہ اندر گئی۔ بلے کے منہ سے نوچی ہوئی آدھی روٹی اس نے کھپریوں کے نیچے چھپا رکھی اور کوٹھری کے باہر نکل کر بانس کا دروازہ ڈھانپ دیا۔ باہر رادھا کھڑی تھی۔ اس نے اس کی طرف دیکھا اور "چلو رادھا" کہہ کر چل پڑی۔ ابھی آٹھ بھی نہیں بجے ہوں گے مگر کہیں دیر نہ ہو جائے، اسی ڈر کے مارے دونوں بھی جلدی جلدی چلنے لگیں۔ چلتے وقت ان کے ہاتھ کی کانسے کی چوڑیوں کی آواز آ رہی تھی۔

"رادھا، دیر تو نہیں ہوئی؟" پل کے چونگوں سے نکلے جانے والے دھوئیں کی طرف دیکھتے ہوئے رامیسری نے پوچھا "نہیں ری۔ مگر تجھے ایسی جلدی کیا پڑی ہے؟ شائد شام کا کام کاج سب کر رکھا...... صبح ہی کا تو گاڑی بھر کام پڑا ہے۔ تیری جیسی سکھی کہاں ہوں میں؟ ساس اپنی روٹی ٹکرا اپنا کر رکھ دیتی ہے اور اپنا آرام سے..... ہاں ساس کے رنگ دیکھے نہیں ابھی؟ اسی لئے سکھ کے سپنے دیکھ رہے ہیں تجھے! خیر گھر کاج تو روز کا ہی رونا ہے مگر یہ تو بتا کہ تیری آنکھیں کیوں ایسی لال سوجھ آئیں؟"

"کل رات پلک سے پلک نہیں لگی"

"اچھا"۔۔۔۔ رادھا شرارت بھری مسکراہٹ کے بعد خاموش ہوگئی۔

"کیا ہوا ری ہنسنے کو؟" ذرا غصہ سے رامیسری نے اسے کرید کر پوچھا۔

"جو جاننا تھا سو تو کھل ہی پڑا۔ اب باتیں بنانے سے حاصل؟"

"اری! ویسا نہیں، تجھے تو ہمیشہ کچھ واہیات ہی سوجھتا ہے؟ میں جو کہوں سو واہیات اور تو جیسے بالکل ویراگن (جوگن) بن گئی ہے نا؟ ویسا نہیں تو پھر کیا؟ کل کی رات کیسی گل گلوں سے بیتی ہوگی۔ یہی نا؟"

"کیا مور کھ ہے ری؟ ذرا سنے گی بھی یا نہیں؟ ساہوکار کل دروازہ پر پہرہ لگائے بیٹھا تھا اسے سمجھاتے سمجھاتے کافی رات ہوگئی اور........"

"مگر روز جاتا ہے نا تیرا گھر والا رات کے کام پر؟"

"ہاں مگر کل پچیس بابین کی پوٹلی زیادہ ڈھوئی تھی اور لوٹ کر آتے ہوئے راستہ میں ناچ تماشا جو ہو رہا تھا سو وہیں رم گئے۔ ذرا دیر اور ڈولتے، جھولتے جو گھر آئے تو رات کے دو بجے تھے!"

"اور پھر تجھے جگایا گیا؟"

"اری! میں تو جاگتی ہی بیٹھی تھی مجھے بھلا اس وقت تک نیند کہاں آتی؟" بے چاری رامیسری نے بھولے پن سے یہ بات

کہہ دی مگر راؤھا کی شرارت بھری ہنسی سے اس کی غلطی اس کی سمجھ میں آ گئی۔

'راؤھا! آج تجھے بڑی ہنسی آ رہی ہے۔ جا میں تجھ سے بولوں گی ہی نہیں۔'

'ایسی بھی کیا تنک مزاجی۔ ذرا مذاق میں کہا' راؤھا نے اس کا پلو پکڑ لیا'

'اچھا۔ اچھا۔ بڑی آئی مذاق والی۔'

'نہیں نہیں میں رونی صورت والی ہی سہی' بس! اب تو بولے گی نا! مجھے بھی کئی بار بالکل نیند ہی نہیں آتی۔ ہاں تو دو بجے رات کو وہ آیا"۔۔۔ اس کی آواز سمجھوتے کی تھی'

رامیسری کا غصہ اس کے آخری الفاظ سے اتر گیا اور وہ بولنے لگی۔

" رات کے دو بجے کے بعد' اس پر تماشا دیکھ آنے کے بعد کیا وہ سونے دیتے مجھے؟ تھوڑی دیر گپ شپ ہو کر پلک جھپکی نہ جھپکی کہ سویرے کی سیٹی بجی' اور دونوں ہڑبڑا کر جاگ پڑے اور پھر اس کے بعد۔۔۔۔۔۔ مل کے پھاٹک کے پاس آتے ہی دونوں نے بولنا گویا ایک دم بند کر دیا۔ پھاٹک پر کا موٹا پٹھان ان کی طرف رسیلی پیاسی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جلدی جلدی اندر چلی گئیں۔ اندر کی سب جگہ کالی ہو گئی تھی کلوں کی عجیب عجیب آوازیں ایسی آ رہی تھیں جیسے قصائی لکڑے پر گوشت کے ٹکڑے کاٹتا ہے۔ باہر کے بڑے بڑے پنکھے برابر چل رہے تھے دونوں طرف لگی ہوئی ہنڈلوں پر کوئلہ کی گرد جم گئی تھی جس سے ان کا ہرا رنگ کالا مونگیا بن گیا تھا درخت ہوا میں اسی طرح لہرا رہے تھے گویا کہ کتنے ہی دنوں سے پانی نہ ملنے پر بھوکے آدمی نے بیزار ہو کر گردن ایک طرف جھکا دی ہو۔۔۔ وہ گویا بڑے ہو گئے اسی لئے' اور کسی طرح جی رہے تھے۔

ان پیڑوں کی آڑ میں وہ دو عورتیں بھی آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔

(نوشتہ) **وامن چورگھڑے**

(مترجمہ) امجد یوسف زئی

رات کا بھولا اور دیگر افسانے :- پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو فارسی و عربی مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں مثلاً دنیائے افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات ۱۶۰ قیمت عہ۔

محبت کی چھاؤں :- مرزا ظفرالحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔

نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔

چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد عہ

قافیہ کی صنفی قدر و قیمت

لغت میں قافیہ کے معنی ہیں "پیچھے آنے والا" پے در پے آنے والا اور اصطلاح میں ان چند حروف معین کا نام ہے جو مطلع اور ابیات مثنوی کے ہر مصرع کے آخر میں اور قطعہ اور باقی اشعار غزل و قصیدہ کے مصرعۂ ثانی کے آخر میں الفاظ مختلفہ کے اندر مکرر آتے ہیں۔ اور مستقل نہیں ہوتے۔ قافیہ کا اطلاق نو حروف پر ہوتا ہے۔ ردف، قید، تاسیس، دخیل، روی، وصل، مزید، خروج، نائرہ۔ لیکن ان سب حروف کا جمع ہونا ضروری نہیں۔ یہ ایک یا دو یا تین یا زیادہ جس قدر چاہیں جمع کریں اور یہ بھی خیال رہے کہ حرف روی اصل قافیہ ہے اسی پر قافیہ منحصر ہے۔ باقی آٹھ حروف کے لانے نہ لانے کا شاعر کو اختیار ہے۔ برخلاف حرف روی کہ کہ اس کے لانے پر شاعر مجبور ہے۔

اہل عرب کے یہاں ردیف نہیں ہوتی اس لیے ان کی ساری توجہ قافیہ کی خوش آہنگی پر صرف ہوتی ہے۔ چنانچہ عربی شاعری میں قافیہ پر طرح طرح کی پابندیاں ہیں۔ مثلاً قافیہ آخر بیت میں واقع ہو حرف قید کا التزام متعلق نہ ہو تاسیس حرف فیل کا التزام ضرور ہو، وزن ضرب بدلنے نہ پائے یعنی اگر قافیہ متواتر ہے تو سارے قصیدہ میں متواتر ہی رہے گا۔ ان سبھوں کو ایک ساتھ جمع کرنا بھی درست نہیں لیکن یہ بھی ممکن نہیں کہ ان میں سے کوئی قید پائی نہ جائے۔

برخلاف اس کے فارسی اور اردو والوں کے یہاں اتنے قید و بند نہیں۔ شائد اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس ردیف قافیہ کے صوتی سقیم کی تلافی کے لیے موجود ہے۔ اس کے علاوہ ردیف کی نباہ اس قدر مشکل ہے کہ اس کے ساتھ قافیہ پر بھی قید و بند عائد کرنا نفس مضلی کا خون کرنا ہے۔ چنانچہ اردو میں قافیہ کا اصول صرف اسی قدر ہے۔

"جو کلمات متشابہ الآخر ہوں خواہ ایک ہی حرف اور اس کی حرکت ماقبل کا متشابہ ہو۔ جیسے "در" "بر" خواہ چند حروف بعینہٖ ایک ہی طرح کے حرکات و سکنات کے ساتھ پائے جائیں بشرطیکہ ان حروف میں کم سے کم پہلا حرف اصلی ہو مثلاً "آرد" "کارد" میں سب حروف اصلی ہیں۔ "چبانا" "دبانا" میں "ب" اصلی ہے۔" (تلخیص عروض قافیہ)

اس کے باوجود فارسی اور اردو میں بھی قافیہ کے حسن و قبح پر ایک مستقل بحث ہے لیکن ان پیچ در پیچ الجھنوں سے بچنے کے لیے قافیہ کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دیا گیا ہے جو ہماری بحث کے سلسلہ میں کافی ہے۔

اعتراض:۔ شعر میں التزام قافیہ کی بحث وزن سے زیادہ متنازعہ فیہ ہے۔ جیسا کہ اکثر حضرات وزن کو شعر کے لیے ضروری نہیں سمجھتے۔ اسی طرح قافیہ بھی شعر کا لازمی عنصر نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن وزن شعر کی جس ضرورت کو پورا کرتا ہے قافیہ اس ضرورت کی تکمیل میں مساوات کرتا ہے۔ اب تک عربی فارسی نیز اردو شاعری میں قافیہ کا اس شدت کے ساتھ التزام رکھا گیا ہے کہ بغیر قافیہ کے مشرقی شاعری کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کچھ دنوں سے اور خاص کر ادبی انقلاب کے بعد سے قافیہ پر یہ اعتراض کیا جانے لگا ہے کہ اس کے التزام سے اظہار مافی الضمیر میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ حالی کا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا۔ لیکن قافیہ کی افادیت کا انہیں بھی پورا اندازہ تھا۔ اس مخالفت کے مندرجۂ ذیل اسباب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ انگریزی شعر و ادب کی تقلید میں ہمارے شعراء نے نظم معرا کی ترویج کرنی چاہی۔ دوسرا سبب جاپانی شاعری کے ترجموں اور ٹیگور کے شاعرانہ نثر کے تراجم کا وہ اثر ہے جس نے بالخصوص نوجوان شعراء کو شعر منثور کی طرف راغب کر دیا۔ تیسری وجہ نو وارد شاعری کا وہ تصنع ہے جو قافیہ اور ردیف کی بیجا ثقالت کے باعث پیدا ہو گیا ہے۔ غرض یہ اور اسی

نوع کے مختلف اسباب نے بعض ادبی حلقوں میں قافیہ سے بیزاری سی پیدا کردی ہے۔ ادبی انقلاب کے آغاز ہی میں شررؔ اور اسمٰعیل نے نظم غیر مقفٰی کو رواج دینے کی کوشش کی لیکن انھیں مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ بعد کو عظمت اللہ خاں نے بھی قافیہ کی پابندی کے خلاف بڑا سخت احتجاج کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ :-

"اب وقت آگیا ہے کہ خیال کے جگہ سے قافیے کے پھندے کو نکالا جائے اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ غزل کی گردن بے تکان ماردی جائے۔" (سریلے بال)

یہی نہیں بلکہ خاں صاحب سرے سے اردو شاعری ہی کی قلب ماہیئت کردینی چاہتے تھے۔ غزل کی بیخ کنی سے تشفی نہ ہو سکی تو دوسری اصناف پر بھی پل پڑے چنانچہ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ :-

"ہاں تو جہاں تک فنی تعلق ہے غزل اور غزل کے ساتھ موجودہ شعر و سخن کے اوزان سانچے بیدردی کے ساتھ توڑ دیے جائیں۔"

(سریلے بال)

لیکن حیرت ہے کہ خود خاں صاحب نے اپنی نظموں کے جو نئے نئے سانچے بنائے ہیں سوائے نظم غیر مقفٰی کے سبھوں میں قافیہ کا التزام ہے اور لطف یہ ہے کہ قوافی کی ترتیب اس قدر مشکل رکھی ہے کہ غزل سے زیادہ ان سانچوں میں قافیہ خیال کے لئے سنگ راہ ہوتا ہے۔ اور پھر اس مدت سے قافیہ کا وہ صوتی حسن بھی باقی نہیں رہا۔ ان کی دو تین نظموں کے سانچے ملاحظہ ہوں۔

وطن............ا ....ا

د ....

ب ....ب............ب

د ....

موہنی مورت ....ا ....ب

د ....

ط ....ب

د ....

پیارا پیارا گھر ....ا ....ب

ا ....ب

ان خاکوں میں کم و بیش ہر مصرعہ پابند قافیہ ہے اور ہم قافیہ مصرعوں کی دوری سے قافیہ کے التزام میں دقت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ صاحب سانچے انھوں نے انگریزی شاعری سے مستعار لئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اردو شاعری کے پرانے سانچوں کو توڑ کر یہ اور اسی نہج کے اور سانچے رائج کئے جائیں۔ لیکن انھوں نے قدیم سانچوں کے معائب پر ہر پہلو سے روشنی نہیں ڈالی۔ اگر ان کا عیب محض قافیہ کی رکاوٹ ہے تو یہ عیب ان کے جدید سانچوں میں بھی موجود ہے۔ خود انگریزی شاعری اور بالخصوص لرک کی اصناف میں قافیہ کا بڑا التزام ہے۔ بعض اصناف میں ہم قافیہ مصرعے اس قدر دور پڑتے ہیں کہ تسلسل و تکرار کا تناسی حسن محو ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اتنی دوری سے قافیہ کو نباہنے کی دقت بھی محتاج بیان نہیں۔ مثال کے لئے چند انگریزی اصناف کے سانچے ملاحظہ کریں۔

اسپنسری اسٹانزا (Spenserian Stanza) کی ترتیب یہ ہے۔ (a b a b b c b c c)

رفرین اسٹانزا (Refrain Stanza) ایک خالص لرک کی صنف ہے۔ جس میں ہر بند کا آخری مصرع ایک ہی لفظ پر ختم کیا جاتا ہے جس سے بند کی موسیقیت بڑھ جاتی ہے۔

سانٹ (Sonnet) کی اطالوی شکل یہ (
(octave) a b b a a b b a Sestet (c d e c d e)

سائٹ کی انگریزی شکل (ا ا ا ا ب ب ج د ج د ج د) (a a a a b b c d c d c d)

انگریزی شاعری کی اصناف میں قوافی کی بوقلموں ترتیب، سانچوں کی پیچیدہ ساخت اور اوزان کی تبدیلیاں معنی کا خون کرنے کی بجائے موسیقیت اور قوت اظہار میں اضافہ کرتی ہیں تو یہ فنی قیود اردو شاعری ہی میں تخیل کے لئے سنگ راہ کیوں بن جاتی ہیں۔ جہاں تک ہم نے اس اعتراض کی حقیقت پر غور کیا ہے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ناقدین نے شاعری کی کم سوادی کو قافیہ کی فنی قید کے سر تھوپا ہے۔

غزل کی تخلیق شعری بالعموم دو طرح پر عمل میں آتی ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ شاعر کسی معینہ خیال کو معینہ زمین میں پیش کرتا ہے۔ دوسری صورت اس کے برعکس ہے یعنی قافیہ کی تحریک سے جو خیال پیدا ہوتا ہے وہ اس کو شعر کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ پہلی صورت میں قافیہ کی مزاحمت شاعر کی فن کارانہ مہارت کے ساتھ گھٹتی بڑھتی ہے جس طرح ایک فن کار کو ایک عرصہ کی مشق و مزاولت کے بعد کسی فن پر قدرت تامہ حاصل ہوتی ہے بالکل اسی طرح ایک شاعر کو بھی ایک عرصہ کی سعی وکاوش کے بعد الفاظ، تراکیب اور پیرایۂ اظہار پر قدرت نصیب ہوتی ہے۔ اعلیٰ اظہار کے لئے محض الفاظ اور اسلوب پر قدرت ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انتقاد کی قوت بھی درکار ہے جس قدر انتقاد قوی ہوگا اسی قدر آسانی کے ساتھ لفظ و بیان کے موزوں ترین سانچے شاعر کی دسترس میں آتے جائیں گے۔ قدرت بیان اور قوت انتقاد کی ہی وہ ہم آہنگی ہے جو ایسے برجستہ ترین قافیہ کو ڈھونڈ لیتی ہے کہ اس لفظ اس سے زیادہ موزوں مقام تصور میں نہیں آسکتا۔ البتہ جس زمین میں قافیہ ثقیل اور ناہموار ہو اور پھر اس کے ساتھ ایک بے ربط اور طویل ردیف بھی جوڑ دی گئی ہو تو ظاہر ہے کہ ایسے قافیہ و ردیف اظہار مافی الضمیر میں مزاحم ہوں گے۔ لیکن یہاں بھی قصور قافیہ و ردیف کے فن کا نہیں بلکہ اس بدمذاقی کا ہے جو قافیہ و ردیف کے لئے بوجھل اور بے ربط الفاظ اختیار کرتی ہے۔

تخلیق شعری کی دوسری صورت تحریک قافیہ سے شروع ہوتی ہے۔ اور ایسی شاعری کو عام طور پر تیسرے درجہ کی شاعری سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کا نام قافیہ پیمائی اور تک بندی رکھا گیا ہے۔ یہ تصور غالباً دو اسباب کی بنا پر پیدا ہوا ہے ایک سبب تو یہ ہے کہ کم سواد شعرا جن کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا یا کچھ ہے بھی تو کہنے کی استطاعت نہیں رکھتے لیکن اس بے مائگی کے باوجود کچھ نہ کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ قافیہ کی مناسبت سے جو مضمون بھی سوجھ جاتا ہے باندھ دیتے ہیں یا اس قافیہ کے ساتھ جس قسم کے مضامین بندھتے آئے ہیں انھیں کو دہرا دیا جاتا ہے۔ ایسی شاعری کو قافیہ پیمائی کے سوائے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ دوسری وجہ شاعری کا وہ تصنع ہے جو قافیہ کی ناہمواری اور ردیف کی بے ربطی کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ جیسے "قفس کی تیلیاں" اور "عکس کی تیلیاں"۔ جیسی زمین میں شاعر سوائے تیلیاں چننے کے اور کیا کر سکتا ہے۔ اسی قسم کی شاعری کو دیکھ کر یہ کلیہ بنالیا گیا کہ قافیہ کی مرہون منت شاعری مصنوعی اور بے روح ہوتی ہے۔ حالانکہ متذکرہ دونوں صورتوں میں شاعر کی صلاحیتوں کی کوتاہی اس کی پست شاعری کی ذمہ دار ہے۔ صورت اول میں شاعر کی گرہ میں کچھ ہی نہیں جس کو قافیہ کی تحریک باہر لاسکے صورت ثانی میں شاعر کی کور ذوقی ایسا بھدا قافیہ اختیار کرتی ہے جو صرف غیر شاعرانہ تجربات کی پیش کشی پر مجبور کرتا ہے۔ غرض نتائج کے اسی غلط استخراج کے باعث قافیہ کی مخالفت کرنے والوں کو اس کی بے پایاں قوت تحریک کا اندازہ نہ ہو سکا۔ اگر شاعر کا وجدان تیز اور تخیل قوی ہو تو قافیہ کی ایک ذرا سی تحریک اس کے تحت شعور پڑے ہوئے گراں قدر تجربات کو شعور کی دنیا میں کھینچ لاتی ہے جہاں وہ شاعر کے جذبہ و احساس سے امتزاج پاکر الفاظ اور پھر تصور شعر کے مدارج سے گزرتے ہوئے تخلیق شعر کی منزل میں پہنچ جاتا ہے۔ فراق گورکھپوری نے اپنے

مضمون دور حاضر اور اردو غزل گوئی میں قافیہ کی اس افادیت کو پوری طرح واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی بحث کا ماحصل یہ ہے کہ:۔

"ہر قافیہ میں شاعر کے واردات حیات، تجربات و احساسات، اور نقد حیات کے راز مضمر ہیں۔ قافیہ و ردیف تحلیل نفسی کے ان تاثرات کا کام کرتے ہیں جو حیات شاعر کے بظاہر فراموش اور حقیقتاً کبھی فراموش نہ ہونے والے واقعات اور واردات کی ترجمانی میں محرک اور معاون ہیں۔ شاعر کی سوئی ہوئی شخصیت کو قافیہ و ردیف چونکا دیتے ہیں۔ مگر یہ صرف غزل میں داخلی اور نفسیاتی شاعری میں ممکن ہے۔ غزل میں قافیے شاعر کی نفسیاتی سوانحعمری کے علامات ہیں۔ قافیہ شاعر کے ذہن کے لئے ایک لحاظ سے پہلا قدم اور دوسرے لحاظ سے منزل پر آخری قدم کا کام کرتا ہے۔"

نگار سنہ ۱۹۳۶ء بابتہ جولائی صفحہ

فراق نے قافیہ کی اس صفت کو داخلی شاعری کے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ اور یہ تخصیص ایک اعتبار سے درست بھی ہے لیکن جان ڈرائیڈن (John Dryden) ہر قسم کی شاعری میں قافیہ کو خیال کا محرک سمجھتے ہیں۔ وہ (Rival) (The Rival.) کے انتساب میں نظم معرا کے مقابلہ میں قافیہ کی افادیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاعر کا تخیل بے مہار ہوتا ہے۔ اگر اس پر قید و بند عائد نہ کی جائے تو نفس خیال کے ساتھ غیر ضروری جزئیات بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ ایسا نہ بھی ہو تو کم از کم وہ غیر ضروری تفصیل اور طوالت اختیار کر لیتا ہے اس لئے یہ قافیہ کا بڑا وصف ہے کہ وہ شاعر کے تخیل کے لئے ایک راستہ متعین کر دیتا ہے۔ یہ تحدید نہ صرف تخیل کی معاونت کرتی ہے بلکہ شاعر کو ایسے الفاظ کے تفحص پر مجبور کرتی ہے کہ قافیہ خود بخود ان کا تابع ہو جاتا ہے قافیہ کے اس تحدیدی وصف سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جب قافیہ تخیل کو متعین اور منظم کرتا ہے اور شاعر کی فنکارانہ صلاحیت سے کام لیتا ہے تو لازماً وہ شاعر کو انتہائی بلند اور واضح خیال بخشتا ہے۔

یہاں یہ اعتراض ممکن ہے کہ قافیہ کی اک ذرا سی تحریک اس قدر ہیجان کیونکر پیدا کر سکتی ہے۔ ورڈسورتھ (Wordsworth) نے اس گتھی کو بھی سلجھا دیا ہے۔ (Lyrical Ballads) کے دیباچہ میں وہ رقمطراز ہیں کہ شاعری سکون میں سوچے ہوئے جذبہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جب اس جذبہ میں استغراق ہوتا ہے تو رد عمل کے طور پر سکون رفتہ رفتہ زائل ہو جاتا ہے اور استغراق سے پہلے کے جذبہ سے مشابہ ایک جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جو تخلیق شعری کا موجب ہوتا ہے۔

حفیظ قتیل

میر محمد مومن :۔ عہد محمد قلی قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ میں پیشوائے سلطنت اور وزیر مطلق تھے۔ انھوں نے ہزارہا روپے کے صرفے سے ایک دائرہ بنایا تھا جس میں خاک کربلائے معلی بچھادی تھی۔ اور یہ دائرہ اب تک "دائرہ میر مومن" کے نام سے حیدر آباد میں مشہور و معروف ہے۔ میر محمد مومن صاحب اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر بھی تھے۔ ان کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالات زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور نے اپنے دلچسپ اور مقبول عام اسلوب میں تحریر فرمائے ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات کی تعداد، قیمت عار

تلقین

شبِ فراق کا مفہوم انتظار نہیں!
نگاہِ شوق بہرحال منتظر نہ رہے
سفینہ درد کا سیلابِ اشک میں نہ بہے
لبِ خموش سے بھی اپنی داستاں نہ کہے
زباں پہ حرفِ شکایت نہ آئے ظلم سہے

اس اضطرابِ تمنّا سے فائدہ کیا ہے؟
یہ کس کی یاد میں دل کروٹیں بدلتا ہے؟
یہ کیوں جگر میں محبت کا درد پیدا ہے؟
خیال کس بتِ بیدادگر کا آتا ہے؟

یہ بڑھتی بڑھتی سی تاریکیوں میں خوف و ہراس
رخِ قرار پہ مایوسیاں، سکوں اداس
نہ موت کی کوئی صورت نہ زندگی کی آس
نہ میں ہوں اُن کے قریب اور نہ وہ میرے پاس

یہ پچھلی شب یہ سکوت و جمود کا عالم
کہ سانس لیتا ہے رک رک کے کائنات کا دم
اداس اداس فضائیں یہ حکمرانیٔ غم
تڑپ نہ اے دلِ مضطر تجھے خدا کی قسم
شبِ فراق کا مفہوم انتظار نہیں!

—— جمیل

استفسار؟

کون ہے جو مرے افکار پہ یوں چھایا ہے؟
اپنے مرکز سے پرے ہٹ کے نظر گھوم گئی
روحِ احساس کی گہرائیوں میں جھوم گئی
کون یہ دل میں نشہ بن کے اتر آیا ہے؟
یک بیک کس نے مرے دل میں یہ چٹکی لی ہے؟

دفعتاً کیوں مرے جذبات اُمڈ آئے ہیں؟
اک گھٹا بن کے جو احساس پہ لہرائے ہیں!
مجھ کو محسوس یہ ہوتا ہے کہ جیسے پی ہے!
کس نے دنیائے سکوں میں یہ مچا دی ہلچل؟

کون ہے جس نے کیا ہے خرد و ہوش کا خوں؟
کر دیا کس نے مجھے محرمِ اسرارِ جنوں؟
ہو رہا ہوں اسی احساس سے میں تو پاگل!

کون ہے جو مرے افکار پہ یوں چھایا ہے؟
کون یہ دل میں نشہ بن کے اتر آیا ہے؟

جمیل ملک

تعارّف

محبت :- کیا میں اندر آسکتی ہوں جناب ؟

بیمار :- جی ہاں، تشریف لائیے۔

محبت :- معاف کیجئے گا بلا تعارف کے آپ سے گفتگو کرنے کا شرف حاصل کر رہی ہوں۔

بیمار :- جی نہیں کوئی ایسی بات نہیں، اور میں بھی تو بغیر تعارف کے شرف ملاقات حاصل کر رہا ہوں۔ کیا میں یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ مجھے کس سے گفتگو کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے؟

محبت :- جی مجھے 'محبت' کہتے ہیں۔ چند احباب کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ کے دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ اس لئے دل نے کہا چلو ذرا دیکھ ہی آئیں۔ وہ آپکے اخلاق کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ فرمائیے اب مزاج کیسے ہیں؟

بیمار :- او محبت صاحبہ معاف فرمائیے اٹھ نہیں سکتا ورنہ آپ کے قدم چوم لیتا۔ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں! میرا اور آپ کا پہلے ہی غائبانہ تعارف تھا اور مدت سے آپ سے ملنے کا اشتیاق بھی رکھتا تھا یہ تمنّا آج پوری ہوئی۔ کتنا خوش قسمت ہوں کہ آپ نے غریب خانہ تک زحمت گوارا کی میرے دوست آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ اور جب کبھی دو چار مل بیٹھتے ہیں تو آپ ہی کا ذکرِ خیر ہوتا ہے اور جو آپ سے متعارف ہیں وہ آپ کے کئی کرشمے بتا کر ہمارا اور آپ کا غائبانہ تعارف کرا چکے ہیں۔

ان میں سے ایک کہتا ہے "کیوں میاں آپ میں سے کسی کی محبت صاحبہ سے دوستی ہے ؟" تو دوسرا کہتا ہے " ارے یار ان سے تو ہمارا بہت زمانہ کا یارانہ ہے ہم دونوں ایک جان دو قالب ہیں" تیسرا بول اٹھتا ہے "ارے تو تو یوں ہی بکا کرتا ہے آخر کوئی ثبوت بھی ہے تیرے پاس ان کی محبت کا؟" تو وہ شخص جواب دیتا ہے "کیا میں جھوٹ کہتا ہوں دوست اگر گواہ اور ثبوت ہی چاہتے ہو تو لو دیکھو ایک کیا دو ہیں "محبت" کی گواہی کے لئے

دل صد چاک بھی ہے' دیدہ خونبار بھی

اس کے بعد ایک اور صاحب بول اٹھتے ہیں "واقعی یار محبت کے کرشمے کچھ عجیب و غریب ہوتے ہیں وہ جن سے ملتی ہیں ہر ایک پر اپنا نرالا ہی اثر جما کر اٹھتی ہیں دیکھیے ہم ان کی تعریف اس طرح کرتے ہیں ؂

وہ آتے ہیں تو دل میں کچھ خلش معلوم ہوتی ہے
میں ڈرتا ہوں کہیں اس کو "محبت" تو نہیں کہتے

اس کے بعد شیفتہ نے اس کی تائید اس طرح کر کے آپ کا غائبانہ تعارف ہم سے کرا دیا ؂

شاید اسی کا نام "محبت" ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

محبت :- جی نہیں شکریہ' آپ نے تو مجھے کانٹوں میں گھسیٹا جو کچھ بھی آپ نے فرمایا وہ آپ کا اور میرے احباب کا صرف حسنِ ظن ہے۔ کہیئے اب مزاج کا کیا حال ہے؟ کیا بیماری ہے؟ کس کا علاج جاری ہے۔

بیمار :- محترمہ' یہ نہ پوچھو بیماری کیا ہے؟ ہماری شمع زندگی بجھا چاہتی ہے۔ میری دلی آرزو آپ سے ملنے کی تھی سو وہ پوری ہو گئی۔ علاج تو میں نے بہت کچھ کروایا لیکن بیماری میں کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ ابھی ایک حکیم صاحب آئے تھے انھوں نے نبض دیکھی اور صرف یہ کہہ کر تشریف لے گئے ؂

از سرِ بالینِ من برخیز اے ناداں طبیب
دردمندِ ہجر را دارد بجز دیدار نیست

محبت :- سنا ہے آپ کے سر میں بھی درد ہوتا ہے اس کے لئے

کسی اچھے حکیم سے رائے لی ہوتی۔
بیمار:- ہاں محترمہ، ایک طبیب کو میں نے بلوایا تھا اُن
درد سر کی کیفیت بیان کی انھوں نے یہ نسخہ بتایا کہ
ع درد سر کے واسطے صندل لگانا ہے مفید
لیکن میں نے کہا حکیم صاحب اس کا گھسنا اور رگڑنا درد سر یہ بھی تو ہے
بس اس پر وہ خفا ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اب آپ
ہی بتائیے کہ کیا کیا جائے؟
محبت:- جناب مجھے آپ سے پوری دلی ہمدردی ہے میں بھی
کچھ طب جانتی ہوں بتائیے اب کس جگہ درد ہے؟
بیمار:- آہ محترمہ کیا بتاؤں درد ایک جگہ ہو تو کہوں ؎
کبھی دل میں کبھی سر میں ہے کبھی پہلو میں
چارہ گر کیا کہوں میں درد کہاں ہوتا ہے؟
محبت:- دوست، پہلو میں اگر درد محسوس ہوتا ہے تو ہمارے
پاس اس کا آسان نسخہ ہے اس پر عمل کرو
جلد آرام ہو جائے گا۔
ع جو جل اٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں
بیمار:- شکریہ حکیم جی، یہ ترکیب تو میں نے کر دیکھی کچھ بھی
تو فائدہ نہیں ہوا۔
محبت:- مجھے اس کا بہت افسوس ہے خیر یہ بیماری
انسان کے دل و جگر پر بہت جلد حملہ کرتی ہے اس لئے
دل و جگر کی اچھی خبر لیتے رہیے۔
بیمار:- محترمہ، میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں؟
مر کر بھی میں آپ کی ہمدردی بھول نہیں سکتا۔
ایک صاحب کل ہی آئے تھے انھوں نے بھی یہی
فرمایا کہ دل و جگر ہی کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔
؎ شب فرقت میں ہم ہر سانس سے یہ پوچھ لیتے ہیں
جگر تو خیریت سے ہے مزاج دل تو اچھا ہے؟
اور اب سانس بھی تسلی بخش جواب نہیں دے رہا
ہے محترمہ!
محبت:- دوست مجھے بہت جلد ہر شخص سے بے تکلف ہونے کی
عادت ہے اس لئے آپ بھی تکلف نہ فرمائیے۔ کہئے
آپ کے بعد میرے لائق کونسی خدمت ہے تاکہ اس کو
میں انجام دوں۔ اور دیکھئے صاحب میرا ایک ذاتی
مطبع ہے۔ اگر آپ کوئی چیز طبع کرانے کے لئے چھوڑتے
ہیں تو اس خدمت کو انجام دینے کی سعادت مجھے
عطا فرمائیے اس طرح مجھے آپ کی روح کو مسرت
پہنچا کر بڑی خوشی حاصل ہوگی۔
بیمار:- ہاں خوب یاد دلایا۔ اب میرے پاس سوائے
اس کے رکھا ہی کیا ہے ؎
چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا
اور آپ سے یہی التجا ہے کہ ان خطوط کو طبع کرا دیجئے
آپ کو تکلیف تو ضرور ہوگی۔
محبت:- اجی جناب کیسی تکلیف، یہ آپ کیا فرما رہے ہیں
اچھا اب اجازت دیجئے۔
بیمار:- محبت صاحبہ آپ جاتی تو ہیں لیکن ہماری میت
میں ضرور شریک ہونا اور اس کا بھی خیال رکھنا
کہ آپ اوروں سے کچھ زیادہ ہی رونا تاکہ لوگ
آپ کو قاتل نہ سمجھیں ؎
ہو نہ دامن گیر کوئی جان کر قاتل تجھے
تو بھی روتا چل جنازے کو ہمارے دیکھ کر
محبت:- ٹھیک تو ہے! لیکن میں اس قدر کیوں روؤں؟
اب تک میری آنکھیں نہیں جانتی ہیں کہ آنسو کیا ہوتے
ہیں؟ اس لئے اس سے کوئی آسان نسخہ تجویز فرمائیے
تو مہربانی ہوگی۔
بیمار:- مجھے تو کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آرہی ہے اگر آپ
ہی کوئی ترکیب بتائیں تو بہتر ہے۔
محبت:- ہاں صاحب ایک ترکیب یاد آگئی اگر آپ اس پر
عمل کرنے راضی ہیں تو میں بتاتی ہوں ؎
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

بیمار:۔ بہت بہتر محترمہ اسی میں آپ کی بھلائی ہے کسی کا آپ پر گمان تک نہ ہوگا۔

محبت:۔ میں خدا سے صدقِ دل سے یہ دعا مانگتی ہوں کہ آپ کو جنت نصیب کرے اور آپ کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

بیمار:۔ نہیں محبت صاحبہ میرا کوئی رشتہ دار نہیں ہے اور تمام احباب میں صرف آپ ہی ایک ایسی ہیں جن سے مجھے محبت ہے۔ اس لئے میں بھی خدا سے دعا کرتا ہوں کہ "رحمتِ تمام! میری ہر خطا معاف' اور میری جان سے زیادہ عزیز "محبت" کو عمرِ خضر نصیب ہو اور ساتھ ہی اس کو صبرِ جمیل بھی عطا فرما۔"

اوہ محبت صاحبہ' میرے کان میں کسی کی آواز آرہی ہے۔ شائد میری دعا قبول ہوگئی۔ کوئی آہستہ سے کہہ رہا ہے "ارے دیوانے' محبت کو تو نے کیا سمجھ رکھا ہے! محبت زندگی ہے' محبت دنیا ہے اور جب تک دنیا رہے گی اس کے ساتھ محبت بھی رہے گی۔" اچھا محبت الوداع

ع۔ خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں۔

ملک ارجن

غزل

دل کو غمِ حیات گوارا ہے ان دنوں ۔۔۔ پہلے جو درد تھا وہی چارا ہے ان دنوں

ایک ایک اشک جان سے پیارا ہے ان دنوں ۔۔۔ موتی ہے ان دنوں کوئی تارا ہے ان دنوں

ہر سیلِ اشک ساحلِ تسکیں ہے آج کل ۔۔۔ دریا کی موج موج کنارا ہے ان دنوں

یہ دل ذرا سا دل تری یادوں میں کھو گیا ۔۔۔ ذرّے کو آندھیوں کا سہارا ہے ان دنوں

شمعوں کی اب نہیں ہے وہ پہلی سی روشنی ۔۔۔ کیا واقعی وہ انجمن آرا ہے ان دنوں

تم آ سکو تو شب کو بڑھا دوں کچھ اور بھی ۔۔۔ اپنے کہے میں صبح کا تارا ہے ان دنوں

نکلا خوشی کا دور بہت مختصر قتیلؔ

پہلے سے تیز وقت کا دھارا ہے ان دنوں

قتیل شفائی

شکست

جعفری اندرونی کشمکش سے ناواقف نہ تھا وہ
خوب جانتا تھا کہ یہ شادی محض وکیل صاحب کی ضد سے ہوئی
ہے۔ جعفری کو بے حد صدمہ تو یہ تھا کہ جس پر وہ فریفتہ ہے اس کی
محبت کا مرکز تو کوئی دوسری ہستی ہے۔ یہ خیال دل میں لئے
ہوئے وہ دلہن کے کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر دراز ہو گیا
اس میں یہ ہمت نہ تھی کہ دل شکستہ بلقیس کو چھیڑے۔ بڑی
دیر کے بعد جعفری نے کہنا شروع کیا "یہ بھی عجیب بات ہے،
جس کی ہم پرستش کرتے ہیں وہ ہم سے نفرت کرتا ہے" آہ نو بہار زمانہ
ایک برق جوالا کی طرح یکایک میرے ہوش و حواس پر گری۔
مجھے سسکتا چھوڑ، چشم زدن میں نگاہوں سے چھپ گئی۔ دیر تک
جعفری محبت کے سر الاپتا رہا۔ بلقیس اپنے خیالات میں مستغرق
رہی۔ جعفری گنگناتا ہوا کرسی پر سے اٹھا، بلقیس کا دل بے طرح
دھڑکنے لگا وہ سمٹ کر بیٹھ گئی جعفری قریب آتا ہوا بولا میری
والہانہ محبت کے پیکر! میری تمناؤں کی ملکہ!! ایک دفعہ اس
رنگین گھونگھٹ کو الٹ کر اپنے فدائی کو دیکھیے (قریب ہوتا ہوا)
یہ جگمگاتا، جھلملاتا ہوا گھونگھٹ کتنا جاذب نظر ہے جیسے کوئی
حسین مہ جبین مسکرا رہی ہے۔ بلقیس کچھ سمجھنے نہ پائی تھی کہ جعفری
یہ کہتا ہوا پھرتی سے گھونگھٹ الٹ دیا۔ صورت پر نظر پڑتے
ہی بے اختیار جعفری کے منہ سے نکل گیا "کون" حسرتوں،
ارمانوں کے ساتھ وہ آگے بڑھا اور گھبراہٹ و سراسیمگی
کی حالت میں وہ کرسی پر گر پڑا۔ بلقیس پر ایک جھرجھری سی
آئی ایک بجلی سی اس کے دماغ میں کوند گئی۔ پہلے تو اس نے
جعفری کی بے تکی باتوں پر غور نہیں کیا۔ کبھی یونہی بکے جا رہے
ہیں لیکن اس کے یہ کہنے پر "کون" وہ سمجھ گئی کہ یہ بے تکی
باتیں محض خیال آرائی نہیں تھیں ضرور اصلیت رکھتی ہیں۔
وہ فوراً تاڑ گئی کہ جعفری میری بجائے کسی اور کو دیکھنے کے
متمنی تھے اس کو جس نے ان کا دل سر بازار لیا تھا اور
جیسے وہ وکیل صاحب کی بیٹی تصور کئے ہوئے تھے۔ ہائے
کیسا دھوکا ہوا۔ ابا جان آپ نے میری زندگی بالکل تباہ
کر دی۔ اپنی ضد پر میری مسرتوں، میری تمناؤں
کو بھینٹ چڑھا دیا۔ دنیا کی یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ جس پر جعفری
فریفتہ تھے انہیں وہ ملا اور میں اپنی مرضی کے خلاف ان کے
پالے پڑ گئی۔ یہ سوچتے سوچتے بلقیس خیالات کے سمندر
میں غرق ہو گئی"

بڑی دیر تک کمرہ میں سکوت چھایا رہا۔ ادھر دولہا
غائب تو ادھر دولہن [illegible] ہوئی۔ اس طویل المدت خاموشی
کو جعفری نے توڑا وہ سوچتا ہوا بلقیس کے قریب آیا اور صاف
سلجھے ہوئے لہجے میں بولا "مجھے سخت افسوس ہے کہ میرے
باعث آپ اس قدر روحانی تکلیف میں گرفتار ہوئیں
میری وجہ سے آپ کی خوشیوں کو ٹھکرا دیا گیا" بلقیس
بالکل خاموش تھی جعفری نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے
کہا "آپ سے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں میں
جس لڑکی سے شادی کرنے کے تصور میں تھا جس کو میں نے
ایک دفعہ دیکھا تھا وہ آپ نہیں ہیں۔ مجھے اس لڑکی کو
وکیل صاحب کی صاحبزادی باور کرایا گیا۔ بلقیس چپ رہی
جعفر کہتا ہوا [illegible] آگے [illegible]
[illegible]
میں چھوڑ دیئے [illegible]
اپنی قسمت پر شاکر [illegible]

بلقیس چونکہ جعفری اس کے مقصد سے دور ہٹ گیا
تھا۔ بولی آپ بھول رہے ہیں اب بھی ہمیں موقع ہے اب
بھی ہم بگڑی ہوئی تقدیر بنا سکتے ہیں اب بھی مذہب ہماری
رہنمائی کر سکتا ہے اب بھی ہم اس زبردستی کے رشتہ کو
توڑ کر آزاد ہو سکتے ہیں۔ اپنی زندگی کے سدھارنے میں
ہمیں کون روک سکتا ہے۔

اس قسم کی گفتگو جعفری دولہن سے سننے کے لئے
تیار نہیں تھا وہ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بول اٹھا

ہرگز نہیں ہو سکتا لوگ کیا کہیں گے۔ بلقیس بولی "لوگ"! ہمیں لوگوں سے کیا سروکار۔ ہم تو اپنی کھوئی ہوئی خوشی حاصل کرنا چاہتے ہیں یہ ہمارا حق ہے۔

جعفری "آپ غور کیجئے یہ ناممکن ہے"۔ بلقیس عاجزانہ لہجہ میں بولی "اب بھی کچھ نہیں گیا۔ مجھ غریب کی زندگی تباہ نہ کیجئے۔ آپ مجھے اس قید سے رہا کر دیجئے۔

جعفری بے چین ہو کر بولا "مجھے کوئی عذر نہیں۔ میں آپ کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں ـــــ لیکن یہ بات محال ہے۔ لوگ کیا کہیں گے ـــــ جعفری کچھ سوچنے لگا ـــــ

بلقیس تیزی سے بولی "ہرگز نہیں ہم بالکل حق بجانب ہیں اسی طریقہ سے ...... تین زندگیاں سدھر جائیں گی۔

جعفری "مگر آپ غور تو کیجئے کہ ایسا کرنے کے بعد آپکے متعلق لوگوں کا کیا خیال ہوگا ـــ کیا لڑکا وہ آپ کو قبول کرلے گا۔ بلقیس کے دل میں چبھن سی محسوس ہوئی ـ وہ الجھ کر بولی "مجھے پورا اعتماد ہے اس کی میں ذمہ دار ہوں آپ کو سوچنے کی ضرورت نہیں"۔

جعفری "اور آپ نے اپنے والد محترم کا خیال نہیں فرمایا وہ اس بے عزتی کو کب برداشت کرسکیں گے۔ وہ خودکشی کرلیں گے"۔ بلقیس "یہ بے عزتی ہرگز نہیں ہو سکتی یہ تو اپنے حقوق کی جنگ ہے۔ ہم مذہب کے حدود سے باہر نہیں ہیں۔

جعفری "یہ آپ کا خیال ہے"۔ بلقیس بولی ـــ "خیال ـــ خوب میری زندگی کے متعلق لوگوں سے پوچھوں۔ آپ کو دنیا کی فکر ہے اوروں کو عزت کا پاس ہے۔ آپنے محبت نہیں کی۔ جب آپ کسی سے محبت کرتے اور آپ کا دل ٹوٹتا تو دیکھتے"۔

جعفری "میں نے جھوٹی محبت کی۔ معاف فرمایئے آپ کا الزام غلط ہے آپ کو دھوکا ہوا ہے۔ اگر آپ چند دن پیشتر میری حالت دیکھتیں تو معلوم ہوتا کہ میں کس آگ میں جل رہا تھا۔ میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ میری زندگی اس ہستی کے بغیر ہیچ ہے۔ میں نے یہ تہیہ کرلیا کہ میری شادی ہوئی تو اس سے ہوگی۔ آپ اس روح فرسا تکلیف کا اندازہ نہیں فرماسکتیں جو مجھے تھوڑی دیر پیشتر ہوا۔ میری ساری تمنائیں، سارے رنگین خواب برباد ہوگئے (دم لیکر) اور میں زندہ ہوں۔ راضی برضا رہنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

بلقیس بولی "مہربان من ایک ہی جذبہ کے اثرات دو مختلف النوع طبیعتوں پر یکساں نہیں پڑسکتے۔ بعض کے تاثرات نقش بر آب ہوتے ہیں اور بعض کے نقش کالحجر۔ آپ کا یہ کہنا میں نے ایسا نہیں کیا اس لئے تم بھیرا اتباع کرو انتہائی ظلم ہے"۔

جعفری "بلقیس یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ اور میں نے پہلے ہی آپ سے کہہ دیا کیا آپ سمجھ سکتی ہیں۔ مجھے مسرت کی تلاش نہیں، حسرتوں کو پورا کرنے کی تمنا نہیں۔ آپ جو کچھ فرما رہی ہیں وہ ایک بیحد دلکش خیال اور خوبصورت تصور ہے۔ جو عمل کے سانچہ میں ڈھل نہیں سکتا۔ ہم موجودہ رشتہ کو توڑ کر خوش و خرم رہیں گے۔ ایک فریب ہے۔ اس سے آپ کی زندگی تلخ اور ناقابل برداشت ہو جائے گی اور میں دنیا کی نظروں میں ذلیل و خوار ہونگا بلقیس کو متاثر پاکر" آپ دنیا کو اپنے مقابل ہیچ سمجھتی ہیں مگر یاد رکھئے آپ اس دنیا ہی کے ایک جز حقیر ہیں۔ کیا جز بھی کل سے علحدہ ہو سکتا ہے۔ کبھی ٹہنی جھاڑ سے ٹوٹ کر سر سبز ہو سکتی ہے۔ کیا آپ کو اس ہستی کا اتنا بھی پاس نہیں جس نے آپ کو اپنے خون سے سینچا ہو جس نے آپ کے آرام و راحت کے لئے اپنی جان ہلکان کر ڈالی ہو اس ساری جانکاہی کا معاوضہ انھیں یہی ملنا چاہیے کیا اسی کی انھیں توقع تھی۔

بلقیس تنک کر بولی "کھسیانی بلی کھمبا نوچے"۔ "آپ موضوع گفتگو سے ہٹ گئے ہیں۔ یہ نظریہ کی کمزوری ہے آپ نے مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ملامت سے کیا حاصل اگر میں کسی فعل قبیح کی مرتکب ہو رہی ہوں تو اس کی سزا میں بھگتوں۔ آپ کا کہنا کس قدر بے معنی ہے کہ رشتہ کا توڑنا ناقابل عمل ہے۔ یہ فرمایئے خود آپ کا جی نہیں چاہتا۔ باتیں کیوں بناتے ہیں۔

جعفری "میں موضوع گفتگو کے ہر پہلو پر سوچ چکا ہوں مگر آپ نے ایسا نہیں کیا میں یہ اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کے تاثرات کو ہر طریقہ سے مٹاؤں۔ جن فوائد کو پیش نظر رکھ کر میں آپ کی خواہش پر عمل کروں وہ فضول ہیں نقصانات کا امکان بھی ہے ایسی صورت میں آپ کا کہنا نا قابل عمل نہیں تو اور کیا ہے۔ مجھے آپ سے کوئی تعلق نہیں آپ کی خواہش کی تکمیل سے میری اور آپ کے والد کی زندگی متاثر ہو رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ آپ کے سچے بہی خواہ کی جان معرض خطر میں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کے خاطر اس ہلاک خطرہ کی ذمہ داری اپنے سر لوں۔ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔

بلقیس بیحد متاثر ہوئی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی" آپ کا جی نہیں چاہتا آپ کی ہمدردی صرف دکھاوے کی تھی۔ ترحم کے لباس میں شقاوت کار فرما تھی۔ مجھے تڑپا تڑپا کر مارنا آپ کی زندگی کا واحد مقصد ہے۔ مجھے امید دلا کر آپ نے فضول مغز پاشی کی" بلقیس کا دل سوسنے لگا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ ساری امیدیں مفقود ہو گئیں جو تھوڑی دیر پیشتر پیدا ہو کر اس کے لئے سامان مسرت بن گئی تھیں۔

جعفری بلقیس کے رونے سے پریشان ہو گیا۔ دلجوئی کرتا ہوا بولا" آپ تعلیم یافتہ ہیں بھلا اس رونے دھونے سے کیا حاصل۔ اس قدر زبردست انقلاب کی خواہش کرنے کی بجائے آپ اپنے دل کو سنبھالئے اگر زمانہ آپ کے ساتھ نہیں چلتا تو آپ زمانہ کے ساتھ چلنے کی کوشش کیجئے۔ سمجھ جائیے آپ مجھے ہی چاہتی ہیں اور چاہتی رہیں گی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں آپ کی کھوئی ہوئی مسرت واپس آجائے گی۔

بلقیس بیحد حقارت آمیز ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔

" میری محبت میں تلون نہیں ایک شریف عورت اپنا دل ایک ہی کو دے سکتی ہے۔ ہمارے مذہب کے بیہودہ رسم و رواج نے آپ کو مجھ پر اختیار دیدیا ہے آپ میرے جسم کے مالک ہیں مگر دل۔

جعفری جز بز ہو کر" اس کا میں طلب گار نہیں آپ کی محبت کا خواہشمند نہیں۔ میں سکون چاہتا ہوں۔

ہنس کر بلقیس بولی" آپ زبردست بھول کر رہے ہیں تو کیا آپ کو سکون نصیب ہو گا؟ آپ کا گھر تو ماتم کدہ بنا رہے گا......."

جعفری اپنے لہجہ کو دباتے ہوئے بولا تیز نہ ہو یہ ساری مصیبتیں آپ کی لائی ہوئی ہوں گی اور میں جن سے خائف ہوں وہ دنیا کی ہوں گی۔ دلی جذبات دبائے جا سکتے ہیں۔ دنیا کا منہ بند نہیں کیا جا سکتا۔ آپ چاہیں تو اپنی زندگی کے ساتھ میری اور اپنے پیارے والد کی زندگی شادماں کر سکتی ہیں۔

بلقیس۔" میری زندگی تو عمر بھر خوش گوار نہیں ہو سکتی"

جعفری:" کم از کم ہماری خاطر"

بلقیس مایوس ہو گئی دل پکڑ کر بولی ظالم کہیں کے۔ زمانہ آپ سے انتقام لے گا اور ضرور لے گا"

بلقیس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ جعفری نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن یہ طوفان امنڈتا گیا۔

ایک ہفتہ بلقیس کے لئے انتہائی غم و اندوہ میں گزرا۔ دلگداز اور جگر سوز آہیں اس کے شدید کرب و اضطراب کا پتہ دے رہی تھیں اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اس نے ارادہ کیا کہ خودکشی کرے اور اس مسلسل جانکنی کی تکلیف سے نجات پائے۔ خودداری نے اسے اس بات سے باز رکھا۔ حریف کے مقابل خودکشی کو وہ اعتراف شکست سمجھتی تھی۔ جعفری کی گفتگو سے اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس نے جان بوجھ کر اس سے شادی کی اور اس پر یہ مصیبت نازل کی۔ بلقیس کا سینہ میں شعلے بھڑکنے لگے ——— جس نے اس کی زندگی تلخ کی اسے زندہ درگور کر ڈالا اور وہ کسی کو چین سے جینے کے لئے نہیں چھوڑ سکتی اس کے لئے دنیا کو جہنم بنانے کا عزم کر چکی تھی۔

رفتہ رفتہ بلقیس کے رنج و الم میں کمی ہوتی گئی مگر نفرت و انتقام کی آگ اس کے سینہ میں تیز ہو رہی تھی۔ ظالم جعفری اس کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹک رہا تھا۔ بلقیس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ جو تعصب اور مذہب نے، سماج نے

مردوں کی بنائی ہوئی دنیا نے جعفری کو دیا ہے کیا وہ اختیار اس سے چھین نہیں سکتی؟

اس اختیار کے سلب ہو جانے سے ہی اس کا مجروح دل صحت پا سکتا ہے۔ اس کی کمھلائی ہوئی تمنائیں تازہ ہو سکتی ہیں۔ اگر قدرت اس کا ساتھ دے تو دوسری قوت ہرگز دھوکا نہیں دے سکتی۔

برخلاف اس کے جعفری کا ہر عمل یہ خواہش لیے ہوئے تھا کہ بلقیس کی مکمل دلجوئی کی جائے اس کو اتم اطمینان قلب حاصل ہو۔ اس نے بلقیس سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ اس کو مکمل آزادی دیدی۔ وہ جہاں چاہے جا سکتی ہے جس سے ملنا چاہے مل سکتی ہے اور جو چاہے کر سکتی ہے۔ وہ بہت کم بلقیس کے ساتھ رہتا تاکہ اسے صحیح طور پر سوچنے ٹھنڈے دل سے غور کرنے کا موقع ملے اور اپنے غم کو جلد بھول سکے۔ ان کشیدہ تعلقات سے وہ ہر ایک نوکر اور بطور خاص وکیل صاحب کو لاعلم رکھنا چاہتا تھا۔ اور اسی وجہ سے اس نے ایسی لڑکی سے شادی کی جو دوسرے کو چاہتی ہو۔

جعفری کا بلقیس کے کمرے میں رہنا بلقیس کے لئے انتہائی تکلیف کا باعث تھا۔ شادی کے بعد جعفری کی ہر رات بے خوابی بے کلی اور سراسیمگی میں گزرتی۔ راتوں میں اٹھ کر گھنٹوں وہ مجنون کی طرح ٹہلتا اور سوچتا رہتا ۔ جب سوتا تو ابھی نیند نہ ہوا کی ہلکی سی سرسراہٹ یا معمولی الجھن سے اس کی آنکھ کھل جاتی۔

بلقیس یہ سب جانتی تھی۔ شروع میں اسے جعفری کے اس رویہ پر غور کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ رنج و ملال کے ساتھ ساتھ اس کو ان باتوں کا احساس ہونے لگا۔ جعفری کی دوری اس کے لئے غیر معمولی حیرت انگیز تھی۔ وہ خود کو اس کی مجبور بیوی اور اس کو اپنا مختار جانتی تھی۔ وہ اس اجتناب سے چند مسرور اور اسی درجہ ششدر بھی۔

دن گزار رہے تھے دونوں کے توقعات وقت کے ساتھ وابستہ تھے۔ دونوں کے آرزو مند دل انقلاب چاہتے تھے۔ ایک کی امیدیں تخریبی تھیں اور دوسرے کی تعمیری۔ ایک دوسرے سے دور یاس و حسرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ بلقیس کی صورت مرجھائے ہوئے پھول کی طرح بے رنگ ہو رہی تھی۔ جعفری کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

تین ماہ گزر گئے اس دوران میں جعفری نے بلقیس سے گفتگو کرنا چاہا۔ پہلی بار بلقیس کمرہ سے باہر چلی گئی دوسری بار جھنجھلا کر بولی "آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہہ دیجئے۔ میں سن رہی ہوں۔"

جعفری نے کہا "میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں" بلقیس تنگ آکر بولی "مجھ سے گفتگو تو ہو چکی۔ میں آپ کا دماغ چاٹنا نہیں چاہتی آپ مجھے دق نہ کیجئے" یہ تھی جعفری کی تین مہینے کی دلجوئی اور ضبط کی تاثیر وہ جھنجھلایا لیکن تحمل ہی کو بہتر جانا۔

ایک دن دفتر سے واپسی پر جعفری سے کلثوم بی (بلقیس کی انا جو ساتھ تھی) نے کہا "ناصر میاں آئے تھے" (ناصر بلقیس کا محبوب اور چچیرا بھائی ہے) سلام کہہ گئے ہیں۔ جعفری معلوم ہوا کہتا ہوا چار قدم کمرہ کی طرف بڑھا پھر رکا اور پلٹ کر پوچھا "بلقیس مجھ سے کہہ دیتیں تم نے کیوں تکلیف کی۔ کلثوم بی نے سادگی سے کہا "بی بی ان سے نہیں ملیں" (جعفری یہی سننا چاہتا تھا بلقیس سے معلوم ہو جانے کا تو بہانہ تھا) جعفری نے حیرت سے پوچھا "کیوں" کلثوم بی بولی "بی بی نے کہلا بھیجا میں نے سامنے نکلنے کی اجازت نہیں لی ہے"۔ جعفری دل میں "مذہب رسم و رواج کا اس قدر پاس"۔ شادی کی رات کے بعد پہلی دفعہ جعفری کے جسم میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ جعفری تیزی سے کمرہ میں داخل ہوا اور بیساختہ کہنے لگا "معلوم ہوا ناصر آئے تھے"۔ آپ نے انھیں اندر کیوں نہیں بلایا۔ یہ کیا غضب کیا۔ ہر فقرہ پر وہ بلقیس کی صورت غور سے دیکھ رہا تھا۔ بلقیس ساکت و صامت تھی۔ "ناصر تو آپ کے بھائی ہیں" .... "چلئے ابھی آپ ان سے معافی چاہیں۔

.... آج پہلی دفعہ جعفری نے بلقیس کے چہرہ پر خون دوڑتا ہوا دیکھا ..... پھر جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو بلقیس تیار تھی۔ رات میں دونوں واپس ہو گئے۔

دوسرے دن صبح میں ناشتہ پر بلقیس نے پہلی دفعہ گفتگو میں پہل کی۔ بلقیس گردن جھکائے ہوئے بولی "میں آج اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔"

جعفری زیر لب تبسم سے "آپ اپنے گھر میں ہی ہیں۔"

بلقیس جھینپی لیکن فوراً تیور چڑھ گئے "زندہ درگور ہوں۔"

جعفری ان تلخیوں کا عادی سا ہو گیا تھا مسکرا کر بولا "میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

بلقیس "خود کردہ را علاج نیست۔"

جعفری "جیسے شاہی نہیں۔ آپ شوق سے جا سکتی ہیں۔"

بلقیس "ناصر جب تک رہیں میں وہیں رہوں گی۔"

جعفری "آپ کو اختیار ہے۔"

ناصر کی موجودگی سے بلقیس کے تن مردہ میں جان پڑ گئی اس کے شباب کی رنگین آرزوؤں اور تمناؤں کا پیکر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ لیکن وہ اس سے بہت دور تھا اس قدر قرب اور اتنا بعد۔ بلقیس کی روح بے چین ہو گئی۔ محرومی اور بدقسمتی کا احساس شدت سے تازہ ہو گیا۔ ناصر کے جانے کے بعد بلقیس مستحکم عزم و استقلال کے ساتھ اپنے گھر لوٹی جعفری نے دیکھا اس قلیل مدت میں بلقیس کا رنگ و روپ نکھر گیا ہے۔ بلقیس نے محسوس کیا کہ جعفری لاغر اور لاغر ہو گیا ہے۔

بلقیس انقلاب کے آثار کو اپنے موافق پا رہی تھی اب اس کو صبر کا یارا نہیں تھا وہ عجلت چاہتی تھی۔ قدرت کی سست رفتاری سے وہ بوکھلا رہی تھی۔ نہیں معلوم ابھی کتنے مہینے، کتنے سال آزمائش میں گزریں گے۔ جعفری نے بھی محسوس کیا کہ ان دنوں بلقیس کا رنگ بدلا ہوا ہے وہ کسی تشویش اور الجھن میں گرفتار ہے۔ دن میں اکثر وہ پلنگ پر پڑی رہتی راتوں میں کم سوتی اور بہت بے کل رہتی۔ بلقیس کیا سوچ رہی ہے۔ کونسے خیالات اس کے دماغ میں گھوم رہے ہیں جعفری معلوم نہ کر سکا۔

انھیں دنوں ایک رات جعفری کلب سے واپس ہوا بلقیس کو اپنا منتظر اور مشتاق پایا۔ جعفری کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر بلقیس کمرہ میں چلی گئی اور کلثوم بی سے بولی "میں کھانا کھاؤں گی۔" جعفری منہ ہاتھ دھو کر کمرہ میں پہونچا بلقیس بیٹھی تھی چہرہ تمتما رہا تھا۔ جعفری نے مسکراتے ہوئے کہا "کیا میرا خیال صحیح ہے کہ آپ کو اپنی غلطی کا احساس شروع ہو گیا۔"

بلقیس چیں بجبیں ہو کر "آپ ہی غلطی پر ہیں۔ آپ سے دوسری بار اور .... آخری بار میں التجا کرتی ہوں۔

جعفری افسردہ ہو گیا "میں سننے کو تیار ہوں مگر جانتا ہوں فضول ہے (کلثوم بی کی طرف مڑ کر) تم باہر جاؤ۔"

بلقیس اضطراب سے "نہیں نہیں آپ سوچئے۔ ضد سے باز آئیے۔ میری اور ناصر کی زندگی تباہ نہ کیجئے۔ رحم کیجئے!"

جعفری تندی سے بولا "میں ضد کر رہا ہوں؟ میں زندگیاں تباہ کر رہا ہوں؟ اور آپ تو کچھ سمجھنا نہیں چاہتیں۔"

بلقیس بھی تندی سے بولی "میں سوچ چکی۔ آپ ایک بے درد ظالم انسان ہیں۔"

جعفری "جیسی ہمدردی آپ چاہتی ہیں۔ وہ ظلم ہے میں ظلم کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔"

بلقیس لال ہو گئی "انتہائی مجبوری جنون خیز ہوتی ہے اب مجھے مجبور نہ کیجئے۔ میں ہر وہ عمل کرنے پر آمادہ ہوں جو مجھے آپ کی قید سے نجات دلائے۔"

جعفری، بلقیس کو دیکھ کر "دھمکی نہ دیجئے۔ آپ جو چاہے کر سکتی ہیں۔"

بلقیس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارا ہو رہی تھی۔ بالکل خاموشی میں دونوں نے کھانا کھایا۔ جعفری گردن جھکائے ہوئے تھا۔ پیشانی پر شکنیں تھیں۔ بلقیس کے چہرہ کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد جعفری اٹھا کلثوم بی باہر ہی تھی جعفری گلاس میں پانی ڈال کر گلاس منہ کو لگانا ہی چاہتا تھا کہ بلقیس نے ہرن

کی طرح چھلانگ ماری اور گلاس پر ہاتھ مارا۔ گلاس نیچے گر کر پاش پاش ہو گیا ساتھ ہی اس نے جگ کو بھی زمین پٹک دیا۔ جعفری تعجب سے بلقیس کو دیکھنے لگا۔ جس پھرتی سے بلقیس آئی تھی۔ اتنا ہی آہستہ وہ واپس ہوئی۔ جعفری زرد پڑ گیا طنز سے بولا " یہ کیا کیا تم نے بلقیس وہیں آواز سے (جعفری کو خشمگیں نظروں سے دیکھ کر) میں جو چاہے وہ کر سکتی ہوں۔

جعفری " حقارت سے بولا " کاش آپ کا قہر و غضب مجھ ہی پر اترتا جگ کی طرح آپ مجھے پاش پاش کر ڈالیں (زہر خندہ)۔

بلقیس زخمی شیرنی کی طرح بپھر کر بولی " عورت کا انتقام بڑا خوفناک ہوتا ہے

جعفری طنز سے بولا ہم بھی دیکھیں گے۔

بلقیس اسی طرح طنز سے بولی " یہ تو میں دیکھ رہی ہوں "

بلقیس اندرونی ہیجان سے بے قابو ہو رہی تھی اس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے وہ دوڑتی ہوئی پلنگ پر گر پڑی اور زار زار رونے لگی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

وہ جانتی تھی کہ مذہب و تمدن کے قوانین کا توڑنا زبردست اخلاقی گناہ ہے۔ لیکن موجودہ شکنجہ سے رستگاری کا زہر سے زیادہ موزوں و مرجح طریقہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا مجبوری و جنون میں وہ اس گناہ عظیم کی مرتکب ہونے والی تھی لیکن نسائی فطری کمزوری یکایک آندھی کی طرح اٹھی اور اس کے عزم کو ہلا ڈالا۔

اس واقعہ کے بعد بلقیس کے جنون و وحشت میں کمی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں موتی پرونے لگیں اس کی زندگی یاس و ناامیدی میں بسر ہونے لگی۔ مذہب اس کی مدد نہیں کرتا تھا۔ قدرت اس کا اعتماد کھو رہی تھی اس کو اپنا انجام غیر یقینی اور زیادہ بھیانک نظر آنے لگا۔

جعفری سوچ رہا تھا کہ اس نے بلقیس کا غلط اندازہ لگایا مفت میں دردسری لے لی اجوائن جیسی شیریں اور گراں بہا چیز جھوٹی بازی میں لگا دی۔ اس واقعہ نے اسے یقین دلا دیا۔ یہ تیقن جاں گسل اور دل شکن ثابت ہوا۔ بدمزگی اور تکان کے آثار جعفری کے چہرہ سے ظاہر ہونے لگے۔ دن بدن اس کی صحت گرتی گئی۔ وہ علیل ہو گیا۔ رنج نے اس کو کمزور کر ڈالا۔ ٹائیفائڈ کا اس پر سخت حملہ ہوا۔

اس زمانہ میں متضاد جذبات بلقیس کے دل میں دوڑ رہے تھے۔ اس خاص واقعہ سے وہ بیحد متاثر تھی۔ اس کے خیالات میں سکون پیدا ہو رہا تھا کہ جعفری بیمار ہو گیا۔ — قدرت اس کے جذبات اور اس کی زندگی سے کھیل رہی تھی۔ جعفری کی علالت پر وہ خوشی سے ناچنے لگی۔

جعفری کا اصرار تھا کہ اسے دواخانہ بھیج دیا جائے۔ اس کی حالت خراب ہوتی گئی۔ اسے دواخانہ بھیج دیا گیا۔ جعفری نے جاتے وقت بلقیس کو قریب بلایا اور بولا " بلقیس اب آپ ہر طرح آزاد ہیں۔

بلقیس بیتاب ہو کر بولی " نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا " وفور جذبات سے وہ بیہوش ہو گئی۔

زندگی اسے خوفناک نظر آ رہی تھی۔ دن گزرتا تو رات سے وہ خائف ہو جاتی رات ختم ہوتی تو دن اسے بھیانک معلوم ہوتا۔ مسلسل روح فرسائی اور پیہم قلبی اذیت سے وقت گزار رہی تھی۔ ہر وقت وہ قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے تیار تھی۔ قدرت اب بھی سہل انگاری سے کام لے رہی تھی بلقیس متحیر تھی کہ اس زبردست جاں سوزی کی حالت میں اس کی توانائیوں نے جواب کیوں نہیں دیا۔

مکمل ۲۱ دن کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ جعفری موت کے پنجے سے نکل گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے کھو سی گئی۔ عورت کا زہریلا انتقام جس پر اس کی ساری امیدوں کا دار و مدار تھا کامیاب نہ ہو سکا اور جبکہ وہ جعفری کی شخصیت سے متاثر ہو چکی تھی۔ قدرت نے (جس سے بلقیس کی آس ٹوٹ چکی تھی) جعفری پر بے موقع اور بے نتیجہ وار کیا۔ وہ سوچنے لگی۔ کیا فی الحقیقت دنیا کو

جعفری کے وجود کی ضرورت ہے۔ کیا دنیا اس سے کسی مسئلہ پر روشنی ڈالنا چاہتی ہے۔ جعفری جو کچھ کہہ رہے تھے کیا وہ صحیح ہے۔ اس کے پہلے زاویہ نگاہ کی، طوفانی واقعات کے پر زور ہچکولوں نے جڑیں ڈھیلی کر دیں۔ جعفری کی صحت کی اطلاع نے اسے اور بھی مایوس کر دیا۔

خیالات نے کروٹ لی۔ نئی روشنی نئی فضا میں اس نے موجودہ حالات کا جائزہ لیا۔ پہلے واقعات کی رو کے اثر میں وہ جعفری کے ساتھ دواخانہ جانا چاہتی تھی لیکن اس کے والدین نے اسے روکا۔ اب جبکہ جعفری اچھا ہو گیا تھا۔ بلقیس دواخانہ جانا چاہتی تھی اور یہ وہ سوچ رہی تھی کہ جب ضرورت تھی میں نہیں گئی اب کیا منہ لے کر جاؤں۔ وہ خود ہی آجائیں گے۔

کچھ دنوں بعد بلقیس کو اطلاع ملی کہ جعفری دواخانہ سے اپنے گھر چلا گیا۔ اس کو دلی تکلیف ہوئی وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ بن بلوائے جانا ٹھیک نہیں۔ خودداری نے اسے اجازت نہیں دی۔ جعفری کی طرف سے بالکل سکوت تھا۔ ماں باپ مجبور کر رہے تھے چند دن اس نے انتظار کیا۔ آخر چلی گئی۔

جب بلقیس کمرہ میں داخل ہوئی تو دیکھا۔ ناصر کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ جعفری پلنگ پر دراز ہے۔ ایک گوشت و خون کا تنومند مجسمہ دوسرا پوست و استخواں کا مضمحل ڈھانچہ بلقیس نے دونوں کو غور سے دیکھا ناصر نے پوچھا "آپ کیسے" ناصر (جعفری کو بتا کر) "آپ کی علالت کی خبر سنتے ہی فوراً ادھر آ گیا۔ تشریف لائیے۔" ایک کرسی ناصر کے قریب رکھی ہوئی تھی۔ بلقیس کرسی کی طرف بڑھی۔ مڑ کر وہ جعفری کے پائنتی پلنگ پر بیٹھ گئی...... گویا مذہب کی معین کردہ جگہ اسے مرغوب ہو گئی۔ اس کے تنزل قلب نے یکسوئی کی راہ ممیز کر لی۔ قدرت کے کھلونا بننے کا اس میں حوصلہ نہیں رہا۔

جعفری نے بلقیس کے پلنگ پر بیٹھنے پر نہ کوئی اعتنا کی اور نہ اس کی جگہ کے انتخاب پر غور کیا۔ اس کے خوفناک عزائم اور ہولناک استقلال نے جعفری کے ارادوں کو شکست دیدی۔ کمرہ میں بالکل سکوت تھا۔ ناصر کے جانے کے بعد بھی یہ سکوت قائم رہا۔ جعفری اور بلقیس اس وقت ایک ہی پلنگ پر تھے۔ دونوں مختلف فضاؤں میں گھوم رہے تھے۔ جعفری نے سکوت توڑا۔

جعفری: "میں آپ کو خط لکھنے والا تھا۔"

بلقیس: "میں بغیر بلائے آگئی۔ فرمائیے۔"

جعفری روکھے پن سے بولا: "میں آپ کو بلانا نہیں چاہتا تھا۔ میں تصفیہ کر چکا ہوں کہ آپ کو مذہب کے قید و بند سے آزاد کر دوں۔ یہ میرا اعترافِ شکست ہے۔ انتقام کا رخ پلٹ گیا۔

بلقیس نے جعفری کے ہاتھ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی مگر صرف انگلیاں چھو سکیں۔ جعفری بلقیس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی کہ کچھ دیکھنا چاہا۔

"بلقیس سرگوشیانہ انداز میں بولی میں آپ کی قید کو آزادی پر ترجیح دیتی ہوں۔ اعترافِ شکست بے محل ہے بلقیس نے نظریں نیچی کر لیں۔

جعفری کی بھویں تن گئیں "ایثار...... قربانی...... نہ اس کی ضرورت ہے اور نہ میں برداشت کر سکتا...... میں ان آنکھوں میں ندامت دیکھنا چاہتا ہوں۔

بلقیس لجاجت سے بولی "دیکھیے ان آنکھوں میں سوائے ندامت و انفعال کے اور کچھ نہیں جعفری نے زبان سے زیادہ آنکھوں میں اظہار تمنا دیکھا۔

جعفری "میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔ کیا یہ حقیقت ہے یا خوشگوار خواب۔

بلقیس بولی "اب میں جاگ گئی۔

جعفری بلقیس کو غور سے دیکھ کر بولا "آپ بدل جائیں گی! مجھے اس کی کوئی امید نہ تھی۔ کمزوری کا اعتراف کرنا بڑے دل کا کام ہے۔ بلقیس بیحد پشیمان تھی۔ لیکن وہ اس فضا کو جلد از جلد صاف کر لینا چاہتی تھی بولی "یہ سب میرا قصور تھا۔

جعفری: "خدا کا شکر ہے"
بلقیس: "تفصیلات میں نہ جانے میں جان گئی آپ غیر معمولی انسان ہیں۔ ضبط و تحمل کا مکمل نمونہ۔"
جعفری: "شکریہ۔"
بلقیس حیرت سے "مگر وہ کیوں؟"
جعفری "پہلے میں آپ کا دل جیتنا چاہتا تھا..... جو آسان نہ تھا - میں نے دل جیت لیا۔"
"سچ؟" بلقیس اس خیال میں کھوسی گئی۔

ابو الظفر عون اللہ ظفر

غزل

پیغام دے رہی تھی فنا کا بقا مجھے
آخر بقا کی دھن نے کیا ہے فنا مجھے

وہ آ گئے تو ہو گئی حاصل شفا مجھے
حیران ہو کے دیکھ رہی ہے قضا مجھے

کچھ کہہ گئی ہے کان میں جب سے صبا مجھے
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

جنجھوڑ تے تیرے جب سے کیا آشنا مجھے
میرے لہو سے آتی ہے بوئے وفا مجھے

آباد دل کیا میرا احسان ہے تیرا
رہ رہ کے یاد آتی ہے تیری جفا مجھے

زلفِ سیاہِ یار ہے یا مار آستین
جینے کہیں نہ دیگی یہ کالی بلا مجھے

دن رات ہجر میں تیرے آنکھیں ہیں اشکبار
کب چین لینے دیگی یہ آہ و بکا مجھے

غیروں کی بیوفائی کا غنی ہے کیا گلہ
خود میری جان دے گئی آخر دغا مجھے

سید غوث الدین غنی

ڈرامہ گلزارِ نسیم (نشری ضروریات کے مدنظر)

[سرد ہوائیں، پرندوں کی چہک، آبشار کا گرنا]

تاج الملوک۔ شہزادے! دیکھ لیا باپ کی شفقت، ماں کا پیار، بھائیوں کی محبت۔ اب تجھے آگے بڑھنا ہے، اپنی دنیا آپ بناتی ہے۔ اپنے پر اعتماد کرنا سیکھ، .... یہ کیا بچی بچی مچا رکھی ہے۔ (پھریری پھینکنے کی آواز)

سپاہی۔ (اپنے ساتھی سے) ابھی تک شہزادوں کا پتہ نہیں چلا۔ جانے کہاں غائب ہو گئے۔

دوسرا سپاہی۔ چلو، اب ڈھونڈنا فضول ہے۔ شام بھی ہو چکی۔

تاج الملوک۔ کس کی تلاش ہے۔

سپاہی۔ تم نے ہمارے شہزادوں کو دیکھا ہے۔

تاج الملوک۔ شہزادے! مطلب۔

سپاہی — کئی دن سے لاپتہ ہیں۔

تاج الملوک۔ کہاں کے شہزادے ہیں۔

سپاہی۔ شہنشاہ زین الملوک کے فرزند ارجمند ہیں۔

تاج الملوک۔ شہنشاہ تاج الملوک کے فرزند!

دوسرا سپاہی۔ ہاں! گل بکاؤلی کی تلاش میں نکلے ہیں۔

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

بیسوا۔ کون۔

تاج الملوک۔ میں۔ شہزادہ تاج الملوک۔

بیسوا۔ (خوشی کے لہجے میں) تشریف لایئے۔ فرمایئے کیسے زحمت کی۔

تاج الملوک۔ آپ کی بڑی تعریف سنی ہے، سنا ہے کہ شطرنج میں کمال حاصل ہے۔

بیسوا۔ (انکسار کے لہجہ میں) ذرہ نوازی ہے۔ خواہ مخواہ کے لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے۔

تاج الملوک۔ تو ایک بازی ہو جائے۔

بیسوا۔ خوب۔

(جنگل، سناٹا۔ دور سے خوفناک آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ جیسے دیو چیخ رہے ہوں)

تاج الملوک۔ اُف، میں کس خوفناک جنگل میں پہنچ گیا۔ اے خدا اب تو ہی بچا (دور سے اونٹوں کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دیتی ہے)

دیو۔ (خوفناک آوازیں) اہا۔ آج میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ اُدھر آدم زاد۔ اِدھر اونٹ۔ پہلے کس کو نوالہ بناؤں۔ پہلے اونٹ کو چٹ کر لیں، بعد میں حضرت آدم کی خبر لیں۔ قہقہہ۔

تاج الملوک۔ اے خدا تو ہی میری زندگی کا محافظ ہے، مجھے بچا —— اونٹ۔ دیکھیں اس میں کیا ہے —— میٹھا!

دیو۔ (قریب آ کر) کیوں میاں صاحبزادے۔

تاج الملوک۔ آداب بجا لاتا ہوں چچا جان۔

دیو۔ اپنے چچا کے لئے کیا رکھا ہے۔

تاج الملوک۔ ایسی چیز ہے بس آپ یاد ہی کرتے رہئے گا —— فرمائیے کیسی چیز ہے۔

دیو۔ (خوشی کے لہجہ میں) بڑی مزے کی ہے —— آج ہم تجھ سے بہت خوش ہیں۔ مانگ کیا مانگتا ہے۔

تاج الملوک۔ چچا —— لیکن آپ وہ چیز نہیں دے سکتے۔

دیو۔ (غصہ سے) ہم ضرور دیں گے۔ مانگ۔

تاج الملوک۔ چچا دل میں ایک ہی آرزو ہے۔

دیو۔ وہ کیا۔

تاج الملوک۔ باغ ارم کی سیر۔

دیو۔ باغ ارم کی سیر! یہ سودا کب سے پیدا ہوا۔ جانتا ہے وہ کس کا باغ ہے۔

تاج الملوک۔ جی ہاں —— آپ کی مدد درکار ہے۔

دیو۔ افسوس —— خیر ہم اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ (تالی بجاتا ہے)

دوسرا دیو۔ حضور

دیو۔ اسے حمالہ دیوی کے ہاں لیجا اور یہ رقعہ دیدے۔

دوسرا دیو۔ بہت خوب۔
جمالہ دیونی۔ (محمودہ کو آواز دیتی ہے) محمودہ، محمودہ۔
محمودہ ۔ جی۔
جمالہ دیونی۔ خوش ہوجا۔ تیرا ہم جنس آگیا۔
محمودہ ۔ سچ۔
تاج الملوک۔ (عالم بےخیالی میں) اُف کیسی سرد ہوائیں چل رہی ہیں۔
محمودہ ۔ (معشوقانہ لہجہ میں) ایسی ہی ہوا سے کلیاں کھلتی
ہیں۔ پھول ہنستے ہیں جن کی خوشبو سے سارا
چمن مہک اٹھتا ہے۔
تاج الملوک۔ اور جس کے دل کا چمن ہی اجڑ گیا ہو ـــــــ
کاش میرے دل کا کنول بھی کھل جاتا۔
محمودہ ۔ کنول! کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ اتنے اداس
کیوں ہیں۔ فرمائیے کیا میں آپ کی کوئی خدمت
کرسکتی ہوں۔
تاج الملوک۔ خدمت! ـــــ قہقہہ۔ مدد کی بھی ایک ہی کہی۔
محمودہ ۔ آپ کی باتوں سے مجھے تو ہول ہوتی ہے۔
[گلزار ارم، ہواؤں کے تیز جھونکے، بلبلے اڑتے ہوئے
فوارے۔ درختوں کی ڈالیوں کو ہٹانے کی آواز۔]
ڈالی سے پھول توڑنے کی آواز۔
تاج الملوک۔ (خوشی کے لہجہ میں) آہا۔ میں کتنا خوش ہوں۔ اے
نورانی دنیا، تیری ہر چیز کتنی حسین ہے۔ جس پھول
کی خواہش تھی مجھے تیری نورانی سرزمین میں لائی میں
نے وہ پھول حاصل کرلیا۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ
جیسے میں بلندیوں پر اڑا جارہا ہوں ـــــــ یہ
کیا۔ یہ تم ہو۔ اے حسن کی ملکہ دلنواز۔ تم ہی بکاؤلی
ہو۔ جن کی تعریف سنا کرتا تھا ـــــ کاش مجھ میں
اتنی ہمت ہوتی کہ اس فتنۂ خفتہ کو بیدار کرتا۔ دنیا
کے کسی جھنڈ میں، نہر کے کنارے، ہریالی کے مخملیں
فرش پر ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سنتے زندگی
گزار دیتے۔ جانے تم عالم خواب میں کن حسین خیالوں
کی دنیا میں سیر کررہی ہوگی۔ اور میں یہاں کھڑا تمہارے
قریب حسن کی سیر کر رہا ہوں۔ صبح تم اٹھوگی۔ تمہیں اس کا
بھی علم نہ ہوگا کہ رات کسی نے تمہیں اس حال میں دیکھا۔
کہ اگر تم خود بھی اپنے آپ کو دیکھتیں تو شرما جاتیں ـــ
دلہن ـــــ) ایک! جانے سے پہلے ہم تمہیں اپنی
ایک نشانی دیئے جاتے ہیں: تاکہ ہماری یاد تمہاری زندگی
بن جائے۔
[زین الملوک کے لڑکے پائے تخت کو واپس ہونے میں]
ایک بھائی۔ .... واہ رے مقدر
کس شکل سے پھر کر جاتے ہیں گھر
کیا رنگ زمانے نے دکھائے
گل لینے گئے تھے، داغ لائے
کس منہ سے پدر کے آگے جائیں
کیونکر بے پھول منہ دکھائیں
دوسرا بھائی۔ .... اور پھول لیجائیں
کحال کو بے وقوف ٹھہرائیں
ایک بھائی۔ کیا پھول ہے کیا اثر ہے اس میں
ہوجاتی ہیں روشن اندھی آنکھیں
فقیر ۔ (بڈھی آواز میں) صاحبزادے۔ یہ پھول وہ نہیں ہے
جس سے آنکھیں روشن ہوجاتی ہیں۔ وہ گل بکاؤلی
ہے۔
دوسرا بھائی۔ گل ہے کہ علاجِ نور ہے یہ
گل ہے کہ چراغ طور ہے یہ
تاج الملوک۔ بکو نہیں۔
پاتے اگر اس درخت کی چھاؤں بھی رکھتے ہی نہ تم زمین پر پاؤں
ڈینگ آپ کی سب فضول ہے یہ تو وہ گل یہ نہیں وہ پھول ہے
دونوں شہزادے۔ خوب۔
فقیر ۔ ہاں، ہاں وہ پھول یہی ہے۔
ایک بھائی۔ چھین لو۔
دوسرا بھائی۔ پکڑ لو، جانے نہ پائے۔

تاج الملوک۔ اس طرح حملہ کرتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی۔۔۔۔
چھوڑ دو۔۔۔۔ (لڑائی کی آواز)

کوتوال۔ (بکاؤلی) جہاں پناہ، اس پائے تخت ابد مدت
میں ایک بے مثل محل تیار ہوا ہے۔

بادشاہ۔ بے مثل، کیا بک رہا ہے۔

کوتوال۔ ان داتا۔ سچ کہہ رہا ہوں، ہر روز بے حساب خیرات
تقسیم ہوتی ہے۔

بادشاہ۔ (زین الملوک) جھوٹ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہماری
برابری کوئی بھی نہیں کرسکتا۔

وزیر۔ (شیریں نوائی آواز میں) حضور، ہو سکتا ہے،
بہتر ہے کہ چل کر دیکھ لیں، حقیقت کا انکشاف ہو جائے گا۔

بادشاہ۔ خوب۔

تاج الملوک۔ حضور نے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرما کر رونق بخشی۔

زین الملوک۔ ہم نے تمھاری داد و دہش کی بڑی تعریف سنی ہے۔

تاج الملوک۔ بندہ نوازی ہے، حضور کے کئی فرزند ارجمند ہیں۔

زین الملوک۔ یہ چار عنصر خلافت
ایک اور ہوا تھا قابل حشم
وہ نور بصر تھا دشمن چشم
جب لائے یہ گل بکاؤلی کا
نکلا تب خار روشنی کا

تاج الملوک۔ حضور، آخر اب وہ کہاں ہے، کیا حضور نے کبھی
اس کی خبر لی۔

زین الملوک۔ ہمیں کوئی خبر نہیں، کیسا ہے کہاں ہے۔

تاج الملوک۔ کیا کوئی اس شہزادے کو جانتا ہے۔

ایک آدمی۔ حضور، یہ وہی تاج الملوک ہے، جن کو حضرت
پیر و مرشد نے اپنی نظروں سے گرا دیا تھا۔

زین الملوک۔ میرے بیٹے۔

تاج الملوک۔ حضور ابا!

زین الملوک۔ میرے بیٹے، اٹھو، اپنا سر اٹھاؤ، مجھے شرمندہ نہ کرو۔

تاج الملوک۔ حضور آپ سے اور بھی نیاز حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

زین الملوک۔ اجازت ہے۔ تخلیہ۔

تاج الملوک۔ دلبر۔ محمودہ۔

دلبر۔ حضور جان کی اماں پاؤں تو کچھ عرض کروں۔

زین الملوک۔ اجازت ہے۔

دلبر۔ حضور، ان شہزادوں نے آپ کو دھوکا دیا۔ پائے تخت سے
نکل کر میری قید میں گرفتار ہوئے۔ شہزادے تاج الملوک
نے تکلیفیں برداشت کرکے گل بکاؤلی کو حاصل کیا اور
پائے تخت روانہ ہوئے۔ راستہ میں ان شہزادوں
نے پھول کو چھین لیا اور آپ کے ہاں سرخرو ہوئے۔

زین الملوک۔ بیٹا۔

تاج الملوک۔ حضور ابا!

زین الملوک۔ بیٹا تم نے مجھے اپنی کھوئی ہوئی روشنی دلائی،
اب اپنی ماں سے لو، جو تمھاری یاد میں گھل رہی ہے۔

تاج الملوک۔ حضور ابا۔

بکاؤلی۔ شہزادے

تاج الملوک۔ بکاؤلی!

بکاؤلی۔ (شیریں نوائی لہجہ میں) کیوں جی تمھیں لے گئے تھے وہاں
کیا کہتی ہوں میں اِدھر تو دیکھو
مری طرف اک نظر تو دیکھو
ہے یا نہیں یہ خطا تمھاری
فرمائیے کیا سزا تمھاری

تاج الملوک۔ (خوشی کے لہجہ میں) رضا ہے جو خوشی ہو
عاشق کی سزا پوچھتی ہو
مشکیں زلفوں سے مشکیں کسواؤ
کالے ناگوں سے مجھ کو ڈسواؤ
تلوار سے جو قتل ہو منظور
ابرو کے اشارے سے کر دو چور
زنداں میں جو زندہ بھیجنا ہو
اپنے دل تنگ میں جگہ دو

بکاؤلی۔ (شیریں لہجہ میں)
گلچیں تو نہیں فقط چمن کا محرم ہے سارے تن بدن کا

رخ دیکھ چکی ہوں اب ترا میں
منہ دوسرے کو دکھاؤں کیا میں

(بکاؤلی کی سہیلیاں بکاؤلی کو سمجھانے لگتی ہیں)

ایک سہیلی۔ ثابت اثر کچھ ستارے کا ہے
اس چاند کو کیا گہن لگا ہے
رحم اپنی جوانی پر ذرا کر
منہ دیکھ تو آئینہ منگا کر

دوسری سہیلی۔ صورت تیری زار ہو گئی ہے
گل ہو کے تو خار ہو گئی ہے
ہے ہے تیری عقل کس نے کھوئی
ناجنس کو چاہتا ہے کوئی

بکاؤلی۔ رنجور جو ہوں تو میں نے تمہیں کیا
مجبور جو ہوں تو میں تمہیں کیا
تا مری حالت اب ردی ہے
بہتر ہے وہی جو کچھ بری ہے
بلبل اسی چمک گل کی ہوں میں
تم کیا ہو ہزار میں کہوں میں
بیماری عشق لا دوا ہے
اس باغ کی اور ہی دوا ہے

سہیلیاں ہنستی ہیں۔ ایک تان دیتی ہے۔
اب تو عشق سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ قہقہہ۔

بکاؤلی۔ روح افزا، خیر تو ہے۔
روح افزا۔ بول مٹھائی کھلاؤ گی۔
بکاؤلی۔ کس خوشی میں۔
روح افزا۔ بڑی مزے کی بات ہے۔
بکاؤلی۔ بتا تو۔
روح افزا۔ چچی جان نے مان لیا۔
بکاؤلی۔ مان لیا۔ کیا مان لیا۔
روح افزا۔ تیرا بیاہ۔
بکاؤلی۔ تیرا بیاہ! کیا بک رہی ہے۔
روح افزا۔ تیرا بیاہ بشر کے ساتھ۔
بکاؤلی۔ سچ ——— اہا۔ اب میں کتنی خوش ہوں۔

تاج الملوک ہنستا ہوا کمرے میں داخل ہوتا ہے ———
بکاؤلی پوچھتی ہے۔)

تاج الملوک۔ (ہنسی)
بکاؤلی۔ خیر تو ہے۔
تاج الملوک۔ (ہنسی)
بکاؤلی۔ سبب۔ دیوانے تو نہیں ہو گئے۔
کوئی بے سبب نہیں ہنستا

تاج الملوک۔ خواب دیکھتا تھا ——— آتش پہ کباب دیکھتا تھا
بکاؤلی۔ ہم بتائیں تعبیر ——— دل سوزی کرے گا کوئی دگر
تاج الملوک۔ رات کو افق میں ——— خورشید تھا آتش شفق میں
بکاؤلی۔ مہر سے شب روز ——— عالم میں رہوگے رونق افروز
تاج الملوک۔ اک مقام ہوتا ——— گلزار خلیل رو برو تھا
بکاؤلی۔ بشر ہو تم ولا در ——— سرسبز ہو تم قوم آتشی پر
تاج الملوک۔ دیکھتی اک شتیل ——— شعلہ ہو انجمن میں رقصاں
بکاؤلی۔ وہ شعلہ میں پری ہوں ——— جو ناچ نچاؤ ناچتی ہوں
تاج الملوک۔ جب ہوا اجالا ——— بخشا مہ انجمن نے ہالا
بکاؤلی۔ ہالہ مہ انجمن کا کیا تھا ——— وہ ہار تھا جو گلے پڑا تھا

ہائیں یہ کیا۔

تاج الملوک۔ ہار نو لکھا (ہنسے لگتا ہے) کیوں جی یہ اکیلے شب کو جلنا
اوپر اوپر مزے اڑانا

بکاؤلی۔ ——— (سن اے صلاح دشمن) میں جا کے جلی تو غم نہیں ہے
ڈر ہے کہ نہ تجھ پر آنچ آجائے

تاج الملوک ——— میرے جلنے پہ خاک ڈالیو۔ تم نام نہ واں کے جلنے کا لو
یہ نہ ہو گا مجھ ——— سے میں دو قدم آگے ہوں گا تجھ سے

(راجہ اندر کا محل، گانا بجانا۔ گھنگرو کا ناچ۔ راجہ کا واہ واہ کرنا۔)

راجہ اندر۔ ہم بکاؤلی کا گانا سننا چاہتے ہیں۔
بکاؤلی۔ کورنش بجالاتی ہے۔
راجہ اندر۔ کوئی اچھی سی غزل۔

بکاؤلی۔ ستار، سارنگی کی گت پر غزل شروع کرتی ہے۔

ساقی قدح شراب دے دے
مہتاب میں آفتاب دیدے
ساقی باقی جو کچھ ہو لے لے
باقی سب تی شراب دیدے
اس بت سے نہیں سوال کچھ۔ اور
اپنے منہ سے جواب دیدے
لیلیٰ میں نے تجھے بنایا
مجنوں مجھ کو خطاب دیدے
اس گل سے بکاؤلی زر نہ مانگ
جو چاہے وہ بیحساب دیدے

راجہ اندر۔ واہ واہ، کمال کر دیا۔ مانگ، کیا مانگتی ہے۔

بکاؤلی۔ حضور۔

راجہ اندر۔ مانگ۔

بکاؤلی۔ حضور ــــــ تاج الملوک!

راجہ اندر۔ تاج الملوک۔ بے شرم، بے حیا۔ یہ مجال! لیجاؤ اس کو میری نظروں سے دور کر دو، دور پھینک دو۔

بکاؤلی۔ مہاراج!

راجہ اندر۔ بارہ برس تک تو پتھر کی مورت بن جا۔

بکاؤلی۔ مہاراج!

(ہل جوتنے کی آواز۔ دہقان کا بیلوں کو ہانکنا)

تاج الملوک۔ بکاؤلی! ــــــ بکاؤلی!

بکاؤلی۔ کون ــــــ آپ ــــــ شہزادے۔ یہاں کیسے۔

تاج الملوک۔ بکاؤلی۔ بتاؤ تم ہی بکاؤلی ہو۔ کیا میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں، تم کو پاکر مجھے کتنی خوشی ہوئی۔

بکاؤلی۔ کیوں جھوٹ بکتے ہو شہزادے۔ میں جانتی ہوں، اس لئے تو آپ نے رانی سے شادی کی۔

تاج الملوک۔ مجبوری۔

بکاؤلی۔ مجبوری! ــــــ خوب۔

تاج الملوک۔ بکاؤلی، زخموں پر نمک نہ چھڑکو، میں شرمندہ ہوں۔ میں مصیبتوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس لئے میں نے رانی سے شادی کرلی۔ چھوڑو ان واہیات باتوں کو، آؤ کسی درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر پیار کی باتیں کریں۔

بکاؤلی آپ چلئے، میں ابھی آئی۔ بابا کو روٹی دیکر آتی ہوں۔ آپ میرا انتظار کیجئے۔

دہقان: (غصہ سے) یہ بات ہے، کیوں جوانی زور کرنے لگی۔

بکاؤلی۔ بابا۔

دہقان۔ مکار، دور ہو۔

بکاؤلی۔ بابا یہ میرے شوہر ہیں۔

دہقان۔ (حقارت سے) شوہر! بناتا ہوں، تو سمجھتی ہے، کیا تو ایسے ہی بیاہی جائے گی۔ تجھے تو سونے میں تولوں گا۔ کیا یوں ہی تجھے کھلا پلا کر بڑا کیا ہے۔

بکاؤلی۔ (غصہ سے) بابا ــــــ آپ دولت چاہتے ہیں۔ آئیے، میں آپ کو دولت دیتی ہوں، اس گڑھے میں دیکھئے۔ اٹھائیے آپ جتنی دولت لے سکتے ہیں لے جائیے۔ میرا منہ کیا دیکھتے ہیں۔

دہقان۔ (خوشی کے لہجہ میں) دولت!

بکاؤلی۔ آپ کو دولت سے محبت ہے نا۔

دہقان۔ میری بیٹی!

بکاؤلی۔ بابا۔ یہ میرے شوہر ہیں۔ آج سے بارہ سال پہلے ان کے ساتھ میری شادی ہو چکی تھی۔ راجہ اندر کی بددعا سے میں پتھر کی مورت میں تبدیل ہو گئی۔ اب مصیبت کے دن ختم ہو گئے۔ اب میں آپ سے جدا ہوتی ہوں۔

تاج الملوک۔ بکاولی تم نے مجھے زندگی بخشی، آؤ چلیں، ایک ایسی دنیا میں جہاں محبت کی چھاؤں ہو، جہاں یہ دل دکھانے والی باتیں نہ ہوں، بس تم ہو اور میں، چڑیوں کے چہچہے، آبشار کا ترنم ایک ایسی ہی سرزمین میں۔ اپنی زندگی گزاریں۔

سید محی الدین احمد

غزل

خوشبو کا کارواں اِدھر آیا اُدھر گیا
طوفاں بہار کا جو اٹھا تھا گزر گیا

ابرِ سیاہ میکدہ پر سے گزر گیا
دیوانہ دل کو اور بھی دیوانہ کر گیا

جب سے مذاقِ دیدِ طلوعِ سحر گیا
بندہ نواز آپ کا ذوقِ نظر گیا

بجلی سے بات چیت نشیمن کے دم سے تھی
کاشانہ جل گیا تو وہ نشّہ اُتر گیا

گزرا ہے کون رہگذرِ فکر سے کہ آج
دامن تصورات کا جلووں سے بھر گیا

تدبیر اک بہانہ تھی، تقدیر اک خیال
تو نے جسے سنوار دیا وہ سنور گیا

لالہ بھی دل میں داغِ غمِ زندگی لئے
چندے نگاہِ اہلِ جہاں میں اُبھر گیا

اب دل ہے اور جذب کی کیفیتِ لطیف
وہ اشتیاقِ سجدۂ ہر سنگِ در گیا

رندوں کو میکدے کی روایات سونپ کر
ساقی شراب پی کے نہ جانے کدھر گیا

بکھرے پڑے ہیں پھول کسی کے مزار پر
یہ کون صبح صبح غریبوں کے گھر گیا

آنسو میں عکس ریز ہے کس کی ضیائے رُخ
کس کی جھلک سے رُوپ گہر کا نکھر گیا

طوفاں اٹھا اٹھا کے حوادث گزر گئے
اپنی ہی راہ میرا دلِ بے خبر گیا

ساغر نہیں، شراب نہیں، میکدہ نہیں
فطرتؔ کسی کا عہدِ جوانی گزر گیا

عبدالعزیز فطرت

آرٹ میں حسن کار کی شخصیت کا عکس

آرٹ کے متعلق کولرج کہتا ہے "دو ہی چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ قدرت کی پیدا کی ہوئی یا انسان کی بنائی ہوئی۔ مادی چیزیں تو خیر قدرت پیدا کرتی ہے، لیکن تخیلی اشیاء بالکلیہ انسانی پیداوار ہوتی ہیں۔ ان دونوں عناصر (یعنی مادی و غیر مادی) کے خوش آہنگ اتحاد و امتزاج کو آرٹ کہتے ہیں"۔ اس تعریف کے اعتبار سے انسانی تخیل اور قدرتی اشیاء کی درمیانی کیفیت کا نام آرٹ ہوا۔ یوں تو ہر نظری آرٹ میں صرف نیچر ہی ہوتی ہے، جس کے اکثر رموز سے عام نقاد کو واسطہ پڑتا رہتا ہے، لیکن اسی نیچر پر انسانی اثر کا اضافہ ہوتے ہی، یہ جاننا ضروری ہو جاتا ہے کہ انسان نے قدرت کو کس جذبے کی عینک سے دیکھ کر بنایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سطح تصویر پر قدرت مصورہ بے کم و کاست ظاہر ہو جاتی ہے جسے ہم دیکھتے ہی فوراً پہچان بھی لیتے ہیں۔ لیکن اس کے بنانے والے صناع کا اسی میں سراغ لگانے کے لئے گہری نظر کی ضرورت ہے۔ حسن کار کی شخصیت کا سراغ لگانے میں ذیل کی چند تنقیحات ممد و معاون ثابت ہوں گی۔

(۱) فرض کیجئے کہ ایک حسن کار، شبیہ کش مصور یعنی چترکار ہے۔ اس کی شبیہ پر نظر پڑتے ہی، ہمیں غور کرنا چاہیے کہ آیا اس نے اپنے معمول کے جسم کی بیرونی سطح کے نشیب و فراز کی نقاشی کی ہے، یا کہ اس کی کرداری خصوصیات کو بھی اجاگر کیا ہے؟ اگر تصویر سے یہ ظاہر ہو کہ مصور نے کردار نگاری میں ہچکچاتا پس و پیش کیا ہے۔ لیکن مشابہت بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ تو اس تصویر کے متعلق ہم یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ مصور نے اپنے معمول کو کیمرے سے دیوار پر ٹھونک دیا ہے اور بس۔ اور اگر اس نے کردار نگاری کی کوشش کی ہے، تو ہمیں یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ اس خصوص میں، کلی یا جزوی حیثیت سے اسے کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔

یہ جاننا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ہر معمول کی شبیہی تصویر حسن کار کے لطافت ذوق اور نزاکت خیال کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اسی آئینہ کے اندر مصور کی شستہ مذاقی اور دقیقہ رس ذہانت کا عکس نظر آجاتا ہے۔ چنانچہ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ کردار نگاری کی پیشکش میں تصویر کے غلط اور ناہموار سطحوں کو بہ غور دیکھنے سے مصور کا باطنی بھدا پن اور فطرت کی ناہمواری ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ دوسرے موضوعات کے مقابلے میں شبیہی تصویروں کے اندر حسن کار کی شخصیت زیادہ نمایاں اور منعکس ہوتی ہے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ بعض قابل اساتذۂ فن، کسی شخص کے کرداری خصوصیات کو نمایاں کرتے وقت کہیں نہ کہیں اپنی ذاتی خصوصیات کا بھی اضافہ کر جاتے ہیں۔ پوری تصویر کو جب تک خود نہ بناتے تھے، اس پر دستخط نہیں کرتے تھے، اسی لئے قدیم اساتذہ کی تصویروں پر شاذ ہی ان کے دستخط ثبت ہوتے ہیں۔

ان حضرات کا ایسا طرز عمل اس بات کا بین ثبوت ہے کہ بڑا چترکار (Portraitist) ایک دقیقہ رس اور نازک خیال، شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ تاریخ سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔

(۲) اگر ہمارا پسندیدہ حسن کار، روزمرہ واقعات کا قلمی عکاس ہے، تو اس صورت میں ہم یہ غور کرنے پر مجبور ہوں گے کہ آیا اس کا نفس روزانہ وقوع پذیر ہونے والے چھوٹے چھوٹے واقعات سے خوش بھی ہوتا ہے یا نہیں؛ یا محض ہماری خوشی اور خوشنودی حاصل کرنے کی خواہش سے اس نے ایسی تصویریں بنا دی ہیں۔ اگر ایسا حسن کار محض ہمیں خوش کرنے کے لئے تصویر کشی کرتا ہے، تو وہ حقیقت میں ایک لازم پیشہ شاعر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، اس لئے کہ جن واقعات کی وہ عکاسی کرتا ہے، ان سے اس کو کوئی ذاتی دلچسپی نہیں ہوتی۔ برعکس اس کے اگر وہ

حقیقت میں اپنی ذاتی دلچسپی کے مد نظر روزمرہ واقعات کا مرقع بناتا ہے، تو ہم یہ ضرور دیکھیں گے کہ آیا اس نے کل واقعہ کو یا تمام اشیائے متعلقہ پر نہایت خلوص سے مصورانہ انداز میں نظر ڈالتے ہوئے، کسی نہ کسی جگہ اپنی حقیقی فراست (genius) کا ایک آدھ گوشہ ضرور ایسا نکال دیا ہوگا جس سے اس کی حقیقی دلچسپی دل لگی کا ثبوت ملے۔ ورنہ وہ تماشائی کی مذمت سے بچنے کی خاطر ضروری فہرست کے مطابق یکے بعد دیگرے کل اشیاء کی شکلیں بنا کر تصویر کو اس طرح مکمل کردے گا کہ اس میں نقاد یا تماشائی کو سوائے اشیاء کے ڈھیر کے اور کوئی دل بستگی کا سامان نہ ملے گا۔ ایسی تصویروں میں ناظر یا تماشائی کو یہ بھی غور سے دیکھنا چاہیئے کہ مصور نے اپنے تصویری موضوع یعنی شئے مصورہ و قدرتی اشیاء کی نقل اتارنے سے ہٹ کر اپنی جدت طرازیوں سے کس حد تک بلند و مرتفع بنایا ہے۔ ورنہ اس کی تصویر ایسے عمل کا نمونہ ثابت ہوگی جو محض قدرتی اشکال کی نقل اتارنے ہی کو آرٹ کا منتہائے کمال سمجھتا ہے۔

(۳) اگر کوئی مصور خود کو محض تاریخی واقعات کی تصویر سازی کا پابند بنا لیا ہو، تو اس حسن کار کا اولین فرض ہوگا کہ جن معلومات کی بناء پر وہ اپنی تصویریں بناتا ہے تماشائی کو اس امر کا یقین دلائے کہ جو موضوع پیش کیا جارہا ہے وہ بالکل حقیقی اور مبنی بر صداقت ہے۔ یہ نہ ہو کہ اپنی غیر حقیقی تفصیل نگاری کو صحیح مان لینے کے لئے ناظر پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ بھی جانچنا ہوگا کہ جس منظر کو یہ حسن کار پیش کر رہا ہے آیا وہ منظر اسنے واقعی اتفاقیہ ہوا ہے یا کہ محض پامال اور پیش پا افتادہ موضوع کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کو ہر معمولی مصور بھی پیش کرسکتا ہے۔ یاد رہے کہ تاریخی تصویر کی خاصیت یہی ہوتی ہے کہ جس زمانہ کی وہ نمائندگی کرتی ہے تماشائی کو اسی زمانے کے ماحول میں لا کھڑا کر دیتی ہے۔ تاریخی پیکر اس انداز میں ہرگز نہ پیش کئے جائیں جس طرح حالیہ زمانے کا کوئی معمولی کرایہ کا لباس زیب تن کئے ہوئے تصویر کے لئے نشست دے رہا ہو۔ اور تصویر ختم ہوتے ہی اپنا اصلی لباس پہن کر گھر جانا چاہتا ہو۔ بلکہ تصویر کے پیکر اور دوسری اشکال بھی بالکل اپنے زمانے کی معلوم ہوں۔ زیر غور تصویر میں یہ نکات ظاہر نہ ہوں، تو وہ تصویر بیکار ہے۔

(۴) جو مصور گل کاری کرتا ہو، اس کے کام کو اس انداز سے جانچنا پڑے گا کہ آیا وہ حقیقی معنی میں حسن کار ہے بھی یا نہیں ؟ یا کہ وہ ایک ماہر نباتیات معلوم ہوتا ہے۔ اگر حسن کار ہوگا تو اس کی تصویر کے پھول پتے، گل بوٹے نباتیاتی تفصیلات اور توضیحات سے پاک ہوں گے، کیونکہ مصورانہ انداز میں بنائے ہوئے پھولوں کے گملوں اور گلدستوں میں، تازگی، شگفتگی، ہم آہنگی، اور تخیل کاری کو زبردست اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

(۵) بحری یا سمندری منظر نگار کی تصویروں کو اسی نقطہ نگاہ سے جانچنا چاہیئے، جس نگاہ سے خشکی کے قدرتی منظر نگار کی تصویروں کو جانچا جاتا ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ قدرتی منظر نگار کی طرح، سمندری منظر نگار بھی اپنے بنائے ہوئے منظر سے اسی طرح متاثر ہو کر بنایا ہے یا نہیں ؟ ورنہ وہی مثل ہوگی کہ تماشائی بھی مثل حضرت مسیح کے، ان پر ایمان لائے بغیر پانی پر چلنے لگیں گے۔ غور سے دیکھو کہ بحر بیکراں کی وسعت اور اس کی شان کو مصور نے کس حد تک دوبالا کیا ہے۔ سمندر کے رنگ اور اس کے ٹون میں کس قدر دلکشی پیدا کی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سمندری ہلچل اور حرکات کو کس دلکش انداز میں ظاہر کیا ہے ؟

(۶) اگر کوئی حسن کار، منظر نگاری کا مدعی ہو تو اس کا دعویٰ مذکورۂ بالا تمام حسن کاروں سے افضل ہے۔ اس صورت میں ناظر کے اس اصول کو یاد رکھئے کہ جو شئے اصل موضوع سے جتنی دور ہٹتا جاتا ہے، یا اس کے برعکس تماشائی سے جو چیز فاصلے میں جتنی دور ہٹتی جاتی ہے ہر دو صورتوں میں اس چیز کی شکل اور نظارے کی باریک

تفصیلات بتدریج دھندلی ہونے کے علاوہ تعداد میں بھی کم از کم دکھائی دینے لگتی ہیں۔ پس دیکھئے کہ منظر نگار نے اپنی تصویر میں اس اصول کی کہاں تک پابندی کی ہے؟ اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے تصویری ضرورت کے مطابق موضوع کی باریک جزئیات یا تفصیلات کو ترک کر دیا جاتا ہے، تو اسے عمل اختصار یا تسہیل کہتے ہیں۔ اور ایسے اختصار کا عمل زیادہ تر انفرادی ذوق اور تجربے پر منحصر ہوتا ہے۔ اس لئے دیکھنا ہوگا کہ مصور نے کس حد تک اپنے انفرادی ذوق کا ثبوت پیش کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ مصور کا نفس جن اشکال و حقایق کو قدرت سے اخذ کرتا ہے، بجنسہ انھیں سطح تصویر پر لوٹا دیتا ہے۔ لیکن منظر نگار تو حقیقت میں اپنے اور قدرت کے موقتی جذبات (Moods) کا مفسر ہوتا ہے۔

اور اسی موقتی انتخاب کی مدد سے وہ اپنے باطنی تاثرات یا کیفیات کو دوسروں پر ظاہر کرتا ہے۔ منظری تصویر کو جانچتے وقت یہ دیکھنا پڑے گا کہ آیا مصور کا مقصد یہ تو نہیں کہ وہ تماشائی کو کسی اونچے پہاڑ یا ٹیلے پر چڑھا کر وہاں سے دنیا کے پھیلاؤ کو اس انداز سے بتلائے کہ تماشائی پہاڑ سے جست کر کے پرندے کی طرح ہوا میں دور تک پرواز کرتا چلا جائے اور درمیان میں ٹکنے کے لئے (نظر کو) کوئی سہارا نہ ملے۔ یا یہ کہ تصویر میں ایسی سنگلاخ اور دشوار گزار زمین بنادی ہو، جس پر سے گزرنا تماشائی کے لئے (یعنی نظر کے لئے) باعث تکلیف ثابت ہو۔ ایک حسن کار کی حیثیت سے اس کا فرض ہے کہ قدرت کے ہر نازک، دلکش اور ترنم ریز کیفیت میں تماشائی کو بھی اپنا شریک اور ہمنوا بنالے! اگر اس اصول کے خلاف وہ ناہموار یا گزر رہ ہو یا موٹی بے ڈھنگی، کرخت اور کھردری پیڑوں سے ایک روک حائل کر دے گا، تو واقعی ایسا حسن کار اپنی نااہلی کے ساتھ باطنی بدذوقی اور خامی کا ثبوت بھی دے گا۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ بھاپ، بجلی، ہوا، آندھی، یا دوباراں جیسی انسان پر قابو رکھنے والی قدرت کی مخفی طاقتیں بھی، انسانی علم کے تابع ہوجاتی ہیں۔ پس حسن کار بھی ان قوتوں کو اپنے قابو میں رکھتے ہوئے، صرف انہی مظاہرات اور قدرتی اعمال کی رونگاری کرتا جاتا ہے، جس انداز سے یہ قوتیں خاص خاص حالات کے تحت ظاہر ہوتی ہیں۔۔۔ ان قوتوں کو اس خوبی سے اپنی تصویر میں جگہ دیتا ہے کہ ان کی موجودگی سے تصویر میں تنوع، یا گونا گونی پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی تنوع کی مدد سے، ہم ان طاقتوں کی اضافی یا تدریجی اہمیت سے واقف ہوجاتے ہیں۔

جو تصویریں ہمیں اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہیں، وہ ضرور دو جذبات کو اکساتی ہیں۔ ایک کا تعلق تصویری موضوع کی دلکشی سے ہوتا ہے، اور دوسرے کا حسن کار کی تعریف و ستایش سے۔ مصور کی فن کاری کی نسبت یہ عام خیال ہے کہ حاصل عمل کے فنا ہوتے ہی (خواہ تصویر ہو یا اور کوئی چیز) عامل (حسن کار) کی قوت اظہار اور کمال مہارت کا بھی خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے تصویر میں شئے مصورہ میں حسن کار کا زور قلم اور صناعانہ مہارت، تماشائی کو اپنی طرف متوجہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہے۔ پتھر، مٹی، کاغذ، رنگ یا جو بھی وسائل حسن کاری میں استعمال ہوتے ہیں، ہر ایک میں کچھ نہ کچھ ایسی فطری کمزوری ضرور پائی جاتی ہے، جو مصور کے تصور کی صحیح ترجمانی نہیں کرسکتے۔ لیکن ایک ماہر فن حسن کار اپنے منتخبہ وسیلہ (medium) کی خامیوں سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود اپنی خداداد قابلیت سے اس میں آرٹ کے زیادہ سے زیادہ محاسن کو سماتا اور نمایاں کرتا ہے۔ یہی خوبی اس کی شخصیت یا کمال مہارت ہوتا ہے، جسے ستایش نصیب ہوتی ہے۔ غالباً ایک شاعر کی مثال سے اس اصول کی وضاحت ہوجائے گی۔ فرض کیجئے کہ کسی شاعر کے دل میں اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کے ارمان تڑپ رہے ہوں۔

اگر وہ شعر و سخن کے وسیع تر حدود سے فائدہ اٹھا کر نظم کہے گا تو وہ ستائش ہرگز نصیب نہ ہوگی، جو مسدس یا رباعی جیسے تنگ حدود میں رہتے ہوئے اپنی طبع رسا کے جوہر دکھانے پر ہوگی۔ اور اسی محدود دائرے میں رہنے کی وجہ سے اس کی شخصیت کے جوہر بھی زیادہ نمایاں ہوں گے۔ حسن کاری بھی یہی حالت ہوتی ہے، جو اپنے منتخبہ وسیلہ کے حدود میں کام کر کے ستائش حاصل کرتا ہے۔

شخصیت ہی کے عنصر نے فوٹو گرافی کو بھی حسن کاری کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ جے۔ سی۔ وان ڈائک کہتا ہے "غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ تصویر محض سوانح حیات یا سرگزشت واقعات سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے استعجاب و استحسان کو اکسانے والے واقعات نہیں ہوتے بلکہ انسان (مصور) ہوتا ہے۔ جب تک ہم تصویر میں کسی انسانی کارگزاری اور اس کی خداداد ذہانت (Genius) کو محسوس نہ کریں گے، اس وقت تک تصویر ہمارے لئے محض چند واقعات کا مجموعہ بنی رہے گی اور بس۔ حقیقت میں کام نہیں، کام کا کرنے والا، سانچہ نہیں، سانچے کا ڈھالنے اور بنانے والا، رنگ نہیں، رنگ کا لگانے والا (مصور) ہی ہمارے خوابیدہ تخیل کو بیدار کر کے خراج تحسین حاصل کرتا ہے۔"

جو شخص بھی میکائیل انجیلو کے بنائے ہوئے مجسموں یا تصویروں کو دیکھے گا یہی بات محسوس کرے گا۔ اسی طرح فرانس ہالز، ریمبرانٹ، روبنس، وان ڈائک، ویلاسکوئز، ری بیرا، گویا، واٹو، ٹنٹوریٹو، تلے، ٹراپان، روسو، ریکو ٹرز، کانسٹیبل، ٹنیس برو، فلنڈرے، ہال، وہسلر، مونے، رووان، برنارڈ، ان لیس، وائی یاٹ اور جارج نور کے شاہکاروں کو غور سے دیکھیں تو ان میں ان اساتذہ کی شخصیتیں بخوبی محسوس ہو جائیں گی۔

یاد رکھنے کی بات ہے کہ جس طرح مذہب منطقیت کا علم نہیں، ویسے ہی آرٹ بھی منطقیت کا علم نہیں ہے۔ حقیقی معنی میں آرٹ روحانیت پر مبنی ہوتا ہے۔ ہر تصویر میں حسن کاری کی روح کو تلاش کرنا چاہئے۔ اس لئے آرٹ میں انسان یعنی مصور کی شخصیت کا پتہ لگاؤ، اور دیکھو کہ وہ کون ہے اور کیا ہے۔

(ترجمہ)

امجد علی

سرگزشت غالب:- اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حیات، کارناموں اور اعزہ و احباب کا ایک مکمل تذکرہ ہے جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ (لندن) نے نہایت تحقیق اور محنت سے مرتب کیا ہے۔ طلبہ اور ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بیحد مفید ہے۔ غالب کی تصویر اور خاندانی شجرے بھی شائع کئے گئے ہیں یہ چھوٹی سی کتاب سالہا سال کی تحقیقات اور غالب کی تصنیفات اور ان کے متعلق جو کچھ ادب اب تک شائع ہوا ہے اس کے تنقیدی مطالعہ کا نچوڑ ہے۔

بڑا سائز۔ صفحات (۶۴) کتابت و طباعت و کاغذ اعلیٰ۔ قیمت ۸/

ملنے کا پتہ:- سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن

زلزلے

اسی ذوم کلیان پہاڑی پر میں اور معراج کھڑے تھے
جو ہمارے نزدیک ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ جب تک میرا قیام
کلیانی میں رہا، ہر روز شام کو کسی نہ کسی بہانے میں اپنے
ملازم معراج کو ساتھ لئے یہاں آجاتا۔ کبھی ساتھ وہاں
کے چند بوڑھے بھی ہوتے جن سے کلیانی کے متعلق سیکڑوں
معلومات حاصل ہوتی تھیں۔ اسی دلچسپی میں گھنٹوں گزر جاتے
لیکن پھر بھی اٹھنے کو نہ چاہتا تھا۔ ایک شام ہم دونوں حسب معمول
وہاں پہنچے، مگر وہاں کوئی نہ تھا خدا جانے بات کیا تھی۔ عموماً
پنجشنبہ کو لوگ وہاں آنے سے جھجکتے تھے۔ اس روز معراج
نے بھی شکار کے بہانے میری بندوق اٹھالی تھی۔ خیر قصہ مختصر
ہم وہاں پہنچے، تھوڑی دیر جھاڑیوں میں ادھر ادھر مارے
مارے پھرا کئے، دو تین دفعہ بندوق چلانے کی بھی نوبت آئی
تماش لطف نہ آیا۔ جھاڑیوں میں سے نکل کر ہم اپنی پرانی
جگہ آبیٹھے۔ بیٹھے ہوئے کچھ تھوڑی دیر بھی نہ ہوئی تھی کہ
معراج نے اپنی بے چینی کا اظہار کیا اور گھر چلنے پر اصرار
کیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور گھوم کر دو قدم ہی بڑھائے
تھے کہ نہ جانے کیوں آس پاس ادھر ادھر بے کلی سی محسوس
کی۔ اس احساس کے ساتھ ہی بے اختیار نظریں سامنے
افق پر اٹھ گئیں۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ایک آتشی
کرہ بالکل سطح ارض سے چھوتا ہوا بہ بانگ دہل اعلان کر رہا
تھا۔ جس کی تیز شعاعوں اور چمکتی کرنوں سے تم اپنا
منہ چھپائے رہتے ہو، اس کا دوسرا رخ بھی دیکھ لو۔
اسی کی رنگین شعاعیں تمہیں دعوت نظارہ دے
رہی ہیں، اب تم چاہتے ہو کہ ساری عمر ایسا ہی موسم
رہے۔ پھر کبھی سورج کی شدید شعاعیں تمہیں نہ ستائیں۔
یہ تمہارے دل کی کیا حالت ہے، کبھی اسی چیز سے
بیزاری۔ اور کبھی اسی چیز کی خواہش کرتے ہو۔ کیا
نفرت اور محبت کا بھی یہی معاملہ ہے۔ کیا تمہارے
دل بدلتے دیر نہیں لگتی —" میں انہی خیالات
میں منہمک جہاں کا وہاں کھڑا تھا۔ اسی دوران میں
معراج نے کئی ایک دفعہ چلنے کے لئے کہا، مگر میں نے
اس کو جلد سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ بھلا ایسے وقت، ایسا کون
بے وقوف ہوگا جو گھر کی راہ لے گا۔ دیکھتے دیکھتے رخ روشن
نے روئے احمر اختیار کیا اور پھر خدا جانے اس کے بعد اس نے
کونسی شکل اختیار کی البتہ اتنا ضرور ہوا کہ جیتی جاگتی دنیا نے
سیاہ چادر تان لی۔

"صاحب"! معراج نے ایک عجیب ذہنی کشمکش کے زیر
اثر کہا "اندھیرا چھا رہا ہے، گھر چلئے نا اب" اس کی آواز میں
ایک نامعلوم خوف اور ایک عجیب کپکپاہٹ تھی۔

"نہیں چلے"، میں نے بڑی متانت سے کہا "اب تو میں
نہیں چلنے کا ——" اس وقت میری عجیب حالت تھی۔ یوں تو
کئی بار سورج کو غروب ہوتا دیکھا لیکن کبھی ایسا اثر نہ ہوا کہ پتھر کے
نقش کی طرح مدتوں قائم رہتا۔ سورج روز کی طرح غروب ہوا لیکن
غروب ہوتے ہوئے میرے تاریک دل میں دیا روشن کر گیا۔
آپ کو یہ صرف ایک معمولی سی کیفیت معلوم ہوگی لیکن سچ پوچھو
تو صحیح معنوں میں اسی دن سے میری زندگی میں ایک نمایاں
تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اکثر اوقات ایسے عظیم الشان انقلاب زندگی
سے پیشتر دماغ گوناگوں خیالات کا آماجگاہ بن جاتا ہے۔
رہ رہ کر ہر بار دماغ کے پردوں سے یہ خیال ٹکراتا تھا "کیا
ایک کی بربادی پر دوسرے کی زندگی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے"
لیکن ساتھ ہی دماغ کی اندرونی گہرائیوں سے ایک خاموش
آواز نکلتی تھی۔ کیا باغبان کے نقصان پر کمہار ہنس سکتا ہے"
خدا جانے یہ سوچ بچار کا عجیب سلسلہ کب تک قائم رہتا۔ معراج
نے اپنے اندرونی خلفشار کا اظہار ان الفاظ سے کیا "حضور رات کو
یہاں بھوت آیا کرتے ہیں اور جو کوئی بھولا بھٹکا ادھر آنکلتا
ہے اس کی تو ہڈیاں بھی نہیں چھوڑتے۔"

"یہ تو بات اور اچھی ہوئی" میں نے ایک اطمینان کا

کش لیتے ہوئے کہا "وہ بھی تو یاد ہی کریں گے، انھیں پالا کس سے پڑا تھا ——" یہ کہہ کر میں نے منہ سے دھوئیں کے چھلے نکالے۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں سرکار"

"ایسی باتیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں بھوتوں کا قائل نہیں۔"

"قائل نہیں ——" اس نے اچانک تعجب کا اظہار کیا "اجی صاحب! نہیں، اگر تو ان لوگوں کا کفر ٹوٹتا ہے۔"

"اچھا ——" مجھے ایک دیہاتی لڑکے کی زبانی ایسا اچھا جملہ سن کر سخت تعجب ہوا "بعض اوقات تم اچھے اچھے جملے کہہ لیتے ہو۔"

"صاحب"! ایک شانِ بے اعتنائی کے ساتھ اس نے کہا "مڈل پاس ہوں۔ جماعت میں ہمیشہ اول رہا کرتا تھا۔ خدا بخشے، اللہ بخش مرحوم میری بڑی عزت کیا کرتے تھے۔" وہ برابر بولتا گیا۔ میں خوش تھا کہ کم از کم اس کے خیالات تو بٹ گئے۔ ممکن ہے اب اس کو بھوتوں کی تکلیف دہ احساس کا خیال نہ رہا ہو۔ مگر وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اور پھر وہی اصرار "چلیے صاحب، رات ہو رہی ہے، گھر پہنچتے بہت دیر ہو جائے گی۔"

"اچھا بابا ——" میں نے مایوس کن لہجہ میں کہا "تیری مرضی، ان سے پھر کبھی ہاتھ ناپ لیں گے۔"

"آج تو سستے ہی چھوٹے سرکار ——" اس نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ اس کے جواب میں، میں خاموش ہو لیا۔ چلتے چلتے، میں نے دور ایک روشنی دیکھی، اس کے بارے میں یونہی معراج سے دریافت کیا "معراج! وہاں یہ روشنی کیسی ہو رہی ہے، کسی کا گھر ہے کیا ——"

"آج جمعرات ہے نا حضور ——" اس نے پھر قدرے توقف کے بعد کہنا شروع کیا "ہر جمعرات کو اس مقام پر روشنی سی دکھائی دیتی ہے، فقیر بابا کہتے تھے وہ ایک چڑیل کا مسکن ہے جہاں بیٹھ کر وہ ایک ہفتہ کی غذا اپنے کنڈے سے پیٹ میں بھر لیتی ہے۔ صاحب! وہ ایک قبرستان ہے جہاں تمام خبیث ارواح رہتی ہیں —— ہمارے فقیر بابا کبھی جھوٹ نہیں بولتے، وہ راتوں کو بھوتوں سے باتیں کرتے ہیں۔"

"کتنا غلط خیال ہے تمھارا" میں نے اس کے اس خیال سے اختلاف کیا "خبیث روحیں وہیں کیوں رہنے چلیں۔" "جھوٹ نہیں سرکار ——" وہ بالکل قسم کھانے کے انداز میں بول رہا تھا "ہندوؤں کا قبرستان ہے وہ" "قطعاً غلط، سوا سولہ آنے غلط" میں نے کہا "مسلمانوں کا مدفن ہو یا ہندوؤں کا مرگھٹ۔ یہ ضروری نہیں کہ دنیا بھر کے شیاطین اور خبیث ارواح وہاں موجود ہوں۔ اجی یہ تو تمھارے اپنے دل کی کمزوری ہے۔ تم مندر میں رات کو ٹھیرے ہو تو صبح کہتے ہو، ایک شعلہ نیم کے پیڑ سے نکلا اور آہستہ آہستہ سبزہ کے پودے میں داخل ہو گیا۔ داخل ہو کر وہ اس کی ٹہنی سے ایک عجیب آدمی کی شکل میں نکلا، جس کا سر چکنے گھڑے کی طرح صاف تھا، مگر پچھلے حصے سے ایک دم لٹک رہی تھی —— وہیں اور اسی جگہ ایک ہندو اپنی زندگی کی کئی راتیں گزار دیتا ہے اور صبح اٹھ کر کہتا ہے "بھگوان کا شکر ہے" جو یہاں رات گزرنے زیادہ آرام میں کٹی۔ کسی ہندو کو مسجد میں سلاؤ اور پھر صبح کو سن لو، ایسے ایسے واقعات بیان کرے گا کہ سنتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ آپ سنا کریں گے وہ من گھڑت واقعات سنانے لگا۔ جی معاف فرمانا، وہ اپنی آنکھوں دیکھی باتیں کہے گا جس پر آپ کبھی ایمان نہیں لا سکتے ہیں، یہی تو آپ کی ضعیف الاعتقادی ہے۔ اگر تم یہ خیال کر لو کہ زہر میرے حق میں باعث ہلاکت نہیں، اس اعتقاد پر تم ثابت قدم رہو تو یقیناً زہر بھی تمھارے حق میں باعث حیات ہو سکتا ہے۔ تم مڈل پاس اس فلسفہ کو سمجھ نہ سکو گے، اس کے متعلق مزید کہنا بے سود ہوگا۔ چلو چل کر دیکھ لیں گے، وہ ہے کون۔"

"نہیں سرکار ——!" وہ چیخ اٹھا "ہندوؤں کے قبرستان میں رات کے وقت ——" "ہاں ——!" مجھے ایک کرید سی تھی، آپ تو جانتے ہی ہیں میں ایسے وہمی دلائل کا سرے سے قائل ہی نہیں۔ جب اس نے اتنے وثوق کے ساتھ کہا کہ وہ شیاطین کا مرکز ہے تو یار دل نے بھی خوب اچھالا، پھر اشتیاق اس کی تائید کیوں نہ کرتا۔ یہاں تو یہ حالت کہ جہاں ذرا سی خواہش ہوئی

وہاں اشتیاق نے کبھی مٹی کا تیل چھڑکنے میں کوتاہی نہ کی۔ مجھے ہمیشہ محیرالعقول واقعات کے انکشافات کا تجسس دامنگیر رہتا ہے۔ میں نے کبھی ایسے معاملات میں اپنے قدم پیچھے نہیں ہٹائے۔

"ہم سے تو یہ نہ ہوگا جناب!" وہ بولا "جان چلی جائے پر میں نہ آنے کا"

"یہ میرا حکم ہے' اس کی تعمیل تمہارا عین فرض ہے" میں نے کڑک کر کہا۔ "جان کے آگے وقت ضرورت اپنا مذہب بھی بدلنے کی اجازت خدا دیتا ہے۔" "تو پھر جاؤ' تم آج سے ہمارے نوکر نہیں ہو' کل بڑے صاحب سے اپنا حساب چکتا کر لینا ——"

"جو حکم سرکار ——" وہ بولا "پائے گدا لنگ نیست' ملک خدا تنگ نیست' خدا کے فضل سے کھانے پینے کی کمی نہیں" "ادھر لاؤ ٹارچ اور میری بندوق' زوال کہیں کا ——" میں نے اپنے بے معنی غصے کو بہت کچھ رفع دفع کرتے ہوئے کہا اور اس کے ہاتھوں سے' ٹارچ اور بندوق ایک جھٹکے کے ساتھ لے لی میں بمشکل تمام دس قدم ہی گیا ہوں گا کہ اس نے کہا "حضور' میری بات مان جائیے' ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔" "چل اپنا راستہ کاٹ' اب یہ بکواس بند کر ——"

"تو پھر چلیے میں بھی آپ کا ساتھ دیتا ہوں"

"کوئی ضرورت نہیں ——" میں نے خفگی کے لہجہ میں کہا "تم میرے نوکر نہیں ہو ——"

"کوئی پرواہ نہیں ——" وہ بولا "آپکا بہت پرانا نمکخوار ہوں' بڑے صاحب' جب سے یہاں آئے ہیں' انھیں کے پاس نوکر ہوں' بھلا آج آپ کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔"

میں خاموش تھا' مصلحت وقت کی خاطر گو دل ہی دل میں اس کی اس بے مثل وفاداری پر عش عش کر رہا تھا' اس کی نظروں کے سامنے موت رقصاں تھی لیکن اس نے اپنی زندگی کے آخری لمحات بھی حب وفاداری میں صرف کر دیئے —— وہ اپنی آنکھوں سے صاف صاف دیکھ رہا تھا کہ اس کے مالک کے پاس جہنم کا ٹکٹ ہے اور خود کے پاس جنت کا پروانہ مگر اس نے جانتے بوجھتے راہ جہنم لی —— کتنی تعجب کی بات ہے۔

راستہ بڑا پرخطر تھا' وہ برابر ٹارچ سے مجھے راستہ بتاتا اور آنے والے خطرناک گڑھوں سے قبل از وقت ہوشیار کرتا لئے جا رہا تھا۔ کبھی کبھی پٹیاں ایسی صاف ملتی کہ قدم نہ جمنے پاتے تھے اور کبھی کبھی ایسے موڑ ملتے تھے کہ زندگی موت سے ہم آغوش ہونے کے لئے آگے بڑھ جاتی تھی —— لیکن ہم دونوں' ایک عزم صمیم کے ساتھ بڑھے گئے۔ خدا خدا کر کے احاطۂ قبرستان کے قریب آپہنچے۔ یہاں چند جھاڑیاں ایسی تھیں جن کے کانٹے ایک ایسا خوفناک منظر پیدا کر رہے تھے کہ دل لرز اٹھتا تھا۔ ایسی کانٹی کہ جسم سے چھو جائے تو قسم لے لو جو کپڑا پھٹنے سے پیشتر ہی نکلے —— خیر سوا تین گھنٹے کی طویل اعرق ریزی کے بعد قبرستان میں داخل ہوئے۔ یہاں خود میرے بھی قدم کچھ بھاری بھاری پڑ رہے تھے۔ ایک ہلکا سا خوف چھا رہا تھا' لیکن میں ہر بار اپنا جی کڑا کر رہا تھا۔ کیونکہ اس سے ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ کہیں یہی ہلکا سا خوف۔ ہیبت کا محرک نہ ہو جائے۔

میں نے اپنی بندوق پر نظر دوڑا کر اطمینان کی سانس لی' اور معراج نے دو تین گاڑ کے پتھر اٹھا لئے۔ ہم پاؤں دابتے' ناگ پھنی اور سینڈ کے جھنڈ کے پیچھے آچھپے جہاں سے ہم نے ایک پرانی قبر دیکھی جس کے سرہانے ایک دیا روشن تھا۔

وہیں پاس ہی چند بتیاں تھیں اور ایک شیشہ میں تیل تھا۔ اور دیا روشن کرنے والی خود سجدہ میں پڑی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے اس کے پاؤں دیکھے" وہ چڑیلوں کے سے نہ تھے ——" میں نے بندوق کی نالی اوپر کر دی' اور اس عجیب عورت کو تکتا کھڑا رہا' اس نے زار زار روتے ہوئے اپنا سر اوپر اٹھایا اور کہا "رمیش تم مجھے معاف کر دو' میں اپنی ساری عمر تمہارے نام بھینٹ چڑھاتی ہوں۔"

میری نظریں اس عورت پر پڑیں اور پچھلے سارے واقعات گھوم گئے۔ اس ناگہانی دماغی حملے کے باعث میری زبان سے ہلکی سی چیخ نکل گئی' اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑا اسی اثنا میں میں نے چند عجیب پرشور' خلط ملط دماغی آوازوں

سکے ساتھ ایک اور چیخ سنی لیکن اس وقت ماحول سمجھنے کی دماغی صلاحیت مفلوج ہوتی جا رہی تھی، اس لئے اس چیخ پر چنداں غور کرنے سے مجبور تھا، رفتہ رفتہ چند لمحوں کے عرصہ میں دماغ کا شیطانی ناچ ختم ہوا، بے سُری آوازیں مدہم پڑنے لگیں اور میں اپنے ماحول سے قطعاً بے خبر ہو کر پانچ سال قبل کے زمانہ میں پہنچ گیا۔

اگر کسی کو اپنی تندرستی پر فخر کرنے کے مواقع حاصل رہتے تو وہ مسعود تھا۔ اس کو سوائے دردِ سر کے کسی اور بیماری نے کبھی گھیرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ جب کبھی وہ اپنے کسی دوست کو فریش دیکھتا تو اس کا دل کھول کر خوب مذاق اڑایا کرتا لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ آئی نہیں، آئی نہیں، اور جو آئی تو کمبخت بیماری نے جانے کا نام نہ لیا۔ دیواروں اور چھتوں سے ٹکر لینے والا، نوجوان بستر سنبھال کر پڑا رہا۔ بہت دنوں تو گھر ہی پر ڈاکٹر دیکھ جایا کرتے تھے، لیکن جب بیماری نے خطرناک صورت اختیار کر لی تو ڈاکٹر کے مشورہ پر اس کو عثمانیہ دواخانہ میں رجوع کرا دیا گیا۔ کھاتے پیتے گھرانے کا تو آدمی تھا ہی، بہت جلد ایک علٰحدہ کمرہ مل گیا، جہاں ازالۂ بیماری کی خاطر بہت سی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ مہربان ڈاکٹر نے چکنا مال دیکھا اپنی خاص ہمدردی جتائی، نبض و بغض کو خوب اچھی طرح دیکھ بھال لیا، پھر اپنے نسخۂ خاص کی فیس سے جیب گرم کی اور ہمیشہ کی طرح دو نرسوں کو خاص تیمار داری اور نگہداشت کی ہدایت کی ——!

للتا کو چوبیس گھنٹے یہ فکر تھی کہ آخر یہ ہے کون، جو نہ رات کو رات خیال کرتا ہے اور نہ دن کو دن، باوجود بیماری کے یہ دن رات لکھا جا رہا ہے۔ باوجود تاکید کے جب جی میں آتا ہے، لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔ ہر روز باوجود انکار کے ملاقاتیوں کا اصرار ہوتا ہے، کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جو ڈاکیہ کے پھیرے سے بچ جاتا ہو۔ آخر یہ خوش قسمت ہے کون ——"

للتا، ایک خوش مزاج اور خوش گلو تھی، جس کی آواز میں ہمدردی، شیرینی، محبت اور خدا جانے اور کون کون سے عناصر تھے کہ مریض اس کی تیمارداری سے بہت جلد شفایاب ہو جاتا تھا، اس کی انگلیاں جس سے چھو جاتی تھیں وہ جھاڑ جھٹک کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ وہ مریضوں کے لئے ایک نوید جانفزا اور مردوں کے لئے پیامِ زندگی تھی۔ اسی خصوصیت کے باعث وہ دنیائے دواخانہ میں "مسیحا" کے نام سے یاد کی جاتی تھی۔

جب سے مسعود دواخانہ آیا وہ برابر دیکھے گئی اور سوچے گئی۔ لیکن بڑی تلاش کے بعد بھی اس کو اس کا حل نہ مل سکا۔ ایک دن اس نے اپنا جی کڑا کیا اور قطعی فیصلہ کر لیا کہ آج یہ معلوم کر کے رہے گی کہ "مسعود" کون ہے۔ اس نے رات کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا۔ رات کی نوکری اسی کی تھی۔ مریض کی دیکھ بھال کے بہانے وہ اس کے کمرے میں گھس آئی۔ جب دیکھا کہ مسعود بے خبر پڑا ہے تو اس نے تپائی پر کے منتشر کاغذات اٹھائے اور چونک پڑی "معیارِ محبت" کا خدا جس کی مجھے بڑی کھوج تھی، جس کی ملاقات کی میں متمنی تھی، وہی آج میرے زیرِ تیمارداری پڑا ہوا ہے" اس نے ایک گہری سانس لی، جس میں لذت پنہاں تھی۔ ایک نظر مسعود پر ڈالی، اس نظر میں ایک تقوی شکن قوت مستور تھی، پھر وہ چلی گئی ——"

"مسعود صاحب!" صبح میں للتا نے دوائی کا گلاس دیتے ہوئے کہا "آپ نے یہاں اپنا نام غلط کیوں درج کرایا ہے اور پھر تعجب ہے کہ اس نام پر آپ کو ایک افسانہ نگار کے خطوط کیسے مل جاتے تھے۔ خیر جب افسانہ مکمل ہو جائے ہمیں بھی سنانا۔"

"کس نے کہا" مسعود بولا "کون کہتا ہے میں افسانہ نگار ہوں"

"یہ تو آپ کی انکساری ہے۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو للتا۔"

"آپ مجھے غلط باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں، اب چھپانے سے کیا حاصل رات یہ حقیقت کھل چکی ہے۔"

"مس للتا، اگر تم سمجھتی ہو کہ میں افسانہ نگار ہوں تو میں اس کو تمہارا حسنِ ظن سمجھوں گا۔"

"کتنے بلند خیال ہیں آپ' کیسی عجیب خاکساری ہے آپ کی' آپ کی اسی خاکساری نے آپ کو کسی کی آنکھوں میں جگہ دلوادی ہے ـــــ"

"آپ کیا کہہ رہی ہیں مس للتا!"

"میں پوچھ رہی تھی آپ ہی نے لکھا ہے نا 'معیارِ محبت'۔"

"اب تم سے کیا چھپاؤں" مسعود نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا' جیسے چور پکڑا گیا۔

"مجھے آپ سے ملنے کی بڑی آرزو تھی' جو آج پوری ہوگئی" مسعود خاموش ہو رہا کوئی جواب بن نہ پڑا۔

"آپ کا وہ افسانہ بہت اچھا تھا ـــــ بہت اچھا تھا"

"شکریہ ـــــ!" پرانا لفظ جوابا دہرا دیا۔

پہلی گفتگو جو دواخانہ کے کسی بھی موضوع پر نہ تھی' ختم ہوگئی' اور حسین للتا' شوخ چشم للتا' دوسرے مریض کی دیکھ بھال کے لیے چلی گئی۔

اس کے بعد بھی کئی اور ایسے مواقع نصیب ہوئے جس میں انھوں نے پورا پورا لطف اٹھایا' گھنٹوں مختلف موضوعات پر بحثیں ہوتی رہیں۔ لیکن کبھی وہ پیچھے نہ ہٹے' رات گئے بیٹھے رہتے تھے' مگر کوئی بھی نہ تھکتا تھا' آخر ایک دن ایسا بھی آیا جب کہ دنیا کے سارے موضوعات کو ختم کر کے انھوں نے "محبت" کو اپنی بحث کا نشانہ بنایا۔

"اب ہمارے دن قریب ہیں للتا ـــــ" مسعود نے تقریباً نیم گریہ آلود لہجہ میں کہا۔

"ہاں!" للتا نے اپنی لانبی سانس کے ساتھ کہا "اب بھلے چنگے ہو چکے ہو' رہ کر کروگے بھی کیا۔"

"للتا ـــــ" مسعود نے' دھیمی آواز میں مخاطب کیا۔ "تمھارا خیال خام ہے' تم سمجھتی ہو میں اچھا ہوگیا۔ لیکن کوئی میری باطنی حالت دیکھے' کوئی گھڑی ایسا نہیں گزرتا جبکہ طوفان' نہ اٹھتے ہوں' زلزلے نہ آتے ہوں۔ تم کہتی ہو میں تندرست ہوگیا' افّ! تم دیکھو میرے دل کے ناسور دیکھو' رستے ہوئے خون کو دیکھو' بہتی ہوئی پیپ دیکھو ـــــ کہو اور کیا بتاؤں!"

"کاش ـــــ!" اس کو ہنسی آگئی "محبت کا پہلے ہی سے احساس تھا' ہم دو نہ ہوتے"

"خدا کرے ایک ہو جائیں۔"

"ناممکن ہے مسعود ـــــ" اس نے فوراً کہا "سماج کا سمندر ہم دونوں کے درمیان حائل ہے' ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہوئے بھی' ایسے ہی نابلد اور ناآشنا ہیں' جیسے سمندر کے دو ساحل۔"

"للتا ـــــ تم پھر بھٹکیں' آخر تم یہ سطحی بینی کب چھوڑو گی' کہہ رہی ہو' سمندر کے دو ساحل ایک دوسرے سے ناواقف ہیں' تم کیسے کہہ سکتی ہو' جبکہ دونوں ساحلوں کو ایک ہی پانی چھوتا ہے' کیا اپریل کے دونوں ستونوں میں کوئی باہمی تعلق نہیں ہوتا' کیا انھیں ملانے والا' درمیانی تار نہیں' تو پھر تم یہ کیوں کہتی ہو کہ ہم دونوں کے درمیان ایک وسیع سمندر حائل ہے' یہی تو وہ سمندر ہے' جو ہم دونوں کو ملائے گا۔ تم اس کی وسعت پہ کیوں جاتی ہو' پہلے باطنی رشتہ دیکھو۔"

"تم تو بال کی کھال اتار لیتے ہو ـــــ" للتا نے اپنی پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا "ایک طرف سماج کا خوف اور دوسری طرف رمیش کا ڈر ـــــ وہ میرا منگیتر ہے' مجھ پر جان چھڑکتا ہے' اس کو مجھ سے والہانہ محبت ہے' وہ پروانہ وار قربان ہونا چاہتا ہے' وہ کب گوارا کرے گا کہ اس کی منگیتر' دوسرے کی آغوش میں چلی جائے' کیا اس کو اپنی ناموس کا خیال نہیں۔"

"تم نہیں جانتیں للتا" میں نے کہا "محبت کی قربانی زندگی کا عجیب انقلاب ہے۔"

"ہوا کرے" وہ بولی۔

"ابھی یہاں تو سورج آفتاب مغرب سے طلوع ہوتے ہیں' اور مشرق میں غروب' یہ بھی کوئی مشکل ہے' تم صرف اپنے منگیتر کو لئے بیٹھی ہو ـــــ"

"اس کی اس فریفتگی نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں بھی اس پر کم از کم ایک نظرِ التفات ہی ڈال لوں ـــــ"

"رمیش ہماری محبت میں' سنگِ راہ ہوگا ـــــ"

"آپ کا مطلب ——؟" تیوری پر بل ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔

"سنگِ راہ، دور کر دیا جاتا ہے ——" میں نے پھولتی سانس کے ساتھ کسی قدر اطمینان سے کہا۔

"کیا کہا ——؟" وہ چلا اٹھی۔

"محبت کی قربانی زندگی کا عجیب انقلاب ہے ——" میں نے اپنا جملہ دہرایا "یہ کام تمھیں کو کرنا ہوگا ——"

"اُف! آٹوگراف ——" اس نے ایک اندرونی سانس کے ساتھ کہا، اور اس کی نظریں پھیکی پھیکی سی ہو گئیں۔ "اتفاق دیکھیے۔ ایک دن للتا نے مجھے آٹوگراف لکھنے پر مجبور کیا، اور کہا "میں ملاقات کی تمنا اسی لئے رکھتی تھی"، میں نے جو آٹوگراف دیا وہی جملہ تھا، جس کو میں نے دہرایا تھا ——

قدرے توقف کے بعد اس نے کہا "میں سوچ کر بولوں گی"

"للتا ——" میں نے مخاطب کیا "محبت سوچنے کی مہلت بھی کب دیتی ہے۔" وہ رو رہی تھی، کمزور فطرت، عورت جو تھی۔ مگر میں سوچ رہا تھا "رمیش کی بربادی پر میری زندگی کی فلک بوس عمارت کھڑی ہوگی۔"

ایک دن رمیش جو ملاقات کے لئے آیا تو للتا نے کہا "رمیش" تمھاری حالت، روز بروز کیوں گری جا رہی ہے، آخر تمھیں کونسا غم کھائے جا رہا ہے؟"

"اس کی دوا تو تمھارے پاس ہے" رمیش نے شدتِ محبت، یا فرطِ عقیدت سے مجبور ہو کر کہا "اپنے ان ہاتھوں سے کوئی امرت ہی پلا کر دوسری زندگی بخشو۔"

"اچھا ——" للتا بولی۔ "تم بیٹھو میں لاتی ہوں، نئی زندگی بخشنے والی دوائی" یہ کہہ کر وہ برابر والے کمرے میں گئی "ٹنکچر آیوڈین" میں چند خوشبوئیات ملا کر ایک گلاس میں لے آئی۔ جس کو رمیش نے، آبِ حیات سمجھ کر چڑھا لیا۔ اور پھر باتوں میں مصروف ہو گیا۔ اس وقت للتا کی حالت نہ پوچھو، دینے کو تو اس نے دیدیا، لیکن ضمیر کی ملامت نے ہر لمحہ اس کے چہرے کے رنگوں میں تبدیلی پیدا کرنی شروع کر دی، اس کے اترتے چڑھتے رنگوں کو دیکھ کر رمیش سہم گیا، وہ حقیقتِ حال بھانپ گیا جس کو للتا کے ان الفاظ نے مزید تقویت پہنچائی "جائیے، آپ اب گھر جا کر آرام فرمائیے، گہری نیند آجائے گی۔ اب یہاں نہ ٹھیریئے، سونے کے لئے جگہ نہیں ہے یہاں ——" پھر بھی وہ اپنے شک و شبہ پر یقین کرنے سے مجبور تھا، وہ اس کی عزیز محبوبہ اور منگیتر تھی۔

محبوبہ ہو، چاہے ماں ہو، جہاں ایک دفعہ وہم نے سیڑھی سنبھالی تو پھر مقیاس الحرارت کے پارہ کی طرح بڑھتا ہی جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر تو تندرست سے تندرست آدمی بھی، چٹ پٹ چند منٹوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس ایک معمولی سے خیال کی آمد نے اس کے دماغ میں انتشار پیدا کر دیا۔ اور اس پر زہر سے زیادہ واہمہ نے کام کیا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں، حلق میں کھرکھراہٹ پیدا ہو گئی۔ اور وہ بے ہوش ہو گیا ——"

بھلا، ایسی بات، چھپ بھی کیسے سکتی تھی، دیکھتے دیکھتے یہ خبر، دواخانہ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک آگ کی طرح پہنچ گئی کہ للتا نے ایک ناکردہ گناہ شخص کو زہر سے ہلاک کر دیا، بوڑھی، کریہہ المنظر عورتوں نے یہ خبر سن کر کانوں پر ہاتھ دھر لئے، اور کہا "ہمیں تو اس کے چلن سے ہی معلوم ہو گیا تھا، حسین ناگن ہے وہ کیسے بل کھاتی ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر مٹک چٹک پھرا کرتی تھی ظالم" ان مریضوں کو کبھی اس بات پر یقین نہ آیا جنھیں دورانِ مرض میں للتا سے سابقہ پڑ چکا تھا، رمیش کو فوراً بڑے ڈاکٹر کے پاس لیجایا گیا، جہاں چند اور نامی ڈاکٹروں نے اس لکھ پتی کا علاج شروع کر دیا، کایا پلٹ کا لکھ پتی موت اور زندگی کی کش مکش میں پڑا ہوا تھا اور للتا —— چونکہ اس نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا تھا، ماخوذ کر لی گئی۔

للتا پر عائد کردہ جرم کی صفائی میں جج نے اس پر سوال کیا

جس کے جواب میں للتا نے صرف اتنا کہا "مجھ سے بھول ہوئی" یعنی دبی زبان میں اقرار جرم تھا۔ اس کے اپنے طرف سے کھڑے کئے ہوئے وکیلوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن للتا نے "مجھ سے بھول ہوئی" کے سوا کچھ اور نہ کہا۔

جج نے اپنا آخری فیصلہ سنایا۔ للتا نے اپنے جرم کا اقبال کرلیا ہے، جب قاتل خود اقرار کرلے تو شہادت دیگر اسی کی کوئی ضرورت نہیں۔ چونکہ للتا ایک نرس ہے اور اس کو ایسے جرم کا ارتکاب سزاوار نہیں ممکن ہے وہ آئندہ بھی ایسے شرمناک افعال کے ارتکاب کی کوشش کرے، اور چونکہ اس نے اقدام قتل کیا ہے جس کی سزا از روئے تعزیرات ہند قصاص ہے، اور چونکہ ——

جج اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ مریض، عدالت میں گھس آیا، اور اس نے اپنی لڑکھڑاتی زبان سے پرزور آواز میں جج کو مخاطب کیا۔

قابل صد احترام جج، معزز حاضرین!

مجھے ڈاکٹروں نے بچہ موت سے بچا لیا ہے، جن کا میں مشکور ہوں، میں زندہ ہوں لیکن میرا بیان قلمبند نہیں کیا گیا اور محض للتا کے اقرار بے معنی پر یہ فیصلہ کیا گیا۔ میں یہ سمجھ نہیں سکا کہ للتا پر کیوں یہ جرم عائد کیا گیا۔ وہ اس سلسلہ میں بالکل بے قصور ہے۔ وہ میری منگیتر ہے بھلا وہ ایسے شرمناک فعل کا ارتکاب کیوں کرنے چلی، وہ اس معاملہ میں قطعاً معصوم ہے اسے سزا دینا قانون کی ناانصافی ہے، چونکہ یہ شادی میری مرضی کے خلاف ہورہی تھی اس لئے میں نے خود پنچر الیوڈین پی لی اور جانتا ہوں از روئے قانون خودکشی کی سزا کیا ہے —— میں —— "وہ یہیں تک کہنے پایا تھا کہ لڑکھڑا کر گرا۔ ہال کی تالیاں یک لخت رک گئیں اور سب حاضرین اٹھ کھڑے ہوئے کہ ماجرا کیا ہے، نتیجہ کیا؟ نامرش گزر چکا تھا مسرسا کو کے ٦ اس نے اپنی عدیم المثال قربانی پیش کی

آف، وہ رشی تھا اور میں، میں خود ــــ دونوں میں کتنا بڑا فرق، زمین و آسمان بلکہ اس سے بھی بڑھکر۔

للتا کو مع اعزازات و انعامات کے رہا کر دیا گیا ——

کہاں ہیں وہ لوگ جو یہ —— دعویٰ کرتے ہیں کہ عورت صرف ایک ہی دفعہ محبت کرتی ہے، اور اسی کی ہو رہتی ہے، کہاں ہیں وہ فلسفی جنھوں نے، محبت کے معاملہ میں رد و بدل کو سب جھوٹ پڑھایا تھا —— للتا نے میری محبت کے حصول کی خاطر اپنے منگیتر کو ختم کیا لیکن پھر اس کے بعد اس نے مجھ سے کبھی ملنے کی کوشش نہ کی، اس واقعہ کے تین سال بعد ایک دفعہ ملاقات ہوئی تھی اس وقت بھی اس نے اجنبیت کا سا سلوک کیا۔ اور پھر دو سال بعد، یہ موقع دیدار نصیب ہوا اس وقت بھی وہ رشی آنجہانی کا دم بھر رہی ہے، آف اس کے دل کا یہ ایسا زلزلہ تھا جو آج تک نہ تو کبھی دنیا ہی میں آیا اور نہ دوزخ میں۔ کیا، کبھی ایسے طوفان، عورت کے دل میں اٹھ سکتے ہیں۔ جو طوفان نوح سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں۔

جب آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا، قبر کے پاس کوئی نہیں —— اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ سورج نکل چکا ہے۔ ہنس کھیلتے ہیں جو مجھے پہلا احساس ہوا تھا، وہ یہی کہ قبر کے پاس کوئی نہ تھا —— للتا جا چکی تھی، صرف اس کے آثار رہ گئے تھے نیچے گرا ہوا تیل اور ایک جلی ہوئی اگربتی۔ اور اس کے پاؤں کے نشانات تھے۔ یکایک مجھے اپنے ساتھی معراج کا خیال آیا اس کی طرف رجوع کیا تو وہ میٹھی نیند سو رہا تھا، اب مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ غلط ملط دماغی آوازوں کے سناٹے میں تھے جو انسانی سن سکتا تھا وہ اسی کی تھی جو میری چیخ کے جواب میں تھی، معراج بے خبر سو رہا تھا۔ اس کو اب دنیا کی کسی چیز کا خوف نہ رہا تھا، سچ تو یہ کہ وہ مجھ سے زیادہ بہادر تھا کیونکہ اس کو اب دنیا کی کسی چیز سے کوئی تعلق نہ رہا تھا —— تاریخ کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا، اور سندور بھی، تھی بس یہ دو لفظ چیز تک اب بھی ویسی ہی ہیں۔

سہام مرزا

تضمین بر قصیدۂ سعدی علیہ الرحمہ

ہائے بچپن گیا گئی وہ خوشی — تھی عجب طرح کی شہنشاہی
پھر جو پہنچی تھی آ کے لڑکائی — چند کھیلوں میں وہ تمام ہوئی
بات پوچھو نہیں جوانی کی — ایک دم بھر کی تھی وہ مدہوشی
اب ہے آغازِ حالتِ پیری — بس فقط چند سانس ہیں باقی

ہر دم از عمر می رود نفسے
چوں نگہ می کنم نماند بسے

دس برس تک نہیں تھے ہوش بجا — بیس تک کھیل کود ہی میں رہا
رہا چالیس تک تو دیوانہ — عیش و عشرت میں محو و بیخود تھا
سال آخر پچاس کا بھی ہوا — نہیں غفلت میں کچھ کمی اصلا
کھول آنکھیں تو نفس ناکارہ — موت سر پر کھڑی ہے دیکھ ذرا

ای کہ پنجاہ رفت و در خوابی
مگر این پنج روز دریابی

کر نہ دنیا کو بے سبب بدنام — عمل خیر کا ہی ہے مقام
خاص ہو کوئی یا ہو کوئی عام — چند روزہ یہاں ہے سب کا قیام
چاہتا ہے جو نیک ہو انجام — درست کر اے نفس نافرجام
نیکیاں جمع کر بہ سعی تمام — منتظر کوچ کا ہو صبح و شام

خجل آں کس کہ رفت و کار نہ ساخت
کوس رحلت زدند و بار نہ ساخت

تو مسافر ہے اور جہاں ہے سرا — صرف دو روز ہے قیام ترا
سامنے آخرت کا ہے رستہ — یہی رستہ ہے تیری منزل کا
دم میں نکلے گا صبح کا تارہ — اٹھ کہ کیوں پڑا ہے تو سوتا
نیند گہری نہ لے یہاں اصلا — کھوئی منزل نہ کر ارے بھیا

خواب نوشین بامداد رحیل
باز دارد پیادہ را ز سبیل

چھوڑ بابا خیالِ بام و در — خاک پتھر ہیں کچھ نہ سیم و زر
سر چھپانے کو کچھ میسر ہو اگر — ہو گا وہ دن کسی طرح سے گزر
جبکہ ہو گا جہاں سے تیرا سفر — قبر کا ہو گا تیرا [illegible] گھر
دوسروں کے لئے یہ فکر نہ کر — قول سعدی نہیں سنا ہے مگر

ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت
رفت و منزل بہ دیگرے پرداخت

جس کا تو آج ہے مکیں یہ مکاں ... چھوڑ جائے گا تو رہے گا یہاں
دوسرا ہوگا اس پہ قبضہ کناں ... اور بڑھائے گا اس کو تا امکاں
یہ ہے کوشش میں وہ سدا جیراں ... کہ عمارت ہو سب میں عالی شاں
چھوڑ کر وہ بھی تیری طرح میاں ... جا بسائے گا شہر خاموشاں

واں دگر پختہ ہم چنیں ہوسے
ویں عمارت بسر نہ برد کسے

جان کر تجھ کو صاحب اقبال ... اور کچھ پاس دیکھ کے زر و مال
جمع جو دوست ہیں ہے ان کا خیال ... دل میں کچھ ہے زباں پہ کچھ ہے مقال
ہو جو دولت کو تیرے آج زوال ... ہیں کے ہر ایک جھاڑ کر پر و بال
یہ نہیں دوست چھوڑ ان کا خیال ... گر تجھے کچھ بھی ہے خیال مآل

یار ناپائیدار دوست مدار
دوستی را نہ شاید ایں غدار

یوں تو ہیں جسم میں کئی اعضاء ... اور ہر ایک کے ہیں کام جدا
پیٹ کا حال ہے مگر نیارا ... سارا سامان ہے اسی میں بھرا
یہی مخزن ہے کل غذاؤں کا ... یہی اعضاء کا ہے قسیم غذا
یہ رہے ٹھیک تو ہے اپنا بھلا ... یہ جو بگڑے تو کام ہو پورا

مادۂ عیش آدمی شکم است
تا بتدریج می رود چہ غم است

ماہرین فنون طبیعات ... یعنی حکماء نے کی ہے تحقیقات
کھاتے ہیں جو غذا و ماکولات ... جا کے پستے ہیں معدے میں دن رات
ان سے بنتے ہیں خون اور فضلات ... خون سے تازگی ہے اور حیات
فضلے خارج نہ ہوں اگر ہیہات ... جان خطرہ میں ہو بلا شبہات

گر بہ بند و چناں کہ نکشاید
گر دل از غم پری کند شاید

علما دان سے جنھیں ہے ساز ... ان حکیموں سے یہ کھلا ہے راز
زندگی جس سے ہو قلیل و دراز ... یہی فضلہ ہے یعنی بول و براز
ان کا منفذ نہ باز ہو نہ فراز ... رہے ہر حال معتدل انداز
ہو جو اخراج میں نشیب و فراز ... موت ہی واقع ہو بہ سوز و گداز

درکشاید چناں کہ نتواں بست
گو بہ شوئی از حیات دنیا دست

بہ صفت آگ میں جلانے کی　　جذب و معدوم کرتی ہے مٹی
باد ہر شے کو ہے اڑا دیتی　　آب میں ہے صفت بہانے کی
چار عنصر ہیں آدمی کے یہی　　شکل انسان ہے انھیں سے بنی
جمع ضدین ہیں بہ دشواری　　بس غنیمت ہے ان کی یکجائی

چار طبع مخالف و سرکش
چند روزے بوند باہم خوش

جسم انسان کے یہ چار اضداد　　آتش و آب اور خاک و باد
ہے اطبا کا اس طرح ارشاد　　تن میں جادواں ہیں یہ آزاد
اعتدال ان کا دل کو رکھے شاد　　کمی بیشی ہے ان کی وجہ فساد
ایک بھی ان میں کا اگر ہو زیاد　　زندگی ہو تباہ اور برباد

گر یکے زین چہار شد غالب
جان شیریں برآید از قالب

زیست ہے چند روزہ بھائی جاں　　جان اور توجہ کر نہ ہو انجان
ایک مہماں سرا ہے تیرا مکاں　　جس میں ہے چار دن کا تو مہماں
جذب پیہم سے جلد تا امکاں　　جمع کر اپنے کوچ کا ساماں
امر حق کل من علیہا فان　　ہے اٹل اس میں شک نہیں ہے جان

لاجرم مرد عارف کامل
نہ نہد بر حیات دنیا دل

حاتم نامدار و ذی ہمت　　اور نوشیرواں با عظمت
گرچہ دنیا سے ہو گئے رخصت　　نام زندہ ہیں ان کے با عزت
اور ہزاروں ہی صاحب دولت　　بانی ظلم و شر و بد طینت
جب انھوں نے یہاں سے کی رحلت　　کچھ نہیں لے گئے بجز حسرت

نیک و بد چوں ہمی بباید مرد
خنک آں کس کہ گوئے نیکی برد

تو کہ ماں باپ کو ہے تجھ پر پیار　　اور بھائی بہن ہیں تجھ پہ نثار
زن و فرزند بھی ہیں بس غم خوار　　دوست کیا کیا چاہتے ہیں سب اغیار
دوست اور چہیتے بحال نزار　　ساتھ دیں گے فقط یہ تا بمزار
کر عمل نیک و زندگی ہی میں یار　　زاد رہ اپنا آپ کر تیار

برگ عیشی بہ گور خویش فرست
کس نیارد ز پس ز پیش فرست

کیسے کیسے شہنشاہان زمن | جن کے زیر نگیں تھے چین و ختن
کتنے ہی ماہرین علم و فن | اور زہاد و عابدان حسن
کیسے کیسے فصیح و اہل سخن | اور حسینان دہر نازک تن
آئے، چند سے اٹھائے رنج و محن | خاک ہو کر ہیں اب تہ مدفن

عمر برف است و آفتاب تموز
اندکے ماند و خواجہ غرہ ہنوز

کیسا بازار ہے یہ خوش اسلوب | مزرع آخرت ہے نام بھی خوب
جنس نیکی بدی تو ہو مطلوب | تجھے مل جائے گی جسے مرغوب
نفس بدخو حریص و پر ز عیوب | دیکھ، شہوات کا نہ ہو مغلوب
ہاتھ خالی نہ جا کہ ہے معیوب | کام ایسا نہ کر کہ ہو معتوب

اے تہید ست رفتہ در بازار
ترسمت پر نیاوری دستار

چار ہوتے ہیں دو سے دو مل کر | کلیہ قاعدہ ہے یہ اظہر
موت واقع ہو زہر کھائے اگر | حظ ملے اس کو جس نے کھائی شکر
تخم نیکی جو بوئے نیک سیر | پائے گا ثمرہ بھی وہ شیریں تر
اور جو باندھے کوئی بدی پہ کمر | بد نتیجہ وہ دیکھے گا اکثر

ہر کہ مزروع خود نخورد بہ خوید
وقت خرمنش خوشہ باید چید

تا بکے غفلت اور نادانی | ہو کے گمراہ دشت پیمائی
جس طرف کو ہوا ہے تو راہی | نہیں یہ راہ تیری منزل کی
ہو خبردار راہ لے سیدھی | بس اسی میں ہے تیری بہبودی
[illegible] نادان حضرت سعدی | کہہ رہے ہیں ز راہ ہمدردی

پند سعدی بگوش دل بشنو
رہ چنین است مرد باش و برو

میر محمد شجاع الدین مہر

شعریت فلسفہ آمیز

دے کے صبا جھونکے پرتو ان کا
منہ چومے ہنس مکھ پھولوں کا

کرنہ وہ کب سمجھے پھولوں کی
سچ سنو مجھ سے پھولوں کی

پھولوں کے جلوے روشن ہیں
پھول، لطافت کا مخزن ہیں

پھول حسیں بھی حسن فزا بھی
حسن کے مرکز پر ہیں فدا بھی

خوش رو بھی خوش ہیں پھولوں تو
یہ سنتا ہوں میں پھولوں سے

ایسا ربط باہمدیگر
پھر بھی جدا رہتے ہیں اکثر

لاکھ کہے کوئی البیلی
ہائے چنبیلی ہائے چنبیلی

پھول چنبیلی کے نہ ملیں گے
موسم جب آئے گا، کھلیں گے

سب پھولوں کا حال یہی ہے
شاہد اس کا سرو سہی ہے

پھولوں کی جتنی ہیں قسمیں
جمع ہوئیں سب کس مجلس میں

طور یہی ہے خاص پھلوں کا
دیکھ لیا اخلاص پھلوں کا

سارے میوے ہر موسم میں
جمع ہوئے کب اس عالم میں

میں نہیں کہتا باغ جناں کی
مجھ کو خبر ہے صرف یہاں کی

جی چاہے سو مل نہیں سکتا
غنچہ نا طرز کھل نہیں سکتا

آم کا موسم، سیتا پھل دے!
کیوں نہ کوئی ہنستا ہوا اچھل دے

ہم جب ان دونوں کو چاہیں
ڈھونڈتی ہی رہ جائیں نگاہیں

سیتا پھل کی ہر اک ڈالی
ہاتھ اپنے دکھلانے کی خالی

ہر میوے کی فصل جدا ہے
فصل جدا ہے اصل جدا ہے

لذت دنیا ہے ہنگامی
یا ہے یہ میرے ذوق کی خامی!

کیف سے میں خود ہوں بیگانہ
یا ہے ادھورا "نعمت خانہ"

سید علی منظور

تنقید و تبصرہ

دنیا ہماری :- از پردیسی۔ حجم ۲۴۹ صفحہ قیمت عہ/۔ ملنے کا پتہ۔ راج محل پبلشرز جموں کشمیر۔

یہ پردیسی کے پندرہ معصوم افسانوں کا مجموعہ ہے۔ افسانوں کے پس منظر میں کشمیر کی مفلسی سسکتی ہے۔ باوجود ترقی پسند مسائل پر بحث کرنے کے عریانیت کا کہیں پتہ نہیں۔ زندگی کے مختلف پہلو افسانہ نگار کے سامنے ہیں۔ "کاریگر" اس مجموعہ کا بہترین افسانہ ہے۔ یہ افسانہ کا لفظ لفظ شاہد ہے کہ براہِ راست انہوں نے زندگی کی مایوسیوں کو محسوس کیا ہے۔

کروٹ :- از سعادت حسن منٹو قیمت عہ/۔ حجم صفحہ ۲۰۰۔ ملنے کا پتہ اردو اکیڈمی لاہور۔

اردو کے سب سے زیادہ بدنام مصنف منٹو کے گیارہ ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ یہ کروٹ ہے۔ سرورق کی تصویر سے پڑھنے والا دھوکا کھاتا ہے کہ شاید اس میں عریانیت کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن ہر ڈراما ناظر کو زندگی کی نئی نئی اداؤں سے روشناس کرتا ہے۔ انسانی فطرت کی دلچسپ خامیوں کو دکھاتا ہے۔ انسان کے آنسوؤں سے متاثر اور اس کی مسکراہٹوں سے لطف اندوز کراتا ہے۔ منٹو نے زندگی کا قریب سے مطالعہ کیا ہے کہ وہ اپنے احساس کی شدت اور بیان کے خلوص کے درمیان کوئی حجاب باقی نہیں رکھتا۔ تصنع اور بناوٹ نام کو نہیں۔ اس کے نام سے چونکنے کی بجائے اس کی تخلیقات کا بغور مطالعہ کرنا اس کو ادیب تسلیم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ یوں تو ہر ڈراما اپنی جگہ بہت اچھا ہے لیکن کروٹ، جھٹکا، اور سب سے زیادہ سلمہ پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے مختلف روپ بظاہر مختلف ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ سب انسانی کش مکش کے مختلف مظاہر ہیں۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ منٹو جنسی مریض ہے وہ "سلمہ" کا ضرور مطالعہ کریں۔ کیونکہ اس المیہ کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ ملعون منٹو ایسی چیز بھی لکھ سکتا ہے۔ زبان صاف ستھری اور دلکش ہے۔ کتابت اور طباعت بہترین۔

ترسول :- از جناب نور الحسن بی۔ اے بی ٹی۔ ہیڈ ماسٹر (گلاسگو) قیمت ۲/ عثمانیہ عہ/ مجلد ۲/ غیر مجلد ۲/۔ ناشر حیدرآباد بک ڈپو۔ محاذی اسٹیٹ بنک۔ حیدرآباد دکن۔

مصنف کے آٹھ افسانوں کا مجموعہ ترسول ہے۔ زبان سیدھی سادھی ہے۔ اور مصنف کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ افسانوں کے روپ میں نوعمر لڑکے لڑکیوں کے لئے اخلاقی مضامین لکھے۔ جابجا پند و نصیحت بھی کی گئی ہے۔ کتاب کو دیکھتے ہوئے قیمت زیادہ ہے۔

ایک حمام میں (شائستہ سنگاقی) :- از خواجہ محمد شفیع دہلوی۔ حجم ۱۹۲ صفحہ۔ قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ نگارستان ایجنسی اردو بازار دلی۔

"ایک حمام میں" بڑا دلچسپ ناول ہے۔ زبان خواجہ محمد شفیع دہلوی کی ہے۔ نہایت سلیس اور ستھری۔ ایسی زبان لکھنے والے اب کمیاب ہیں۔ قصہ الف لیلیٰ سے نہیں بلکہ ہماری اپنی دنیا کی زندگی سے لیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب ترقی پسند ادب کے حامی نہیں مگر اس ناول کو لکھ کر وہ اس تحریک کے مقاصد کو پورا کر رہے ہیں۔ کرداروں کو نہایت چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے۔ ایک مقصد کے تحت سب کو ایک مرکز پر لایا گیا ہے۔ نفسیات نگاری کا کمال اس سے ظاہر ہے کہ شریف بیوی، طوائف، چور، شہدے اور دلی کے رنگیلے نواب زادے سبھی اس میں موجود ہیں اور ہر ایک کے کردار پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ تھیٹریکل کمپنی کا ذکر بڑے مزے سے کیا ہے اور اس ضمن میں ایک علٰحدہ افسانہ "روشن آرا" بھی ناول میں ضم کر دیا گیا ہے۔ اگر کوئی دلی کے محاورے اور ان کا استعمال سیکھنا چاہے تو یہ کتاب نہایت مفید ہوگی۔ کتاب عمدہ ہے۔

نیا راگ :- مرتبہ: کنیز سلطانہ ساغر حجم صفحہ ۱۰۲ قیمت عہ/۔ ناشر:- بمبئی ٹھیکر اینڈ کمپنی لمیٹڈ بمبئی۔

ماہنامہ "ایشیا" میں جو نظمیں اور غزلیں مختلف اوقات میں شایع ہوئی ہیں ان کا نہایت ستھرا انتخاب "نیا رنگ" کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

ذکیہ سلطانہ صاحبہ کے سلجھے مذاق کی داد دینے کو جی چاہتا ہے جب ہم تینتالیس (۴۳) مشہور شاعروں کا عمدہ کلام پڑھتے ہیں۔ مرتبہ خود بھی شاعر ہیں اور شاعر کی رفیقۂ حیات بھی۔ اس لئے انتخاب کا معیار بہت بلند ہے۔ طباعت و کتابت عمدہ اور قیمت نہایت کم۔ ایسے انتخابات کی اشاعت اردو ادب کی بڑی خدمت ہے۔

سنگم :- از جناب سید شبیر حسین قیس۔ حجم ۱۰ صفحے قیمت ۸/ ناشر :- دکن بک ڈپو چنچل گوڑہ حیدرآباد دکن

جناب شبیر حسین قیس نہایت پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کے گیارہ مختصر افسانوں کا مجموعہ "سنگم" ہے۔ افسانوں کے پلاٹ پرانے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کا قلم لکھتے لکھتے تھک گیا ہے۔ افسانوں میں کوئی جدت اور انوکھا پن نہیں۔ مگر ان اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپ ہوگا جو افسانوں کو محض دل بہلانے کے لئے پڑھتے ہیں۔ فن کی نزاکت اور باریکیوں سے الجھنا نہیں چاہتے۔ قیمت کے لحاظ سے مجموعہ برا نہیں۔ ایک افسانہ "سنگم" واقعی اچھا ہے۔

یادِ اقبالؒ :- مرتبہ غلام سرور فگار۔ حجم ۱۲۰ صفحات قیمت ۸/ ناشر :- اقبال اکیڈمی لاہور۔

یہ جو کسی نے کہا ہے کہ بڑا شاعر کبھی مرتا نہیں اور زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ اقبالؒ پر روز روز کچھ نہ کچھ نکھا جا رہا ہے۔ فگار صاحب نے اس مجموعہ میں ۱۳ مشہور شاعروں کی ان نظموں کو پیش کیا ہے جو اقبالؒ کی یاد میں لکھی گئیں۔ حفیظ ہوشیارپوری کا مرثیہ لاجواب ہے۔ سر عبدالقادر نے مقدمہ لکھا ہے اور جناب محمد حسنین سید بی اے۔ جامعی نے اقبالؒ کی مختصر اور جامع سوانح حیات نہایت سلیس اور سادہ زبان میں لکھی ہے۔ اس میں چند خواتین کی نظمیں بھی شامل ہیں۔

زہریلے پودے :- از محمد عبدالسلام بی اے۔ ایم ایس سی لکچرار نباتیات جامعہ عثمانیہ۔ حجم ۶۲ صفحات قیمت ۸/ ناشر :- سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن۔

مولوی عبدالسلام نے نہایت سادہ زبان میں مختلف زہریلے پودوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ساتھ ان کے زہر دور کرنے کا طریقہ بھی بتلایا ہے۔ سائنس کے متعلق ایسی عام فہم کتابیں اردو میں ضرور لکھی جائیں۔ سائنس کے طالب علم اور عوام ہر ایک کے لئے اس کا مطالعہ یکساں مفید ہے۔

یونان و روما کے انوکھے قصے :- از امجد علی صاحب۔ قیمت ۸/ کلدار حجم ۱۶۰ صفحات ناشر حیدرآباد بک ڈپو حیدرآباد دکن۔

انگریزی ادب میں اکثر تلمیحات لاطینی اور یونانی مستعمل ہیں۔ چونکہ اردو ادب پر انگریزی کا اثر بہت زیادہ ہے اس لئے یہ اردو میں بھی رائج ہیں۔

آٹھ تلمیحات کو افسانوں کی شکل میں پیش کیا ہے اور اکثر مشہور ہیں۔ اس لئے کتاب کا مطالعہ عوام کے لئے خصوصاً جو انگریزی سے ناواقف ہیں مفید ہوگا۔

تذکرۂ بابِ حکومت :- مرتبہ محمد مظہر۔ حجم ۲۰۸ صفحات قیمت قسم اول عہ قسم دوم ۸/ قسم سوم ۸/ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن۔

محمد مظہر صاحب نے اپنی ذاتی معلومات سے کام لے کر اس تذکرہ کو مرتب کیا ہے۔ ملک اور حکومت سے دلچسپی لینے والے حضرات اسے ضرور پڑھیں۔

باب حکومت کی نہایت مبسوط تاریخ ہے۔ اس کا خاتمہ فرمانِ عالیہ کے دو فقروں پر کیا گیا ہے۔

"ز۔ س"

ادارہ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	روپیہ	آنہ	پائی
سرگزشت حاتم	۱۲۸	۲	۰	۰
سرگزشت غالب	۹۴	۰	۸	۰
نظام الملک	۴۰	۰	۶	۰
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خاں	۱۶	۰	۲	۰
سرسالار جنگ	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۳۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر	۲۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۳	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰	۰
حیدرآباد	۸۵	۰	۱۰	۰
عماد الملک	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۶	۰
" " دوسری کتاب	۵۶	۰	۶	۰
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ	۱۴۰	۱	۴	۰
فن تعمیر	۹۰	۰	۱۲	۰
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۲	۱	۰	۰
ہندوستانی تمدن	۱۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی	۸	۰	۱۰	۰
سرما	۱۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۶	۰
رسائل طیبہ	۳۹۰	۲	۸	۰
سلک گوہرین	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو	۱۷۲	۱	۸	۰
اشوک اعظم	۵۶	-	۸	۰
باتیں	۸۴	۱	۰	۰
یورپ جنگ سے پہلے	۲۱۶	۲	۸	۰
شاد اقبال	۱۷۰	۲	۸	۰
آریائی زبانیں	۱۰۲	۱	۰	۰
ناظم علی خاں	۳	۰	۴	۰
تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۰	۵	۰	۰
عرب اور عربستان	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	روپیہ	آنہ	پائی
سچ کا جادو	۴۸	۰	۴	۰
طبیعاتی کائنات	۶۸	۰	۸	۰
متاع سخن	۱۲۳	۰	۱۲	۰
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۴۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵ تصاویر)	۵۰۰	۵	۰	۰
" " دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
فن کی دنیا	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
[illegible]	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن	۱۵۳	۱	۴	۰
روح غالب	۱۴۰	۲	۸	۰
عاصمہ	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
خود زندگی	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگزشت ادارہ	۳۰۰	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۲۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان	۳۲	۰	۳	۰
عطائیات	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار	۱۶۸	۱	۸	۰
نقش مانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
گارساں دتاسی	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت	۵۲	۰	۸	۰
ادارہ سنہ ۱۹۴۱ع میں	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ	۲۴	۰	۴	۰
افضل الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خاں	۳۲	۰	۴	۰

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم

جلد ۹ — بابت مارچ و اپریل ۱۹۴۶ء — شمارہ ۳ و ۴

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین شاہد ایم اے کے اہتمام سے صحیفہ مشین پریس میں چھپکر رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

زندگی ـــ غالب کی نظر میں

یہ تو ایک حقیقت ہے کہ شاعر کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں ہوتا بلکہ وہ ہماری ہی سماج کا ایک فرد ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کی طبیعت عام لوگوں سے زیادہ حساس ہوتی ہے اور اس میں فطری طور پر یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ کسی واقعہ سے متاثر ہو کر اسے شعر کے سانچے میں ڈھالے۔ اسی لئے وہ ہر اس جذبے کو جو انسانی دل میں پیدا ہو سکتا ہے صحیح طور پر پیش کرتا ہے۔ ورنہ ہر انسان کے دل میں وہی جذبات پیدا ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں جو شاعر کے قلب و دماغ کو دعوتِ فکر دیتے ہیں لیکن صرف محسوس کرنا اور بات ہے اور محسوس کرنے کے بعد ان کا اظہار ایک علیحدہ چیز ہے۔

ہر بڑے شاعر کے کلام کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں اس کی پوری شاعری میں ایک مرکزی خیال ملے گا اور اسی ایک مرکز یا محور کے اطراف اس کی شاعری گھومتی ہوئی نظر آئے گی۔ کہیں وہ زندگی کے متعلق تاثرات بیان کرے گا۔ چاہے وہ اپنے ہوں یا پرائے۔ اور کہیں زندگی کو مختلف زاویہ ہائے نظر سے دیکھے گا۔ اور ان زاویوں کی مدد سے چند حقائق و واقعات زندگی کو پیش کرے گا۔ چونکہ انسان کے دل میں اس کی زندگی کی مختلف منزلوں میں متضاد جذبات پیدا ہوتے ہیں اس لئے شاعر کا کلام بھی متضاد خیالات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کہیں وہ زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو لگاتار محنت سے سلجھاتا ہوا پایا جائے گا اور کہیں اس دنیا سے تنگ آکر اپنے تخیل کی مدد سے ایک نئی دنیا بساتا ہوا نظر آئے گا۔ کبھی وہ کشمکشِ زندگی میں پیہم مشکلات اور ناکامیوں سے دوچار ہو کر انسان کی مجبوری اور ان مجبوریوں کے خاتمے کا ذریعہ موت کو ٹھیرائے گا۔ کبھی اس کی نظر میں دنیا ایک بازیچۂ اطفال نظر آئے گی اور ہنسی خوشی سے زندگی گزارنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل نظر آئے گا۔ اگر کسی موقع پر وہ مصائب کی زندگی سے تنگ آکر ایک آخری "بلا" یعنی "مرگ ناگہانی" کا منتظر رہے گا تو کبھی اس سازِ ہستی کے ایک نہ ایک دن "بے صدا" ہو جانے کا یقین کر لینے کے بعد اپنے دل کو یہ مشورہ دے گا کہ "نغمہائے غم کو بھی غنیمت جانو"۔ کبھی وہ ہستی کی رونق بڑھانے اور "زیست کا مزہ" پانے کیلئے عشق خانہ ویراں ساز کا دامن تھامنے کی تعلیم دیگا اور کبھی آلام و مصائب سے گھبرا کر اور آکر کاروبارِ شوق کے لئے فرصت اور نظارۂ جمال کے ذوق کا فقدان محسوس کرے گا۔ کبھی فکر دنیا میں سر کھپانا اس کے لئے وبال ہو جائے گا اور جینے کا مزا موت کے لازم ہونے میں محسوس کرے گا جہاں وہ اپنی زندگی مشکلات میں بسر کرنے کے سبب یہ کہہ اٹھے گا کہ ؎

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

وہیں زندگی جیسی گراں قدر شئے کو بارگاہ ایزدی میں پیش کرتے ہوئے یہ کہے گا ؎

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مختصر یہ کہ شاعر زندگی و موت کے مسائل، انسانی جذبات کی ترجمانی اور اپنے تجربات زندگی کو شاعری کا موضوع بناتا ہے۔ درحقیقت وہی شاعر ادبی دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کا مستحق ہے اور وہی شاعر ادبی دنیا میں اپنا مقام آپ پیدا کر لیتا ہے جس کی شاعری کا محور زندگی اور واقعاتِ زندگی ہوا کرتے ہیں۔ ان ہی شاعروں نے اپنے نتائجِ فکر سے دنیا والوں کو ایک پیام دیا ہے۔ زندگی کی دکھتی رگ پکڑنا یا زندگی کے نشیب و فراز کو ہماری نگاہوں کے سامنے لا کھڑا کرنا اور

ان سے بجائے فرار و گریز کے پامردی سے راہ زندگی کو طے کرنے کی تعلیم دینا ایسے ہی شاعروں کا مطمح نظر ہوا کرتا ہے۔
مذکورۂ بالا تمام خصوصیات دنیائے شاعری کی جس عظیم المرتبت اور لایق فخر ہستی میں جمع ہوگئی تھیں، وہ اسد اللہ خاں غالب ہے جس نے تمام شعرائے متقدمین کی راہ سے ہٹ کر اپنے لیے ایک نئی راہ انتخاب کی۔ وہ اپنے رنگ کا پہلا اور آخری شاعر تھا۔ اُسی کے کلام کو دیکھنے کے بعد تخیل کی بلندی کا مفہوم ہمارے ذہن نشین ہوتا ہے۔ تب ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اندازِ بیان کی خوبی کسے کہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تمام اردو شاعری کی متانت و سنجیدگی سمٹ سمٹا کر اس کی شاعری میں جمع ہوگئی ہے۔ اس کے کلام میں اردو شاعری ایک شریر و چلبلی دوشیزہ کی طرح نہیں بلکہ ایک باوقار، شائستہ اور متین عورت کے روپ میں جلوہ گر ہوئی ہے جسے اپنی شخصیت و ذمہ داری کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اس نے دنیا کے سامنے اپنا مخصوص پیام اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا جو یقیناً قابل قدر ہے۔ اس کا کلام حیات جاوید حاصل کر چکا۔ وہ باقی رہے گا کیونکہ اس میں چند حقائق ہیں اور حق کبھی مٹ نہیں سکتا۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔

غالب کی ابتدائی زندگی نہایت عیش و عشرت اور بے فکری میں گزری۔ لیکن اس کے بعد انھیں اپنی بقیہ طویل زندگی میں اطمینان و مسرت سے کہیں زیادہ پریشانی و غم سے سابقہ رہا۔ مصیبت کے اِن دنوں میں وہ عیش رفتہ کو یاد کرتے ہیں اور پھر اپنی اس حرکت پر عجیب طرح سے نکتہ چینی بھی کرتے ہیں ؎

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

ایک اور مقام پر وہ اس خیال کو کہ جب مشکلات نے ہمیں گھیرا تھا اس وقت ان کے دفع کرنے کی طاقت تھی اور اب جبکہ پریشانی کا سامنا ہے کچھ بھی نہیں سوجھتا۔ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

ہندوستان کے مسلمانوں کی عظمت کے اظہار کا واحد ذریعہ یعنی رہی سہی سلطنتِ مغلیہ کا چراغ گل ہوگیا۔ متاع آزادی لوٹ لی گئی اور بدبخت کاروان کے دل سے "احساسِ زیاں" بھی جاتا رہا۔ مصیبت ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ سایہ کی طرح پھرتی تھی۔ ان تمام ناخوشگوار حالات سے غالب کا دل بھی بیٹھ گیا۔ وہ مسلمانوں کی طرف سے مایوس سا ہو گیا تھا۔ کہتا ہے ؎

خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

آخر عمر میں وہ فقدانِ راحت سے گھبرا اٹھے تھے کیونکہ اس وقت نہ ذریعۂ معاش باقی رہا تھا اور نہ جسمانی صحت اور دراصل یہی دو بنیادی ضرورتیں ہیں جن سے انسان کو بڑی حد تک سکونِ قلب حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ شاہی سرپرستی کے زمانے میں بھی وہ کبھی فارغ البالی سے گزر بسر نہ کر سکے۔ شاید یہی سبب ہے کہ ان پریشانیوں نے انھیں غم و مصیبت کو اپنا موضوعِ فکر بنانے پر مجبور کیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے کلام میں غمِ ہستی کا بار بار تذکرہ کیا ہے۔ اور کہیں کہیں انداز بیان سے حسرت و یاس جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

انسان کی زندگی اپنے اختتام کو پہنچنے تک نشیب و فراز او مصیبت و غم سے گزرتی ہے۔ اس غم ہستی کا واحد علاج موت ہے۔ اور غالب کے خیال کے مطابق موت ہی وہ "سحر" ہے جس کے طلوع ہونے کے بعد شمع حیات گل ہو جاتی ہے ؎

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اسی خیال کو ذوقؔ نے بھی باندھا ہے اور خوب باندھا ہے ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے

حکیم آغا جان عیشؔ نے اسی خیال کو یوں نظم کیا ہے ؎

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

جب تک انسان زندہ ہے غم و اندوہ بھی اس کے ساتھ ہیں۔ موت ہی غم و رنج کا خاتمہ کر سکتی ہے ورنہ زندگی و غم ایک دوسرے سے وابستہ ہی رہتے ہیں ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

لیکن غالب چونکہ بلند مرتبہ شاعر ہے اور جہاں وہ غم سے متاثر ہوتا ہے وہیں اس کی دور رس نگاہ چند حقائق پر بھی پڑتی ہے جہاں تک معمولی نظریں نہیں پہونچ سکتیں۔ اس لئے وہ ایک بار غم کو بھی غنیمت سمجھتا ہے کیونکہ جب یہ ساز ہستی ختم ہو جائے گا تو پھر نغمہائے غم بھی سنے نہ جا سکیں گے ؎

نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے　　بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

جب ہماری زندگی کی رونق' ہما ہمی اور دھوم یا ہنگامہ پر موقوف ہے اور مسرت ہمیں حاصل نہیں ہو سکتی تو پھر نوحۂ غم ہی غنیمت ہے ؎

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

انسان کی زندگی بہت مختصر ہے اس لئے اسے غفلت میں نہیں گزارنا چاہیے۔ زندگی کے مختصر ہونے کی غالب نے ایک انوکھی تشبیہہ دی ہے ؎

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

صوفیا کے ایک گروہ کے خیال کے مطابق دنیا ایک فریب ہے اور کچھ نہیں۔ غالب نے بھی اس خیال کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے ؎

ہاں کھائیو مت فریب ہستی　　ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ　　عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم		لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

شاعر کو ہستی یا زندگی کیوں فریبِ نظر معلوم ہوتے ہیں اور وہ اسے کیوں دامِ خیال سمجھتا ہے۔ محض اس لئے کہ وہ دیکھتا ہے کہ اس زندگی پر بظاہر انسان کا کوئی قابو نظر نہیں آتا۔ مشکلات و مصائب سدِ راہ بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ناکامیاں ہمت پست کئے دیتی ہیں۔ اسی سبب سے وہ سمجھتا ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے اور اسے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ اس کی مجبوری کی مثال کو غالب نے اس شعر میں پیش کیا ہے ؎

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے		نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

جب اس نے زندگی کے متعلق ایسا نظریہ قائم کیا تو پھر دنیا کو وہ بیکار چیز سمجھنے لگتا ہے۔ اور انسان کے عقل و دانش کے دعوے اسے غلط معلوم ہوتے ہیں۔ وہ دنیا و دین کو انسان کے لئے غفلت میں ڈالنے والی چیزیں سمجھتا ہے ؎

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم		دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

اسی لئے وہ زندگی کو ایک تماشے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا اور ہستی اشیاء کو ہمارا وہم قرار دیتا ہے کیونکہ اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "عالم" محض نام ہی نام ہے۔ اس سے بڑھ کر اس کے وجود کی کوئی حقیقت نہیں ہے ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے		ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور		جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

جہاں زندگی مصائب و آلام سے بے مزہ ہوتی ہے اور جہاں انسان اس سے بددل ہو جاتا ہے۔ وہیں رونقِ ہستی کے لئے شاعر ایک لازوال شئے پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس شئے کے بغیر زندگی واقعی فضول ہے ؎

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

زندگی اور عشق میں گہرا تعلق ہے۔ انسان کے لئے عشق ایک ایسا بلند مقام ہے جہاں سے دنیا کے تمام آلام و مصائب کے پہاڑ نشیب میں نظر آنے لگتے ہیں اور رنج و غم کے بندھن ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور اس دنیا کو عشق کے سہارے ایک قدم میں پار کر لیا جا سکتا ہے ؎

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب		ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یہی عشق ہے جو انسان کو مصائب و آلام کی شدت کے باوجود اپنے حقیقی منصب یا فرض سے غافل نہیں ہونے دیتا اور اس کشمکشِ حیات میں بھی اپنے آپ کو ایک قابلِ پرستش ہستی سے وابستہ رکھتا ہے ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

انسان کی زندگی کا کمال یہ ہے کہ وہ ذاتِ الٰہی میں اپنی ہستی کو فنا کر دے ؎

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اگر انسان کے لئے کسی نہ کسی دن مرنا لازمی نہ ہوتا تو زندگی بے لطف ہو جاتی۔ زندگی کا لطف موت میں پنہاں ہے کیونکہ اس حقیقت سے واقف ہو کر کہ ایک دن مادی زندگی کا ختم ہو جانا ضروری ہے انسان کے دل میں کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ جلد سے جلد اپنے بلند ارادوں کی تکمیل کرے تاکہ کہیں فرشتۂ اجل اسے اپنے ارادوں کو نامکمل چھوڑ دینے پر مجبور نہ کرے۔ اگر موت لازم نہ ہوتی تو انسان بے پروا ہو کر اپنے ہر کام کو "فردا" پر ڈال دیتا اور زندگی جس کا مزا سراسر مصروف رہنے میں ہے بے مزہ ہو جاتی ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

مقصد میں کامیابی کے لئے نتیجے کی فکر کئے بغیر اپنے کام میں لگے رہنا چاہیے کیونکہ بالآخر وہی ہوگا جو فکر کرنے کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔ مصیبت سے گھبرانا باہمت انسان کا شیوہ نہیں ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اگر قوت برداشت ہو تو مصیبت بھی راحت سے بدل سکتی ہے۔ رنج و مصیبت کی کثرت انسان کو بے پروا بنا دیتی ہے اور وہ ان کا خوگر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ غالب کہتا ہے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج　　مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

زندگی کے ہر شعبے میں اور انسان کے ہر فعل میں نیت و ارادہ اور خلوص کو دیکھنا چاہیے۔ اور اگر مقصد پورا ہو جاتا ہے تو سطحی باتوں کو موضوع بحث و تکرار نہ بنانا چاہیئے ؎

وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اگر کوئی ہمیں برا کہے تو اس پر دھیان نہ دینا چاہیئے۔ اگر کسی کو غلط راستے پر چلتے ہوئے دیکھا جائے تو اس کی رہبری کرنا تقاضۂ انسانیت ہے۔ اور چونکہ خطا و قصور ہر شخص سے سرزد ہونے کا امکان ہے اس لئے عفو و درگزر اچھی صفت ہے۔ دنیا میں ہر شخص کو احتیاجات ہیں اس لئے کوئی کسی کی ضروریات کہاں تک پوری کر سکتا ہے۔ ان خیالات کو غالب کی زبانی سنیئے :-

نہ سنو گر برا کہے کوئی　　نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی　　بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند　　کس کی حاجت روا کرے کوئی

چاہے حوادث کی کتنی ہی کثرت کیوں نہ ہو ان سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہی حوادث ہمیں سبق دیتے ہیں۔ ان ہی سے ہم تجربات حاصل کرتے ہیں اور آئندہ کے لئے احتیاط سے کام لیتے ہیں ؎

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

مردِ میدان وہی ہے جو خطرات کو آواز دے کہ وہ آئیں اور اس کے عزم و ارادہ اور پامردی کا امتحان لیں۔ موانعات رخشِ ترقی کے لئے تازیانے کا کام کرتے ہیں اور مشکلات میں گھر کر انسان خوش ہوتا ہے کہ اسے اپنی ہمت کے مظاہرے کا موقع مل گیا ؎

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

بعض لوگ بہت جلد مایوس ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر مقصد کے حاصل کرنے میں انتظار ہی کرنا پڑے تو اس زحمت کو بھی گوارا کر لینا چاہیئے ؎

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

غالب کا خیال ہے کہ عبادت، عبودیت کے اظہار کی خاطر کی جانی چاہیئے۔ جنت کی خاطر عبادت کرنا، عبودیت کی شان نہیں۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہیے تاکہ لوگ صرف اللہ کے لئے عبادت کریں ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

غالب کے نظریۂ حیات اور لافانی پیام کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کے سنوارنے میں عشق کا بہت بڑا حصہ ہے کیونکہ وہی رونقِ ہستی ہے اور اسی سے دنیا قائم ہے۔ ہر چند انسان بے بس اور عمر برق خرام کا مالک ہے لیکن اگر وہ چاہئے تو اس فرصتِ زندگی میں بڑے بڑے کام انجام دے سکتا ہے۔ عشق ہی کی بدولت دشتِ امکان ایک نقشِ پا نظر آتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ رنج و غم سے زندگی میں واسطہ پڑتا ہے لیکن اگر عزم و ارادہ ہو اور دل کی تربیت عمدہ ہو تو یہ آلام و مصائب راحت و آرام سے بدل سکتے ہیں۔ انسان کی معراجِ کمال یہی ہے کہ وہ اس ذات میں فنا ہو جائے جس کا ایک پرتو ساری دنیا اور وہ خود بھی ہے۔

مختصر یہ کہ اگر زندگی میں رنج و غم نہ ہوتے تو زندگی کا مزا حاصل نہ ہوتا۔ رکاوٹیں نہ ہوتیں تو انسان کو سعیِ پیہم کا خیال نہ آتا اور موت لازم نہ ہوتی تو دنیا میں یہ گرما گرمی اور چہل پہل نظر نہ آتی۔

محمد منظور احمد

محبت کی چھاؤں :۔ مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ[۱۴] افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحاتِ فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔

چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد عہ

احساسِ مجبور

وہ چنگاری کہ جس کی آگ سے خرمن بھڑک اٹھیں — وہ دل جس کے دھڑکتے ہی ہزاروں دل دھڑک اٹھیں
ترے ہاتھوں فروزاں ہو تو بھڑکا بھی نہیں سکتا!

مرے لب کے تبسم کتنے ہونٹوں پر بکھرتے ہیں — مرے نغموں کے نشتر کتنے سینوں میں اتر تے ہیں
میں اپنے دل کو لیکن آپ بہلا بھی نہیں سکتا!

دھواں شاداب سینوں سے اٹھا سکتا ہوں محفل میں — ہزاروں تیر میں پیوست کر سکتا ہوں ہر دل میں
ترے ہی زخم لیکن تجھ کو دکھلا بھی نہیں سکتا

فضا میرے فسانوں سے فسانہ ساز ہوتی ہے — مرے نغموں سے فطرت گوش بر آواز ہوتی ہے
ترے ہی گیت تیرے سامنے گا بھی نہیں سکتا

مرے ہی اشک میری آنکھ چھلکا بھی نہیں سکتی — مرے ہونٹوں پہ خود میری ہنسی آ بھی نہیں سکتی
ترے آگے ترا افسانہ دہرا بھی نہیں سکتا

حرم سے دور جانا، بتکدے سے دور تر جانا — بہت آساں ہے مجھ کو ان دیاروں سے گزر جانا
مگر تیری وفاؤں کے محل ڈھا بھی نہیں سکتا

تری دنیا کہ ہے نغمات میں نغمات کی دنیا — مری صبحوں کی دنیا ہے نہ میری رات کی دنیا
مگر میں ہوں کہ اس دنیا کو ٹھکرا بھی نہیں سکتا

ترے نزدیک اگر چاہوں تو خود آ بھی نہیں سکتا — تجھی سے دور تجھ کو چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتا
تجھے کھو بھی نہیں سکتا، تجھے پا بھی نہیں سکتا

شور

ادبی رجحانات کا تجزیہ

ادب زندگی کی تصویر ہے اور اس کے ہر پہلو کی عکاسی ادیب کا فرض ہے مگر مخالفین کے اعتراضات اور موافقین کے بیجا تصورات نے مل کر ترقی پسند ادب کو گورکھ دھندا سا بنا دیا ہے۔ ان باتوں کے پیش نظر ادب کے شاندار مستقبل سے امید رکھنا بیکار ہے۔ مخالفین کا یہ خیال غلط ہے کہ ترقی پسندی موجودہ دور کی پیداوار ہے۔ دراصل ترقی پسندی کوئی جدید چیز نہیں۔ عام نقطۂ نگاہ سے یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے اور یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ ایسے ادب کی ابتدا کب اور کیونکر ہوئی کیونکہ ہر زمانے اور ہر دور میں ادب میں ترقی ہوتی رہی۔ ابتدا میں کہانیوں کی بنیادیں کھوکھلی تھیں۔ ان کا مقصد زندگی کی عکاسی کرنا نہیں تھا چنانچہ اس زمانے کی کتابیں "نثر البیان" "گلزار نسیم" وغیرہ جن کے افراد کی فوق البشر اور محیر العقول قوتیں ہیں اور وہ روزمرہ کے انسان نہیں [illegible] اور عجیب و غریب انسانوں کی مخصوص [illegible] لیتے ہیں [illegible] کو تعجب [illegible] ہوئے [illegible] انسان [illegible] دیتے ہیں۔

مگر زمانے کے ساتھ ساتھ تخیل اور ادب دونوں میں تبدیلیاں ہوتی گئیں اور اردو نثر میں بھی انقلاب آیا اور ماضی کے اسی شاندار بہاؤ کا نتیجہ حال اور مستقبل ہیں۔ ان ادیبوں کا مطالعہ بیحد ضروری ہے جنھوں نے اپنی زندگیاں ہماری زبان کی اشاعت میں صرف کر دی تھیں۔

اردو کی خدمت غالب نے زیادہ کی ہے۔ غالب اردو زبان کا بہت بڑا معمار ہے کیونکہ وہ ایسے دور میں پیدا ہوا جبکہ مغلیہ سلطنت اپنے زوال کے آخری مراحل طے کر رہی تھی اور [illegible] شمع گل ہو رہی تھی۔ پرانا دور ختم اور نیا دور شروع ہو رہا تھا۔

"غالب کا زمانہ ایک ایسا دور ہے جس میں غدر، ختم ہوتے ہوئے دور کی آخری شکست تھی اور نئی شہنشاہیت کی آخری فتح۔ یہی وہ درمیانی زمانہ ہے جس کے بعد اردو ادب میں انقلاب پیدا ہوا۔ اسی دور میں دو مشہور ہستیاں مصروف کار نظر آتی ہیں جو ہم عصر ہوتے ہوئے بھی دو مختلف رجحانات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ذوق اور غالب۔ انحطاط اور احتیاج میں جو فرق ہے وہی ذوق اور غالب میں ہے۔"

ذوق پرانے ادبی دور کا آخری نمونہ ہے، اور غالب کی شاعری نئے دور کی پیغامبر۔ اسی دور کی کڑی حالی، سرسید، پریم چند اور اقبال ہیں۔

غالب کی حیثیت غزل میں محصور رہنے کے باوجود ہر طرح آزاد ہے۔ ان کے اشعار ان کا تصوف، ظرافت، طنز، ذوق، غرض ان کی ہر چیز میں ذوق نمو اور حرکت حیات ہے جو اس سے صد ہا سال پہلے کے سکون کو ختم کر دیتی ہے۔

اس انقلاب کی تکمیل سرسید نے کی۔ یہ سرسید ہی کی کوششیں تھیں [illegible] اردو کے اسالیب بیان کا رخ بدل دیا [illegible] سادگی اور سادگی پیدا کر دی [illegible] کا ساتھ حالی نے دیا۔ وہ بھی وہ انشا پرداز ہے جس نے زمانے کے تقاضا سے واقف ہو کر اردو نثر نگاری کی طرف توجہ کی اور زبان کی اہمیت ہمیشہ قائم رکھی۔

کم و بیش اسی زمانے میں پریم چند پیدا ہوا جو حقیقتاً اردو ادب میں مختصر افسانہ نگاری کا موجد ہے۔ پریم چند کی فن کاری کی حیرت انگیز صلاحیتوں کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس نے اپنے فن کی بنیادیں کچھ اس طرح رکھیں کہ سطحی نظر سے دیکھنے والوں کو احساس نہیں ہو سکتا کہ وہ مغربی افسانہ نگاری سے متاثر ہوا۔ پریم چند کی تکنیک کئی رنگوں کی آمیزش سے بنی [illegible] افسانہ نگاری فنی حیثیت سے اردو میں ایک نئی [illegible] اس سے قبل کے افسانوں کا انداز کچھ اور تھا ان [illegible] خیالی باتوں کے ایسی چیزیں مقصود تھیں جن کا تعلق [illegible] تلخ اور ٹھوس حقیقت سے نہ ہو۔ پریم چند نے [illegible] فن بنایا اور اردو ادب میں واقعیت نگاری کو رواج دیا جو

بالکل نئی چیز تھی۔ وہ زندگی کے ہر پہلو، ہر رخ اور ہر سمت پر روشنی ڈالتا ہے اور ساتھ ہی پیغام بھی دیتا ہے۔ اصلاح کا پیغام۔

پریم چند نے اردو افسانوں میں کردار نگاری کو زیادہ اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے خود جو کچھ لکھا ہے وہ بہت بڑی خدمت ہے مگر اس سے بھی بڑی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب میں کچھ ایسی روایتوں کی بنیادیں ڈالیں جو دوسرے افسانہ نگاروں کے لئے خضر راہ بنیں۔

جس طرح پریم چند دو تمدنوں کو ملاتے ہیں اسی طرح اقبال کی شاعری بھی دو تمدنوں کو ملاتی ہے بلکہ اس میں ہر تمدن کا جوہر موجود ہے۔ ان کی شاعری، ترقی پسند شاعری کی محرک بنی۔ ان کے ادب کا نظریہ ترقی پسند ادب کے نظریئے سے بہت زیادہ قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے آنیوالی نسل سے توقع کی ہے۔

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اور اسی توقع پر انھوں نے مستقبل کے ارباب کا پہلے ہی سے خیر مقدم کیا ہے۔

ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے
عجب نہیں ہے کہ ہوں میرے ہم عناں پیدا

اور آگے چل کر تو انھوں نے یہ بھی کہہ دیا ہے۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

اقبال نے عشقیہ شاعری کے موضوع کے لئے مختلف تبدیلیاں تجویز کی ہیں۔

عشق اب پیرویٔ عقل خدا داد کرے
آبرو کوچۂ جاناں میں نہ برباد کرے

کیا بالکل یہی تصور ترقی پسند شاعری کا نہیں ——؟ تقریباً تمام صاحب عقل و فہم ترقی پسند شعرا اور ادیبوں نے اقبال کی رہنمائی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ چونکہ یہ زمانہ زوال کا ہے اس لئے فن کار کو مشرق اور مغرب سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھنا چاہیے۔ اور اس امتزاج سے اگر زندگی کی شب تاریک کی سحر ہو سکتی ہے تو۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

چنانچہ اقبال نے ان رجحانات کو آگے بڑھایا جن کی مدد سے آج ہم منزل کے اتنے قریب ہیں ——

جب زندگی بدلتی ہے تو آرٹ بھی بدل جاتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں —— بے شک ترقی پسندوں کا شعری اسلوب نیا ہے، افسانہ اور موضوع سخن نیا ہے لیکن اس پر بھی وہ حکایت رخ زیبا سے غافل نہیں —— ان کی داستانوں میں کیف اب بھی موجود ہے۔ ہاں ساقی بدل گئے۔ جام اور شراب بدل گئی ہے لیکن یہ تو زندگی کا خاصہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قدیم ادب کے "دلدادہ" اسی بدلتی زندگی کا ساتھ دینا نہیں چاہتے اور اسے ترقی کی طرف تیز گام ہونے کی بجائے اسی پرانی ڈگر پر ڈالنا چاہتے ہیں۔

نئے ادب کی شعری تخلیقات نے بلندی اور ترقی کے بہت سے مدارج کم عرصے میں طے کر لئے ہیں اور ان تمام تخیلات تصورات کو ابھارا ہے جو عرصۂ دراز سے قوم کے سینے میں موجزن تھے جیسے ٹیگور، اقبال، جوش، اور نذر الاسلام نے عصر جدید کی زبان دی ہے اور جسے نئے ادب کے شعرا نت نئے روپ میں پیش کر رہے ہیں۔

جہاں تک موضوع کا تعلق ہے نثر اور نظم ہم آہنگ نظر آتے ہیں مگر جو وجدانی تاثر، حسن بیان اور ندرت کی شاعری کو نصیب ہے وہ دیگر اصناف ادب کے حصے میں کم آئی ہے۔ ہاں موضوعات کی انقلابی نوعیت کے پیش نظر ترقی پسند فن کاروں نے شعری اسلوب کو بھی ایسے سانچے میں ڈھال دیا ہے جو کہ موضوع کا ساتھ دے سکے۔ اسی شعری اسلوب کی تبدیلی نظم معرا یا آزاد نظم کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہے اور اسی پر آج کل اس قدر اعتراضات ہو رہے ہیں اور جو عروضیوں اور

پرانے نقادوں کی شدید نکتہ چینی کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

سب سے پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ موجودہ شعرا میں "شاعری" کی قابلیت نہیں (گویا شاعری فطری نہیں اکتسابی چیز ہے) جس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے قافیہ و ردیف کی بندشوں سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا۔ دوسرے طریقہ پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ شاعری بغیر قافیہ ردیف کے ناممکن ہے اور اس کے بغیر شاعری، شاعری ہی نہیں اور موجودہ شعرا (جنھیں شعرا کہنا بھی درست نہیں) اسے نباہ نہیں سکے اس لئے انھوں نے اپنی آسانی کے لئے نظم معرا ایجاد کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ہر طرف شاعر نظر آ رہے ہیں کیونکہ اس صنف نظم میں قافیہ و ردیف کے پیچ و خم نہیں۔ اسی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک نظم معرا شاعری کی قسم نہیں یا اسے شاعری نہیں کہہ سکتے۔ ہمیں اپنے ان بزرگوں کی خدمت میں عرض کرنا ہے کہ آپ کی قابلیت مسلم لیکن آپ کا مشاہدہ غلط بینی پر مبنی ہے۔

دوسرا اعتراض یہ عائد ہوتا ہے کہ اس صنف نظم میں لے نہیں، ترنم و ہم آہنگی نہیں، نغمہ نہیں۔ جس طرح تال راگ کے لئے ضروری ہے اسی طرح قافیہ شاعری کی جان ہے۔ مجھے تال کے بارے میں اعتراض ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ تال کے بغیر سنگیت، سنگیت نہیں کیونکہ سنگیت کی دو صورتیں ہیں، پابند اور آزاد۔ آزاد کو ہم "الاپ" بھی کہہ سکتے ہیں اور اہل فن جانتے ہیں کہ الاپ جس میں راگ کا مکمل شکوہ موجود ہوتا ہے اسے تال کی ضرورت نہیں۔ ستار پر شروع میں ہی "الاپ" بغیر طبلے کی مدد کے ادا کیا جاتا ہے۔

اب ترنم کو لیجئے۔ صوتی اعتبار سے ہر لفظ میں ترنم ہوتا ہے اور ترنم کے لئے نثر یا نظم کی قید نہیں چونکہ دونوں میں ترنم ہوتا ہے اس سے دونوں سنگیت میں ڈھالے جا سکتے ہیں۔ اس طرح اگر آپ مہمل اصوات کے ایک مرکب کو کسی موسیقار کے حوالہ کیجئے وہ اس میں سنگیت کی روح بھر دیگا۔ اس اعتبار سے نظم معرا اسلوب شاعری کی بہترین شکل ہے۔

بعض کرم فرما یہ اعتراض کرنے سے بھی نہیں چوکتے کہ آزاد نظم مغرب کی نقالی ہے اور ہماری قدیم تہذیب اور اس کی روایات اس نقالی کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ مغرب کی نقالی کا طعنہ اکثر تنقید نگاروں کا شیوہ ہے اور ترقی پسند ادب کا ہر شعبہ اس کا نشانہ ہے۔ ہمارا انداز فکر، اسالیب بیان، موضوعات سب کچھ مغرب سے چرایا گیا ہے اور اس میں ہمارے ذاتی جوہر، استعداد، اپج یا وطنی ماحول کا کچھ تعلق نہیں۔ اول تو یہ الزام ہی غلط ہے جس کی آگے چل کر تردید کی جائے گی۔ فی الحال مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ جب ہم زندگی کے ادنیٰ سے اعلیٰ ترین شعبے تعلیم، سیاست، صنعت وغیرہ میں مغرب کی نقالی کرتے ہیں تو ادب کو کیونکر اس سے الگ رکھ سکتے ہیں۔ کیا بدلتی ہوئی زندگی کے ساتھ ادب نہ بدلے گا — ؟ کیا ادب تاریخی قوتوں کے بہاؤ کے ساتھ نہ چلے بلکہ ماضی کی تاریکی میں ٹھہری ہوئی دلدل بن جائے — ؟ یہ ماضی کی طرف لوٹانے والی تحریک ملک کو، ادب کو کیا فائدہ پہنچا سکے گی۔

اور یہ الزام غلط ہے کہ آزاد نظم مغرب کی نقالی ہے کیونکہ نظم معرا مغربی ایجاد نہیں ہے جس طرح افسانے کی ایجاد کا سہرا ہندوستان کے سر ہے اسی طرح نظم معرا بھی ہندوستان ہی کی ایجاد ہے کیونکہ رگ وید جو دنیا کی قدیم ترین الہامی کتاب سمجھی جاتی ہے نظم معرا کا بہترین نمونہ ہے اسی طرح آریائی گیتوں سے لیکر کالیداس کی شاعری، نظم معرا کی شاعری ہے اس طرح نظم معرا کو مغرب نے ہم سے مستعار لیا اور آج عظیم الشان روایت جو قومی ادبار کی بنا پر ٹوٹ چکی تھی پھر سے تازہ کی جا رہی ہے تو بجائے اس کے کہ اس کوشش کی داد دی جائے اور بنظر تحسین دیکھا جائے الٹا آوازے کسے جاتے ہیں اور مغرب کی نقالی کا طعنہ دیا جاتا ہے۔

ترقی پسند شاعروں میں غزل سے اب وہ دلچسپی باقی نہیں ہے بلکہ اس دور کی ذہنی، روحانی، سیاسی اور سماجی زندگی کا عکس اپنی نظموں میں پیش کر رہے ہیں اور جوش، ساحر، مجاز، ساغر، ندیم، سردار اور اختر کی نظموں میں

ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان کا خاص امتیاز جزئیات نگاری ہے۔

احمد ندیم قاسمی نے پنجاب کی دیہاتی زندگی کو پیش کیا ہے۔ اس کے فن میں سادگی اور معصومیت پائی جاتی ہے۔ دیہاتی دوشیزاؤں کے حسن کا بیان، دیہاتی نوجوانوں کے جذبات کی تصویر کشی اس کی افسانہ نگاری کو بہت دلکش بنائے ہوئے ہے۔

اب رہ گئے سعادت، عصمت اور حسن عسکری، تو انھوں نے افسانہ نگاری میں ایک نئے باب کا افتتاح کیا ہے اور سب کے سب جنسیات کے متعلق لکھتے ہیں۔ شاید ترقی پسند ادب کے کسی شعبے پر اتنا اعتراض نہیں کیا گیا۔ جتنا کہ جنسیات سے متعلق ادب پر کیا گیا ہے۔ یہ اعتراض ایک حد تک ٹھیک بھی ہے گر وسعت نظری سے کام لینے کے بعد ہمیں معلوم ہوگا کہ ادب میں عریانی آج کی چیز نہیں۔ پرانے شاعروں اور پرانے نثر نگاروں اور پرانے ادیبوں نے جنسیات ہی سے متعلق لکھا ہے۔ دنیا کا بہترین ادب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ کرشن چندر نے وضاحت سے لکھا ہے "میں دنیا کے بہترین ادیبوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ شکسپیر سے لیکر روڈن تک، گوئٹے سے لیکر ٹیگور تک۔ پرانے آریائی گیتوں سے لیکر کالیداس تک، ولی دکنی سے لیکر جگر مراد آبادی تک ہمارے دنیا کے بہترین ادب کا مرجع و مرکز عورت کی ذات ہے۔ ہر غزل گو اپنی غزل کے ہر دوسرے تیسرے شعر میں شربت وصل کا پیاسا نظر آتا ہے۔ اس پر بھی لوگ ترقی پسند ادب پر عریانی کا الزام لگاتے ہیں۔ درحالیکہ ترقی پسند ادیبوں نے عورت کی اہمیت کو اپنے ادب میں پچاس فی صدی کم کر دیا ہے۔ وہ پرانے ادیبوں کی طرح شربت وصل کا رونا نہیں روتے۔ پانی، روٹی، دھوپ، ایک کھلا مکان، صاف ستھرے کارخانے اور شہروں سے لائے ہوئے تمدن، کلچر، انسانیت، محبت، اشتراک عمل سب چیزیں ہیں جن سے ایک نئی دنیا تعمیر ہو سکتی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے یہاں تو اعتراض کرنا مقصود ہے۔ سمجھنا اور سمجھ کر اعتراض کرنا رجعت پسندوں کی طبیعت میں داخل نہیں ——"

غرض کہ ہماری افسانہ نگاری نے باوجود ہزار مشکلات کے بہت جلدی ترقی کی منزلیں طے کی ہیں اور اب ہر ملک کی افسانہ نگاری کے دوش بدوش کھڑی ہو سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا چراغ مغربی افسانہ نگاری سے روشن ہوا ہے لیکن بقول ندیم کے "ہم نے فن کی باریکیاں مغرب سے مستعار لی ہیں لیکن

"ہم نے فن کے خطوں میں ہندوستانی رنگوں کو سمایا ہے۔ ہم نے اپنے دیہات کی گلی سڑی لاشوں پر سے ریشمی کفن اتار ہیں۔ ہم گالیاں نہیں دیتے۔ سچائیاں بیان کرتے ہیں۔ ہم عریانی کے شیدا نہیں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ سطح پر تیرنے کی بجائے تہوں میں جائیے۔ زندگی عمیق ہے اور صاف ستھری سطح پر تیرنے والوں کو یہ احساس دلانا بہت ضروری ہے کہ تہوں میں چٹانیں بھی ہیں اور وہ خوفناک روئیدگی بھی جس میں زندگی پھڑپھڑا رہی ہے ——"

بیشک اس میں زندگی کے اتھاہ ساگر کی سی گہرائیاں ہیں۔ اس میں مچلتے ہوئے جذبات و احساسات کی سی بیتابی تڑپ ہے غرض اس میں سب کچھ ہے۔

نئے ادب میں بلاشبہ ایک چیز کی کمی ہے اور وہ ہے طربیہ عناصر۔ نئے ادب میں شاعری نشاطیہ نہیں۔ اس کے نثری کارنامے مسرت آگیں نہیں بلکہ غمناک ہیں۔ انسانیت کے اس جلتے سلگتے دور میں۔ بدبودار لاشوں اور کراہتے ہوئے ڈھانچوں کی زندگی کی تصویریں۔ ادبار و تیرگی کی طویل داستان۔ انسانی معاشرت کا وحشتناک تجزیہ۔ یہ ہیں نئے ادب کے نثری کارنامے جنھیں پڑھ کر بعض اوقات طبیعت اکتا جاتی ہے اور جب ایک نئی دنیا کی

کی تلاش میں ان تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ ادب اسے پھر اسی دنیا میں کھینچ لاتا ہے اور اسے مجبور کرتا ہے کہ اپنے گرد و پیش کے ماحول پر غور کرے۔ بقول کرشن چندر۔

"اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جب تک کہ دنیا کی خوشیاں اور اس کے آرام ایک مخصوص کی سیل" طبقے "تک محدود رہیں گے اور انسانوں کی آبادی کا بیشتر حصہ ان سے محروم رہے گا۔ نیا ادب اسی کمی کو محسوس کرتا رہے گا اور ہر لحظہ اس محزون محرومی کی طرف آپ کی توجہ دلاتا رہے گا کیونکہ نیا ادب مرمریں محل کی پیداوار نہیں:

"مگر نئے ادب کی آنکھ صرف حسرت و یاس کے مناظر نہیں دیکھتی۔ محض افلاس و ادبار کی خوفناک کالی گھٹاؤں کا نظارہ نہیں کرتی بلکہ ان ہولناک تاریک گھٹاؤں کے پرے اس تابناک روشن لکیر کو بھی دیکھ رہی ہے جو زندگی کے لئے ایک نئی مشعل راہ ہے جو انسانی دکھوں کو کم کر دیتی ہے اور کائنات میں اجتماعی مسرت کی بنیاد رکھتی ہے اور انسانی حیات کی تاریکی میں تاروں کی روشن لکیر کھینچ دیتی ہے ــــ"

نجمہ سمیع اللہ شاہ

اڈیٹر: قاضی عبدالغفار

گزشتہ چند سال میں ترقی پسند ادب کی تحریک نے اتنی کافی ترقی کر لی ہے کہ اس کی ترجمانی کے لئے متعدد رسائل کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ چنانچہ اس خیال کے پیش نظر حیدرآباد سے ایک معیاری سہ ماہی رسالہ "نیا زمانہ" جاری کیا گیا ہے جسے بعض مشاہیر اہل قلم مثلاً ڈاکٹر عبدالحلیم، پروفیسر احتشام حسین، کرشن چندر اور فضل الرحمن صاحب (حیدرآباد) کی عملی تائید حاصل ہے۔

اس کا پہلا شمارہ اواخر اپریل میں شائع ہوگا۔ ہمیں توقع ہے کہ ملک کے وہ اہل قلم جنھیں اردو ادب اور خصوصاً ترقی پسند ادبی رجحانات سے ہمدردی ہے اس طرف توجہ کر کے جلد از جلد افسانے، مضامین اور نظمیں عنایت فرما کر اپنے مشوروں سے ہمیں مستفید ہونے کا موقع دیں گے۔

یکّے میں

میں عجلت عجلت سے رخصت ہوا اور جھپٹ کر یکے پر سوار ہو چل پڑا۔ چلتے یکے میں اکیلا بیٹھا سوچنے لگا، تم بھی آدمی ہو، وقت پر کچھ نہیں کر سکتے۔ پھر سوچتے ہو کیوں نہیں کر سکے؟ بیٹھے سوچا کرو، کچھ نہیں تم سکے ہو۔ ہاں تو سید صامتہ اٹھا کے چلتے چلے آئے، زرگوں کے چہرے تو پھولے ہوتے۔

اب یکہ چل رہا تھا اور یکہ بان اپنے مریل گھوڑے کو ٹک ٹک کرتا چلا رہا تھا۔ گھوڑا الھڑ یہ لو یکے کے بوجھ کو ذرا جلدی کھینچتا پھر اپنی رفتار پر آ جاتا۔ اور بنارس کی سڑک اور گلی اس طرح پا زہوتی جا رہی تھی۔

سوچا۔ یہ کیا بات ہے جی کہ کہیں جاؤ اور پھر وہاں سے آ جاؤ۔ پہلے تو کہیں جاؤ ہی کیوں؟ اور اگر چل ہی پڑے اور پہنچ ہی گئے تو پھر وہاں سے آ جانا کیوں ضروری ہو جانا چاہیے؟ نہیں نہیں یہ سب گڑبڑ ہے...... یہ سب تماشا ہے۔" اور میں نے گرنے سے بچنے کے لئے ایک دم یکے کا ڈنڈا پکڑ لیا۔ کہا "ٹھیک سے کیوں نہیں چلاتا رے یکہ" بولا "بابو جی جنگی کی میونسپلٹی میں لکچر ہوت ہے۔ اور سڑکن میں گڑھے پڑے جاتے رہیں۔" میں نے کہا "گاڑی کے لئے تھوڑا وقت ہے ذرا یکہ بڑھائے چل۔" اس نے کہا "ہو...... ٹک ٹک اور گھوڑے کے کھڑے دائیں کان پر چابک کا تسمہ بھی زور سے مارا۔ گھوڑا اگلے پیروں پر زور دے کر آگے بڑھا۔ دوڑا اور پھر پہلے کی طرح مدھم ہو گیا۔ میں پاس رکھے بلندے پر کہنی ٹیک کر اور ٹھوڑی ہتیلی پر رکھ کر دیکھنے لگا۔ یہ مقام مذہب کی جنم بھومی ہے اس کے چاروں طرف کھیت ہیں اور باغیچے بھی۔ یہ لال تین منزلہ مکان کیسے خوبصورت ڈیزائن کا بنا ہے۔ اور یہ عورتیں روز سامنے کے اس تین منزلہ خوبصورت مکان کو دیکھتی ہیں، ہنس ہنس کر اپنی نوکریاں تھتی ہیں، گالیاں بکتی ہیں۔ اپنے مردوں کو لیکر اپنے بند گھروں کے اندر پھوس، گدڑ کو اوڑھنا بچھونا بنا کر سوتی ہیں اور رات

کاٹ دیتی ہیں۔ اور پھر دن میں آکر اس لال محل کی عمراتی اٹھان کے سامنے ہنستی اور چہل کرتی اپنا گوبر پاتھی اور نوکریاں بنتی ہیں اور ہم کہتے ہیں محبت ——— محبت کے ساتھ کہتے ہیں، گلاب، بلبل، شراب، مخمل کے تکئے کھڑے آئینے اور ——— کہتے ہیں فراق، اشتیاق، آرزو، کسک، ٹیس، آہ، آنسو، آگ وغیرہ کہتے ہیں حسن، اجمالیات اور آرٹ...... لیکن یہ عورتیں بچوں کو لیکر ان گنت بچے جنتی ہیں۔ گوبر پاتھتی ہیں اور نوکریاں بنتی ہیں۔ ہنستی ہیں اور لڑ جھگڑ کر رہتی ہیں گالی گلوچ کرتی رہتی ہیں...... اور یہ مقدس شہر ہے اور بارونق اور خوبصورت بھی تو ہے!

میں نے کہا "کیوں رے یہ یکہ اور گھوڑا...... کیا اسی لئے تو نے چلا چلا کر مجھے اپنے یکہ پر بلا کر بٹھایا۔ گاڑی نہ ملی تو تجھے دھیلا بھی نہ ملے گا۔"

یکے والے نے چابک سرایا اور ایک کس مارا۔ ایک فحش گالی دی، گھوڑے نے دو لتی جھاڑی اور پھر دوڑنے لگا۔ یکہ والے نے کہا واہ میرے بیٹے ——— اور اپنے بیٹے کے پٹھے پر پیار کے چار تھپکے دیئے۔

میں نے دیکھا چابک کی چوٹ پر گھوڑا ایک بار کھنچ کر دولتی جھاڑتا ہے لیکن میں نے یہ بھی تو دیکھا کہ پیار کی تھپکیوں پر فوراً ہی اس کے بدن پر مسرت دوڑنے لگتی ہے، کھڑے کان کھڑے رونگٹوں کی طرح کانپتے ہیں اور اس کی چال میں تیزی آ جاتی ہے، کیونکہ اس نے جو سن لیا ہے۔ واہ میرے بیٹے! وہ اچھلتا ہوا پیچھے یکہ کے بوجھ کو کھینچتا خوشی سے بھاگتا چلا جا رہا ہے۔

سوچا، چابک کی چوٹ کیا جھوٹ ہے؟ ورنہ کیا پھر پیار کی تھپکیاں جھوٹ نہیں؟ ایک ہی یکہ والا اپنے گھوڑے کو کوڑا مارتا ہے اور بیٹا کہہ کر پکارتا ہے، اس میں کونسی بات جھوٹ ہے اور کونسی سچ؟ کس بات میں وہ یکہ والا زیادہ واضح اور ظاہر

ہے۔ میں نے یکہ والے کو غور سے دیکھا چہرے پر کچھ شکن موجود تھے جن سے یہ جاننا مشکل تھا کہ کونسی شکن کیا ظاہر کرتی ہے۔ ماتھا کم تھا اور بھاری بھویں گھنی ہوکر آنکھوں پر چھجے کی طرح چھائی تھیں۔ اور ٹھوڑی کی نوک لٹکتی جا رہی تھی۔ میں نے کہا "کب سے بنارس میں رہتے ہو؟"

اس نے کہا "بابو دس ہوگئے۔ تب ہی سے یہ جناور (جانور) میرے پاس ہے کبھوا تنے دگا (دغا) نہیں دی۔ بیچارا جناور ہے" کہہ کر پھر گھوڑے کو جو دھیما ہو رہا تھا، گالی دیکر ایک کوڑا گھما کر جمایا۔ "ہٹ تیرے سالے —" مجھ سے کہا "بابو پورے دس ہوگئے اور ہم یہاں پیڑی در پیڑی رہت آوت رہیں........ یہ جناور بڑا مضبوط ہے" اور میں یکہ کے بیچ میں بیٹھا سڑک پار کرتا ہوا ریل کے اسٹیشن کے قریب کھنچا ہوا جا رہا تھا۔

"کیوں جی یہ کیا ہے؟ ابھی بنارس اور ابھی ٹکٹ لیا؟ ریل میں بیٹھے اور کل دلی — کیوں کل دلی اور آج بنارس؟ کیوں ہر روز ایک ہی مقام پر نہیں؟ اور کیوں نہ پوری طرح چین اور سکون نہیں؟ کہ کس لئے ایک ہی جگہ مطمئن رہا جائے؟..... مطمئن ہی کیوں رہا جائے؟ کیوں نہ یہاں سے وہاں بھاگتے پھریں اور ایک دن آئے کہ جہاں ہوں وہیں ٹھنڈے ہوکر ڈھیر ہوجائیں۔ آخر یہی تو ہونا ہے پھر کیوں نہیں" اور کیا وہاں — یہ ریل بھی تو عجب تماشا ہے چھک چھک کرتی ہوئی آکر کھڑی ہوجاتی ہے اور کہتی ہے "آؤ لوگو یہاں سے وہاں چلو" اور پانچ دس منٹ بیچاری چپ چاپ انتظار میں کھڑی رہتی ہے اور جو لوگ آتے رہیں انھیں اپنے پیٹ میں لے کر چھک چھک کرتی پھر چل پڑتی ہے اسے اس کے سوا کچھ کام ہی نہیں ہر جگہ جا کر یہی کہتی ہے "یہاں سے چلو وہاں" اور لوگ اسی تبدیل مقام اور آواگون کو کہتے ہیں "ہم کام کر رہے ہیں" اسی کو توسط بنا کر کہتے ہیں ہم تجارت کر رہے ہیں، اصلاح کر رہے ہیں، تبلیغ کر رہے ہیں، پرچار کر رہے ہیں، احسان کر رہے ہیں تغیر و تبدیلی کر رہے ہیں ہم کام کر رہے ہیں۔

اب کے زور سے میرا سر بکس رکھے اپنے بستر کے پلندے میں لگا خیر ہوئی کہ ٹرنک میں نہیں لگا۔ خیال آیا۔ دنیا خیالی نہیں ہے۔ یہ تو بنارس کا یکہ ہے اور بنارس کی سڑک ہے اس لئے اگر خیالی جانور بن کر بیٹھوں گا تو سخت غلطی کا مرتکب ہوں گا۔

میں نے کہا "سنبھال کر کیوں نہیں چلاتا رے یکہ" اور میں سنبھل سنبھال کر کنارہ ہو بیٹھا۔ دیکھتا ہوں کہ سڑک کو پار ہونے کی جلدی نہیں ہے یکہ کے نیچے سے گہرے چیچک کے داغ کے گڑھا ہونے والی یہ بڑھیا خالہ سڑک بڑی دھیمی دھیمی چال سے کھسک رہی ہے۔

میں نے کہا "یکہ بڑھاتا ہے کہ ریل نکالنے کی دھن میں ہے..... ریل نکلی کہ پھر تو ہے اور میں۔" اس نے گھوڑے کی پونچھ کے پاس ہاتھ لگا کر کہا ہو..... ہر ٹک..... تاب..... مجھ سے کہا "بابو کہاں جاؤ گے؟"

میں نے خوشی سے کہا۔ دلی۔

"دلی" اور وہ مجھے آنکھ پھاڑ کر دیکھنے لگا "بابو دلی! اس نے سمجھا ہوگا سونے سے کہیں کم قیمتی دھات دلی کی سڑکوں میں لگی ہوئی ہے۔ ایک پل کی بڑی عظمت سے چونکے ہوں گے اس کے تعجب کے بعد پوچھا "بابو تھارے ہاں کیا روزگار ہوت ہے"

میں نے کہا "چلو۔ چلو۔ یکہ چلاؤ —" یکہ رک رہا تھا۔ اور چل پڑا۔ "بابو دلی میں مغل کے بادشاہ رہت تھے۔ وہی دلی۔ وہاں کلا ہے؟"

میں نے کہا "ہاں وہی دلی" وہاں قلعہ ہے اور چاندنی چوک بھی ہے۔

"چاندنی چوک"؟

"خوب چوڑی..... پکی ہموار سڑک ہے ٹرامیں چلتی ہیں بڑی رونق ہے۔ تم نے نہیں دیکھی؟"

"بابو ہمارے چوک سے بھی بڑھیا ہے؟"

"ارے دنیا میں ایک ہے"

"اچھا! — اور وہ اپنے گھوڑے کی طرف دیکھ کر بولا "چل، بیٹے شاباش"۔

اس اجنبی و جاہل شخص کے دل میں دلی کی اہمیت جگا کر

مئے سہ آتشہ

مطمئن تھا ہیں پراگندہ دل انسانوں میں
لکھ لیا کس نے مرا نام غزل خوانوں میں

ڈھونڈتی ہیں مری نظریں انھیں ہر سو لیکن
وہ یگانوں میں نظر آئے نہ بیگانوں میں

میرے افسانۂ دل کے یہ پریشاں اوراق!
ذکر ہے ان کی بھی زلفوں کا پریشانوں میں

چوٹیاں جلوہ گہہ دوست کی چھو لیں اب بھی
جان اتنی ہے مرے غمزدہ ارمانوں میں

وہ بڑے لوگ ہیں افسانہ جو بن کر رہ جائیں
ایسے ولیوں کا نہیں نام بھی افسانوں میں

ہائے ہم سوختہ دل کیوں ہیں ادھر ہی نگراں
ایسی کیا بات ہے جلتے ہوئے پروانوں میں

کبھی شیریں کبھی پرویں کبھی کچھ ہیں کبھی کچھ
روپ وہ دھارتے رہتے ہیں پرستانوں میں

میری آنکھیں ہی نہیں حسن کے دیوانوں میں
میرا دل بھی ہے محبت کے نگہبانوں میں

ان کا ہم رنگ ہے ماحول گلستانوں کا
خود وہ کب رنگ جماتے ہیں گلستانوں میں

ماہِ نو چھپ بھی گیا ہم نے ادھر رخ نہ کیا
ہائے یہ جذب حسینوں کے گریبانوں میں

ان کی ان سرکشیوں میں ہیں بہت دلکشیاں
پھر دو تن تنکے یہ کہتے ہیں گلستانوں میں

پھر گلگشت اگر سرو قد آیا نہ کریں
خاک اڑا جائیں بگولے چمنستانوں میں

اُف پسینہ کے یہ قطرے یہ حیا وقتِ کرم
کیا خدا داد مزے ہیں ترے احسانوں میں

میں ترے حسن کے معیار پہ جانچوں انھیں کیا
مہر و مہ خود نظر آتے ہیں پشیمانوں میں

حسن پردوں میں نقابوں میں شبستانوں میں
جگمگاتا ہے یہ عنوان کئی عنوانوں میں

نہ تجلی نہ تبسم نہ سزا ہے نہ جزا
دھوم ہی دھوم ہے کچھ بھی نہیں بت خانوں میں

خود وہ کہتے ہیں کہ مجھ سا کوئی ہشیار نہیں
عمر کہتی ہے کہ گنئے ابھی نادانوں میں

ان بتوں کا بھی ہمیں ڈر نہیں اللہ اللہ
نام اللہ کا جپتے ہیں صنم خانوں میں

چپکے چپکے بتِ کافر کی بھی پوجا کر لی
کافرانہ اثر آتا ہے مسلمانوں میں

رازِ اصنام کھلے ہم پہ خدا جانے کب
مسجدوں سے ابھی اٹھ آئے ہیں بت خانوں میں

خوش دلوں کی یہ نہیں بزم جنابِ منظور
سہم کر بیٹھیے بیٹھے ہوئے انسانوں میں

علی منظور

عزیزی مدیر "سب رس"

(ایک خط)

بعد مدت مدید اور عرصہ بعید کے السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ کیا معنی کہ اس طویل عرصہ میں آپ کے خیال و تصور اور آپ کی اطلاعات سے مجھے خدا جانے کن کن صورتوں میں پیش کیا ہوگا اور محسوس کرایا ہو کا ممکن ہے کہ میری اس طویل غیر حاضری کو جناب نے میری چار بیویوں کا وبا و تصور کیا ہو مگر عزیز از جان مدیر "سب رس" یہ کچھ بھی نہ تھا بلکہ معاملہ یہ تھا کہ مجھ میں یہ بات گورنمنٹ آف انڈیا نے کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے کہ جس کام کو ہاتھ میں لو اس کو حد ادب تک پہنچا کر چھوڑو اس لئے میں کم نہ زیادہ پورے تین کاموں میں لگا تار بھی و منہمک رہا۔

پہلا کام یہ کیا کہ ناقدر دان قوم کے ماحول سے جو مالی نقصانات پہنچے ان کو پورا کرنے کے لئے اور غم سے نجات حاصل کرنے کے لئے ایک "بکرا بکری الیوسی ایشن" قائم کی اور ایک "مرغا مرغی کلب"۔ "بکرا بکری الیوسی ایشن" کا بقلم خود صدر تھا اور ناظم بھی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسا کہ یورپ میں بعض اوقات وزیر اعظم ہی وزیر جنگ بھی ہوتا ہے چاہے وہ توپ تو توپ کی جگہ پٹاخہ بھی قاعدہ سے نہ چلا سکتا ہو اور مرغا مرغی کلب کا صدر بیوی نمبر ۳ کو اور ناظم بیوی نمبر ایک کو بنایا۔ امید تھی کہ میں بکرا بکری الیوسی ایشن کے اور بیویاں مرغا مرغی کلب سے تین چار سال کا بجٹ عرف میزانیہ درست کر لیں گی مگر بیوی نمبر ۳ کے کلہم انگریزی داں ہونے سے یہ نقصان پہنچا کہ اس غریب نے ہر کام میں یورپ والوں کے کاموں کی نقل کی اور اس نقالی کا نام اس نے "ترقی" اور "روشن خیالی" رکھا اگرچہ میں نے ثابت کر دیا کہ دیکھو یورپ اپنی جس چیز کو ایشیا، وا آفریقہ والوں میں مقبول بنانا چاہتا ہے اس پر پہلے شاندار اور "دلکش الفاظ" کا غلاف چڑھا دیتا ہے جیسا کہ یورپ کی تعلیم پائے ہوئے کو "اعلیٰ تعلیم یافتہ" کہتے ہیں اور باقی تمام تعلیموں کے ماہر کو "ادنیٰ تعلیم یافتہ" علیٰ ہذا اسی طرح اگر تم نے ہندوستان میں مرغا مرغیوں کے کلب کو بھی یورپی اصول پر چلایا تو انشاء اللہ تعالیٰ ناکام رہو گی مگر آخر کار بیوی نمبر ۳ گریجویٹ ہی تو تھی مذاق تو تھی نہیں بس بھائی جان اس اٹھکی انگریزی داں بی بی نے امریکہ اور انگلستان تک کے تمام مرغا مرغیوں کے رسالے پمفلٹ کتابیں اور ضوابط منگا کر جو اس کلب میں رائج فرمائے تو اب زیادہ کیا عرض کروں بیوی نمبر ایک کے پاس تو دس پانچ دیسی مرغا مرغی ہیں بھی لیکن بیوی نمبر ۳ کے پاس کلہم ایک ریڈیو ہے سو الحمد للہ کہ وہ بھی انہی کے میکے میں کیونکہ بفضل خدا آپ نے تو مجھے کل ہی ناگپور میں دیکھا تھا۔ میں نے تو اپنے محلے تک میں یورپ کی ایک چیز کو نہیں آنے دیا۔ اب رہی میری "بکرا بکری الیوسی ایشن" سو خدا کے فضل سے وہ برابر ترقی کر رہی ہے۔ نتیجہ میں اب مجھے تو سوجھتی ہے بکرا بکریوں کے فائدے اور ترقی کی اور آپ چاہتے ہیں قوم اور ادب کی ترقی کی اس لئے میں لکھتا تو کیا اور پیش کرتا تو کیا اور یہ آپ ہرگز برداشت نہ کرتے کہ میں "سب رس" میں مضمون کے بجائے آپ کو ایک بڑے بڑے سینگ کا بکرا بھیج دیتا!

دوسرا کام میں نے یہ کیا کہ علم نجوم اور پامسٹری کو میں نے اتنا رگیدا کہ اب یہ دونوں میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں وہ تو اونٹ کے ذریعہ یورپ جانا اب تک ممکن نہیں ہو سکا ورنہ ان علوم میں یورپ تک کے ناک کان کاٹ کر آپ کو لا دیتا تب آپ فرماتے کہ بے شبہ ملا رموزی نہ تھا مضمون نگار نہیں بلکہ صدر "بکرا بکری الیوسی ایشن" اور منیجم بھی ہے۔

تیسرا کام میں نے یہ کیا کہ عورت ذات پر میں نے ایک ہی سانس میں یہاں سے لیکر لندن تک کے برابر طویل

تین کتابیں لکھ دیں کیا معنی کہ میں نے یورپ کی کتابوں کے ترجموں اور حوالوں سے نہیں بلکہ بقلم خود تحقیق کر کے اس راز کا پتہ چلا ہی لیا کہ یہ آخر کار عورت کو مرد کے برابر ثابت کرنے اور مرد کی طرح کے کام لینے اور عہدے دینے کی چال سب سے پہلے کس نے چلی؟

امید کہ آں محترم بھی بخیریت ہوں گے خورد و کلاں اور پرسان حال کو درجہ بدرجہ سلام۔

مکرر آنکہ

اگر جناب زور قادری صاحب بعد نماز جمعہ مل جائیں تو قرماوجب مگر اس کو ماحضر سمجھ کر تناول کا شرف نہ عطا فرمادیجئے گا۔

سہ کرر آنکہ

میں نے سنا ہے کہ دنیا میں سب کچھ علی حالہ پیدا ہونے پر بھی جو قحط پڑے گا اس سے آپ ضرور محفوظ رہیں گے تو اگر ایسا کوئی تعویذ جناب کے پاس ہو تو براہ کرم ایک تفصیل اس کی!

چہار کرر آنکہ۔

سنا ہے کہ اب ریل گاڑیوں سے زیادہ ہوائی جہازوں کا چلن ہوگا لہذا اگر ایسا ہو تو ایک دن کے لئے آپ میرے "امیر خانے پر" بھی اگر نزول اجلال فرمائیں تو زہے مکرا بکری نوازی۔

پنج کرر آنکہ! اگر کہیں اخبار "رہبر دکن" کے کارکن مل جائیں تو ان سے میرا دست بستہ آداب ضرور کہہ دیجئے گا زیادہ حد ادب۔

شش کرر آنکہ

"سب رس" مجھے عزیز ہے اس لئے کہ اس کا تعلق آپ سے ہے اور میرے عزیز بھائی زور قادری صاحب سے اس لئے میں یقین دلاتا ہوں کہ میں اس میں لکھتا رہوں گا اور انشاء اللہ وہ لکھوں گا جو دوسروں کے سوچے ہوئے کا ترجمہ نہ ہو اور یہی بات آپ "سب رس" میں لکھنے والوں اور والیوں سے کہتے رہئے اور ان کو تاؤ دلانے کے لئے یہ بھی کہہ دیجئے کہ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک کی اردو میں یہ تنہا اپنا ملا رموزی ہی ہے جو دوسروں کے پیش کئے ہوئے "مسلک ادب" کو قبول کرتا نہ "مسلک علم و سیاست" کو بلکہ وہ سب کچھ اپنا ہی غور کیا ہوا لکھتا ہے اور کہتا ہے اور بدبختی سے اردو کے ذخائر اسی اپنے سوچے ہوئے اور اپنے پیدا کئے ہونے سے محروم ہیں یقین نہ ہو تو اس کی جملہ کتب ادب و کتب علم کو ملاحظہ فرما لیجئے، امید کہ اس تھوڑے کہے کو بہت جان کر آپ ایسے ادیب پیدا کریں گے جو دوسروں کے مسالک کے پیرو ہونے کے عوض بقلم خود کسی مسلک ادب کے خالق و موجد ہوں گے اور ہاں بھئی یہ تو فرمائیے کہ کیا آپ کی طرف بھی بارش ہوئی ہے میری طرف تو اتنی ہوئی ہے کہ آج مبلغ ۱۹ مارچ ۱۹۴۶ء کو بھی صبح کے وقت میں چادر اوڑھ کر صبح کی نماز کے لئے اپنے محلہ کی مسجد میں گیا تھا زیادہ حد ادب۔

ملا رموزی

ہمارے قلمی معاونین سے

مندرجہ بالا خط کے آخری حصے میں حضرت ملا رموزی نے اپنے اچھوتے انفرادی انداز میں اردو کے لکھنے والوں کو اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ وہ دوسروں کی نقالی اور پیروی کرنے کی بجائے خود کسی خاص مسلک ادب کے موجد و خالق بنیں۔ ملا صاحب کے اس مشورہ کی اہمیت اور افادیت سے کون انکار کرسکتا ہے مگر افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے لکھنے والے اس طرف توجہ نہیں دیتے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنا ذاتی اسلوب پیدا کرنا بہت مشکل اور صبر آزما کام ہے لیکن اگر کوئی اس بات کا پکا ارادہ کرلے اور مسلسل مشق کرے تو یقیناً وہ اس مقصد میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ کسی زبان ادب کی ترقی کے لئے تخلیقی ادیبوں اور فن کاروں کا پیدا ہونا ضروری ہے ورنہ اس ادب میں (originators) کی بجائے صرف نقالی ہی نقالی رہے گی۔ شاہد

آثارِ اقبال

ہر ہائینس نازلی رفیعہ سلطان نواب بیگم صاحبہ (ریاست جزیرہ من مضافات بمبئی) نے ۱۹۰۸ء میں انگلستان، فرانس، سوئٹزرلینڈ، قسطنطنیہ اور مصر کا سفر کیا تھا۔ یہ سفر اپریل سے اکتوبر تک جاری رہا۔ نازلی رفیعہ بیگم صاحبہ کی خواہر محترمہ زہرا بیگم فیضی نے اپنی بہن کا روزنامچہ ترتیب دیا اور لاہور سے غالباً ۱۹۱۰ء میں شائع کرایا۔

جس زمانے میں نازلی رفیعہ صاحبہ لندن گئی ہوئی تھیں اسی زمانے میں حضرت اقبال بھی وہیں تشریف رکھتے تھے۔ رفیعہ صاحبہ اپنے روزنامچہ مورخہ بدھ ۲۰ مئی ۱۹۰۸ء کو لکھتی ہیں :-

"ڈاکٹر انصاری جو آزہر کے بھائی کے دوست ہیں اور بہت لائق آدمی ہیں، بمبئی میں ہمیں (کذا) ملنے آئے۔ اور بہت دیر تک ان سے باتیں ہوتیں رہیں۔ آپ اصل میں لکھنؤ (کذا) کے رہنے والے ہیں۔ یہاں انھیں ہز ہائی نس نظام دکن کی طرف سے وظیفہ ملتا ہے۔ سب امتحان پاس کر چکے ہیں۔ اور یہیں لندن میں انھیں کام مل گیا ہے۔ یہاں انھیں تین پونڈ (تین سو روپے) ماہوار ملتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کی بہت تعریف کرتے تھے۔ انھوں ایک دفعہ آئے تھے۔ مگر اس وقت حضور (رفیعہ صاحبہ کے شوہر) تشریف نہیں رکھتے تھے۔ حضور کو ان سے ملنے کا شوق ہے مگر پھر نہیں آئے۔"

ص ۲۶ کتاب مذکور روزنامچہ سفر یورپ

" پیر ۲۵ مئی ۱۹۰۸ء

...... اقبال بھی اسی شب کو آئے تھے۔ کھانا ہمیں کھایا۔ اور دیر تک دنیا بھر کی تاریخ اور فلسفہ کی گفتگو ہوتی رہی"

ص ۳۰

تیسری اور آخری مرتبہ اقبال کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:-

" ۱۰ جون ۱۹۰۸ء بدھ

...... میں نے ان عنایت فرماؤں کو چائے کی دعوت دی تھی جن کی مہمان داری سے فائدہ اٹھایا تھا...... مسٹر محمد اقبال موجود تھے...... کئی مہمانوں نے دستخطوں کی کتاب میں دستخط اور عبارتیں لکھیں۔ مسٹر اقبال نے اس روز یہ شعر فی البدیہہ کہہ کر میری کتاب میں درج کر دئے جنھیں میں نقل کرتی ہوں۔

اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر
اور فیضِ آستاں بوسی گل برسر قمر

روشنی لیکر تری موجِ غبارِ راہ سے
دیتا ہے لیلائے شب کو نور کی چادر قمر

کاروانِ قوم کو تجھ سے ہے زینت اس طرح
جس طرح گردوں پہ صدرِ محفلِ اختر قمر

شمعِ بزمِ اہلِ ملت را چراغِ طور کن
یعنی ظلمت خانۂ ما را سراپا نور کن

سید مبارز الدین رفعت

غزل

دیکھا نہ کچھ مذاقِ تماشا کے باوجود
ہوں بے نگاہ دیدۂ بینا کے باوجود

غمگین نہیں ہے دل غمِ دنیا کے باوجود
نشہ ہوا نہ تندیٔ صہبا کے باوجود

ہر پردۂ نظر سے ہوس جھانکتی رہی
تسکیں ملی نہ ترکِ تمنا کے باوجود

تقدیر کی شکست پہ ہے اک لطیفہ یہ
جینا تسلسلِ غمِ دنیا کے باوجود

ساحل سے ہے تعلقِ خاطر وہی مجھے
آغوشِ موج و دامنِ دریا کے باوجود

ہمدم نہیں رفیق نہیں مہرباں نہیں
تنہا ہے دل ہجومِ تمنا کے باوجود

پیرِ حرم سے پیرِ مغاں کے تعلقات
قائم ہیں پردۂ مئے و مینا کے باوجود

جورِ زمانہ سے کبھی ڈرنا نہ چاہیے
مرنا نہ چاہیے غمِ دنیا کے باوجود

تم میری زندگی میں بہاراں نہ کر سکے
اپنے تبسمِ چمن آرا کے باوجود

یک جائیاں نگاہ کی فطرت نہ جائیں گی
آوارگیٔ فکرِ تمنا کے باوجود

عبدالعزیز فطرت

غزل

ترکِ الفت کا اگر اذن ہے ایسا ہی سہی
آرزوؤں کے تسلسل میں بھی وقفہ ہی سہی

نہ سہی لطف و کرم وعدۂ فردا ہی سہی
التفاتِ نگہِ ناز کا دھوکا ہی سہی

شرحِ افسانۂ دل شکوۂ بے جا ہی سہی
آپ کے واسطے کچھ دیر تماشا ہی سہی

ڈھونڈھ لے گی نگہِ شوق تجھے حسنِ نہاں
راہ میں لاکھ حجابات کا پردہ ہی سہی

میں بھی گزرا ہوں محبت کے چمن زاروں سے
اب مرا جوششِ جنوں زینتِ صحرا ہی سہی

تجھ کو میں تیرے سوا دیکھوں گا آخر کب تک
یہ کرشمہ بھی تری جلوہ گری کا ہی سہی

اور بھڑکے گا بجھانے سے مرا شعلۂ دل
تیری مرضی ہے تو کچھ اور بہانہ ہی سہی

مجھ کو جینا ہے تو بس تیرے لئے جینا ہے
انقلاباتِ محبت کا سہارا ہی سہی

فاش کر رازِ جنوں بے خبری میں اشرف
پھر بہ عنوانِ دگر لغزشِ صہبا ہی سہی

علی اشرف

اسلوب بیان

اسلوب بیان تحریر کی جان ہے۔ کسی مضمون کے مطالعہ کے وقت جو چیز سب سے پہلے ہماری توجہ کی طالب ہوتی ہے وہ اس کا طرز تحریر ہے نفس مضمون کے دلچسپ اور غیر دلچسپ ہونے کا احساس بہت بعد کو ہوتا ہے۔ مضمون کا عنوان ہی درحقیقت مضمون سے نصف آگاہ کرتا ہے۔ اس نصف آگاہی کے بعد قاری اس کا منتظر نہیں رہتا کہ مضمون نگار کیا بات کہنا چاہتا ہے بلکہ غیر شعوری طور پر یہ معلوم کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے کہ وہ کونسا طریقۂ اظہار اختیار کرتا ہے بہت سے ایسے مضامین جن کے مطالعہ کی افادیت کا ہمیں احساس ہوتا ہے صرف اس وجہ سے ہم پڑھنا نہیں چاہتے کہ ہم سے اس کا ایک صفحہ بھی پڑھا نہیں جاتا برخلاف اس کے اکثر دفعہ ہم کوئی رسالہ یا کتاب اٹھا لیتے ہیں صرف عنوانات پر ایک سرسری نظر ڈالنے کی خاطر۔ دفعتاً کسی عنوان کے تحت ایک جملہ ہماری توجہ کو جذب کر لیتا ہے پھر دوسرا پہلے سے زیادہ جاذب توجہ ہوتا ہے' اس طرح مضمون ختم کرنے تک ہمیں چین نہیں پڑتا۔

ٹن ٹن "پگر مز پروگریس" کی ابتدا بغیر کسی تمہید کے اس طرح کرتا ہے کہ پڑھنے والا دو چار جملوں کے بعد ہی اپنے آپ کو مصنف کے قابو میں پاتا ہے۔ سیدھے سادے الفاظ چھوٹے چھوٹے جملے ایک طلسمی اثر پیدا کر دیتے ہیں جس کی فضا کتاب کی آخری سطر تک برابر قائم رہتی ہے۔ بجنوری کا مشہور مقدمہ "محاسن کلام غالب" اٹھا لیجئے۔

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں "مقدس وید" اور "دیوان غالب" لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں......"

یہ اچھوتی طرز تحریر ہمارے دل میں وہی جوش وہی عقیدت اور کلام غالب سے وہی محبت پیدا کرتی ہے جن کو بجنوری محسوس کرتے تھے۔

بہتر اسلوب بیان نہ صرف عبارت کو شگفتہ دلچسپ اور جاذب توجہ بناتا ہے بلکہ نفس مضمون کی کمزوریوں کی بھی بڑی حد تک تلافی کر دیتا ہے۔ بجنوری کے محاسن کلام غالب" میں ان کی غالب سے شدت عقیدت کی بنا پر جو مبالغہ کا عنصر بڑھ گیا ہے اور انھوں نے غالب کے خیالات کی جو جزادیں اور اشعار کے نئے نئے مطالب نکالنے میں جو موشگافیاں کیں اس کے باوجود اس دلکش مقدمے کی مقبولیت کسی طرح کم نہیں ہوئی۔ وہ حضرات بھی جنھوں نے اس پر سخت سست تنقیدیں کی ہیں اس کی دل پسند طرز تحریر اور جان دار اظہار بیان کا حظ اٹھانے کی خاطر اس کو بار بار پڑھتے رہتے ہیں۔ آب حیات کی اکثر روایتوں کو تاریخ ادب میں استناد کا درجہ حاصل نہیں مگر "آب حیات آج ہر ادب کے طالب علم کے لئے ایک تحفۂ زریں سے کم نہیں۔ "آزاد" کے جادو نگار قلم کی گلکاریاں پڑھنے والے پر ایک سحر سا کر دیتی ہیں اور اسے اس بات کی بالکل پرواہ نہیں رہتی کہ زیر نظر واقعات میں سے اکثر حقیقت سے بعید ہیں۔

داغ کی شاعری کا تجزیہ کیجئے: دو ہی چیزیں ملیں گی۔ " زبان و بیان "۔ وہی باتیں جو آپ دن بھر سوچتے کرتے اور بولتے رہتے ہیں آپ کے سامنے آتی ہیں اور آپ چونک پڑتے ہیں منہ سے واہ واہ نکل جاتی ہے:-

بغل میں داب کر تاب و تواں کو
کہاں کو اے دل ناداں کہاں کو

تو بھی کسی سے دل لگا ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی
کبھی تڑپا کے دل پہ ہاتھ رکھنا کبھی کہنا اسے یہ ہوگیا کیا

ہم تو مرتے ہیں ادا پر دلستاں ہو کوئی ہو
دوست دشمن مہرباں نامہرباں ہو کوئی ہو

غالب کی عظمت کا ایک بڑا راز اس کا انفرادی انداز بیان ہے ایک لحاظ سے غالب کی شاعری گزشتہ پورے دور غزل گوئی کی روح ہے غالب کی مضمون آفرینی اور اس کے فلسفیانہ نکات کو نظر انداز بھی کیجئے تو غزل گوئی کے

عام اور پامال موضوع گل و بلبل، سرو قمری، بہار، غم عشق بے مہری حبیب وغیرہ پر جو اس نے شعر لکھے ہیں ندرت بیان اور تنوع اظہار کی ان سے بہتر بہت کم مثالیں دیکھنے میں آئی ہیں:-

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا

مندرجہ ذیل اشعار کا انداز بیان دیکھئے۔ اردو غزل میں واقعی ایک بے بہا اضافہ ہے:-

ہے کس قدر ہلاک فریب وفائے گل
بلبل کے کاروبار پہ ہے خندہ ہائے گل

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں آ گیا
اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

خیالات ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتے ہیں ہر انسان کچھ نہ کچھ سوچتا ہی رہتا ہے چاہے اس کے سوچنے کی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ مگر ان خیالات کو بجنسہ خانۂ دل سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا بہت مشکل ہے اور ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ ایمرسن کہتا ہے "آدمی خود نصف ہے دوسرا نصف اس کا اظہار بیان ہے۔" آپ کو دنیا میں آدھے آدمی بہت نظر آئیں گے اور مکمل انسان بہت کم۔

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا!

لیکن خیالات کے اظہار ہی پر بات ختم نہیں ہوتی سب سے بڑا مشکل مرحلہ ان خیالات کو سلیقے سے ان کی تازگی کھوئے بغیر پیش کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم سوچ بہت لیتے ہیں مگر مافی الضمیر کے اظہار میں وہ دلچسپی رنگینی اور لطافت نہیں پیدا کر سکتے جس کو ہم سوچتے وقت محسوس کرتے ہیں۔

انگریزی میں کہا گیا ہے (Style is The man) اسٹائل آدمی کا جوہر خاص ہے ایک اور مثل ہے (Style is The index of personality) اسٹائل آدمی کی ذات کا آئینہ دار ہے۔ دراصل طبائع کے ساتھ ساتھ طرز بیان بھی بدلتا جاتا ہے کسی کا لہجہ سست اور کسی کا چست کوئی نرم اور کوئی گرم ہوتا ہے کسی کا اسلوب بیان رواں دواں ہوتا ہے اور کسی کی طرز تحریر یہ بتلا دیتی ہے کہ لکھنے والا خود سوچ سوچ کر لکھ رہا ہے اور پڑھنے والوں سے بھی اسی غور و فکر کا طالب ہے بعض مصنف تحریر کی ابتدا ہی میں بتا دیتے ہیں کہ وہ کیا ہیں اور بعض کی طبیعت کا کھوج لگانا پورا مضمون پڑھ لینے کے بعد بھی مشکل نظر آتا ہے۔

اسلوب بیان درحقیقت آدمی کی طبیعت کا آئینہ دار ہوتا ہے ہر ادیب اپنی زبان کو بالکل اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے طرز بیان ایک بالکل ذاتی خصوصیت ہے ہر ایک کا اسلوب دوسرے سے بالکل جدا ہوتا ہے الفاظ کے انتخاب میں ترتیب محاورات جملوں کی ترکیب اور فقروں کی بندش میں ہر ایک اپنے انفرادی ذوق کا پابند ہوتا ہے۔ کارلائل کہتا ہے "اسلوب بیان انشا پرداز کا لباس نہیں پوست ہے" ایک اور مشہور ادیب کا کہنا ہے کہ "ادب زبان کے ذاتی استعمال کا دوسرا نام ہے" اسلوب بیان کا غائر مطالعہ ہمیں انشا پرداز کی ذات سے بہت قریب کر دیتا ہے اس آئینہ میں ہم کو نہ صرف اس کی ذات کا عکس نظر آتا ہے بلکہ اس کی دماغی اور روحانی نشو و نما کا خاکہ بھی مل جاتا ہے اس کے ماحول کے وہ تمام اثرات جنھوں نے اس کی حیات کی تعمیر میں حصہ لیا ہے ضرور اس کے اسٹائل کی ترکیب میں بھی حصہ لیں گے بالفاظ دیگر اس کا اسلوب بیان اس کی تمام جسمانی اور ذہنی تجربات کا آئینہ دار ہوگا۔

مکالے کی "تاریخ انگلستان" لیجئے جس کی تاریخی اہمیت کم اور ادبی اہمیت زیادہ ہے تاریخی واقعات اور کردار کے متعلق مکالے نے جو کچھ لکھا ہے وہ واقعی سطحی ہے مکالے خود کوئی بڑا مفکر نہیں تھا مگر اس کی جدت طرازی واقعیت پسندی اپنے دور کی مادیت پرستی سے پُر جوش اعتقاد اور ہر چیز کو سیدھے سوچنے اور سمجھنے کا شوق یہی چیزیں اس کے انداز بیان کو متنوع روشن اور پُر زور بنا گئیں۔

مکالے ہر چیز کو واضح طور پر سوچنے اور کہنے کا قائل تھا اس کا خیال اس کی دلیل سے زیادہ واضح ہوتا تھا اس کے اسلوب بیان کے پرزور ہونے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ ہر بات جس کو وہ کہتا اس پر پورا پورا اعتماد ہونا چاہیے اس کی صحت کے متعلق شبہ ہی کیوں نہ ہو تمسکر سے کہتا ہے۔ "میں چاہتا ہوں کہ کسی چیز کے متعلق بھی مجھے ایسا یقین حاصل ہو جائے جیسا کہ مکالے کو ہر چیز کے متعلق ہے"۔ ڈبلیو۔ ایچ رونا W. H. (R onae) نے مکالے کے اسٹائل کو پسٹل شاٹ اسٹائل (Pistol Shot Style) کہا ہے۔

برخلاف مکالے کے رسکن کی طبیعت کی نرمی حق پرستی روحانیت پر اعتقاد اور اپنے ماحول کی "مادیت پرستی" سے نفرت نے اس کے لہجہ کو بھی نرم اور پاکیزہ کر دیا، اس کی عبارت ان مصوروں کی تصاویر سے زیادہ رنگین اور دلکش ہے جن کے متعلق اس نے خامہ فرسائی کی ہے۔

حالی کی طبیعت کی متانت ان کی ہمیشہ محتاط رہنے کی عادت اور سنجیدگی ان کے انداز بیان میں ہر جگہ جھلکتی ہے۔ میر انیس کی طبیعت کی نفاست اور پاکیزگی مزاج کا ثبوت ان کے مراثی کے ہر شعر سے ملتا ہے جس طرح زندگی میں وہ سلیقہ اور نفاست کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیتے اسی طرح شعر کہتے وقت بلاغت و فصاحت سے کوئی مصرعہ باہر نہ ہونے دیتے۔ آزاد کی طبیعت کا بانکپن اٹھان، جوش و خروش اور ان کی نزاکت طبع کا شاہد "آب حیات" کا ایک ایک جملہ ہے ہر بات کو وہ ایک خاص انداز سے کہتے تھے رنگینی پیدا کئے بغیر انھیں کچھ کہنا شاید اچھا نہ معلوم ہوتا تھا تکلف اور شوخی ان کی عبارت کی خاص خصوصیت ہے ایک جگہ جنگ کی تیاریوں کی تصویر یوں کھینچتے ہیں:-

"خلوت کے چمن میں حکم ہوا کہ مشورت کی بلبلیں آئیں کہ ہنگامہ کے لئے کیا صلاح ہے بعض کا زمزمہ ہوا کہ برسات میں ملک مقبوضہ کا بند و بست ہو جاڑے کی آمد میں ہنگامہ پرخونریزی سے گلزار کا خاکہ ڈالا جائے۔ بعض نے نغمہ سرائی کی کہ غنیم دم نہ لینے دے اڑ جائیں اور پھر یہی کیاری ہو جائے کہ یہی بہار رہے فتح کے گلچیں اور سلطنت کے باغباں نے کہا کہ ہاں یہی ہانک ہے"۔

کلام ذوق کے متعلق آب حیات میں لکھتے ہیں:-

"جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔ جن کی خوشبو شہرت عام بن کر جہاں میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے تارے آسمان سے اتارے ہیں "ملک الشعراء" کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس پر یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا"۔

اسلوب بیان اور مضمون بالکل علیحدہ چیزیں ہیں۔ اسلوب بیان کی اہمیت مضمون کے اختصار کے ساتھ بڑھ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ چھوٹے مضمون میں تفصیل کا موقع نہیں ملتا طویل بحث اور مباحثے اور دلائل کے لئے گنجائش نہیں رہتی۔ صاحب مضمون کو اختصار سے کام لینا ناگزیر ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ کہیں مضمون میں تشنگی نہ پیدا ہو جائے

یا کہیں اختصار مطلب سے عبارت خشک اور بے مزہ نہ ہوجائے۔
حسن نظامی طویل اور خشک تمہید کے بغیر مضمون کو یکایک شروع
کردیتے ہیں۔ حسن نظامی صاحب کے مضمون میں کوئی اعلیٰ اور
اچھوتے خیالات ہمیں نہیں ملتے نہ ہمیں کسی نئے انکشاف کا
اس میں علم ہوتا ہے۔ پورا مضمون پڑھ لینے کے بعد اگر ہم
خاموشی سے غور کریں تو اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہمیں
کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوئی۔ مگر ہمارے لطف میں اس سے
کوئی فرق نہیں پڑتا ہماری حیرت بدستور قائم رہتی ہے کہ
کس طرح بات میں سے بات نکلتی چلی گئی عبارت تھی کہ
ایک جوئے شیریں کا سرود رواں۔

مگر یہ طرز تحریر طویل ناول افسانہ یا مضمون کے لئے
جس میں اہم مسائل سے بحث کرنا ہو موزوں نہیں۔ کیونکہ
اس وقت بیان کی سادگی اور عبارت کا سلجھاؤ بالکل کافی
ہوتا ہے۔ اگر انشاء پرداز انداز بیان میں لطف و رنگ
پیدا کرنے میں محو ہوجائے تو اصل مطلب کے خبط ہوجانے کا
اندیشہ ہوجاتا ہے جیسا کہ "آب حیات" میں آزاد نے کیا
ہے پریم چند کا انداز بیان انتہائی سادہ اور فطری ہے
اگر ان کا مطلب سیدھے سادھے الفاظ میں ایک جملے میں
ادا ہوجائے تو پھر وہ ایک لفظ کا اضافہ کئے بغیر آگے بڑھ جاتے
ہیں۔ سخن آرائی اور بات میں بات نکلنے کی فرصت ان کو
کم ہوتی ہے ورنہ "گئودان" اور "میدان عمل" جیسے معرکتہ الارا
مسائلی ناول لکھنے کے وہ کبھی قابل نہ ہوتے اس کے برعکس سرشار
کا "فسانہ آزاد" لیجئے اکثر واقعات حقیقت سے کوسوں دور
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار لطف بیان و زبان کے طلسم
کو قائم رکھنے کے لئے قصے میں ہر قسم کی بے اعتدالی کرنے تیار
ہے ہم آج "فسانہ آزاد" کو محض لطف اندوز ہونے کے
لئے اور زبان و طرز ادا سے محظوظ ہونے کے لئے زیادہ
پڑھتے ہیں ظاہر ہے کہ اس طویل قصے کو صرف انداز بیان
سے حظ اٹھانے کی خاطر ہم اس اضطراب اور ذوق و شوق
سے نہیں پڑھتے جس کا اظہار ہم رینالڈس کے طویل ناول
پڑھتے وقت کرتے ہیں بلکہ ہمیں "فسانۂ آزاد" کا مطالعہ
وقفہ وقفہ سے کرنے میں لطف آتا ہے۔

ہر بڑے ادیب کی تحریر کے مخصوص خدوخال ہوتے
ہیں اس کا انداز بیان طرز ادا اور اظہار جذبات کا طریقہ دوسروں
سے بالکل مختلف ہوتا ہے ہر بڑے انشاء پرداز یا شاعر کی
عظمت کا یہی ثبوت نہیں کہ وہ اسلوب بیان کا ماہر ہو بلکہ
یہ بھی ہے کہ وہ دوسرے کے رنگ میں کہنے سے معذور ہے۔
جس طرح ہم آواز سن کر اشخاص کو پہچان لیتے ہیں اسی طرح
طرز بیان کے مطالعہ سے ہم مصنف کو فوراً معلوم کرلیتے ہیں۔
شبلی کی تحریر دیکھ کر اسے ہم کبھی آزاد کی عبارت قرار
نہیں دے سکتے۔ اور نہ ہم ابوالکلام کی نثر کو عبدالحق سے
منسوب کرسکتے ہیں ایک ہی موضوع پر اگر غالب و ذوق طبع
آزمائی کریں اور ان کے نتائج فکر ہمارے سامنے لائے
جائیں تو ہم فوراً بول اٹھیں گے۔ یہ شعر ذوق کا ہے اور یہ
غالب کا۔ ذوق صفائی، روانی اور بول چال کی چاشنی
کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیں گے چاہے اس سے ان کے
بیان میں سطحیت ہی کیوں نہ آئے۔ غالب تنوع ندرت
اور جدت طرازی کے قائل ہیں۔ وہ مجدد شاعر ہے اور ادائے
مطلب کی ضرورت پڑے تو وہ نئے الفاظ اور نئی ترکیب
بآسانی تراش لیتا ہے معمولی بات کو بھی انوکھے انداز میں
پیش کرنا اور اپنے مشاہدہ کے اظہار میں ژرف نگاہی
کا ثبوت دینا اس کا خاص امتیاز ہے۔

ذوق کا شعر ہے:۔

ہم آپ جل بجھے مگر اس دل کی آگ کو
سینے میں ہم نے ذوق نہ پایا بجھا ہوا

یہی مضمون غالب سے سنئے:۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

مضمون ہے "مئے نوشی" ذوق اس مضمون کو
لیکر لے ناگ محاورے کے استعمال سے بے تکلف شعر موزوں

کر لیتے ہیں گو بیان میں گہرائی نہیں۔

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں
کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہہ گیا

یہ غالب کا نتیجۂ فکر ہے:۔

مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کا
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

مومن کو لیجئے اس کا ہر جذبہ شدت کا رنگ لئے ہوئے ہے معلوم ہوتا ہے گویا اس کے دل و دماغ میں آتش بھری ہوئی ہے اس کا انداز بیان بھی "شعلہ نوائی" سے کم نہیں ہر چیز کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ شدید احساس کی بو سننے والے کے دل و دماغ میں بس جائے۔

ذوق کہتے ہیں:۔

نہیں ہے کم زر خالص سے زردیٔ رخسار
تم اپنے عشق کو اے ذوق کیمیا سمجھو

یہ مومن کا شعر ہے:۔

زرد رخ دکھلا دیا داغ جگر دکھلا دیا
آج اس کو ہم نے اپنا زور و زر دکھلا دیا

اچھے اسلوب بیان کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس کی صحیح نقل نہیں کی جا سکتی۔ مرحوم سجاد نے "محشر خیال" میں ابوالکلام کی نثر کی طرز اختیار کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس میں وہ شان و شوکت اثر انگیزی بلاغت اور روانی نہیں آ سکی جہاں عبارت بلیغ ہو گئی ہے، وہاں آورد کا احساس ہونے لگتا ہے؟ جہاں عبارت میں روانی پیدا ہو گئی ہے وہاں شوکت لفظی دھیمی پڑ گئی ہے آزاد کے پوتے طاہر نے آزاد کے شوخ و رنگین انداز بیان کی نقل اڑانے کی کوشش کی تھی مگر کبھی ان کی عبارت ایک پھیکی نثر اور بے معنی کوشش سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔ سرسید کی اردو انتہائی سلیس اور رواں ہے تکلف اور تصنع کا اس میں نام نہیں سرسید کبھی بات کو بڑھا چڑھا کر کہنے اور مترادف الفاظ کی بھرمار کرنے کے قائل نہیں۔ وہ ہمیشہ سیدھی بات سادے لفظوں میں ادا کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں سرسید کا ہر پڑھنے والا شاید یہ سمجھتا ہو گا کہ ایسی آسان اردو وہ بھی بے تکلف لکھ سکتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ ویسے دو چار جملے بھی لکھنا انتہائی مشکل معلوم ہو گا۔ سرسید کا ایک چھوٹا سا مضمون "بحث و تکرار" جو اکثر درسی کتابوں میں موجود ہے طنز و مزاح اور سلاست و بے تکلفی کا بے مثال مرقع ہے چھوٹے چھوٹے جملے معمولی الفاظ رواں عبارت کہیں تصنع کا نام نہیں مگر ایسا انداز بیان اردو ادب میں اور کہیں نہیں ملتا انشاء پردازی دراصل الفاظ کے صحیح استعمال کا دوسرا نام ہے لفظ کو اس کے صحیح معنی میں صحیح مقام پر استعمال کرنے سے اس میں جان پڑ جاتی ہے اسی طرح بہترین اسلوب بیان وہی ہے جو فطری ہو تصنع سے پاک ہو اور تکلف سے دور ہو عبارت میں سادگی اسی وقت پیدا ہو گی جب کہ الفاظ کا استعمال بے تکلف کیا جائے فطری انداز بیان وہی ہے جبکہ تحریر و تقریر میں کم فرق رکھا جائے۔ شگفتہ اسلوب بیان حاصل کرنے میں جو بہت سی دقتیں پیش آتی ہیں وہ صرف اسی صورت میں دور ہو سکتی ہیں کہ انسان لکھنے سے پہلے یہ سوچ لے اگر ایسی ہی بات کسی سے کہنی ہوتی تو کیسے کہتا۔ پس وہی طرز ادا و اختصار اور جامعیت کے ساتھ تحریر میں اختیار کرے تو وہ بہترین اظہار مطلب ہو گا۔ اختصار اور جامعیت اس لئے ضروری ہیں کہ ہماری گفتگو میں ہر جملے کا مکمل طور پر ادا ہونا ضروری نہیں۔ بہت سی باتیں جملۂ معترضہ کے طور پر ہمارے منہ سے نکل جاتی ہیں نیز گفتگو میں عام طور پر ایک ہی بات کو دہرانا اور بار بار کہنا اتنا معیوب نہیں ہوتا جتنا تحریر میں برا لگتا ہے۔

غالب کے خطوط کی نثر شگفتہ اور فطری اسلوب بیان کا اعلیٰ نمونہ ہے غالب نے اپنے انوکھے انداز بیان سے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے وہ اردوئے معلیٰ کا بادشاہ ہے۔

اس کی زبان نرم شستہ اور فصیح ہے ایسی ٹکسالی اردو بہت کم لوگوں نے لکھی ہے غالب کے خطوط پڑھتے ہوئے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے گویا غالب خود ہم سے محو گفتگو ہے یہ انداز بیان کا سب سے بڑا کمال ہے اس کی تحریر

میں اشارے کنائے طنز و مزاح کے تمام پہلو بالکل اسی طرح موجود ہوتے ہیں جسطرح گفتگو میں، برہان قاطع کی مخالفت کے زمانہ میں ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"ان فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے جو اپنے نزدیک صحیح سمجھتا ہے وہ لکھدیا۔ نظامی یا سعدی کی لکھی ہوئی کوئی فرہنگ ہو تو ہم اس کو مانیں ہندیوں کو کیونکر مسلم الثبوت جانیں ایک گائے کا بچہ بزور سحر آدمی کی طرح کام کرنے لگا۔ بنی اسرائیل اس کو خدا سمجھے۔"

آخری جملے میں جو طنز کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے اردو نثر اس سے بالکل پہلی بار روشناس ہو رہی ہے۔ برسات کے موسم میں ایک دوست کو خط لکھتے ہیں دیکھئے کوئی جملہ ۵ یا ۶ الفاظ سے زیادہ کا نہیں۔ نہ کوئی لفظ ایسا جو عام گفتگو میں نہ آتا ہو پھر بھی اسلوب بیان اتنا دلکش کہ پوری عبارت یاد کرنے کو جی چاہتا ہے۔ "دیوان خانے کا حال محلسرائے سے بدتر ہے، مرنے سے نہیں ڈرتا فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں چھت چھلنی ہو گئی ہے ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔" ایک خط میں دلی کی اجڑی ہوئی ریاست کو بڑے پر اثر انداز میں پیش کرتے ہیں مخاطب نواب علاء الدین خاں ہیں :۔

"کل تمھارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے اے میری جان یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے تحصیل علم کیا وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں ایک کیمپ ہے جس میں مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود ۔ بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں......"

غالب کی یہی زبان ذرا نرم ہو کر حالی کے حصے میں آئی ہے سادہ بیانی وہی ہے۔ مگر ذرا اظہار کا طریقہ بدل گیا ہے۔ احتیاط حالی کے دل و دماغ کی خاص صفت ہے وہ کبھی خیالات کی رو میں بہہ نہیں جاتے غم و غصے کے وقت بھی جذبات میں اعتدال ہوتا ہے انداز تحریر نہ کبھی بہت تیز اور نہ کبھی بہت مدھم ہو جاتا ہے۔ اتار چڑھاؤ ضرور ہے مگر ایسا نہیں کہ سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ حالی کبھی الفاظ سے نہیں کھیلتے وہ ایسے ہی لکھتے ہیں جیسے باتیں کرتے ہیں۔ بقول فراق گورکھپوری الفاظ ان کے مطلب کو نہیں چمکاتے ان کے مطالب سادہ الفاظ کو چمکا دیتے ہیں۔

اپنے دیوان کے دیباچہ میں اپنے زمانہ کے بگڑے ہوئے ذوق شاعری کی اصلاح سے متعلق لکھتے ہیں :۔

"جو لوگ عاشقانہ گوئی کے چٹخارے سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ خون جہاں منہ کو لگا پھر ذرا مشکل سے چھوٹتا ہے مگر زمانہ کی ضرورتوں نے یہ سبق پڑھایا کہ دلفریب مگر نکمی باتوں پر آفریں سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفریں سننی بہتر ہے۔ اور حاکم وقت نے یہ حکم دیا کہ پروانہ و بلبل کی قسمت کو بہت رو چکے کبھی اپنے حال پر بھی دو آنسو بہانے ضرور ہیں۔"

ایک جگہ یادگار غالب میں لکھتے ہیں :۔

"اگرچہ اس لحاظ سے کہ ایشیائی شاعری کا مذاق یورپین سپورٹ میں روز بروز قریب ہوتا جاتا ہے ....

اور فارسی لٹریچر ہندوستان سے ایسا رخصت ہوا کہ بظاہر اس کے مراجعت کرنے کی توقع نہیں رہی۔ یہ امید رکھنی تو فضول ہے کہ مرزا کی فارسی نظم و نثر اب یا آئندہ زمانے میں مقبول خاص و عام ہو گی مگر جو تو پردے مرزا کی شاعری اور نکتہ پردازی پر ان کی زندگی میں پڑے رہے اور جو اب تک مرتفع نہیں ہوئے کیا عجب ہے کہ ہماری اور ہمارے بعد کسی دوسرے شخص کی کوشش سے رفع ہو جائیں۔"

دور حاضر کے سب سے اچھے صاحب طرز انشاء پرداز ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب ہیں حالی کی تمام اچھی خصوصیات

بدرجۂ اتم موجود ہیں وہی سنجیدگی وہی خودداری وہی اعتدال پسندی وہی مبالغہ آمیزی سے احتراز اور وہی ہر بات کو احتیاط سے سپرد قلم کرنے کی عادت جو حالی کا طرۂ امتیاز ہے عبدالحق کے حصے میں آئی ہے مگر عبدالحق صاحب کا اسلوب حالی سے زیادہ شگفتہ اور سادہ ہے حالی اکثر جگہ مطلب کے اظہار کے لئے انگریزی الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں مگر عبدالحق ادق ترین انگریزی تراکیب اور الفاظ کو بڑی شگفتگی سے خالص اردو کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔

عبدالحق کی اردو جتنی سادہ ہے اتنی ہی شیریں ہے ان کا یہ انداز بیان ہر قسم کے مطالب کے اظہار کے لئے نہایت موزوں ہے ان کے مقدمات دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس آسانی سے معاشی، سیاسی اور سائنسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اور تمام مشکل مسائل کو اپنے دل کش اور سادہ انداز بیان میں بہ تفصیل تشریح کرتے چلے جاتے ہیں۔

کلام غالب کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"غالب کا کلام ایک لازوال نعمت ہے جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے اس کی قدر اور بڑھتی جاتی ہے جب تک اردو زبان زندہ ہے اس کے زندہ رہنے میں کوئی کلام نہیں اگر یہ نہ بھی رہے تو بھی یہ کلام زندہ رہے گا کیونکہ اس کا کمال محض الفاظ اور زبان پر منحصر نہیں بلکہ ان قیود سے بالا و برتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی متعدد شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور آئندہ سیکڑوں لکھی جائیں گی اور فاضل شارح اس کلام کے سایے میں اپنی جدت اور ذہانت کو دکھانے کے مواقع ڈھونڈھ لیں گے۔"

مقدمۂ باغ و بہار میں میرامن دہلوی کی زبان کے متعلق لکھتے ہیں :-

"رہا زبان کا معاملہ تو اس کی فصاحت اور خوبی میں کلام نہیں ہو سکتا اس کے علاوہ جو بات دیکھنے کی ہے یہ کہ اس میں سیکڑوں محاورے اور الفاظ ایسے ملتے ہیں جو آج کل بول چال یا تحریر میں نظر نہیں آتے بعض تو ایسے ہیں جو متروک ہو گئے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو آنکھ سے اوجھل ہو جاتے اور نہ جاننے کی وجہ سے استعمال میں نہیں آتے ہماری زبان کا دار و مدار ایک مدت تک شاعروں پر رہا اور شاعری کا میدان زیادہ تر غزل کے لئے وقف تھا وہ ایسا تنگ کہ اس میں زبان کی کہاں تک کھپت ہوتی۔"

ذیل کی عبارت جو ان کے خطبے سے ماخوذ ہے خاص طور پر قابل غور ہے اس میں ان کے طرز تحریر کی حالی کے اسلوب سے قریب ترین مشابہت کا پتہ چلتا ہے۔ بالکل اسی موضوع پر حالی نے اپنے مشہور مقدمۂ شعر و شاعری میں بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ اگر وہ عبارت پیش نظر ہو تو اس عبارت سے اس کا مقابلہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

"یہ جو کہا گیا ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ مثلاً عرب جاہلیت کے شعراء کو لیجئے شاعری ان کے رگ و پے میں پھیری ہوئی تھی۔ معمولی سا معمولی اور جزوی سا جزوی معاملہ بھی ان کی نظر میں ایک بڑا واقعہ تھا اور تحریک شعر کے لئے کافی تھا۔ ان کی لڑائیاں ان کی فتح و شکست اور عشق و محبت (خیالی نہیں) خوف و خطر انتقام مہماں نوازی وغیرہ یہاں تک کہ ایک بچھیرے کی ولادت کا نقشہ ان کی نظموں میں زندہ موجود ہے۔"

اسلوب بیان کے متعلق اکثر دو مختلف نظریے پیش کئے جاتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ یہ ایک بالکل فطری چیز ہے جیسے شاعری۔ بعض کے نزدیک اسلوب بھی مضمون نگاری اور علم نقد کی طرح محنت اور مشق کا رہین ہے۔ لیکن غور کیا جائے اس کا جواب بھی حالی کے اس بیان سے مل جاتا ہے جو انھوں نے شعر کی آمد و آورد کے متعلق دیا ہے۔ حالی کہتے ہیں کہ آمد اور آورد کا مفہوم جیسا کہ عام طور پر لیا جاتا ہے حقیقت سے بعید ہے۔ مثلاً کسی شعر میں بے ساختگی روانی اور زور ہو تو اسے آمد کا نتیجہ سمجھا جاتا۔ اور کمزور اور سست شعر کو آورد کی پیداوار۔ نیز برآں ہر اس شعر کو جس میں روانی اور زور ہو نا برجستگی اور بدیہہ گوئی کا نتیجہ خیال کیا جاتا۔ گویا جو شعر سوچ بچار کے بعد بڑی دیر میں صفحۂ قرطاس پر آتا اس میں آورد کا ہونا ضروری تھا۔

لیکن غور کیا جائے تو واقعہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ وہی شعر جس پر زیادہ وقت صرف کیا جائے ہر نقطۂ نظر سے بہترین ہوگا۔ رہی بداہت تو ہر برجستہ شعر کا اچھا ہونا ضروری نہیں۔ اسلوب بیان کا بھی کچھ یہی حال ہے۔ میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ فلاں شخص بڑا صاحب طرز ادیب ہے اور ایک خاص بے ساختہ اسلوب رکھتا ہے۔ ثبوت اس کا یوں دیا جاتا ہے کہ وہ قلم ہاتھ میں لیتے ہی بغیر دماغ پر زور ڈالے بیسیوں صفحے لکھ ڈالتا ہے۔ لیکن ہر اس شخص کا جو فی البدیہہ مضمون لکھ سکتا ہو صاحب طرز ہونا ضروری نہیں۔ اچھے اسلوب اور طرز بیان کے حصول پر غور کریں تو ہمیں چند نمایاں نکات نظر آئیں گے۔

ایک اچھے طرز کا مالک ہونے کے لئے زبان پر قابو ازحد ضروری ہے۔ جب تک الفاظ پر محاوروں پر جملے کی ترکیب پر کسی کو پوری طرح قابو نہ ہو اسلوب قطعاً پیدا نہیں ہوتا۔ جس بات کو آپ کہنا چاہیں بے تکلف بیساختہ مختلف دلچسپ انداز میں اسی وقت ادا کرسکتے ہیں جب کہ آپ کے پاس زبان کا وسیع ذخیرہ موجود ہو ورنہ آپ کے خیالات آپ کے محدود الفاظ کے تابع رہیں گے۔ اور آپ کا ذہنی رجحان جو صرف آپ کے خیالات کے برجستہ ادا ہونے میں باقی رہے گا اس صورت میں غائب ہو جائے گا۔

دوسری چیز وسیع مطالعہ ہے۔ آپ کہیں گے ہمیں ایسے ادیب بھی نظر آتے ہیں جن کی تحریروں میں ہمیں کسی قسم علمیت کی علامات نظر نہیں آتیں لیکن اسلوب کی شگفتگی اور رنگینی کی وجہ سے ہم انھیں پڑھتے ہیں۔ لیکن یاد رکھئے یہ شگفتگی اور رنگینی بالکل عارضی اور سطحی ہے۔ اسلوب کو ایک مستقل رنگ دینے اور اس کو ہمیشہ باقی رہنے والی پختگی عطا کرنے کے لئے مطالعہ کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کو اردو کے بہت سے ایسے ادیب نظر آئیں گے جو ابتدا میں اپنے طرز نگارش کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ لیکن فقدان مطالعہ نے ان کی تحریر سے وہ بات چھین لی اور ان کی تحریر کی دلکشی کی جگہ پیوست تکرار لفظی اور ایک اکتا دینے والے اسلوب نے لے لی ہے۔ اور وہ لوگ موجودہ زمانے سے بہت دور دکھائی دیتے ہیں۔ اچھے اسلوب نگارش کے لئے یہ بات سب سے ضروری ہے کہ لکھنے سے پہلے سوچنے کا انداز بہت سلجھا ہوا ہو (clear Thinking) یا سلجھے ہوئے انداز فکر کے بغیر نہ تحریر میں خوش اسلوبی پیدا ہوگی نہ مافی الضمیر کا واضح اظہار ہوگا اور نہ لکھنے والے کی طبیعت کا وہ رنگ اس میں جھلکے گا جو انفرادیت کے حصول کے لئے ناگزیر ہے۔ (R. L. Stevenson) اسٹیونسن کہتا تھا میں ہر چیز پر لکھنے سے پہلے اتنا سوچ لیا کرتا ہوں کہ وہ بالکل میرے دماغ میں واضح ہو جاتی ہے۔ لکھنے کے بعد ہر لفظ اور ہر جملے پر غور کرتا ہوں تاکہ اس سے موزوں اور بہتر کوئی طریقہ اظہار نظر آئے تو اختیار کرلوں۔ میں اپنی تحریر پر اتنی محنت صرف کرنا چاہتا ہوں کہ میرے پڑھنے والے کو اس کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔"

محمد احسان اللہ

کھیل

دھرتی کا جو سینہ چیرے آخر منہ کی کھائے — زر کی خاطر خون بہائے، لیکن خاک نہ پائے
جگ کی جھولی بھرنے والا اور دامن پھیلائے — ہرے بھرے کھیتوں کا آقا اور فاقوں مر جائے

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

یہ کہساروں کی دیوی، یہ بے پروا چرواہی — جس کی ایک اداس نظر سے رستہ بھولیں راہی
دل کو ہلکورے سے دے جس کی مخمور نگاہی — اور اک دُور کا دولت والا اس کا مول چکائے

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

قدم قدم پر گاگر کو یہ چھلکاتی پنہاری — آنکھوں میں تاروں کی لَو، سانسوں میں مٹی کی دھاری
اٹھی ہوئی باہوں کے خم میں اڑنے کی تیاری — اور اک "اپ ٹو ڈیٹ" شکاری اس کی تاک لگائے

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

گاؤں کے یہ البیلے، بانکے، مستانے، متوالے — بھولی بھالی دہقانی ماؤں کی گود کے پالے
جن کے ساتھی جیٹھ کے جھونکے اور ساون کے جھالے — ان کو اک منحوس مہاجن ہتھکڑیاں پہنائے

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

زرّیں ٹیلے، مست کھجوریں، خاموشی، رعنائی — پھٹے پرانے خیمے، یعنی یہ قریے صحرائی
جب ان پر چھا جاتے ہیں تہذیبوں کے سودائی — دھرتی ماتا چلاتی ہے: "میں لٹتی ہوں، ہائے!"

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

مٹی کے معصوم گھروندے، حسن کی یہ درگاہیں — کھیتوں میں بل پر بل کھاتی پتلی پتلی راہیں
گھنے گھنے یہ جنگل جن میں بھٹکیں تیز نگاہیں — اور یہاں سنگ مرمر کی محل سرا بنوائے

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

آزادی پر مرنا لیکن زنجیروں سے ڈرنا — بڑی بڑی تنخواہیں پانا اور من مانی کرنا
خود ہی آگ لگانا اور الزام کسی پر دھرنا — شاعر اور بھانڈوں کی طرح قوالوں کے گن گائے

مجھ سے تو یہ آڑا سیدھا کھیل نہ کھیلا جائے

احمد ندیم قاسمی

ماحول اور شخصیت

نفسیات کے جدید نظریوں نے اس پرانے خیال کی
آج تردید کر دی ہے کہ ہر دور میں بعض نمایاں شخصیتوں نے
اپنے ماحول کی تشکیل کی ہے۔ لیکن اس مکتب خیال کے حامی ابھی
تک اپنی اس بات پر مصر بھی ہیں مثلاً ان کا یہ ادعا ہے کہ گزشتہ
جنگ کے بعد جرمنی کی ناگفتہ بہ حالت میں ہٹلر ہی کی شخصیت
تھی جس نے ہٹلر کو بام عروج پر پہونچایا۔ اور وہ ہٹلر کی شخصیت
کا جائزہ لینے لگتے ہیں کہ اس کے کردار کی استقامت۔ راسخ
عزم مضبوط عقیدہ اور قوت ارادی نے اس کی شخصیت
کی تشکیل کی اور وہ اس قابل ہو سکا کہ ہنڈ برگ کے مقابلہ میں
اپنی تحریک کو آگے بڑھا سکے۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے سیاسی غلطیاں
کیں جس کی وجہ سے اس کو اپنے ارادوں میں ناکامی ہوئی۔
واقعہ یہ ہے کہ ہٹلر کی شخصیت فاشزم کی ذمہ دار نہیں ہے۔
جرمنی کی سیاسی اور معاشی تاریخ شاہد ہے کہ وہاں فاشزم
کے ارتقاء و نمو کی ضرورت تھی۔ جرمنی کی بڑھتی ہوئی سرمایہ داری کا
کا تقاضا یہ تھا کہ جرمنی کی قیادت ساری دنیا پر چھا جائے اس سے
جرمن عوام اور باشندوں کا مفاد وابستہ تھا اور اس لئے
ساری جرمن قوم نے ہٹلر کی اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ ہٹلر
کی ترقی یا اس کی عظیم تر شخصیت کا نفسیاتی راز یہ ہے کہ اس نے
جرمن قوم کی دلی خواہش کو جان لیا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے
کہ شخصیتوں کی تشکیل میں ہمیشہ ماحول کی کارفرمائیاں رہی ہیں:
مثلاً چین کا ایک ممتاز فوجی جرنیل چودے ([illegible])
بچپن سے شباب تک ایک آوارہ و وارفتہ مزاج شخص تھا۔
اس کی یہ ابتدائی زندگی افیون نوشی اور عیش پسندی میں گزری۔
اس کم عمری میں اس نے نو شادیاں کیں اور تعیش پرستی
میں وقت گزارتا رہا لیکن جب اس کے شباب کے زمانے
میں ڈاکٹر سن یات سین کی کوششوں کی بدولت جمہوری
حکومت کے قیام کی کوشش ہونے لگیں، انقلابی تحریکات میں
سارے چینی نوجوان حصہ لینے لگے اور چین کو بدیسی حکومت
سے نجات دلانے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کوششوں کا علم چودے
کو بھی ہوا اس نے اپنی قدیم زندگی یک لخت ترک کر دی اور یہ جاہل
نوجوان اس زمانے میں کچھ تحصیل علم کے بعد اس نئی تحریک میں
شریک ہو گیا۔ آج اس کا شمار چین کے گنتی کے چند مشاہیر میں ہے
اور اس کو چین کا توشنکو کہا جاتا ہے چینی توشنکو کی زندگی
اس بات کی شاہد ہے کہ اس کے ماحول نے اسے جاہل اور افیونی
سے ایک جرنیل بنا دیا۔
نفسیات کے جدید نظریات اس بات کی وضاحت
کرتے ہیں کہ انسان کی زندگی پر اثر انداز ہونے والے اہم ترین
عوامل اس دور کے مادی حالات ہیں۔ مثلاً انگلستان میں کبھی گوتم
کی پیدائش کا تخیل نہیں کیا جا سکتا چونکہ انگلستان کسی دور میں
بھی روحانیت اور تجلی غیب کا قائل نہیں رہا۔ مادی حالات وہ
اہم ترین ذریعہ ہیں جو کسی شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں اور
مادی و معاشی حالات ہی کسی شخص کی سیرت و کردار کی تشکیل کا باعث
ہوتے ہیں۔ اور یہ حالات شخص سے گزر کر قوم تک اپنا احاطہ
کئے ہوئے رہتے ہیں۔ مثلاً افریقہ کے حبشی اپنی معاشی پستی
و محکومی کے باعث آج تک کوئی ممتاز مقام حاصل نہ کر سکے۔ حالانکہ
کئی حبشیوں نے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی اور متمدن ممالک میں
بھی زندگی بسر کی لیکن انھیں کہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا نہ
گیا۔ یہ ایک کھلی بات ہے کہ جس ملک کے معاشی حالات جیسے ہوں
اس ملک کی معاشرت بھی ویسی ہوگی۔ مثال کے طور پر جس
زمانہ میں جاگیری نظام رائج تھا تہذیب اور معاشرت کے
جو اقدار تھے وہ سائنسی اقدار اس مشینی دور میں یکسر بدل گئے
معاشرت کی اس تبدیلی نے انسان کا مزاج بھی بدلا۔ اس کا
انداز فکر بھی تبدیل ہوا مزاج اور انداز فکر کی یہ تبدیلیاں
شخصیت کی نشو و نما میں اہم ترین ناربہر رکھتی ہیں اور یہ تسلیم
کرنا پڑے گا کہ ماحول نے ہمیشہ شخصیتوں کو جنم دیا ہے ثبوت
کے طور پر یہ پیش کیا جانا مناسب ہوگا کہ آج چنگیز پیدا

نہیں ہو سکا آج چینی ساحر کا وجود ممکن نہیں اور اسی طرح آج سے ایک ہزار سال پیشتر جوہری بم کے موجد یا پنی سلین کے دریافت کرنے والے کا وجود ممکن نہ تھا۔

یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ ماحول کی تبدیلی شخصیتوں کی اہمیت پر بھی بڑا اثر رکھتی ہے مثلاً جنگ کے آغاز سے قبل ہٹلر موسولینی کے متعلق بڑی خوش اعتقادی تھی اور ساری دنیا انھیں خراج عقیدت ادا کرتی تھی کہ ان دو شخصیتوں نے اپنے اپنے ممالک کو ترقی کی انتہا پر پہونچا دیا ہے۔ لیکن سات آٹھ سالوں کے اس عرصہ میں سارا ماحول بدل گیا۔ سارا جغرافیہ تبدیل ہو چکا اور دنیا کی سیاسی و معاشی تنظیموں میں بھی ایک تغیر رونما ہو گیا۔ یہی دو ممتاز شخصیتیں آج ایک بلا قرار دی جا رہی ہیں۔ اس موقع پر نپولین کی زندگی کو بھی میں پیش کرنا چاہتا ہوں ایک جرمن مصنف کی لکھی ہوئی سوانح کا میں نے ترجمہ پڑھا تھا جس میں اس نے نپولین کو دنیا کا ممتاز ترین فاتح قرار دیا تھا۔ اس کے کچھ دنوں بعد ایچ جی ویلز کی لکھی ہوئی تاریخ عالم پڑھنے کا اتفاق ہوا جس کے مطالعہ سے پچھلی کتاب کا وہ تاثر باقی نہ رہا اور جب جرمنی نے روس پر حملہ کیا تو روس نے یہ بتلایا کہ نپولین نے بھی روس کی فتح کے منصوبے باندھے تھے۔ اور وہ سینٹ گراڈ تک پہونچ چکا تھا لیکن اس کے ارادوں کو ناکامی ہوئی اور یہی حشر جرمنی کا بھی ہوگا۔ جب یہ دعوے کئے جا رہے تھے تو نپولین کے متعلق یہ تصور برقرار نہ رہا جو پہلے پیدا ہوا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس ایک صدی میں فتح اور جہاں بانی کے وہ تصورات جو پہلے تھے اب بدل گئے اور ان بدلے ہوئے تصورات میں نپولین کی شخصیت بھی وہ برقرار نہ رہی جو پہلے تھی۔

شخصیت کی تشکیل میں جہاں خارجی حالات یا معاشی عوامل کی کارفرمائی ہے وہاں کسی شخص کی داخلی فطرت یا اس کے احساسات کا بھی بڑا دخل ہے۔ مثلاً حال میں میں نے ایک روسی کہانی پڑھی تھی کہ ایک روسی سپاہی نے ایک نازی کو گولی کا نشانہ بنایا اور جب وہ چیخ مارتا ہوا گر پڑا تو یہ روسی سپاہی رونے لگا اور اس پر غشی طاری ہو گئی بعد کو یہ روسی سپاہی خود اپنی خواہش سے محاذ پر سے ہٹا اور نرسنگ (تیمارداری) کے ادارہ میں شریک ہو گیا۔ لیکن زخمیوں کی حالت کو وہ پھر بھی دیکھ نہ سکا اور اسے وہاں سے ہٹا کر ایک جنگی کارخانہ میں بھیجا گیا۔ اس کی نرم دلی اور رقیق القلبی نے مجبور کر دیا کہ وہ محاذ سے ہٹ جائے۔ کسی جیل خانے میں آپ کو کئی ایسے شخص ملیں گے جو کسی جرم کی پاداش میں سزا بھگت رہے ہوں لیکن ان کے ارادوں میں جرم کا کوئی شائبہ نہیں اور وہ پاک زندگی کا تصور رکھتے ہیں۔ یا پھر آپ کو ایسے مجرم بھی ملیں جنھیں سخت ترین سزائیں دی گئی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مکرر جرم کرنا چاہتے ہیں۔ ان تمام حالات میں انسان کی داخلی خواہشات کا بڑا کام ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے یعنی بعض فطرتیں نشو و نما پا کر اس کی شخصیت کا ایک اہم جزو بن جاتی ہیں اور ہمیشہ برقرار رہتی ہیں۔

نفسیات کے ماہرین کا ایک گروہ یہ بھی خیال رکھتا ہے کہ بعض اشخاص میں بجائے خود انفرادیت ہوتی ہے۔ اور یہی انفرادیت انھیں ممتاز بناتی ہے مثلاً مہاتما گاندھی ہیں وہ اس دور میں ہندوستانی سیاست میں داخل ہوئے جب کہ موتی لال نہرو اور تلک جیسے ممتاز سیاسی تھے لیکن گاندھی جی کو ان کی زندگی ہی میں ایک اعزاز نصیب ہوا اور اس کی وجہ ان کا راسخ عقیدہ اور خود اعتقادی ہے وہ اس دور میں بھی اہنسا پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں اور اسے اپنا مسلک ہی نہیں بلکہ اپنی جماعت کا بھی مسلک قرار دیتے ہیں اس دور میں اہنسا کی تحریک بجائے خود ایک انفرادیت رکھتی ہے۔ اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کسی شخص کی داخلی کیفیات بھی اس کی شخصیت میں ایک مقام رکھتی ہیں مثلاً مصطفیٰ کمال کی شخصیت کے بنانے میں ان کی خودداری کا بہت بڑا حصہ ہے۔ انگریزی زبان کا پہلا اور شہرۂ آفاق ناول ......

(Pilgrims Progress) جسے جان بینن نے لکھا ہے۔ ہرگز نہ لکھا جاتا اگر بینن کو قید نہ ہوتی اور

وہ اس زنداں میں غور و فکر کا عادی نہ ہوتا۔ نہرو کے متعلق مشہور ہے کہ وہ تنہائی پسند اور خاموش تھا زنداں نے اس کو یہ موقعہ دیا اور اس نے انگریزی زبان کا مشہور ترین ناول لکھا۔ حال ہی میں ایک انگریز مصنف نے جواہرلال نہرو کے متعلق یہ لکھا ہے کہ ان کی کتاب (My Auto - biography) پڑھے تو معلوم ہوگا کہ نہرو اپنی جگہ پہاڑ کی طرح اٹل ارادہ رکھتے ہیں لیکن ان کی اخباری تقریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ رائے قائم کرنے میں جلد باز ہیں اور میری سابقہ رائے کی شاید وجہ یہ ہو کہ (My Auto -- biography) جواہرلال نہرو نے سکون و خاموشی میں لکھی ہے اور ان کی تقریریں ہنگاموں اور نعروں کے درمیان ہوتی ہیں۔

شخصیتوں کی تشکیل میں مادی حالات ہی کی کارفرمائیاں ہیں اور بسا اوقات کسی شخص کی داخلی کیفیات بھی اس کی شخصیت کو بنانے میں کام کرتی ہیں۔ اگر یہ بنی ہوئی شخصیتیں بگڑی بھی ہیں تو انہی معاشی مادی حالات اور سیرت و کردار کی تبدیلی کا اثر رہتا ہے۔ اس دور میں تشکیل و تخریب کا نفسیاتی جائزہ لیا جارہا ہے اور اب یہ کہہ کر زندگی سے اور شخصیت سے گریز نہیں کیا جا سکتا کہ

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

عابد علی خاں

جلووں کے شرار

مسکراتے ہوئے جلووں کے شرار
ناچتے ناچتے گل ہونے لگے بجھنے لگے
چشمِ میگوں کی چھلکتی ہوئی صہبا کا خمار
حسنِ محبوب کی نوخیز بہار
اور الفت کا وہ احساسِ جمیل
چاندنی رات میں اک تازہ مسرت بن کے
سارے ماحول پہ یلغار کرے
ہر طرف نور ہی نور

رنگ و نکہت کا فسوں خیز جہاں
وسعتِ ماضی میں بکھرے ہوئے رنگین نقوش
کتنے خوابوں کے سنہرے سائے
ظلمتِ شب سے ہم آغوش ہوئے
آج اک پرتوِ رنگیں کے سوا کچھ بھی نہیں
صبح دم ڈوبتے تاروں کی طرح
ایک بے جان تصور کے دیئے۔
مسکراتے ہوئے جلووں کے شرار
ناچتے ناچتے گل ہونے لگے بجھنے لگے

شہر دار الہام

بیدر کی آبادی اور نام

شہر بیدر سطح سمندر سے (۲۱۰۰) فٹ اور حیدرآباد سے ۶۰۰ فٹ بلند اس وقت ایک فصیل کے اندر واقع ہے۔ یہ ایک قدیم شہر اور دکن کا ابتدائی پایۂ تخت تھا۔ پرانی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دکن کے نام سے جب اس ملک میں آبادی ہوئی تھی اس کا دارالحکومت یہی شہر قرار پایا۔ دوسرے لفظوں میں اس کو یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں جب دکن کے نام سے یہ ملک آباد ہوا تو اس کے ساتھ ہی یہ شہر مستقر حکومت تھا اس قدر پرانا اور تاریخی شہر یا آبادی کا حصہ دکن میں دوسرا نہیں ہے۔

اس میں اختلاف ہے کہ موجودہ آبادی ہی آیا زمانۂ قدیم میں شہر تھا یا اس کے قرب و جوار میں وہ حصۂ آبادی واقع تھا۔ انقلاب زمانہ سے قدیم آثار باقی نہیں رہے اور اس کا فیصلہ آسانی اس وقت ہو سکتا ہے یہ بڑا پیچیدہ اور طول طویل مضمون ہے جو ہم انشاءاللہ تعالیٰ اپنی تاریخ بہمنیہ میں لکھیں گے۔

ہماری رائے یہ ہے کہ موجودہ آبادی کا بانی اعظم السلاطین احمد شاہ ولی بہمنی ہے جس نے قلعہ ارک بنایا اس میں کسی مورخ اور کسی شخص کو انکار بھی نہیں۔ صاحب فرشتہ اور نیز دیگر مورخوں جو واقعات اس شہر کی آبادی کے متعلق لکھے ہیں وہ قرین قیاس ہیں کہ جب سلطنت بہمنیہ ممالک دکن و تلنگانہ میں وسیع ہو گئی اور اس کے حدود ایک طرف بحر ہند تک جا پہونچے اور دوسری طرف راس کماری سے بھی دور تک نکل گئے خلیج بنگالہ اور ملک اڑیسہ اس سلطنت میں داخل ہو گیا تو ایک مناسب مقام پر دارالسلطنت کے قائم کرنے کی فکر ہوئی اگرچہ کہ گلبرگہ بلحاظ ابتدائی دارالحکومت اور خاندان بہمنیہ کے حق میں مبارک ہونے کے بیدر سے کچھ ایسا دور نہیں تھا۔ مگر اعظم السلاطین کو اس بات کی بڑی فکر تھی کہ آب و ہوا کے لحاظ سے بھی مفید تر اور خوشنما مقام منتخب ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس نے گلبرگہ کے اطراف چار چار منزل تک دورہ کر کے چپہ چپہ زمین کے معائنہ کے بعد اسے یہ حصۂ زمین بہت پسند آیا اور اس نے اس میں قلعہ بنوا کر شہر آباد کیا۔ فی الحقیقت یہ امر واقعی معلوم ہوتا ہے اور جن دلائل پر مبنی ہے اس کا آج بھی ثبوت موجود ہے۔ بہ نسبت گلبرگہ کے بیدر کی آب و ہوا بلندی وسعت اور کشادہ میدانوں کے لحاظ سے نہایت خوشگوار ہے۔ بہ نسبت گلبرگہ کے بیدر کی زمین کی حالت بھی نہایت اچھی ہے۔ آبادی کی غرض سے ایسے دارالسلطنت کے لئے جن زمینات کی ضرورت تھی وہ سب صفتیں بیدر کی زمین میں موجود ہیں۔ یہ نرم پتھر کی پہاڑی پر واقع ہے۔ مشہور ہے کہ اسی زمین میں زعفران اور اقسام کے ولایتی انگور وغیرہ کی پیداوار ہوتی تھی۔ اب بھی افیون و چاول وغیرہ کی اچھی پیداوار ہو سکتی ہے مگر بہ حکم سرکار افیون کی کاشت بند ہو چکی ہے۔ اعظم السلاطین کی دانشمندی کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے سیاسی و سماجی غرض ہر پہلو سے اس خطہ کو منتخب کیا جو فی الحقیقت دکن بھر میں نظیر نہیں رکھتا تھا۔ یہ امتیاز صرف اسی ملک کو ہے کہ پچاس میل جنوب و مشرق میں سرخ زمین کی سطح واقع ہے جو مسلسل بیدر تک چلی آئی ہے اور اسی طرح شمال و مغرب میں پچاس میل تک جو ہر موسم میں اپنی خوبی کے لحاظ سے نہایت [illegible] ہے۔ ایک زندہ دل شاعر اس کی سرخ مٹی سے متاثر ہو کر یوں اظہار خیال کرتا ہے ؎

ازبرائے ماندن عشاق منزل کردہ اند
خاک بیدر را بخون عاشقاں گل کردہ اند

یہ بات نہ گلبرگہ کے کسی خطہ اراضی پر مشتمل ہے نہ ناندیڑ کے نہ تعلقات بیدر کے۔ غرض یہ کہ بیدر کی آبادی واقعی ایک نہایت خوشنما خطہ اور بلند تر مقام پر واقع ہوئی ہے اگرچہ کہ یہ مقام سطح سمندر سے ۲۱۰۰ فٹ گلبرگہ سے ۱۵۰۰ فٹ حیدرآباد سے ۹۰۰ فٹ ناندیڑ سے ۱۵۰۰ فٹ میدک سے ۲۰۰۰ فٹ (جو اس شہر و ضلع کے اطراف کے مستقر اضلاع ہیں) بلند ہے تاہم کوئی شخص یہاں پہونچ کر دفعتاً ایسی بلندی کو محسوس نہیں کرتا

کیونکہ قدرتی طور پر بیدر کے اطراف میں درجہ بدرجہ متوازی گھاٹیاں ایسی واقع ہوئی ہیں کہ وہ کہیں ۴۰۰، ۳۰۰ اور کہیں ۵۰۰، ۶۰۰ فٹ کی بلندی سے زینہ بزینہ یکے بعد دیگرے واقع ہیں چنانچہ گلبرگہ سے آنیوالوں کو بیدر سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر ایک گھاٹی ملتی جو ۶۰۰ فٹ بلند ہے اس سطح گھاٹی کا سلسلہ ۱۵۔۱۶ میل تک ایک ساتھ چلا آیا ہے اور یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ ہم ایک گھاٹی پر چل رہے ہیں پھر اس کے بعد معلوم ہوگا کہ ۲۰۰ فٹ کی ایک اور گھاٹی سامنے موجود ہے اس کو طے کرنے پر یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ بیدر کے قرب و جوار میں ہیں یا گلبرگہ کے۔ سطح ارضی پر اس طرح بیدر کے مدرسے کے مینار، اور شاہ علی بریدو غیرہ کے گنبدہ ۲ میل سے اچھی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ شمال کے آنیوالوں کو خانہ (خانان پور) سے ۳۰۰ فٹ کی گھاٹی سے بلندی کی سطح پر پہونچنا ہے اور مغرب کے آنے والوں کو۔ سرسی۔ رورا۔ بادگی۔ بگدل وغیرہ کے پاس اسی قسم کے بلندی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ پھر کہیں میل یا دو میل تک مسطح زمین کے بعد ایسی گھاٹیوں کا سلسلہ ملتا ہے جو خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ بیدر کے قریب (فصیل کے باہر کے حصہ میں) اب تک ناہمواری ہے لیکن کوئی حصہ اونچے مقام پر ہے تو کہیں اس کے برعکس کہا جاتا ہے کہ زمانہ قدیم میں بیدر کا نام دورا بہا تھا جو مشہور راجہ بھیم سین کا پایۂ تخت تھا جس کی بیٹی دکمن پر مالوہ کا راجہ نل عاشق ہو کر سلطنت سے دست بردار ہوگیا۔ انقلاب زمانہ سے جب اس خاندان کی سلطنت بھی ملیامیٹ ہوگئی تو قندہار تخت گاہ بنا اور جب اس میں کئی راج ہو گئے تو کلیان اور ورنگل کو یہ عزت حاصل ہوئی۔ پٹن چروا اور پٹن بھی دکن کے پرانے تخت گاہ کہلاتے ہیں اور اکثر قدیم آثار جو اس وقت تک برآمد ہوئے ہیں وہ اپنے بانیوں کی شہادت بن کر متحیر کر دیتے ہیں۔ خواہ کچھ ہی ہو، بیدر کے بعد قندہار، کلیان، ورنگل، پٹن چرو وغیرہ ہوئے ہوں لیکن قدامت اور عزت و شہرت اس خطۂ زمین کو حاصل ہے۔ قدیم راجاؤں کے بھاٹ (مورخ) اور کتاب خوانوں (فسانہ خوانوں) نے اس کا نام دنیا بھر میں مشہور کر رکھا تھا یہ بات دکن میں کسی اور شہر یا پایۂ تخت کو نصیب نہیں ہوئی۔

سلاطین بہمنیہ جو دکن میں حکومت حاصل کرکے عرصۂ دراز تک کوس لمن الملکی بجاتے رہے ان کو یہ بھی بخوبی معلوم تھا کہ دوار بہا (بیدر) کے سوائے دوسرے شہر بھی تخت گاہ قدیم ہیں مگر ان کی نظروں کو سوائے اس حصہ کے دوسری آبادی پسند نہ آئی۔

اس بات کی مسلمہ شہادت موجود ہے کہ دورا بہا (بیدر) کی قدامت کے برابر سلاطین بہمنی دوسرے کو نہیں تصور کرتے تھے۔ اس کے سوا ہم ایک اور بات پر غور کرتے ہیں کہ بہمنیہ کے بعد پانچ سلطنتیں مسلمانوں کی قائم ہوئیں۔ سوائے بریدیہ سلطنت کے دوسری چاروں سلطنتیں عظیم قوت کے ساتھ مشہور و معروف رہیں۔ ان چاروں سلطنتوں کی نگاہ بہمنیہ بیدر پر رہی جو شخص بیدر پر قابض ہوتا وہ فی الواقع دکن کا مالک اور سلطان کہلانے کا مستحق ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ بیدر قدیم پایۂ تخت اور دار الحکومت تھا۔

حیدرآباد اور اورنگ آباد تو کبھی قدیم پایۂ تخت تھے ہی نہیں اس لئے ہم ان پر کوئی بحث نہیں کرتے۔ دولت آباد (دیوگڈھ) کی نسبت بعض مورخین کا خیال ہے مگر یہ صریح غلطی ہوگی کہ دونوں اورنگ آباد اور دولت آباد کو ہم ایک ہی مقام سمجھیں۔ البتہ پٹن کو قدیم پایۂ تخت کی عزت حاصل تھی

دکن کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کو بڑے غور سے اس بات کی طرف اپنے ذہن کو منتقل کرنا چاہیے کہ اس کی وسعت کے لحاظ سے کتنے دار الحکومت یہاں ہو سکتے تھے اور کون کون سے ہوں گے۔ معمولی روایت یا قصہ کہانیوں پر قیاس کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بیدر کے نام کے متعلق ایک فارسی خواں مورخ کا یہ خیال ہے کہ راجہ بدر نے (جو اس مورخ کا عقیدہ ہے کہ یہاں کا راجہ تھا) اپنے نام سے آباد کیا۔ لوگوں کو حیرت میں ڈالنے کی غرض سے جب قلعہ میں کوئی سیاح یا مسافر جاتا ہے تو احشام کہ راجپوت

لوگ بدر کا دیول اور مکان بھی بنا دیتے ہیں۔ مگر بدر اور بھی چالوکیا خاندان کے حکمرانوں کا نام تھا جو کلیانی اور ورنگل پر حکمران تھے۔ خاص وہ راجا (بیدر) کے آخری راجاؤں میں کوئی چالوکیا خاندان کا درجہ نہیں تھا۔ اس زمانہ کے ایک فارسی مورخ کی یہ رائے ہے کہ زمانۂ قدیم میں یہاں بانس بن تھا اس کی وجہ سے اس آبادی کو بیدر کہتے ہیں حالانکہ سنسکرت میں بانس بن کو بدر نہیں کہتے۔

بہمن نامہ۔ سراج التواریخ۔ فرشتہ۔ تاریخ ہند مولفہ خان بہادر اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ بیدر کی آبادی کے پاس پہلے ہی سے حصار بیدر موجود تھا (حصار بیدر کے الفاظ سے ان مورخین کا منشا کسی ٹھانہ یا چوکی سے ہو کیونکہ جنگی مقام کو قدیم محاورے میں حصار کہتے تھے) لیکن یہ واجب التعظیم مورخین بیدر کی وجہ تسمیہ پر غور نہیں فرماتے۔

مسلمانوں کی سلطنت جب ہندوستان میں قائم ہوئی تو انھوں نے اس شہر کا نام دہلی رکھ دیا۔ دہلی کے معنی آستانہ کے ہیں اور جیسا کہ اسلام میں رواج رہا کہ بلدہ یثرب کو مدینہ شریف کہا کرتے تھے۔ آج تک کے تمام مورخین مدینہ منورہ سے ہی اس آبادی کو تعبیر کرتے ہیں درآنحالیکہ مدینہ کے معنی شہر کے ہوتے ہیں اور صرف شہر کسی شہر کا نام نہیں ہو سکتا۔ مگر ادب و احترام کے مدنظر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روحی فداہ کے مقدس شہر کو اس کے اصلی نام سے نہیں پکارتے تھے بلکہ مدینہ طیبہ یا مدینہ منورہ زبان زد عام ہو گیا۔

یہی بات خلفائے عباسیہ کے پایۂ تخت بغداد سے متعلق ہے کیونکہ عموماً بغداد کو عرب "دارالسلام" کہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں بغداد بھی اپنے نام سے دنیائے اسلام میں مشہور نہ ہوا۔ اور سلاطین اسلام کے زمانہ میں دہلی کو تعظیماً حضرت دہلی سے یاد کیا جانے لگا اور پھر بعض سلاطین نے اس کو لفظ دارالسلام سے ملقب فرمایا۔ اسی طرح دولت آباد کو حضرت سلطان محمد تغلق شاہ نے دارالسلام کا خطاب عطا فرما کر ضرب سکہ میں بھی لقب کندہ کرایا ہے (ملاحظہ ہو فہرست سکہ جات مرتبہ عاصی)۔

جب حامی دین سلاطین اسلام ہندوستان میں اپنا پایۂ تخت ہستنا پور (اندرپت) کے قریب دہلی کے نام سے قائم کر کے اس کی عزت و عظمت کے بڑھانے میں متوجہ ہوئے اور خلفائے عباسیہ کے نائب ہو کر خود ہی شیخ الاسلام۔ قاضی القضاۃ مقرر کرنے اور بیعت اسلام کی اجازت لے چکے تو اسی دہلی کو حضرت دہلی کے معزز لقب سے ملقب فرمایا جیسا کہ امیر خسرو کا شعر موجود ہے۔ دولت عثمانیہ عموماً دنیائے اسلام میں اسلام بول اور یوروپ میں باب عالی سے مشہور ہوا حالانکہ اسلام بول قسطنطنیہ کا نام نہیں اور باب عالی وزیر کا محکمہ ہے۔

چونکہ سلاطین بہمنیہ بھی نائب خلفائے عباسیہ تھے وہ اپنے مستقر خلافت کو عزت سے یاد کیا کرتے تھے اس لئے اس کو ترکی لفظ بدر (آستانہ) سے موسوم کیا۔ شہر کا اصلی نام احمد آباد رکھا۔ جیسا دارالسلام بغداد کا نام تھا ایسا ہی بیدر کا نام احمد آباد سمجھنا چاہئے۔ اس کے علاوہ یہ شہر جب تک سلطنت بہمنیہ کا پایۂ تخت تھا ارض اقدس کے نام سے بھی مشہور تھا۔ یہ نام اور مدارج محض اس شہر کی بزرگی نسبت اور خلافت اسلام کا تعلق ہونے سے بادشاہ۔ علماء، وزرا، ورادنی طبقہ میں عام ہو گئے۔ اس شہر کے متعلق ہم کو ابھی اور زیادہ لکھنا باقی ہے۔ جبکہ دیوگڑھ[1] پر سلطان سکندر ثانی کا قبضہ ہو گیا تو اس نے اس کے اطراف کے اقطاع و جوانب میں اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ اسی لحاظ سے اس وقت ۱۳۰۸ء میں دوراہا تک مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا یہاں اس زمانہ میں کوئی راجہ نہیں تھا بلکہ دوراہا طوائف الملوکی سے

---

[1] دیوگڑھ پٹن کے قریب قلعہ کی وجہ سے مشہور تھا جو در اصل شہر کا فوجی مقام تھا۔ پٹن کی آبادی زمانہ قدیم کے لحاظ سے آجکل کی بمبئی سے کم نہ تھی اس طرح ہم باسانی اس کو سمجھتے ہیں کہ سلطان علاء الدین خلجی سکندر ثانی نے دکن میں آنے کی خبر ملتے سے راجہ نے دیوگڑھ میں پناہ لی تھی اور وہیں لڑا تھا اس لئے تمام مورخین اصل شہر یا پایۂ تخت (پٹن) کو چھوڑ کر دیوگڑھ ہی کو سمجھتے رہے۔

کھنڈر ہوگیا تھا۔ مسلمانوں نے اس موقع کی قدامت اور حالات کو دیکھ کر اپنا تھانہ مقرر کرکے حصار بیدر سے منسوب کیا۔ اس میں ابھی تامل ہے کہ وہ حصار بیدر کیا یہی آبادی بیدر ہے؟ مگر جو لوگ موقعی حالت کو دیکھ چکے ہیں وہ ایسی رائے نہیں رکھتے البتہ یہ حصار بیدر موجودہ آبادی (بیدر) سے چودہ میل کے فاصلہ پر مغرب میں ہے جو ایک پہاڑ پر اب تک اس حصار کے کھنڈر [illegible] یادگار تازہ کر رہے ہیں۔

غرض موجودہ آبادی کے متعلق سوائے اس کے کہ اس کے قلعہ اور آبادی کا بانی اعظم السلاطین اکیلا شخص ہے ہم اور کوئی دوسری رائے نہیں رکھتے۔ اس شہر کو اعظم السلاطین احمد شاہ ولی البہمنی نے ۸۲۵ھ میں آباد کرکے پایۂ تخت بنایا اور قلعہ کی بنیاد ڈالی۔

محمد سعید بیدری

غزل

ہجوم غم میں راحت کی جھلک معلوم ہوتی ہے
مجھے تاریکیوں میں کچھ چمک معلوم ہوتی ہے

مجھے اپنی محبت کا یقیں سا ہوتا جاتا ہے
کہ اب اشکوں میں کچھ خوں کی جھلک معلوم ہوتی ہے

محبت اصل میں شاید اسی کا نام ہے ہمدم
جو دل میں میٹھی میٹھی سی کسک معلوم ہوتی ہے

مجھے ڈر ہے یہی وجہ شکستِ دل نہ بن جائے
جو دل میں دائمی سی اک کھٹک معلوم ہوتی ہے

یہ کون آیا مریض عشق کی بیمار پرسی کو
یہ کس کو بات کرنے میں جھجک معلوم ہوتی ہے!

تری دنیا میں شاید غم سے کوئی دل نہیں خالی
دلِ ہر ذرہ میں غم کی جھلک معلوم ہوتی ہے

جمیلؔ اک خواب دیکھا تھا کبھی زلفوں کے سائے میں
چمک دل میں کچھ اس کی آج تک معلوم ہوتی ہے

جمیلؔ ملک

(ڈیوڈ لایل (Davidsyall) کے افسانوی واقعہ (According to Scots Law) کا ترجمہ ہے جس میں انسان کے بلند و لطیف نفسیاتی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔) (مدیر)

قانون

ایک دن صبح ہی صبح کہ دفتر ابھی ابھی کھلا تھا اور مسٹر جیمس ویڈر برن اپنے اجلاس پر پہنچے ہی تھے کہ ایک گاڑی گھڑ گھڑ کرتی دروازے پر رکی۔ ایک نوعمر خاتون اتری' تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی دروازے پر پہنچی اور دفتر کے بیرونی حصے میں داخل ہوئی۔

"مجھے ان وکیل صاحب سے ملنا ہے" اس نے تیز اور باریک آواز میں کہا۔ "جو اس کاروبار کے صدر ہیں ——— ابھی۔ فوراً"۔ اس غیر معمولی درخواست اور انوکھی طرز نے ہم سب کی توجہ اپنی طرف مائل کرلی اور سب کے سب اپنی میزوں سے نظر اٹھائے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ بالکل نوجوان تھی۔ ۲۳-۲۴ برس کا سن ہوگا۔ دیکھتے ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی سخت تردد میں مبتلا ہے۔ اس کا جنوبی انگلستان کا لہجہ بے حد شیریں تھا۔ بدن شمال کی بھدی لڑکیوں کے برعکس نازک تھا۔ کسی کلرک نے اس سے نام پوچھا مگر اس نے پورا جواب نہیں دیا۔

"تمہارے مسٹر ویڈر برن مجھے نہیں پہچانتے۔" اس نے کہا۔ "کہنا ایک مصیبت زدہ عورت ہوں"

اس پیام نے مسٹر ویڈر برن جیسے شخص کی مشہور سخت دلی کو بھی پگھلا دیا۔ وہ فوراً کمرہ میں بلا لی گئی اور دروازہ بند ہوگیا اور پھر ہم کچھ دیکھ یا سن نہیں سکے۔ میرے افسر نے اس ملاقات کے سارے واقعات مجھ سے بے کم و کاست بیان کردیے۔ اب میں یہ واقعہ غائب کے صیغہ میں بیان کروں گا اور جہاں میرا اپنا تعلق ہوگا اس حصہ کو ترک کرتا جاؤنگا۔ مسٹر ویڈر برن کے پاس خانگی خطوط کا ایک طومار رہتا تھا اور وہ خط کھولنے کے بارے میں بڑے اولڈ فیشن واقع ہوئے تھے۔ ہر خط اپنے ہی ہاتھ سے کھولتے اگرچہ خود زیادہ خطوط بازی کے عادی نہ تھے۔ جس وقت یہ موکلہ آئی ہے وہ خطوط کے ایک پلندے کو بیٹھے حیرت سے تک رہے تھے۔ اپنی گھومنے والی کرسی پر بیٹھے ہوئے انھوں نے ایک نصف دائرہ بنایا۔ سونے کے فریم والی عینک ناک پر درست کی اور نووارد لڑکی کو غور سے دیکھنے لگے۔

"گڈ مارننگ میڈم" انھوں نے اسی متین آواز میں کہا۔ "کیا میں آپ کا اسم شریف دریافت کرسکتا ہوں؟"

"میرا نام!" اس نے بے بسی کے انداز میں دہرایا۔ "میں اپنے نام ہی کے معاملہ میں آئی ہوں۔ آج صبح تک تو میں اپنے کو مسز ہیملٹن ویر کہتی آئی"

"اس نام سے تو میرے کان آشنا نہیں میڈم" انھوں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "میں دیکھ رہا ہوں آپ سخت مضطرب ہیں۔ فرمائیے میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

"بس یہی کہ آپ میری پریشانی دور کرسکتے ہیں" اس نے کہا اور بے چینی میں جلدی جلدی دستانے اتارنے لگی۔ "میں سمجھتی ہوں پہلے مجھے کچھ اپنے متعلق بیان کرنا چاہیے؛ ماں اور باپ دونوں ہی داغ مفارقت دے گئے۔ میرا اپنا نام گرٹ روڈ کنگ تھا۔ میرے والد محکمۂ مال کے ایک عہدہ دار تھے اور میری ماں اسکاچ تھیں۔

ابا کے انتقال کو گیارہ برس ہوئے اور جب سے ہم یہیں مقیم رہے۔ مگر میں سسکس میں گرنسٹڈ کے مقام پر پیدا ہوئی۔ دو برس قبل امی نے بھی رحلت کی اور ان کے پیچھے رہا وہ حقیر پنشن جس کی وجہ سے ہمیں بمشکل ٹھنڈی چھاؤں نصیب ہوتی تھی بند ہو گئی۔ اس وقت سے میں ایک مدرسہ میں ڈرائنگ کی استانی کا کام کرنے لگی۔"

"بڑا دردناک واقعہ ہے میڈم۔ مگر بغیر کسی غیر معمولی عنصر کے۔ اچھا آگے چلیے۔"

"امی کے انتقال پر میں نے بچا بچایا اثاثہ فروخت کرکے تجہیز و تکفین کے مصارف ادا کئے اور ایک کمرہ کرایہ پر لیکر رہنے لگی۔ نیچے درجہ کے محلے میں رہنے کی مجھے کوئی پرواہ نہ تھی اور اس سے زیادہ کی مجھ میں استطاعت بھی کہاں تھی۔ چنانچہ میں نے ایک چھوٹا سا کمرہ کھیرل کے مکان میں لے لیا جہاں اور بھی بہت سے لوگ رہتے تھے اور اکثریت مردوں کی تھی۔"

وہ یکایک رک گئی اور سینہ پہ ہاتھ رکھ لیا جیسے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس کی حالت سنبھلنے تک وکیل جاب مجسم ہمدردی بنے بیٹھے رہے۔

"اس ہمارے گھر میں مکاندارنی ہی ایک عورت تھی۔ اس نے عشرت کے دن بھی دیکھے تھے اور اب قسمت کی تنگ دامانی کے ہاتھوں نیچے آ رہی تھی۔ میں اس سے بھی بہت کم ملتی تھی۔ بالکل اکیلی اور گنگی زندگی تھی میری — یہاں تک کہ ایک کرایہ دار گاڈفری ہیملٹن سے اتفاقی طور پر شناسائی ہو گئی۔"

اس نے پھر ایک وقفہ لیا۔ مسٹر ویڈر برن نے پہلے ہی سمجھ لیا کہ اب آگے وہ کیا کہنے والی ہے۔

"مجھے آپ کو تفصیلات میں الجھانے کی ضرورت نہیں" حیرت انگیز طریقے سے وہ اپنی طبیعت کو قابو میں لاتے ہوئے بولی۔ "اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ہم بہت گہرے دوست ہو گئے اور آپس کے ربط ضبط نے خفیہ شادی کی نوبت آئی۔ وہ ایک طالب علم تھا۔ طب کا۔ بالکل باپ کا دست نگر۔ اگرچہ وہ ہیمپ شائر میں بہت دور رہتے تھے۔ اس نے کبھی ان کو اس واقعہ سے مطلع کرنے کی جرأت نہیں کی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ اس کے ڈگری حاصل کرنے سے پہلے ہمارا نکاح کر لینا اس کے لیے سخت مصیبت کا باعث ہو گا اور مجھے اس سے اس درجہ عشق تھا کہ میں اپنے لیے اس کا مستقبل تاریک ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں نے اسے توقف کرنے پر مجبور کیا۔ مگر وہ کب ماننے والا تھا۔ آخر ہمارا بیاہ ہو گیا۔ وہ فوج میں بھرتی ہو رہا تھا اور پردیس جانے کا بھی بہت کچھ امکان تھا۔ گزشتہ تین ماہ تک تو وہ نسٹلی میں رہا اور اب ہیمپ شائر میں اپنے گھر پر ہے۔"

"اس ساری مدت آپ کو تنہا چھوڑ کے؟" مسٹر ویڈر برن نے اُن اشارات میں ایک اور لفظ کا اضافہ کرتے ہوئے پوچھا جو وہ اپنی نوٹ بک میں لکھتے جاتے تھے۔

"ہاں مجھے اس کی کوئی فکر نہیں تھی۔ میں آپ اپنے پیروں پر کھڑی تھی۔ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ اس کی تعلیم پوری ہو جائے۔ میں نے اس وقت تک انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ گزشتہ ہفتے وہ گھر پہنچا اور آج صبح مجھے یہ خط ملا ہے۔ وہ خط کہ اگر آپ نے مدد نہ کی تو بس سمجھ لیجے کہ اس نے میری زندگی ہی کا خاتمہ کر دیا اور بدنامی و رسوائی کی صورت الگ دکھائی۔"

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے خط گریبان سے نکالا۔ جب تک مسٹر ویڈر برن خط کا مطالعہ کرتے رہے وہ آنکھیں بند کئے کرسی پر دراز رہی۔ جب انھوں نے خط میز پر پھینکدیا تو چونک کے اٹھ بیٹھی۔

"محترم خاتون!" انھوں نے کہا جس نسبت سے انھوں نے یہ دو کلمے ادا کئے اب تک کبھی ان کا لہجہ اسقدر ملائم نہیں ہوا تھا۔ "ایک کمینے کا خط ہے یہ۔ ایک سنگدل، خودغرض، بدمعاش کا جو اپنے مقدس بندھنوں کو توڑ دینا چاہتا ہے۔ کہتا یہ ہے کہ کوئی نکاح ہی نہیں ہوا تھا اور جس نے نکاح باندھا تھا وہ کوئی سرکاری پادری نہیں تھا اور یہ کہ اب آپ اس پر کوئی دعویٰ نہیں کر سکتیں۔ خیر دیکھ لینگے۔ دیکھ لینگے۔ اچھا اب مجھے آپ سے کئی سوالات کرنے ہیں۔ میں جواب کے لیے کوئی جلدی نہیں کروں گا۔ ہر چیز کا انحصار ان کی صحت و صداقت پر ہے۔ فرمائیے یہ نکاح کب اور کہاں ہوا؟"

"مسٹر ویر کی ایک دوست مسز فیرلی کے گھر پر۔ ۲۴ نمبر۔ ونسلو ٹیریس۔" اس نے فوراً جواب دیا اور اسی مختصر و جامع طریقے سے وہ ہر سوال کا جواب دینے کو تیار تھی۔

"مائی ڈیر مسز ویر" انھوں نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا "میں سمجھتا ہوں اس نام سے پکارے جانے کی آپ اب بھی اسیقدر مستحق ہیں جسقدر پہلے سمجھتی تھیں۔ آپ کے نااہل شوہر نے اس رسم کے ادا کرنے سے پہلے اسکاچستان کے قوانین کی کچھ ورق گردانی ضرور کی ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے وہ اس بات سے واقف نہیں جسے قانون کا ہر مبتدی جانتا ہے کہ اسکاچستان کے قانون کے مطابق مرد اور عورت کا دو گواہوں کے مواجہ میں ایک دوسرے کو میاں بیوی قبول کر لینا عین شرعی نکاح کے مترادف ہے۔"

وہ لمحہ بھر چپکی سی بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ وہ زرد پڑنے لگی۔ اس کے چہرے پر مردنی سی چھانے لگی۔ مسٹر ویڈربرن گھبرا اٹھے کہ کہیں وہ بیہوش تو نہیں ہوئی جاتی ہے۔

"گھبرائیے نہیں" وہ بولی "میں بیہوش نہیں ہو جاؤنگی۔ مگر احساسِ نجات کا اثر بہت قوی ہے" کچھ دیر وہ ساکت بیٹھی رہی اور مسٹر ویڈربرن اس کے ضبط طبیعت کا دل ہی دل میں اعتراف کرنے لگے۔ "میں نے بڑی نادانی کی۔ کوئی مجھے بیدار کرنے والا بھی نہیں تھا اور میں بے اختیار آنسو بہانے لگی۔" وہ سہولت کے ساتھ بولتی جاتی تھی۔ "میں خوش ہوں کہ خدا مجھے اتنی کڑی سزا نہیں دیگا یہی سلوک میرے لیے بہت ہو گیا۔ اب میں زیادہ سزا کی مستحق نہیں۔"

مسٹر ویڈربرن حیران تھے کہ کیا جواب دیں۔ وہ بیحد متاثر ہو چلے تھے مگر ان کے پیشے کے اعتبار سے اس قدر رقیق القلبی بالکل روایت کے خلاف تھی۔

"پھر آپ کیا کرینگی میڈم! کیا آپ اس معاملے کو میرے سپرد کرکے میری ہدایات پر عمل کرینگی؟"

"اوہ بسر و چشم۔ جو ہدایت آپ دیں گے میں اس کی تعمیل کو حاضر ہوں۔ صرف دو باتوں کا میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اول تو یہ کہ میں اب اس کے لیے نہیں بندھنے کی۔ مطلب یہ ہے کہ میں اسکے پاس واپس نہیں جاؤں گی۔ دوسرے میرا موقف دنیا کے آگے واضح کر دیا جائے۔"

"یقیناً ایسا ہی ہوگا مسز ویر۔ اس کے خاندان کو آپ کی حیثیت تسلیم کرنی اور آپ کا کفیل ہونا پڑیگا اور میں یہ سب ہو لینے تک سانس نہیں لونگا۔"

میں نے مسز ویر کو جاتے دیکھا۔ ان کے چہرے سے انتشار کے آثار مٹ چکے تھے۔ ان کے جاتے ہی مسٹر ویڈربرن نے مجھے اپنے کمرے پر بلایا اور ساری تفصیلات میرے آگے رکھ دیں جو میں نے ابھی ابھی اوپر

بیان کی ہیں۔ انھوں نے بہت جلد اپنا پیش نامہ مکمل کر لیا اور بالآخر بتایا کہ مسز ہیملٹن ویر کے ساتھ انھیں جنوبی انگلستان میں ہیمپ شائر جانا ہے۔ یہ کہتے کہتے وہ مسکرا دیے اور اس مسکراہٹ میں مجھے ایک عجیب لایعنی پن نظر آیا۔ اس مقدمے کے سوا میں نے کبھی ان کو کسی معاملے میں اس طرح ہمہ تن مصروف ہوجاتے نہیں دیکھا۔ وہ ہفتہ بھر غائب رہے۔ لندن میں چند ہم پیشہ دوستوں سے ملاقات بھی کی اور واپسی کے روز مجھے یہ ہدایت ملی کہ ہیریٹ روڈ میں ان کے گھر پر شام کے کھانے کے بعد منتظر رہوں تاکہ ان کے غائبانہ کی ساری روداد سنا سکوں۔ میں نے دیکھا بہت بشاش نظر آتے تھے اور خوش قسمتی سے میری روداد میں کوئی ناخوشگوار عنصر بھی نہیں تھا اور جب ہم چند امور طے کر چکے تو وہ اپنے کتب خانے کی بڑی کرسی پر لیٹ گئے اور سگار کیس نکال کے میرے آگے کر دیا۔

"بیٹھ جاؤ لائل دیکھو اب میں اپنی روداد سناتا ہوں۔ یہ اُن سب عجیب واقعات میں سے ہے جن سے مجھے سابقہ پڑا ہے۔ اور بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی ناول کا ایک باب ہے۔ شاید تم نے سوچا ہوگا کہ اس نوعمر موکل کے ساتھ ہیمپ شائر جانے سے میرا کیا مقصد ہوسکتا تھا۔"

"میں نے خیال کیا آپ اس کے سسرالیوں سے اس کی حیثیت تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔"

"بالکل۔ اور ہم ایک لمحہ بھی ہاتھ سے نہیں دے سکتے تھے کیونکہ اسی وقت اس ذلیل آدمی کو ہندوستان جانے کا پروانہ بھی مل چکا تھا۔"

"اور آپ نے خیال کیا کہ وہ ان سارے بندھنوں سے آزاد ہو کر ایک نئی دنیا میں پہنچ جائیگا۔" میں نے پیش قیاسی کرتے ہوئے کہا اور مسٹر وینڈربرن سر ہلانے لگے۔

"اُس لڑکی میں ایک بات تھی جس نے ابتدا ہی سے مجھے اپنی طرف مائل کر لیا تھا۔ اس کی بجائے کوئی دوسری عورت ہوتی تو بالکل مخبوط ہوجاتی۔ اس نے شروع ہی سے ہمت دکھائی اور وبر کورٹ میں تو بڑی ہی مردانگی کا مظاہرہ کیا ــــــ بڑی مردانگی کا" میں دنگ رہ گیا۔ میں نے کبھی ان کو کسی شخص یا کسی چیز کی اس قدر بے دھڑک مدح سرائی کرتے نہیں سنا تھا۔

"وہ یقیناً آپ کے منشا کو پہنچ گئی ہوگی؟"

"ہاں ہاں۔ یقیناً۔ ابھی وہ تو ایسی عورت ہے کہ جو صفت چاہو تم بلا تامل اس سے منسوب کر سکتے ہو۔ وہ ہر وقت منشا پہچان جاتی ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ میں کہتا ہوں نا۔ اس کی تعریف کو مجھے الفاظ نہیں ملتے۔ اگر مجھے ویسی ہی غلط فہمی ہوئی ہو تو خیر۔ ورنہ وہ ان میں اپنا مقام خود پیدا کر لیگی۔ اور یہ بڑی بات ہے"

اب میرے اشتیاق کا پیالہ لبریز ہو چلا گو میں جانتا تھا کہ مسٹر وینڈربرن سے جلد جلد کہلوانے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ وہ اپنے اسی انداز اور سہولت سے بولتے جاتے تھے "ہم ساتھ ساتھ لندن گئے۔ سمجھو ــــ گزشتہ پنجشنبہ کو۔ وہ رات سینٹ پینکراس ہوٹل میں مقیم رہی اور میں اپنے ایک قدیم دوست کی ملاقات کو کوئینس گیٹ چلا گیا۔ دوسرے دن حسب وعدہ ہم چاشت کے وقت واٹرلو پر ملے، وہاں سے پول پہنچے اور یہی شہر وبر کورٹ سے زیادہ قریب ہے۔"

"تو ایسے میں اسے کچھ اضطراب نہیں ہوا؟"

"جی بہت ۔ مگر اس نے اپنی طبیعت کو سنبھالے رکھا۔ غریب نے ایک لفظ بھی تو زبان سے نہیں نکالا۔ کہتی تھی ہر بات کا انحصار مجھ ہی پر ہے گو میں خوب جانتا تھا اگرچہ میں نے کہا نہیں کہ اسی پر ہر چیز کا دارومدار تھا۔ جب ہم پول پہنچے تو معلوم ہوا کہ ویر کورٹ کوئی چھ میل پر ہے۔ اثنائے راہ میں میں نے اسے اچھی طرح سکھا پڑھا دیا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے"

"وہ کیا" میں نے پوچھا۔ میرا اشتیاق ان کی چپ کو برداشت نہ کرسکا۔

"بس یہی کہ اسوقت تک کسی علحدہ کمرے میں ٹھیرے جب تک کہ میں کرنل ویر یا ان کی بیوی سے خود مل لوں یا دونوں ہی سے اگر وہ گھر پر موجود ہوں۔ ہم اچھے وقت پہنچے۔ وہ دوپہر کے کھانے پر تھے اور کرنل صاحب کے فارغ ہونے تک ہمیں کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ ہم ایک چھوٹے سے صباحی کمرے (Morning Room) میں ٹھیرے رہے۔ میں نے خانساماں کو سمجھایا کہ مجھے کرنل صاحب سے راز میں گفتگو کرنی ہے۔ اس نے مجھے کتب خانے میں لیجا بٹھایا اور میری موکلہ اسی کمرہ میں رہ گئی۔

"ہمت" میں نے جاتے ہوئے اس کے کان میں کہا۔ گو اس کی مسکراہٹ پھیکی پھیکی تھی تاہم مجھے یقین تھا کہ وہ آخر تک اپنے کو سنبھالے رہیگی۔ ایسی عورت کی اعانت کرتے ہوئے دل میں مسرت و انبساط کے چشمے ابلنے لگتے ہیں۔ سچ ہے۔ واللہ سچ ہے۔

میں کتب خانے میں بیٹھا ہی تھا کہ کرنل صاحب داخل ہوئے۔ میرے دیکھنے میں تو ایک باوقار فوجی نظر آتے تھے مگر کچھ روکھے پن کی آمیزش کے ساتھ۔ میں نے سلام کرتے میں فیصلہ کر لیا کہ جب تک مسز ویر نہ آلیں اپنے مطلب کا ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالونگا۔ لائیل! معاملات انسانی کے اس وسیع تجربہ نے مجھے بارہا دکھایا ہے کہ عورت کی ایک مسکراہٹ قانون کی لاکھوں فنون سازیوں پر حاوی ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں اپنی موکلہ کے قانونی موقف سے زیادہ مجھے "عورت کی گداز دلی" پر بھروسہ تھا اگرچہ ابھی مسز ویر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

"جناب کو دن مسعود ہو" کرنل صاحب نے اسی روکھے پن سے کہا جو ایک انگلستانی سے ایک ایسے اجنبی سے ملاقات کے وقت ظاہر ہوتا ہے جسکی ملاقات کے مقصد سے وہ بالکل ناواقف ہے۔ ساتھ ہی میرے بھیجے ہوئے کارڈ کو وہ اس انداز سے دیکھنے لگے جیسے انھیں تعارف میں اس سے کوئی مدد نہیں مل رہی تھی۔

"آپ میرے نام سے متعارف نہیں" میں نے کہا "میں ایک وکیل ہوں۔ اڈنبرا سے آرہا ہوں۔ میرا معاملہ آپ کے صاحبزادے سے ہے مگر یہ معاملہ ایسا ہے جسے سب سے پہلے ان کے والد اور والدہ کے آگے پیش ہو جانا چاہیے"۔

"اور والدہ کے آگے!" کرنل صاحب نے دُہرایا۔ اور میں نے دیکھا ان کے چہرہ پر تشویش کا ایک ہلکا سا رنگ دوڑ گیا تھا۔

"اگر کوئی تکلیف دہ چیز ہو تو میرے خیال میں لیڈی ویر کو معاف ہی رکھیے تو بہتر ہے"۔

"میں کچھ سٹپٹا سا گیا۔ مجھے اقرار ہے۔ میری موکلہ نے خاندان کا نام نہیں بتایا تھا۔ مجھے ایسا

محسوس ہونے لگا جیسے معاملہ اُبھر نہیں سکتا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ لیڈی ویر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ان کا مطلع ہونا لازمی ہے" میں نے سہولت سے جواب دیا "مجھے ایک سوال کی اجازت دیجیے۔ کیا آپ کے فرزند ہندوستان روانہ ہو چکے ہیں ؟"

"ابھی نہیں۔ پیر کو روانگی ہے۔"

"پھر گھر میں ہیں ؟"

"گھر میں ہیں" کرنل صاحب نے دُہرایا اور ساتھ ہی گھنٹی بجادی۔ "میں یقین کروں کہ آپ جو کچھ بیان کرینگے اس سے میری بیوی کو کوئی صدمہ نہیں پہنچیگا ؟" انھوں نے جلدی سے پوچھا۔

"مجھے اندیشہ ہے کہ یہ نتیجہ لازمی ہے۔ بات صرف یہ ہے ـــ کہ ـــ آپ کے فرزند نے اسکاچستان میں ایک خفیہ نکاح کیا ہے اور میں یہاں مسز ہیملٹن ویر کی حمایت میں حاضر ہوا ہوں۔"

کرنل صاحب کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا اور انھوں نے اضطراری طور پر گھنٹی کو ایک اور جھٹکا دیا "خفیہ نکاح !" انھوں نے دہرایا۔ "ہمیں معلوم تھا کہ وہاں اس کے کسی سے تعلقات ہیں اسنے اپنی ماں سے یہ واقعہ بیان کیا اور معافی حاصل کرلی۔ میں نے اسے بیگم پر چھوڑ دیا تھا۔"

"اگر آپ اجازت دیں تو ہم آگے بڑھنے سے پہلے لیڈی ویر کا انتظار کر لیں۔" میں نے لینت سے کہا۔ یہ الفاظ بمشکل میری زبان سے ادا ہوئے ہونگے کہ وہ داخل ہوئیں۔ میں نے ان کے چہرہ کا جائزہ لیا۔ معاملہ سے تعلق رکھنے والی عورت ہی پر ہر چیز کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اپنی موکلہ کے بارے میں مجھے امن ہونے لگی جب میں نے لیڈی ویر کے چہرہ کا گہری نظر سے جائزہ لیا۔ ایک حسین چہرہ ـــ عورت جیسی عورت کا ـــ جو "ماں" بھی اور سب حیثیتوں سے پہلے۔ ان کے انداز سلام میں اجنبیت جھلکتی تھی۔ ان کے میاں نے جو بے شبہ ان کے پرستار تھے فوراً کرسی پر بٹھا دیا۔

"یہ بچے کا قضیہ ہے بیگم" میں نے انھیں کھسیاتے ہوئے سنا۔ "ہمت سے کام لو" پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ بیوی کی کرسی سے لگے ٹیکے اور ان کے شانہ پر ہاتھ رکھے ہوئے۔

"اچھا مسٹر ویڈر برن ہم آپ کی بات سننے کو منتظر ہیں"

"میں نے تفصیلی روداد سنا کر وقت ضائع نہیں کیا۔ اجمالی طور سے سچے سچے واقعات ان کے آگے رکھ دیے مگر اسی میں اپنی ساری قوت استعمال کرلی۔ میں عدالت کے کٹہرے کے پاس بھی زور وکالت دکھا سکتا۔ مگر میں نے دیکھا میرے الفاظ نے میدان مار لیا تھا۔"

"آہ ـ فرینک !" لیڈی ویر نے ایک آہ کی "ہمارا جگر پارہ ! اس کے متعلق یہ سوچتے ہوئے کہ وہ ایسے بہیمانہ سلوک اور دغابازی کے گناہ میں آلودہ ہے کسقدر دردناک معلوم ہوتا ہے !"

"جب میں اپنی تقریر ختم کر چکا تو وہ اٹھیں۔ میں نے دیکھا انھیں سخت صدمہ ہوا تھا۔ ساتھ ہی مجھ یہ بھی یقین تھا کہ ان کی بلند پایہ کیفیات، تحفظ وقار کا جبلی احساس اور عدل گستری اپنا کام کر کے رہینگے۔"

"اگر آپ نے جو کچھ کہا ہے سچ ہے" وہ بولنے لگیں اور ان کی شیریں اور کھلی آواز کہیں بھی لغزش نہیں کھاتی تھی "تو ہمارے لیے بس ایک ہی راہ کھلی ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ میرے بچے کی بیاہتی سے ہمارا تعارف

ضروری ہے۔ اُسے یہاں آنا چاہیئے اور فوراً آنا چاہیئے۔"

"میڈم !" میں خوشی سے چلا اُٹھا کیونکہ اسقدر فوری ظہور مطلب کا مجھے گمان بھی نہ تھا۔ وہ یہاں موجود ہے اور بازو والے کمرہ میں ہے۔"

انھوں نے مجھے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور دوسرے لمحہ وہ کمرہ سے باہر جاچکی تھیں۔ میں نے ان کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد منٹ بھر تک کمرہ پر خاموشی چھائی رہی۔

"کیا یہ حیرت کی بات نہیں ؟" آخر کرنل صاحب بول اٹھے۔ ان کے چہرے کی جلد کے نیچے کرب وآزار گھٹ رہے تھے۔ "کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ ایسی عورت کا شکم زاد ایسی حرکت کرے جو میرے لڑکے گاڈفری نے کی ہے ؟ نظریۂ توارث کی ساری دلیلیں پاش پاش ہوئی دھری ہیں۔

"ہم کچھ دیر یوں ہی گفتگو کرتے رہے۔ مگر کرنل صاحب بری طرح متاثر ہو چکے تھے۔ آخر انھوں نے جلدی سے معافی چاہی اور جھٹ سے کمرہ سے باہر نکل گئے۔ میں اپنے خیالات کے میدان میں شہسواری کرنے کو آزاد چھوڑ دیا گیا۔ دس منٹ بعد خانساماں آیا اور صباحی کمرہ سے بلاوا لایا۔ جب میں کمرہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ان تینوں چیزوں نے اپنا اپنا اقتضاء پورا کر لیا تھا۔" عدل، حق ، اور عورت کی گداز دلی" اور باقی سے میری موکلہ کی پیاری صورت اور جادو نگار وجاہت نے بنٹ لیا تھا۔ مگر ابھی اس عجوبہ میں الم کی چاشنی پیدا ہوئی باقی تھی اور یہ اس وقت پیدا ہوئی جب گاڈفری ویر ایک مزید لاعلمی کے ساتھ طلبی کے انتثال میں بے اندیشہ منظر پر آگیا۔ میں اس کی وہ صورت کبھی نہیں بھولونگا۔ بس مردنی ہی تو چھا گئی اس کے چہرہ پر۔ بالکل بے جان نظر آنے لگا۔ اس کی سجیلی نوجوان دلھن جس سے وہ مکر چکا تھا اور بدنام کر دینے میں کچھ بھی باقی نہ رکھا تھا۔ دوسرے نسوانی ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کے ایک طرف ہو لی۔ کرنل صاحب نے سینہ پر ہاتھ باندھ لئے اور لڑکے کو گھورنے لگے۔ خدا ایسی چبھتی ہوئی نظروں سے پناہ میں رکھے۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں"۔ انھوں نے رعب دار آواز میں پوچھا۔ "کہ ایک ہونہار سپوت کے بجائے ایک کمینہ ہمارے پلے بندھے کس قدر تکلیف دہ نہ ہوگا ؟"

"الفاظ نے کوڑے کا سا تڑاخہ لگایا۔ خجالت کی کڑواہٹ اور تمتماہٹ سے اس کے رخسار تپنے اور جھلسنے لگے اور وہ ہاتھ ملنے لگا۔ مگر اس نے زبان نہیں کھولی اور بولتا بھی تو کیا بولتا۔ کس منہ سے بولتا ؟ اپنے کرتوت اس پر عیاں تھے۔ وہ خط جو اس پر تعزیں کر رہا تھا، اور جس نے ایک عورت کا کلیجہ نچوڑ ڈالا تھا، میز پر کھلا پڑا تھا۔ وہ الفاظ جو اس نے اعتذار میں تراشے تھے ہونٹوں ہی پر پھسل کے رہگئے میں اس منظر کی تفصیلات پورے طور پر پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ جب اس لمحہ کی شدت کشاکش اور تناؤ میں ڈھیلا پن پیدا ہوا تو پھر گفتگو ہونے لگی آخر میں سب ایک سمجھوتے کی طرف آنے لگے۔ اتنے میں میری موکلہ کچھ بولنے لگی اور میں سمجھتا ہوں ابتداء میں کسی نے اس کی بات سنی بھی نہ ہوگی"

"میں جس مقصد کے لئے آئی تھی حاصل کر چکی" وہ صاف صاف بولنے لگی اور اس نے لیڈی ویر کے چہرہ سے نظریں نہیں ہٹائیں۔" میں نے اچھی طرح سے ثابت کر دیا ہے کہ میں آپ کے فرزند کی

شرعی اور جائز ہوی ہوئی۔ میں آپ کی شفقت اور مہربانی کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ اب رہا " ان " کا معاملہ تو میں اپنی خوشی سے دو بارہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گی۔ اور نہ کبھی منہ لگاؤں گی۔ مسٹر ویڈربرن! اگر آپ تیار ہیں تو بسم اللہ ہم روانہ ہو جائیں "۔

" میں نے دیکھا اس کی طاقت جواب دے رہی تھی۔ دوسرے لمحہ وہ بے قابو ہو جاتی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ مگر لیڈی ویر بیچ میں آگئیں "۔

" مگر پیاری تو یوں تو نہیں جا سکتی۔ تو میرے بچہ کی دلہن ہے۔ اس نے جو کچھ کیا سو کیا مگر اب تو تو ہماری ہے۔ میرے کوئی بچی نہیں اللہ پاک نے تجھے ہمیں بخشا ہے۔ آ! رہ جا ہمارے ساتھ!! "

" میری موکلہ نے جلدی سے لیڈی ویر کا ہاتھ لے کے لبوں سے لگا لیا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا "۔

" نہیں نہیں۔ میں نہیں رہ سکتی۔ مجھے جانے دیجئے " اور میں نے انھیں اشارہ سے کہہ دیا کہ ہمیں جانے ہی دیں "۔

" رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائیگا " میں نے لیڈی ویر سے کھسیاتے ہوئے کہا۔

" میں سمجھتا ہوں وہ اس وقت حق پر ہے۔ بعد میں کوئی بھی راہ نکل سکتی ہے "

" انھوں نے مہربانی کی کہ ہمیں چھوڑ دیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ دنیا کی کوئی قوت اسے وہاں روکنے پر قادر نہیں۔ اس شخص کی صورت کا پیش نظر ہو جانا جس نے اس سے دغا کی تھی اس کی برداشت سے بالکل باہر تھا "۔

" یہاں مسٹر ویڈربرن نے ایک وقفہ لیا اور میں نے دیکھا اس واقعہ نے ان کے دل پر عجیب طرح سے اثر کیا تھا۔

" تو کیا وہ واقعی آپ کے ساتھ اسکاچستان واپس آگئی؟ "

" یقیناً۔ آج شام میں لیوں ٹرس کی قدیم قیام گاہ پر چھوڑ آیا اور میرا خیال ہے وہ پیر کے دن سے پھر تعلیم دینے میں مشغول ہو جائیں گی۔ اور یہ وہی دن ہو گا جس دن اس کا شوہر ہندوستان کی طرف کوچ کریگا "

ارے! تو پھر نتیجہ ہی رہا؟ " میں نا امیدی سے پوچھ اٹھا۔

" نہیں بابا! " میرے افسر نے اپنے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولوں کو تاکتے ہوئے جواب دیا ابھی نتیجہ باقی ہے۔

(ڈیوڈ لایل)

(مترجمہ)
محمد وقارالدین صدیقی

ٹھوکریں

میرے دوست کسی بڑے مفکر کا قول ہے کہ عقل کا کام جذبات کے لئے راستہ صاف کرنا ہے۔ اگر آپ کی عقل نے آپ کے جذبات کی رہنمائی کی ہے تو یقیناً آپ کی زندگی ہیجانوں سے نا آشنا ہوگی اور آپ محبت کے جھمیلوں سے دامن کش ہی رہے ہوں گے۔ خوش قسمت ہے وہ شخص جس نے محبت کے صدمے نہیں اٹھائے یقین جانئے محبت کا آغاز جس قدر پُر کیف ہوتا ہے انجام اسی قدر تلخ۔ یہی ایک حقیقت ہے، جو افسانہ بنتی رہتی ہے۔ مگر ہم نے جذبات کی اندھا دھند پیروی کی ہے اور اسی جوشِ جنون میں ہم نے تمنا کی تھی۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل، لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

دل کی یہ کبھی کبھی کی تنہائیاں ہی تو غضب ڈھاتی ہیں۔ بھولی ہوئی محبتوں کی یورش ہوتی ہے۔ کچھ یاد آتا ہے اور دل کے زخم تازہ ہو جاتے ہیں۔ میرا سن چھے، سات سال کا ہوگا اپنے والد کے ساتھ میں ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ ہمارے محلہ میں ایک بڑے زندہ دل ملازم سرکار رہتے تھے۔ میں اسکول سے چھٹ کر وہیں جاتا۔ ان کے پاس ایک عورت تھی وہ عورت مجھے ہر روز آنے کے لئے کہتی۔ وہ عورت گوری چٹی نہ تھی، حسین نہ تھی۔ بس ایک عورت تھی، جسے ہارمونیم بجانا آتا تھا۔ اور گانا بھی آتا تھا۔ میں وہاں گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ بیٹھا گھورتا رہتا۔ اس عورت کو۔ اس گانے بجانے والی عورت کو، اور اندر ہی اندر میرا دل ایک عجیب گھلاوٹ سی محسوس کرتا۔ وہ گاتی، مجھے بھی ساتھ دینے کے لئے کہتی اور میں جب اس کے ساتھ گانے لگتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میری آواز ہی نہیں۔ میری زندگی بھی اس کا ساتھ دینے کے لئے تخلیق ہوئی ہے۔ کہاں میں چھے سات سال کا بچہ اور کہاں وہ بیس پچیس سال کی عورت۔ لیکن مجھے عمر سے کیا سروکار تھا میں تو اس کی آواز اور ہارمونیم پر ناچنے والی انگلیوں کا دیوانہ تھا۔

میں گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا رہتا اور جب وہاں سے زبردستی اٹھا دیا جاتا تو راستہ بھر سوچتا رہتا کہ اگر کبھی میری شادی ہوگی، کسی عورت کو میں اپنی بیوی بناؤں گا تو وہ ایسی ہی عورت ہوگی۔ میرے والد کا تبادلہ ہو گیا تو مجھے اس گاؤں کو چھوڑنا پڑا۔ جانے سے پہلے میں اس عورت سے ملا۔ اس نے اپنا صندوق کھولا۔ اس میں سے.... ایک قلم نکالا۔ کافوری قلم، جس پر پھول پتے بنے ہوئے تھے۔ اس قلم کو اس نے میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ کچھ دیر میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے مجھے اپنی گود میں اٹھا لیا اور میری پیشانی اور گالوں کو چومنے لگی۔ جب میں جانے کو ہوا تو اس نے مجھے ہاتھ کے اشارہ سے روکا اور ہارمونیم لے کر بیٹھ گئی۔ اس طرح دل لگا کر گانے لگی کہ میں رو پڑا۔ اسی طرح روتے ہوئے میں وہاں سے چلا گیا اور وہ بھی میرے ساتھ ہو گئی، میرے دل میں بیٹھی ہوئی۔ پتنگ ہوا میں اڑتی ہے تو ڈور بھی ساتھ رہتی ہے۔ لیکن اس معصوم محبت کی ڈور ٹوٹ گئی۔ ایک نوخیز الھڑ لڑکی نے لوٹ لیا۔ مگر اس کا قلم اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ جانے کب تک رہے۔ میرے دل سے کھیلنے والی یہ دوسری لڑکی میری رشتہ دار تھی۔

میں گانے کا شوقین ہوگیا تھا۔ جب بھی موقع ملتا میں تانیں اڑاتا رہتا۔ جانے کس گیت کا اثر تھا کہ اس نے ایک دفعہ کچھ عجیب انداز سے دیکھا اس طرح کہ میرا دل زوروں سے دھڑکنے لگا۔ جیسے کچھ میں نے چرالیا۔ اس وقت میں اپنے بزرگوں کی روک ٹوک اور نگرانیوں سے محبت کو چوری ہی سمجھنے لگا تھا۔ اس لڑکی کی نظروں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میں ہر وقت اس کے خیال میں گم "کیا کرنا چاہئیے" "اور کیا ہوگا" کی ادھیڑ بن میں لگا رہتا۔ ایک رات گرمی کے مارے برا حال تھا۔ سب کے بچھونے باہر صحن میں بچھ گئے۔ جس پلنگ پر وہ سو رہی تھی وہ میرے پلنگ سے ساتواں تھا سات پلنگ میرے اور اس کے درمیان حائل تھے۔ مجھے اس رات نیند نہ آئی۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی، اس نے موتیا کے پھول اپنی چوٹی میں گوندھے تھے۔ وہ موتیا کے خوشبودار پھول وہ اس کا دمکتا چہرہ اور وہ اس کے چمکیلے بال مجھے نیند نہ آئی۔ اتنے میں زور کی آندھی چلنے لگی سب لوگ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور چھپر کے سائبان میں سونے کی صلاح ہوئی۔ سائبان کے نیچے بھی بچھونوں کی وہی ترتیب رہی۔ سات پلنگ میرے اس کے درمیان حائل رہے۔ آندھی کا زور بڑھنے لگا اور یکایک سائبان کا ایک بانس ٹوٹ گیا۔ سائبان اڑا اڑا دھم زمین پر آرہا۔ میں ہڑبڑا کر اپنے پلنگ سے اٹھا اور اس لڑکی کے پلنگ کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ ہوشیار ہوگئی تھی لیکن اس حادثے سے اس کے ہوش و حواس ٹھکانے سے نہ تھے۔ میں نے بے اختیار اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھالیا اور باہر نکل گیا۔ میرے اطراف سب گھروالے جمع ہوگئے۔ سب کی نظریں کچھ پوچھ رہی تھیں۔

اس تاریخ اور واقعہ کے بعد سے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے نہ دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد اس لڑکی کی شادی بھی ہوگئی۔ اب بھی میں کبھی کبھی اس لڑکی سے ملتا ہوں۔ وہ ہر دفعہ اس واقعہ کی یاد دلاتی ہے۔ کیا وہ کبھی نہ بھولے گی اس طرح یاد رکھ کر اور یاد دلا کر آخر اس کا مقصد کیا ہے؟

زندگی نکھرے آسمان پر بہنے والے اکیلے ابر کے ٹکڑے کی طرح سست رفتار اور بے سہارا ہوگئی۔ دل کے ہر گوشے سے گرم بخارات اٹھتے محسوس ہونے لگے کہ پھر وہی چھیڑ۔ میں نے ان کو نہ دیکھا۔ انھوں نے مجھ کو دیکھا۔ ہاں بعض وسائل ایسے تھے کہ انھیں میرے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوگیا۔ وہ اپنی سہیلیوں سے کہتیں "میں ان سے محبت کرتی ہوں" اور میں اپنے دوستوں سے کہتا "وہ مجھ سے محبت کرتی ہیں" اکثروں کو شبہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن یقین مانئیے نہ ہم نے ایک دوسرے کو خط لکھے نہ کہیں ہماری ملاقات ہوئی۔ بس دل ہی دل میں شاید ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے اور محبت کرتے ہیں۔ اور اسی محبت کی شہرت ہے۔ وہ اب بھی کہتی ہیں کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے اس محبت کا انجام کیا ہوگا؟ یہ محبت بھی ایک دن مٹ جائے گی۔ ہاں میں محبت کی پائداری کا قائل نہیں ہوں۔

ایک تلخ تجربہ نے مجھے عورتوں اور محبت کا مخالف بنا دیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ محبت میں فریقین ایک دوسرے سے بے وفائی کی امید رکھتے ہیں اور ہر ایک اپنی ہی محبت کو "مجنونانہ" ثابت کرتے ہوئے دوسرے کی محبت کو غرضی یا مطلبی بتلاتا ہے۔ لیکن میں نے ان سے جو محبت کی تو میرے دل میں کسی مطلب یا غرض کا شائبہ تک نہ تھا۔ میں ان کے حسن یا شباب کا وارفتہ نہ تھا۔ مجھے ان میں ایک خاص کشش محسوس ہوتی تھی۔ ایک ایسی کشش جو صرف دل کی پاکی اور گرمی کے زیر اثر پیدا ہوتی ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ مجھ سے بدظن رہیں۔ آخر اسی بدظنی میں انھوں نے اپنے لئے ایک دوسرے مرد کا انتخاب کرلیا۔ میری خوش قسمتی یا بدقسمتی کہ اس نے

ان کے ساتھ دغا کی اور وہ پھر میری طرف متوجہ ہوئیں۔ میں اب بھی ان کے لئے اپنے دل میں محبت ہی پاتا تھا وہ بدستور بدظن ہیں۔ کہتی ہیں "تم جھوٹے تمہاری محبت جھوٹی"۔ ان کی بدظنی نہیں نہ جانے اور کتنی ٹھوکریں کھلوائے۔ میں سوچتا ہوں جب ان کی بدظنی دور ہو جائے گی۔ کیا اس وقت بھی میں ان سے محبت کرسکوں گا؟۔ شاید۔

حسن اور محبت کی یہ یورشیں ہی کیا کم تھیں کہ ایک اور "محبت نامہ" وصول ہوا جنھیں میں ایک محترم خاتون سمجھتا تھا انھوں نے لکھ بھیجا تھا کہ "رات کا کھانا" ان کے ساتھ کھاؤں۔ وہ رات میرے لئے بڑی صبر آزما رہی۔ بڑا پرتکلف انتظام کیا گیا تھا۔ باتوں باتوں میں پوچھ بیٹھیں "محبت کیا ہوتی ہے" اور اس سوال نے ان کی آنکھوں میں وہ خاص چمک پیدا کردی، جو محبت کی پیاس سمجھی جاسکتی ہے۔ میں نے انھیں اپنے سے دور رکھنے کے لئے اپنی محبت کی ساری داستانیں بیان کردیں (ان میں زیادہ تر فرضی اور من گھڑت افسانے تھے) کہنے لگیں "آپ تو چھپے رستم ہیں۔ ہمیں بھی سکھائیے نا محبت"۔ کون میں؟ میرا دماغ چکرانے لگا۔ وہ اس طرح مگن ہوگئیں جیسے میں انھیں مایوس کرہی نہیں سکتا وہ اپنے پلنگ سے اٹھیں میرے قریب سے گزریں۔ ان کا پلو میرے چہرہ پر لہرا گیا اور وہ گنگنانے لگیں "تیرے من میں بسوں گی — او" میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ لیکن انھوں نے راستہ روک دیا "آپ صبح جائیے۔ اتنی اندھیری رات میں آپ کیسے گھر جاسکیں گے"۔ کس طرح میں نے ان سے چھٹکارا پایا ہے، میرا ہی دل جانتا ہے۔ دوسرے دن میں نے اپنے ایک دوست سے رات کا واقعہ بیان کردیا۔ اس دوست نے کسی سے کہا اور کسی نے ان سے کہدیا۔ بہت چراغ پا ہوئیں۔ مجھے بہت برا بھلا کہا اور جہاں کہیں بھی میرا ذکر آتا ہے۔ کہتی ہیں "اس سے تو مجھے نفرت ہے"۔

محبت اور نفرت کے اس ہجوم میں دل دھڑک رہا ہے۔ محبت کی آڑ لے کر بہت سی نادانیاں کربیٹھے بہت سی کامرانیاں حاصل ہوئیں۔ لیکن اب دل کی تنہائی سے وحشت ہوتی ہے۔ عقل کو آگے ہی آگے رکھنا چاہتا ہوں اور دل کی باگ مضبوطی سے تھاما ہوا ہوں۔ اب اس کی سرکشی میری جان پر بنا دے گی۔ لیکن ان حالات میں سکون اور یکسانیت زندگی کو کچھ اس درجہ بے کیف بنا دیتے ہیں کہ بے اختیار کسی ہلچل سے آشنا ہونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن میں اپنے کنج عافیت سے باہر نہیں نکلتا۔ بیتے ہوئے حادثوں کو یاد کرلیتا ہوں۔ سکون کے سارے بوجھل پردے چاک چاک ہوجاتے ہیں اور دل کی دنیا زیر و زبر ہوجاتی ہے۔ ماضی کے لئے میں اپنے حال اور مستقبل سے دامن کش نہیں ہونا چاہتا۔ ٹھوکروں سے سنبھلتے اور اپنی منزل سے قریب ہوچکنے کے بعد میں لوٹ کر پھر ان پتھروں میں گھرنا نہیں چاہتا۔ رکتاؤں، ٹانگوں اور موٹروں کے ہٹتے سرکتے پردوں کی اوٹ میں مجھے کھوئے ہوئے جلووں کی جھلملاہٹیں دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن میرے دل میں کوئی چنگاری نہیں چٹکتی! کسی سے میری مڈبھیڑ بھی ہوجاتی ہے۔ بے رخیاں، شکایتیں، عتاب اس کے سوا بھی کچھ ہو تو میرے سر آنکھوں پر۔ لیکن اب میں کیا کرسکتا ہوں اور کوئی مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ ان آنکھوں میں مجھے وہی پہلے کی سی ہمت افزائیاں جھلکتی نظر آتی ہیں۔ ان کے حسن کی تمنا ہیٹیں للکار للکار کر پوچھتی ہیں "ہم نے مایوس کیا تو پھر تمہیں جینے کا حق کیسے ملے گا"۔ میں محبت کو نشاطِ زندگی سمجھتا ہوں۔

سوہانِ روح ...... نہیں میں اپنی موت سے ایک بار اپنا دامن چھڑا لیتا ہوں۔

کہیں سے دعوت نامے وصول ہوتے ہیں۔ بچھڑنے سے ملنے کے جتن کئے جاتے ہیں لیکن میں پوچھتا ہوں۔ اس کے بعد۔ میری عقل کی نارسائیوں پر مچل جاتے ہیں۔ دوسرے طریقوں سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے ہاتھ کا پان تو اس کو ہمیشہ سے بڑا مزیدار معلوم ہوتا ہے۔ بتا دوں۔ آپ کو یاد ہے وہ رات ٹانگہ سے ہم دونوں گر پڑے تھے۔ آپ اور میں۔ کس بری طرح گرے تھے۔ اچھا ہوا رات تھی۔ اور بھئی شادی کی تو میں قائل نہیں۔ آپ جو چاہیں سمجھیں "میں پھر بھی کچھ نہیں سمجھتا یا سمجھتا بھی ہوں تو اپنی سمجھداری کو ناسمجھی کے پردہ میں چھپانا چاہتا ہوں۔ آپ تو بالکل بدل گئے۔ وہ جمائی لیتے ہیں۔ میرے پاس ان کے لئے "شب بخیر" کے سوا اور کیا رہتا ہے۔

بعض اپنی شادیوں میں جاتی ہیں۔ میں شریک ہوتا ہوں اور مجھے خوشی ہوتی ہے۔ بعض اپنی "نئی ملاقاتوں" سے تعارف کرانے کے لئے بلا بھیجتی ہیں۔ میں جاتا ہوں اور ان دو گرفتاروں کی قسمتوں پر روتا ہوں کہ جس جال میں پھنسے ہو اس سے چھوٹو گے بھی تو ہائے ہائے کرنے کے لئے"

چند دل والیاں ایسی بھی نکلیں جنھوں نے "پریم سندیسہ" بھیجا۔ محبت کے کھیل میں مقابل ہونے کے لئے آواز دی۔ اپنی طرف سے ہر طرح اطمینان دلایا۔ لیکن انھوں نے راکھ کی ڈھیر پر ہاتھ مارا تھا۔ گرمی محسوس نہ ہوئی تو انھوں نے اس ڈھیر کو پھونک مار کر اڑا دیا۔ اچھا ہی کیا! میری دعائیں ان کے لئے۔

اب بھاگتا ہوں سایۂ عشق بتاں سے میں		کچھ دل سے ہوں ڈرا ہوا کچھ آسماں سے میں

یہ "کارنامے" اس شوہر کے ہیں۔ جو اپنی زندگی میں۔ میرا دوست اور اپنی بیوی کا پاکباز شوہر تھا۔ آج میری بیوہ بھابی مرحوم کی معصومیوں اور وفا شعاریوں کا ذکر کرتے تھکتی نہیں۔ اسی کے سوگ میں اپنی زندگی گزار دینا چاہتی ہیں۔ ایسے فرشتے ہم انسانوں میں کہاں؟

رشید قریشی

تنقید و تبصرہ

عہد نبوی کے میدان جنگ

از ڈاکٹر محمد حمید اللہ استاد قانون جامعہ عثمانیہ
مطبوعہ انتظامی پریس حیدرآباد دکن

یہ ۵۶ صفحات کا ایک رسالہ ہے جو دراصل مجموعۂ تحقیقات علمیہ جامعۂ عثمانیہ میں چھ سات سال قبل بہ حیثیت مضمون کے شائع ہوا تھا - بعد کو لائق مولف نے نظر ثانی اور ترمیم و اصلاح کے ساتھ اسے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔

یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن مولف نے عہد نبوی کی جنگوں کے حالات اور ان کے محل وقوع نہایت تحقیق اور تلاش سے قلمبند کئے ہیں اور چونکہ ان مقامات کا جہاں یہ جنگیں لڑی گئی تھیں مولف نے نہ صرف بچشم خود معائنہ کیا بلکہ ان کے فوٹو بھی لئے اور نقشے بھی تیار کئے جو اس کتاب میں شریک ہیں اس لحاظ سے یہ کتاب بہت گراں قدر اور گہری معلومات کی حامل بن گئی ہے - اب تک غزوات نبوی سے متعلق زیادہ تر تاریخی اور روایتی واقعات کتابوں میں درج کئے جاتے تھے لیکن ڈاکٹر حمید اللہ نے پہلی بار سائینٹفک نقطۂ نظر سے ان لڑائیوں پر نظر ڈالی ہے جس کے مطالعہ سے نہ صرف عہد نبوی کی جنگوں کے اسباب ذہن نشین ہو جاتے ہیں بلکہ اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے پیغمبر اسلام کی قیادت میں کس طرح اپنے دشمنوں کو مغلوب اور مرعوب کیا تھا اور جنگ کرنے کے کتنے اچھے ڈھنگ انھوں نے رائج کئے تھے -

یہ کتاب اس قابل ہے کہ نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ عام تاریخ اور سیاسیات کے طلبہ بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں -

ہندوستان کے معاشی مسائل

از محمد ناصر علی ایم اے لکچرار معاشیات جامعہ عثمانیہ

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

تقریباً چار سو صفحات کی ضخیم کتاب ہے جس میں مولف کے تیس تیس مضامین یک جا کر دئے گئے ہیں - ان سب مضمونوں کا تعلق ہندوستان اور حیدرآباد کے معاشی مسائل سے ہے - ناصر علی صاحب جامعہ عثمانیہ کے ایک لائق تعلیم یافتہ ہیں اور اس سے قبل انھوں نے کئی مضامین اور کتابیں لکھیں اور شائع کی ہیں - معاشیات پر جتنا تحریری کام اردو میں انھوں نے گزشتہ چند سالوں کے قلیل عرصے میں کیا ہے اتنا کام کسی اور شخص نے یا کسی اور زمانے میں اس زبان میں نہیں کیا گیا -

وہ اپنے مضمون پر بخوبی حاوی ہیں اور عوام کو معاشی مسائل سمجھانے کے لئے جس انداز بیان اور نقطۂ نظر کی ضرورت ہے اس سے اچھی طرح واقف ہیں - توقع ہے کہ ان کی یہ کتاب بھی پڑھے لکھے لوگوں میں ہندوستان کے معاشی مسائل سے متعلق ضروری معلومات میں اضافے کا باعث ہو گی -

نشتر اک

- از جہاں بانو بیگم لکچرار اردو کلیۂ اناث جامعہ عثمانیہ

جہاں بانو بیگم حیدرآباد کی ان تعلیم یافتہ خواتین میں سے ہیں جنھوں نے اپنے ذوق ادب اور انشا پردازی کی بنا پر ممالک محروسہ کے باہر بھی اچھی شہرت حاصل کی ہے - ان کے ادبی و تنقیدی مضامین کے دو چار مجموعے اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں - یہ کتاب بھی ان کے مزاحیہ اور سماجی مضمونوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے - اس میں چھوٹے چھوٹے ستائیس مضمون شریک ہیں - جہاں بانو بیگم کا اسلوب بیان بہت دلچسپ ہے اور ان کی ہر عبارت میں ایک خاص شوخی اور طنز کی جھلکیں نظر آتی ہیں - وہ اپنے مضمون میں مٹھاس کو بھی تلخی میں تبدیل کر دیتی ہیں - واقعہ یہ ہے کہ

اردو ادب میں اب تک خواتین کی جو کتابیں یا مضامین ہم دست ہوتے ہیں ان سبھوں میں جہاں بانو بیگم کی کتابیں اپنے طعن و طنز کی بناء پر ایک خاص حیثیت رکھتی ہیں۔ عہد حاضر کی خواتین میں وہ اپنے اس مخصوص انداز کی وجہ سے بہت ممتاز ہیں اور ان کی یہ تحریریں اردو کے مزاحیہ اور طنزیہ ادب میں اضافے کا باعث ثابت ہو رہی ہیں۔ جو لوگ دنیا کو اس خاص نقطۂ نظر سے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں ان کے لئے اس مجموعۂ مضامین کا مطالعہ بہت ہی دلچسپ ثابت ہوگا۔

سیر افغانستان

از سید سلیمان ندوی مطبوعہ نفیس اکیڈیمی حیدر آباد۔

۱۹۳۳ء میں نادر شاہ والی افغانستان نے علامہ اقبال، سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کو کابل آنے کی دعوت دی تھی تاکہ ان تینوں کے مشورے سے افغانستان میں نظام تعلیم کا ایک اچھا سلسلہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ یہ تینوں اصحاب اکتوبر ۱۹۳۳ء میں کابل گئے اور وہاں دو چار روز قیام کیا۔ اس مختصر قیام میں نادر شاہ اور ان کے عمائد سلطنت اور افغانی عالموں اور ادیبوں سے ان تینوں نے مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کیا اور اپنے مشوروں سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔

زیر نظر کتاب میں اپنے اور اپنے ہم سفروں کے تجربات سفر کو مولوی سید سلیمان ندوی نے اپنے سلیس اور دلچسپ انداز میں قلمبند کیا ہے اور جگہ جگہ ان کے قلم سے ایسے دردمندانہ اور پُر کیف جملے نکل پڑتے ہیں جن کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک حساس اور صاحب ذوق عالم اپنے شاگردوں کو ساتھ لئے ہوئے سفر کر رہا ہے اور آثار کی تحقیق و تاریخ کے ساتھ ساتھ مزید مطالعہ کے لئے دوسرے ماخذوں کی طرف بھی توجہ دلاتا جاتا ہے۔

یہ کتاب اگرچہ ایک باضابطہ سفرنامۂ افغانستان نہیں ہے لیکن ہندوستان کے ایک مشہور عالم و فاضل کے ایسے احساسات پر مشتمل ہے جو انھوں نے افغانستان کے سفر کے درمیان قلمبند کئے تھے اس لئے اس کی اہمیت ایک معمولی سفرنامے سے بہت زیادہ ہے۔

یونان اور روما کے انوکھے قصے

از امجد علی ناشر حیدر آباد بک ڈپو۔

اس چھوٹی سی کتاب کے مصنف امجد علی صاحب ہیں۔ جو اس سے قبل مصوری اور تاریخ حسن کاری کے موضوعوں پر مختلف کتابیں شایع کر چکے ہیں۔ یہ کتاب بھی انھوں نے اپنے ذوق حسن کاری کی تشریح ہی کی خاطر لکھی ہے۔ اس لئے کہ قدیم حسن کاروں نے یونان و روما ہی کے دیومالا کے کرداروں کو تصویروں اور مجسموں کے قالب میں ڈھالا ہے جن کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان قصوں سے واقفیت ہو جن پر قدیم مصوروں اور بت تراشوں کی تصویریں اور مجسمے مبنی ہیں۔

یوں بھی اردو زبان میں انگریزی اور یوروپین زبانوں کے توسط سے یونان اور روما کے مختلف افسانوی کرداروں کے نام اور حوالے نظر سے گزرتے رہتے ہیں لیکن اردو میں کوئی ایسی کتاب اب تک شایع نہیں ہوئی ہے جس میں ان تلمیحات کی تشریح کی گئی ہو اس لئے یونان و روما کے انوکھے قصوں کا یہ مجموعہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا اور افسانوی لطف کے علاوہ پڑھنے والے کو یونان اور روما کے دیومالا سے بھی واقف کرائے گا۔

دلکش شخصیت

از برزوجی فیروز شاہ تاراپوری ناشر۔ راج پبلشنگ ہاؤس حیدر آباد

یہ کتاب مشہور مفکر و ماہر نفسیات مسٹر الیف اوس کی انگریزی کتاب وننگ (Winning)

پرسنیالٹی کا اُردو ترجمہ ہے۔ مترجم برزوجی فیروزشاہ حیدر آباد کے ایک صاحب ذوق پارسی بزرگ ہیں جن کو اردو ادب اور تصنیف و تالیف کا بھی بڑا اچھا ذوق حاصل ہے۔ چنانچہ انھوں نے اب تک اس زبان میں کئی کتابیں تالیف و تصنیف کی ہیں جن میں برنارڈ شاہ کے ڈرامے جون آف آرک کا ترجمہ مظلوم دوشیزہ بہت مقبول ہو چکا ہے۔

زیر نظر کتاب ایک شہرۂ آفاق اور مفید انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے اور اس کا مطالعہ ہر ایسے نوجوان کے لئے ضروری ہے جو اپنی زندگی میں کامیابی اور ترقی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے جن کے عنوان ہیں شخصیت، شعوری شخصیت، نیم شعوری شخصیت اور عملی شخصیت۔ ان چاروں ابواب میں متعدد ذیلی سرخیوں کے تحت یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ زندگی کو کامیاب اور خوش بنانے کے لئے انسان کو کیا طریقے اختیار کرنے چاہئیں واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک بہترین اصلاحی کتاب ہے اور اگر اس کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کیا جائے تو بہت سی مایوس اور ناکام زندگیاں امید اور کامرانی سے مملو ہو جائیں گی۔

انگریزی کتاب کا اسلوب بیان خشک اور ناصحانہ ہے مترجم نے اپنے اردو اسلوب کو شگفتہ اور کاروباری بنانے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے پڑھنے والے پر کسی قسم کا دماغی بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔ توقع ہے کہ طلبہ، عوام اور کاروباری اصحاب اس کتاب کو پڑھ کر اپنی زندگیوں کو سنوارنے اور اپنے کاروبار کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہوں گے۔

گریز از عزیز احمد۔ ناشر مکتبۂ جدید، لاہور

یہ ایک ناول ہے جس کے مصنف عزیز احمد سابق لکچرار انگریزی جامعہ عثمانیہ اپنے ذوق تصنیف و تالیف کی وجہ سے جامعۂ عثمانیہ کے فیض یافتوں میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس سے قبل ترقی پسند ادب پر بھی ایک کتاب شایع کی ہے۔ اور ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "ماہ لقا اور دوسری نظمیں" ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شایع ہو چکا ہے۔ زیر نظر ناول حیدرآباد اور ہندوستان کے ان نوجوانوں کی سماجی زندگی اور ذہنی کشمکش کا ایک بہترین آئینہ ہے جو ہندوستان سے باہر خاص کر یوروپی ممالک کو تعلیم کے لئے جاتے ہیں۔ اس کے کردار اور اس کا خاکہ ہر ہر قدم پر نوجوانوں کی گریزی خصوصیات کو واضح کرتا جاتا ہے۔ اس کتاب میں پلاٹ کے علاوہ اس وجہ سے بھی ایک طرح کی دلکشی پیدا ہو گئی ہے کہ اس میں عام ناول نگاروں کی طرح محض سنی سنائی باتوں پر تبصرے کی تعمیر نہیں کی گئی ہے بلکہ مصنف نے زندگی کے ان تمام شعبوں کا مشرق اور مغرب میں بچشم خود معائنہ کیا ہے جن کا ذکر اس ناول میں نہایت ہی خلوص اور بے باکی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول خود مصنف کا سفرنامۂ یورپ ہے۔ یوروپی زندگی کی عام عریانی اور اخلاق باختگی کو مصنف نے بعض جگہ اتنی بے تکلفی سے بیان کیا ہے کہ عریانی جھلکنے لگتی ہے۔ کتاب کا اسلوب جدید اور ترقی پسند ادب کی اکثر کتابوں کی طرح نہایت بے باک ہے لیکن زبان میں شائستگی اور نفاست بھی پائی جاتی ہے۔ توقع ہے کہ یہ ناول جدید اردو ادب میں بے باکی اور شائستگی کے امتزاج کا ایک اچھا نمونہ ثابت ہوگا۔

"ق"

نئی زندگی۔ اڈیٹر سید انیس الرحمٰن صاحب قیمت اسپیشل نمبر ایک روپیہ۔ چندہ سالانہ چھ روپے ملنے کا پتہ دفتر نئی زندگی الہ آباد

رسالہ نئی زندگی اردو زبان کا واحد سیاسی رسالہ ہے۔ عام طور پر سیاسیات عالم اور خاص طور پر جو ہندوستان کی سیاسی زندگی سے واقف ہونا چاہیں، ان کے لئے یہ رسالہ بہت زیادہ کارآمد ہے اور یوں بھی تعلیم یافتہ طبقہ کا سیاسیات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ زیر تبصرہ شمارہ سان فرانسکو نمبر ہے۔ چار ابواب کے تحت مختلف عنوانات قائم کرکے مضامین شائع کئے گئے ہیں۔ سب مقالے غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ لکھائی چھپائی عمدہ اور کاغذ بھی اچھا ہے۔

مظلوم دوشیزہ ۔ مترجمہ برزو جی ۔ فیروز شاہ تاراپور والا قیمت تین روپے مجلد تین روپے آٹھ آنے علاوہ ۔ حجم ۔ صفحہ (۲۶۳) ملنے کا پتہ ۔ نفیس اکیڈمی عابد روڈ ۔ حیدرآباد دکن ۔

جون آف آرک کے نام سے کون واقف نہیں۔ انگلستان کے مشہور ڈراما نویس برنارڈ شا کے ڈرامے جون آف آرک کو مترجم نے اردو جامہ پہنایا ہے۔ زبان گوارا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ المیہ ڈراما کی پوری دلچسپی ترجمہ میں بھی باقی رہے۔

دنیائے شہرزاد از محترمہ آلسنہ محمودہ رضویہ (ادیب فاضل) قیمت ۔ عا/ حجم صفحہ ۱۶۶ ملنے کا پتہ ۔ عباسی کتب خانہ ۔ جونا مارکٹ یا بشیر احمد اینڈ سنز جونا مارکٹ کراچی

محترمہ رضویہ اردو کی بڑی زود نویس ادیبہ ہیں۔ یہ ان کی تیرھویں تصنیف ہے۔ اُن کی گزشتہ تصانیف سے یہ کتاب بہتر ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس میں انھوں نے بجائے حسن و عشق کی المیہ کہانیوں کے عراق کی تاریخ و معاشرت پر قلم اٹھایا ہے۔ اپنا سفرنامہ عراق بھی اس میں شامل کیا ہے جو دلچسپ ہے۔ بعض اوقات زبان کی غلطیاں بہت ناگوار ہوتی ہیں یہ شاید ناقص کتابت کی وجہ ہے۔ خصوصاً بھاوج کی جگہ بھاوجہ ایک جگہ بری طرح کھٹکتا ہے۔ معلوم نہیں یہ تانیث کی تانیث کیسی۔ فارسی ترکیبوں کا بے جا استعمال اگر یہ ترک کردیں تو زبان بڑی حد تک سدھر جائے۔

افسانۂ زریں مترجمہ اسماء صاحبہ ۔ قیمت عہ/ حجم ۱۱۲ صفحے ملنے کا پتہ ۔۔۔ اردو اکیڈمی لاہور ۔

ایک امریکی مصنف کی کتاب کا ترجمہ یہ افسانہ ہے۔ پیش لفظ فیض نے لکھا ہے اور اس کوشش کو سراہا بھی ہے۔ لیکن درحقیقت ترجمہ اُس فن کا نام ہے جو اصل مصنف سے کتاب کو چھین لے۔ آئندہ کوشش شاید کامیاب ہو۔ اس ترجمہ میں تو کوئی دلچسپی نہیں مگر شاید کہانی کو صرف قصہ کی خاطر پڑھنے والے اسے پسند کریں۔

سوویٹ یونین کی قومیں از ادھیکاری مترجمہ احمد حسین صاحب عہ/ قیمت ۲ار- حجم ۵۹ صفحے ۔ ملنے کا پتہ قومی دارالاشاعت بمبئی

یہ کتابچہ اُس سلسلۂ مضامین کی ایک کڑی ہے جو اشتراکیت کا مطلب و مفہوم عوام کو سمجھانے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ذیلی طور پر موجودہ روسی نظام کو سراہا گیا ہے اور مختلف مثالوں سے یہ بات خاص طور پر واضح کی گئی ہے کہ روس میں مختلف اقوام اپنے اتحاد کی وجہ ایک ہیں۔ اور آپس میں برابر ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ ان کے اپنے قومی حقوق کی بھی حفاظت ہوتی ہے۔ اور انھیں اس کا اختیار حاصل ہے کہ جب چاہیں الگ ہوجائیں۔ شاہیت اور اشتراکیت دونوں ادوار میں ان اقوام کی حالت کا موازنہ کیا گیا ہے اور بے شک موجودہ زمانہ ان کو زندگی کے جائز حقوق عطا کرتا ہے۔ ادبی حیثیت سے اس کتابچہ کا کچھ درجہ نہیں لیکن اپنے مقصد کی تکمیل بدرجۂ اتم کرتا ہے۔ عوام اور خواص دونوں کے لئے اس کتابچہ کا مطالعہ مفید ہے کیونکہ یہ سیاسی شعور پیدا کرتا ہے۔ "زس"

ادارے کی خبریں

روئداد مجلس اردو امتحانات مجلس ہذا کا ایک جلسہ بتاریخ ۲۳ فروری ۱۳۵۵ ف مطابق ۲۴ فروری ۱۹۴۶ء روز یکشنبہ شام کے ۶ بجے پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی کے مکان واقع حمایت نگر میں منعقد ہوا۔ باتفاق آرا پروفیسر صدیقی صاحب نے جلسے کی صدارت کی۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

۱۔ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی۔ ۲۔ ملا فخرالحسن صاحب۔ ۳۔ پروفیسر فضل حق صاحب۔ ۴۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔ ۵۔ خواجہ حمید الدین صاحب شاہد۔ ۶۔ مولوی سید محمد صاحب معتمد شعبہ۔

ف۔ گزشتہ جلسے کی روئداد کی خواندگی اور توثیق کے بعد حسب ذیل امور پیش اور طے ہوئے۔

(۱) مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مجلس اردو امتحانات کی اس خواہش کی بنا پر کہ موصوف کو ختم ۱۳۵۵ ف تک بوجہ معروفیات سرکاری مجلس ہذا کی صدارت کے فرائض کی انجام دہی سے معاف رکھا جائے۔ طے پایا کہ موصوف کی جگہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ختم ۱۳۵۵ ف تک بحیثیت نگران کار صدر کام انجام دیں۔

(۲) طے پایا کہ سال حال کا جلسۂ تقسیم اسناد ۱۴ اردی بہشت ۱۳۵۵ ف کو منعقد کیا جائے اور اس کی صدارت کے لئے حضرت صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر سے اور تقسیم اسناد و انعامات کے لئے حضرت صاحبزادی نفیس النساء بیگم صاحبہ سے درخواست کی جائے۔

(۳) طے پایا کہ آئندہ سے اردو دانی کے ساتھ اردو زباں دانی کا امتحان بھی سال میں دو بار لیا جائے بشرطیکہ ان دونوں امتحانات میں کافی تعداد میں امیدوار شریک ہوں اور امتحانات کے اخراجات کی شعبے کی گنجائش سے بآسانی سربراہی ہوسکے۔

(۴) طے پایا کہ سال حال مجلس ہذا کے امتحانات ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ امرداد ۱۳۵۵ ف کو لئے جائیں۔ اس کے بعد تمام سالانہ امتحانات ڈسمبر میں منعقد ہوا کریں۔

(۵) طے پایا کہ اردو زباں دانی کے امتحان میں بجائے محمد اسمٰعیل کی قواعد اردو کے بشیر النساء بیگم صاحبہ کی کتاب "پہلی قواعد اردو" شریک نصاب کیجائے۔

(۶) طے پایا کہ معاوضہ ممتحنین کے لئے ملا سید فخر الحسن صاحب مولوی سید محمد صاحب اور مولوی خواجہ حمید الدین صاحب کی ایک کمیٹی بنائی جائے جو تمام امور پر غور کر کے آئندہ مجلس میں اس خصوص میں رپورٹ پیش کرے۔

(۷) طے پایا کہ مولوی خواجہ حمید الدین صاحب کو جو بحیثیت مہتمم ادارہ مجلس کے اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے مجلس ہذا کا رکن منتخب کیا جاتا ہے۔

جلسۂ تقسیم اسناد اردو امتحانات بابت ۱۹۴۵ء اردو امتحانات بابت ۱۹۴۵ء کا جلسۂ تقسیم اسناد بصدارت عالیجناب حضرت صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر بتاریخ ۱۴ اردی بہشت ۱۳۵۵ ف م ۲ اپریل ۱۹۴۶ء شام کے ۵ بجے کو آرٹس ٹیوٹوریل ہال متصل نظام کالج میں منعقد ہوا۔ آنریبل نواب ڈاکٹر سر مہدی یار جنگ بہادر نائب صدر اعظم دولت آصفیہ و صدر ادارۂ ادبیات اردو نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ نواب صاحب معزز کی استدعا پر حضرت صاحبزادی نفیس النساء بیگم صاحبہ نے اپنے دست مبارک سے

کامیاب امیدواروں کو اسناد اور تمغ تقسیم فرمائے۔ اس کے بعد حضرت صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر نے اپنا پرمغز خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا۔ اسناد لینے والوں میں افواج آصفیہ کے امیدوار زیادہ تعداد میں شریک تھے۔ اضلاع کے مرکزوں میں سے ٹاکلی جاگیر، بشیر آباد، اور پرلی کے نمائندے شریک جلسہ تھے۔ تقریباً دو گھنٹے کی کارروائی کے بعد جلسہ بحسن و خوبی اختتام کو پہنچا۔ علم دوست اصحاب کے علاوہ حسب ذیل مہمان قابل ذکر ہیں۔

آنریبل نواب لیاقت جنگ بہادر صدر المہام فوج و صنعت و حرفت، مولوی سجاد مرزا صاحب سینئر نائب ناظم تعلیمات ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب مہتمم کتب خانۂ آصفیہ مولوی میر محمد عالم صاحب مددگار تعلیمات، ملا فخر الحسن صاحب لکچرار عثمانیہ ٹریننگ کالج پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی، مولوی فاروق علی صاحب ایڈوکیٹ، مولوی ضامن علی صاحب غازی کنٹراکٹر۔ پروفیسر سید محمد صاحب مسٹر مہندر راج سکسینہ ریڈر جامعہ عثمانیہ۔ مسٹر وینکٹ راؤ۔ لفٹننٹ ایس شنکرن آرمی ایجوکیشنل افسر۔ اس جلسہ کو کامیاب بنانے میں مولوی ضامن علی صاحب غازی نے کارکنان ادارہ کا بہت ہاتھ بٹایا۔ نیز مینجر صاحب کواپریٹیو یونین ہال نے جلسہ منعقد کرنے کی اجازت دیکر شکریہ کا موقعہ عطا فرمایا۔

آئندہ اردو امتحانات کی تاریخیں

ادارۂ ادبیات اردو کے اردو امتحانات سال حال ۱۰ ر تا ۱۲ ر امرداد ۱۳۵۵ف مطابق ۵ ر تا ۷ ر جون ۱۹۴۶ء کو منعقد ہوں گے۔

شرکت کی فیس دفتر ادارہ خیریت آباد پر ۹ ر تیر مطابق ۱۱ ر مئی ۱۹۴۶ء تک پہنچ جانی چاہیے۔ نصاب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے جو اصحاب یا ادارے کی شاخیں اپنے اپنے مستقر پر اردو امتحانات کے مرکز قائم کرنا چاہتے ہوں۔ قبل از قبل ادارے سے مراسلت کریں تاکہ ممکنہ سہولتیں بہم پہونچائی جائیں۔

ہر وہ مقام مرکز قرار پاسکتا ہے جہاں سے کم از کم پچاس امیدوار شریک ہوں۔

خطبۂ استقبالیہ

جلسۂ تقسیم اسناد اردو و امتحانات ادارۂ ادبیاتِ اردو بابتہ ۱۹۴۵ء عیسوی

آنریبل ڈاکٹر نواب سر مہدی یار جنگ بہادر ایم۔ اے ڈی لٹ صدر ادارۂ ادبیاتِ اردو و نائب صدر اعظم دولتِ آصفی

حضرت صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر، حضرت صاحبزادی نفیس النساء بیگم صاحبہ و معزز خواتین و حضرات!

ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبۂ امتحانات کی جانب سے آج اس جلسۂ تقسیم اسناد و انعامات میں آپ سب خواتین و حضرات کا میں نہایت مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو ہندوستان کی عام اور ہماری سرکاری زبان اردو کی ترقی و اشاعت، تعلیم بالغاں کی ترویج اور خواندگی کی توسیع کے لئے جو کوششیں کر رہا ہے وہ نہ صرف خواص و عوام میں مقبولیت حاصل کر رہی ہیں بلکہ ہمارے لئے یہ ایک فخر کی بات ہے کہ ان کو دودمانِ آصفی کی سرپرستی بھی حاصل ہوتی رہی ہے۔ اس ادارے کے امتحانات کی سندوں اور انعاموں کی تقسیم کے گزشتہ جلسوں کی صدارت حضرت شہزادہ جنرل والا شان سر اعظم جاہ بہادر اور حضرت شہزادۂ والا شان سر معظم جاہ بہادر فرما چکے ہیں۔ آج ہم اپنی خوش بختی پر مسرور ہیں کہ اسی مبارک خانوادۂ آصفی کے ایک اور چشم و چراغ صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر ہمارے اس جلسے کی صدارت فرما رہے ہیں اور حضرت صاحبزادی نفیس النساء بیگم صاحبہ اپنے دستِ مبارک سے اسناد اور انعامات تقسیم فرمانے والی ہیں۔

حضرات! آپ صاحبان اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ حضرت صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر کو علمی مسائل سے بیحد دلچسپی ہے۔ آپ نے مجلس تعلیم ثانوی کے صدر اعلیٰ کی حیثیت سے ریاست کے مختلف مدارس کا وقتاً فوقتاً بہ نفسِ نفیس معائنہ فرما کر توسیع تعلیم میں ذاتی دلچسپی کا اظہار کیا۔ آپ کی توجہ گرامی سے مدرسوں میں نہ صرف ذہنی تعلیم کی رفتار ترقی پذیر ہوگئی ہے بلکہ طلبہ کی جسمانی تربیت کی ترقی کے لئے آپ نے مختلف جسمانی مقابلوں کے قیام اور ان کے معائنوں کے ذریعہ سے بھی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ آپ کی ذاتِ گرامی ہمارے ملک سے جہالت اور ناخواندگی کو دور کرنے کے لئے شمعِ ہدایت ثابت ہو رہی ہے اور اسی مناسبت سے ادارے کے اس جلسہ کی صدارت کے لئے اس موقع پر حضرت صاحبزادہ صاحب سے زیادہ موزوں کوئی اور شخصیت نہیں ہو سکتی۔

حضرت صاحبزادی نفیس النساء بیگم صاحبہ بھی خواتین کی ہر جہتی ترقی اور خصوصاً ان کی معاشرتی اور تعلیمی اصلاح و فلاح سے جو خاص دلچسپی رکھتی ہیں اس سے آپ سب حضرات بخوبی واقف ہیں۔ میں نہایت ادب کے ساتھ حضرت صاحبزادہ صاحب اور حضرت صاحبزادی صاحبہ کا خیر مقدم کرتا ہوں اور کارکنانِ ادارہ کی جانب سے نذرانۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔

حضرات! ادارۂ ادبیاتِ اردو جس کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اور ان کے چند ادب دوست رفقاء نے اب سے سولہ[۱۶] برس پہلے قائم کیا تھا خاموشی کے ساتھ اردو زبان اور ادب کی جو خدمات اپنے بارہ[۱۲] مختلف شعبوں کے ذریعے سے نیز اپنی مطبوعات و رسائل سب رس کے علاوہ ایک مخزنِ علوم و فنون یعنے انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و طباعت کے صبر آزما مراحل طے کر کے انجام دے رہا ہے وہ آپ سے مخفی نہیں ہیں۔ تعلیم بالغاں کے سلسلے میں اس کے ایک شعبۂ اردو امتحانات کی افادیت اور

دائرہ اثر روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ نہ صرف بلدہ اور متعدد اضلاع و دیہات میں بلکہ ممالک محروسہ کے باہر بھی اس کے اُردو امتحانات کو مقبولیت حاصل ہوتی جا رہی ہے سالہائے ماسبق کی طرح سال گزشتہ بھی اردو دانی کا امتحان دو بار لیا گیا۔ جن کے نتائج امید افزا رہے۔ اس امتحان میں ایک ہزار پچانوے (۱۰۹۵) بالغوں نے شرکت کی اور چھ سو اٹھتّر (۶۷۸) کامیاب ہوئے۔ جن میں (۱۲۲) نے امتیاز حاصل کیا۔

دوسرے امتحانوں کے شرکا، اور کامیاب امیدواروں کی تفصیل یہ ہے۔

	شریک	غیر حاضر	کامیاب	فی صد
اردو دانی	۴۰۶	۱۴۲	۲۶۰	۸۷
اردو عالم	۱۵۶	۳۷	۵۱	۴۳
اردو فاضل	۴۵	۸	۳۳	۸۹
خوش نویسی	۸	۳	۱	۲۰

جیساکہ اوپر کہا گیا ہے ادارے کے امتحانات نہ صرف بلدہ حیدرآباد ہی میں مقبول ہیں بلکہ اضلاع او دیہات میں بھی یہاں سے زیادہ مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ چنانچہ سال گزشتہ بلدہ کے تین مرکزوں یعنی مرکز ذکور، مرکز اناث اور مرکز فوج کے علاوہ اضلاع میں حسب ذیل مقامات کے مرکز تھے۔

اندولہ الندہ، بشیرآباد، بلولی، بانسواڑہ، پرلی، ٹاکلی، کوڑنگل، جگتیال، گدوال، ناگرکرنول، نظام آباد، منجھلے گاؤں، دوم کنڈہ، مومن آباد۔

ریاست حیدرآباد کے ان مراکز کے علاوہ صوبہ بمبئی اور ریاست میسور میں ادارے کی یہ مہم قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی اور ان دونوں جگہ بھی گزشتہ سال مرکز قائم ہوئے۔ مرکز بمبئی سے ایک سو اڑتیس امیدواروں نے شرکت کی اور امتحان اردو عالم میں ایک خاتون منیرہ خانم نے درجۂ اول میں کامیابی حاصل کی اور سب سے زیادہ نشانات حاصل کرنے کے صلہ میں تمغے کی مستحق قرار پائیں۔

اردو امتحانات کے ان اعداد و شمار کے سلسلہ میں آپ کی اطلاع کے لئے اس امر کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ امتحانات ایک مجلس کے ذریعہ منعقد کئے جاتے ہیں جو ملک کے ماہرین تعلیم اور اساتذہ اردو پر مشتمل ہے۔ انہی کی ہدایت اور مشورے کے مطابق ادارۂ ادبیات اردو تعلیم بالغان کی مہم کی پیش رفت کے لئے مفید کتابوں کی ترتیب و اشاعت کا کام بھی انجام دے رہا ہے۔ چنانچہ جو لوگ اردو دانی کا امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں ان کے شوق مطالعہ کو برقرار رکھنے کے لئے موزوں کتابیں بھی ادارے کی جانب سے لکھوائی اور شائع کی گئی ہیں اور تدریجی طریقہ امتحان بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اضلاع میں تعلیم بالغان کی ترویج کے لئے ادارے کی طرف سے وفد کی صورت میں حسب ضرورت دورے بھی کئے جاتے ہیں اور مختلف مقامات پر تعلیم بالغان کے مدارس شبینہ کے قیام کی اسکیم بھی مرتب ہو چکی ہے اور جیسے ہی رقمی سہولتیں فراہم ہوں یہ تجاویز بھی روبہ عمل لائی جائیں گی۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ ادارے کے ان اردو امتحانات میں ہر قوم و مذہب کے لوگ شریک ہوتے ہیں اور انھیں یکساں طور پر ملک و بیرون ملک میں تمام اقوام و ملل میں مقبولیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ ان امتحانات کی فیس بھی بہت قلیل رکھی گئی ہے یہ اتنی قلیل یعنے ایک روپیہ، دو روپے اور پانچ روپے ہے کہ اس سے ان امتحانات کے پورے پورے اخراجات نہیں نکل سکتے اور ممتحنین جن میں تقریباً نصف بیرون ریاست کے ماہرین علم و ادب شامل رہتے ہیں نہایت ہی ایثار کے ساتھ پرچہ جات سوالات کی ترتیب اور جانچ کی زحمت برداشت کرتے ہیں۔

اردو امتحانات میں اول آنے والے امیدواروں کے لئے ہر سال مختلف علم دوست اصحاب اور خود ادارے کی طرف سے تمغے عطا کئے جاتے ہیں۔ گزشتہ سال اردو فاضل میں کوئی امیدوار درجۂ اول میں کامیاب نہیں ہوا۔

اس لئے سر عقیل جنگ مرحوم کا عطا کردہ طلائی تمغہ نہیں دیا جا رہا ہے۔ نواب صاحب مرحوم اردو امتحانات کے خاص قدردان تھے اور انھوں نے پانچ سال قبل اپنے رقمی عطیے کے ذریعہ سے ایسا انتظام فرما دیا تھا کہ ہر سال اردو فاضل میں اول آنے والے کو یہ تمغہ ملتا رہے گا۔

میں ان تمام مخلص کارکنان بلدہ و اضلاع اور خاص کر عارف الدین حسن صاحب۔ کمانڈر احمد العیدروس بہادر، کرنل نذیر الاسلام خاں، محمد غوث صاحب (دوم کنڈہ) شیخ لعل صاحب وکیل (ٹاکلی) مولوی عبدالرزاق قریشی اور مولوی اسمٰعیل منصوری صاحب (بمبئی) اور پروفیسر سروری صاحب (میسور) کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ محض اردو دوستی کے لئے ادارے کے امتحانات کو کامیاب بنانے میں ہر طرح کی امداد فرماتے رہے۔

آپ صاحبوں اور خصوصاً حضرت نواب بسالت جاہ بہادر اور حضرت صاحبزادی صاحبہ کا مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اپنی شرکت سے اس جلسے کو زینت بخشی۔

ادارے کی نئی کتابیں

(۱) ہندوستانی قومیت کا تمدنی پہلو از ڈاکٹر ایشور ٹوپا صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔

ڈاکٹر ایشور ٹوپا صاحب کی ایک کتاب "ہندوستانی تمدن" ادارے کی طرف سے شایع کی گئی تھی۔ اپنے موضوع پر یہ پہلی کتاب تھی جو علمی حلقوں میں بیحد پسند کی گئی۔ ادارے کی خواہش پر ڈاکٹر صاحب نے ایک دوسری کتاب "ہندوستانی قومیت کا تمدنی پہلو" لکھ کر ایک اہم موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ ہندوستانی قومیت کا مسئلہ نہایت نازک اور پیچیدہ ہے۔ موجودہ دور میں تو اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس لئے اس بات کی بیحد ضرورت تھی کہ ہم اپنی سماج کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھیں تاکہ ہندوستانی قومیت کے مسئلے کی گتھیاں سلجھ سکیں۔ ڈاکٹر ٹوپا صاحب نے اپنے عالمانہ اور ماہرانہ انداز میں اس مسئلہ کو واضح کیا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ سیاست اور تمدن کی بحثوں کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بیحد مفید ثابت ہوگا۔ صفحات (۵۲) قیمت ۸؎

(۲) عروض از مولوی سید کلیم اللہ حسینی صاحب مولوی فاضل منشی فاضل، اردو فاضل اردو امتحانات کے نصاب کے لئے مولوی کلیم اللہ حسینی صاحب نے ادارے کی خواہش پر ایک کتاب "بلاغت" مرتب کی تھی جو اتنی مقبول ہوئی کہ اب تک اس کے دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ عروض اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے جس کے مطالعہ سے مبتدی اس فن پر بخوبی حاوی ہوسکتے ہیں۔ اس رسالہ کی ترتیب میں عربی فارسی اور اردو کی مستند کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

(صفحات (۵۶) قیمت ۱۰؎)

خطبۂ صدارت

حضرت صاحبزادہ نواب بسالت جاہ بہادر دام اقبالہٗ

جلسہ، حاضرین!

ہمارے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان سے ہم دونوں بہت متاثر ہوئے اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ادارۂ ادبیاتِ اردو کا نصب العین قابلِ تحسین ہے اور اس کے پرجوش کارکن جو علم و فن کی بے لوث خدمت میں حصہ لے رہے ہیں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مجھے یہ معلوم ہو کر بہت مسرت ہوئی کہ ادارہ اپنی عمر کے سولہ منازل اردو زبان و ادب کی خدمت میں نہایت کامیابی سے طے کر چکا ہے اور اپنے دیگر مقاصد کے ساتھ تعلیم بالغان کے سلسلہ میں نمایاں خدمت انجام دے رہا ہے۔ ہمارے ملک کی پست تعلیمی حالت کے مدنظر یہ کام نہایت اہم اور مفید ہے اور دوسرے تعلیمی اداروں کے لئے قابل تقلید۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ ادارہ کا لائحہ عمل نہایت وسیع نظر سے مرتب کیا گیا ہے اور ادارے کے امتحانات کو اندرون و بیرون ملک بڑی مقبولیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ ہر قوم و ملت کے مرد و خواتین شریک امتحانات ہوتے ہیں۔ نتائج نہایت امید افزا ثابت ہو رہے ہیں نیز سال گزشتہ مرکز بمبئی سے اردو عالم کے امتحان میں ایک خاتون نے شاندار کامیابی حاصل کی اور تمغہ کی مستحق قرار پائیں۔

ماہرین تعلیم اور اساتذہ اردو کی مشتملہ مجلس کے زیر اہتمام ادارہ کے امتحانات کا انعقاد نہ صرف ایک صحیح طریق کار ہے بلکہ ادارہ کی افادیت، بہبودی اور دائرہ اثر کی روز افزوں ترقی کا ضامن ہے اور مجھے امید ہے کہ جو کتابیں تعلیم بالغان کی مہم کی پیش رفت کے لئے ادارہ کی جانب سے لکھوائی اور شائع کی گئی ہیں وہ طالب علموں میں ذوق مطالعہ کے علاوہ فرض شناسی۔ وقت کی پابندی۔ تحت ضابطہ تنظیم۔ استقلال۔ راست بازی۔ روشن خیالی۔ کشادہ دلی۔ ہمدردی اور سب سے زیادہ ملک و مالک کی محبت کو ترقی دیں گی۔

تعلیم بالغان کے ضمن میں شبینہ مدرسوں کا قیام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اضلاع کیساتھ ساتھ بلدہ و بیرونی مرکزی مقامات میں شبینہ مدارس قائم کئے جائیں اور ان کی تعداد میں مزید اضافہ کرنے کی پیہم کوشش جاری رکھی جائے۔ مجھے امید ہے کہ وقتی مشکلات سد راہ نہ ہوسکیں گی اور ملک کے باثروت و علم دوست اصحاب مالی اعانت و دستگیری میں دریغ نہ کریں گے۔ جہالت اور ناخواندگی کو دور کرنے کی مساعی بارآور ہوں گی۔

ادارہ جس نے امتحانات کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی ہیں اور ممتحن جنھوں نے ایثار کی اعلیٰ مثال پیش کی ہے ملک کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

مجھے قوی توقع ہے کہ یہ ادارہ اپنے بانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کی ان تھک کوششوں کی وجہ سے شاہراہ ترقی پر گامزن رہے گا اور ملک کی تعلیمی اور تمدنی ارتقا میں قابل قدر حصہ لے گا۔

یہ سب شاہ فریجاہ اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی متعالی مدظلہ العالی کی دور اندیشانہ قیادت کے فیوض و برکات ہیں کہ سرزمین دکن علم و ادب کا گہوارہ بن گئی ہے اور یہاں نشاۃ ثانیہ کی زیبائی اور شان دیکھنے میں آ رہی ہے۔ ملک کے نوجوان ملک کی عام اور ذہنی سطح بلند کرنے میں کوشاں ہیں اور علم و فن کی خدمت کے لئے کمربستہ اور انسانوں کے قلوب ایسی یگانگت کا مسکن ہیں کہ جس کے بغیر تحصیل علم و ترقی ناممکن ہے۔

میں دست بدعا ہوں کہ خدائے عزوجل شاہِ جم جاہ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے اور ذات شاہانہ کی رہبری میں ملک ترقی کے مزید منازل طے کرے۔

روئداد مجلس انتظامی

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس بتاریخ ۱۶ خورداد ۱۳۵۵ف م ۲۰ اپریل ۱۹۴۶ء شام کے پانچ بجے عالیجناب آنریبل نواب لیاقت جنگ بہادر کے دولت کدہ "کوہان" پر منعقد ہوا جس سے قبل آنریبل موصوف نے ارکان مجلس کو اپنی جانب سے ایک عصرانہ پر مدعو فرمایا تھا۔ حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

عالیجناب آنریبل نواب لیاقت جنگ بہادر صدر المہام فوج و صنعت و حرفت
" " " معین نواز جنگ بہادر صدر المہام اصلاحات
" مولوی سید علی اکبر صاحب ناظم تعلیمات
" عبد المجید صاحب صدیقی صاحب
ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور معتمد اعزازی ادارہ

آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر نے بذریعہ تحریر اور آنریبل مولوی سید محمد اعظم صاحب نے بالمشافہ معتمد صاحب کو اطلاع دی کہ وہ دوسری مصروفیات کے باعث شریک اجلاس نہ ہو سکیں گے۔

گزشتہ اجلاس کی روئداد سنائی گئی اور جناب صدر نے اس کی توثیق فرمائی۔

حسب ذیل امور پیش ہوئے اور طے پائے۔

(۱) عالیجناب نواب معین نواز جنگ بہادر کی صدر المہامی اصلاحات پر ترقی کے سلسلہ میں حسب ذیل قرارداد مسرت باتفاق آرا منظور کی گئی۔

"ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی اپنے ہر دلعزیز رکن عالیجناب آنریبل نواب معین نواز جنگ بہادر کی خدمت میں دلی مبارک باد پیش کرتی ہے کہ جناب کی اعلیٰ خدمات کی قدر کرتے ہوئے حضرت اقدس اعلیٰ نے بہ عطوفت شاہانہ معزز کونسل باب حکومت کی رکنیت پر آپ کا تقرر فرما کر عزت بخشی جس کی وجہ سے نہ صرف ادارۂ ہذا کے اعزاز میں اضافہ ہوا بلکہ اس کی علمی و ادبی خدمت گزاری کے منصوبے اور زیادہ مستحکم ہو گئے۔

مجلس ہذا کو یقین ہے کہ عالی جناب اپنے اعلیٰ کردار اور ملک و مالک کی خدمات کی بنا پر اس سے زیادہ اعزاز و مناصب حاصل فرمائیں گے اور مجلس انتظامی کو اسی طرح کئی بار مبارک باد پیش کرنے کا موقع ملے گا۔"

(۲) مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب کے کتب خانے کی خریدی کے بارے میں معتمد صاحب نے اطلاع دی کہ ہاشمی صاحب سے ان کے کتب خانے کے معائنے کے بارے میں وقت کا تعین نہ ہو سکا اس لئے یہ کارروائی آئندہ اجلاس کے لئے ملتوی کی گئی۔

(۳) عمارت ادارہ ہذا کے سلسلے میں معتمد نے گزشتہ اجلاس سے اب تک جو کارروائی اور مراسلت عمل میں آئی اس سے ارکان مجلس کو مطلع کیا۔ اور طے پایا کہ نواب زین یار جنگ بہادر سے مل کر ٹپہ خانہ صفیہ والے مکان کے بارے میں قطعی طور پر طے کرا لیا جائے اسی سلسلہ میں یہ بھی طے پایا کہ اگر اس مقام کے ملنے میں دشواری ہو تو آرائش بلدہ کے محاذی جو زمین خالی ہے اس کے لئے یا آرائش بلدہ کے دفتر کے مقابل

رحمت علی سید صاحب کا جو مکان ہے اسکے حصول کے بارے میں نواب زین یار جنگ بہادر سے مشورہ کر کے ضروری کارروائی کی جائے۔

(۴) اردو امتحانات کی مجلس انتظامی نے سال حال کے امتحانات کے لئے جو تاریخیں ۔ ۱ تا ۱۲ امرداد مطابق ۵ تا ۱۷ جون مقرر کی ہیں ان کی توثیق کی گئی۔

(۵) طباعت اردو انسائیکلو پیڈیا کے سلسلہ میں جو سرکاری کارروائی ہورہی ہے اس کے بارے میں غور ملتوی کیا گیا تاکہ آئندہ آنریبل مولوی سید محمد اعظم صاحب کی موجودگی میں اس کا تصفیہ ہو سکے۔

(۶) معتمد نے ارکان مجلس کو توجہ دلائی کہ بعض معتمدین کے دفاتر سرکار عالی محکمہ باب حکومت کے محاذی جو نئی عمارت بنی ہے اس میں منتقل ہورہے ہیں اس لئے اگر کوئی خالی شدہ سرکاری عمارت ادارے کے لئے عارضی طور پر حاصل کی جائے تو سہولت کا باعث ہوگا۔ اس بارے میں جناب صدر اور آنریبل نواب معین نواز جنگ بہادر نے توجہ کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

مذکورۂ بالا تحریکات کے علاوہ بعض امور کے متعلق مناسب تصفیے کئے گئے۔

ادارہ کی مطبوعات

کتاب	صفحات	قیمت	کتاب	صفحات	قیمت
(۱) سرگزشت حاتم	۱۲۸	عاں	(۱۶) گریہ و تبسم	۱۹۲	عاں
(۲) سرگزشت غالب	۹۴	۸ر	(۱۷) مشاہیر قندھار دکن	۱۰۴	عہ
(۳) تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	سے	(۱۸) من کی دنیا	۱۴۵	عہ
(۴) محبت کی چھاؤں	۱۳۲	عہ	(۱۹) مدراس میں اردو	۱۹۶	عہ
(۵) اقبال نمبر	۲۶۸	عہ	(۲۰) روح غالب	۱۴۰	عاں
(۶) شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	عاں	(۲۱) دفتری معلومات	۵۶	۶ر
(۷) مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	عاں	(۲۲) سرگزشت ادارہ	۳۰۰	۸ر
(۸) فن تقریر	۹۲	۱۲ر	(۲۳) میر محمد مومن (۲۴) تصاویر	۳۱۲	عاں
(۹) مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۳	عہ	(۲۴) انوار	۱۶۸	عہ
(۱۰) تاریخ ادب اردو	۱۷۲	عہ	(۲۵) گارساں دتاسی	۱۲۸	عہ
(۱۱) شاد اقبال	۱۶۹	عاں	(۲۶) بلاغت	۵۲	۸ر
(۱۲) نظام علی خاں	۳۰	عہ	(۲۷) ادارہ سنہ ۱۹۴۴ء میں	۲۰۰	۸ر
(۱۳) عرب اور عربستان	۵۶	۱۰ر	(۲۸) ناصر الدولہ	۲۴۰	ہہر
(۱۴) مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	عمہ	(۲۹) افضل الدولہ	۳۲	سہر
(۱۵) ” ” دوم (۵۰) ”	۱۷۵	عہ	(۳۰) نواب میر محبوب علی خاں	۳۲	ہہر

ادارہ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت		
		روپے	آنے	پائی
سرگزشت حاتم	۱۲۸	۲	۰	۰
سرگزشت غالب	۹۴	۰	۸	۰
نظام الملک	۴۰	۰	۶	۰
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خاں	۱۶	۰	۲	۰
سرسالار جنگ	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر	۲۹۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۳	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰	۰
حیدرآباد	۸۵	۰	۱۰	۰
عماد الملک	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۶	۰
،، ،، دوسری کتاب	۵۶	۰	۶	۰
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ	۱۴۰	۱	۴	۰
فن تقریر	۹۲	۰	۱۲	۰
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۳	۱	۰	۰
ہندوستانی تمدن	۱۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی	۸۰	۰	۱۰	۰
مہ لقا	۱۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۶	۰
رسائل طیبہ	۳۹۰	۲	۸	۰
سلک گوہرین	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو	۱۷۲	۱	۸	۰
اشوک اعظم	۵۶	۰	۸	۰
باتیں	۸۴	۱	۰	۰
یورپ جنگ سے پہلے	۲۱۸	۲	۸	۰
شاد اقبال	۱۷۹	۲	۸	۰
آریائی زبانیں	۱۰۲	۱	۰	۰
نظام علی خاں	۳۰	۰	۴	۰
تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰	۰
عرب اور عربستان	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت		
		روپے	آنے	پائی
سچ کا جادو	۴۸	۰	۴	۰
طبیعاتی کائنات	۹۸	۰	۸	۰
متاع سخن	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۴۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵ تصاویر)	۵۰۰	۵	۰	۰
،، ،، دوم (۵۰) ،،	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن	۱۵۳	۱	۴	۰
روح غالب	۱۴۰	۲	۸	۰
عاصمہ	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگزشت ادارہ	۳۰۰	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۲۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان	۳۲	۰	۳	۰
خطابات	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۹) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار	۱۶۸	۱	۸	۰
نقش ثانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
کارنامہ دقاسی	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت	۵۲	۰	۸	۰
ادارہ سفر ۱۹۴۱ء میں	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ	۲۴	۰	۴	۰
افضل الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خاں	۳۲	۰	۴	۰

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم

نشان طبع آصفیہ ۱۵۳
نشان طبع برطانیہ ایم ۲۹۵
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۶؍

جلد ۹ — بابت ماہ جون سنہ ۱۹۴۶ء — شمارہ ۶

خواجہ حمید الدین شاہد ایم اے نے باہتمام محمود یہ مشین پریس میں چھپوا کر عشرت منزل خیریت آباد سے شایع ہوا

حسرت کی شاعری

حسرت ایک غزل گو شاعر ہیں اور ہر غزل گو دور حاضر میں رجعت پسند خیال کیا جاتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو حسرت باوجود غزل گو ہونے کے رجعت پسند نہیں ہیں۔ انھوں نے نئے رجحانات کا اندازہ لگاتے ہوئے اردو غزل میں ایک نئی روح پھونکی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جس وقت اردو غزل جسد بے روح ہو چکی تھی اور اس سے عام بیزاری کا اظہار کیا جا رہا تھا حسرت نے اسی میں ایک نیا رنگ تغزل شامل کیا اور اسے مقبول بنایا۔ حسرت اردو غزل میں ایک صاحب طرز کی حیثیت رکھتے ہیں، انھوں نے تمام ممتاز اساتذہ سے استفادہ کیا ہے مگر جس چیز نے حسرت کو صاحب طرز کی حیثیت دی ہے وہ ان نئے رجحانات کے چھینٹے ہیں جو حسرت کے یہاں نظر آتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ہم ان نئے رجحانات کا اندازہ لگائیں جن کے چھینٹوں نے حسرت کی غزلوں میں ایک نئی تازگی اور دل کشی پیدا کی ہے۔

اردو ادب میں (اور صرف اردو ادب میں نہیں بلکہ ادب عالم میں) اس وقت جو رجحان سب سے زیادہ نمایاں اور ترقی پذیر ہے وہ حقیقت نگاری کا رجحان ہے۔ فنون لطیفہ میں عموماً اور ادب میں خصوصاً حقیقت نگاری دور حاضر کی مسلم حقیقت ہے۔ حسرت نے جب اردو غزل کا راگ الاپا تو اس وقت داغ، امیر اور جلال کے نغمے کانوں میں گونج رہے تھے۔ ان ہی کے رنگ کا چرچا اور اسی رنگ میں غزل کہنے کو لوگ شاعری سمجھتے تھے۔

ان اساتذہ میں امیر نے تو پھر بھی ثقاہت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا مگر داغ کی بدمستی، معاملہ بندی اور ایک قسم کی جنسی سطحیت کے ہاتھوں اردو غزل گوئی اپنی متانت، فلسفیانہ بلند آہنگی اور شائستگی مذاق کھو بیٹھی تھی۔ اس دور کی غزلوں میں جو حقیقت نگاری ملتی ہے وہ حد درجہ پست اور جنسی قسم کی ہے۔ اس میں وہ حقیقت نگاری نظر نہیں آتی جو پائیدار اور غیر فانی ادب کا ایک لازمی عنصر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو غزل پر سنجیدہ اور شائستہ ذوق ادب رکھنے والے انگلیاں اٹھانے لگے۔

داغ، امیر اور جلال اور بالخصوص امانت، رند، صبا اور امیر وغیرہ کے رنگ شاعری کا ردعمل شروع ہوا۔ لکھنؤ میں بے خود اور عزیز کے ہاتھوں اردو شاعری کے جذباتی اسکول کی بنیاد پڑی اور قدما کے پاکیزہ رنگ شاعری کا احیا شروع ہو گیا۔ حسرت کی شاعری نے اردو غزل گوئی کے اسی پس منظر میں جنم لیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی غزل گوئی بدنما داغوں سے پاک ہے اور اس میں ایک ایسی صداقت اور حقیقت نگاری پائی جاتی ہے جو ادب عالیہ کا حصہ ہے۔ ان کے اکثر و بیشتر اشعار مبالغہ آمیزی اور سستی رومانیت سے پاک ہوتے ہیں مگر ان میں کوئی نہ کوئی جذباتی حقیقت ضرور ہوتی ہے۔

حسرت کے یہاں ایسی حقیقت نگاری نظر آتی ہے جس سے ہم اپنی حقیقی زندگی میں دوچار ہوتے رہتے ہیں اور جو انسانی نفسیات سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ وہ محض الفاظ کے گورکھ دھندے اور خیالی طوطا مینا اڑانے کو شاعری نہیں سمجھتے۔ ان کے اشعار میں گہری نفسیاتی حقیقتیں پوشیدہ رہتی ہیں۔

حسرت نہ تو ایسے ثقہ ہیں کہ سرخوشی اور رنگینیٔ خیال کو ممنوع قرار دیں اور نہ ایسے بدمست کہ ہوش و خرد کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھیں۔ ان کے یہاں حقیقت نگاری اور رومان کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کی حقیقت نگاری میں دو خصوصیتیں قابل ذکر ہیں ایک تو اس کا بازاریت اور سطحیت سے پاک ہونا اور دوسرے اس کا نفسیاتی ہونا۔ اردو کے تمام جدید غزل گو شعرا میں نفسیاتی حقیقت نگاری پیش کرنے میں حسرت سب سے آگے ہیں۔ عشقیہ جذبات اور حسیات کی تصویر کشی اور ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں کی نقاشی حسرت سے زیادہ کامیاب طریقے سے کسی نے نہیں کی۔

حسرت نفس انسانی کے رازداں ہیں۔ وہ تحت الشعور کی الجھنوں اور نزاکتوں کو انتہائی صفائی اور حسن کے ساتھ غزل کے اشعار میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کمال

یہ ہے کہ وہ معاملات حسن وعشق کے غیر شعوری اور غیر محسوس رموز وحقایق کو بھی اتنی سادگی اور سہولت سے شعر میں ادا کردیتے ہیں کہ وہ ہمیں ذرا بھی مشکل، مرعوب کن یا سمجھ میں نہ آنے والی بات نہیں معلوم ہوتے۔ شاعر کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ شعر میں گہرے سے گہرے اور مشکل سے مشکل مسئلوں کو آسان کردے۔ بقول فراق گورکھپوری حسرت کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ان کی باتیں بیک وقت سامنے کی چیز بھی ہیں اور ادراک انسانی کی آخری منزل بھی۔

دوسری سب سے بڑی خصوصیت جو حسرت کی شاعری کو جدید اردو غزل میں ممتاز بناتی ہے یہ ہے کہ ان کی شاعری سے اردو غزل میں ایک نئی "خارجیت" کا آغاز ہوتا ہے۔ صنف غزل کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے اندر ایک ایسی مخصوص قسم کی داخلیت کارفرما ہے جس کا خارجی ماحول سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

یہ داخلیت کچھ تو صوفی شعرا کے اثر اور کچھ سماجی جکڑ بندیوں کی وجہ سے روزافزوں ترقی پر رہی۔ لیکن انیسویں صدی کے آخر سے نئی ادبیت اور جدید تحریکیں شاعری پر نمایاں طور پر اپنا اثر ڈالنے لگیں۔ اردو شاعری میں بھی مادی اور عملی زندگی کے علاوہ خارجی زندگی کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ اسی اثر سے نظم نگاری کی ابتدا ہوئی۔ حالی اور آزاد نے جب دیکھا کہ غزل کی داخلیت خارجی اور حقیقی ماحول کی نقاشی کی متحمل نہیں ہوسکتی تو انھوں نے نئے اور مختلف موضوعات پر نظم لکھنا شروع کیا۔ اس خارجیت کا اثر جدید اردو غزل پر بھی پڑا اور اب ہمیں غزل کے جذبات میں آس پاس کی جانی پہچانی اور آشنا چیزیں بھی نظر آنے لگیں۔ غزل میں اس رجحان کا سب سے زیادہ کامیاب نمونہ حسرت کے یہاں ملتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حسرت کی غزلوں میں نہ صرف نفسیاتی اور داخلی زندگی کے رموز وحقایق ہوتے ہیں بلکہ وہ خارجی دنیا اور اس کی موضوعی صداقتوں کا عکس بھی شاعرانہ حسن وصداقت کو برقرار رکھتے ہوئے پیش کرتا ہے۔

مجھ کو روتا دیکھ کر وہ قصد پابوسی مرا
اور ترا ٹھوکر لگا کر مسکرانا یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے
بزم اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے
ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

جہاں تک قدما کے رنگ شاعری کا تعلق ہے حسرت میر اور مومن سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے اکثر وبیشتر اشعار میں میر کے لب ولہجہ اس کی سپردگی اور نشتریت کی صاف جھلک مل جاتی ہے۔ جہاں تک نفسیاتی اور فلسفیانہ موشگافیوں اور معاملات حسن وعشق کا تعلق ہے وہ مومن سے اثر پذیر معلوم ہوتے ہیں۔

غزل میں جہاں تک خارجیت پیدا کرنے کا سوال ہے حسرت کی خارجیت کا اس خارجیت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی جو لکھنؤ کے آخری دور کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ جرأت نے اپنی غزلوں میں جس خارجیت کو راہ دی ہے وہ ناسخ یا ان کے پیروؤں کی خارجیت سے بالکل علحدہ ہے۔ وہ چوٹی، کنگھی، سرمہ، مسی اور انگیا، ڈوپٹہ والی خارجیت نہیں ہے جو عامیانہ اور مبتذل ہونے کے علاوہ شاعرانہ حسن وصداقت سے خالی ہوتی ہے۔ اور جس کے لئے کوئی جمالیاتی جواز نہیں ہوتا۔

حسرت کے یہاں جو خارجیت ملتی ہے اس میں شاعرانہ حسن، نازک خیالی اور جمالیاتی عنصر ہوتا ہے۔ حسرت نے اردو غزل کو مبالغہ آمیز داخلیت اور غیر شاعرانہ اور مبتذل خارجیت سے پاک کرکے اسے بہترین غنائی شاعری کے پہلو بہ پہلو کھڑا کردیا ہے۔

یاد ہیں سارے وہ عیش بافراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغاز الفت کے مزے
حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

صحتیں لاکھوں مری بیماریٔ غم پر نثار
جس میں اٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے

حسرت کی غزل گوئی کی ایک گہری حقیقت جو سرسری مطالعہ میں نظر نہیں آتی یہ ہے کہ حسرت کے تصور عشق و محبت میں فطری انداز اور اس کے ساتھ ایک طرح کی مردانگی پائی جاتی ہے۔ اس کا عشق کمزور، ناتوان اور زنانہ قسم کا نہیں ہے۔ اس میں بلاوجہ کی گریہ وزاری، پست ہمتی اور نسائیت بھی نہیں ہے۔ حسرت کا عشق وہی ہے جو ایک عملی، مصروف اور متوازن دل و دماغ رکھنے والے انسان کا ہونا چاہیے۔

غزل کی ایک خاص چیز جسے حسرت نے بیحد فروغ دیا معاملہ بندی ہے۔ حسرت کی بدولت اس میں ایک نیا تیکھاپن اور ایک نئی شوخی اور دلکشی پیدا ہوئی۔ حسرت کے شائستگی مذاق نے جرأت اور داغ کی معاملہ بندی میں سنجیدہ بانکپن پیدا کیا۔

حسرت کی شاعری کی زبان دور حاضر کے تمام غزل گو شاعروں کی زبان سے زیادہ صاف ستھری، پاکیزہ اور موثر ہے۔ اردو غزل کا جو کلچر بن چکا ہے اس کے لئے حسرت کی زبان بیحد موزوں ہے۔ روزمرہ اور محاورہ کا پورا لطف ان کے کلام میں ملتا ہے۔ ان کے انداز بیان میں بیحد شیرینی اور شگفتگی اور ترنم ہے۔

غرض کہ حسرت کی جملہ خصوصیات شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ دور حاضر کے غزل گو شعراء میں ان کا درجہ سب سے ممتاز ہے۔ ان کی بدولت اردو غزل کو ایک نیا مزاج ملا اس میں ایک نئی تازگی اور نیا بانکپن پیدا ہوا۔

محمد حفیظ سید

غزل

(نذر سلطان محمد قلی قطب شاہ)

مریں بھی تو کیا جب جیا جائے نا / کہ اب زہر بھی تو پیا جائے نا

وہ حسن مجسم ہے اے دوستو / اسے نام قاتل دیا جائے نا

بیابان و تیشے سے مجھ کو غرض / محبت کو رسوا کیا جائے نا

جنوں آشنا جس نے مجھ کو کیا / اسی سے گریباں سیا جائے نا

اک اشک چکیدہ مری کائنات / یہ تحفہ بھی اس کو دیا جائے نا

کسی کی عنایت نہ پوچھو اریب / زمانے کا شکوہ کیا جائے نا

سلیمان اریب

اوٹی

سرگوشیوں میں غرق ہیں کہسار و آسماں — رنگینیوں میں ڈوبے ہیں فطرت کے رازداں

بستی ہے بادلوں کی، ترنم کا دیس ہے — اس سرزمیں پہ ہوتا ہے فردوس کا گماں

ہیں جابجا کرشمۂ قدرت کے شاہکار — رہ رہ کے جگمگاتے ہیں انوارِ لامکاں

رقصاں ہے مرغزاروں کے حسنِ سکوت پہ — کہسار کی جبینوں سے اٹھتا ہوا دھواں

شفاف آبشار، سمندر کے ہیں سفیر — ہیں جن کے انتظار میں پھولوں کی وادیاں

ہے کارگاہِ ابرِ گہربار، یہ دیار — شادابیوں کے یاں سے گزرتے ہیں کارواں

سرشار ذرہ ذرہ ہے کیفِ حیات سے — ہر جنبشِ نظر ہے تاثر کی داستاں

جچتی نہیں ہیں، روئے زمیں کی بلندیاں — یاں زندگی بدلتی ہے رخ، سوئے آسماں

لاریب! یہ مقام، وطن ہے بہار کا —!

جس کی خنک فضاؤں میں ہے سوزِ جاوداں۔!

بشیر النساء بیگم بشیر

مایوسی

غم ہستی کے اسباب میں سے بڑی وجہ احساس تنہائی بھی ہے۔ کتنے ہی انسانوں نے اپنے احساس تنہائی کو مٹانے کے لئے اپنی زندگیوں کو تباہ نہ کر دیا ہو گا۔"

پرکاش چندر ایم اے پراڈائز ہوٹل کے چمن میں کرسی پر ایک گوشہ میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے زندگی کے بیتے ہوئے دن پھرنے لگے۔ ماں کی گود، بچپن کا زمانہ، جوانی اور اس کی رنگینیاں —— ایک وسیع ماحول لیکن اس پر بھی تنہائی! اسے اپنی زندگی کا سب سے حسین دن یاد آیا جب شاما نے پہلی دفعہ اپنی زلفیں اس کے شانے پر بکھیر دی تھیں۔ اپنی آنکھوں سے پیام الفت سنایا تھا— گویا احساس تنہائی کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا تھا لیکن اب وہ دن نہ رہے تھے۔ وہ پچھلی ملاقاتیں انہیں بظاہر ایک دوسرے سے قریب کر رہی تھیں۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہی تھی۔ محبت کے بے پناہ سیلاب نے انہیں کشمیر کی حسین وادیوں میں بہا لایا۔ یہاں سے واپس ہونے کے بعد ہی شاما کے برتاؤ اور میل جول میں فرق پیدا ہو گیا۔ اس کی ہر ملاقات میں احساس برتری بڑھتا جا رہا تھا۔

ان کی ملاقات کی آخری پچھلی سی دیوہوٹل کی گفتگو تھی۔ پرکاش نے اپنی وسیع دنیا کو شاما کی ذات میں مرکوز کر دیا تھا۔ اور اس کا متمنی تھا کہ شاما کا ہر عمل اس کے لئے وقف ہو جائے۔ یکایک جیون ان کی زندگیوں میں داخل ہوا۔ شاما سے اس کا برتاؤ مہذب اور محبت آمیز تھا۔ شاما اس کو پسند کرنے لگی تھی۔ پرکاش کو یہ گوارا نہ تھا۔ پرکاش اور شاما کی آخری گفتگو کا موضوع جیون تھا۔ "اگر میں جیون سے ملتی ہوں تو تمہیں کیوں اعتراض ہوتا ہے۔" شاما نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔

یہ پرکاش سے ضبط نہ ہو سکا۔ بولا شاما "تمہاری الفت نے میرے احساس تنہائی کو مٹا دیا تھا۔ میں نے یہ سمجھا تھا کہ تمہارے تصورات صرف میرے لئے وقف ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ میری بھول تھی۔ تمہاری زندگی میں جیون نے بھی ایک مقام حاصل کر لیا ہے۔ اور میں نے سب کچھ کھو دیا۔ آج کی گفتگو میری زندگی میں یادگار رہے گی۔ آئندہ سے ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوں گے جیسے کہ ہم ایک دوسرے کو کبھی جانتے ہی نہ تھے۔ انسان ہمیشہ ایسے دل فریب دھوکے صنف نازک ہی کی وجہ سے برداشت کرتا ہے اور اپنی زندگی کو رنج و مصائب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اگر وہ ایسے حسین خواب نہ دیکھتا تو اس کی زندگی اعتدال پر قائم رہتی" پرکاش کے ہونٹوں پر جان لیوا مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ اپنی آخری گفتگو ختم کر کے رخصت ہو گیا۔

شاما بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن احساس خودداری پھر غم و غصہ، وہ بت بنی بیٹھی رہی۔ کچھ کہہ نہ سکی۔ پرکاش نے دو سال تک اپنی زندگی کو اخلاقی پستیوں میں جھونک دیا تھا۔ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ شاما سے اس کی کبھی ملاقات تھی۔

لیکن حقیقت کس طرح بھلائی جا سکتی ہے۔ وہ گزرے ہوئے دنوں کی یاد کو تازہ کرنے پھر ایکبار کشمیر چلا آیا۔ اور پراڈائز ہوٹل میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا۔

اسی ہوٹل میں اس نے شاما کے ساتھ رنگین ساعتیں بسر کی تھیں۔ آج پھر وہی جان لیوا احساس تنہائی —— دو سال کی پیہم بے اعتدالیوں نے پرکاش کی صحت کو بہت گرا دیا تھا۔ یادِ ماضی نے اس کے دماغ میں الجھن سی پیدا کر دی تھی۔ وہ آج شراب بہت پی گیا تھا۔ خرابی صحت نے قوت برداشت باقی نہ رکھی تھی۔ اسی عالم مدہوشی میں وہ اٹھا اور سڑک پر جا پہونچا۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ جیسے آج وہ کسی ضروری کام سے جا رہا تھا۔ پرکاش ایک تیز رفتار موٹر سے ٹکرا گیا۔ آہ دردناک منظر موٹر ران حادثہ کو روک نہ سکا۔

شاما کو پرکاش کے وہ الفاظ یاد آ گئے۔

"اب جو ہماری کبھی ملاقات ہو گی تو ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوں گے۔"

شاماؔ نے پرکاش کا سر اپنے زانو پر رکھا۔ اس کی آنکھوں سے دو گرم قطرے آنسو کے پرکاش کے چہرے پر گرے۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور مسکرایا۔ پھر ہمیشہ کے لئے خاموش۔

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

پرکاش کے بعد شاماؔ کی زندگی اداس، پھیکی اور بدمزہ ہو گئی تھی۔ اب اس کا کوئی مقصد نہ تھا۔ انسان کی زندگی مصائب و آلام میں گھر جائے تو کیا موت وقت سے پہلے آسکتی ؟

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

سعیدہ

رنگِ جذبات

کام کچھ بن پڑا ہے آہوں سے
پردے اٹھتے ہیں جلوہ گاہوں سے

جانے کیا ربط خاص ہے دل کو
دن کے نالوں سے شب کی آہوں سے

آپ سا جب نہیں جہاں میں کوئی
آپ چھپتے ہیں کیوں نگاہوں سے

گردِ منزل لپٹ کے روتی ہے
تیرے بختوں سے بے نپا ہوں سے

دیکھی جائے گی گرمیٔ محشر
جب بھی فرصت ملی گناہوں سے

کیوں خلش سی ہے دل میں کیا معلوم
کیوں دھواں اٹھ رہا ہے آہوں سے

میں وہ آزاد طبع ہوں اخترؔ
جس کو نفرت ہے کج کلاہوں سے

اختر رضوانی

مری کی گلپوش وادیوں میں ....

مری کے مسکراتے، گنگناتے رہگزاروں میں — حریری آنچلوں کے دھیمے دھیمے گیت سنتا ہوں
مگر وہ گیت جو تیری نگاہوں نے بکھیرے تھے — انھیں اب تک افق کے سرمئی دامن سے چنتا ہوں

مری کے بھیگے بھیگے اونچے اونچے کوہساروں میں — برستی بوندیوں نے موتیوں کا جال پھیلایا
مری ناشاد محبوبہ! تصور کے دریچے سے — نہ جانے کیوں ترا بھیگا ہوا چہرہ نظر آیا!

مری کی گل بداماں وادیوں میں کھو کے رہ جاؤں — اگر مجھ کو تمھارا عارضِ گلگوں نہ یاد آئے
تمھاری یاد نے ہر دام سے مجھ کو بچایا ہے — وگرنہ آدمی اور پنجۂ عصیاں سے بچ جائے!

مری کی وسعتوں پر زر کی دیوی راج کرتی ہے — کبھی اے کاش مزدوروں کی زردی رو سے ہٹ جائے
پھٹے کپڑے پہن کر میں اسے کیا منہ دکھاؤں گا — کوئی بدلی مرے ملبوس کا پیوند بن جائے

مری کے پھیلے پھیلے سبز گوں پیڑوں کے سائے میں — سنا کرتا ہوں اکثر میٹھی میٹھی پیار کی باتیں
تمھارے گاؤں کے شہتوت کیا اب بھی ملتے ہیں — مری پیاری حسینہ! آ رہی ہیں چیت کی راتیں

مری کا حسن افرنگی اداؤں سے نکھرتا ہے — برہنہ پنڈلیاں بنتی ہیں ہر محفل کی آرائش
مرا ذوقِ تجسس ایک گھونگھٹ کو ترستا ہے — مرے ہمراز! مغرب میں نہیں مشرق کی گنجائش

قتیل شفائی

غزل

درد کو نیچا دکھانا آگیا　　چوٹ کھا کر مسکرانا آگیا

مرثیہ خوانی سے اب گھٹتا ہے دم　　زندگی کا گیت گانا آگیا

جاہلوں کی بات ہنس کر ٹال دی　　جہل سے پیچھا چھڑانا آگیا

اُس کو سب کچھ آگیا سمجھو جسے　　دوسروں کے کام آنا آگیا

حسن نے رکھا جوانی میں قدم　　خود بخود بجلی گرانا آگیا

رنج ناکامی سے دل بجھتا نہیں　　وقت سے زور آزمانا آگیا

بے عمل سے کام کچھ ہوتا نہیں
وجدؔ کو باتیں بنانا آگیا

سکندر علی وجدؔ

آپ نے لکھا میں نے پڑھا

عزیز مدیر "سب رس" زاد مجدہ

اللہ تعالیٰ آپ کو سینما کے تماشے اور ریڈیو کی غزلوں سے ہمیشہ ہمیشہ محفوظ رکھے، مارچ اور اپریل سنہ ۱۹۴۲ء کا "سب رس" ملا۔ ان توام رسالوں کی پیشانی پر قیمت فی پرچہ درج کرنا کاتب صاحب نے پھر ترک فرما دیا ہے جو اصولی کوتاہی ہے اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے میری عینک سے ہر پرچہ کی اتنی ہی باریک کوتاہ کاریاں نظر آجاتی ہیں۔ لہٰذا آپ کے کاتب صاحب کے راشن کارڈ میں اگر کمی نہ کر دی گئی ہو تو ان کو تنہائی میں طلب کر کے اردو میں ڈانٹ دیجیے کیونکہ انگریزی زبان میں تو وزارتی وفد کا موجودہ نظام ہند موجود ہے!

دیگر احوال یہ ہے کہ "سب رس کے" یہ توام پرچے ملے حال معلوم ہوا۔ کیا معنی کہ دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوا! ما بعد میں یہ اقرار صالح کہتا ہوں کہ اس زمانے کے اردو کے اخباروں اور رسالوں میں آپ سب سے بہت اصولی اور قاعدہ کے عین مطابق ایڈیٹر اس طرح ثابت ہوئے کہ آپ نے میرے تار دیئے بغیر میرے خط کا ایک ایک حرف پڑھا ہی نہیں بلکہ سمجھا بھی اور اپنا فرض ادا کرنے پر مستعد بھی رہے۔ اسی لئے آپ نے میرے خط کی درج آخر پر نئے ادیبوں کے لیے ایڈیٹری کا نوٹ لکھا۔ ورنہ میں تو آج کل کے اچھے اچھے پرچوں کے ایڈیٹروں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنے مقالہ نگاروں کے مقالات کو اس درجہ بے خبری اور بے پروا حقیقت سے شائع کرتے ہیں جس سے ان کے کندۂ ناتراش پن کی اصلیت چودھویں کے چاند کی طرح نمایاں ہو جاتی ہے مگر الحمد کہ آپ "مستعد لوگوں" میں ملے۔ البتہ آپ کے اس نوٹ کی ایک غیر شرعی شرح رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ جناب گرامی نے لکھا ہے کہ ہر لکھنے والے کو ایک جدید اسلوب نگارش کا خالق اور موجد ہونا چاہیے اور میں نے لکھا تھا کہ ہر لکھنے والے کو دوسروں کے لکھے ہوئے کے ترجمہ اقتباس اور حوالہ کے عوض خود کچھ سوچ کر لکھنا چاہیے مثلاً یورپ والے لکھتے ہیں کہ عورت کو بے پردہ رکھیے تو اس کی نقل کے عوض اپنے غور سے ثابت کیجیے کہ بے پردگی کے یہ نقصانات ہیں، مثلاً یورپ والے لکھتے ہیں کہ فٹ بال کا کھیل صحت کے لئے مفید ہے مگر آپ بطور خود تمام ملکی اور جغرافیائی حالات پر غور فرما کر لکھئے کہ بس بس خموش ہندوستان ایسے گرم ملک میں فٹ بال کا کھیل مشقت شاقہ ہے اس لئے ہندوستانیوں کا اعصابی نظام اس کھیل سے تباہ ہو جائے گا۔ مثلاً یورپ والے صبح کے وقت ننگ دھڑنگ پھرنے لگے ہیں اور اپنے اس ننگے پن کو ڈاکٹری کہتے ہیں تو آپ خود غور کر کے لکھئے کہ ہندوستان کی ہوا میں جو برقی لہریں چلتی ہیں ہندوستان کا جسم ان کے اثرات کو جذب کرنے کے عوض بوجھل ہو کر ضعیف ہو جائے گا اس لئے ہندوستانیوں کا اتنی دیر تک ننگ دھڑنگ رہنا مضر ہے اسی لئے اپنے گاندھی جی صاحب سوکھتے ہی جا رہے ہیں اور بیمار ہی رہتے ہیں، مثلاً یورپ والے لکھتے ہیں کہ سینما کے تماشوں سے اصلاح ہوتی ہے تو آپ خود غور کر کے لکھئے کہ ہندوستانی قوم ذہنی اور دماغی حیثیت سے ابھی اتنی مستعد نہیں کہ وہ سینما کے تماشوں سے کسب فیض کر سکے لہٰذا ہندوستان میں سینما کے تماشے تجارت اور آوارگی کے سوا کچھ نہیں، اِلّا ماشاء اللہ، پس اگر اس طرح غور کر کے لکھنے والے پیدا ہو جائیں تو سمجھ لیجیے کہ ادب اردو ترقی کر رہا ہے ورنہ سمجھ لیجیے کہ ہنوز طفل مکتب ہے اور بس کیونکہ اردو میں ادیب اور ایڈیٹر تو ایک طرف آپ تو اردو کی کتابیں لکھنے والوں تک میں ایک ایسا نہ پائیں گے جس کی کتاب یورپ کے مصنفین کے تراجم اور حوالوں سے خالی ہو حتیٰ کہ تصنیفات اردو کے نام سے جو ادارے کام کر رہے ہیں ان کی جملہ کتابیں دو قسم کی کمزوریوں سے خالی نہیں۔ یا تو وہ ترجمہ اور مشتمل ہوں گی چند یورپی حوالوں پر یا پھر معیار اور سوجھ بوجھ کے اعتبار سے حد سے گزری ہوئی بازاری:

معیار کی اور عوام کے ذوق کی اور بس۔ اس لئے میں نے ہندوستانی دماغ کی اس فطری بے بضاعتی سے تنگ آکر لکھنے لکھانے کے عوض "بکرا بکری الیوسی ایشن" اور "انجمن مرغا مرغی" کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اب "شتر سواروں کا ادارہ" بنانا اور رہ گیا ہے جو امید ہے کہ بعد ماہ رمضان المبارک میری عربی داں بیوی کی صدارت میں بن جائے گا۔ فی الحال میں "مرغا مرغی انجمن" کو چلا رہا ہوں جس کی صدر بیوی نمبر ۳ اور سکریٹری بیوی نمبر ۱ ہیں۔ انڈے مجھی کو فروخت کرنا پڑتا تھا اس لئے میں نے "بیوی گرانڈ کونسل" میں اپیل کر کے اس انجمن کے خزانچی کا عہدہ بقلم خود حاصل کر لیا ہے۔ کہ "بیوی گرانڈ کونسل" نے میری تحریری لیاقت کے اعتماد پر مجھی کو "انجمن مرغا مرغی" کا وزیر پروپیگنڈا بھی مقرر فرمایا ہے۔ اس لئے آنے والی جمعرات کو میں سیمرغ کا حلف وفاداری اٹھا کر اس عہدہ کا جب چارج لے لوں گا تب میں مرغا مرغیوں کا ڈاکٹر گوبلز مشہور ہو جاؤں گا جو ہٹلر ساکن جرمنی کا وزیر پروپیگنڈا تھا۔ میرا ارادہ ہی نہیں بلکہ میں ایسی رپورٹ تیار کر چکا ہوں جس میں میں نے قبلہ شمس العلماء خواجہ حسن نظامی کے "مرغی خانے" کے جواب میں ایسی تجاویز مرتب کی ہیں جن پر عمل کرتے تمام غیر ہندوستانی مرغا مرغیوں سے کہا جائے گا کہ ہندوستان خالی کر دو۔ کیونکہ میں اپنی بیویوں کی گرانڈ غیر فاسسٹ کونسل میں ثابت کروں گا کہ ہندوستانیوں کو اطالوی مرغا مرغی پالنے خصوصاً لیگ ہارن اور روڈ نسل کی ولایتی مرغا مرغیوں سے بقدر کئی کروڑ کے نقصان پہنچا اور ابھی مزید نقصان کا اندیشہ ہے۔ "بیوی گرانڈ کونسل" میں مجھے اپنی انگریزی داں بیوی کی مخالفت کے سوا کوئی خطرہ نہیں کیونکہ بدبختی سے ہندوستانی دماغ جس زبان کی تعلیم حاصل کرتا ہے اس زبان کی نسل کے لوگوں کے جملہ خواص کی بھی نقل کئے بغیر نہیں رہتا۔ حد ہے کہ عراق عرب جاتا ہے تو لباس کی حیثیت سے پورا بدو بن کر آتا ہے، لہذا اگر میں اپنی تجاویز میں غیر ہندوستانی مرغا مرغیوں سے ہندوستان خالی کرا رہا ہوں" تو اس سے ایک "مرغیانہ مقصد" یہ بھی ہے کہ ہندوستانیوں میں ملکی مصنوعات کی طرح "ملکی حیوانات" سے بھی انس اور ہمدردی پیدا ہو۔ ورنہ یہ کہاں کی روشن خیالی ہے کہ صرف انگریزوں سے تو کہا جائے کہ "ہندوستان خالی کیجیے" اور ولایتی کتوں سے نہ کہا جائے کہ ہندوستان خالی کیجیے، ریس کے ولایتی گھوڑوں سے نہ کہا جائے کہ ہندوستان خالی کیجیے، الحاصل مجھے امید ہے کہ میں "بکرا بکری الیوسی ایشن" اور "انجمن مرغا مرغی" کے بعد ہی جیسا ہی کہ قحط کا خطرہ کم ہوا کہ فوراً تمام ہندوستان کے فائدہ کے لئے "بھینس بھینسا انسٹیٹیوٹ" بھی قائم کرواں گا جس کا مقصد یہ ہوگا کہ ملک میں ادبی عرف دماغی کام کرنے والوں کو دولت مند لوگ تو دماغی منافع بہم نہیں پہنچاتے اس لئے میری اس "تنظیم حیوانات" ہی سے ان لوگوں کو تندرستی کے منافع حاصل ہوں الغرض کہ میری ان تحریکات کو فروغ دینے میں ملک کے تمام ادیب اور شاعر میرا ساتھ دیں گے مراد یہ ہے کہ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کے بعد کوئی نہیں رہا جو مرغا مرغی، بکرا بکری اور بھینس گائے کے منافع پر نظمیں لکھا اور مضامین لکھے۔ مگر خدارا کوئی صاحب ایسا نہ کریں کہ فوراً ہی کسی یورپ والے کی حیواناتی کتاب کا ترجمہ کر ڈالیں بلکہ صرف ہندوستانی گدھوں کو چھوڑ کر باقی کے جملہ حیوانات کے منافع کا ایک ذاتی نظریہ لے کر کچھ لکھیں، اور اس سلسلہ میں تمام وہ مصطلحات محاورات اور نام استعمال کریں جو ہندوستان ہی کی پیداوار ہوں کیونکہ اردو میں نااہل اصحاب قلم کے ذریعہ انگریزی الفاظ کا جو عظیم ذخیرہ جمع ہو گیا ہے اس کا بدل پیدا کرنا جدید نسل کے بس کا اس لئے نہیں کہ یہ نسل عربی فارسی سے یکسر بیگانہ ہے اور سینما کی ماہر۔ امید کہ میرے اس تھوڑے لکھے کو بہت جان کر آپ بھی اس طرف کے لوگوں کو میری مذکورہ بالا انجمنوں کا ممبر بنانے کا کام شروع فرماویں گے۔ زیادہ حد ادب

ملا رموزی

غزل

وہ لطفِ جوانی تو ضعیفی میں نہیں ہے
ہے دل ابھی پہلو میں خیال اور کہیں ہے

دیکھو تو جنوں ہم کو کہاں لیکے چلا ہے
افلاک ہیں سر پر تہہ پا سطحِ زمیں ہے

کندہ تھے خیالات جوانی میں جو دل پر
ان کی بھی ابھی یاد دمِ بازپسیں ہے

افسوس جوانی میں اسے بھول گئے تھے
دل کہتے ہیں جس کو وہ زمرد کا نگیں ہے

کس چیز کو ہم زادِ سفر سمجھیں الٰہی
ہم ایسے مسافر کی نہ دنیا ہے نہ دیں ہے

ایک ایک نفس یادِ الٰہی میں ہے مصروف
میں دور اگرچہ ہوں بہت وہ تو قریں ہے

دنیا کا ہے یہ حال عزیز آپ نے دیکھا؟
اپنا جسے سمجھے تھے وہی بر سرِ کیں ہے

عزیز یار جنگ بہادر عزیز

حشرِ جذبات

ذوقِ اسیری کا یہ کہنا ہے کہ میعاد نہ ہو
ہم بھی آزاد نہ ہوں قید بھی آزاد نہ ہو

ابھی ممکن ہے کہ عشرت کی ہوس ہو پیدا
اس فراوانیٔ غم میں تو ابھی شاد نہ ہو

ہاتھ سے سلسلۂ قیدِ محبت کو نہ چھوڑ
روح جب تک قفسِ جسم سے آزاد نہ ہو

کم سے کم موت سے لے عشق میں تعلیم سکوت
ضبط اتنا ہو کہ اندیشۂ فریاد نہ ہو

کہتے ہیں بجھ گئی اک شمع سحر سے پہلے
یہ دلِ وقفِ ستم کی کہیں روداد نہ ہو

احتیاط اتنی حسینوں سے نہ کرائے زاہد
کوششِ حسنِ عمل بھی کہیں برباد نہ ہو

دل محبت کے لئے چاہیئے ثاقب ایسا
جس میں عنصر کوئی من جملۂ اضداد نہ ہو

ثاقب کانپوری

کس کا خون!

"او بالوجی"! ایاز بن حسن نے آواز کی کوئی پروا نہ کی۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق چلا جا رہا تھا۔ ماں سن کر کتنی پریشان ہوگی۔ ابی نے تو شاید اب تک کہہ بھی دیا ہوگا۔ "او بالوجی"! ایاز ٹھہر گیا۔ ایک لڑکی اس کے پیچھے دوڑتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کے خوبصورت ماتھے پر شکنیں تھیں۔ "کب سے بھاگی آ رہی ہوں۔ بالوجی، یہ لو" یہ کہہ کر اس نے ہنس کر ایاز کے ہاتھ میں دے دیا۔ ایاز مسکرایا۔ واقعی اس کا بٹوہ گر پڑا تھا۔ "تم نے اسے رکھ کیوں نہ لیا۔" ایاز نے شرارت سے پوچھا۔ "ارے رام رام مجھے پرایا مال نہیں چاہیے۔" وہ واپس چلی گئی۔ اس کے پیروں سے گھنگروؤں کی جھنکار آنے لگی۔ کچھ دور جا کر اس نے اپنا گھڑا اٹھایا اور پلٹ کر ایاز کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ وہ اپنی سہیلیوں میں جا ملی۔ ایاز آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ بے پروائی سے بٹوہ کھولا۔ اس میں سے پانچ روپیہ کا نوٹ غائب تھا! ایاز کو ہنسی آئی۔ "شریر کہیں کی" یہ کہتا ہوا کنویں کے پاس پہنچا۔ سب لڑکیاں جا چکی تھیں۔ ایاز ابھی گھر سے کچھ ہی دور تھا۔ اس نے دیکھا کہ کھڑکی میں اس کی ماں اس کی منتظر کھڑی تھی۔ جب وہ گھر پہنچا تو اس کی ماں نے فوراً دروازہ کھولا اور ایاز سے لپٹ گئی۔ "آ گئے میرے چاند؟" خوشی سے اس کے آنسو نکل پڑے۔ ہاں ایاز کا قیاس ٹھیک تھا۔ ابی نے ماں کو خبر سنا دی تھی۔ اس کا باپ تلوار صاف کر رہا تھا۔ "چھوڑ دے اسے!" چلا کر اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "حسن بن عبداللہ کے بیٹے کو تو خوف دلا رہی ہے۔ میں کہتا ہوں چھوڑ اسے۔" ماں نے با دلِ ناخواستہ بیٹے کو چھوڑ دیا۔ حسن بڑبڑانے لگا: "روز بروز لڑکی بنتا جا رہا ہے۔ اب تو گھر بیٹھ۔" ایاز کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "ابی! میں لڑکی نہیں۔ ایاز بن حسن ہوں۔" حسن نے حقارت سے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جب ہی تو ماں سے لڑکیوں کی طرح لپٹ رہا ہے۔ ہٹ یہاں سے ہتھیار سنبھال۔ کل معلوم ہوگا کہ تو لڑکی ہے یا ایاز بن حسن۔" دن بھر دونوں باپ بیٹے کام کرتے رہے۔ آخرکار رات کو تھک کر باپ بیٹے وہیں سو رہے۔ آدھی رات کو کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ "حسن بن عبداللہ!" بدنصیب ماں رات بھر نہیں سوئی تھی، وہ دوڑتی ہوئی اس کمرے میں آئی جہاں اس کے دونوں شیر پڑے سو رہے تھے۔ خوف اور فکر سے اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ "حسن بن عبداللہ!" حسن فوراً نیند سے چونک پڑا "کون ہے؟" "میں علی بن مصطفیٰ" حسن نے فوراً تلوار سنبھالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے میں اس کی نظر اپنی بیوی پر پڑی۔ "کھڑی منہ کیا تک رہی ہے؟ اٹھا اپنے لڑکے کو۔ آج تیری جوانمردی کا امتحان ہے۔ اٹھو، تو سن کر بھی پڑا ہے" باپ کی آواز سن کر ایاز اٹھ بیٹھا۔ اپنی تلوار سنبھالی۔ کمر پٹہ کس کر باندھ لی۔ باپ بیٹے جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ایاز کی ماں دوڑتی ہوئی آگے بڑھی۔ اور حسن کے قدموں سے لپٹ گئی۔ "خدا کے لئے خبردار رہنا" "چل دور ہو" حسن نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔ "ایک عرب کی جان کے لئے ڈرتی ہے؟" بیباک حسن "بسم اللہ" کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ ایاز اپنی ماں کو اٹھا کر لپٹ گیا۔ "خدا پر بھروسہ رکھو ماں" یہ کہہ کر ایاز بھیانک اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ ماں کی آنکھیں تاریکی میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں —— ایاز۔

—— ۲ ——

شہر میں ایک کہرام سا بپا تھا اور پیاسی زمین دو بھائیوں کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہی تھی۔ بہادر جوان جوشیلے بوڑھے بھوکے شیروں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے جن میں جانباز مسلمان اور بہادر راجپوت سبھی تھے۔ کیا یہ لڑائی حصول آزادی کے لئے تھی؟ نہیں! محض جہالت، اور ایک دوسرے پر فوقیت جتانے کے لئے۔

حسن بن عبداللہ جس کے باپ دادا نے سرزمین عرب کے لئے اپنی جانیں لڑا دی تھیں، اب اس کے پہلو میں

اس کا شیر سا بیٹا باپ کے دوش بدوش لڑ رہا تھا۔ دونو کی تلواریں سورج کی کرنوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ مگر ان دونوں کے مقابل میں کوئی گیدڑ تھوڑا ہی تھا۔ یہ تو مہندر جیت سنگھ جی تھے! جن کے چھوٹے سے مکان کی دیوار پر بہادری کے طلائی تمغے لگے تھے۔ وہ حسن بن عبداللہ یا اس کے باپ سے کیوں ڈرتا بوڑھے مہندر کی رگوں میں راجپوت خون تھا۔ حسن نے تلوار روک لی اور کہا میدان میں آؤ۔ اس نے مہندر سے کہا۔ دونوں نے ایک دوسرے میدان کو جنگ گاہ بنا دیا۔ اور دونوں کی تلواریں پھر چمکیں۔ حسن بن عبداللہ کا سینہ زخمی ہو چکا تھا۔ پھر بھی مسکراہٹ اس کے چہرے پر تھی۔ وہ لڑا جا رہا تھا۔ بوڑھے مہندر سے برسوں کی دشمنی تھی۔ وہ آج اس کی جان بچا لئے بغیر نہ چھوڑے گا۔ حسن جانتا تھا کہ آج فتح اس کی ہوگی کیونکہ مہندر اس کے نزدیک ابھی بچہ ہی تھا۔ مہندر بھی اپنی جان کی بازی لگا چکا تھا۔ نڈر ہو کر لڑ رہا تھا۔ ایاز کی آواز حسن کے کان میں آئی: "اس بوڑھے کا دم تو ویسے ہی نکل رہا ہے۔ آپ کسی اور سے لڑیئے" حسن نے فوراً تلوار روک لی۔ اسے پہلی دفعہ مہندر کے بڑھاپے اور خود کی جوانی کا احساس ہوا۔ مہندر کا سانس پھول رہا تھا۔ اس کے کندھے پر زخم گہرا لگا تھا۔ حسن اور مہندر کی آنکھیں چار ہوئیں جو مہندر غصہ سے لرزنے لگا: "بزدل کہیں کا۔ تجھ جیسے سیکڑوں سے لڑنے کی ابھی ہمت ہے۔" مہندر تلوار کھینچ کر آگے بڑھا۔ ایاز نے بھی تلوار سنبھال لی۔ اتنے میں ایک پولیس افسر کی آواز آئی: "لاٹھی چارج کرو کمبختوں پر، راستی سے کوئی بات مانتے نہیں۔" ایک پولیس والے نے پیچھے سے لاٹھی ماری مہندر کے پیر لڑکھڑانے لگے۔ کہیں دور سے ایاز کی ہنسی کی آواز آئی۔ مہندر دانت پیسنے لگا: "اچھا تو ٹھیر تو۔" مہندر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا گھر پہنچا۔ اس کی بیوی دوڑتی ہوئی آ کر مہندر کے قدموں سے لپٹ گئی: "یہ کیا ہوا ناتھ" وہ رونے لگی۔ "کبتیا او کبتیا" اس نے اپنی لڑکی کو پکارا۔

"پتاجی کے لئے بستر لا" کبتیا دوڑتی ہوئی آئی۔ خوف سے اس کا خوبصورت چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ آخر کار ماں اور بیٹی نے مہندر کو بستر پر لٹا دیا۔ کچھ دیر تو مہندر آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ اس کے بعد اس کے زرد لبوں کو جنبش ہوئی "کبتیا کی ماں" "کہو ناتھ" مہندر کی ماں بولی — "کاش چار لڑکیوں کے بجائے صرف ایک لڑکا ہوتا۔" "ناتھ اس وقت لڑکے کی باتیں کیوں کرتے ہو۔ ناتھ پل بھر آرام کرو۔" مہندر اٹھ بیٹھا۔ جوش و نفرت کے جذبہ سے وہ کانپ رہا تھا۔ "ہاں صرف ایک لڑکا ہوتا تو وہ میرا نام روشن کرتا۔ حسن بن عبداللہ کے بیٹے نے آج میرا اپمان کیا۔ کاش لڑکا!" کبتیا سے رہا نہ گیا۔ وہ دوڑتی ہوئی مہندر کے قریب آئی: "پتاجی مجھ میں بھی تو راجپوت خون ہے۔ میں بدلہ لوں گی۔" "تو؟ میری چھوٹی کبتیا؟" "ہاں ہاں میں" مہندر مسکرایا۔ کبتیا نے ایک نازک ہاتھ باپ کے سینہ پر رکھ دیا جہاں اس کا بہادر خون آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا: "قسم ہے اس راجپوت خون کی میں اپنے باپ کا بدلہ لوں گی۔" بوڑھے مہندر کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایاز صبح اٹھا۔ اپنی گٹھڑی اٹھائی اور گھر کی طرف چل پڑا۔ راستہ میں اسے وہی کنواں نظر پڑا جہاں وہ لڑکی ملی تھی۔ ایاز ٹھیر گیا۔ اس شریر سے روپے مانگنے تھے۔ وہ اکیلی گھڑا لئے ہوئے اس کی طرف آئی۔ اس کا شگفتہ چہرہ کملایا ہوا تھا۔ اس کی نظر ایاز پر پڑی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں شرارت کی ایک جھلک پیدا ہو کر بجھ گئی۔ ایاز بھی مسکرا دیا۔ اس نے اشارے سے اسے اپنے قریب بلایا۔ وہ گھڑا نیچے رکھ کر ایاز کے قریب آئی۔ "کہاں ہیں باقی پیسے میرے" "جھوٹی کہیں کی۔" لڑکی کی صورت پر سنجیدگی چھا گئی۔ اس نے جلدی سے ایک میلا سا نوٹ نکالا "یہ لو تمہارے پیسے" "نہیں نہیں تو رکھ لے۔" "مجھے نہیں چاہیئے۔" "کیوں؟" "مجھے نہیں چاہیئے۔" "میں تو مذاق کر رہا تھا۔" "میرے پتاجی بیمار ہیں۔" اس کے دل کو دھکا لگا — "نہیں نہیں" — "کبتیا او کبتیا" کبتیا کی سہیلیاں اسے پکار رہی تھیں "شکریہ"

"کبیتا نے کن انکھیوں سے ایاز کی طرف دیکھا۔ "کبیتا کل ملو گی؟"
ایاز نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "نہیں۔
اب میں آپ سے نہیں مل سکتی۔ آپ جائیے۔"

ایاز اور کبیتا میں محبت کی پینگیں بڑھنے لگیں۔
ایاز چھپ کر آتا۔ اور کبیتا کی آنکھیں بند کر دیتا۔ "بتاؤں
نام ——— ایاز ———" دونوں ہنس پڑے۔ شام ہو جاتی
پرندے اپنے گھونسلوں کی طرف چل پڑتے، چاند پہاڑیوں کے پیچھے
سے مسکراتا ہوا ساری کائنات کو اپنے آغوش میں گھیر لیتا۔
سرد ہوائیں چلنے لگتیں۔ وہ دونوں۔ ایاز، کبیتا، باتوں میں منہمک
رہتے، دلچسپ، دلفریب۔ کبیتا اپنے بندھے بناتی۔ ایاز اسے
شادی کے لئے مجبور کرتا۔ شادی کا نام سنتے ہی ساری خوشیاں
ہونٹوں پر لرکھنے لگتیں۔ ہونٹ کانپ کر رہ جاتے۔ کبیتا۔
ایاز کبیتا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر پوچھتا۔ "کہو منظور؟"
کبیتا کے ہونٹ ہل جاتے۔ "ایاز تم "مسلمان"۔ "کبیتا" "کبیتا۔
محبت کرنے والوں کا کوئی مذہب نہیں۔"

—— (۳) ——

حسن بن عبد اللہ اپنے مکان میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔
ایاز اس کے قریب بیٹھ گیا۔ "کیوں بے" حسن نے پوچھا۔ "کل
تو نے کتنے ہندوؤں کی جان لی؟" "ایک کی بھی نہیں" حسن نے
ایک قہقہہ لگایا۔ "اور پھر کہتا ہے کہ میں ایاز بن حسن ہوں۔
بتا کیا کر رہا تھا؟" "جہاں تک ہو سکے اپنی اور دوسروں کی
جان بچا رہا تھا۔ اگر میں بیچ بچاؤ نہ کرتا تو مہندر مر ہی گیا
تھا۔" حسن غصہ کی حالت میں کھڑا ہو گیا۔ "کمبخت۔ بزدل
کہیں کا!" ایاز بھی جوش میں کھڑا ہو گیا۔ "ابی میں ڈرپوک
نہیں ہوں۔ میں اس لئے لوگوں کی جانیں بچا رہا تھا کہ یہ
سب لوگ زندہ رہ کر پہلے اپنی غلامی کی زنجیروں کو توڑیں۔
ابی بھلا بھائی بھائی بھی کبھی آپس میں لڑتے ہیں؟" "کیا
بھائی بھائی کی رٹ لگا رکھی ہے؟" حسن نے جھنجھلا کر کہا۔
"ابی ہندو مسلم بھائی بھائی ———" "خاموش" حسن نے
چیخ کر کہا۔ "نہیں ہو سکتا۔"

—— (۴) ——

"کبیتا۔ بیٹی کبیتا!" کبیتا نیند سے چونک پڑی۔ "پتا جی!"
"چل میرے ساتھ۔" کبیتا خاموشی سے باپ کے ساتھ چل گئی۔
مہندر نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ کچھ دیر تک دونوں
راستہ پر کھڑے تھے۔ چوطرف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ مہندر
نے ایک ہاتھ کبیتا کے کندھے پر رکھا۔ "بیٹی اپنی قسم یاد ہے؟"
"ہاں پتا جی۔" "میں بدلہ ضرور لوں گی۔" مہندر اور کبیتا آہستہ
آہستہ جانے لگے۔ آخر کار مہندر نے کبیتا کو ایک مکان کے آگے
لا کھڑا کیا۔ "یہی ہے اس کتے کا مکان ———" کبیتا اور
مہندر ایک چھوٹی سی کھڑکی سے دیکھنے لگے۔ حسن اور اس کی
بیوی بے فکری سے پیر پھیلائے سو رہے تھے۔ مہندر نے
کبیتا کو ایک دوسرے کمرے کی کھڑکی کے آگے لا کھڑا کیا۔ وہ بند تھی۔
اس نے بوسیدہ کھڑکی کو آہستہ سے ہلایا۔ کنڈی کھٹ سے
گر پڑی۔ حسن بن عبد اللہ کے بیٹے نے کروٹ بدلی۔ کچھ دیر تک
دونوں باپ بیٹی دم سادھے کھڑے رہے۔ آخر کار مہندر
نے کہا۔ "یہی ہے اس کتے کا بچہ" "کبیتا تو اندر جا کر اسے
جگا دے۔ اور کہہ کہ مہندر جیت سنگھ خود تجھ سے اپنے اپمان کا
بدلہ لینے آیا ہے۔ اگر وہ تجھ پر ہاتھ اٹھائے تو اسی کٹار سے
اپنی حفاظت کرنا۔" کبیتا کے نازک ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا
چاقو تھا۔ کبیتا کھڑکی پر چڑھ گئی۔ ہر طرف بھیانک تاریکی اور
خاموشی چھائی ہوئی تھی ——— کہیں ——— الو چیخ رہا تھا۔
کبیتا کا ہاتھ رک گیا۔ "پتا جی یہ بدشگونی ہے۔" مہندر ہنسنے لگا۔
اور بولا "میری بہادر بیٹی!" یہ جملہ کبیتا کی روح میں اتر گیا۔
وہ بے تحاشا اندر کود گئی۔ حسن بن عبد اللہ کا بیٹا بے خبر سو رہا
تھا۔ کبیتا کو ایک دم کچھ خیال آیا۔ وہ کیوں نہ خود اس کو مارے؟
اس کی قسم بھی پوری ہو گی اور پھر پتا جی کو لڑنے کی زحمت
بھی نہ ہو گی! وہ ابھی ابھی تو بستر سے اٹھے تھے۔ کبیتا کے کانوں
میں وہ الو کی منحوس آواز گونج گئی۔ ہاں پتا جی کے لئے آج
لڑنا مناسب نہیں ہے۔ کبیتا آگے بڑھی۔ اس کے ماتھے پر
پسینہ کے قطرے تھے۔ وہ حسن بن عبد اللہ کے بیٹے کے قریب

گئی۔ اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اونچا کیا اور اس کے سینہ میں چاقو پیوست کر دیا۔ ایاز کے منہ سے ایک دلدوز آہ نکلی۔ کبیتا دوڑتی ہوئی کھڑکی تک گئی۔ ایاز نے ایک ہاتھ سے کلیجہ پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے لالٹین روشن کی۔ دھندلی سی روشنی میں کبیتا کا زرد اور خوفزدہ چہرہ نظر پڑا۔ "کبیتے!" ایاز نے حیرت سے پکارا۔ کبیتا پر گویا بجلی گر گئی۔ وہ اس پیاری آواز کو خوب جانتی تھی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ "ایاز!" وہ دوڑ کر ایاز کے پہلو میں گر پڑی۔ ایاز نے اپنا ایک کمزور ہاتھ کبیتا کے گرد ڈال دیا۔ "کبیتا تم نے یہ کیا کیا؟" کبیتا کے رخسار پر آنسو بہہ رہے تھے۔ "ایاز مجھے معلوم نہ تھا" ایاز مسکرایا۔ کبیتا اس سے لپٹ گئی۔ "نہیں نہیں ایاز۔ تم اور میں جدا نہیں ہو سکتے۔" ایاز پھر مسکرایا۔ "تم ہی نے تو جدا کر دیا۔" "ایاز میں نے جدا کیا تم ہی ملا دو۔" ایاز گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ "کیا کہہ رہی ہو کبیتا؟" کبیتا اندھیرے میں چاقو ڈھونڈ رہی تھی "تو ایاز" "کبیتے اب چلی جاؤ" کبیتا نے چاقو ایاز کے ہاتھ میں دیدیا۔ ایاز چاقو لے کر دیکھنے لگا۔ وہ اس کے بہادر اور جوشیلے خون میں نہا رہا تھا۔ "ایاز تمھیں اپنے خون کی قسم مجھے بھی قتل کر دو۔" "کبیتا! ایاز مجھے بھی ساتھ لے چلو یاد ہے تم نے کہا تھا کہ ہم ہندی ہیں؟ ایاز اگر اپنی شادی ہوتی تو ہم کبھی چین سے نہ رہتے۔ اب مجھے اپنے ساتھ لے چلو ایاز۔" ایاز کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ ایاز نے چاقو تنگ پکڑ لیا۔ "اچھا کبیتا" اس نے آہستہ سے کہا۔ کبیتا خوشی سے ایاز کے قریب کھسک گئی۔ ایاز نے اسے تنگ پکڑ لیا۔ کبیتا نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایاز نے ہاتھ اونچا کیا۔ اور دور بہت دور پھینک دیا۔ "نہیں نہیں کبیتا" کبیتا آنکھیں کھول کر "یہ کیا ـــــ" کبیتا نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔" "اچھا!" کبیتا نے چاقو زمین سے اٹھا لیا اور اپنے سینہ میں گھونپ لیا۔ ایک دلخراش چیخ نکلی۔ اس کا چھوٹا سا سر ایاز کے کندھے پر ڈھلک گیا۔ دروازہ کھلا۔ حسن بن عبداللہ اور اس کی بیوی اندر داخل ہوئے۔ اور ادھر کھڑکی سے مہندر کود پڑا۔ "حسن بن عبداللہ نے مہندر کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ایاز نے بہ مشکل تمام آنکھیں کھولیں۔ اس کے زرد چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ حسن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ "تو کون ہے؟" کبیتا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "میری لڑکی" مہندر نے فخر سے کہا۔ حسن تلوار کھینچ کر مہندر کی طرف بڑھا۔ "ڈرپوک کتے" اس نے غضبناک حالت میں کہا۔ "لڑکی سے" "ابی" ایاز نے آہستہ سے کہا "اس میں مہندر کا قصور نہیں۔ کبیتا اور میں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔" ایاز کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ کمرے میں موت کی سی خاموشی تھی۔ حسن اور مہندر اسی طرح کھڑے تھے۔ ایاز کا دم سینہ میں رک رہا تھا۔ وہ مر رہا تھا اس کی آنکھوں میں امید کی نئی روشنی جھلک رہی تھی۔ ایاز اور کبیتا کا خون زمین پر بہہ رہا تھا۔ ایاز اور کبیتا کے ٹھنڈے خون نے دونوں کے ہاتھ سے تلواریں گرا دیں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

خدیجہ بلگرامی

اشوک اعظم:۔ یہ کتاب مجلس ادبیات اطفال کی طرف سے طلبا اور عوام کے لئے سلیس اور سادہ زبان میں لکھائی گئی ہے۔ محترمہ سیدہ مہدی جعفری صاحبہ بی۔ اے (عثمانیہ) نے ہندوستان کے اس مشہور فرمانروا کے حالات زندگی اور کارنامے دلچسپ پیرائے میں قلمبند کئے ہیں۔ کتاب باتصویر ہے اور کتابت و طباعت اچھی ہے۔ قیمت (۸ر)

ملنے کا پتہ :۔ سب رس کتاب گھر رفعت منزل

حیدرآباد دکن

وہ دو فرلانگ لانبی سڑک پر جا رہا تھا، کالی کالی، سفید سفید کنکریاں اس کے بے ڈھب پیروں سے ٹکرا کر آگے پیچھے اچھل رہی تھیں ——— پھر اس کے قدم سوکھے اور مرجھائے ہوئے کھیتوں کی جانب اٹھے، اور وہ چھوٹے چھوٹے گڑھوں کو پھاندتا ہوا ایک اونچی سی چٹان پر چڑھ آیا ——— اس کی نظریں پیاسی زمین اور مرجھائے ہوئے سرسوں پر پڑیں، بارش کے نہ ہونے کی وجہ سے زمین میں جا بجا شگاف پڑ گئے تھے۔ جیسے اپنے سوکھے ہوئے ہنیالے لب وا کئے، وہ آسمان کی نیلگوں ہردوں سے پانی کی بھیک مانگ رہی ہو، جھلسی ہوئی زمین پر ٹیڑھی لکیروں کے نقش، بوڑھی عورت کے جھریوں والے چہرے کے مانند نظر آ رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا۔

"گزشتہ سال تو بارش اچھی ہوئی تھی لیکن اس سال بارش کا نام و نشان نہیں۔ آخر کیوں؟"

اس کی نظریں آسمان کی جانب اٹھیں، اس نے زیر لب کہا "کیا آج بھی بارش نہ ہوگی ——— بھگوان کیا تیرے پاس ہم غریبوں کے لئے رحم نہیں ——— کیا تجھے ان بلکتے ہوئے معصوم بچوں، تڑپتے ہوئے کمزور بوڑھوں چیختی ہوئی مجبور عورتوں ——— پر ترس نہیں آتا ——— تو ہم سے اتنا خفا کیوں ہو گیا ہے۔ اے بھگوان ——— ہم غریبوں پر دیا کیوں نہیں کرتا ———!!"

اس کے قدم آبادی کی جانب اٹھنے لگے، وہ زیادہ دور چلنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کی نظریں مردم خوار گدھوں پر پڑیں ——— ہزارہا گدھ ——— ایک گائے کی تکا بوٹی کر رہے تھے۔ اس نے گائے کو بغور دیکھا۔ اس کی نگاہیں گائے کی سینگوں کے سنہری کنڈوں پر تیرنے لگیں۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے وہ بےجان بوٹوں اور سنہرے کنڈوں کو دیکھتا گیا اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ اس کے خیالات ماضی کے دھندلکوں پر تیرنے لگے۔

"دو سال پہلے اس نے کتنے ہی پیار سے اس گائے کی سینگوں کے لئے سنہری کنڈے بنوائے تھے ——— چندرا کی ماں نے اس کو بڑے ہی پس و پیش سے فروخت کیا تھا۔" دفعتاً اس کو اپنی دکھیا ماں کے الفاظ یاد آ گئے

"جگت میری گوری دو دن سے غائب ہے ——— ذرا کھیتوں پر دیکھ آ بیٹا، نہ جانے کہاں چلی گئی ———"

اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے ——— وہ سوچنے لگا، گھر پہنچ کر ماں کو کیا جواب دے گا۔ جب وہ یہ سنے گی کہ اس کی گوری اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھین لی گئی ہے تو اس کو کتنا دکھ ہوگا۔" گائے کی لاش پر گدھ نہ ہوتے تو شاید وہ گائے کی ہڈیوں کے ڈھانچے سے لپٹ کر کہتا۔

"مقدس ماں تو تو چلی گئی ——— لیکن اب معصوم نندوا کا کیا ہوگا۔ اس کو دودھ کہاں سے ملے گا۔ وہ کیسے زندہ رہے گا ——— ہاں میرا نندو۔ مقدس ماں!"

مکان میں داخل ہوتے ہی اس کی بوڑھی ماں نے پوچھا۔ "گوری کا کچھ پتہ چلا بیٹا؟"

"ماں، وہ تو املی کے درخت کے نیچے، راموکے کھیت کے اس پار مری پڑی ہے"۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "گوری مر گئی!" اس کی ماں نے اس طرح کہا گویا اس سے اس کا نندو چھین لیا گیا ہے۔ اس کی بھیگی ہوئی آنکھوں کے آگے، نندو اور گوری کی سینگوں کے سنہری کنڈے رقص کرنے لگے ———! جگت کے

بوڑھے چچا نے آنگن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "گوری تو مر چکی ——— اب خود کی فکر کرو ———
تالاب کا پانی بھی سوکھنے کو ہے"۔ "اب کیا ہوگا" "ہوگا کیا! قحط کی وجہ سے تو ہزار ہا انسان دم توڑ رہے
ہیں۔ پانی بھی میسر نہ آئے تو اور کئی نعشیں موت کی ہچکیوں سے سسکتی نظر آئیں گی ———" بوڑھے نے پتھر کے ایک
کالے کلوٹے ٹکڑے کو بے رحمی سے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا ——— جیسے وہ غریبوں کی کالی کلوٹی قسمت کو
کوس رہا ہو ——— !

تالاب کا پانی سوکھ گیا' فصل برباد ہوگئی اب تک گاؤں والے قحط سے پریشان تھے! جو کچھ اناج
ان کے پاس تھا وہ بھی ختم ہوچکا تھا۔ بچے ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ بھر کے سوکھ جانے کی وجہ سے
بلک بلک کر دم توڑ رہے تھے۔ پانی کی قلت نے ان کی مصیبتوں میں اور اضافہ کر دیا تھا ——— مویشی چارے
کی تلاش میں سوکھے ہوئے بنجر کھیتوں میں آوارہ روحوں کی طرح بھٹکتے پھر رہے تھے۔ کھروں اور دانتوں
سے مردہ زمین کا پیٹ کرید کرید کر' اور کچھ نہ پا کر وہ زمین پر ڈھیر ہو جاتے اور گدھوں کا چارہ بن جاتے تھے
اور گاؤں کے کمزور بوڑھے فاقہ کی لعنتوں میں لپٹے لپٹائے' سسکتی زمین کی آغوش میں سوتے جا رہے تھے۔
آبادی سے کچھ فاصلے پر' بوڑھے برگد کے سائے میں ایک کنواں تھا' گاؤں سے دور ہونے کی وجہ سے یہ
کنواں ایک عرصے سے اس عورت کی طرح بیکار ہوچکا تھا' جو محض بیوہ ہونے کے سبب سوسائٹی اور سماج
کی نظروں سے گر چکی ہو ——— ! کنویں کا پانی برگد کے سبز پتوں سے نیلا ہوچکا تھا' گندے پانی پر برگد کے
سوکھے پتے کوڑھ کے داغوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ گاؤں والے اسی پانی کو آخری زندگی کے لئے
استعمال کر رہے تھے۔ گاؤں کی ایک تہائی آبادی فاقہ کشی سے موت کے بھیانک غاروں میں پھیل چکی تھی
اور گاؤں کے اکثر نوجوان "فوجی بھرتی" میں اپنا نام لکھوا چکے تھے۔ اگر جگت کو رجنا' نندو اور اپنی بوڑھی
ماں کا خیال نہ ہوتا' تو شاید وہ بھی فوج میں شریک ہو جاتا ——— !

ان مصیبتوں کے باوجود جگت اور رجنا تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں' کنویں پر ملا کرتے' ان کے پریم
اور پریت کے بندھن مضبوط ہوتے جاتے! رجنا کی بھولی بھالی باتیں ——— جگت کے کانوں میں امرت رس
گھول دیتیں اور اس کی روح میں ستاروں کی موسیقی سرسرانے لگتی ——— اور اسے محسوس ہوتا کہ وہ
سورگ کی رنگین و رومانی فضاؤں میں اڑا چلا جا رہا ہے ——— !

رجنا ——— بوڑھی بیوہ کی ان بیاہی لڑکی تھی' گاؤں کو آنے والی سڑک کے کنارے اس کا بوسیدہ
مکان تھا' جس کا ایک حصہ بجلی کے گرنے کی وجہ سے منہدم ہوچکا تھا۔ بوڑھی بیوہ قرض کے بوجھ تلے دبی
اس ٹوٹے ہوئے حصے کی تعمیر کرانے کی سکت اپنے میں نہ پاتی تھی ——— رات کی تاریکیوں میں جب بوڑھی
ماں کی آنکھ لگ جاتی تو چپکے سے رجنا اس ٹوٹے ہوئے حصے سے باہر نکل آتی' جگت ٹھیک وقت پر کنویں
پر پہنچ جاتا' پھر برگد کے تاریک سایوں میں بیٹھے کبھی تو وہ پریم اور پریت کی رسیلی باتوں سے اپنا
دل بہلاتے اور کبھی مستقبل کے سہانے اور سلونے سپنوں میں کھو جاتے۔

آج بھی رجنا ——— جگت سے ملنے کنویں پر چلی آئی' لیکن آج اس کی کنول جیسی آنکھوں میں آنسو

تیور رہے تھے ۔ اس کی حسین آنکھیں گہر میں لپٹی ہوئی دو جھیلیں معلوم ہو رہی تھیں ۔ اس کے پتلے پتلے لبوں کو جنبش ہوئی ۔

" جگت ! ماں دو دن سے بھوکی ہے، گھر میں اناج کا ایک دانہ نہیں ہے ۔ تم ـــــ ! "

جگت کے سینے میں طوفانی موجوں سا تلاطم برپا ہو گیا' اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے اپنے مکان کا منظر ابھر آیا ـــــ اس کی بوڑھی ماں دو دن سے بخار میں مبتلا تھی ـــــ جس کی آنکھیں نندو کے لئے روتے روتے سوجھ گئی تھیں، پھر گوری کی سینگوں کے سنہرے کنڈے اس کی نظروں کے آگے رقص کرنے لگے ـــــ ماں کے لئے وہ بہ مشکل مٹھی بھر چاول فراہم کر سکا تھا ۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ۔

" میرے گھر میں بھی یہی حالت ہے، میں خود دو دن سے بھوکا ہوں لیکن ـــ لیکن آج کی رات ـــــ تم، میں ـــ ماں، بھوکے نہیں رہ سکتے ! " اتنا کہہ کر جگت جانے لگا ۔

" کدھر جا رہے ہو جگت " ـــ رجنا نے پوچھا ۔

" چوری کرنے ـــــ ! "

" کہاں ؟ "

" راجندر کے گھر ـــ ! "

ایسا نہ کرو جگت ـــــ چوری کرنا بہت بری بات ہے !

رجنا تم گھر چلی جاؤ ۔

نہیں ۔ ایسا نہیں ہو سکتا ـــــ میں تمھیں چوری کرنے نہ دوں گی ـــــ !

لیکن جگت چلا گیا ـــــ رجنا کی نظروں کی سطح پر بوڑھے راجندر کا مکروہ اور سلوٹوں والا چہرہ رقص کرنے لگا ۔ اس کی نیلی رگیں تڑپنے لگیں ۔ دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں ۔

راجندر ـــ گاؤں بھر میں سب سے زیادہ خوش حال آدمی تھا ۔ بوڑھے نے ایک روز اس کی ماں سے کہا تھا ۔ رجنا سے اگر میرا بیاہ کر دے گی تو دولت سے مالا مال ہو جائے گی ۔

رجنا ـــ برگد کے تاریک سایوں میں بیٹھ گئی، رات سینما فلم کی طرح ختم ہو گئی ۔ صبح ہوئی، رجنا ماں کے پاس چلی آئی لیکن بوڑھی ماں ـــ رجنا کے پہنچنے سے پہلے ہی اپنی اندر دھنسی ہوئی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر چکی تھی ـــ رجنا دیوانہ وار ماں کی ہڈیوں میں لپٹے ہوئے مردہ پنجر سے لپٹ گئی،

ماں ـــ ! ماں، میرا اب کون ہے، اس سنسار میں ۔ کہاں جاؤں ۔ ماں، میرا جیون اب کس کے سہارے کٹے گا ۔ ماں ۔ ماں !

تم میرے سہارے جی سکتی ہو اچھا ۔ بوڑھے راجندر نے رجنا کے قریب پہنچ کر کہا ۔

نہیں اب میں زندہ رہنا پسند نہیں کرتی ۔

تمھیں میرے ہاں چلنا ہو گا ـــ تم کو اب میری رانی بن کر رہنا ہو گا ' اچھا ـــ خوبصورت رجنا ـــ !

نہیں ـــ نہیں، میں تجھ جیسے ظالم کے گھر نہیں آ سکتی ـــ جا ـــ یہاں سے چلا جا ـــ ظالم ـــ

نہیں چلے گی ـــ !

ہاں ——— وہ تجھ جیسے شیطان بھیڑیے کے ساتھ نہیں آسکتی ——— جگت نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ راجندر کا سلوٹوں والا چہرہ غصہ سے کسی پچکے ہوئے ٹماٹر کی طرح سرخ نظر آنے لگا۔ اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے ——— اس کے کمزور ہاتھ اس کی جیب کے جانب بڑھے۔ دوسرے لمحے پستول کی گولی جگت کے سینے کو چھلنی کر چکی تھی ——— وہ لڑکھڑایا' اور بے جان مجسمے کی طرح فرش پر گر پڑا۔

چاولوں کی تھیلی اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ چاول ——— اس کے شیرازۂ حیات کی طرح خشک زمین پر بکھرے پڑے تھے ——— امارت' غربت پر مسکرا رہی تھی ——— شاید اسے غریب کی نوجوان زندگی چھین کر لذت محسوس ہو رہی ہو۔ کتنی ظالم اور سفاک ہیں یہ امارت کی چڑیلیں ———!!!

جاوید یزدانی

من کی دنیا ۔ حیدرآباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی کے افسانوں کا نفیس مجموعہ ہے۔ افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں۔ کتاب بہت دلچسپ اور انداز بیان نہایت شگفتہ ہے۔

اردو کے نئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور ترقی پسند نظریوں کے پرستاران افسانوں کے مطالعہ سے ضرور محظوظ ہوں گے جو اصحاب اردو کے جدید ترین افسانوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ اس نوجوان مصنف کے ان پرکیف افسانوں سے ضرور لطف اندوز ہوں گے۔ صفحات (۱۶۰) قیمت مجلد عہ یہ کتاب سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہے۔

ماہرین کتابیات

الہ آباد کے مشہور و معروف ناشرین کتب کتابستان

نے

مابعد جنگ کی ادبی تنظیم کی تازہ ترین تجویز کے ماتحت اردو ادبیات کے ہر شعبے کی جدید تصنیف کی طباعت اور اشاعت کا تہیہ کیا ہے۔ **لہذا** ملک کے جملہ اہل قلم اور ارباب تصنیف و تالیف کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنی قابل قدر مجوزہ تالیفات کے مسودے طبع اور اشاعت کے لئے ہمارے پاس بھیجیں۔ ان پر غور کرنے کے بعد صحیح اور مناسب مشورے کے بعد طبع و اشاعت کا ایسا معقول اور پسندیدہ انتظام کیا جائے گا جو مصنف اور تصنیف دونوں کے لئے عزت و وقار اور ناموری کا سبب ہے اور ملک اور زبان کی ادبیات میں ہر لحاظ سے صحیح اور قابل قدر اضافہ کر۔

اس سلسلہ میں ذیل کے پتے پر خط و کتابت کی جائے۔

کتابستان نمبر ۱۷۔ کملا نہرو روڈ الہ آباد

پیکرِ ناز

اے مری روحِ زیست، پیکرِ ناز
تیرے ہنسنے میں برق کا انداز

ہر ادا تیری مرکزِ فطرت
ہر نظر تیری جلوہ گاہِ ناز

زلفِ پُر پیچ و نرگسی آنکھیں
اک فریبِ حسین ہے ان کا راز

عشقِ عالم شکار کے ہاتھوں
حسنِ خوباں بھی بن گیا غمّاز

ایک مدت سے ہائے! تیرے بغیر
نغمۂ آرزو ہے بے آواز!

یاس و حرماں کی تُند موجوں میں
ڈگمگاتا ہے زندگی کا جہاز

نغمۂ جاوداں کو کیا کہیئے!
اک مسلسل حیات بخش ہے ساز

میں نے کھایا تھا اک حسیں دھوکا
عشق کا دل فریب تھا آغاز

شاید! ان کا کرم ہے تجھ پہ عظیم
فکرِ عالی ہے مائلِ پرواز!

عظیم حیدرآبادی

غزل

شکستِ ربط سے بھی یہ پریشانی نہیں جاتی
محبت کی خلش تا حدِ امکانی نہیں جاتی

تسلّی لاکھ ہو غم کی فراوانی نہیں جاتی
تری محفل میں بھی دل کی پریشانی نہیں جاتی

ہزاروں بار دیکھا ہے جمالِ شاہدِ عالم
مگر ذوقِ نظر کی تشنہ سامانی نہیں جاتی

یہ کون اٹھا تھا آخر میری آغوشِ محبت سے
زمانہ ہو گیا پہلو کی ویرانی نہیں جاتی

ہمیں اپنی تباہی کا نہیں کوئی گلہ لیکن
نگاہِ ناز کی طرزِ پشیمانی نہیں جاتی

یہ نازک لمحے اُن کی یاد کے توبہ ارے توبہ
کہ اپنے دل کی دھڑکن مجھ سے پہچانی نہیں جاتی

قیامت ہو گیا حسّاس ہو جانا طبیعت کا
کوئی عالم بھی ہو دل کی پریشانی نہیں جاتی

وہی احساسِ تنہائی ہے ان کے سامنے عرشی
نظر آباد ہے اور دل کی ویرانی نہیں جاتی

عرشی (بھوپال)

بی بی کمالہ حضرت خونجہ ماں صاحبہ کا گنبد

مختصر حالات تاریخی اور مقامی دونوں روایتیں اس امر پر متفق ہیں کہ بی بی کمالہ حضرت خونجہ ماں صاحبہ سلطان محمود بہمنی اول کی صاحبزادی ہیں اور حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی سے آپ کو شرف بیعت حاصل ہے۔ اس لحاظ سے آپ خواجہ بندہ نواز کی پیر بہن ہوتی ہیں۔ تسیر گلبرگہ میں مولوی محمد سلطان صاحب نے لکھا ہے کہ آپ کے شوہر محترم شمس العشاق حضرت میراں حسینی ہیں جن کا مزار موضع سدلگہ تعلقہ ہوکری میں ہے جس پر ایک عالی شان گنبد بنا ہوا ہے

چونکہ خود محمود شاہ اول ایک نہایت متقی اور پرہیزگار بادشاہ تھا جس نے بیس سال حکومت کرنے کے باوجود ایک سے زیادہ بیوی نہیں کی اور مرکر حسب وصیت دفن بھی ہوا تو حضرت شیخ ضیاء الدین قتال رح نبیرۂ حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر رح کے پائین میں۔ فقیر دوست اور جوہر شناس ایسا کہ اسی نے حضرت خواجہ حافظ رح کو شیراز سے دکن آنے کی دعوت دی اور بہت سے قیمتی تحائف از قسم نقد و جنس روانہ کیا، ایسے نیک اور خدا ترس بادشاہ کی بیٹی اگر ایسی ولیۂ کاملہ ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں چنانچہ اب تک آپ کا گنبد زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ کمالات باطنی کی وجہ سے ممکن ہے کہ آپ کا لقب کمالہ ہوگیا ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ خونجہ کمالہ آپ کا نام ہو۔ شاہی خاندان سے ہونے کی وجہ سے آپ کو خونجہ سلطانہ بھی کہتے ہیں، مگر آپ کے تقدس کی دلوں پر ایسی عظمت چھائی ہوئی ہے کہ سب آپ کو خونجہ ماں صاحبہ ہی کہتے ہیں۔

لفظ خونجہ کی تحقیق خونجہ جس کا تلفظ خونزہ بھی ہے، فارسی لغت میں اس کا کہیں پتہ نہیں۔ یہ ترکی زبان کا لفظ معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں جب کہ ان ترکی نژاد سلاطین کی مادری زبان ترکی تھی، ناموں میں اکثر ترکی الفاظ نظر آتے ہیں۔ خصوصاً خونجہ کا لفظ مستورات کے ناموں میں، امراء و فقراء دونوں میں یکساں مقبول تھا چنانچہ حضرت خواجہ بندہ نواز رح کی دو صاحبزادیوں کے ناموں میں یہ لفظ آیا ہے۔ منجھلی صاحبزادی کا نام خونجہ بتول اور چھوٹی صاحبزادی کا نام خونجہ ام الدین تھا۔ حضرت خواجہ صاحب کی اولاد و احفاد میں بھی یہ لفظ اس قدر پسندیدہ رہا ہے کہ کوئی پیڑھی اس سے خالی نظر نہیں آتی۔ چند نام ملاحظہ ہوں خونجہ زینب، خونجہ فاطمہ، خونجہ حجتہ اللہ، خونجہ بوبوجی، خونجہ تجمل، خونجہ روشن، خونجہ پارسا۔

ان ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ خونجہ کا لفظاً کلمۂ تعظیم و احترام ہے جو عورتوں کے لئے رائج تھا جیسا کہ مغلوں کے زمانہ میں بیگم نے رواج عام پایا۔ بہمنیوں کے بعد دکن کے دیگر شاہی خانوادوں کے حالات میں بھی یہ لفظ باربار آتا ہے۔ مثلاً خونزہ ہمایوں اہلیۂ حسین نظام شاہ

گنبد گلبرگہ سے جانب شمال دو ایک میل کے فاصلہ پر موضع گبنور کے قریب، درختوں کے جھنڈ میں، کھیتوں سے گھرا ہوا ایک گنبد ہے جس کا ہر ضلع اندر سے ۳۱ فٹ پانچ انچ اور باہر سے ۴۷ فٹ ہے۔ اس کا طرز تعمیر دور اول کے ابتدائی حصہ کا سا ہے۔ کمانوں کے پاکھے پھیلے ہوئے، لٹکے ہوئے اور بے ڈول سے، اس کی بعض کمانیں تو اندر اور باہر کی طرف بد نمائی کی حد تک پہنچ گئی ہیں۔

گنبد اندر سے بالکل سادہ ہے۔ قبہ بھی بالکل سادہ ہے۔ کمانوں اور نیم محرابوں پر کسی قسم کا نقش و نگار نہیں۔

صرف سروں پر ہلال اور ہر دو طرف ڈھال نما پھول ہیں جن میں مختلف نقوش ہیں۔ البتہ مغرب رویہ محراب پر کسی قدر معمولی قسم کی گل کاری ہے اور اس کے نیچے خفی عربی خط میں کچھ لکھا ہوا ہے جو چونے کی تہوں کے جم جانے سے پڑھا نہیں جاتا۔ یہ محراب ہلال نما کنگرہ دار ہے جس کے صرف پانچ کنگرے اب باقی رہ گئے ہیں۔ کنگرے خوش نما ہیں، جب پورے ہوں گے تو محراب بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہوگی۔ اس محراب کے سرے پر لفظ اللہ لکھا ہوا ہے۔ اس محراب کے ہر دو جانب دو چھوٹی طاقچے ہیں، ایک میں میٹھے تیل کا چراغ جلتا ہے۔ تین محرابیں کھلی تھیں، بعد میں حفاظت قبور کے لئے تینوں کو چن کر جانب جنوب ایک بہت ہی چھوٹا سا پست دروازہ لگا دیا گیا ہے، اس وجہ سے گنبد میں اندھیرا رہتا ہے۔ گنبد کے بیچوں بیچ ایک مردانہ قبر ہے اور اس سے ہٹ کر جانب مغرب ایک زنانی مزار ہے جس پر غلاف پڑا رہتا ہے اور ہری چوڑیاں رکھی رہتی ہیں۔ یہ دونوں مزار مٹی، پتھر کے ہیں جن پر صندل لپا ہوا ہے۔ زنانی مزار کافی لمبا چوڑا مگر پست ہے اور سرہانے کی طرف ذرا اٹھا ہوا جیسے کوئی چادر تانے محو خواب ہے۔ مردانی مزار کچھ زیادہ لمبا چوڑا نہیں البتہ حسب رواج اونچا ہے زنانی مزار تو یقیناً خوزہ ماں صاحبہ کا ہے۔ مردانی مزار کے متعلق مقامی روایت یہ ہے کہ یہ آپ کے کم سن صاحبزادے کی قبر ہے جن کا نام لوگ شمنا میراں بتلاتے ہیں۔ شمنا مخفف ہے شمس الدین کا جیسا کہ عرف میں ہو جایا کرتا ہے۔ اس لئے آپ کا نام شمس الدین میراں حسینی معلوم ہوتا ہے۔ میراں حسینی کا جزو خاندانی ہو سکتا ہے۔ ایک صاحب نسبت بزرگ سے بھی مجھے اس کی تصدیق ہوئی کہ یہ مردانی مزار صاحبزادے ہی کا معلوم ہوتا ہے۔

کپنور ایک چھوٹا سا موضع ہے۔ یہاں مسلمانوں کے تیس چالیس گھر ہیں۔ یہاں کا مالی پٹیل جو مسلمان ہے وہ اور یہ سب لوگ مل کر ہر سال رجب کی چھٹی کو عرس کر لیتے ہیں اور نذر و نیاز چڑھاتے ہیں۔ گنبد کے سامنے جو کھیت ہے وہ بھی اسی مالی پٹیل کا ہے جس کا نام مشائخ پٹیل ہے۔ یہ گنبد اس سمت کا آخری گنبد ہے۔

ڈیڑھ دو فٹ اونچے چبوترے پر واقع ہے۔ اس میں ایک بدعت یہ کی گئی ہے کہ مغرب کی طرف اس چبوترے کے بیچ میں مسجد نما شہ نکالا گیا ہے۔ اس کے نیچے ایک اور چبوترہ ہے جو ہر طرف سے ٹوٹ گیا ہے۔ اس لئے اس کا عرض ہر طرف کچھ مختلف ہے۔ جانب شمال ۲۳ فٹ پانچ انچ اور بلندی ۴ فٹ ہے۔ اس چبوترے پر جنوب کی طرف دو قبریں ہیں اسی طرف اس چبوترے کے نیچے ذرا ہٹ کر ۳۲ فٹ لانبا ایک اور چبوترہ ہے جس پر آٹھ قبریں بنی ہوئی ہیں۔ اس چبوترے کے نیچے بھی ہر طرف چند قبور ہیں۔ جانب مغرب کھیت میں بھی کچھ قبور ہیں۔

ایک اور گنبد ہمنا باد کی سڑک پر مذکورۂ بالا گنبد سے آگے تو کوئی گنبد نہیں ہے البتہ اس کے جنوب میں ایک میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا گنبد ہے ضمناً اس کا بھی مختصر حال سن لیجئے۔

یہ گنبد ایک وسیع چبوترہ پر جو اب ہر طرف سے ڈھ گیا ہے واقع ہے۔ جس کا ہر ضلع اندر سے ۱۹ فٹ اور باہر سے ۲۹ فٹ ہے۔ اس کی کمانیں اور نیم محرابیں، فیروز شاہی طرز کی ہیں اور یہ سب نقش و نگار سے خالی ہیں۔ صرف ان کے سروں پر ایک ایک پھول اور ہر دو طرف ایک ایک ڈھال نما پھول ہے۔

مغربی محراب پر کچھ آیتیں لکھی ہوئی ہیں جو اب اکثر جھڑ گئی ہیں ۔ اس محراب کی ہر دو طرف خوش نما طاقچے ہیں ۔ دیواروں کی گچ سب جھڑ گئی ہے ۔ فرش بھی اکھڑ گیا ہے ۔ بیچ میں صرف ایک قبر ہے جو مردانی معلوم ہوتی ہے ۔ قبہ بھی سادہ ہے صرف بیچ میں ایک گول پھول ہے جس کا اکثر حصہ جھڑ گیا ہے ۔ باہر کی بھی سب استرکاری نکل گئی ہے قبہ کی گچ باقی ہے ۔ گنبد تین طرف سے بند ہے ۔ صرف جانب جنوب کھلا ہے جس میں چوکھٹ کے نشان پائے جاتے ہیں مگر اب چوکھٹ موجود نہیں ہے ۔ گنبد مجموعی حیثیت سے بہت خستہ حالت میں ہے اور نہ معلوم کس کا ہے ۔

میر جہانگیر علی خان

بھیک

سکونِ زندگانی کھو چکا ہوں
جوانی میں جوانی کھو چکا ہوں
شبابِ زیست آ کر چل دیا ہے
سراپا غم بنا کر چل دیا ہے
تری چشمِ عنایت کا تبسم
مرے دل کے مقدر میں نہیں ہے
خرامِ ناز کا رنگیں ترنم
ابھی تک وہ قیامت دل نشیں ہے
مری الفت کی تاثیریں غلط ہیں ——— مری قسمت کی تحریریں غلط ہیں
مگر پھر بھی دلِ غمگین و مضطر
ترا معصوم اشارہ چاہتا ہے
ہر اک تارِ نگاہِ شوق اکثر
ترا رنگیں نظارہ چاہتا ہے
بس اب یہ بے نیازی ترک کر دے
مرا دامنِ گلِ مقصد سے بھر دے
نظارہ اور قربت چاہتا ہوں
گداگر ہوں محبت چاہتا ہوں۔

جبریل

پشیمانی

شام کا سہانا وقت تھا، آسمان ابر آلود تھا۔ ایک سفید موٹر کار بڑی تیزی سے چلی آ رہی تھی، کار آ کر پورچ میں کھڑی ہو گئی۔ بیگم ظہیر دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کہ رات ہو رہی ہے اور ایسے وقت کون آیا ہے۔ انھوں نے اپنے مہمان بھتیجے خاقان کو اس کے کمرہ میں بھیج دیا۔ انھوں نے برآمدے میں قدم رکھا ہی تھا کہ سامنے سے خالدہ نیلوفر ان کی لاڈلی بیٹی آتی ہوئی دکھائی دی وہ دوڑ کر لپٹ گئی۔ دو سال بعد انھوں نے اپنی بیٹی کو دیکھا۔ نیلوفر بی اے پاس کر چکی تھی۔ وہ لاہور میں اپنی نانی جان کے ساتھ رہتی تھی۔ بیگم ظہیر نے ظہیر بیرسٹر کو فون سے نیلوفر کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ بھی فوراً آ گئے۔ گھر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی غریب خاقان کو کسی نے یاد تک نہ کیا۔ نیلوفر خود نہیں جانتی تھی کہ آج کل خاقان کہاں ہیں۔ والدین نے کھانے کے لئے کہا تو اس نے انکار کر دیا کہ وہ شام کو چائے پی چکی ہے وہ اپنے کمرہ میں سب کو شب بخیر کہہ کر چلی گئی!۔

یکایک خاقان کے سر میں شدت کا درد ہونے لگا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ نیند آ جائے۔ لیکن کسی پہلو آرام نہ ہوا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر ٹہلنے لگا تاکہ ٹھنڈی ہوا سے درد کچھ کم ہو۔ اسی وقت نیلوفر بیدار ہو گئی چاندنی رات میں کسی کو ٹہلتا ہوا دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ چیخ اٹھی۔ امی! امی ہوتیں تو جواب دیتیں۔ اس کے دل میں یکایک چور کا شک ہوا اس نے خود ہی ہمت کی مارچ اور اسٹک لیکر باہر آئی۔ دیکھا ایک شخص گیٹ کی طرف چلا جا رہا ہے۔ شک یقین میں تبدیل ہو گیا، وہ اس کے پیچھے دوڑی اور اسٹک سے اس کے سر پر کھینچ مارا اور چور "چور" چلانے لگی!! اس کی آواز سن کر ظہیر اور بیگم دونوں دوڑ پڑے۔ دیکھا تو گیٹ کے پاس خاقان بے ہوش پڑا ہے۔ سر پر کاری ضرب آئی تھی۔ بیگم ظہیر کے منہ سے چیخ نکل گئی ہائے۔ خاقان۔ ظہیر تو پتھر کے مجسمہ کی طرح کھڑے رہ گئے۔ خاقان ایک چیخ نیلوفر کی زبان سے نکل گئی۔

ظہیر نے بیگم کے سہارے خاقان کو اٹھایا اور مسہری پر ڈال دیا۔ زخم نہ ہوا۔ ظہیر نے ڈاکٹر فیروز حیدر کو ٹیلیفون پر اس حادثہ کی خبر دیکر جلد آنے کی تاکید کی۔ ڈاکٹر صاحب نے خود اپنی کار نکال کر شب خوابی کے لباس ہی میں آ پہونچے۔ ڈاکٹر نے خاقان کے زخم کو دیکھا اور تسلی آمیز لہجہ میں بولے۔

مسٹر ظہیر، گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ زخم گہرا ضرور ہے لیکن جلد ہی اچھا ہو جائے گا۔ رات کی ڈیوٹی کے لئے ایک نرس رکھ لیجئے ——!" نیلوفر بھی کمرہ میں آ گئی تھی۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ بیگم ظہیر نے کہا۔

"خدا جانے خاقان کیوں باہر ٹہل رہا تھا کہ نیلوفر نے سوچا کہ چور ہے اس کے کمرہ میں خاقان ہی کی ایک اسٹک رکھی تھی اس نے اسی سے اس کے سر پر مارا"

ظہیر:۔ سچ! تو اس میں ہم لوگوں کی سخت غلطی تھی جیسے وہ آئی تھی ہمیں خاقان سے بھی ملانا تھا، وہ غریب تو سمجھا کہ کوئی ملنے والی بیوی آئی ہیں تو اپنے کمرہ میں چلا گیا۔ اس بچی کو کیا معلوم کہ کون آیا ہے ——!"

فیروز:۔ ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ نیلوفر بیٹے اپنی رو رو کر جان کیوں ہلکان کئے دیتی ہو۔ تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے!"

نیلوفر کی طبیعت بگڑنے لگی اور وہ بے ہوش ہو گئی ڈاکٹر فیروز نے کہا:۔ "بچی ہی تو ہے فرطِ غم سے طبیعت بگڑ گئی ہے۔ اسے آرام کی سخت ضرورت ہے!"

نیلوفر حالانکہ تندرست تھی لیکن ایک ہی رات میں اس کی حالت تپ دق کے مریضوں کی سی ہو گئی تھی!

خاقان آنکھ کھول کر کہا "چچی، پانی ......!" بیگم ظہیر نے جلدی سے پانی کا گلاس دیا اور پوچھیں۔ اب کیسی طبیعت ہے؟ خاقان نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا "اف، مت پوچھئے چچی۔ درد سے سر پھٹا جا رہا ہے۔" اور اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو رخسار پر ڈھلک پڑے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان سے دو ستارے ٹوٹ پڑے ہوں چچی نے دوپٹہ کے

آنچل سے آنسو پونچھے اور بولی: "بیٹا تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے ضبط سے کام لو ابھی ڈاکٹر صاحب آ کر دوا دیں گے تو سر کا درد اچھا ہو جائے گا ۔۔۔!"

خاقان :- (نحیف آواز سے) "نہیں چچی جان۔ اب شاید نہیں بچوں گا!"

بیگم ظہیر :- (بھرائی ہوئی آواز میں) "بیٹا یہ تم کیا کہتے ہو۔ ہم تمہارے لئے خون پسینہ ایک کرنے کو تیار ہیں مگر نہیں۔ تم جلد اچھے ہو جاؤ گے۔"

نیلوفر، خاقان کے سرہانے بیٹھی اس کا سر آہستہ آہستہ سہلا رہی تھی۔ خاقان کو کچھ آرام ہوا اور وہ سو گیا۔ نیلوفر اپنی صحت کا خیال کئے بغیر دن رات اس کی تیمارداری میں لگی رہتی تھی۔ دو گھنٹہ بعد جب خاقان بیدار ہوا تو دیکھا کہ نیلوفر اب تک اس کا سر سہلا رہی ہے۔

خاقان :- "نیلوفر۔ تم اب تک جاگ رہی ہو ۔۔۔!"

نیلوفر :- "مجھے نیند نہیں۔"

ایک ہفتہ بعد خاقان کو کچھ آرام ہوا۔ اس نے حادثہ کی رات کے تمام حالات بتائے چچا چچی نیلوفر اور ساتھ ہی ڈاکٹر فیروز حیدر اس کی حالت سنبھلتے دیکھ کر بے انتہا خوش تھے۔ بیگم ظہیر تو ایک گھنٹہ کے لئے بھی دن کو اس کے پاس سے نہیں ہٹتیں۔ اور خوشی سے پاگل ہوئی جاتی تھیں۔ خاقان کی پیشانی پر بوسوں کی بارش کرنے لگتیں! ان کے کوئی لڑکا نہیں تھا۔ نیلوفر ہی ان کی آرزوؤں و تمناؤں کی مرکز تھی۔ بیگم ظہیر خاقان کو بعد چاہتی تھیں کالج بند ہوتے ہی اسے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ اپنے عزیز و دلنواز بھتیجے کی علالت سے آخر وہ کیوں نہ پریشان ہوتیں۔!

خاقان حسین، تندرست، بائیس سالہ نوجوان تھا۔ اس نے اسی سال ایم۔ ایس۔ سی کا امتحان دیا تھا۔ اور اب نتیجہ کا سخت انتظار تھا۔!

ایک ماہ کی سخت پریشانی کے بعد خاقان بالکل تندرست ہو گیا۔ غسل صحت کے بعد تمام دوستوں اور عزیز و اقارب کو اعلیٰ پیمانہ پر ٹی پارٹی دی گئی۔ اسی دن خاقان کے ایک دوست کا ٹیلیگرام آیا کہ خاقان ایم۔ ایس۔ سی میں کامیاب ہو گیا۔ اس خوشخبری نے خوشی میں اور اضافہ کر دیا! دوسرے دن نیلوفر نے اپنی سب سہیلیوں کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ وہ ابتک اپنی کسی سہیلی سے نہیں ملی تھی۔ خاقان بھی نیلوفر کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کاموں میں حصہ لیتا رہا۔ کھانے کے بعد سہیلیوں نے بہت اصرار کیا کہ نیلوفر ایک گانا سنائیے لیکن اس نے اپنی ناسازیٔ طبع کا بہانہ کیا۔ خاقان نے کہا: "جانتی ہو میں تمہارا بڑا بھائی ہوں؟"

نیلوفر :- (ٹھنڈی سانس لیکر) "جی ہاں!"

خاقان :- "چھوٹوں کو بڑوں کا کہا ماننا چاہیئے ۔۔۔!"

نیلوفر سوچ رہی تھی کیا میرا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہوگا۔ کیا وہ اب تک میرے دل کے درد کو نہیں سمجھ سکے ....

خاقان کی آواز سے یکایک اس کے خیالوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور وہ چونک پڑی اور بغیر کچھ سوچے سمجھے "جی" کہہ دیا۔

خاقان :- "میں جانتا ہوں نیلوفر کہ تمام رات جاگ کر تم نے اپنی صحت خراب کر لی ہے، لیکن مجھے یہ بھی امید ہے کہ تمہاری تندرستی بہت جلد واپس آ جائے گی؛ تم اداس ہو اور اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن میری ایک خواہش پوری کرو۔ گانا سنا دو۔ تمہاری طبیعت بھی بہل جائے گی!"

نیلوفر :- "اتنی سی بات کے لئے اتنی لمبی چوڑی تمہید کی کیا ضرورت تھی۔ اگر آپ لوگوں کی یہی خواہش ہے تو ضرور سناؤں گی۔ (ایک سہیلی کو پیانو کی طرف اشارہ کرکے) انجم تم پیانو بجاؤ۔"

انجم :- "کون سا گانا گاؤ گی ۔۔۔؟"

نیلوفر :- "تم لوگ بتاؤ!"

سب سہیلیاں :- "نہیں بھئی۔ ایسا ٹھیک نہیں ہے جو تمہیں پسند ہو گاؤ!" انجم کو نیلوفر نے آہستہ سے بتایا اور وہ پیانو بجانے لگی اور نیلوفر گانے لگی۔ دل کی دھڑکن بنا لیا ان کو!

اس کے گلے میں بلا کا درد تھا، اس کی سریلی آواز فضا میں

پھیل گئی۔ کائنات کا ذرہ ذرہ جھومتا نظر آنے لگا۔ خاقان کی عجیب کیفیت ہوگئی۔ اس کی نگاہیں کھڑکی سے باہر ابر آلود بادل پر جمی ہوئی تھیں۔ چاند کبھی چھپ جاتا اور کبھی اپنے جلوہ سے دنیا کو روشن کر دیتا۔ گانا ختم ہو گیا لیکن خاقان اپنے خیالوں میں محو تھا۔ نیلوفر کی دوسری سہیلی اقبال نے چھیڑتے ہوئے کہا: "بھائی خاقان، کس خیال میں محو ہیں۔ کسی دل کی دھڑکن بن کر تو آپ کو مسرور ہونا چاہیے!"

خاقان :- (محجوب نگاہوں سے نیلوفر کو دیکھ کر)

"تم لوگ تو بیکار چھیڑتی ہو۔ بھئی پروین اب تم کچھ سنا دو!"

پروین :- "میں تو اس وعدہ پر گاؤں گی کہ آپ بھی گائیں ـــــ!"

خاقان :- "ضرور، آپ کا حکم سر آنکھوں پر!"

نیلوفر انجم سے پیانو لے کر خود بجانے لگی اور اس کے موافق پروین گانے لگی "تورے من میں بسوں گی وہ سانجنا!"

گانے کے ختم پر خاقان نے کہا: "آیا بچی" اور وہ جلدی سے کمرہ سے نکل گیا۔ گانا ختم ہوتے پر پروین نے خاقان کو تلاش کیا۔ وہ بیگم ظہیر کے پاس بھی نہیں ملا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے تو نہیں بلایا ہے۔

پروین نے بتایا کہ وہ اس طرح جواب دے کر وہاں سے چلے آئے۔ بیگم ظہیر نے ہنستے ہوئے کہا "بڑا نداق بچہ ہے۔ خیر آج اسے چھوڑ دو کسی دن میں خود سنوا دوں گی!" ظہیرا اور بیگم بہت دیر تک خاقان کے مذاق پر ہنستے رہے۔ پروین کا اداس چہرہ دیکھ کر سب سہیلیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں! بارہ کا گھنٹہ سنتے ہی سب جانے کو اٹھ کھڑی ہوئیں۔ نیلوفر نے سب کو رخصت کیا۔ پھر اپنے کمرہ میں آکر کرسی پر بیٹھ گئی اور باہر کے پر کیف منظر سے لطف اندوز ہونے لگی۔ اس کی آنکھوں سے نیند روپوش ہو چکی تھی۔ والدہ نے پکار کر کہا: "بیٹی، تم اب تک کیا کر رہی ہو۔ آرام کرو!" نیلوفر نے سوچا کہ بجلی کی روشنی سے امی نے سمجھ لیا ہے کہ میں جاگ رہی ہوں۔ روشنی کا بٹن دبا کر لائٹ بند کر دی۔ اور کرسی پر بیٹھی رہی۔ اب آسمان صاف ہوتا جا رہا تھا۔ کہیں کہیں روشن ستارے نظر آ رہے تھے۔ چاروں طرف پھیکی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ نیلوفر گنگنانے لگی۔

"اے چاند میری امیدوں کو صبح دکھا دے!"

"کھٹ" سے کسی چیز کے گرنے کی آواز ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی گود سے کتاب گر گئی۔ وہ اٹھانے لگی تو پیچھے خاقان کو کھڑا دیکھ کر شرما گئی۔

نیلوفر :- آپ ـــــ اس وقت ـــــ یہاں ـــــ؟ کوئی کام ـــــ ہے ـ ؟

خاقان :- ایک بات پوچھنے آیا ہوں نیلوفر۔ کیا تم جواب دو گی؟

نیلوفر :- خاموش ......!

خاقان :- آخر اس خاموشی کا کیا مطلب نکالوں؟ کیا میں سمجھ لوں کہ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو۔ تمھیں مجھ سے بات کرنا تک گوارا نہیں۔!"

نیلوفر کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

نیلوفر :- کاش میرے درد کا اندازہ کر سکتے۔ میری قسمتی۔

خاقان :- "میں تم سے یہی پوچھنے آیا تھا۔ کیا معلوم، جب تم ایک معصوم ننھی سی گڑیا تھیں ...... لیکن اس کا اظہار اس لئے نہیں کیا کہ کہیں تم یہ خیال نہ کرو کہ میں خاقان کو بھائی سمجھتی تھی اور محبت کرتی رہی لیکن ...... کئی مرتبہ علالت کے درمیان میں یہ خیال ہوتا کہ آخر تم میرے لئے اپنی صحت کو کیوں برباد کر رہی ہو، تمھاری نظروں میں رات بھی صبح تھی، لیکن ہر بار میں اسے اپنی غلطی سمجھ کر دل سے نکال دیتا۔ لیکن آج میں اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کروں کم ہوگا۔ کاش چچا، چچی میری خواہش کو نہیں ٹھکراتے!"

نیلوفر اب تک خاموش بیٹھی اس کی باتیں سن رہی تھی پھر بولی: "اب آپ جا کر آرام کیجئے۔ ابھی بستر سے اٹھے ہیں لاپرواہی نہیں کرنی چاہیئے۔" اور وہ خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ خاقان شب بخیر کہہ کر اپنے کمرہ میں چلا گیا۔ نیلوفر کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی اسے کچھ کھسر پھسر کی آواز سنائی دی اسے

یقین ہو گیا کہ اس کے والدین اب تک جاگ رہے ہیں۔ وہ دروازے کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ بیگم ظہیر کہہ رہی تھیں: "ہمیشہ کے لئے اپنا ہی ہو جائے گا۔ بہت حسین جوڑا ہو گا!"

ظہیر نے کہا: "کل ہی والدہ اور اکرام (ظہیر کے چھوٹے بھائی اور خاقان کے والد) کو آنے کے لئے ٹیلیگرام دے دیتا ہوں! بہت اچھا ہوا جو آج تم نے ان کی باتیں سن لیں۔ ورنہ بچی کی زندگی ہمارے ہاتھوں تباہ ہو جاتی پھر بھی وہ ایک لفظ ہمارے خلاف زبان پر نہیں لاتی۔ خدا ہماری امیدوں کو پوری کرے!"

نیلوفر کا دل دھڑکنے لگا کہ والدہ نے اس کی باتیں سن لی ہیں۔ وہ آہستہ سے آکر بستر پر دراز ہو گئی اور سوچتے ہی سوچتے اسے نیند آگئی۔ صبح دیر سے بیدار ہوئی۔ دیکھا تو سامنے خاقان سفید سوٹ پہنے کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب دیکھ رہا ہے۔ اور میز پر چائے ناشتہ رکھا ہے۔ خاقان نے مسکراتے ہوئے نیلوفر کو دیکھا۔ نیلوفر کے پریشان بال پیشانی پر بکھر گئے تھے گویا بادل کے سیاہ ٹکڑے میں سے چاند مسکرا رہا ہے۔ نیلوفر مسکراتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔ خاقان نے ملازمہ سے کہا کہ ابھی ناشتہ لیجاؤ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ بی بی آجائیں تو لے آنا۔!

نیلوفر نے سبز سلک کا جوڑا پہنا۔ بال سنوارے اور اپنے کمرہ میں آئی ——!

خاقان:۔ "اوہو! اس وقت تو سبز پری معلوم ہو رہی ہو۔ بھلا تمہاری اس نازک فگنی سے کوئی دل والا کیوں کر بچ سکتا ہے!"

نیلوفر نے ناشتہ کے بعد رات کی تمام باتیں خاقان کے گوش گزار کر دیں۔ وہ خوشی سے کھل اٹھا۔!

تیسرے دن نیلوفر کی نانی جان اور چچا، چچی آگئیں!

ظہیر نے اکرام سے کہا:۔ "میں نے تم لوگوں کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ ہماری دلی خواہش ہے کہ خاقان کو ہم اپنا داماد بنائیں۔ کیا خاقان کے لئے نیلوفر موزوں نہیں ہے؟"

بیگم اکرام:۔ "ایسے بھی وہ آپ کا ہے بھائی صاحب!"

اکرام:۔ "میری خوش قسمتی ہے۔ آپ کے ہر حکم کے آگے میرا سر خم ہے!"

بیگم ظہیر:۔ (اپنی والدہ سے) امی جان آپ کی کیا رائے ہے؟

والدہ:۔ "تم لوگوں کے دل میں اب یہ خیال پیدا ہوا ہے لیکن میں تو بہت دنوں سے یہی چاہتی تھی۔ خدا انھیں ہزاروں ان کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے ——!"

ایک ماہ بعد خاقان اور نیلوفر شادی کی سنہری زنجیروں میں باندھ دیئے گئے۔ اب نیلوفر، نیلوفر خالدہ ہی نہیں تھی بلکہ بیگم نیلوفر خاقان تھیں۔ چند روز کے لئے نیلوفر سسرال آئی۔ سب نے خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا اور سب نے انتہا درجہ مسرت کا اظہار کیا!

نیلوفر اپنے کمرہ میں بیٹھی خاقان کی حسین تصویر جو کہ میز پر رکھی تھی دیکھ رہی تھی۔ یکایک پیچھے سے خاقان نے آکر آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ نیلوفر نے اس کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں پر سے علٰحدہ کیا۔ خاقان نے کہا "ایک چور کو یہ مرتبہ کیوں عطا ہوا ——؟"

نیلوفر:۔ "ان باتوں کو بھول جائیے میری غلطی نہیں تھی۔!"

خاقان:۔ "بھول کیسے جاؤں اسی حادثہ کی وجہ سے تو یہ مرتبہ ملا۔ جی ہاں آپ کی غلطی نہیں تھی، شائد آپ کے ہاتھوں کی غلطی ہو، اب کچھ بھی کہو —— ایک بار تو چور کہہ دیا۔ پھر کیسے پسند کیا ——؟" اور وہ زور سے ہنس پڑا —— لیکن نیلوفر کا سر پشیمانی سے جھک گیا!

سلطان بیگم تور

فریاد بھی ہے نغمہ بھی، شعر بھی ہے افسانہ بھی

(اپنی ان رفیقوں کے نام جو یہ مضمون پڑھ کر مجھ سے خفا ہو جائیں)

میری ایک سہیلی راز سربستہ ہیں، مجموعۂ اضداد ہیں، پراسرار شخصیت کی مالک ہیں۔ پہلی ملاقات میں ان سے مل کر اکثر مایوسی ہوتی ہے۔ نہایت خاموشی، طویل سوالات کا جواب بھی ایک دو لفظ میں ادا کر دینا ان ہی کا کمال ہے۔ چہرے پر عجیب قسم کی مسکراہٹ جس سے دوسروں کے لئے حقارت اور طنز کا پتہ چلتا ہے۔ کبھی کبھی یہ مسکراہٹ قہقہہ بن جاتی ہے۔ سراسر طنزیہ قہقہہ۔ چھوٹی چھوٹی روشن آنکھیں — جو ہر وقت بے چینی سے گھومتی رہتی ہیں۔ جن میں دوسروں کے راز معلوم کرنے کا بے پناہ تجسس ہے۔ وہ دوسروں کے راز معلوم کر کے تشہیر دنیا بہت پسند کرتی ہیں۔ مگر ان کے راز معلوم کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اتنی گہری ہیں کہ الاماں۔ بعض وقت ان کی گہرائی معلوم کرنے کے شوق میں دوسرے بھی کھو جاتے ہیں۔ دوست بنانے کی بہت شیدائی ہیں مگر جلدی ہی اکتا کر کسی نئی ساتھی کی تلاش میں لگ جاتی ہیں، اس کے باوجود جس سے بھی سچی دوستی کا عہد کرتی ہیں اسے عمر بھر نباہتی ہیں پھر درمیان میں کتنی ہی سخت چٹانوں سے ٹکرائیں ان کے پائے استقامت کو لغزش نہیں ہوتی — ایک چیز سے بہت نفرت کرتی ہیں اور وہ ہے غریب، دوسروں کو بھی نصیحت کرتی ہیں کہ حتی الامکان غریبوں سے نفرت کرو — اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گفتگو کے درمیان غریبوں کا ذکر آ گیا اور وہ خاموش ہو گئیں۔ کہیں گی کچھ نہیں مگر اپنی زہریلی ہنسی بکھیرتی رہیں گی، اف ان کی یہ ہنسی اور اگر کہیں گی بھی تو سراسر طنز، حقارت۔ غرض عجیب مجموعۂ اضداد ہیں۔

— ۲ —

صورت، سیرت سے بڑھ کر حسین ہے تو سیرت، صورت سے بڑھ کر درخشاں، محفل احباب میں بہت ہر دلعزیز ہیں مجھ پر تو ان کی خاص عنایت ہے۔ میرے دل میں بھی ان کی بہت عزت ہے اور طبیعتوں کے اختلاف کے باوجود بھی جاری ہے۔ کچھ صاف گو اور سادہ لوح واقع ہوئی ہیں اس پر غضب یہ کہ جو کچھ سنتی ہیں اس پر بغیر کسی تحقیق کے یقین کر لیتی ہیں پھر ناممکن ہے کہ ان کا خیال بدل جائے۔ چاہے آپ کتنی ہی تحقیق سے ان پر ثابت کریں کہ یہ بات غلط ہے مگر وہ ہرگز یقین نہیں کریں گی اور انھیں ہم سے شکایت ہی رہے گی۔ ہر دوسرے تیسرے دن یہی ہوگا: اب دوستوں کو حیرانی کہ آخر کہاں سے انھیں یہ سب باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ آپ سوچ کر حیران اور وہ شکایت کر کے۔ چہرے پر بلا کی سنجیدگی مگر ساتھ ہی ہلکی سی نرم مسکراہٹ بھی۔ سنجیدگی اور مسکراہٹ کا دلکش امتزاج۔ پہلی ملاقات میں ملنے والے اکثر دھوکہ کھا جاتے ہیں کیونکہ متانت کا وہ عالم کہ ایک ایک لفظ سوچ کر کہیں گی مگر بخدا جب کھلتی ہیں تو بے پناہ ہو کر۔ پھر آپ ان سے زیادہ کسی کو پرمذاق نہیں پائیں گی۔ ان کی فطرت کا یہ رخ مجھ پر ابھی نمایاں ہوا ہے۔

— ۳ —

ہم ان کی تصویر بناتے ہیں بنے یا نہ بنے

رنگ کچھ گورا اور سرخ۔ رنگ کی سرخی میں کچھ کچھ ہیجانی قسم کی روحانیت ہے۔ عموماً ہنستی رہتی ہیں اور ایمانداری

کی بات یہ ہے کہ جب بھی ہنستی ہیں خلوص دل سے ہنستی ہیں مگر جذبات کے نہ معلوم کس کھیل میں ہارنے کا نتیجہ ہے کہ اب تکان کی ہنسی کو بے کیف بنائے ہوئے ہے۔ ہر وقت کسی گہری سوچ میں رہتی ہیں "کیا کھویا۔؟" یہ تو وہی جانیں مگر کچھ کھو ضرور گیا ہے۔ اپنی سہیلیوں کی بہت مداح ہیں۔ سہیلیوں ہی پر کیا منحصر جس سے بھی ملتی ہیں اس کے بارے میں ہمیشہ اچھی رائے قائم کرتی ہیں۔ جیسی خود نیک ہیں ویسی ہی سب کو دیکھنا چاہتی ہیں اور جب انھیں تلخ تجربات اٹھانے پڑتے ہیں تو دوسروں کی اصلاح سے مایوس ہو کر بیٹھ رہتی ہیں۔ ان میں ایک صفت بہت اچھی ہے۔ جہاں کہیں دیکھتی ہیں کہ دوسروں کی برائی کی جارہی ہے۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر چلی جاتی ہیں اور اگر نہ جا سکیں تو بھولی بھالی شکل بنائے خاموش بیٹھی رہیں گی اب آپ ان سے دوسروں کے بارے میں کچھ بھی پوچھئے وہ سوائے تعریف کے اور کچھ نہیں کہیں گی۔ کہتی ہیں "دوستی کے تو معنی ہیں کہ دوست کی برائیوں کو بھی عزیز رکھے ورنہ اچھائیوں کو تو سب ہی پسند کرتے ہیں اور کون انسان برائی سے بری ہے ——"

غرض نور سے زیادہ پاکیزہ اور فرشتے سے زیادہ معصوم ہیں مگر نہ جانے معصومیت کے کونسے انوکھے "کھیل" میں ناکامی ہوئی جس سے ان کے چہرے کی شگفتگی میں حزن زیادہ نمایاں ہو گیا ہے ——

۴

بڑی بڑی بھنوری آنکھیں جن میں عجیب قسم کا حزن و ملال۔ ایک قسم کی حسرت ہے۔ چہرے پر مغموم مسکراہٹ۔ ان کے ملنے والوں کو سب سے پہلے یہی چیز متاثر کرتی ہے اور بعد میں وہ خود —— اکثر لوگ انھیں غلط سمجھ کر ان سے شاکی رہتے ہیں کیونکہ بعض عجیب متضاد باتیں ان میں موجود ہیں عام لوگوں کی دنیا سازی اور منافقت سے انھیں بڑی تکلیف ہوتی ہے کیونکہ اکثر وہ اپنے رنج و غصے کو چھپا نہیں سکتیں، جو ان کے دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر آجاتا یا حرکات سے ظاہر ہو جاتا ہے جس سے اکثر لوگ ناراض ہو جاتے ہیں برخلاف اس کے خلوص ان میں حد درجے کا ہے اور یہی خلوص وہ دوسروں میں بھی دیکھنا چاہتی ہیں —— جس کی طرف سے ان کے دل میں اچھا گمان پیدا ہو جائے اس کی برائیوں کو بھی نظرانداز کر جاتیں اور ہر وقت اس کی مدافعت کے لئے آمادہ رہتی ہیں۔

بعض ذرا ذرا سی باتیں انھیں سخت پریشان کر جاتی ہیں۔ خاص کر غریبوں کی ذرا سی تکلیف بھی وہ نہیں دیکھ سکتیں اور کبھی بڑے سے بڑا صدمہ بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

ادب و مطالعہ سے انھیں بے پایاں محبت ہے اور یہی ان کے سچے رفیق ہیں۔ ان کا واحد مشغلہ کتب بینی ہے۔ ایک چیز ان میں عجیب ہے وہ جس کسی مصنف کے طرز نگارش اور خیالات سے متاثر ہوتی ہیں اسے دوسروں میں سب سے افضل سمجھنے لگتی ہیں اور اس کے بارے میں ذرا سی تنقید بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔

دوستوں کی محفل میں انھیں زیادہ مقبولیت نہیں کیونکہ وہ تنہائی پسند ہیں انھیں ان محفلوں سے نفرت ہے جہاں سوائے عیش و عشرت کے تذکروں کے اور کچھ نہیں۔ جہاں سرمایہ داروں کے مظالم، بہادری کی داستانیں سمجھی جاتی ہیں۔ غریبوں پر ظلم مصلحت اور سیاست سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایسی کھوکھلی تہذیب سے انھیں نفرت ہے۔ دلی نفرت ——

۵

پیچیدہ شخصیت کی مالک ہیں انھیں سمجھنا میرے بس کی بات نہیں۔ خوش رہیں گی تو اتنی کہ دنیا میں ہم سے بڑھ کر

انھیں کوئی عزیز نہیں مگر ان کا زیادہ خوش رہنا بھی نقصان دہ ہوتا ہے کیونکہ انہیں چاہتیں کہ وہ کسی سے بھی خوش رہیں یا دوستی کریں اس سے دوسرے لوگ بھی ملیں۔ ان کا یہ بے پناہ جذبہ رشک ہمیشہ دوستوں کو ناگوار ہوتا ہے۔ شیریں گفتاری میں سب میں مشہور ہیں مگر اس شیریں گفتاری کے پیچھے کتنے زہر پوشیدہ ہیں اس سے کچھ ہی لوگ واقف ہیں۔ چہرے پر بھولاپن اور معصومیت۔ ان کی یہی معصومیت تو سب کو متاثر کر دیتی ہے اور لوگ ان پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔ آپ کتنی ہی سنجیدہ اور اہم گفتگو کیجئے وہ بظاہر آپ کی باتوں سے لاپروا رہیں گی مگر ایک ایک لفظ بغور سنیں گی اور دل ہی دل میں انتقاماً مسکرائیں گی۔ جس کا نتیجہ دو محبوب دوستوں میں لڑائی ہو جاتا ہے۔ جانے کیوں؟ یہ کسی کی بڑھتی ہوئی دوستی اور محبت کو دیکھ نہیں سکتیں اور فوراً ایسا کچھ کرتی ہیں کہ جہاں محبت کی فرحت بخش ہوائیں چل رہی تھیں وہاں نفرت کی بادِ سموم دوستی کے نازک پودے کو جھلس دیتی ہے —— اس غضب کا تیز دماغ ہے کہ کوئی بھی یہ گمان نہیں کر سکتا کہ انہی کی "عنایت" سے دوستوں میں دشمنی کی بنیادیں پڑ رہی ہیں۔ کیونکہ سب کچھ کرتے ہوئے بھی معصوم اور بھولی بنی رہتی ہیں —— شاید اسی لئے داناؤں نے کہا ہے کہ "زیادہ دوست نہ بناؤ کیونکہ سچے دوست دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں ——"

نجمہ سمیع اللہ شاہ

نذرِ فانی

ہوش نہیں ہے، کب کا مجھ سے اشوق کا محور چھوٹ گیا
دیکھا! آخر ہاتھوں کے ہاتھوں ضبط کا ساغر چھوٹ گیا

رو بھی نہ سکوں، ہنس بھی نہ سکوں اور جینے کی پابندی بھی
جا اشک و تبسم اور کہیں! اس دل سے ترا گھر چھوٹ گیا

تھا کون؟ کہ جس کا بس چلتا! اور راہنمائی کر لیتا!
اس جادۂ قسمت میں آ کر! جب خضر سا رہبر چھوٹ گیا

اچھی تو تھی ٹیس جگر کی! پھانس بھی دل کی اچھی تھی!
ظالم کا ہے کو ہاتھ سے تیرے ظلم کا نشتر چھوٹ گیا

اللہ اللہ! اپنا سر ہی مجھ کو وبالِ دوش ہے جب
کس کو کس کو ڈھونڈھوں میں پھر! مجھ سے کوئی گر چھوٹ گیا

پہلی منزل بھی نہ عدم کی آنے پائی تھی کہ کہیں!
سختی تھی! جی چل نہ سکا! دو گام ہی چل کر چھوٹ گیا

بیٹھے کیا ہو؟ جاؤ، اٹھو بھی! راہ لو اپنی! آہ وقت!!!
ہستی کی اس راہ میں اب تو نقش کا منظر چھوٹ گیا

وفا تقوی

(وشنو سکھا رام کھانڈیکر مرہٹی ادب کے سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں جناب احمد یوسف زئی نے ان کے افسانہ "کلرک" کا بڑا اچھا ترجمہ کیا ہے۔ اس سے قبل بھی آپ نے کئی مرہٹی افسانوں کا کامیاب ترجمہ کیا اور اس فن میں انھیں خاص مہارت پیدا ہو گئی ہے)
(مدیر)

کلرک

نہ جانے کس گھنٹے کی آواز سنائی دی۔ ایک۔ دو۔ تین چار۔ گیارھویں ضرب پر وسنت راؤ نے دل ہی دل میں کہا۔ بس۔ لیکن اس گھنٹہ بجانے والے پہرہ دار کو وسنت راؤ کے دل سے کیا کرنا تھا اس نے ایک اور گھنٹہ بجا ہی دیا، وسنت راؤ کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا سچ مچ ہی کسی نے ان کے سر پر ایک ضرب لگائی۔ وہ چونک اٹھے۔ آفس کے کام کو گھر پر بارہ بجے تک ختم کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن انسان کی خواہشات کو اتفاقات کی طرح گھڑیال کی بھی پروا نہیں ہوتی۔

وسنت راؤ نے سامنے کی میز پر نگاہ ڈالی۔ کاغذوں کا انبار جس کو ابھی دیکھا نہیں گیا تھا۔ اور وہ انبار جسے دیکھا جا چکا تھا۔ دونوں انبار۔ اتنے ہی اونچے گویا کہ ہم توام بھائی ہی ہیں۔

میز کی اس طرف گلاس میں پانی انڈیل کر وسنت راؤ نے گٹ گٹ پی لیا مگر پانی پینے کے باوجود حلق اور خشک معلوم ہونے لگا، برتن میں کا پانی بھی گرم ہو گیا تھا گویا کہ عین دوپہر کے وقت کسی اسٹیشن کے نل کا پانی بھر کر رکھا ہو۔

ٹھنڈا پانی پینا بھی ایک طرح کی عادت ہے اگر وہ دستیاب نہ ہو تو انسان بے چین ہو جاتا ہے۔ وسنت راؤ دل ہی دل میں بیوی پر دانت پیسنے لگے۔ میز پر کے کاغذوں کے انبار کو دیکھ کر وہ دل میں کہہ رہے تھے، مردوں کی مصیبتوں کو یہ عورتیں کیا جانیں؟ ہمیں اتنا سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ان عورتوں کو اس کی کیا پروا...... بازار میں نئی نئی ساڑیاں کیسی خوشنما آئی ہیں اگر کسی کو معلوم نہ ہو تو ان سے پوچھ لو۔ اور اس خصوص میں تو ان کا حافظہ دکان داروں سے بھی بدرجہا اچھا ہوتا ہے۔ ان میں اس کا کہاں خیال رہنے چلا کہ شوہر کو ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہو گی، اس برتن کو اگر ایک گیلا کپڑا لگا دیا ہوتا تو؟ اب تو...... اب آگے کا لفظ سوچتے ہی باہر کی آوازیں ان کے کان میں پڑیں وسنت راؤ فوراً کھڑکی کی طرف گئے۔ راستہ پر بہت سے لڑکوں کو جھگڑا فساد کرتے دیکھ کر انھیں خیال آیا۔ یہ بالکل ٹھیک ہی ہے۔ سال کے آخر مہینے میں ہولی دھولنڈی آتی ہے...... دن تمام دفتر میں آٹھ آٹھ گھنٹے کام کرتے مریں اور پھر گھر میں کام کرنے بیٹھیں۔ پچھی اس گھر کی کھڑکی سامنے ہی تھی اس کھڑکی میں سے آواز آئی۔ کیا وسنت راؤ نیند نہیں آ رہی ہے؟ وسنت راؤ سوچا کہ میں بخوشی کمبھ کرن کی طرح سو جاؤں گا مگر کچہری میں وہ ظالم صاحب ہیں نا، خواب میں بھی وہ مجھے فائل پڑھے بنا نہیں چھوڑیں گے۔ کیا وسنت راؤ ختم ہو گیا کام؟ یہ پوچھتے ہی انھوں نے سوچا کہ اس کو کیسے سمجھاؤں کہ کام کوئی ہنسی مذاق تو ہے نہیں۔ لیکن دل کے جوابات میں سے جس طرح دس میں نیصد ہی باہر آتے ہیں اب بھی ایسا ہی ہوا۔

کیسا ہے دامو اَنا۔ کچھ بولنے کے لئے انھوں نے کہا۔

کیا گرمی ہے۔ ہوا کا جھونکا تک نہیں آتا۔ آج ہوا کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔

اجی اس نے ہڑتال کی ہے ہڑتال، دامو اَنا زور سے ہنسنے لگے۔

صرف ہم جیسے ہی کلرکوں کو اسی طرح کی ہڑتال کرنا نہیں آتی باقی سب کو......

ہش، دامو اَنا نے صرف اتنا ہی کہہ کر ہمدردی دکھائی۔

وسنت راؤ میز کی طرف آئے وہ بہت بے چین تھے۔ باہر ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا بھی نہیں اور نہ گھر کے گھڑے میں ٹھنڈے پانی کا ایک گھونٹ گرمی کے مزدور تو بھی ہڑتال کرتے ہیں لیکن آفس کے کلرکوں اور شادی شدہ مردوں کو! انھیں تو ہڑتال کرنے کا حق ہی نہیں۔

پرے کے کمرہ سے چھوٹے بچہ کے رونے کی آواز آنے لگی وسنت راؤ بڑبڑائے "شاید دینو روتا ہے، وہ اسے چھوڑ کر آرام سے سو گئی ہو گی، ابھی تو مجھے کم از کم دو گھنٹے بیٹھنا ہے۔

اس کام میں یہ رونے کی آواز کیوں؟ توبہ..... توبہ......
بیاہ کے وقت مرد خیال کرتا ہے کہ دنیا موسم بہار ہے لیکن یہ تو صرف وہم ہے وہم۔ ازدواجی زندگی یعنی جین گرا۔ اگر اس میں بارش ہو تو وہ بھی میاں بیوی کے جھگڑے سے ہی۔ لیکن کیا اس بارش سے اور بھی گرمی نہیں ہوتی ہے؟

چراغ کی بتی کو بجھا کر وسنت داؤ جب اپنے بستر پر آئے اس وقت دو بج گئے تھے۔ ہوا سے خود کو مطمئن کرنے کے لئے وہ کھڑکی کی طرف گئے۔ ابھی ہوا بہہ نہیں رہی تھی۔ سامنے کی کھڑکی میں داموانا کھڑے تھے۔
کیا ہے داموانا؟
کیا ہے وسنت راؤ؟
ان دونوں کا پوچھنا ایسا ہی تھا جیسے دو قیدی ایک دوسرے کا حال پوچھیں۔
وسنت راؤ نے اپنے جسم کو ڈھیلے طور سے بستر پر ڈال دیا۔ تھکے ہوئے تھے فوراً نیند لگ گئی ان کو دل بچپن تک رہا تھا انھیں کئی خواب دکھائی دے رہے تھے ایک خواب میں آفس کے صاحب اسے توپ کے منہ کو لگا رہے تھے۔ دوسرے خواب میں وہ ان کا غذات کے نیچے دبے جا رہے تھے۔ آخری خواب تو عجیب تھا انھیں ایسا دکھائی دیا کہ وہ گھر ہی میں ہیں اور ان کا گھر یکایک جیل خانہ میں تبدیل ہو گیا۔ دھوتی کے بجائے جیل خانہ کا لباس آ گیا۔ ہاتھ میں کٹ کٹ کرنے والی گھڑی نہ جانے کہاں چلی گئی اور اب کھڑ کھڑ کرنے والی بیڑی پاؤں میں نظر آئی تھی۔ تب پہرہ دار کو دیکھا تو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ان کی بیوی خود یہ فرض انجام دے رہی ہے۔

نیند نہ ملنے کی وجہ سے وسنت راؤ آٹھ بجے اٹھے۔
چائے وغیرہ پی کر وہ حسب معمول داموانا کے گھر اخبار پڑھنے کے لئے گئے۔ ان کا دل چھاتما گاندھی کے اس بیان پر کہ راجکوٹ کے معاملہ میں وہ برت رکھنے والے ہیں، بے چین ہو گیا۔ ان کو گاندھی جی سے خاص عقیدت تھی۔ ان کی ڈانڈی یاترا کا فوٹو تو انھوں نے خاص طور سے خرید لیا تھا جب ننھا تو بیاس کو دیکھ کر دادا کہتا تو اس کا ذکر وہ دوست احباب میں خاص طور پر کرتے اور مسرت سے ان کے گدگدیاں ہونے لگتیں۔ وہ راجکوٹ کے بارے میں داموانا سے باتیں کرتے رہے اور اس میں دس کب بجے اس کی انھیں خبر ہی نہیں ہوئی۔ عجلت سے جا کر وہ چوکے پر بیٹھ گئے۔ پتے پر ہمیشہ کی طرح زیادہ چاول ڈالے گئے تھے۔
یہ تو بہت ہو گیا۔ کچھ کم کر دو نا۔
آج روٹی نہیں پکائی؟
ایک ظالم ساہوکار کی طرف جن نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے ان کی نظریں بھی اسی طرح بیوی کو دیکھ رہی تھیں۔
انھوں نے تیکھے لہجہ میں کہا "کھانا بھی شاید کچھ کم ہی ہے۔"
صرف آپ تنہا کے لئے تو پکائی،
'میرے لئے یا تمھارے لئے'،
جی....... آج منگل ہے نا'
'منگل ہی کا دن سب عورتوں کو برت رکھنا چاہیے'
'کیا ہے'
گھر میں خاموش بیٹھ کر اناج تو بھی کس طرح ہضم کیا جائے؟
ان کی بیوی فوراً سمجھ گئی کہ وسنت راؤ کا یہ طنز آج روٹی نہ پکانے کی وجہ سے ہے۔ مگر وہ خاموش رہی۔ وسنت راؤ گھر سے باہر نکلے تو اپنی بیوی کو برا بھلا کہتے ہوئے۔ مجھے روٹی پسند ہے یہ تو اسے معلوم ہی ہے اس پر بھی اس کو پکانا نہیں چاہیے تھا۔ اس کا مطلب....... اس کے معنی کچھ بھی نہیں...... یہ سچ ہے کہ محبت کا رنگ جتنا شوخ ہوتا ہے اتنا ہی کچا ہوتا ہے۔ شادی ہونے کے ایک دو سال تک بیوی کس طرح کھیلتی ناچتی رہی۔ اور اب...... اب تو اس کو میرے آرام کا مطلق خیال نہیں۔ وہ تو میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی...... پہلے میں پان نہیں کھاتا تھا وہ اصرار

کر کے کھلاتی اور اب؟ آج خاوند پیٹ بھر کھایا یا نہیں اس کی بھی اسے فکر نہیں۔ اسے تو بہر کی۔۔۔۔۔۔۔۔

وسنت راؤ کی بی اے کی ڈگری آڑے آئی ورنہ انھوں نے یہ جملہ پورا ہی کیا ہوتا۔ راستہ پر اخبار بیچنے والے لڑکے گاندھی جی کے برت کے بارے میں زور زور سے چلا رہے تھے لیکن بیوی کے روٹھ نہ پکانے کے باعث یہ خبر ان کو صبح کی سی اہم معلوم نہ ہو سکی۔

شام کے چھ بجتے ہی وسنت راؤ آفس سے باہر نکلے اس وقت دھوپ بالکل ہلکی تھی لیکن ان کے غصہ کا پارہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے رات میں جاگ کر اپنا کام ختم کیا تھا لیکن صاحب نے اس میں نہ جانے کیا کیا غلطیاں نکال کر۔۔۔۔۔۔۔ راستے میں ان کے پڑوسی دوست مل گئے۔ کیا وسنت راؤ کچھ چائے وغیرہ پلاتے ہیں یا نہیں؟ وسنت راؤ کو ہاں کہنا ہی پڑا۔ دوستوں کو باہر بٹھا کر وہ اندر گئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ کیتلی میں چائے تیار ہے۔

' ابھی اور دو پیالی چاہیے '

' وینو سو رہا ہے اس کے لئے آدھی پیالی ہے نا،

اور تم؟

میرا کیا؟ برت ہے اس لئے جلد ہی کھاؤں گی۔

تم کھاؤ گی اور شاید میں ویسا ہی رہ جاؤں گا۔ اول چائے کا پانی رکھو پھر۔۔۔۔۔۔

وسنت راؤ نے غصہ سے وہ ڈھائی پیالی چائے ان دو پیالیوں میں انڈیلی اور اٹھائی۔ پیالی میں کی چائے گرنے لگی مگر وہ ویسے ہی باہر گئے۔ دو پیالیوں کو دیکھ کر ایک دوست نے کہا اور آپ؟

دوسرے نے پیالی کو منہ سے لگاتے ہوئے کہا انھیں اندر ہی چلتے چلتے دو چائے پی رہا ہے اور یقینی رانی تب تو۔

وسنت راؤ کو کل کا خواب یاد آ گیا۔ میرا گھر ایک جیل ہے۔ انھوں نے سوچا "قیدی کو راجہ سمجھنے سے زیادہ ظلم اور کیا ہوتا ہے؟" اندر آ کر دیکھا تو بیوی اسٹو سلگانے کی کوشش کر رہی تھی۔

' میں باہر جا رہا ہوں '

پانچ منٹ نہ جائیں تو۔'

وسنت راؤ جواب نہ دیکر باہر آئے اور دوستوں سے پوچھا کیوں؟ اب تفریح چلیں؟

واہ گرما میں شام کی ہوا بہت اچھی ہوتی ہے۔ ابھی کچھ ٹھنڈی ہوا نہیں بہہ رہی ہے لیکن۔۔۔۔۔۔۔

دوسرے نے ایک دم بات کاٹی اور کہا ارے۔ انہیں اس حکیم کے پاس جانا تھا نا؟

پہلے نے جواب دیا۔ صحیح تو؟ انھیں سات بجے گھر لینا ہے۔

وسنت راؤ تنہا ہی نکلے انھیں یہ خیال آیا کہ کہیں وہ جا کر اکیلے بیٹھ جائیں لیکن رات کے جاگنے اور دل کے مضطرب ہونے کی وجہ سے انھیں تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ انھوں نے یونہی دیکھا۔ برہمچاری نامی فلم کے اشتہار پر ان کی نگاہ پڑی ــــــ وہ تھیٹر ہی آ گئے۔ فلم ابھی شروع ہوا تھا انھوں نے اس کے پہلے اسے دیکھا تھا اس وقت انھیں آدومبر جو برہمچاری رہتا ہے ایک دیوانہ نظر آ رہا تھا۔ لیکن اب؟ آج انھیں احساس ہوا کہ آدومبر جیسے دیوانے ہم جیسے ہوشیاروں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ وقفہ کے وقت انھوں نے سامنے دیکھا۔ اس وقت سے دونوں چائے پی کر گئے ہوئے دوست ہنستے ہوئے بیٹھے تھے۔ وسنت راؤ کی یہ خواہش ہوئی کہ جا کر کہیں "کیا ڈاکٹر کو ڈھونڈنے کے لئے یہاں آئے ہو؟" مگر وہ اپنی جگہ پر سے نہیں اٹھے ــــــ سات سال ساتھ رہنے والی بیوی سے تو زیادہ ان کی پروائی نہیں تھی۔ فلم کے ختم ہوتے وقت وسنت راؤ آدومبر کو دیکھ کر بڑبڑائے بیٹا آج ہنس لو پھر کل۔۔۔۔۔۔۔۔ ان کے اس کہنے پر بازو کا آدمی ہنس پڑا۔

نو بج گئے تھے لیکن ابھی تک ہوا میں خنکی نہیں تھی، ہوا اتنی گرم تھی کہ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ابھی شام ہی نہیں ہوئی۔ گم شدہ بچہ کی طرح ہوا نہ جانے کہاں لاپتہ تھی۔ وسنت راؤ نے سوچا، باہر اتنی گرمی ہے تو گھر میں تو۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ تو کھا پی کر

سو گئی ہو گی اگر وہ جاگ کر کھانا لا بھی دے گی تو میں یہی کہوں گا کہ مجھے بھوک نہیں' ایک روز بھوکا رہوں گا۔ اس سے کیا ہوگا! اس کو آگاہ کر دینے کے لئے کچھ کرنا ہی ہوگا۔ ہاں ہاں ازدواجی زندگی بھی ایک طرح کی حکومت ہی تو ہے۔ گاندھی جی کی بھوک ہڑتال کا اثر نہیں ہوتا کیا؟ پھر ــــ ازدواجی زندگی میں...

وہ آنگن میں کھڑی تھی اس نے خوشی سے کہا کہ مجھے بڑی بھوک لگ رہی تھی ـــــ وسنت راؤ سیدھا جانے لگے وہ بازو ہٹی اور بولی "میں سانولے میں ہوں' چھونا نہیں۔ ابھی میں نے برت نہیں توڑا ہے۔

وسنت راؤ چونکے ـــــ یعنی وہ میرے لئے اب تک بھوکی رہی! میں بھوکا رہ کر اس کو سیدھی راہ پر لانے والا تھا لیکن اس نے ہی بھوکا رہ کر مجھے شکست دی لیکن پہلے ہی تلے میں کون اثر قبول کرتا ہے؟

وسنت اس کی طرف آ کر بولے "یہ کہاں کا برت رکھا تم نے؟

وہ رسوئی گھر میں جاتے جاتے بولی' ایسا نہ کہو' میں نے ونیو کے لئے پانچ منگل برت رکھنے کی منت کی تھی۔ ونیو کے لئے؟

ہاں کل رات اسے پھر بخار آیا' میں نے فوراً دیوی انبا بائی سے منت مانگی' رات تمام بڑا بے چین تھا' میری ہی گود میں تھا۔ مجھے کیوں نہیں بلایا؟

آپ کو دفتر کے ہی تھوڑے کام رہتے ہیں' اب تو آپ دو تین بجے تک جاگنے لگے ہیں۔ اگر پڑھی لکھی بیوی ہوتی تو وہ دفتر کے کام میں بھی تو مدد دیتی ہوتی۔ وہ بولتے بولتے زور سے ہنسنے لگی۔

وسنت راؤ نے اب سمجھا کہ آج صبح ان کی بیوی نے روٹی کیوں نہیں پکائی تھی۔ وہ رات تمام جاگتی رہی تھی نا۔ مگر اب بھی ان کے دل میں ایک گرہ باقی تھی۔ انھوں نے کہا' میں ڈاکٹر کو بلانے جاتا ہوں'

اس نے ہنس کر جواب دیا' ڈاکٹر گھر آئے تھے کہ پانچ روپے فیس کے لے لیتے ہیں۔ ادھر تو آپ کا ارادہ نئی رسٹ واچ لینے کا بھی ہے۔ اسی لئے ونیو کا بخار کچھ کم ہونے کے بعد میں خود اسے تانگہ پر لے گئی' واپس آئی اور چائے بنائی۔

پتنی نے ڈاکٹر کی فیس بچائی اور میں ــــــــ!"

وسنت راؤ ونیو کے کمرہ میں گئے' ونیو کے جسم کو ہاتھ لگا کر دیکھا ابھی وہ گرم تھا۔ وہ پھر رسوئی گھر میں آئے۔ اُن کی پتنی کھانا نکال رہی تھی اور اُس طرف ایک اور برتن چاول کے لئے نظر آ رہا تھا۔ انھوں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ کس کا؟

آٹھ بجے واپس آنے والے انسان کے لئے؟

اور یہ چولھے پر کا؟

ساڑھے نو بجے واپس آنے والے کا؟

وہ تو بہت تھوڑا دکھائی دیتا ہے؟

آپ کو چاول کہاں بھاتے ہیں؟

وسنت راؤ نے دونوں بچے ہوئے چاول کھانے کی ضد کی۔ پتنی نے پکائی ہوئی چھوٹی سی خوشبودار چپاتیوں کو چھوتے ہی انھوں نے سوچا مردوں کے دکھ ایک تپتے ہوئے آتش فشاں کے بالائی سطح یا چٹان کی طرح ہے' لیکن عورتوں کے دکھ اس کے اندر کے جوش کھاتے ہوئے لاوے کی طرح ہے وہ فوراً دکھائی نہیں دیتا اور محسوس بھی نہیں ہوتا۔

لیکن کیا اسی لئے وہ کم گرم ہوتا ہے؟

وسنت راؤ کی پتنی رسوئی گھر کو صاف صوف کر کے اپنے کمرے میں گئی' دیکھی کہ ونیو بچھونے پر نہیں ہے۔ وہ باوری سی ہو گئی۔ وسنت راؤ کے کمرے میں آتے ہی وہ ہنسنے لگی' ونیو ان کے بچھونے پر سو رہا تھا اور وہ اسے پنکھے سے ہوا جھل رہے تھے۔

ونیو کو لے جاؤں؟

انہوں؟

کیوں؟

وہ کیا تمھارا اکیلا کا ہے؟

لیکن یہاں تمھیں دفتر کے کام سے ... اُٹھنا پڑتا ہے نا۔

اس پر ....

اس سے کیا ہوتا ہے ؟

گرو نیو کچھ تمہارا اپنے کا بھی تو نہیں ؟

پھر کیا اس کو بانٹ لیں گے ؟ دو نبجے تک میں سنبھالوں گا اس کے بعد تم اسے لیجانا ——— یہ کہتے کہتے بولتے بسنت راؤ کیوں ہنسے یہ ان کی پتنی سمجھ گئیں اس کی نیند بہت گہری ہوتی ہے اس لئے درمیان میں اٹھ کر وہ اسے نہیں لیجا سکے گی۔

ان کا اسے یقین تھا۔

وسنت راؤ نے گیارہ کے گھنٹے سنے۔ بارہ کے سنے۔ اب ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ جاگتے ہی وہ دینو کو پنکھا جھلتے اور پھر ان کی آنکھیں جھپکنے لگتیں۔

دینو کے بدن کو ہاتھ لگا کر اس کی ماں سے کہا خوب پسینہ آیا ہے۔ آپ کے ہاتھ میں بڑا اثر ہے۔

لیکن میرا ہاتھ کچھ میرا نہیں۔

یعنی ؟

وہ کب کا کسی کے ہاتھ میں دیدیا گیا ہے اور اسی کے ہاتھوں کا اثر ہے یہ کیوں ہے نا ٹھیک ؟

وسنت راؤ محبت بھری نظروں سے اپنی بیوی کے قریب آئے۔ اتنے میں سامنے کی کھڑکی میں سے آواز سنائی دی۔

کیا وسنت راؤ اب بھی جاگ رہے ہیں۔ بڑی گرمی ہو رہی ہے بھائی۔

وسنت راؤ اپنی کھڑکی کے پاس جاکر اسے بند کرتے ہوئے بولے جی ——— کیا ٹھنڈی ہوا بہہ رہی ہے۔

ٹھنڈی ہوا ؟ راموا کا لہجہ ایسا تھا گویا کہ وسنت راؤ پاگل تو نہیں ہو گئے

وسنت راؤ کل دیوانے ہو گئے مگر آج ؟ آج دل گا رہا تھا۔ ازدواجی زندگی کے گرما میں تپتا کبھی محبت کے سرد جھونکے ناچتے ای رہتے ہیں۔

(مترجمہ) امجد یوسف زئی

مرقد اقبال پر

جھکی ہے آج مرے پاؤں پر مری تقدیر — کہ خوابِ شوقِ زیارت کی ہو گئی تعبیر

یہ ہے وجودِ گرامی کے قرب کی تاثیر — کہ ذرہ ذرہ ہے خاکِ لحد کا بدرِ منیر

وفورِ شوق میں پلکوں پہ اشک رک نہ سکے — مری عقیدتِ بیدار تو ہے خوش تقدیر

زباں خموش ہے آنکھوں میں آنسوؤں کا ہجوم — ہر ایک اشک ہے احساسِ جذب کی تصویر

میں آج اپنی نگاہوں میں سربلند ہوا — مری نگاہِ تنگ مایہ بھی ہوئی ہمہ گیر

تری بلند مقامی کا صدقہ ہو جائے — خیال و جذبہ و احساس و فکر کی تطہیر

ہمارے اوجِ سعادت نصیبِ فطرت ہے — کہ آج سجدہ گہہ شوق تیری تربت ہے

عبدالعزیز فطرت

تنقید و تبصرہ

قرآنی دنیا ماہوار

مدیر ابو محمد مصلح ملنے کا پتہ دفتر عالمگیر تحریک قرآن مجید حیدرآباد دکن۔

یہ رسالہ خالص قرآنی مضامین شایع کرتا ہے۔ اور مسلمانوں کو ان کے مذہبی اور دینی مسائل سے آگاہ کرتا ہے۔ اس میں بچوں کے لئے بھی چند مضامین شایع کیے جاتے ہیں۔ اس لئے بڑوں اور بچوں کے لیئے اس کا مطالعہ مفید ہے۔ ابو محمد مصلح صاحب کا نام اسلامی تحریک کے ضمن میں کافی مشہور ہے۔ زیر نظر شمارہ محرم کا ہے جس میں ڈاکٹر ہاشم امیر علی کا مضمون خاص طور پر نہایت عمدہ ہے۔

مومنہ ماہوار

مدیرہ صبیحۃ النساء بیگم زیر نگرانی ابو محمد مصلح صاحب چندہ سالانہ پانچ روپیہ۔

زیر تبصرہ رسالہ محرم الحرام کا شمارہ ہے۔ اور اسے تذکرۂ حیات بخشی بیگم کے لیئے مختص کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی دوسرے مضامین شایع کئے گئے ہیں۔ عورتوں سے متعلق اسلامی مسائل پر سیدھی سادھی بحث ہے۔ اور قرآنی تعلیم کو عام کرنے کی جا بجا تحریک کی گئی ہے۔ مسلمان بچیوں کے لیئے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ "ز س"

ترقی پسند ادب

از عزیز احمد۔ ناشر ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن۔

اس کتاب میں اردو ادب کے جدید رجحانات نہایت بالغ نظری کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے مولف عزیز احمد صاحب ادب کے ایک اچھے طالب علم رہ چکے ہیں اور گزشتہ چند سالوں میں ان کی جو کتابیں شایع ہوئی ہیں ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مشرقی اور مغربی ادب کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے اور ان میں تنقید نگاری کی بڑی اچھی صلاحیت موجود ہے۔ چنانچہ زیر نظر کتاب میں بھی ترقی پسند ادب کے متعلق نہایت ضروری معلومات صحیح تنقیدی روشنی میں قلمبند کی گئی ہیں۔

مولف نے پہلے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ حقیقت نگاری کیا ہے۔ اس کے بعد انقلابی قدروں کی وضاحت کی ہے۔ پھر اردو ادب پر جدید تحریک کا جو اثر ہوا ہے اس کو بیان کرکے ترقی پسند شاعری۔ افسانہ اور ناول۔ ڈرامہ۔ ظرافت اور تنقید پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ترقی پسند ادب کے موافق اور مخالف دونوں قسم کے اصحاب اس کا مطالعہ کریں اور یقین ہے کہ دونوں اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

علامہ راشد الخیری

مرتبہ پروفیسر وقار عظیم ایم اے۔ ناشر خاتون کتاب گھر دہلی۔

اس مجموعہ میں اردو کے مشہور ادیب علامہ راشد الخیری کی ادبی خدمات پر مختلف مصنفین و مولفین کے گیارہ تنقیدی مقالے شایع کئے گئے ہیں۔ اس کے بعض لکھنے والے اردو کے مشہور انشار پرداز مثلاً پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی۔ مولوی شاہد احمد دہلوی۔ ڈاکٹر شائستہ اختر سہروردیہ۔ ڈاکٹر عابد حسین۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی ہیں۔ اور ان سبھوں نے محنت اور تحقیق کے ساتھ راشد الخیری کی تحریروں کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس کتاب میں جو کمی نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ راشد الخیری کے حالات زندگی اور اصلاح نسواں کے سلسلے میں انھیں جن دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑا ان کی تفصیلات درج نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ مرتب یا ناشر اس موضوع پر ایک علحدہ کتاب شایع کرنا چاہتے ہوں۔ اگر ایسا ہو تو اس موضوع کی ایک حد تک تکمیل ہو سکے گی۔

سنگم

از سید شبیر حسین قیس۔ ناشر دکن بک ڈپو حیدرآباد دکن۔

قیس صاحب حیدرآباد کے پرانے لکھنے والے ہیں اور ان کے بہت سے افسانے مختلف رسالوں میں اب تک شایع ہو چکے ہیں۔ اس چھوٹی سی کتاب میں ان کے گیارہ افسانے ایک جگہ کیے گئے ہیں جن میں سے بعض ترجمہ ہیں اور اکثر طبع زاد۔ قیس صاحب کے قلم میں روانی ہے اور خاکہ کے لحاظ سے بھی ان کے افسانے ایک اچھا معیار پیش کرتے ہیں۔

نغمۂ جاوید

از نواب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔ ناشر راج محل پبلشرز جموں۔

یہ کتاب دراصل شریمد بھگوت گیتا کا آزاد منظوم ترجمہ ہے۔ بھگوت گیتا کے منظوم اردو تراجم اس سے پہلے بھی شایع ہو چکے ہیں لیکن جعفر علی خاں اثر جیسے اعلیٰ پایہ شاعر کا نتیجۂ قلم ہونے کی وجہ سے یہ کتاب اردو ادب میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اثر عہد حاضر کے غزل گو شعرا میں ایک استاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ انھوں نے بھگوت گیتا جیسی طویل مقدس کتاب کا اردو میں ترجمہ کرنے کی زحمت بھی گوارا کی۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ غزل گو شعرا کی طبیعت طویل نظموں کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ لیکن اثر کی اس کاوش نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ اور اس نظم کے پڑھنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کتاب کسی قدیم نظم کا ترجمہ ہے۔ اسلوب بیان اور زبان کی حلاوت ہر بیت میں موجود ہے۔ کتاب کی ابتدا میں متعدد اصحاب مثلاً مہر کیلاس نارائن ہاکسر۔ راجہ نریندر ناتھ۔ گنگا شنکر اور گنگا ناتھ شرما کی تحریریں بطور تعارف و پیش لفظ و دیباچہ شریک کی گئی ہیں جو اثر جیسے اعلیٰ پایہ شاعر کے تعارف کے لئے غیر ضروری بلکہ غیر موزوں نظر آتی ہیں۔

زمین کانپ رہی تھی

از سری کرشن سنہا۔ ناشر ادبی روشنی حیدرآباد دکن۔

سنہا صاحب جامعہ عثمانیہ کے ایک فارغ التحصیل اور حیدرآباد سیول سروس کے ایک جواں سال رکن ہیں۔ ان کو اردو ادب کا بڑا اچھا ذوق حاصل ہے اور طالب علمی ہی کے زمانے سے انھوں نے مختلف مضامین اور افسانے لکھ کر اس کا ثبوت دینا شروع کیا تھا۔ اب ان کی پہلی کتاب شایع ہوئی ہے جس میں کل آٹھ افسانے ہیں۔ اس کتاب کا مقدمہ بھارت چند صاحب کھنّا نے لکھا ہے جس میں انھوں نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ مصنف کی طرز نگارش اور رجحان تخیل کو اگر ترقی پسند کہا جائے تو غیر صحیح نہ ہوگا۔ مگر ان کی ترقی پسندی میں وہ چیز موجود نہیں جس کے باعث آج کل کے اکثر و بیشتر ترقی پسند ادیب تنقید کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔"

بزم سخنوران

از سید مجتبیٰ حسن جونپوری۔ ناشر نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔

مجتبیٰ حسن صاحب صفی لکھنوی کے عقیدت مند شاگرد ہیں اور انھوں نے اس کتاب میں ساٹھ مختلف عنوانات کے تحت مختلف شعرائے ماضی و حال کے کلام کے انتخابات جمع کر دیئے ہیں۔ اس قسم کے گلدستے اردو زبان میں قدیم زمانے ہی سے شایع ہوتے رہے ہیں جن میں مولوی الیاس برنی صاحب کے منتخبات نے خاص طور پر مقبولیت حاصل کی ہے۔ یہ مجموعہ بھی اسی قبیل کا ہے اور مولف کے ادبی ذوق کا ایک اچھا ترجمان ثابت ہو سکتا ہے۔

عہد آصفی کی قدیم تعلیم

از مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ ناشر حیدرآباد بک ڈپو۔

اس تذکرہ میں قیام سلطنت آصفیہ سے ۱۲۵۰ھ تک تعلیم ذکور اور ۱۳۰۰ھ تک تعلیم اناث کے لئے جو کوششیں کی گئی ہیں ان کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس کا پیش لفظ مولوی سید علی اکبر صاحب نے تحریر کیا ہے اور اس میں مولف کی محنت اور کاوش کی داد دی ہے۔ اس قسم کی کتابیں کسی ملک کی تاریخ کی تکمیل میں بہت ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔

پریم رس

از محمد ابرار حسین فاروقی۔ ناشر نظامی پریس بدایوں۔

شاہ عبد اللہ فاروقی اودھ کے ایک بڑے صوفی گذرے ہیں جو ہندی کے شاعر بھی تھے اور وجہن تخلص کرتے تھے۔ سندیلا میں پیدا ہوئے اور بارہ بنکی میں مدفون ہیں۔ انھوں نے تصوف میں ایک کتاب لکھی تھی جو الف بلئے وجہن کے نام سے مشہور اور مقبول عوام تھی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مولف محمد ابرار حسین صاحب کے ہاتھ لگا تو انھوں نے اردو میں اس کی شرح لکھ کر پریم رس کے نام سے اس کو شایع کیا۔ مولف نے تصوف کی اصطلاحوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی قابل قدر کوشش کی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ تقریباً

ڈیڑھ سو برس پہلے کی ہندی زبان کا ایک اچھا نمونہ منظر عام پر آگیا جس کی مدد سے لسانیاتی مسائل کے حل کرنے میں سہولت حاصل ہوئی۔

انتخاب اور رائے دہی

از محمد نور اللہ صاحب بی ایس سی ناشر انجمن طیلسانین عثمانیہ۔

یہ چھوٹی سی کتاب وقت کی ایک نہایت اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ عہد حاضر میں جبکہ ہر طرف اصلاحات اور انتخابات کا چرچا ہے ضروری تھا کہ عوام کو رائے دہی کے طریقوں اور انتخابات کی نوعیتوں وغیرہ کے متعلق ضروری معلومات ایک کتابچہ کی شکل میں شایع کی جائیں اس لئے کہ جب تک عوام کو اس کا علم نہ ہو کہ انتخابات کیا ہیں اور ان کے ضمن میں کون کون سے مرحلوں کی تکمیل لازمی ہے اندیشہ ہے کہ انتخابات کا استعمال غلط ثابت ہوگا۔

دامن تہی

از سید مبارز الدین صاحب رفعت ناشر ادارۂ دانش حکمت حیدرآباد۔

رفعت صاحب حیدرآباد کے نوجوان انشا پرداز ہیں جن کی بعض کتابیں انجمن ترقی اردو دہلی کی طرف سے شایع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے چند افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں سے تین طبع زاد ہیں اور بقیہ تراجم۔ مصنف کی زبان اور بیان کے لحاظ سے یہ مجموعہ قابل قدر اور افسانے دلچسپ ہیں۔

رہنمائے قرآن

مترجمہ ڈاکٹر میر ولی الدین۔ ناشر ادارہ اشاعت اسلامیات حیدرآباد۔

یہ دراصل نواب سر نظامت جنگ بہادر کی ایک انگریزی کتاب "این اپروچ ٹو اسٹڈی آف دی قرآن" کا اردو ترجمہ ہے۔ اصل کتاب زیادہ تر غیر مسلم افراد سے مخاطب تھی اور خصوصاً انگریزوں سے جن کی نفسیات سے مصنف خود واقف ہیں۔ لیکن ڈاکٹر ولی الدین صاحب نے اس کتاب کا اتنا اچھا اردو ترجمہ کیا ہے کہ ہر نوجوان خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم اس کتاب کو دلچسپی سے پڑھے گا۔ ادارۂ اشاعت اسلامیات نے اسی قسم کے مفید موضوعوں پر قلیل عرصہ میں متعدد کتابیں شایع کی ہیں لیکن ان سب میں رہنمائے قرآن کو خاص طور پر اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوگی۔

روح صہبائی

از خواجہ عبدالسمیع پال اثر صہبائی۔ ناشر راج محل پبلشرز جموں۔

اثر صہبائی پنجاب کے ایک اچھے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں سوز و گداز اور رندی و سرمستی کی جھلکیں جگہ جگہ نظر سے گزرتی ہیں۔ ان کے اس مجموعہ میں ان کا ہر قسم کا کلام تاریخی ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ رباعیاں بھی ہیں۔ نظمیں بھی اور غزلیں بھی۔ پورے مجموعے کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر غزل یا نظم کے نیچے تاریخ تصنیف بھی لکھی گئی ہے۔ علامہ اقبال کی کتابوں کی طرح اس کتاب کی کتابت و طباعت بھی دیدہ زیب ہے۔

سالنامہ آجکل

دلی سے ایک پندرہ روزہ رسالہ "آجکل" آغا محمد یعقوب دواشی کی ادارت میں شایع ہوتا ہے جس کی ترتیب و تہذیب میں خاص ذوق اور سلیقہ کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر شمارے میں اردو کے کسی بڑے ادیب یا شاعر کی تصویر اور حالات بھی شایع کئے جاتے ہیں۔ اور ہر شمارہ با تصویر رہتا ہے۔ چنانچہ زیر نظر شمارے میں جوش ملیح آبادی اور تلوک چند محروم کی عمدہ تصاویر کے علاوہ مختلف ممالک کی تہذیب و معاشرت سے متعلق بھی بیس پچیس تصویریں شریک ہیں۔ اس کے لکھنے والوں میں خواجہ حسن نظامی، جگر مرادآبادی، تسنیم سلیم چھتاری، ڈاکٹر تاثیر اور بادشاہ حسین خاص کر قابل ذکر ہیں۔ یہ رسالہ اس قابل ہے کہ انگریزی اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مفید اور دیدہ زیب رسائل سے مقابلہ کر سکتا ہے۔

تبصرۂ حیات شبلی

از محمد امین زبیری۔ مطبوعہ سنٹرل انڈیا پریس بھوپال۔

یہ کتاب دراصل علامہ سید سلیمان ندوی کی مبسوط حیات شبلی کے جواب میں شایع کی گئی ہے۔ لیکن اس میں صرف شبلی کی زندگی کے رنگین پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش نمایاں ہے۔

اور اس لیئے مولف نے اس کتاب کا نام غلط تجویز کیا ہے یا تو وہ حیات شبلی پر تفصیلی تبصرہ کرتے یا اگر ان کا مقصد شبلی کی محض ایک کمزوری کو اچھالنا تھا تو اسی کی مناسبت سے اس چھوٹی سی کتاب کا نام بھی تجویز کرتے۔ بظاہر یہ ایک مضمون ہے اور اس سے علامہ سلیمان ندوی کی کتاب حیات شبلی کی عظمت اور افادیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ "ق"

ادارے کی مطبوعات

سرگزشت حاتم:۔ دہلی کے پہلے اردو شاعر اور استاد الشعراء شاہ ظہور الدین حاتم کے حالات زندگی اور اردو و فارسی کلام پر تبصرہ جس کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور نے نہایت ہی تحقیق و تلاش کے بعد عالمانہ انداز میں قلمبند فرمایا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کے ذریعے سے اردو کے ایک بڑے شاعر اور استاد الاساتذہ کی شخصیت اور کردار کے ایسے پہلو روشنی میں آجاتے ہیں جو ہر زمانے میں معیاری سمجھے جائیں گے۔ ان کی زندگی کے حالات پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حال اور قال ایک ہی تھا۔ ان کی زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی تکلف اور تصنع سے پاک تھی۔ تشنہ گان ادب اور محققین کے لئے یہ نادر تحفہ ہے۔

صفحات (۱۲۰) طباعت و کتابت دیدہ زیب

(قیمت عا)

تاریخ سیاسیات:۔ از پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی۔ استاد تاریخ جامعہ عثمانیہ۔

اردو زبان میں تاریخ سیاسیات پر پہلی کتاب ہے جس میں پروفیسر مجید صدیقی صاحب نے سیاسیات کی تاریخ کو اپنے خاص ماہرانہ انداز میں تحریر فرمایا ہے۔ یہ کتاب آپ کی سیاسی معلومات اور سالہا سال کے تجربوں کا نچوڑ ہے۔ کالج کے طلبہ کے لئے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ صفحات (۲۷۲)

قیمت (ستے)

ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر رفعت منزل خیرت آباد حیدرآباد دکن

ادارہ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	روپے	آنے	پائی
سرگذشت حاتم	۱۲۸	۲	۰	۰
سرگزشت غالب	۹۴	۰	۸	۰
نظام الملک	۴۰	۰	۶	۰
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سونیلی ماں	۴۸	۰	۴	۰
سرسید احمد خان	۱۶	۰	۲	۰
سرسالار جنگ	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر	۲۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۳	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰	۰
حیدرآباد	۸۵	۰	۱۰	۰
عماد الملک	۴۰	۰	۶	۰
اردو بولی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۶	۰
,, ,, دوسری کتاب	۵۶	۰	۶	۰
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ	۱۴۰	۱	۴	۰
فن تقریر	۹۲	۰	۱۲	۰
مختصر تاریخ دکن	۱۴۳	۱	۰	۰
ہندوستانی تمدن	۱۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی	۸۰	۰	۱۰	۰
سرنما	۱۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۶	۰
رسائل طیبہ	۳۹۰	۲	۸	۰
سلک گوہرین	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو	۱۷۲	۱	۸	۰
اشوک اعظم	۵۶	۰	۸	۰
باتیں	۸۴	۱	۰	۰
یورپ جنگ سے پہلے	۲۱۸	۲	۸	۰
شاد اقبال	۱۷۹	۲	۸	۰
آریائی زبانیں	۱۰۲	۱	۰	۰
نظام علی خان	۳۰	۰	۴	۰
تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	۲۹۰	۵	۰	۰
عرب اور عربستان	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	روپے	آنے	پائی
سچ کا جادو	۴۸	۰	۴	۰
طبیعاتی کائنات	۶۸	۰	۸	۰
متاع سخن	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
معراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۴۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵ تصاویر)	۵۰۰	۵	۰	۰
,, ,, دوم (۵۰) ,,	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن	۱۵۳	۱	۴	۰
روح غالب	۱۴۰	۲	۸	۰
عاصمہ	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگزشت ادارہ	۳۰۰	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۲۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان	۳۲	۰	۳	۰
خطابیات	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار	۱۶۸	۱	۸	۰
دشمش دانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
کارمان دقاسی	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت	۵۲	۰	۸	۰
ادارہ سنہ ۱۹۴۱ء میں	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ	۲۴	۰	۴	۰
افضل الدولہ	۳۲	۰	[illegible]	۰
نواب میر محبوب علی خان	۳۲	۰	۴	۰

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم۔اے
سکینہ بیگم

جلد ۹ بابت ستمبر ۱۹۴۶ء شمارہ ۹

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین شاہد ایم اے کے اہتمام سے دستگیری پریس میں چھپکر رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

تجلیات

غم ہے کیا، زینۂ صفات و ذات
غم نہیں ہے تو آرزو۔ نہ حیات

نغمۂ آرزو و رقصِ حیات
مرحبا عاشقانِ خوش اوقات

تو محبت کو لازوال بنا
زندگی کو اگر نہیں ہے ثبات

آرزو ہر نفس حیات و مرگ
عاشقی بے نیازِ مرگ و حیات

باتوں باتوں میں آج تو سرِ بزم
کہہ گئے وہ ہر ایک دل کی بات

آپ جو کچھ کہیں بجا، لیکن
آپ پر بھی ہیں چند الزامات

ہم نے دیکھے ہیں جاگتے ہوئے دل
ہم سے پوچھو ستم کے احساسات

عشق وہ تشنہ کام ہے کہ جسے
زہر کا گھونٹ بھی ہے آبِ حیات

اے کمالِ سخن کے دیوانے
ماورائے سخن بھی ہے اک بات

جگر مرادآبادی

عربی ادب عہدِ بنی امیّہ میں

(۴۱ھ سے ۱۳۲ھ تک)

خلافت راشدہ کے خاتمہ پر عرب کے سیاسی حالات میں پھر ایک انقلاب رونما ہوا۔ حضرت معاویہ جو اپنی سیاست دانی اور تدبر کے بل بوتے پر اب تک صرف گورنر بن سکے تھے، اب موقعہ پا کر انھوں نے اپنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ خلافت کے حاصل کرنے کی اس کوشش میں انھوں نے مستحقین یعنی اہل بیت ہی سے جنگ کی اس سلسلہ میں انھوں نے اسلام کے بنیادی اصولوں سے انحراف کیا یا نہیں یہ ہمارے بحث سے خارج ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ خلافت کو تبدیل کر کے انھوں نے بادشاہی کی بنیاد ڈالی۔

اموی حکومت شام میں قائم ہوئی جس کا دار الخلافہ دمشق قرار پایا۔ اہل شام نے امیر معاویہ کے ہاتھ پر ۴۱ھ میں بیعت کی اور انھیں اپنا خلیفہ تسلیم کیا۔ عرب کی اس جدید خلافت میں شخصی حکومت کی پوری شان نمایاں تھی۔ حضرت معاویہ کے بعد یہ سلطنت نہایت کمزور اور کوتاہ اندیش حکومتوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ صرف عبدالملک بن مروان (۶۵ھ سے ۸۶ھ تک) اور حضرت عمر بن عبدالعزیز قابل حکمران گزرے۔ بالآخر ۱۳۲ھ میں خلافت عباسیہ کے بانی کے ہاتھوں اس حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

اموی حکومت اور خلافت راشدہ میں بعض اختلافات بیحد نمایاں ہیں۔ مثلاً خلافت راشدہ میں خلافت کی بنیاد عوام کی پسند پر تھی۔ سب لوگ شورہ اور رائے سے جسے منتخب کرتے وہی خلیفہ ہوتا بجائے اس کے بنو امیہ میں "سلطنت دست بدست" چلی آتی رہی۔ خلفاء راشدین عوام کے مشورہ اور مدد سے اسلامی امور کی پابجائی کرتے لیکن خاندان امیہ کے خلفاء بالکل خود مختار اور مطلق العنان تھے۔ سب سے بڑھ کر خلافت راشدہ کے تمام کام دینی اصولوں، مذہبی احکام اور خدا اور رسول کے فرامین کے مطابق ہوتے مگر شاہان بنو امیہ ان اصولوں کی پابندی پر مجبور نہ تھے۔ یہی وجوہ تھے جن کی بناء پر ابتدائے اسلام کی حق پرستی، سادگی، راستی اور راست بازی اس عہد میں بالکل نہیں تو بہت کچھ غائب ہو گئی۔

سیاسی اعتبار سے اموی حکومت کامیاب کہی جائے یا نہ کہی جائے لیکن علمی سرپرستی اور علماء نوازی کی حد تک اس کی مثال قابل تقلید ہے۔ علوم و فنون کی سرپرستی اور ان کی ترقی میں بنو امیہ کے ہر خلیفہ نے کچھ نہ کچھ حصہ لیا۔ خصوصاً شاعری اس عہد میں خوب پھلی پھولی۔ اس عہد میں شاعروں کی قدر و منزلت ہونے کے کئی وجوہ ہیں جنھیں آگے بیان کیا جائے گا۔

اموی حکومت کے آتے ہی قبائل عرب میں پھر ایک مرتبہ پھوٹ پڑ گئی۔ اسلام نے آ کر جہاں ہزارہا قبائل اور متعدد قوموں میں یگانگت اور اتحاد کی روح پھونک دی تھی وہاں اب سلطنت کی خواہش نے عرب کے ان جنگجوؤں میں پھر اختلافات کا بیج بویا۔ ہر قبیلہ اپنی پرانی روایات کو دہرانے لگا اور اپنے قدیم عز و شرف پر ناز کرنے لگا۔ اصل میں دیکھا جائے تو ان جھگڑوں کی بناء حضرت عثمان رضؓ کی شہادت سے ہوتی ہے۔

اسی واقعہ فاجعہ کے بعد حضرت علی رضؓ کے طرف داروں کی ایک جماعت بن گئی اور دوسری حضرت معاویہ کی حتیٰ کہ ان کی لڑائیوں کا سلسلہ بہت زمانہ تک جاری رہا۔ جس کے آخر میں تاریخ اسلام کا وہ خونچکاں اور دل گداز واقعہ پیش آیا جسے ساری دنیا "سانحہ کربلا"

کے نام سے یاد کرتی ہے۔ وہ پھوٹ جو اب تک سیاست کے میدان میں چند خاندانوں تک محدود تھی اب عوام میں پھیل گئی۔ حتیٰ کہ بچہ بچہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔

اس عہد میں فتوحات کا سلسلہ بھی جاری رہا چنانچہ کئی نئے ممالک اس زمانہ میں مقبوضات اسلام میں شامل ہوئے جو ممالک خلافت راشدہ کے زمانے میں پوری طور پر فتح نہ ہونے پائے تھے یا فتح ہونے کے بعد بھی جہاں پوری طور پر قبضہ نہ ہو سکا تھا وہ اسی دور میں اسلامی تصرف میں آ گئے اس کی وجہ سے سلطنت کا خزانہ معمور اور رعایا میں آسودہ حالی بڑھ گئی۔ دمشق کو دلہن کی طرح آراستہ کیا گیا۔ نئے شہر بسائے گئے باغ لگوائے گئے۔ نہریں اور کنویں کھدوائے گئے۔ بڑی عالیشان اور خوبصورت عمارتیں، مساجد، درسگاہ، سرائیں، پل، مینار اور محلات وغیرہ تعمیر کئے گئے۔

غرض فساد اور بدامنی کے ساتھ جیسی کہ خوارج کی بغاوت یا دوسری ایسی ہی اندرونی سرکشیوں کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی، ملک میں خوشحالی اور آسودگی پھیل گئی تھی۔ عرب بدوی پہلی مرتبہ اپنے بے برگ و گیاہ صحراؤں کو خیرباد کر کے اموی بادشاہوں کی سرپرستی کے نو معمور شہروں میں جا بسے۔ یہ صحرائی، شہری زندگی سے اور ایسے وحشی تہذیب و تمدن سے آشنا ہونے لگے۔ دولت کی فراوانی سے عوام کا معیار زندگی بلند ہو گیا۔ ان وجوہ کا اثر لوگوں کے خیالات پر پڑا، جس کا عکس ادب کے ہر ٹکڑے اور تحریر کے ہر پارے میں ابھر آیا۔

اس زمانہ کے ادب کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) جدید ادب جس میں حسب ذیل علوم شامل ہیں۔

(ا) علوم اسلامی مثلاً علوم القرآن، حدیث، فقہ، تفسیر وغیرہ۔

(ب) علوم لسانی مثلاً لغت، نحو وغیرہ۔

(ج) تاریخ و جغرافیہ وغیرہ۔

(د) وہ علوم جو یونان، فارس اور ہند وغیرہ سے ادب عربی میں منتقل کئے گئے۔

(۲) قدیم علوم و فنون جو جہالت اور ایام راشدین دونوں میں موجود تھے جیسے لغت، خطابت، امثال، شعر وغیرہ۔

علوم و فنون کی مندرجہ بالا فہرست میں بعض علوم ایسے بھی ہیں جن کی اس زمانہ میں حقیقی معنوں میں بنیاد پڑی اور جن کی ترقی عہد عباسی میں ہوئی جیسے یہی علوم اسلامی ہیں۔ بلکہ ایک لحاظ سے ہمارا یہ کہنا بالکل حق بجانب ہو گا کہ جدید ادب کی صرف بنیاد اس زمانہ میں رکھی گئی۔ یہ واقعہ ہے کہ علوم و فنون کی حالت بالکل انسانوں کی سی ہے کہ انھیں کی طرح علوم کی زندگی بھی ہوتی ہے یعنی پہلے تو وہ نکویں پاتے ہیں جس طرح کہ بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے بعد وہ کچھ ترقی کرتے ہیں پھر پورے شباب پر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ کمزور ہو جاتے ہیں اور بالآخر بوڑھے ہو کر ادب کے آسمان سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتے ہیں۔

انسانوں ہی کی طرح ان کے بھی بڑھنے اور گھٹنے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں۔ زمانہ اور ماحول۔ انھیں کو پیش نظر رکھ کر ہم ان علوم کی تفصیلات پیش کریں گے۔

عربی ادب کے مرکز

جس طرح ادب اردو میں دہلی اور لکھنؤ کی علمی مجالس اور صحبتیں تاریخ ادب اردو میں دائمی یادگار بن گئیں، یہی حالت عربی ادب کی تاریخ میں بصرہ اور کوفہ کی ہے مگر ان کی اہمیت اردو کے ان ابتدائی گہواروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ عربی ادب، لغت، شعر و شاعری

اور نحو کا ایک مایۂ ناز حصہ انھیں دو مقامات کا رہین منت ہے۔

بصرہ اور کوفہ کی بنا کا بھی عجیب حال ہے۔ یہ دونوں مقامات آباد تو ہوئے فوجی ضروریات کے تحت لیکن زمانہ نے انھیں علم و ادب کے مرکزوں میں تبدیل کر دیا۔ ابتدائے اسلام میں جبکہ فتوحات کا سلسلہ جاری تھا اور مقبوضات میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا تھا اس وقت پایۂ تخت سے بروقت فوجیں روانہ کرنے اور واپس بلانے میں دقت ہوتی تھی اور دوسرے یہ کہ دور دراز کے علاقے آسانی سے قابو میں نہیں رکھے جا سکتے تھے اور ان کے سرکش ہونے کا خطرہ بروقت لگا رہتا تھا اسی لئے جا بجا فوجی چھاؤنیاں بنائی گئیں جن میں ہمیشہ فوج رہا کرتی تھی۔

جب یہ چھاؤنیاں خوب آباد ہو گئیں اور یہ فوجی مرکز بڑے شہروں میں بدل گئے اور لڑائیاں کم ہو کر بالآخر امن کا زمانہ آگیا تو ان کی حالت بھی بدل گئی۔ عرب چونکہ فطرتاً شعر پرست واقع ہوئے ہیں۔ اسی لئے وہ کسی موقعہ پر بھی (خواہ وہ جنگ ہی کا کیوں نہ ہو) اپنی اس عادت کے پورا کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ ان مقامات میں پہلے پہل شعر و شاعری کے مقابلے ہوا کئے پھر ہر قسم کے ادبی مناظرے اور بحثیں وغیرہ ہونے لگیں حتی کہ ان اغراض کے لئے باقاعدہ انجمنیں اور مجلسیں قائم ہو گئیں اور جاہلیت کی طرح اسواق بھی بن گئے۔

بصرہ کے مشہور "سوق مربد" کا نام اس سلسلہ میں بیحد مشہور ہے۔ یہاں ہر قسم کے علمی و ادبی مباحث کا تذکرہ رہا کرتا۔ شعر و شاعری کے معرکۃ الآرا مقابلے بھی یہیں ہوا کرتے اور بعد میں چل کر لغت اور نحو کا بھی یہ زبردست مرکز قرار پایا۔ اس کی حالت جاہلیت کے "سوق عکاظ" سے اتنی مشابہ ہو گئی کہ اسے "عکاظ الاسلام" کہنے لگے۔

خلفاء بنی امیہ کی سرپرستی میں ان شہروں نے اتنی ترقی کی کہ دور دور کے لوگ انھیں دیکھنے اور یہاں کی علمی دلچسپیوں میں حصہ لینے کے لئے آتے۔ علم و ادب کے یہ مرکز تاریخ میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ ان کا تذکرہ یہاں اس لئے ضروری تھا کہ جدید عربی ادب بلکہ کل ادب عربی پر جو اسلام کے بعد تیار ہوا ان مقامات کا بیحد اثر پڑا اور اس عہد کے علوم و فنون کے تذکرے میں ان کا ذکر آنا نہایت ضروری ہے۔

اسلامی علوم

اسلامی علوم میں سب سے پہلے قرأت قرآن کا نمبر آتا ہے۔ عرب میں چونکہ پڑھے لکھے لوگ بہت کم ہوتے تھے اور خصوصاً قرآن کے حفاظ اور اس کی قرأت کے ماہر گنتی کے ہوا کرتے تھے اس لئے امتیازاً انھیں "القراء" کہا جاتا تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ قرآن شریف کی باقاعدہ تدوین کے بعد بھی قرأت کے اختلافات کا سلسلہ قائم رہا۔

فتوحات کی وسعت کے ساتھ مسلمان اقصائے عالم میں پھیلتے گئے اور ان میں بھی ہر قبیلہ اور عرب کے ہر خاندان کے لوگ شامل ہوتے جن کی لغتوں میں ابتدا ہی سے جزوی اختلافات موجود تھے۔ پس یہ اختلافات نئے ماحول کے اثرات اور نئی زبانوں کے اختلاط کی وجہ سے ہر جگہ کی قرأت میں ایک خاص رنگ پیدا ہوتا گیا۔ چنانچہ قرآن کی عبادت کو سات طریقوں سے پڑھا جاتا تھا عموماً میں صحیح قرأت کے کئی ماہر موجود تھے جن میں بعض بہت عرصہ تک زندہ رہے ان میں سے مشہور یہ ہیں:

عبداللہ بن کثیر المتوفی سنہ ۱۲۰ھ
عاصم بن ابی النجود المتوفی سنہ ۱۲۸ھ
عبداللہ بن عامر المتوفی سنہ ۱۱۸ھ
یزید بن القعقاع المتوفی سنہ ۱۳۲ھ
حمزہ بن حبیب المتوفی سنہ ۱۵۶ھ
ابو عمرو بن العلاء المتوفی سنہ ۱۵۶ھ

اور نافع بن عبدالرحمن المتوفی ۱۶۹ھ وغیرہ ہیں۔

تفسیر

قرأت کے بعد تفسیر کا نمبر آتا ہے اسلام کے ابتدائی ایام میں جب قرآن کی سورتوں اور آیتوں کے معانی کے سمجھنے میں دقت ہوتی تو لوگ آنحضرت صلعم سے استفسار کرتے اور آپ نہایت آسانی سے ان کے شکوک رفع فرمادیتے اس کے علاوہ قرآن چونکہ قریش کی لغت ہی میں نازل ہوا تھا اسی لئے ان کو اس کے سمجھنے میں زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا نہ پڑتا۔ پیچیدہ سورتوں اور آیتوں کے جو معانی اور مطالب آنحضرت صلعم نے بیان کئے تھے انھیں صحابہ نے اور پھر ان کے بعد ان کے تابعین نے محفوظ کرلیا اور یہ سلسلہ یونہی چلا۔ یہی تفسیر کی بنا ہے۔

اس کے بعد قوانین اور احکام کے وضع کرنے میں جب قرآن سے مدد لینے کی ضرورت لاحق ہوئی تو ساتھ ہی مفسرین کی بھی ضرورت پڑی جو مشکل عبارات کے مطالب حل کرتے اس خصوص میں پہلے حضرت ابن عباسؓ جنھوں نے قرآن کی سب سے پہلے تفسیر کی اور دوسرے مجاہد المتوفی ۱۰۳ھ کے نام خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ لیکن ہم بلا خوف وخطر کہہ سکتے ہیں کہ تفسیر کے فن کی صرف بنا اس عہد میں پڑی اور اس کی ساری ترقی عصر عباسی میں ہوئی۔

حدیث

کلام الٰہی کے بعد مسلمانوں کے نزدیک سب سے قابل قدر اور قابل احترام اگر کوئی چیز ہے تو وہ اقوال رسول اکرم ہیں۔ آنحضرت نے مسلمانوں کو قرآن شریف کے مطالب کے ادراک اور دیگر دنیوی امور کی رہبری کے لئے زریں نصیحتیں فرمایا کرتے یا زندگی کے اہم ترین مسائل کے حل چند عام فہم اور معمولی الفاظ میں فرمادیا کرتے اور یہ جواہر پارے مسلمانوں کے مصائب میں شمع ہدایت کا کام کرتے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جو سیاسی اختلافات پیدا ہوگئے ان میں مختلف جماعتوں نے اپنی اپنی تائید کے لئے نئی نئی احادیث کو گھڑنا شروع کیا یا اصل احادیث ہی سے اپنی مطلب کی باتیں نکالا کرتے جیسے کہ خوارج کے مقابلہ میں مہلب بن ابی صفرہ کیا کرتا تھا۔ یہ اختلافات اتنے شدید ہوگئے کہ اصل احادیث کی تحقیقات کے سلسلہ میں "فن حدیث" کی بنا پڑگئی۔

اسی زمانہ میں حدیثوں کے مختلف نام قرار پائے مثلاً صحیح، حسن، ضعیف، مرسل، منقطع، معضل، شاذ اور غریب وغیرہ اس عہد کے مشہور محدثین میں

شعبۃ بن الحجاج المتوفی ۱۶۰ھ

خالد الحذاء المتوفی ۱۴۱ھ

ابوالمہزم اور عاصم بن سلیمان المتوفی ۱۴۲ھ

وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ تفسیر کی طرح اس کی ترقی بھی عصر عباسی ہی میں ہوئی۔

فقہ

اسلامی قوانین اور احکامات "فقہ" کی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔ قانون سازی میں گو اہل یونان اور ایک حد تک اہل روم بھی عربوں سے آگے رہے ہیں مگر جس کمال پر اسلام نے اس فن کو پہونچایا اس کی نظیر آج تک دنیا کی بڑی سے بڑی قانون ساز قوموں میں بھی نہیں ملتی۔

شخصی تنازعات اور باہمی مناقشات کا فیصلہ ابتداً پنچایت وغیرہ کے ذریعہ ہوا کرتا تھا لیکن جب اسلام نے ہر چیز کی منظم اور مدون شکل پیش کی تو عوام کے جھگڑوں کے تصفیہ کے لئے بھی کسی ایسے ہی با اصول فن کی ضرورت درپیش ہوئی جس کے لئے سب سے بہتر ذریعہ ان کے پاس خدائے عزوجل کے احکامات کی صورت میں موجود تھا یا اس کے بعد فرامین مصطفوی ان کی ہدایت کے لئے موجود تھے۔ چنانچہ یہی ہوا مسلمانوں نے قضایا کے فیصلوں کے لئے قرآن اور حدیث سے ہی کام لینا شروع کیا اور یہ فن آگے چل کر

"فقہ" کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔

اسلامی سلطنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ فقہ نے بھی ترقی کی۔ ہر بڑے شہر اور مشہور مقام میں فقیہ اور علما موجود ہوتے جن سے شرعی امور متعلق ہوتے تھے۔ فقہ کی بنیاد اصل میں دیکھا جائے تو خلفاء راشدین کے ہاتھوں پڑی کیونکہ مسلمانوں کے کل تنازعات کے فیصلے وہی کیا کرتے تھے اور ان ہی شرعی اصولوں پر۔ ان کے بعد صحابہ کا نمبر آتا ہے ان میں عبدالرحمٰن بن عوف، ابی بن کعب، عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل، عمارہ بن یاسر حذیفہ، زید بن ثابت اور ابو موسیٰ اشعری وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

عہد اموی میں یعنی تابعین میں سعید بن المسیب، ابوبکر بن عبدالرحمٰن قاسم، عبیداللہ، عروہ، سلیمان اور خارجہ نے بڑا نام پیدا کیا اور ان ساتوں فقہا کے ناموں کو کسی نے ان اشعار میں کیا ہی خوبی سے جمع کیا ہے دیکھئے!

الا کل من لا یقتدی باءمۃ
فقسمتہ ضیزی عن الحق خارجۃ
فخذہم عبید اللہ عروۃ قاسم
سعید سلیمان ابوبکر خارجۃ

علوم لسانی

نحو اسلام کی آمد اور عربوں کے ہر طرف پھیلنے کے بعد بھی زبان کی حفاظت اور اپنی لسانی خصوصیات کے تحفظ کی طرف عربوں نے کچھ خیال نہ کیا تھا۔ اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ قواعد اور علم نحو کے وجود میں آنے سے مدتوں پہلے سے عرب میں وہ مایۂ ناز شعر و ادب، نثر اور خطابت وغیرہ کا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا جو خود بعد میں نحوی مسائل اور اختلافات لغت کے جواز میں پیش کیا جانے لگا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ زبان کو پوری طور پر ترقی کرنے اور اس کے تمام محاورات اصطلاحیں، روزمرہ ضرب الامثال اور دوسری ایسی ہی چیزوں کے جاری ہو جانے کے بعد انہیں کی بنیادوں پر نحو کی عمارت کھڑی کی گئی۔ عرب اپنی زبان اور اپنی قوت نطق پر ہمیشہ غرور کرتے چلے آئے ہیں حتیٰ کہ وہ اپنے سوا ہر ایک کو "گونگا" کہا کرتے۔ ان کے تعلقات جب عجمیوں سے ہونے لگے اور حکومت میں اہل فارس اور ایران بھی شریک ہو گئے تو اس اختلاط کا ان کی زبان پر اثر پڑنے لگا۔ عرب یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی لغت میں کسی قسم کی خرابی ہو۔ کلام پر اعراب لگانے کا قاعدہ گو ان کے پاس پہلے سے ہی موجود تھا۔ لیکن اتنی سی حفاظت زبان کی صحت کے لئے ناکافی تھی۔

اور دوسرے یہ کہ موالی اور فارس کے نومسلم عربی لغت کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں سے قطعاً نابلد تھے اپنی گفتگو میں بہت غلطیاں کرتے انہیں وجوہات سے مجبور ہو کر عربوں نے نحوی اصول گھڑنے شروع کئے۔ علم نحو کا بانی ابو الاسود الدؤلی ہے جن کا انتقال سنہ ۶۹ھ میں ہوا۔ یہ تابعین کے گروہ میں بہت بڑی شخصیت کا مالک تھا۔ حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ صفین میں حصہ بھی لیا اور پھر بصرہ میں آکر رہنے لگا۔ زیاد ابن ابیہ والیٔ عراقین (بصرہ و کوفہ) کے سامنے جب اس جب اس نے پہلے پہل اپنی اس ایجاد کو پیش کیا تو اس نے کچھ التفات نہ کی مگر حالات سے مجبور ہو کر اس نے نحو کی کتاب لکھنے کی اجازت دیدی۔ ابوالاسود نے نہایت محنت سے ایک قواعد مرتب کی جس کے اجزاء مختلف اشیاء پر تحریر کئے۔

(باقی آئندہ)

ابوالفضل

ذوقِ سفر

گردشِ شمس و قمر، گردشِ شام و سحر — وقت ہے گرمِ سفر، وقت ہے گرمِ سفر
میرے نفس نے دیا، وقت کو ذوقِ خرام — رینگتے رہتے یوں ہی ورنہ یہ شام و سحر
میری نظر نے لیا جائزۂ کائنات — مجھ کو نظر آگیا میرا ہی حسنِ نظر
میرے ہی خوابوں میں گم، شام کی افسردگی — صبح کی رنگیں شفق میرا ہی خونِ جگر
میرے تبسم کی موج میری جبیں کی شکن — یعنی بہار و خزاں میری ہی طرزِ نظر
عشق میں بے چارگی، حسن میں زعمِ غلط — عشق رہا سرنگوں، حسن رہا خود نگر
نالہ بھی میری نوا، نغمہ بھی میری نوا — وہ بھی مرا چارہ گر، یہ بھی مرا چارہ گر

میری رہِ شوق میں طور بھی تھا اک مقام — طور سے بڑھنے لگا اور بھی ذوقِ سفر
جرأتِ پرواز نے عرش کو چھو بھی لیا — عرش بھی نکلا مگر میری ہی حدِ نظر

میری نظر بڑھ گئی توڑ کے حدِ فلک — اپنی نظر میں ہوں میں اب بھی مگر کم نظر
میرے سکوں میں بھی ہے آرزوئے اضطراب
یعنی یہ شبنم کی بوند رکھتی ہے رقصِ شرر

میکش

داستان

ایک طویل القامت، دبلے پتلے، لانبے بال والے آدمی نے سارنگی بجانی شروع کی۔ اس شخص کے چہرے سے فقر و فاقہ کے ساتھ ہی بدعنوانی اور غیر معمولی قوتِ تخلیق کے ملے جلے عجیب غریب آثار ہویدا تھے۔ یہ ایک پُرعظمت، ساحرانہ اور فسوں ساز نغمہ تھا جس کے اونچے سر نہایت دردانگیز تھے اور نچلے سروں میں حزن و یاس کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اس میں قرونِ وسطیٰ کی کوئی ادا تھی، کوئی مایوس کن، ناگوار حد تک دلکش، ظالم اور خوف زدہ کرنے والی چیز تھی۔

میزبان جو اپنے آپ کو موسیقی کا سرپرست سمجھتا تھا سرخ گون پہنے ہوئے تھا۔ اس کی بڑی بڑی، سبک، ادھر ادھر گھومنے والی آنکھیں دیوانے آدمیوں کی مانند چمک رہی تھیں۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھا، اس انداز میں گویا وجد و کیف سے بے خود ہو گیا ہو، ساز پر ایک قصہ گانے لگا اور اس کی آستینوں کی مسلسل بے ترتیب حرکت تر کپڑے پر رکھے ہوئے شیشوں اور پیالوں کو الٹ پلٹ کرنے لگی۔

"مدتیں گزریں کہ......" اس کے الفاظ بری طرح بگڑ رہے تھے۔ اس لئے اس نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے منہ کو اوپر اٹھا کر کہا۔ ہر چند کہ وہ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور بذاتِ خود اس نے اچھی تعلیم پائی تھی، تاہم اس کی گفتگو پردیسیوں کی جیسی اجنبی معلوم ہو رہی تھی۔

"اس واقعہ کو صدیاں گزر گئیں...... آہ! اس واقعہ پر کتنا طویل زمانہ گزر گیا، قرن ہا قرن گزر گئے...... صدیاں بیت گئیں...... ہر شخص اس کو فراموش کر چکا ہے...... وہ اس وقت کتنا بھیانک تھا......"

میز کے گرد بیٹھے ہوئے مجمع میں سے ایک شخص یکایک اٹھا، وہ اس وقت تک خاموش تھا اور اسے شاید ہی کوئی جانتا تھا جو شخص اسے یہاں لے آیا تھا، اس نے بھی اس کا کسی سے تعارف کرانے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اس کے کپڑے معمولی سے تھے، اس کا قد پست تھا، لیکن سینہ کشادہ تھا۔ وہ بظاہر اجڈ معلوم ہوتا تھا، اور اس کے بال ایک عجیب مضحکہ خیز طریقے سے بنے ہوئے تھے۔

"کیا آپ مجھے اجازت نہ دیں گے؟" اس نے التجا آمیز آواز میں دریافت کیا۔ میزبان، ایک مسخرے کی طرح پیچھے ہٹا اور اپنے بازوؤں کو سینہ پر سے ایک جھٹکا دے کر زمین کی طرف لاتے ہوئے مضحکہ خیز آواز میں بولا۔

"کیوں نہیں، ضرور، ضرور"

"پھر شروع سے" آوارہ اجنبی نے سارنگیے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھیں سارنگیے سے چار ہوئیں اور اس نے سارنگی کے پہلے بولوں کے ساتھ اپنا قصہ شروع کر دیا۔

یہ اگلے وقتوں کا ذکر ہے۔ اس وقت سے لے کر اب تک بہت سے قدیم خاندان دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، بہت سے قلعے ویران ہو چکے ہیں۔

اس زمانے میں قدیم قلعہ جھیل کے درمیان چٹانوں پر کھڑا ہوا تھا۔ اور اس کے گرد و نواح میں ہر شخص جانتا تھا کہ جھیل بے تاہ تھی، قلعہ ناقابلِ تسخیر تھا، اور یہ کہ لوہے کا لانبا پل رات کے وقت اٹھا لیا جاتا تھا۔

رئیس نے اپنی عمر کی ساٹھ منزلیں طے کی تھیں، تاہم وہ نہایت قوی، بلند حوصلہ اور حد سے زیادہ شجیع تھا۔ کسی عقاب کی پُرمسرت چیخ پر وہ قیر کی شعلوں کے سرخ دہشت ناک شعلوں میں اپنے سرداروں کے آگے گھوڑے پر بیٹھا تیزی سے پل پر سے گزرتا اور اس کے قدموں کے نیچے جھیل کی موجیں ایک دوسرے سے ٹکراتیں اور ٹاپوں کی آواز سے ہم آہنگ ہو جاتیں۔ پھر قصبات شعلوں کی نذر کر دئے جاتے، عورتیں روتیں، اور سامانِ تجارت لانے والے سوداگروں کا قیمتی مال اس کی لوٹ مار کی نذر ہو جاتا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس نے ایک معمولی لڑکی سے شادی کیوں کی؟ کیا اس کے باج گزاروں کی بیٹیوں میں کسی

حسین عورت کی کمی تھی ؟ کیا کسی اونچے گھرانے کی لڑکی کو یہ اعزاز بخشا نہیں جاسکتا تھا ؟ اس نے وحشیانہ طور پر اپنی شادی کا جشن منایا، خوب خوب شرابیں پیں، اپنے غلاموں کو مٹھیاں بھر بھر کے جواہرات دیئے اور اپنی جوان بیوی کو اپنی بڑی بڑی وحشیانہ بے کیف آنکھوں سے گھورتا رہا۔

وہ ایک غریب مصور کی بیٹی تھی۔

ہزارہا آنکھوں نے اس حسین عورت کا نظارہ کیا تھا لیکن ایک شخص ایسا بھی تھا جو اس کو محبت بھری نظروں سے تکتا جو زبان حال سے کہتیں "میری جان حاضر ہے یہ تم پر سے نثار ہے، مجھے تم سے محبت ہے......!"

ایک دن ــــ جیسا کہ ماضی کی تاریکی میں لپٹی ہوئی داستان میں مذکور ہے ــــ رئیس ایک مہم سے واپس آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک نوعمر غلام اس عورت کے قدموں پر پڑا ہوا ہے۔ اس نے غلام کو صحن میں آنے کا حکم دیا اور اس کی سیدھی آنکھ میں گولی مار کر اسے ٹھنڈا کردیا۔

اس نے اپنی بیوی کو چھوا تک نہیں، لیکن اس نے اپنے فرماں بردار اور جفاکش سرداروں کی جمعیت کو طلب کیا اور ہر ایک سردار کو شاہانہ فیاضی سے سونا عطا کر کے کہا۔

"تم آزاد ہو، جہاں جی چاہے جاسکتے ہو۔"

اور جب ان میں کے آخری آدمی نے لوہے کے پل کو پار کرلیا تو رئیس خود اٹھا، زنجیر توڑ ڈالی، اور قلعے کے عظیم الشان دروازوں کو مقفل کردیا۔

سردار جب قلعہ پر آخری نظر ڈالنے کے لئے پلٹے تو انھوں نے رئیس کو برج کے سب سے بلند جھروکے میں نمودار ہوتے اور لوہے کی بڑی کنجی کو، جس سے قلعہ کے دروازے مقفل کیے گئے تھے، بے تاہ جھیل میں پھینکتے ہوئے دیکھا۔

سال ہا سال گزر گئے کسی نے بھی اس قدیم، ویران قلعے کے متعلق کچھ نہیں سنا۔ سوائے کھنڈر کے اب وہاں کچھ باقی نہیں ہے۔ ہر طرف کانٹی آگ آئی ہے اور دھول اڑتی رہتی ہے۔ ہری ہری چھپکلیاں ادھر ادھر دوڑتی پھرتی ہیں اور شہد کے چھتے ہوا میں اپنی بو پھیلاتے ہیں۔ ان دو انسانی ہستیوں کا کیا انجام ہوا ؟ کیا وہ طویل اور شدید تکلیف اٹھاتے رہے ؟ ان دونوں میں سے کس نے زیادہ اذیت اٹھائی ؟

"شخص" ہاں کوئی شخص بھی اس راز کو کبھی نہ جان سکے گا۔

موجیں پتھر کی بنیادوں سے ٹکرا رہی ہیں...... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان موجوں کی آواز گھوڑوں کے ٹاپوں کی وہ پرانی دہشت ناک آواز کی صدائے بازگشت ہے۔ کوئی بھی اس راز سربستہ کا پتہ کبھی نہ چلا سکے گا......

اور خاموش موجیں ساحل سے ٹکرا رہی ہیں......

سارنگیہ اور گانے والا دونوں ایک ساتھ چپ ہوگئے اور چاروں طرف چھائی ہوئی لرزہ خیز خاموشی میں میزبان نے ناس کی چٹکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"بس، اتنا ہی ؟ ہاں ــــ طویل نہیں لیکن قدیم اور اس کہانی کا یہ"

(ترجمہ از کپرن)

سید مبارز الدین رفعت

محبت کی چھاؤں مرزا اظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ہر فسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کار فرما ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔ اس کا حسین و جمیل سرورق دیکھتے ہی اس کتاب کے بیباک اسلوب اور اس کے افسانوں کے بے پناہ شوخی کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد عہ

بغاوت اور موت

مجھے ہوسٹل میں رہتے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا تھا اور اس عرصے میں کئی واقعات رونما ہوئے۔ ہوسٹل کی زندگی کا ماحول بہت پر شور اور ہنگامہ خیز ہوتا ہے۔ اس لئے زندگی کو پرسکون بنانے کے لئے کچھ نہ کچھ ذریعہ پیدا کرنا پڑتا تھا کیونکہ مجھ جیسی خاموش لڑکی کو اپنی زندگی میں ایسے ہنگاموں کا تحمل ہونا ایک دشوار امر تھا۔

ہمارا کالج تعطیلوں کی ایک طویل مدت کے بعد کھلا تھا اس لئے اس میں ایک نیا رنگ پیدا ہوگیا اور ہوسٹل میں دھڑا دھڑ داخلے شروع ہونے لگے۔ یہی وجہ ہوئی کہ میرا کمرہ بھی خالی نہ رہ سکا اور قانتہ نے آکر اس کمی کو پورا کر دیا۔ قانتہ کو ہوسٹل کی ماں نے آکر میرے کمرے میں اس کا ٹھکانہ بتایا اور اس کی ماں مطمئن ہو کر قانتہ کو چھوڑ کر جانے لگی تو اس کی صورت سے ایسی سنجیدگی اور متانت ظاہر ہو رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک بارعب ہستی کھڑی ہوئی ہے۔

میں نے دل سے گواہی دی کہ اگر دوست ہو سکتی ہے تو صرف یہی ہستی۔ کیونکہ میں نے اب تک کسی لڑکی کو اپنا دوست نہیں بنایا تھا۔ میں ایسی سہیلی کی ضرورت محسوس کرتی تھی جو مجھ جیسی ہی خاموش ہو۔

اس لئے میں جلد اس سے مانوس ہو جانا چاہتی تھی جیسا کہ عام لڑکیوں کا خاصہ ہے۔ میں نے اس سے مسکراتے ہوئے کہا کہ کہئے آپ کو اپنی جگہ پسند آئی۔ میں نے گفتگو کے دوران میں کمرے کا دریچہ کھول دیا اس نے دریچہ کے باہر جھانکتے ہوئے کہا کہ میں بھی ایسی ہی پرسکون جگہ کی جویا تھی۔ خیر وقت گزرتا گیا دنوں سے مہینے گزر رہے لیکن قانتہ سے کوئی بے تکلفی نہ ہوئی۔ سوائے معمولی گفتگو کے۔ کبھی تعلیم کے بارے میں کبھی موسم۔ میں اس کو بار بار مجبور کرتی کہ خدا کے لئے اپنی زندگی کو اس قدر متانت سے نہ گزارئیے۔ لیکن وہ صرف یہ کہہ کر ٹال دیتی ہے۔

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشئ ازل ہو

قانتہ بالکل سیدھی سادی زندگی گزارتی تھی نہ اس میں کوئی تکلف تھا نہ تصنع۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں مذہبی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ وہ نماز بھی پڑھتی تھی اور روزے بھی رکھتی تھی۔ باوجود متین ہونے کے ملنسار بھی تھی اور ہمدرد بھی جب کبھی وہ لڑکیوں سے بات کرتی تو مسئلہ قضا و قدر کے متعلق روشنی ڈالتی تو احکامات الٰہیات پر یہی وجہ تھی کہ تمام لڑکیاں اس کو "زاہدہ خشک" کہا کرتیں۔

قانتہ میرے ساتھ میرے کمرے میں رہتی تو میں چاہتی کہ اے کاش وہ مجھ سے باتیں ہی کئے جائے۔ میں ہزار موقع تلاش کرتی اور اس سنجیدگی کے راز کو فاش کرنے کی کوشش کرتی۔ لیکن اس کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا کہ وہ بمصداق ؎

سب زبانِ حال سے ہے حالِ دردِ غم
جس کو کہتے ہیں خموشی ہے وہ گویائی مری

جب میں اس کے خانگی معاملات میں اس کے متعلق پوچھتی تو وہ آہ بھر کر کہا کرتی کہ بہن آپ کو کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں؟ کیا ہوں۔ صرف یہی سن لیجئے کہ ؎

پکارتا ہے ہر اک داغ میرے سینے کا
لئے ہوئے چمنِ سوگ کی بہاریں ہوں میں

لیکن میرے پیہم اصرار سے یہ معلوم ہوا کہ وہ سایۂ پدری سے محروم ہے، ایک غمگسار بہن بسترِ علالت پر ہے اور اس کے کمسن بھائی بہنوں کی تعلیم کا عسرت و ناداری کی وجہ سے کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں ہوا۔ اب اس سے اچھی خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ ایک روز میں اپنے امتحان کی تیاری کے لئے کتابوں کی ورق گردانی میں مصروف تھی۔ قانتہ نے میرے پیچھے سے آکر ایک خط دیا اور کہا کہ پڑھو۔ مجھ کو اس کی بے تکلفی پر تعجب ہوا اور بڑی پرشوق نظروں سے خط کھول کر پڑھنے لگی لیکن آہ اس میں کیا تھا، لکھا تھا کہ اس کی بہن

نزہت اپنی زندگی کے آخری دنوں کو بڑی بے چینی سے گزار رہی ہے۔ ڈاکٹر نے دق کے دفعیہ کے لئے میسور کی صحت بخش ہوا میں رہنے کی تجویز کی ہے۔ میں نے خط پڑھ کر قانتہ کو دیکھا جو دریچہ میں کھڑی ہوئی آنکھوں سے آنسو گراتے ہوئے یہ گنگنا رہی تھی ؎

سنبھلنے دے، ہجوم ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

اس کے چہرے سے یاس و ناامیدی ٹپک رہی تھی میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ گھبراؤ نہیں قانتہ خدا پر بھروسہ رکھو اور اس سے مدد مانگو۔

اب اس کے قریب چلی گئی تھی اور میں نے کہا خدا کریم و رحیم ہے وہ تمہارے حال پر رحم و کرم کرے گا۔

قانتہ نے میری طرف دیکھ کر اس قسم سے گھورا کہ میں سہم گئی میں سمجھی شاید اس پر اپنی بہن کی ناسازی کا بہت اثر ہو رہا ہے لیکن اس نے کہنا شروع کیا۔ تم نے کیا کہا! رافعہ خدا سے دعا مانگوں ؟! اس خدا سے جس نے مجھے بن باپ کا کیا۔ اور اس سے جس نے میرے بھائی بہنوں کو بے وجہ موت کا مزا چکھا کر ہماری زندگیوں کو سوگوار بنایا اور اس وجہ سے جو اب اس بہن کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے جو ہمارے لئے زندگی کی نعمت غیر مترقبہ ہے اور اس خدا سے جس نے طبقۂ امرا کو اپنی تمام رحمتیں عطا کر کے طبقۂ غربا کے لئے اپنے پاس کوئی چیز نہ رکھی ؟ تم نہیں دیکھتیں کہ اس کی ہزار ہا مخلوق بے خالق کی طرح ایڑیاں رگڑتی پڑی ہوئی ہے۔

کیا تم اس کو محسوس نہیں کرتیں کہ سیکڑوں بچے لاوارث یتیم ہو کر اپنی زندگیوں کو نیست و نابود کر رہے ہیں اور کیا اس کے لاکھوں بندوں کی تعداد بے یار و مددگار پڑی ہوئی ہے ؟ اور کیا ہزاروں شاکر مائیں اپنے کمسن بچوں کو فاقوں سے بلکتے تڑپتے دم توڑتے ہوئے دیکھ کر بھی اس کی حسب مرضی شاکر نہیں رہیں ؟ تم ہی بتاؤ اتنا ہونے پر بھی کیا اس کی رحمت میں جوش آیا ؟!

اگر میں دعا مانگوں تو کیا اس کو اپنی رحمت عطا کرنے کا خیال آئے گا۔ ہرگز نہیں وہ غربا، کو ان کی زندگیوں کو تلخ کرنے پر تلا ہوا ہے اس نے ایک سانس میں اتنی لمبی تقریر کر دی میں نے ہکا بکا ہو کر اس کی صورت کو دیکھا اور کہا آہا! قانتہ! تم سے ایسی امید نہ تھی۔ بجائے اس کے تم خدا کا شکر کرتیں اور مدد مانگتیں، اچھی خاصی باغی بن گئیں۔ اس خدائے لایزال و لم یزال کی شان میں گستاخی کر رہی ہو، جس کے قہر اور عذاب کے ڈر سے بڑے بڑے انبیاء نے رو رو کر شب بیداری کی اور فاقوں پر فاقے رکھ کر بھی اس کی مرضی کے خلاف گردن نہیں موڑی اور جس کے شان میں میں یہ کہہ سکتی ہوں ؎

عطر و گلاب و مشک سے دھو کر زبان کو
گستاخ ہوں جو پھر بھی ترا نام لے سکیں

یہ سن کر اس کی صورت بدل گئی چہرہ سرخ ہو گیا آنکھوں سے سخت غصہ کا اظہار ہونے لگا۔ مجھ سے کہنے لگی بس بس رافعہ اس وقت تم پند و نصائح کے نشتر سے میرے زخم ہائے جگر کو اور مجروح نہ کرو۔ تم کو کیا معلوم کہ میرے دل میں ناامیدیوں کے سمندر کی موجیں امیدوں کے جہاز کو بڑی تیزی سے بھنور میں پھنسا رہے ہیں اور غم کی موجیں بڑے زور شور سے ساحل دل سے ٹکرا رہی ہیں اور ان موجوں کے نظارے کا لطف حاصل کرنے والے تمہارے جیسے والے ہیں آہ میری دلی کیفیت کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا ؎

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکساران ساحل ہا

تم نے دیکھا ہو گا سیدہ کہ میں نے ناامید ہو کر اب خدا کی عبادت بھی چھوڑ دی ہے جب کہ میری بہن کی پہلی دفعہ ناسازیٔ مزاج کی کیفیت معلوم ہو چکی تھی، میں نے خدا کو اپنا بنانے کے لئے تاکہ اس کو ہمارے حال پر رحم آجائے اس کے احکام پابندی سے بجا لائے۔ لیکن جب مجھے معلوم

ہو گیا کہ خدا بھی عیش و عشرت میں سرشار رہنے والے انسانوں کی طرح ہماری طرف سے غافل ہے تو ضمیر نے گواہی دی کہ وہ قاضی الحاجات ہیں، اب میں کس طرح امید رکھوں کہ میری بہن اتنی سخت بیماری میں بغیر موثر علاج کے صحت مند ہو سکتی ہے۔ اُف رافعہ! ہماری زندگی کو خدا نے کس قدر پُر آلام بنایا۔

میں نے کہا اے کاش تم اس پُر آلام زندگی کو باطمینان گزارتیں اور سمجھتیں کہ ؎

آئیں مصیبتیں تو اکڑ مسکرا کے چل
سر جھک گیا تو موت ہے یاں سر اٹھا کے چل

قانتہ! ابتدائے آفرینش سے مخلوق میں خدا کی محبت کے ساتھ بغاوت کی صلاحیت بھی موجود تھی اسی کے تحت جب اس کی محبت میں فرق آ جائے تو بغاوت کا جذبہ جوش میں آتا ہے۔

تمھارے دل میں خدا کی محبت باقی نہ رہنے سے باغیانہ خیالات جمع ہو کر تمھارے دماغ کو پراگندہ کر رہے ہیں تم اس کو خوب سمجھ لو ؎

گرا نہ آنکھ سے آنسو فریب قسمت پر
سکون دل کو جو ہے وہ اضطراب پیدا کر

میں کچھ اور کہہ رہی تھی یا کچھ اور کہنے والی بھی تھی کہ کچھ خوش باش لڑکیاں پرلطف گفتگو اور ہوسٹل کو گونجا دینے والے قہقہے لگاتی ہوئی آئیں اور آتے ہی چھیڑ چھاڑ شروع کر دیا لیکن قانتہ اٹھ کر اپنے میز پر نہ جانے کیا لکھتی بیٹھی رہی چونکہ اس کی یہ عادت تھی ہی اس لئے لڑکیوں نے اس کی اس بے توجہی کو زیادہ محسوس نہیں کیا۔ اسی طرح دن گزرتے گئے لیکن قانتہ کی زندگی میں کوئی دلچسپی پیدا نہ ہوئی وہ اور زیادہ اداس ہوتی گئی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ہم دونوں نامعلوم جگہوں میں جا کر بیٹھ جاتے اور میں اس کو سمجھاتی اس کی بہن کی طرف سے تسلی دلاتی وہ کہا کرتی آہ رافعہ بقول کسی کے ؎

یہاں بیٹھا ہوا دل میں کسی کو یاد کرتا ہوں
کبھی آنسو بہاتا ہوں کبھی فریاد کرتا ہوں

اور راتوں کو ہم دونوں ایک ساتھ سوتے لیکن کسی وجہ سے جب میری آنکھ کھل جاتی تو دیکھتی کہ وہ ٹہل رہی ہے میں اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کرتی اس کو سمجھاتی لیکن وہ آہ کھینچ کر کہتی ؎

شب میں ہو جاتی ہے جب شورش عالم خاموش
ہم فضا میں تری آواز سنا کرتے ہیں

وہ بہت مایوس ہو کر کہا کرتی رافعہ تم کو نہیں معلوم میرے دل میں کتنی آرزوئیں بستر مرگ پر پڑی ہوئی بہن کو دیکھنے کے لئے تڑپ رہی ہیں۔ لیکن مالی کمزوری کے باعث لاہور جانے کے قابل نہیں ہوں۔

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فضا کے جھونکے لمحہ بہ لمحہ بیمار بہن کی کراہ اور تڑپ کو راست مجھ تک لاتے ہیں اور میں دل سے تڑپ جاتی ہوں۔ آہ! کس قدر دلدوز جملہ تھا اس کا۔ میں نے کہا "میرے معبود قانتہ کے دل کو سکون نصیب کر"۔

(۲)

ایک روز میں حسب معمول کھانے کے وقفہ میں ہوسٹل میں اپنے کمرے میں گئی تاکہ ذرا آرام لوں اور کھانے کی گھنٹی بجتے ہی کھانے پر پہنچوں۔

لیکن میں نے جوں ہی کمرہ میں قدم رکھا کسی کی سسکیوں کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا کہ قانتہ اپنے پلنگ پر بے ڈھب پڑی ہوئی رو رہی ہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ اس آٹھ مہینے کے عرصے میں وہ کبھی اس طرح نہ روئی تھی میں نے جلد سے جلد پہنچ کر سبب دریافت کیا۔ اور اس کو منانے لگی۔

بجائے اس کے کہ وہ اور زیادہ روتی اٹھ بیٹھی اور اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے ایک لفافہ پھینکا۔ میں نے دیکھا اس کی ماں کی طرف سے تار آیا ہے

لکھا ہے تمہارے دنیا میں اکیلے ہونے کا مجھے بہت افسوس ہے تم نزہت کے خدا کے پاس با اطمینان رہنے کی دعا کرو۔"

اس کو پڑھتے ہی میرا سر چکرا تا ہوا معلوم ہوا۔ دل نے کہا جس کا خدشہ تھا آخر ہو کر رہا۔ اف میرے معبود تو نے قانتہ کے دل کو زبردست نشتر لگایا۔

اس کے مایوس خیالات کے دریا کا سیلاب امید کے کھیتوں کو کس قدر پامال کر دے گا ؟ میں لفافہ کو نیچے رکھنے لگی اور قانتہ کو دیکھا کہ وہ سنبھل کر بیٹھی اور کہنے لگی کہو رافعہ تمہارا کیا خیال ہے کیا میں حقیقت میں باغی ہوں؟ جیسا کہ تمہارا خیال میرے متعلق تھا۔ کیا خدا کو صرف میری بہن کی اتنی شدید ضرورت تھی؟ جس کا وجود ہمارے لئے ایک ذمہ دار باپ سے زیادہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا کا مستحکم ارادہ ہماری زندگیوں کو بالکل تباہ کرنے کا ہے"

"لیکن میں کہتی ہوں کہ وہ کیوں نہ ہمیں ایک دم موت دیدیتا؟ وہ کیوں دنیا کو تباکر دنیا والوں کو ہم پر ہنسنے کا موقع دے رہا ہے کیا اس کو نہیں معلوم کہ ہماری زندگی میں اس بہن کی کتنی اہم ضرورت تھی؟ کیا اس کے پاس ایسے ہزاروں بندے جن کی دنیا اور دنیا والوں کو کوئی ضرورت نہیں پڑے ہوئے ہیں۔ کیا ان میں سے کسی ایک کو چن لینا اس کے لیئے امر محال تھا" اس نے انتہائی زور و غصہ سے یہ باتیں کیں۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے پھر اس نے میری طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھا میں نے کہا قانتہ صبر کرو۔ بہ قول شخصے ؎

سطح ہیں کاشانہ ہستی کے یہ نقش و نگار
دست قدرت نے بنائے ہیں مٹانے کے لئے

خدا تمہارے صبر کا امتحان کر رہا ہے فوراً اس نے طنزیہ لہجے میں کہا کیا تم لوگ اس امتحان میں کامیاب ہوگئے؟ میں دل میں بڑی شرمندہ ہوئی مجھے افسوس ہوا کہ میں نے کیوں کہا؟

اس نے انتہائی جوش میں کہا یہ وہ خدا ہے جس کو ایوب علیہ السلام کا صبر پسند نہ آیا وہ ہمارے صبر کا کیا امتحان لے گا؟ میں تمہاری عبث دلیلوں کو سننا نہیں چاہتی تم لوگ ہمدردی کے نشتروں میں مکاری کا انجکشن دیتے ہیں۔ امراء و رؤسا کو تمام راحتیں میسر ہیں یہی وجہ ہے کہ غربا کے حقوق تلف ہوگئے؟ کیا ہم صرف آٹھ آٹھ روز کی چھٹیوں میں اتنے دور دراز فاصلے پر اپنی ماں کے پاس ملنے نہیں جاتیں تمہارے پاس معمولی معمولی وجوہ بڑی اہم نہیں ہوتیں؟ لیکن ہماری بڑی سی بڑی اہمیت کو کوئی محسوس نہیں کرتا۔ کیا مرنے تک میرے دل میں یہ خلش نہ رہے گی۔ آہ میں نے اسی غربت کی بنا پر مرنے والی کا چہرہ تک نہیں دیکھا۔ اس کا احساس خدا کو ہی نہیں تو تم جیسوں کو کیا ہوتا؟ امراء و رؤسا کے پاس غریبوں کی عزت کا کوئی سوال ہی نہیں۔ غربا کی عزت و حرمت ذلیلوں اور بازاریوں کے برابر بھی نہیں ہوتی کیا وہ کسی غریب لیکن شریف طبقے کو اپنے بہن یا بھائی کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

اے کاش! وہ صرف غربا کی عزت کا ہی احساس کرتے؟ غربا کی درگزر کی جانے والی غلطیوں کو قابل قبول سمجھتے؟ لیکن نہیں ایسا نہیں ہے۔ ایسا کیوں نہیں سمجھ میں نہیں آتا۔

کیا اچھا ہوتا کہ خدا اپنی تمام رحمتیں انہی لوگوں پر ختم کرکے تمام غربار کو موت دیدیتا۔ اگر موت بھی نہ دیتا تو اس قدر بلک بلک کر ایڑیاں رگڑنے نہ دیتا۔ اگر ایسا مجبور بھی کرتا تو اس کا صرف احساس پیدا کر آتا۔

لیکن آہ امرار تو غربا کو حشرات الارض سمجھ کر ان کو کچلنے کے درپے رہتے ہیں کہ مبادا ان کے حقوق ان کے اس عیش و عشرت کو متزلزل نہ کردیں۔

سیدہ! میں سچ کہتی ہوں کہ میرے دل میں خدا کی ناانصافی سے بغاوت کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور انہی شعلوں سے میں جلی جارہی ہوں اور اپنے جذبات کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

مرے جذبات رہ جاتے ہیں اکثر تشنۂ معنی
ہے کتنی دل شکن الفاظ کی یہ تنگ دامانی

کیا تم نہیں دیکھتیں کہ میں نے اپنے شباب کی کوئی امنگ کوئی آرزو پوری نہیں کی۔ دل مر چکا فنا ہو چکا۔ میرے دل کی رنگینی ماتم کی سیاہی بن گئی ہے

چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

میں نے کہا خدا سے مدد مانگو اور اس کے احکام پر چلنا شروع کرو نہ معلوم خدا کی مصلحت کیا ہے؟ اور کیا معلوم کہ تمہارے صبر سے تم کو وہاں کوئی اچھی جگہ ملے۔ اس نے بے پروائی سے منہ پھیرتے ہوئے کہا اونھ۔ ع

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

دیکھو سیدہ اب میں نہ جنت کی خواہشمند ہوں نہ دوزخ کی۔ ع

نہ میں مشتاق جنت کا نہ میں بیزار جنت سے

کیونکہ میرے باپ میرے بہن بھائی راہ عدم اختیار کر چکے اب مجھے کوئی حسن دنیا میں رہنے کا نہیں نہ میں دنیا میں رہنے کے قابل ہوں نہ دنیا کو میری ضرورت ہے۔

میں نے کہا قانتہ آہ تم جیسی سمجھدار ذہین لڑکی سے ایسی امید نہ تھی کہ تمہاری گمراہی حد سے تجاوز کر جائیں گی تم خدا سے ناامید ہو کر موت مانگ رہی ہو؟

کیا تم کو نہیں معلوم کہ خدائے تعالیٰ اپنے کلام میں فرماتا ہے کہ اُدعُونی استجب لکم وہ انہی لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی عبادت اور احکامات پر سرنگوں رہتے ہیں اس کی رضاجوئی کے خواہشمند ہوتے ہیں جب ہی وہ خدا کے ہو جاتے ہیں اور خدا ان کا ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امرا اور رؤسا، کی تمام خواہشیں آئین رزیہ تمام و کمال پوری ہوتی ہیں میری اس تقریر کو بڑی بےچینی سے سنتی رہی اور پھر کہنے لگی۔ آہ سیدہ میرے نشتر زدہ دل کو اور زیادہ مت دکھاؤ۔

تم نے کیا کہا۔ امراء و رؤساء ہمیشہ خدا کی رضاجوئی کے منتظر رہتے ہیں۔ اے کاش کیا غرباء کے لئے ہمیشہ ان کے دروازے در شداد کی طرح بند نہیں رہتے؟ وہ خدا کی خدائی میں شرک کر کے فرعون بے ساماں بنے ہوئے ہیں۔ کیا یہ ہامان اپنی ذرا سی عیش پرستی کی وجہ سے غربا کی زندگیوں کے بارآور درختوں کو جڑ سے اکھیڑ کر نہیں پھینک رہے ہیں۔ بتاؤ سیدہ کہ مساکین کی محنتوں کی لہلہاتی کھیتیوں پر طوفان نوح برپا نہیں کر رہے ہیں۔ یہ ایسے خزانے دار ہیں جن کے ایک خزانہ پر دس قارون کے خزانے برابری نہیں کر سکتے۔

اس دوران میں اس کا غصہ بہت بلند ہو گیا منہ سے کف جاری ہو رہا تھا۔ اپنے ہاتھ کی مٹھیوں کو خوب بھینچ بھینچ کر اس تقریر کو ادا کر رہی تھی پھر کہنے لگی کیا تم انھیں شقی القلب اور ظالموں کی طرف داری کر رہی تھیں جو اپنے اندر بیداد صاف رکھتے ہیں۔

میں خدا کو ہی کہوں گی کہ اس نے ناانصافی کی بےشک اس نے ناانصافی کی ہے۔ میں اس کے بندوں میں سے ہونا بھی نہیں چاہتی چنانچہ خدا کے ستائے ہوئے کسی بندے نے کہا ہے

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

(۳)

ایک روز دوران گفتگو میں قانتہ نے کہا کہ سیدہ میں بہت دن تک سوچتی رہی کہ سکون کیسے نصیب ہوگا۔ میری سمجھ میں آتا ہے کہ خودکشی ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے سکون ابدی حاصل ہو سکتا ہے۔

اور اب میں موت صرف موت چاہتی ہوں اور میں تم کو بتاؤں گی کہ میں کیا کروں گی

جان مضطر کی حقیقت کو نمایاں کر دوں
دل کے پوشیدہ خیالوں کو بھی عریاں کر دوں

میں دنیا کے تمام جھگڑوں کا خاتمہ خودکشی سے کرتی ہوں۔

خودکشی کا نام سن کر میرے حواس معطل اور ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔ میں نے اس سے کچھ نہ کہا کہ مبادا وہ اور مشتعل نہ ہو جائے۔ میرے دل میں ایک خلش سی ہو گئی کہ کہیں سچ مچ وہ خودکشی نہ کر لے۔ میں نے اپنی دواؤں کی صندوقچی کو مقفل کیا اور ہمیشہ سائنس روم میں اس کی خاص نگرانی رکھنے لگی کہ کہیں کوئی زہریلی گیس نہ سونگھ لے اور نہ کوئی ایسی چیز اٹھا لے جس سے جانی خطرہ لاحق ہو۔

اس کو فرصت کے اوقات میں سمجھاتی کہ تم اپنی غربت و افلاس کا ہرگز خیال نہ کرو اس کو ایسا سمجھو کہ ؎

میرے افلاس کی ٹھوکر پہ ہے تاروِ نیت قیصر

مرے پائے گدائی پر نگوں ثروت کی پیشانی

یہ سن کر کہنے لگی نہیں رافعہ میرا مطلب ثروت و دولت کو حاصل کرنا نہیں بقول شخصے ؎

اے زر تو خدا نہٗ ولیکن بہ خدا

ستار العیوب قاضی الحاجاتی

میں اس کی حامی ہوں۔ لیکن رافعہ میرا دل دنیا کے ہنگاموں سے بھر گیا۔ میں نے نہایت آہستگی سے کہا دیکھو قانتہ تم اسم بامسمیٰ ہو خودکشی حرام ہے۔ تمہاری دنیا کو ضرورت اور شدید ضرورت ہے تم ان خرافات کو چھوڑ دو اپنی ہمت کو کام میں لا کر سربلند ہو جاؤ گی تو بہت سی زندگیاں تم کو دیکھ کر اپنے آپ کو سدھاریں گی۔ چونکہ مجھے اس سے قلبی محبت ہو گئی تھی اس لئے ہر ممکن طریقہ سے اس کو باز رکھنے کی کوشش کرتی وہ بہت مایوسانہ انداز میں کہنے لگی رافعہ تم کو کیوں مجھ سے اتنی ہمدردی ہو رہی ہے۔ مجھ جیسی ہزاروں لڑکیاں یا دوسرے معنوں میں سیکڑوں غربا عسرت و ناداری کی وجہ سے خودکشی کر لیتے ہیں تم کس کس کو مناؤ گی، کس کس کو روکو گی۔ مجھے دنیا کو چھوڑ دینے دو کیونکہ اب دنیا میں کوئی غمگسار نہیں رہا۔

رافعہ! میری زندگی پہلے ایسی خاصی خوش باش تھی میرا دل بھی بھلا چنگا تھا لیکن اب دل مجھ سے پہلے مر چکا۔ کیونکہ میری دنیائے حسرت کو دوبالا کرنے والی ہستیاں بھی موجود تھیں۔ اور میں یہ کہہ سکتی ہوں ؎

شفق، نورِ سحر، کالی گھٹائیں چاند اور تارے

کبھی اجزا تھے یہ سب میری دنیائے مسرت کے

لیکن آہ اب کیا ہے ؎

اور اب یہ حال ہے دل خود بہ خود ہی بیٹھا جاتا ہے

بھیانک پستیوں تاریکیوں میں آتا جاتا ہے

میں نے یہ سن کر اس کو منانے کی حتی الامکان کوششیں کیں اور کہا کہ انشاء اللہ تمہاری زندگی اب ایسی نہ رہے گی تم دنیا میں اوجِ کمال کو پہونچ کر اپنی ہمت کی بلندی دکھاؤ اور بالکل اس شعر کے مطابق اپنا نصب العین کر لو ؎

دل سے نکال طالعِ برگشتہ کا خیال

کر چرخ کو اسیر، ستاروں کو پائمال

قانتہ اس کو سن کر بہت خاموشی سے بیٹھی رہی اور آہ بھر کر کہنے لگی وقت گزرنے کے بعد کیا ہوتا ہے ؎

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ

صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

بہت رات گئے تک ہم لوگوں نے اسی قسم کی گفتگو کی۔ دوسرے روز قانتہ اپنے وطن کو جا رہی تھی اور اپنے نام کے اخراج کی درخواست بھی دیدی تھی۔

مجھے اس کا جانا ناگوارِ خاطر ہوا۔ اور ہم نے ایک دوسرے کو خط لکھنے کی تاکید کی۔ تمام لڑکیوں نے بھی اس کو باولِ ناخواستہ خدا حافظ کہا۔ لیکن آہ۔ اس کے جانے کے چند روز بعد ہی ایک اور کھلا خط قانتہ کا آیا لکھا تھا کہ سیدہ میں نے جو خودکشی کا ارادہ کیا تھا اس کو پورا کر رہی ہوں۔ تم کو اس وقت خط ملے گا جب کہ میں دنیا میں نہ ہوں گی۔ لیکن میرے جذبات اور احساسات کا لحاظ کرتے ہوئے میں اپنے آپ کو قابلِ معافی تصور کرتی ہوں مجھے بھول جاؤ لیکن ہو سکے تو میرے جذبات اور خیالات کو ہمیشہ یاد کرنا خدا حافظ ؎

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

تم سے کبھی نہ ملنے والی قانتہ۔

سیدہ بدر رافعہ

علی گڑھ کے چند فارسی مخطوطات

گزشتہ فروری میں کانفرنس کے سالانہ جلسہ سے فراغ کے بعد حضرت قبلہ نواب صدر یار جنگ بہادر مدظلہ العالی کے ارشاد سے کتاب خانہ سلطان جہاں منزل کا فارسی ذخیرہ دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی۔ جناب ممدوح کا حکم تو یہ تھا کہ عربی اور فارسی کتابوں کی فہرست از سر نو مرتب کر دی جائے مگر میرے حیدرآباد لوٹنے میں صرف چار روز رہ گئے تھے۔ تین روز کی قلیل مدت میں سب کو فن وار ترتیب دینا اور مختصر سا مختصر نوٹ لکھنا بھی دشوار تھا اس لئے اپنے حالیہ مشغلہ اور دلچسپی کے لحاظ سے فارسی کتابوں میں جو نادر اور کمیاب نسخے نظر آئے خاص کر ان پر عاجلانہ مطالعہ کے بعد جیسے کچھ ذہنی نوٹس بن پڑے لکھ کر جناب ممدوح کی خدمت میں پیش کر دئے۔ میں جانتا ہوں کہ ان میں بہت کچھ اضافہ کی گنجائش ہے جس کو مجھ سے زیادہ فرصت اور قابلیت رکھنے والے اصحاب انشاء اللہ پوری کریں گے۔ پھر بھی اس ناچیز کی حوصلہ افزائی کے لئے جناب ممدوح نے از راہ بزرگانہ شفقت یہ عبارت تحریر فرمادی جس کو تبرک کے طور پر میں نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔

"میں نے فہرست ہذا پڑھی۔ کاوش اور تحقیق سے لکھی گئی ہے جس کی بابت شکر فہرست نگار منجانب کانفرنس ادا کیا جاتا ہے۔"

حبیب الرحمان سکریٹری

مندرجہ کتابوں پر میرے اپنے ترتیبی نمبر ہیں۔ کتاب خانہ کی فہرست میں ان کے نمبر اور ہیں۔ وَمَا تَوْفِیقِیٓ إِلَّا بِاللّٰہِ۔

محمد عبد الحمید خاں

---

(۱) مثنوی ولدی در بیان اسرار احدی۔

اس مجموعہ میں دو مثنویاں ہیں جو حضرت مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمۃ کے فرزند حضرت سلطان ولد کی تصنیف ہیں۔
پہلی مثنوی کا وزن "فاعلاتن مفاعلن فعلن" ہے۔
سلطان ولد نے اس کی جو وجہ تصنیف لکھی ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں زیادہ پر لطف ہو گی "غرض ــــ از انشاء اللہ مثنوی ولدی در بیان اسرار احدی آن بود کہ حضرت والدم و شیخم سلطان العلماء و العارفین جلال الحق والدین محمد بن محمد بن الحسین البلخی در مثنوی خود قصہ ہائے اولیائے گزشتہ را ذکر کردہ است و کرامات و مقالات ایشاں را بیان فرمودہ غرضش از قصہ ہائے ایشان اظہار کرامات و مقالات خود بود و ازاں اولیائے کہ ہمدل و ہمدم و ہم نشیں او بودند مثل سلطان الواصلین سید برہان الدین محقق ترمذی" و سلطان المحبوبین والمعشوقین شمس الدین تبریزی و قطب الاقطاب صلاح الدین زرکوب قونوی و زبدۃ الاولیا والسالکین حسام الدین چلپی ولد اخی ترک قونوی۔۔۔۔
احوال خود را و احوال ایشاں را بواسطہ قصہ ہائے پیشیناں اینجا درج فرمود

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

لیکن چوں بعضے را آں فطانت و زیرکی نبود کہ مقصود قصہ حال را فہم کنند و غرض او را بدانند دریں مثنوی مقامات و کرامات حضرتش و از ان مصاحبان کہ ہمدم او بودند۔۔۔۔۔۔ شرح کردہ شد تا مطالعہ

کنندگان و مستحقان را معلوم شود کہ ان ہمہ احوال او و مصاحبانش بودہ است تا شبہت و گمان از ایشان برود۔"

(ترجمہ ملخصاً) مثنوی ولدی در بیان اسرار خودی لکھنے کی غرض یہ تھی کہ حضرت والد نے اپنی مثنوی میں پچھلے اولیاء کے جو قصے اور ان کی کرامات و مقامات بیان کئے ہیں اس سے ان کا مقصد اپنے کرامات و مقامات اور ان اولیا کے (کرامات و مقامات) کا اظہار تھا جو ان کے ہمدل ہمدم اور ہم نشیں تھے (اس لئے) اپنے اور ان کے احوال کو پچھلے بزرگوں کے قصوں (کے پردہ) میں درج کیا لیکن چونکہ بعض لوگوں میں اتنی زیادہ سمجھ نہیں ہوتی کہ ان حالات اور (ان کو پردہ میں بیان کرنے کی) غرض کو سمجھ سکیں اس لئے اس مثنوی میں حضرت والد اور ان کے ہمدم مصاحبوں کے مقامات و کرامات کی تشریح کی گئی تاکہ پڑھنے اور سننے والوں کو معلوم ہو جائے کہ (قصوں کے پردہ میں بیان کئے ہوئے) حالات خود ان کے اور ان کے ہمنشینوں کے ہیں اور (ان کے متعلق) جو شبہات دل میں ہوں دور ہو جائیں۔

اس مثنوی کا آغاز ابتدائے ربیع الاول سنہ ۶۹۰ھ میں ہوا اور تکمیل اسی سنہ کی چوتھی جمادی الآخر کو یعنی دو مہینے میں ختم ہوئی۔

مطلع ایں بیان جاں افزا	بود در شش صد و نود یارا
گفتہ شد اول ربیع الاول	گر فزوں گشت ایں مگر طول
مقطعش ہم شدست اے فاخر	چارمین مہ جمادی آخر

دوسری مثنوی کی بحر وہی ہے جو مثنوی مولانا رومؒ کی ہے۔ اس کی وجہ تصنیف یہ لکھتے ہیں کہ:۔

بزرگے از بزرگان اہل دل بطریق اعتقاد و استدعا کرد و التماس نمود کہ بوزن الٰہی نامہ خواجہ سنائی رحمۃ اللہ علیہ کتابے انشا فرمودہ آید توقع است کہ بر وزن مثنوی خداوندگار مولانا قدس سرہ العزیز مثنوی انشا فرمائید جہت خواطر دوستاں کہ بآں وزن از خواندن بسیار خو کردہ اند و ایں وزن در ایشان نشستہ است کتابے دیگر بسیار تد زیرا کہ ہر نظم کہ گفتہ آید بطریق تتبع و تشبہ حضرتش بودہ است ہم بریں وزن آں کتاب ساختن اولیٰ بود زیرا کہ معنی متابعت و مشابہت دریں اجمل و اکمل ست۔ بموجب التماس ان بزرگ و جہت آنکہ "نے" بحضرت مولانا قدس سرہ العزیز مخصوص و منسوب ست ایں مثنوی را از "رباب" آغاز کردہ شد۔"

(ملخص ترجمہ) اس مثنوی کے لکھنے کا سبب یہ ہوا کہ ایک اہل دل بزرگ نے عقیدت مندانہ درخواست کی کہ خواجہ سنائی کی مثنوی "الٰہی نامہ" کے وزن پر تو آپ نے ایک مثنوی لکھ دی ہے (مگر) ہم کو امید ہے کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی مثنوی کے وزن پر ایک مثنوی اور لکھ دیں گے۔ ان احباب کی خاطر جو اس وزن (کے اشعار) ہمیشہ پڑھتے رہنے سے اس کے خوگر ہو گئے ہیں اور یہ وزن ان کے دل نشین ہو گیا ہے۔ (نیز) اس لئے کہ اب تک ہر نظم میں آپ نے حضرت مولانا کا تتبع اور تشبہ ملحوظ رکھا ہے اس وزن پر (دوسری مثنوی) لکھنے سے متابعت اور مشابہت کا مقصد زیادہ بہتر اور مکمل صورت میں پورا ہو جائے گا اس بزرگ کے التماس سے اور اس لئے بھی کہ (لفظ) "نے" حضرت مولانا رحمۃ اللہ کے ساتھ مخصوص و منسوب ہے اس مثنوی کو "رباب" (کے لفظ) سے شروع کیا گیا۔"

اس مثنوی کا آغاز سنہ ۷۰۰ھ میں ہوا اور تکمیل تقریباً ۸ مہینے میں اس سنہ کی ذی الحجہ کو۔

رو ولد خامش مکش ایں سر راز	گرچہ داری درون دریائے راز
غرۂ شعبان شد آغاز کتاب	در سنہ سبع مائتہ بہر ثواب

درمہ ذی حجہ شد ہم ایں تمام　　تا نماند بر خور معنی غمام

دونوں مثنویوں میں ہر نظم سے پہلے چند سطری نثر کے عنوانات ہیں جن میں ان چیزوں کی مختصر تشریح ہے جن پر اشعار میں خیال آرائی کی گئی ہے۔

دونوں کے شستہ اور پختہ الفاظ اور چست بندشیں مصنف کی کمال شاعری اور پختہ مشقی کی دلیل ہیں۔ پہلی مثنوی کا انداز بیان مولانا رحمۃ اللہ کی مثنوی سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ اگر دونوں کے اشعار ملا دئے جائیں تو فرق کرنا دشوار ہوجائے گا۔

پہلی مثنوی کے دیباچہ میں اپنی غزلیات اور ان میں حضرت مولانا کے خیالات اور اسلوب بیان کے ساتھ تشبیہ ملحوظ رکھنے کا بھی ذکر کیا ہے یہ مثنوی حجم میں دوسری مثنوی سے کم ہے۔

اس مجموعہ کی تقطیع متوسط ہے جدولیں کاغذ اور خط بالکل یکساں ہے چند صفحوں کے سوا جو بخط نستعلیق ہیں ساری کتاب نسخ میں ہے اور ایک ہی شخص کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے کاتب نے اپنا نام نہیں لکھا صرف تاریخ اور سنہ کتابت لکھ کر چھوڑ دیا ہے۔

" تمت الکتاب [illegible] روز [illegible] ہم ماہ محرم الحرام سنہ اثنین وستین وسبعمائۃ (۷۶۲ھ)

یہ مجموعہ ہر اعتبار سے قیمتی اور قابل قدر ہے۔

---

(۲) تحفۃ الاخبار۔

یہ مدراس کرناٹک اور میسور کے مقامی حالات کی عمدہ تاریخ ہے جس کو منشی غلام حسین خاں نے ایلیٹ صاحب گورنر مدراس کے عہد حکومت میں لکھا ہے۔ اس میں پانچ فصلیں ہیں۔

پہلی فصل میں ان روسائے کرناٹک کے حالات ہیں جو عہد عالمگیری سے ۱۲۱۵ھ تک برسر امارت رہے ہیں۔

دوسری فصل میں مدراس کے گورنروں اور ان کی طرز حکومت کا ذکر ہے۔

تیسری فصل میں انگریزی قوانین کے متعلق اظہار رائے کیا گیا ہے۔

چوتھی فصل میں انگریزوں کی معاملہ فہمی اور عدل و انصاف کا بیان ہے۔

پانچویں فصل میں کرناٹک کے قدیم جاگیرداروں اور باج گزار روساء کے حالات ہیں۔ یہ حالات و واقعات کس حد تک صحیح اور قابل اعتماد ہیں اس کا فیصلہ تاریخ داں ہی بہتر کر سکتا ہے۔

زبان صاف و رواں ہے۔ کاغذ قدیم سبزی مائل، خط عمدہ اور تقطیع بڑی، صفحات کی تعداد ۱۶۲ اور سنہ تصنیف ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۵ء۔ نسخہ کامل و بے عیب ہے۔

---

(۳) لغات عالمگیریہ۔

فہرست میں اس کا نام " مفتاح اللغات " غلط درج ہوا ہے مصنف " فاضل خان " امرائے عالمگیری میں سے ہے۔ غالباً دربار شاہی میں تحفۃً پیش کرنے کی غرض سے جیسا کہ دیباچہ میں اشارہ کیا ہے۔ تعانہ کا لتحفۃ والہدیہ

اے الملک الہام ..... ، لکہ کر اس کا نام "تحفۂ عالمگیریہ" رکھا ہے۔

یہ لغت کی ایک محققانہ اور مبسوط کتاب ہے۔ قرآن، احادیث، رجال، انساب کے لغات، فقرا کے ان محاورات کی تشریح جن میں علمار کو اختلاف رہا ہے، بہت خوبی سے کی ہے جن الفاظ کے ساتھ تاریخی واقعات یا مذہبی خیالات وابستہ ہیں ان کو پوری تفصیل اور جامعیت سے لکھا ہے۔ مصنف کو زبان اور بیان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ یہ کتاب کمیاب ہے۔ دیکھا تو نہیں سنا ہے کہ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں بھی ہے۔ تقطیع بڑی ہے کاغذ قدیم ختائی مگر خط زیادہ قدیم نہیں معلوم ہوتا۔ ناقص الآخر ہونے سے سنہ کتابت کا پتہ نہیں چلا۔

(۴) مکتوبات حضرت امام ربانیؒ

اس کتاب کا جامع اور مولف یار محمد بدخشی طالقانی ہے۔ بہت عمدہ اور بے عیب نسخہ ہے۔ محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں کسی امیر "ہدایت اللہ خاں" نامی کی فرمایش سے لکھا گیا۔ کاتب کا نام محمد بیگ ہے۔ سنہ و تاریخ کتابت غرہ رجب ۳ سنہ جلوس۔ آخری صفحہ پر سید غلام خواجہ جالی کی مہر اور انہی کے قلم کی لکھی ہوئی عبارت ہے۔

"بدست خود مہر کردم شب ۱۷ صفر المظفر ۱۱۵۷ ہجری"

(۵) تصحیح لغات فرس

یہ کتاب شاہ طہماسپ صفوی کے عہد کی تصنیف ہے۔ مصنف "حسین فانی" نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس کے لغات تین رسالوں سے ماخوذ ہیں جن میں سے ایک محمد بن محمد فخر الدین ہندو شاہ منشی نے خواجہ محمد غیاث الدین محمد رشید کے نام پر لکھا ہے۔ دوسرا شمس فخری نے امیر شیخ ابو اسحٰق بن امیر محمود شاہ انجو کے نام پر تیسرا شمس الدین محمد کشمیری نے۔ اکثر لغات کے شواہد میں اساتذہ کے اشعار بھی درج کئے ہیں۔ یہ لغت ہے تو مختصر سا مگر بہت مفید اور بصیرت افروز ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ایران میں تصنیف ہوا اور نہ فارسی کے اکثر مروجہ لغات ہندوستان میں تصنیف ہوئے ہیں۔

تقطیع چھوٹی کاغذ باریک اور خط پختہ ہے۔ ۱۰ شوال سنہ ۱۱۴۷ھ میں بمقام احمد نگر لکھا گیا ہے۔

(۶) درمجالس

مصنف "سیف مظفر برہان" یہ کتاب ۳۲ ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دس بابوں میں حضرت آدم علیہ السلام سے حضور سرور کائنات علیہ افضل التحیات تک انبیا کے فضائل ہیں۔ باقی میں مذہبی قصص و حکایات۔ کاتب کا نام محمد طاہر ابن محمد ابن شمس الدین محمد ہے۔ لاہور میں ۱۴ رجب سنہ ۴۶ جلوس عالمگیر بادشاہ لکھی گئی۔ نسخہ صاف اور خوشخط ہے۔

(۷) ابیات من کلمات الصوفیہ

یہ چھوٹا سا چھوٹی سی تقطیع پر قدیم چھپا ہوا رسالہ ہے جس کو مصنف نے کسی امیر عبداللہ خاں کے دربار تک رسائی کا وسیلہ بنانے کے لئے لکھا ہے۔ چھوٹی چھوٹی مدبثوں اقوال صحابہ اور کلمات صوفیہ کا مفہوم چار چار مصرعوں میں ادا

کیا ہے اوپر جلی خط میں حدیث یا قول صحابی یا کلمات صوفیہ لکھے ہیں اور ان کے نیچے چار مصرعے۔ دیباچہ عربی میں ہے جس کا صرف ایک ورق رہ گیا ہے اور کتاب کے آخر میں لگا ہوا ہے۔

شاعر کے نام تخلص اور زمانہ کا پتہ نہیں چلا۔ کلام کا انداز ایرانی ہے اور طباعت بھی وہیں کی معلوم ہوتی ہے۔

---

(۸) جنت الفردوس

مذہبی رسالہ ہے۔ اس کی ۳۱ فصلیں ہیں جن میں نماز قرآن خوانی صبر وغیرہ کے فضائل درج ہیں۔ کاغذ اور خط معمولی ہے۔ مصنف کا نام اور سنہ تصنیف معلوم نہ ہو سکا۔ صرف اتنا ظاہر ہوا کہ حاجی ابن ترک سلطان کمال الدین کے ایما سے لکھا گیا ہے۔

---

(۹) رسالہ در فقہ فارسی۔

اول اور آخر سے ناقص ہے۔ اس لئے مصنف کے نام اور سنہ تصنیف کا پتہ نہ چل سکا۔ صفحہ ۱۴۱ کے بعد والے دو صفحے غائب ہیں۔ نکاح وصیت اور قصاص وغیرہ کے مسئلے بحوالہ کتب وائمہ مختصراً لکھے ہیں۔ مسائل کے ضمن میں بعض ائمہ فقہ کے حالات بھی درج کر دیے ہیں۔ کاغذ حنائی قدیم اور رسم الخط نسخ ہے اور موجودہ صفحات کی تعداد ۲۶۱ ہے بہ حیثیت مجموعی رسالہ بہت اچھا اور کار آمد ہے۔

---

(۱۰) گمنام رسالہ۔

فہرست میں اس کا نمبر ۲۰ ہے۔ آگے گمنام لکھا ہوا ہے۔ اس مجلد میں پہلا رسالہ فقہی مسائل کا عربی میں ہے۔ جس کے نام اور مصنف کا پتہ نہ چلا۔ دوسرا رسالہ شیخ علی متقی کے رسالہ "العبارت النصیحۃ فی الواعظ والنصیحۃ" کا پہلا حصہ ہے۔ مصنف کا پورا نام علی بن حسام الدین مشہور بہ متقی ہے۔ جلد ساز کی غلطی سے صفحہ ۵ اور ۶ کے درمیان ۵ ورق کسی اور رسالہ کے آ گئے ہیں جو عربی میں ہیں۔ کاغذ چکنا اور قدیم ہے۔ تقطیع چھوٹی اور خط معمولی۔

---

(۱۱) بدایع الانشاء۔

اس کتاب کے سابق مالک عبدالغنی صاحب قادری ساکن گلکنڈہ (ریاست حیدرآباد دکن) نے سرورق پر ایک مختصر سے نوٹ میں داد تحقیق یہ دی ہے کہ "بادشاہ ہمایوں نے اپنے فرزند عزیز قرۃ العین رفیع الدین حسین کی تعلیم و تربیت کے لیے میر منشی یوسفی سے تصنیف کرائی" لیکن مصنف لکھتا ہے کہ:۔

"این رسالہ ایست مسمی بہ بدایع الانشاء مشتمل بر محاورات خطابی و جوابی کہ جہت فرزند عزیز قرۃ العین ... حسین طال عمرہ و صابر طالبان در تحریر عبارت و قید کتابت می آید"

اس عبارت کے انداز اور الفاظ کی نوعیت سے صاف ظاہر ہے کہ یوسفی نے اپنے ہی بیٹے اور دوسرے طلبہ کے لئے یہ انشاء لکھی ہے۔ ہمایوں بادشاہ کا کوئی بیٹا رفیع الدین حسین نامی نہ تھا۔

مقدمہ میں قابل مصنف نے "انشاء" کی تقسیم اس طرح کی ہے۔

فن انشا منقسم می شود بدو قسم یکے توقیعات کہ مضامین آں منطوی بر امثلہ و احکام سلاطین و حکام است و دیگر محاورات کہ تراکیب آں مواد و صور مکاتبات مفاوضات است۔

و محاورات منقسم می شود بہ سہ قسم از برائے آں کہ خالی از آں نیست کہ رتبہ مکتوب الیہ از کاتب بلند تر ست یا فروتر یا مساوی ست اگر بلند تر ست مواقعات گویند اگر فروتر ست رقاع و اگر مساوی ست مراسلات و ہر یکے ازیں اقسام ثلثہ منقسم می شود بہ خطابی و جوابی۔"

نمونہ کے طور پر جتنے خطوط اور مراسلات درج کئے ہیں ان میں الفاظ کا حسن انتخاب فقروں کا دروبست ان کی شستگی اور پختگی مصنف کی اعلیٰ قابلیت اور پختہ مشقی کا روشن ثبوت ہے۔ سنہ تصنیف مصنف کے ان اشعار سے ۹۴۰ نکلتا ہے۔

این نامہ کز دست فن انشا بہ نظام   کردہ خردش بدایع الانشا نام
تکرار کنی چو نام او را یک بار   شک نیست کہ رہ بری بسال تمام

بحساب جمل "بدایع الانشا" کے اعداد ۴۷۰ ہوتے ہیں جن کی تکرار سے ۹۴۰ھ نکلتا ہے۔

یہ کتاب بہت کمیاب ہے۔ یاد اگر غلطی نہیں کرتی تو اس کا ایک نسخہ صرف رامپور کے کتاب خانہ میں سنا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

صفحات کی تعداد ۲۶۲ ہے۔ افسوس ہے کہ اخیر کے ۹ صفحے آدھے سے آدھے دیمک کی نذر ہو گئے ہیں۔ کاغذ خانی قدیم اور دبیز ہے۔ خط نہایت عمدہ اور پختہ نستعلیق۔

---

(۱۲) خمسہ نظامی۔

اب تک جتنے خمسے نظر سے گزرے ان میں یہ خمسہ ہر لحاظ سے بہترین ہے۔ اس مجموعہ میں ۶ مثنویاں ہیں۔ مخزن اسرار۔ خسرو شیریں۔ لیلیٰ مجنوں۔ ہفت پیکر۔ سکندر نامہ۔ اور شرف نامہ۔ مثنوی ہفت پیکر میں (۱۲) رنگین تصویریں بھی ہیں جن کے رنگ و طرز سے معلوم ہوتا ہے کہ راجپوتانہ کے انداز میں بنوائی گئی ہیں۔ خط ایرانی ہے نہایت صاف اور بے عیب قلم کی شان اول سے آخر تک ایک ہے جدولیں طلائی ہیں۔ شروع کے دو صفحے ایرانی نقاشی اور نازک ترین بوقلم کاری کا بہترین نمونہ ہیں۔

مجموعہ کے آخری صفحہ پر کاتب نے اپنا نام اور سنہ کتابت لکھا تھا مگر کسی احمق نے کاتب کا نام اس طرح مٹایا ہے کہ پتہ چلانا ناممکن ہو گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"قد فرغ الکاتب عن تسوید ہذہ الکتاب بعون الملک الوہاب ثمت حضرت شیخ الاسلام قطب المحققین شیخ نظامی قدس سرہ العزیز علی ید العبد الضعیف الی رحمۃ اللہ الغنی .... غفر ذنوبہ وستر عیوبہ فی عاشر شہر ربیع الاول سنہ ۹۶۳ ثلاث و ستین و تسعمائۃ۔"

کاتب کی فطرت اور اس کی روایت کے خلاف ہے کہ وہ جا بجا تحریف نہ کرتا جائے۔ اس تحریف جا و بیجا میں بھی تو اتفاق سے شعر زمین سے اٹھ کر آسمان پر پہنچ جاتا ہے ورنہ اکثر و بیشتر تو آسمان سے کھنچ کر زمین ہی پر آ رہتا ہے۔

ان پانچوں مثنویوں کے جستہ جستہ مقامات خصوصاً وہ حصے جو جامعہ کے نصاب کے سلسلہ میں برسوں سے زیر نظر چلے آ رہے ہیں، بغور دیکھے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی کہ یہ مجموعہ متداول اغلاط سے پاک ہے۔

---

(۱۳) دیوان حافظ۔

سورت میں ایک مشہور امیر نواب غلام بابا خاں گزرے ہیں، جن کے نام مرزا غالب کے متعدد خطوط اردوئے معلی اور عود ہندی میں موجود ہیں۔ یہ بے نظیر نسخہ ان ہی کے کتاب خانہ کا ہے جو ۱۹۱۹ء میں مولوی انوار احمد زبیری مرحوم سفیر کانفرنس کو ان کے زمانہ قیام سورت میں نواب ممدوح کے پوتے نواب میر حفیظ الدین احمد خاں نے عطا کیا تھا۔ سرورق پر نواب میر غلام بابا خاں مرحوم سی آئی ای کی مہر ثبت ہے اور اس سے آگے صفحہ پر انوار احمد صاحب مرحوم کا لکھا ہوا یہ نوٹ ہے۔

"این نسخہ نادر دیوانِ حافظ از کتاب خانہ نواب میر غلام بابا خاں مرحوم سی آئی ای بہ اجازت نواب زادہ میر حفیظ الدین خاں صاحب گرفتم و داخل کتب خانہ سلطان جہاں منزل کردم۔"

خاکسار انوار احمد زبیری مارہروی مقام سورت

۲ر جنوری ۱۹۱۹ء

اس کے نیچے نواب میر حفیظ الدین احمد خاں نے یہ فقرہ لکھ دیا ہے۔

"بپاس خاطر محبی انوار احمد صاحب بخشیدم۔"

عاصی سید حفیظ الدین خاں

دیوان کے آغاز میں وہی دیباچہ ہے جو اکثر مطبوعہ نسخوں میں پایا جاتا ہے۔ آخری صفحہ پر ایک جگہ عبارت بے جوڑ ہوگئی ہے غالباً کاتب نے کچھ حصہ سہواً چھوڑ دیا ہے۔

تقطیع متوسط۔ کاغذ بہ رنگی مائل بادامی بہت دبیز۔ ہر صفحہ پر طلائی امثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی شایق امیر کے لئے لکھا گیا ہے تمام جدولیں رنگین اور طلائی ہیں۔ خط بہترین نستعلیق ہے۔ ابتدا کے ۱۲ صفحوں پر کہیں کہیں روشنائی اڑ گئی ہے بعض صفحات پر آب دیدگی کے نشانات بھی ہیں۔ کہاں اور کب لکھا گیا کس نے لکھا یہ کچھ پتہ نہ چلا۔ بہرحال نسخہ بہت قدیم اور نادر ہے۔

---

(۱۴) شرح قران السعدین۔

یہ حضرت امیر خسرو کی مشہور مثنوی قران السعدین کی نہایت بہترین شرح ہے جو بعض احباب کی فرمایش سے حضرت شیخ نور الحق محدث دہلوی نے لکھی ہے۔ یہ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند اکبر تھے۔

تیسیر القاری شرح صحیح بخاری کے سوا آپ کی اور تصانیف بھی ہیں جن میں سے ایک تحقیق الرویا عربی میں ہے۔ غیر مطبوعہ اور کمیاب ہے اس کا ایک نسخہ خانقاہ مجددیہ سرہند شریف میں موجود ہے۔ حضرت شیخ نور الحق حضرت امام ربانی علیہ الرحمۃ سے بیعت تھے۔ اور خرقۂ خلافت حضرت عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ سے لیا۔ مکتوبات امام ربانی (جلد سوم) میں مکتوب سوم "ان ہی کے نام ہے۔

اس شرح کو اول سے آخر تک حضرت شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ نے ملاحظہ فرما کر جا بجا جو کمی رہ گئی ہوگی اسے پورا کرایا ہے خود فرماتے ہیں۔

" القصہ تا بزیور قبول.......آن ادب آموز نکتہ سنج مزین نہ گردید بہ نظر اعتماد نہ سنجیدم و شائستہ اعتبار ندانستم و بر بسیارے از لطائف کہ از کوتہی اندیشہ بدآں نرسیدہ بودم آں رموز ال کل آگہی داد!"

اس کی تکمیل کی تاریخ حضرت نے خود تحریر فرمائی ہے۔

شکر للہ کہ با نجام رسید ۔۔۔ شرح ابیات قران السعدین
مشرقی از پئے تاریخ تمام ۔۔۔ برہ نعیم رفتی نہ بہ عین
چشم عیب ار زمیاں بردارند ۔۔۔ می شود " شرح قران السعدین "

شرح قران السعدین کے اعداد ۱۰۹۴ ہوتے ہیں۔ ان میں سے ع کے ۷۰ نکال دینے کے بعد ۱۰۲۴ رہتے ہیں۔
کاتب کے نام اور سنہ کتابت کا کہیں ذکر نہیں۔ تقطیع درمیانی ہے کاغذ خانی خط صاف اور پختہ کہیں کہیں کرم خوردہ ہے۔ بڑا نادر اور.......قیمتی نسخہ ہے۔

---

(۱۵) یوسف زلیخائے جامی۔

ولایتی کاغذ پر ایرانی خط میں لکھا ہوا نہایت خوشخط اور صاف ستھرا نسخہ ہے۔ اول اور آخر کے کچھ ورق غائب ہیں۔ بہت قدیم لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

---

(۱۶) منطق الطیر

اس مجموعہ کے متن میں تو حضرت شیخ فرید الدین عطار کی مشہور مثنوی منطق الطیر ہے اور حاشیہ پر پندنامہ کاغذ و کتابت معمولی۔

---

(۱۷) نمبر ۴۵ (مندرجۂ فہرست)

یہ مذہبی قصص و مباحث کا مختصر سا رسالہ ہے۔ مصنف کاتب یا سنہ کا نہ ابتدا میں ذکر ہے نہ اخیر میں۔

---

(۱۸) نمبر ۲۵ (مندرجۂ فہرست)

اس رسالہ کا نہ نام معلوم ہوسکا۔ نہ یہ کہ کس نے کب لکھا۔ زیادہ تر انبیاء علیہم السلام کے حالات اور عجائبات خلق مذکور ہیں۔

---

(۱۹) تفسیر حسینی۔

اس کی دو نوں جلدیں بہ خط نسخ ہیں۔ آیات سرخی سے لکھی گئی ہیں اور تفسیر سیاہی سے۔ پہلی جلد سورطہٰ پارہ تک

ہے۔ دوسری قل اعوذ برب الناس تک۔ سب سے اخیر کا ایک صفحہ غائب ہے۔ اس لئے سنہ کتابت وغیرہ کا پتہ نہ چلا۔ تقطیع بڑی ہے۔ کاغذ حنائی، چکنا اور مضبوط۔

---

(۲۰) الحمد فی الحمد۔

یہ کتاب ابوبکر سعد زنگی والی شیراز (۶۲۳-۶۸۰) کے عہد کی تصنیف ہے۔ مصنف نے اس دور کے مسلمانوں کی ضعیف الایمانی اور اسلامیات کی طرف سے غفلت ولاپروائی کا شکوہ کرتے ہوئے ایسی کتابوں کی ضرورت پر زور دیا ہے جن میں تمام ضروری اعتقادی مسائل صاف اور آسان زبان میں لکھے گئے ہوں۔

ابوبکر سعد زنگی کے نام پر معنون کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے

"تاوقع ان در دلہائے عوام افزوں تر باشد وخطر ان در دیدہ ہا بحکم تقلید بزرگ تر ازیں وجہ آن را بہ ذکر بندہ برگزیدہ خدا بہ بادشاہی بقیہ صالحہ ملوک وسلاطین اسلام، بادشاہ نیازمند دین ترحم دل درویش نواز سلغر سلطان اتابک ابوبکر سعد زنگی کہ ہموارہ در نظر و کنف خدائے باد معنون گردانید"

سرورق پر مصنف کا نام امام توریشی یا توربشتی لکھا ہوا ہے۔ کتاب میں تین باب ہیں اور ہر باب میں دس فصلیں۔

باب اول۔ در ایمان بخدائے عزوجل۔

باب دوم۔ در ایمان بہ فرشتگان وکتابہا وپیغمبران۔

باب سوم۔ در مسائل اعتقادی بر موجب کتاب سنت واجماع امت۔

مسائل آسان اور مدلل عبارتوں میں لکھے ہیں۔ اس نوعیت کی کتابیں بہت کم دیکھنے میں آئیں۔ کس سنہ میں لکھی گئی اس کا پتہ نہیں چلا۔ خط صاف اور عمدہ ہے۔ صفحات کی تعداد ۲۴۲ ہے۔

---

(۲۱) مظہر الحق فی اباحۃ السماع۔

یہ رسالہ کمال صفی حسینی قزوینی کی تصنیف ہے جو سید السادات حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے معتقدین میں سے تھے۔ ناواقف لوگوں کو روایات اور اصطلاحات فقرا کے ورد وانکار سے بچانے کے لئے لکھا گیا ہے۔ خط پختہ و نستعلیق ہے۔ آخری چند صفحے ضایع ہو گئے ہیں۔ اس لئے سنہ کتابت وغیرہ کا پتہ نہ چلا۔

---

(۲۲) کلیات حزیں۔

اس مجموعہ میں پہلے قصائد ہیں پھر بہ ترتیب ابجد غزلیات۔ غزلوں کے بعد رباعیات و قطعات ہیں۔ سنہ کتابت وغیرہ کا پتہ نہ چل سکا۔ بظاہر بہت زمانہ کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے شروع کے دو صفحوں پر خود شیخ حزیں کا مولفہ دیباچہ ہے۔ کاغذ ولایتی ہے۔ کم آسفید۔ خط نستعلیق۔

---

(۲۳) نزہتہ الارواح۔

مصنفہ رکن الدین حسین ابن عالم بن ابوالحسین حسینی۔ تصوف وسلوک میں ہے۔ ۲۸ فصلیں ہیں۔ جن میں مبدا رسلوک معرفت سلوک مقامات سلوک نصیحت سالک ہدایت خلقت وحدت اور نفس وغیرہ کے مباحث ہیں۔

عبارتیں مغلق اور موٹے موٹے لغات سے بھری ہوئی ہیں۔ آخری صفحہ کی تھوڑی سی عبارت ملاحظہ ہو:۔

"مصنف این بدیع لطائف ومولف این غرائب وطرائف فقیر حقیر حسین بن عالم بن ابی الحسن الحسینی..... کہ این غرائفین ابکار یعنی نفایس افکار......... این ضعیف اندبعد ازاں کہ از مند مستقر فطرت بستودع خلقت نزول کردہ انداز کمال طراوت ونہایت لطافت بغایتے رسید کہ صیانت در شہور سنہ احد عشر و سبعمائتہ (۷۱۱) مشاط نشاط فکر بر بساط این بساط کوشش وگردن ہر یک را بزیور فصاحت و بلاغت مفرط موشح ساخت"

عبارت مذکورہ میں سنہ تصنیف ۷۱۱ بتایا گیا ہے۔ کتاب دبیز بادامی کاغذ پر ہے۔ تقطیع متوسط اور خط معمولی ہے۔ آخر سے چند صفحات غائب ہیں۔

---

(۲۴) الجمعات الشاہیتہ جلد ششم۔

اس کتاب میں نویں صدی کے ایک برہانی رفاعی بزرگ سید محمد بن عبداللہ مخاطب بہ شاہ عالم کی ہفتہ وار صحبتوں کے حالات اور افادات کو کسی معتقد نے جو اپنے آپ کو "جامع کنوز محمدیہ" "جامع ملفوظ مبارک" اور "جامع ملفوظات محمدیہ" کے لقب سے یاد کرتا ہے جمع کیا ہے۔ زیر نظر حصہ یکم محرم ۸۸۴ھ روز جمعہ کے مذاکرے سے شروع ہوکر ۲۰ ذی الحجہ سنہ مذکور کے جمعہ پر ختم ہوا ہے۔

ہر جمعہ کی صحبت میں شیخ برہان الدین ملقب بہ میاں مخدوم قاری خاص اور جامع کنوز محمدیہ کا ذکر ضرور آیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ بالالتزام حاضر مجلس رہا کرتے تھے۔ کہیں کہیں خواجہ کریم الدین اور شیخ فرید بن ولت شاہ کا بھی ذکر ہے۔ ایک جمعہ کی مجلس میں باشندگان احمد آباد کے ہجوم کا ذکر بھی ہے۔ اس لئے قیاس ہوتا ہے کہ یہ صحبتیں احمد آباد میں ہوا کرتی تھیں۔

اس حصہ میں برہانی (غالباً منسوب بہ قطب عالم سید برہان الدین) کے خاندان مختلف شاخوں کے ۴۴ شجرے درج ہیں اور چند رسالے جہاد وغیرہ کے متعلق ہیں۔

حضرت قطب عالم کے متعلق حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار (مجتبائی) کے صفحہ ۱۶۰ پر لکھتے ہیں "حضرت قطب عالم نبیرۂ مخدوم جہانیاں سید جلال بخاری ست از وطن اصلی خود بہ گجرات رفتہ توطن اختیار کردہ نام او سید برہان الدین ست و مشہور در زبان خلائق ان دیار بہ قطب عالم است۔ روضہ او سہ کروہی از احمد آباد ست۔ وفات او ہشتم ذی الحجہ سنہ سبع و خمسین و ثمان مائتہ است۔"

وقت کی تنگی کے باعث کتاب کو بالاستیعاب دیکھنے کا موقعہ نہ ملا۔ جستہ جستہ جن عنوانوں پر نظر پڑی ان میں سے چند یہ ہیں۔

حقیقت فکر۔ اثبات رویۃ ملائکہ۔ قلب سلیم۔ روز قیامت۔ مناقب صحابۂ کرام۔ صبر و شکر۔ مراقبہ۔ عبودیت۔ استقامت۔ فراست۔ فتوت۔ حقوق والدین۔

ان میں سے ہر ایک پر حضرت شاہ عالم کے ارشادات بڑے عالمانہ اور محققانہ ہیں۔ جامع کتاب ہر موقع پر جن القاب اور جس ادب و احترام سے ان کا نام لیتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موصوف بڑے بلند پایہ عالم اور بڑے عالی مرتبہ صوفی تھے اور خواص و عوام سب ان کا انتہائی ادب کرتے تھے۔

فرصت سے بغور مطالعہ کرنے والے کو اس کتاب میں ایسے مسائل ملیں گے جن کو زوائد سے الگ کر کے اگر ایک جا کر دیا جائے تو تصوف سے ذوق رکھنے والوں کے لئے بہت مفید اور دلچسپ ثابت ہوں گے۔

کتاب میں نہ کہیں جامع کا نام ملا نہ کاتب کا نہ سنہ کتابت۔ البتہ سرورق پر ان اصحاب کے نام مع سنین کے درج ہیں جن کے قبضہ میں نسخہ رہ چکا ہے۔

۱۔ من نعم اللہ علی عبدہ ابن شیخ بہاء الدین۔

۲۔ الملک لله، آل بیت النبوی ابوالحسن الحسینی نقشبندی مہر میں ہے۔ خادم درگاہ ابوالحسن دیوانہ۔ ۱۱۵۸ھ۔ خادم ابوالحسن درگاہ دیوانہ۔

۳۔ رسالہ ہائے حضرت شاہیہ از کتاب خانہ نواب نیک عالم خاں خواجہ عباد اللہ ہدیہ گرفتہ در ہراج بتاریخ غرہ جمادی الاول ۱۱۸۷ھ۔

۴۔ این رسالہ جمعات شاہیہ جلد ششم از خواجہ عباد اللہ نانیا الحال فقیر حقیر حسین الدین حسینی بتاریخ غرہ جمادی الثانی ۱۱۹۰ھ ہدیہ گرفتہ مہر میر حسین الدین ۱۱۶۴ھ۔

عبدالحمید خاں

(مسٹر رشید قریشی ایم اے حیدرآباد کے کامیاب نوجوان افسانہ نگار ہیں۔ آپکے افسانوں کا مجموعہ "من کی دنیا" ادارہ ادبیات اردو سے شائع ہو کر بہت مقبول ہوا۔ اب آپ ایک دوسرا مجموعہ مرتب کر رہے ہیں) ادارہ

جھنکار

فاروق اپنی خالہ زاد بہن فیروزہ کے ساتھ اب کھیل میں شریک ہوتا تو اس کا دل دھڑکتا رہتا۔ فاروق کی شریر آنکھیں کیسی مداتی معلنڈری اور کھوجی ہوگئی تھیں۔ اُف ایک رات اس نے وہ خواب بھی تو دیکھا تھا۔ گڑیوں کی شادی کا نقشہ جما تھا اور تو یہ ہے کیسی شرم کی بات گڑیا کی جگہ وہ خود دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اور فاروق...... فیروزہ کا دل سنسنا اٹھا۔ اور پسینے بھی ٹھنڈے۔ مدہوش کرنے والے۔ اسی زمانے میں چھوٹے چچا وہ ریکارڈ لے آئے تھے جس میں کئی عورتیں مل کر گاتی ہیں: "کرلو محبت کرلو" چھوٹے چچا تو ریکارڈ کے ساتھ خود بھی گانے لگتے۔ پر فیروزہ کیا کرتی بے چاری۔ اور اس دن جو چھوٹے چچا اپنی ہونے والی سسرال چلے گئے تھے۔ اس کی کیسی درگت بنی تھی۔ چھوٹے چچا وہ ریکارڈ اپنے ساتھ لیتے گئے تھے۔ لیکن اس کی ایک ہلکی سی گونج فیروزہ کے دل میں بھٹکتی رہ گئی تھی۔ چھوٹے چچا کی شادی کا دھیان...... اور اس کے بعد اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کے چاروں طرف عورتیں ہی عورتیں جمع ہیں اور اسی گانے کا شور مچ رہا ہے۔ کوئی اس کے اندر بھی گانے لگا: "کرلو محبت کرلو"

فیروزہ نے گھبراہٹ کے عالم میں آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ فاروق...... اور فیروزہ کی نظروں نے وہی گیت فاروق کو بھی سنا دیا۔ دھک۔ دھک۔ کرلو محبت کرلو۔ فیروزہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اب وہ فاروق کا سامنا کرتے ہوتے جھجکی جا رہی تھی۔ پلو کی آڑ کافی نہ ہوئی تو دروازے کے پٹ نے پناہ دی۔ اپنوں کی یہ اجنبیت۔ کیسی دلچسپ۔ کیسی عجیب تھی۔ بچپن کا معصوم بندھن جوان امنگوں کی تاب نہ لا سکا۔ پہلی ہی نظر میں ٹوٹ گیا۔ اور ایک انوکھا جذبہ دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کر رہا تھا۔ دور بھی...... فیروزہ دور ہٹتی گئی۔ دروازے کی آڑ کتنی ناقابل عبور آڑ ہوتی ہے۔ کوئی فاروق کے دل سے پوچھے۔ اسے تو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے فیروزہ نہ تھی۔ کوئی آسمانی مخلوق تھی۔ زمین پہ آئی پھر آسمان پر چلی گئی۔ مگر وہ آسمان سے تارے کو توڑ لانا چاہتا تھا۔ اس کا دل اچھل اچھل کر اسے دروازے کی طرف ڈھکیل رہا تھا۔ اور فیروزہ کی جھانکتی ہوئی آنکھیں اس کے قدموں میں بچھی جا رہی تھیں۔ آج اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ دلوں کے میل کو رتبہ اور دولت کی حد بندیوں سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اس کے ماں باپ دولت مند اور فیروزہ غریب ہے۔ تو اپنی امارت داری پر اکڑتے ہوئے غریب نصیب فیروزہ سے انجان کیوں رہا جائے۔ فیروزہ کو دولت اور حیثیت کی خاطر گنوانا کتنی بڑی بھول ہوگی۔ اس نے اپنے باپ کے تاکیدی احکام کی تعمیل میں اپنی خالہ کے ہاں آنا جانا جو چھوڑ رکھا تھا۔ آج اس کی غلطی دروازے کی آڑ کی صورت میں اس کا راستہ روکے کھڑی تھی۔

"فیروزہ ہم سے پردہ کر رہی ہو؟" اس نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا۔ فیروزہ کیا جواب دیتی دروازے کے پٹ کو خفیف سی حرکت ہوئی۔ چوڑیاں جھنکیں۔ اور فاروق کے دل میں ہزاروں جگنو ٹمٹمانے لگے۔ فیروزہ کی ماں کے قدموں کی آواز نے اس طوفانی کش مکش میں سکون کی لہریں دوڑا دیں۔ "خالہ بی۔" یہ فیروزہ کی ماں مسکرانے کو تھیں کہ ان کی بھنویں پیشانی کی طرف کھنچ گئیں مسکراہٹ کی یہ ہلکی سی کرن حزن و ملال کے بھنور میں بجھ کر رہ گئی۔ فیروزہ کے چہرے کی تمتماہٹوں اور اس کی خود فراموشیوں کو بھانپ گئی تھی۔ وہ اس بوجھ سے جس قدر جلد ہو سکے سبکدوش ہو جانا چاہتی تھی۔ لیکن جہیز میں سوتے کے پازیب اور دوسرے مطالبوں کی تکمیل بھی تو ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لئے کوئی اچھا پیام جمتا نہ تھا۔ فاروق کے پاسنگ کا کوئی لڑکا تو انھیں ڈھونڈے سے نہ ملتا تھا۔

انھیں یقین تھا کہ فاروق کے اصرار پر ماں باپ اس رشتہ کو ہرگز پسند نہ کریں گے۔ لیکن وہ پھر سوچنے لگتیں۔ شاید فاروق کے اصرار پر مان جائیں۔ شاید فیروزہ کی قسمت اس کی طرح حسین ہو۔ انھوں نے فاروق کی آمد و رفت کو خطرناک تو ضرور محسوس کیا، پر فاروق کے ساتھ ان کے سلوک میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہ ہوا۔

فاروق روز آنے لگا۔ وہ نت نئی آن بان کے ساتھ آتا۔ دولت مند ماں باپ کی دولت اولاد کے حوصلے پورے نہ کرے تو یہ حسین تلفیاں کب رنگ لائیں گی۔ فیروزہ تو ویسے ہی فاروق کی طرف مائل تھی۔ اب اس کی دولت نواز وابستگی نے تو اس کے دل کو سارے سہاروں سے توڑ لیا فیروزہ کا دل فاروق کے قدموں میں آگرا۔

ایک دن باتوں باتوں میں فیروزہ کی ماں نے پوچھ ہی لیا۔ بیٹی فاروق بڑا اچھا لڑکا ہے۔ مجھے پسند ہے۔ فیروزہ نے شرما کر سر جھکا لیا۔ مگر بیٹی ایک بات پوچھتی ہوں۔ فاروق نے کبھی شادی کا ذکر بھی چھیڑا ہے۔ فیروزہ جواب دیئے بغیر اپنے کمرہ میں چلی آئی۔ ایک تشویش ناک سنسنی اس کے دماغ میں کسی موذی کیڑے کی طرح بھنبھناتی ہوئی گھس پڑی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ آج وہ فاروق کے ساتھ سینما جائے گی۔ آج تک اس نے اس کی اس خواہش کو ہمیشہ ٹال دیا تھا۔ پر آج تو اسے جانا ہی ہوگا وہ سینما ضرور جائے گی اور وہیں اسے فاروق کے رجحانات کا پتہ چل جائے گا۔

سینما سے واپس ہونے کے بعد فیروزہ جب فاروق کی موٹر سے اتری تو اسے پہلی بار اپنے پیروں تلے زمین کی سخت اور کھردری سطح کا احساس ہوا اور جب فاروق کی موٹر کا شور دھیمے دھیمے بے آواز ہو گیا تو اسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ زمین سے ابھر کر آسمان کی نظر نہ آنے والی بلندیوں میں کھو گئی اور پھر ان بلندیوں سے پستیوں کی طرف ڈھکیل دی گئی۔ وہ روتی رہی۔ انسان کی فیروزہ کہ زندگی بھر میں جتنے آنسو وہ بہا سکتی تھی ایک ایک قطرہ کر کے اس کے تکیہ میں جذب ہو گئے۔ اس کا دل اس بچہ کی طرح دہشت زدہ اور مجرمانہ ندامت کے زیر اثر لرز رہا تھا۔ جس نے دیا سلائی کے کھیل میں گھر کو آگ لگا دی ہو۔

فاروق۔ فیروزہ کا نہیں۔ نہیں نہیں سینما کے سارے تماشائیوں نے پکار پکار کر کہا۔ پردۂ سیمیں کے اداکاروں نے چیخ چیخ کر کہا اور خود فاروق نے کہہ دیا۔ "فیروزہ میں تم سے محبت کی بھیک مانگتا ہوں۔ میں مجبور ہوں میں ان بندشوں کو نہیں توڑ سکتا محبت ان ڈھکوسلوں سے بے نیاز ہے۔ لیکن تم میری مجبوریوں کو سمجھو مجھے ٹھکراؤ نہیں۔ فیروزہ سوکھی گھاس کی طرح سلگ اٹھی۔ "فلم کی طرح آپ مجھ پر کچھ خرچ کر کے اپنی دلچسپی کا سامان ڈھونڈ رہے تھے۔ مجھے خبر نہ تھی۔ میرے دل سے کھیل رہے تھے۔ اور میری تباہی کی پیش بندیاں کی گئی تھیں۔ مجھے علم نہ تھا۔ دغا باز۔ فریبی۔ اس کے بعد جو فیروزہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ بارش کے قطروں سے لدی ہوئی ٹہنی کی طرح رو پڑی۔ فاروق مجھے تمھاری دولت نہیں چاہیے۔ مجھے یوں بیچ راستہ میں اکیلا نہ چھوڑ جاؤ۔ چلو اس دنیا ہی کو چھوڑ جائیں۔ جہاں انسانوں کو درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اور دل پاؤں تلے روندے جاتے ہیں۔ کیا تم میری بات نہ مانوگے۔ فاروق نہ فاروق نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور فیروزہ رنگ برنگ کے دلفریب اجالوں میں سے نکل کر بھیانک اندھیروں میں کھو گئی۔ اس پہلی ہی ٹھوکر نے اس کے شیرازۂ حیات کو درہم برہم کر دیا۔ فیروزہ اپنی ماں سے بھی سارا حال کہہ چکی لیکن وہ فاروق کو شادی پر رضامند کر لینے کے سوا اور کیا مشورہ دے سکتی تھی۔ پر کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ ایک۔ غریب لڑکی کو کسی نوجوان کا من جیتنے کے لئے کیسی کٹھنائیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔

مجبوریاں، ماں بیٹی کی مجبوریاں۔ گہرے کھڈوں کی طرف انھیں دھکیلیں رہی تھی۔ اور وہ بڑھتی ہی گئیں۔ فاروق کا آنا جانا اب بہت کم ہوگیا۔ کچھ دن بعد تو یہ کبھی کبھار کا آنا بھی بند ہوگیا۔ ایک فیروزہ نہ ہوئی تو کیا۔ فاروق کے ماں باپ کی دولت اس کے لئے ہر روز حسن اور جوانی کی خریداریاں کرسکتی تھی۔ آنکھیں بھٹک جاتی ہیں تو دل بھی ڈانواں ڈول رہتا ہے۔ فاروق اس چوٹ کو سہہ جانے کے لئے بیباک جو ہوا تو رنگ رلیوں کی فضاؤں میں اتنی اونچی اڑان مار گیا کہ اس کے ماں باپ کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہوئی۔ صاحب جائداد ماں باپ کے بیٹوں کو کون بیٹی نہیں دیتا۔ ایک معزز اور لکھپتی سیٹھ کی بیٹی سے فاروق کی نسبت قرار پا گئی۔ فیروزہ کے لئے یہ خبر ایک ایسی افتاد تھی جس نے اس کے ارادوں اور منصوبوں کے محل کو ڈھا دیا۔ اب وہ کیا کرے۔ لیکن وہ زہر نہیں کھائے گی۔ کنوئیں میں ڈوب نہ مرے گی۔

اس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن اس کی شخصیت زندگی کی سانسیں لے رہی تھی۔ وہ زندہ رہے گی اور تقدیر کے تھپیڑوں کے مقابل ڈٹی رہے گی۔ اچھا ہوتا جو وہ مر جاتی۔ جینے کا ایسا مجنونانہ عزم بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ یہ ایسا تیر ہوتا ہے جو ذرا سے بھٹکا ہوا کسی نشانہ کی طرف نہیں بے مقصد ہی چھوٹ جاتا ہے۔ پھر جو بھی اس کی زد میں آجائے —— فاروق کی شادی ہوگئی۔ شادی کے کئی مقصد ہوتے ہیں۔ فاروق نے اپنی پسند کے ٹھکرائے جانے کے بعد صرف ماں باپ کی خوشی پوری کی تھی۔ اب اس کے بعد ماں باپ کی عزت کو پھر خطرہ لاحق ہوگیا۔ فاروق اپنی پچھلی ڈگر پر چل پڑا۔ ڈانٹ ڈپٹ ہوئی۔ زری فراہمیوں پر روک تھام کی گئی۔ لیکن فاروق کو نہ سنبھلنا تھا نہ سنبھلا۔ فاروق کی بیوی کو شوہر کی بے راہ روی کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اس کی مرضی کو کسی نے قابل اعتنا سمجھا تھا۔ اب وہ فاروق کو اپنے لئے کیوں روک رکھے۔ وہ سب کچھ دیکھتی پر اس طرح بے تعلق رہنا چاہتی تھی جیسے قیدی قید خانے کے داروغہ سے۔

فیروزہ کے لئے ایک بوڑھے جاگیردار صاحب کا پیام آیا تھا۔ خاصے مالدار آدمی تھے۔ بڑی ڈیوڑھی میں رہتے تھے۔ انھیں جہیز کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ صرف ایک جوان لڑکی درکار تھی۔ جسے وہ اپنی بیوہ چھوڑ جانا چاہتے تھے۔ تھوڑی سی ہیری پھیری کے بعد ان کی شادی فیروزہ سے ہوگئی۔ حکیم صاحب کا علاج ابھی مکمل نہ ہونے پایا تھا کہ جاگیردار صاحب چل بسے۔ وہ اس شادی کے انتظار ہی میں زندگی کی گھڑیاں گزار رہے تھے۔ بیوگی ایک سانحہ جانگداز ہے عورت کے لئے موت ہے۔ لیکن فیروزہ کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ حصہ بخروں کے بعد جو کچھ بھی فیروزہ کے پلے پڑا اس کی امیدوں سے زیادہ تھا۔ وہ اب امیر ہوگئی تھی۔

جوان بیوہ اور مزدور۔ ان دونوں سے ہمیشہ اندیشہ لگا رہتا ہے۔ محلہ والوں کی رائے ہوئی کہ فیروزہ دوسرا عقد کرلے۔ محلہ کے ایک نوجوان نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ چہرے سے تعلیم یافتہ تھے۔ شکل و صورت میں بھی برے نہ تھے۔ فیروزہ ماں کے اصرار پر راضی ہوگئی۔ اور تجمل اس کی زندگی میں اس طرح داخل ہوا جیسے کوئی بڑی رقم کا چیک بھنانے کے لئے بنک میں۔ پہلے ہی دن اس نے اپنی بہن کی شادی کے قرضہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ فیروزہ سے کوئی چاہتا اس کی جان مانگ لیتا۔ لیکن روپیہ پیسہ کے معاملہ میں وہ بے حد محتاط ہوگئی تھی۔ اس نے تجمل کو ملازمت کا مشورہ دیا تو تجمل نے یقین دلایا کہ فلاں جو ہیں انھوں نے قسمیں کھائی ہیں۔ فلاں جو ہیں میرے دوست ہیں۔ فلاں جو ہیں انھوں نے وعدہ کیا ہے اور اب کوئی دن جاتا ہے جو مجھے ایک اونچی کرسی پر ٹانگیں جھلاتے ہوئے مکھیاں مارنے کا حکم مل جائے گا۔ فیروزہ ان اڑان گھاٹیوں میں آنے والی نہ تھی۔ اس نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ

اگر تم نے میری دولت کے لیے شادی کی ہے تو بھول کی ہے۔ میری دولت میری زندگی ہے۔ یہ دولت میرے مرحوم شوہر کی نشانی ہے۔ یہی میرا شوہر ہے! میری دولت! مجمل چند دن بعد بغیر کچھ کہے سنے گھر سے غائب ہو گیا۔ اور اس کے بعد فیروزہ کے گلے میں ست لڑا کبھی نظر آیا۔

فاروق نے بیوی کے زیورات کو بھی اپنے مشاغل کی نذر کیا۔ اور ایک ایسی تلاش زندگی گزارنے لگا جو موت کی آرزو میں سرگرداں تھی جس نے اپنوں سے ناتہ توڑ لیا تھا جس کا اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ ماں کے انتقال نے فیروزہ کو ایک تیز روندی کی ساحلی چٹان کے سرے پر پہنچا دیا اب اس مقام سے پھلانگ اُل تھی۔ لوٹنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ وہ بیمار رہنے لگی۔ اور ناکامیوں کے چھلکتے ہوئے داغوں نے اسے کھوکھلا کر قبل از وقت بوڑھا کر دیا۔ ایک دن اس نے اپنے چھوٹے چچا کو بلوا بھیجا اور اس سے فاروق کے بارے میں دریافت کیا۔ فاروق کی تباہ حالی سے کون واقف نہ تھا۔ فیروزہ کا سارا حال سنتی رہی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل گئی۔

جیسے اس کے نزدیک فاروق خود اپنی تباہی کا ذمہ دار ہو۔ چھوٹے چچا جانے لگے تو اس نے آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ میرا وقت اب قریب آ گیا ہے۔ چھوٹے چچا کہیں فاروق سے ملنا ہو جائے تو اسے میرے پاس بھیج دیجئے۔ فیروزہ اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ وہ کتنی بدل گئی تھی۔ بچپن کی فیروزہ۔ جوانی فیروزہ سے مختلف تھی اور یہ بستر پر پڑی ہوئی بیمار فیروزہ تو پہچانی ہی نہ جاتی تھی۔ اس کی زندگی قبر سے پہلے اس کے دل میں دفن ہو چکی تھی۔ فیروزہ کی آنکھیں دروازے کی آہٹ پر کچھ کھلنے لگیں۔ فاروق کا دھندلا چہرہ اسے نظر آنے لگا تو فیروزہ کے ہونٹ مسکرانے لگے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے اپنے چہرہ پر آنچل ڈال لیا: "مجھ سے پردہ کرو گی" فاروق نے سسکتے ہوئے کہا: "فاروق میرے قریب آؤ .... فیروزہ نے اپنے سرہانے سے ایک گٹھڑی نکالی "سنو تم نے مجھے غریب جان کر ٹھکرا دیا۔ تمہارے جانے کے بعد میں نے آپ کو بیچ کر یہ دولت اکٹھی کی ہے۔ میرے قریب آؤ۔ میں امیر ہوں اب۔ لو یہ شاید تمہارے کچھ کام آ سکے۔ فیروزہ کا کمزور ہاتھ اس وزن کو تھام نہ سکا۔ گٹھڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ چھن۔ سونے چاندی کے سکے اور زیورات بستر کی چادر پر بکھر گئے۔ اس جھنکار میں کسی کے دل کی ناتوان دھڑکن فریاد بن کر ڈوب گئی۔ فاروق آگے بڑھنے لگا۔ بلنگ کے قریب پہنچ کر اس نے فیروزہ کے چہرے پر سے آنچل ہٹا دیا۔ فیروزہ کی زندگی ایک مسکراہٹ بن کر اس کے ہونٹوں سے چپکی رہ گئی تھی۔ اس مسکراہٹ کی اوٹ میں غم و اندوہ کے کتنے امڈے ہوئے طوفان دم توڑ چکے تھے۔ کتنے آنسو۔ کتنی فریادیں۔ کتنی ہچکیاں گھٹی ہوئی تھیں۔

(حیدرآباد ریڈیو سے نشر کیا گیا)

رشید قریشی

حیاتِ محمد قلی قطب شاہ

از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ

اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر اور شہر حیدرآباد کے بانی کی یہ سوانح حیات جدید ترین انداز میں مرتب کی گئی ہے۔ اس کی خصوصیات کا اندازہ اردو کے چند مشہور ادیبوں کی حسب ذیل آراء سے ہوگا۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی قدرت نے اس کام کے لئے ڈاکٹر زور کو چن لیا اور انھوں نے اس موضوع پر لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ خادم زبان و ادب ہونا تو ان کا پہلے ہی سے مسلم تھا۔ مورخ وہ اب نکلے۔ کتاب قابل دید ہے مفصل بھی، جامع بھی اور بقدر امکان مستند بھی۔ مورخانہ شان ادبی آن دونوں موجود۔ ہر عبارت سلجھی ہوئی اور شستہ۔ ہر بحث سنجیدہ اور شائستہ۔ (صدق ۳۰ دسمبر ۱۹۴۰ع)

مولانا نیاز فتحپوری پروفیسر زورؔ کی یہ تالیف دونوں حیثیتوں سے مکمل ہے۔ یہ تصنیف فن سیرت و انتقاد کے موجودہ اصولوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔ ہر حیثیت سے معیاری چیز ہے۔ جس محنت و سلیقہ سے کام لیا ہے اس کی جتنی تعریف کیجائے کم ہے۔ (نگار دسمبر ۴۰ء)

مولوی قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر پیام سوانح حیات لکھنے کا ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے۔ اور اس لحاظ سے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر زورؔ کی یہ علمی اور تحقیقاتی کوشش اہل علم اور عوام کے حلقوں میں قدر کی نظر سے دیکھی جائے گی۔

حکیم یوسف حسین صاحب ایڈیٹر نیرنگ خیال لاہور یہ علمی کتاب دیکھ کر دل کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔ ہمارے خیال میں اردو زبان میں اتنی اچھی کتاب کئی سالوں بھی شایع نہیں ہوئی ہوگی۔ اس کی تیاری میں بلا شبہ سیکڑوں پرانی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا اور کئی سال صرف کردیئے ہوں گے۔

پروفیسر ہارون خاں شروانی یہ کتاب تاریخ ادب اور تاریخ سیاسی میں ایک گراں قدر اضافہ ہے اس زمانے کے تمدن کو نہایت صاف اور واضح کر کے رکھ دیا ہے۔ تاریخی تنقیدی حصے بھی نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔

(صفحات ۵۰۰ سے زیادہ تصویریں عکسی ۳۰ سے زیادہ)

قیمت مجلد ۵ روپے ۱۲ آنے

ملنے کا پتہ۔ سب رس کتاب گھر خیرت آباد حیدرآباد

ہماری قومی زبان

ہندستان اتنا وسیع ملک ہے کہ اس کو براعظم کہنا بجا ہے۔ ایک طرف یہ مختلف مذاہب کا گہوارہ ہے تو دوسری طرف مختلف زبانوں کا مخزن ہے۔ یہاں رنگ برنگ کی بولیاں بولی جاتی ہیں اور ہر خطہ کی بولی جدا جدا ہے ——— اس لئے ہندستانی بچہ قدرتاً دو زبان بولنے پر مجبور ہے۔ ایک تو اس کی اپنی مادری زبان جس کو وہ دنیا میں جنم لیتے ہی رات دن اپنے گھر میں سنتا رہتا ہے۔ اور دوسری وہ زبان جس کے ذریعہ سے وہ اپنے ملک کے مختلف زبان والوں کے خیالات سے واقف ہو سکے۔ اپنی بات انھیں سنا سکے اور ان کی بات خود سمجھ سکے۔

مشترکہ زبان کی ضرورت :- ہر ملک اور قوم کی ایک ایسی مشترکہ زبان ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے افراد آپس میں تبادلۂ خیال کے قابل ہوتے ہیں۔ جیسے عربوں کی زبان عربی، ایرانیوں کی فارسی اور انگریزوں کی انگریزی۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ایک عام اور مشترکہ زبان قومی ترقی کی اولین شرط ہے۔ دنیا کا ہر مہذب ملک ایک قومی زبان رکھتا ہے۔ کیونکہ باہمی تبادلۂ خیال کے لئے کسی مشترکہ ذریعہ کے بغیر کسی نصب العین کو جاننا ایک مشکل امر ہے۔

قدیم زمانہ میں جب ہماری معاشرت، معاشی حالات اور آمد و رفت کے ذرائع محدود تھے، ممکن تھا کہ مقامی زبان ہماری ضروریات زندگی کے لئے کافی ہو۔ مگر آج کل تہذیب و تمدن کی ترقی، سائنسی انکشافات اور آمد و رفت کی سہولتوں نے دنیا کے تمام ممالک اور ہندوستان کے مختلف خطوں کو ایک دوسرے سے اتنا قریب تر کر دیا ہے کہ اب ہماری ضروریات محض مقامی حد تک محدود نہیں رہ سکتیں بلکہ ہمیں مختلف حصوں سے رشتہ جوڑنا پڑتا ہے۔ مگر اس سلسلے میں ہمیں یہ مشکل پیش آتی ہے کہ جب ہم ہندوستان کے کسی مقام پر جانا چاہیں تو نہ ہماری بولی وہاں سمجھی جاتی ہے اور نہ ہم وہاں کی بولی سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ ایک مقام والے دوسرے مقام کی بولی سیکھیں۔ مگر ہم اپنی ضروریات کے تحت نہ صرف ایک مقام بلکہ کئی مقامات پر جانے پر مجبور ہیں۔ اگر ہم ہر جگہ کی بولی سیکھنے بیٹھیں تو اس کے لئے ہماری عمر وفا نہ کرے گی۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ ایک نہ ایک ایسی زبان ہو جس کو ملک ہند کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سب بولتے اور سمجھتے ہوں۔

مہاتما گاندھی نے دسمبر ۱۹۴۵ء میں بمقام "رام پور ہاٹ" اس بارے میں بالکل بجا فرمایا کہ :-

> "اگر ہم سارے ہندستان کا سفر کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ دوسرے ہمارے پاس آئیں تو ہماری ایک مشترک زبان ہونی چاہئے، اور یہ زبان ہندوستانی ہے۔ جو لوگ ہندوستان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کو ہندوستانی کے دونوں اشکال اور رسم الخط (اردو، ہندی) سیکھنا چاہئے۔"

اس ضرورت کو ہماری اپنی بین قومی زبان "لنگوا فرینکا" نے بجا ہے ہم اسے اردو کہیں یا ہندی یا ہندستانی، پورا کر دیا ہے۔ یہاں اس بات کے بتانے کی ضرورت تو نہیں ہے کہ اس زبان کو بنانے، پال پوس کر پروان چڑھانے اور ارتقائی منازل سے گزار کر موجودہ حالت پر پہنچانے کا سہرا کسی خاص قوم و مذہب کے سر نہیں ہے، بلکہ اس کی پرورش اور پرداخت میں مادر ہند کے دونوں سپوت، ہندو اور مسلمان برابر کے حصہ دار ہیں۔ یہ ایک بڑی غلط فہمی اور لاعلمی ہے کہ اس زبان کو کسی خاص مذہب یا فرقہ سے متعلق کر کے "اردو" اور "ہندی" کا جھگڑا کھڑا کیا جائے کیونکہ اردو

اور ہندی میں بجز طرز نوشت کے کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ زبان تو ایک ہی ہے، مگر اس کا لباس جدا جدا ہے۔ ایک کو فارسی خط میں لکھتے ہیں تو دوسرے کو دیوناگری میں۔ اس کے علاوہ اُردو میں ہندی کی قواعد اور پچاس فی صد سے زیادہ الفاظ موجود ہیں۔ افسوس اس کا ہے کہ لوگ اس حقیقت سے دانستہ یا نادانستہ انجان بن جاتے ہیں۔

اُردو زبان کا پھیلاؤ۔ ہندوستان کی ان گنت زبانوں میں جس کا اندازہ ہندوستانی زبانوں کے محقق مسٹر گریرسن کے حساب سے (۲۲۳) ہے، اُردو کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ دُنیا میں انگریزی کے بعد "اُردو" کو تمام آریائی خاندان کی زبانوں میں یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یہ نہ صرف تعلیم یافتہ افراد کی بولی ہے بلکہ یہ عوام کی زبان ہے۔ کانگریس کمیٹی کے فراہم کردہ اعداد کے لحاظ سے ہندوستان میں اُردو بولنے والوں کی تعداد (۱۷) کروڑ (۲۰) لاکھ ہے۔ اگر اس میں اس کے سمجھنے والوں کو بھی ملا لیا جائے تو ان کی تعداد (۲۵) کروڑ ہو جاتی ہے۔

ہندوستان کے باہر ہندوستانی زبانوں میں سے یہی زبان زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ممالک غیر میں بھی اس کو بین قومی حیثیت حاصل ہے۔ حجاز اور عراق میں تمام ہندوستانی اسی زبان میں آپس میں تبادلۂ خیال کرتے ہیں، اور اسی طرح چین اور ہانگ کانگ وغیرہ میں بھی اسی سے کام لیا جاتا ہے۔

اُردو نہ صرف ہماری ریاست، بلکہ کل ہند اور بیرون ہند کے لئے بھی اہم ہے۔ کشمیر سے لیکر راس کماری بلکہ لنکا تک، اور بلوچستان سے لیکر برما تک یہی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کا جاننے والا جیسے ملایالم، تامل، تلنگی، مرہٹی، بنگالی، سندھی، گجراتی، پنجابی وغیرہ بولنے والا ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں چلا جائے تو وہاں وہ اجنبی ہو جاتا ہے کیونکہ نہ تو وہ وہاں کی بولی سمجھتا ہے اور نہ اس کی بات وہاں سمجھی جاتی ہے۔ مگر اُردو بولنے اور سمجھنے والا ہندوستان کے کسی خطے میں بھی کسی دشواری سے دوچار نہیں ہوتا۔ حدود ہند سے باہر مشرق میں جاوا، برما، سیام اور مغرب میں عدن اور سویز وغیرہ تک بھی یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

حیدرآباد کی حد تک تو اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ یہ ہماری ریاست کی بین فرقہ جاتی زبان ہے۔ ہر علاقہ کا باشندہ، چاہے وہ مرہٹواڑہ کا ہو یا کرناٹک اور تلنگانہ کا، یہی زبان اس کے تبادلۂ خیال کا ذریعہ ہے۔ اس زبان کو یہاں نہ صرف سرکاری، عدالتی اور کاروباری زبان ہونے کا امتیاز حاصل ہے بلکہ جامعہ میں بھی یہی ذریعۂ تعلیم ہے۔ ہماری ریاست نے اس کو اپنا کر اور ذریعۂ تعلیم بنا کر جو پہل کی ہے اس کی معقولیت کو مشرق و مغرب دونوں نے مان لیا ہے، اور ہندوستان کی اور جامعات بھی اس کی پیروی پر آمادہ ہو گئی ہیں چنانچہ جامعہ عثمانیہ کی پیروی کرتے ہوئے جامعہ لکھنؤ نے فیصلہ کیا ہے کہ ابتداء میں بی۔ اے، بی۔ ایس۔ سی، ایل۔ ایل۔ بی اور بی کام کا سارا نصاب اُردو، ہندی میں رہے، اور ذریعۂ تعلیم اُردو زبان قرار دی جائے، اور آسان اُردو یا ہندی زبان میں تعلیم شروع کی جائے۔

اُردو زبان ہندوستان کی عام فہم زبان ہے۔ اس کے ذریعہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہندوستان کی مختلف قومیں ہم زبان ہو کر ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کر سکیں گی، اور ہندوستان کی بین الملی مغائرت اس کے استعمال سے زائل ہو جائے گی۔ اس کا جاننے والا بنگال، آسام، گجرات، ٹراونکور، مدراس، سرحی نگر، بمبئی اور کلکتہ، غرض تمام ہندوستان میں جہاں کہیں چلا جائے کسی دشواری سے دوچار نہ ہوگا۔

اردو کی خصوصیات اور دوسری زبانوں پر اس کی فوقیت :- اُردو زبان کا سیکھنا، جو ہندوستان ہی نہیں بلکہ اس کے باہر بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے کسی طرح فائدہ سے خالی نہیں۔

(۱) اُردو تاریخی، سماجی اور سیاسی اعتبار سے ہندو مسلمانوں کے اتحاد و یکجہتی کی سب سے اہم اور عظیم الشان یادگار ہے۔ یہ زبان ہندو مسلمانوں کے باہمی میل جول، رواداری اور رفاقت کا نتیجہ ہے۔ یہ زبان تمام ہندوستانیوں کا بلا امتیاز مذہب و ملت موروثی ترکہ ہے۔ سر تیج بہادر سپرو نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ: "ہندو مسلم اتحاد کو اس سے بڑھ کر کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا کہ اُردو کو جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد سے بنی ہے، مٹانے کی کوشش کی جائے، اور یہ کہنا کہ اُردو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ نہیں ہے تاریخ کو جھٹلانا ہے"۔

(۲) یہ زبان اسی ملک میں بنی اور اسی ملک والوں نے بنائی۔ اس کے بنانے میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ یوں تو زبان کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے اور نہ اس کی کوئی قوم اور ذات ہوتی ہے خصوصاً اُردو کی بناوٹ تو کچھ اس قسم کی اور اس کی نشو و نما کچھ اس ڈھنگ سے ہوئی ہے کہ یہ بلا لحاظ قوم و ملت سارے ہندوستان کی زبان ہو سکتی ہے۔

(۳) مشترکہ زبان ہونے کا دعوٰی ہر بولی نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے چند شرطیں ہیں :-

(۱) دیسی ہو بدیسی نہ ہو۔ (۲) کسی خاص فرقے اور رقبے تک محدود نہ ہو۔ (۳) ملک کے بڑے علاقہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ (۴) ہر قسم کے خیالات اور جذبات کے ادا کرنے پر قادر ہو۔ (۵) زمانے کا ساتھ دے سکے اور حالات کے مطابق ڈھل سکے۔

یہ تمام خصوصیات اُردو زبان میں موجود ہیں ـــــ یہ خالص دیسی زبان ہے۔ یہیں پیدا ہوئی، پلی، بڑھی اور پروان چڑھی۔ نہ یہ کسی خاص فرقہ کی زبان ہے اور نہ کسی خاص رقبہ تک محدود ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس کے بنانے اور ترقی دینے میں صرف ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کا ہاتھ نہیں ہے بلکہ انگریز، پارسی، سکھ وغیرہ بھی اس میں شریک ہیں، اور ان میں سے ہر قوم کے لوگ اُردو کے مصنف، شاعر اور مضمون نگار گذرے ہیں اور اب بھی موجود ہیں۔

(۴) جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط بڑھنے لگا اور تجارت سے سیاست کی طرف قدم بڑھا، اور ملکی زبان کے بغیر کام چلانا مشکل ہو گیا تو اس کے لئے انگریزوں نے اُردو ہی کا انتخاب کیا، اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی بناد ڈالی، جہاں انگریز نو واردوں کو ہندوستانی (اردو) کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہاں ہندوستان کے قابل افراد سے اُردو میں کتابیں لکھوائی گئیں، اور تراجم شائع کئے گئے۔ اس میں اُردو کے ہندو مسلمان ادیبوں نے مل کر کام کیا، اور اپنے قلم کے زور سے زبان کی ایسی کایا پلٹ دی کہ ۱۸۳۲ء میں جب دفتروں اور عدالتوں سے فارسی زبان خارج کی گئی تو اُردو زبان نے اس کی جگہ لی۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اُردو ہی ہندوستان کی عام زبان تسلیم کی گئی۔ اس کالج کے معلم اول جان گلکرائسٹ اس زبان کو (Grand Popular Speech of India) کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ـــ "یہ نہایت کار آمد اور عام زبان ہے جس پر ہندوستان فخر کر سکتا ہے"۔ عیسائی مشنریوں نے بھی اسی کو اپنی تبلیغ کا ذریعہ بنایا، اور اس میں کثرت سے کتابیں اور رسالے شائع کئے۔

(۵) ہندوستان کی تمام فوجوں میں یہ زبان عام طور پر استعمال ہوتی ہے۔ ہندوستان کے خانگی معاملات میں کسی زبان کا ایسا عام رواج نہیں جتنا ہندوستانی کا ہے۔ کیڈٹوں کو (جو فوجی تعلیم حاصل کرتے ہیں) بنگال، مدراس اور بمبئی میں ہندوستانی

سکھائی جاتی ہے۔ ہندستان میں ہندستانی کا وہی درجہ ہے جو انگریزی کا برطانیہ میں یا ترکی کا ترکستان میں۔

(۶) اُردو زبان ہمیں اتحاد و یکجہتی کا سبق دیتا ہے۔ یہ زبان مختلف زبانوں سے مل کر بنی ہے۔" اور مختلف زبانوں کے الفاظ ایک دوسرے سے مل کر ایسے ایک ہو گئے ہیں کہ ان میں فرق کرنا عوام کے لئے ناممکن ہے۔

(۷) یہ زبان ہندستان ہی میں پیدا ہوئی، ہندو مسلمانوں نے مل کر اس کو جنم دیا، پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔ اگر اب انہی دونوں میں اس زبان کے بارے میں آپس میں کھینچ تان ہو تو ظاہر ہے کہ اس کا وہی حال ہوگا جو ماں باپ کی نااتفاقی سے اولاد کا ہوتا ہے ——— اس کا نام گو بدیسی ہے (کیونکہ اُردو ترکی زبان کا لفظ ہے) مگر نام اُردو ہو یا ہندستانی، زبان تو ایک ہی ہے"، اور بقول خان بہادر شیخ عبدالقادر "ہم نام کے پابند نہیں، ہمیں کام سے کام ہے، جو نام کسی کو بھلا معلوم ہو اسی نام سے اسے یاد کرے"۔

(۸) زمانۂ جنگ میں ہندستانی مسلمہ طور پر تمام دنیا میں ہندستان کی مشترکہ زبان سمجھی گئی۔ یہی وجہ تھی کہ جاپان، جرمنی، ترکستان، انگلستان وغیرہ سے ہندوستان والوں کے لئے ہندستانی (اُردو) میں خبریں لاسلکی کے ذریعہ سے نشر کی جاتی تھیں۔

(۹) دنیا بھر کی زبانوں میں اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو سب سے کم جگہ گھیرتی ہے۔ چونکہ آج کل معاشی حیثیت سے اختصار کا مسئلہ بڑا اہم ہے، اس لئے اُردو زبان اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔

(۱۰) "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" اُردو زبان کی ایجاد ایک زمانہ میں ضرورت ہی کے تحت ہوئی۔ آج کل تو اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ ہر قوم اس کوشش میں ہے کہ ایک مشترکہ زبان ایجاد کرے۔ چنانچہ ایک روسی عالم نے، یورپ کے لئے "اسپرانٹو" (زبان امید) ایجاد کی جس میں روسی، فرانسیسی، انگریزی، جرمن، اطالوی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں"، اور مغرب کا ہر ملک اپنی تجارتی، معاشی اور سیاسی سہولتوں کے لئے اس زبان کی ترویج میں مصروف ہے۔ اس کی وجہ سے تاجروں، سیاحوں اور سیاسیوں کو بڑی سہولت ہو گئی ہے ——— بقول سر شیخ عبدالقادر "ہماری اسپرانٹو وہی پیاری زبان ہے جسے کوئی اُردو، کوئی ہندی اور کوئی ہندستانی کہتا ہے۔ مگر اُردو مغربی اسپرانٹو کی طرح مصنوعی نہیں ہے۔ بلکہ صدیوں میں قدرتی اسباب کے جمع ہونے سے ہوئی ہے۔ اس لئے اُردو کی ترویج کا کام بہ نسبت اسپرانٹو کے آسان ہے"۔

(۱۱) اُردو کے پھیلاؤ کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں تقریباً (۲۵) کروڑ باشندے اُردو سمجھتے اور بولتے ہیں ہندوستان کے باہر بھی افریقہ، ایران، عرب اور دیگر علاقوں میں تقریباً (۳۰) کروڑ دس لاکھ اُردو بولنے والے موجود ہیں۔

مختصر یہ کہ:۔

۱۔ یہ بول چال کی زبان ہے۔ اس کے بنانے میں عوام کا بڑا حصہ ہے"، اور زبانوں کی طرح یہ محض تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان نہیں ہے، بلکہ یہ عوام کی زبان ہے۔

۲۔ یہ ہندستان کی دو بڑی قوموں کے اتحاد کی عزیز ترین یادگار ہے۔

۳۔ ہمارے تمدن و معاشرت، ہمارے دل و دماغ کے نتائج اور ہمارے مادی اور روحانی خیالات کی حامل ہے۔

۴۔ ہمارے اسلاف کی صدیوں کی محنت، جانکاہی اور دماغی و ذہنی کاوشوں کا نچوڑ ہے۔

۵۔ اور بزرگوں کی مقدس وراثت ہے۔

اُردو اور انگریزی:۔ بعض لوگ اُردو کے مقابلہ میں انگریزی کو ترجیح دینے اور اس کو مشترکہ زبان بنانے کے حامی ہیں لیکن حق تو یہ ہے کہ جتنی توجہ وہ انگریزی کے سیکھنے پر صرف کرتے ہیں اگر اس کا دسواں حصہ بھی اُردو پر صرف کریں تو وہ آسانی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کا سیکھنا ہندوستانیوں کے لئے بالکل سہل ہے، کیونکہ اُردو، شہروں، بازاروں، سڑکوں اور گھروں میں غرض کہ ہر جگہ اور ہر مقام پر سننے میں آتی ہے۔ اس لئے اس زبان سے کان آشنا رہتے ہیں اور یہ زبان اجنبی نہیں معلوم ہوتی جتنی کہ انگریزی زبان ہے۔ اُردو کے سیکڑوں الفاظ ہندوستان کی مقامی زبانوں میں داخل ہونے کے علاوہ یہ زبان ہندوستان کے اکثر صوبوں میں بخوبی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اپنے پھیلاؤ کے علاوہ یہ زبان آسان ہے، اور اس کا بولنا اور سمجھنا بہت جلد آجاتا ہے۔ کیونکہ یہ ہر جگہ بولی جاتی ہے اور اس کے الفاظ بچپن ہی سے کانوں میں پڑتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزی بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بہت قلیل ہے۔

مہاتما گاندھی فرماتے ہیں کہ:۔ "بلا شبہہ انگریزی بین قومی زبان ہے۔ مگر یہ کبھی ہماری قومی زبان نہیں بن سکتی۔ قومی زبان کو ہماری قوم کے کروڑوں افراد کی ملک ہونی چاہئے۔ وہ انگریزی کو سیکھنے کا بار نہیں اٹھا سکتے۔ ہندستانی قدرتی طور پر قومی زبان ہے۔ اس لئے کہ اسے اس وقت ۲۱ کروڑ آدمی سمجھ لیتے ہیں اور باقی لوگ بھی اسے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن انگریزی صرف چند آدمیوں (زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ آدمیوں) کی قومی زبان کہی جا سکتی ہے۔ اگر ہندوستان ایک قوم ہے تو اس کی قومی زبان بھی ایک ہونی چاہئے"۔۔۔۔۔۔۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:۔ "ہندستانی زبان عوام سے رابطہ پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے، اور آج کل ہندستانی ہندی اور "اُردو" کے مرکب کا نام ہے۔ جو شخص ہندی جانتا ہے اس کے لئے ہندستانی آسان ہے ۔۔۔۔۔۔ فارسی رسم الخط کا سیکھنا بہت آسان ہے۔ اس خط میں چند ہی بنیادی حروف ہیں جو (۳۷) حروف کے قائم مقام ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حروف کا ملانا ذرا مشکل ہے۔ لیکن حروف اور ان کے جوڑ سیکھنا زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ کی بات ہے۔ اگر ابتداء میں روزانہ کم از کم ایک گھنٹہ دیا جائے اور اس کے بعد روزانہ آدھ گھنٹہ کی مشق کی جائے تو چھ مہینے میں کام چلانے کی حد تک اُردو سیکھ سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔ یقینی دونوں قسم کے خطوں کا مطالعہ جو ایک ہی زبان کے لئے کام میں لائی جاتی ہیں، بڑا دلچسپ ہے۔ اگر ہمارے دل میں وطن اور اہل وطن کے لئے محبت ہے تو یہ تمام کوششیں بار آور ہو سکتی ہیں۔۔۔۔ (اور انگریزی کے مقابلہ میں اس میں کم محنت کی ضرورت پڑے گی) فارسی رسم الخط مسلمانوں کے لئے ایسا ہی ضروری ہے جیسے ہندوؤں کے لئے سنسکرت۔ اس کے علاوہ یہ خط شمالی ہند میں کروڑوں ہندو اور مسلمان لکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں قسم کی (فارسی اور دیوناگری) تحریر سیکھیں"۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:۔ مسٹر رام بابو سکسینہ مصنف تاریخ ادب اُردو، لکھتے ہیں کہ:۔ "عام طور پر لوگ اُردو کو فارسی کی ایک شاخ خیال کرتے ہیں۔ اس غلط فہمی کی بناء پر عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے، اور ہندی ہندوؤں کی؛ اور اس بحث میں لوگ زبان اُردو کی اصل کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ زبان اُردو اس ہندی یا بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں تک دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی۔

یہ کہنا بجا ہے کہ زبان ہندی اُردو کی اصل اور ماں ہے۔ زبان اُردو کی صرف و نحو، محاورات، اور کثرت سے ہندی الفاظ کا استعمال اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی ابتدا ہندی سے ہوئی اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ہندوستان کی عام زبان بن گئی۔ مگر حال کی ہندی اُردو سے پیدا ہوئی۔ وہ اس طرح کہ اُردو سے فارسی الفاظ کو نکال کر اس کی جگہ سنسکرت کے بڑے بڑے الفاظ رکھ دئے گئے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اُردو اور ہندی اپنے ماخذ کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ اگر کچھ فرق ہے بھی تو اس کی نشو و نما کے طریقہ میں ہے ـــــ اُردو مسلمانوں میں پلی اس لئے اس میں فارسی الفاظ کی کثرت ہوگئی ـ اور ہندی سنسکرت کی طرف عود کر گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانہ کی ادبی اُردو، اور ادبی ہندی میں زمین و آسمان کا فرق ہوگیا۔ ایک میں عربی، فارسی کی بھرمار ہے تو دوسرے میں سنسکرت کی ٹھونس ٹھانس ہے۔"

اُردو کو عام بنانا کیا ہندستان کی اور زبانوں کے حق میں مضر ہوگا؟

ـــــ اُردو کے پریمی ڈاکٹر عبدالحق صاحب اس بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔ "ایک ہی زبان ہونے کا اگر یہ مطلب ہے کہ "ملک میں کوئی دوسری زبان نہ رہے" تو یہ دعویٰ سرے سے نامعقول اور غیر مقبول ہے۔ اگر اس سے مطلب یہ ہے کہ مقامی زبانوں کے علاوہ کوئی ایسی مشترک زبان بھی ہو جو باہم تبادلِ خیالات، کاروبار اور تعلیم وغیرہ کا ذریعہ ہو سکے تو اس کی معقولیت میں کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔"

ہندی کے بارے میں مولوی صاحب کی رائے ملاحظہ ہو:۔ "ہندی کی اشاعت سے ہندی سیکھنے والے اُردو سے اور اُردو کی اشاعت سے اُردو سیکھنے والے ہندی سے زیادہ قریب ہو جائیں گے۔ کیونکہ ہندوستان کی کوئی دو زبانیں باہم اتنی قریب نہیں جتنی اُردو اور ہندی ہیں ـــــ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی شخص اُردو کا اعلیٰ ادیب اور محقق نہیں ہو سکتا، جب تک کہ ہندی نہ جانے۔ کیونکہ ان دونوں زبانوں کا بلا مبالغہ اور اصلی معنوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے، اور اس لئے ایک دوسرے کی مخالفت لاحاصل ہی نہیں بلکہ مضر ہے ـــــ جہاں کہیں میں نے ضرورت سمجھی ہندی کی حمایت کی۔ جامعہ عثمانیہ میں ہندی کے رواج دینے میں تھوڑی سی میری ناچیز کوشش کو بھی دخل ہے۔ جس قدر ہندی زبان کا زیادہ رواج ہوگا اسی قدر ہندو ہم سے زیادہ قریب ہو جائیں گے۔ کیونکہ ہندی سے زیادہ ہندوستان کی کوئی زبان "اُردو" سے زیادہ قریب بلکہ اقرب نہیں ہے۔"

"یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ملک کی موجودہ فضا نے زبان کے مسئلہ کو پیچیدہ اور ناگوار بنا دیا ہے۔ کسی نے اس کا ناتا مذہب سے جوڑا ہے، اور کسی نے سیاست سے۔ یہ باتیں ہمیں ایک دوسرے سے جدا کرنے والی ہیں۔ ہر زبان کو خواہ ہندی ہو یا اُردو، ترقی کا حق حاصل ہے۔ لیکن کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسری زبان کی ترقی میں حائل ہو۔ ایک دوسرے سے بدگمانی کی بجائے ایک دوسرے سے قریب ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔"

علامہ سیاب اکبرآبادی کا خیال ہے کہ: ـــــ "ہم پر ہندستان کی ہر زبان کا احترام فرض ہے۔ ہم کسی زبان کو ناقص یا غیر ضروری نہیں سمجھتے۔ جب ہم غیر ملکی زبانوں میں بھی مہارت حاصل کرنا عیب نہیں سمجھتے تو ہندوستانی زبانوں کے حاصل کرنے سے ہمارا اجتناب بے معنی اور ناپسندیدہ ہے۔ ہمیں ہندوستان کی ہر زبان سے دلچسپی ہے ـــــ زبانوں کے متعلق جو باہمی جھگڑے آئے دن ہوتے رہتے ہیں، وہ بے فائدہ ہیں۔ زبان قومی نہیں بلکہ ملکی ہوتی ہے۔ کچھ دنوں سے ہندی زبان کو ترقی دینے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ میں اس طریق کار سے بدگمان یا بددل

نہیں ہوں، اور چاہتا ہوں کہ "ہندی" سے مسلمان ویسی ہی دلچسپی لیں جس طرح ہندو "اُردو" سے دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی ایک ہندوستانی زبان ہے، اور کسی زبان کا جاننا نہ جاننے سے بہتر ہے۔"

ان ذمہ دار حضرات کی آراء سے صاف ظاہر ہے کہ اُردو کے بہی خواہ، ہندی یا کسی اور دوسری زبان کے مخالف نہیں ہیں، بلکہ وہ ہندی سیکھنے کی تاکید مسلمانوں کو بھی کرتے ہیں ــــــ اُردو زبان کو مشترک بنانے کے معنی، مقامی زبانوں کی روک تھام نہیں، بلکہ ہندوستان کے عام باشندوں کو ایک زبان بنا کر آپس کے برادرانہ تعلقات کو بڑھانا ہے تاکہ ایک دوسرے کو سمجھنے کے قابل ہیں۔

اُردو زبان کے بارے میں اہلِ مشرق اور اہلِ مغرب کے خیالات

ــــــ اُردو زبان کے فرانسیسی پروفیسر اور عالم گارسان دتاسی، جنھوں نے اُردو زبان و ادب پر پیرس میں خطبے پڑھے ۱۸۶۱ء کے خطبہ میں لکھتے ہیں :ــــــ "اُردو زبان نے ہندوستان میں وہی رتبہ حاصل کیا ہے، جو فرانسیسی نے یورپ میں۔ یہ وہ زبان ہے جو بکثرت استعمال میں رہتی ہے۔ یوروپین لوگوں سے گفتگو کرنے کا وسیلہ یہی ایک زبان ہے۔" ایک اور مقام پر کہتے ہیں کہ :ــــــ

"اُردو سارے ہندوستان کی مشترک زبان بن گئی ہے اور روز بروز جو ترقی اس کو ہو رہی ہے، اس کی وجہ سے وہ پورے دیس کی زبان کہی جا سکتی ہے۔ بلا شبہہ کچھ عرصہ کے بعد ہندوستانی مشرق کی ایک نہایت اہم زبان کی حیثیت اختیار کرے گی۔ اس زبان کے توسط سے لاکھوں اہلِ مشرق تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ اس زبان میں بدرجۂ اتم یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ ہندو، مسلمان دونوں کے مقاصد کو پورا کرے۔"

مسٹر جارج کیمبل اپنی کتاب (India as it is) میں لکھتے ہیں کہ :ــــــ "ہندوستانی (اُردو) ملک کے اکثر طبقوں میں عام طور پر بولی جاتی ہے، اور اس سے زیادہ سمجھی جاتی ہے۔ مسلمانوں نے اپنی تحریری زبان کو ایک حد تک فارسی رکھا، مگر بول چال میں عام طور پر ہندوستانی کو استعمال کرتے تھے، اور یہی ہندوستان کی عام زبان قرار پائی۔ اور زبانیں جہاں تک ضرورت ہے سکھائی جائیں، مگر بغیر مشترک زبان کے ترقی محال ہے۔"

ڈینی سن راس، مشہور مستشرق کا خیال ہے کہ :ــــــ "اُردو ہندوستان کی لنگوا فرینکا (عام مشترک زبان) ہے، اور یہ وہ زبان ہے جو مختلف قوموں کو اتحاد اور اخوت کے مضبوط رشتہ میں جکڑے ہوئے ہے۔"

سائمن کمیشن کو اعتراف ہے کہ :ــــــ "ہندوستان کے باشندوں کی سب سے بڑی تعداد ہندوستانی زبان بولتی ہے۔"

مہاراجہ سرکشن پرشاد آنجہانی کا خیال ہے کہ :ــــــ "اُردو زبان ہندوستان کی دو بڑی قوموں یعنی ہندو مسلم اتحاد کی یادگار ہے، اور جس قدر اسے فروغ ہوگا اسی قدر دونوں قوموں کی یکجہتی کا باعث ہوگا۔"

جنوبی افریقہ کا ڈیلیگیشن اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ :ــــــ

"جنوبی افریقہ میں جو ہندوستانی لوگ آباد ہیں وہ ہندوستانی بولتے ہیں۔"

نواب ڈاکٹر مہدی یار جنگ بہادر کا ارشاد ہوتا ہے کہ :ــــــ

"اُردو زبان ایک ایسی زبان ہے جو تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ لوگ اس کو بولتے ہیں۔ عام اس سے کہ ان کا کیا مذہب و ملت ہے۔"

خان بہادر احمد خاں صاحب والی محمود آباد کی رائے ہے کہ: ـــــ "اُردو زبان کی بنیاد اتحاد پر قائم ہے، اور اس کا وجود باہمی اتفاق کا ثبوت ہے۔ بعض قدرتی اسباب کا لازمی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے اس کی طرف زیادہ توجہ کی مگر ہندو شعرا، و مصنفین کی خدمات بھی کچھ کم قابل قدر نہیں۔ اُردو کو سر تیج بہادر سپرو اور مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے سے بزرگوں کی سرپرستی اور حضرت کیفی دہلوی کے جیسے عالموں کی امداد حاصل ہے۔"

سر تیج بہادر سپرو کا خیال ہے کہ ـــــ "دراصل اُردو زبان کے وجود میں آنے کی وجہ یہ تھی کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ ہو سکیں۔ میں یہ تسلیم کرنے تیار نہیں ہوں کہ اُردو زبان صرف مسلمانوں کی زبان ہے، اور اُردو جاننے والے محض مسلمان ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے اُردو کی بنیاد اتحاد کے لئے ڈالی تھی۔ اگر آپ اتحاد کے جویا ہیں جس کے بغیر ہندوستان ترقی نہیں کر سکتا، تو آپ اُردو کو ترقی دیں۔"

پنڈت ہردے ناتھ کنزرو "اُردو" کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر زور دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ: ـــــ "یہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ سے موجودہ منافرت دُور کی جا سکتی ہے، اور ہم آپس میں متحد ہو سکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اگر کسی زبان کو ہندو مسلم اتحاد کی پیداوار کہا جا سکتا ہے تو وہ "اُردو" ہے، اور اس کے تمام اجزاء ہندو مسلم اشتراک کا صاف مظہر ہونے کے علاوہ دوسرے ہندوستان میں سب سے زیادہ وسعت اور اثر حاصل ہے۔"

غرض یہ کہ کیا ہندو کیا مسلمان اور کیا عیسائی سب اس بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔ اگر ہم ان اقوال پر غیر جانب دارانہ طور پر نظر ڈالیں تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُردو ایک ہر دلعزیز، مقبول عام اور مشترکہ زبان ہے، جو ہندوستان کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

زبان و مذہب: ـــــ ہمیں اس بات کو کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ زبان کا تعلق مقامات سے ہے، مذہب سے نہیں۔ اس لئے اگر زبان کو مذہب سے متعلق نہ کیا جائے تو زبان کا جھگڑا جلد مٹ سکتا ہے ـــــ

ہندی کو ہندوؤں کی زبان کہا جاتا ہے، مگر جب کانگریس کی طرف سے ہندی کے پرچار کی کوشش کی گئی تو بہار میں بنگالی اور مدراس کے تامل اور آندھرا اس کے خلاف ستیہ گرہ کر کے جیل میں تک گئے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندی کی مخالفت خود ہندوؤں نے کی ـــــ اُردو کو مسلمانوں کی زبان کہا جاتا ہے، مگر کیا کوئی ترکی، ایرانی، افغانی، عربی اور حبشی مسلمانوں کو اس کے بولنے اور لکھنے پر مجبور کر سکتا ہے؟ مدراس کے ہندو مسلمان دونوں ہی تامل اور بنگال کے بنگالی اور گجرات کے گجراتی بولتے ہیں۔ یہی حال حیدرآباد کا ہے جہاں کے ہندو مسلمان بلا تفریق مذہب مرہٹواڑہ میں مرہٹی اور تلنگانہ میں تلنگی اور کرناٹک میں کنڑی بولتے ہیں۔

اردو کو عام کیسے بنایا جا سکتا ہے: ـــــ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے بجا ارشاد فرمایا ہے کہ: ـــــ "اُردو زبان کی ترقی دوسری زبانوں سے نفرت کرنے یا دوسری زبانوں کے ہمدردوں سے دشمنی مول لینے سے نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک تخریبی طریقہ ہے، اُردو بولنے اور سمجھنے والے کشمیر سے لنکا تک، اور بلوچستان سے آسام تک محض اس لئے اب بھی مل جاتے ہیں کہ ان کے اسلاف نے صلح جویانہ مسلک اختیار کیا۔ کبھی کسی مقامی یا دوسری زبانوں کی مخالفت نہیں کی، حالانکہ اس زبان کی تاریخ میں ایسا زمانہ بھی گذر چکا ہے کہ اس کے بولنے والے صاحبان تخت و تاج تھے اور ہر طرح کی سماجی اور سیاسی اقتدار رکھتے تھے۔ اگر اُردو کے مصنفین اور مولفین ایک ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیں جو اس کی دیرینہ روایات کے خلاف ہے اور جس پر اپنے حاکمانہ اقتدار کے زمانے میں بھی

ارباب اردو نے عمل نہیں کیا تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا نتیجہ اس کے حق میں مفید نہ ہوگا اور اہل اردو ہمیشہ کے لئے تاریخ میں بدنام ہو جائیں گے۔"

اردو کی عام اشاعت کے لئے اس کی سخت ضرورت ہے کہ اس کی تحصیل میں عوام کے لئے جو مشکلات ہیں ان کو دُور کیا جائے، اور رسم الخط کی اصلاح کی جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ مولوی سجاد مرزا صاحب ایم۔ اے (کنٹب) نے بنیادی رسم الخط ایجاد کرکے جوڑ اور کرسیوں کو کم کر دیا ہے، اور سیکھنے والوں کے لئے سہولت پیدا کر دی ہے ــــــ مگر بقول ملا سید فخر الحسن صاحب لکچرار عثمانیہ ٹریننگ کالج:ــــــ "گو اردو زبان آسان ہے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں غیر زبان والوں کے لئے دشواریاں نہیں ہیں۔ اگرچہ گردان اور تصریف والی زبانوں کے مقابلے میں یہ آسان ہے مگر رسم الخط اور جنس و تعداد کی دشواریاں غیروں کے لئے اور بعض وقت خود اہل زبان کے لئے بھی مصیبت کا باعث ہوتی ہیں ـ" اس جانب ارباب اردو کو توجہ کرنی چاہئے۔"

مولانا وحید الدین سلیم مرحوم، سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے اردو زبان کی ترویج کے بارے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ ارباب فکر کے لئے قابل توجہ ہیں:ــــــ

"اردو زبان کی قدرتی ساخت آریائی ہے، کیونکہ اس کی گرامر وہی ہے جو آریائی زبانوں کی ہے، اس کو عربی گرامر سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ جو حضرات سنسکرت الفاظ کی بھر مار اردو میں کرتے ہیں یا عربی الفاظ اردو میں بکثرت استعمال کرتے ہیں، وہ گویا اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اردو ہندستان کے لئے عام فہم نہ رہے، اور ہندو مسلمانوں میں جدائی کی خلیج وسیع ہوتی رہے، اور خود اردو زبان اپنی قدرتی بناوٹ سے دُور ہوتی جائے۔"

"اس غرض کے لئے کہ اردو عام ہندستانی زبان بن سکے، ایک مؤثر تدبیر یہ ہے کہ ہندی کے ان الفاظ کا اردو میں اضافہ کیا جائے، جو آسان، عام فہم اور شیریں ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ ہندو بھائی اس زبان سے زیادہ مانوس ہو جائینگے۔ اس سے نہ صرف ہماری زبان کا دائرہ وسیع ہوگا بلکہ ہندوستان کے ہر صوبے کے باشندوں کے لئے یہ عام فہم ہو جائے گی ـ اردو زبان میں مسلمانوں کی تاریخ، مذہب اور رسم و رواج کے متعلق الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ اگر اس میں ہندو تاریخ، دیو مالا، مذہب اور رسم و رواج کے متعلق الفاظ بڑھا دیئے جائیں تو پھر یہ زبان ایک ایسی زبان بن جائے گی، جس کے ساتھ ہندو مسلمانوں کو یکساں دلچسپی ہوگی۔" ــــــ اب ہندوستان کو ایسے ادیبوں کی ضرورت نہیں ہے جو ہندو مسلمانوں کے تعصبات کو بھڑکائیں، بلکہ ایسے ادیبوں کی ضرورت ہے جو حُب وطن کے ترانے سُنا کر ہندوستانیوں میں اتحاد و محبت کی روح پھونکیں، اور اردو زبان کو جو ہندو مسلمانوں کے ملاپ سے بنی ہے ایسی حالت پر پہنچائیں کہ وہ تمام اقوام کی مشترک زبان بن جائے۔"

"اردو زبان کا موجودہ ادب، عرب و ایران کے متحدہ اثر سے تیار ہوا ہے۔ اس میں ہندوستانیت کی جھلک نام کو نہیں ہے۔ اگر ہم اردو کو ملکی زبان بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں ایسا ادب تیار کرنا چاہئے جس کا مطالعہ کرنے والا قدم قدم پر ہندوستانیت کی نشانیاں دیکھتا جائے۔ یہی نشانیاں اس ادب کو تمام ہندوستان کی نظر میں محبوب و عزیز بنا دے گی۔ کیونکہ غیر ملکی خیالات کو ہم جبراً ہندوستانیوں کے دماغوں میں ٹھونس نہیں سکتے ــــــ اردو زبان میں موجودہ تلمیحات کا بیشتر حصہ عرب و ایران سے لایا گیا ہے۔ ہندوستانی تلمیحات عام بول چال میں کسی قدر ہیں مگر وہ لائق شمار نہیں ہیں ــــــ ہندوستان کی زبانوں اور ان کی ادبیات سے نفرت و گریز کرنے کے بعد کوئی حق نہیں ہے کہ ہم اردو زبان کو ہندوستان کی

مشترک زبان کا خطاب دیں۔" ——— اُردو میں ہندو مذہب، ہندو دیو مالا اور تاریخ و ادب کی تلمیحات کا اگر اضافہ کریں تو اس سے ہمارے مذہب اور عقل پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، بلکہ اس سے ہیں حسب ذیل فوائد حاصل ہوں گے:—

(۱) مختلف خیالات کے ادا کرنے پر ہم پہلے سے زیادہ قادر ہوں گے۔

(۲) یہ الزام ہم پر سے دُور ہو گا کہ ہم محض مذہبی تعصب کی بناء پر ہندو ادبیات سے گُریز کرتے رہے۔

(۳) ہماری زبان صحیح معنوں میں ہندستانی، اور ہمارا ادب صحیح معنوں میں ہندستانی کہلانے کا مستحق ہوگا۔

(۴) ہندو ہمارے ادب سے پیشتر کی نسبت زیادہ مانوس ہو جائیں گے۔

(۵) ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی بنیاد مضبوط ہو گی اور حُب وطن کے میدان میں آسانی سے دونوں قومیں ایک ساتھ دوڑیں گی۔

بقول سر شیخ عبد القادر:— "اُردو زبان کو کئی زبانوں کا مرکب ہونے میں "اسپرانٹو" کے ساتھ پوری مشابہت ہے، اور بڑی خوبی یہ ہے کہ ابھی اور الفاظ کی آمیزش کی گنجائش اس میں موجود ہے۔ ہندوستان کی مختلف بولیاں ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں، اور خصوصاً ہندستانی کے الفاظ اس میں بہت شامل ہیں۔ انگریزی الفاظ کی آمیزش سے یہ مشترکہ حصہ ان میں اور بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں اُردو کا عام رواج دیا جانا سب کی آسانی کا باعث ہوگا——— یورپ دس، بارہ مختلف سلطنتوں کا مجموعہ ہے، جس کے لئے ایک مشترکہ زبان پیدا کرنے کی کوشش ہے، اور باوجود اختلاف کے ایک نیا رشتۂ یگانگت پیدا کرنے کی فکر ہے، اور ہم ایک ہی ملک اور ایک ہی حکومت اور مشترکہ ضروریات اور اغراض کے باوجود فکرِ ہم زبانی سے غافل ہیں۔ حالانکہ ہمارے رستے میں وہ مشکلات بھی نہیں جو ان کے رستے میں ہیں۔ اگر ہم ان سب ذرائع سے جو اس کی اشاعت کے لئے ہمارے پاس ہیں، کام لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری اسپرانٹو (اُردو) ہندوستان بھر کی عمومی زبان نہ بن جائے——— اگر اسپرانٹو کے حامی چند سال میں کئی سو سے کئی ہزار اور کئی ہزار سے کئی لاکھ بن سکتے ہیں تو کیا ہماری اسپرانٹو کے کئی کروڑ بولنے والے اور کئی کروڑ آدمی اپنے ساتھ نہیں لے سکتے؟

بالریڈی

آسرا

مجھ کو مری دعاؤں کا اچھا صلہ دیا
غم اس قدر دیے کہ مجسمِ غم بنا دیا

اب کیوں کھنچے کھنچے نظر آتے ہو آج کل
شاید کہ تم نے مجھ کو نظر سے گرا دیا

میں ڈوبنے لگا تو سہارا دیا مجھے
ابھرا تو اور جوشِ تلاطم بڑھا دیا

یہ بھی کوئی ادا ہے کہ اظہارِ دلبری
افسانۂ کلیمؑ لیا اور سُنا دیا

تیری عنایتوں کا مجھے اعتراف ہے
مجھ کو مری حیات کا مقصد بتا دیا

نفرت بھی کچھ نہ کچھ ہے محبت کے ساتھ ساتھ
تیرے کرم نے مجھ کو دو طرفہ مزا دیا

میں نے تو خضرِ راہ بنایا تھا آپ کو
مجھ کو فریب کس لئے پھر جا بجا دیا

نقشِ وجودِ صفحۂ ہستی سے لو مرا
حرفِ غلط سمجھ کے کسی نے مٹا دیا

اب مرگ و زیست دونوں کے قابل نہیں ہے تو
جبریل تجھ کو اس نے بڑا آسرا دیا

جبریل

قصّہ شاہ داؤد

ایک زمانے میں بغداد شریف کا ایک بادشاہ تھا جس کو شاہ جُنید کہا کرتے تھے، اُس کے ایک لڑکا مسمی شاہ داؤد تھا۔ حضرت شاہ جُنید کا وصال ہوگیا، اُس وقت اُن کی ایک بیوی اور کمسن لڑکا داؤد پسماندگان میں تھے۔ بادشاہ کے انتقال کے بعد اُن کا بھائی مسمی آمن تخت و تاج کا مالک بن گیا۔ بیوہ اور شاہ داؤد کو گھر سے نکال کر ساری جائداد پر قابض ہوگیا۔ لوگ کھانے پینے سے بھی محتاج ہوگئے، بیوہ چکی پیس کر اپنا اور بچے کا پیٹ پالتی۔

حضرت شاہ جُنید نے اپنے فرزند شاہ داؤد کی نسبت شداد شاہ مصر کی لڑکی سے کی تھی۔ شاہ جُنید کے انتقال کے بعد شداد شاہ مصر اپنی لڑکی شاہ داؤد سے بیاہنے رضامند نہ تھا، چنانچہ اُس کی نسبت کو منقطع کر دیا اور شاہ روم کے لڑکے سے نسبت کی۔ داؤد کمسن تھا، اپنا سارا وقت کھیل کود میں گزارتا، کھیل ہمیشہ فوجی، تخت و تاج اور عدل و انصاف کا کھیلا کرتا۔

بیٹا شاہ جُنید کا اک کھیل بنایا — اونچی ٹی دیکھ کر اک تخت بنایا
آپ بنا تھا بادشاہ کوئی نوکر لایا — کوئی بنایا چوبدار تو کوئی کوتوال بنایا
تیلی کا چھوکرا پکڑ کے جب چور بنایا — بیڑی ڈنڈا ٹھوک کے بہتا دھمکایا
کھال بدن کی ڈھادی کچھ خوف نہ آیا

جب تملین (جو بہت نیک اور روشن ضمیر ولی صفت تھی) کو اپنے لڑکے کی مار پیٹ کا حال معلوم ہوا تو اسے اپنے ساتھ لیکر شاہ داؤد کے پاس فریاد کی اور شاہ داؤد کے سامنے اُس کی نسبت کا حال (جس کی اس کو خبر نہ تھی) سُنایا اور پھر رشتہ منقطع ہوکر شاہ روم کے لڑکے سے ہونے کا ذکر کیا تو داؤد یہ حال سُنکر سوچ اور فکر میں پڑ گیا۔

(۲)

لڑکے کا ہاتھ پکڑ کے جب تملین روئی — جہاں بیٹھے تھے حضرت داؤد وہاں تملین گئی
تو نے مارے پوت غریب کی تو نے بہت کی — شداد مصر میں بادشاہ تیری ہوئی تھی منگائی
انہیں بیاہے روم کا بادشاہ تجھ کو ملتی نا ہیں — جو تو ایسا مرد ہے لا تو کر بیاہی را
اتنی سن شاہ داؤد من چنتا ہوئی

آخر کار مجبور ہوکر اپنے چچا شاہ آمن کے دربار میں جاکر اپنا مُدعا ظاہر کرتے ہوئے امداد کا طالب ہوا جس کی بنا پر شاہ آمن نے امداد دینے کے لئے اپنے بیٹے کو فوج لے کر داؤد کے ساتھ جانے کا حکم دیا، لیکن اس کے بیٹے نے شاہ جنید کے مظالم، بُت شکنی اور سب کو دائرۂ اسلام میں لانے کے واقعات کا اعادہ کیا تو شاہ آمن نے امداد دینے سے انکار کرتے ہوئے اپنے گھر واپس بھاگ جانے کا حکم دیا۔

(۳)

چچا کے دربار میں داؤد پکارے — مانگ لئے میرے مصر میں اختیار تمہارے

کہتا امن بادشاہ فرزند تمہارے　　جا داؤد کے سات میں لشکر سارے
پوت کہتا شاہ کا سن بادشاہ تمہارے　　بیٹا شاہ جنید کا جنھیں ظلم گزارے
ہمیں جبر کئے مسلماں بت توڑے تمہارے　　کیسے بغداد سے باہر پڑے قہر گزارے
اتنا سنکر چچانے لڑکا نیچے اترارے　　بھاگ جا پوت جنید گھر لوٹو تمہارے

۱ فوج

جب شاہ داؤد کو اپنے چچا کی جانب سے بھی نا امیدی ہوئی تو اس نے اپنے باپ حضرت جنید کا گھوڑا (کہتے ہیں کہ تہ خانے میں رکھوا جاتا تھا) باہر نکالا، اور اس پر سوار ہوکر امداد کے لئے بجانب مدینہ شریف آنحضرت صلعم کے پاس جانے کے ارادے سے راہی ہوا، اثنائے راہ میں حضرت علیؓ سے ملاقات ہوئی (جو شکار کھیلنے کی غرض سے نکلے تھے) حضرت علیؓ نے شاہ جنید کے گھوڑے کو پہچان کر داؤد سے دریافت کیا کہ تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟ اس نے اپنا سارا حال کہہ سنایا اور برائے امداد مدینہ شریف کا قصد ظاہر کیا۔ حضرت علیؓ کو خیال ہوا کہ امداد کے لئے آنحضرت صلعم اس کام پر یقینی مجھ کو ہی مامور فرمائیں گے، اس لئے مناسب تو یہی ہے کہ قبل ہی امداد دی جائے۔

(۴)

بھنور سے گھوڑا لیا کاڑ نور الٰہی بندہ　　گھوڑے اوپر بیٹھا اللہ کا بندہ
چلا مدینے شریف اللہ کا بندہ　　رستہ میں حضرت علی ملے شکار کھیلندہ
گھوڑا شاہ جنید کا کہاں لئیو جانندہ　　جاؤں مدینہ شریف کو فریادی بندہ
شدّاد مصر کا بادشاہ میرا مانگ نہیں دیندا　　رستہ میں ٹھاڈا الو لا کہیں جانیندہ

۲ باؤلی ۳ نکال ۴ کھیلنے والا ۵ جاتے ہو ۶ زبردست ۷ جانے نہیں دیتا

حضرت علیؓ کے حکم سے پریاں حاضر ہوئیں اور داؤد کو پھول پہنا کر اور مہندی لگا کر دولہا بنائیں اور داؤد کو حضرت علیؓ اپنے ہمراہ جلد لیکر چلے۔

(۵)

تارا مارا علیؓ نے میدان کے مائی　　مجرے لئے ہاتھ میں چلی پریاں آئی
ہاتھوں کو مہندی لگی ہوا حکم خدائی　　اب داؤد گھوڑے چڑھو تم اپنے بیاہی
نفل دوگانہ پڑھ لئے شکر منائی　　گھوڑے اوپر بیٹھ مجرے نے بار لگائی

۸ اندر یا میں ۹ دولہن ۱۰ دیر

حضرت علیؓ اپنے ہمراہ داؤد کو سخت دھوپ اور لوؤں میں لیکر بجانب شہر مصر راہی ہوئے۔ شہر مصر میں، شاہ روم کے لڑکے سے شادی کی تیاری ہو رہی تھی، کسی اجنبی کو بلا اجازت شہر کے حدود میں داخلہ کی ممانعت تھی۔ یہ لوگ مصر کے ایک زنانی شاہی باغ میں پہنچے جہاں مرد کا گزر و دخل نہ تھا۔ مالن باغ کی نگہبان تھی جو باغ کے دروازے میں بیٹھی تھی، باغ کے اندر داخل ہونے سے روک دی، جس کی وجہ حضرت علیؓ نے مالن کو کچھ نذر کرنے داؤد سے ارشاد فرمایا، لیکن داؤد مجبور تھا، پاس پائی نہ تھی، اپنی حالت پر آنسو بہایا، اور افسوس کے ساتھ کہنے لگا کہ میرے باپ جو بادشاہ تھے اور جن کے پاس دولت تھی وہ تو داخل بہشت ہوگئے، رہ گئی ماں، وہ تو بیچاری چکی پیس کر بسر کر رہی ہے۔

(۶)

دُھوپ پڑے دھرتی[۱] تپے تُو چلے | چلدئے شہر مصر میں دو یار جو[۲] چلے
جا پہونچے تھے مصر میں حشمت والے | مالن بیٹھی باغ کی دروازہ تلے[۳]
حضرت کھتے بار نہیں ڈوڈی کھولئے | لے کے دے اس کے نذر کچھ ہو تیرے پلے
اتنی سُن داؤد نے نس آنسو گھلے | جو ہم ہوتے بادشاہ کیوں آتے اکیلے
میری ماں بیسے لپسے میں رب کے حوالے | باپ چلے گئے بہشت میں حشمت والے

۱ زمین ۲ جوڑ ۳ پاس ۴ دروازہ

جب شاہ داؤد کو حضرت علیؓ نے رنجیدہ پایا تو خدا سے دعا کی، داؤد نے حضرت کی ایما سے خدا کا نام لے کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو ایک اشرفی ملی، وہ اشرفی مالن کو دی گئی۔ مالن اشرفی پاکر خوش ہوئی اور باغ کا دروازہ کھول دیا اور انھیں اندر لے گئی۔ حضرت علیؓ نے مالن کو اسلام سے مشرف فرمایا۔ مالن دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے ہی اپنا کام تک بھول گئی۔ اُس دن شہزادی کے لئے پھول چننے اور نہ گجرے گوندھے۔ حضرتؓ نے ہی گجرے گوندھے اور ایک چٹھی شہزادی کے نام لکھ کر گجرے میں لگائی، اور چٹھی میں تحریر فرمایا کہ تیرا پہلا منگیتر باغ میں آیا ہوا ہے، اب تجھ کو شاہ روم کے لڑکے سے بیاہ ہو کر نہ جانا چاہئے بلکہ اسی سے نکاح کر لینا چاہئے۔

(۷)

اشرفی لیکر ہاتھ میں مالن شرمائی | باغ دروازہ دیا کھول نے دیر لگائی
حضرت نے مسئلے کہے حدیث کی مالن پڑھائی | نورِ الٰہی بھر دیا مسلمان بنائی
نہ توڑے پھول نہ گوندھے ہار سب بھول گئی | حضرتؓ ہار گوندھے کر کے چترائی
بائی[۵] تجو بیٹی شدّاد کی میری چٹھی آئی | آیا تیرے باغ میں تیرا پہلا سائیں[۶]
جو تو جاوے روم میں جانے دوں ناہیں | آؤ حق پہچان دے کے ہوا حکم خدائی

۵ پڑھو ۶ دُلھا

مالن حسب معمول پھول کے گجرے شہزادی کے پاس لے گئی تو شہزادی نے اُس میں چٹھی پاکر خلوت میں جاکر پڑھی اور مالن کو ڈرا دھمکا کر سارا حال دریافت کر لیا اور فوراً اپنے وزیر مسمی ابراہیم کے نام ایک چٹھی اور حضرت علیؓ کی چٹھی کا جواب لکھ بھیجا کہ شہزادے داؤد کو باغ میں تنہا نہ چھوڑیے گا، میں حسب الحکم ضرور اس سے ہی شادی کر لوں گی چاہے کچھ ہو۔

(۸)

ابراہیم وزیر تو ہے فرزانہ | حضرت علیؓ ہے باغ میں دو جا پروانہ
بیٹھے رکھو باغ میں نہیں اور ٹھکانا | اُن دو لے کو چھوڑ کو نہیں اور کہیں جانا
مل جاؤں اسکے نام پہ چاہے بدل جاوے زمانہ

جب شادی کی تاریخیں قرار پائیں تو شاہ روم نے شادی کے لئے مصر جانے سے قبل نجومیوں سے شادی کے متعلق آنے والے واقعات دریافت کئے تو نجومیوں نے بیان کیا کہ وہاں داؤد اور حضرت علیؓ تشریف رکھتے ہیں چونکہ

وہ بیوہ کا لڑکا ہے اُس کا مقابلہ نہ کرنا چاہئے، بجز کہ یہ آسانی کسی اور جگہ لڑکی مل سکتی ہے لیکن اُس کو کوئی اور لڑکی نہیں مل سکتی اس لئے مناسب ہے کہ اُس لڑکی سے بیاہ کا ارادہ ترک کر دیا جائے۔

(۹)

کھڑے نجومی شاہ کے سلام سُنائی — مانگ بیاہ غریب کی تونے شرم نہ آئی
تجھے مل جائیں بہت سی اوجھیں ملتی ناہیں — مصر میں نیزہ گرد علی کا ہیں دیا سنائی
وہ بیوہ کا پُوت ہے اُسے ملتی ناہیں

جب شاہ روم نے نجومیوں سے یہ سُنا کہ وہ لڑکی داؤد کو ہی ملے گی تو اپنی کثیر فوج ہاتھی گھوڑے پیدل وسوار لے کر مصر کا رُخ کیا تاکہ اُسی لڑکی سے شادی کرلائے۔ وہاں پہنچنے کے بعد نجومیوں نے کہا کہ تیرا دشمن وہی داؤد ہے اسی تیری فوج میں بیٹھا تماشا دیکھ رہا ہے (چونکہ باوصف حضرت علیؓ کی ممانعت کے داؤد تماشا دیکھنے باغ سے باہر نکل کر شاہ روم کی فوج میں آگیا تھا) اور حضرت علیؓ بھی اس مقام پر تشریف لائیں گے تو یہ سُن کر بادشاہ روم کو یقین نہ آیا اور تحقیق ہونے تک نجومیوں کو قید میں رکھا۔ داؤد کی تلاش و گرفتاری کے لئے حکم دیا اور چاروں طرف پہرہ مقرر کر دیا۔

(۱۰)

کھڑے نجومی شاہ کے سلام سنائی — ہم کرے بہت سی تو مانے ناہیں
بیٹھا تیری فوج میں تیرا دشمن بھائی — بیگم جا، شاہ داؤد کو تونے ملتی ناہیں
یہاں شیر خدا آرہیں یہ دھوم مچائی — پکڑ نجومی کئے قید دی مشکی چڑھائی
اتنا حضرت کو دیکھ نہ لیوں چھوڑ دو نگا ناہیں — پہرہ کر دیا تعینات دیا حکم چڑھائی
اُس داؤد کو پکڑ لو کیوں دیر لگائی

تلاش سے داؤد کا پتہ نہ چلا تو اُس کی تصویر منگوا کر شناخت کرنے لگا۔ تصویر کی وجہ داؤد گرفتار ہو گیا اور بادشاہ روم جو ترکی ظالم بادشاہ تھا، داؤد کو پکڑ کر کٹھڑی بنائی اور فوج کے ایک مست ہاتھی کو داؤد پر کچلنے اور مار ڈالنے کے لئے چھوڑ دیا۔ لیکن ہاتھی داؤد کو دیکھ کر سلام کیا اور پیشانی زمین پر ٹیک دی اور اُس کٹھڑی کو سونڈ سے اُٹھا کر سر پر رکھ لیا۔ بہرحال یہ دیکھ کر ترک بادشاہ روم خوف زدہ ہوا، اُس کٹھڑی کو ایک کنوئیں میں ڈال دیا، اور اُس کو پتھر کی سِلوں سے پاٹ کر مُہر لگا دی، اور کہا کہ اب دنیا میں تیرا حامی کوئی ایسا نہیں جو تجھے بچائے، اب اسی کنوئیں میں سڑ گل کر مر جائے گا۔

(۱۱)

دروازہ بے کمان کا بڑی عقل بنائی — چاروں طرف فوج کھڑی ہو گئی نہیں دیر لگائی
ایک ایک کو پکڑ کے پھر باہر نکالی — اُس لڑکے شاہ داؤد کی تصویر ملائی
اُس لڑکے کو پکڑ لیا ظالم ترکائی — اُس لڑکے کو پکڑ کے کٹھڑی بندھوائی
خونی ہاتھی دیا چھوڑ نہیں دیر لگائی — ہاتھی مجرے کر رہا ہے سیس جھکائی — ماتھا پا پیشانی

گھڑی لیکر سونڈھ میں سیر اُوپر لگائی دیکھے روم کا بادشاہ لرزے تھرکائی
گھڑی اُٹھائی ہاتھ میں کنواں گردائی اُوپر سِل جھک دی تِد لگائی ڈھانک دی مہر
مُہر لگائی اپنے ہاتھ کی نا ہیں دیر لگائی ایسا تیرا کون ہے دُنیا کے ماہی درمیان
لو شہر کے مرے گا کنویں کے ماہی

مالن کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اُس نے سارا قصّہ شہزادی مصر کو سُنایا جس سے وہ بے حد پریشان ہو کر ایک چٹھی حضرت علیؓ کے نام لکھی کہ افسوس کی بات ہے کہ آپ تو بڑے بہادر اور سمجھ دار اور مشہور ہیں۔ لیکن آپ کو کچھ خیال نہ آیا کہ آپ نے گویا اپنے ہاتھوں داؤد کو کنویں میں گرا دیا۔ میں حشر کے دن آپ کی دامن گیر ہوں گی۔ اور اگر وہ (داؤد) مرجائے تو دُنیا میں آپ کی ہنسی اُڑاؤں گی۔

(۱۲)

بیگم چٹھی لکھ دی کر کے چترائی بڑے بہادر علیؓ تھے کچھ سمجھی نا ہیں دُلھن
اپنے ہاتوں کنواں میں دیا گردائی پلہ پکڑوں جناب میں چھوڑونگی نا ہیں
جو مرگیا بادشاہ تیری کروں ہنسائی دُلھا

جب حضرت علیؓ کے پاس شہزادی کی چٹھی پہنچی تو آپ نے تکبیر کا نعرہ لگایا اور نیزہ گاڑ دیا۔ مالن سے اُس باؤلی کا پتہ دریافت کیا جس میں داؤد کو ڈالا گیا تھا۔ مالن نے اُس باؤلی کا پتہ دیا۔ تب حضرتؓ نے باؤلی کے پاٹے ہوئے پتھروں پر مُصلا بچھا کر نماز دوگانہ پڑھی اور آواز دی کہ اے لڑکے اگر تو کنویں میں زندہ ہے تو جواب دے ورنہ اگر قضاء الٰہی سے مرگیا ہے تو پھوکچھ نہیں۔ حضرتؓ کی آواز سُن کر لڑکے نے اندر سے جواب دیا کہ حضرتؓ یہ کنواں نہیں ہے بلکہ باغ ہے۔ یہاں پریاں مجھے جھولا جھلا رہی ہیں اور اقسام اقسام کا میوہ کھلا رہی ہیں۔ یہ ایسا باغ ہے کہ آج تک میں نے اپنی عمر میں دیکھا نہیں۔ اِس وقت حضرتؓ نے باؤلی کی سِل پر اپنا نیزہ مارا جس کے اثر سے شاہ روم کی فوج کے نو سو گھوڑے اور نو سو سپاہی کٹ کر مرگئے۔ بادشاہ روم بے حد پریشان ہوگیا۔ نجومیوں نے شاہ کو پھر سمجھایا۔

(۱۳)

الف نام اللہ تو ہی جو رچی الٰہی نیزہ گاڑ رہا علیؓ نے دیا باغ ہلائی
مالن کو نسا غار کنواں ہے مجھ کو دیو بتلائی مالن حضرتؓ کو لے چلی نہیں دیر لگائی
سِل کے اُپر آن کے دیا مصلا بچھائی نفل دوگانہ پڑھ کے لیا شکر منائی
آواز دی حضرت علیؓ نے لڑکا بولا ناہیں جو بچہ زندہ ہو کنویں میں تو آواز سُنائی
جو مرگیا ہو قضا سے ہوا حکم خدائی اتنا سُن کے لڑکے داؤد نے سلام سُنائی
حضرتؓ کنواں نہیں یہ باغ ہے یہاں پریاں آئی مجھے پریاں جھولا دی رہی سب میوہ لائی
کبھی نہ گذری جگت میں اتنی عمر جو پائی حضرتؓ نے نیزہ مارا سل پہ دی اسمان چڑھائی
پڑی روم کی فوج میں بچ گئی دو ہائی نو سو گھوڑے کٹ گئے نو سو سپاہی

.لوٹے روم کا بادشاہ کیا آفت آئی   کھڑے برہمن سامنے سلام سُنائی

پھر جب حضرت علیؓ نے داؤد کو باؤلی سے باہر نکالا تو ایک چٹھی کے ذریعہ شہزادی کو اطلاع دی کہ میں نے تیرے دُلھا کو باؤلی سے باہر نکال لیا ہے وہ اب باغ میں بیٹھا ہوا ہے اُس کی نسبت کوئی فکر نہ کر۔ اب جلد یہاں باغ میں آجا شاہ روم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

(۱۴)

حضرتؓ چٹھی لکھے کر کے چترائی   یا نچو بیٹی شداد کی ہُوا حکم خدائی   پڑھو[1]
کنویں سے باہر لیا کاڑیوں بچی الہی   تیرا دُلھا بیٹھا باغ میں سندیا سنائی
تم جلدی آجاؤ باغ میں کیوں دیر لگائی   اس روم کو بادشاہ سے کچھ ڈرنا نا ہی

جب حضرت کی چٹھی شہزادی کو ملی تو اُس نے اپنی باندھی اور سہیلیوں کو جو اُس کے ساتھ رہا کرتی تھیں آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے کہا اور چھپ کر ایک مقام کو چھونے کے لئے شرط لگائی۔ کھیل شروع ہوا، سب چھپ گئیں تو شہزادی دروازہ لگا کر آہستہ سے ڈولی میں سوار ہو باغ میں پہنچ گئی، اور حضرت علیؓ کے قدموس ہو کر اسلام سے مشرف ہوئی اور کہا کہ ہم لوگوں کو جلد بغداد شریف جانا چاہئے، ورنہ تُرک ظالم بادشاہ روم ہم کو باغ ہی میں روک دے گا۔

(۱۵)

بیگم ڈولی بیٹھ کے باغچے آئی   بیگم پُوتؔ جو ئیے رہی تم کھاؤ ڈائی[3]   کھرمیا[2] آنکھ مچولی[3]
بیگم دو ڈی بیچ دی   باندھی نظر نہ آئی   دروازہ
ادھر اُدھر پھر گئی   جلدی ماعصر میں آئی
بیگم ہاتھ اُٹھا کر دیکھی کوئی نظر نہ آئی   بیگم دوڈی چھوڑ کے باغچے آئی
حضرت علیؓ کے قدم میں سر لیا جھکائی   تم پیالہ لُولُو دین کا دو شرح پڑھائی
جلدی چلو بغداد شریف کو ہیں باسنائی   یہ ہی روم کا بادشاہ ظالم ترکائی
تم کو جلدی ہیر کو باغ میں جاؤ دینہ نا ہی   اتنا سن چکے حضرت۔ بیگم سمجھائی   روکنا[5]

شہزادی کے مشورے پر حضرت علیؓ وہاں سے بغداد شریف جانے تیار ہوئے چنانچہ حضرتؓ اپنے دُلدُل پر سوار ہوئے اور گھوڑے پر داؤد نے شہزادی کو اپنے ساتھ بٹھایا۔ جب ایڑ لگائی تو دُلدُل ایک جست میں بائیس ہاتھ اور گھوڑا ایترہ ہاتھ کودا۔ جب شاہ روم نے دیکھا کہ شہزادی کو لیکر داؤد جا رہا ہے تو اُس نے کہا کہ ہم جس کو بیاہنے آئے تھے وہ بیاہ نہ ہو سکا۔ اب خواہ میری فوج ساری کٹ جائے لیکن تجھ کو جانے نہ دوں گا بلکہ مار دوں گا۔

(۱۶)

حضرت کا دُلدُل بائیں ہاتھ کودگیا گھوڑ کو دا ایترہ   دیکھے روم کا بادشاہ اُٹھ گیا ڈیرہ

بیگم لئے جا رہا ہے ساتھ میں دشمن مرا	میرے آگیا نظریں ہیں نے کنوئیں میں گیڑ	گرا یا
تو چلا یا بیگم لیکے بیاہ کھو دیا مرا	تجھ کو ماروں ہیر کے چاہے لٹ جاؤں ڈیرا	گھیر کے

جب شاہ روم نے داؤد کو شہزادی لے کر جاتے ہوئے دیکھا تو شاہ نے داؤد پر گولہ باری کا حکم دیا۔ حضرت علیؓ نے داؤد کے گھوڑے کے اطراف اسم اعظم پڑھ کر لکیر کھینچ دی تاکہ گولہ باری کا کوئی اثر نہ ہو لیکن داؤد نے غصہ میں اس لکیر کے حصار سے باہر ہو گیا، جس کی وجہ گولہ لگ گیا اور وہ مر گیا۔ شہزادی اس واقعہ سے متاثر ہو کر وہ بھی حصار سے باہر داؤد کے پاس آئی جس کی وجہ اس کے گولہ لگ گیا اور وہ بھی مر گئی۔ دلہا دلہن کی بے وقت موت سے حضرتؓ کو افسوس ہوا کہ بغیر نکاح کے ہی دونوں مر گئے۔ اس وقت خدا سے دعا کی کہ یا اللہ نکاح تک کم از کم چار گھڑی کے لئے انھیں زندگی بخش۔ خدا نے سُن لی اور زندگی عطا کی۔

(۱۷)

کار توڑ دی علیؓ کی کچھ سمجھا ناہی	گولہ لگ گیا داؤد کے گئے پران چکائی	لکیر	مر گیا
بیگم اچھلی کار سے لڑکے پر آئی	دوسرا گولہ لگ گیا بیگم کے تائی
دونوں کا ہو گیا خاتمہ یوں لکھی الہی	آکے حضرت علیؓ نے چھاتی لگائی
لئے اللہ بے شرح کر مرگیو گیا تیری خدائی	چار گھڑی کی زندگی اللہ سے پائی

حضرت علیؓ نے بغرض نکاح کھجور اور پھول وغیرہ لانے کے لئے اسی باغ میں تشریف لے گئے، اس اثناء میں دوسری راہ سے ان لوگوں کے لئے کھانا لے کر مالن یہاں پہنچی۔ حضرتؓ نے جب باغ میں مالن کو موجود نہ پایا تو اس کے انتظار میں باغ میں ٹھیرے رہے (چونکہ بلا اجازت باغ سے کھجور و پھول توڑنا مناسب خیال نہ فرمایا) ایک فقیر اس وقت وہاں پہنچ کر سوال کیا کہ مجھ پر تین فاقے گزر چکے ہیں، مجھے کھانا کھلایا جائے (یہ فقیر در اصل فرشتہ تھا جس کو خدا نے زندگی بخشنے بھیجا تھا)، تو باوصف خود ان لوگوں پر کئی فاقے گزرنے کے اپنا کھانا کھلا دیئے، تو فقیر نے شکرا دا کر کے ان دونوں کو سَو سَو برس کی عمر عطا کی، اور کہا کہ تجھے موت نہیں آئے گی اور وہاں سے غائب ہو گیا۔

(۱۸)

لے دیگچی ہاتھ میں جب سلے پائی	صاحب کھانا کھا چکے کیا شکر منائی
عمر جو سو سو برس کی انھیں دیا فرمائی	بیٹے شاہ جنید کے کبھی مرتے ناہی
اِتنا سائیں کہہ چکے نہ دئے دکھائی

مالن کی واپسی کے بعد حضرت علیؓ نے کھجور پھول لے کر واپس تشریف لائے، اثناء راہ میں حضرت علیؓ کو ملال ہی تھا کہ میں نے خدا سے صرف چار گھڑی کی ہی زندگی مانگی تھی لیکن اتفاق سے دیر ہوئی، افسوس کہ پھر وہ بغیر نکاح کے ہی مر گئے ہوں گے۔ لیکن یہاں آکر دیکھا تو انہیں زندہ پایا۔ حضرتؓ نے متحیر ہو کر داؤد سے دریافت فرمایا کہ تو نے یہ کیا عمل کر دیا اور جیسے زندہ رہ گیا، تو داؤد نے حضرتؓ سے سارا قصہ کہہ سنایا کہ ایک فقیر آیا تھا، اس کو میں نے اپنا کھانا جو مالن لائی تھی

کھلایا تو اُس نے ہمیں سَو سَو برس کی عُمر دے گیا۔

(۱۹)

بیٹے شاہ جُنید کے کیا عمل[1] کمایا اُجڑا گھر جُنید کا آج کس نے بسایا
اِتنا لڑکا سُن چکا جواب سُنایا حکم ہوا جناب سے ایک سائیں آیا
سالن کھانا لائی ہم نے نہیں کھایا عمر دے گیا سَو سَو برس کی وِیدا[2] نہیں آیا

[1] عمل کیا
[2] مرنے کا وقت

داؤد پھر حضرت رضؓ کی کلیہ کے حصار سے باہر نکل کر شاہ مصر کی فوج پر تلوار کھینچ کر ٹوٹ پڑا، اور بڑے زبردست کابلی روہیلوں ایک سو اٹھارہ اور شاہ روم کے بیٹے کو جو شہزادی سے شادی کرنے آیا تھا مار ڈالا۔

(۲۰)

لڑکا نکلا تتار[3] سے دل کیا دلیرا روم کی فوج میں جا بڑھا کھینچا شمشیرا[4]
بیٹا مارا روم کا بندھا سہرہ والا گلجہ[5] مارا کھیت میں ایک سو اٹھارا
حضرت علیؓ بھی بولے اب کر دو ٹالا

[3] لکیر
[4] تلوار
[5] کابلی

حضرت علیؓ ان دونوں کو لے کر میدانِ جنگ سے مصر تشریف لے گئے اور شداد شاہ مصر سے کہا کہ اب جلد نکاح پڑھا دو، تاکہ ہم لوگ بغداد شریف جلد واپس جا سکیں۔ چونکہ ہم لوگوں نے بے حد تکلیف اُٹھائی ہے۔

(۲۱)

حضرت رضؓ چلے دَلّوں[6] سے نہیں دیر لگائی جلدی آ گئے مصر میں ہو گئی روشنائی
شداد بادشاہ کو بولے اب سمجھو بھائی جلدی نکاح کر دو ہم کو دیا سُنائی
ہم جلدی جائیں گے بغداد شریف میں ٹی آفت آئی

[6] فوجیں

چنانچہ قاضی مُلا بلوائے گئے اور وکیل، گواہ رکھ کر نکاح کی تکمیل ہوئی اور بے حد خوشی منائی گئی اور بعد نکاح وہاں سے حضرت علیؓ دُلہا دُلہن کو لے کر نکل گئے۔

(۲۲)

قاضی مُلا آ گئے بڑی دُھوم مچائی شاہد وکیل کھڑے کرے نہیں دیر لگائی
حکم دیا شداد نے نکاح فرمائی لڑکے کی شادی میں بڑی خوشی منائی
وہاں سے حضرت رضؓ لیکے نکل گئے کچھ دیر نہ لگائی گھوڑوں پر سوار جو ہو گئے لیا شُکر منائی

حضرت رضؓ نے داؤد اور شہزادی کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور گھوڑے نے پر تھاپ ماری تو صرف تین گھنٹے میں بغداد شریف پہنچ گئے۔ داؤد کا چچا آمن بادشاہ دیکھا کہ داؤد شہزادی لے کر آ گیا تو اُس کو تعجب ہوا کہ آخر یہ لایا کیسے، کیوں مارا نہ گیا؟ داؤد کی ماں چکی پیسنے اور رو رو نے روتے اندھی ہو گئی، شہزادی بہو بن کر گھر میں آئی تو خدا کی قدرت سے اس کو بینائی عطا ہوئی اور

سب خوش ہوئے ۔ حضرت علیؓ نے اب واپس مدینہ شریف جانے کی اجازت چاہی تو داؤد حضرتؓ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ میرا چچا امن نے میرا تخت و تاج ، محل و فوج اور دھن دولت ظلم سے لے لی ہے وہ واپس دلوائی جائے تو مناسب ہے ۔

(۲۳)

الف نام اللہ تو ہی جو رچی الہی لڑکے کی آنکھ دے سچ دستی لگوائی
گھوڑے پہ تھا پ دیدی نہیں دیر لگائی سفر کیا تھا بہت سشیر جدائی
تین گھنٹے میں آگئے اپنی بستی کے ماہیؔ دیکھے امن بادشاہ دل سوچ پائی [۱] اندر
لڑکا شادی کر کے آگیا کس نے مارنا ہی اُس کی ماتا چکی پیس کے اندھی ہو جائی
جب بیگم آئی محل میں بڑی خوشی منائی حکم ہوا جناب سے دونوں اکھیاں کھل جائی
حضرت علیؓ بھی بولتے لڑکے کے تائیں لڑکے حکم دیدو حضرتؓ نے مدینہ جائی
ہاتھ جوڑ لڑکا کہے حضرتؓ کے تائیں حضرتؓ میرا چچا امن بادشاہ ظالم ترکائی
میرا محل لوٹ لیا سب آیا کھائی بارہ ہزار میری فوج ہے یہ دیتا ناہی [۲] دھن دولت

حضرت علیؓ ، امن بادشاہ کے محل میں تشریف لے گئے اور اُس کو کہا کہ داؤد کا تخت و تاج اور محل و دولت سب واپس کر دے ، ورنہ مجبوراً جنگ کرنی ہوگی ۔ امن بادشاہ نے حضرتؓ کو جب دیکھا اور حکم سُنا تو بخوشی داؤد کو سینہ سے لگا کر تخت و تاج حوالہ کر دیا ۔ حضرت علیؓ وہاں سے واپس مدینہ شریف تشریف لے گئے ۔ اس طرح شاہ داؤد کا قصہ تمام ہوا ۔

(۲۴)

حضرتؓ لڑکے کو لئے چلے دیوڑھی کے ماہیؔ حضرتؓ دیکھے امن کو دل سوچ پائی [۳] اندر آیا میں
حشمت ساری دیدئے ہیں دیا سنائی جو تو زور جائے گا یہاں ہوئے لڑائی
امن نے لڑکا لیا گود میں لیا چھاتی لگائی داؤد تجھ کو کر دوں بادشاہ میں ہوں سپاہی
حضرتؓ ساری اچھی کر گئے جب کری چڑھائی چلے مدینہ شریف کو نہیں دیر لگائی
قصہ داؤد کا دیا حضرتؓ نے بنائی

محمد جمال الدین حیدر

غزل

محبت میں خزاں بھی اک بہارِ جاودانی ہے
شبابِ شعلہ ساماں ہی امینِ کامرانی ہے

کسی کے غم کی میرے دل پہ کتنی مہربانی ہے
کہ میں ہوں شب کا سناٹا ہے اشکوں کی روانی ہے

جو آنسو دردِ فرقت میں نگاہوں سے ڈھلکتا ہے
وہی غم کا فسانہ ہے، وہی دل کی کہانی ہے

محبت میں جو زندہ ہے وہ ناکامِ محبت ہے
رہِ الفت میں مٹنا ہی حیاتِ جاودانی ہے

ترے رنگین جلووں کی یہ حشر آرائیاں! توبہ
نقابِ رُخ کے ہر اک تار میں رقصاں جوانی ہے

بہاریں رقص کرتی ہیں قفس کے گوشے گوشے میں
مجھے رنجِ اسیری ہی نشاطِ جاودانی ہے

نہ دن کو چین آتا ہے، نہ شب کو نیند آتی ہے
کسی کے حُسنِ رنگیں کی یہی تو اک نشانی ہے

نہ جانے کس کی نظروں کا فسوں ہے آج کل انورؔ
خموشی میں تکلم ہے، زباں میں بے زبانی ہے

منظور احمد انورؔ قریشی

تنقید و تبصرہ

۱۹۴۵ء کی منتخب نظمیں ۔ مرتبہ ادارۂ ادب لطیف لاہور۔ ادارۂ ادب لطیف کی جانب سے ہر سال اس قسم کے دلچسپ مجموعے شائع کئے جا رہے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ انتخاب اور ترتیب دونوں کے لحاظ سے گذشتہ مجموعوں سے بہتر ہے۔ اس قسم کے مجموعوں کی اشاعت سے ہمارے ادب کی رفتار کا صحیح طور پر اندازہ ہو سکتا ہے۔ یوں تو اکثر و بیشتر منتخبات ناقص ہوتے ہیں اور ان میں صوبہ جاتی تعصب اور جانب داری کی جھلکیں نظر آتی ہیں، اور بعض میں تو خلوص کی کمی بھی دکھائی دیتی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی اس قسم کے منتخبات تاریخ ادب کی ترتیب و تدوین میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ زیر نظر انتخاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر مہینے اردو کے رسائل میں جو بہترین نظمیں چھپی ہیں ان کو اس خاص مہینے کے عنوان ہی کے تحت درج کیا گیا ہے، اور مرتبین کا یہ دعویٰ ایک حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کہ نظموں کا انتخاب شعرا کا نام پڑھ کر نہیں کیا گیا بلکہ نظمیں پڑھنے کے بعد شاعر کا انتخاب کیا گیا ہے، اور جس کسی نے کوئی کام کی بات کہی ہے اسے نظر انداز نہیں کیا گیا۔ سال گزشتہ کی طرح اس سال بھی کتابوں کا انتخاب مجموعے کے آخر میں شامل کیا گیا ہے۔

مجلۂ کلیہ گلبرگہ مدیر مولوی محمد نصیر الدین صاحب ایم اے۔ بی ٹی۔ گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج سے ایک رسالہ شایع ہو رہا ہے جس کی تیسری جلد کا تیسرا شمارہ اس وقت پیش نظر ہے اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کے لکچرار اردو مولوی نصیر الدین صاحب ایم اے اپنے طلبا میں علم و ادب کا بہت اچھا ذوق پیدا کر رہے ہیں، اور توقع ہے کہ یہ رسالہ اپنی دلچسپیوں اور افادیت میں اسی طرح اضافہ کرتا رہے گا۔ اس شمارے میں بہمنی دور کے اردو ادب پر جو مضمون لکھا گیا ہے وہ خاص طور پر قابل ستایش ہے۔

انور نامہ مصنفہ میر محمد اسمٰعیل خاں ابجدی۔ مرتبہ مولوی محمد حسین محوی جونیر لکچرار اردو مدراس یونیورسٹی۔

یہ کتاب مدراس یونیورسٹی کے سلسلۂ اسلامیات کی ایک کڑی ہے، اور در اصل کلیات ابجدی کا پہلا حصہ ہے۔ ابجدی، نواب محمد علی خاں والاجاہ اول والی ارکاٹ کے دربار میں ملک الشعرا تھے۔ وہ علاقۂ مدراس کے قصبۂ چنگل پیٹھ میں پیدا ہوئے تھے لیکن ان کے آبا و اجداد بیجاپور کے رہنے والے اور مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ کے اعزہ میں شامل تھے۔ ابجدی نے اردو اور فارسی میں تقریباً دس کتابیں لکھی تھیں جن میں "انور نامہ" اس لئے بھی اور اہم ہے کہ یہ نواب والاجاہ کے معرکوں پر لکھی گئی ہے۔ اس طرح سے اس کتاب کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ فارسی زبان میں ہے اور مولف نے فارسی کی مشہور رزمیہ نظموں کے انداز میں اس کو مرتب کیا ہے۔ ابتدا میں مترجم نے چند صفحات کا دیباچہ اردو میں قلمبند کیا ہے جس میں ابجدی کے حالات اور تصنیفات پر اجمالی طور پر نظر ڈالی ہے۔ ضرورت تھی کہ کتاب کو مرتب کرتے وقت تاریخی واقعات کے متعلق ضروری حوالے اور تشریحیں بھی دی جاتیں۔ بحالت موجودہ یہ کام اس لئے قابل قدر ہے کہ اس سے دکن کے ایک دور افرا تفری کی نسبت ضروری تاریخی معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔

تحلیل نفسی اور تعبیر خواب مصنفہ سگمنڈ فرائڈ مترجمہ عبد الحی جمیل ایم۔ اے۔ ادارۂ دانش و حکمت۔ حیدر آباد۔

اردو کے جدید ادبی رجحانات میں سگمنڈ فرائڈ کی تحریروں اور تخیل کا خاص اثر پڑ رہا ہے۔ ضرورت تھی کہ اس کی اصل کتاب کا بھی اردو میں ترجمہ کر دیا جاتا، اور خوشی کی بات ہے کہ عبد الحی صاحب نے اس کی تکمیل کر دی ہے۔ لیکن اس

کتاب کے ساتھ خود مصنف اور اس کی دوسری تصنیفات کے متعلق ضروری معلومات کا اندراج بھی کیا جانا ضروری تھا۔ اگر اس کے دوسرے ایڈیشن میں یہ اضافہ کردیا جائے تو اردو داں، اور خاصکر وہ لوگ جو فرائڈ کی اہمیت اور اس کی تحریروں کی خصوصیات سے ناواقف ہیں اس کتاب سے پوری طرح مستفید ہوسکیں گے۔ یہ کتاب چار ابواب پر منقسم ہے۔ پہلے مقدمہ ہے جس میں نفسیات پر بحیثیت سائنس بحث کی گئی ہے، پھر پہلا باب شروع ہوتا ہے جو تحلیل نفسی اور تعبیر خواب سے بحث کرتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے ابواب میں تعبیر خواب کی وضاحت کی گئی ہے، اور چوتھا باب تلازم اختیاری کے لئے وقف ہے۔ کتاب اگرچہ ایک نفسیاتی موضوع پر لکھی گئی ہے لیکن دوسرے تعلیم یافتہ افراد بھی اس کو پڑھ کر سمجھ سکتے ہیں۔

شیطان

از قیس رامپوری۔ ناشر ہندستانی پبلشر دہلی۔

اس ناول میں قیس صاحب نے یو۔ پی کے ایرانی اور نوابوں کی کمزوریاں بے نقاب کی ہیں۔ زنانہ امیروں کے خبط اور ان کی خود غرضیوں اور بد نفسیوں کو بڑے عمدہ پیرایے میں نمایاں کیا ہے۔ ساتھ ہی اس امر کی کوشش کی ہے کہ ایسے گھرانوں کی مسلمان خواتین کے اعلیٰ کردار کو واضح کیا جائے۔ ناول کی ہیروئین ایک علمی گھرانے کی ایک ایسی پاکباز خاتون ہے جو اپنے خاندان کے ظالم اور خود غرض امیروں کے مقابلہ میں اپنی شرافت اور ایثار نفسی کا اعلیٰ ثبوت دیتی ہے۔

اس ناول کا پلاٹ بہت دلچسپ ہے اور کردار نگاری فنی نقطۂ نظر سے قابل تعریف ہے۔ اردو کے جدید ناولوں میں امید ہے کہ اس کو کافی مقبولیت حاصل ہوگی۔

لکھنؤ کا دبستان شاعری

از ڈاکٹر محمد ابو اللیث صدیقی۔ ناشر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ۔

یہ ضخیم کتاب جو ۶۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ دراصل مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے بطور مقالہ قلمبند کی گئی تھی، اور اب مسلم یونیورسٹی کی طرف سے وہاں کے سلسلۂ مطبوعات میں شایع کی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۰ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے، جن میں پہلا باب تمہیدی ہے اور اس میں لکھنؤ کے حکمرانوں کے مختصر سے حالات درج کئے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں لکھنؤ کے تمدن پر نہایت ہی اجمال کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، اور ایران کا جو اثر لکھنوی معاشرت اور ادب و شاعری پر پڑا ہے اس کی طرف سرسری طور پر اشارے کئے گئے ہیں۔ یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس پر عبدالحلیم شرر نے ایک مبسوط کتاب قلمبند کی تھی جو "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" کے نام سے چھپ چکی ہے اور بعض جامعات میں بطور نصاب پڑھائی جاتی ہے۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر ابو اللیث نے اس باب کی تیاری میں اس سے استفادہ نہیں کیا۔ ورنہ یہ باب اتنا مختصر نہ رہنے پاتا۔

زیر نظر کتاب کا تیسرا باب اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ لکھنویت کیا ہے اور دراصل اس امر کی چھان بین میں مرتب نے صحیح ذوق سے کام لے کر لکھنویت کے تعین کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ چوتھے باب میں اودھ کے حکمرانوں کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ پانچواں باب دہلی کے ان شعرا کے تذکرہ پر مشتمل ہے جو وہاں سے ہجرت کرکے لکھنؤ چلے آئے اور دراصل ان ہی کی آمد اور قیام لکھنؤ کے باعث لکھنؤ کا ایک جداگانہ دبستان شعر و سخن وجود میں آیا۔ ایسے شعرا میں تقریباً چودہ اساتذۂ سخن کے حالات اور ان کی خصوصیاتِ کلام پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ان ہی میں اردو کے مشاہیر سخن مثلاً میر، سودا، میر حسن، سوز، جرات اور انشا، و مصحفی جیسے شاعر شامل ہیں۔ یہ باب بہت طویل ہے اور سَو سے زیادہ صفحات اس کے لئے وقف کئے گئے ہیں۔

اس کے بعد دو باب ناسخ اور آتش اور ان کے سلسلے کے شاعروں سے بحث کرتے ہیں۔ آٹھواں باب سلسلۂ مصحفی سے متعلق ہے۔ نویں باب میں لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر نظر ڈالی ہے، اور چونکہ اس موضوع پر شبلی نعمانی کا موازنہ انیس و دبیر ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے مصنف نے کوشش کی ہے کہ

اپنی کاوش کے ذریعہ سے اس میں کچھ اضافہ کیا جائے! اس کتاب کا آخری باب آخری دَور کے لکھنوی شعراء کے لئے وقف ہے۔ ان میں بعض ایسے شعراء بھی شامل ہیں جو ابھی زندہ ہیں اور ان کے متعلق اظہار رائے میں مصنف نے کافی بے باکی اور حسنِ ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ کتاب کے آخری حصہ میں دو ضمیمے بھی شریک ہیں۔ ایک لکھنؤ کے بعض غیر معروف شعراء سے بحث کرتا ہے اور دوسرے کے ذریعہ سے لکھنوی شعراء کے سلسلوں کو شجروں کے طور پر ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں فہرست ماخذات بھی شریک ہے لیکن اس کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس کے آخر میں کوئی اشاریہ درج نہیں کیا گیا ہے، حالانکہ تحقیقی کتابوں میں اس کا ہونا ضروری ہے اور اشاریے کے شمول کے بغیر کتاب کی افادیت نصف کے قریب گھٹ جاتی ہے۔

جلیل نمبر مجلۂ عثمانیہ

از حسن الدین احمد ایم۔ اے۔

امام الفن نواب فصاحت جنگ جلیل مرحوم لکھنؤ کے دبستان سخن کے آخری بڑے شاعروں میں سے تھے، اور اعلیٰحضرت آصف جاہ سابع سلطان الشعراء کے استاد ہونے کی حیثیت سے ان کا رتبہ عہد حاضر کے اساتذۂ سخن میں بہت بلند تھا۔ ان کی وفات کے بعد سے اب تک اردو زبان کے مختلف رسائل وجرائد نے ان کے متعلق اپنے اپنے خاص نمبر شایع کئے ہیں لیکن طلبائے جامعہ عثمانیہ کے ترجمان مجلۂ عثمانیہ کا زیر نظر شمارہ جو تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہے اپنی گونا گوں خصوصیات کی وجہ سے ان تمام خاص نمبروں پر فوقیت رکھتا ہے" اور واقعہ یہ ہے کہ یہ بجائے خود حضرت جلیل پر ایک مستند کتاب ہے جو آنے والی نسلوں کو حضرت جلیل سے متعلق اُن کے معاصرین کے افکار و آرا کا ایک بہترین ذخیرہ ثابت ہوگی۔ اس مجموعہ میں چالیس سے زیادہ مضامین نظم و نثر شریک ہیں جن میں سے اکثر و بیشتر ایسے اصحاب کے لکھے ہوئے ہیں جو جلیل سے ذاتی طور پر واقف تھے اور جن کی قلمبند کردہ معلومات اور خیالات آئندہ حیاتِ جلیل کے مرتب کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔ یہ مجموعہ باتصویر شایع ہوا ہے، اور اس کے مرتب کرنے میں مولوی حسن الدین احمد صاحب نے بڑی تلاش و جستجو اور سلیقے سے کام لیا ہے۔ پنجاب کے مشہور مصوّر خان بہادر عبد الرحمن چغتائی سے جلیل کے ایک شعر کا رنگین مرقع تیار کرا کے اس کی زیب و زینت میں اضافہ کیا ہے، اور خود امام الفن کی بڑی اچھی تصویریں بھی جمع کر دی ہیں۔ ایک تصویر ایسی ہے جس میں اعلیٰحضرت سلطان الشعراء اور استاد السلطان حضرت جلیل دونوں موجود ہیں۔ ایک تصویر ایسی بھی ہے جس میں حضرت جلیل کے ساتھ حیدر آباد کے عہد حاضر کے دوسرے مشاہیر شعراء مثلاً نواب مفتی ضیاء یار جنگ بہادر ضیاء، نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز، نواب تراب یار جنگ بہادر سعید، نواب قدرت نواز جنگ بہادر، نواب شہید یار جنگ بہادر شہید اور دیگر اصحاب اور جلیل صاحب کے خاندان کے افراد بھی شریک ہیں۔ اس مجموعہ کے مضامین میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ نواب ہوش یار جنگ بہادر کا مضمون جو "جانشین امیر مینائی" کے عنوان سے شریک ہے بہت دلچسپ ہے حکیم الشعراء حضرت امجد حسین امجد کا قطعۂ تاریخ بھی قابل ذکر ہے، اور رسالے کے آغاز میں خود اعلیٰحضرت سلطان العلوم کا ارشاد فرمایا ہوا وہ مادۂ تاریخ رحلت بھی درج کیا گیا ہے جو حضرت جلیل کے لوح مزار پر کندہ کیا گیا ہے۔ دیگر مضامین میں "حضرت جلیل کا رنگ تصوف و حکمت" از مفتی رحیم الدین صاحب اور "نظریۂ حسن و عشق" از تمکین کاظمی صاحب اور "حضرت جلیل کی اصلاحیں" از مونس احمد صاحب اچھے پایے کے مضامین ہیں۔

لائق مرتب نے مختلف اصحاب سے جلیل کے کلام پر مختلف پہلوؤں مثلاً غزل گوئی، نعت گوئی، تاریخ گوئی، خمریات اور جدید شعری رجحانات وغیرہ پر بھی کافی مفید اور پُر از معلومات مضامین قلمبند کرا کے اس مجموعہ میں درج کئے ہیں۔ اس کی اشاعت سے اردو شعر و سخن کی کتابوں میں ایک قابل ذکر اضافہ ہوا جس کے لئے مرتب قابل مبارک باد ہیں۔

مرقع علم الصحرا

از عبد الحمید خاں مددگار ناظم جنگلات ملک سرکار عالی مطبوعہ دار الطبع حیدر آباد۔

یہ کتاب حیدر آباد کے محکمۂ جنگلات کے علم دوست ناظم

مولوی سید عبدالواحد صاحب کی تحریک پر لکھی گئی ہے اور اس کے آغاز میں انھوں نے ایک پیش لفظ بھی لکھا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے مرتب ایک واقف کار اور صاحب ذوق عہدہ دار ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب کو پانچ بابوں میں تقسیم کیا ہے اور ان سے پہلے ایک دیباچہ لکھا ہے جس میں اس امر کو خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے کہ جنگل قومی دولت ہوتے ہیں اور ان کا وجود زندگی کے لئے لازمی ہے۔ پہلا باب تربیت صحرا کے لئے وقف کیا گیا ہے، اور یہ کافی طویل ہے۔ اس میں درختوں کے اگانے کے طریقے اور اصول بہت عمدہ پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں صحرا کے مصرف سے بحث کی گئی ہے، اور یہ سمجھایا گیا ہے کہ صحرا کی پیداوار کتنی قسم کی ہوتی ہے اور اس کا استعمال کن کن طریقوں سے ہونا چاہئے۔ تیسرا باب فن تعمیر کے عنوان سے لکھا گیا ہے، اور اگرچہ عنوان مناسب نہیں ہے تاہم اس کے تحت یہ دکھایا گیا ہے کہ جنگلوں میں سڑکیں کہاں کہاں اور کس قسم کی بنائی جائیں، اور ان کے ذریعہ سے صحرا سے کس طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی سلسلہ میں عمارتوں کی تعمیر، ان کی داغ دوزی اور ان سے متعلقہ مختلف اجزا کا اندازہ اور وزن وغیرہ سمجھا گیا ہے۔ چوتھا باب دراصل دفتری ضروریات سے متعلق ہے اور اس میں صحرا کے قوانین، ضابطے اور دستور العمل وغیرہ پیش کر دئے گئے ہیں۔ ان سے نہ صرف اس محکمہ کے ملازمین استفادہ کر سکتے ہیں بلکہ وہ لوگ بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جن کو صحرا سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق ہوتا ہے۔ پانچواں اور آخری باب صحرا سے متعلق متفرق معلومات پیش کرتا ہے۔ اس میں اوزان اور پیمانوں کے ضابطے، لکڑیوں وغیرہ کے نرخ نامے، حفظان صحت اور دیگر تختہ جات شریک کئے گئے ہیں۔ آخر میں ایک ضمیمہ ہے جو دراصل ایک فرہنگ اصطلاحات ہے جس میں انگریزی فنی اصطلاحوں کے اُردو مترادفات دکھائے گئے ہیں۔ یہ فرہنگ بہت ہی مفید اور ضروری تھی۔ اس کے مطالعہ سے عوام بھی یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ہمارے ملک کے معمولی درختوں مثلاً جامن، آم، تلسی، بھلاواں، بیل پھل، پلاس، پانگرہ، دھتورہ، ریٹھہ اور ریتیا پھل وغیرہ کے فنی اصلاحی نام کیا ہیں۔

اس کتاب کی زبان میں دفتریت زیادہ پائی جاتی ہے اور جگہ جگہ مقامی لب ولہجے کا اثر نمایاں ہے۔ لیکن ان نقائص کے باوجود یہ کتاب اُردو دُنیا کے لئے ایک غیر معمولی نعمت ثابت ہوگی۔

تاریخ زبان عربی از ڈاکٹر عبدالمعید خان۔ ناشر اُدارۂ اشاعت علوم وفنون حیدرآباد۔

یہ ۵۴ صفحات کا ایک مضمون ہے جس میں عربی زبان کے لسانیاتی ارتقا پر نظر ڈالی گئی ہے اور مختلف زمانوں مثلاً عہد جاہلیت۔ عہد اسلامی۔ عہد اموی۔ عہد عباسی اور اس کے بعد سے اب تک اس زبان نے جو جو ترقیاں یا تبدیلیاں حاصل کیں ان کو اجمال کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر ایک بہت بڑی کتاب لکھی جا سکتی ہے اور ضرورت ہے کہ لکھی جائے۔ اس کتاب کے آخر میں امکنہ اور اسماء کے دو مختصر اشاریے بھی شریک ہیں جو اس کی افادیت میں اضافہ کا باعث ہیں۔ توقع ہے کہ ڈاکٹر عبدالمعید خان صاحب یا عربی کے کوئی اور فاضل اس موضوع پر آئندہ ایک مبسوط کتاب لکھ کر موضوع کی اہمیت کا حق ادا کریں گے۔ بحالت موجودہ یہ چھوٹی سی کتاب بھی اپنے اندر کافی افادیت رکھتی ہے۔

ادارہ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی	نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
سرگزشت حاتم	۱۲۸	۲	۰	۰	سچ کا جادو	۴۸	۰	۴	۰
سرگزشت غالب	۹۴	۰	۸	۰	طبیعاتی کائنات	۶۸	۰	۸	۰
نظام الملک	۴۰	۰	۶	۰	متاع سخن	۱۲۴	۰	۱۲	۰
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	۰	کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰	بادۂ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
ارمغان جذب	۱۲۰	۰	۱۲	۰	سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
سونیلی ماں	۴۸	۰	۴	۰	ایمان سخن	۱۴۰	۰	۱۲	۰
سر سید احمد خان	۱۶	۰	۲	۰	فیض سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
سر سالار جنگ	۴۸	۰	۶	۰	مرقع سخن جلد اول (۵۵ تصاویر)	۵۰۰	۵	۰	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۲۵	۱	۴	۰	" " دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
صحت کی جھاڑن	۱۲۲	۱	۴	۰	نقد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
اقبال نمبر	۲۶۸	۱	۴	۰	نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰	گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۳	۰	مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰	من کی دنیا	۱۴۵	۱	۰	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	۰	مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰	۰	محرم نامہ	۱۱۲	۱	۰	۰
حیدر آباد	۸۵	۰	۱۰	۰	نذر دکن	۱۵۳	۱	۴	۰
عماد الملک	۴۰	۰	۶	۰	روح غالب	۱۴۰	۲	۸	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۶	۰	عاصمہ	۲۰۰	۱	۴	۰
" " دوسری کتاب	۵۶	۰	۶	۰	دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	۰	۰	آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
کاغذ کی ناؤ	۱۴۰	۱	۴	۰	اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۲	۱	۱۲	۰
فن تقریر	۹۲	۰	۱۲	۰	نمود زندگی	۲۱۶	۱	۸	۰
مختصر تاریخ دکن	۱۴۲	۱	۰	۰	سرگزشت ادارہ	۳۰۰	۰	۱۲	۰
ہندوستانی تمدن	۱۴۰	۳	۸	۰	میر محمد مومن (۲۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
پودوں کی کہانی	۸۰	۰	۱۰	۰	بلقان	۳۲	۰	۳	۰
مہ لقا	۱۰۰	۱	۰	۰	خطابیات	۱۱۳	۰	۱۲	۰
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۶	۰	علم خانہ داری	۱۵۰	۱	۰	۰
رسائل طیبہ	۳۹۰	۲	۸	۰	چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
سلک گوہرین	۴۰	۰	۴	۰	انوار	۱۶۸	۱	۸	۰
تاریخ ادب اردو	۱۷۲	۱	۸	۰	نشمش مانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
اشوک اعظم	۵۶	۰	۸	۰	گارساں دتاسی	۱۲۸	۱	۴	۰
باتیں	۸۴	۱	۰	۰	رات کا بھولا	۱۶۸	۱	۰	۰
یورپ جنگ سے پہلے	۲۱۸	۲	۸	۰	سکندر جاہ	۲۴	۰	۴	۰
شاد اقبال	۱۷۹	۲	۸	۰	بلاغت	۵۲	۰	۸	۰
آریائی زبانیں	۱۰۲	۱	۰	۰	ادارہ سفر ۱۹۴۱ء میں	۲۰۰	۰	۸	۰
ظام علی خان	۳	۰	۴	۰	ناصر الدولہ	۲۴	۰	۴	۰
تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	۲۹۰	۵	۰	۰	افضل الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
عرب اور عربستان	۵۶	۰	۱۰	۰	نواب میر محبوب علی خان	۳۲	۰	۴	۰

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۲
نشان ٹپہ برطانیہ ۴۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم

جلد ۹ — بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۶ء — شمارہ ۱۰

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے دستگیری پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شایع ہوا

اس طرح محو تھا کہ اسے بلوائیوں کے پہنچنے کی خبر اس وقت ہوئی جبکہ وہ اس کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ زرد چہروں کا ایک ہجوم جن کی صورتیں دیوانگی، بہیمیت اور خونریزی کی ہوس سے انتہائی بھیانک ہو گئی تھیں۔ سروں سے بلند بے شمار تلواریں، برچھیاں اور لاٹھیاں اور تباہی مچانے کے لئے بیقرار ہاتھ۔ یکایک دوسری سمت سے اسی طرح کے چہروں کا ایک ملا جلا انبوہ چمکتی ہوئی تلواروں اور لہرائی ہوئی لاٹھیوں کا ناچتا ہوا انبوہ ——— بے تحاشا دوسرے گروہ پر ٹوٹ پڑا اور مردہ لاشوں پر نئی لاشیں بچھ گئیں۔ بیدردی سے قتل کرنے والوں نے جمیل کو بھی گھیر لیا اور ایک ساتھ اس کے سینے کو ہندو اور مسلمان تلواروں نے چھلنی کر دیا۔ وہ منہ کے بل لاشوں پر گر پڑا اور وہ دل جو دونوں جماعتوں کی محبت میں ایک ہی طرح سے دھڑکتا تھا، ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ آنکھیں جو دونوں جماعتوں کی تباہی پر یکساں آنسو بہاتی تھیں ان ہی کے ہاتھوں زندگی کا نور کھو چکیں۔ اور وہ بہادر ہاتھ جو دونوں بھائیوں کی خدمت کرتے تھے ہمیشہ کے لئے بے جان اور سرد ہو گئے مگر ان تمام لاشوں کے درمیان پڑی ہوئی وہ بہادر لاش اب بھی محبت کا سبق دے رہی تھی۔ چاروں طرف سرخ لہو بہہ رہا تھا۔ اس سرخ سرخ خون میں ترکی ٹوپی اور گاندھی کیپ ڈوب گئی تھی اور دور ——— افق کی شفق سے سرخ سویرا جھانک رہا تھا۔

نجمہ سمیع

تصحیح :-

جولائی و اگست ۱۹۴۶ء کے مشترکہ سب رس میں "سمتان دوم کنڈہ" کے مضمون کے تحت صفحہ (۶۷) سطر ۱۳ میں سومیشور راؤ کی بجائے سہواً راميشور راؤ چھپ گیا ہے۔ حسبہ تصحیح فرمالی جائے۔

ادارہ

غریب کا دل

ماں! ایک گھونٹ پانی! بیمار بچے نے کراہتے ہوئے کہا۔

اس آواز کے ساتھ ہی سلیمہ تڑپ کر اٹھی ایک پیالے میں تھوڑا سا پانی ڈالا اور بچے کے حلق میں دھیرے دھیرے ٹپکایا۔ بچے کی تکلیف اور بے چینی اس سے دیکھی نہ گئی اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور اس کا دل کسی نامعلوم خوف کے بوجھ سے ڈوبنے لگا۔ آج سترہ دن ہوئے کہ اس کا بچہ بھیانک بخار میں مبتلا تھا۔ دوا کو کون پوچھے یہاں تو ضروریات زندگی کے تک لالے پڑے ہوئے تھے۔ اور پھر دیہات کا مقام جہاں حکیم اور ڈاکٹر نایاب ہوتے ہیں اور ہوں بھی تو ان کی زر پرستی کب انہیں اتنی اجازت دیتی ہے کہ غریبوں کا مفت علاج کریں۔ اس میں شک نہیں کہ شہروں کی بہ نسبت دیہات میں انسانیت اپنے کمال عروج پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ سادہ لوح لیکن ہمدرد پڑوسی ہر روز بچے کی تیمارداری میں ایسا ہی حصہ لیتے جیسے وہ ان کا اپنا ہی بچہ ہے۔ لیکن صرف ہمدردی ہی سے اگر مریض صحت یاب ہونے لگیں تو یہ فلک بوس ہسپتال آخر کس مرض کی دوا ہیں۔ سب کی یہی متفقہ رائے تھی کہ بچے کو شہر لیجا کر وہاں کے ہسپتال میں شریک کروایا جائے۔ سلیمہ بڑی الجھن میں تھی۔ شہر کے ہسپتال میں کیسے شریک کروائے۔ بیماری اور مفلسی کے اس اہم معاشی مسئلہ کو وہ کیسے حل کرے۔ یہ اس کی حد امکان سے باہر تھا۔ وہ ابھی اسی ادھیڑبن میں تھی کہ اس نے سنا کہ شہر سے کوئی قابل ڈاکٹر رام داس نامی آئے ہیں۔ ہر قسم کے زہریلے بخار کا علاج کرنے میں انہیں خاص مہارت ہے۔ اور ان کا مکان بھی کوئی دور نہیں یہی چار پانچ میل کا فاصلہ ہوگا۔ چار پانچ میل کا فاصلہ دیہات والوں کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس فرحت افزا خبر کو سن کر اس کو کتنی مسرت ہوئی اس کا اندازہ صرف وہی لگا سکتے ہیں جنہیں خود بھی کبھی اس قسم کا تجربہ ہوا ہو۔ امید کی ایک ہلکی سی کرن اس کے دل میں پیدا ہوئی۔ اور وہ خوش آئند تخیلات میں کھو گئی۔ اس کو ایک گونہ اطمینان قلب حاصل ہو گیا۔ تمام رات گزر گئی لیکن بچے کی بے چینی بدستور رہی۔ وہ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ آہ! معصوم نو شگفتہ کلی! جس نے زندگی کی ابھی صرف تین ہی بہاریں دیکھی تھیں۔ آج سلیمہ کو وہ رات رہ رہ کر یاد آرہی تھی۔ جب کہ ندیم اب کی طرح بیمار تھا۔ اس کے سر میں سخت چوٹ آئی تھی۔ اس وقت قاسم زندہ تھا۔ بار حیات کو ان دونوں نے مل کر کس طرح بانٹ لیا تھا۔ کیسا ہی بوجھ کیوں نہ ہو اس کو جب دو آدمی مل کر بانٹ لیتے ہیں تو وہ کتنا ہلکا ہوجاتا ہے۔ انتہائی پریشانی کے باوجود بھی وہ ایک دوسرے کو تسلی دیتے۔ جب کبھی سلیمہ مامتا سے مجبور ہو کر زار و قطار رونے لگتی تو عین اسی وقت قاسم اس کی گریہ و زاری کو اس کے خدا پر ایقان اور اعتقاد کامل کے فقدان پر محمول کرتا۔ عورت کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی تازیانہ نہیں۔ سلیمہ فوراً اپنے ہوش میں آجاتی۔ اور بارگاہ الٰہی میں گھنٹوں سر بسجود ہو کر دعائیں مانگا کرتی۔

لیکن آج —— آج —— وہ تنہا تھی۔ اس کا دنیا میں سوائے اس بچے کے اور کوئی نہ تھا۔ آج ایسے ماضی کی ساری باتیں دھیرے دھیرے یاد آرہی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ میری قسمت ہی میں شاید دکھ لکھا ہوا ہے۔ قسمت کے لکھے کو کون کیا کرے۔ پیدا ہوئی تو ماں کی موت کا تحفہ لائی۔ اور ماں کے بعد بچے کی زندگی سوتیلی ماں کی موجودگی میں کس عذاب میں گزرتی رہتی ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ دنیا بھر کی تکلیفیں سہیں۔ مظالم برداشت کئے۔

اب دو سال ہوئے ذرا سکون نصیب ہوا تھا کہ زندگی نے پھر ایک پلٹا کھایا۔ گویا زندگی کے باغ میں بہار کا جھونکا آئے ہوئے ابھی تین برس بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ شہر میں طاعون کی وبا پھیلی اور اس شدت سے کہ آٹھ آٹھ، دس دس جنازے ہر روز ایک ایک محلے سے نکلتے۔ آہ! میرا قاسم بھی اسی منحوس وبا کا شکار ہو گیا۔ اور میری

کشتیٔ حیات کو حوادث کے منجدھار میں چھوڑ کر مصائب و آلام
کے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے تن تنہا چھوڑ گیا۔ اس کو
اولاد کی کتنی تمنا تھی؟ لیکن ابھی وہ ندیم کی زندگی کی ایک
بہار بھی دیکھنے نہ پایا تھا کہ موت کی پُرسکون وادی میں
روپوش ہو گیا۔

ندیم کی پرورش کس طرح ہوگی اور تعلیم کا بار کون اٹھائے گا۔
یہ وہ سوالات تھے جو سلیمہ کو گھنٹوں پریشان رکھتے۔ لیکن
سلیمہ ایک عورت تھی اور عورت صبر و استقلال کا دامن
آخر تک بھی نہیں چھوڑتی۔ اپنی کفایت شعاری اور خوش سلیقگی
سے اپنی اور اپنے بچے کی کشتیٔ حیات کو ساحل مراد تک پہنچانے
کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتی لیکن اس بیماری سے اس مہلک
بخار سے اس کو کس طرح نجات ملے۔ یہ اس کے بس کا روگ نہ
تھا۔ ویسے بیماری میں تو روپے پیسے ہی سے کام چلتا ہے۔
دیہات کے خوش پوش اور تعلیم یافتہ نونہالوں کی رائے تھی
کہ ندیم کو ٹائیفائڈ ہو گیا ہے۔ اسے مقوی غذا، زود اثر دوا
اور مکمل آرام کی سخت ضرورت ہے اور اسے شہر کے کسی
بڑے ہسپتال میں شریک کروانا چاہیے۔ لیکن سلیمہ مجبور تھی
وہ کیا کرے۔ عام سرکاری دواخانوں کی لاپروائی سے وہ
بخوبی واقف تھی۔ اور ذاتی طور پر صرفہ کر کے علاج کروانا اس کے
امکان سے باہر تھا۔ ایک مکان اور چند زیورات اس کی
کل کائنات تھی۔ مکان کو تو قرض خواہوں کے تقاضے سے
تنگ آ کر کئی برس ہی نیلام کر دیا تھا۔ اور زیورات وہ بھی
یونہی تنگدستی کا شکار ہو گئے۔ اب اس کے پاس اگر کچھ تھا تو
عقیدت کے چند آنسو۔ اور عاجزانہ التجائیں۔ محبت کا بحر بیکراں۔

رام داس کی شہرت سن کر وہ بھی رام داس کے ہاں
گئی۔ لیکن وائے بدنصیبی! ہر دفعہ یہی جواب ملا کہ "ڈاکٹر صاحب
گھر پر نہیں ہیں۔ ابھی ابھی باہر گئے ہیں اور جلد واپس ہونے کی
توقع نہیں۔" وہ اور بھی دو تین ڈاکٹروں کے پاس گئی لیکن
سبھوں نے وہی تُلا سا جواب دیا جیسی کہ آج کل کے ڈاکٹروں
اور حکیموں سے توقع ہے۔ یعنی وہی "فیس کا مسئلہ اور

ہندوستان کا معاشی سوال درپیش تھا۔ ایک نے تو علانیہ
سامنے ہی نرس سے مخاطب ہو کر (انگریزی میں) اس کی
ہیئت کذائی، مفلسی اور اس کا اپنے ساتھ لے چلنے
کے لیے مصر ہونے پر نہایت ہی ظریفانہ انداز میں خوب خوب
مضحکہ اڑایا۔ اور اس پر نرس کے فلک شگاف قہقہے جلتی پر
سہاگہ کا کام کر رہے تھے۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ ان کی
ہمدردی اپنے ہم جنسوں سے زیادہ غیر جنسوں سے [illegible]
سے زیادہ دولتمندوں سے ہوتی ہے۔ ان کے حسن سلوک
پر کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

"ہوں جس کے جیب میں چند نقرئی ٹکے
کریں حاضر وہی نرسوں کی نیازمندیاں"

بیچاری (سہاگن) ہی کیسے اس کلیہ سے مستثنیٰ رہ
سکتی تھی۔ اس نے بھی وہی کیا جو اس کے ہم پیشہ کرتے ہیں۔ سلیمہ
کا دل اس بیدردی سے پاش پاش ہو گیا۔ بیشک وہ انگریزی
نہ جانتی تھی لیکن کیا وہ تیور بھی پہچان نہ سکتی تھی۔ وہ ایک قیافہ
شناس تھی بلکہ قیافہ شناس۔ کچھ سلیمہ ہی پر موقوف نہیں
ہر ہندوستانی عورت بہترین قیافہ شناس ہوتی ہے کیونکہ
وہ ایک ایسے ماحول میں رہتی ہے جہاں ہر وقت اسے
زمانے کے تیور پہچاننے ہوتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی سلیمہ
ہمت نہ ہاری۔ ایک مرتبہ وہ پھر رام داس کے ہاں گئی
لیکن پھاٹک کے اندر داخل ہونے سے قبل ہی دربان نے
روکا اور تحکمانہ لہجہ میں پوچھا "کون ہے؟" اور پھر سلیمہ
کو دیکھ کر (مضحکہ خیز انداز میں) "اجی خالہ! آپ کس واسطے
یہاں تشریف لائی ہیں۔" "آہ! ڈاکٹر صاحب سے ملنے آئی
ہوں۔" "چلا او۔ رکھ دو ایک چونی۔ ہم تمہیں جلد ڈاکٹر صاحب
تک پہنچا دیتے ہیں۔ دیکھتی نہیں ہو کتنی بھیڑ ہے۔ اتنی
بھیڑ میں سے گھس کر جانا کیا آسان کام ہے؟"

سلیمہ نے ان انسانیت سوز سوالات کا کوئی جواب
نہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں اپنی مفلسی اور بیمار ندیم کی تصویر
کھنچ گئی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ گلوگیر آواز میں جواب

دیا کیوں تنگ کرتے ہو بھائی! میں خود ہی مصیبت زدہ ہوں میرے
پاس تو دوا اور فیس کے لئے بھی پیسے نہیں۔ تمھیں کہاں
سے دوں؟ چھوڑ دو بابا! میں غریب ہوں اور دکھیا۔
لیکن چوکیدار کے ہوس پرست دل پر اس التجا کا کوئی اثر نہ ہوا
اور ہوتا بھی کیونکر کیونکہ انسان جب ایک دفعہ نیکی کے راستے سے
ہٹ جائے اور اسے جلدی کوئی راہبر نہ ملے تو پھر اس کا راہ راست
پر آنا محال ہو جاتا ہے۔ وہ گناہوں کی پوٹ بن جاتا ہے اور
پھر اسے کوئی قوت بچا نہیں سکتی۔ اس نے ایک فحش گالی
دی اور زور سے پھاٹک کے دروازے کو بند کر لیا۔ سلیمہ چیخی
چلائی اپنے آپ کو برا بھلا کہا کہ آخر میں نے کیوں ایک حقیر
سکے کے لیے دل چھوٹا کیا۔ کیا وہ میرے لال کی زندگی سے بڑھ کر
ہے۔ "کھولو۔ پھاٹک کھولو..." چوکیدار یہ لو چونی۔ اس نے
اپنی ہتھیلی میں سے چونی نکالتے ہوئے کہا۔ چوکیدار کی آنکھیں
چمکنے لگیں۔ اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "آؤ ہاں جی! میں تمھیں
راستہ بتلا دوں۔" سلیمہ چوکیدار کی رہنمائی میں ڈاکٹر صاحب
تک پہنچ گئی۔ ڈاکٹر صاحب بہت مصروف تھے۔ دیکھ کر کہا "ٹھہر
ٹھہر! وہیں ٹھیرو!! میں ابھی آتا ہوں۔"

"جلدی کیجیے۔ ڈاکٹر صاحب میرا بچہ زندگی اور موت
کی کشمکش میں..." اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی
اور وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ آہ ممتا! موت کے بھیانک تصور
ہی سے اس کی روح لرز اٹھی۔ اس منحوس لفظ کو وہ اپنے
لال کے متعلق کیسے استعمال کرے۔ بالآخر سب سے نپٹ کر
ڈاکٹر صاحب نے اس کی طرف توجہ کی۔ کیفیت پوچھی۔ اور
نسخہ لکھ دیا۔ لیکن مریض کو دیکھنے کی التجا کی گئی تو ٹال گئے
کہ اس وقت موٹر موجود نہیں ہے اور پھر یہ کہا کہ کیا تم ہماری
فیس دے سکوگی۔ سلیمہ کا دل اس سوال سے پاش پاش ہو گیا۔
فیس ——— وہ اپنے بچے کی جان بچانے کے لئے اپنی جان
کی بھی بازی لگا دے گی۔ لیکن وہ کیا کرے مفلسی اور بیماری
کے عقدے کو وہ کیسے حل کرے۔ ممتا آہ ظالم ممتا نے
پھر ایک مرتبہ منت و سماجت کروائی خوشامد کروائی تھی کہ
چرن چھوائے اور اس سر کو ایک انسان نما شیطان کے آگے
جھکایا جو آج تک کسی کے آگے خم نہ ہوا تھا۔ آہ عورت مجسمہ
خودداری! لیکن اس کی خودداری بھی ممتا کی چوکھٹ پر
قربان ہو چکی تھی۔ لیکن اس پر بھی ظالم، ناخدا ترس رام داس
پر کوئی اثر نہ ہوا۔ انھوں نے جب دیکھا کہ یہ کسی طرح ٹلتی ہی
نہیں تو سخت کلامی سے پیش آئے چوکیدار کو ڈانٹا کہ تو نے
اسے اندر آنے ہی کیوں دیا۔ کلب جانے کا وقت ہو رہا تھا
اور اسی بحث و تکرار میں دیر ہو رہی تھی آج کلب میں ان کا
خاص پروگرام تھا۔ وہ فوراً اٹھے اور موٹر میں بیٹھ کر چل دیے
اور سلیمہ منہ تکتی ہی رہ گئی ——— وہ ناکام اور دل شکستہ
لوٹی۔ راستہ بھر وہ دنیا اور اہل دنیا کا غریبوں اور
بالخصوص دکھیا ماؤں کے ساتھ بیدردانہ سلوک پر غور
کرتی رہی۔ وہ ان ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھی کہ معاً
اسے اپنے بچے کا خیال آیا کہ نہ جانے وہ کتنی بار "ماں
ماں" پکار کر تھک چکا ہے۔ وہ گھر پہونچی۔ تیز قدموں کے ساتھ
بجلی کی سی سرعت کے ساتھ راستے میں دو دفعہ موٹر سے ٹکر
ہوتے ہوتے بچ گئی۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں، نمناک
آنکھوں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ گھر پہنچی۔ لیکن
آہ! اس کے پہنچتے پہنچتے تک ندیم کی شمع حیات گل ہو چکی
تھی۔ وہ ایک ایسی دنیا میں پہنچ چکا تھا جہاں سکون ہی سکون
ہے۔ ابدی سکون! جہاں امیر، غریب میں کوئی امتیاز نہیں
جہاں مذہب اور سماج کا کوئی خوف نہیں ——— جہاں
خود غرض رشتہ دار، مطلبی آشنا دوست و احباب کا گزر نہیں۔
پڑوسن جس کی حفاظت میں وہ بچہ کو دے گئی تھی
بچہ پہ جھکی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ سلیمہ نے اس کی سرد
پیشانی اور نیلے ہونٹوں کو محسوس کیا اور ان پر مہر مادری
کی مہر لگا دی۔ وہ دیوانہ وار اس سے لپٹ گئی، دیر تک
اس کے بالوں کو چومتی رہی، رخساروں کے بیشمار بوسے
لئے ——— پھر ایک وحشیانہ انداز میں قہقہہ لگایا اور پھر
گھر سے باہر نکل گئی ——— وہ پاگل ہو گئی ——— اس جانکاہ صدمے

جس کے لئے اس نے دنیا کے بیدردانہ مظالم سہے تھے اپنے ہی عزیزوں کی لعن طعن سنی تھی۔ آہ! وہ جاچکا تھا اس کی زندگی کا آخری سہارا شوہر کی موت کے بعد عورت کی زندگی کا آخری سہارا اس کی اولاد ہوتی ہے اگر عورت اس کو بھی کھو دے تو وہ خودکشی نہ کرے تو اور کیا کرے۔ قاسم کی موت کے بعد اسے سکتہ سا ہو گیا تھا لیکن لوگوں نے جب بار بار اس کی توجہ ندیم کی طرف منعطف کروائی تو وہ اپنے ہوش میں آئی تھی اور بے اختیار ہو کر اس سے لپٹ کر اتنا روئی کہ عرش والے بھی کلیجہ مسوس کر رہ گئے ہوں گے لیکن آج وہ کس کے لئے زندہ رہے۔ کیا دنیا کے لئے؟ اس دنیا کے لئے جس نے اسے ٹھکرایا تھا جس نے اس کے دکھ میں اپنی زبان کے تیر و نشتر چبھا چبھا کر اور بھی اضافہ کیا تھا جو اس کے شوہر اور بچے کی موت کا باعث اسے ٹھہرواتی ہو۔ وہ سوسائٹی کے اصولوں سے واقف تھی جس کی لاٹھی اس کی بھینس" فضا میں ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی۔ جو تنہا ظالم سماج پر ایک طنز تھا۔ آہا ہا! میرے لال! تم بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اچھا کیا، بہت اچھا کیا، ورنہ تمہارے باپ اکیلے رہ جاتے گھبراؤ نہیں میں بھی تمہارے پیچھے آتی ہوں۔ یہ کہہ کر وہ ایک موٹر کے سامنے آ گئی، موٹر کی رفتار بہت تیز تھی لیکن سلیمہ کے دل کی رفتار اس سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ ڈرائیور نے کئی ایک بار ہارن دئے آخر میں غش گوئی پر اتر آیا۔ بہری ہے یا قضا کھینچ کے لائی ہے کمبخت کب سے ہارن دے رہا ہوں سنتی ہی نہیں، مرنا ہے تو زہر کھا کر مر، ہمیں کیوں کوتوالی کے پھندے میں پھنساتی ہے۔

موٹر پر بیٹھنے والے حضرات نے جو یہ شور و غل سنکر جھانکا اور ڈرائیور سے کہا۔ چلاؤ بھی یار، تم بھی نرے ڈرپوک اور پرلے درجے کے بیوقوف ہو۔ اگر اسے اپنی جان کی پرواہ ہوگی تو خود ہی ہٹ جائے گی۔ عموماً عورتیں بہت سخت جان ہوتی ہیں تم دیکھ لینا اس کے چوٹ بھی نہ آئے گی۔ لیکن افسوس کہ ان کی پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی۔ اور اس بیچاری کی روح پہیے کے ایک زوردار ٹکراؤ کے ساتھ ہی قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس میں قوت ہی کیا تھی۔ مسلسل فاقہ کشی اور سونے پر سہاگہ بچے کی تیمارداری اور پریشانی اور اب ایک ہلکی سی ضرب بھی اس کے بربط زندگی کا تار تار کرنے کو کافی تھی۔ وہ اس پاپی بے رحم دنیا سے جا چکی تھی۔ اپنے معبود حقیقی کے پاس۔ ستم کی فریاد کرنے کے لئے ____ کہ اس دنیا میں کسی دکھیا غریب کی موت بھی سرمایہ داروں کے لئے لمحۂ تفریح ہے۔ وہ اپنے معبود سے اس ناانصافی اور ستم کا شکوہ کرے گی۔ جنٹلمین صاحب کے ساتھ ایک میم صاحبہ بھی تشریف فرما تھیں جو یہ چیخ کی دلدوز آواز کے ساتھ ہی! اوہ! مائی گاڈ! کہہ کر جھانکیں اور پھر یہ دیکھ کر کہ چیخنے والی کا ساز حیات خاموش ہو چکا ہے، اوہ! پور تھنگ ڈائیڈ (غریب بیچاری مر گئی) کہہ کر ایک ادائے نسوانیت سے اچھلیں تو ان جنٹلمین کی عینک کو بھی اپنے ساتھ لے گھسیٹا۔ پھر سنبھل کر ڈرائیور کو کہا کہ موٹر کی رفتار تیز سے تیز تر کر دی جائے تاکہ مقام واردات پر پولس اور پبلک جمع نہ ہونے پائے۔ موٹر کے پہیے ایک سماج کی ٹھکرائی ہوئی بیوہ کو کچل کر پھر تیز رفتاری سے چلنے لگے۔ یہ ہے ہماری سماج کا سلوک کمزور اور بے بس ہستیوں کے ساتھ۔

بقول نورالحسن صاحب :-

"وہ سماج جو ظالم و قتور کے سامنے دم نہ مارے
اور کمزور کو آنکھیں دکھائے۔ یہاں تک کہ
اس کا جینا دشوار کر دے۔ قابل صد نفریں ہے
وہ سماج جو انسانی حقوق کو غصب کرے خواہ
وہ صنف نازک کے حقوق ہی کیوں نہ ہوں"

کب تک ہماری سماج کمزوروں پر ظلم کرے گی۔ آخر کب تک سوسائٹی ایک بیوہ اور یتیم کے ساتھ یہی سلوک روا رکھے گی۔ اے سماج کے ٹھیکہ دارو! کیا تمہارے پہلو میں ایک دھڑکتا ہوا دل نہیں اور اگر ہے تو اس میں احساس کیوں نہیں۔ کیوں ایک ہی محلہ کے رہنے والوں میں مفلسی اور تونگری کا اتنا زبردست تفاوت ہے۔ کیوں ایک گھر میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں اور دلکشیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے اور کیوں اس کے مقابل کی ہی زندگی سسک سسک کر آہیں بھر بھر کر دم توڑ رہی ہے۔ کیوں ایک فرقہ عیش و طرب میں ناز و نعم میں زندگی گزارتا ہے تو دوسرا کیوں اس قدر مفلوک الحالی، پریشانی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتا ہے۔ کیوں خدا کی مخلوق کے دل میں جسے دنیا عیسیٰ مسیح سمجھتی ہے جذبہ ہمدردی نہیں، ایثار نہیں۔ کیوں وہ ایک سرمایہ دار مریض کو مفلس مریض پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس لئے نا، کہ وہ فیس نہیں دے سکتا صحت یاب ہونے کے بعد ایٹ ہوم نہیں دے سکتا۔ ریڈیو سیٹ یا موٹر بطور تحفہ نہیں دے سکتا۔ لیکن کیا حقیقت اور انصاف پسند طبیبوں کا یہی لائحہ عمل ہے کہ وہ جسے چاہیں از سر نو حیات بخش دیں اور جسے چاہیں موت کی پر خار وادی میں قبل از وقت دھکیل دیں۔ انسانی زندگی کو ایک کھیل سمجھیں۔ بولو! کیوں تمہاری حمیت اتنی گر گئی ہے کہ تم سیم و زر کے چند ٹکڑوں کی خاطر انسانی زندگی کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتے ہو۔ کیا تم کسی کے باپ بھائی بیٹے نہیں ہو اگر ہو تو پھر تم میں دوسروں کے درد کا احساس کیوں نہیں۔ کیا تم انسانی زندگی کے رگ و ریشے سے اسلئے واقف ہوتے ہو کہ اسکا علم تمہیں تلاش معاش سے بے نیاز کر دے۔ میڈیکل کالج میں شریک ہونے سے قبل تمہیں سوچ لینا چاہئے کہ یہ پیشہ روزی کمانے کا ذریعہ ہونے سے کہیں زیادہ مخلوق خدا کی خدمت اور ہمدردی کا ہے۔ حال ہی میں میری ایک سہیلی نے مجھ سے سوال کی کہ میں میڈیکل کالج جانا چاہتی ہوں، میرٹ اگین ... جاتی ہیں لکھ بھیجا ہے کہ "اگر تم اپنے آپ کو خلق خدا کی خدمت کرنے کے قابل پاسکو تو ضرور جاؤ۔

آج کل جدھر دیکھئے جھگڑے نظر آتے ہیں کہیں مزدور اور سرمایہ دار جھگڑ رہے ہیں تو کہیں مظلوم اور ظالم میں کش مکش جاری ہے۔ ایک طرف حاکم و محکوم میں رسہ کشی ہو رہی ہے تو دوسری طرف زبردست و زیر دست میں جنگ ہو رہی ہے۔ غرض ہر طاقت دوسری طاقت سے برسرِ پیکار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کا یہ کارخانہ جھگڑوں کا بارود خانہ ہے۔ جھگڑوں کا بانی ابلیس ہے جس نے اللہ میاں سے جھگڑنا شروع کیا، اور شاید دُنیا شیطان کے بہکانے میں آگئی۔ آج کی دُنیا جھگڑوں کا گھر ہے لیکن اس وقت دُنیا کے جھگڑوں سے زیادہ توجہ کے محتاج گھر کے جھگڑے ہیں۔ آئیے اب ہم اپنی روزمرہ زندگی کا جائزہ لیں ـــــ جب ہم لوگ اپنی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کہیں میاں بیوی میں ٹھنی ہے تو کہیں ساس بہو میں اُلجھن پڑی ہے کسی جگہ داماد و خسر میں کھنچاؤ ہے تو کہیں باپ بیٹوں میں ان بن ہے۔ ادھر چھوٹے بھائی بہنوں میں جوتی پیزار چل رہی ہے تو اُدھر پڑوسیوں میں تو تو میں میں ہو رہی ہے۔ اسی لئے ہمیں جھگڑوں کا نفسیاتی تجزیہ کرنا ہے۔ یہ جھگڑے آخر ہوتے کیوں ہیں؟ پھر یہ کیسے شروع ہوتے ہیں اور کہاں ختم ہوتے ہیں۔

اگر ہم ان جھگڑوں کے اسباب پر غور کریں تو اُن کی تہہ میں انسان کی معمولی کمزوریاں نظر آئیں گی۔ جہالت فساد کی جڑ ہے۔ اسی سے انسان میں غصہ اور نفرت، بدکلامی اور بدسلوکی، غلط فہمی اور بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ پہلے پہل آپ کو یقین نہ آئے گا کہ کیا واقعی جہالت انسان کو اتنا نقصان پہنچا سکتی ہے! آپ نے بڑی بوڑھی عورتوں سے یہ کہانی ضرور سُنی ہوگی کہ کس طرح ایک جاہل آدمی نے طیش میں آکر اپنی بیوی بچوں کو قتل کر دیا۔ کہتے ہیں کہ کوئی صاحب مونچھوں پر تاؤ دیتے چلے جا رہے تھے۔ اُن کی اس حرکت کو کسی خان صاحب نے دیکھ لیا۔ کہنے لگے "میاں تمھیں کیا حق ہے کہ میرے آگے مونچھوں کو تاؤ دیں"۔ راہ چلتے نے جواب دیا "خان صاحب! جس طرح آپ مونچھیں رکھ سکتے ہیں ویسے میں بھی مونچھیں رکھنے کا حق رکھتا ہوں۔ رہا میرا مونچھوں کو تاؤ دینا، بھئی آپ ہی بتائیے اُس سے آپ کو کیا نقصان پہنچا؟" اتنی سی بات پر خان صاحب طیش میں آگئے۔ کہنے لگے "میرے سامنے مونچھوں کو تاؤ دینے کی ہمت۔ اگر ہمت ہے تو آؤ، دو دو ہاتھ لڑ لیں"۔ یہ کہہ کر خان صاحب نے اپنی تلوار میان سے نکال لی۔ ہوشیار راہ گیر نے خان صاحب سے کہا "بھائی! میں آپ کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوں، لیکن اگر ہم دونوں میں سے کوئی کٹ مرے تو اُس کی بیوی بیوہ اور بچے یتیم ہو جائیں گے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ پہلے دونوں اپنی اپنی بیویوں اور بچوں کو قتل کر دیں اور اس کے بعد جی کھول کر لڑیں۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ دونوں نے اپنی بیویوں اور بچوں کو قتل کیا ہے، طے پایا کہ قتل کرنے کے بعد خون میں کپڑا رنگ لیں"۔ غرض دونوں اسی مقام پر واپس آنے کا وعدہ کر کے چل کھڑے ہوئے۔ خان صاحب جذباتی تھے۔ سیدھے گھر گئے اور آؤ دیکھا نہ تاؤ بس بے گناہ بیوی اور معصوم بچوں کی جانیں لیں۔ خان صاحب غصہ کی آگ کو خون کے دھارے میں بجھا کر اُسی مقام پر آ پہنچے۔ خان صاحب کا حریف بھی اُس وقت تک آ چکا تھا۔ وہ بڑا چلتا پرزہ تھا۔ اُس نے کبوتر کے خون میں کپڑا ڈبویا، اور اِدھر اُدھر گھوم کر پھر وہیں آگیا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ کیا تم نے اپنی بیوی بچوں کو قتل کر دیا۔ دونوں نے شہادت کے طور پر خون میں لتھڑا ہوا کپڑا دکھلایا۔ خان صاحب کو یقین آگیا کہ اُس نے بھی میری طرح اپنی بیوی اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا۔ لیکن اُس راہ چلتے کو معلوم تھا کہ خان صاحب جو کہتے ہیں کر دکھاتے ہیں۔ ضرور انھوں نے اپنی بیوی اور بچوں کو قتل کر دیا ہوگا۔ اب اُس نے خان صاحب سے سوال کیا کہ "بھائی یہ تو بتائیے کہ

ہم دونوں میں جھگڑا کس بات کا ہے؟" خان صاحب نے جواب دیا کہ "مجھے آپ کا موچھوں کو تاؤ دینا پسند نہیں!" اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راہگیر نے خان صاحب سے کہا "تو لیجئے میں خود اپنی موچھیں نیچی کئے دیتا ہوں۔" اتنی سی بات پر خان صاحب خوش ہوگئے اور یہ سمجھ کر کہ میری جیت ہوئی ہے" راہ چلتے کو چھوڑ دیا ــــ اب آپ ہی بتائیے کہ حقیقت میں جیت کس کی ہوئی؟ کیا جہالت نے بیوی بچوں کو قتل نہیں کروایا؟ کیا جہالت نے غصہ کی آگ کو بھڑکا کر خون سے اپنی پیاس نہیں بجھائی؟ واقعہ یہ ہے کہ ہر جگہ جہالت ہی نے خاندانوں کو تباہ و تاراج کیا ہے۔ افسوس تو اس کا ہے کہ بعض تعلیم یافتہ حضرات اور خواتین میں بھی جہالت پائی جاتی ہے۔ تعلیم پانے کے بعد بھی بعض لوگ اپنے کو برتر اور دوسروں کو کمتر سمجھتے ہیں اور اس احساس برتری سے جھگڑے ہوتے ہیں تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب اولاد، والدین کو نیچی نظر دان سے دیکھنے لگے جنھوں نے خون پسینہ ایک کرکے تعلیم دلوائی، تو گھر کے نظام میں انتشار ہونا ضروری ہے۔ تعلیم دلوانے والے والدین کو کمتر سمجھنا، جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟ دراصل یہی جہالت جھگڑوں کی بانی ہے۔

جہالت کا ایک لازمی نتیجہ غصہ ہے، جس سے جھگڑا پیدا ہونا ضروری ہے۔ جب انسان غصہ میں آتا ہے تو اس کے جذبات ذہن پر غالب آجاتے ہیں۔ عقل سے زیادہ جذبہ کام کرنے لگتا ہے، ایسے وقت انسان اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ غصہ سے انسان بد دماغ ہوجاتا ہے، وہ ذراسی بات پر جھگڑنے لگتا ہے۔ غصہ ایک آگ ہے جو گھر کے سکون کو تنکے کی طرح خاک میں ملا دیتی ہے۔

عام طور پر معمولی باتوں ہی پر جھگڑے ہوتے ہیں۔ اکثر گھروں میں دیکھا جاتا ہے کہ میاں بازار سے بڑی محنت کرکے بیوی کے لئے کپڑے خرید کر لاتے ہیں، لیکن بیوی، میاں کی دوڑ دھوپ کی قدر کرنے کی بجائے کپڑوں کو ناپسند کردیتی اور بلا سوچے سمجھے یہ کہہ دیتی ہے کہ "تمھیں تو کبھی مال خریدنا نہ آیا" ظاہر ہے کہ شوہر پر اس کا ردعمل برا ہوگا، اور وہ یا تو بیوی کے لئے آئندہ کوئی چیز نہیں خریدے گا، یا اس سے نفرت کرنے لگے گا، جس سے جھگڑوں کا ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح اکثر اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ شوہر جب دفتر سے تھکا ماندہ گھر واپس آتا ہے تو بیوی گھر کا دکھڑا شروع کردیتی ہے کہ فلاں نے یوں برا بھلا کہا۔ پڑوس کے بچے نے اُن کے بچے کو خوب پیٹا۔ گھر میں بڑے بچے نے چھوٹے بچے کو تھپڑ رسید کیا، وغیرہ وغیرہ ان تمام دکھڑوں کو سن کر میاں کا بدمزاج ہوجانا یقینی ہے۔ یہ بدمزاجی گھر کے سکون کو ختم کردیتی ہے۔

بعض اوقات گھر کے جھگڑے بے توجہی سے شروع ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ میاں گھر سے باہر جا رہے ہیں، ایسے وقت اگر بیوی اُن سے پوچھے کہ "آپ کہاں جارہے ہیں؟" اور اگر میاں یہ جواب دے کہ "ہم کہیں بھی جارہے ہیں آپ کو اس سے کیا!!" تو یہ معمولی بے توجہی میاں بیوی کے تعلقات کو بری طرح متاثر کرے گی اور دونوں میں رنجش پیدا ہونا یقینی ہے۔ اسی طرح اگر ماں بیٹے سے یہ پوچھے کہ "بیٹا، تم کونسی کتاب پڑھ رہے ہو؟" اور اس کا بیٹا اگر یہ کہہ دے کہ "یہ کتاب آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی، پھر کیا بتاؤں" تو اس بے توجہی سے جھگڑوں کی بنیاد پڑے گی۔

گھر کے اکثر جھگڑے بدگمانی سے ہوتے ہیں۔ ساس بہو کے جھگڑے اسی بدگمانی کا نتیجہ ہیں۔ ماں سمجھتی ہے کہ جب سے بہو آئی ہے، اُس کا بیٹا جس کو اس نے پال پوس کر بڑا کیا، چھن گیا۔ اس کو یہ گمان ہوتا ہے کہ اب اُس کا بیٹا اُس سے زیادہ بیوی سے محبت کرتا ہے، اس لئے وہ بہو سے بدگمان ہوجاتی ہے کہ اُس نے لگا بجھا کر اس کے بیٹے کو اپنا بنا لیا۔ ایک اور وجہ یہ ہے کہ ساس اپنے مقابلے میں بہو کو کم سمجھ اور کم تر سمجھتی ہے، جس سے بدمزگی پیدا ہوتی ہے۔ بہو دیکھتی ہے کہ نئے گھر میں شوہر کے سوا سب اُس کے لئے نئے ہیں، اس لئے وہ شوہر ہی کے آگے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑتی ہے۔

بعض اوقات شوہر کے زعم پر بہو، ساس سے بے توجہی برتتی ہے جس سے تعلقات روز بروز بگڑتے جاتے ہیں۔ اگر بہو اپنے شوہر سے زیادہ، ساس کی دلجوئی کرے اور اسی طرح ساس بہو کو اپنے بیٹے سے زیادہ چاہنے لگے تو گھر کے جھگڑے بڑی حد تک دور ہو سکتے ہیں۔

گھر کے جھگڑے جھوٹی بڑائی سے بھی ہوتے ہیں۔ اکثر بیبیاں سسرال میں بڑی ڈینگیں مارتی ہیں جیسے میکے میں وہ سونے کے جھولے میں جھول رہی تھیں۔ اگر بیوی سسرال کی بجائے میکے کو اپنا گھر سمجھے تو اس گھر میں ضرور جھگڑے ہوں گے۔ جب بیوی میکے ہی کی بڑائی کرتی ہے تو میاں اس بڑائی سے زچ ہو کر میکے اور بیوی سے بدظن ہو جاتا ہے اور گھر جھگڑوں کا مرکز بن جاتا ہے۔

جھگڑوں کا ایک اور سبب فضول خرچی ہے۔ فضول خرچی انسان کو مقروض بنا دیتی ہے اور قرض انسان کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے۔ اکثر گھروں میں دیکھا جاتا ہے کہ میاں کی آمدنی سو روپے ہے اور ان کی بی بی اپنی آرائش و زیبائش پر فضول خرچی کر رہی ہیں۔ یہ فضول خرچی پہلے پہل برداشت کر لی جاتی ہے اور جب وہ اپنی حد سے گذر جائے تو میاں بیوی کے تعلقات کا بگڑنا یقینی ہے۔

جھگڑوں کا ایک اہم سبب جھوٹ ہے، وہ رائی کا پہاڑ بناتا ہے۔ جھوٹ، پھوٹ کا گھر ہے۔ لگائی بجھائی اس کا پیشہ ہے۔ سسرال اور میکے کی لڑائیاں اسی سے شروع ہوتی ہیں۔ اگر بیوی اپنے ماں باپ کو غلط طور پر یقین دلا دے کہ شوہر اور ساس اس پر ظلم کر رہے ہیں، اور اگر اس کے ماں باپ ان جھوٹی باتوں کو سچ مان لیں، تو سسرال اور میکے میں جھگڑے ہونا ضروری ہیں۔

جن گھروں میں جھگڑے ہوتے ہیں، وہاں دیکھا گیا ہے کہ لڑکے گھر میں نہیں رہتے، بلکہ اپنا سارا وقت باہر گزارتے ہیں۔ غرض، جس گھر میں سکون نہیں، وہ گھر نہیں، جہنم ہے۔

سعیدہ سلطانہ

(لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے نشر کیا گیا)

فیضِ نگاہ

مریخ و مشتری و قمر دیکھتا ہوں میں　　اے مرزمیں! یہ آج کدھر دیکھتا ہوں میں
اہلِ نگاہ ہو نہ کوئی تو سحر رہی کیا؟　　فیضِ نگاہ ہے کہ سحر دیکھتا ہوں میں
افتادگیٔ قطرۂ شبنم کا یہ اثر!؟　　سارے چمن میں رنگِ دگر دیکھتا ہوں میں
سب تیرگی میں نورِ سحر دیکھتے ہیں اور　　روپوش تیرگی میں سحر دیکھتا ہوں میں
ہوتی نہیں نگاہِ محقق بہ طرزِ عام　　ہر چیز کو بہ نوعِ دگر دیکھتا ہوں میں
ہیں ہر ایک شے پہ ادائے نمودِ حسن!　　کہتی ہے دیکھ دیکھ! اگر دیکھتا ہوں میں
پایانِ کار ہی ہو آغازِ کار کیوں؟　　سارا نظام زیر و زبر دیکھتا ہوں میں
محرومِ ستیزِ شبنم برگِ سمن سے آج!　　خورشید تابدارِ سحر دیکھتا ہوں میں
منزل مرے قدم پہ نہ قربان جائے کیوں!　　منزل پہ آ کے اور ادھر دیکھتا ہوں میں

اف! اہلِ ہند اور نہ جھے ساتھ اے قمر
کس پر پڑی ہے تیری نظر دیکھتا ہوں میں

قمر

خواتین کے مسائل

انسانی زندگی کی تکمیل کے لئے قدرت نے مرد اور عورت کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ ہماری زندگی کی گاڑی دونوں کے تعاون عمل سے چلتی ہے۔ مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ لیکن ہر ایک کی ذمہ داری علیحدہ علیحدہ ہے جس طرح ان کی ذمہ داری مختلف ہے اسی طرح ان کے مسائل بھی جدا جدا ہیں، مرد کے ذمہ روزی حاصل کرنا ہے، جس پر رہنے سہنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، غرض کہ زندگی کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کا دارومدار ہے۔ اگر مرد فکر معاش نہ کریں تو پھر زندگی کے نظام میں خرابی پیدا ہو جائے گی۔ اس لئے مرد اپنا سارا وقت روزی فراہم کرنے میں صرف کرتے ہیں اور ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ روزی فراہم کرنے کے علاوہ دوسرے معاملوں پر توجہ کریں، اس لئے خواتین پر یہ اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ مرد کی کمائی کو ایسے سلیقہ سے صرف کریں کہ گھر کی اور باہر کی تمام ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ یعنی نہ صرف اپنے بچوں اور دوسرے متعلقین کی وقتی ضرورتیں پوری ہوں، بلکہ ناگہانی مشکلات دکھ درد، شادی بیاہ، بے کاری و بے روزگاری، خیر خیرات وغیرہ کے لئے بھی حسب حیثیت انتظام رہے۔ خواتین کی یہ ذمہ داری اس قدر اہم ہے کہ اکثر خاندانوں کی خوش حالی و تباہی، ان کی خوش انتظامی و بد انتظامی میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ روز مرہ کے تجربات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جو عورتیں اپنی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا طریقہ جانتی ہیں، ان کے مرد اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ روزی کمانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ جو کوئی اس طرح اپنے کام میں لگا رہتا ہے وہ اپنے پیشہ میں کافی ترقی کرتا ہے۔ گھر کے باہر بھی وہ عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا اور گھر کے اندر اپنے اہل و عیال کو خوش و خرم دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی گھر دنیا میں جنت کا نمونہ پیش کرتے ہیں لیکن جو عورتیں اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے طریقے نہیں جانتیں ان کی وجہ بھرے گھر بھی چند دنوں میں خالی ہو جاتے ہیں اور ان کے مردوں کی کمائی میں روز بروز کمی ہونے لگتی ہے۔ رفتہ رفتہ بے کاری و بے روزگاری، دکھ بیماری، افلاس و محتاجی کا منہ دکھاتی ہے، اور وہ بھرے گھر جیتے جی جہنم بن جاتے ہیں۔

خواتین کے مسائل میں سب سے اہم مسئلہ انتظام خانہ داری کا ہے، اور نظام خانہ داری کی درستی ہی سے زندگی خوشگوار بن سکتی ہے۔ اس کی بالکلیہ ذمہ داری خواتین پر عاید ہوتی ہے۔ خواتین کا پہلا فرض ہے کہ وہ اپنے گھر کا ایسا انتظام کریں کہ زندگی خوشگوار بن جائے۔ بظاہر یہ مسئلہ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے، لیکن ذرا سی ہوشیاری اور اصولوں کی پابندی سے کام لیا جائے تو یہ مشکل نہایت آسان ہو جائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ گھر والوں کی حیثیتیں جدا جدا ہیں، اس لئے گھروں کے انتظام کی نوعیتیں بھی مختلف ہیں۔ مثلاً جن گھروں میں نوکر چاکر، خادمائیں، مامائیں ہوتی ہیں، ان گھروں کی گھر والیوں کی ذمہ داریاں ان گھر والیوں سے علیحدہ ہوتی ہیں جن کو گھر کا سارا کام کاج خود کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض گھر ایسے بھی ہیں جن میں صرف میاں بیوی ہیں، اور بعض گھر رشتہ داروں سے بھرے ہوتے ہیں۔ تاہم نظام خانہ داری کی کامیابی چار چیزوں پر منحصر ہے، وقت کی پابندی، کفایت شعاری، قناعت، خوش خلقی، یہ گویا نظام خانہ داری کے چار ستون ہیں جن پر خانہ داری کی عظیم الشان عمارت قایم ہے۔ اگر اس میں سے کوئی ایک ستون بھی کمزور ہوگا تو جلد یا بدیر سارا نظام خانہ داری خطرہ میں پڑ جائے گا۔

نظام خانہ داری کی کامیابی کے سلسلہ میں وقت کی پابندی نہایت ضروری امر ہے، لیکن وقت کی پابندی طری

بہنوں کو نہایت مشکل معلوم ہوتی ہے۔ جب بہنوں سے اس کے متعلق کہا جاتا ہے تو اکثر بہنیں کہہ دیتی ہیں کہ "ایک سر ہزار سودے، ایک دو کام ہوں تو کوئی وقت کی پابندی کرسکتا ہے، یہاں تو ایک جان اور سو کام۔ وقت کی پابندی کی جائے تو کیوں کر؟" یہ بات بظاہر صحیح معلوم ہوتی ہے، لیکن ہماری بہنوں کو جان لینا چاہیے کہ مختلف کاموں کے لئے اگر وقت کو تقسیم کردیا جائے تو اس سے نہ صرف سب کام وقت پر تکمیل پائیں گے۔ بلکہ ضروری آرام کے لئے فرصت بھی مل جائے گی۔ اکثر کام ایسے ہوتے ہیں کہ اگر وہ وقت پر نہ ہوں تو ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہوجاتا ہے، اور عموماً ایسے خطرناک نتایج برآمد ہوتے ہیں کہ گھر کا چین اور آرام ہی چھن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ کوئی صاحب کسی دفتر میں ملازم ہیں اور ٹھیک دس بجے دفتر کی حاضری ہے، لیکن بیوی وقت پر کھانا تیار نہیں کرتیں۔ ایسی صورت میں یا تو وہ صاحب دیر سے دفتر پہنچیں گے یا بھوکے چلے جائیں گے۔ اگر دیر سے دفتر پہنچے تو ملازمت پر حرف آئے گا، اور بھوکے چلے گئے تو بھوک کی حالت میں کام دلجمعی سے نہ ہوگا، اور اگر یہ صورت مستقل ہوگئی تو کیا عجب ہے کہ ملازمت ہی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اس کے علاوہ اگر شوہر ہوٹل میں کھانے کا عادی ہوجائے تو نہ صرف وہ رقم جو گھر میں صرف ہونی چاہیے باہر صرف ہوگی، بلکہ صحت پر بھی بازاری کھانے کی وجہ برا اثر پڑے گا۔ اس لئے پابندی وقت نہ صرف اپنی آسانی و کامیابی کے لئے لازمی ہے بلکہ گھر کی خوش حالی کو برقرار اور شوہر کی کمائی کو قایم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

پابندی وقت کے بعد سب سے اہم اور ضروری چیز کفایت شعاری ہے، لیکن کفایت شعاری کے معنی بخل نہیں۔ بخل اور کفایت شعاری میں بہت بڑا فرق ہے۔ کفایت شعاری کا صحیح مطلب یہ ہے کہ قلیل سے قلیل آمدنی کو اس عمدگی سے صرف کیا جائے کہ تمام ضرورتیں پوری ہوجائیں اور کوئی ضرورت باقی نہ رہنے پائے۔ روپیہ بچانے کی خاطر زندگی کی ضرورتوں کو پورا نہ کرنا بخل کے لگ بھگ ہے۔ کفایت شعاری میں صرف اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ پیسہ کی چیز سوا پیسہ کا کام دے۔ عام طور پر گھر کی معمولی چیزیں جس کو ناکارہ سمجھ کر ضایع کردیا جاتا ہے اگر سمجھ بوجھ سے کام لے کر ان کو کارآمد بنائیں تو بہت کچھ بچت ہوسکتی ہے۔ مثال کے طور پر میں ایک واقعہ بیان کرتی ہوں: ایک بہن کو دیکھا کہ ان کے پاس وضو کرنے کی ایک چوکی پائے بوسیدہ ہونے کی وجہ ٹوٹ گئی تھی۔ خادمہ نے رائے دی کہ اس کو جلا دیا جائے، ناحق کوڑا جمع کرنے سے کیا فایدہ۔ لیکن انھوں نے کہا کہ اگر کوئی بڑھئی ادھر سے گزرے تو بلا لینا، چنانچہ انھوں نے اس ٹوٹی ہوئی چوکی کے کارآمد تختوں سے چراغ رکھنے کی تپائی اور آٹا گوندھنے کے جوکھٹے تیار کرلئے۔ ظاہر ہے کہ اگر خادمہ کے مشورہ پر عمل کیا جاتا تو اس کی لکڑی زیادہ سے زیادہ دو پیسے کے ایندھن کا کام دیتی، لیکن چار چھ آنے خرچ کرکے اسی لکڑی سے کارآمد چیزیں تیار کرلی گئیں۔ غرض اس طرح چیزوں کو بے کار ہونے سے بچانے اور بے کار چیزوں کو کارآمد بنانے کا نام کفایت شعاری ہے۔ اس سلسلے میں، ہماری بہنیں بڑی غفلت برتتی ہیں اور بے کار چیزوں کو کارآمد بنانا کسر شان سمجھ کر خواہ مخواہ اسراف میں مبتلا ہوجاتی ہیں، جس کا اثر مردوں کی آمدنی پر پڑتا ہے، اور وہ ان کی لاپروائی سے مقروض ہوجاتے ہیں جس کی وجہ ان کو سخت پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ ہماری بہنوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے شوہروں کو قرض میں مبتلا نہ ہونے دیں اور جو کچھ آمدنی ہو اسی کو اس سلیقہ سے صرف کریں کہ گھر کی جملہ ضرورتیں پوری ہوجائیں۔

کفایت شعاری کے بعد قناعت ہی سچی مسرت کی کنجی ہے۔ قناعت کے نہ ہونے سے عورتوں اور مردوں کا اطمینان و سکون چھن جاتا ہے اور زندگی کا لطف ہی جاتا رہتا ہے۔ اکثر بہنیں اپنے سے زیادہ حیثیت والی خواتین کو دیکھ کر خود بھی ان جیسی بننے کی آرزو کرتی ہیں، لیکن چونکہ ان کے شوہروں کی آمدنی بڑھیا حیثیت کی چیزیں فراہم

کرنے کے لئے ناکافی ہوتی ہے، اس لئے ان بیویوں میں بددلی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی بددلی کا اثر گھر کے نظام پر پڑتا ہے، جس کی وجہ اچھے خاصے بنے بنائے گھر بگڑ جاتے ہیں۔ اس لئے ہماری بہنوں کو یہ بات اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ دُنیا میں کثرت ان لوگوں کی ہے جن کے پاس پیٹ بھرنے کے لئے ٹکڑا اور تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا نہیں اس لئے شکر کا مقام ہے کہ وہ عزت کے ساتھ روکھا سوکھا کھا لیتی ہیں اور موٹا دھوٹا پہن لیتی ہیں۔ ہماری بہنوں کا فرض ہے کہ مردوں کی محنت و جاں فشانی، اور خود ان کی انتہائی خوش نظمی و کفایت شعاری کے بعد جو کچھ انھیں حاصل ہوا ہے اس پر اللہ کا شکر کریں اور اس بات کو یاد رکھیں کہ دُنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ اگر کم حیثیت والی بہنیں بڑی حیثیت والی بہنوں کو دیکھ کر خود بھی حرص کرنے لگیں، تو زندگی کی حقیقی لذت، جو قناعت میں پوشیدہ ہے، مفقود ہو جائے گی۔ لیکن قناعت کے معنی یہ نہیں کہ اپنی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ بلکہ سچی قناعت تو یہ ہے کہ محنت و کوشش اور کفایت شعاری کے بعد جس حالت میں رہیں اس کو غنیمت سمجھیں۔

پابندیٔ وقت، کفایت شعاری و قناعت کے ساتھ اگر خوش خلقی نہ ہو تو نظام خانہ داری کی کامیابی خطرے میں پڑ جائے گی۔ گو، بظاہر خوش خلقی کا تعلق خانہ داری سے زیادہ اخلاقیات سے متعلق نظر آتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ خوش خلقی نہایت ضروری چیز ہے۔ ہماری بہنوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ اگر وہ محنت سے کام کریں، وقت کی پابندی کا خیال رکھیں، کفایت شعاری اور قناعت پر بھی عمل کریں، لیکن اگر مردوں اور گھر والوں کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ پیش نہ آئیں تو ان کا سب کچھ کیا دھرا اکارت ہو جائے گا کیونکہ ان کی بد خلقی سے مردوں کا اور دوسرے گھر والوں کا دل ٹوٹ جائے گا۔ اور اس کا اثر مرد کی کمائی پر بھی پڑے گا۔ مرد کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنا اور اس کی دلجوئی کرنا اس کو دوسرے دن کی محنت کے لئے تازہ دم کرنا ہے۔ جو بہنیں خوش خلقی برتتی ہیں ان سے نہ صرف ان کے شوہر بلکہ تمام گھر والے اور ملنے جلنے والے، سب ہی خوش ہوتے ہیں اور ہر ایک کو ان سے مل کر مسرت ہوتی ہے۔

(نشرگاہ حیدرآباد سے پڑھا گیا)

ثریا جبین

نذرِ ولی اس میں دکن کی چار گریجویٹ خواتین انشا پرداز محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ، محترمہ نعیم النساء بیگم صاحبہ اور محترمہ نجم النساء بیگم صاحبہ کے دلچسپ مضامین ہیں جو بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی اور خصوصیاتِ کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں ولی کی معلومات، ان کے تخیل، ان کے فن شعر اور ذوقِ عرفان کے علاوہ ان کے اسلوبی زبان اور انتخاب الفاظ کے متعلق بھی نہایت مفید اور دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ ولی کے متعلق یہ پہلی مستقل اور جامع کتاب ہے اس کا مطالعہ تشنگانِ ادب کی تسلی کا باعث ہوگا۔ صفحات ۲۴۸ طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر دو جگہ سنہری نام، قیمت مجلد عا/ ۸

حیوان سے انسان تک!
(حیاتیات کی روشنی میں)

آج سے لاکھوں برس پیشتر کا ذکر ہے کہ اس کرۂ ارض پر زندگی کا نام و نشان تک نہ تھا، اور زمین اس قدر گرم تھی کہ اس پر کوئی جاندار زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ زمین سے حرارت کا انتشار ہوتا گیا، اور اس کا درجۂ حرارت کم ہوگیا جس سے اس کی سطح سرد ہوکر سکڑنے لگی، اس لئے اس میں جابجا شگاف اور دراڑیں پڑ گئیں۔ کچھ مدت کے بعد ہوا سے بخارات نے پانی کی شکل اختیار کرکے ان گڑھوں اور نشیبی جگہوں کو پُر کردیا۔ اب زمین اس قابل ہوگئی کہ اس پر زندگی کے وجود کا آغاز ہو سکے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ زندگی پانی کے اندر وجود میں آئی اور اس کی ابتدا قطبین کے سمندروں میں ہوئی، کیونکہ یہی حصے سب سے پہلے ٹھنڈے ہوئے۔

ماہرین علم ارتقا کا خیال ہے کہ مادۂ حیات، نخزمایہ، یعنی وہ مادہ جس سے کہ زندگی وجود میں آئی، بے جان مادہ میں کیمیاوی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے۔ مادۂ حیات دراصل ایک پیچیدہ ترین مرکب ہے جو کاربن، ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن اور گندھک وغیرہ عناصر پر مشتمل ہے۔

ابتدا میں جاندار صرف ایک خلیہ (cell) پر مشتمل تھے، ان کی شکل و شباہت، بکٹیریا، یا جراثیم کی طرح تھی بعض یک خلوی جراثیم جن کی زندگی ہوا، پانی اور پانی میں حل شدہ نمکوں پر قایم تھی، اپنی ادنیٰ اور ابتدائی حالت سے ترقی کرکے اعلیٰ اور ترقی یافتہ قسم کو معرض وجود میں لانے کا باعث ہوگئے، پھر ان میں سبزی پیدا ہوئی۔ یہی سبز مادہ ہے جس کی وجہ سے درختوں کے پتے سبز رنگ کے دکھائی دیتے ہیں۔ مادہ حیات کے کیمیائی عمل سے یہ سبز مادہ ہوا کی کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی میں حل شدہ معدنی اشیاء سے پودوں کی غذا تیار کرتا ہے۔ اس قسم کے ادنیٰ جراثیم سے عالم نباتات وجود میں آیا۔

بعض یک خلوی جراثیم کی قسم کے جاندار جن میں سبز مادہ پیدا نہ ہوا، اور جس کے بغیر وہ اپنی خوراک تیار کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے، انھوں نے اپنی غذا کا سامان بنالیا۔ ان سبز مادہ نہ رکھنے والے جراثیم کی قسم کے جانداروں سے عالم حیوانات ظہور پذیر ہوا۔

مسلسل تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ مادۂ حیات کے عناصر کی ترکیب کیچڑ میں ہوئی، یہی وجہ ہے کہ عالم حیوانی میں سب سے پہلی، ابتدائی اور سادہ ترین مخلوق، جس کو امیبا (Amoeba) کہا جاتا ہے، کیچڑ یا ساکن پانی کے ذخیروں کی تہوں میں پیدا ہوتا ہے، اور وہیں نشو و نما پاتا ہے۔

امیبا کی ساخت پر غور کیجئے، بالکل ادنیٰ، غیر ترقی یافتہ اور ابتدائی جاندار مخلوق ہے۔ اس کا جسم ایک خلیہ پر مشتمل ہے جو زندگی کو قایم رکھنے کے لئے ہر کام انجام دیتا ہے یعنی حرکت، تغذیہ اور تنفس۔ بے کار مادہ، یعنی فضلہ جسم سے خارج کرتا ہے۔ بیرونی اثرات محسوس کرتا ہے، اور تولید یا پیدائش سے اپنی نسل کو بڑھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تقسیم کار کا جو بنیادی اصول ترقی یافتہ اور اعلیٰ درجہ کے حیوانات میں پایا جاتا ہے امیبا اس سے محروم ہے۔ ابتدا میں امیبا، یا اسی قسم کے بعض دوسرے جاندار اپنی حالت پر قایم رہے، رفتہ رفتہ بعض اپنے ماحول کی تبدیلیوں کے باعث

بدلنے لگے۔ پس ان کے اندر کئی قسم کے جسمانی تغیرات رونما ہوتے گئے۔ چنانچہ طویل مدت کے بعد ایک خلوی جان داروں سے ایسی مخلوق معرضِ وجود میں آئی جن میں جسم متعدد خلیوں سے بنا ہوا تھا۔ امیبا کو اگر"یک خلوی جان دار" کہا جائے تو یہ "کثیر خلوی جان دار" ہوئے۔ کثیر خلوی جان دار ایک دوسرے کے ساتھ مل کر یعنی بستیاں بنا کر رہنے لگے تاکہ بیرونی خطرات سے محفوظ رہیں اور زیادہ آسانی سے ترقی کے مدارج طے کر سکیں۔ یہ ابتدائی زندگی سالہا سال نئے نئے تغیرات اور نئی نئی تبدیلیوں کی منزلیں طے کرتی رہی۔ اس میں طرح طرح کی رنگینیاں اور گوناگوں قسمیں پیدا ہوتی گئیں۔ ایک خلوی امیبا سے بہت کثیر خلوی جان دار، حلقہ دار کیچوے، اسفنج، مونگے، کیڑے مکوڑے، ریڑھ کی ہڈی والے ادنیٰ اور اعلیٰ حیوانات پیدا ہو گئے اور اپنے اپنے مخصوص ماحول میں زندگی گزارنے لگے۔ ماہرینِ علم حیاتیات نے یہ متفقہ طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ امیبا ہی مختلف مدارج ارتقا طے کرتا ہوا انسان کی ساخت اختیار کر لیتا ہے۔ گویا پیچیدہ ترین ساخت کا جان دار "انسان" سادہ ترین جان دار امیبا کی ترقی یافتہ شکل ہے!

غور کیا جائے تو سب جانور اپنی اندرونی ساخت کے اعتبار سے دو حصوں میں منقسم ہیں: (۱) "صلبی" یا ریڑھ کی ہڈی والے جانور۔

(۲) "غیر صلبی" یا ریڑھ کی ہڈی کے بغیر جانور۔

"صلبیے" وہ جانور ہیں جن کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی ہے، جو پسلیوں کے ڈھانچہ کا مرکزی سہارا اور مجموعہ ہوتی ہے۔

"غیر صلبی" وہ جانور ہیں جن کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کا ڈھانچہ نہ ہو۔

علم حیاتیات کے سرسری مطالعہ سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ وہ جان دار جن کے جسم ریڑھ کی ہڈی اور ڈھانچہ کے بغیر ہیں، اور جنھوں نے صفحۂ ہستی پر ابتدائی ایام میں فروغ پایا، نہایت ہی حقیر اور بے وقعت تھے۔ ان میں سے اکثر تو مٹ گئے کیوں کہ وہ نئے ماحول کے مطابق اپنی زندگی کو نہ ڈھال سکے۔ کچھ ایسے سخت جان اور ڈھیٹھ مزاج بھی ہیں جو اب تک اپنی ابتدائی صورت میں پائے جاتے ہیں۔ بعض نے اپنی اشکال اور ساخت بدل لی تاکہ وہ نئے ماحول میں زندہ رہ سکیں۔ ان جانوروں سے بتدریج ریڑھ کی ہڈی والے جانور پیدا ہوئے۔ یہ اپنی بناوٹ اور قوائے جسم کے لحاظ سے غیر صلبی جانوروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ریڑھ ان کی ترقی کی ایک نمایاں اور مستقل نشانی ہے۔ پس اس اعتبار سے ترقی یافتہ حیوانات کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ صرف پانی کے اندر رہنے والے جانور، مثلاً مچھلی۔
۲۔ خشکی پر اور پانی کے اندر رہنے والے جانور یا جل تھلیے، مثلاً مینڈک۔
۳۔ خشکی پر رینگنے یا پیٹ کے بل چلنے والے جانور، مثلاً چھپکلیاں، سانپ۔
۴۔ ہوا میں اُڑنے والے جانور یا پرندے، مثلاً کوا، کبوتر۔
۵۔ دودھ پلانے والے جانور، یا شیر خوار، مثلاً گائے، بندر، انسان۔

ریڑھ کی ہڈی والے یا صلبی جانوروں میں سب سے پہلے مچھلی ظہور میں آئی۔ یہ جانور صرف پانی کے اندر ہی رہے اور یہاں ہی سے زندگی بسر کرنے کا سامان پیدا کرتے رہے۔

رفتہ رفتہ ایک ایسا زمانہ آیا کہ خشکی (زمین) پر نباتات کی بہتات ہونے لگی تو بعض مچھلیاں پانی سے نکل کر کنارے پر آ گئیں۔ جب زمین سے ان کا تعلق ہوا تو ان کے اعضا میں تغیر و تبدل ہونے لگا، اور وہ جانور عالم ظہور میں آئے جو خشکی اور پانی دونوں میں رہتے ہیں اور جن کو ہم جل تھلیے کہتے ہیں۔ مینڈک ان کی ایک واضح مثال ہے۔ یہ جانور زندگی کے ابتدائی دور پانی میں بسر کرتے ہیں۔ مادہ مینڈک گڑھوں کے پانی میں انڈے دیتی ہے، انڈوں سے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں

ان کا جسم بالکل مچھلی کی طرح ہوتا ہے۔ اس حالت میں اسے غوکچہ (Tadpole) کہتے ہیں۔ غوکچہ مچھلی کی مانند گلپھڑوں سے سانس لیتا ہے، کچھ عرصہ کے بعد غوکچہ کی جسمانی حالت میں حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ گلپھڑے سکڑ کر غائب ہونے لگتے ہیں، دُم خوراک کے طور پر استعمال ہو جاتی ہے۔ اس مقام پر جہاں دُم جسم سے جڑی ہوئی ہے، دو چھوٹے چھوٹے اعضاء نمودار ہوتے ہیں، یہ پچھلی ٹانگوں کی ابتدا ہے۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر یہ اعضاء لمبے ہو کر جوڑ دار بن جاتے ہیں، پھر ان پر انگلیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس دوران میں اگلے اعضاء کی بالیدگی جلد کے نیچے شروع رہتی ہے اور آخر کار ان سے بھی بازو اور انگلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بازوؤں اور ٹانگوں کی موجودگی میں خشکی پر چلنے پھرنے اور آزادانہ زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے، مگر اکثر اوقات خوراک کی تلاش میں یا دشمنوں سے بچاؤ کی خاطر گڑھوں، کنوؤں اور تالابوں کے اندر آبی پودوں میں چھپ رہتا ہے۔ یہ جانور اپنی زندگی پانی اور خشکی دونوں جگہوں پر گزار سکتے ہیں، اسی لئے ان کا نام جل تھلیے ہے۔

جل تھلیے جانوروں کے بعد رینگنے والے جانوروں کا وجود ہوا۔ ان جانوروں کے ہاتھ اور پاؤں اس قدر کمزور اور مختصر ہوتے ہیں کہ ان کی رفتار سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ پیٹ کے بل رینگ رہے ہیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کے ہاتھ پاؤں نہیں ہوتے، مثلاً سانپ، اور وہ حقیقتاً اپنے پیٹ پر رینگ کر چلتے پھرتے ہیں۔

اب عالم حیوانی کے ارتقائی دَور میں ایک طویل مدت ایسی آتی ہے جبکہ رینگنے والے یا پیٹ کے بل چلنے والے جانور بکثرت ظہور پذیر ہوئے۔ یہ حیوانات دیکھنے میں بے حد خوفناک، جسمانی لحاظ سے لحیم و شحیم اور عادات کے مطابق بڑے ہی خوں خوار اور پیٹو تھے۔ اکثر دریاؤں کے قرب وجوار میں اُگی ہوئی سبزی چٹ کر جاتے، یا سمندروں کے ساحلوں پر شکار کی گھات میں پڑے لیٹے رہتے۔ (Brontosaurus) یا (Thunder lizard) اس وقت کے رینگنے والے حیوانات کا سردار تھا، اور اپنے جسم کی لمبائی کے لحاظ سے، جو (۷۰) فٹ سے زیادہ تھی، آج تک سب سے طویل قامت حیوان مانا گیا ہے۔ اس کے رکازی ڈھانچے دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ یہ حیوان اور اس کے بھائی بند اس قدر عظیم الجثہ تھے کہ موجودہ زمانہ کا سب سے زیادہ جسیم حیوان، ہاتھی بھی ان کے سامنے ایک چڑیا سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ظلم و استبداد کی بے پناہ قوت کے باعث انھوں نے زمین پر ایک قیامت برپا کر رکھی تھی۔ ادنیٰ، چھوٹے اور عاجز جانور ہراساں اور پریشان ہو کر رہ گئے۔ مگر قدرت کا قانون زور اور زبردستی پر چلتی نہیں۔ یہ عظیم الشان جانور اپنی ناقابل برداشت جسامت کے باعث تنازع للبقا میں کامیاب نہ ہو سکے، اس لئے معدوم ہو گئے۔ ان کے مقابل میں وہی کمزور اور ناتواں رینگنے والے جانور مثلاً کچھوے، گرگٹ اور ننھی ننھی چھپکلیاں جنھوں نے زمانے کے ساتھ مطابقت کی آج بھی روئے زمین پر آرام و عیش کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

مچھلی، جل تھلیے اور رینگنے والے جانور، سرد خون والے جانور کہلاتے ہیں۔ سرد خون رکھنے والے جانوروں کا کوئی طبعی یا باقاعدہ درجۂ حرارت نہیں ہوتا، بلکہ ان کا درجۂ حرارت ان کے گرد و نواح کی ہوا کے مطابق بدلتا رہتا ہے یہی سردیوں میں کم اور گرمیوں میں زیادہ۔ مذکورۂ بالا ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں کے بعد پرندوں اور دودھ پلانے والے جانوروں کا ظہور ہوا۔ ان جانوروں کے جسم کا درجۂ حرارت صحت اور تندرستی کی حالت میں یکساں رہتا ہے یعنی اس میں کمی یا بیشی واقع نہیں ہوتی۔

زمین اپنے ارتقائی دَور میں اس وقت گرم اور مرطوب تھی، رینگنے والے جانوروں نے اپنے ماحول میں

اثرات پائے تو ان میں بھی تبدیلیاں ہونے لگیں۔ وہ عظیم الجثہ چھپکلیاں یعنی (Dinosaurus) جو اب تک زمین پر اپنی حکمرانی کا سکہ بٹھائے بیٹھی تھیں آہستہ آہستہ مفقود ہونے لگیں۔ مگر چھپکلیوں کی وہ اقسام جن کی جسامت موزوں اور متناسب تھی زندہ بچ رہیں۔ انھوں نے گڑھوں اور بلوں میں چھپ کر یا سو کر گزار نے کا طریق اختیار کیا۔ ان میں سے بعضوں کے پر نکلنے لگے۔ چونکہ ان کے جسم ہلکے پھلکے اور کم وزن واقع ہوئے تھے اس لئے ان میں طاقت پرواز جلد آنے لگی۔ ابتدائی پرندوں کی جسمانی ساخت میں رینگنے والے جانوروں کی بہت سی خصوصیتیں موجود تھیں جو بچ ندارد دُم گرگٹ کی طرح، انگلیاں ناخن دار چمگادڑ کی طرح کا جھلی دار آلہ پرواز اور جبڑوں میں بڑے بڑے نکیلے دانت تھے۔ اس قسم کے جانوروں نے ترقی کی اور وہ پرندے کہلائے۔

رینگنے والے جانور کھونا کھلیوں پر انڈے دیتے مگر بعد ازاں ان سے بے پرواہ ہو جاتے۔ پرندے اپنے انڈوں کی بیحد دیکھ بھال اور نگرانی کرتے، مادہ اور نر باری باری ان کو سیتے ہیں۔ انڈا سینا، بچوں کو دانہ بھرنا، پھر ان کو اڑنے کے پینتروں سے آگاہ کرنا تو بہت ہی جانفشانی کا کام ہے۔ انڈوں کی حفاظت، بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی تربیت عقل حیوانی کی وہ نشانیاں ہیں جو ابھی تک پختہ نہ ہوئی تھیں۔

زمین پر کشمکش حیات پوری سرگرمی سے کار فرما تھی۔ اس عہد میں نباتات کی نوعیت عہد حاضر کی نباتات سے بہت قریب ہوگئی۔ پانی کم ہوگیا خشکی کا رقبہ بڑھ گیا۔ رطوبت پسند نباتات (Hydrophytes) نابید ہونے لگے۔ اس کی جگہ میلوں تک پھیلی ہوئی ہری بھری چراگاہیں منظر عام پر آگئیں۔ ان ہی سرسبز میدانوں اور وادیوں میں چھپکلیوں، کیڑے مکوڑوں اور پرندوں کی بستیاں آباد ہوگئیں۔ ماحول کی تبدیلیوں نے بعض رینگنے والے جانوروں میں حیرت انگیز تغیرات پیدا کر دیے۔ اب ان کی ساخت ایسے حیوانات میں منتقل ہونے لگی جو انڈوں کی بجائے بچے جنتے تھے اور انھیں اپنی چھاتیوں سے دودھ پلاتے تھے۔ یہ حیوانات دودھ پلانے والے یا شیرخوار جانور کہلاتے ہیں۔ دودھ پلانے والے جانور عالم حیوانی کے سرتاج ہیں۔ یہ حیوانات اپنی جسمانی، دماغی اور قوی کی خوبیوں میں سب سے اعلیٰ ہیں۔ وہیل مچھلی، کنگرو، دریائی گھوڑا، سم دار مویشی، کترنے والے چوہے، گوشت خور درندے، کرم خور خار پشت، چمگادڑ، گینڈے اور بندر نما حیوانات، مثلاً لنگور، گبن، اورنگ اوٹان اور چمپانزی، ان ترقی یافتہ حیوانات میں شامل ہیں۔

دودھ پلانے والے جانوروں کی خاص شناخت جو ان کو دوسرے جانوروں سے ممتاز رکھتی ہے، ان کے تھن ہیں جن کے ذریعے مادہ اپنے بچوں کو دودھ پر پرورش کرتی ہے اور بچپن میں ان کو ہر قسم کے خطروں سے محفوظ رکھتی ہے۔ دودھ پلانے والے جانوروں کے خون میں حرارت ہوتی ہے۔ ان کے جسم پر بال یا اون کثرت سے موجود ہوتی ہے۔ بالوں کی جگہ بعض جانوروں کے جسم پر سخت اور مضبوط چھلکوں کی ڈھالیں چڑھی ہوتی ہیں۔ ماہرین علم حیوانات دانتوں کو جسم کا ایک اہم حصہ مانتے ہیں کیونکہ دانتوں کی شکل اور ساخت سے ان جانوروں کی خوراک کی نوعیت کا پتہ بآسانی لگ جاتا ہے۔ شیرخوار جانوروں کے ہاتھ پاؤں ان کی ضروریات کے مطابق مختلف شکلوں کے بن گئے ہیں۔ دودھ پلانے والے جانوروں میں اکثر نر اور مادہ کی صورت اور وضع میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ نر کسی قدر قد آور اور جسامت میں بڑا ہوتا ہے۔ بعض اوقات نر اور مادہ کے رنگ ایک دوسرے سے ذرا مختلف بھی ہوتے ہیں۔

ان ہی دودھ پلانے والے جانوروں نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے انسانی شکل اختیار کر لی۔ عرصہ دراز تک انسان

غیر متمدن رہا۔ اس کی زندگی ان وحشی جانوروں سے کچھ بہتر نہ تھی جن کا یہ شکار کیا کرتا۔ لاکھوں سال تک انسان وحشی جانوروں کی طرح غاروں میں زندگی بسر کرتا رہا۔ ان ہی کی طرح لڑتا جھگڑتا اور چیختا چلاتا پھرتا رہا۔ غالباً آج سے ایک لاکھ سال قبل انسان میں گفتگو کی قوت پیدا ہوئی۔ اس میں نہ صرف منصوبے بنانے، اور تدبیریں سوچنے کی صلاحیت پیدا ہوئی بلکہ یہ بھی کہ وہ اپنے ساتھیوں سے تبادلۂ خیالات کرلے اور اپنا مافی الضمیر ان کو بتا سکے۔ ان خصوصیات کی بدولت اس کو دنیا کے سب جانوروں پر غیر معمولی فوقیت اور سرفرازی حاصل ہوگئی۔ اس کی فطرت نے اب اُسے مجبور کردیا کہ وہ صحیح معاشرتی زندگی اختیار کرے جس سے کہ اس کے ذہنی اور دماغی قوٰی میں حیرت انگیز ترقی ہوئی اور بالآخر موجودہ دور کے مہذب اور ترقی یافتہ انسان کی خلقت کی تکمیل عمل میں آئی۔

عبد المجید

اُردو نامہ اس میں اُردو ادب سے متعلق ہندوستان کے بہترین انشاپردازوں اور تنقید نگاروں کے معلومات آفریں مضامین اور مقالے درج ہیں جو خاص طور پر لکھوائے گئے۔ اکثر و بیشتر مشہور شاعروں کی غیر مطبوعہ غزلیں اور نظمیں بطورِ خاص حاصل کرکے شائع کی گئیں۔ ان میں قدیم اور جدید شاعری کے جو نمونے ہیں ان سے اُردو شاعری کے مختلف رجحانات کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی مختلف جامعات کے اُردو کے پروفیسروں کے حالاتِ زندگی اور علمی خدمات سے اہلِ زبان کو روشناس کرایا گیا ہے، جن کی دماغی محنت اور ایثار سے نوخیز ادیبوں، انشاپردازوں، اور شاعروں کی صحت بخش تربیت ہوتی ہے۔ مشاہیرِ اُردو کے غیر مطبوعہ خطوط کو پہلی دفعہ منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ یہ خطوط اُردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ اس میں ایسی تصویریں بھی ہیں جو یا تو اُردو ادب کے شاعروں، ادیبوں اور محسنوں کی ہیں یا اُردو سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُردو ادب کی تاریخ اور ارتقا پر ایک جامع اور مفید کتاب ہے صفحات (۲۰۰) قیمت عالی

بلاغت یہ کتاب فنِ شعر و انشا کے محاسن سے متعلق ضروری معلومات پر مشتمل ہے جس کا پہلا حصہ معانی دوسرا بیان اور تیسرا علم بدیع سے بحث کرتا ہے۔ یہ کتاب اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں اور خاص کر اُردو کے طلبہ کے افادے کے لئے مولوی سید کلیم اللہ حسینی صاحب منشی فاضل، مولوی فاضل، اُردو فاضل سے مرتب کرائی گئی ہے صفحات (۵۶) قیمت صرف (۱۰/)

بہمنیہ دور میں زراعت و تجارت کی ترقی

ہندوستان زراعت کے اعتبار سے خاص خوبی اپنے میں رکھتا تھا، اور اس لئے ہر اسلامی فاتح کو ہندوستان سے جو محبت ہوتی تھی وہ محض اس کی زرخیزی کی وجہ سے تھی۔ بہمنیہ سلطنت میں مسلمانوں کی جاگیریں، انعام علی الوقف، انعام التمغا وغیرہ سب اس کی زرخیزی کی شہادتیں ہیں کہ وہ یہاں دل کھول کر زراعت کریں۔ بہمنیہ زمانے کے آثار اور بہمنی دور کی نہروں اور زراعت کا مختصر حال یہاں لکھا جاتا ہے تاکہ اس دور میں دکن کی زراعت اور مسلمانوں کی اس سے دلچسپی کا اندازہ ہوسکے۔

حال کے انکشافات سے عربوں کی بیسیوں تصانیف کا علم تاریخی دنیا کو ہو رہا ہے کہ عربوں نے زراعت پر خوب دل کھول کر محنت کی ہے۔ چنانچہ کتب خانۂ سلطانی واقع دارالخلافہ قسطنطنیہ سے ایک قیمتی نسخہ کتاب الفلاحۃ کا مصر میں آکر چھپا جس کا مصنف علامہ ابی ذکریا یحییٰ بن محمد بن احمد اشبیلہ ہے۔ اس کتاب کا ایک ہی ایڈیشن مصر سے نکلا ہی تھا کہ اس کا ترجمہ ہسپینی، اطالوی، فرانسیسی زبانوں میں ہوگیا۔ فرانسیسی ترجمہ تو اصل عربی نسخہ ایک کالم میں اور ترجمہ دوسرے کالم میں ہے۔ اس نسخہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اول تو یورپ کے جدید علم زراعت کی بنیاد اسی کتاب پر ہے۔ دوسرے یہ کہ جب ابی ذکریا نے عربی میں یہ نسخہ لکھا تھا تو اس کی نقلیں یا اس کے جیسے اور علمائے زراعت نے ایسی اور کتابیں لکھی ہیں اور جبکہ سلطنت بہمنیہ میں عام زبان عربی ہی تھی اس قسم کی تصنیفات کا شایع یا مدون ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ مذاق عام اور اشتیاق زمانہ نے یہ سامان یہاں بھی مہیا کر دئے تھے۔ اگرچہ کوئی خاص تصنیف علم فلاحت عہد بہمنیہ کی اس وقت تک شایع نہیں ہوئی مگر ان عربی رسائل کی موجودگی سے ان علمائے اسلام کا شغف معلوم ہوتا ہے جنھوں نے بہمنیہ سلطنت میں زراعت و فلاحت پر جاں سوزی سے کام کیا ہے جس کی کچھ کچھ جھلک فرشتہ کے اوراق سے ظاہر ہوتی ہے۔ فرشتہ سلطنت بہمنیہ کی زراعت کی ترقی کے بارے میں بیدر کی سرزمین کی قوت فلاحت بیان کرتا ہے کہ :۔

> "آب و ہوا میں زمین یہاں کی بہتر اماکن ہندوستان سے ہے۔ میں بلاد معظم ہندوستان کو دیکھا، لطافت و خوبی میں مانند اس مملکت کے نظر نہ آیا۔ زمین اس کی شنجرف سودہ کی طرح سُرخ ہے اور اکثر میوہ خراسان اور عراق کا یہاں پیدا ہوتا ہے، از خواجہ محمود گاواں خواجۂ جہانی زعفران اور امرود اور قسم قسم کے انگور اس زمین سے حاصل کئے ہیں۔ ص ۴۱۶"

یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ علمائے اسلام عہد بہمنیہ میں طریق زراعت و آبپاشی سے واقف تھے اور ان کو اسی قسم کی کتابوں سے مواد ملا تھا جو عربی زبان میں عربوں کے عین زمانۂ عروج کی تصنیفات و تحقیقات تھیں۔ اس لئے اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ ابی ذکریا کی کتاب جیسی دارالخلافتہ قسطنطنیہ سے آج پانچسو برس کے بعد دنیا میں آئی ہے، اس طرح پانچسو برس پہلے دارالخلافۂ بیدر کے سلاطین کے کتب خانہ میں ہوگی جس کو ضرور محمود گاواں خواجۂ جہاں یا کسی عالم نے دیکھا اور اس پر عمل کیا ہوگا۔ کیونکہ یوسف عادل خاں ترکی (شاہزادۂ عثمانیہ)، خواجہ محمود گاواں کا معتمد علیہ و مشیر کل و فرزند لطفی تھا جس کے کتب خانہ میں نایاب کتابیں تھیں۔

عراق و خراسان کے میوے بادام، انگور، سیب، ناشپاتی، امرود، شہتوت، چلغوزہ، پستے، اخروٹ وغیرہ مشہور ہیں۔ اگر یہ سب سلطنت بہمنیہ میں بوئے جاتے تھے تو زراعت کی ترقی کا اس بات سے بہتر کیا ثبوت مل سکتا ہے؟
زعفران کی کاشت سرزمین بیدر کے لئے محض خواجۂ جہاں کی زراعت سے دلچسپی اور شوق کا ثبوت ہے، اور

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان حکام اور وزرا یہ تک کاشت کاری اور باغبانی کے فن میں کتنی دلچسپی لیتے تھے اور اس کو کہاں تک ترقی ہو چکی تھی ۔ ان کو اقسام غلہ اور میوہ کی کاشت سے بھی واقفیت تھی اور اس میں کمال رکھتے تھے ۔ وہ جانوروں کی پرورش میں بھی ماہر تھے کھیتی کے تجربات کے لئے جداگانہ کھیتوں یا فارم کی تیاری سے بھی یہ پورے ماہر معلوم ہوتے ہیں ۔

فن زراعت سے متعلق کیمیائی ترکیبیں ، زمین سے کام لینے کے طریقوں ، پرندوں اور چوپایوں کی پرورش اوران کی بیماریوں کے علاج سے پوری طرح واقف تھے ۔

سلطان علاء الدین ثانی بہمنی کا "باغ علائی" جس کی تعریف میں حکیم آزری جیسا مشہور شاعر کہتا ہے ؎

گوئی کہ ماہ و مشتری از برج آسماں تحویل کردہ اند بہ باغ خدائیگاں

سلطان فیروز شاہ کا فیروز آباد بسانا اور قلعہ میں دریائے بھیمرا سے نہریں کاٹ کر لانا اور فیروز آباد میں طرح طرح کے کوشک اور باغات بنوانا ، اس کے شوقِ فلاحت کا بین ثبوت ہے جو ہندوستان کے بہت کم بادشاہوں میں دیکھا گیا ہے ۔

درختوں اور ترکاریوں کی کاشت اوران میں پیوند وغیرہ لگانے کے بھی عجیب عجیب طریقے رائج تھے جن کے ذریعہ سے شیریں میووں کو اور زیادہ میٹھا ، خوشبودار اور مفید بنایا جاتا تھا ، یا ان سے مسہل کی دوا بنائی جاتی تھی ۔ گلاب کے پھول کا رنگ حسب مرضی تبدیل کیا جاتا تھا یعنی زرد ، لاجوردی اور سفید رنگ کا پھول بن سکے ۔ بے موسم سیب کے درخت میں ایسی ترکیب استعمال کی جاتی تھی کہ پھل پیدا ہوں تو ان پر کوئی عبارت یا تصویر بنی ہو ۔ ناشپاتی اور امرود اور سیب کے پھلوں کو اپنی پسند کے مطابق جس شکل کا چاہیں بنا سکتے تھے ، انگور بےدانہ کرنا ، ایک خوشہ میں مختلف رنگ کے دانے پیدا کرنا ، اور انجیر کی ایک شاخ میں جدا جدا رنگ کے انجیر پیدا کرنا ، بلکہ ایک ہی دانۂ انگور میں مختلف رنگوں کا ہونا ، درخت خیری میں کئی رنگ کے پھول لانا وغیرہ ۔ مختلف اقسام کی ترکاریوں کا بونا ، مثلاً مولی ، گاجر ، شلجم کو بڑے بنانے کی ترکیب ۔ غرض ایسی ہی بہت سی باتیں ہیں جن کو پڑھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے ۔

احمد شاہ ولی بہمنی کے حوض محل میں ، پانچ پانچ ہاتھ کے کھجور کے درخت تھے جو ہر موسم میں رسیدہ ہوتے تھے ، اور حکیم آزری نے سلطان کے مسہل کے لئے چند منٹوں میں ایسے انگور لائے کہ جتنے انگور کھائے اسی قدر دست آئے ۔ (ملاحظہ ہو سوانح عمری حکیم آزری ، مطبوعہ رسالہ حکمت) ۔

اب رہ رہ کے یہ خیال ہوتا ہے کہ کیا یہ وہی سرزمین تھی جہاں سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کا "حوض محل" تھا ، اور علاء الدین ثانی بہمنی کا "باغ علائی" تھا ، اور محمود گاواں خواجہ جہاں کے وہ زراعتی قطعات اور میوہ دار درختوں کا جھنڈ جہاں عراق کے میوے اور زعفران و انگور پیدا ہوتے تھے ۔

(۲)

ہندوستانِ قدیم کے تجارتی تعلقات اہل فارس سے تھے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران کی تہذیب و تمدن کا اثر ہندوستان پر بہت کچھ تھا ۔ جب ایران پر عربوں کا قبضہ ہوا تو عربوں اور ایرانیوں نے مل کر اسلامی تہذیب و تمدن کو آگے بڑھایا ۔ اگرچہ ابتداً سندھ ، مکران ، کرمان پر قبضہ ہوا ، مگر بعد میں زیادہ تر ایرانیوں ہی کا سلسلہ رہا ۔ ہندوستان پر یمین الدولہ سلطان محمود غزنوی کا قبضہ ہوا ، اور اس کے بعد جو فاتح ہندوستان آئے وہ ایران کی خاک پاک سے تعلق رکھتے تھے ، چنانچہ سلاطین بہمنیہ ایرانی نژاد تھے ، اور ایک عرصہ کے رسم و رواج اور تجارتی

تعلقات سے ان کا ملک متاثر ہوگیا تھا، اس لیے ان کے حدود مملکت میں بھی ایرانی تجارت کا اثر غالب تھا۔ ایران کی بندرگاہوں میں ہرمز، بصرہ اور مملکت دکن کی بندرگاہوں میں مصطفےٰ آباد۔ دربل، بلگام، مہایم، گوا مشہور تھے جہاں تجارتی جہاز آیا کرتے۔

اہل فارس بنو امیہ کے ابتدائی زمانے سے تجارت میں بڑے مشاق ہوگئے تھے اور پانچسو برس کی تجربہ کاری نے جہانیان جہاں گرد بنا دیا تھا۔ کبھی عماد الدین محمود گرجستانی بیدر میں ذاتی جہازوں کا بیڑا اقسام اقسام کے مال سے لدا ہوا لاتے ہیں۔ کبھی عماد الدین محمود گاواں کے تجارتی جہاز دنیا بھر کی بندرگاہوں پر نظر آتے ہیں اور کبھی خود سلاطین بہمنیہ کے جہازوں سے درآمد و برآمد شدہ مال اتنا ہوتا تھا کہ اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

ملک التجار خلف حسن بصری کی تجارت کا وہ حال تھا کہ قسطنطنیہ سے لے کر چین تک ان کے جہازوں کا تانتا بندھا رہتا۔

بعض مشہور یوروپین اور چینی سیاح نے ہندوستان کی قدیم تجارت پر نوحہ خوانی کرتے ہوئے اندرون ملک اور ساحل کارومنڈل کی تجارت پر بھی دو آنسو بہائے ہیں جن کا اقتباس اس موقع پر کچھ بیجا نہ ہوگا۔

جب ہندوستان کی تجارت بھی مسلمانوں کے ہاتھ آگئی تو ایران اور ممالک عراق و عرب اس سے بے انتہا فائدہ اٹھانے لگے جس کو دیکھ کر اہل شام و عرب نے اسے اپنے ممالک میں فروغ دینے کی کوشش کی۔ جب مصر و شام خلیفہ کے ہاتھ آگئے تو اسکندریہ کے تاجروں کو روما اور یونان کے ساتھ تجارت کرنے کی ممانعت ہوگئی اور چونکہ مسلمانوں اور یونانیوں کے مابین ہمیشہ جنگ رہا کرتی تھی اس لئے اہل یونان بلکہ ان کے ساتھ اہل اطالیہ بھی ہندوستانی مال سے محروم ہوگئے۔ اس سے کچھ پہلے وہ چین سے ریشمی کپڑا چرا کر لائے اور ریشم کی تیاری کا حال بچشم خود دیکھا تو اپنے بادشاہ کے حکم سے چند سال چین میں رہ کر یہ کام سیکھا اور واپسی کے وقت ایک لکڑی کے اندر چند کیڑے رکھ کر قسطنطنیہ بھیجا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ ابھی آل عثمان کا قبضہ قسطنطنیہ پر نہ ہوا تھا۔ اس وقت شاہ قسطنطنیہ ان پادریوں کی مدد کر کے ریشم کا کارخانہ قایم کر دیا اور وہ مشرقی ریشم کی تجارت سے مستغنی ہوگئے۔ مگر ان پادریوں کو یہ معلوم تھا کہ دریائے جیحوں پر دو شہر ایسے آباد ہیں جو ہندوستان اور چین کے مال کی منڈیاں ہیں۔ چنانچہ بعض الوالعزم تاجروں نے ان مقامات میں اپنے آدمی بھیجے اور وہاں کا مال بحیرۂ خضر [illegible] دریائے سیرس کے راستے آنے لگا، اور دریائے سیرس سے یہ مال جو وسط ایشیا کے مال سے تبادلہ میں بحیرۂ اسود کو جاتا تھا اور وہاں کا مال پھر ہندوستان آتا تھا جو اندرون ملک تک پہنچ جاتا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی طاقت بہت بڑھ گئی تھی انھوں نے مالابار میں ایک بستی قایم کی اور بنگال، سیام اور چین کے ساتھ بھی تجارتی تعلقات قایم ہوگئے۔ اسلامی طاقت کے اس عروج کو یورپ کے صناع نہایت حسد کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ وینس، قسطنطنیہ اور اسکندریہ کے مابین ابتدائے اسلام سے ہی تجارتی تعلقات قایم ہوگئے تھے، چنانچہ دوسری صدی ہجری میں ہندوستان اور چین کو اسلامی قافلے روانہ ہونے لگے اور پانچویں صدی ہجری میں نوادر، ریشمی ململ اور مسالے وینس میں پہنچنے لگے اور رفتہ رفتہ یہ شہر تجارت کی وجہ دولت سے مالا مال ہوگیا۔

خلفائے عباسیہ مصر کے زمانے میں مصر کا راستہ عیسائی اور مسلمانوں کی لڑائیوں کے اختتام پر کھل گیا اور سابق کی طرح پھر براعظم یورپ ہندوستانی تجارت سے مستفید ہونے لگا۔ وینس سے شہر جینوا میں بھی ہندوستانی مال آتا تھا، اگرچہ اس کی مقدار قلیل ہوتی تھی۔ ان ہر دو مقامات کے باہمی مقابلے کے زمانہ میں فلورینس ترقی پر تھا اور اس کی تجارت مشرقی ممالک کے ساتھ

بڑھتی جارہی تھی۔ جب مصر اور شام سلطان سلیم خان (معاصر سلطان احمد شاہ ولی بہمنی) کے ہاتھ آئے تو وینس اپنے ہمسایہ شہروں سے بڑھ گیا۔

مشہور جغرافیہ نویس مولانا آذری لکھتے ہیں کہ سلطنت بہمنیہ سے جو مال برآمد ہوتا تھا اس میں زیادہ تر چھینٹ، ململ، ریشمی دھاگے، نیل اور دیگر اقسام کے رنگ، الائچی، سیاہ مرچ، ہیرے، موتی، فولاد، ہاتھی دانت، ادویات، عطریات شامل تھے۔ بیدری ظروف بھی ایک حد تک ممالک غیر کو بھیجے جاتے تھے، جس کی بڑی قدر دانی ہوتی تھی کبھی کبھی غلاموں یا غلام لڑکیوں کی تجارت ہوتی تھی، جو اشیاء درآمد کی جاتی تھیں ان میں اونی مخملی زرین کپڑے، قالین، بانات، پوستین، اصفہانی ہتیار، عربی گھوڑے، مغزیات، میوہ جات، سونا، چاندی، فیروزہ، عقیق، یشب، ترکی، رومی غلاموں کی تجارت ہونے لگی۔ ایک اور مشہور سیاح کا بیان ہے کہ آم، نارنگیاں، کافور، صندل کی لکڑی بھی یہاں سے برآمد ہوتی تھی۔

وینس کا ایک گراں قدر امیر چودھویں صدی کے شروع یعنی ۸۰۰ھ ہجری کے کچھ قبل (عہد محمد شاہ بہمنی لشکری) میں ممالک شرقی کی سیر کے لئے ادھر آیا تو ہندوستان کے مختلف مسالوں کا ذکر کرتا ہے۔

جنیوا کا سیاح پرونتم سان سیسٹو تھا جو ۹۰۰ھ ہجری میں آیا تھا، ان قیمتی پتھروں اور مسالوں کا ذکر کرتا ہے جن کی تجارت ہوتی تھی۔ ان قیمتی پتھروں سے وہ ہیرے مراد ہیں جو مملکت بہمنیہ میں گولکنڈہ کے ہیروں کے نام سے سارے یورپ میں مشہور تھے، اور جن کی نسبت مارکو پولو اور دیگر سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں ذکر کیا ہے۔ ایک فرانسیسی مورخ لکھتا ہے کہ ۸۰۰ھ ہجری میں جبکہ بہمنیہ سلطنت کے تحت قطب شاہ کا پرچم تلنگانہ اور ساحل مالابار میں لہراتا تھا تو اس وقت غیر ملکوں کے (۳۰۰) جہاز ساحل مالابار پر آتے تھے۔ اس کے علاوہ فرمانروائے کالی کٹ راجہ سامری نے جو خط شاہ پرتگال کو لکھا اس میں یہاں کی اشیا برآمد و درآمد کا ذکر پایا جاتا ہے۔ لکھا ہے کہ:۔

> "آپ کے خاندان کا ایک امیر واسکوڈی گاما میری سلطنت میں آیا اور مجھے اس کی ملاقات سے خوشی ہوئی۔ میری سلطنت میں الائچی، جائفل، ادرک، سیاہ مرچ اور قیمتی پتھر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ آپ کے ملک سے سونا، چاندی، مرجان اور یاقوت درکار ہے۔"

یہ ظاہر ہے کہ علاقہ راجہ سامری اور ایسے کئی علاقے ڈیڑھ سو برس سے سلطنت بہمنیہ کے زیر نگیں تھے اس لئے ان علاقوں کی تجارت دراصل مملکت بہمنیہ کی تجارت تھی۔

(۳)

سلاطین بہمنیہ نے گرانی کی روک تھام کے لئے جو تدابیر اختیار کی تھیں ان میں سے ایک کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

جب سلطان علاء الدین بہمنی نے اشیاء خوردنی کی گرانی اور رعایا کی تکالیف محسوس کی تو نہ صرف اس مصیبت میں رعایا سے ہمدردی ظاہر کی بلکہ اپنی فیاضانہ طبیعت و رحم دلی سے وہ چند تاجروں کے فائدے کے لئے کروڑوں انسانوں کو بھوکوں مرتے نہ دیکھ سکا۔

قلمروئے بہمنیہ سے قحط و گرانی معدوم کرنے کی غرض سے سلطان نے اجناس خوردنی کے نرخ مقرر کر دیئے تاکہ لوگوں کو خریدنے میں دشواری نہ ہو، اور اس بات کی خاص طور پر نگرانی رکھی کہ احکام سلطانی سے کوئی شخص سرمو انحراف

ذکر سکے۔ خشک سالی اور کثرت باراں سے بعض مقامات کی فصلوں کو جو نقصان پہنچتا تھا اس کا بھی عام نرخ پر مطلق اثر نہ پڑتا تھا۔ سلطان نے غلّہ کے سرکاری ذخیرے اور گودام بھی قایم کئے۔ یہ ذخیرے سلطنت کے ہر حصے اور ہر پرگنے میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں غلّہ غیر ممالک کو برآمد نہیں کیا جاتا تھا، اس لئے سلطان کو گرانی کے انتظام میں چنداں وقت بھی نہ تھی۔ کاشت کی زمینوں کا مالیہ نقد رقم کی بجائے اجناس کی شکل میں لیا جاتا تھا جو قحط کے زمانے میں سابق نرخوں پر فروخت کئے جاتے تھے تاکہ تاجروں کو نفع اندوزی کے مواقع حاصل نہ ہو سکیں۔

ایک دفعہ تاجروں نے سلطانی نرخ پر غلّہ فروخت کرنے سے انکار کیا تو سلطان نے حکم دیا کہ کوئی شخص سلطانی ذخیرے کے سوا کسی تاجر سے غلّہ نہ خریدے۔ چنانچہ سلطانی ذخائر سے تمام رعایا چھ ماہ تک ارزاں غلّہ خریدتی رہی۔ ادھر تاجروں نے یہ دیکھ کر کہ اگر اور کچھ عرصہ تک یہی کیفیت رہی تو ہمارے غلّہ کے ذخائر کو دیمک چاٹ جائے گی اور تجارت کو نقصان پہنچے گا، سلطان سے عفو قصور کی درخواست کی جو اس شرط پر منظور ہوئی کہ پہلے جس نرخ پر فروخت کرنے سے انھوں نے انکار کر دیا تھا اس سے بھی ارزاں نرخوں پر فروخت کرنے راضی ہو جائیں۔

ملک نائب نے تمام تاجروں کو طلب کر کے تنبیہ کی کہ سرکاری نرخ سے انحراف کرنے کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ طرفدار اور سرلشکر اس حکم کی تعمیل کا ذمہ دار تھا جس کا فرض تھا کہ ان سلطانی احکام کی پوری پوری تعمیل کرائے۔ محتسب نرخی یعنی مہتمان بازار، شقدار، داروغہ، حوالدار پر لازم تھا کہ روزانہ کے نرخوں سے سلطان کو مطلع کرتے رہیں۔ سلطان نے خفیہ طور پر اپنے آدمی بھی صحیح کیفیت کے لئے نہ صرف دار الخلافت میں بلکہ دُور دراز صوبوں اور ملکوں میں متعین کر رکھے تھے بلکہ ان کارپردازوں پر بھی نگران اور جاسوس مقرر تھے۔

اگر کبھی کوئی بات خلاف حکم ہوتی یا کسی فرد بشر کو نرخ معینہ کے مطابق کوئی چیز نہ ملتی تو محتسب و نرخی دونوں قتل کر دیے جاتے تھے یا ہاتھی کے پیر سے بندھوا کر شہر میں ان کو گشت کرایا جاتا تھا۔ یہ عبرتناک سزائیں تھیں جو بہت کم دی جاتی تھیں۔ مگر ہیبت و رعب کا وہ سکہ بیٹھا ہوا تھا کہ کوئی شخص کسی طرح کی کوئی سرتابی نہ کرتا۔ مزید برآں تاجروں کو زیادہ قیمت کی توقع سے غلّہ ذخیرہ کرنے کی (جس کو احتکار کہتے ہیں جو شرعاً حرام ہے) اجازت نہ تھی، اور نہ کوئی شخص سستے داموں خرید کر مہنگے داموں بیچنے کا مجاز تھا۔ ایسے شخص کو بھی وہی سزا تھی جو نرخی و محتسب کے لئے مقرر تھی، بلکہ طرفدار اور سرنوبت بھی اس سزا سے نہیں بچ سکتے تھے۔

یہ بھی حکم تھا کہ کوئی تاجر یا بیوپاری فصل کاٹے جانے سے پہلے غلّہ نہ خریدے۔ کاشتکاروں پر واجب تھا کہ غلّہ کاٹنے کے بعد سب سے پہلے سرکاری محاصل کا غلّہ ادا کریں اور اپنی ضرورت کا غلّہ رکھ کر بقیہ کو قریب ترین بازار میں فروخت کریں، غلّہ کا ذخیرہ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

سلطان علاء الدین خلجی نے نہ صرف انسداد گرانی کا انتظام کیا بلکہ اس بات کا بھی بندوبست کیا کہ تاجر غلّہ کے اوزان اور پیمانوں میں کمی زیادتی نہ کریں۔ چنانچہ وہ خفیہ طور پر بازار سے اجناس قیمتاً منگوا کر اپنے سامنے تلواتا تھا۔ وزن میں جنس جتنے چھٹانک کم ہوتی تھی اسی قدر گوشت فروشندہ کے جسم سے کاٹ لیا جاتا تھا۔

سید محمد بیدری

عربی ادب عہد بنی امیہ میں

(سلسلہ گزشتہ)

قواعد کی ترتیب کے ساتھ ہی اس نے علامات، حرکات اور اشارات کی طرف بھی توجہ کی لیکن اعراب ابھی ابتدائی حالت ہی میں تھے۔ یعنی اگر کسی لفظ کے حروف پر فتحہ، ضمہ، کسرہ ظاہر کرنا ہوتا تو اسے نقاط سے ظاہر کیا جاتا مثلاً فتحہ ظاہر کرنا ہوتا تو حرف کے سامنے نقطہ لگایا جاتا ضمہ کے اظہار کے لئے نقطہ حرف کے اوپر نقطہ لگایا جاتا۔ اور اسی طرح کسرہ کے لئے نیچے ہوتا۔

ابوالاسود کی یہ ایجاد زیادہ عرصہ تک عالم طفولیت میں نہ رہی بلکہ وقتاً فوقتاً اس میں اضافے ہوا کیے۔ پھر بھی اس کی اصلی ترقی عہد عباسی ہی میں ہوئی۔

عربی حروف تہجی کی اشکال میں بھی اسی زمانے میں تبدیلی ہوئی۔ عربی خط چونکہ سریانی اور نبطی سے پیدا ہوا تھا اسی لئے اس میں حروف بھی انہی زبانوں سے لئے گئے تھے۔ اسلامی عہد میں دوسری قوموں کو عربوں کے ان حروف کی تمیز کرنے میں دقت ہونے لگی۔ اسی لئے حجاج بن یوسف والیٔ عراق نے عبدالملک بن مروان کے عہد میں عجمی حروف ابجی سے نقاط وغیرہ مستعار لے کر عربی میں جاری کئے۔ اس سے عربی خط کے سمجھنے میں بڑی آسانی پیدا ہو گئی۔ اور پہلی مرتبہ عربی حروف کی موجودہ شکل وجود میں آئی۔

تاریخ وجغرافیہ

جاہلیت میں تاریخ وجغرافیہ کا وجود ہی نہ تھا۔ البتہ اشعار میں ایام عرب کی رزمیہ داستانیں یا بعض مقامات کی تفصیلات بھی مل جاتی ہیں۔ قبائل کے تعلقات امرا و سلاطین کے کارنامے اور ہری بھری چراگاہوں اور نخلستانوں کی تلاش میں جن جن مقامات پر انھیں خیمہ زن ہونے کے مواقع ملتے تھے ان کی مناظر کشی بس اس حد تک قدیم عربی شاعری سے مواد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ کی حقیقی ابتدا خلفاء بنی امیہ کے عہد میں ہوتی ہے۔ اس عہد کی تاریخی کتابیں دو نوع کی ہیں۔ پہلی قسم میں مسلمانوں کی فتوحات، غزوات، اور بہادران اسلام کے سوانح حیات کے تذکرے ہوا کرتے اور دوسری قسم میں دیگر اقوام کی تواریخ شامل تھیں چونکہ خلفاء بنی امیہ کو دوسری قوموں کے طرز حکومت، سیاست اور حالات جاننے کا بیحد شوق تھا اسی لئے وہ انھیں جمع کرتے اور دوسری زبانوں سے ترجمے بھی کراتے تھے۔

حضرت معاویہ بن سفیان کو تاریخ سے اتنی دلچسپی تھی کہ رات کا بڑا حصہ وہ مورخین کی صحبت میں گزارا کرتے تھے جو انھیں ایام عرب کے علاوہ شہنشاہان ایران و یونان و روما کی عدل گستری اور تدبر کے قصے سنایا کرتے۔ جنگوں کے واقعات اور فن حرب کی عیاریوں کی داستانیں سننے کا بھی انھیں بے حد شوق تھا۔ مشہور سلاطین کی سوانح عمریاں اور ان کی زندگیوں کے عبرت خیز افسانے سنانے کے لئے ان کے پاس متعدد غلام مقرر تھے جو ان واقعات کو دوسری زبانوں سے مثلاً لاطینی، یونانی اور پہلوی زبانوں سے ترجمہ کر کے انھیں سنایا کرتے تھے۔

دوسری اقوام کی تاریخ سب سے پہلے معاویہ کے ایما پر عبید بن شریہ نے لکھی جس کا ذکر صاحب الفہرست نے بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ ابن ندیم نے اس قسم کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جسے ابو مخنف الازدی نے لکھا تھا اور خود معاویہ اور بنی امیہ کے دوسرے خلفاء کی سیرت کو عوانۃ بن الحکم نے جمع کیا تھا لیکن ان میں سے اب کوئی کتاب دستیاب نہیں ہوتی۔

تاریخی علم میں علم انساب کی ابتدا اس زمانے کے نہایت اہم کارناموں سے ہے۔ مختلف قبائل کے نسب نامے

کو جمع کرنے اور نسخوں کی تحقیق کرنے کا شوق اسی زمانے میں ہوا خصوصاً زیاد ابن ابیہ نے اس کی طرف بہت توجہ کی۔ وہ خود ایک کنیز کا لڑکا تھا جس کو معاویہ نے اپنی اجازت اور دشمنوں کے مقابلہ کے لئے اپنا بھائی ہونا تسلیم کیا تھا۔

جغرافیہ کا علم اس عہد میں بہت ہی ابتدائی حالت میں تھا۔ حضرت عمرؓ کو ہر مقام کی حالت آب و ہوا اور باشندوں کی کیفیات جاننے کا بڑا شوق تھا اور وہ خاص طور پر ان مقامات کے تفصیلی حالات منگوایا کرتے جہاں مسلمانوں کے قدم جم چکے تھے۔ مسعودی نے اپنی کتاب "مروج الذہب" میں اس پر کافی طور پر بحث کی ہے۔

علوم دخیلہ

علوم دخیلہ میں وہ علوم شامل ہیں جن کیا مسلمانوں نے دوسری قوموں سے لے کر عربی میں منتقل کئے جیسے یونان، روم، اور فارس و ہند کے متعدد علوم و فنون سے پہلی بار عربی کان آشنا ہوئے ان میں زیادہ مشہور علم نجوم، فلکیات، علم کیمیا اور طب وغیرہ ہیں۔

خلفائے بنی امیہ ان علوم سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور ان کے عالموں کی امداد بھی بے دریغ کیا کرتے تھے۔ اس خصوص میں خالد بن یزید کا نام بہت مشہور ہے۔ خالد بن یزید نے معاویہ ثانی کی وفات کے بعد خلافت حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اس میں ناکام رہا۔

خلافت کے حصول میں ناکام ہونے کے بعد اس نے علوم و فنون کے حاصل کرنے کی ٹھانی خصوصاً اس زمانے میں علم کیمیا کا لوگوں کو بڑا شوق تھا۔ اس کے پاس دوسری زبانوں کے کئی عالم موجود تھے جن میں بعض راہب بھی تھے۔ اس نے بہت سی کتابیں یونانی ادب سے ادب عربی میں منتقل کی گئیں۔

علم نجوم کا بھی یہ بڑا شائق تھا چنانچہ اس نے نجوم کی دریافت اور تحقیق کے لئے متعدد آلات تیار کئے تھے۔ طب کی بہت سی کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں جن میں اس فن کی ایک مشہور کتاب کو جو اس زمانے میں ماسرجویہ نے عربی میں ترجمہ کیا تھا حکومت کے خزانے میں داخل کر دیا گیا جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو مسلمانوں کے بیحد اصرار پر انھوں نے چالیس دن تک استخارہ دیکھ کر اس کتاب کو عوام کے حوالے کیا کیونکہ اس کتاب کو انقلابی کتب میں سے سمجھا جاتا تھا اور مسلمانوں کو بھی اتنا شوق تھا کہ اس کو حاصل کئے بغیر نہیں رہے۔

ابن ندیم نے لکھا ہے کہ ہشام بن عبدالملک کے کاتب (سکرٹری) سالم نے ارسطو کے رسائل کا ترجمہ عربی میں کیا تھا لیکن اب یہ کتاب آسمان ادب سے ناپید ہو چکی ہے اس زمانہ کی ان مشہور کتابوں سے بہت کم ایسی ہیں جو آج کل دستیاب ہو سکتی ہیں

قدیم علوم کا احیاء

عصر اموی کے علوم کی تعلیم کے تحت جہاں ہم نے جدید ادب کے آغاز کا تذکرہ کیا ہے وہیں قدیم علوم کے حالات بیان کر دینا بھی ضروری ہے۔ بلکہ یہی بہت اہم ہیں کیونکہ جدید ادب ابھی اس منزل پر نہ پہنچا تھا کہ اس کی تفصیلات کی ضرورت درکار ہوتیں یہی قدیم علوم تھے جو ابھی اپنی بہار دکھلاتے آرہے تھے قدیم علوم سے مراد وہ علوم ہیں جو جاہلیت سے مسلسل چلے آتے ہیں ان میں یہاں قابل تذکرہ لغت، شعر، خطابت اور کتابت ہیں۔

لغت میں اس عہد میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ وہی پرانا ڈگر جاری رہا سوائے اس کے کہ اسلام کی آمد سے بعض اصطلاحات اور محاوروں کا اضافہ ہوا جس کا تذکرہ خلفائے راشدین کے عہد میں آچکا ہے۔ اب یہاں خطابت اور کتابت کی کچھ تفصیلات۔ بعض مشہور خطیبوں کے حالات اور کاتبین کے واقعات بیان

کرکے ہم اس عہد کی شاعری کی طرف توجہ دیتے ہیں جو نہایت اہم ہے اور جس پر اس باب کا خاتمہ کیا جائے گا۔

خطابت

خلفائے راشدین کے عہد کی خطابت پر بحث کرتے ہوئے ہم نے مختصراً لکھا ہے کہ اسلام کی آمد نے خطابت میں گویا ایک روح پھونک دی۔ مسلمانوں کے ہر طرف پھیل جانے سے دور دراز کے مقامات میں اسلام کی دعوت دینے کے لئے پرگو اور فصیح البیان خطیبوں کی سخت ضرورت تھی۔ دوسرے اس وجہ سے بھی خطیبوں کا وجود ناگزیر تھا کہ وہ اجتماعی روح جو اب تک مسلمانوں میں چلی آرہی تھی کہیں اس میں تفرقہ نہ پڑ جائے اور ان کا شیرازہ اسی طرح مجتمع رہے۔ علوم کے عام ہوجانے اور ہر کس و ناکس کے علم کی طرف توجہ کرنے کی وجہ سے بھی خطیبوں کی تعداد اس عہد میں زیادہ نظر آتی ہے۔ ہر شخص سحر بیان مقرر بننا چاہتا تھا خصوصاً اموی دور میں بعد کی جماعت بندی کے تحت انھیں خطیبوں کی بدولت امداد کا ممنون ہونا پڑا۔ اسلامی تعلیمات اور قرآن و حدیث کے اثر سے ان میں قند و نبات کی شیرینی اور جادو سے بڑھ کر اثر پیدا ہوچلا تھا۔ اس عہد کے بعد میں مشہور خطیبوں کے حالات ہم درج کرتے ہیں۔ خلفائے راشدین کی خطیبانہ قابلیتوں کو کون نہیں جانتا۔ اسلامی دنیا کا بچہ بچہ آج ان کی تیر و نشتر سے زیادہ اثر کرنے والی تقریروں کا مداح ہے۔ ان کے بعد حضرت معاویہ رضؓ بھی کچھ معمولی درجہ کے مقرر نہ تھے۔ بنائے اموی سلطنت کے قیام میں جہاں ان کی دور اندیشی، حلم اور سیاست دانی کو دخل تھا، وہیں پر خطرناک موقع پر حضرت معاویہؓ نے اپنی سحر بیانی سے مدد لینا بھی نہ چھوڑا۔

ان کے بعد سحبان وائل، زیاد ابن ابیہ، حجاج ابن یوسف، اور قطری بن الفجاءۃ بہت مشہور ہیں۔

سحبان وائل المتوفی سنہ ۵۴ھ

قبیلۂ ایاد کی شاخ وائل سے سحبان کا تعلق تھا۔ ان کا نام سحبان بن زفر بن ایاد ہے۔ اور قبیلہ کی نسبت سے انھیں سحبان وائل کہا جاتا ہے۔ جاہلیت میں پیدا ہوئے لیکن ظہور اسلام کے ساتھ ہی ایمان لے آئے۔ معاویہ موقع شناسی اور مردم شناسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ سحبان کو کام کا آدمی دیکھ کر انھوں نے ہمیشہ کے لئے اپنے سے متصل کرلیا۔ معاویہ ہی کے عہد میں سنہ ۵۴ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

سحبان نے اپنی لیاقت کی وجہ سے بہت جلد معاویہ پر اپنا اعتماد قائم کرلیا جس طرح شاعری ایک خداداد عطیہ ہے اسی طرح خطابت بھی خدا ہی کی دین ہے۔ جتنا اثر شاعر اپنے کلام کے ذریعہ حاضرین پر پیدا کرتا ہے۔ اتنا ہی بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر خطیب اپنی جادو بیانی سے سامعین کے دلوں پر کرتا ہے۔ سحر بیان خطیب کے اثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ بھڑکنے میں آگ سے زیادہ سریع، تیروں سے زیادہ تیز، صحرا کی تیز و تند ہواؤں کی طرح بیباک اور دلوں کو موہ لینے میں طلسم سے بڑھ کر تاثیر رکھتے ہیں۔ سحبان کی خطابت ان تمام خوبیوں سے مملو تھی۔

سحبان بلا تکان کہنے والے شخص تھے۔ اور پھر خوبی یہ کہ ان کی ساری تقریر پر مغز ہر بات کام کی اور ہر لفظ فصیح و بلیغ ہوا کرتا۔ ان کی تقاریر کا کوئی حصہ مہمل اور بیہودہ نہ ہوتا۔ اس زمانے کے اکثر مورخین اور ہمعصر ادیبوں کی آراء کے بموجب ان کی خطابت کسی مافوق البشر ہستی کا کارنامہ سمجھی جاتی تھی۔ ان کے خطبات کے دوران میں سامعین کی سانسوں کی آواز بخوبی سنی جاسکتی تھی۔ اور اثر تلاطم خیز سمندر کی

سحر کی طرح لوگوں کے چہروں سے ظاہر ہوتا۔

ان کی تقاریر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ منہ سے کہتے نہ تھے بلکہ ان کے دل کے گوشوں سے آواز نکلتی تھی۔ خطابت کی دنیا میں ان کا نام آج بھی ضرب المثل ہے۔ ایک مرتبہ خراسان سے ایک وفد حضرت معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وفد کی گفتگو کا جواب دینے کے لئے معاویہؓ نے سحبان کو طلب کیا۔ اتفاق سے یہ کہیں گئے ہوئے تھے۔ بہرحال کچھ دیر بعد جس حال میں تھے اسی حال میں معاویہ کے سامنے پیش ہوئے۔ معاویہ نے حکم دیا کہ وفد کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ انھوں نے ایک عصا مانگا۔ لوگوں نے کہا کہ عصا لیکر کیا کروگے جبکہ تم امیر المومنین کے سامنے ہو۔ انھوں نے فوراً کہا وہی کروں گا جو عصا لیکر موسیٰ نے اپنے خدا کے ساتھ کیا تھا۔ معاویہ نے ہنس کر انھیں عصا دینے کو کہا۔ عصا کے سہارے کھڑے ہوکر انھوں نے کہنا شروع کیا۔ ظہر کے قبل سے لیکر عصر کی نماز کے وقت ہونے تک یہ مسلسل کہتے رہے نہ انھوں نے اس اثنا میں کھانسا' نہ جمائی لی اور نہ ذرا بھی توقف لیا ____ بلا توقف کہتے ہی چلے گئے۔ وفد کے لوگ اور دیگر حاضرین مبہوت بنے ہوئے تھے۔ بس ان کے ہونٹوں کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں سے ہر لفظ قند و نبات سے زیادہ شیرینی لئے ہوئے پے درپے نکلتا تھا۔

اس خطبہ کو سن کر معاویہ نے کہا "پہلے تو نماز پڑھ لیجئے کیونکہ نماز کا وقت ختم ہو رہا ہے۔" لیکن سحبان نے انھیں روکنے سے منع کیا۔ معاویہ نے ان کی یہ حالت دیکھ کر جوش سے کہا "تم عرب میں سب سے بڑے خطیب ہو" اس پر سحبان نے کہا "نہ صرف عرب بلکہ عجم اور جن و انس سب سے بڑھ کر"۔

سحبان مال و دولت کے شائق نہ تھے۔ ورنہ معاویہ کے نزدیک ان کو سونے چاندی میں تلوانا کچھ بڑا کام نہ تھا۔

فصاحت و بلاغت' لہجہ کی دلفریبی' شاعرانہ انداز' سلاست ان کی خطابت کے ساتھ یوں وابستہ ہے جس طرح شاعری تخیل کے ساتھ وابستہ ہے۔

زیاد ابن ابیہ المتوفی ۵۳ھ

حکیم حارث بن کلدہ ثقفی کے پاس ایک نہایت نازک اور حسین کنیز تھی جس کا نام سمیہ تھا۔ اور انھیں کے پاس ایک خوشرو رومی غلام تھا جسے عبید کہتے تھے۔ حارث نے ان دونوں کی شادی کردی تھی معلوم ہوتا ہے کہ ابوسفیان اس کنیز کی دلکش اداؤں پر لٹو ہو گئے تھے۔ کنیز نے بھی ممکن ہے ان کا ساتھ دیا ہو ____ بہرحال اس شادی کے ایک سال بعد ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام زیاد رکھا گیا۔

شریف خون کی آمیزش اور عرق صالح کی کوشش نے زیاد میں اعلیٰ قابلیتوں کے پورے جوہر مہیا کردیئے تھے۔ دن گزرتے گئے اور زیاد نہ صرف حسن ظاہری میں بلکہ دولت علم سے بھی مالا مال ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ ہمعصروں میں اپنی ذاتی لیاقت کی بنا پر انھوں نے بڑی عزت پیدا کرلی۔

سمیہ سے ابوسفیان کے تعلقات اس وقت تک تھے جب انھوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ اسلام قبول کرکے وہ ان سب چیزوں سے بری الذمہ ہو چکے تھے۔ اس واقعے کا اظہار انھوں نے حضرت عمرؓ کے خوف سے ان کے عہد تک کسی سے نہ کیا تھا۔ ورنہ حضرت عمرؓ ان واقعات پر شرعی سزائیں دینے میں مطلق تامل نہ کرتے گو وہ عمل کفر کے زمانے ہی میں کیوں نہ کیا گیا۔ ایک مرتبہ مہاجرین اور انصار کے ایک بڑے مجمع کے آگے زیاد نے ایک نہایت فصیح و بلیغ خطبہ دیا۔ حضرت علیؓ اور حاضرین میں قریش کے بہت سے سربرآوردہ صحابی بھی موجود تھے۔ عمرو بن العاص نے

ان کی پر مغز اور دلکش تقریر سن کر کہا کہ "کاش یہ نوجوان قریش سے ہوتا کہ عرب اس کے عصا کو چومتے" اس پر ابو سفیان سے نہ رہا گیا اور انھوں نے اپنا واقعہ سب کے سامنے بیان کر دیا اور کہا کہ "حضرت عمرؓ کے خوف سے میں نے اب تک اس کا اظہار کسی سے نہ کیا تھا۔"

حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں زیاد نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور لیاقت کی بدولت خزانہ کی نگرانی کا عہدہ حاصل کیا۔ یہیں سے ان کی ترقی کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ کی شہادت اور معاویہ کے سریر آرائے خلافت ہونے کے بعد یہ کہیں سے کہیں پہونچ گئے۔ ابتدأ معاویہ نے انھیں اپنا بھائی کہتے ہوئے پس و پیش کیا۔ بلکہ وہ چاہتے ہی نہ تھے کہ انھیں اپنی نسب میں شریک کریں۔ اگر زیاد معمولی قابلیت کے انسان ہوتے اور گمنامی میں رہتے تو معاویہ سے بعید نہ تھا کہ انھیں بالکل فراموش ہی کر دیں۔ جب معاویہ نے اپنی سلطنت سے استحکام اور دولت اموی کے قیام کے لئے زیاد جیسی شخصیتوں کی امداد کو ناگزیر سمجھا تو اس وقت کہیں وہ انھیں بھائی کہنے اور زیاد بن ابی سفیان کہہ کر خطوط لکھنے سے بھی باز نہیں آئے۔ یہ معاویہ کی مردم شناسی اور سیاست دانی کا نتیجہ تھا۔

معاویہ کے زمانے میں یہ بصرہ اور کوفہ کے گورنر بنائے گئے۔ اس خدمت کو جس عمدگی اور خوبی سے انھوں نے نبھایا ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ صرف یہ شکایت کی جاتی ہے کہ یہ ذرا سخت گیر تھے۔ لیکن اس زمانے کی حکمت عملی کے لحاظ سے ان کی سخت گیری بالکل بجا تھی۔ یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ "زیاد ہی وہ مضبوط ستون اور مستحکم بنیاد تھے جس پر بنی امیہ کی عمارت کھڑی کی گئی۔"

زیاد نے حکومت کے طریقوں کو حضرت عمرؓ کی مثالوں سے سیکھا ہے۔ "تاریخ میں یہ مشہور ہے کہ "زیاد نے حضرت عمرؓ کی تقلید کی اور سختی دکھائی اور حجاج نے زیاد کی تقلید میں ناحق ہزاروں کا خون بہایا۔" یہ ظن اور شبہات پر سزائیں دیتے تھے۔ علانیہ جرم پر قتل اور خفیہ طور پر کرنے والوں کو سزا ملتی۔

ان کے زمانے میں مجرموں کی تعداد بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔ ہر شخص ان کے نام سے لرزتا تھا۔ اپنی آخر عمر تک انھوں نے یونہی بسر کی۔ چھ مہینے کوفہ میں رہتے اور چھ مہینے بصرہ میں گزارتے بالآخر ۵۳ھ میں طاعون سے ان کا انتقال ہوا۔

خطابت میں سحبان وائل کی طرح ان کا نام بھی ہمیشہ آسمان شہرت پر مہر و ماہ کی طرح جلوہ گر رہے گا۔ حکومت کے اثرات لوگوں پر ڈالنے، بغاوتوں کو فرو کرنے اور ارکان حکومت کی تالیف قلوب کیلئے جتنا انھوں نے اپنی خطابت سے کام لیا ہے اتنا شاید ہی کسی اور نے لیا ہو۔ حجاج بھی اس میں شک نہیں اس معاملہ میں اپنی آتش بیانی سے کبھی باز نہ رہتا۔ لیکن واقعات کے مطالعہ سے ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ حجاج نے زیاد ہی کی پیروی کی اور ان کے نقش قدم کو اپنا رہبر بنایا۔

"خطبۂ بتراء کے نام سے ایک خطبہ "تاریخ خطابت" میں ہمیشہ کے لئے زیاد کے نام کے ساتھ وابستہ رہے گا۔ کہتے ہیں کہ اس خطبہ میں انھوں نے نہ خدا کی تحمید بیان کی تھی اور نہ رسول اکرمؐ کی ثناء۔ ان امور کا اس زمانہ میں اتنا خیال کیا جاتا تھا کہ ان کے اس مشہور خطبہ کو خطبۂ بتراء کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہیں "ناقص تقریر"

اس کے زمانے کا ایک مشہور شخص شعبی کہتا ہے۔ "نیز جب کسی بہترین تقریر کرنے والے کو میں نے کوئی دلنشین بات کہتے سنا تو دل یہی چاہتا کہ وہ اس کے بعد

اپنی گفتگو کو ختم کر دے کیونکہ یہ خوف ہوتا کہ اس کے بعد وہ اتنی عمدہ بات نہ کہہ سکے گا۔ لیکن جب زیاد خطبہ کے لئے کھڑے ہوتے تو دل یہی چاہتا کہ یہ ہمیشہ کہتے ہی رہیں۔ کیونکہ ان کی ہر بات پچھلی بات سے زیادہ شاندار، زیادہ فصیح، زیادہ دلکش اور بہت ہی پر اثر ہوا کرتی تھی۔ اس سے ان کی خطابت کے خداداد ملکہ کی غیر معمولی طاقت کا اظہار ہوتا ہے۔

حجاج بن یوسف المتوفی ۹۵ھ

ابو محمد الحجاج بن یوسف الثقفی ۴۱ھ میں گوشۂ خمول و عسرت میں پیدا ہوا۔ باپ کی سرپرستی میں اس نے ابتدائی تعلیم کا کچھ حصہ طائف میں حاصل کیا۔ لیکن زمانے کی گردش اور خود اس کے فطری تجسس و اضطراب کی وجہ سے اسے بہت جلد درسگاہ سے نکل کر عملی دنیا میں قدم رکھنا پڑا۔ اس کی ذکاوت اور غور و فکر کو دیکھ کر روح بن زنباع جذامی نے جو عبدالملک بن مروان کے محکمۂ پولیس کا افسر تھا اسے اپنے محکمہ کے دائرہ ملازمین میں داخل کر لیا۔ موقع شناسی اور دور اندیشی کی وجہ سے حجاج نے بہت جلد اپنا رسوخ پیدا کر لیا۔ ایک مرتبہ فوج کے ایک دستہ نے اطاعت سے انحراف کیا جس سے عام انتظام میں بے چینی پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ عبدالملک نے اس کی شکایت روح بن زنباع سے کی اس نے اس واقعہ کے رفع دفع کرنے کا انتظام حجاج کے سپرد کیا۔ اس نے اپنے حسن انتظام اور حکمت عملی سے نہ صرف منحرف شدہ فوجیوں کو راہ پر لایا بلکہ عسکری نظام میں وہ خوبی پیدا کی کہ کبھی شکایت کا موقع نہ ملا۔ اس سے اس کی شہرت بہت بڑھ گئی۔ اس کی زندگی کا دوسرا کارنامہ حضرت عبداللہ بن زبیر کے خلاف کامیاب فوج کشی کا ہے۔ عبدالملک اپنے تمام مخالفین پر غلبہ پانے کے خیال سے حجاج کو حکم دیا کہ وہ حضرت عبداللہ کے ہاتھوں سے چھین لے۔ حجاج کی فطرت اور قسی القلبی کی شہادت تاریخ سے ملتی ہے۔ وہ بغیر کسی کی پروا کئے سنگ زنی کرتا گیا اور مکہ پر کامل فتح حاصل کر لی۔ وہ حضرت عبداللہ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ کر عبدالملک کے دل میں اس کا رتبہ دوچند ہو گیا۔ عراق میں شیعوں کی فتنہ انگیزی اور خارجیوں کی شورش کا حال سن کر عبدالملک نے وہاں کی گورنری کے لئے حجاج سے زیادہ مناسب آدمی کسی کو نہ پایا لہذا وہ وہاں کا گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جتنی سختی اور جس قدر ظلم حجاج نے اہل عراق پر کیا اس کی مثال تاریخ عالم میں شاید ہلاکو اور چنگیز کے سوا نہیں مل سکے۔

حجاج نے وسعت سلطنت میں بھی حصہ لیا اور چین تک اپنی تلوار کی دھاک بٹھا دی۔ مشرقی فسادوں کی اس نے ہمیشہ کے لئے بیخ کنی کر دی یعنی ساری عمر اس نے عراق پر [illegible] اور سندھ [illegible] تحت اس نے جو شہر واسط کے نام سے بسایا تھا آخر ۹۵ھ میں مر کر وہیں دفن ہوا۔

بلحاظ فطرت حجاج کتنا ہی شقی القلب اور سنگدل آدمی کیوں نہ ہو لیکن حاکم [illegible] ہستی کے لئے اس کی قوت انتظامی تھا سخت گیری [illegible] اس نے [illegible] کو بھی پیچھا دکھا دیا۔ تاریخ میں حجاج کی شخصیت کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے بہرحال بلحاظ ادب ------ اور وہ بھی بلحاظ خطابت اس کی ہستی کو ہمیں دکھانا مقصود ہے۔ حجاج کے ابتدائی کارناموں سے لیکر آخری عمر تک کے امور پر نظر ڈالیے تو اس میں اس کی ذکاوت اور بیدار مغزی کے ساتھ ساتھ جادو بیانی اور آتش نفسی کا بھی بڑا حصہ ہے۔ لوگوں کو اپنا بنا لینے کا جو ملکہ اسے حاصل تھا اور [illegible] مخالفین کے گروہ میں کھڑے ہو کر اپنے دل نشین خطبے سے ان کی دشمنی کو بدل دیتا [illegible]

کرنا یہ کچھ معمولی کارنامہ نہیں۔ عراق میں جہاں اس نے ہر قسم کے ظلم وستم توڑے تھے، ہر آدمی سے مخالفت مول لی تھی۔۔۔۔ وہاں بھی اس کی نرالی گفتگو اور غضبناک تقاریر کے آگے عوام گونگوں کی طرح اس کو تکا کرتے۔ بحث مباحثہ میں شاذ ہی کوئی اس سے بازی لیجاتا ہوگا۔

مالک بن دینار کہتا ہے "منبر پر حجاج سے زیادہ مطالب کو واضح کرنے والا میں نے کسی کو نہ پایا۔ جب وہ خطبہ میں اہل عراق پر اپنے احسانات اور عنایتوں کو جتانے لگتا اور ان کی طرز روش کی نکتہ چینی کرتا تو ہر ایک یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا کہ وہ بالکل سچ کہہ رہا ہے اور اس کے مخاطبین سراسر دروغ گو ہیں۔"

کتابت

صدر اسلام میں پہلی مرتبہ کتابت اور انشا کی طرف خاص توجہ دی جانے لگی۔ بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ عربی نثر اور اس کے خاص اسلوب کا آغاز یہیں سے ہوا ہے۔ نظم کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا گیا۔ نثر کی حکومت کے اصول و قواعد مقرر کئے گئے اور خاص ادبی طرز نگارش کے مد نظر بھی تھے۔ اس دور کی کتابت پر کہتے ہیں کہ اس کی روح تو سادہ صورت میں اگر عربوں نے پھونکی تو موالیوں اور عجمیوں نے اس کی آراستگی اور پیراستگی میں حصہ لیا۔ چونکہ اس کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے اسی لئے اس کا اسلوب بھی آج تک کی عربی سے نہایت مختلف ہے۔ شاندار الفاظ و دلکش تحسین اختصار اور مبالغہ کا فقدان ۔۔۔ اس زمانے کی تحریر کی خاص خصوصیات ہیں۔ تعظیم کے استعمال میں ابھی کوئی فرق نہ آیا تھا جیسے کہ بعد میں متکلم کے لئے جمع کے صیغے استعمال کئے جانے لگے۔ عموماً ہر تحریر کی ابتدا بسم اللہ الرحمن الرحیم سے کی جاتی جس کے بعد خدا کی حمد ہوتی ۔۔۔ اختتام بھی عام طور پر "بالسلام" یا "والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ" پر ہوتا۔

مندرجہ بالا ابتدائی اصولوں پر عربوں کے نازک خیال و جدت پسند دماغوں نے زیادہ عرصہ ٹیکا لینا مناسب نہ سمجھا اسی لئے کچھ ہی عرصہ بعد ابتدائے رسائل میں حمد و ثنا کے طویل الفاظ کا استعمال کیا جانے لگا۔ مخاطبت کے طریق بھی بہت بدل گئے۔

مسجع اور مقفی ہونی کتابت کی تاریخ میں ایسا زمانہ بھی آیا کہ نثر کا اثر نظم سے بڑھ گیا۔ اس دور کے کاتبین میں سے ہم صرف عبدالحمید بن یحییٰ کا اجمالی حال بیان کرکے اس کو ختم کرتے ہیں۔

عبدالحمید بن یحییٰ المتوفی ۱۳۲ھ

ابو غالب عبدالحمید بن یحییٰ شام میں پیدا ہوا۔ باعتبار نسل خالص عرب ہونے کا اسے فخر حاصل نہ تھا مگر قبیلہ بنی عامر سے اس کا تعلق ضرور تھا۔ خود اعتمادی اور ذاتی ذہانت کی وجہ سے اس نے بڑی ترقی کی اور ہشام بن عبدالملک کے چچیرے بھائی سالم کا کاتب اور پرائیویٹ سکریٹری بن گیا۔

ایک زمانے تک اس نے طالب علموں کی رہبری اور انشا کی درس و تدریس کے لئے شہر شہر اور دیس دیس گھوما۔ اس کی شخصیت کا علم مروان بن محمد کو بھی ہو چکا تھا۔ مروان نے اسے اپنے ہی پاس رکھا۔ اور ان میں بڑی دوستی ہو گئی تھی۔ مروان خلیفہ ہوا تو اس کے نصیب بھی جاگ اٹھے اور یہ سلطنت کا سکریٹری بن گیا۔

سیاسی پیچیدگیوں کی بنا پر جب مروان کے مسند خلافت پر بیٹھنے کی توقع نہ رہی تب بھی اس نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ آخر جس بات کا خوف تھا وہ پورا ہوا اور مروان قتل ہو گیا۔ عبدالحمید نے اس عہد کے دوسرے بہترین انشا پرداز ابن المقفع کے پاس جا کر پناہ لی جو اس کا دلی دوست تھا۔

مخالفین کی ایک جماعت اس کی تلاش میں یہاں بھی پہونچی جس میں سے بعض لوگ ابن المقفع کے گھر میں گھس آئے۔

عبدالحمید اور ابن المقفع کی انتہائی دوستی کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ جب مخالفین نے گھر میں داخل ہو کر عبدالحمید کو طلب کیا تو یہ دونوں سامنے ہی موجود تھے ان کی وضع قطع صورت شکل اور چال ڈھال میں اتنی مشابہت تھی کہ توام بھائی معلوم ہوتے تھے۔ اب ان لوگوں کو یہ حیرانی درپیش تھی کہ کہیں عبدالحمید کی بجائے دوسرا قتل نہ ہو جائے جب انھوں نے دریافت کیا کہ عبدالحمید کون ہے؟ تو ابن المقفع نے اپنے کو پیش کیا جس پر فوراً عبدالحمید نے آگے بڑھ کر دلیری سے ان علامات کو بیان کیا جس سے اس کا عبدالحمید ہونا ثابت تھا۔ مخالفین نے فوراً اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا۔

عبدالحمید سے پہلے کتابت بالکل ابتدائی حالت میں تھی اور عوام کے خیال کے بموجب کتابت کوئی شریف اور قابل احترام فن سمجھا نہیں جاتا تھا۔ اس نے از سرِ نو کتابت کی داغ بیل ڈالی۔

تنوع مضامین اور جدت تخیل سے اسے مالا مال کیا۔ تحمیدات اور تخاطب کی تبدیلیاں بھی اسی کی دماغی پیداوار تھیں۔ ابتدائے رسایل میں خاص طرز کی عبارت تحریر کرنا اور اختتام بھی ایک مخصوص انداز میں کرنا یہ اسی کی جدت تھی۔

عبدالحمید کا انداز بیان نہایت شیریں اور سلیس ہوا کرتا۔ اس کے الفاظ میں ایک لوچ اور دلکشی ہوتی۔ حکیمانہ خیالات اور فلسفیانہ مضامین کی بھی اس کے پاس کمی نہیں۔ اس کی ندرت تحریر کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ابو مسلم خراسانی نے عبدالحمید کی تحریروں کو جو مروان کی طرف سے اس کی ہدایت کے لئے لکھی گئی تھیں پڑھنے سے انکار کیا کہ کہیں اس کے خیالات ہی نہ بدل جائیں اور اسی خوف سے انھیں آگ کی نذر کر دیا۔

عربی نثر کے آغاز میں عبدالحمید کی شخصیت اتنی گرانمایہ تھی کہ اسے بعد میں "عربی نثر کا باوا آدم" کہنے لگے۔

ابوالفضل

غزل

دیر و حرم کی بنیادوں پر آؤ نئے مینار اٹھائیں
صدیوں سے چھپنے والے کو ایک نئی منزل سے پکاریں

تیری لو بھی پوشیدہ ہے، اپنا عزم بھی خوابیدہ ہے
دھواں دھواں پستی و بلندی، کیسی جیتیں، کیسی ہاریں

بندوں کو دھمکانے والے، کاش کبھی یہ سوچا ہوتا
سانسوں کی خیرات کے بدلے ہم دو جگ کا بوجھ سہاریں

پوجا کے بھوکے دیوتاؤ، تم ہی کوئی ڈھنگ سجھاؤ
رنگ اجاڑے، روپ بگاڑے، سب کچھ وارا، اب کیا واریں

تند ہواؤں کی شدت کو پل پل بعد بڑھاتے کیوں ہو؟
کب تک کاہل گیتی کو ہم بیچارے انسان سنواریں!

وقت ہے اک چکر میں خراماں گھوم گھوم کر لوٹ آئے گا
امڈیں گی گھنگھور گھٹائیں، مہکیں گی بھرپور بہاریں

کہتے ہیں یہ بے نام اجالے، اب جاگیں گے قافلے والے
قلب افق میں کوندے بن کر ڈوبے [illegible]

فرش ہمارا، عرش ہمارا، آؤ عہد یہ آؤ دہرا لو
جو تاروں کی روشن افشاں کو دھرتی کے ماتھے پہ اتاریں

احمد ندیم قاسمی

مہر و مہ و انجم

پچھلے دنوں بمبئی میں عابد روڈ کی ایک دوکان پر قطار میں کھڑا ہوا تھا۔ ابھی میری باری آنے بھی نہ پائی تھی کہ بارش شروع ہوگئی اور قطار میں کھلبلی مچ گئی۔ پناہ کے لئے سب دوکانوں کے سائبانوں میں ٹوٹ پڑے۔ میں بھی ایک کتب فروش کی دوکان کے برآمدے میں پناہ کے لئے دوڑا۔ جب میں قطار سے نکل کر دوڑ رہا تھا وہیں بجلی کے کھمبے سے قریب ایک لفافہ پڑا ہوا ملا، جو نہ معلوم ڈاک میں حوالے کئے جانے کے بجائے وہاں کیسے گر گیا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا تاکہ ڈاک خانہ میں ڈال سکوں۔ سائبان میں جب میں نے لفافے پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ سوائے لفظ بمبئی کے باقی تمام حروف بارش سے دھل گئے ہیں، اور ڈاک میں ڈالنے سے یہ خط صرف لاوارثی خطوط کے دفتر میں پہنچ کر ضائع ہو جائے گا۔ جب تک بارش ہوتی رہی، میں یہی سوچتا رہا کہ اس خط کو کیا جائے۔ سوچا یہ خیال آیا کہ خط کو کھول کر کاتب کے پتہ پر واپس کر دیا جائے۔ گو اس خیال پر ضمیر نے ملامت بھی کی کہ اور دن کا راز کیوں جان رہے ہو؟ جانے کسی محبوب کا خط ہو، کسی بیوی نے اپنے شوہر کو خط لکھا ہو، یا یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مہاجن نے اپنے قرضدار کو نوٹس دیا ہو! ان لمحوں میں مجھے ان شاعروں کی یاد بہت ستا گئی جو لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیتے تھے۔ جب میں گھر لوٹا تو یہ خط پھر یاد آگیا، اور مجھے سند باد جہازی والے پیر تسمہ پا کی یاد آگئی۔ چونکہ یہ خط مجھ سے میرے خیالوں پر چھایا ہوا تھا میں نے لفافہ چاک کیا۔ انداز تحریر سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ کسی لڑکی نے لکھا ہے۔ کسی لڑکی کا خط پا کر جیسے میں ہواؤں میں تیرنے لگا۔ آج میں بھی ایک لڑکی کی دل کی دھڑکن کا سن رہا ہوں۔ اس خط میں پیار کی باتیں ہوں گی۔ راز کی ملاقاتوں کا ذکر ہوگا، اندھیرے سے اجالے میں آنے کے احوال ہوں گے۔ میں نے جب القاب پڑھے میری یہ خیال آرائیاں دفعتاً فو ہو گئیں۔ ایک بھتیجی نے چچا کو یہ خط لکھا تھا۔ اس خط میں مہر و مہ و انجم ہی کا ذکر تھا۔ مہ نے یہ خط لکھا تھا۔

"چچا جان! قدمبوسی اور ہزار احترام!

بہت دنوں سے آپ نے کوئی خط نہیں لکھا، اور نہ ہماری خیریت معلوم کی۔ اماں کہتی ہیں کہ ہم تینوں یتیم بہنوں کا آپ کے سوا اور کون سہارا ہے۔ وہ یہ فرماتی ہیں کہ اس بیوہ کے صرف آپ ہی پرسانِ حال ہیں۔ لیکن آپ نے بمبئی جانے کے بعد سے کوئی خط نہیں نہ لکھا۔ ہمسایہ گھر والی آمنہ خالہ نے بتلایا کہ ان کے بھائی کے ہاں آپ کا خط آیا ہے کہ آپ کو بمبئی میں اچھی ملازمت مل گئی ہے۔ کیا اس خوش خبری کے سننے کے ہم حق دار نہیں ہیں؟

پیارے چچا! آپ کو یہ سن کر بے حد تکلیف ہوگی کہ مہر کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اماں اس واقعہ سے اتنی دل گیر ہو گئی ہیں کہ رہ رہ کر انھیں پسینہ آجاتا ہے اور وہ گھبرائی ہوئی دیوانوں کی سی باتیں کرتی ہیں۔ گھڑی میں رو رہی ہیں، گھڑی میں دیوانوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فضا میں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہتی ہیں۔ بہت دیر دیر تک چپ رہنے کے بعد کہتی ہیں کہ تقدیر نے مجھے یہ دن دکھانے کے لئے زندہ رکھا ہے۔ کل جب وہ کہہ رہی تھیں کہ "یہ تین لڑکیاں میرے سینے پر تین پہاڑ ہیں۔ ان تین پہاڑوں تلے میرا دم نکلا جا رہا ہے" تو انجم برا مان گئی اور کہنے لگی کہ اماں

اگر آپ کو ہمارا وجود اس قدر برا معلوم ہوتا ہے تو ہمیں زہر دے دو!" انجم بچپن ہی سے اُلٹی باتیں کرنے کی عادی ہے۔ وہ اماں کی باتیں سمجھ نہ سکی۔ اس کے اس جملے پر اماں زار زار رونے لگیں، اور انجم کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ کہنے لگیں کہ "میری لختِ جگر تو نے کچھ سمجھا نہیں، میری بھولی بچی، میری کلی جیسی نازک بچی تجھے کیا معلوم!" پھر انجم بھی رونے لگی۔ ہاں چچا جان! اماں کو اس رشتہ کے ٹوٹ جانے کا سخت ملال ہے۔ کہتی ہیں کہ اس انتظار اور یاس بھری نگاہوں میں روشنی کی ایک کرن آ رہی تھی وہ بھی جاتی رہی۔ مہر آپا کے منگیتر نے پرسوں کہلا بھجوایا کہ مہر آپا کی عمر بہت زیادہ ہے اس لئے وہ بیاہ نہیں کر سکتے، البتہ انجم سے بیاہ کرنے تیار ہیں۔ اماں نے بہت دیر سوچنے کے بعد کہلا بھیجا کہ یہ ممکن نہیں۔ پھر وہ ہم سب کو اپنے کلیجے سے لگا لیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر ہمارے رخسار اور پیشانی پر بہنے لگے۔ اماں نے کہا کہ انجم کو اگر بیاہ دوں تو پھر میری دونوں پھول، مہر و قمر کو کون بیاہے گا۔ تم دونوں کے متعلق یہ دنیا کیسے اعتراضات نہیں اٹھائے گی۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ یہ جو رشتہ ٹوٹ گیا اچھا ہی ہوا۔ آپ نے منگیتر صاحب کو دیکھا ہے نا! سر پر بگلوں کی طرح سفید بال ہو گئے ہیں بشکل سے سر ڈھانک کر سپیدی چھپانا چاہتے ہیں۔ حنائی رنگ کی مونچھیں، خضاب کی مدد کا صاف پتہ دیتی ہیں، لیکن اس کے باوجود چاہتے ہیں کہ انجم سے بیاہ کریں۔ مہر آپا کو بھی اس رشتہ کے ٹوٹنے کا افسوس سا معلوم ہوتا ہے۔ وہ بھی کچھ کھوئی کھوئی سی، اداس اور خاموش معلوم ہوتی ہیں۔ جب سے شادی کی بات پکی ہوئی تھی ان کا رنگ جیسے نکھر رہا تھا اور وہ خوش خوش دکھائی دے رہی تھیں، لیکن دفعتاً جیسے انھیں اب کچھ ہو گیا ہے۔ اماں مہر آپا کو سمجھاتے سمجھاتے تنگ آ چکی ہیں کہ اتنی دل گیر نہ ہو لیکن لڑکی اور شادی کا تصور۔ اس افسوس کو اماں کی باتیں کیسے دور کر سکتی ہیں، آپ ہی بتلائیے نا!

انجم اس سال میٹرک میں کامیاب نہ ہو سکی، وہ دو پرچوں میں ناکام ہو گئی۔ اس سال وہ اسکول نہیں جائے گی۔ گھر ہی میں وہ امتحان کی تیاری کر کے خانگی امیدوار کی حیثیت سے شریک ہونا چاہتی ہے۔ بے چاری کامیاب ہو جاتی، لیکن اس کے پاس پڑھنے کے لئے کتابیں بھی نہ تھیں۔ اماں کہتی تھیں کہ امتحان کے قریب کتابیں دلوائیں گی، لیکن مشیت کو ہمارا امتحان لینا مقصود تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہماری گزر بسر صرف ایک مکان پر ہے جسے ہم نے کرایہ پر دے رکھا ہے، اور اس چھوٹے سے مکان میں معمولی کرایہ پر ہیں۔ ہمارے مکان کا چالیس روپے جو کرایہ آتا ہے وہی ہماری زیست کا آسرا ہے۔ اس مکان میں جس کمپنی کا جو منیجر تھا وہ ایک ہی رات میں مکان خالی کر کے بلا کسی علم و اطلاع کے معلوم نہیں کہاں چلا گیا۔ ایک مہینہ کا کرایہ کیا ڈوبا، ہم سب کی دنیا ڈوبی۔ اماں کے ہاتھ میں چاندی کا جو آخری کڑا تھا وہ بیچ کر ہم نے ایک مہینہ کاٹا۔ اگر یہ حادثہ پیش نہ آتا تو انجم کو کتابیں دلوائی جاتیں، اور شاید وہ رب العالمین کے صدقے کامیاب بھی ہو جاتیں، لیکن میں نے

آپ سے ابھی جو کہا کہ مشیت ہمارا امتحان لینا چاہتی ہے۔ اماں انجم سے کہہ رہی ہیں کہ ابھی امتحان کو ایک سال باقی ہے، جب تک کسی اسکول میں نوکری کرے لیکن انجم اماں کی بات نہیں مانتی۔ وہ کہتی ہے کہ بغیر سند والوں کو نوکری کے لئے سفارش کی ضرورت ہے، اور ہم غریب سفارش کہاں سے لائیں۔ پھر جب وہ ایک مرتبہ ملازم ہو جائے گی تو اس چکر میں وہ میٹرک بھی کامیاب نہ کر سکے گی۔

آپ کو آخر میں یہ خوش خبری سنانا چاہتی ہوں کہ میں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کر لیا ہے، اور اب بی۔اے میں داخلہ بھی لے لیا ہے لیکن مجھے کالج جانے سے ڈر سا لگتا ہے، مجھ سے کوئی لڑکی نہیں ملتی، مجھ سے کوئی دوستی نہیں کرتی، سب مجھ سے کترا کر بھاگتی ہیں۔ آپا ئیں بھی مجھے نہیں چاہتی ہیں۔ چونکہ میں تیلیا رومال پہنے کالج جاتی ہوں، میرے پاس اچھے کپڑے کہاں؟

چچا جان! میں نے سنا ہے کہ بمبئی میں جمعرات کے بازار میں سپید ساڑیاں وغیرہ سستی ملتی ہیں، اگر آپ سے ہو سکے تو میرے لئے مستعملہ سستی ساڑیاں اور قمیصوں کے لئے سستا ریشمی کپڑا بھجوائیے، اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہاں پرانے سینڈل اور زنانی جوتے بھی فروخت ہوتے ہیں، اگر کوئی سستا جوتا مل جائے تو میرے لئے ضرور خرید یے۔ پرسوں جب میں ننگے پیر کالج گئی تھی تو میری جماعت کی لڑکیوں نے بہت بری نظروں سے مجھے دیکھا۔ اگر وہ مجھے اسی طرح دیکھتی رہیں گی تو میں کالج جانا چھوڑ دوں گی۔ جب میں کالج جاتی ہوں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ احساس کمتری میرا گلا دبوچ رہا ہے۔ میری غربت میری روح کو سلب کر رہی ہے۔ میری بیچارگی میری شرافت کا خاتمہ کر رہی ہے۔ لیکن یہ غریبی بھی عجیب ہے کہ پھر بھی ہم جئے جاتے ہیں۔

میں نے اتنا طویل خط آپ کو لکھ دیا، لیکن اصل بات لکھنا ہی بھول گئی۔ اماں کہتی ہیں کہ آپ بمبئی جاتے وقت ان سے جو پاؤ تولہ کی طلائی انگوٹھی لیکر رہن کرائے تھے اب ان کو اس انگوٹھی کی سخت ضرورت ہے۔ چونکہ ہم سب کے کپڑے تار تار ہو چکے ہیں۔ ابا کے انتقال کے بعد سے کوئی کپڑے ہم بنوا نہ سکے، اور چار سال تک وہی پرانے کپڑے استعمال کرتے رہے۔ براہ کرم آپ توجہ فرمائیے، ہم پر احسان ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ میرے اچھے چچا خط کا جلد جواب دیں گے۔ تہرآپا اور انجم آپ کو قدمبوسی کہتی ہیں۔ اماں آپ کو دعا فرماتی ہیں۔"

آپ کی

مہر

یہ خط اس لئے میں نے چاک کیا تھا کہ کاتب کے پاس واپس کر دوں۔ لیکن واپس کرنے کی مجھ میں اب ہمت نہیں، کتنے ارادے، کتنی امیدیں، کتنی آرزوئیں اس خط میں ہیں جو یہ خط واپس پہنچ جائے تو تین لڑکیوں اور ایک ضعیف ماں پر

ایک اور بجلی گرے گی۔ یہ خط مہرو مہ و انجم سے چھپا تک بھی نہیں سکتا۔ چونکہ بارش کے قطروں سے پتہ دُھل چکا ہے، شاید قدرت کو ان لڑکیوں کا اور امتحان مقصود ہے۔ لیکن اس امتحان میں میں بھی شریک کر لیا گیا ہوں۔ بیچاری ستم نصیب لڑکیوں نے نام بھی کتنے اُلٹے رکھ لئے ہیں، مہرو مہ و انجم تینوں کے پاس اندھیرا ہے، اندھیرے میں جا رہی ہیں۔ آگے بھی اندھیرا ہے۔ اس اندھیرے میں وہ اس خط سے نور کی کرن کی کتنی اُمید باندھی ہوئی ہیں، اور یہ خط میرے پاس ہے۔

گزشتہ چار روز سے یہ خط میرے پاس ہے اور میری عقل گُم ہوگئی ہے۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ اس خط کو کیا کروں۔

محبوب حسین جگر

غزل

ان کی الفت میں سب گوارا ہے — وہ ہیں پیارے تو غم بھی پیارا ہے

موت کی جستجو میں نکلا ہوں — زیست نے کیوں مجھے پکارا ہے

دیدۂ تر سے اشک یوں ٹپکا — جیسے ٹوٹا ہوا ستارا ہے

زندگی جس کو لوگ کہتے ہیں — نگہِ دوست کا اشارا ہے

دل کی کشتی جہاں بھی رُک جائے — ہم سمجھتے ہیں وہ کنارا ہے

اشک آنکھوں میں ہے نہ خوں باقی — سسکیوں پر ہی اب گزارا ہے

دو ہی آنسو ظفر بہائے تھے
ایک جگنو ہے، ایک تارا ہے

احمد ظفر (راولپنڈی)

محبت

اف وہ طغیانِ محبت، ہائے وہ جوشِ جنوں — وقت کے قدموں پہ ہوتا ہی نہیں جس کا سرنگوں

موج و طوفاں میں بھی جو مرکز سے ہٹ سکتا نہیں — جس کا رُخ دریا کا دھارا بھی پلٹ سکتا نہیں

عشق کی فطرت ہواؤں سے بدلتی ہے کہیں — قالبِ شبنم میں ایسی آگ ڈھلتی ہے کہیں

صرصرِ ایام سے افسردہ ہوں نغموں کے پھول — قہقہے ہو جائیں طوفانِ حوادث سے ملول

عشق کی فطرت حریفِ گردشِ ایام ہے — عشق جس عالم میں ہے، آزادِ صبح و شام ہے

گرمِ احساسِ شباب و تیز نبضِ کائنات — از زمیں تا آسماں رقصِ رگِ جانِ حیات!!

ایک نشہ، اک تبسم، اک ترنم صبح و شام — گریۂ فطرت سے دل کے قہقہوں کا انتقام!

اک سرورِ سرمدی، اک عالمِ کیفِ تمام — عشق کیا ہے روح کی مستی میں کھو جانا مدام

وقت بدلے، عشق کا عالم بدلتا ہی نہیں — وقت کے شعلے میں یہ سونا پگھلتا ہی نہیں

صفحۂ فردا کے افسانے پڑھے جاتے بھی ہیں — عشق کے پُرکیف لمحے جا کے پھر آتے بھی ہیں؟

روئے مہر و ماہ سے پردے اٹھا سکتا ہے کون — قسمتِ آدم کی تحریریں مٹا سکتا ہے کون؟

آ مرے نزدیک او فردوسِ فطرت کی بہار — عشرتِ کونین کر دوں تیرے قدموں پہ نثار

لوٹ کر آ اے دوست پھر عہدِ شباب آتا نہیں
انقلاب آتے ہیں، ایسا انقلاب آتا نہیں!!

شور

سوزِ دروں

(اس افسانے کی تخلیق اپنے وقت سے دو سال پہلے ہوئی ہے اس لئے دو سال بعد پڑھئے اس افسانے کو)

وہ ایک اندھیری گلی تھی، جہاں سے کھسر پھسر چند انسانی آوازیں آرہی تھیں۔ شام کے دھندلکے میں لالہ رام جی کی کوٹھی کی چاندنی پر چند انسانیت سوز شخصیتیں براجمان تھیں جنھوں نے صرف سڑی ہوئی نعشوں کو چاٹنا سیکھا تھا، اور اکیلے دکیلے کا راستہ ہی بیلی کہہ کر لوٹ پڑتی تھیں۔ یہ اس تنگ گلی کے شیر کہلاتی تھیں۔ تاریخ گواہ ہے تم بھی الٹ کر دیکھو تو پتہ چلے کہ انھوں نے کیسے کیسے سورماؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، جن کا چلنا پھرنا خود دوبھر تھا، اور ہمیشہ زندگی کو کوسا کرتے تھے۔ نہ صرف انھوں نے سورماؤں کی جانیں لیں بلکہ زمین پر پھینک کر کھڑ ساٹھ سترفٹ کی بلندی سے اس پر سلیں پھینک کر پاش پاش کر دیا تھا۔ ان کی کامیابی کا راز دراصل ان کی اپنی جماعت کا ناقابل شکن اتحاد تھا، یہ جماعت ہمیشہ لالہ رام جی کی کوٹھی پر بیٹھا کرتی تھی، یہیں ساری کانفرنسیں ہوا کرتی تھیں۔ یہیں سوڈے کے شیشے، کانچ کے ٹکڑے، لوہے کے گولے اور پتھر کی سلیں لئے کسی بھولے بھالے، گم کردہ راہ مسلمان کا انتظار کیا کرتے تھے وہ! یہ وہ تنگ و تاریک گلی تھی جدھر سے پولیس کا گذر کبھی نہ ہوتا تھا، اور ان کے اپنے بیان کے مطابق یہ گلی "ناقابل توجہ تھی" ——— اور ناقابل توجہ ہوتی بھی کیوں نہیں، جبکہ [illegible] پر جو [illegible] اور پر گھبراتی تھی، اور جو ہے اس کی آمد کا نام سنتے تو دم سادھ کر خاموش ہو رہتے۔ بہرحال جو ہے اپنی جان و مال کو دور ہی سے دعائیں دیتے تھے، اور بلی چوہوں کو موٹا موٹا دیکھ کر گھبراتی تھی۔

فساد کو شروع ہوئے [illegible] گھنٹے ہو رہے تھے۔ مگر ابھی تک پولیس کھلے کھلے میدانوں میں فسادیوں پر آتش باری کر رہی تھی، مگر فسادی تھے کہ اپنے حقوق کو دم توڑتا دیکھ کر آگ کی چادر اوڑھ کر بھی ان کی دیواریں ہتھیلیوں میں اپنی جانیں رکھے گھسے جا رہے تھے۔ ایسے میں مصیبت کا مارا ایک نوجوان گھبرا کر پاس کی جانی پہچانی گلی میں گھس گیا، اور ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کی ایک سانس لی ——— وہ بلوائیوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے آج تک کبھی ایسے انسانیت کش مظاہرے نہیں دیکھے تھے، وہ اپنی زندگی کی ڈور میں بائیسویں گرہ ڈال رہا تھا، مگر اس کو قسم کھانے کو جگہ نہ تھی جو کہیں انسان کے حلقوم سے ابلتا ہوا خون دیکھا ہو۔ میدان جنگ سے لوٹے ہوئے سپاہیوں کی زبانی اس نے صرف مرچ مسالے کے ساتھ حیرت زا واقعات سنے تھے، کہ سنی سنائی باتیں، آج حقیقت کا روپ کاڑھے جلوہ افروز تھیں۔ انسان جو کمخواب و دیبا میں اٹھتا بیٹھتا ہے، انسان جو گھاس پھوس کے نرم نرم بستر پر لیٹتا اٹھتا ہے، سڑکوں پر، گلیوں میں، ادھر ادھر خون میں لت پت ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، جیسے روح اس سے [illegible] ہو رہی تھی، یا خون [illegible] ہو رہا تھا، یا ہندوستان کی فرقہ وارانہ [illegible] اور باہمی نفاق پر یہ لاشے خندہ زن تھے۔ ہندوستان کو آزادی دلانے والے بہادر ایک ایک کر کے ختم ہو رہے تھے۔ اگر یہی سڑکوں پر جان دینے والے اور ہر سنگ و خشت سے ٹکر لینے والے مذہبی فرہاد ہند ماتا کے نام قربان ہوتے تو کیا انھیں آزادی نہیں مل سکتی تھی؟ مگر یہ ہندو! یہ مسلمان! ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ...... ان میں ہوش و خرد کا نام کہاں، جو سمجھتے ہندو و مسلمان خون الگ کوئی علاحدہ خون نہیں۔ وہ دو درخت پاس پاس ہوتے ہیں تو [illegible] ہو کر ایک ہو جاتے ہیں، لیکن یہ دونوں آپس میں

ملتے ملتے نیل کے پانی کی طرح علیحدہ ہو کر موسیٰ کی فوج کو گزرنے کیوں دیتے ہیں، ہوش کی دوا کیوں نہیں کرتے۔ بہت ساری زمینیں گزرتی رہیں، اب فرعون کی فوج بھی گزرنے لگی ہے۔ کیا ہوا انہیں جو موسیٰؑ اور فرعون میں تمیز نہیں کرتے؟ یہ دونوں مل جائیں تو کیا فرعون کی ساری فوج اور اس کے اپنے سارے ارمانوں کا خون نہ ہوسکے گا۔ ؟ ——.

وہ گرم گرم گولیوں کے درمیان سے کبھی نہ گزرا تھا، ہر بار جب گولی اس کے کان پر سے گزر جایا کرتی تو اس کو زندگی کی کچھ قدر و قیمت محسوس ہوتی، اس کا سارا جسم پسینہ سے تربتر تھا، اور ایسا لگ رہا تھا، جیسے اس کے ہر ہر عضو سے پسینے کے جھرنے بہہ رہے ہیں۔ تقریباً کچھ دن اوپر ایک سال تک اس نے بنجر زمین پر ہل چلایا تھا، بڑے بڑے پہاڑ کھود کر نہریں نکالی تھیں، سبل اور کدال لئے پہروں سڑکوں پر پسینہ بہایا گیا، پسینہ اس کے ہر ہر بال سے بہتا تھا، ہر بال کی جڑ میں پسینے کے چشمے ہی چشمے تھے۔ مگر وہ پسینہ ہی کیا تھا، جو اس کا مقابلہ کرتا، کیا بلحاظ لطافت اور کیا بلحاظ شدت، اس پسینے اور اس پسینے میں خورشید و اختر کا فرق تھا۔ پہلے خون عرق ہو کر بہتا تھا، اور اب ہمت پانی ہو رہی تھی، اور یہ مناظر دیکھ کر تقدیر آپ ہی آپ پانی پانی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے خیالات کے سہارے بڑھنے لگا، اس گلی میں سے وہ کئی دفعہ گزر چکا تھا، وہ اچھی طرح پہچانتا تھا، یہی گلی آگے چل کر بڑی سڑک میں کھلتی تھی، جہاں سے ڈاک خانہ بالکل قریب پڑتا تھا، بس یہی کان اور ناک کی مسافت! جہاں تک ہوسکے جلدی کو پوسٹ آفس بحفاظت تمام پہنچ جانا چاہیئے تھا، اس لئے کہ ذرا سی آہٹ ہوتی اور اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر دہنی جیب کی طرف اٹھ جاتا تھا، حالانکہ اس کو وہاں کا ذرہ ذرہ جانتا اور پہچانتا تھا، وہ دل ہی دل میں کہنے لگا "یہی تو ہے چندر بھان کی کوٹھی، اور یہ جو برابر میں ہے سیٹھ لکشمی نارائن ہی تو ہے، اور ہاں یہ اونچا مکان سردار بابو کا ہے نا" —— یکایک وہ ٹھٹکا، کیا اعتبار اس دنیا کا ——؟ باپ بیٹے کو نہیں سمجھتا، موقع پر بہن بھائی کو آنکھیں دکھاتی ہے" —— یہاں تو ہندو مسلم بات ہے، وہ قدم قدم پر بچھے ہوئے انسانیت سوز جال، آزادی کی راہ میں پھیلے ہوئے روڑوں کو دیکھ کر شانتا کے گھر چلا جانا مناسب جانا، مگر اس کے پیش نظر شانتا کی گھریلو عزت اور بیرونی وقار ہر دو چیزیں تھیں، اگر وہ چلا جاتا تو بہت ممکن ہے شانتا اس کو چھپالیتی، مگر اس کے باپ کو پتہ چل جاتا تو —— جانے بیٹی کا کیا حشر ہوتا، آخر وہ مسلمان ہی تو تھا اور جو محلے والوں کو اس کی خبر ہو جاتی! کیا ایسے نازک موقع پر شانتا سر اٹھانے کے قابل رہتی؟ اس کے اپنے مذہب والے اس کی تکا بوٹی نہ کر دیتے ——؟ وہ چہرے کا پسینہ پونچھنے لگا، اور خدا کا نام لیکر جلد جلد اس نے قدم اٹھائے، ابھی گلی کی اس نکڑ پر پہنچ نہ پایا تھا جہاں سے اس کو توی امید تھی کہ جیون پگڈنڈی کو بکھرے ہوئے خار مغیلاں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ ایک اچھے مقام پر پہنچا دے گا، عین اس وقت جب وہ رام جی کی کوٹھی تلے تھا، بمباریں سے بم پھینکنے والوں کی طرح ان لوگوں نے بھی نشانہ باندھ کر ایک دو —— تین چار سلیں غریب جعفری پر دے ماریں، تیورا کر کہاں سے گرتا، بس کھڑا کھڑا دفن ہو گیا، نہ سر کی جگہ سر رہا اور نہ دل و جگر میں کوئی امتیاز ہی باقی رہا، وہ کہو کہ خیر ہوئی دو تین سلیں اوپر ہی اوپر ٹکرا کر دور دور جا پڑیں، کھوپڑی پچک کر رہ گئی، اور اس کے اونچے اونچے خیالات، بس رام جی کو مس کرتے ہوئے اوپر چلے گئے۔

"بھگوان کی قسم! مار کھا کے سور کی طرح گر پڑا سالے کا بچہ" شفق القاب حیوان اپنی جوانمردی پر دانت دکھلانے لگا۔

ہی —— ۰۰۰ ہی ہی ۰۰۰ ہی ہی ہی!!! ——.

"ہم سے کہیں بڑھ سکتے ہیں ایک قدم بھی یہ" دوسرا خاندانی بہادری کا تذکرہ کرنے لگا۔

"پرماتما کی قسم گن گن نہ ماروں تو کہنا میں اپنے ایک باپ کا بیٹا نہیں"

"ایک ہی وار میں سکت کی تاب بھی نہ رہی، آیا ہے جاسوسی کرنے، ذرا اس کا دل گردہ تو دیکھو کہ ایسے خطرناک موقع پر

نئے نئے کپڑے پہن رکھے ہیں، بس نئی شیروانی اس کے حق میں کفن ہو کر رہ گئی"
"سوچ سمجھ کر پہنے ہوں گے اس نے کپڑے، غسل بھی کر لیا ہوگا، ہوشیاری سے تلاشی لو، کہیں
اٹھ نہ جائے وہ، گرگٹوں کی طرح سخت جان ہوتے ہیں بڑے وہ، کچھ مل جائے تو اچھا ہے۔"

دو تین نیچے اتر گئے، اور دو چار اوپر کے اوپر ہی رہے۔

رضوی نہ جانے کیوں ہر سال ایک ایک ٹھوکر کھاتا آیا، اور جب اس نے بائیسویں ٹھوکر کھائی تو گر کر پھر اٹھ نہ سکا۔ اس کو حیدر آباد چھوڑے کچھ دن ادھر ایک سال ہو چکا تھا۔ حیدر آباد میں اس کو کس چیز کی کمی تھی، کھاتے پیتے گھرانے کا خوش حال فرد تھا، نہ خیالِ امروز نہ فکرِ فردا، بس زندگی ہنستی کھیلتی ایک ہی سڑک پر دوڑتی تھی۔ کالج سے گھر، گھر سے کالج! فرصت کے اوقات میں سسکتی ہوئی روحوں اور لرزتے ہوئے جیون کو، دل سوز، دل فگار مناظر کی اس عمدگی سے پُر کاری کرتا کہ الفاظ کی صورت میں قرطاس پر کھنچی ہوئی تصویریں، ہندوستان کا منہ چڑاتی تھیں، وہ پُر سوز مناظر دیکھ کر خود کے دل میں بھی جلا دینے والے شعلے محسوس کرتا تھا، مگر اس کی خاندانی خوش حالی اور تمول نے بذاتہ اس کے دل میں سوز، اور رنج و غم پیدا ہونے کا موقع نہ دیا تھا، لاکھ دولت ہو لیکن زندگی سدا مسرت و خوشی کی نذر نہیں ہوتی، اس کو اٹھتے ہوئے، بڑے بڑے طوفانوں میں سے بھی گزرنا ہوتا ہے، مکھی صرف شکر پر ہی نہیں بیٹھتی، زخموں پر بھی بیٹھ بیٹھ کر زخمی کو تنگ کر دیتی ہے، ہنسی خوشی زندگی کے دن کاٹنے والے خاندان پر یکایک عقابِ کی بھسم کر دینے والی نظریں پڑیں، اور رضوی کے بڑے بھائی پر ناگہاں پہاڑ ٹوٹ پڑے اور حکومت نے اس کو حادثۂ شاہ منزل کا ملزم ٹھہرا کر حراست میں لے لیا۔ بات فی الحقیقت یہ تھی کہ حکومت کی ذرا سی غلطی پر مسجد شہید ہو گئی۔ بارہا احتجاج پر بھی حکومت کے کان پر جوں نہ رینگی، اگر اس کو اپنی غلطی کا علم ہو چکا تھا تو یہ احساس بہت دیر بعد ہوا۔ مسلم عوام تاخیر کا سبب نہ سمجھ سکے، ان میں مزید تابِ صبر نہ تھی، اپنے سر دل پر منڈلاتے ہوئے عقاب کو دیکھ کر پہلے تو انھوں نے اپنا منہ چھپایا، لیکن جب انھیں یقین ہو گیا کہ بلند پرواز عقاب کے اوپر کڑکڑانے والی بجلی موجود ہے تو فوراً بغاوت پر کمر باندھ لی اور جوشِ غضب میں صدر اعظم بہادر کے گھر کو بھی آگ لگا دی۔

رضوی کے بھائی کی ایک بڑی دوکان تھی، اور دوکان کا یکایک بند ہو جانا تجارتی نقطۂ نظر سے زبردست خسارہ کا موجب ہوتا ہے۔ بڑے بھائی نے جیل میں پند و نصائح کا دامن پھیلایا اور خوب نصیحتیں کیں، زندگی کے نشیب و فراز سمجھائے، اور اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے طریقے بتائے۔ رضوی بھائی کی حسرت بھری نظروں سے نظر نہ ملا سکا، رضوی کے باپ نے بھی بہت دنوں پہلے اپنی آخری سانسوں میں بالکل اسی طرح دیکھا تھا کہ وہ نظر نہ ملا سکا، اور بے اختیار اشک بہنے لگے تھے۔ بھائی کی گریہ آلود آواز اس کے کانوں میں دھماکے پیدا کر رہی تھی، جو ہری بم کے دھماکوں سے بھی بڑی اور خطرناک آواز، وہ لرزنے لگا، اور جی میں آئی کہ کھڑے ہوئے پہریداروں کو ایک ایسا تھپڑ جمائے کہ چکرا کر پھر کھائے ہوئے گیند کی طرح گھومے، اور یہ جو جیلر بیٹھا ہے اس کے ایک ایسی دولتی لگائے کہ بیٹھا بیٹھا دم چھوڑ دے، آخر ان لوگوں کو محض شبہ پر حراست میں رکھنے کا حق کیوں حاصل ہو گیا، وہ جیل کی اونچی اونچی دیواروں کو اپنے سر کی ضربوں سے برباد و مسمار کر سکتا تھا، اور وہاں سے اپنے بھائی سمیت نو دو گیارہ ہو سکتا تھا، راہِ سفر تلاش کرتی نظریں پاس ہی کھڑے ہوئے پہرے والے پر پڑیں، اور اس کو ایسا لگا کہ آنسوؤں میں سے گزرتی ہوئی دھندلی نظریں پہرے... والے کو نہیں چاند بی بی کو دیکھ رہی ہیں، جو فصیل سے لگی کھڑی تھی، چاند بی بی کے آگے اس نے بےاختیار

ڈال دیے اور بھائی کی طرف متوجہ ہوا۔ حالانکہ بھائی شروع سے اب تک برابر کہے جا رہا تھا، رضوی نے بھائی کو دلاسا دیا اور ضمانت پر چھڑا لینے کی ممکنہ سعی کا وعدہ کیا، حالانکہ مجلس اتحاد المسلمین" گرفتاران شاہ منزل کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی، پھر بھی، اپنوں کی دوڑ دھوپ قیدی کو ایک نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوتی ہے، کافی تسلی اور تشفی دینے کے بعد اس نے اپنی ساری توانائیاں دوکان پر صرف کرنے کا پُر زور وعدہ کیا۔

رضوی سے جیسے بھی بن پڑا دو مہینے دوکان سنبھالی اور جب بھائی آیا تو چند جھوٹوں اور چند سچوں نے دوکان بھر کے خود بھائی کو بھائی پر شبہ ہونے لگا۔ جب بھائی پر بھائی شبہ کرتا ہے تو دونوں میں اتفاق کیونکر ممکن ہوگا، اور جب اتفاق ہی نہ ہوگا تو گھر کیسے چلے گا، کیا دوسرے اس گھر کی تاک میں نہ لگے رہیں گے، ہندو، مسلمان، دونوں بھائی بھائی، اگر ہر دو، ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں، کیا ایسی صورت میں اتحاد ممکن ہوگا، کیا وہ اپنا گھر بچانے میں کامیاب ہو سکے؟ . . . . . . بھائی کے جھوٹے بہی خواہوں نے اپنی ہمدردی جتانے کے شوق میں اور اپنے احسان کے دکھاوے کی خاطر، اتنی دفعہ، اتنی دفعہ کہا کہ جھوٹ بھی سچ ہو کر رہ گیا، اور ایک دن بھائی نے رضوی سے حساب لیتے ہوئے کہا: "تم نے چار سو روپے اپنی ناجائز خواہشات پر صرف کئے ہیں!" رضوی بھائی کی زبانی یہ الفاظ سننے کے لئے کسی قیمت بھی تیار نہ تھا، نیکی کرا ور دریا میں ڈال" کے مصداق معاملہ درپیش تھا، اپنے مذاق کے خلاف اس نے دوکان چلائی تھی، چونکہ دوکانداری اس کے مذاق کی چیز نہ تھی، بہت ممکن ہے کچھ نقصان بھی ہوا ہوگا۔ دن بھر غور و فکر کرنے والا، اپنے خیالات میں آپ مست رہنے والا انسان بھلا تجارت کیا خاک کرے گا، یہی وجہ تھی کہ دوکان کا وہ پہلے کا سا رنگ نہ رہا تھا، لیکن چار سو روپیوں کا اس کی ناجائز خواہشات پر صرف ہونا سراسر بہتان تھا، اس نے تھوڑی ہی دیر میں، جو کچھ فیصلہ کرنا تھا کر لیا، اور بھائی کے لگائے ہوئے اتہام پر جلا بھنا وہاں سے اُٹھ گیا۔ سیدھا گھر گیا، کسی سے کچھ کہا نہ کسی کو کچھ بتایا، اپنے افسانوں کے مجموعے کو اُٹھایا، اور برسوں کا بکھرا ہوا سوز لئے جو فاسفورس کی طرح چمک رہا تھا، اپنے کمرے سے باہر نکل گیا۔ بھابی نے چہرے پر ناگوار شکنیں دیکھیں، جن میں سے غم و اندوہ کے بادل، ور رنج و ملال کی بجلیاں جھانک رہی تھیں ہنس مکھ، اور ہمیشہ صاف رہنے والے چہرے پر رنج و غم کی لکیریں شدت کے ساتھ مرتسم ہوتی جا رہی تھیں۔ خلافِ معمول چیز دیکھ کر بھابی جھجکی، اور بولی: "کیوں بھیا خیر تو ہے؟"

"دعا ہے تمہاری!" رضوی نے نظریں نیچی رکھتے ہوئے ہی جواب دیا۔

"آج کچھ کھوئے کھوئے سے معلوم ہو رہے ہو؟" بھابی کا فطری جذبہ انگڑائی لینے لگا۔ بھابی اپنے دیور کو بیٹے سے بھی زیادہ چاہتی تھی۔

"کھانا کھا لو نا بھیا:—"

"نہیں بھابی!—" وہ کتاب کے اوراق اُلٹ پلٹ کر رہا تھا، مگر نظریں، بہت دور دیکھ رہی تھیں۔

"بھوک نہیں ہے مجھے"

بھابی سمجھ گئی، آج کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ اس نے اپنے دیور کی کمزوری سے فائدہ اُٹھانا چاہا،

"نسرین آ رہی ہے آج مجھے فرصت بہت کم ملے گی"

پرواہ نہیں—" وہ حیران رہ گئی، نسرین سے اتنی دلچسپی رکھنے والا لڑکا آج جانے کیوں بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا، وہ پکارتی کی پکارتی رہ گئی اور رضوی گھر چھوڑ چل دیا۔

افسانوں کا مجموعہ اس نے ایک ناشر کے حوالے کیا، جس میں پندرہ تڑپتی ہوئی زندگیاں دفن تھیں، بولا: "مہربانی کیجئے، اس مجموعے کو آپ اپنے یہاں محفوظ رکھئے گا، آج مجھ پر بجلی گری ہے، اگر زندگی باقی رہے تو مستقبل قریب میں واپس لے لونگا ورنہ ——— !" وہ آگے نہ بول سکا، اور وہ بول بھی نہ سکتا تھا۔ اس سے پہلے بھی اس نے اسی ناشر کو اپنی کتاب دی تھی اور نہایت فخر سے کہا تھا: "دل و جگر کے خون سے لکھا ہے میں نے!" ناشر نے اس کا معاوضہ اتنا کم بتایا کہ وہ صرف اس کے ایک لمحہ کی بے چینی اور اضطراب کی بھی قیمت نہ تھا، رضوی اس معاوضہ پر راضی نہ ہوا تو اس نے کہا تھا "یہ فاسفورس ہے، صرف رات میں چمکتا ہے، روپیہ بٹورنے کے لئے دہکتا ہوا انگارہ پیدا کرو کہ دن میں بھی چمکے اور رات بھی چمکے ——" رضوی نے مجموعہ یہ سوچتے ہوئے واپس لے لیا تھا کہ سورج بھی تو آخر صرف دن ہی میں چمکتا ہے، اور چاند بھی تو صرف رات ہی میں روشن نظر آتا ہے —— ناشر نے جلدی سے اس کی رسید پھاڑ دی اور احتیاط سے اپنی شیروانی کے جیب میں رکھتے ہوئے "شکریہ" کہا اور چلتا بنا۔ ناشر شکریہ کے جواب میں چہرے سے خوشی کا اظہار کرنے لگا۔

بھابی کے بھیجے ہوئے نوکروں نے بھائی کو اطلاع دی، اور بھائی کے آدمی اور بھابی کے نوکروں نے مل کر سارا حیدرآباد چھان مارا، مگر کہیں بھی اس کی پرچھائیں تک نہ ملی۔

البتہ کچھ ہی دنوں بعد وہ دہلی کی سڑکوں پر ٹن ٹن کرتا، دوڑتا پھرتا نظر آیا، گرد اور پسینہ میں اٹا ہوا مزدور رکشا کھینچ رہا تھا، اور وہ رکشا بھی بڑی مشکلوں سے سیٹھ نے رحم کھا کر دیا تھا۔

"خیر بابا! تیرا ایمان تیرے ساتھ، اگر واقعی جو کچھ کہ تو نے کہا ہے، سچ ہے تو تجھ پر سے یہ رکشا قربان، لے جا، اپنا پیٹ پال، مگر سن! روز دو روپیہ دے دیا کرنا اس کا"

وہاں اس نے دن کو دن سمجھا اور نہ رات کو رات جانی، بس ایک دھن سوار تھی کہ کسی طرح بھی بن پڑے، چار سو روپے الگ کرے۔ رکشا کھینچنے میں اس کو ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ پیسہ زیادہ بچا سکتا تھا، اس لئے کہ اس کی آمدنی کافی ہوتی ہے اگر فضولیات پر پیسہ نہ اڑایا جائے تو بہت جلد چار سو کیا، ایک ایک کر کے پانچ سو بھی ہو جاتے تھے، ان کا معیار زندگی پست جو ہوتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اس نے اچھی سی نوکری کیوں نہیں دیکھ لی، آخر تعلیم کا مصرف کیا؟ وہ جانتا تھا کہ ہندوستان میں اچھی نوکری اور اچھی بیوی بہت کم ملا کرتی ہے، اور پھر نوکری کے ساتھ ساتھ معیار زندگی میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جو لاکھ کماتا ہے سوا لاکھ خرچ کرتا ہے۔ اور بیس کمانے والا ۲۱ روپے صرف کرتا ہے۔

ایک دن ایک عجیب واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ حالانکہ اس نے موٹی موٹی سواریاں بھی کھینچی تھیں، پیٹ نکلے ہوئے مرد اور پٹیلی عورتوں کو بھی اس نے رکشا میں بٹھایا تھا، سیٹھ لوگوں کو بھی بتائے ہوئے مقام پر پہنچایا تھا، کالج کے بابا لوگ اور بی بی لوگوں کو بھی وقت پر پہنچایا تھا، مگر اس دن جانے اس کی کون دانتی جو بھاگ گئی، ہلکی پھلکی سی ایسی نازک لڑکی کو سڑکوں پر کھینچا کھینچا پھرا، اور اپنی محنت کا معاوضہ لیتے ہوئے اس نے لڑکی کا شکریہ ادا کیا، ویسے تو وہ ہر ایک کا اپنی محنت کا صلہ پاکر شکریہ ادا کیا کرتا تھا مگر کسی نے اس کے شکریہ پر اپنے کان نہ دھرے تھے، حتیٰ کہ اس ناشر نے بھی کچھ نہ کہا تھا جو ادب کی بڑی بڑی کتابیں شایع کرتا ہے۔ نفسیات کی یہ طالبہ تڑپ کر رہ گئی، اور ذہن ہی ذہن میں نفسیات کی موٹی موٹی کتابیں نیچے اوپر کر دیں مگر کچھ بھی سجھائی نہ دیا، جیسے اس کے دماغ کے محفوظ ہزار ہا صفحوں پر کالک پھر گئی۔ دلوں کے اندر تک گھس کر رتی رتی کی جانچ کرنے والی نظریں بار بار رکشا والے کے سینے پر سے لوٹ لوٹ جاتی تھیں۔ حالانکہ وہاں ذرا چھوڑ، پورے کپڑے نہیں تھے، گرد، مٹی، پسینے میں اٹے ہوئے رکشا والے کے پیچھے اس نے ایک بلند شخصیت دیکھی اور

جاتے جاتے اس سے اس سے وعدہ لیا کہ وہ روز کالج چھوڑ دیا کرے اور گھر پہنچا دیا کرے۔

وہ دن بھر کالج میں اسی رکشا والے کے متعلق سوچتی رہی، کئی دفعہ خواہش نوکِ زبان تک آکر رہ گئی ورنہ وہ اپنے پروفیسر کے آگے اپنی قلبی کش مکش اور ذہنی انتشار کا راز کھول کر رکھ دیتی۔ مگر نفسیات سے کھیلنے والی ذہین طالبہ جانتی تھی کہ اندرونی خلفشار اور کلیجے میں کھٹکتی ہوئی پھانس کو دُور کر دیا جائے تو وہ جیس کی لذتوں سے یکسر محروم ہو جائے گی تو اپنے قیمتی جذبات کے اظہار کے بعد اب اس کی قیمت ہی کیا رہی؟ اس معاملہ میں پروفیسروں کی مدد کی توقع محض فضول تھی، دارالمطالعے میں نفسیات کی ساری کتابیں کھول کھول کر رکھ دیں مگر ان سے اس معاملہ میں کچھ بھی مدد نہ ملی۔ ڈھیروں کتابیں سامنے پڑی تھیں، مگر ان کتابوں میں محض فضولیات اور خرافات کے کچھ نہ دھرا تھا۔ اس کا جی بھر آیا، غصہ سے تلملانے لگی، ضخیم ضخیم کتابیں لکھ کر عالمی شہرت کمانے والے، اس کے سامنے بازیچۂ اطفال سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے، آج یہ پہلا موقع تھا، کہ نفسیات کے شہرۂ آفاق عالم اور ماہر خس و خاشاک کی طرح سیلِ جذبات میں رواں دواں تھے۔ ان کی عزت و توقیر ہی کیوں کی جائے، جبکہ یہ اوٹ پٹانگ لکھ کر اپنے نام کا ڈھول پیٹ لیا کرتے ہیں۔ وہ ان ساری کتابوں کو دیا سلائی دکھا دینا چاہتی تھی مگر بس نہ چلتا تھا۔

تین بجے ہی سے وہ رکشا ـــــ رکشا والے کا انتظار کرنے لگی لیکن وہ ٹن ٹن کرتا ہوا عین وقت پر جبکہ کالج کی گھنٹی ٹن ٹن ٹن کر رہی تھی گیٹ کے سامنے پہنچا، وہ دھڑ سے رکشا میں سوار ہو گئی، جیسے اس کے سارے اعضا شدتِ تفکر کے باعث مضمحل ہو کر رہ گئے، وہ اپنے تقریباً مفلوج اعضا کو دیکھ دیکھ سوچنے لگی، میرے اعضا جانے کیوں مفلوج ہو رہے ہیں، وہ اپنے بازو میں چیونٹی لے کر اعضا کی حساسیت کا پتہ چلانے لگی، ابھی اس کے سارے جوڑ اپنے اپنے کام میں مصروف تھے، اس سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی، مگر قوتِ گویائی جواب دے دیا کرتی تھی، ورنہ وہ تو رکشا والوں کو چھوڑ موٹر والوں کو بآسانی ڈانٹ لیا کرتی تھی۔ اس کے ننھے سے دل میں ہمدردی و مہربانی کے جذبات ابھریں لینے لگے، وہ بہت دیر تک رکشا والے کی پشت، کہنیوں اور ڈنڈے کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے پنجوں کو گھورتی رہی، لیکن وہ قطعی بے خبر بھاگا جا رہا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھے بنا۔ وہ اس کی پنڈلیوں کو تکنے لگی، بھاگتے وقت جو بھلی بنتی تھی وہ مزدوروں کی سی نہ تھی، اس نے ننگے پنجوں کو دیکھا، ایڑی پر نظر پڑتے ہی وہ آپ ہی آپ کہنے لگی "شاہ نتا! میں تجھ سے شرط بد سکتی ہوں، یہ صاف ایڑی رکشا والے اور مزدور لوگوں کی نہیں ہوتی، مزدوروں کی ساری ایڑیاں ہمیشہ برہنہ رہتی ہیں اور گرمی اور شدتِ سردی کی تاب نہ لا کر پھٹ پھٹ جاتی ہیں۔ میں شرط بد سکتی ہوں، بہت بڑی شرط!" وہ تیز ہونے لگی، رکشا والے نے رفتار سست کرتے ہوئے کہا "کیوں بی بی یہاں اترنا چاہتی ہیں آپ؟"

"نہیں! نہیں!!" وہ بولی "گھر تو ابھی بہت آگے ہے۔ میں ذرا خبطی قسم کی لڑکی ہوں، جانے وقت بے وقت کیوں بڑبڑا لیتی ہوں۔" اس نے اپنی ایک کمزوری کو دوسری کمزوری میں چھپا لیا۔

"میں بھی کیسا عقل سے گیا گزرا ہوں سرکار! آپ کی باتیں سمجھ نہ سکا!" وہ بھی اپنی کمزوری کا بھانڈا پھوڑنے لگا۔

اب کوئی چیز مانعِ صحتِ خیال نہ تھی کہ جو کچھ اس نے رکشا والے کے متعلق اپنا خیال باندھا تھا سو فیصدی سچ نکلا، اس نے صرف دو باتیں کیں، اور دو باتیں بھی کس لطیف انداز اور کس پیارے پیرایہ میں! میری کمزوری کو اس نے اپنی کمزوری میں ڈھکیل کر مجھے سمجھایا کہ کمزوری ہر فردِ بشر میں ہونی ضروری ہے۔

وہ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر ساری باتیں حلق تک آکر رہ جاتی تھیں ۔ وہ اسی کشمکش و پیچ میں تھی کہ رکشا والے نے سلسلۂ خیالات کو توڑا :۔

"یہی گھر ہے نا حضور آپ کا ؟"

"نہیں !۔۔۔۔۔" وہ بیدار سی ہونے لگی " ارے ہاں ! یہی یہی بہت جلد پہنچ گئے ہم گھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

رکشا والا جواب میں خاموش تھا ، پھر خود ہی بولی " روز ٹھیک وقت پر آنا ۔۔۔۔ سن لیا نا !"

"اچھا حضور !" وہ تڑپ گئی ۔

دوسرے دن رکشا والا وقت پر اپنی سواری کے گھر گیا ، شانتا کہنے لگی "کیوں بھئی اتنی دیر لگادی آج تم نے ؟"

"ابھی تو اس موڑ کے گھنٹہ گھر نے نو بجائے ہیں بی بی ۔۔۔ دیر کیسی ؟"

"نو بجے ہیں اب ؟" بناوٹی تعجب کا اس نے اظہار کیا ، اور اپنی کلائی کی سنہری گھڑی پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا " ننھے نے کانٹے گھمادئے ہیں شاید ، دس بج رہے ہیں میری گھڑی میں" ۔ حالانکہ گھڑی میں چھوٹی سوئی نو پر اور بڑی ایک پر تھی ۔ رکشا والا جلد جلد قدم اٹھانے لگا ، شانتا کبھی اپنی کتابیں گود میں ڈال بیٹھ رہتی کبھی اپنے برابر میں اسی سیٹ پر رکھ لیتی ، کبھی ہاتھ میں پکڑلیتی ، کبھی ٹانگ پر ٹانگ ڈالے بیٹھتی ، بیٹھک مناسب نہیں معلوم ہوتی تو غرارے کو نیچے کھینچ کر پاؤں کے نیچے چھپا لیتی ، کبھی ٹانگیں برابر کرلیتی ، کبھی آگے بڑھاتی ، کبھی پیچھے ہٹاتی ، یہ راز خود اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ آج اس کو بے قراری سی کیوں ہو رہی ہے ۔ اس کے بازو کا آپریشن تو نہیں کیا جا رہا تھا ، پھر یہ اضطراب ، یہ بے چینی کیا معنی ؟ جیسے اس کے کسی قریبی عزیز کو بے حد دکھ پہنچ رہا ہو ، شاید شاعر بیچارہ اپنے دل کے نقصان پر بھی کسی رات اتنی کروٹیں نہ بدلا ہوگا ، جتنی دفعہ کہ شانتا نے رکشا کو ہلا کے رکھ دیا تھا ، وہ بولنے لگی :۔

"تم رکشا کھینچنے میں بہت کچے نظر آرہے ہو ؟" اس کو شبہہ نہیں ، یقین تھا کہ یہ اعلیٰ گھرانے کا شخص ہے ۔

"کسی طرح بھی پیٹ پالنا ہے بی بی !"

"تم مجھے جانتے ہو ؟ غالباً نہیں ! میں ہوں لالہ رام جی کی اکلوتی بیٹی ، اچھا بتاؤ تو سہی تم کتنے بھائی بہن ہو ؟"

"دنیا میں صرف میں ایک اکیلا ہوں ، کوئی نہیں اس جہان میں میرا !"

"اوہ !" شانتا نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی " کھاتے کہاں ہو ۔۔۔ ؟"

"جہاں کہیں مل جاتا ہے !" شانتا کا معصوم دل کانپنے لگا ، غریبوں کی زندگی مصایب کا گھر کیوں ہوتی ہے ۔۔۔؟

"میں بی ۔ اے میں پڑھ رہی ہوں ، اس سال چند ہی دن ہوئے ، میں پورے کالج میں اول رہی ، مجھے بہت ساری چیزیں انعام میں ملیں ، ہمارے پتاجی بہت خوش ہوئے کہنے لگے :۔

"شانتا میں تجھے ایک موٹر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اچھا تو تمھارا کیا نام ہوا ۔۔۔ ؟

"میرا نام ؟" جیسے وہ طنز کرنے لگا ، غریبوں کا نام پوچھ کر مزید دکھ پہنچانا چاہتی ہیں " رضوی کہتے ہیں مجھے !"

"تمھیں موٹر چلانی آتی ہے رضوی ؟"

"نہیں ، سیکھ جاؤں گا سرکار ! اگر آپ موقع دیں گی !"

"خبردار رضوی ، احتیاط کرو ، تم میرا نام بگاڑ رہے ہو ، شانتا ، شانتا ہوتی ہے ، سرکار نہیں ہوتی وہ"

اچھا جب تم موٹر سیکھ جاؤ تو مجھے روز کالج پہنچا دیا کرنا، وہاں سے پارک جائیں گے، جب کالج کی لڑکیاں سرکاری طور پر پکنک منانے جائیں گی تو ہم بھی اپنی موٹر میں وہاں جائیں گے، میں تعارف کراؤں گی تمھارا۔ میری ایک بڑی پیاری سہیلی ہے بڑی خوب صورت ہے وہ" وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگی۔ "رکشا کھینچنا چھوڑ دو، بہت بُرا اثر پڑتا ہے اس کا صحت پر"

رضوی شانتا کو کالج چھوڑ کر دوسری سواری کی فکر میں آگے بڑھ گیا، وہ شانتا کی باتوں پر غور کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھا، مگر اس کو رہ رہ کر تعجب ہوتا تھا، یہ لڑکی اتنی تیز کیوں ہے سمجھتی نہیں، جب بولنے پر اترآتی ہے تو سب کچھ کہہ جاتی ہے، حیدرآباد میں بھی لڑکیاں رکشا والوں سے ایسی ہی باتیں کرتی ہیں کیا؟ شانتا کدھر، اور میں کدھر، لیکن وہ مجھ سے چاہتی کیا ہے۔ یہ نوشگفتہ کلی جس پر ابھی ابھی بادِصبا کے لطیف طمانچوں کے نشانات اُترے ہیں، وہ کلچیں کی طرف اپنا ہاتھ کیوں بڑھا رہی ہے۔ وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا، مگر خیالات تھے کہ رہ رہ کر آتے تھے، اس کے ملاقاتی رنگ برنگی موٹروں لئے عطر و گلاب میں بسے ہوئے آتے ہیں گھر میں ——— میں تو ایک ادنیٰ مزدور ہوں، جس کے سارے جسم سے پسینے کی بو آتی ہے۔

رضوی شانتا کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا محض اس لئے کہ وہ اخلاقی فرض سے مجبور تھا، مگر لوٹتے وقت شانتا کہنے لگی، ذرا اس گلی سے چلو، میں اپنی سہیلی سے مل لیتی ہوں۔ بہت دوڑ دھوپ کے بعد گھر ملا، شانتا کہنے لگی: "خیر چلو، کیا ملتے ہیں اس سے، اب گھر بھی نہیں ہوگی!" رکشا والا اتنی دور آنے کی وجہ کافی تھک چکا تھا۔ لیکن شانتا کی میٹھی میٹھی باتیں تھکاوٹ کو ایک حد تک کم کر دیتی تھیں، نماز پڑھنے جاتے ہیں، تو قدم قریب قریب ڈال کر خدا کو زاید قدم دکھاتے ہیں تاکہ معمولِ نماز میں ہیں اتنے قدم اُٹھانے پڑے۔ شانتا بھی یہی طریقہ اختیار کرنے لگی کہ گھر ایک طویل چکر کاٹ کر جانا چاہیئے۔ شانتا رکشا سے اُتر کر رکشا والے پر محبت بھری نظر ڈالتے ہوئے کتابیں اُٹھانے لگی "دیکھو رضوی آج تو تم خوب تھک گئے، آؤ کھانا کھاتے جانا ———"

"نہیں شانتا!" وہ کتاب کے اوراق اُلٹ پلٹ کر رہی تھی، مگر نظریں بہت دور دیکھ رہی تھیں "بھوک نہیں ہے مجھے" رضوی کا دھیان یکایک اس جملے پر بھابی کی طرف پلٹا، وہ کھانا کھانے بلا رہی تھی، بھابی کو اس نے نفی میں جواب دیا تھا، یہ تو شانتا ہوئی .... "آپ بُرا نہ مانئے مجھے بھوک نہیں ہے اس وقت"

شانتا دل گیر ہوگئی، گھر سے اس نے روپیہ منگوایا اور دیتے ہوئے کہنے لگی "رضوی اپنی دل گیر اور آزردہ شانتا سے اپنا معاوضہ لیتے ہوئے انکار نہ کرنا، میں تمھیں انعام نہیں تمھارا اپنا معاوضہ دے رہی ہوں!"

"شُ شُ ــ کُ ......" وہ شکریہ نہ بول سکا، اس لئے کہ یہ معاوضہ اس کی محنت سے سوا تھا۔

وہ بہت دنوں تک شانتا کو لاتا اور لے جاتا رہا، کئی دفعہ شانتا کالج جانے کی بجائے رکشا والے کے ساتھ پارکوں میں پھرتی رہی۔ شانتا کے آگے رضوی ایک وفادار ملازم کی طرح پیش آتا رہا، مگر شانتا کا اصرار تھا، وہ اس کو بہت کچھ سمجھتی تھی، دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے اس کی شانتا نے دس ہزار بار اپنی قسمیں دے کر پوچھا ہوگا، مگر وہ صرف یہی سے انکار کرتا رہا، شانتا کہتی "تم خاصے پڑھے لکھے ہو اطوار طریقے بڑے گھرانے کے معلوم ہوتے ہیں، گفتگو کا انداز رکشا والوں کا سا نہیں۔ تم اپنے آپ کو چھپا رہے ہو، ایک دفعہ میں نے اپنی دوست کے سامنے انگریزی میں تمھیں بُرا بھلا کہا تھا۔ اس وقت میں تمھارا امتحان لے رہی تھی، تم نے ایک دم پلٹ کر غضبناک نظروں سے ہمیں گھورا، جیسے تمھاری خودی پر کسی نے اپنا وزنی پاؤں رکھ دیا تھا، جب میں نے تمھاری رفع غلط فہمی کی خاطر انگریزی ہی میں لڑکی سے کہا" رضوی کو انگریزی خوب آتی ہے ــ" اس وقت میں بلاشبہ کہتی ہوں تم بے طرح محجوب

ہوئے تھے ـــــــ رضوی اب نہ چھپاؤ تم، خود کو میرے سامنے؛ اگر میں نے غلطی کی ہے اس میں تو پھر یہ سمجھو میرا نفسیات کا پڑھنا محض فضول ہوگا، صرف تم اتنا کہو میں آج کل جس آزمائش میں مبتلا ہوں اس میں پوری پوری اتروں گی۔ یہی سوال اور اسی قسم کے بے شمار سوالات اس نے تاروں کی چھاؤں میں، کہکشاں تلے، چمنوں میں، باغوں میں پوچھے تھے، مگر رضوی جانے کیوں مصر تھا، صرف اتنا کہہ کر شانتی کی تشویش میں مسلسل اضافہ کئے جاتا تھا'' شانتا، میرے برسوں کے زخم کو نہ چھیڑو، کیا تمھیں مسرت ہوگی میرے زخم کو دوبارہ جو رستا دیکھوگی، میں وہ نہیں ہوں، جو تم سمجھتی ہو۔ میں ایک ادنیٰ رکشا والا ہوں۔ دن بھر سڑکوں پر دوڑتا دوڑتا پھرتا ہوں، کبھی کوئی مرد ہوتا ہے، اور کبھی کوئی عورت لدی لدی پھرتی ہے۔

''رضوی!'' شانتا بولی ''اب تم رکشا کھینچنا چھوڑ دو، کچھ اپنی حالت بنالو، روز بروز گرے جا رہے ہو، کل پرسوں میری موٹر آجائے گی، چلانا سیکھ لو، ...... یہ ...... لو......'' شانتا منی بیگ رضوی کو دینے لگی۔

''یہ کیا ـــ؟'' رضوی گھبرانے لگا

''رکھ لو تم ـــ کام آئیں گے''

''نہیں شانتا، مجھے شرمندہ نہ کرو''

''رضوی! تم میری بات نہیں مانوگے تو بس یہ سمجھ لو کل تمھیں شانتا کہیں بھی نظر نہ آئے گی''

''شانتا! تم میری سوانح حیات سننا چاہتی ہو تو میری قسم اُسے تم ہی رکھ لو، پرسوں میں تمھیں اسی پارک میں اپنی کہانی سناؤں گا!'' وہ ایک بڑے احسان سے بال بال بچ گیا۔

رضوی نے اسی دن رکشا واپس کر دیا، کچھ کپڑے سلوائے، اور تیسرے روز جمع کئے ہوئے سارے روپیے شیروانی کی جیب میں رکھے، اور پوسٹ آفس کی طرف جانے لگا، شام کو اُسے اپنی روداد غم سنانی تھی۔

رضوی ہلنے بھی نہ پایا کہ جان نکل گئی۔ اس کی جھڑتی لی تو دہنی جیب میں سے چار سو کے نوٹ اور بائیں جیب سے ڈیڑھ سو کے نوٹ، چند خون میں لت پت اور چند پتھر کی ضرب سے چور چور نکلے۔

لالہ رام جی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایسا بھولا شکار انھوں نے کم از کم اپنی پوری عمر میں کہیں نہیں دیکھا تھا، اُنھیں تعجب ہو رہا تھا، کہ یہ پگلا گھر میں اپنی خیر چھیں منا کر اس گلی میں کیوں آنکلا۔ کیا پہچانتا نہیں تھا اس گلی کو وہ؟ لالہ جی کو اس کی موت پر افسوس ہونے لگا، لالہ جی بہادر تھے، اور ہمیشہ بہادروں کی قدر کرتے تھے۔ انھیں بہت افسوس ہوا، مگر بعد کے پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ نوٹوں کو پھاڑ دینا چاہتے تھے مگر ہاتھ نہ بڑھتے تھے۔ خدا کی دین ہے۔ خدا کی دین سے انحراف کرنے والا، پاپی ہوتا ہے۔ بھگوان جس کو دینا چاہتے ہیں، چھپر پھاڑ کر یا سر پھوڑ کر بھی دیدیتے ہیں' وہ نوٹوں کی گڈی زور سے دباتے ہوئے اپنے بہادروں کی ہمت افزائی کی خاطر بولے:۔

''پانچ روپیے کی مٹھائی دوڑ کر بھگوان داس کی دوکان سے لے آؤ، ہم سب مل کر کھائیں گے''

لالہ جی مال غنیمت اپنی جیب خاص میں اتارتے ہوئے لونڈے کو مٹھائی لانے بھیج رہے تھے' اور اس دوران میں' چیل کی تیز نظر گلے میں پڑی ہوئی چاندی کی تعویذ پر پڑی، جو پتھر کی ضرب سے سینے پر پچک گئی تھی، پچک گئی تو کیا ہوا' چاندی تھی آخر وہ! ایک دوسرے شخص نے لالہ رام جی کی نظریں بچا کر تعویذ اُتار لی، اگر لالہ جی دیکھ پاتے تو وہ بھی ان کی نذر ہو جاتی۔

پٹرول اور مٹی کا تیل چھڑک کر نعش کو کچرے کی کنڈی میں پھینکا گیا اور دیاسلائی دکھا دی۔
جب سب مٹھائی کھا چکے تو بیٹھے بیٹھے اس شخص نے تعویذ نکالی اور اس کو کھولا تو خلافِ توقع اس میں سے کسی ناشر کی رسید نکلی:
"مسٹر رضوی سے اُن کے اپنے پندرہ افسانوں کا ایک مجموعہ بعنوان "دردکی کہانیاں" وصول ہوا ...."
سب تعجب کرنے لگے، اور آخر میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مرحوم بلاشبہہ پاگل تھا، اور دُنیا کا بہت بڑا بے وقوف!

سُنتے ہیں شاستا ہر روز نو بجے ہی سے رکشا والے کا انتظار کرتی ہے، مگر مہینوں گزر گئے، وہ ادھر کبھی نہیں پھٹکا۔ آخر انتظار سے تنگ آکر خود ہی پیدل نکل پڑتی ہے، باپ موٹر میں جانے کے لئے اصرار کرتا ہے مگر وہ اس کی ایک نہیں مانتی!

سہام مرزا

نذرِ محمد قلی قطب شاہؒ

سُبک فصلِ گُل کو کیا جائے نا
گریبان و دامن سیا جائے نا

لگے جو نہ لب سے ترے ساقیا
وہ ساغر تو مجھ سے پیا جائے نا

تری دل ربائی ہے افسوں گری
تجھے دے کے دل پھر لیا جائے نا

یہی زندگی ہے تو مرنا بھلا
یہاں پر تو اک پل جیا جائے نا

تری کل سے ہے رات دن بے کلی
موا جائے نا اور جیا جائے نا

ترے اک اشارہ کے ہیں منتظر
جو تو چاہے پھر کیا کیا جائے نا!

تمنا ہے تجھ سے یہی ساقیا
کہ محشر کو رسوا کیا جائے نا

محشر نقوی

جنازہ

فضا کی جبیں پر پسینہ ہے غم کا
ہر اشکِ مژہ آبگینہ ہے غم کا
جوانی کا دامن خزینہ ہے غم کا
یہ دُنیا میں کوئی قرینہ ہے غم کا

نفس در نفس شورِ ماتم بپا ہے
یہ کس اہلِ دل کا جنازہ پڑا ہے
تری انجمن میں!

رُخِ زندگانی پہ آنسو ہیں رقصاں
کہ لیلائے شب کی ہیں زلفیں پریشاں
مشیت بھی حیراں ہے فطرت بھی لرزاں
قبائے محبت کا دامن گریباں

نفس در نفس شورِ ماتم بپا ہے
یہ کس اہلِ دل کا جنازہ پڑا ہے
تری انجمن میں!

چراغِ شبستاں کی لَو تھرتھرائی
کدورت سی آئینۂ کُن پہ آئی
ہوئی رنگِ ماحول سے غم نمائی،
بتِ کفر پرور خدا کی دُہائی

نفس در نفس شورِ ماتم بپا ہے
یہ کس اہلِ دل کا جنازہ پڑا ہے
تری انجمن میں!

کرم چاہتا تھا ستم ہو رہا ہے
قیامت کا معیار کم ہو رہا ہے
وجود اب برنگِ عدم ہو رہا ہے
فرشتوں کو جبریل غم ہو رہا ہے

نفس در نفس شورِ ماتم بپا ہے
یہ کس اہلِ دل کا جنازہ پڑا ہے
تری انجمن میں!

جبریل

نئی کتابیں

۱۔ کڑیاں (افسانے) از لیلیٰ لکھنوی۔ قیمت عہ۸ر۔ پتہ جنرل ٹریڈرز حضرت گنج لکھنؤ۔
۲۔ دامنِ گلچیں۔ (مزاحیہ) از مقرب دہلوی۔ قیمت ۲ر۔ پتہ مشہور پبلشنگ ہاؤس۔ فراش خانہ۔ دہلی۔
۳۔ بدلیاں (افسانے) از سحاب قزلباش۔ قیمت عہ۸ر۔ پتہ نگارستان ایجنسی اردو بازار۔ دہلی۔
۴۔ دنیائے راز (نظمیں) از راز چاندپوری۔ قیمت ۸ر۔ پتہ محمود ابن راز۔ جی سی نیا گڑھی۔ جبلپور۔
۵۔ چھالے (افسانے) از قدوس صہبائی۔ قیمت سے۔ پتہ نیا کتاب گھر۔ اردو بازار۔ دہلی۔
۶۔ زینت (ناول) از قیسی رام پوری حجم ۱۲۸ صفحے قیمت عہ۸ر۔ پتہ رائل ایجوکیشنل بک ڈپو۔ دہلی
۷۔ خاکستر (افسانے) از بہار ولی حجم ۱۹۲ صفحے۔ قیمت عا؍ 〃 〃 〃 〃 〃 〃
۸۔ پھندا (ناول) از قیسی رام پوری حجم ۲۰۶ صفحے قیمت عا؍ 〃 〃 〃 〃 〃
۹۔ آخری رات (ناول) از ایم۔ اسلم حجم ۳۵۲ صفحے۔ قیمت ۴ کلعہ۔ پتہ دار البلاغ۔ محمد نگر میور روڈ۔ لاہور
۱۰۔ سندیسہ (افسانے) از مولا رام کوٹی۔ قیمت عا۸ر۔ پتہ مکتبہ چاند۔ جموں۔ کشمیر
۱۱۔ خوش انجام (ڈراما) از سعید الحق۔ قیمت عہ۔ پتہ دانش محل۔ کوچہ ناہرخاں۔ دہلی
۱۲۔ طغیان (افسانے) از محمد یونس احمر۔ قیمت عہ۸ر۔ پتہ خاتون کتاب گھر۔ اردو بازار۔ دہلی
۱۳۔ مرگِ پروانہ (منظوم افسانہ) از سیدہ اختر۔ قیمت ۸ر۔ پتہ رائل ایجوکیشنل بک ڈپو۔ اردو بازار۔ دہلی
۱۴۔ وزارتی مشین۔ مرتبہ ادارۂ نئی زندگی، بالتصویر۔ قیمت عا؍۔ پتہ منیجر رسالۂ نئی زندگی۔ الہ آباد
۱۵۔ دیس سے باہر (جنگی مضامین) از آغا محمد اشرف۔ قیمت عا؍۔ پتہ شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار۔ لاہور
۱۶۔ وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ (ڈرامے) مرتبہ اختر شیرانی۔ قیمت سے۔ پتہ 〃 〃 〃 〃 〃
۱۷۔ مقالاتِ شیرانی (تنقیدی مضامین) از حافظ محمود شیرانی۔ قیمت سے۔ پتہ 〃 〃 〃 〃
۱۸۔ معاشیاتِ قومی۔ مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان۔ قیمت سے۔ پتہ 〃 〃 〃 〃 〃
۱۹۔ ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے۔ از ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ قیمت ۸ر۔ پتہ حالی پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی
۲۰۔ غبارِ خاطر۔ از ابو الکلام آزاد۔ قیمت للعہ۔ پتہ 〃 〃 〃 〃
۲۱۔ سحر ہونے تک (ناول) مترجمہ ابن انشا۔ قیمت عا؍۔ پتہ سنگم پبلشرز لمیٹڈ۔ ۱۳۔ نسبت روڈ۔ لاہور
۲۲۔ ایک کاروباری (ناولٹ) از اختر اورینوی۔ قیمت ۱۲ر۔ پتہ نگارستان ایجنسی۔ اردو بازار۔ دہلی
۲۳۔ تاریخ آزاد ہند فوج۔ از منشی عبد القدیر۔ قیمت سے۔ پتہ حالی پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی
۲۴۔ نئی تہذیب نئی تعلیم۔ مترجمہ برکت علی فراق۔ قیمت عا؍ 〃 〃 〃 〃 〃 〃
۲۵۔ ہمالیہ کی گود میں (افسانے) از ساگر چند گورکھا۔ قیمت ۱۲ر۔ پتہ راج محل پبلشرز۔ جموں۔ کشمیر
۲۶۔ پنجم مدہم۔ از محمد عمر۔ قیمت عا؍۔ پتہ 〃 〃 〃 〃 〃 〃
۲۷۔ ارمان (ناول) از آغا شاعر۔ قیمت عا؍۔ پتہ ہندوستانی پبلشرز۔ دہلی
۲۸۔ ٹیڑھی لکیر (ناول) از عصمت چغتائی۔ پتہ مکتبہ اردو۔ لاہور
۲۹۔ ایک بات (افسانے) از 〃 قیمت عا؍۔ پتہ 〃 〃 〃 〃
۳۰۔ پردہ نشین (افسانے) از ڈاکٹر محمد نصیر الدین۔ قیمت سے۔ پتہ

مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

تاریخ علم نباتات از پروفیسر محمد سعید الدین۔ مطبوعہ چشتیہ پریس حیدر آباد۔

یہ چھوٹی سی کتاب "ادارۂ اشاعت علوم و فنون" کے سلسلۂ مطبوعات کی چوتھی کڑی ہے۔ اس میں جامعۂ عثمانیہ کے صدر شعبۂ نباتیات نے اس علم کی مختصر سی تاریخ پانچ ابواب میں قلمبند کی ہے۔ سعید الدین صاحب نے اردو میں نباتیات کے مختلف پہلوؤں پر اب تک چار پانچ کتابیں لکھی ہیں جن میں سے ایک کتاب "پودوں کی کہانی" بچوں اور طلبہ کے لئے خود پودوں کی زبانی بہت ہی سلیس اور سادہ انداز میں لکھی گئی ہے، اور زیر نظر کتاب (جو "تاریخ علم نباتیات" کے عنوان سے چھپی ہے) کا اسلوب بیان عالمانہ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ پروفیسر سعید الدین صاحب اپنے موضوع پر بخوبی حاوی ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کی تمہید میں علم نباتات کے متعلق گزشتہ زمانوں میں جن مصنفین نے اپنی تحریریں چھوڑی ہیں ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر اصل کتاب کا پہلا باب شروع ہوتا ہے جو سنہ ۱۵۳۰ء سے سنہ ۱۶۲۳ء تک اس علم کے جو ماہرین گزرے ہیں اور انھوں نے جو کارنامے اپنی یادگار چھوڑے ہیں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح سے ہر باب میں علم نباتات کے سنہ وار ارتقا کو بیان کیا گیا ہے۔

چونکہ یہ کتاب مشاہیر علما، اور ان کے علمی اور فنی نظریوں کے ناموں اور اصطلاحوں سے بہت زیادہ بحث کرتی ہے، اس لئے اس کے سمجھنے کے لئے نباتات سے تھوڑی بہت واقفیت ضروری ہے اور اسی لئے نباتیات کے طلبہ اس کتاب سے بطور خاص استفادہ کرسکیں گے۔

حیدرآباد کے جدید دستور پر ایک نظر از جانکی پرشاد صاحب۔

اس کتابچہ میں حیدرآباد کے جدید دستور کا ایک عمدہ پیرایہ میں تعارف کرایا گیا ہے، اور اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید دستور کے پس منظر اور اس کی ترتیب و تدوین کی منزلوں کو نہایت خوبی سے واضح کیا جائے۔ چونکہ اس کتاب کے مرتب جانکی پرشاد صاحب کا انداز بیان نہایت ہی شگفتہ اور سلجھا ہوا ہے اس لئے اس کتابچہ کے پڑھنے میں وہ ذہنی بار محسوس نہیں ہوتا جو بالعموم قانونی اور دستوری موضوعوں پر لکھی ہوئی کتابوں کے پڑھنے سے ہوتا ہے۔ ادھر کچھ عرصہ سے حیدرآباد کے رسائل و جرائد میں حیدرآباد کے جدید دستور کے متعلق جو بیانات اور مضامین شایع ہوتے رہے ہیں ان کے پیش نظر پڑھنے والے اس دستور کی خوبیوں یا خرابیوں کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے اور اصل دستور کے پورے خد و خال ٹھیک طور پر واضح نہیں ہوسکتے، اس لئے زیر نظر کتابچہ اس قابل ہے کہ اس کے ذریعہ سے حیدرآباد کی جدید دستوری کشمکش کو سمجھا جائے۔ اس میں جانکی پرشاد صاحب نے اس موضوع کو بہت ہی دلکش پیرایہ میں ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کے طرز بیان کی دلکشی کتاب کو بیک وقت ختم کرلینے کی طرف توجہ دلاتی ہے۔

معروضہ از مولوی محمد الیاس برنی صاحب۔ مطبوعہ شمس الاسلام پریس حیدرآباد۔

یہ چھوٹی سی کتاب جس کے دو حصے اب تک شایع ہوچکے ہیں۔ مولوی الیاس برنی صاحب کی متصوفانہ شاعری کا مجموعہ ہے اور اس کے ہر حصہ کی ابتدا میں مصنف نے جو صفحات نثر کے لئے وقف کئے ہیں وہ بھی اپنی معنوی اور ادبی خوبیوں کے لحاظ سے مصنف کے شاعرانہ کلام سے کم دلچسپ نہیں۔ مولوی الیاس برنی صاحب کی تقریر اور تحریر

دونوں کا انداز بیان نہایت شگفتہ اور رنگین ہے۔ ان کو شعر و سخن کا بھی ایک خاص ذوق حاصل ہے۔ چنانچہ اس سے قبل ان کے مرتب کردہ منتخبات نظم کی متعدد جلدوں کے ایک سے زیادہ ایڈیشن شایع ہو کر اردو دنیا میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں، لیکن زیر نظر مجموعۂ کلام کی اشاعت سے قبل شاید کسی کو بھی علم نہ تھا کہ برنی صاحب خود بھی شعر لکھتے ہیں۔ ان کے زیر نظر دونوں مجموعے شاعری کے اعلیٰ نمونوں سے معمور ہیں اور ان کے کلام میں نعت و منقبت کے پاکیزہ مضامین کے علاوہ اتنی رنگینی اور موسیقیت بھی موجود ہے کہ یقین ہے کہ ان کا کلام بہت جلد سماع کی مجلسوں میں مقبولیت حاصل کرے گا۔ تصوف کا ذوق رکھنے والوں کے لئے تو یہ دونوں کتابیں ایک نعمت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سلطانہ رضیہ از خورشید لکھنوی۔ ناشر کتابستان لاہور۔

یہ ایک مختصر سا ڈرامہ ہے جس میں ہندوستان کی مشہور جانباز ملکہ سلطانہ رضیہ کی زندگی کے ڈرامائی پہلوؤں کو دلچسپ اور فنی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ڈرامہ فلم کی ضروریات کے پیش نظر قلمبند ہوا ہے اور اس کا پیش لفظ سید احتشام حسین لکچرار شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی نے لکھا ہے جس میں انھوں نے یہ صحیح رائے ظاہر کی ہے کہ جب اس ڈرامہ کی فلم تیار کی جائے تو وہ ضرور پسندیدہ ہوگی۔

رضیہ سلطانہ کی زندگی کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں عام طور پر رائج ہیں اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رضیہ سلطانہ اور اس کے حبشی غلام یاقوت کے آپس میں عشق عاشقی کا تعلق تھا۔ اس ڈرامہ کے مصنف نے اس واقعہ کا بڑی خوبی کے ساتھ بطلان کیا ہے اور تاریخ کی اس تحقیق کو پیش نظر رکھ کر یہ ڈرامہ لکھا ہے کہ یاقوت دراصل ایک وفادار اور عقلمند غلام تھا، اس لئے رضیہ اس کی عزت اور قدر کرتی تھی اور حقیقت میں اس کو بھٹنڈے کے گورنر ملک التونیا سے محبت تھی۔

موجودہ فلمی ڈراموں میں جہاں تاریخی پس منظر پیش کیا جاتا ہے یا تاریخی اشخاص سے متعلق قصہ تیار کیا جاتا ہے تو اس امر کا خیال نہیں رکھا جاتا کہ جو باتیں ڈرامہ میں پیش کی جا رہی ہیں وہ تاریخی نقطۂ نظر سے کہاں تک صحیح ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر تاریخی فلموں سے متعلق اخبارات و جرائد میں اعتراضات شایع ہوتے رہتے ہیں۔ اپنے اسلاف کی برائیوں کو اجاگر کرنا یا ان کے معائب کو نمایاں کر کے دکھانا بجائے خود بہت بڑا عیب ہے، اور جو برائیاں یا خرابیاں ان میں موجود نہ تھیں محض ڈرامہ میں دلچسپی پیدا کرنے کی خاطر ان کو زیب داستان کرنا نہ صرف عیب بلکہ جرم ہے اور اس قسم کے ڈرامے پیش کرنے والی فلم کمپنیوں کے خلاف شاید مقدمے بھی دائر کئے جا سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فلم کے لئے ڈرامہ تیار کرتے وقت فلم سازی کو ٹکنیک کی پابندی ضروری ہوتی ہے اور مکالمے اور کہانی میں ایسے پہلو بھی پیدا کرنے پڑتے ہیں جو فن کی ضرورت کو پورا کریں لیکن ان ضرورتوں کی خاطر کوئی غیور قوم اپنی تاریخ اور اپنی زبان کو مسخ ہونے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ زیر نظر کتاب میں جو مکالمے قلمبند کئے گئے ہیں وہ نہایت برجستہ ہیں۔ اس میں زبان کی ادبیت کو بھی باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے بعض مشہور تاریخی فلموں کی طرح اس کتاب کے مکالموں اور زبان میں تصنع نظر نہیں آتا، اور واقعہ یہ ہے کہ اگر اس ڈرامہ کے پیش لفظ اور تمہید میں اس امر کی طرف اشارہ نہ کیا جاتا کہ یہ ڈرامہ فلمی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے تو زیادہ بہتر ہوتا، اس لئے کہ بحالت موجودہ اردو ادب میں اچھے ڈراموں کی جو کمی ہے اس کو رفع کرنے کے لئے اس قسم کے عمدہ ڈراموں کی بیحد ضرورت ہے۔

ہندوستان میں اقلیتوں کا مسئلہ از سید عبدالہادی ایم۔ اے لکچرار دارالعلوم کالج۔ ناشر نفیس اکاڈیمی حیدرآباد۔

عہد حاضر کے ہندوستان میں سب سے زیادہ اہمیت اسی مسئلہ کو حاصل ہوگئی ہے، اور اہل ہند کی قدیمی تنگ نظریوں میں برطانوی راج کی پیدا کردہ تہذیب و ثقافت کے باوجود کسی طرح کی کمی ہوتی نظر نہیں آتی۔ دنیا کے دوسرے ممالک اور خاصکر مصر اور بلقان میں بھی اقلیتوں کا مسئلہ موجود تھا، لیکن وہاں کبھی کے اس کو حل کرلیا گیا۔ ہندوستان ہی ایک ایسا بدقسمت خطہ ہے کہ جہاں اس میں روز بروز پیچیدگیاں پیدا ہوتی جارہی ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر انگریز ہندوستان چھوڑ بھی دیں تو اقلیت و اکثریت کے تصور کی جو متعدی بیماری وہ اس ملک میں پھیلا چکے ہیں اس کی سمیت میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔ زیر نظر کتاب اسی معرکہ آرا موضوع سے بحث کرتی ہے۔ اس کے مضامین کو نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں مسئلہ اقلیت کا تاریخی پس منظر دکھایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی سامراج کو ہندوستان میں کس قسم کے خطرے درپیش ہوئے تھے اور کس طرح فرقہ واریت کی ابتدا کی گئی۔ تیسرے باب میں مسلمانوں کے مطالبات اور سنہ ۱۹۰۹ء کی اصلاحات پر روشنی ڈالی گئی۔ چوتھا باب ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی اتحاد اور اس کے محرکات پر مشتمل ہے اور لکھنؤ کے سنہ ۱۹۱۶ء کے میثاق سے بحث کرتا ہے۔ پانچویں باب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۱۹ء میں جو اصلاحات نافذ کی گئیں ان میں اقلیتوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا۔ چھٹا باب اس فرقہ واری جدوجہد کو پیش کرتا ہے جو سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۲۵ء تک کی گئی۔ ساتویں باب میں سنہ ۱۹۲۵ء کے قانون حکومت ہند کے ذریعہ فرقہ وارانہ مسائل کے لئے جو تجویزیں نافذ کی گئی تھیں ان کو پیش کیا گیا ہے۔ آٹھواں باب ہندو مسلم اختلافات کے حقیقی اسباب بیان کرتا ہے، اور آخری باب میں مسئلہ اقلیت کی موجودہ صورت حال سے بحث کی گئی ہے۔ بحیثیت مجموعی کتاب پُر از معلومات اور مفید ہے۔ خاص طور پر ان نوجوانوں کو چاہیے کہ اس کا مطالعہ کریں جو سیاسی امور میں حصہ لے رہے ہیں یا اس سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

"ق"

ہمالیہ کی گود میں ساگر چند گورکھا

(۱۱۹) صفحات۔ قیمت عہ/۱ر۔ راج محل پبلشرز۔ جموں کشمیر۔

ساگر چند گورکھا کا نام کسی کتاب کے مصنف کی حیثیت سے پہلی دفعہ سنا گیا ہے۔ سترہ چھوٹے چھوٹے ادب پاروں کو انھوں نے "ہمالیہ کی گود میں" کا ارزاں نام دیا ہے، کیونکہ ان کے تاثرات وہی ہیں جو "ہمالیہ کی گود میں" انھوں نے محسوس کئے۔ انھیں فطرت سے محبت ہے۔ خصوصاً ہمالیہ کے حسن سے۔ طرز بیان دلچسپ ہے اور مزاج کی ہلکی ہلکی لہریں ہیں۔ مگر ہر مضمونچہ بجائے خود بے حد مختصر اور تشنہ ہے۔ گورکھا اگر اپنے مشاہدات کو فنکارانہ تفصیل سے بیان کرتے تو یہی باتیں اور چمک جاتیں۔ بہرحال اردو ادب میں یہ ایک نیا تجربہ ہے۔ "سپنوں کی دنیا" میں وہ لکھتے ہیں کہ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر چمکنے والی برف بن جاتے۔ اس سے زیادہ فطرت سے محبت کا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے۔ کوبیے والی، پاپا، مرزم بہت اچھے افسانچے ہیں۔ شملے کی آب و ہوا اچھا طنزیہ ہے۔ ان کے افسانوں کے پس منظر میں کشمیر کی مفلس و معصوم دیہاتنیں مسکراتی ہیں، روتی ہیں اور فطرت سے محبت

کرنے کی دعوت دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی اُردو کے سب سے بلند پایہ ادیب نے مقدمہ لکھا ہے، اگر انھوں نے بجائے گورکھا کے فن پر بحث کرنے کے ان کے ذاتی حالات زیادہ لکھ دیئے ہیں، اس سے مصنف کے متعلق معلومات تو حاصل ہوجاتی ہیں مگر ساتھ ہی محسوس ہوتا ہے کہ بیدی نے مقدمہ لکھا تو ہے مگر وہ ان کے فن کے متعلق کچھ لکھنا نہ چاہتے تھے۔

مثنوی عورت اور سماج

از صائب عاصمی۔ (۳۲) صفحے۔ قیمت ۸؍ پبلشرز یونائیٹڈ۔ چوک انارکلی لاہور۔ ملنے کا پتہ از بک ڈپاٹ۔ بیرون دہلی دروازہ لاہور۔

اس مثنوی میں شاعر نے طوائف کی زندگی پر آنسو بہائے ہیں، نتیجہ یہی نکالا ہے کہ مفلسی اور بھوک عصمت کو بھی ویران کر دیتے ہیں جو ہندوستانی عورت اور ہر عورت کا جوہر ہے۔ زبان ستھری، طرزِ بیان دل کش۔

مثنوی کا مقدمہ ثریا جبیں صاحبہ بی۔ اے فاضل نے لکھا ہے جو اس چھوٹی سی مثنوی کے لئے بے حد طویل ہے۔ اگر صائب صاحب اُسے اپنے دیوان کے لئے بھی محفوظ رکھیں اور استعمال کریں تو اچھا ہے، کیونکہ اس میں ان کی شخصیت اور شاعری کے متعلق نہایت تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔

اسلام اور مشاہیرِ عالم

مرتبۂ حبیب عبداللہ ابن حسن بالفقیہہ۔ (۱۱۲) صفحات، قیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں۔

لائق مولف نے ایک قابل قدر کام نہایت محنت اور کاوش سے انجام دیا ہے۔ اس میں انھوں نے قرآن مجید، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور بعثت اسلام کے متعلق ہندو، سکھ، چینی اور عیسائی عالموں کے اقوال اور تاثرات جمع کر دئے ہیں جنھیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ دشمنانِ اسلام بھی جب اسلام کے متعلق کچھ کہتے ہیں تو سوائے تعریف کے کچھ نہیں کہہ سکتے۔

زیرِ نظر مجموعہ میں رابندرا ناتھ ٹیگور، سروجنی نائیڈو اور گاندھی جی کے تاثرات بھی موجود ہیں۔

انیسیات

مجموعۂ کلام انیسہ ہارون شروانیہ۔ (۱۹۲) صفحات۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ اُردو محل حیدرآباد دکن۔

محترمہ انیسہ شروانیہ کی مختلف نظمیں، غزلیں، نعت اور حمد اس مجموعۂ کلام میں شامل ہیں۔ ترتیب میں مختلف ادوار کا خیال رکھا گیا ہے جس سے موصوفہ کے فن کی ارتقائی منازل کو سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے۔ زبان شیریں اور سلیس ہے۔ ہر شعر خلوصِ دل اور شدتِ احساس کا آئینہ دار ہے خصوصاً وہ نظمیں جو بارگاہ رسالت میں حج کے موقع پر لکھی گئی ہیں عشق محمدی و عشقِ خداوندی کی بہترین تفسیر ہیں۔ جہاں جہاں ضرورت ہوئی ہے آسان حدیثوں اور آیتوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔

البیان — ختم نبوت نمبر

مرتبہ اقبال سلمانی۔ قیمت ۸؍۔ ملنے کا پتہ دفتر اصلاحِ مسلمہ۔ بیرون دروازہ حکیماں امرتسر۔

سلمانی صاحب نے فرقۂ احمدیہ کے دعوئے نبوت سے متاثر ہو کر یہ کتاب مرتب کی ہے، اور رسولہ لائق مشاہیرِ اسلام کے مضامین درج کئے ہیں، اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسلام میں نبوت آنحضرت صلعم پر ختم ہوگئی، اب ہر دعویٰ باطل ہے۔ مضامین نگاروں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبداللہ سندھی، سر محمد اقبال، سید سلیمان ندوی اور مولانا اسلم جیراج پوری کے نام ہی اس بات کے ضامن ہیں کہ مضامین دلائل و براہین کی مدد سے لکھے گئے ہیں کج بحثی کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

پنچم مدھم محمد عمر (نور الہیٰ)
(۲۰۸) صفحات۔ قیمت عا۱۔ راج محل پبلشرز۔ جموں کشمیر۔

محمد عمر صاحب کے سات ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اکثر تو وہ ہیں جو مصنف نے غیر زبان سے لے کر ہندوستانی طرز پر اُردو میں ڈھالے ہیں۔ اکثر ڈرامے تاریخ سے متعلق ہیں۔ مگر تختِ طاؤس کا خاتمہ غیر مکمل ہے جو عہد شاہجہانی سے متعلق ہے۔ حادثہ جو اس مجموعہ کے آخر میں ہے ان کا طبعزاد ڈرامہ ہے، طنزیہ ڈرامہ ہے۔ اُردو ادب میں ڈرامہ نگاری کے فن نے ترقی نہیں کی، اس لئے یہ قدر کی نظر سے ضرور دیکھے جائیں گے۔ بعض اوقات زبان ثقیل استعمال کی ہے۔

ساحلی خاموشی اور دوسرے ڈرامے از سید عبدالقدوس مہاراج کالج میسور۔
(۵۰) صفحات قیمت درج نہیں مطبوعہ سنٹرل پبلشنگ ہاؤز۔ شہر بنگلور۔

ادارۂ ادبیات اُردو نے اب حیدرآباد سے باہر بھی اشاعت اُردو ادب کا کام شروع کردیا ہے اور اُردو میں لکھنے کا شوق پیدا کیا جارہا ہے۔ چنانچہ یہ کتاب بھی وہاں کے ایک طالب علم کی پہلی ادبی کوشش ہے اس لئے قابل قدر ہے۔ تین مختصر ڈرامے شامل ہیں۔ آیندہ معیار اور بڑھایا جائے۔ کتاب میں فنِ ڈرامہ نگاری ایک مضمون بھی ہے جو بجائے خود قابل قدر ہے۔ عبدالقادر سروری صاحب اور عبدالواحد صاحب نے دیباچہ اور پیش لفظ لکھا ہے۔

ادبِ لطیف سالنامہ ۱۹۴۶ء مکتبہ اُردو۔ حجم (۲۰۲) صفحات۔ سالانہ چندہ چھ روپے۔

سالناموں کو اس قدر حسنِ ترتیب کے ساتھ پیش کرنا ادارہ ادبِ لطیف کا ہی حصہ ہے۔ کیا مقالات و منظومات، کیا غزلیات و افسانے سبھی انتخاب ہیں۔ تقریباً تمام مشاہیر اہل قلم نے حصہ لیا ہے خصوصاً افسانوں کا مجموعہ تو بے حد اچھا ہے۔ کرشن چندر نے اُردو ادب میں اس دفعہ نئی چیز پیش کی ہے۔ "پودے" جس میں واقعات نگاری کے باوجود افسانوں کا سا حسن ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے اپنے افسانے کے لئے نیا موضوع اختیار کیا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی "ماسوا" لکھ کر ہمیشہ کی طرح اپنے آپ کو ممتاز ثابت کردیا ہے۔ ان کے ہر افسانہ میں کچھ نہ کچھ انوکھا اچھوتا پن ضرور ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عزیز احمد، علی عباس حسینی، عصمت چغتائی اور ابراہیم جلیس نے اچھے افسانے لکھے ہیں۔ بحیثیت مجموعی پورا شمارہ دلچسپ ہے۔ نئے ادب کے مخالفین کو اسے پڑھنا چاہیئے اور سوچنا چاہیے کہ اگر ترقی پسند ادب یہ کچھ ہے تو پھر کیا چاہیئے۔ لکھائی چھپائی عمدہ اور کاغذ اچھا ہے۔

افکار ماہنامہ بھوپال۔ چندہ سالانہ ۶ہ۔

بھوپال ہمیشہ سے علمی و ادبی خدمت کے لئے مشہور ہے۔ چنانچہ ترقی پسند رجحانات کا عکاس ایک رسالہ افکار جاری کیا گیا ہے۔ مجلس ادارت میں رشدی بھوپالی، صہبا لکھنوی اور کوثر چاندپوری کے نام ملتے ہیں معیار کافی اچھا ہے۔ مقالات، نظموں اور افسانوں کا انتخاب اچھا ہے۔ زیر نظر شمارہ میں تسنیم سلیم کا افسانہ بہت اچھا ہے۔

سوویت روس اور مسئلہ قومیت مترجمہ تمنائی۔ حجم (۱۶) صفحات قیمت ۳ر۔ ملنے کا پتہ نیا سنسار، بانکی پور، پٹنہ۔

تمنائی صاحب مترجم کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں۔ "زندہ چین" کا انھوں نے ہی ترجمہ کیا تھا۔ روسی مسائل پر چھوٹے چھوٹے مضامین کا ترجمہ کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس کتابچہ میں سوویت روس میں قومیت کے مسئلہ اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ عوام کے لئے اس کا مطالعہ صحت بخش اور

معلومات آفریں ہوگا۔

دور دیس کی شہزادی بھائی جان (دفتر میزان) قیمت ۴ر۔ حجم (۲۳) صفحات۔
بھائی جان نے بچوں کے لئے ایک انتہائی دلچسپ قصہ لکھا ہے۔ ایسی کہانیاں بچپن میں ہی بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے ہیں۔ لیکن اندیشہ تھا کہ زمانہ شاید اسے بھلا دے اس لئے ان کو لکھنا اور محفوظ کر لینا مفید ہے۔ ان شہزادے شہزادیوں کے روپ میں بچے ان کرداروں سے متاثر ہوتے ہیں جو حصول مقصد کے لئے دُکھ جھیلتے ہیں، زمانہ کا مقابلہ کرتے ہیں۔ بھائی جان کی زبان فصیح نہیں ہے اور اکثر جگہ انھوں نے معمولی معمولی غلطیاں کی ہیں۔ اس طرف انھیں زیادہ توجہ دینی چاہیئے کیونکہ بچوں پر اس کا بہت اثر پڑتا ہے۔ زبان سلجھی ہوئی ہونی چاہیے۔

راجکماری چمپا راجہ مہدی علی خان۔ حجم (۴۸) صفحات۔ قیمت ۶ر۔ راج محل پبلشرز۔ جموں کشمیر۔
راجہ مہدی علی خان نے پانچ چھوٹی چھوٹی کہانیاں دلچسپ انداز میں لکھی ہیں۔ زبان عام فہم اور سادہ ہے۔ سرورق بھی خوب صورت ہے۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر یقیناً بچے خوش ہوں گے۔

بونوں کا قلعہ راجہ مہدی علی خان۔ حجم (۷۴) صفحات۔ قیمت ۶ر۔ راج محل پبلشرز۔ جموں کشمیر۔
اس میں بھی پانچ دلچسپ چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں۔ "بہادر پرشین" اور "ڈیوار جین" ان میں تاریخی ہیں۔ بچوں کے لئے ایسی دلچسپ تاریخی کہانیاں بہت اچھی ثابت ہوں گی، اور دل بہلائی کے ساتھ ساتھ وہ بہت کچھ سیکھ لیں گے۔

ہمارے آس پاس غوث انصاری۔ قیمت ۶ر۔ حجم (۵۱) صفحات۔ راج محل پبلشرز۔ جموں کشمیر۔
بچوں کے لئے سائنس کی عام فہم کتابیں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ اس کی بے حد ضرورت ہے۔ انصاری صاحب نے آسان پیرایہ میں بچوں کے لئے اکثر اہم ایجادات کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی ہیں مثلاً "ربڑ کی کہانی" "برقی قوت کی کہانی"۔ کیڑے کوڑے وغیرہ۔ کتاب کا انتساب بچوں کو بہت پسند آئے گا کیونکہ لکھا ہے "تمہارے نام" ہر بچہ اسے پڑھے اور زمانہ کی ترقی سے باخبر ہو۔

توافق للبقاء نعیم صدیقی (۶۹) صفحات۔ قیمت ۱۰ر۔ دار الاشاعت نشاۃ الثانیہ۔ حیدرآباد دکن۔
یہ کتاب ڈارون کے نظریہ "تنازع للبقاء" کی تردید میں لکھی ہے۔ اپنے مضمون کا انھوں نے اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ انداز عالمانہ ہے۔ زبان ادبی استعمال کی گئی ہے۔ باوجود خشک نظریوں سے بحث کرنے کے طرز دلچسپ ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔

ایک کاروباری اختر اورینوی۔ حجم (۶۴) صفحات۔ قیمت ۱۲ر۔ ہندوستانی پبلشرز دلی۔
اورینوی کا نام ادبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ ان کے افسانوں کا پس منظر جنوبی بہار کی فطری دل کشی ہے۔ مگر اس کاروباری کی نفسیات نگاری کرتے کرتے انھوں نے انوکھی جنبش کی ہے کہ فطری حسن دل کشی کی بھی قیمت وصول کرنا چاہتا ہے۔ اس کی نفسیاتی الجھنوں کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ انجام تو بس ایسا ہے کہ تعریف کئے بغیر نہ رہا جائے۔ "ز۔ س"

ادارے کی خبریں

شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی کے تاثرات

بتاریخ ۱۸ جنوری ۱۹۴۶ء م ۱۴ صفر ۱۳۶۵ھ بروز جمعہ صبح ۹ بجے آنریبل مولوی سید زاہد حسین صاحب صدر المہام فینانس سرکار عالی اور شمس العلماء مولانا خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی ادارہ ادبیات اردو کے معائنہ کے لئے تشریف فرما ہوئے۔ اس موقع پر ادارے کی مصروفیات معلوم کر کے حضرت خواجہ صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ دہلی تشریف لیجانے کے بعد اس گروپ فوٹو کو جو اس روز ادارے میں لیا گیا تھا ایک بڑے پوسٹر میں شایع کیا۔ اور اس پوسٹر میں بحرف جلی جو عبارت از راہ قدردانی درج فرمائی وہ حسب ذیل ہے:

ایوانِ اردو حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیاتِ اردو

گروپ فوٹو

"آل نبی اولاد علی سید محی الدین قادری زورؔ نے حیدرآباد دکن میں اردو زبان کا یہ ایوان بنایا ہے جس نے اعلیٰ درجہ کی علمی اور تاریخی کتابیں شایع کی ہیں۔ زورؔ صاحب کی رفاقت میں بڑے بڑے تعلیم یافتہ ہندو مسلمان بلامعاوضہ اردو زبان کی ترقی کا بہت بڑا کام انجام دے رہے ہیں۔"

جنوری ۱۹۴۶ء کے شروع میں آنریبل مولوی زاہد حسین وزیر خزانہ شاہ دکن اور خواجہ حسن نظامی دہلوی کو یہ ایوان اردو دکھایا گیا۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن میں ہندو مسلمان مل جل کر اردو زبان کا وہ شاندار کام کر رہے ہیں جس کی مثال ہندوستان کے کسی مقام پر نہیں ملتی۔

شمس العلماء حضرت خواجہ حسن نظامی جانشین حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی کے لئے ایڈیٹر اخبار منادی دہلی نے شایع کیا۔ ۲۰ جنوری ۱۹۴۶ء

یہ پوسٹر ہزاروں کی تعداد میں شایع ہوا اور ہندوستان کے مختلف شہروں کے علم دوست اصحاب کی خدمت میں روانہ کیا گیا۔ اس قدر افزائی کے لئے منجانب ادارہ حضرت شمس العلماء خواجہ حسن نظامی صاحب کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

روزنامچہ

شمس العلما حضرت خواجہ حسن نظامی نے اپنے روزنامچہ میں جو اخبار منادی مورخہ ۹ و ۱۰ فروری ۱۹۴۶ء کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ ۱۰ جنوری کی تاریخ کے تحت ادارۂ ادبیات اردو کا عنوان قائم کرکے اپنے معائنہ کے حسب ذیل تاثرات قلمبند کروائے ہیں۔

ادارہ ادبیات اردو

"دس بجے ادارۂ ادبیات اردو میں گیا تھا۔ یہاں مولوی زاہد حسین صاحب صدر المہام فینانس تشریف لائے تھے۔ مولوی سید محی الدین صاحب زور بانی ادارۂ ادبیات اردو نے اپنے بے مثال کاموں کو دکھایا۔ اتنی زیادہ خوبیاں یہاں جمع تھیں کہ روزنامچے میں ان کی تفصیل لکھوں تو ایک کتاب بن جائے۔ صدر المہام صاحب بھی بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ ایسے سائنٹفک طریقے سے اردو کی نسبت معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اور ایسی عجیب و غریب خدمت انجام دی گئی ہیں کہ زور صاحب کو اردو پاشا خطاب دینے کو جی چاہتا ہے۔

ایک عجیب کتاب

ابوالحسن تانا شاہ کی قید کے زمانے میں قلعہ دار جو روزنامچہ لکھتا تھا یا جو معروضے شہنشاہ اورنگ زیب کو بھیجتا تھا اور جس قسم کے انتظامی جوابات اورنگ زیب کی طرف سے آتے تھے۔ وہ سب اس کتاب میں درج ہیں اور یہ دکن کی تاریخ کا وہ قیمتی خزانہ ہے جو دنیا میں کہیں میسر نہ آسکے گا اور ایک کتاب حضرت ٹیپو سلطان شہید کا روزنامچہ ہے اور وہ بھی نہایت بیش قیمت چیز ہے۔ میں نے زور صاحب سے درخواست کی کہ وہ ان دونوں کتابوں کی نقلیں مجھے شائع کرنے کے لئے عنایت فرمائیں اور انھوں نے وعدہ کیا ہے۔ اگر میں اس ارادے میں کامیاب ہوجاؤں تو یہ سمجھوں گا کہ موجودہ سفر دکن بہت کامیاب ہوا جس نے مجھے تھکا دیا ہے۔ کیونکہ رات دن کے ہجوم کی وجہ سے مجھے کوئی وقت سکون اور آرام کا نہیں ملتا ہے۔

وہاں تصویر بھی لی گئی۔ مگر رواجی تکلفات بالکل نہیں تھے۔ کیونکہ ایک سچے مخلص کا علمی ایوان تھا۔"

یکم ستمبر کے منادی میں حضرت خواجہ صاحب کے چار روزہ سفر حیدرآباد کے تاثرات درج ہیں ان میں خواجہ صاحب نے حسب ذیل تاثر ادارہ کے متعلق ظاہر فرمایا۔

ادارۂ ادبیات اردو کے بانی

"مولوی سید محی الدین صاحب قادری زور حیدرآباد کے ان درخشندہ باشندوں میں ہیں جن کے کاموں کی روشنی اب بھی حیدرآباد کو منور کرتی ہے۔ اور آئندہ بھی صدیوں تک درخشاں رکھے گی۔ انھوں نے اور ان کے ادارے کے رفیقوں نے اردو زبان کی بے نظیر اور قابل تقلید خدمت انجام دی ہیں۔ اور مجھے تمنا رہتی ہے کہ اگر فرصت ملے تو میں ادارۂ ادبیات اردو کے ان کاموں کو بار بار دیکھوں جن سے اردو زبان کی خدمت کرنے کے لئے ولولوں میں عملی نور پیدا ہوتا ہے۔"

اردو امتحانات کے مرکزوں کی روئدادیں

مرکز بمبئی

اس سال ادارۂ ادبیات اردو کے امتحانات انجمن اسلام بمبئی کی شاندار عمارت میں بتاریخ ۱۵ جون سنہ ۴۶ء منعقد ہوئے۔ امتحان دینے والوں میں چھوٹے بڑے اور ہر طبقے کے امیدوار شریک تھے۔ امیدواروں کے تعلیمی شوق کا حال سن کر بہت خوشی ہوئی۔ ان میں سے اکثر کسی نہ کسی کارخانے، انگریزی صنعتی ادارہ یا دکان سے تعلق رکھتے تھے۔ بعض عمر اصحاب بھی امتحان گاہ میں نظر آئے جو ادارہ کے امتحانات کے ذریعہ سے لکھنے پڑھنے کی نعمت سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ میں نے جب ان سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ انھیں زبان سیکھنے، اخبار اور رسائل پڑھنے اور خطوط لکھنے کا بے حد اشتیاق ہے۔ اور باوجود تمام دن کی محنت و مصروفیت کے وہ کچھ نہ کچھ وقت اس علمی بھوک اور پیاس بجھانے کے لئے نکال ہی لیتے ہیں۔

بمبئی کی بارش مشہور ہے۔ اس زمانہ میں یہ اپنے شباب پر تھی۔ بارش کا سلسلہ امتحان کے دن بھی جاری رہا۔ علاوہ ازیں امتحان کے دن گرہن میں اور کارخانوں کو تعطیل نہ ہونے کی وجہ سے مزدور پیشہ لوگ متوقع تعداد میں نہ آسکے۔

ادارہ کی یہ شاخ عبدالرزاق صاحب قریشی مددگار انجمن اسلام ہائی اسکول کی نگرانی میں تعلیم بالغان کا کام انجام دے رہی ہے۔ صاحب موصوف اس شاخ کے بانی اور روحِ رواں ہیں۔ صاحب موصوف کی ذاتی دلچسپی اور اردو کی نشر و اشاعت سے والہانہ لگاؤ قابل داد ہے۔ قریشی صاحب نہایت مخلص کارکن ہیں جو نہایت مستعدی سے باوجود کئی موانع کے زبان کی خدمت میں مصروف ہیں۔ اگر حکومت بمبئی کا محکمہ تعلیم بالغان ادارہ کی شاخ بمبئی کو اپنے اعتماد میں لے اور اس کی ہمت افزائی کرے تو بہت آسانی سے اور ایک وسیع پیمانہ پر اردو کی نشر و اشاعت کا انتظام انجام پاسکتا ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ پر مجھے وہاں کئی علم دوست اصحاب سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ قریشی صاحب نے اس مقصد کے تحت چند حضرات کو چائے پر مدعو کیا تھا۔ اس پارٹی میں تعلیم بالغان، اردو کی نشر و اشاعت اور ادارہ کے امتحانات کے متعلق بات چیت ہوئی۔ دیر تک تبادلۂ خیالات کے بعد طے پایا کہ بمبئی کے افسر تعلیم بالغان سے اس خصوص میں ربط پیدا کیا جائے تاکہ اس نیک مقصد کے لیے سرکاری و خانگی ذرایع کو استعمال میں لایا جاسکے۔ اس گفتگو میں شہاب الدین صاحب دسنوی سابق پرنسپل انجمن اسلام ہائی اسکول اور موجودہ پرنسپل صاحب نے بھی نمایاں حصہ لیا۔ دسنوی صاحب اردو کے ایک مخلص اور دیرینہ خدمت گزار ہیں۔ آپ بمبئی کی انجمن ترقی اردو کے معتمد بھی ہیں۔ ادارہ کے امتحانات سے آپ کو گہری دلچسپی ہے۔ ادارہ سے آپ کا یہ اشتراک عمل نہ صرف قابل تحسین ہے بلکہ لائق تقلید بھی۔

میرا قیام بمبئی میں گو مختصر رہا لیکن دلچسپ رہا۔ اسمٰعیل منصوری صاحب اور انصار احمد صاحب وارڈن انجمن اسلام ہاسٹل کی عنایات کو فراموش نہیں کرسکتا۔ منصوری صاحب کا حسن سلوک، انصار صاحب کی مہمان نوازی اور قریشی صاحب کا خلوص میرے لئے ناقابل فراموش ہیں۔ محمد بن عمر

مرکز ناکلی جاگیر

بتاریخ ۱۳ جون سنہ ۴۶ء یوم پنجشنبہ شام کی ٹرین سے ناکلی روانہ ہوا غالباً [illegible] کی وجہ سے مرکز ناکلی کے پہنچنے میں چند گھنٹوں کی تاخیر ہوگئی۔ نظام الاوقات میں خفیف سی ترمیم کے بعد جملہ امتحانات حسب قاعدہ بہ پابندی اوقات لئے گئے۔ چنانچہ مذکورہ امتحانات میں حسب ذیل امیدوار شریک رہے۔

اردو فاضل (ذکور) ایک

اردو عالم (اناث) ایک
اردو زباں دانی (ذکور) ۱۲
اردو دانی (ذکور) ۲۰
اردو دانی (اناث) ۹

طبقۂ ذکور کی نگرانی مولوی کریم خاں صاحب صدر مدرس وظیفہ یاب و مولوی آغا نائک صاحب مدرس وظیفہ یاب نے نہایت فرض شناسی کے طور پر فرمائی اور طبقۂ اناث کی نگرانی افضل النساء بیگم صاحبہ بنت کریم خاں صاحب اردو فاضل نے کی۔

سرپرست شاخ ادارہ | مولوی شیخ لعل صاحب بی ایس سی ایل ایل بی وکیل ہائیکورٹ ادارہ کی شاخ کے سرپرست ہیں۔ صاحب موصوف اپنی غیر معمولی مصروفیات کی وجہ اورنگ آباد تشریف لیجا چکے تھے چنانچہ واپسی پر اورنگ آباد میں ان سے ملاقات کی۔ صاحب ممدوح کا خلوص، علمی دلچسپی اور جوش عمل نے نہ صرف ٹاکلی جاگیر پہ احسان کیا ہے بلکہ مستقر اورنگ آباد میں بھی غیر معمولی شہرت کے مالک ہیں۔

صدر شاخ ادارہ | مولوی محمد حنیف صاحب تحصیلدار ٹاکلی جاگیر شاخ ادارہ کے صدر ہیں۔ آپ ہر روز امتحان گاہ تشریف لاتے رہے۔ آپ کا وجود ٹاکلی جاگیر کے لئے ایک نعمت سے کم نہیں۔

معتمد | مولوی وزیر خاں صاحب شاخ ادارہ کے معتمد اور نہایت سرگرم کارکن ہیں۔

ایک بے لوث خدمت گزار | مولوی کریم خاں صاحب صدر مدرس (وظیفہ یاب) بظاہر سن رسیدہ معلوم ہوتے ہیں مگر آپ کی محنت اور غیر معمولی قابلیت سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ موصوف کی ان تھک کوششوں سے ایک خانگی وسطانیہ مدرسہ ٹاکلی جاگیر کے سربرآوردہ حضرات کی اعانت سے انتہائی کامیابی کے ساتھ جاری ہے اور ممکن ہے کہ وہ بہت جلد فوقانیہ کے درجہ تک پہنچ جائے۔ چنانچہ صاحب موصوف نے اس مدرسہ کا تفصیلی معائنہ کرایا۔

منتظم پولیس | مولوی محمد جعفر صاحب ٹاکلی جاگیر کے منتظم پولیس ہیں۔ میرے قیام و طعام کا انتظام آپ ہی کے ہاں رہا۔ آپ نے جس عمدگی کے ساتھ مہماں نوازی فرمائی ہے میں اس کو کبھی بھی نہ بھلا سکوں گا۔ آپ کی اعلیٰ ظرفی سے مجھے متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔

شکریہ | مذکور الصدر حضرات جن کا میں نے مختصر طور پر ذکر کیا ہے قابل مبارکباد اور انتہائی شکریہ کے قابل ہیں چنانچہ بحیثیت صدر نگران کار میں ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے بھی ان سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ نیز افضل النساء بیگم صاحبہ کا بھی شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ موصوفہ نے اپنا قیمتی وقت دیکر ادارہ کی پرخلوص خدمت انجام دی۔ مظہر الدین

مرکز پرلی | بتاریخ ۱۴ جون ۱۹۴۶ء روز جمعہ تقریباً نو بجے شب اسٹیشن پرلی پہونچا۔ اسٹیشن پر مولوی شیخ حسین صاحب مددگار مدرسہ تحتانیہ و رکن شاخ سابق معتمد مولوی ابوظفر محی الدین صاحب اور لال خاں صاحب موجود تھے۔ ان کے ہمراہ ادارہ کے دفتر پر پہونچا جہاں میرے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ طعام کا انتظام واپسی تک مولوی ابوظفر محی الدین صاحب۔ مولوی شیخ حسین صاحب مولوی شیخ وزیر صاحب معتمد شاخ اور مولوی محمد عزیز الدین صاحب قریشی سابق نائب صدر نے کیا تھا۔ امتحان گاہ کے انتظامات کی نسبت دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سب کچھ مقامی ادارہ نے کر لئے ہیں۔ چنانچہ میں صبح ۹½ بجے پہنچکر امتحان گاہ کا انتظام معقول پایا۔ امیدواروں کی نشستیں بہت ہی اصولی طریقہ پر جمائی گئیں تھیں۔ اناث کی نشستوں کا انتظام ایک علحدہ مکان میں کیا گیا تھا۔

شرکار امتحانات کی تفصیل درج ذیل ہے

اردو دانی	(ذکور)	۱۷	جملہ ۲۷
اردو دانی	(اناث)	۳	
زباندانی	(ذکور)	۵	
"	(اناث)	۱	
اردو عالم	(")	۱	

مقامی حالات اور اردو کی سرگرمی

مولوی شیخ وزیر صاحب معتمد، مولوی شیخ حسین صاحب اور مولوی ابوظفر محی الدین صاحب اردو زبان کی اشاعت اور ترویج میں سعی بلیغ کر رہے ہیں اور مجھے جہاں تک معلوم ہوا مقامی ادارہ نے جو بھی اس وقت تک ترقی کی ہے وہ ان ہی حضرات کی انتہائی دلچسپی کا نتیجہ ہے جو ہمیشہ رفاہی کاموں میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ان حضرات کا وجود باشندگان پرلی کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ ان اصحاب کے دلوں میں اردو کی خدمت کا حقیقی جذبہ موجزن ہے۔ اور عام لوگوں کی بھلائی کے لئے جو کام کئے ہیں وہ قابل تحسین ہیں مجھے امید واثق ہے کہ مستقبل میں اس ادارہ کے فارغ طلبہ پرلی میں اردو کی ترقی و ترویج میں سب سے زیادہ حصہ لیں گے۔

مولوی شیخ حسین صاحب مددگار تحتانیہ اور ان کی اہلیہ صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ نسواں نے اہالیان پرلی میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے میں جو حصہ لیا ہے وہ قابل تعریف و مبارکباد ہے۔ میں وہاں کے کمسن طلبہ وطالبات کے علمی شوق کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگاتا ہوں کہ وہ آئندہ چل کر اردو کی گراں بہا خدمات انجام دیں گے۔

جن حضرات نے ادارہ کے کاموں کو آگے بڑھانے میں اپنے قیمتی اور عزیز وقت کو صرف کیا۔ ضروری انتظامات اور کاروبار امتحان میں مدد دی ان کے نام حسب ذیل ہیں:

مولوی شیخ وزیر صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ
" شیخ حسین صاحب مددگار " "
" ابوظفر محی الدین صاحب۔
" محمد ہاشم صاحب کرمانی۔
" محمد عزیز الدین صاحب قریشی۔
" لال خاں صاحب۔

محترمہ نیاز النساء بیگم صاحبہ مددگار مدرسہ نسواں۔
" صدر معلمہ صاحبہ مدرسہ نسواں۔

ظہیر الدین

مرکز میسور

اس دفعہ مرکز میسور میں اردو امتحانات مہاراجہ کالج میسور میں منعقد ہوئے اور میری شخصی نگرانی میں، نہایت باضابطگی کے ساتھ تکمیل کو پہنچے۔ نگرانی میں حسب ذیل حضرات نے میرا ہاتھ بٹایا۔

(۱) مولوی غلام حیدر صاحب بی اے آنرز، لکچرار، انٹرمیڈیٹ کالج، میسور۔

(۲) مولوی سید عبدالعزیز صاحب اردو فاضل، معلم جامعہ مولوی، گورنمنٹ ٹریننگ کالج، میسور۔

ان کے علاوہ خواتین امیدواروں کی نگرانی میں محترمہ رحمت النساء بیگم صاحبہ بی اے، بی ٹی، صدر اردو زنانہ نارمل اسکول، میسور نے حسب سال گزشتہ میرا ہاتھ بٹایا اور خواتین کو امتحانات کے لئے تیار کیا جس کے لئے وہ ادارے کے شکریہ کی مستحق ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو شاخ میسور

شاخ میسور کی کارگزاری کی بابت عرض ہے کہ :-

۱۔ یہ شاخ میسور میں اردو کی اشاعت کے لئے ممکنہ کوشش کررہی ہے۔ اردو پڑھو اور پڑھاؤ، کا براہ راست پروپگنڈا کیا جارہا ہے۔ گزشتہ دو سال سے اردو امتحانات کے لئے امیدواروں کو تیار کیا جارہا ہے، جن میں سے اکثر امتحانات میں شریک ہوکر کامیاب بھی ہورہے ہیں۔ چنانچہ اس سال اردو فاضل کے ایک امیدوار، مسٹر سعید احمد بی ایس سی (علیگ) جو اس امتحان میں شریک ہوئے تھے، وہ نہ صرف درجہ اول میں کامیاب ہوئے بلکہ سارے امیدواروں میں اول آئے اور سر عقیل جنگ تمغۂ طلائی کے مستحق قرار پائے۔

ادارۂ میسور کی شاخ اشاعت کی جانب سے اس وقت تک حسب ذیل تین کتابیں شائع کی گئی ہیں اور چند زیر ترتیب ہیں۔

۱۔ مرآۃ الاسرار، از شاہ محمد صدر الدین، جو آج سے ڈیڑھ

دو سال پہلے میسور کی اردو نثر کا نمونہ ہے، میرے حواشی اور مقدمے کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔

۲۔ ساحل خاموشی اور دو ڈرامے۔ از سید عبدالقدوس بی اے آنرز۔

۳۔ مہتاب سخن۔ لالہ مہتاب رائے منشی سرکار حیدری کے اردو و فارسی کلام کا نادر مجموعہ جو میری ترتیب اور مقدمے کے ساتھ شائع کیا گیا۔

عبدالقادر سروری

شاخ بشیرآباد | بشیرآباد پہلی مرتبہ امتحان اردو دانی منعقدہ ۳۰ نومبر ۱۳۴۸ھ م ۲۶ ردے ۱۳۴۸ھ کا مرکز بنا۔ میرے رفقائے کار مولوی سید بدرالدین احمد صاحب شہرت منشی فاضل و اردو فاضل مددگار مدرس اور محترمہ جمیلانی بیگم صاحبہ ناہید اردو فاضل معلمہ مدرسہ نسواں کی کوششوں اور دیگر علم دوست احباب کے تعاون عمل سے یہ کام بخوبی انجام پایا اور امتحان کا نتیجہ (۶۹) فیصد رہا۔

قیام شاخ ادارۂ ادبیات اردو | مرکز امتحان کے قیام کے ساتھ قیام شاخ ادارہ کا مسئلہ بھی پیش نظر رہا۔ اور مولوی خواجہ حمیدالدین صاحب شاہد ایم اے مہتمم ادارہ کی ترغیب اور حوصلہ افزائی سے اس کا قیام بھی عمل میں آیا۔ چنانچہ حسب مراسلہ نشان (۱۷/۴۱) مورخہ ۹ امرداد ۱۳۵۵ف قیام شاخ کی منظوری بھی شرف صدور لائی۔

دوسرا امتحان منعقدہ ۱۳ امرداد ۱۳۵۵ف | اس امتحان میں اردو دانی کے علاوہ زباندانی، اردو عالم اور اردو فاضل کے امیدواروں نے بھی شرکت کی۔ اردو دانی اور اردو فاضل کا نتیجہ صد فی صد اور زباں دانی اور اردو عالم کا نتیجہ (۶۰) فیصد سے زائد رہا۔ جو کارکنان ادارہ کی محنت اور دلچسپی کا بین ثبوت ہے۔

شیوع مرض طاعون | اگرچہ بشیرآباد ایک اونچے اور پرفضا مقام پر واقع ہے۔ مکانات بھی دور دور واقع ہیں۔ صفائی کا معقول انتظام ہے۔ لیکن گرد و نواح کے متاثرہ مقامات کے باشندوں کی آمد و رفت کے باعث بشیرآباد بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ماہ شہریور میں ہی پریشانی پھیل گئی .... اور آبادی کا تخلیہ ہو گیا۔ شہریور، مہر، آبان تین ماہ تک ادارہ کے کاروبار حالت تعطل میں رہے۔

جلسۂ انتخاب عہدہ داران و ارکان | جب ماہ آذر میں لوگ آبادی میں منتقل ہو گئے تو فوراً ہی ضروری انتظامات عمل میں لائے جا کر بصدارت عالیجناب مولوی سید عزیزالدین صاحب وکیل ہائیکورٹ بتاریخ ۲۱ آذر ۱۳۵۵ف روز جمعہ انتخاب عہدہ داران کا ایک جلسہ بمقام عمارت مدرسہ منعقد ہوا۔ بغلبۂ آرا حسب ذیل عہدہ دار منتخب ہو گئے۔

۱۔ مولوی سید عزیزالدین صاحب وکیل ہائیکورٹ　　صدر شاخ ادارہ
۲۔ مولوی عبدالحکیم صاحب منشی فاضل　　نائب صدر
۳۔ سید کریم الدین صاحب منشی فاضل اردو فاضل　　معتمد و خازن
۴۔ سید بدرالدین احمد صاحب شہرت منشی فاضل　　شریک معتمد

علاوہ ازیں حسب ذیل ارکان انتظامی کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔

مولوی شیر علی خاں صاحب اڈیٹر انجمن امداد باہمی۔ مولوی داؤد خاں صاحب الفاری سب انسپکٹر آبکاری۔ مسٹر تکارام جی اسٹون کنٹراکٹر۔ نالور راؤ صاحب (عثمانیہ) جنرل مرچنٹ۔ مولوی عبدالباری صاحب اردو عالم۔ مولوی مرزا احسن بیگ صاحب مدرس۔ مولوی امجد علی صاحب امجد صیغہ دار۔ مولوی محمد عزیزالدین صاحب صیغہ دار۔ مولوی محمد وہاب الدین صاحب مدرس۔

جلسہ دوم برائے مباحثہ "تقدیر و تدبیر" | یہ جلسہ جناب صدر مدرس صاحب کی صدارت میں ۲۳ اسفندار ۱۳۵۵ف منعقد ہوا۔ اس میں ارکان ادارہ کے علاوہ مدرسین اور طلبائے مدرسہ نے بھی کثیر تعداد میں حصہ لیا۔ مقررین نے اپنی بحث و تقریر سے یہ ثابت کر دیا کہ انھوں نے اس مباحثہ کی تیاری میں کافی محنت اور دلچسپی سے کام لیا ہے۔ یہ تصفیہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ کس کو ترجیح دی جائے۔ بالآخر آرا شماری ہوئی اور

بغلبۂ آرا آندہیر کو ترجیح دی گئی۔ آئندہ مباحثہ کے لئے "شہری اور دیہاتی زندگی" کا عنوان مقرر کیا جاکر جلسہ برخاست ہوا۔

جلسہ سوم منعقدہ ۸ اردی بہشت ۱۳۵۵ف مباحثہ بر عنوان "شہری و دیہاتی زندگی"

اس جلسہ کی صدارت بھی نائب صدر ادارہ نے کی۔ اس جلسہ میں مباحثہ کے لئے جو عنوان مقرر تھا۔ اکثر مقررین نے شہری زندگی کو پسند کیا۔ بچوں کے مباحث بڑے دلچسپ رہے۔ جن سے حاضرین بہت ہی محظوظ ہوئے بالآخر بغلبۂ آرا طے پایا کہ "شہری زندگی" دیہاتی زندگی سے اچھی ہے۔

جلسہ چہارم منعقدہ ۲۰ شہریور ۱۳۵۵ف انتظام تعلیم برائے امیدواران امتحانات

سال ۱۳۵۵ف کا یہ چوتھا جلسہ تھا۔ اس جلسہ کی صدارت مولوی سید عزیز الدین صاحب صدر ادارہ نے فرمائی۔ اولاً معتمد ادارہ نے صدر صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ ادارہ کی سرپرستی کے لئے علم دوست عہدہ دار مولوی حافظ محمد علی صاحب سے استدعا کی جائے۔ صدر صاحب نے یہ کام اپنے ذمہ لیا اور بالمشافہ تصفیہ کر لینے کا وعدہ فرمایا۔

دوسرا مسئلہ اردو امتحانات کے لئے امیدواروں کی تیاری کا تھا۔ مستقر کے حالات کے پیش نظر یہ ضروری تھا کہ بلا معاوضہ یا کم سے کم معاوضہ پر کام کرنے والے مل جائیں۔ چنانچہ اس کا حسب ذیل انتظام روبہ عمل لایا گیا۔

برائے اردو عالم و اردو فاضل

۱۔ مولوی محمد عبد الحکیم صاحب منشی فاضل نائب صدر ادارہ
۲۔ سید کریم الدین فیاض منشی فاضل، اردو فاضل معتمد ادارہ

برائے اردو دانی و زبان دانی

۱۔ مرزا حسن بیگ صاحب مدرس و رکن ادارہ
۲۔ محمد وہاب الدین صاحب مدرس ″ ″
۳۔ محمد بشیر احمد صاحب مدرس

جلسہ پنجم منعقدہ [illegible] آبان ۱۳۵۵ف قیام کتب خانہ و دار المطالعہ

سال ۱۳۵۵ف کا یہ پانچواں اور آخری جلسہ بصدارت مولوی سید عزیز الدین صاحب وکیل ہائیکورٹ صدر ادارہ بمقام عمارت مدرسہ منعقد ہوا جب کہ اس کو علم دوست عہدہ دار مولوی حافظ محمد علی صاحب اول تعلقدار کی سرپرستی کا شرف بھی حاصل ہو چکا تھا۔ اس جلسہ میں ایک کثیر تعداد نے شرکت کی۔ مطالعہ کے فوائد اور قیام کتب خانہ کی ضرورت پر پرزور تقاریر ہوئیں۔ آخر میں معتمد ادارہ نے اس کی اہمیت و ضرورت پر زور دیتے ہوئے ایک موثر تقریر کی اور کہا کہ کوئی علمی ادارہ، کوئی درس گاہ اس وقت تک ترقی نہیں پا سکتی جب تک کہ اس کو مقامی مقتدر اور اہل کرم حضرات کی توجہ اور امداد حاصل نہ ہو۔ ہم کام کرنے تیار ہیں جب تک کہ علم دوست اور مخیر اصحاب دست تعاون اور دست کرم دراز نہ فرمائیں ہماری تمام سعی اور ساری کوششیں بیکار اور بے سود ثابت ہو جائیں گی۔

خاتمہ تقریر پر بیشتر اصحاب نے ماہانہ چندہ دینے کا وعدہ فرمایا۔ صدر ادارہ مولوی سید عزیز الدین صاحب نے اپنی ملکی اور ذاتی کتب کے علاوہ کتب خانہ مسجد کی کتابیں بھی ادارہ ہذا کے کتب خانہ کو مستعار دینے کا وعدہ فرمایا۔ مسٹر ناگو راؤجی جنرل مرچنٹ بشیر آباد نے بھی اپنے پاس کی تمام کتابیں مستعار دینے کا وعدہ کیا۔ علاوہ ازیں حسب ذیل حضرات نے رسائل و اخبارات عطا فرمانے کا وعدہ کیا ہے۔

۱۔ مولوی سید عزیز الدین صاحب صدر ادارہ۔ اخبار رہبر دکن تنویر۔ ترجمان القرآن۔
۲۔ دیو ونکا ریڈی صاحب سب انسپکٹر تمباکو۔ اخبار میزان
۳۔ مسٹر ناگو راؤجی جنرل مرچنٹ۔ اخبار مدینہ سہ روزہ
۴۔ مسٹر بنکٹ لال جی ساہو۔ اخبار پیام

۵. مولوی محمد عزیز الدین صاحب صحیفہ دار اخبار مدینہ
(اخبار کی مدت کچھ باقی رہ گئی ہے اس کے بعد آپ
دوسرا کوئی اخبار یا رسالہ جاری فرمائیں گے)
۶. مسٹر نگارام جی اسٹون کنٹراکٹر اخبار رعیت
اس کے بعد آئندہ یکم آذر ۱۳۵۶ف کو کتب خانہ
اور دارالمطالعہ کا افتتاحی جلسہ کیا جانا قرار پایا اور جلسہ ہذا
کے برخاست کا اعلان کر دیا گیا۔

شاخ پرلی شاخ پرلی ادارۂ ادبیات اردو کے کاروبار مولوی فیض محمد خاں صاحب بی اے ڈیپ ایڈ صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ پرلی کی صدارت میں بحسن خوبی انجام پا رہے ہیں ہر سال شاخ ہذا کے سرگرم رکن مولوی منیر الدین صاحب، مولوی شیخ حسین صاحب، مولوی نواز الدین صاحب، مولوی سعید الدین صاحب صدیقی کی کوششوں سے اردو کی ترویج اور اردو امتحانات کے اہم کام پورے ہو رہے ہیں۔ سال میں دو مرتبہ شاخ کی جانب سے قصبات میں وفد بغرض ترویج و اشاعت اردو کی تشہیر کے لئے روانہ کیا جاتا ہے وفد کے ارکان مولوی شیخ حسین صاحب، مولوی سعید الدین صاحب، مولوی ابوظفر محی الدین صاحب متعلم سٹی کالج (جو تعطیلات میں پرلی آیا کرتے ہیں) ان ہی حضرات کی دلچسپی اور کوششوں کا نتیجہ ہے کہ شاخ ادارۂ ادبیات اردو پرلی قائم اور کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ وفد ہر سال مندرجۂ ذیل قصبات و دیہاتوں کا دورہ کر کے سابقہ کامیاب شدہ امیدواروں کے اسناد ذریعہ جلسۂ عام تقسیم کر کے عوام الناس پر اردو امتحانات کی اہمیت کو واضح کرتا ہے اور آئندہ سال کے لئے بالاتر امتحانوں میں شرکت کے لئے سند گیرندہ امیدواروں کو ترغیب و تحریص کرتا ہے۔ سیل گاؤں۔ سون پیٹھ جاگیر مہاراجہ کشن پرشاد۔ گنگاکھیڑ گھاٹ نانددرہ جاگیر۔ رینا پور۔ پات گاؤں۔ وفد کا دوسرا دورہ ہر سال ماہ تیر میں فراہمی امیدواران برائے امتحان ادارہ مندرجہ قصبات میں ہوا کرتا ہے اور ان قصبات سے زیادہ تر امیدوار شریک امتحان ہوا کرتے ہیں۔

مستقر پرلی پر اردو امتحانات کے لئے باضابطہ انتظام ہے اس کام کے انجام دینے کے لئے صاحبان صدر منتخب ہیں اور تدریس کا انتظام قاضی محبوب الدین صاحب صدیقی کے دیوانخانے میں ہوا کرتا ہے شاخ ادارہ جناب قاضی صاحب کا بہت ہی ممنون ہے کہ موصوف نے ازراہ عنایت اپنا دیوانخانہ شاخ کے لئے وقف کر دیا ہے جہاں تدریس کا کام ہوتا ہے اور شاخ کا کتب خانہ بھی ہے۔

کتب خانہ شاخ کا کتب خانہ جو مولوی قاضی محبوب الدین صاحب کے دیوانخانے میں قائم ہے روزانہ شام میں لوگ کتب کا مطالعہ کر کے مستفید ہوتے ہیں۔ چند اہم اردو کتب پر مشتمل ہے جس کے مطالعہ سے لوگوں میں اردو کے تدریس کا شوق ہو کر امتحانات میں شرکت کا باعث بنتے ہیں۔

اردو امتحانات ہر سال شاخ ہذا کی کوشش سے پرلی امتحانات کا مرکز رہا کرتا ہے اور ہر سال تقریباً ۵۰ سے زائد امیدوار مندرجۂ ذیل امتحانات میں مرکز پرلی سے شرکت و کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ اردو دانی اردو زباندانی۔ اردو عالم اراکین ادارہ کی کوششوں سے ان امتحانات میں ہندو امیدوار بھی شریک ہوتے ہیں۔

نتائج امتحانات ہر سال مرکز پرلی کے امتحانات کے نتائج تشفی بخش رہا کرتے ہیں سال گزشتہ مرکز پرلی سے ۳۰ امیدوار شریک ۲۲ کامیاب مندرجۂ ذیل مقامات کے حضرات شاخ ادارہ پرلی کی جانب سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے جو ہر وقت ادارہ کے لئے دامے درمے سخنے اعانت کرتے ہیں۔

پرلی قاضی مولوی محبوب الدین صاحب۔ سیٹھ حاجی سلیمان احمد صاحب۔ سالگرام جی بھاؤ صاحب۔ عبداللہ بھائی کچی مہتمم صاحب مارکٹ۔ مولوی عبدالستار صاحب۔ مولوی عبدالحکیم خاں صاحب۔ مولوی مہتاب صاحب انجینیر۔ مولوی سید رسول صاحب گتہ دار۔

سون پیٹھ۔ مولوی بنے میاں صاحب تاجر۔
سیل گاؤں۔ مولوی ہدایت علی صاحب پٹیل۔ مولوی قاضی نصیر الدین صاحب
گھاٹ نانددرہ۔ مولوی امین الدین صاحب۔
گنگاکھیڑ۔ مولوی آصف خاں صاحب نواگر۔ مولوی رحمت اللہ خان صاحب مالک سنیما

ادارہ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	قیمت آنے	قیمت پائی
سرگزشت حاتم	۱۲۸	۲	۰	۰
سرگزشت غالب	۹۴	۰	۸	۰
...م الملک	۴۰	۰	۶	۰
تاریخ گولکنڈہ	۳۲۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں	۴۸	۰	۴	۰
سرسید احمد خاں	۱۶	۰	۲	۰
سرسالار جنگ	۴۸	۰	۶	۰
عربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۲۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر	۲۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۳	۰
مکتوبات شاہ عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰	۰
حیدرآباد	۸۵	۰	۱۰	۰
عمادالملک	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۶	۰
" " دوسری کتاب	۵۶	۰	۶	۰
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ	۱۳۰	۱	۴	۰
فن تعمیر	۹۲	۰	۱۲	۰
مختصر تاریخ دکن	۱۴۲	۱	۰	۰
ہندوستانی تمدن	۱۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی	۸۰	۰	۱۰	۰
مرلما	۱۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۶	۰
رسائل طیبہ	۳۹۰	۲	۸	۰
ملک گوہرین	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو	۱۷۲	۱	۸	۰
اشوک اعظم	۵۶	۰	۸	۰
باتیں	۸۴	۱	۰	۰
یورپ جنگ سے پہلے	۲۱۲	۲	۸	۰
شاد اقبال	۱۷۴	۲	۸	۰
اردیالی زبانیں	۱۰۲	۱	۰	۰
ظام علی خاں	۳	۰	۴	۰
تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	۲۹۰	۵	۰	۰
عرب اور عربستان	۵۲	۰	۱۰	۰
سیج کا جادو	۴۸	۰	۴	۰
طوبیعاتی کائنات	۶۸	۰	۸	۰
متاع سخن	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۴۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵ تصاویر)	۵۰۰	۵	۰	۰
" " دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
معروم نامہ	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن	۱۵۴	۱	۴	۰
روح غالب	۱۴۰	۲	۸	۰
عاصم	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۴	۱	۱۲	۰
سود زندگی	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگزشت ادارہ	۳۰۰	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۲۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان	۳۲	۰	۳	۰
خطابیات	۱۱۴	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار	۱۶۸	۱	۸	۰
دھمش نالی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
کاروان داسی	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا	۱۹۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت	۵۲	۰	۸	۰
ادارہ سلم ۱۹۴۱ع میں	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ	۲۴	۰	۴	۰
افضل الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خاں	۳۲	۰	۴	۰